علی پور کا ایلی
ممتاز مفتی

فہرست

دیباچہ برائے بار پنجم

۱۹۹۵ء

میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کتاب کی اتنی ایڈیشن شائع ہوں گی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مشاہیر اردو ادب اس کتاب کو تسلیم کر لیں گے اور اردو ادب میں اسے ایک مقام بخش دیں گے۔ میں اردو ادب کے وسعت قلب کا مرہون منت ہوں، چونکہ یہ میری کوششوں یا جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوا۔

مجھ میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ادیب بنوں۔ کس برتے پر ہوتی نہ تو میں اردو زبان سے واقف تھا نہ ہی میں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں اس زمانے کی پیداوار ہوں جب اردو زبان پنجاب میں در نہیں آئی تھی۔ ہم لوگ گھروں میں محلوں میں مدرسوں میں کالجوں میں دفتروں میں ہر جگہ بے تکلف پنجابی بولتے تھے۔ مدرسوں میں صرف آٹھویں جماعت تک اردو پڑھائی جاتی تھی۔ کالجوں میں اردو کا وجود نہ تھا۔ اورینٹل لینگوایج کے لئے الگ کالج بنائے گئے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے براہمنوں کے آشرم کے قریب ہریجن کٹیا بنی ہو۔ اورینٹل کالج کے طلبا کو اجازت تھی کہ تحصیل علم کے بعد صرف انگریزی کا پرچہ دے کر وہ گریجویٹ ڈگری کے حقدار ہو سکتے تھے۔ ایسے گریجویٹ کو عرف عام میں تحقیر سے وایا بٹھنڈا کہا جاتا تھا۔

ان دنوں میں یکسر مغرب زدہ نوجوان تھا ان حالات میں میں اردو ادیب بننے کی خواہش کیسے کر سکتا تھا۔

پیش لفظ

(تیسرا ایڈیشن)

یہ کتاب میری آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔

پہلے مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی خامیوں' کجیوں اور بے راہ رویوں کو اپناتا۔ اس لئے میں نے اسے روئیداد کا نام دے دیا۔

یہ آپ بیتی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں ہر واقعہ' ہر کردار حقیقت پر مبنی ہے۔ افسانہ نگاری اسلوب میں ہو تو ہو واقعات میں حقیقت گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ارادہ تھا کہ سوانح کا دوسرا حصہ "ایلی اور الکھ نگری" کے عنوان سے پیش کروں گا' لیکن الکھ نگری والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالٰی کو پردہ دری پسند نہیں۔ لہٰذا معذور ہوں۔

مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۸۴ء

ممتاز مفتی

(دوسرا ایڈیشن)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا جو دو سو پچاس جلدوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایڈیشن افراتفری میں چھپا۔ یہ افراتفری آدم جی انعام سے متعلق تھی۔ "اب یہ کتاب اس لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہ ملا۔" (ابن انشا)

اس زمانے میں میں کیوں اردو میں لکھتا رہا بظاہر اس کی صرف ایک وجہ تھی' ضد۔ میرا موقف یہ تھا کہ صرف ادیب ہی کو لکھنے کا حق نہیں ہے غیر ادیب بھی لکھ سکتا ہے آپ اسے ادیب نہ مانیئے گا لیکن لکھنے کا حق تو دیجئے نا۔

دراصل یہ سارا گورکھ دھندا تقدیر کا چلایا ہوا تھا۔ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے تقدیر کو کیا کیا گھمن گھیریاں چلانی پڑتی ہیں۔

علی پور کا ایلی میں نے اردو ادب کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی۔ اردو ادب کئی ایک پہلوؤں میں بڑا اجلا تھا بڑا مہذب تھا بڑا اخلاق زدہ تھا' اس حد تک کہ حقیقت پسندی سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔ اردو ادب کی خود نوشتیں بڑی دھلی دھلائی' کلف زدہ اور استری کی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سچی خودنوشت پیش کروں۔ اخلاق اور تہذیب سے بے نیاز۔

دراصل یہ کتاب میں نے .ر، ادب پر طنز کی حیثیت سے لکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ کتاب چھینٹے اڑائے گی شوراشوری پیدا کرے گی اور پھر ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن یہ کتاب تو چل نکلی۔ اپنی سچائی اور اردو ادب کی وسعت قلب کی وجہ سے۔ تقدیر کے بھید کس نے پائے ہیں۔

ممتاز مفتی

جون' ۱۹۹۵ء

صرف دو سو پچاس جلدیں چھپنے کے باوجود اس کتاب کو اتنے افراد نے پڑھا ہے کہ جان کر حیرت ہوتی ہے۔ اب سعادت، فرزانہ اور چودھری بشیر احمد کی تحریک پر اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ناول ہے۔ محمود ایاز کہتے ہیں کہ "یہ تلاش ذات کا ناول ہے۔" ابن انشا کا کہنا ہے کہ "یہ ناولوں کا گرنتھ صاحب ہے۔" سعادت اور فرزانہ کا خیال ہے کہ "اس ناول میں ایسے ٹکڑے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر پھر سے جینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔" ایسے قاری بھی ہیں جو کہتے ہیں کاش یہ ناول ہوتا اور رومان کے نقطہ عروج کے بعد ختم ہو جاتا۔ ایسے قاری بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسے کہ ہے۔

خوشی اور تعجب کی بات ہے کہ اس طویل کتاب کو کئی ایک اعلیٰ افسروں نے بھی پڑھا ہے جن کی عدیم الفرصتی کا یہ عالم ہے کہ بیگم کے پاس بیٹھ کر پڑوسیوں کی بدخویاں کرنے کی عشرت سے بھی محروم ہیں اور ان کی رائے اس کتاب کے متعلق خاصی شگفتہ ہے۔

اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا ——— یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے ——— شاید ہم سب پنچھی ہوں اور کنارے لگنے کے بعد پر جھاڑ کر جوں کے توں خشک ہو جاتے ہوں۔

بہرحال اردو ادب میں کوئی کہانی ایسی نہ ملے گی، جس کی تفصیلات براہِ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چناؤ کئے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں ——— اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

ایلی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک خط ہے جو اس نے سادی اور عالی کے نام لکھا ہے۔ بری الذمہ ہونے کے لئے نہیں بلکہ اعتراف جرم کے لئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے دوسرے حصے "ایلی اور الکھ نگری" کی تکمیل کے بعد یہ کتاب ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے دھواں دار اندھیرے، آنے والی کرن کو، مزید چمک بخشیں گے۔ اور دونوں حصے مل کر تلاش ذات کا ناول بن جائے گا ———

لیکن بارہ سال الکھ نگری کی دہلیز پر بیٹھنے کے بعد مجھے شک پڑنے لگا ہے کہ شاید الکھ نگری ایک دہلیز کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے پار کر کے آپ مڑ کر اپنے ہی دل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک عظیم تر کائنات سر بسجود ہے۔

راولپنڈی۔ جنوری ۱۹۶۹ء

ممتاز مفتی

(پہلا ایڈیشن)

۱۹۳۶ء میں میں نے اپنا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" پیش کیا تھا، آج میں اپنی پہلی مسلسل کتاب "علی پور کا ایلی" پیش کر رہا ہوں ——— یہ روئیداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں، لیکن محبت نہ کر سکا، جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں، لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ پیدا نہ کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں کھویا رہا، حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے۔ ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا مقصد صرف ایلی کی داستان حیات پیش کرنا ہے۔ کسی متعلقہ یا ضمنی کردار کی دل آزاری، تضحیک یا تذلیل نہیں۔ اگر اس کتاب کے کسی حصے سے ایسا پہلو نکلتا ہے ——— تو وہ

میری تحریر کے خام ہونے اور وسعت نگاہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔

شاید آپ علی پور کے ایلی کی روئیداد پسند کریں ــــ تو شاید میں بھی کبھی دوسری کتاب میں اس "نہ جانے کہاں سے چمکنے والی کرن" اور "نہ جانے کدھر کو لے جانے والے راستے" کا تذکرہ کروں، جس کے اشارے پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے اور جس پر گامزن ہونے کے لئے ایلی پر تول رہا ہے۔

ممتاز مفتی

راولپنڈی ۲۵ جون ۶۱ء

بانو قدسیہ

اگر آپ کو غزل الغزلات پڑھنے کا شوق ہے اور آپ عورتوں سے باتیں کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں تو "علی پور کا ایلی" ضرور پڑھئے۔

اگر آپ جانتے ہیں کہ مرد بطخ کی مانند ہے، ہمیشہ اوپر سے پانیوں میں تیرتا ہے اور مچھلی کی طرح نچلے پانیوں میں نہیں جا سکتا تو بھی "علی پور کا ایلی" آپ کے لئے مسرت کا باعث ہو گی۔

اگر آپ میں تجسس کا مادہ ہے اور آپ بچپن میں بھول بھلیاں اور پہیلیاں بوجھتے رہے ہیں تو آپ کے لئے "علی پور کا ایلی" وہ سنہری پوستین ہے جو ہزار منزلوں کے بعد شہزادے کو ملی تھی۔

اگر آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مکمل طور پر مردم بیزار نہیں ہوئے تو "علی پور کا ایلی" ضرور پڑھئے، اس میں اک جہان آباد ہے ــــ لیکن ــــ اگر آپ بچپن میں پوری کہانی کو چار سطروں میں بیان کرنے کا فن سیکھ چکے ہیں، جوانی میں آپ نے صرف وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کے آخر میں سمری درج ہوتی ہے اور اگر طبعاً آپ کم گو، درست بات کرنے والے اور انگلیوں پر گن گن کر گفتگو کرنے کے عادی رہے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لئے بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہو گا کہ آپ اس کی سمری کسی ایسے دوست سے سن لیں جس نے اسے غور سے پڑھا ہو اور اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا ہو۔

اشفاق احمد

جب "علی پور کا ایلی" شائع ہوا تو میں اسے اردو زبان کا ایک عظیم ناول تصور کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ناشر نے اسے آدم جی پرائز کے لئے گلڈ کے دفتر میں گزارا۔ججوں نے اسے "پڑھا" اور اس پر "غور" کیا۔ پھر فیصلہ دیا کہ "علی پور کا ایلی" اس قابل نہیں کہ اسے آدم جی انعام سے نوازا جائے۔ چونکہ یہ ملک کے پانچ بڑوں کا فیصلہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری رائے ویسی ہی چلی آ رہی ہے کہ پچھلے دنوں اس ناول کو پھر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم مجھے بچپن سے ملا ہے' اس لئے میں ان کے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔

ویسے میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ "فسانہ آزاد" اور "علی پور کا ایلی" اردو کے دو عظیم ناول ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی آواز مجھ ہی تک محدود ہے۔ ورنہ بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

آپ اس ناول کو پڑھئے لیکن اپنی رائے قائم کرنے کے بجائے فاضل ججوں کے فیصلے کے پابند رہیے کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم فیصلہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مستقبل کے ادب کے بارے میں اقوال فیصل دیئے جانے چاہئیں۔

ضمیر جعفری

ممتاز مفتی اردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ دبستان کے خالق ہیں۔ ان کے فن اور فکر کو میں ایک ایسے جوان رعنا سے تشبیہ دوں گا جو دیکھنے میں بہت الھڑ مگر سوچنے میں نہایت بالغ ہے۔ آپ اس سے پیار بھی کر سکتے ہیں اور بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی کا ادب بوڑھا ہی نہیں ہمیشہ جوان بھی رہے گا۔ سوچتا ہوں اگر ممتاز مفتی پیدا نہ ہوتا تو زندگی کئی رعنائیوں اور دلچسپیوں سے محروم رہ جاتی۔

"علی پور کے ایلی" کو میں اس دور کا ایک اہم ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں اور زندگی کے اس قدر وسیع محاذ پر یہ کارنامہ شاید ممتاز مفتی ہی سرانجام دے سکتا تھا ——— کتاب کی "فر[illegible]

ادھر ادھر سے "چھپلی" سے جمع نہیں کی گئی' خود مصنف کے خون جگر سے صورت پذیر ہوئی ہے۔

کرنل محمد خان

جب ممتاز مفتی کی کتاب ——— "علی پور کا ایلی" ——— کو آدم جی انعام نہ مل سکا تو معاً ہمیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کام کی کتاب ہو گی' اسے پڑھنا چاہئے' اور پڑھی تو ہمارا وہی حال ہوا جو "ان" کی تقریر سن کر غالب کا ہوا تھا' یعنی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی ادب پارے کی عظمت پرکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں ——— ظاہر ہے کہ ممتاز مفتی کے منکروں کے بھی دل تو مومن ہوں گے' صرف دماغ کافر ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرائم پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشعور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے محمد خاں اور بھوپت ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا' ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے جب وہ عقیدت طاری کرے تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔ اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے ——— "علی پور کا ایلی" میں مفتی بتدریج محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شہزاد' مفتی کی محبت کے پھوڑے کی ٹیسوں اور لذت کی دو دھاری چھری تلے تڑپ رہی ہے۔

مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی تحریریں شعور اور لاشعور کے تصادم کو سلجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔ "علی پور کے ایلی" میں مفتی نے افسانوں میں لاشعور کے تجزیاتی نظام کو تصوف کی ابتدا کے پہلے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

اگر مفتی "علی پور کا ایلی" کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دو آتشہ ہو کر یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کرے گی۔

جمیل الدین عالی

آدم جی ادبی انعام کی ایک مجلس منصفین ہوتی ہے۔ میں پہلے سال سے اس کا معتمد اعزازی ہوں، میرا کام انتظامی ہے اور ضابطے کی رو سے میں کتابوں کے بارے میں حق رائے دہی نہیں رکھتا۔

جب اس کتاب (علی پور کا ایلی) پر غور ہوا، اس مجلس کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اراکین تھے پروفیسر ممتاز حسن، پروفیسر وقار عظیم اور دیگر مشاہیر جن کے نام شائع ہو چکے ہیں ـــــ انہوں نے اس کتاب (علی پور کا ایلی) کو بہترین نہ سمجھا، بلکہ جمیلہ ہاشمی کی "تلاش بہاراں" کو انعام کا مستحق قرار دیا ـــــ منصفین نے اپنی رائے دے دی جس کا احترام کیا گیا اور انتظامی پابندی بھی کی گئی۔ مجلس منصفین کی کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے صرف متفقہ یا اکثریتی رائے کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کارروائی کا حال نہیں بتا سکتا ـــــ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ فیصلہ اردو ادب کے ساتھ کم از کم ایک ناانصافی کے مترادف تھا۔

ابن انشا

"علی پور کا ایلی" ممتاز مفتی کا بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ حجم اور وزن کے اعتبار سے ہی نہیں مضمون، پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، کچھ لوگ اسے اردو ناولوں کا گرو گرنتھ صاحب بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہاتھ میں اٹھا کر مطالعہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے چوکی پر رکھ کر مور چھل ہلاتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسے نئے ادب کی طلسم ہوشربا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر ہفتخواں آتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ہیرو کے اور قاری کے ہوش گم ہوتے ہیں۔ کردار پر کردار چڑھا ہوا ہے، طلسم میں طلسم گرفتار ہے، اور افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اس کا سٹائل بھی افسانے سے زیادہ داستان کا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ زمان و مکان کی زقندیں نہیں ہیں، جن سے پائے نگاہ میں موچ آنے کا اندیشہ ہو، یہ ناول قلم سے کم کیمرے سے زیادہ ک[illegible] ہے اور اس کا فوکس ایلی پر رہتا ہے ـــــ اس ناول کے دو نمایاں پہلو ہیں، راست بازی کردار تراشی۔ راست بازی روسو کی سی نہیں کہ غلو کی وجہ سے ریا بن جائے، بلکہ سادہ غیر جذ[illegible] اور سادہارن قسم کی۔ کردار بنانے میں مفتی جلدی نہیں کرتے، سہج پکے سو میٹھا ہو۔ ایک

کی تشکیل میں پچاسوں صفحے اور دسیوں برس صرف ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ ٹن ٹن بجتا ہے۔ پتھر پر نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ ناول پڑھے بہت دن ہوئے، لیکن آج بھی علی احمد ہو یا شہزاد، سادی ہو یا انصار منصر، تسلیم ہو کہ ارجمند، ذہن میں اپنی اپنی جگہ قطب نما بنے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی سج دھج الگ، خمیر جدا، دولہا اس بارات کا ایلی سہی، لیکن آگے چل کر شہزاد اسے پچھاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ پاپن جو یوں جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ، اردو ادب کے لازوال کردار کے طور پر زندہ رہے گی۔ پھر سادی ہے جس نے اس قصے میں شوخی اور رومان کا رنگ بھرا ہے ایک تتلی جو ہاتھ نہیں آتی، ایک غزال جو وحشت کرتا ہے۔ ایلی پر تو اس ناول میں ناحق کو خود مختاری کی تہمت ہے وہ تو ان تین حبشیوں ـــــ علی احمد (باپ) شہزاد اور سادی کے درمیان کوڑے کھاتا پابجولاں چلا جا رہا ہے، چلا جا رہا ہے ـــــ بارہ سو صفحے کے اس ناول کو شروع کر کے ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے، جس نے پڑھا ایسے پڑھا کہ کام سے یا دفتر سے چار دن کی چھٹی لی، اتنے دن کی رسد اور پانی کی ایک مٹکی پاس رکھ لی۔ بنیوں اور تاجروں اور ان لوگوں کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں جن کا لمحہ لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے اور جو صرف منڈیوں کے بھاؤ اور سینما کے اشتہار پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، غالباً انہیں طبقوں کا مفاد مد نظر تھا کہ آدم جی انعام کے فاضل ججوں نے انعام نہ دے کر قوم کو اس ناول سے بچانے کی کوشش کی لیکن تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے۔

سنا ہے اب یہ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

علی پور کا ایلی

ایلی

اس کا نام الیاس تھا۔ لیکن گھر میں سبھی اسے ایلی کہا کرتے تھے۔ "ایلی ـــــ" اس کے ابا آواز دیتے۔ ابا کی آواز سن کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ "ایلی۔ حقہ بھر دو۔" وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھتا۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہچکچاتا' محسوس کرتا کہ اس بند کمرے میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔ دبی آواز میں کھانسنے کی کوشش کرتا تاکہ کمرے کے لوگ اس کی آمد سے مطلع ہو جائیں۔ لیکن اس کی آواز حلق میں سوکھ جاتی۔ پھر وہ بڑی کوشش سے چلاتا۔ "آیا جی" اور جرائت کر کے دروازہ کھولتا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی نگاہیں جھکا لیتا اور ایسا انداز اختیار کر لیتا۔ جس سے ظاہر ہو کہ حقہ کے علاوہ اسے کمرے کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کمرے میں ابا کو اکیلے دیکھ کر اس کے دل سے بوجھ اتر جاتا پھر وہ بے فکری سے حقہ کی طرف بڑھتا۔

اس کے ابا عام طور پر چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قمیض اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوئی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھر ادھر سرک کے رہنے کی بری عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی۔ "ہوں ـــــ کیا ہے۔" ابا گھور کر اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ خواہ مخواہ کمرے میں آگھسا ہو۔ "جی۔ جی۔ چلم" ایلی ان کی دھوتی کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا اور پھر چلم اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگتا۔

"ایلی ——" اس کی سوتیلی ماں صفیہ اسے آواز دیتی۔ "بازار سے سودا لا دے ایلی۔"

صفیہ کی آواز سن کر اس کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی لیکن اس کے باوجود وہ چلا جاتا۔ "آیا جی۔" ابا کا ڈیسک خالی دیکھ کر اس کا انداز دفعتاً بدل جاتا۔ "جی" اس کی آواز میں لجاجت نہ رہتی لیکن اس کے باوجود اس کی نگاہ جھکی جھکی رہتی۔ "یہ لو پیسے۔" صفیہ کے دو حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے جن میں زرد میلی انگوٹھیاں اس کا منہ چڑاتیں اور پھر انگلیوں سے نکل کر وہ گھومتے ہوئے میلے چکر ایلی کی طرف یورش کرتے وہ ڈر کر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی۔ نہ جانے کیوں اسے مہندی لگے ہاتھوں اور انگوٹھی سے سخت نفرت تھی۔ کھولتی ہوئی نفرت وہ اپنی نگاہیں ان ہاتھوں سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ لیکن سارا کمرہ مہندی والے ہاتھوں سے بھر جاتا اور وہ انگوٹھیاں تمام جگہ پر چھا جاتیں۔ مہندی کی بو چاروں طرف سے اسے گھیر لیتی۔ چاروں طرف غلاظت کے ڈھیر' گندے پنڈے کے انبار —— اور ان کے درمیان صفیہ کا سرخ و سپید باوقار چہرہ!

ایلی کو اس منظر سے بے حد نفرت تھی نہ جانے اس کے دل کی گہرائیوں میں طوفان سا کیوں آ جاتا تھا۔ خوفناک طوفان۔ ڈر کر وہ صفیہ سے پرے ہٹتا۔ لیکن صفیہ اس کے قریب تر ہو جاتی۔ "اب لو بھی" صفیہ زبردستی چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ مہندی کی بو سے رچے ہوئے پیسے ایلی کے ہاتھ کو کاٹتے .... ہتھیلی میں جلتی انگوٹھیوں سے بچنے کے لئے گھبرا کر وہ نگاہ اوپر اٹھاتا —— صفیہ کا اتنا بڑا گورا چٹا چوڑا چہرہ دیکھ کر وہ پھر نگاہیں جھکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اس کی نگاہیں صفیہ کی ململ کی قمیض پر پھسل آتیں ململ کی سفید قمیض دیکھ کر دفعتاً اسے خیال آتا کہ کہیں قریب ہی سے وہ ابھری ہوئی ہے۔ شرم سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آتے۔ "توبہ ہے۔ توبہ ہے۔" اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ "ایک سیر آلو اور دو پیسے کی پیاز۔" وہ باآواز بلند دہراتا جیسے وہ مشکل کشائی کا اسم اعظم ہو جس کا ورد کرنے سے وہ اس طوفان سے مخلصی پا سکتا ہو۔ اس غلاظت سے خود کو محفوظ کر سکتا ہو۔ پھر وہ بھاگ لیتا "ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔ ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔" آلو ابھرتے۔ پیاز کے چھلکے کھل جاتے اور ململ کی شکل اختیار کر لیتے۔

"ایلی" اس کی اپنی ماں ہاجرہ اسے آواز دیتی "ڈونگے میں پانی لا دے!"۔ وہ باورچی خانے میں داخل ہوتا۔ ہاجرہ برتن مانجھنے آٹا گوندھنے یا آلو چھیلنے میں مصروف ہوتی۔

"اماں۔" وہ ماں کے قریب تر ہو جاتا۔ "تم ہر وقت ان کا کام کیوں کرتی ہو؟"

"گھر کا کام جو ہوا۔ گھر کا کام کرنا ہی پڑتا ہے نا۔"

"گھر تو ان کا ہے اماں۔ پھر تم کیوں کام کرتی ہو؟"

"نہ بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"اماں مجھے بھوک لگی ہے"۔

"کام ختم کر کے اپنا چولہا جلاؤں گی نا۔"

"اتنی رلت تو ہو چکی۔"

"بس ابھی ختم ہو جائے گا کام۔"

"اماں۔ ہمارا چولہا الگ کیوں ہے؟"

"اپنا چولہا الگ ہی ہونا چاہئے بیٹا۔"

"تو پھر تم دوسروں کا چولہا کیوں جلاتی ہو؟"

"فضول باتیں نہ کر" ماں چڑ جاتی۔ "جا آرام سے بیٹھ فرحت کے پاس ابھی آتی ہوں میں۔"

ایلی کو فرحت سے چڑ تھی۔ وہ مگن بیٹھ رہتی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ اس گھر کے ماحول سے قطعی بے پروا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے لئے کوئی بات انوکھی نہ تھی۔ وہ دو چولہے دو گھروں کا کام کرنے والی ماں۔ وہ خونیں ہاتھوں والی صفیہ۔ اس کی ابھری ہوئی قمیض۔ سرکی ہوئی ابا کی دھوتی اور ان کا وہ بند کمرا فرحت اس گھر میں یوں گھومتی پھرتی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے وہ گھر اور اس کے افراد اس کی اپنی دنیا سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔ ابا کے بند کمرے سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتیں تو وہ چپ چاپ یوں اپنے کام میں مصروف رہتی جیسے بہری ہو۔ گھر میں فرحت کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ نہ ابا اسے کبھی بلاتے اور نہ صفیہ پوچھتی۔ البتہ اماں جب بھی فارغ ہوتی تو فرحت کے شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھ رہتی۔ دونوں باتیں بھی نہیں کیا کرتی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھ رہتیں یوں جیسے بن بولے باتیں کر رہی ہوں۔ اس پر ایلی کو اور بھی غصہ آتا۔ اس قدر قریب کیوں بیٹھتی ہیں۔ بات کئے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ یوں چپکی رہتی ہیں۔ جیسے گوند سے جوڑ رکھا ہو۔

اماں کے قرب کی وجہ سے وہ فرحت سے جلتا تھا اور اپنے آپ کو فرحت سے بہتر سمجھتا تھا۔ فرحت کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی نہ تو ابا نے اسے کبھی بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایلی کو تو وہ اکثر بلاتے تھے۔ وہ جب کھانا کھانے لگتے تو "ایلی" کو آواز دیتے ایلی اور جب ایلی جاتا تو دو انگلیوں سے بوٹی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیتے "ایلی بوٹی——" اور ایلی اسے ہاتھ میں اٹھائے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کوئی تمغہ ہو۔ وہ فخریہ انداز سے فرحت کی طرف دیکھتا۔ لیکن فرحت یوں ناک چڑھا کر منہ پھیر لیتی جیسے ایلی کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی نہیں بلکہ مرا ہوا چوہا ہو۔ ہونہہ ایلی غصے سے پھنکارتا "بڑی آئی ہے۔ جیسے بوٹیاں کھا کھا کر اکتا چکی ہو۔"

پھر جب صفیہ پھلوں کی ٹوکری نکال کر انہیں چھانٹتی اور گلے سڑے پھل الگ کرتی تو ابا ایلی کو آواز دیتے اور جب وہ ان میں سے کم گلا سڑا کیلا یا سیب ایلی کی طرف بڑھاتے تو صفیہ بول اٹھتی۔

"لو یہ تو ابھی اچھا بھلا ہے۔" یہ کہہ کر وہ عجیب سی مسکراہٹ، مسکراتی اس مسکراہٹ سے سارا کمرا بھر جاتا اور ایلی خود محسوس کرتا جیسے واقعی وہ پھل ابھی اچھا بھلا ہو اور اس قابل نہ ہو کہ کسی کو دیا جائے۔ علی احمد حیرت سے صفیہ کی طرف دیکھتے اور پھر کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسرے گلے سڑے پھلوں سے چناؤ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

اگر کبھی ابا کوئی پھل فرحت کو دیتے تو وہ اسے یوں ایک طرف رکھ دیتی، جیسے وہ کھانے کی چیز ہی نہ ہو۔

بڑا بنتی تھی فرحت اور اماں اس کی ان حرکتوں پر خفا ہونے کی بجائے فخر اور مسرت سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اماں کی اس مسکراہٹ پر ایلی محسوس کرتا جیسے فرحت اور اماں نے چوری چوری آپس میں سمجھوتا کر رکھا ہو۔ اسے غصہ آتا کہ اماں اس سے سمجھوتہ کیوں نہ کرتی تھی۔ اول تو ایلی اپنے حصے کا پھل رکھ دینے کا قائل ہی نہ تھا اور کبھی رکھ دیتا تو اماں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

"اے اب کھا بھی لے ایسے پڑا رہے گا خراب ہو جائے گا۔" اماں یہ بات فرحت سے کیوں نہیں کہتی وہ سوچتا۔ وہ ہم سے ایک سا برتاؤ کیوں نہیں کرتی۔

فرحت کی بات چھوڑیئے خود صفیہ سے اماں کا برتاؤ عجیب سا تھا۔ صفیہ گردن اٹھا، چھاتی

ابھار ہاجرہ کے سر پر آ کھڑی ہوتی۔ "ہاجرہ یہ کرو وہ کرو اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں اور وہ کام جو میں نے کل تمہیں دیا تھا وہ"۔ صفیہ کی باتیں سنتے ہوئے اماں کی عجیب حالت ہوتی۔ اس کی نگاہیں صفیہ کے چہرے پر لگی ہوتیں۔ جسم میں گویا جان نہ ہوتی۔ نس نس حاضر ہوتی۔ ایلی کو تو شک پڑتا تھا کہ اماں اس پر قربان ہوئی جا رہی ہے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

آصفی محلے والیاں سب یک زبان ہو کر کہا کرتی تھیں۔ ہے ہاجرہ بیچاری تو مظلوم ہے۔ جسے سوکن کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہن سچ پوچھو تو ہمارے لئے تو گھر والی وہی ہے اور یہ کالے منہ والیاں جو گھر میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔

محلے والیاں بکتی تھیں صفیہ کا منہ کالا کہاں تھا۔ الٹا وہ تو سرخ اور سفید تھا نہ صفیہ سوکن تھی۔ نہ اماں مظلوم۔ پھر وہ کیا تھیں اس الجھن کو بھولنے کے لئے ایلی نیچے محلے کے احاطے میں اتر جاتا۔ اس کا اپنا گھر ایک معمہ تھا۔ وہ مہندی والے ہاتھوں ململ کے ابھاروں والی صفیہ۔ سوکن کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے والی ہاجرہ۔ سنتی بہری بولتی گونگی فرحت اور بند کمرے میں بیٹھنے کے شوقین علی احمد۔

آصفی محلے کے چوگان میں پہنچ کر وہ اپنے گھر کو بھول جاتا حتیٰ کہ چوگان میں کھیلتے ہوئے اسے ابا کی آواز سنائی دیتی ایلی—— ایلی—— ابا کا حقہ بھرنے کے بعد وہ ان کاموں سے بچنے کے لئے احاطہ چھوڑ کر علی پور کے بازاروں یا کھیتوں میں چلا جاتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو کسی درخت کے تلے بیٹھ کر سوچنے لگتا۔ ان کا گھر ایسا کیوں ہے۔ ابا ایسے کیوں ہیں۔ صفیہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔

علی پور

علی پور چھوٹا اور بے حد پرانا قصبہ تھا۔ اس کی وضع قطع وہاں رہنے والوں کی نفسیات کی آئینہ دار تھی۔ قصبہ کے اردگرد چاروں طرف نانک چندی اینٹوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جو اب جگہ جگہ سے گری جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ چکے تھے۔ فصیل میں آٹھ دروازے اور دو موریاں تھیں۔ اس چار دیواری کے باہر گول سڑک بنی ہوئی تھی جو قصبہ کے گرد گھومتی تھی۔ جس کے پرے سرسبز کھیتوں میں یہاں وہاں قدیم باغات

کے شکستہ مگر واضح آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچی پگڈنڈیاں قرب و جوار کے گاؤں کی طرف نکل گئی تھیں۔ جہاں سے علی پور کا شہریوں دکھائی دیتا تھا' جیسے قدیم عمارتوں کا ایک ڈھیر ہو۔

شہر کے اندر نانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں گلیاں اور عمارتیں تھیں۔ بازاروں میں تنگ سڑکوں کے اردگرد دکانوں میں تھیلیاں لٹکتی تھیں۔ مٹی کی ہنڈیاں نیچے اوپر رکھی تھیں۔ حکیم کی دوکان میں سیاہ رنگ کی بوتلوں پر زنگ آلود ٹین کے ڈھکنے چڑھے تھے۔ جن پر مکھیاں بھنبھناتیں۔ بازاروں سے تنگ گلیاں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹی اینٹوں کی دیواریں ایستادہ تھیں۔ ان بوسیدہ رینگتی دیواروں میں کہیں کہیں اکا دکا کھڑکی کھلتی۔ تنگ و تاریک کھڑکی۔ ان اونچے ترچھے نانک چندی مکانات کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ دیواروں پر بدرنگ نانک چندی اینٹوں کو دیکھ کر سر میں درد ہونے لگتا۔ طبیعت پر ان جانی اداسی چھا جاتی۔ یہاں وہاں اندھیری ڈیوڑھیوں سے ویرانی جھانکتی۔ منڈیروں اور چھتوں پر سائے سے حرکت کرتے۔ جیسے بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ گلیاں گھومتے گھومتے دفعتاً آگے سے بند ہو جاتیں یا گلی کے اختتام پر محلے کا احاطہ شروع ہو جاتا۔ جہاں بچے فرش پر رینگتے۔ عورتیں چرخہ کاتتے یا ازار بند بننے میں مصروف نظر آتیں یا کھڑکیوں سے سر نکال کر ایک دوسری سے لڑتیں ہاتھ چلا کر کوسنے دیتیں۔

قدیم شہروں کی طرح علی پور بھی ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ٹیلے کی چوٹی تھی۔ جس پر اک مسمار شدہ قلعے کے آثار تھے جو شاید کسی زمانے میں شہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا اس اونچے مقام کو ٹبہ کہتے تھے۔ ٹبے کے پاس ہی قصبے کی عالی شان جامع مسجد تھی۔ جس کے قریب بڑا بازار تھا۔ جس میں کپڑے اور منیاری کی دکانیں تھیں۔ بڑے بازار کے چاروں طرف گہری تاریک گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان سے پرے شہر کی فصیل اور دروازے اور اس سے پرے گول سرسبز کھیت اور پرانے باغات کے مسمار شدہ آثار۔

علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے دنیاوی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے۔ کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کونسا بے نظیر نسخہ ہے جو تنکوں کے حساب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ راز فاش کرتا کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی

بیوی کی آنکھیں اتنی متکلم کیوں ہیں۔

نتھو تمباکو فروش کی دوکان پر چوپٹ کا کھیل چلتا۔ بولے حکیم کی دوکان پر شریعت سے متعلقہ مسائل پر گرماگرم بحث ہوتی۔ معراج لنگڑے کی دوکان پر ترپ کی بازی کھیلی جاتی اور چاند حلوائی کے تخت پوش پر آنے والے سیاسی دور کا تذکرہ رہتا۔

ہر دوکان پر ایک نہ ایک خصوصی قسم کا مجمع لگا رہتا۔ یہ لوگ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے۔ کہاں سے آیا ہے کہاں جا رہا ہے کیوں آیا ہے کس لئے جا رہا ہے اور اس کے گذر جانے کے بعد دیر تک ان تفاصیل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے۔ اجنبی کی آمد پر پہلے تو ان کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں اور اس کا احاطہ کر لیتیں پھر اس کا تعاقب کرتیں۔ ایک گروپ کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کے بعد وہ دوسرے گروہ کی نگاہوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے خدوخال' لباس' انداز' چال' گفتگو اور سرسری حرکات کا مفصل جائزہ لیا جاتا پھر ان جملہ تفصیلات پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر تنقید و تبصرہ کے بعد اس کی شخصیت اور طور اطوار پر آخری فیصلہ سنا دیا جاتا جس کے خلاف اپیل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی اور جس کو بدلنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

آصفی محلہ

علی پور کے جنوب مغرب میں ہاتھی دروازے کے قریب بڑی ڈیوڑھی کے عقب میں آصفی محلہ تھا جس میں ایلی کے عزیز و اقربا رہتے تھے۔ بڑی ڈیوڑھی کے پٹ زنگ آلود ہو چکے تھے اور چولیں بے کار۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر دھندلے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اندر ڈیوڑھی کے پہلو میں آصفیہ مسجد تھی جس کے قریب شاہ ولی کا مزار تھا۔ مزار سے آگے آصفی محلہ تھا۔ چاروں طرف چہار منزلہ مکانات ایستادہ تھے جن کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس میں کمیٹی کی ایک خمیدہ لال ٹین لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف رنگ محل تھا جس کی چونے گچی دیواروں پر رنگ کے نقش و نگار کی بجائے میل جما ہوا تھا۔ دوسری طرف شیش محل تھا جس میں نہ تو کوئی شیشہ لگا ہوا تھا اور نہ بلور دونوں کی وضع قطعی طور پر محل کی سی نہ تھی۔ اس کے باوجود محلے والے انہیں رنگ محل اور شیش محل کہتے تھے۔ شیش محل کے نیچے ایک فراخ تہ خانہ تھا' جس میں ایک مسجد اور ایک کنواں تھا۔

اس تہہ خانے کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تہہ خانہ بندے کے حملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جب سکھ لٹیرے شہر پر ہلا بولتے تو آصفی محلّہ کے مرد عورتیں اور بچے تہہ خانے میں پناہ لیتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے' اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پی پی کر اللہ کا شکر بجالاتے۔

محلے میں کئی ایک ڈیوڑھیاں اور کمرے ایسے تھے جن میں سورج کی روشنی کبھی داخل نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی محلے والے ہاتھوں سے ٹٹول کر یا دیاسلائی جلا کر ان ڈیوڑھیوں اور کمروں سے گزرا کرتے تھے۔ ان پرانے محلات میں چونے گچے کمرے تھے۔ جن کی کھڑکیاں اک زمانے سے بند پڑی تھیں چھجے خمیدہ ہو چکے تھے۔ کمروں میں جالے تنے ہوئے تھے۔ چھتوں میں چمگادڑیں رہتی تھیں اور خمیدہ دیواروں میں شگاف پڑ چکے تھے۔ ان مکانات میں نت نئے انکشافات ہوتے رہتے تھے۔ کسی اندھیرے کمرے میں کسی بوسیدہ صندوق سے کوئی قلمی مسودہ برآمد ہو جاتا۔ کسی چونے گچی دیوار پر کسی پرانے کتبے کا از سرنو انکشاف ہوتا یا کسی طاق کے اندر ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے ہر آصفی کے دل میں ایک پرائیویٹ خیال جاگزین رہتا کہ محلے کے کسی نہ کسی کونے میں کہیں نہ کہیں دبا ہوا خزانہ موجود ہے۔ لیکن ہر آصفی نے اس امید افزا خیال کو دل میں چھپا رکھا تھا۔ وہاں کسی دبے ہوئے خزانے کا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ شہنشاہوں کے زمانے میں جب آصفی برسراقتدار تھے تو ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے گدھوں پر لد کر آتی تھی۔

پرانے زمانے میں آصفیوں کی عظمت مسلم تھی لیکن اب وہ باتیں محض قصے تھے۔ خوش کن تھے۔ اب آصفی اور ان کے رنگ محل اور شیش محل کے اردگرد بسنے والے خدمتگار اور کمین سب خلط ملط ہو چکے تھے۔ سارے محلے میں صرف چند افراد ایسے تھے جو مکتب سے تحصیل یافتہ تھے۔ اس لئے زیادہ تر آصفیوں کا شغل دوکانداری' مزدوری اور بے کاری پر مشتمل تھا۔ یہ آصفیوں کے انحطاط کا زمانہ تھا' اس لئے وہ اپنی عظمت کا احساس پدرم سلطان بود سے اخذ کرتے تھے۔ گذشتہ جاہ و حشمت کی کہانیاں ان کے نزدیک حال کی فارغ البالی سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی تھیں' جنہیں سنانے میں آصفی محلے کی بوڑھیاں بخل سے کام نہ لیتی تھیں۔

علی احمد

ایلی کے والد علی احمد کا گھر محلے بھر میں بڑے گھرانوں میں گنا جاتا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ محلے بھر میں احمد واحد شخص تھے' جنہوں نے چودہ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ وہ بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے تھے' لیکن اس زمانے میں بی اے فیل ہونا بڑی بات تھی۔ بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد علی احمد کو ایک معقول اسامی مل گئی تھی اور اس آسامی کی وجہ سے محلے بھر میں ان کی عزت تھی۔

اپنے والد کی طرح علی احمد کی طبیعت میں بھی عاشقانہ چمک کا عنصر تھا۔ لیکن ان کی طبعی رنگین مزاجی اور جرائت رندانہ عاشقانہ عنصر پر حاوی رہتی' جو انہیں آہیں بھرنے اور فراق میں تڑپنے کی بجائے جینے کی طرف مائل رکھتی۔ دراصل علی احمد کو افراد کی بجائے زندگی سے عشق تھا۔

علی احمد کا قد درمیانہ تھا بدن چھریرا' رنگ سانولا ان کی پیشانی فراخ تھی۔ خدوخال میں کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی مگر اس کے باوجود نہ جانے اس فراخ پیشانی میں ان سادہ سیاہ آنکھوں میں یا جانے کہاں وہ بے نام اثر تھا' جسے محسوس کر کے راہ چلتی عورت اپنے راستے سے بھٹک جاتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ ٹھٹکنے لگتے۔ پلو سر سے سرک کر شانوں پر جا گرتا۔ پھر برقعہ کے پٹ کھلتے اور درز سے ایک بڑی سی چمکیلی آنکھ طلوع ہو جاتی۔

علی احمد کی چال میں ایک خصوصی جاذبیت تھی ان کے شانے کبھی خم سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ ان کی چھاتی تنی رہتی نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتیں۔ وہ دیکھ کر راہ چلنے کے عادی نہ تھے بلکہ انہیں راہ چلتے ہوئے دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ علی احمد کے انداز میں ایک وقار تھا۔ ان کی طبیعت میں ملنساری کے علاوہ ایک رنگینی تھی۔ گفتار میں شوخی اور شرارت تھی اور ان کی نگاہوں میں نصرت اور کامیابی کا پیغام جھلکتا تھا۔

بیویوں کے متعلق علی احمد کے خیالات نہ تو محدود تھے اور نہ رسمی۔ انہیں بیویوں سے یہ گلہ تھا کہ انہیں جلدی ہی عام ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ چاہے کتنے چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لاؤ۔ کتنے ہی رکھ رکھاؤ سے رکھو لیکن جلد ہی وہ باورچی خانے میں بیٹھی آلو چھیل رہی ہو گی یا راکھ بھرے چولہے میں پھونکیں مار رہی ہو گی۔ اس طرح چند ہی روز میں وہ

بیوی سے باورچن بن کر رہ جائے گی۔ بیوی کی اس بری عادت کے خلاف انہیں بہت شکایت تھی۔

والدین نے چھوٹی عمر ہی میں علی احمد کو ہاجرہ سے بیاہ دیا تھا وہ ابھی جوان ہی تھے کہ ان کے گھر دو بچے بھی ہو گئے۔ بڑی لڑکی فرحت اور چھوٹا ایلی۔ ایلی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد علی احمد کے سر سے ان کے دادا اولاد علی کا سایہ اٹھ گیا۔ اس وقت علی احمد نوجوان تھے برسراقتدار تھے اور اپنی پیشانی اور رنگین نگاہوں کے بے نام سحر سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے گردوپیش ایک حسین و دلکش دنیا پھیلی ہوئی تھی اور دل میں تسخیر کا بے پناہ جذبہ موجیں مار رہا تھا۔

علی احمد کو ہاجرہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی' اس کی کئی ایک وجوہات تھیں اول تو ہاجرہ کے نام میں اتنی تقدیس تھی۔ ایسے مقدس نام کی لڑکی سے کوئی شوخ یا رنگین قسم کی حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے اعمال کے لحاظ سے بھی وہ ہاجرہ ہی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کا نام ہی علی احمد کے رنگین مزاج پر بار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ چنداں قابل قبول نہ تھی قد چھوٹا بناوٹ میں نزاکت کا عنصر قطعی طور پر مفقود۔

ہاجرہ ان بیویوں میں سے تھی جو خاوند کی آمد پر تسلیم ورضا کی شدت سے بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس علی احمد کو عمل تسخیر سے عشق تھا اور تسخیر جبھی ممکن ہے جب سرکشی کا عنصر غالب دکھائی دے - چاہے وہ فریب نظر ہی کیوں نہ ہو جو تسخیر کے جذبے کو ابھارے تسخیر کرنے والے کو مائل بہ عمل کرے اور پھر مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ایستادہ چال' ابھری ہوئی چھاتی' فراخ پیشانی اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر تخیلیئے میں ڈان کو ہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلاوے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ بچہ ٹین کا سپاہی۔ جنگجو سورما۔

جنسی پہلو کے علاوہ علی احمد میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کی گفتگو میں طنز اور مزاح کی شیرینی تھی۔ لطائف اور روایات کے علاوہ انہیں شجرہ نسب اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں بے حد مہارت تھی۔ محفل میں وہ اپنے تاریخی علم کا

اظہار کچھ اس انداز سے کرتے کہ ذرا کوفت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ لکھنے سے تو انہیں عشق تھا عشق۔ اپنا بیشتر وقت وہ لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ شاید یہ آصفیوں کی بدقسمتی تھی یا شاید خوش قسمتی ہو کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کی یہ قابلیت گھر کا حساب اور پیدائش و موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کام بھی ایک بہت بڑی مصروفیت تھا۔ علی احمد کے ڈیسک پر بڑے بڑے ضخیم رجسٹر پڑے رہتے تھے۔ جن کے ساتھ المونیم کی تھالی میں ایک دوات اور دو موٹی نبوں کے قلم رکھے رہتے۔ اپنی مخصوص میلی اور پھٹی ہوئی دھوتی پہن کر قمیض اتار کر کمبل یا چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ فرصت کے اوقات میں ان بھاری بھرکم رجسٹروں میں مختلف نوعیت کے اندراج کرنے میں شدت سے مصروف رہا کرتے تھے۔

علی احمد کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔ وہ پیسوں کو احتیاط سے رکھتے تھے اور ہر قسم کے خرچ کو فضول خرچ کے مترادف سمجھتے تھے حتیٰ کہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں۔ روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی مادی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوانی ہی میں علی احمد عظیم الشان کامیابیوں سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ ابتدائی دور میں جاناں کے التفات نے ان میں خود اعتمادی کی بنا ڈالی تھی۔ پھر صفیہ کی ڈرامائی شکست نے تو انہیں ہیرو بنا دیا تھا۔

صفیہ

صفیہ شام کوٹ کی ایک مٹیار تھی۔ اس کے سرخ وسپید چہرے پر عجب وقار تھا۔ اس کا لانبا قد کشادہ پیشانی اور ایستادہ چال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نے شام کوٹ میں ایک قلوپطرہ پیدا کر دی ہو۔ صفیہ کو دیکھ کر علاقہ کا پولیس انسپکٹر شہاب الدین اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔ لیکن پولیس کا افسر اعلیٰ ہونے کے باوجود وہ شام کوٹ کی اس مٹیار حسینہ کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہاب الدین کے دل میں صفیہ کی آرزو نے

عشق کا رنگ اختیار کر لیا اور عالم مجبوری میں وہ صفیہ کو اغوا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ شہاب الدین کے ذرائع وسیع تھے اس لئے وہ صفیہ کو لے کر امرتسر پہنچ گیا اور اسے اپنے موروثی مکان کے دیوان خانے میں بٹھا کر خود والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اندر گیا تاکہ صفیہ کے لئے اپنے مکان میں دائمی جگہ پیدا کر سکے۔

علی احمد اسی وقت اتفاق سے اپنے دوست شہاب الدین سے ملنے اس کے مکان پر جا پہنچے۔ صفیہ کو دیکھ کر وہ بھوچکے رہ گئے۔ صفیہ کی بے پروا اور بھرپور جوانی نے ان کی قوت تسخیر کو للکارا۔ نہ جانے اس مختصر سے وقفہ میں شہاب الدین کے دیوان خانے میں ٹین کے سپاہی نے اس سرخ و سپید مٹیار کو کیا جوہر دکھائے کہ شہاب الدین کی آمد سے پہلے ہی صفیہ علی احمد کی ہو کر رہ گئی اور ایک بچے کی طرح علی احمد کی انگلی پکڑے دیوان خانے سے باہر نکل آئی۔

آصفی محلے میں صفیہ کو چھپائے رکھنا مشکل کام نہ تھا اس لئے پولیس کی صفیہ کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوششیں اکارت گئیں اور صفیہ چپکے سے علی احمد کی بیوی بن گئی۔

صفیہ کے آنے پر محلے میں کافی ہلچل پیدا ہوئی مگر بیچارے محلے والے معمولی احتجاج کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ ہاجرہ اس نئی آمد پر سٹپٹائی۔ روئی پیٹی لیکن ہاجرہ کی سنتا ہی کون تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوب جانتی تھی کہ علی احمد کے گھر میں اس کی حیثیت نوکرانی سے زیادہ نہیں۔ چاہے صفیہ آتی یا نہ آتی۔ اس لئے جلد ہی وہ خاموش ہو گئی۔ علی احمد کی والدہ جانتی تھی کہ بیٹا اپنے باپ کی طرح جذباتی واقع ہوا ہے۔ خاوند کے جذبہ محبت کی وجہ سے اس نے عمر بھر رنڈاپے میں بسر کی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بیٹا بھی اسی جذبہ کے تحت اسے داغ مفارقت نہ دے جائے' اس لئے وہ بھی چپ چپ ہو رہی کہ چلو بیٹے کے صدمے کی نسبت دوسری بہو کا گھر میں آنا برا نہیں۔ محلے والے بھی خاموش ہو رہے کیونکہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو آسان ہے مگر اسے قائم رکھنا محنت طلب بات ہے۔ انہیں صرف یہ گلہ تھا کہ صفیہ شام کوٹ کی ترکھانی تھی۔ ایک ترکھانی کا آصفیوں میں آ شامل ہونا تکلیف دہ امر تھا مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ شریعت اس بات کی اجازت دیتی تھی اور کھلے بندوں شریعت کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہ تھا۔

صفیہ کے آنے پر ہاجرہ کی حیثیت محض ایک نوکرانی کی رہ گئی۔ اس وقت ہاجرہ کی گود

میں ایلی تھا وہ ایک نحیف و نزار بچہ تھا۔ اکثر بیمار رہتا۔ ہاجرہ کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اس کے پاس فرحت اور ایلی تھے جن کے سہارے وہ زندگی بسر کر سکتی۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ ایلی کے علاج معالجے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ایلی زندہ رہے۔ ایلی صحت مند ہو جائے' چاہے گھر میں بیسیوں صفیائیں آ جائیں۔ پڑی ایں۔ اپنے نصیب میں بھن۔ مقدر کے خلاف کیا شکوہ۔ ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور دوپٹے سے عطر کی خوشبو آنے کی بجائے ہسپتال کی آیوڈین اور پنساری کے کسٹر آئل کی بو آنے لگی۔ اس کے خیالات میں اپنے گھر کی بجائے ایلی کا گھر بس گیا۔ جب ایلی جوان ہو گا۔ جب ایلی کی بیوی آئے گی۔ جب اجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو گا۔ جب لٹا ہوا سہاگ لوٹ آئے گا۔ ہاجرہ نے بستر پر پڑے ہوئے بیمار ایلی کی طرف دیکھا اور فرط محبت سے اس کے قریب تر ہو گئی۔ ننھی فرحت حیران کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاجرہ فرحت اور ایلی یہ ان کی دنیا تھی۔ ہاجرہ ایلی کی طرف دیکھتی رہی فرحت ہاجرہ کا سہارا ڈھونڈتی رہی اور ایلی بے بس نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا کیا اور ساتھ والے کمرے میں روغنی گجری اور ٹین کا سپاہی محبت کا میدان جنگ گرمانے میں مصروف رہے اور علی احمد کی بوڑھی ماں جائے نماز پر یوں بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو' کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

انوکھا انتقام

ایلی جئے گیا بچپن کی لمبی بیماری کے چنگل میں پڑا وہ آخری سانس لیتا رہا۔ مگر لیتا رہا' اس کی لاغری اور ناتوانی کی وجہ سے بیماری اسے ہلاک نہ کر سکی اور بالآخر چھوڑ گئی۔ وہ رو بصحت ہونے لگا۔

ہاجرہ نے اسے رو بہ صحت ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ ایلی زندہ رہے گا۔ ایلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر ہاجرہ کی توجہ اپنے لٹے ہوئے سہاگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ خاوند کے لئے جو دبی چھپی محبت اس کے دل میں تھی وہ پھر سے ابھر آئی لیکن اظہار کو کون روک سکتا ہے۔ اصلی روپ میں نہ سہی' کسی بہروپ میں سہی۔ ہاجرہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی پیار کی آگ نے نفرت کا روپ دھار لیا تاکہ اظہار تو ہو سکے۔ لیکن نفرت جتانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا وہ تو خود علی احمد کی محتاج تھی۔ اس کی نفرت

یا محبت کو کون خاطر میں لاتا تھا۔ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی اور اظہار تو جبھی اظہار ہوتا ہے جب دوسرے اسے محسوس کریں۔ ہاجرہ نے اسی اظہار محبت یا نفرت کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ایسا انوکھا طریقہ جو صرف عورت ہی کو سوجھ سکتا ہے جسے عمل میں لانے کی جرأت صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی سوکن صفیہ سے عشق لگا لیا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اسے رقابت کی آگ میں جلا سکتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کے گھر کی نوکرانی ہاجرہ اب علی احمد کی نوکرانی نہیں تھی بلکہ اس کی حریف تھی۔ وہ صفیہ کی نوکرانی بھی نہ تھی۔ عشاق نوکر نہیں ہوتے۔ اگر صفیہ کے دل میں ہم جنسی کا ذرا سا بھی پہلو ہوتا تو ہاجرہ کی کامیابی یقینی ہو جاتی اور علی احمد ہاجرہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ صفیہ اپنے فطری مردانہ جاہ و جلال کے باوجود اپنی سرشت میں ہم جنسی کا پہلو نہ رکھتی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کے اس انوکھے تسلیم و رضا کے جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اچھا تو میں آزما دیکھوں۔ اس نے سوچا اور وہ ہاجرہ کو آزمانے کے دلچسپ مشغلے میں کھو گئی۔

ہاجرہ قدم آگے اٹھا چکی تھی اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی۔ صفیہ کیا کہے گی کہ وہ اظہار محبت محض ایک دکھلاوا تھا۔ اس خیال سے ہاجرہ کے احساس خودداری پر ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ اندھا دھند اس راہ پر آگے بڑھنے لگی۔ ایک قدم اور شاید اب صفیہ کو یقین آ جائے ایک قدم اور شاید اب صفیہ قائل ہو جائے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ صفیہ کی جانب قدم اٹھاتی گئی اور فرحت اور ایلی پیچھے رہتے گئے۔ پیچھے رہتے گئے۔ "صفیہ صفیہ۔" ہاجرہ کی آواز میں وہ للکار تھی جو صرف احساس شکست ہی پیدا کر سکتا ہے۔ "صفیہ۔ آزما دیکھو۔ صفیہ۔" دور ایلی پڑا چارپائی پر رو رہا تھا۔ فرحت گڑیا کھیلتے کھیلتے اکتا گئی تھی۔ گھر کے اس چھوٹے سے ویران کمرے میں جو ہاجرہ کے لئے مخصوص تھا۔ فرحت اور ایلی تنہا رہ گئے۔

نرالا امتحان

باورچی خانے میں ہاجرہ صبح و شام صفیہ کی خوشنودی کے لئے مصروف کار رہتی۔ صفیہ پھولدار پلنگ پوش پر بظاہر بے نیاز بیٹھی علی احمد کا انتظار کرتی اور علی احمد گھر سے باہر اپنی قوت تسخیر کے امتحان، میں، مصروف رہتے۔ ہاجرہ کے کمرے میں ایلی اور فرحت رو رو کر

بھوکے سو جاتے۔ پھولدار پلنگ پر بیٹھے بیٹھے صفیہ انتظار سے اکتا کر چلاتی۔ "ہاجرہ جب تک وہ نہ آئیں' تم باورچی خانے سے نہیں جانا سونا نہیں۔" اور ہاجرہ چوکی پر بیٹھی انتظار کرتی کہ کب علی احمد آئیں اور وہ انہیں کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر اپنا چولہا جلائے۔ ایلی اور فرحت کے لئے چاول پکائے۔

علی احمد واپس آتے تو چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتے تاکہ صفیہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اتنی دیر سے لوٹے ہیں۔ لیکن ان کی آہٹ پا کر صفیہ جاگ اٹھتی۔ وہ علی احمد سے بگڑتی۔ علی احمد اسے مناتے لیکن وہ بگڑے چلی جاتی۔ پھر کمرے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگتیں چونکہ معاملے کی نزاکت دیکھ کر ڈان کوہٹے میدان میں آ نکلتا۔ ٹین کا سپاہی اپنے داؤ دکھاتا بالآخر شام کوٹ کا وہ مضبوط مگر حسین قلعہ سر ہو جاتا اور صفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ علی احمد خوب جانتے تھے کہ ٹین کا سپاہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہاجرہ کو آواز دی جاتی۔ ہاجرہ کھانا کھلاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹین کا سپاہی تازہ دم ہو کر پھر سے میدان کارزار میں شام کوٹ کے قلعے کو للکارتا اور ہاجرہ چپکے سے اپنا چولہا جلا کر سوئے ہوئے بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتی۔

پھر صفیہ کو ایک نئی بات سوجھی ایک نیا امتحان۔ "ہاجرہ" صفیہ بولی! "دیکھو تو میری بانہوں میں سونے کے کڑے ہوں تو کیسا رہے۔" وہ آنکھ بچا کر مسکرائی۔ اسی دن ہاجرہ کی زندگی میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی روپیہ بچانا۔ صفیہ کے کڑوں کے لئے روپیہ بچانا۔ صفیہ کے لئے ریشمیں کپڑے مہیا کرنا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہاجرہ صفیہ کو اپنا نہ سکی۔ صفیہ فرحت اور ایلی کو دیکھ کر خوش نہ ہوتی تھی الٹا اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ نگاہیں خشمگیں ہو جاتیں کیونکہ اس کے اپنے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔

علی احمد کبھی کبھار حیرانی سے ان دو بچوں کی طرف دیکھتے جیسے ان کے وجود سے پہلی مرتبہ واقف ہو رہے ہوں۔ انہیں یاد آتے کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں اور پھر وہ بچے خواہ مخواہ ان کو اچھے لگتے اور وہ کھانا کھاتے ہوئے آواز دیتے۔ "ایلی۔ یہاں۔ یہاں آؤ ایلی۔ یہ لو بوٹی۔" جسے ہاتھ میں پکڑ کر ایلی وہ بے حد مسرور ہوتا اور یوں فخر سے اٹھائے پھرتا جیسے وہ تمغہ ہو۔

ہاجرہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ بچے یہ محسوس نہ کریں کہ جو چیزیں علی احمد اور صفیہ کو میسر تھیں، وہ انہیں نصیب نہیں۔ اس لئے وہ انہیں ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی چیز منگوا دیا کرتی تھی۔ اگر علی احمد کے لئے پلاؤ تیار ہوتا تو وہ انہیں نمکین چاول پکا دیا کرتی اور کہتی "لو یہ بہترین قسم کا پلاؤ ہے اور ایلی اور فرحت خوشی خوشی وہ بہترین قسم کا پلاؤ کھاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ دیکھتے کہ ان کی ماں گھر میں برتن مانجھنے اور صفیہ کا کھانا پکانے میں صبح و شام مصروف رہتی ہے اور صفیہ کو پلنگ پر بیٹھ کر حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تو وہ محسوس کرتے کہ ان کی ماں محض نوکرانی ہے اور علی احمد ان کے آقا ہیں۔ ابا نہیں۔

صفیہ کے آنے پر علی احمد کو وہ آزادی نہ رہی تھی۔ تسخیر کا شوق تو ان کے دل میں جوں کا توں قائم تھا۔ لیکن اس کے مواقع کم ہو چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے عورتوں کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن صفیہ اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ علی احمد کو مجبوراً اپنی اس دلچسپی کو گھر سے باہر تک ہی محدود رکھنا پڑا۔ اب وہ راتیں باہر گزارنے لگے اور آدھی آدھی رات گئے گھر آنے لگے تھے۔ صفیہ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن علی احمد صدائے احتجاج سے نہ ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ صفیہ کی بڑی سے بڑی صدائے احتجاج کو ٹین کا سپاہی مسکراہٹ میں بدل سکتا ہے۔

***

بچپن

مہندی رنگے ہاتھ

ایلی بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ گرد و پیش کے حالات کو سمجھے بغیر ان سے متاثر ہو رہا تھا۔ پلنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ اس کی توجہ کا مرکز بنی جا رہی تھی۔ وہ صفیہ جس کے مہندی رچے ہاتھ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی میلی زرد انگوٹھیاں گھومتی تھیں۔ جس کی مہین ململ کی قمیض ہر وقت ابھری رہتی تھی۔ وہ صفیہ .... جس کے حکم کو بجالانے کے لئے اس کی ماں ہر وقت کمربستہ رہتی تھی۔ جس نے ماں کو بچوں سے چھین لیا تھا جس نے اس کے باپ کو اپنے جادو کے زور سے ٹین کے سپاہی میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ صفیہ، وہ اس صفیہ سے ڈرتا تھا اس کے خونیں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جوڑے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین قمیض سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بال کھڑے ہو جاتے۔ کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں۔ تنفس تیز ہو جاتا پھر اس کی روح کی گہرائیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔ صفیہ کے خون سے بھیگے ہوئے ہاتھ اس کی طرف لپکتے۔ زرد میلی انگوٹھیاں گھومتیں۔ اس کا سر چکرانے لگتا طبیعت مالش کرنے لگتی اور وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دور صفیہ کے کمرے سے دور، ان تمام چیزوں سے جنہیں صفیہ کے خون آلود ہاتھوں نے چھوا ہو۔

صفیہ کو معلوم تھا کہ ایلی مہندی والے ہاتھوں سے چڑتا ہے اور انگوٹھیوں سے گھن کھاتا ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر ہر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگا دیتی تھی اور اسے آواز دیتی: "ایلی یہ لو

مٹھائی ـــــ" اور پھر مٹھائی کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مسل کر اسے دیتی۔ ایلی اسے یوں پکڑتا جیسے وہ مٹھائی نہیں بلکہ چوہا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آ کر غصہ سے کھولتا۔ "بڑا بدد ماغ ہو گیا ہے تو" صفیہ اسے ڈانٹتی۔ کیا ہے "مہندی رنگے ہاتھ کو۔ یہ دیکھ ایسے اچھے لگتے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھ۔ دیکھ تو" وہ اس کے منہ پر ہاتھ مل دیتی اور ایلی آؤ آؤ کرتا بھاگتا اس کی ناک میں مہندی کی بو بس جاتی۔ میٹھی میٹھی ننگے پنڈے کی بو' اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا گردوپیش میں انجانی پچکاریاں چلتیں۔ برہنہ صورتیں چاروں طرف سے یورش کرتیں۔ آخ تھو۔ آخ تھو۔

صفیہ نے ایک دن ایلی کو ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ سو رہا تھا تو اس کے ایک ہاتھ پر مہندی مل کر اسے باندھ دیا۔ ہاجرہ نے منتیں کیں۔ "نہ صفیہ اسے کچھ نہ کہہ"۔ صفیہ بولی۔ "مہندی ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے اس لڑکے نے۔ دیکھوں کیا کرے گا۔ اپنا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے گا کیا۔" یہ سن کر ہاجرہ خاموش ہو گئی۔ وہ بیچاری خود مجبور تھی۔
جب اگلے روز ایلی جاگا اپنا مہندی رنگا ہاتھ دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ جسم کے بند بند سے میٹھی میٹھی بو آ رہی تھی۔ نگاہ میں ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ اس روز اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا جسم غلاظت سے لتھڑا ہوا۔ باہر صحن میں سفید ململ کی باریک کرتی پہنے صفیہ کھڑی بال بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے ایلی کو کیا ہوا۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دینے لگی۔ سرخ' خونیں سرخ۔ جیسے وہ قمیض مہندی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا۔ لپکا اور آن کی آن میں صفیہ کی کرتی پر پل پڑا۔ اس کے ناخون سفید ململ میں دھنس گئے۔ قمیض کی دھجیاں صحن میں اڑنے لگیں۔ "مجھے بڑا ہو لینے دے۔ مجھے دسویں پاس کر لینے دے پھر۔ پھر" وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نہ جانے بڑے ہو جانے کو اس ننگے پنڈے کی بو اور مہین قمیض سے کیا تعلق تھا نہ جانے دسویں پاس کر لینے کو اس سرخ رنگ سے کیا تعلق تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سوچے سمجھے بغیر چیختا چلاتا رہا ململ کی دھجیوں کو بکھیرتا رہا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ "ہاں۔" وہ چلایا۔ "بڑا ہو جاؤں پھر۔" اس کے حلق میں آواز سوکھ گئی۔

صفیہ حیران کھڑی تھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ پھر ایلی بھاگ گیا۔ گھر سے باہر۔ دیوان خانے سے باہر۔ سکول میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کا مرتکب ہو

چکا ہو۔ جیسے وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے ننگا ہو گیا ہو۔
"ہوں۔ تم یہاں ہو۔" سارے دن کی تلاش کے بعد علی احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ "چلو گھر چلو۔ چلو" اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علی احمد نے اس کے کپڑے اتروا دیئے۔ قمیض پائجامہ جوتے اور اسے گھر سے باہر نکل کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔
گلی ویران پڑی تھی لیکن ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے لوگ کھڑکیوں کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ منڈیروں کے پیچھے کھڑے ہنس رہے تھے۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا شور مچا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر دفعتاً گلی کے نانک چندی اینٹوں کے فرش پر پاؤں کی چاپ گونجی۔ کوئی آ رہا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہتھوڑے کی ضربیں قریب تر ہوئی جا رہی تھیں۔ ایلی دیوار میں منہ دے کر کھڑا ہو گیا۔ چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مہندی کی بو کا ریلا آیا۔ تڑپ کر وہ نالی میں گر پڑا' جیسے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ بے بسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
نہ جانے کتنا عرصہ ایلی نے اپنا بایاں ہاتھ بغل میں چھپائے رکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا۔ ایک ہاتھ سے منہ دھوتا اور سارے کام اسی ایک ہاتھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی مجبوری کی وجہ سے وہ مہندی رنگا ہاتھ بغل سے نکالتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے ابا نے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نکال رکھا ہو۔ جہاں وہ نالی میں منہ دے کر رو رہا ہو۔

انوکھا باپ

اس زمانے میں وہ رہتک میں رہتے تھے جہاں اس کے ابا ملازم تھے۔ روہتک ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ گلیاں ویران تھیں۔ دکانوں میں سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکے رہتے تھے اور مضبوط بانہوں والے پست قد قصائی کلہاڑیوں سے ان ٹکڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہتے۔ موٹی موٹی عورتیں یوں کچر کچر باتیں کرتیں جیسے چارہ کاٹنے کی مشینیں چل رہی ہوں۔ پھر علی احمد سیر کے لئے دلی گئے تو ایلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دلی کو دیکھ کر ایلی دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کا اسے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا بازاروں کی بھیڑ' دکانوں کی قطاریں۔ خوانچے والوں کا شور اور تانگوں اور گاڑیوں کا تسلسل دیکھ کر اس کے دل میں نئی بیداریوں نے کروٹ لی۔ دلی میں ماموں حشمت علی کا گھر جہاں وہ ٹھہرے تھے' بذات خود ایلی کے لئے اچنبھے کی چیز تھی۔ وہاں کی ہر بات

نرالی تھی۔ ہر طریقہ انوکھا تھا۔ اس سے پہلے کسی کے گھر رہنے کا ایلی کو اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے اپنے گھر کے علاوہ وہ کسی گھریلو ماحول سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ حشمت علی ابا ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتے تھے۔ دفتر سے واپسی پر علیحدہ کمرے میں ٹین کے سپاہی کا کھیل کی بجائے اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ جاتے۔ ایلی کے لئے یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔ اچھا باپ تھا وہ باپ نہ ہوا ساتھی ہو گیا۔ ایلی سمجھتا تھا کہ باپ وہ ہوتا ہے جو بچوں کے لئے ہمیشہ دور رہے۔ جس کی تیوری چڑھی رہے۔ جس کے انداز میں ایک شان برتری ہو بے نیازی ہو۔ جو دو انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا اٹھا کر بیٹے کو آواز دے۔ "ایلی"

حشمت علی کے چھوٹے بیٹے جمیل کو دیکھ کر ایلی کو اس کی جرأت پر حیرانی ہوتی تھی۔ باپ سے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ بات بات پر ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے ابا اس کے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نہیں نکالتے تھے۔ جمیل کتنا نڈر اور آزاد تھا۔ وہ دلی کے بازاروں میں اکیلا گھومتا پھرتا تھا۔ ہجوم کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔

"چلو ایلی" جمیل نے اسے کہا "چلو ہم تمہیں سوہن حلوا کھلائیں گے۔ یہ دیکھو۔" اس نے مٹھی کھولی "یہ دیکھو۔ اٹھنی ــــــــــ" ایلی حیران رہ گیا۔ اٹھنی کا حلوہ! اٹھنی ایلی کے نزدیک بہت بڑی رقم کا حلوہ؟ لیکن جمیل کو اٹھنی مل کیسے گئی۔ "آؤ" جمیل نے کہا "ہم تم کو دکھائیں۔ اٹھنی کا حلوہ لیں گے۔ پھر بھی یہ ہماری ہی رہے گی۔" یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھنی کا حلوہ خریدو۔ اٹھنی پھر بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ضرور جمیل مذاق کر رہا ہے۔ ایلی چپ چاپ جمیل کے ساتھ ہو لیا "سنو اٹھنی بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی دوکان پر چلو جہاں بھیڑ لگی ہو۔ ہاں بھیڑ میں سودا خوب رہتا ہے۔" جمیل اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور ایلی حیران ہو رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے کبھی نہ سوجھی تھیں۔

جمیل سے مل کر اسے کئی ایک باتوں کا پتہ چلا۔ عجیب و غریب باتوں کا مثلاً یہ کہ اس کے بڑے بھائی صفدر کو تھیٹر کی ایک پارسی لڑکی سے عشق تھا۔ پارسی لڑکی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ تھیٹر میں جا کر دیکھے کہ پارسی لڑکی کیسی ہوتی ہے اور اس سے عشق کیسے لگتا ہے' لیکن جلد ہی وہ ہمایوں کے مقبرے اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا پہنچے اور وہ ان عالیشان عمارتوں میں کھو گیا۔ پھر رہتک میں واپس آنے کے بعد اسے پارسی لڑکی کا خیال آیا اور وہ چوری چوری خواہش کرنے لگا کہ کبھی وہ بھی پارسی لڑکی کو دیکھے لیکن رہتک میں تو ہر طرف پوربی عورتیں تھیں جو پتھر کوٹنے

میں لگی رہتی تھیں اور یا موٹی عورتیں جو کھُر کھُر باتیں کرتی رہتیں۔

اجمل کے بال

پھر رہتک میں اس کا پھوپھی زاد بھائی اجمل آ گیا۔ اجمل کا قد لمبا رنگ نکھرا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اس کے بال کس قدر ملائم اور لمبے تھے۔ کپڑے بھی تو بہت خوبصورت پہنتا تھا۔ ایلی اجمل کو غور سے دیکھتا رہتا حتیٰ کہ اسے پارسی لڑکی بھی بھول گئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اجمل کی طرح اونچا لمبا ہو جائے۔ اس کا جسم بھی اسی طرح نکھر جائے اور بال اجمل کے بال تو ایلی کی نظر میں بے حد خوبصورت تھے۔ وہ اجمل کو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے غور سے دیکھتا اور اجمل سا بننے کی کوشش کرتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اجمل اسے دوست سمجھے جیسے دلی میں جمیل اسے دوست سمجھتا تھا اور وہ دونوں رہتک کے بازار میں اکٹھے سوہن حلوہ خریدنے جائیں' لیکن اجمل نے کبھی ایلی کو اہمیت نہ دی تھی۔ سکول میں وہ بڑے لڑکوں کے ساتھ رہا کرتا تھا اور بیچارے ایلی کو اس کے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ نہ جانے وہ بڑے لڑکوں سے مل کر کیا کیا باتیں کیا کرتا تھا۔ جب ایلی ان کی باتیں سننے کے لئے قریب جاتا تو وہ باتیں کرنا بند کر دیتے یا سرگوشیاں کرنے لگتے۔ بڑی مشکل ہی بورڈنگ کے لڑکے اجمل کی دعوتیں کیا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد وہ گھٹنوں بیٹھ کر گپیں ہانکا کرتے۔ گھر میں اجمل کا رویہ عجیب سا رہتا تھا۔ جیسے گھر والوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور صفیہ' صفیہ تو اس کے نزدیک اس مکان میں رہتی ہی نہ تھی۔ چاہے وہ مہندی رنگے ہاتھ چلاتی یا اپنی میلی انگوٹھیاں گھماتی اجمل کو کچھ خبر ہی نہ ہوتی وہ بال بنا کر چپکے سے باہر نکل جاتا پھر صفیہ غصہ میں چلاتی: "ہاجرہ یہ کیا ہے۔ تمہیں برتن صاف کرنے بھی نہیں آتے اور یہ دیکھو شلغم تو تم نے بالکل ہی جلا دیئے ہیں۔" پھر وہ نیا جوڑا پہنتی' خوشبو لگاتی اور علی احمد کے انتظار میں بیٹھ جاتی۔ علی احمد کے آنے پر ٹین کا سپاہی میدان عمل میں نہ آتا بلکہ اس کی جگہ کٹ پتلیوں کا کھیل شروع ہو جاتا۔ ایک منتیں کرتی دوسری منہ چڑاتی ایک سیٹیاں بجا کر بلاتی دوسری ناک چڑھاتی۔ ایک ہنسی ہنسے جاتی' دوسری گھورتی اور پھر جب دروازہ کھلتا تو شاہکوٹ کا قلعہ یوں طمطراق سے قائم ہوتا۔ جیسے وہ ناقابل تسخیر ہو۔ پھر صبح اٹھتے ہی علی احمد چلاتے "اجمل ادھر آؤ یہ کیا واہیات عادت ہے تم سارا دن بننے سنورنے میں گزار دیتے ہو اور شام محفلوں میں بسر کرتے ہو اور تمہارے یہ بال کتنے واہیات بال ہیں جیسے عورتوں کے ہوتے ہیں۔ ہٹ جاؤ

میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

پھر ایک رات کٹ پتلیوں کا تماشہ شدت اختیار کر گیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجنے لگا اور ٹین کے سپاہی نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے اور بند کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اگلی صبح جونہی علی احمد بیدار ہوئے تو گھر پر ایک مصیبت ٹوٹ پڑی۔ "یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے؟ وہ وہاں کیوں گیا ہے؟" ایلی حیران تھا کہ اس بند کمرے کے سپاہی کو کیا ہوا کہ اپنی سرزمین چھوڑ کر گھر کے ویرانے میں گھومنا شروع کر دیا۔ لیکن جلد حیرت مصیبت میں بدل گئی۔ جب علی احمد نے للکار کر کہا "تم پڑھتے کیوں نہیں ہروقت کھیلتا ہے۔ لنڈور۔ ادھر آؤ۔" اور آخر کار تان اجمل پر آٹوٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجام بلوا کر اجمل اور ایلی دونوں کے بال کٹوا دیئے گئے اور علی احمد فاتحانہ قہقہہ لگا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس رات ایلی رضائی میں منہ ڈھانپ کر روتا رہا کہ ابا ہائے اجمل کے بال ہائے اجمل کے بال۔

اس کے بعد علی احمد نے اجمل کے باہر جانے اور شامیں باہر بسر کرنے پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ایک روز اجمل دیر سے گھر آیا تو انہوں نے اجمل کے منہ پر تھپڑ جما دیا "بڑا بنتا ہے تو" اور اجمل رونے لگا۔ اندر صفیہ مسکرا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کی انگوٹھیاں گھما رہی تھی اور رضائی میں منہ ڈال کر ایلی نہ جانے کیوں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا " میں بڑا ہو لوں۔ میں دسویں پاس کر لوں۔"

اگلے روز اجمل مدرسے سے واپس نہ آیا شام کے وقت ایک آدمی ایک رقعہ لایا۔ لکھا تھا' میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اجمل کے جانے کے بعد ایلی اکیلا رہ گیا۔ اگر انہی دنوں ابا کا تبادلہ دوراہے نہ ہو جاتا تو ایلی کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ بہر حال وہ رہتک چھوڑ کر دوراہے چلے گئے۔

اس نئے شہر میں ان کے مکان کے سامنے ایک گندہ نالہ بہتا تھا جس کے ارد گرد بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایلی کے لئے یہ نالہ ایک بہت بڑی نعمت تھی جہاں کھیل کر وہ ابا کی بے حسی اور صفیہ کے غلیظ ہاتھوں کو بھول سکتا تھا۔

خانم

ایک روز جب وہ گندے نالے کے قریب کھیل رہا تھا تو اس کے ابا باہر نکلے۔ ایلی انہیں

دیکھ کر سہم گیا ——— علی احمد رک گئے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایلی کو اشارہ کر کے بلایا۔ وہ ڈر گیا نہ جانے ابا اسے کیوں بلا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اسے یوں کبھی بلایا نہ تھا یا تو وہ خاموشی سے پاس سے گزر جایا کرتے تھے اور یا اسے دیکھ کر کہتے "تو یہاں کھیل رہا ہے۔ دوڑ گھر جا نالائق سارا سارا دن کھیلتا رہتا ہے۔" اور ایلی چپکے سے دوڑ کر گھر میں جا چھپتا۔ اس روز ان کے بلانے پر ایلی ڈرتا ہوا پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاس بلا کر ابا گھوریں گے اور اسے گھر جانے کو کہیں گے۔ لیکن ایلی قریب آیا تو وہ بولے "ادھر آ۔ ہمارے ساتھ"۔ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید اس نے ان کا اشارہ غلط سمجھا ہو لیکن پھر وہ چپ چاپ آگے آگے کیوں چل پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا شاید وہ اسے گھر کے لئے کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بہر حال ساری بات عجیب سی تھی۔ ایلی ان کے پیچھے خاموشی سے چلنے لگا بازار آیا اور ختم بھی ہو گیا لیکن خاموش چلتے گئے۔

بازار کے اختتام پر علی احمد ایک گلی میں گھوم گئے اور دیر تک پر پیچ گلیوں میں چلتے رہے۔ حتیٰ کہ گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ شہر کے باہر کالی سڑک پر جا پہنچے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر وہ اس مختصر سی آبادی میں جا داخل ہوئے جو ریل کے پل کے پار تھی اور از سر نو گلیوں میں جا گھسے جہاں چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ بالآخر وہ ایک دروازے پر رکے جہاں علی احمد نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر کے بعد دروازے کی درز میں ایک موٹی سی اتنی بڑی کالی آنکھ دکھائی دی "خانم" علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ اندر سے گویا چاندی کی گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سرخ و سفید چہرہ طلوع ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔

خانم کو دیکھ کر ایلی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چوڑے گورے چٹے چہرے پر دو موٹی موٹی کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں "آؤ بیٹھو۔" اس نے چارپائی کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ۔" علی احمد نے ایلی کو حکم دیا اور وہ خود بے تکلف چارپائی پر لیٹ گئے "حقہ بھرنا ذرا خانم" علی احمد نے یوں کہا جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو۔ خانم نے جلدی سے چلم میں دو کوئلے ڈالے اور پھر علی احمد کے پاس بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی وہ دونوں ایلی کے وجود سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایلی حیران تھا کہ خانم کون ہے اور اس کا منہ اتنا چوڑا اور سرخ و سفید کیوں ہے اور اس کی آنکھیں اتنی شوخ کیوں ہیں اور رعب بھرے چہرے کے باوجود اس قدر مسکراتی کیوں ہے

اور اس کی طرف دیکھنے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ابا وہاں یوں لیٹ کر حقہ پی رہے ہیں۔ جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو اور خانم یوں ان کے پاس بیٹھی تھی جیسے صفیہ گھر میں ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ صفیہ اور خانم کا کوئی مقابلہ بھی تو نہ تھا اگرچہ صفیہ کا رنگ بھی کافی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے بھی رعب برستا تھا۔ لیکن صفیہ کے ماتھے پر تو ہر وقت شکن پڑی رہتی تھی۔ اس کے برعکس خانم مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ایلی کو دیکھ کر ویسے ہی مسکراتی تھی۔ جیسے علی احمد کو دیکھ کر جیسے ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ صفیہ تو صرف علی احمد کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خانم کے ہاتھ مہندی رنگے نہ تھے۔ کتنے صاف ستھرے ہاتھ تھے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی تو نہ تھیں۔

وہ باتیں کرنے میں مشغول تھے کہ اندر کوئی بچہ رونے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ایلی گھبرا گیا نہ جانے کہاں سے ایک شخص میلی سی چادر میں لپٹا ہوا آموجود ہوا "دیکھ تو سراب رو رہا ہے۔" خانم بولی اور پھر علی احمد سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ چادر میں لپٹا ہوا عورت نما شخص اندر جا کر بچے کو تھپکنے لگا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا۔ نوکر تو نہیں معلوم ہوتا تھا وہ ——— خانم کا خاوند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کون تھا وہ۔ ایلی کے لئے وہ مکان ایک راز محسوس ہونے لگا وہ بے تکلف مسکرانے والی عورت۔ وہ عورت نما مرد اور وہ روتا بچہ۔

"اچھا تو یہ لڑکا ہے۔" خانم نے اپنے ہاتھ سے ایلی کے منہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اس کی اس تھپک میں کتنا پیار تھا۔ ایلی کے جسم میں ایک جھرجھری سی ناچنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خانم کا ہاتھ اسے تھپکتا رہے اور وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں ویسے ہی مسکاتی رہیں اور اس کے سامنے وہ بڑا سا سرخ و سپید چہرہ یونہی معلق رہے اور وہ ابا کے ساتھ ہمیشہ وہیں اس مٹی کے گھروندے میں رہے اور اور ———

اس کے بعد گندے نالے کے پاس کھیلتے ہوئے وہ چوری چوری دعائیں مانگتا کہ ابا گھر سے نکل کر اسے اشارہ کریں۔ ایلی ادھر آؤ ہمارے ساتھ چلو وہ اسی طرح خانم کے گھر جائے اور اس دروازے سے خانم کی سیاہ آنکھ انہیں دیکھے اور بالآخر اس کا ہاتھ اسے تھپکے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ابا باہر نکل کر انگلی کے اشارے سے بلاتے اور پھر کہتے "اس مکان میں جہاں تم اس روز گئے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہاں جاؤ اور خانم کو یہ دے آؤ۔" اور وہ چپکے سے ایک گٹھڑی سی اس کی بغل میں تھما دیتے۔ "کسی سے کہنا نہیں سمجھے۔" وہ زیر لب کہتے اور ایلی

خانم کے گھر کی طرف اڑ لیتا اور پھر خانم کا چٹا سفید ہاتھ پیار سے اس کے منہ کو تھپکتا اور اس کے ہونٹ سہلاتا وہ مٹی کا گھروندا اس کی آنکھوں تلے کانپتا اور اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا نہ جانے کیا ہوتا۔

پھر ایک روز خانم ان کے اپنے گھر آ گئی۔ ایلی نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خانم نے رازدارانہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اندر سے ابا بھاگے بھاگے باہر آئے۔ "صفیہ یہ استانی ہیں۔ اسلامیہ سکول کی بڑی استانی تم سے ملنے آئی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ استانی صاحبہ۔ ایلی ان کے لئے کچھ لاؤ نا بھئی۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔ کتنی دور ہے آپ کا سکول' ہاں آٹھ کوس مجھے یاد آ گیا اور نام کیا ہے۔ سلاں والی نہیں نہیں۔ سیل آباد ٹھیک" اور علی احمد کو دیکھ کر خانم نے اتنا بڑا گھونگٹ نکال لیا اور ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر وہ ایلی کی طرف دیکھ کر رازدارانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ لیکن وہ ابا سے پردہ کیوں کر رہی تھی؟ اس نے گھونگٹ کیوں نکال رکھا تھا کیا وہ استانی تھی؟ لیکن وہ تو وہیں رہتی تھی۔ شہر میں' پھر ابا کیوں کہہ رہے تھے کہ وہ سیل آباد سے آئی ہے ایلی کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خانم عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے بلا رہی ہو جیسے ہاتھ کی بجائے نگاہوں سے اسے تھپک رہی ہو ——— سہلا رہی ہو۔

"نہیں۔ نہیں۔" علی احمد کہہ رہے تھے "اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ ہاں ہاں اچھا تو آپ کے سکول میں کتنی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں؟ آپ کے سکول کا بڑا چرچا ہے۔" خانم مسکرائے جا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ صفیہ گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور ہاجرہ اندر سبز رنگ کی میٹھی بوتلیں کھولنے میں مصروف تھی تاکہ سیل آباد کی استانی کی تواضع کی جا سکے۔

تین بچے

اس روز ایلی کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تین بچے عجیب و غریب کھیل کھیل رہے ہوں۔ علی احمد' خانم اور ایلی۔ ابا تو یوں سنجیدگی سے باتیں کئے جا رہے تھے۔ جیسے وہ علی احمد ہی نہ ہوں۔ مگر ان کی آنکھوں کی چمک ان کے بہروپ کی چغلی کھا رہی تھی اور خانم یوں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی' جیسے واقعی ہی علی احمد اس کے لئے ایک بیگانہ شخص ہوں۔ لیکن وہ ہر بار ایلی

کی طرف دیکھ کر یوں آنکھ چمکاتی کہ اسے اس انوکھے کھیل کا لطف آجاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کھیل ہمیشہ کے لئے جاری رہے۔ اور خانم اس کی طرف دیکھ مسکاتی رہے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس دے۔

پھر جلد ہی چند ایک ماہ کے اندر اس استانی کا راز کھل گیا جو سیل آباد کے سکول میں پڑھاتی تھی اور علی احمد سے گھونگٹ نکالنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی اور صفیہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور اس کی آواز سارے محلے میں گونجنے لگی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر علی احمد تو گھر سے باہر چلے گئے اور جان بوجھ کر دیر سے آئے۔ حقیقت یہ تھی کہ روز بروز علی احمد کی طبیعت صفیہ سے ہٹتی جا رہی تھی اور صفیہ کو خود اس کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اپنے اثر کو قائم رکھنے کے لئے اس نے از سر نو ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ باریک ریشمیں قمیص پہنی' سیاہ کناری والے دوپٹے اوڑھے لیکن ان کوششوں کے باوجود اس کا رنگ زرد پڑتا گیا اس کی آواز مرجھا گئی۔ یہ محسوس کر کے صفیہ نے نئے پہلو سے اپنی اہمیت کا احساس اخذ کرنے کی کوششیں کیں۔ علی احمد نہیں تو نہ سہی ہاجرہ جو ہے جس پر وہ حکومت کر سکتی تھی۔

علی احمد مزاج کے بہت شگفتہ واقع ہوئے تھے۔ وہ صفیہ کے غصے کو دیکھ کر چوری چوری مسکراتے اور پھر سنجیدگی سے ان بگڑے ہوئے حالات پر بات کرنے کی بجائے جھٹ ٹین کا سپاہی بن جاتے۔ اس پر صفیہ چڑ جاتی اور بے بسی اور غصہ میں ہاتھ چلاتی لیکن ٹین کا سپاہی ہنسے جاتا لڑے جاتا حتیٰ کہ صفیہ کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ مسکرانے لگتی اور ٹین کا سپاہی فاتحانہ طور پر قہقہہ لگاتا اور سب ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اب سب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ صفیہ کے دل کی پھانس نہ نکلتی تھی اور اس کا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ خانم روز آموجود ہوتی تھی اس کی موجودگی سے صفیہ کا رنگ اور بھی پھیکا پڑ جاتا اور گھر میں خانم کے قہقہے گونجتے اور اس کی کالی آنکھیں مسکاتیں اور علی احمد دبی دبی خوشی سے بے تاب ہو کر جھومتے اور چلاتے "ایلی اب تم ذرا سراب کو کھلاؤ باہر جا کر کھلاؤ اسے۔ اسے باجا سناؤ۔" اور ایلی بڑی مسرت سے سراب کو اٹھا لیتا اور خانم کے چھیڑ دینے والے ہاتھ ایلی کے منہ کو تھپکتے اور اس کا جسم جھنجھنے کی طرح بجتا اور رگ وپے پر بیر بہوٹیاں سی چلتیں اور خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے اور وہ محسوس کرتا جیسے ہوا میں اڑا جا رہا ہو۔ خانم کی نگاہیں علی احمد کو جھنجھناتیں اور علی احمد فرط ال سے یا نہ جانے کیوں صحن میں اِدھر اُدھر گھومنے لگتے اور صفیہ بیزار ہو کر پلنگ پر جا بیٹھتی اور منہ دیوار

کی طرف موڑ لیتی۔

خانم کے آنے سے صفیہ ایلی سے اور بھی چڑنے لگی "ہوں تو تو ابا کے پیغام لے کر جاتا ہے شرم نہیں آتی۔" اور شرم آنے کی بجائے ایلی کی ایڑیاں اونچی ہو جاتیں اور اس کی چھاتی تن جاتی اور وہ ابا سے گہرے تعلقات رکھنے کے خیال سے فخر محسوس کرتا۔

ابا اب تقریباً ہر روز کھانا کھاتے ہوئے اسے آواز دیتے "ایلی" اور پھر دو انگلیوں میں لٹکتا ہوا گوشت کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ اسے مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پکڑتا تھا بلکہ یوں لٹکائے چلا جاتا جیسے وہ کوئی تمغہ ہو اور پھر روٹی پر رکھ کر اسے یوں کھاتا کہ فرحت دیکھ لے تو جل کر راکھ ہو جائے۔

صفیہ اب عام طور پر چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی اور تنہائی میں کھانستی رہتی تھی۔ ادھر علی احمد کے کمرے میں خانم کے قہقہے گونجتے۔ سراب کو بہلانے کے لئے ایلی گراموفون پر پرانے ریکارڈ لگاتا اور خانم کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ موسیقی کا ساز چھڑ جاتا ادھر باورچی خانے میں ہاجرہ خانم کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی۔ پھر دفعتاً" علی احمد چلاتے "ایلی سراب کو باہر لے جاؤ۔ وہاں بہل جائے گا۔" سراب کو اٹھا کر ایلی باہر نکل آتا اندر خانم کی سریلی سروں پر ٹین کا سپاہی رزمیہ انداز سے رقص کرتا اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ چھپ چھپ کر اس رقص کو دیکھے۔

بیچاری صفیہ کا بیشتر وقت اب تنہائی میں گزرتا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی سے اکتا کر یا تو وہ ہاجرہ کو کوستی رہتی یا کھانستی رہتی۔

ہاجرہ نے کئی ایک بار ایلی کو بتایا تھا کہ صفیہ بیمار ہے اسے سل کا عارضہ ہو گیا ہے مگر ایلی کو اعتبار نہ آتا تھا۔ صفیہ بیماری یا کسی اور د۔ سے عاجز آجائے ایلی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صفیہ کو کوئی عارضہ ہو جائے۔ اونہوں۔ یہ تو محض تنہائی کی وجہ سے تھا ابا جو باہر رہتے تھے اور پھر خانم جو آجاتی تھی وہاں'

خانم آتی تو گھر میں ایک شور مچ جاتا۔ خانم کتنا شور مچاتی تھی۔ اس کا ایلی کو مسکا کر دیکھنا نگاہ سے ایلی کا منہ سہلانا اور اس کے منہ کو' جھنجھنے کی طرح بجانا۔ اب ایلی کو معلوم ہو چکا تھا کہ خانم استانی نہ تھی یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا اگر وہ استانی ہوتی تو خوب رہتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا تھا نہ جانے استانی کیسی ہوتی ہو گی وہ تو فر فر انگریزی بولتی ہو گی اور پھر اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر ٹپ ٹپ چلتی ہو گی بالکل جیسے بازاروں میں میمیں چلتی ہیں۔

استانی

پھر ایک روز علی احمد دورے پر جانے لگے تو انہوں نے ایلی کو پاس بلایا "چلو ایلی" وہ بولے۔ "تمہیں ساتھ لئے چلتے ہیں۔" ایلی گھبرا گیا نہ جانے علی احمد اسے کہاں لے جائیں گے۔ ہاجرہ نے یہ بات تعجب سے سنی اور صفیہ نے ناک چڑھائی ـــــــــ "نہیں نہیں گھبرانے کی کیا بات ہے۔" علی احمد بولے "وہاں سکول کی استانی ایلی کا خیال رکھے گی۔" استانی ـــــــ ایلی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ابا کے ساتھ تانگہ میں بیٹھا تو خانم کا ہاتھ لگے بغیر ہی اس کے گال جھنجھنے کی طرح بج رہے تھے اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ استانی۔ استانی اس محلے کی چکی خوشی سے چیخ رہی تھی۔ تانگہ میں بیٹھے ہوئے وہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا وہ کھیت وہ سڑک وہ پیڑ سب دھندلائے ہوئے تھے دور افق پر ـــــــ ٹیلوں کے پیچھے سے ایک حسینہ جھانک رہی تھی۔ جب وہ منزل پر پہنچے تو انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بٹھا دیا گیا اور پھر انکی تواضع کے لئے دودھ کی ایک بھری ہوئی گاگر آ گئی۔ اتنا سارا دودھ اور سکول میں اس کے اپنے مدرسے میں تو دودھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کبھی البتہ خوانچے والے مدرسے کے باہر پاپڑ اور پکوڑے بیچا کرتے تھے دودھ تو نہیں بیچتے تھے وہ شاید زنانہ مدرسوں میں دودھ بکتا ہو۔ بہر صورت وہ حیران تھا دو اونچے لمبے گلاس رکھ کر نوکر چلا گیا۔ پلنگ پر علی احمد تکیہ لگائے حقہ پی رہے تھے۔ جیسے وہ خانم کے گھر پیا کرتے تھے۔ ایلی نے ان کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

"سلام و علیکم" عورت کی آواز سن کر ایلی چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے لٹکے ہوئے پردے سے ایک حنائی ہاتھ نکل آیا "بچے کو اندر بھیج دیجئے۔ کیسے اچھے تو ہیں آپ؟" ـــــــ شکر ہے۔ "ایلی" علی احمد بولے۔ اندر جاؤ استانی جی بلا رہی ہیں تمہیں۔" ایلی ہچکچاتا رہا لیکن علی احمد کی نگاہ میں سنجیدگی کی جھلک تھی "آؤ نا بیٹا۔" اندر سے آواز آئی اور ایلی جھجکتا ہچکچاتا ہوا اندر چلا گیا۔ ارے استانی کی طرف دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ جسم بھدا اور منہ پر بیزاری چھائی ہوئی تھی۔

ایلی کے تخیل میں تو استانی نہ جانے کیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ استانی خانم سے کہیں زیادہ

خوبصورت اور رنگین ہو گی اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی ہو گی اور مژگاں اشاروں سے لدی ہوں گی اور اس کے ہاتھ خانم کے ہاتھوں سے زیادہ بے تکلف ہوں گے جو اسے جھنجھنائیں گے۔ اس استانی کے چہرہ پر تو نحوست چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بے حد بھدی تھیں اور پھر شلوار کی جگہ چادر باندھ رکھی تھی۔ عورت اور چادر۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایلی کے دل میں نفرت کھولنے لگی۔ یہ کیسی استانی کے ہاں لے آئے تھے۔ ابا شاید وہ غلطی سے وہاں آ گئے ہوں۔ لیکن اس معاملے میں ابا غلطی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی وہ چارپائی پر مطمئن اور متوقع انداز سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایلی حیران تھا۔

استانی کی نگاہیں علی احمد پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے انہیں جانچ رہی ہوں تول رہی ہوں۔ تو یہ تھیں استانی، ہیڈ معلمہ "یہ لو مٹھائی۔" اس نے ایلی کے سامنے مٹھائی کی تھالی رکھ دی اور خود پھر سے پردے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی وہ پھر سے علی احمد سے باتیں کرنے لگی "شمیم تو ان دنوں کشمیر میں ہے وہ وہیں رہتی ہے کیوں نہ رہے لڑکی کے کھانے پینے کے دن ہیں اور پھر وہ تو کشمیر کے میووں پر پلی ہوئی ہے۔ یہ سرخ چہرہ اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی جوانی آئی ہے لڑکی پر! آنکھیں پھٹتی ہیں دیکھ کر اور پھر اوپر سے دسویں پاس۔"

"اچھا دسویں بھی کر لی ہے؟" علی احمد نے قہقہہ مار کر پوچھا۔

"پچھلے سال جو کی تھی میں نے بتایا تو تھا۔"

"اچھا" علی احمد بولے "لیکن تم بھی تو آج تک باتیں ہی کرتی رہی ہو کبھی ملایا تو نہیں شمیم سے۔"

"ہے بچی ہے ابھی۔" استانی نے ذرا تنک کر جواب دیا "عمر ہی کیا ہے اس کی افسروں کے سامنے کہاں آتی ہے۔"

"بیگماں ادھر دیکھو۔" علی احمد بولے "ہم کیا غیر ہیں؟"

"نہیں غیر تو نہیں۔" وہ بولی "پھر بھی جب تک بات طے نہ ہو جائے "بھئی واہ۔" وہ ہنسنے لگے" کیا کوئی کسر باقی ہے۔ بات طے ہی سمجھو۔" نہ جانے وہ کس کی باتیں کر رہے تھے۔ شمیم کون تھی وہ کشمیر میں کیوں پل رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں کیوں پھٹتی تھیں اور وہ بات کیا تھی جسے طے سمجھا جا رہا تھا۔ ایلی ان کی باتوں سے اکتا گیا اور مٹھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استانی سے تو مٹھائی ہی کہیں اچھی تھی۔

دورے سے واپسی پر علی احمد نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کہا "دیکھو ایلی گھر میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بات سمجھے بغیر ہی اثبات میں سرہلا دیا۔ پھر وہ سوچتا رہا کہ نہ کرنے کی بات ہی کونسی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں وہ تو وہاں دودھ پینے کے علاوہ مٹھائی کھاتا رہا تھا اور وہ شمیم کی باتیں کرتے رہے تھے اور پردہ ہوا سے اڑتا رہا تھا "ہائیں!" دفعتاً اسے خیال آیا۔ استانی نے تو شلوار کی جگہ چادر باندھی ہوئی تھی۔ جیسے جاٹ باندھتے ہیں رنگدار چادر' ساڑھی نہیں' رنگدار چادر اور قمیص' آخر استانی نے چادر کیوں باندھی ہوئی تھی۔ شاید ابا کا بات نہ کرنے سے یہی مطلب ہو گا کہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ استانیاں شلوار پہننے کی بجائے چادر باندھتی ہیں۔ لیکن وہ شمیم کون تھی۔ جو کشمیر کے پھلوں پر پل رہی تھی اور جس پر جوانی ٹوٹ کر آرہی تھی۔ شاید علی احمد شمیم کی بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ بہر حال اس پر استانی کی حقیقت تو کھل چکی تھی۔ استانی سے مایوس ہو کر وہ ایک دفعہ پھر خانم کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی خانم کا قرب بھی اس سے چھین لیا گیا اور علی احمد نے کسی وجہ سے انہیں علی پور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہاجرہ فرحت اور ایلی علی پور آگئے۔

چوگان اور پیڑے

پہلی مرتبہ محلہ میں آکر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ محلے والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے ہیں اور اس کی ماں کو گھر کا نوکر نہیں سمجھتے اور پلنگ پر بیٹھنے والی صفیہ کو گھر کی مالکہ نہیں مانتے "تم آگئے بیٹا۔" چچی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا "اچھا ہوا تم آگئے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ جگہ جگہ علی احمد کے ساتھ جوتے چٹخاؤ۔ تم اپنے گھر میں رہو۔ یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور وہ صفیہ کالے منہ والی چڑیل اسے کون جانتا ہے اچھا کھیلو بیٹا کھیلو۔"

بوڑھی جاناں چلائی "خدا کا شکر ہے۔ میرا بیٹا ایلی گھر آیا۔ جانے دو علی احمد کو در در کی خاک چھانتے تم کیا اس کے نوکر ہو جو اس کی چاکری کرتے پھرتے ہو۔ تم اللہ کے فضل سے اس گھر کا چاند ہو۔"

"آگئی تو ہاجرہ۔" برکتے بولی۔ "سو بار آؤ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹی۔ علی احمد کا کیا ہے اس کے

سر پر تو عورتوں کا بھوت سوار ہے۔ بس عورتیں ہوں۔ اللہ ماری رنگ رنگیلی۔ ان کے نخرے ٹسے اور چھیڑ چھاڑ ہو اور میاں پریوں کے درمیان میں اندر بن کے بیٹھے رہیں دفع کر علی احمد کو۔" ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ "نہ بیٹی تو اپنا آپ کیوں ہلکان کرتی ہے۔ تیری بلا سے جو تو ہے وہ اور کون ہو سکتی ہے۔ محلہ والوں کی نگاہ میں۔ آپ جھک مار مار کر تھک جائے گا۔ اللہ کرے یہ تیرا ایلی جئے زندگی دراز ہو۔"

کئی ایک روز تو محلہ والیوں کا تانتا بندھا جا رہا اور ہاجرہ بات بات پر آنسو بہاتی رہی اور محلے والیاں اسے دلاسہ دیتی رہیں ایلی حیران تھا کہ اماں بات بات پر رو کیوں دیتی ہے۔ رونے کی تو کوئی بات نہ تھی نہ جانے پھر وہ کیوں روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صفیہ سے جدا ہو گئی تھی۔ مگر محلے میں پہنچ کر تو اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ جیسے وہ صفیہ سے بیزار ہو۔ جیسے وہ خوشی سے اس کے خدمت نہ کرتی ہو مگر باہر جا کر تو وہ صفیہ صفیہ کرتے تھکتی نہ تھی۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نیچے احاطے میں محلے کی بوڑھیاں چرخے رکھے باتوں میں مشغول تھیں۔ سب انہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ علی احمد کے قصے۔ ہاجرہ کی مظلومیت۔ چاروں طرف لوگ ہاجرہ فرحت اور ایلی سے ہمدردی جتا رہے تھے اور ہاجرہ کی نیکی اور خدمت گزاری کا تذکرہ کر رہے تھے اور ہاجرہ ڈھلکتے آنسوؤں کے باوجود پھولے نہ سما رہی تھی۔ آنسوؤں کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایلی نے اس چمک کو پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔

گھر میں صرف دادی اماں خاموش تھی وہ ایلی کی طرف دیکھتی مسکراتی اور پھر تلخ انداز سے کہتی "ایلی اب تو سارا دن آوارہ گردی ہی کرتا رہے گا کیا۔" اور ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اسے گھورنے کی بجائے پیار کر رہی ہو۔ "ادھر آ۔" وہ چلاتی اور ایلی دبکنے کی بجائے اس کے کندھوں پر جا سوار ہوتا اور پھر بڑھیا ہنستی۔ "تو تو میرے کندھے توڑ دے گا۔ ہٹ اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔ دفع ہو۔" اور ایلی اس کے کندھوں سے اور بھی چمٹ جاتا۔

ہاجرہ کو روتے دیکھ کر دادی اماں ہاتھ چلا کر کہتی "تو تو پاگل ہے لڑکی خواہ مخواہ جان کھپا رہی ہے۔ علی احمد کا کیا ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک آپ ہی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

کئی ایک دن تو یونہی رونے دھونے کا سلسلہ جاری رہا پھر ایلی اکتا کر باہر نکل گیا اور چوگان میں کھیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ محلے کے لڑکوں سے واقف ہوتا گیا اور دھیرے دھیرے اس کی

جھجک کم ہوتی گئی۔ جمیل سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اسے دلی کی یاد آگئی جہاں وہ پارسی لڑکی رہتی تھی اور اٹھنی دیئے بغیر انہوں نے حلوہ خریدا تھا۔ جمیل نے اسے دیکھ کر کہا۔ "آؤ ایلی چلو پیڑے کھائیں۔" "پیڑے" ایلی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "لیکن کیسے۔ تمہارے پاس اٹھنی ہے کیا؟" "نہیں" جمیل بولا۔ "روپے۔ بہت سے روپے آؤ دکھاؤں تمہیں۔" جمیل نے لکڑی کی چوکی اٹھائی اور اس کے پاؤں تلے دو روپے پڑے تھے۔ ایلی حیرآن رہ گیا ان کے گھر میں تو ایسی کوئی چوکی نہیں تھی، جس کے پاؤں تلے روپے ملتے ہوں۔ چوکی تلے روپے، اس نے حیرانی سے جمیل کی طرف دیکھا۔ "ہاں۔" جمیل نے لاپروائی سے کہا۔

"اماں کے ہیں۔ میں نے اٹھا کر چوکی تلے چھپا دیئے تھے۔"

اتنے پیڑے ایلی نے کبھی زندگی بھر نہ دیکھے تھے ــــــــــــــ اس نے چار ایک تو بڑے شوق سے کھائے۔ پھر وہ اکتا گیا اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے گناہ کیا ہے جرم کیا ہے۔ اتنے پیڑے خریدنا جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چاند حلوائی کو معلوم تھا کہ وہ روپے اس نے چوکی تلے سے نکالے ہیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ خاموش مگر چالاک مسکراہٹ اور ایلی جھینپ رہا تھا۔ نہیں۔ نہیں میں نہیں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

پیڑے کھانے کے بعد ایلی پر مجرمانہ خاموشی طاری ہو گئی اور وہ واپس چلے آئے۔ ٹھک ٹھک، ایلی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ہائیں وہ گھبرا گیا۔ رضا لکڑی ٹیکتا اور لنگڑی ٹانگ گھماتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے انہیں للکارا۔ "کہاں سے آئے ہو تم۔" "بک نہیں بے جمیل ہنسنے لگا۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ضرور اس لنگڑے کو جمیل کی ماں نے بھیجا ہو گا۔ "بے۔" رضا چلایا۔ "اکیلے اکیلے پیڑے کھاتا ہے تو اور اسے کھلاتا ہے۔ ہوں۔ یہ پیڑے اکیلے ہضم نہیں ہوئے۔ بتا دوں میں۔"

جب وہ دونوں بڑی ڈیوڑھی کے پاس پہنچے تو جمیل کو دیکھ کر سب چلانے لگے "کیوں بھئی پیڑا۔" ایلی کا رنگ فق ہو گیا اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ سب شور مچائے جا رہے تھے۔ رضا، ضیاء، بالا اور پھر کان پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔ "بازار بکیندی برفی۔" آہا بھائی واہ وا۔ رضا نے لنگڑی ٹانگ کھا کر داد دینی شروع کی اور ان سب کی توجہ پیڑوں سے ہٹ کر بالے کے گانے کی طرف مبذول ہو گئی اور ایلی چپکے سے وہاں سے سرک آیا اور دادی اماں کی رضائی میں چھپ

کر پڑ رہا۔

چار ایک دن تو اس کے لئے گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھپے رہنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے باہر نکلنا ہی پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ رضا، ضیا، بالا اور ارجمند سبھی جمیل سے پیڑے کھاتے ہیں اور جمیل روز چوکی سرکا کر روپے نکال لاتا ہے۔ اور وہ سب اس راز سے واقف ہیں یہ جان کر اس کے دل سے وہ بوجھ اتر گیا اور وہ لڑکوں میں شامل ہو کر کھیلنے گا۔

انکرا اینڈی ماباؤں

پھر اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اس کا سکول محلے کے باقی لڑکوں کے سکول سے بہت دور تھا۔ محلے کے قریبی سکول والوں نے ایلی کو داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ پڑھائی میں کمزور تھا دوسرے اس مدرسے میں جگہ نہ تھی۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اسے اطمینان سا ہو گیا کیونکہ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ اس اسکول میں بھی محلے کے چند ایک لڑکے تعلیم پا رہے تھے ان لڑکوں میں ارجمند سب سے زیادہ تیز تھا۔ ارجمند ڈاکٹر ذاکر کا بیٹا تھا وہ سب مل کر پانچ بھائی تھے۔ سب اونچے لمبے پتلے دبلے بچپن کا زیادہ تر زمانہ پانی پت میں بسر کر کے وہ پہلی مرتبہ علی پور آئے تھے۔ ان کے والد اب بھی پانی پت میں ڈاکٹر تھے۔ جہاں ڈسپنسری میں انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ بسر کیا تھا۔

ارجمند بے حد لمبا تھا حالانکہ وہ ایلی کے ساتھ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے قد و قامت اور برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عرصہ دراز سے فارغ التحصیل ہو چکا ہو۔ پانی پت میں رہنے کی وجہ سے ارجمند فر فر اردو بولتا تھا۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اس نے چار ایک خوبصورت فقرے چلا دیئے۔

"آیئے تشریف لایئے۔ فرمایئے۔ خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے۔" اور اِدھر وہ گیا اُدھر اناپ شناپ بولنا شروع کر دیا۔ ویسے تو ارجمند کو سینکڑوں چیزیں یاد تھیں۔ اینکر اینڈی ماباؤں۔ کیلے ریو، ریو پیتے ریور پریم سندیس، پریم ٹوٹا اور نہ جانے کیا کیا لیکن ایلی کو اس کی انکرا اینڈی ماباؤں بہت پسند تھی "دیکھو ایلی" ارجمند چلاتا "انکرا اینڈی ماباؤں کے لئے ریو ریو پیٹے ریو ریو، کیا سمجھے۔" اور ایلی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم سمجھاتے ہیں مطلب ہے لڑکی پھنسانا کیا مشکل ہے کچھ مشکل نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ یہاں محلے داری ہے۔ اگر ڈسپنسری

ہو تو یوں پھنستی ہے یوں جیسے چٹکی بجتی ہے اور پھر ڈسپنسری پانی پت میں ہو تو ________ تو کیا بات ہے۔ آئی پھنسی' آئی پھنسی۔ خیر کچھ پروا نہیں۔ یہ دیکھو یہ ریشمیں رومال کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ کیلیے ریوریو۔ سمجھے کیا سمجھے۔ صرف ہونا ہی نہیں طریقہ استعمال بھی جاننا چاہئے۔ "ہاں" اور وہ رومال ہلا کر کہتا "لہٰذا ہم بتائیں گے یہ دیکھو۔ اسے تھامنے کی مشق کرو پہلے یوں نہیں بلکہ یوں ہاتھ میں مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پڑا رہے بلکہ ہر چند منٹ کے بعد جنبش میں آئے۔ اب منہ پونچھو گرد جھاڑو۔ ذرا احتیاط سے جنبش کی خوبصورتی ہی میں سارا جادو ہے۔ کیا سمجھے۔ لیکن ٹھہرو یہ کیلیے ریوریو ہی کافی نہیں۔ اس پر سینٹ یعنی خوشبو کا چھڑکنا لازمی ہے۔ یہ دیکھو شیشی چار آنے کی یہ شیشی' بیسیوں لڑکیوں کو پھنسانے کے لئے کافی ہے ہاں تو اس رومال سے گالوں کو سہلاؤ۔ بالوں کو جھاڑو گردن پر لٹکا لو۔ ہاتھ میں رکھو۔ لڑکی دور کھڑی ہو تو منہ پر جھٹکا دے کر یعنی سلام عرض کرتا ہوں اور یوں ہلایا تو مطلب ہے اب آؤ بھی ناجان من اور یوں چھاتی پر پھینک لیا تو مطلب ہے ظالم سینے سے لگ جا اس کے استعمال کے کئی انداز ہیں۔ لیکن فی الحال یہی کافی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھو۔" اس نے جیب سے ایک بانسری نکالی اور نچلا ہونٹ لٹکا کر اس میں پھونکیں مارنے لگا "یہ ہے پریم سندیس کہیں اندر بند کمرے میں بیٹھی ہے تو یہ چیز اسے منڈیر پر لے آئے گی اور آخری چیز یہ ہے پریم ٹونا۔ دیکھا۔" اس نے ایک چھوٹی سی کتاب جیب سے نکالی۔ "اس میں سب کچھ لکھا ہے محبت کے خطوط' غزلیں' گیت ہر موقع کے لئے۔ "مثلاً یہ دیکھو" اور وہ گانے لگا "جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا نائٹ سلیپنگ چھوڑ دیا۔" بڑی لاجواب چیز ہے۔ سنتے ہی لڑکی ہنسی اور ہنسی تو سمجھو پھنسی اور یہ سب کچھ کیا ہے انکرائینڈی ماباؤں۔"

ایلی اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور بے حد کمتر محسوس کر رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لڑکی پھنسانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر اتنے بڑے انکرائینڈی ماباؤں کا کچھ تو مقصد ہوگا لڑکیاں نہیں۔ اسے تو مٹیار عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں خاصی لگتی تھیں۔ لیکن کوئی خاص اچھی نہ لگتی تھیں اور اچھی لگتی بھی تو بھی انہیں پھنسانے کا مطلب۔ اچھی لگتی تھیں۔ نہیں اچھی لگتی تھیں تو نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن وہ ریشمی رومال اور بانسری اور پریم ٹونا پریم سندیس وہ سب کس لئے تھے۔ خانم کی بات تو اور تھی نا۔ وہ تو بہت ہی اچھی تھی اور اس کا ہاتھ سے ایلی کو تھپکنا۔ منہ سہلانا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ وہ تو شرم سے آنکھیں

جھکا لیتی تھیں۔ دور سے دیکھ کر مسکراتی تھیں خواہ مخواہ ہنسے جاتی تھیں۔ بے کار بے مصرف۔ اگر ارجمند کو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ سب گورکھ دھندا۔ انکرائینڈی ماباؤں کیا تھا۔ فضول ہو نہ ہو۔ ارجمند جانتا ہی کیا تھا۔ نہ تو اس نے خانم کو دیکھا تھا اور نہ کسی اور کو پانی پت کے ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔

کھوری ڈکوری

ایک روز ارجمند دوڑا دوڑا ایلی کے گھر آیا۔ اسے ادھر اُدھر آؤ بھاگ کے آؤ بھاگ کے آؤ۔ آؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ ایلی کو اپنے گھر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ دوست نے کھوری ڈکوری بھی نہیں دکھایا۔ چلیے آؤ آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پیر جی کے یہاں گئے ہیں۔ آداب و نیاز کے لئے اور ہم رہ گئے ہیں یہاں انداز و ناز کے لئے۔"

گھر پہنچ کر اس نے ایلی کو بند کھڑکی میں دھکیل کر کہا۔ "اب یہاں بیٹھ جاؤ۔ چپ شور نہ مچانا کھڑکی کی ان درزوں سے دیکھو کھوری ڈکوری۔" اور وہ دونوں بیٹھ کر بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے دیکھنے لگے۔ ایلی کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر ارجمند چلائے جا رہا تھا۔ "وہ سامنے بالکونی دکھائی دیتی ہے نا۔ بس اس میں کھیل ہوتا ہے کھوری ڈکوری کا۔ سمجھے۔ آیا نظر ________ نہیں ابھی نہیں انتظار کرو ابھی آئے گا۔"

سامنے سبز رنگ کا جنگلہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اندر دو دروازے ایک کمرے میں کھلتے تھے۔ جنگلے سے نیچے محلے کا بازار تھا۔ سامنے دوکان پر عماد حلوائی دودھ کی کڑاہی صاف کر رہا تھا۔ ساتھ ہی حکیم صاحب مریضوں کے انتظار میں بیٹھے داڑھی کو سہلا رہے تھے "آہا" ارجمند نے چٹکی بجائی "وہ رہا" ایلی نے شوق سے جنگلے کی طرف دیکھا۔ جنگلے کے پچھلے کمرے میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی۔ "ابھی ادھر آئیں گے۔ کچے دھاگے سے کھنچی آئے گی سرکار مری۔"

زن سے ایلی کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے سر میں بھن بھن سا ہونے لگا جیسے دفعتاً سر مکھیوں کے چھتے میں بدل گیا ہو۔ دل گھڑی کی طرح بجنے لگا۔ جنگلے کے پچھلے دروازے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے جسم پر ایک تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف گلابی جسم پر

سیاہ بال لٹک رہے تھے جنہیں بنانے میں وہ مصروف تھی۔ دو بازو بھرے بھرے سفید بازو۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ بال بنانے کے بہانے اس کا منہ سہلا رہے ہوں۔ چھن چھن چھن جھنجھنا بجنے لگا ارجمند جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔

دفعتاً بالوں کو جنبش ہوئی اور۔ اور۔ ایک بڑا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ چوڑا۔ چٹا سفید' دو مخروطی بانہیں لٹکنے لگیں ــــــــ "انہوں" ارجمند چلایا۔ "یہ تو دوسرا ایڈیشن ہے یہ نہیں بڑا والا ایڈیشن نہیں بالکل نہیں ہمیں تو چھوٹا والا چاہیے چھوٹا والا چلو ایلی یہ سب غلط ہے۔ یہ کوری ڈکوری نہیں۔ یہ تو کورا ڈکورا ہے۔ چلو۔"

ایلی کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے مگر ارجمند نے اس کا بازو کھینچ لیا اور اسے باہر لے گیا۔ سب غسل فرماتی ہیں۔ سب چھوٹا بڑا سائز پھر غسل فرمانے کے بعد اس کمرے میں ضرور آتی ہیں۔ تولیہ لپیٹے' کچے دھاگے کا معجزہ ہے۔ بڑی چیز ہے کچا دھاگا "لیکن یہ گھر کس کا ہے؟" ایلی نے پوچھا کیونکہ وہ گھر محلے سے باہر تھا اور ایلی کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کون رہتا ہے "کسی کا بھی ہو۔" ارجمند نے کہا "ہمیں تو آم سے مطلب ہے پیڑ سے نہیں اور آم بھی وہ جو آم ہوں حلوہ کدو نہیں۔ سمجھے ہمارے پاس آیا کرو گے تو یونہی عیش کرائیں گے۔"

ہم جولی ٹولی

محلے میں ہر عمر کے لڑکے تھے اور عمر کے مطابق وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے مثلاً ایک تو جلیل یوسف اور رفیق کی ٹولی تھی جو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ جلیل اس کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ رفیق اس کا ماموں زاد اور لطیف خالہ زاد بھائی۔ والدہ کی طرف سے اس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا اور ہوتا بھی تو کیا تھا۔ علی احمد پرانے رشتہ داروں کو خوش رکھنے کی نسبت نئے رشتے پیدا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رفیق جمیل کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن وہ جمیل سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ نہ تو اسے چوکی تلے روپے رکھنے کا شوق تھا نہ حلوائی سے پیڑے کھانے کا اور نہ ہی بھیڑ والی دوکان سے اٹھنی کا سودا خریدنے کا جمیل کی طرح نہ تو وہ شوخ تھا نہ دبلا پتلا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ جسم فربہی پر مائل تھا۔ طبیعت میں خاموشی اور مٹھاس نمایاں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد ملنسار تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کے کام آئے۔ رفیق مزاج کا رنگین

تھا۔ لیکن یہ رنگ ہلکا ہلکا تھا' مدھم مدھم سا' کبھی شوخی سے نہ چمکا تھا۔ نہ ہی اس کی طبیعت میں جرأت تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ سکے اس کے برعکس وہ ذہنی طور پر محسوس کئے جاتا اور اظہار کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر جھجک جاتا اس کے باوجود اس کے پاس ہر وقت انکرائنڈی ماباؤں کا سب سامان مہیا رہتا تھا۔ جیب میں ایک آنے والی غزلوں کی کتاب ہاتھ میں خوشبو دار ریشمی رومال اور آنکھوں میں چوری چوری دیکھنے اور جھجکنے والی نگاہیں۔

جلیل اس کے برعکس شان قلندری کا قائل تھا۔ آنکھوں میں رندانہ جھلک تھی۔ انداز میں والہانہ پن تھا اور یوسف بیچارہ تو ان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ سپاہیوں کے سکول ماسٹر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ کئی ایک سال فوجی پلٹنوں میں رہا تھا اور نتیجتاً بھاگنا' دوڑنا' کودنا' ہالٹ اور کوئک مارچ کے کھیلوں کو دنیا کی سب سے بڑی لذت سمجھتا تھا۔ اس کی طبیعت ڈر سے خالی تھی اور وہ کسی عظیم الشان کارنامے کا متلاشی تھا۔ رفیق کی طبیعت میں بھی کسی کارنامے کی خواہش کی جھلک تھی۔ لیکن اس خواہش سے ریشمی ملبوسات عطریات اور حنائی ہاتھوں کی بو آتی تھی۔ یہ تینوں لڑکے ایلی کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایلی کا زیادہ وقت انہی کے پاس کٹتا تھا۔ لیکن وہ تینوں عمر میں ایلی سے بڑے تھے اور ایلی سے چھپ چھپ باتیں کرتے تھے۔ رفیق اور جلیل آپس میں راز دارانہ طور پر کچھ طے کرتے یوسف ان کی ایسی باتوں سے اکتا کر دیوار پر چڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور ایلی ایک طرف کھڑا شدت سے محسوس کرتا کہ کاش وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہوتا۔

ارجمند کے گھر سے فارغ ہو کر ایلی رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا جہاں رفیق کے دوست اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جلیل کا گھر محلے میں نہ تھا۔ یہ بہت خوبی تھی۔ کیونکہ وہاں وہ محلے والیوں کی نگاہوں سے دور جو جی چاہے کر سکتے تھے گھر میں جلیل کو ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جس میں بوڑھی عورتیں چوکیوں پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جب وہ وہاں سے سرکتیں تو جلیل اور رفیق چوری چوری باہر جھانکنے لگتے اور ان کا ریشمی رومال کھڑکی سے باہر لہرانے لگتا۔ جسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی جھاڑو دینے کے بہانے باہر گلی میں نکل آتی اور باآواز بلند کسی چچی یا خالہ سے باتیں کرتے ہوئے خواہ مخواہ مسکرائے جاتی اور پھر دہلیز پر جھاڑو دیتے دیتے وہ آدھی سے زیادہ گلی صاف کر دیتی۔ اس وقت جلیل کھڑکی میں بیٹھ کر عجیب سی آنکھوں سے مسکراتا اور رفیق بے تابانہ اٹھ بیٹھتا اور عالم اضطراب میں غزلوں کی کتاب سے

کچھ گنگنانے لگتا۔

نہ جانے وہ لڑکی گلی میں جھاڑو کیوں دیا کرتی تھی اور با آواز بلند باتیں کیوں کیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں لوچ کیوں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز میں اس قدر شوخی کیوں تھی اور جلیل اس وقت ایسی آنکھیں کیوں بنا لیا کرتا تھا۔ جس میں بیک وقت مسکراہٹ بھی ہوتی اور وحشت بھی اور اس وقت رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی سی کیوں ہوا کرتی تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ سب کھیل اس لڑکی سے متعلق تھا مگر اس کا مقصد کیا تھا یہ باتیں ایلی کیلئے حیران کن ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ تھیں۔ رفیق اور جلیل میں یہ عیب تھا کہ وہ ایلی کو بات سمجھانے کی بجائے اس سے بات چھپانے کی کوشش کرتے۔ اسی لئے ایلی ان کے ہاں بیٹھا بیٹھا اکتا جاتا اور ان کو چھوڑ کر ارجمند کی طرف بھاگتا۔

ارجمند اسے دیکھ کر چلّاتا "ایلی ایلی۔ چلو ایلی۔ بڑی ڈیوڑھی میں چلیں۔" اور وہ اپنا تمام ترانکرانیڈی ماباؤں اٹھا کر ڈیوڑھی میں چلے جاتے جہاں چورستہ بنا تھا لوگ آتے جاتے رہتے۔ ارجمند وہاں کھڑے ہو کر بانسری بجاتا اور آتی جاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ مذاق کرتا اور وہ جھینپ کر مسکرا کر چلی جاتی۔ "لاجواب چیز ہے ایلی۔ مگر ابھی نہیں کچھ سال کے بعد دیکھنا۔ وہ دیکھو ٹاٹ کے پیچھے۔ ارے تم تو اندھوں کی طرح کھڑے رہتے ہو"۔ اور ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر کسی نے دیکھ لیا تو محلے کا بڑا بوڑھا ادھر سے گزرتا تو ایلی یوں کسی اڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھنے لگ جاتا جیسے وہاں کھڑے ہونے سے اس کا مقصد صرف چڑیا دیکھنا ہو۔ ارجمند آنکھیں بند کر کے بانسری بجانے لگتا۔ محلے کے سب لوگ انہیں گھورتے "ارے لڑکو یہاں کیا کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ رستہ نہ روکو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" یہ سن کر ایلی کو پسینہ آجاتا اور ارجمند چپکے سے جواب دیتا۔ "اچھا صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔ ذرا انتظار کر رہے ہیں بھائی صاحب کا"" ارجمند کو بات ٹالنے میں کمال حاصل تھا۔

جلیل اور رفیق کے علاوہ محلے میں ایک اور ٹولی تھی۔ اجمل' صفدر' اکرم' دین محمد اور غلام بخش کی ——— یہ ٹولی محلے کے جوانوں کی تھی۔ وہ جلیل اور رفیق سے بھی الگ تھلگ رہتے تھے۔ جوانوں کی اس ٹولی کے مشاغل تخلیئے میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ وہ منظر عام پر کوئی ایسی حرکت سرزد نہ کرتے تھے جس پر محلے والیوں کو ان پر نکتہ چینی کرنے کا موقعہ ملے چونکہ محلے والیوں کو جوانوں سے چڑ تھی۔ وہ چھوٹے بچوں سے پیار کرتیں لیکن جوں

جوں وہ بڑا ہوتا جاتا توں توں وہ ان کی نظروں میں کھٹکتا۔ حتیٰ کہ جوان ہو کر وہ مشکوک ہو جاتا اور اس کے ہر فعل پر محلہ والیاں چونک کر دیکھتیں اور چہ میگوئیاں کرتیں۔ اس ٹولی کا کوئی فرد جب باہر چوگان میں نکلتا تو محلے والیوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں جیسے وہ کوئی خطرناک ارادہ رکھتا ہو۔ محلے میں جوان ہونا جرم سمجھا جاتا تھا اور جوانوں کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے ان کا احتجاج دبا دبا رہتا اور ان کی بیشتر قوتیں بزرگوں کے خلاف احتجاج اور سازش کرنے میں صرف ہو جاتیں۔

اجمل دسویں جماعت پاس کر کے اب کالج میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی چھٹی پر محلے میں آجاتا تھا۔ اکرم' ارجمند کا بڑا بھائی تھا اور وہ اتنا لمبا تھا کہ بڑی ڈیوڑھی کے علاوہ کسی دروازے سے جھکے بغیر گزر نہ سکتا تھا۔ وہ شملے میں نوکر تھا اور کبھی کبھار چھٹی لے کر محلے میں آیا کرتا تھا۔ دین محمد کی علی پور میں دکان تھی اور وہ پتلا دبلا ہونے کے باوجود بڑا معزز بنا پھرتا۔

صفدر کو دیکھ کر تو ایلی بڑا مایوس ہوا تھا کیا یہ وہی صفدر تھا جو دلی میں پارسی لڑکی سے محبت کیا کرتا تھا اور صبح شام پارسی تھیٹر میں رہا کرتا تھا۔ وہ تو بالکل ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ جس میں ذرا بھی پارسی جھلک نہ تھی۔ بہرحال اس میں ایک خوبی ضروری تھی۔ جب وہ کوئی تھیٹر کی دھن گنگناتا تو اس کی آنکھوں میں عجیب بوندا باندی سی ہوتی گلابی گلابی بوندیوں کی پھورا پڑتی۔ اس کی چوڑی کلائی پر نیلے رنگ کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھدا تھا' جسے وہ اکثر دیکھتا اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا۔ اس کی طبیعت بہت رنگین تھی۔ رفیق کی طرح دبی دبی رنگینی نہیں بلکہ چھلکتی ہوئی رنگینی ابلتا ہوا جوش لیکن جسمانی طور پر اس پر جمود طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ غلام بخش کی آنکھیں اکثر چھتوں تلے کچھ ڈھونڈنے میں مصروف رہتیں اور اس کی چھاتی تنی رہتی۔

کبھی کبھار محلے کی ان تینوں ٹولیوں کا میل بھی ہو جایا کرتا۔ سب سے بڑی ٹولی یعنی محلے کے جوان محلے کے نوجوانوں کو بلاتے چلو بھئی آج کرکٹ کا کھیل رہے گا۔ محلے کے نوجوان محلے کے لڑکوں کو مطلع کر دیتے۔ کھیل کی خبر سن کر لڑکوں کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ گیند بلا اور وکٹیں اٹھا کر قصبے سے باہر تالاب والے میدان کو چل پڑتے۔ پھر جب وہ میدان میں وکٹیں گاڑ کر سنٹر ناپ کر تیار ہوتے تو محلے کے جوان آپہنچتے ان کے آتے ہی نوجوانوں کی حکومت کا دور ختم ہو جاتا۔ رفیق اپنا خوشبودار ریشمی رومال چپکے سے گردن سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیتا اور

ارجمند اپنا شوخ انداز ترک کر کے مودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ صفدر اور اکرام آکر ایک نظر میدان پر ڈالتے۔ صفدر ہاتھ میں گیند اٹھاتا اور قمیض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے ایک بار بازو پر کھدے ہوئے حروف کی طرف دیکھ کر سر جھٹکتا اور تھیٹر کی دھن گنگنانے لگتا۔ "حافظ خدا تمہار۔" اس وقت ایلی کی آنکھوں سے وہ میدان اوجھل ہو جاتا اور تھیٹر کے منظر پر ایک پارسی لڑکی آکھڑی ہوتی۔ "اے دلربا میں ہوں فدا۔" صفدر کے مضبوط بازو اس کی جانب بڑھتے اور وہ جھینپتی۔

"ایلی تم ادھر جاؤ شاپ کے پاس۔" ایلی چونک پڑتا۔ "سنا تم نے" اکرم گردن جھکائے چلاتا اور غلام بخش خاموش ہنسی ہنسنے لگتا۔ ایلی کو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ میدان میں کھڑا ہے۔ تھیٹر میں نہیں اور کھیل شروع ہونے والا ہے۔

آصفی لڑکے کرکٹ کھیلنے کے بہت شوقین تھے لڑکے تو محلے ہی میں گیند اور تختی سے کرکٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ مگر جوان اور نوجوان صرف میدان میں گیند بیٹ سے کھیلتے تھے۔ صفدر گیند پھینکنے کا بے حد شوقین تھا اکرم لمبا ہونے کی وجہ سے بہت زور سے ہٹ لگاتا تھا اور غلام بخش صرف گیند روکنے کا مشاق تھا۔ اکثر میچ بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ایلی کا کام صرف کھلاڑیوں کی چیزوں کی رکھوالی کرنا ہوتا تھا۔ بہر حال اسے میچ میں شامل ہونے سے بڑی دلچسپی تھی۔

بالا

ان دلچسپیوں کے علاوہ محلے میں ایک اور دلچسپی تھی اور وہ بالا تھا جو بذات خود ایک ٹولی تھا اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ اسے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بالا ایلی کا ہم عمر تھا اور اس مکان میں رہتا تھا جو ایلی کے مکان کے عین سامنے واقع تھا۔ صبح سویرے ہی بالا اٹھ کر اپنے بہت بڑے تخت پوش پر چیزیں سجانا شروع کر دیتا۔ یہ گرامو فون ہے یہ ریکارڈ ہیں۔ یہ منہ سے بجانے والا ہارمونیم ہے اور یہ تاش کی گڈیاں ایک دو تین۔

تخت پوش پر چیزیں سجانے کے بعد وہ ان کے درمیان بیٹھ جاتا اور پھر چیزوں کو بنانے سنوارنے اور ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ "یہ نیلم ہیں اور یہ زمرد' وہ اس ڈبیا میں ہونے چاہئیں۔" وہ آپ ہی اپ گنگناتا رہتا۔ "یہ۔ ہائیں۔ آج اس کا رنگ مدھم کیوں پڑ گیا۔ ہاں آج بدھ ہے نا' بدھ' تت تت تت بدھ کو پکھراج کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے

اور لعل کا نکھرتا ہے۔ لعل کہاں ہے۔ آؤ بھائی ایلی ہے۔ آجاؤ بھائی ایلی یہاں میرے سر آنکھوں پر۔ ہی ہی ہی میں دیکھ رہا تھا کہ لعل کہاں ہے۔ پکھراج یوں چمک رہا ہو گا یوں جیسے پالش کر رکھا ہو۔ یہ قیمتی پتھر حساب کے مطابق چمکتے اور پھیکے پڑتے ہیں۔ ہاں تو لعل کہاں ہے۔ ہی ہی ہی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ بیچارے بڑے اچھے ہیں۔ ہی ہی ہی ابھی مجھے ڈیوڑھی میں ملا تھا ایک کہنے لگا۔ نیچے کنوئیں کے پاس ایک دیگ نیلم اور پکھراج کی بھری ہے۔ وہ تو ہمیں پتہ ہے سبھی جانتے ہیں اور وہ روز ان دیگوں کو ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔ رات بھر آوازیں آتی رہتی ہیں وہ انہیں ادھر ادھر کرنے میں ساری رات' ساری رات چھن چھن ہوتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں روتے ہیں چیختے ہیں اچھا تاش کھیلو گے آؤ بھلا تمہیں جانکی بائی کا ریکارڈ سنائیں۔ بیاں موری مروڑی' ہی ہی بڑا اچھا ہے۔ ہائیں یہ گردا' گرد پڑ جائے تو ریکارڈ خراب ہو جاتے ہیں۔ تت تت تت' ہی ہی لو سنو۔"

ایلی بالے کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اسے یہ چیزیں کون دیتا تھا۔ وہ کون تھے جو اس کے گھر میں رہا کرتے تھے اور اسے تنگ کرتے تھے اور اسے بالکل تنگ نہ کرتے تھے اور کنوئیں والے کمرے کے نیچے کیا دبا ہوا تھا اور وہ دیگیں کس کی تھیں۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ بالے کا گھر آسیب زدہ ہے اس لئے کہ مائی عمدہ نے وہاں چلہ کاٹا تھا۔ اور جب وہ آخری رات اکیلی وہاں بیٹھی ہوئی تھی تو دو کٹے ہوئے بازو اس کے سامنے آگرے تھے اور پھر سارے کا سارا دھڑ دھم سے آگرا اور سر کھڑا ہو گیا اور پھر وہ بھاگی۔ ڈر کر بھاگی اور لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگی۔ اس کے پیچھے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ڈر کے مارے دروازے بند کر لئے۔ پھر عمدہ کی چیخیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی اور صبح عمدہ بے ہوش پڑی ملی اور اس کے گرد گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آصفی محلے میں کئی ایک مکانات اور مقامات کے متعلق ایسی ہی باتیں مشہور تھیں۔ چچی عظمت کے چوبارے کی کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی تھی اور اس میں سے بے موسم کے میوے گرتے تھے۔ شیخاں کی حویلی کی سب سے اوپر والی منزل سے رات بھر آوازیں آتی تھیں۔ حسن دین کی ڈیوڑھی میں کوئی بزرگ رہتا تھا وہاں ہر جمعرات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ ایلی کے گھر کا چوبارہ بھی آسیب زدہ تھا اور رحمت بی بی کے کوٹھے پر تو لوگوں نے آگ جلتی دیکھی تھی۔ محلے میں عمدہ کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی وظائف پڑھے تھے اور وہ چلہ پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے

تھے۔

محلہ والیاں

اس کے باوجود بچے آزادانہ ہر جگہ کھیلتے تھے اور محلے کی بوڑھی عورتیں انہیں گھورتی تھیں۔ "کھیل کود کا وقت ہونا چاہئے۔ ہر وقت اللہ مارا گیند بلا اور پھر ہر وقت چیخ پکار اور اس پلید گیند کے چھینٹے ان لڑکوں کو تو اللہ ہی سمجھے۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔" دوسری کھڑکی سے جھانکتی "ٹھیک ہے بہن کیا زمانہ آیا ہے۔ بڑے بات کریں تو یہ منہ چڑاتے ہیں۔" تیسری بولتی "اب تو زمانہ ہی بدل گیا نہ بڑے کا خوف نہ بوڑھے کا لحاظ۔" بچے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے اور وہ وہاں کھڑی گھنٹوں نئے زمانے پر لیکچر دیتی رہتیں اور چھپے ہوئے لڑکے ان کا منہ چڑاتے، "ہوں بڑی آئی ہیں!"

محلے کی بوڑھیاں محلے کے نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں پر آکاش بیل کی طرح چھائی ہوئی تھیں حتیٰ کہ محلے کے تمام مرد بھی ان سے دبتے تھے۔

بوڑھی چڑیل

لڑکے سب سے زیادہ ایلی کی دادی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہر بات پر انہیں ڈانٹتی تھی۔ ایک بار بات شروع کرتی تو پھر مسلسل لیکچر دیئے جاتی۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ اس کی آواز سن کر سب بھاگ لیتے تھے اور پھر کسی تنگ گلی میں چھپ کر اس کا منہ چڑاتے۔ نوجوان اسے چڑیل سمجھتے تھے۔ جوانوں میں صفدر کو تو اس کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ "مجھ سے تو بیر ہے اس بڑھیا کو خواہ مخواہ ہر بات میں میرا نام گھسیٹ لیتی ہے۔"

ایلی کی دادی کو محلے کے لڑکوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اس کی دیوار کے ساتھ گیند کھیلتے تھے۔ جس سے دیوار کمزور ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر صفدر کو اتنا غصہ آتا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر بڑے اہتمام اور محنت سے ——— پوٹاش کا ایک اتنا بڑا پٹاخہ تیار کرتا تاکہ تہوار کے دن دادی اماں کی دیوار پر مارے۔ پٹاخہ چھوٹتے ہی زناٹے کی آواز آتی اور دادی اماں کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ "اے ہے جوانوں کے سر پر تو بھوت سوار ہے۔ خون چڑھا ہوا ہے۔ یہ تو محلے کو تباہ کر کے رہیں گے۔"

دادی اماں کو چیختے سن کر صفدر کو عجیب سی روحانی مسرت حاصل ہوتی وہ اطمینان سے گانے لگتا۔ "اے دلربا میں ہوں جدا۔" ان تمام باتوں کے باوجود ایلی کو یقین نہ آیا کہ دادی اماں سخت مزاج ہیں حالانکہ جب بھی وہ گھر جاتا تو دادی دور سے اسے دیکھ کر برس پڑتی "بس تو بھی اب کہیں کا نہ رہا۔ ان محلے کے لڑکوں میں کھیل کر تو بھی بگڑ گیا۔" لیکن ایلی اس کی جھڑکیوں کی پروا نہ کرتا اور اس کے کندھوں پر سوار ہو جاتا اور وہ تنگ آکر کہتی: "کتنی دیر سے بیٹھی انتظار کر رہی ہوں کہ تو آئے تو مچھلی کھائے۔ صبح سے تیرے لئے پکا کر بیٹھی راہ تک رہی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ کڑاہی کا ڈھکنا اٹھاتی۔ کڑاہی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھری ہوتی۔ ایلی کو چھوٹی مچھلیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ کڑاہی اٹھا کر بھاگ جاتا اور دادی پھر سے اسے کوسنے لگتی اور چوری چوری منہ پر پلہ لے کر مسکاتی، بڑا شیطان ہو گیا ہے نکما کہیں کا۔

دادی اماں کے ساتھ ایلی کی پھوپھی زاد بہن سیدہ رہا کرتی تھی، جو ہر وقت دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور دادی اماں کے کام کیا کرتی تھی۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی حیران ہوتا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود دادی اماں کی طرح سر لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ شادی ہو جانے کے باوجود اپنے میاں کے پاس کیوں نہیں رہتی اور اس کی شکل اتنی غم آلود کیوں ہے اور اس کے میاں کہاں رہتے ہیں اور وہ وہاں آتے کیوں نہیں؟

سیدہ کو دیکھ کر ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔ لیکن اسے سیدہ سے یہ باتیں پوچھنے کی کبھی جرات نہ ہوتی تھی۔ ادھر اونچے چوبارے میں سیدہ کی بہن نیاز اپنے تینوں بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس کی حالت سیدہ سے بھی بدتر تھی۔ یا تو وہ چپ چاپ پڑی رہتی اور یا اٹھتی تو نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسی طرح رہتی تھیں جیسے پیپ سے بھرے پھوڑے ہوں جیسے ان کے دل دکھتے دکھتے پھوڑے بن چکے ہوں۔ اس کی اپنی ماں تو ان سب سے مختلف تھی۔ وہ دن بھر بیسیوں کام کیا کرتی تھی۔ کبھی کپڑے سیتی کبھی گوٹا لگاتی۔ کبھی بچوں کے لئے گڑیا بنانے لگتی۔ کبھی کسی دولہا کے لئے عروسی پگڑی تیار کرتی اور ایلی کو پتنگ اڑا کر بھی تو وہی دیتی تھی۔ ایلی کو پتنگ اڑانا نہیں آتا تھا۔ ہاجرہ اسے خود پتنگ بنا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں پر خود ہی جلد چڑھایا کرتی تھی۔ ہاجرہ کو دنیا بھر کے سب کام کرنے آتے تھے نہ جانے اس نے اتنے سارے کام کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔

طوفانا

ابھی وہ محلے کی زندگی سے پورے طور پر محفوظ نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز علی احمد اور صفیہ آ گئے۔ دادی اماں انہیں دیکھ کر چلائی "علی احمد تو"۔ "ہاں" انہوں نے لاپرواہی سے کہا "یہ بیمار ہے۔" ہاجرہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ "اللہ خیر کرے۔ کون بیمار ہے کہیں صفیہ تو——————"

صفیہ کے آنے پر سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔

"اے کیا ہوا صفیہ کو؟"

"لو خواہ مخواہ۔ اچھی بھلی تو ہے صفیہ۔"

"کیوں صفیہ کیا بات ہے۔ کون سی تکلیف ہو گئی تجھے؟"

صفیہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ پلنگ پر پڑی کھانستی رہتی تھی۔

"آرام آجائے گا۔ تو خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔"

ایلی نے صفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی مہندی بالکل اڑ چکی تھی۔ انگوٹھیاں اور بھی میلی ہو گئی تھیں۔ مگر اس کا جسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ماتھے پر شکن اسی طرح پڑی تھی۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ اسؔ کے قریب جاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ایک دم سے اس پر جھپٹ نہ پڑے۔— اگر وہ بیمار تھی تو اسکی تیوری کیوں چڑھی۔ بیمار تو گھورا نہیں کرتے۔ نہیں نہیں صفیہ بیمار نہیں اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اس کے باوجود صفیہ بیمار تھی اور لوگ روزانہ اس کی عیادت کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی اور چھت کی طرف دیکھتی رہتی۔ "اے ہے تو کس فکر میں پڑی ہے۔ لڑکی۔" محلہ والیاں اسے پیار سے گھورتیں۔ "انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا پرہیز کا خیال رکھ اور بس۔!"

لیکن ان باتوں کے باوجود صفیہ کا چھت کو گھورنا نہ گیا۔ سارا دن وہ چھت کو گھورتی رہتی اور ہاجرہ اس کی چارپائی کے گرد یوں گھومتی رہتی۔ جیسے ہاجرہ شہنشاہ بابر ہو اور صفیہ اس کا بیمار بیٹا ہمایوں۔

پھر شام کے وقت جب گرمی بڑھ جاتی تو ہاجرہ صفیہ کو سہارا دیتی اور وہ آہستہ آہستہ چلتی

ہوئی اسے کوٹھے پر لے جاتی تاکہ کھلی ہوا میں سو سکے۔ ایک رات جب وہ سب کوٹھے پر سو رہے تھے تو آندھی چلنے لگی۔ بوندا باندی ہونے لگی۔ ہاجرہ کا خیال تھا کہ جلد ہی آندھی تھم جائے گی‘ اس لئے وہ صفیہ کو اٹھا کر برساتی میں لے گئی تاکہ اسے نیچے گرمی میں تکلیف نہ ہو۔ یہ آندھی ایک عام آندھی تھی۔ آندھیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ چند ایک منٹ کے لئے تیز ہوا چلتی بادل گرجتا چھینٹے پڑتے اور پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ علی احمد سیدہ اور دادی اماں کے نیچے چلے جانے کے بعد وہ آندھی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ ہاجرہ گھبرا گئی۔ ہاجرہ کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مدد سے صفیہ کو نیچے لے جانا مشکل تھا۔ طوفان اور بھی تیز ہو تا گیا۔ ہوا مکانوں اور دکانوں سے ٹکرا ٹکرا کر یوں چیخنے لگی‘ جیسے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے۔ آسمان پر سیاہ رنگ کی گھٹا چھا گئی۔ بجلی کی کڑک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ ایلی اور فرحت جاگ پڑے۔ وہ دونوں ڈر کر رونے لگے۔ "اماں‘ اماں‘ اماں۔" ادھر مریضہ کراہ رہی تھی۔ برساتی میں دو کھلے محراب تھے‘ جن پر پٹ نہیں لگے ہوئے تھے۔ ان محرابوں میں ہوا چنگھاڑ رہی تھی۔ ہاجرہ نے چلّا چلّا کر علی احمد‘ دادی اماں اور سیدہ کو آوازیں دیں‘ لیکن طوفان کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز نچلی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ طوفان کی شدت کے ساتھ مریضہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ہاجرہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مریضہ کراہ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے چارپائیاں مریضہ کی گرد کھڑی کر دیں اور ایلی اور فرحت سے کہا کہ انہیں تھامے رکھیں مگر ہوا کے جھونکوں نے چارپائیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں بچے چارپائیوں کے ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ بچے ڈر کر چیخیں مارنے لگے۔ پھر دفعتاً ان کی نگاہ مریضہ پر جا پڑی۔ مریضہ دیوانوں کی طرح سر چلا رہی تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں۔ آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ دم اکھڑ رہا تھا۔ ہاجرہ گھبرا گئی۔ روتے ہوئے بچے سہم گئے۔ بادوباراں کے اس طوفان کی نسبت وہ طوفان جو مریضہ کے سینے اور آنکھوں میں چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا‘ کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ ان کی توجہ بیرونی طوفان سے ہٹ کر صفیہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ "میں جاتی ہوں۔ میں کسی کو بلاتی ہوں۔" ہاجرہ گھبرا کر چلائی۔ صفیہ کا سر انکار میں اور بھی شدت سے ہلنے لگا۔ پھر ایک ساعت کے لئے صفیہ کا سر تھم گیا۔ اس کی آنکھوں کی وہ بھیانک مردنی کم ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ صفیہ نے ہاجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ میں میں نے تیری قدر نہ کی۔ اس کی نگاہ میں بے بسی کی ایک عجیب جھلک تھی۔ چند ساعت کے لئے اس نے

اپنی نگاہیں ہاجرہ پر جمائے رکھیں پھر اس کی آنکھ سے ایک موٹا سا آنسو ڈھلک آیا اور گال پر
پھسل کر بالوں میں کھو گیا۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بازو گر کر لٹکنے لگا اور سر ہمیشہ کے
لئے ساکت ہو گیا۔ "اماں" ایلی نے چیخ ماری۔ ہاجرہ نے سر پیٹ لیا "صفیہ' صفیہ۔"

ایک فقیر

طوفان تھم چکا تھا۔ نیچے بڑے کمرے میں پلنگ پر صفیہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے گرد
محلہ والیاں بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ صفیہ کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کا جوڑا
صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایلی نے دو ایک بار صفیہ کی طرف دیکھا' اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا
جیسے وہ موت کا بہانہ کر کے پڑی ہو۔ جیسے ابھی جاگ اٹھے گی۔ کہے گی "ایلی بازار سے دودھ لا
دو۔ ہاجرہ تو میری بیماری کا بہانہ کر کے آرام سے بیٹھی ہے۔ چل اٹھ برتن صاف کر چل اٹھ۔"
لاش میں جنبش ہوئی۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ صفیہ کا جوڑا کھل کر لٹکنے لگا۔ محلہ والیوں نے با آواز
بلند کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ایلی چیخ مار کر بھاگا "دادی اماں' دادی اماں۔" دادی نے اسے تھام
لیا۔ "تو کیوں بیٹھا ہے۔ یہاں ادھر آ میں تجھے سلا دوں۔" دادی اماں نے اسے بازو سے کھینچتے
ہوئے کہا۔

صفیہ کی وفات پر ہاجرہ کئی دن تک روتی رہی۔ رہ رہ کر صفیہ کا وہ فقرہ یاد آتا تھا۔ "میں
نے تمہاری قدر نہ کی۔" اس وقت اس کی آنکھوں میں فخر بھری چمک لہراتی اور گالوں پر آنسو
بہنے لگتے۔ برسوں کی خدمت گزاری اور عشق کے بدلے اسے ایک فقرہ ملا تھا۔ "میں نے
تمہاری قدر نہ کی۔" ہاجرہ اس فقرے کو تمغے کی طرح سینے پر لگائے پھرتی تھی۔ اس ایک فقرے
کی وجہ سے برتری میں بدل گیا تھا۔ وہ اس ایک فقرے کی خاطر ایک بار پھر عمر بھر کسی خدمت
گزاری میں بسر کر سکتی تھی۔

صفیہ کی موت سے علی احمد کے گھر کے روز مرّہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ ایلی اسی طرح
ارجمند سے انگرائنڈی ماباؤں کی تفصیلات سمجھتا رہا اگرچہ عملی طور پر ان تفصیلات کا کوئی نتیجہ نہ
نہ ہوا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی درز سے وہ بکوری ڈکوری کے مختلف سائز دیکھتا رہا۔ محلے کے جوانوں
کے ساتھ کرکٹ کے میدان میں جاتا رہا جلیل اور رفیق کے ساتھ قاضی دروازے کے پاس
تنگ گلی میں جھاڑو دینے والی کی شوخیوں کو بغور دیکھتا اور دادی اماں کے ساتھ لیٹ کر سوتا رہا۔

ہاجرہ اسی طرح سارا دن باورچی خانے میں برتن مانجھتی۔ کھانا پکاتی اور علی احمد کی چلمیں
بھرتی رہی اور فرحت حسب معمول گھر کے کام کرنے کے علاوہ سہیلیوں کے گھروں کے چکر لگاتی
رہتی اور دادی اماں اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے چولہے کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے پاس
سیدہ خاموشی سے تنکوں سے زمین کریدتی رہی اور علی احمد وہی پھٹی ہوئی میلی دھوتی باندھے
ڈیسک کے رجسٹر میں لکھتے رہے اور محلہ کی چمگادڑیں رات کو احاطے پر چیخ چیخ کر منڈلاتی رہیں۔
بچے کھیلتے رہے۔ بوڑھیاں انہیں گھورتی رہیں اور محلے کے بوڑھے نماز ادا کرنے کے بعد کھانستے
ہوئے سر لٹکائے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور صفدر دادی اماں کی دیوار پر پھینکنے کے
لئے منجھل پوٹاش کے پٹاخے تیار کرتے ہوئے گنگناتا رہا۔ "حافظ خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں
فدا۔"

سارہ صبورہ

پھر ایک دن علی احمد کے یہاں مہمان آ گئے۔

"ہاں یہی مکان تو ہے۔"

"تم آگے چلی جاؤ۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اے ہے تمہارا اپنا محلہ ہے۔" چاچی حاجاں
کی آواز آئی۔

"کون آیا ہے۔ چاچی؟" ماں جیواں بولی۔

"اپنے علی احمد کے مہمان آئے ہیں۔"

"کون مہمان آئے ہیں۔ چاچی کن کے گھر آئے ہیں؟"

"مہمان آئے ہیں۔" دادی اماں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "دیکھ تو لڑکی کون مہمان آئے ہیں۔
شام کوٹ سے تو نہیں آئے۔"

"کون آیا ہے؟" علی احمد قلم ڈیسک پر رکھتے ہوئے بولے اور پھر حسب عادت جلدی سے
قمیض پہننے لگے۔ ہاجرہ باورچی خانے سے نکل کر چپ چاپ دروازے میں آ کھڑی ہوئی اس کی
آنکھیں ابھی سے پرنم ہو رہی تھیں کہ شاید مہمانوں کے آتے ہی صفیہ کی موت پر اظہار افسوس
کرنا پڑے۔ شاید وہ آئے ہی اسی غرض سے ہوں۔ ایلی سہم کر کھڑا ہو گیا۔ فرحت اپنا دوپٹہ
سنبھالنے لگی۔ سب سیڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سیڑھیوں سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی

آوازیں سنائی دیں۔ کوئی ہنس رہی تھی۔ جیسے سکول کی لڑکیاں ہنستی ہیں۔ ایک کہہ رہی تھی۔ "تم چلو آپا۔ چلو بھی نا۔" دوسری بولی "تو خواہ مخواہ جھینپتی ہے"۔ پھر کوئی سریلی آواز میں ہنس پڑی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

"اے ہے کون ہے؟" دادی اماں بولی۔ "آجاؤ نا اوپر۔"

"سلام کہتی ہوں۔" وہ دونوں دروازے میں آکھڑی ہوئیں۔ "فرحت کہاں ہے؟"

"ہائے۔" فرحت چلائی۔ "یہ تو سارا صبورہ ہیں۔" اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ "کون ہیں۔ دادی اماں؟" احاطے سے عورتوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔

"کون آیا ہے؟"

"لڑکیاں ہیں۔" دادی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ "اپنی فرحت سے ملنے آئی ہیں۔"

"اپنی ہی بچیاں ہیں اللہ عمر دراز کرے۔"

"بڑی دور سے آئی ہیں۔ خیر سے۔"

"ہاں چاچی سہیلیاں جو ہوئیں۔"

"اچھا کیا جو ملنے آگئیں۔"

"کیا نام ہیں لڑکیوں کے؟"

چند ایک ساعت میں محلہ بھر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ جیسے تالاب میں پتھر پھینکتے ہی چھوٹی چھوٹی لہریں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔

دیر تک محلے میں وہ لہریں ناچتی رہیں پھر سکون طاری ہو گیا۔ لیکن علی احمد کے گھر میں ایک دبا دبا طوفان ابھر رہا تھا۔ ادھر بڑے کمرے میں ہاجرہ' فرحت' سارہ' صبورہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے سے ہلکے لطیف قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایسے رنگین قہقہے جو محلے کے کسی گھر سے کبھی سنائی نہ دیئے تھے۔ باہر دادی اماں چولہے پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کے پاس سیدہ سرہاتھوں میں تھامے تیل سے بھری کڑاہی کو حسرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اندر علی احمد قمیص پہنے بار بار چور نگاہوں سے جھانکتے اور پھر حقے کے کش لینا شروع کر دیتے اور کھانستے۔ پھر وہ ایک دم اضطراب سے آواز دیتے "ایلی کی ماں حقہ بھر دو۔" پھر قلم اٹھا کر لکھنے کی کوشش کرتے اور پھر کھانسنے لگتے۔ "ایلی کی ماں کون آئی ہیں؟ لڑکیاں ہیں۔ اچھا تو دوراہے سے آئی ہیں۔ دوراہے میں یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟ پھاٹک والے محلے میں۔ اچھا وہ جو سبز کھڑکیوں

والا مکان تھا وہاں ——— ہوں تو اپنے قاضی اظہر حسین کی بیٹیاں ہیں۔ لو تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ وہ تو بالکل اپنے ہی ہیں۔ ہی ہی ہی۔ جب ہم دوراہے دورے پر جایا کرتے تھے تو قاضی اظہر ہی کے گھر رہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے تعلقات تھے قاضی جی سے ہی ہی ہی ہی۔" ان کی باتوں کے دوران دادی اماں ان کی قمیض کو گھور گھور کر دیکھتی اور موہوم آہیں بھرتی۔ ایلی بھی ان کی قمیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے آنے پر وہ قمیص ضرور پہنا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی مطمئن ہو کر اتار بھی دیتے تھے اور پھر اپنے کام میں لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے سارہ صبورہ کے آنے پر انہوں نے قمیض اتاری کیوں نہ تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ چلم اٹھائے خود باہر چولہے کی طرف آ رہے تھے۔ وہ تو چلم بھرنے کیلئے ایلی یا کسی اور کو آواز دیا کرتے تھے۔

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے اور با آواز بلند بولے "اپنے قاضی اظہر کی بیٹیاں ہیں۔ ایک مرتبہ ہم قاضی صاحب سے ملنے گئے۔ ہی ہی ہی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کمرے کی طرف چل دیئے جس میں لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ "وہ سبز کھڑکیوں والا مکان تھا نا پھاٹک محلے میں۔" وہ اندر گھس گئے۔ "اچھا تو تم بڑی لڑکی ہو ان کی۔ ہی ہی ہی۔ سارہ ہو۔ تم فرحت کی ہم جماعت ہو۔ اور یہ صبورہ ہے۔ ہی ہی ہی۔"

باہر چولہے کے پاس دادی اماں چمٹے سے زمین کرید رہی تھی اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کی آنکھوں میں چمک لہرا رہی تھی اور وہ حسرت ناک نگاہوں سے تیل کی کڑاہی کو گھورنے کی بجائے غور سے اس تنکے کا جائزہ لے رہی تھی جو چولہے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کان سے دوپٹہ سرکائے جا رہی تھی۔

"ہی ہی ہی۔ آؤ نا۔ ادھر۔ اس طرف۔ اس کمرے میں' اچھا تو قاضی صاحب کا اب کیا حال ہے؟ ایلی بھئی بھاگ کر جا اور لے آ کچھ بوتلیں اور کچھ ——— ادھر آؤ نا سارہ ——— انہیں لے آؤ نا ایلی کی ماں ——— ہی ہی ہی۔ بہت ہی بھلے آدمی تھے ان کے ابا۔ ہمارے دوست تھے۔ ہی ہی ہی۔"

ہاجرہ مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کا اضطراب تھا اور فرحت کے ماتھے پر بل پڑ رہے تھے۔ علی احمد کی مسلسل ہی ہی ہی کی آواز آ رہی تھی۔ دادی کا ہاتھ کانپے چلا جا رہا تھا اور سیدہ کا کان بالکل ننگا ہو چکا تھا۔

شام کو ارحمند نے آواز دی ــــــــــــــــــ "آیا" ایلی چلّایا۔ لیکن نہ جانے کیوں ارحمند ایلی کا انتظار کرنے کے بجائے چپ چاپ اوپر آگیا۔ حالانکہ وہ عام طور پر ایلی کے گھر آنے سے گریز کیا کرتا تھا "دادی اماں سلام ایلی گھر ہے کیا؟" اس نے چوری چوری دالان کی طرف دیکھا جہاں سارہ اور صبورہ بیٹھی تھیں اور پھر دروازے سے باہر اس مقام پر کھڑا ہو گیا' جہاں دالان میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے جیب سے ریشمیں رومال نکالا اور اسے گردن پر پھیرنے لگا پھر وہ ایک انداز سے کھڑا ہو گیا۔ "بیٹھ جا۔" دادی اماں بولی "نہیں دادی اماں میں ٹھیک ہوں۔" ارحمند نے چوری چوری کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر آواز نکالے بغیر کوئی شعر گنگنانے لگا۔ ایلی سامنے حیران کھڑا تھا۔ کیونکہ ارحمند جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو ایلی دیکھتا رہا پھر چپکے سے اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اسے یوں قریب دیکھ کر ارحمند بولا "ایلی وہ کتاب تمہارے پاس ہے نا؟"

"کونسی کیسی کتاب؟" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی وہی۔" وہ با آواز بلند بولا۔" جو ماسٹر صاحب کل پڑھا رہے تھے کیا نام ہے اس کا۔" وہ پھر دبی دبی آواز میں ایلی سے کہنے لگا۔ واہ وا کیا چیزیں ہیں۔ کیا ہکوری ڈکوری ہیں۔ ہاں بھئی تو وہ کتاب ہے جس میں سے آج سوال کرنے ہیں۔" وہ پھر دادی اماں کو سنانے کے لئے چلایا۔ "بڑا والا نہیں چھوٹا والا ایڈیشن وہ گلابی گلابی سی۔" اس نے اندر دالان کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا چیز ہے واہ" ــــــــــــــــــ ایلی کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ دادی اماں ارحمند کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمیں رومال کو گھور رہی تھی۔ دفعتاً" اس نے دادی اماں کی کڑی نگاہوں کو محسوس کیا۔ "اچھا۔" وہ بولا "ذرا ہمارے گھر آؤ نا ایلی۔ وہ چھوٹی گلابی گلابی۔ چھوٹا والا ایڈیشن ۔ آؤ گے نا۔" اس نے اندر دالان کی طرف دیکھا۔ "میں انتظار کروں گا۔ ہائے کیا چیز ہے۔" اور وہ چلا گیا۔

ارحمند کے جانے کے بعد رفیق آگیا اس کی نگاہیں یوں مطمئن تھیں' جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ "پھوپھی کہاں ہے؟" اس نے زیرِ لب کہا "شاید ادھر ہو۔" وہ اپنے آپ ہی بولا اور دالان میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ ٹھٹھکا "اوہ۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔" اس نے گویا دیوار سے مخاطب ہو کر معذرت کی اور واپس جانے لگا۔ "رفیق ہے۔" ہاجرہ نے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ ایک سرسری مگر بھیگی نظر سارہ اور صبورہ پر ڈالی ایک ہلکی سی آہ بھری۔ "وہ کہا تھا نا پھوپھی جی نے سودا لانا ہے تو میں آگیا۔ خیر خیر!" اس کی آنکھوں میں گلابی چھینٹے اڑ رہے تھے۔

ہائے اللہ

ہی ہی ہی۔ اندر علی احمد ہنس رہے تھے۔ "وہ بات بتانا تو میں بھول ہی گیا جب۔" کہتے ہوئے وہ چلم اٹھائے چلے آئے اور چولہے کے قریب جانے کی بجائے سیدھے دالان میں گھس گئے۔ "ہی ہی ہی جب ہم سب قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ ہی ہی ہی ادھر آؤ نا سارہ صبورہ تمہیں بات سنائیں۔ اس کمرے میں آؤ نا۔ تم شرماتی کیوں ہو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ ہی ہی ہی۔ قاضی صاحب کے گھر کو تو ہم اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ تم کیوں شرماتی ہو۔ آجاؤ آجاؤ"۔

وہ کھڑے ہنسے جا رہے تھے دادی اماں کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کا ڈوپٹہ کان سے گرتا جا رہا تھا۔

"بھئی فرحت یہ تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آئیں گی۔ ٹھیک تو ہے۔ بھئی یہ آداب طور طریقہ کیسے چھوڑیں۔ جب تک میزبان خود نہ کہے کیسے آئیں اور بھئی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں فرحت یہی بات ہے نا ہی ہی ہی۔ آخر بڑے گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ بہت بڑا گھرانا ہے ان کا' کون نہیں جانتا ان کے گھرانے کو دور اہے میں۔ اچھا تو فرحت تم انہیں ساتھ لے آؤ۔ ادھر ہی ہی۔" وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رات پڑ چکی تھی۔ لیکن ہاجرہ ابھی باورچی خانے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ علی احمد کھانا کھا لیں تو وہ فارغ ہو۔ صبورہ فرحت کے ساتھ گپیں مارنے میں مشغول تھی۔ دادی اماں جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ سیدہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ ایلی دادی اماں کی چارپائی پر اوندھا پڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ علی احمد اپنے کمرے میں سارہ کو وہ قصہ سنا رہے تھے' جب وہ قاضی صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

"ہی ہی ہی اور قاضی صاحب نے سمجھا۔ یہاں قریب ہو کر سنو نا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہی ہی ہی اندھیرے میں نہ جانے کون ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہاتھ چلانے شروع کر دیئے یوں۔ یوں ہی ہی ہی۔" ہلکی سی باریک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ "ہی ہی ہی۔" علی احمد بے تحاشا ہنسے چلے جا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں نہ جانے کیا گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ جیسے واقعی قاضی صاحب پکڑ دھکڑ کر

رہے ہوں۔ ہنسی کی ہلکی آواز آئی پھر بند ہو گئی۔ "ہی ہی ہی۔" بھاری آواز بھی بند ہو گئی۔ ب
دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دفعتاً" ہائے اللہ کی آواز آئی اور پھر علی احمد کے کمرے پر موت
سی خاموشی چھا گئی۔

جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے مانگتے دادی اماں کے ہاتھ لرزے جیسے دفعتاً" اسے ر
کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ دھپ سے سجدے میں گر گئی۔ سیدہ نے آہ بھر کر رضائی منہ پر لے لی
مشین پر کپڑا سیتے سیتے ہاجرہ کا ہاتھ کانپا اور دستہ مشین کی چرخی سے باہر نکل آیا اور ہاجرہ
پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحت نے ماں کی طرف دیکھا اس
رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن صبورہ اسی طرح خوشی سے چلاتی رہی ہنستی رہی پھر دفعتاً" اس نے محسو
کیا۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو اور وہ خاموش ہو گئی۔

ایلی نے سر اٹھایا۔ چاروں طرف گھبرا کر دیکھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت کچھ ہو
تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔

کچھ بھی تو نہیں

چواؤں۔ ٹھک علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ تمام گھر پر بھیانک سکوت طار
تھا۔ موت کا سکوت' موت! ایلی کانپ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صفیہ آ گئی۔ جیسے وہ ا
روز چارپائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ علی احمد کے ساتھ سارہ کمرے م
اسی طرح سر پٹک رہی تھی۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ آنکھیں پتھرائے جا رہی تھیں۔
کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ دادی اماں اچک کر اس کے پاس آ گئی۔ "کیا ہے دادی اماں"
وہ زیر لب گنگنایا۔ "کچھ نہیں ایلی۔" دادی اماں نے کہا "کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا تو۔" اور
اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔

اگلے روز جب ایلی بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر پر وہی بھیانک خاموشی چھا
ہوئی ہے۔ اس صبح وہ تمام دنیا کے خلاف غصہ محسوس کر رہا تھا وہ کمرہ غلاظت سے بھرا تھا۔ وہ
، وہ محلہ وہ شہر سب گندگی سے بھرے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ محلے والے سبھی اندھے ہ
اندھے اور اپاہج۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر وہ محلہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں غلاظت
ہو جہاں گندگی نہ ہو جہاں بھیانک خاموشی نہ چھائی ہو۔ اس کی نگاہ دادی اماں پر جا پڑی جو

چاپ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ دادی اماں پر غصہ محسوس کیا۔ کیا وہ گھٹنوں میں سر دینے اور سجدے کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے محلے کے لڑکوں کے خلاف تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب صفدر اس کے مکان کی دیوار پر پٹاخہ چلاتا تو اس وقت وہ کیوں چیختی تھی۔ اے ہے مکان کی دیواریں ہل گئی ہیں"۔ اب کیا مکان کی دیواریں نہیں ہل رہی تھیں۔ پھر وہ یوں چپ کیوں بیٹھی تھی اور فرحت کے پاس بیٹھی ہوئی وہ بھیگی بلی سارہ جھکی جھکی نگاہوں سے گھر والوں کو ٹٹول رہی تھی۔ اور صبورہ یوں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ایلی نے پہلی مرتبہ سارہ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ بھیگی بلی کیسی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسے واضح طور پر معلوم نہ تھا کہ وہ اسے بری کیوں لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بری لگ رہی تھی۔

ادھر سے ابا کے حقے کی گڑگڑاہٹ سن کر اس نے منہ بنایا۔ بڑے علی احمد بنے پھرتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ فضول دانت نکالتے رہنا۔ باہر دادی اماں بیٹھی بار بار دالان کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی۔ اور سیدہ چپ چاپ بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ ہاجرہ تو خیر برتن دھونے کے سوا کچھ کر ہی نہ سکتی تھی۔ ایلی دل ہی دل میں بل کھاتا رہا اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں بل کھا رہا ہے۔

پھر گھر میں یہ دستور ہو گیا علی احمد سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اگرچہ دن میں چار ایک مرتبہ خود حقہ کی چلم اٹھا کر دالان کی طرف چلے آتے حالانکہ انہوں نے کبھی خود چلم نہ بھری تھی اور پھر ہاجرہ کے کمرے میں جھانکتے۔ "ہی ہی کیا ہو رہا ہے۔ بھئی۔"

سارہ صبورہ "گپیں چل رہی ہیں۔ خوب خوب۔ صبورہ کو گپیں بڑی پسند ہیں۔"

دن میں دو ایک بار ارجمند آ جاتا۔ "ایلی' ایلی بھئی وہ سوال چھٹی مشق کا پندرواں سوال وہ کیسے ہو گا۔ اپن سے تو نہیں ہوتا۔ بھئی واہ آج تو صندلی پیراہن' زیب تن ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ چاہ غب غب صندلی پیراہن پر کیا بہار دیتا ہے۔"

رفیق آکر پوچھتا "پھوپھی آج مچھلی بہت سستی بک رہی ہے' کیا خریدو گی؟" اور چھپ چھپ کر اندر جھانکتا آہیں بھرتا۔

رات پڑتی کو علی احمد آتے۔ "ہی ہی صبورہ سو گئی کیا ابھی نہیں سوئی ———— یہی عمر تو ہے گپیں ہانکنے کی ہی ہی ہی اور سارہ۔ سارہ تو دیر تک

جاگنے کی عادی ہے۔ کیوں سارا۔ اچھا بھئی"۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آتے۔ اور پھر دالان سے آواز دیتے "فرحت کی ماں صبورہ سو جائے تو مجھے آج کا حساب لکھوا دینا۔ اور۔ اور۔" اور وہ عجیب انداز سے ہنسنے لگتے۔

اس پر ہاجرہ کہتی "ہائے لڑکیو اتنی دیر ہو گئی ہے اب سو جاؤ۔" اور فرحت فوراً لیٹ کر کہتی۔ "بھئی ہم تو اب سوتے ہیں۔ نیند آ گئی۔ آؤ صبورہ تم بھی جاؤ۔" اور وہ زبردستی صبورہ کو لٹا لیتی اور پھر آنکھیں بند کر کے یوں پڑ جاتی جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہوئی ہو۔

سارہ چپ چاپ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیٹتی نہ تھی۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہتی۔ اس پر ہاجرہ محسوس کرتی۔ جیسے کمرے میں گھٹن پھیل رہی ہو اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر کوئی بات چھیڑنے کی کوشش کرتی مگر سارہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

پھر جب صبورہ سو جاتی تو علی احمد کی آواز آتی "فرحت کی ماں۔ فرحت کی ماں آج کا حساب تو لکھوا دو آکر۔ صبورہ سو گئی ہے نا۔"

علی احمد کی آواز سن کر دادی اماں کا سر ہلنے لگتا اور وہ رکوع کے بغیر ہی سجدے میں گر جاتی۔ ادھر سارہ کنکھیوں سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی۔ ہاجرہ اٹھ بیٹھتی اور سارہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑتی۔ جب وہ صحن سے گزرتیں تو سیدہ اپنا منہ رضائی میں لپیٹ لیتی۔ ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا لیکن دادی اماں نماز پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے تھپکنے لگتی۔ پھر کچھ دیر کے بعد ہاجرہ ان کے کمرے میں جھانکتی۔ "سو گیا؟" ایلی کو جاگتے دیکھ کر گھبرا کر بات بدل لیتی اور ہاجرہ کے جانے کے بعد گھر پر ہنگامہ خیز سکوت چھا جاتا۔

پھر ایک رات جب صبورہ اور فرحت حسب معمول باتیں کرتے کرتے لیٹ گئی تھیں اور سارہ دوپٹہ اوڑھے یوں صبورہ کی چارپائی کے کونے پر بیٹھی تھی۔ جیسے اسے ابھی اٹھ کر کہیں جانا ہو اور ہاجرہ منتظر کھڑی تھی کہ کب آواز پڑے اور وہ سارہ کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے فارغ ہو جائے کہ دفعتاً علی احمد کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بالکل ہی بدلی ہوئی ہو۔ "صبورہ جاگ رہی ہے۔" انہوں نے سرتال میں کہا۔

صبورہ! ہاجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی عنفوان شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔

صبورہ! سیدہ کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے دفعتاً بینائی سے محروم ہو گئی ہوں۔

دادی اماں نے صبورہ کا نام سنا تو اس نے پہلی ہی رکعت میں سلام پھیر دیا۔

"کس نے بلایا ہے مجھے؟" صبورہ اٹھ بیٹھی "مجھے بلایا ہے مجھے؟ چچا نے بلایا ہے۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی "مجھے بلایا ہے۔ مجھے۔" اور وہ شور مچاتی چلاتی ہوئی بولتی "آ تو رہی ہوں میں۔" اور پھر آپ ہی آپ علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ دیکھ کر سارہ بیٹھی بیٹھی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے کوئی گٹھڑی گر کر اوندھی ہو گئی ہو اور فرحت نے منہ موڑ کر اوپر کمبل لے لیا اور ہاجرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

چراؤں ٹھک دروازہ بند ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ایلی نے دانت پیس کر رضائی پر گھونسہ مارا۔ اس روز دادی اماں اسے تھپکنا بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ کہا "سو جا ایلی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

لو لیٹر

اگلے روز ایلی ارجمند کے گھر بیٹھا تھا اور ارجمند اسے سمجھا رہا تھا "بڑی والی کو نہیں چھوٹی والی کو۔ وہ جو گلابی گلابی سی ہے۔" "اچھا" ایلی نے سمجھے بغیر کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ارجمند نے زیر لب کہا "سب بڑی والیاں بے کار ہوتی ہیں۔ ان سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے انہیں لو لیٹر نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھو بھی تو بیکار ہے' پوچھو کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل دھک دھک نہیں کر سکتا اور دل دھک دھک نہ کرے تو پھر عشق کیونکر ہو سکتا ہے۔ سمجھے کیا سمجھے۔ تو جان من لو لیٹر چھوٹی والی کو لکھا جائے ہکوری ڈکوری کو۔"

"لو لیٹر۔" ایلی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ہاں۔" ارجمند چلایا۔ "بالکل موزوں ہے عمر اس کی لو لیٹر کے لئے اور اگر ہم نے لو لیٹر نہ لکھا تو وہ خفا ہو جائے گی کہ لو لیٹر بھی نہ لکھا مجھے بڑے عاشق بنے پھرتے تھے اور اس کا دل دکھے گا۔ سمجھے۔"

لیکن ایلی گھبرا رہا تھا۔ "اگر اس نے علی احمد سے کہہ دیا تو۔" "انہوں" ارجمند بولا "تم انہیں نہیں جانتے۔" ارجمند اسے سمجھانے لگا۔ "انکرا اینڈی ماباؤں لو لیٹر کے سہارے جیتی ہیں جب تک لو لیٹر نہ پڑھ لیں طبیعت کو چین نہیں پڑتا تازہ موصول نہ ہو تو پرانے پڑھ پڑھ کر وقت

کاٹتی ہیں۔ ان کے ٹرنک لو لیٹروں سے بھرے ہوتے ہیں اور چاہے کوئی لکھ دے انہیں۔ پڑھتی ضرور ہیں اور پھر کیا مجال جو کسی کو بتائیں۔ انہوں بالکل نہیں بتاتیں۔"

"بالکل نہیں۔"

"انہیں کیا ضرورت ہے۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر کیا۔ پھر پھڑ اڑ اور ایک لو لیٹر۔" ارجمند بولا۔

"اچھا۔" ایلی نے تھوک نگلنے کی بے کار کوشش کی۔ "کس چیز سے لکھیں۔ میں بتاؤں آنسوؤں سے لکھیں۔"

"مگر آنسو آئیں گے کہاں سے۔ ہم تو بھئی ہنسنے کے قائل ہیں۔ رونے کے نہیں۔ البتہ خون سے لکھنا آسان رہے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"پن چبھولیں گے کیا؟"

"تکلیف نہ ہو گی کیا؟"

"واہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے لڑکیاں خون پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے سیاہی سے لکھ دو۔"

"اچھا لیکن لکھیں کیا؟" ایلی نے پوچھا "یہ مسئلہ تو چٹکی بجانے میں حل ہو جائے گا ہاں۔" ارجمند نے کہا "یہ اتنے پریم شاستر پڑے ہیں۔ ان میں سے چن لو۔" ارجمند نے کشمیری بازار کی چھپی ہوئی چار ورقی کتابوں کا ایلی کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

سارا دن وہ خط کا مضمون چھانٹتے رہے۔ آخر شام کے چار بجے کے قریب خط مکمل ہو گیا۔ اس میں زیادہ تر شعر لکھے ہوئے تھے۔ "مائی ڈیری لکھوں، میری جان لکھوں یا دلربا لکھوں۔ اے جان من میں تم کو القاب کیا لکھوں۔" یہ شعر تو القاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ نفس مضمون کا شعر یہ تھا "اس حسن ترے کی بیوٹی نے مرے جینٹل ہارٹ کو توڑ دیا۔ جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا نائٹ سلیپنگ چھوڑ دیا۔" اس شعر کے چناؤ میں بڑی لے دے ہوئی تھی مگر ارجمند نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ شعر نہ لکھا گیا تو لیٹر ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ سکول کی لڑکیاں صرف انہی شعروں کو پسند کرتی ہیں۔ جن میں انگریزی کی چاشنی ہو ورنہ وہ اپنا لو لیٹر

کسی سہیلی کو بھی نہیں دکھا سکتیں کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اسے کسی گنوار نے لو لیٹر لکھا ہے۔

ارجمند کی بات معقول تھی اور نہ بھی ہوتی تو بھی ایلی لکھنے پر مجبور تھا کیونکہ اسے تو لو لیٹر کے متعلق علم ہی نہ تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ لو لیٹر لکھنے سے ہو گا کیا۔ شام تک لو لیٹر تو مکمل ہو گیا لیکن اسے صبورہ تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی قمیض کی وہ جیب جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں اس نے لو لیٹر اس کی جیب میں ڈال دینا اور جیب میں نہ ڈال سکو تو اسے دور سے دکھانا۔ دیکھ کر وہ بے قرار ہو جائے گی اور خود ہی منت کر کے مانگ لے گی۔

دوسری تجویز تو ایلی کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی دکھانا بڑی جرأت کا کام تھا۔ البتہ چوری چوری اس کی جیب میں رکھنا شاید ممکن ہو۔ لیکن دقت یہ تھی کہ اس کی قمیض میں جیب نہ تھی۔ عجیب قمیض پہنتی تھی۔ وہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی قمیض شروع سے لے کر آخر تک انوکھی تھی۔ جابجا چٹیں پڑی ہوئی تھیں کہیں کھلی کہیں تنگ کہیں کچھ کہیں کچھ ایسی قمیض تو محلہ بھر میں کسی کی نہ تھی۔

پھر جب دونوں بہنیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو دفعتاً اسے لو لیٹر کا خیال آیا اور پسینہ آگیا۔ دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اس نے وہ رقعہ اس کے جوتے میں ڈال دیا۔ جلدی میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جوتا کس کا تھا۔ سارہ کا یا صبورا کا۔

اگلے دن وہ علی احمد کے روبرو سر لٹکائے کھڑا تھا۔ "بول" وہ کہہ رہے تھے "سچ سچ بتا دے۔" اور سارہ ان کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی "بتا" وہ گرج رہے تھے "ہوں تو تمہیں نے شرارت کی ہے شرم نہیں آتی۔"

"شرم نہیں آتی شرم نہیں آتی"۔ چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ غصے بھری آوازیں، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دیوانہ وار چلانے لگے۔ شرم نہیں آتی اور علی احمد کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے شرم نہیں آتی۔ ہی ہی ہی اور باہر نکل جائے اس مکان سے دور۔ اس شہر سے دور۔

"دفع ہو جاؤ ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" علی احمد گرجے اور ایلی چپ چاپ آ کر چارپائی پر پڑ گیا۔

تمام گھر میں چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔

ہی ہی ہی۔ شرم نہیں آتی۔

قاضی صاحب تو سمجھ لو ہمارے بھائی تھے۔ ذرا قریب ہو جاؤ نا۔ شرم نہیں آتی۔

شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔ محلے کے کوے چلا رہے تھے۔

چراؤں، ٹھک، علی احمد کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کراہ رہا تھا شرم نہیں آتی۔

غصے میں بھنا کر ایلی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سوجھا ہوا تھا۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ "شرم نہیں آتی۔" وہ بہ آواز بلند چلایا لیکن گھیں گھیں کے علاوہ اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بے بسی اور لاچاری کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

بیداریاں

بام آباد

چھٹی ختم ہونے پر علی احمد کا تبادلہ بام آباد ہو گیا' لیکن علی احمد تن تنہا بام آباد جانے کے لئے تیار نہ تھے۔

علی احمد تنہائی سے ڈرتے تھے شاید وہ اپنے آپ سے خائف تھے وہ کمرے میں اکیلے سو نہ سکتے تھے۔ اگر سوتے میں ان کے کمرے سے لوگ چپ چاپ نکل آتے تو جونہی آخری آدمی باہر نکلتا' وہ گھبرا کر جاگ اٹھتے۔ اسی وجہ سے ان کا کسی کمرے یا مکان میں اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ تنہائی کے علاوہ خاموشی بھی ان پر گراں گزرتی تھی۔ رات کے وقت اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسی چھائی ہوئی خاموشی سے ڈر کر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے تاکہ اپنی آواز کا سہارا لیں یا وہ اپنی بیوی کو پکارتے اور یا حقہ بھر کر اس کی گڑگڑ سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

لہٰذا بام آباد تنہا جانا کیسے ممکن تھا۔ ایلی کی ماں ان کے ساتھ جانے کی خواہشمند نہ تھی وہ جانتی تھی کہ اسے ساتھ لے جانے سے علی احمد کا مقصد صرف یہی تھا کہ اپنا کمرہ آباد رکھنے کے لئے گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا بہانہ قائم ہے۔

اس روز علی احمد دادی اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دادی اماں کہہ رہی تھیں "اے ہے۔ لڑکی اگر تو ساتھ چلی جائے تو کم از کم علی احمد کو روٹی کی تکلیف تو نہ ہو گی۔" اور دروازے سے لگی ہوئی ہاجرہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"اللہ رکھے تیرے بال بچے ہیں تو ہی تو اس گھر کی مالکہ ہے تو ساتھ جائے گی تو ہی گھر بسے گا نا۔"

"نہ میں نہیں بنتی مالکہ اس گھر کی"۔ ہاجرہ نے ہچکی لے کر کہا۔ "بہت چاکری کر دیکھی ہے۔"

دادی بولی۔ "آخر تو نہ جائے گی تو گزارہ کیسے ہو گا۔" "ہاجرہ نے کہا۔ میرے بغیر انہیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔"

"چل چھوڑ اب۔" دادی اماں بولی۔

پھر نہ جانے کیسے چند ہی منٹوں میں محلہ والیاں آپہنچیں جیسے انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام بنا رکھا ہو۔

"اے ہے کیوں نہ جائے گی تو" چاچی حاجاں ہاتھ چلا کر بولی "اللہ رکھے تو اس گھر کی مالک ہے۔"

"لو یہ سنو۔" ماں جیواں نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اللہ عمر دراز کرے تیرے بچوں کی تو نہ جائے گی اپنے گھر تو ہو گا کیا۔"

"تو ان آنے جانے والیوں کی کیا پروا کرتی ہے آتی ہیں تو آجائیں۔ آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ ان کل مونہیوں کا کیا ہے جی۔ گھر تو تیرا ہی ہے نا۔ اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کے لئے تجھے ضرور جانا چاہیے۔"

محلے کی بوڑھیاں ہاجرہ کے گرد چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں۔ ان کی چیخیں سن کر ایلی نے محسوس کیا کہ بام پور کا طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ پہلے تو ہاجرہ نے جلی کٹی سنانے کی کوشش کی پھر اس نے ہچکیوں سے احتجاج کیا اور بالآخر خاموش ہو گئی اور اس کی خاموشی پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

"ہاجرہ جائے گی، ہاجرہ جائے گی۔"

"اے ہے کیوں نہ جائے اپنے گھر۔"

"ہی ہی ہی۔" علی احمد ہنسنے لگے "تو سامان باندھ دو نا اس کا۔" اور سامان باندھا جانے لگا اور دو روز میں وہ سب بام آباد جا پہنچے۔

بام آباد ایک نیا شہر تھا۔ لیکن جب ایلی نے اسے دیکھا تو اس میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہ دیا۔ ایلی کا خیال تھا کہ نیا شہر بھی ویسا ہی ہو گا جیسے نیا گھر ہوتا ہے لیکن اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ نیا شہر نئے گھر سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

بام آباد ایک ویرانہ تھا، وسیع ویرانہ۔ اس کی سڑکیں بے تحاشہ چوڑی تھیں کہ سڑک پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پختہ سڑکیں تو در حقیقت بہت چھوٹی تھیں مگر ان کے ارد گرد بہت ساری زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانوں کی جگہ جھونپڑیاں بنی تھیں۔ جن میں عجیب سی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کے درمیان دو چوک آتے تھے۔ وہ چوک اتنے وسیع تھے کہ ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے ایلی تھک جایا کرتا۔ علی پور کا آصفی محلہ اس ایک چوک میں سما سکتا تھا۔ سڑک ختم ہوتے ہی ویرانہ شروع ہو جاتا پھر ہسپتال کی عمارت آتی جس پر ہر وقت موت کا سا سکوت طاری رہتا۔ دائیں طرف ہائی سکول کی عمارت تھی۔ ایک بہت بڑی پختہ اور خوبصورت عمارت شکل و صورت میں وہ انگریزی کے حرف ای (E) سے ملتی تھی۔ بڑی عمارت سے ہٹ کر کچے کمروں کی ایک لمبی قطار تھی اور اس سے مغرب کی طرف ایک مربع بلڈنگ تھی جس کے سامنے بہت بڑا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ یہ سکول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

سکول کے ارد گرد وسیع میدان تھے۔ جن میں ریت اڑتی تھی۔ ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ سکول سے پرے یہاں وہاں کھجور کے درخت لگے ہوتے تھے اور سڑک پر اونٹوں کے قافلے آتے جاتے رہتے تھے۔

سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھڑی میں مائی رفیقاں اور اس کا بیٹا گلاں رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے، جن کا رنگ بے حد کالا تھا مگر جن کی پیشانی محراب دار تھی۔ ڈاکٹر کا بیٹا فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا منہ کتنا چوڑا تھا اور اس کا جسم کس قدر پھیلا پھیلا سا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ زاہدہ اور عابدہ، جو ہر وقت نمازیں پڑھنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر کالی کیوں تھیں۔ ان کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ دونوں فرحت کی سہیلیاں بن گئیں۔ اس بات پر ایلی کو بڑا غصہ آیا۔ اسے فرحت کی سہیلیوں سے بے حد چڑ ہو گئی تھی۔ فرحت کی سہیلیوں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں تلے سارہ اور صبورہ آجاتیں اور پھر آواز آتی، "سارہ سو گئی ہے کیا"۔ اور پھر چراؤں، ٹھک دروازہ بند ہو جاتا۔ "ہونہہ، سہیلیاں۔!" ایلی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں ایک گھونسہ چلا دیتا۔

زاہدہ اور عابدہ نے صحن کی درمیانی دیوار سے ایک اینٹ نکال رکھی تھی تاکہ آپس میں باتیں کر سکیں اور علی احمد آتے جاتے دزدیدہ اور حسرت بھری نگاہوں سے اس سوراخ کی طرف دیکھا کرتے اور ہاجرہ علی احمد کی نگاہوں کو دیکھ کر اپنا سینہ تھام لیا کرتی ہائے اللہ اب کیا ہوگا اور ایلی محسوس کرتا کہ اب وہ سوراخ بڑا ہو جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے دروازہ بن جائے اور پھر ایک دن آواز آئے گی۔ زاہد سو گئی کیا اور عابدہ چپکے سے دروازے سے نکل کر گھر میں آجائے گی اور پھر علی احمد کے کمرے میں گھس جائے گی۔ پھر دروازہ بند ہو جائے گا اور پھر۔ پھر۔ لیکن غصے سے اس کا منہ اس قدر سرخ ہو جاتا کہ "پھر" کے متعلق اسے کوئی دلچسپی نہ رہتی۔

رفیقاں

بام آباد میں سب سے پہلی عورت جو ان کے گھر آئی رفیقاں تھی۔ "بی بی کوئی کم ہووے تاں ڈسونا" اس کے انداز میں بے بسی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ایلی نے محسوس کیا کہ اس کی جھکی جھکی آنکھیں نہ دیکھنے والی نظر آنے کے باوجود دیکھتی تھیں۔

ہاجرہ پہلے ہی روز رفیقاں کی دکھ بھری کہانی سن رہی تھی اور اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ ایلی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر غصے سے بے تاب ہو کر باہر چلا گیا۔

رفیقاں روز ان کے یہاں آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا گاماں بھی ہوتا تھا۔ وہ آکر گھر کے کام کاج میں ہاجرہ کا ہاتھ بٹاتی اور اس دوران میں علی احمد خلاف معمول خود چلم اٹھائے باورچی خانے میں آجایا کرتے۔

"اوہ۔ رفیقاں ہے۔ کیا حال ہے رفیقاں۔ اچھی تو ہے تو۔ بڑی دیر کے بعد دیکھا تجھے۔" اور رفیقاں مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کرتی اور نظریں جھکا لیتی اور علی احمد اپنے آپ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر آواز دیتے "رفیقاں ذرا آنا تو۔" اس پر ہاجرہ کی تیوری چڑھ جاتی اور رفیقاں مسکرا کر سر جھکا لیتی جیسے سب سمجھتی ہو اور چپ چاپ بیٹھی کام کئے جاتی۔

لیکن ایلی کو محسوس ہوتا جیسے اس کی خاموشی میں ہاں کی جھلک ہو جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں چلی جائے اور پوچھے آپ نے بلایا ہے جی لیکن وہ بیٹھے رہنے پر مجبور تھی۔ بی بی کیا کہے گی اور بی بی بات بات پر کچھ نہ کچھ کہا کرتی تھی آواز پڑنے پر وہ

لب کہتی "اونہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں رفیقاں ایسی نہیں۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں کہ بلاوے کی منتظر بلاوے کی منتظر ہوں۔" یہ سن کر رفیقاں مسکرائے جاتی اور ایلی مبہم طور پر محسوس کرتا۔ جیسے رفیقاں کا جی کچھ اور چاہتا ہے اور وہ کچھ اور کر رہی اور ایلی کی نگاہ میں رفیقاں کی مسکراہٹ دو دھاری چھری کی طرح محسوس ہوتی تھی اور وہ رفیقاں سے نفرت کرتا اور یہ نفرت روز بروز شدید تر ہوتی جاتی تھی۔

لیکن ہاجرہ رفیقاں کے گن گاتی تھی۔ بات بات پر رفیقاں کی تعریف' رفیقاں کی شرافت اور نیکی کی گھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاید اسی دھوم کی وجہ سے رفیقاں قطعی طور پر مجبور ہو گئی تھی کہ علی احمد کی آواز سننے کے باوجود اور ان کی متبسم آنکھوں کے اشارے کے باوجود چپ چاپ بیٹھی رہے۔ اس کے باوجود جب وہ علی احمد کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرتی تو اس کی گردن تن جاتی۔ گھگھرا یوں کھلتا اور بند ہوتا کہ عجیب سے دائرے بنتے چلے جاتے اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ رک جائے اور چوری چوری مسکرانے کی بجائے قہقہہ مار کر ہنس دے۔ کیوں بلایا ہے مجھے۔ کس نے بلایا ہے مجھے' مگر وہ چلے جاتی چلے جاتی۔ ایلی سمجھتا تھا کہ ہاجرہ کی توقعات نے اس کا وہاں رکنا ناممکن کر دیا اور ہاجرہ کے ان محبت بھرے جذبات سے جو اس نے رفیقاں سے وابستہ کر رکھے تھے۔ صفیہ کی بو آتی تھی اور ایلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے رفیقاں صفیہ کی جانشین ہو ——— ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا تھا۔

علی احمد کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ اس میں دو طاقتیں بر سر پیکار تھیں۔ علی احمد اور ہاجرہ ہر نووارد کو دیکھ کر دونوں طاقتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچتیں۔ علی احمد کے کمرے کا کھلا دروازہ اسے اپنی طرف بلاتا اور باورچی خانے کی محراب اسے اپنی طرف کھینچتی۔ علی احمد کے دروازے سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور باورچی خانے سے دبی دبی آہوں کی۔ وہ کمرہ اور باورچی خانہ دونوں ہی مظلوم تھے۔ کمرہ ہی ہی کرنے پر مجبور تھا اور باورچی خانہ آہیں بھرنے پر۔ فطرت ان دونوں کی مجبوریوں پر مسکراتی تھی۔ جیسے وہ ان دونوں کے راز سے واقف ہو اور ان دونوں کی کشمکش سے دور ایلی اور فرحت ایک دیوانے میں اکیلے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ تن تنہا۔

ہر نووارد کے پاؤں کی آہٹ سن کر دونوں بھائی بہنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب کیا ہوگا۔ وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگتے۔ نووارد کمرے اور باورچی خانے کے

درمیان لٹک جاتی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ بالآخر یا تو وہ باورچی خانے میں جا پہنچتی اور یا علی احمد کے کمرے میں رک جاتی اور پھر مکان سے یا تو قہقہوں کی گونج سنائی دیتی اور یا آہوں کی۔ ہر صورت میں مکان پر ایک اداسی چھا جاتی۔ جس میں دبی بی چیخوں کی گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیتیں اور ایلی ڈر کر چلاتا۔ آپا اتنی اداسی کیوں ہے۔ اور فرحت آہ بھر کر کہتی "اب تو سوئے گا بھی کہ نہیں۔"

صفیہ کی موت کے بعد بھی گھر میں ہاجرہ کی حیثیت ایک نوکرانی کی سی تھی۔ وہ دن بھر باورچی خانے میں برتن مانجھتی۔ آہیں بھرتی اور آنے جانے والیوں کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتی رہتی "ایلی کی ماں" کمرے سے آواز آتی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی "جی آئی۔" اور پھر دروازے کے باہر چوکھٹ سے لگ کر پوچھتی۔ "جی کیا ہے؟" جیسے کوئی فقیر بھیک مانگنے کے لئے کھڑا ہو۔ ہاجرہ فطری اور ازلی طور پر بھکارن تھی۔ ڈر' خوف' ہراس اور احساس کمتری اس کی گھٹی میں پڑے تھے جو اس نے وراثت میں ایلی کو بخش دیئے تھے۔

بند کمرا

پھر علی احمد کے دفتر میں کلرکوں کی بھرتی کے لئے امتحانات شروع ہو گئے اور علی احمد کے گھر میں سفارشات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب کہ ایلی کو احساس ہوا کہ امتحانات اس قسم کے نتائج بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

ڈیوڑھی میں سے غریب سائلوں کی منتیں سنائی دیتیں اور پھر کھجوروں سے بھری ہوئی ٹوکری اندر آجاتی اور پھر علی احمد کو خود باہر جا کر ٹوکری بھیجنے والے کو ڈانٹنا پڑتا۔ پھر مزید منتوں کی آوازیں بلند ہوتیں اور پھر ٹوکری دوبارہ گھر میں آپہنچتی۔

ان دنوں سفارشوں کا تانتا بندھا تھا۔ شاید اس لئے کہ بام پور غریبوں کا شہر تھا۔ یا شاید اس لئے کہ علی احمد کے ٹین کے سپاہی کے متعلق لوگ جان چکے تھے۔

علی احمد اپنے کمرے سے باہر سائلوں کی طرف دیکھتے اور پھر یوں کام میں لگ جاتے۔ جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ادھر ہاجرہ ان مہمانوں کو منہ نہ لگاتی اور بات کئے بغیر اپنے کام میں مشغول رہتی۔ پھر ایلی چوری چوری جھانکتا اس کی توجہ لوگوں کی نسبت اس ٹوکری پر پڑتی۔ جو ان کے ساتھ ہوتی۔ علی احمد کی توجہ ٹوکری کی بجائے اس شخص پر پڑتی جو سفارش کے لئے آتا تھا۔

ایک بار دیکھنے اور جانچنے کے بعد وہ باہر نکلتے اور غصے میں چلاتے "ہاں بھئی کیا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں قطعی طور پر مجبور ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلے جاتے اور از سر نو کام میں مشغول ہو جاتے۔

اکثر بار سفارشی براہ راست علی احمد کے کمرے میں جا پہنچتا اور ابتدائی جھاڑ جھپاڑ کے بعد ہی ہی ہی ان کا قہقہہ گونجتا اور ایلی کو معلوم ہو جاتا کہ ٹین کا سپاہی بیدار ہو چکا ہے اور ابھی وہ رزم گاہ میں اتر آئے گا اور پھر ———— پھر گھر پر موت کا سناٹا چھا جائے گا اور اس سناٹے میں رنگین مگر دبی ہنسی کی آواز ابھرے گی۔ پھر دفعتاً "سب ٹھیک ہو جائے گا اور نتائج خوشگوار ہوں گے۔ جیسے دکھی شہزادی کی کہانی میں مشکلات لڑائیوں اور امتحانات کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد سب ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔

اس سے پہلے ایلی کو مبہم سا احساس تھا کہ سب قصور علی احمد کا ہے اور وہ سوچا کرتا نہ جانے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیوں دروازہ کھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ کیوں ٹین کا سپاہی ہنس ہنس کر لڑتا ہے اگرچہ اسے خوب معلوم تھا کہ علی احمد کے کمرے میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جسے قہقہوں اور بھیانک سناٹے سے تعلق ہے۔ گناہ ہے لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں ہوتا کیا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں دبی دبی آرزو تھی کہ کبھی وہ اتفاقاً وہاں چلا جائے اور اتفاقاً اس کی نظر پڑ جائے اور پھر اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا نہ جانے اپنی بے بسی پر یا اس عمل پر جو اس کے خیال میں وہاں ظہور پذیر ہوتا تھا۔

اب ایلی کو مبہم سا احساس ہونے لگا کہ علی احمد بیچارے مجبور تھے ان کی نگاہوں سے ان کی مجبوری واضح ہوتی تھی۔ ان کی ہی ہی ہی میں ان کی مجبوری صاف سنائی دیتی تھی۔ وہ کیوں اور کیسے مجبور تھے اسے معلوم نہ ہوا۔ بہر حال وہ مجبور تھے۔ قصور ان کا تھا جو اپنے عزیزوں کو ساتھ لاتی تھیں۔

کور اور آسا

کور بھی پہلی مرتبہ بھائی کی سفارش کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ خود آسا تھا جسے دفتر میں کلرک بننے کا بے حد شوق تھا تینوں کا قافلہ چپ چاپ اندر آگھسا۔ آگے آگے ماں تھی۔ درمیان میں کور تھی اور پیچھے آسا۔ ماں کے کپڑے میل سے بھرے ہوئے تھے

اس کا جسم لٹا ہوا تھا۔ نگاہ حرص آلود تھی۔ اسے دیکھ کر انتہائی غلاظت کا احساس ہوتا تھا۔ کور سیاہ
فام گوشت تھا۔ کور سیاہ فام گوشت کا ایک گول مٹول لوتھڑا تھی۔ جس پر بھڑکیلے کپڑے ٹنگے
ہوئے تھے۔ جو اس لوتھڑے کو اور بھی بدنما بنا رہے تھے۔ اس کا قد ٹھنگنا تھا۔ سر چھوٹا اور گول
جس میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں رینگتیں اور سفید دانت رضامندی کی چمک سے روشن تھے۔

آسا ایک اونچا لمبا لڑکا تھا۔ اس کا چہرہ ذہنی چمک سے کورا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حماقت
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کور کے پیچھے پیچھے
چلنے کا عادی ہے۔

یہ قافلہ چپکے سے مکان میں داخل ہوا اور علی احمد کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل
کرنے کے بعد باہر صحن میں اسی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ جہاں سے اندر کام میں منہمک علی احمد
پورے طور پر دکھائی دیتے تھے۔ علی احمد نے باہر دیکھا۔ کور کے دانت چمکے۔ انہوں نے جلدی
سر جھکا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کور اپنے گھگھرے اور چولی کو ٹھیک کر کے علی احمد کی طرف منہ
موڑ کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ آسا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی چیلوں کا بغور
معائنہ کرنے لگا۔ کور کے دانت پھر چمکے اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ علی احمد کے ہاتھ سے قلم
چھوٹ کر رجسٹر پر جا گرا۔ "کون ہے؟" وہ بولے۔ جواب میں دانت چمکے اور بغیر کسی تمہید کے
کور اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ اس پر بوڑھیا اس خاردار درخت کو دیکھنے میں
مصروف ہو گئی۔ جو صحن میں پھیلا ہوا تھا اور آسا تنکے سے زمین پر بیل بوٹے بنانے لگا۔

اس روز علی احمد کے کمرے سے ٹین کے سپاہی کی ہی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربڑ کی
گڑیا کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔ اور ایلی حیران تھا اور فرحت یوں خلا میں گھور رہی تھی
جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور کور ہنستی ہوئی نکلی۔ "ماں۔ ماں آسا فیل تو نہیں۔ آسا تو پاس ہے
نہ جانے کس نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو فیل ہے خواہ مخواہ وہ تو پاس ہے۔ میں نے خود نتیجہ
دیکھا ہے۔ تو نے کہا نہیں تھا۔" اس نے آسا کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ تو پاگل ہے۔" آسا کی ماں بولی۔

آسا پاگلوں کی طرح ہنسا اور پھر خاموش ہو گیا کور کے دانت چمکے علی احمد سر کھجانے لگے۔

"آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ بابو جی۔" وہ بولی "چل ماں" اور مڑ مڑ کر دانت چمکاتی ہوئی باہر

گھگھرے کو ٹانگوں پر لپیٹتی ہوئی چل پڑی۔ اب آسا سب سے آگے تھا پیچھے اس کی ماں اور
سب سے پیچھے کور تھی۔

انہیں جاتے دیکھ کر ایلی باہر نکلا۔ مضطربانہ گھر میں گھومنے لگا۔ باورچی خانے میں داخل ہوا
تو دفعتاً سرگوشیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ ہاجرہ چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا
پرے رفیقاں گھگھرے پر بوٹیاں بنا رہی تھی۔

ظاہر تھا کہ وہ دونوں کور کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن کیوں ایلی کے آنے پر وہ
دفعتاً چپ کیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ یوں سر سے سر جوڑ کر دبی دبی آواز میں پہروں باتیں کرتے
رہنا اور رفیقاں کے ہونٹوں پر وہ دبی دبی مسکراہٹ جیسے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو جیسے
وہ ہاجرہ کو فریب دے رہی ہو۔ اماں اسے اس قدر اچھا کیوں سمجھتی تھیں اور وہ چلتے وقت جان
بوجھ کر اس طرح قدم کیوں اٹھاتی تھی کہ اس کے گھگھرے میں دائرے پڑیں اور علی احمد کے
کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے اس کی گردن مورنی کی طرح تن کیوں جاتی تھی۔ ایلی کو ان
سب باتوں کی وجہ سے رفیقاں سے نفرت تھی۔

شدید نفرت ایسی نفرت جو اسے کور سے بھی نہ تھی۔

نوکرانی کے ہاں بچہ

چند ہی دنوں بعد ان کے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز وہ گلی میں کھیلنے کے بعد
جب گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو فرحت نے اسے روک دیا۔

"اونہوں اندر نہ جانا۔"

وہ اس بات پر حیران رہ گیا "کیوں اندر کیا ہے؟"

"اماں بیمار ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔" ایلی نے کہا۔ وہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ علی احمد کا کمرہ تو نہ تھا جس میں جانے
سے ہمیشہ گھبرایا کرتا تھا اور داخل ہونے سے پہلے ان جانے میں کھانستا اور پھر نگاہیں جھکا کر داخل
ہوتا جیسے کوئی جرم یا گناہ ہو مگر یہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ پھر فرحت کا اسے روکنے سے کیا مطلب
تھا۔ اگر اماں بیمار تھیں تو کیا تھا۔ بیماری کی وجہ سے کمرے میں جانے کی ممانعت تو نہیں ہو سکتی۔
اماں دفعتاً میم تو نہیں بن گئی تھیں کہ بیماری میں لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا یہ سب فرحت اپنی

طرف سے کہہ رہی تھی۔ ایلی نے سوچ کر سینہ تان لیا۔ "نہیں نہیں میں جاؤں گا۔" وہ بولا۔

عین اس وقت رفیقاں دوڑتی ہوئی باہر نکلی "تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں ایک ننھا بھائی ہوا ہے۔" بھائی ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔ رفیقاں کا مطلب کیا تھا۔ اماں کے یہاں بیٹا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اماں تو اس گھر کی نوکرانی تھی۔ نوکرانی کے گھر بیٹا۔ اماں تو علی احمد کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ اماں کو تو کبھی آواز پڑتی تھی۔ ہاجرہ سو گئی کیا۔ اماں تو ایسی نہ تھی۔ پھر اماں کے ہاں بیٹا نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ تھا بے عزتی تھی۔ نوکرانی کی بے عزتی۔ اماں نے تو کسی کلرک کو بھرتی نہ کرانا تھا۔ پھر یقیناً" رفیقاں بکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اندر گیا اور ننھے منے بچے کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ کے رہ گیا۔ پھر وہ باہر آبیٹھا اور محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ آسا ہو۔ جیسے علی احمد نے اس کی ماں کو بھی کھلونا بنایا ہو اس خیال پر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

وہ صحن میں خاردار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ دور تک کچی اینٹوں کی منڈیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس سے پرے ریت کے ٹیلے اداس کھڑے تھے۔ آسا۔ آسا درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ اس نے غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔

ہاجرہ کے کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ محلے والیاں اونچی آواز میں چلا رہی تھیں۔ "بہن تمہیں مبارک ہو۔"

وہ ہاجرہ کو مبارک باد کیوں دے رہی تھیں۔ لوگ کیوں ہاجرہ کے کمرے میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ کیوں لوگوں کو تو چاہئے تھا کہ اس سے نفرت کریں جو نوکرانی ہونے کے باوجود گود میں بچہ لئے پڑی تھی۔ لیکن اماں کو بھی احساس نہ تھا۔ کس بے شرمی سے مسکرا رہی تھی۔ اسے شرم نہ آتی تھی۔ مگر اماں تو ایسی نہ تھی۔

ایلی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اب وہ لوگوں کو کیسے منہ دکھائے گا اب وہ اپنی ماں کے سامنے کیسے جائے گا اور فرحت —————— فرحت کو اس بات پر کتنا دکھ ہو گا۔ مگر فرحت تو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ کیا فرحت کو یہ بات گوارا تھی۔ کیا اس حادثہ پر اسے دکھ نہ ہوا تھا۔ ادھر ابا اپنے کمرے میں آقاؤں کی طرح اطمینان سے بیٹھے لکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں نوکرانی اور اس کے نوازئیدہ بچے کی خبر ہی نہ ہو۔

بچے کی مبارکباد دینے کے لئے مختلف قسم ک لوگ آتے تھے۔ کچھ تو ہاجرہ کی کوٹھڑی میں جا کر گھس جاتے اور کچھ علی احمد کے کمرے سے آگے نہ جا سکتے۔ کور ان لوگوں میں پیش پیش تھی۔ "بابو جی مبارخ ہو۔" وہ دور سے چلّاتی ہوئی آئی اور پھر علی احمد کے کمرے میں داخل ہو کر یوں مطمئن ہو گئی۔ جیسے علی احمد ہی زچہ اور بچہ ہوں۔

علی احمد کا کمرہ کور کے لئے مخصوص ہوا جا رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ دانت چمکاتی گھگھرا اچھلاتی آموجود ہوتی۔ "کہو بابو جی کیا حال چال ہے ننھا کیسا ہے۔ اس کے سفید دانت سیاہ رنگ میں چمکتے۔ "آگئی تو" علی احمد اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

"اچھا تو ابھی یقین نہیں آیا۔" وہ پنکھے کی رسی ہاتھ میں پکڑ کر چابک کی طرح جھلاتے ہوئے چلاتی۔

یہ دیکھ کر ٹین کا سپاہی جوش میں آجاتا "اچھا یہ جرأت۔"

پھر کمرے میں اودھم مچ جاتا اور ایلی غصے میں مٹھیاں بھینچتا ہے "کتنی مکروہ آواز ہے کور کی' انداز کس قدر ننگا ہے۔ ننگا اور غلیظ" اسے کور سے نفرت تھی اور وہ آسا کو دیکھ کر غصے میں کھولنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا جیسے خود آسا ہو اور کلرکی کا امتحان پاس کرنے کے لئے ہاجرہ کو لے کر آیا ہو۔

ایلی بڑی محنت سے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا مگر ان کی آوازیں اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑتیں۔ پھر دفعتاً" علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلتا اور علی احمد کی آواز سنائی دیتی "ایلی' ایلی۔"

دھرم بھرشٹ

اس وقت ایلی کا علی احمد کے کمرے میں جانا کس قدر دشوار اور پر اذیت ہوا کرتا اور وہ دروازے پر جا کر رک جاتا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر وہ انتظار کرتا کہ ایک بار پھر آواز پڑے تو اندر جائے۔ باہر چلچلاتی دھوپ میں اسے کافی دیر تک کھڑا رہنا پڑتا۔ اندر ربڑ کی گڑیا نہ جانے کیا کیا تماشے کرتی۔ ان تماشوں میں وہ دونوں بھول جاتے کہ انہوں نے ایلی کو آواز دی تھی۔

"ایلی" دوسری مرتبہ آواز پڑنے پر وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوتا اکثر دونوں ایک دوسرے

سے یوں باتوں میں مشغول ہوتے ایک دوسرے میں اس حد تک کھوئے ہوتے کہ دیر تک قریب کھڑے ایلی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہوتی۔ پھر علی احمد چونک کر کہتے "اوہ تو آ گیا ایلی۔ وہ میز پر بوتل پڑی ہے۔ اس میں پانی لے آ۔ کور کو پیاس لگی ہے۔" ایلی غصہ سے تنگ منہ والی بوتل کو دیکھتا ——— گردن مروڑ کر اسے اٹھالیتا۔

"ایلی۔" کور چلاتی "کنوئیں سے لانا۔"

ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کنوئیں سے لانا۔ بڑی آئی دھرم والی چاہے خود روز بھرشٹ ہوتی رہے۔ پر دھرم بھرشٹ نہ ہو۔ اس گھر کا پانی نہ پیئے گی۔ مٹکے کا پانی نہ پیئے گی۔ دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ لیکن بند کمرے میں خون چوسنے سے دھرم برشٹ نہیں ہوتا۔ مسلمان سے کشتی لڑنے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔ ہتھیلی پر دو روپے رکھوانے سے دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔ بڑی دھرم والی بنی پھرتی ہے۔ کنوئیں سے لانا غصے میں وہ بل کھاتا۔ لیکن بل کھانے کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں چلتا ہوا، غصے کی آگ میں کھولتا ہوا وہ کنوئیں پر پہنچتا راستے میں وہ بار بار دانت پیس پیس کر بوتل کی گردن مروڑتا۔ جیسے وہ کور ہو بوتل کی گردن مروڑنے سے اس کی ایک گونہ تسلی ہو جاتی تھی۔

بام آباد میں کنوئیں نہیں تھے۔ جن میں ڈول ڈال کر پانی نکالا جا سکتا۔ وہاں سب کنوئیں راہٹ والے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ایلی کو تن تنہا رہٹ کو بیل کی طرح کھینچنا پڑتا اول تو اس کے چلانے سے رہٹ کا چکر ہلتا بھی نہ تھا۔ دم لینے کے بعد وہ پھر سے رہٹ کو دھکیلتا اور پھر تھک کر رک جاتا تاکہ تازہ دم ہو کر اسے چلا سکے اور جب چلتا پانی کا اتنا بڑا دھارا بوتل پر گرتا تو بوتل گر کر اوندھی ہو جاتی۔ اوندھی نہ بھی ہوتی تو بھی پانی ادھر ادھر بہہ جاتا اور بوتل خالی رہ جاتی۔ اس نے کئی بار علی احمد سے کہا تھا کہ کنوئیں پر بوتل نہیں بھرتی لیکن کور نے شیشے کی بوتل کے علاوہ کسی اور برتن میں پانی پینے سے انکار کر دیا تھا۔ شیشے کی بوتل میں پانی پینے سے دھرم بھرشٹ نہ ہوتا تھا اور علی احمد کے گھر میں کور کے نزدیک اور کوئی برتن نہ تھا، جس میں دھرم بھرشٹ کئے بغیر پانی پیا جا سکتا ہو۔ علی احمد بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے وہ کور کی بات سن کر ہنس دیتے اور کور انہیں ہنستا دیکھ کر کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی رسی معنی خیز انداز سے گھماتی جس پر علی احمد اور بھی ہنسنے لگتے اور بات شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

علی احمد رسی کا سگنل دیکھتے ہی ٹین کے سپاہی میں بدل کر ربڑ کی گڑیا پر وار کرنا شروع کر

دیتے۔ جیسے کہ ایک سپاہی کا فرض ہوتا ہے اور ایلی بوتل ہاتھ میں اٹھائے کھڑے کا کھڑا رہ جاتا اور اس کی رہٹ اور بوتل کی داستان علی احمد اور کور کے قہقہوں میں دب کر رہ جاتی۔

ایک روز کنوئیں سے پانی لاتے ہوئے اسے ایک خوفناک خیال آیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بام آباد کا وہ ریتلا میدان ویران پڑا تھا۔ دور تک گلیوں میں کوئی نہ تھا۔ اس نے بوتل کی طرف دیکھا ایک بار پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مطمئن ہونے کے بعد ایلی نے منہ میں تھوک بھرا اور پھر دھڑکتے ہوئے بوتل میں تھوک دیا۔

اس روز پانی لاتے ہوئے وہ بے حد مسرور تھا۔ جیسے اس نے اپنے دشمن کو ہمیشہ کے لئے زیر کر لیا ہو۔ جیسے اس کا انتقام پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہو۔ پھر دفعتاً" اسے ایک اور خیال آیا وہ رک گیا اور بوتل زمین پر رکھ کر سوچنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک بج رہا تھا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور بدن پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ لیکن وہ ڈر گیا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی اس کے علاوہ اس کھلے میدان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جہاں وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ لیکن ڈیوڑھی میں پہنچ کر دفعتاً" اس نے محسوس کیا کہ وہاں اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی نہیں۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا وہ خوش تھا۔ اس کا انتقام ادھورا نہ رہے گا۔ اس نے بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ دروازے کی کنڈی چڑھا دی اور پھر ——— بوتل میں پانی کی سطح ابھر رہی تھی۔

اس روز کور کو بوتل سے پانی پیتا دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خوشی اس کے دل میں یوں چھلک رہی تھی، جیسے سوڈے کی بوتل میں جھاگ اچھلتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فرحت اور ہاجرہ دونوں کو اپنی مسرت میں شریک کر لے۔ محلے کے ہر دروازے کو جا کر کھٹکھٹائے اور انہیں اپنا راز بتائے اور پھر ان کو اپنے ساتھ علی احمد کے کمرے میں لے آئے تا کہ وہاں وہ سب کور کو بوتل سے پانی پیتے دیکھیں۔

اماں کو بتانا بے کار تھا۔ اماں تو نصیحتیں کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی ایلی کوئی بات بھی کرتا۔ وہ جواب میں نصیحت فرما دیتی کہا کرتی تھی کوئی برا کرتا ہے تو کرنے دو لیکن تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ اس پر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اماں عیسائی ہو جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہونہہ اماں تو خواہ مخواہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب سے

اس کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ ایلی کی اس کے متعلق رائے بدل چکی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اس نے بوتل کے پانی کا راز کسی کو نہ بتایا البتہ اس روز کے بعد اسے بوتل بھرنے کی کوفت سے نجات مل گئی۔

اس سے پہلے وہ کور کی آمد کی خبر سن کر گھبرا جایا کرتا تھا۔ اب اسے بوتل بھرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کنوئیں کا بھاری چکر دھکیلنا پڑے گا لیکن اب جونہی وہ گھر میں داخل ہوتی ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جلدی پانی مانگے اور ایلی بوتل میں نفرت کا زہر بھر کر لا دے۔ اب اسے کنوئیں چکر چلانے اور بوتل بھرنے میں کوفت کی بجائے مسرت ہوتی اور پھر جب چوگان میں بیٹھ کر وہ منہ میں تھوک اکٹھا کرتا تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا پھر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتا اور بالآخر بوتل اٹھائے خوشی خوشی علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ اس خوشی میں وہ قطعی طور پر بھول جاتا کہ علی احمد کے کمرے میں کھانس کر داخل ہونا چاہئے اور وہاں جانے سے پہلے سر جھکا لینا چاہئے۔

انوکھے جذبات

اس زمانے میں وہ محبت کے اولین جذبات سے واقف ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں نئے انوکھے جذبات ابھر رہے تھے۔ اسے بلاوجہ سکول کے دو ایک لڑکے اچھے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ اچھا لگنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ پھر بھی وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ مثلاً اس کے ہم جماعتوں میں ایشور لال، پرکاش اور گھنشام تھے۔ مثلاً اسے گھنشام کا چپ چاپ کھڑا ہونا۔ وہ ایک عجیب انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیدھی ہوتی۔ دوسری یوں خمیدہ رہتی جیسے ازلی طور پر اس میں سیدھا ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ ہونٹ یوں آپس میں چٹکی سی بنائے رہتے جیسے ابھی کوئی بات کرنے والے ہوں، مگر ہونٹوں پر آئی ہوئی وہ بات ہونٹوں میں دبی رہتی۔

پھر وہ پرکاش تھا۔ پرکاش کا پھولا پھولا چہرہ اور اس کے رخسار پر وہ سیاہ تل اسے بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور ایشور لال کا وہ قہقہہ۔ اس کا بے تکلف انداز۔ اس کا لمبا سا منہ اور میلے دانت اسے بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایلی صبح شام ایشور لال کے ساتھ رہتا تھا اور شوق سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ حالانکہ ایشور لال کے دانت بڑے بھدے اور زرد تھے اور اس کے منہ سے بو آتی تھی مگر وہ بو کتنی اچھی لگتی تھی اسے ایشور لال کا بولے جانا بولے جانا۔ اونچی آواز میں شور مچانا

اس کی پھٹی پھٹی آواز سن کر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اس پر ہپناٹزم کر دیا گیا ہو۔ وہ کیفیت کس قدر پرلذت محسوس ہوتی تھی۔

روز شام کے وقت ایلی اس طرف نکل جاتا۔ جس طرف گھنشام کا گھر تھا اور گھنٹوں گلیوں اور بازاروں میں اس امید پر آوارہ پھرتا کہ شاید گھنشام کسی کام کے لئے باہر نکلے اور پھر۔ پھر اسے دیکھ کر رک جائے۔ کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک ٹانگ سیدھی اور دوسری میں خم، پھر وہ دونوں پاؤں ملا لیتا اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر ایڑیاں اٹھا لیتا اور پھر پنجوں پر جھولنے لگتا۔ ایلی کو یوں لگتا جیسے کوئی ننھا سا فرشتہ فضا میں تیر رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کلی سے بنے رہتے تھے۔ نہ جانے ہونٹ کیوں کلی سے بن جاتے تھے۔ جیسے اس نے کوئی بڑی شگفتہ بات سنی ہو یا کہنے والا ہو۔

بیٹھے بٹھائے ایلی کے دل میں اضطراب سا پیدا ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ وہ ایشور لال کی باتیں سنے یا گھنشام کے سامنے کھڑا ہو اور فضا میں کوئی پیارا فرشتہ جھول رہا ہو یا پرکاش کا گول چہرہ اس کی نگاہوں میں سما جاتا اور وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتا اور باہر گلی میں جا کر ٹہلنے لگتا۔ لیکن گلی میں ٹہلنا بھی تو مشکل ہوا جا رہا تھا۔ وہاں ٹہلتا تو پڑوس والے گھر سے زاہدہ، عابدہ کی آوازیں کان میں پڑتیں کس قدر سریلی آوازیں تھیں۔ دل میں تیر کی طرح چبھ جاتی تھیں اور پھر اندر جا کر ڈولنے لگتیں جیسے دل میں کوئی فرشتہ پنجوں کے بل کھڑا جھول رہا ہو۔ آوازوں میں کیسا جادو تھا۔ کیوں۔ شکلیں تو بالکل سیدھی سادھی تھیں۔ رنگ بھی کالا اور ان میں کچھ بھی تو جاذب نظر نہ تھا۔ لیکن آوازیں ایلی کو بیتاب کر دیتی تھیں۔ تیکھی سریلی اور لوچدار آوازیں۔

پھر دفعتاً" اسے خیال آتا کہ قریب ہی وہ چٹی سفید نرس میز کے مقابل کھڑی آپ ہی آپ شرما رہی ہو گی۔ جیسے اس کی عادت تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن وہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کی کوئی وجہ بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی۔ زرد رنگ کے مرہموں کے مرتبانوں اور کڑوی دوائیوں کی بوتلوں کے درمیان کھڑے ہو کر مسکرانا۔ ایلی کے لئے یہ عقدہ ناقابل حل تھا۔ پھر اس کی چال۔ کس پھبن سے چلتی تھی۔ مسکراتی تو جیسے چراغ روشن ہو جایا کرتے۔ مگر وہ ایلی کو دیکھ کر قطعاً" نہ مسکراتی تھی۔

ہاں اس روز جس روز اماں نے اسے بلایا تھا۔ جب ان کے گھر ننھا ہوا تھا اس روز ——

علی احمد بار بار نرس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ نرس مسکراتی تھی اور منہ موڑ لیتی تھی پھر منہ موڑ کر مسکراتی تھی اور علی احمد گھوم کر پھر اس کے سامنے آکھڑے ہوتے تھے۔

زاہدہ اور عابدہ کے خیال سے بچنے کی کوشش میں ایلی نرس کے خیال میں کھو جاتا مگر ڈسپنسری کی کھڑکی تک جانے کی اس میں ہمت نہ پڑتی۔ پھر اس کے خیالات کا رخ زاہدہ کے بھائی فرید کی طرف منعطف ہو جاتا کتنا شوق تھا اسے نرس کو دیکھنے کا۔ فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا جسم کتنا بڑا تھا۔ موٹے موٹے ہاتھ۔ پھولی پھولی پنڈلیاں اور بھرے بھرے بازو۔ وہ نرس کے لئے ہروقت مضطرب رہتا تھا۔ "ایلی" وہ اسے گلی میں دیکھ کر رک جاتا۔ "ایلی ذرا جانا تو ہسپتال کی کھڑکی سے جھانکنا ہے یا چلی گئی۔ خدا کے لئے ابھی جاؤ۔ یار ہم تو مر گئے۔ تباہ ہو گئے۔ اس کے لئے اور پھر وہ مضطربانہ گلی میں گھومنے لگتا۔ بار بار جسم کھجاتا اور ڈسپنسری کی کھڑکی سے نرس اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو کہ باہر کون کھڑا ہے۔

نرس مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کے بعد منہ کیوں موڑ لیتی تھی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کی طرف جاتا۔ کھڑکی میں سے دھڑکتے دل سے جھانکتا۔ کتنی سفید تھی وہ چٹی سفید ایلی کو گورا رنگ بے حد پسند تھا۔ لیکن نرس اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ مسکراتی بھی تو اسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ مسکراہٹ بالکل روکھی پھیکی ہو۔ نہ جانے ایلی کے روبرو نرس وہ مسکراہٹ کیوں نہ مسکراتی تھی جو وہ فرید کے سامنے مسکرایا کرتی تھی اور ایلی کو دیکھ کر وہ منہ بھی تو نہ موڑتی تھی۔ اس پر ایلی کو بے حد دکھ ہوتا اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کونے میں جا کر رو دے چیخیں مار مار کر روئے۔ مگر رونا بھی تو نہ آتا تھا اسے۔

اس روکھی مسکراہٹ والی نرس سے مایوس ہو کر وہ از سر نو گھنشام کے خیال کی طرف متوجہ ہو جاتا اور ہسپتال کی کھڑکی کو چھوڑ کر بازار کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنشام کہیں بازار میں کھڑا ہو۔ شاید ایشور گلی میں کھیل رہا ہو۔ یا شاید پرکاشت ——

ایلی کے دل میں انوکھی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ جوں جوں اس کے دل میں نئی آرزوئیں تشکیل پائے جاتیں توں توں اس کے دل میں علی احمد کے کمرے سے نفرت بڑھتی جاتی اور اس کمرے میں جانے والیوں کے خلاف بغض شدید تر ہوتا جاتا اور اماں اور رفیقاں کے متعلق شبہات تقویت پکڑتے جاتے۔

اماں تو اب ننھے میں کھو چکی تھیں۔ صبح و شام' دن رات وہ ننھے کی دیکھ بھال میں وقت بسر کرتی اور باقیماندہ وقت باورچی خانے میں گزارتی۔ فرحت بھی ہروقت ننھے کو کھلانے میں لگی رہتی تھی۔ رفیقاں اسے کھلاتی تو نہ تھی۔ مگر بڑے شوق سے دیکھتی۔ آتے ہی سیدھی ننھے کی طرف جا کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی "یہ ننھا بال ہے۔ یہ مینڈھا سائیں ہے۔" اور پھر باورچی خانے میں بیٹھ کر گھگھرے پر دھاگے سے بوٹیاں بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

علی احمد اب بھی سارا دن حساب کتاب لکھنے میں وقت صرف کرتے تھے اور کور بھی مہینے میں صرف چار ایک مرتبہ آتی تھی۔ اب تو ایلی کو کور میں چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی وہ اس کی بوتل میں تھوکنے سے بھی اکتا چکا تھا۔ جب کبھی علی احمد اس سے پانی لانے کو کہتے تو وہ چپکے سے بوتل اٹھا کر باہر نکل آتا اور پھر گھڑے سے پانی بھر لیتا۔ پھر کچھ دیر گلی میں کھیلنے کے بعد بوتل اٹھا کر ابا کے کمرے کی طرف چل پڑتا اور کور سمجھتی کہ وہ پانی کنوئیں کا ہے۔ کور کو پانی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی وہ تو بند کمرے میں ربڑ کی گڑیا کی طرح چیں چیں کرتی اور جاتے وقت دو روپوں کے لئے علی احمد سے جھگڑا کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ علی احمد کا بھی کور سے دل بھر چکا تھا کیونکہ اب وہ اس کے آنے پر بھی کام میں لگے رہتے تھے اور اس کے جانے سے پہلے ہی پھر سے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ نہ جانے ان دنوں وہ کسے چٹھیاں لکھ رہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ایک چٹھی لکھ کر ایلی کو دیتے "لو بھئی اسے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔"

پہلی مرتبہ جب ایلی نے لفافے کا پتہ پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ استانی کے نام چٹھی اور وہ بھی شالکوٹ والی کیا وہی جس نے شلوار کی جگہ چرپلیٹ رکھی تھی؟ وہ تو شاید اس بات کو اہمیت نہ دیتا لیکن گلی میں فرید نے اسے پکڑ لیا "ہوں استانی کو خط جا رہا ہے۔ کون ہے یہ استانی۔ دال میں کچھ کالا ہے دوست!" اس وقت ایلی نے بھی محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دال کون تھی اور کالا کون تھا۔ استانی تو دال نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ "ایلی" اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا ایلی کے جسم میں جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی۔ "ایلی" فرید نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ ایلی کی ایڑیاں ہوا میں معلق ہو گئیں اور وہ فضا میں جھولنے لگا جیسے وہ کوئی ننھا فرشتہ ہو۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود گھنشام ہو اور کوئی ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں

سی دوڑنے لگیں۔

اس روز ایلی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ لیکن وہاں ایک بھدے کالے اور بھونڈے لڑکے کے سوا کچھ نہ تھا پھر اس نے باہر جا کر صابن سے منہ دھویا شاید وہ پہلا دن تھا۔ جب اس نے اس شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بدصورت ہے۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ فرید اسے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتا تھا۔ نہ جانے وہ ایسی آنکھیں کیونکر بنا لیا کرتا تھا اور پھر اس کا "ایلی" کہہ کر خاموش ہو جانا۔ جیسے اس کی آواز حلق میں خشک ہو گئی ہو۔ لیکن اس کے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی کیوں رینگنے لگتی تھیں۔ وہ چیونٹیاں گدگدی کیوں کرتی تھیں۔ جس سے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ عجیب سا احساس تھا وہ'

ان جانے میں ایلی کو فرید سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور اس نے فرید کے گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ لیکن کیوں۔ وہ یہ نہ جان سکا۔ اس کے باوجود جب کبھی وہ کپڑے بدلتا یا نیا جوڑا پہنتا۔ تو اسے کوئی نہ کوئی ضروری کام پڑ جاتا اور مجبوراً اسے گلی میں اس سمت کو جانا پڑتا۔ جہاں فرید کا گھر تھا۔ جاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اس کے دل پر عجیب سا دباؤ محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔ "ایلی" اسے خواہ مخواہ آوازیں سنائی دیتیں اور پھر جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ گلی میں فرید نہ ملتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا لیکن دل میں دبی دبی سی خلش کانٹے کی طرح لگی رہتی اور بالآخر مایوس ہو کر گھنشام کے گھر کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنشام بازار میں کھڑا ہو۔ اس کی نگاہ تلے گھنشام آ کھڑا ہوتا۔ جس کے پاس ہی فرید کھڑا ہنس رہا ہوتا فرید اور گھنشام۔ اب اس کے ذہن میں لازم و ملزوم ہوئے جا رہے تھے۔ روز بروز بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ بات بات پر اس کا دل دھڑکتا ایک اضطراب چاروں طرف سے اس پر یورش کر دیتا اور اس اضطراب کے تعاقب میں وہ آوارہ پھرتا۔ گلی میں میدان میں بازاروں میں اور گھر میں بھی وہ مختصر سا گھر دفعتاً" اس قدر وسیع کیوں ہو گیا تھا اور علی احمد کا کمرہ روز بروز سکڑ کر چھوٹا کیوں ہوتا چلا جا رہا تھا۔ خود علی احمد بھی تو اب اس کی نگاہوں میں اتنے عظیم نہ رہے تھے۔ اب وہ انہیں اور ان کے کمرے کو آسانی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔

کشمیر کا سیب

ان دنوں علی احمد مضطرب رہنے لگے تھے۔ لکھتے لکھتے وہ قلم رکھ کر باہر آ جاتے اور کسی ٹوٹی

ہوئی چارپائی پر ہاتھوں میں سر تھام کر لیٹ جاتے۔ دیر تک چپ چاپ لیٹے حقہ پیتے رہتے پھر دفعتاً" جوش میں اٹھ بیٹھتے اور کسی نہ کسی بہانے کشمیر کی بات شروع کر دیتے۔ "اجی کیا بات ہے کشمیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جنت کا نمونہ اتار رکھا ہے۔ رہنے کا مزہ ہے تو کشمیر میں۔" وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر کہتے "سرو قد درخت ٹھنڈی نہریں پھل بے اندازہ۔ پھل کھاؤ' چشموں کا ٹھنڈا پانی پیو' اجی وہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہوں گے تو کون ہو گا۔" یہ محسوس کر کے کہ ان کی بات کوئی نہیں سن رہا علی احمد کبھی نہ گھبراتے تھے۔ "جنہوں نے صبح شام سیب کھائے ہوں ان کی شکل سیب سی نہ ہو گی تو پھر کیسی ہو گی۔ سیدھی بات ہے کیوں رفیقاں جو سیب کھا کر پلے گا وہ بڑا ہو کر سیب بن جائے گا۔ ہی ہی ہی۔ کیا کہتی ہے۔" اندر باورچی خانے میں رفیقاں چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ "کیا بات ہے کشمیر کی۔ واہ وا کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

ایلی یہاں آؤ۔ ادھر تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے کیا؟" وہ شعر پھر سے دہراتے اور ایلی کی خاموشی پر کہتے "آؤ تمہیں اس کا مطلب سمجھائیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کشمیر ہے کہاں ——— وہ تو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ وہاں گرمی کیوں نہیں پڑتی اور وہاں چشمے کیوں پھوٹتے ہیں۔ شاباش ٹھیک پہاڑ تو ہے لیکن پہاڑ پر رہنے والے۔ رفیقاں تم جانتی ہر پہاڑ پر رہنے والوں کے چہرے سیب کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ ایلی کی ماں تم نے دیکھا ہے کسی کو جو برسوں کشمیر میں رہا ہو۔ سبحان اللہ کیا رنگ روپ ہوتا ہے۔ میمیں بیچاری کیا مقابلہ کریں گی۔ انگریز تو بدصورت ہوتے ہیں۔ ان کے منہ پر تو نحوست برستی ہے۔ لیکن کشمیر والے۔ واہ وا سبحان اللہ"

گھر میں کسی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد بام آباد کے ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً" کشمیر کیسے جا پہنچے۔ ہاجرہ نے یہ عالم دیکھا تو ایک دن چپکے سے رفیقاں کے کان میں بولی "کوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہے میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میری بات یاد رکھو۔ اگر بات نہ نکلی تو میرا ذمہ اور بات نکلنے میں دیر بھی نہیں لگے گی ہاں۔ میں تو تیور پہچانتی ہوں ان کے۔"

رفیقاں ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرانی سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی "اچھا۔ لو میں بیچاری کیا جانوں۔"

بڑی بیچاری تو دیکھو۔ ایلی گھورتا۔

پھر دفعتاً" ننھا بیمار پڑ گیا اور سب کی توجہ ننھے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہاجرہ رفیقاں اور فرحت ہاجرہ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ ایلی کو دن میں دو تین بار ڈسپنسری جانا پڑتا۔ وہ نرس تک پہنچ تو جاتا لیکن اس سے براہ راست بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ کئی بار وہ بات کرنے کے لئے فرید کو ساتھ لے جاتا اور نرس فرید کی طرف دیکھے بغیر جھینپتی۔

نرس کی آمد پر علی احمد قمیص پہن لیتے اور ننھے کی چارپائی کے قریب آ کھڑے ہوتے۔ "ہی ہی ہی۔" وہ نرس سے اپنی بات شروع کر دیتے۔

نرس کے جانے کے بعد علی احمد ان سب کو تسلی دیتے۔

"گھبراؤ نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا سیب کھلاؤ اسے سیب ——— لیکن سیب کشمیر کا ہو۔ کلو کا نہ ہو۔ ایلی بھاگ کر ایک سیب لے آؤ۔ وہ دو آنے جیب سے نکال کر کہتے۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایلی کی ماں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایلی کلو کا نہ لانا تھوڑا سا رس نکال کر بچے کو دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں نا انگریز۔ این ایپل اے ڈے۔ کیپس دی ڈاکٹر اوے' کیا سمجھے ایلی۔ اچھا تم آؤ گے تو تمہیں سمجھادیں گے۔"

رفیقاں آتی تو علی احمد اسے روک لیتے "رفیقاں ٹھہر تو سہی۔ تو تو بام آباد کا سکندر اعظم معلوم ہوتی ہے۔ آندھی کی طرح آتی ہے' بگولے کی طرح چلی جاتی ہے۔ اس طرح بھاگنے دوڑنے سے فائدہ اور پھر بام آباد میں یہ کوئی جگہ ہے کیا بالکل فضول بے کار' یہاں تو اچھا خاصا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب دیکھو اندر ننھا بیمار پڑا ہے۔ میری اپنی صحت تباہ ہو چکی ہے۔ تم بھی تو زرد پڑ رہی ہوں۔ کیوں" رفیقاں آنکھیں جھکائے مسکرائے جاتی۔ اچھا تو سکندر اعظم اب کی گرمیوں میں ہم تمہیں کشمیر لے چلیں گے۔ تم بھی اور ننھا بھی وہاں جا کر یوں سرخ ہو جاؤ گے۔ جیسے جیسے ———"

کور کی آمد پر وہ قہقہہ مار کر صحن سے اٹھ بیٹھتے "آیئے مہاراج لو بھئی یہ راجپوتانے کے شدھ سانسی بھی آ گئے۔ تم چاہے جا کر ساری عمر کشمیر رہو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔" اور کور یہ بات سن کر پنکھے کی رسی کی چابک بنا لیتی اور اسے گھمانے لگتی۔ علی احمد ہنسنے لگتے۔

ادھر کور اور علی احمد کے درمیان ہنگامہ شروع ہوتا ادھر ساتھ والے کمرے میں ننھے کی حالت بد سے بدتر ہوئی جاتی۔ ننھے پر ہاجرہ کا سر جھکا ہوتا۔ گالوں پر آنسو رواں ہوتے اور چارپائی کے پاس رفیقاں چپ چاپ کھڑی ہوتی۔ اس پر ایلی نرس کو بلانے کے لئے بھاگتا۔

نرس کو گھر آتا دیکھ کر ٹین کا سپاہی چونکتا اور اپنی رزم گاہ کو چھوڑ کر نکل آتا پھر دفعتاً" یہ محسوس کر کے کہ اس نے قمیض نہیں پہنی ہوئی علی احمد لپک کر اندر داخل ہوتے اور قمیض پہن کر نرس کے روبرو آ کھڑے ہوتے۔

"کیوں کیا بات ہے؟" وہ کہتے "خیریت تو ہے کیا بچے کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے پر ہر شخص کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ نرس۔" وہ مسکراتے۔

دفعتاً" انہیں خیال آتا۔ کہتے "اگر آپ برا نہ مانیں نرس تو پوچھوں کیا آپ کشمیر کی رہنے والی ہیں۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہی ہی ہی۔"

ان کی باتیں سن کر ہاجرہ اندر ننھے کو گود میں لئے بیٹھی آنسو بہائے جاتی اور رفیقاں اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہاجرہ روتی کیوں تھی۔ وہ کیوں توقع کرتی تھی کہ علی احمد اس کے بچے میں دلچسپی لیں۔

دلچسپی تو وہ لیتے تھے۔ اکثر آ کر دیکھتے بھی "گھبراؤ نہیں۔" مسکرا کر کہتے "ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمیوں میں اسے کشمیر لے چلیں گے۔" لیکن ہاجرہ چاہتی تھی کہ نوکرانی کے بچے کی بیماری کی وجہ سے آقا اپنی زندگی حرام کر لیں۔ نرس سے باتیں نہ کریں۔ کور سے کشتی نہ لڑیں۔ یہ سوچ کر ایلی کو آقا پر نہیں بلکہ نوکرانی پر غصہ آتا تھا۔

پھر ایک روز علی احمد کو ایک ضروری خط موصول ہوا۔ خط پڑھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور جلدی سے تیاری کرنے لگے۔ پھر وہ ہاجرہ کے کمرے کے دروازہ پر آ کھڑے ہوئے۔ ہاجرہ اور سب عورتیں بچے کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا حال ہے؟" وہ بولے۔ "واہ تم تو ویسے ہی گھبرا جاتی ہو فضول۔ آخر بیماری جاتے جاتے ہی جائے گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بچے بیمار ہوا ہی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اچھا تو میں دو دن کے لئے سرکاری کام پر جا رہا ہوں۔ گھبرانا نہیں دو روز کے بعد آ جاؤں گا ہاں ہاں ——— ایلی' ایلی یہ لو۔" انہوں نے چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے "خرچ کر لینا۔ اچھا بھائی میں جاتا ہوں۔"

ننھے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سانس اکھڑ رہا تھا۔ منہ سوج رہا تھا۔ ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ رفیقاں کے ہونٹوں پر وہی مبہم سی شرارت آمیز ہنسی تھی۔

فرحت چپ چاپ بیٹھی ابا کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد بڑے اطمینان سے انہیں الوداع کہتے ہوئے تسلی دے رہے تھے "کوئی بات نہیں میں جلد آجاؤں گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

آٹھ دن کے بعد علی احمد لوٹے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چلّانے لگے۔" ایلی کی ماں تمہیں مبارک ہو۔ اب تم تنہا نہ رہو گی۔ تمہارا ایک ساتھی گھر میں آجائے گا۔ ——

"ہائیں تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔" انہوں نے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے کہا اور پھر جیسے یک دم کچھ یاد آجانے پر بولے۔

"ہاں ننھے کا کیا حال ہے؟"

ہاجرہ کے منہ سے ایک دبی ہوئی چیخ سن کر وہ گھبرا گئے۔

"اوہ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں مجھے تار دے دیا ہوتا کوئی آدمی بھیج دیا ہوتا۔ تت تت تت۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ بے حد افسوس ہے۔" انہوں نے آہ بھری۔ "مگر اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں اس طرح رونے سے کیا ہوتا ہے۔ رونا دھونا بے کار ہے۔ بالکل بیکار قسمت میں یونہی لکھا تھا۔" قسمت! ہاجرہ نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام علی احمد صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے "وہ اپنی استانی شام کوٹ کی ہے نا۔ تم جانتی ہونا۔ نہیں جانتی۔ ہاں ایلی جانتا ہے' کیوں ایلی جب تم میرے ساتھ دورے پر گئے تھے اور اس نے تمہیں مٹھائی کھلائی تھی یاد ہے نا۔ اس کی لڑکی ہے۔ سولہ سال کی عمر ہو گی۔ کشمیر میں پرورش پائی ہے۔ رنگ انار سا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جس نے اناج کی جگہ پھلوں پر پرورش پائی ہو۔ اس کا رنگ انار سا کیوں نہ ہو گا۔ ساری بات طے ہو گئی ہے تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ ایلی کی ماں اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ کوئی تو ساتھی ہونا چاہئے۔ لو بس اب تیار ہو جاؤ۔ ایلی کی ماں۔ ہم سب علی پور جا رہے ہیں۔ ایلی کی دادی نے بلایا ہے۔ سارا انتظام تمہیں کو کرنا ہو گا ایلی کی ماں۔ تمہارے سوا گھر میں اور کون ہے۔ ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگے۔

ہاجرہ کی آنکھیں بالکل ہی پتھرا گئیں۔ رفیقاں مسکرانے لگی اور ایلی علی پور جانے کی خوشی میں ناچنے لگا۔ ایلی کو بھائی کی موت پر چنداں غم نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھا ہی ہوا کہ نوکرانی

کے گناہ کا نشان مٹ گیا۔ اب اسے کوئی یاد دلانے والا نہ تھا کہ وہ آسا ہے۔

علی پور جانے کی خبر سن کر ایلی کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ یوں بہل گیا جیسے کوئی بچہ کھلونا ملنے پر بہل جاتا ہے۔ نویں جماعت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے علی پور جانے کی خبر اس کے لئے بے حد خوش کن تھی۔

شہ بالا

علی پور پہنچتے ہی محلے والوں نے ایلی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

"کیوں ایلی کیا باپ کی شادی پر آئے ہو۔ کیا کہتا ہے۔"

"ایلی شہ بالا بنے گا اپنے ابا کا ہے نا" —— "کیوں میاں تمہاری نظر میں بھی کوئی کشمیر کا سیب ہے۔ ابھی سے چناؤ کر لو میاں پھر پچھتاؤ گے۔"

"اے ہے ایلی بیٹے سے مذاق کیوں کرتے ہو۔ وہ کیوں بنے شہ بالا کسی کا۔ اس کے تو دولہا بننے کے دن آرہے ہیں۔ بھئی اسے دق نہ کرو۔"

"کیوں بھئی اماں کو ڈولی میں بٹھا کر کب لائے گا۔ ایلی۔"

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ویسے وہ کوشش تو کرتا تھا کہ کوئی چمکیلی بات کرے لیکن نہ جانے کیوں اسے اس بات پر شرم محسوس ہونے لگتی اور اس کی آواز گلے میں خشک ہو کر رہ جاتی۔ اس پر عورتیں اسے چھیڑتیں۔

"لے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔"

"اے ہے اس کے گلے میں تو آواز خشک ہو گئی۔"

"نہ بیٹے ایلی برا نہ مان۔ اس کا کیا ہے علی احمد تو ہے ہی ایسا۔"

"عورتوں کے بغیر اس کا وقت کتنا مشکل ہے۔ مگر بیٹا چاہے کوئی آئے کوئی جائے گھر کا مالک تو ہی ہے اور گھر کی مالکہ تیری ماں ہاجرہ۔"

"ان آنے جانے والیوں کو کون پوچھتا ہے ماں۔"

ادھر علی احمد کے گرد لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ "کیوں علی احمد نہ رہ سکا تو نئی شادی کئے بغیر شرم نہیں آتی علی احمد۔ یہ کیا تیرے دولہا بننے کا وقت ہے۔ گھر بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ لڑکا دسویں پاس کر چکا ہے۔" "علی احمد کوئی کشمیر کا سیب ہمیں بھی لا دو۔"

لیکن علی احمد کے حلق میں آواز خشک نہ ہوتی تھی نہ ان کا چہرہ زرد پڑتا اور نہ ہی ان کی زبان لڑکھڑاتی اور وہ سب کو کوئی نہ کوئی جواب دے کر خاموش کر دیتے۔ داروغہ سے کہتے بھائی داروغہ کشمیر کے سیب لانے کی چیزیں نہیں۔ بھئی وہ تو ڈال سے توڑ کر کھانے کی چیز ہے۔ ہمت ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔"

جانوں مائی سے کہتے "لو مائی اللہ نہ کرے میں کیوں رہوں شادی کے بغیر مرد ہوں میں م اور وہ بھی تیرا بیٹا۔"

پھر جیواں آکر چلّاتی۔ "علی احمد تیرے تو بال بھی سفید ہو گئے۔"

"ہاں ماں"۔ وہ جواب دیتے "دل سفید نہیں ہوا۔ ابھی ایمان کی روشنی سے منور ہے اور اللہ رسول کی سنت کا لحاظ ہے۔"

"اے ہے۔ علی احمد۔" جیواں ہنس کر دوہتڑ مارتی "تو تو بھانڈ ہی رہے گا۔ ساری عمر۔" اور علی احمد ہنستے اور جیواں چلّاتی اور ان کا گھر قہقہوں سے گونجنے لگتا۔ اس وقت ایلی کو علی احمد سے عقیدت سی محسوس ہونے لگتی۔ ان کی باتیں سن کر وہ ان کے تمام قصور بخش دیتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی علی احمد کی طرح باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان اٹک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رو رو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ ننھے کی باتیں کرتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی۔ "اور پھر ایسا سمجھدار اور متحمل مزاج۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا ہائے اتنی تکلیف وہ بیماری لگی اسے کہ توبہ ہے۔ زہرباد کوئی معمولی بیماری نہیں بہن۔ لیکن اس بچہ نے اُف تک نہ کی۔ رویا ہی نہیں۔ بس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ میں کہاں آگیا جہاں میری کسی کو قدر نہیں۔ جہاں کسی کو میرے دکھ کی خبر نہیں۔"

ہاجرہ کے آنسو از سرنو ٹپکنے لگتے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتی۔ "بیماری میں اس کا مسکرانا نہ گیا۔ یوں مسکراتا۔ جیسے سیانے لوگ مسکراتے ہیں۔ میں روتی تھی اور وہ مسکرا تھا۔ بیماری نے اسے ذرا بھی مہلت نہ دی۔" ہاجرہ وہ رو رو کر بچے کی باتیں کرتی رہتی اور سے آنسو پونچھتی رہتی۔

ہاجرہ بار بار علی احمد کے بے حسی کا قصہ بیان کرتی رہی۔ "انہیں اپنے شغل سے کام۔ کوئی

مرے یا جئے ان کی بلا سے۔ انہیں تو کشمیری سیب کا عشق لگا تھا۔ کہتے تھے۔ کشمیری پھلوں پر پلی ہے۔ دسویں پاس ہے۔ انگریزی فرفر بولتی ہے۔ اچھا ہے بہن ہم بھی اس سے اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا۔ بات کرنا سیکھیں گے۔ مجھے تو خوشی ہے بہن کہ گھر میں میم آئے گی۔ سچ کہتی ہوں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ بہن مجھے کلمے کی قسم مجھے کوئی دکھ نہیں۔ بس یہی دکھ ہے کہ ننھا تڑپ تڑپ کر مر رہا تھا اور میاں کو کشمیری سیب کی دھن لگی تھی۔ دو پیسے کی دوا تک نہ منگوائی۔ نرس دیکھنے آتی تھی تو اس سے ٹھٹھے کئے جاتے تھے توبہ ہے۔ گھر میں کوئی دم توڑ رہا ہو اور لوگ اپنی حرص و ہوس میں کھوئے ہوئے ہوں۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ مجھے سوکن کا دکھ تو نہیں۔ اس ننھے پھول سے بچے کا دکھ ہے۔" اور وہ از سرنو رونے لگتی۔ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا کہ ہاجرہ بچے کا نام لے کر نہ جانے کس دکھ کی وجہ سے رو رہی ہے۔ سوکن کا دکھ نہ تھا تو وہ اتنی قسمیں کیوں کھاتی تھی۔ کلمہ کیوں پڑھتی تھی۔

پہلے تو ہاجرہ ننھے کے لئے روتی رہی اور علی احمد کی بے وفائی کا گلہ کرکے آنسو بہاتی رہی پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ سوکن کی آمد کی وجہ سے رو رہی ہے اور بیٹے کے بہانے اپنے لٹے ہوئے سہاگ پر آنسو بہا رہی ہے۔ ہاجرہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔

یہ نہیں کہ لوگ اس کی قوت برداشت کا مذاق اڑائیں۔ اس پر خاوند پسندی کا جرم عائد کریں۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر علی احمد کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی اور یوں شوق سے انتظامات کرنے لگی، جیسے خاوند کی بجائے اس کے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی۔ انتظامات پر وہ بات بات پر اعتراض کرتی "نہیں نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں دولہن کو یہ پہننے نہ دوں گی۔ دولہن کیا کہے گی۔ سسرال والے کیا سمجھیں گے۔ اور یہ زیور تو اب پرانا ہو گیا ہے۔ دولہن کے لئے نئی طرز کی چیز ہونی چاہئے۔"

اماں کے اس انہماک اور شوق کو دیکھ کر ایلی حیران ہوتا تھا۔ لوگ حیران ہوتے تھے اور حیرانی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ "ہاجرہ تم کیوں جان مار رہی ہو۔ لو خواہ مخواہ۔ چھوڑ کرنے دو آپ ہی اسے۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے انسان کو۔"

یہ سن کر ہاجرہ کی آنکھ میں چمک سی لہراتی۔ "اے ہے بہن اس میں کیا ہے۔ سوکن آئی ہے تو بے شک آئے۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔ جو اللہ نے نصیب میں لکھ دیا بسم اللہ۔"

اس پر لوگ اس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھتے۔ حیرانی شکوک میں بدل جاتی اور وہ سوچتے ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ ایلی بھی ان شکوک کو شدت سے محسوس کرتا اور اسے ماں پر غصّہ آتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے اور اس کے اپنے دل میں شکوک کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس گھر کی تمام تر باتیں ہی عجیب تھیں۔ صرف ایک دادی اماں تھیں جو گھر کی الجھنوں سے دور بیٹھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

ایلی کو صرف دادی اماں پر بھروسہ تھا جو کسی بات میں دخل نہ دیتی تھی اور کھری کھری سنا دیتی تھی۔ "علی احمد رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔" اس نے علی احمد کی شادی کے متعلق صرف یہی ایک جملہ کہا تھا اور پھر خاموش ہو کر جائے نماز پر جا بیٹھی۔

گھر کے باقی تمام لوگ عجیب تھے۔ ابا اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ اماں یوں مکّے کی حاجن بنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہو۔ صرف دو پروں کی کسر تھی اور سیدہ۔ کیسی چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ مسکراتی بھی تو ہونٹوں کے کونوں سے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

گھر کی ان الجھنوں سے اکتا کر ایلی باہر نکل جاتا اور محلے کے لڑکوں کو بلا کر سب کچھ بھول جاتا یا تو وہ ارجمند کے چوبارے میں جا کر کھڑکی کی درز سے ھوراڈ کورا دیکھتا رہتا یا محلے کے کنوئیں کے پاس کھڑے ہو کر انکرائنڈی ماباؤں کو آزماتا یا جمیل کے ساتھ جا کر تنگ گلی میں پیڑے کھاتا یا رضا کی دوکان پر بیٹھ کر اس کی اناپ شناب باتوں پر ہنستا یا بالا کے ہاں جا کر گراموفون سنتا اور یا محلے کے سب لڑکوں کو اکٹھا کر کے میدان میں گیند بیٹ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ ان مصروفیتوں میں دن بیت جاتا اور شام پڑ جاتی اور پھر دادی اماں کی آواز محلے میں گونجتی۔ "ایلی اب تو آئے گا کہ نہیں سارا دن لنڈوروں کی طرح پھرتا ہے۔ آ اب رات ہو گئی۔ ایلی۔" پھر وہ چپکے سے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا اور دادی اماں اسے دیکھ کر غصّے سے چیختی اور وہ بے خوف آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور وہ ہنس پڑتی اور پھر وہ دونوں ایک چارپائی پر سو جاتے اور دادی اماں اسے تھپکتی۔ "سو جا اب لنڈور کہیں کا۔" اس وقت ابا لیمپ کی روشنی میں مہاجنوں کی طرح حساب ملانے میں مصروف ہوتے۔ دو اور تین پانچ' آٹھ۔ تیرہ یہ ہوئے دو سو تیرہ اور ہاجرہ چیزیں دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی "لو یہ قمیص کا کپڑا تو بالکل بے کار ہے۔ دولہن کیا کہے گی۔" اور علی احمد چلاتے "تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ اٹھارہ روپے گز کا ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دو سو تیرہ

اور چھ سو چھبیس یہ ہوئے کل ——"

دولہن

دولہن کی آمد پر محلے میں ایک شور مچ گیا۔ چاروں طرف سے عورتوں نے علی احمد کے گھر کی طرف یورش کر دی۔

"آؤ بہن دولہن کو دیکھ آئیں۔"

"دولہن آگئی کیا؟"

"ابھی آئی ہے ابھی۔"

"ہائے میرا دوپٹہ کہاں ہے؟"

"کہتے ہیں کشمیر میں پلی ہے۔"

"سنا ہے وہ تو انگریزی فرفر بولتی ہے۔" اور وہ دوپٹے سنبھال کر علی احمد کے گھر کی طرف چل پڑتیں۔

دولہن کی آمد کی خبر سن کر ایلی نے جھرجھری لی۔ اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ چپ چاپ کھڑے کا کھڑا رہ گیا نہ جانے کیوں وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔

"اے ہے تو یہاں کھڑا ہے۔ ایلی۔" وہ اسے سہما ہوا کھڑا دیکھ کر بولیں "اور تمہارے گھر میں اللہ کے فضل سے نئی دولہن آئی ہے۔"

دوسری بولی بہن اللہ کے فضل سے کیوں کہو۔ یوں کہو کہ علی احمد کے شوق کی وجہ سے۔"

پہلی بولی: "اب جو آ گئی ہے تو اس پر اللہ کا فضل ہو۔ خوشیاں دیکھے۔"

ایلی حیرانی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ عجیب باتیں تھیں ان کی۔ وہ علی احمد پر غصّے سے بل کھاتیں اور ساتھ ہی ان کی رنگیں مزاجی کی وجہ سے ان کی جانب کھنچی جاتیں۔ ہاجرہ سے ہمدردی کا اظہار کرتیں اور ساتھ ہی اسے موردِ الزام بھی سمجھتیں۔ کتنی عجیب بات تھی۔

دولہن کو دیکھنے سارا محلہ علی احمد کے گھر اکٹھا ہو رہا تھا مگر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اسے گھر نہیں جانا چاہئے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی' لیکن آخر اسے گھر جانا ہی پڑا اور وہ چپکے سے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ بڑے کمرے میں عورتوں کے ہجوم کے درمیان پلنگ پر ایک سرخ رنگ کی گٹھڑی سی لپٹی پڑی تھی دو حنا مالیدہ ہاتھ لٹک رہے تھے۔ کتنی رنگدار مہندی تھی

نہ جانے مونگیا قمیض کی وجہ سے وہ اور بھی سرخ دکھائی دے رہی تھی یا شاید اس لئے کہ ہا
بہت سفید تھے۔ ایلی نے نفرت بھری جھرجھری محسوس کی اور منہ موڑ لیا۔

ادھر عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا "ایلی یہاں آ۔ اپنی امی کو سلام کر آ کر۔"

"سلام جی۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"تجھے ہے لڑکا سلام کہتا ہے۔ اسے پیار تو کر لے دولہن۔"

"اللہ رکھے تیرا بیٹا ہے۔"

"پلا پلایا بیٹا مل گیا تجھے یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔"

مونگیا چادر تلے سے حنائی ہاتھ ایلی کی طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور منہ موڑ
سانس بند کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ اسے حنا کا رنگ دکھائی نہ دے۔ بو نہ آئے۔ سر تھپکنے کے ب
وہ حنائی ہاتھ اس کے منہ پر آ ٹکا۔ مہندی کی بو کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ اس کی آنکھوں میں
ڈورے دوڑ گئے۔ نہ جانے اس بو میں کیا تھا۔ ایلی کے جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا تھا۔ تار تار
لگتا۔ گھبرا کر اس نے اپنا آپ چھڑا لیا اور صحن کی طرف بھاگا۔

"شرماتا ہے۔" ماں جیواں چلائی۔ "بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔"

دوسری بولی "ایسا اچھا بیٹا ملا ہے تجھے۔"

ایلی دادی اماں کے تخت تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا دل مالش کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اند
سب ہنس رہی تھیں۔

"دیکھ آیا اماں کو۔" دادی اماں نے کہا "بیٹھ جا۔" دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

"میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ وہاں مٹی کی ہنڈیا میں۔" دادی اماں اس کے
پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

دوسرے کمرے میں علی احمد مضطربانہ طور پر ٹہل رہے تھے۔ بار بار وہ باہر نکلتے "مائی ج
تجھ پر تو پھر سے جوانی آ رہی ہے۔ ہلدی کا برتن کھاتی ہے کیا؟"

"شرم کر علی احمد۔" مائی جیواں ہنستی۔ "شرم کر۔" لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا
اس کی بے شرمی پر بے حد مسرور ہو۔

چاچی حاجاں چلاتی "لے آ گیا تیرا کشمیر کا سیب۔ تجھے مبارک ہو علی احمد۔"

"کیوں چاچی؟" وہ جواب میں پوچھتے "خسارے کا سودا تو نہیں کیا ہم نے۔"

وہ مسکرا کر کہتی "علی احمد پہلے تو ہمیشہ مٹی پر گرا کرتا تھا۔ اب کی بار تو جیت گیا ہے۔"

"پسند ہے تمہیں چاچی؟"

"اچھی ہے۔ اپنی لڑکیوں کی طرح ہی ہے۔ بیچاری' ناک نقشہ برا نہیں رنگ سفید ہے۔
آنکھیں کالی تو ہیں پر ذرا کھلی کھلی ہیں۔ بہر حال ناک نقشہ برا نہیں۔"

"تیرے ناک نقشے کی طرح ہے کیا۔" علی احمد نے مسکرا کر پوچھا۔

"چل دفعہ ہو منہ کالا۔"

"کیوں چاچی میں کیا بات کہتا ہوں۔" چاچی ہنسے جا رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ایلی پھر دولہن کے کمرے میں جا داخل ہوا اور چوری چوری اسے
دیکھنے لگا۔ سفید جسم سے چارپائی بھری ہوئی تھی۔ اسے سفید رنگ بہت پیارا لگتا تھا اور ان جانے
میں وہ بھرے جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پھر وہ
دولہن کے پاس جا بیٹھا۔ دفعتاً" دوپٹے میں حرکت ہوئی اور ایک بڑا سا سفید منہ ننگا ہو گیا اور وہ
چوری چوری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہائیں۔" اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کے عالی شان محل کو پاؤں کی
ٹھوکر سے چور چور کر دیا ہو۔ دولہن کی آنکھوں میں فرق تھا اور اس کا چہرہ خالی ورق کی طرح
سراسر کورا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو۔ جیسے اس کی توقعات کو ٹھکرایا گیا ہو
اسے جان بوجھ کر غلط فہمی میں مبتلا رکھنے سے علی احمد کا کوئی خاص مقصد ہو گا۔ غصّے سے اس کی
کنپٹیاں بجنے لگیں اور وہ بھاگا۔ دور' دور دولہن سے دور اس جیتے جاگتے دھوکے سے دور باہر
صحن میں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کئی دن تو اس صدمہ کی وجہ سے وہ سخت
اداس رہا پھر اس نے اپنے آپ کو محلے کی زندگی میں کھو دیا تاکہ گھر کے واقعات کو دل سے بھلا کر
اپنی خوشی کو محفوظ کر سکے۔

نماز کمیٹی

اس زمانے میں علی پور میں خلافت تحریک کے تحت نماز کمیٹیوں کا دور دورہ تھا۔ مسلمانوں
میں اسلام کے متعلق بڑا جوش تھا ہر محلے میں نماز کمیٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے علی
الصبح منہ اندھیرے جاگ پڑتے اور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک دوسرے کو جگاتے۔ پھر

جلوس کی شکل میں شہر کا چکر لگاتے۔ محلّے محلّے پھرتے اور گا گا کر لوگوں کو جگاتے۔ نماز پڑھنے کی
تلقین کرتے۔ لڑکوں کو نماز پڑھنے سے اس قدر دلچسپی نہ تھی۔ البتہ اکٹھے ہو کر گاتے ہوئے جگہ
جگہ جانا۔ مجاہدانہ انداز سے گھومنا اور مجاہدانہ شان سے للکار للکار کر گانا یا غازی مصطفےٰ پاشا کمال کی
شان میں قصیدے پڑھنا اور امان اللہ خان کے گن گانا اور علی برادران کو سراہنا ——— ایلی کو
شغل بے حد پسند آیا۔ کیوں نہ پسند آتا محلے کے جوان اس بات میں شان امتیاز سمجھتے تھے۔ جب
وہ باہر نکلتے تو ان کا انداز عجیب ہوتا جیسے ہیرو ہوں۔ جیسے مصطفےٰ پاشا کا گیت گانے والے خود
مصطفےٰ کمال ہوں۔ جنہوں نے زمانے کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بھیس بدل رکھا ہو۔ اس
شغل میں سبھی شریک ہوتے تھے۔ رفیق، اعظم، غلام علی، ضیاء اور صفدر لیکن صفدر اور غلام علی
کی حیثیت صرف منتظمان کی سی تھی۔ وہ صبح جاگتے لال ٹینوں کا انتظام کرتے۔ انہیں جلاتے
پھر نعتوں کی کاپیاں نکال کر گیتوں کی دھنیں قائم کرتے اور بالاخر چھوٹے لڑکوں کو گانے کا کام
سونپ کر خود سگریٹ سلگا کر جلوس کے ساتھ چل پڑتے۔

بڑے لڑکوں میں صرف اعظم تھا جو انتظامات کرنے کے علاوہ گانے میں بھی پیش پیش ہوتا
تھا۔ ایلی اعظم کو دیکھ کر فخر سے پھولے نہ سماتا۔ اس کا لے، گانے کا انداز، گردن اٹھا کر چلنے کی
عادت اور گاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کا انداز ایلی کو بے حد جاذب معلوم ہوتے تھے۔ اس کے
گلے میں یا کندھوں پر ایک شان بے نیازی سے رومال پڑا ہوتا تھا۔ جس پر کمبل بڑی شان سے
لٹکتا اور پھر گاتے ہوئے اس کی گردن کا زاویہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا
کہ وہ بھی اعظم کی طرح بے نیازی سے چلے اور شان استغنیٰ سے گائے اور اس کا کمبل بھی
ویسے ہی لٹکے۔ لیکن سردی کی وجہ سے وہ کمبل میں ٹھٹھرتا ہوا چلتا اور گاتے ہوئے اس کی گردن
پھول جاتی اور آواز چیختی اور کنپٹیاں درد کرنے لگتیں۔ ایلی کی آواز تو بہت بلند تھی لیکن اس کے
گانے میں مٹھاس نہ تھی۔ عام طور پر وہ آواز بہت اونچی نکالتا اور ابتدا ہی میں ایسی سر قائم کرتا
جسے نبھانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ سب اصرار کر کے اسے گانے والوں کے گروپ کا سردار بنا دیتے
یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے وہ بہت سویرے جاگ اٹھتا اور باہر نکل جاتا کہ
کمیٹی کے لئے لیٹ نہ ہو جائے۔

علی پور میں جب وہ جلوس کی صورت میں چلتے تو بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ چھتوں سے
آلود چہرے جھانکتے، منڈیروں سے انگڑائی لیتے ہوئے بازو دکھائی دیتے، بڑے لڑکے سگریٹ

کش لے لے کر کھڑکیوں منڈیروں اور چھتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور ساتھ ہی ٹولی کو
ہدایات دیتے رہتے۔ دریچوں سے مہین آوازیں سنائی دیتیں۔ "آکر دیکھو تو نماز کمیٹی والے
ہیں۔ دیکھ تو۔"

مسجد کے زیر سایہ

دوپہر کے وقت وہ ارجمند کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں "انکرا ینڈی ماباؤں" کے تمام سامان
سے لیس ہو کر کنوئیں کے قریب جا کھڑے ہوتے اور ہر آتی جاتی لڑکی پر انکرا ینڈی چلاتے۔
ارجمند ریشمیں رومال لہراتا۔ اس کے ہونٹ بانسری پر رکھے ہوتے لیکن بانسری بجانے کی
بجائے وہ کچھ اور ہی ظاہر کرتے اور وہ دبی زبان سے کہتا "اف! غضب ہے۔ قیامت ہے۔ اب
لڑکپن چھوڑ دے ظالم شباب آنے کو ہے۔"

ان دونوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر کنوئیں کے پاس والے مکان سے برتن بجنے کی آوازیں آنا
شروع ہو جاتیں پھر کوئی قہقہہ مار کر ہنستی اور با آواز بلند کسی کو پکارتی "عائشاں آئے گی بھی یا
نہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔" اس کے قہقہے سن کر ایلی کو علی احمد کا کمرہ یاد آجاتا اور وہ سوچنے لگتا "کیا
ہر مکان میں علی احمد کا کمرہ ہوتا ہے، کیا ہر بند دروازے کے پیچھے ٹین کے سپاہی چھپے ہوتے
ہیں۔"

پھر دفعتاً ٹاٹ کا پردہ ہلتا اور ایک بھرے جسم کی لڑکی سامنے آکھڑی ہوتی۔ ارجمند کا رومال
ہلتا بانسری منتیں کرتی۔ آنکھیں چمک چمک کر دیکھتیں۔ بازو بغل گیر ہونے کے اشارے کرتے۔
اس وقت ایلی کے ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔
کوئی آنکلتا تو وہ اس انداز سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ جیسے کسی اور کام میں مصروف ہو۔ جیسے اسے
ارجمند سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ راہ چلتے چلتے رک گیا ہو۔ اور ٹاٹ کے پردے سے مسکراتی
ہوئی نوجوان لڑکی کی موجودگی کا اسے قطعی علم نہ ہو جیسے وہ انکرا ینڈی ماباؤں کے عمل سے قطعی
ناواقف ہو۔
ادھر ارجمند کا ریشمیں رومال اس کی گردن پر آگرتا بانسری کا زاویہ بدل اور وہ یوں آسمان کی
طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے اللہ سے لو لگا کر اس کی حمد و ثناء میں کوئی دھن بجا رہا ہو۔
اس کے باوجود آتے جاتے شکوک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے اور پھر مسکرا کر آگے نکل

جاتے۔ ان کے جانے کے بعد ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے چھپی ہوئی لڑکی کا بازو یا آنکھ پھر سے باہر نکل آتی اور ارجمند کا رومال پھر سے لہرانے لگتا۔ ایلی کا دل پھر سے دھڑکنے لگتا اور اس کی پیشانی پھر سے پسینے سے بھیگ جاتی۔ اس خطرناک کھیل میں وہ زیادہ دیر مشغول نہ رہ سکتے تھے اس لئے کہ آتے جاتے لوگ انہیں وہاں اس طور کھڑے دیکھ کر گھورتے تھے۔ شاید خطرناک ہونے ہی کی وجہ سے یہ کھیل ان کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ حالانکہ ایلی کو کبھی اتنی مہلت نہ ملی تھی کہ وہ ٹاٹ سے جھانکتے ہوئے چہرے کو نظر بھر کر دیکھ سکے وہ صرف یہی جانتا تھا کہ وہ بڑا سا چہرہ سفید سفید ہے اور وہ بانہیں مخملیں گوشت سے لبالب بھری ہیں اور وہ آنکھیں بے حد کالی اور شوخ ہیں۔

پھر وہ دونوں کنوئیں کو چھوڑ کر پرانی حویلی کے میدان میں آکھڑے ہوتے۔ اس میدان میں کسی زمانے میں ایک حویلی تھی' جو اب منہدم ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف چند ایک پختہ مکانات تھے۔ شمال کی سمت میں ایک گلی نکل گئی تھی' جس میں دور تک کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ گلی آصفی محلے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ پرانے زمانے میں آصفیوں کا کام کرنے والے کمیں' یہ گلی انہیں کی تھی اگرچہ اب ان کی مجلسی حیثیت آصفیوں سے کسی صورت کم نہ تھی۔

پرانی حویلی کے میدان کے پرے مشرق میں شیخوں کے چند ایک مکانات تھے۔ کنوئیں کے پاس ایک مکان میں سید آکر آباد ہو گئے تھے اور اس کے قریب چند کشمیری آبسے تھے۔ اس لئے آصفی محلہ صرف مغربی حصہ تک محدود تھا۔ وہ پختہ وسیع میدان جسے منڈی کہتے تھے' اس کا مرکزی حصہ تھا۔ آصفی لڑکے عام طور پر اس مرکزی حصے میں کھیلنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں کھیلنے سے انہیں محلے کی عورتوں کی نگاہوں تلے رہنا پڑتا تھا اور وہ بات بات پر اعتراض کرتیں "اے نالی کا گند اچھالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سارا دن نلپاک چھینٹے اڑاتے رہتے ہو۔ چھوڑو اس گندے کھیل کو۔" گلی میں کھیلنے پر وہ چلاتیں۔ "کسی کا سر پھوڑ کر اطمینان کا سانس لو گے تم یہ کیا شریفوں کا کھیل ہے۔" منڈی میں انکرائنڈی ماباؤں کا کھیل تو بالکل ناممکن تھا۔ وہاں تو ریشمی رومال تک لہرایا نہ جا سکتا تھا۔ بانسری بجانا تو الگ چیز تھی۔ اگر وہاں ریشمی رومال لہرایا بھی جا سکتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ منڈی کے گرد رہنے والی لڑکیاں کھڑکیوں میں نہیں آسکتی تھیں۔ یا تو ان میں اس قدر جرات نہ تھی اور یا شاید حس ہی نہ تھی۔

دبے پاؤں چلتیں جیسے پاؤں کی آہٹ ان کی دشمن ہو۔ نیچی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بند ہونٹوں سے مسکراتیں اور یوں آہستہ بولتیں جیسے وہ لڑکیاں نہیں بلکہ چلتے پھرتے سائے ہوں اور پھر منڈی میں ہر آہٹ پر بوڑھیوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔

"کون ہے۔ اے ہے شریفوں کے بیٹے بھی اب بانسریاں بجانے لگے۔ میراثی بن گئے۔ کیا توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔"

"ریشمی رومال لہراتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا۔" چاروں طرف سے بوڑھیاں کھڑکیوں میں آجمع ہوتیں۔ "یہ ذرا دیکھنا ماں برکتے۔ چاچی حاجاں ذرا آؤ تو۔"

سارے محلے میں انکرائنڈی ماباؤں کے لئے صرف دو مناسب مقامات تھے ایک تو کنوئیں کے پاس مسجد کے قریب جہاں بڑی ڈیوڑھی تھی اور دوسرے پرانی حویلی کے میدان میں بڑی لالٹین کے نیچے ——

کپ اور کیپ

جب وہ دونوں لالٹین کے نیچے کھڑے ہوتے اور ارجمند بانسری کی سروں کو چھیڑتا تو دفعتاً عصمت اللہ کے مکان کی کھڑکی کی چق کو حرکت ہوتی جسے دیکھ کر ارجمند زیر لب کہتا "وہ مارا دیکھا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔" پھر وہ چق کی طرف دیکھ کر آنکھیں چمکاتا اور ایلی سے مخاطب ہو کر کہتا "دیکھا ادھر بین بجی ادھر سانپ ناچنے لگا۔ اسے کہتے ہیں انکرائنڈی ماباؤں۔"

ارجمند کی باتیں سن کر ایلی فخر محسوس کرتا کیونکہ ارجمند کی فتح اس کی اپنی فتح تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سانپ کون ہے۔ کہاں ہے اور اس کے ناچنے کا مطلب کیا ہے۔ چق کی طرف تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ مگر اتنی دور سے چق کے پیچھے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پھر وہ دوسری جانب دیکھنے لگتا شاید سانپ ادھر ناچ رہا ہو۔

اسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر ارجمند چلاتا "نہیں یار۔ کیپ کیپ سمجھے کیپ کھڑکی میں آ بیٹھی ہے وہ ہلی چق' وہ اب دیکھا۔ اف یار کس غضب کی چیز ہے بس سمجھ لو بالکل تیار ہے۔ ذرا سی کسر ہے ایک آنچ کی اگر ہماری ڈسپنسری یہاں علی پور میں ہوتی اور کیپ کسی روز دوا لینے آنکلتی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ صاف ہو جاتا۔ لیکن اب یہاں ڈسپنسری جو نہیں کیا کیا جائے۔"

ایلی محسوس کرتا کہ انگرایئڈی ماباؤں میں ایک ڈسپنسری کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ سوچنے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ڈسپنسری اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ ڈسپنسریاں تو علی میں بھی تھیں۔ جہاں لمبی میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر روئی کے پھاہے پڑے ہوتے کمپاؤنڈر قینچی لئے کھڑا رہتا۔ پھر بڑی بڑی بوتلیں اور وہ عجیب سی بو جسے سونگھنے سے انسان مخواہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بیمار ہے اور وہ ڈاکٹر جس کے ماتھے پر شکنیں پڑی رہتیں۔ ہاتھ میں ربڑ کی ٹوٹیاں لگتیں۔ جو نہایت خشک آواز میں باتیں کرتا تھا۔ اور مریضوں کی بات یوں پروائی سے سنتا تھا۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ ایسی جگہ کے ہونے سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا تھا فائدے سے ارجمند کا مطلب کیا تھا۔

"کیپ کیپ۔" ارجمند کی آواز سن کر ایلی پھر چونکتا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا کھڑکی میں ا زرد رو لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور وہ نگاہیں پھیر لیتا پھر ارجمند کا رومال ہلا اس کے بالوں اور گالوں سے مس کرتا ہوا چھاتی پر آ کر رکتا اور ارجمند اسے یوں گلے لگا لیتا جیسے جاندار چیز ہو۔ یہ دیکھ کر کیپ مسکراتی اور لوچدار آواز سے پڑوسن کو بلاتی۔ "سکینہ، سکینہ۔"

وہ دونوں اسے کیپ کہا کرتے تھے۔ یہ نام ارجمند نے تجویز کیا تھا تاکہ سننے والوں کو معل نہ ہو کہ وہ کس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ایلی جب چوگان میں لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہو ارجمند اس کے پاس آ کر بہانے سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ جس سے ایلی کو معلوم ہو جا کیپ کے متعلق کوئی بات ہے یا کیپ کھڑکی میں کھڑی ہے یا وہ چوگان کی طرف آ رہی ہے یا کے سکول سے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اگر کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے ایلی ارجمند کا اشارہ نہ سمجھتا تو ارجمند ٹوپی کے متع کوئی بات کر دیتا۔ ایلی ہم نے ایک کیپ خریدی ہے آؤ دکھائیں۔ غضب کی چیز ہے۔ ا خوبصورت رنگ ہے کہ تمہیں کیا بتائیں۔ واہ واہ دیکھو اور پھڑک جاؤ۔"

اس پر ایلی کی سمجھ میں آ جاتا کہ کوئی بات ہے اور پھر ایلی کسی بہانے کھیل چھوڑ کر ا کے ساتھ چل پڑتا اور وہ دونوں پرانی حویلی کے میدان میں جا کھڑے ہوتے اور کیپ کھڑکی آ کر سکینہ کو آوازیں دیتی اور با آواز بلند ہنستی یا انگریزی پڑھتی یا ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی سکینہ سے باتیں کرنے لگتی۔

"کل چھٹی ہے نا۔ پرسوں سے سکول کا وقت بدل جائے گا۔ پرسوں سے نو بجے

سکول ——— اور ڈھائی بجے ختم ہو گا۔"

اس پر ارجمند چلاتا "نوٹڈ نوٹڈ" اور پھر زیر لب گنگناتا "ڈارلنگ مابدولت تین بجے ڈیوڑھی پر ڈیوٹی دیا کریں گے تاکہ حضور کا باقاعدہ استقبال کیا جائے جو حضور کے شایان شان ہو۔" اتنے میں کیپ کے گھر سے ایک چھوٹی سی لڑکی مسکراتی ہوئی نکل آتی۔

ارجمند چلاتا "کپ کپ، مدھ بھری پیالی۔"

وہ خواہ مخواہ شرماتی اور مسکاتی اور ان کے پاس سے گزر جاتی۔

"مدھ بھری پیالی۔" ارجمند با آواز بلند کہتا "چند سال کے بعد کیا غضب ہو گا۔ کیا قیامت ٹوٹے گی۔ کیا فتنہ بیدار ہو گا۔ اف پیالی پیالہ بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی کلی کھل کر چمن ہو جائے گی کیا سمجھے ایلی۔"

ایلی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھتا۔ ارجمند کی باتیں کس قدر دلفریب تھیں۔ اسے کیسے اچھے فقرے یاد تھے اور وہ اردو کس بے تکلفی سے بولتا تھا۔ "کاش" ایلی سوچتا "میں بھی پانی پت جاتا اور وہاں سے خوبصورت زبان سیکھ آتا اور پھر میں بھی ایسے جملے بول سکتا۔" لیکن ایلی تو سیدھی سادھی بات کرتے ہوئے بھی جھینپ جاتا تھا پاگلوں کی طرح وہ کپ کی طرف دیکھ تو سکتا تھا لیکن بات نہ کر سکتا تھا اور وہ پیالی تھی بھی تو بے حد خوبصورت۔ کس قدر سفید رنگ تھا اور اس پر سرخی جھلکتی تھی۔ ایلی اسے دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتا تھا مگر وہ پیالی بہت ہی چھوٹی تھی اور اس کی سیاہ اور شفاف آنکھیں خوبصورت ہونے کے باوجود ان نگاہوں سے خالی تھیں جو بڑی لڑکیوں کی آنکھوں سے چھلکتی تھیں نہ جانے ان میں کس چیز کی کمی تھی کپ میں مدھ تو بھری تھی اور وہ چھلکتی بھی تھی مگر وہ مدھ اس مدھ سے کس قدر مختلف تھی جو کیپ سے چھلکا کرتی تھی۔ حالانکہ کیپ رعنائی اور حسن میں کپ کے مقابلے میں ہیچ تھی۔

جب کپ لجائی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی تو ارجمند ہنس کے کہتا "جان من کیا دو سال کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو گی بھلا نہ دینا خاکسار کو۔"

کپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور ایلی کا دل گویا کھل کر پھول بن جاتا۔

ارجمند کہتا "چلو بھئی اب کوری ڈکوری کی باری ہے۔ دعا کرو سائز بڑا نہ ہو۔" پھر وہ ارجمند کے گھر بند کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکتے رہتے۔ لیکن عام طور پر ان کا شوق پورا نہ ہوتا اور سامنے کا دالان ویران رہتا۔ اگر کبھی کوئی عورت غسل کرنے آتی بھی تو ایلی کی آنکھیں آپ ہی

آپ بند ہو جاتیں اور وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ جرم کر رہا ہو لیکن اس وقت اس کا دل
نسیں تھرکتیں اور سانس مشکل سے آتا۔ یہ کیفیت تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ پر لذت
تھی ایلی کی تمام تر دلچسپی اس کیفیت سے وابستہ تھی۔ اس منظر سے نہیں وہ منظر صرف اس
ضروری تھا کہ اس کی موجودگی سے ایلی کو یہ کیفیت حاصل ہوتی تھی۔

نسانذیراں

ہکوری ڈکوری سے فارغ ہو کر ایلی جمیل کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں مل کر روپے
جو جمیل نے ماں کی صندوقچی سے چرائے ہوتے ایک دو تین چار ——— پھر وہ مل کر منصو
بناتے۔ منصوبے بناتے وقت سامنے چوبارے میں ایک لڑکی آجاتی انہیں دیکھ کر لڑکی کو نہ
کیا ہو جاتا۔ وہ اٹھ بیٹھتی چار ایک قدم چلتی پھر لوٹ آتی پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر انگڑائیاں
پھر سرہانہ اٹھا کر اسے سینے سے لگاتی۔ گود میں بٹھاتی پھر وہ ناچنا شروع کر دیتی۔ ناچ ختم ہو
وہ پھر سے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتی۔ از سر نو کھڑکی میں آجاتی۔ دوپٹہ اتار کر پھینک د
بالوں کو لپیٹ لیتی پھر انہیں کھول دیتی۔ پھر دوپٹہ اوڑھ لیتی اور از سر نو ناچنے لگتی۔ ایلی نے
مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے جمیل سے بات نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ ا
انکرا ینڈی ماباؤں کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ کھیل تو ارجمند کی موجو
محتاج تھا۔ جمیل کو ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فی الحال وہ تو ماں کی گٹھڑی میں سے
چرانے اور دوستوں کو پیڑے کھلانے کے دلچسپ مشغلے میں کھویا ہوا تھا۔

لیکن ایک روز جمیل نے اس سیماب صفت لڑکی کو دیکھ لیا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا
کھیل اسے بہت پسند آیا اور وہ دونوں شدت سے اس جوان لڑکی کی طرف دیکھنے لگے جو دو
چوبارے میں نہ جانے کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ کیسا ناچ ناچ رہی تھی۔ پھر ان کا یہ معمول
اور ایلی کے لئے جمیل کے چوبارے میں انکرا ینڈی ماباؤں کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انکرا ینڈ
اس باب میں ایک عجیب و غریب خصوصیت تھی نہ تو اس میں ریشمی رومال ہلانا پڑتا تھا
بانسری بجانے کی ضرورت تھی۔ نہ پریم پتروں کی کتاب کھولنی پڑتی تھی۔ بس وہ صرف
کھول کر اس میں بیٹھ جاتے باقی سب کچھ وہ لڑکی خود کیا کرتی تھی۔ جب ایلی اکتا جاتا تو وہ
آتا۔

جب وہ گھر کی سیڑھیوں کے قریب پہنچتا تو نذیراں اسے دیکھ کر کسی بہانے اپنا کام چھوڑ کر
ان کی ڈیوڑھی میں آجاتی "کہاں سے آئے ہو؟" وہ اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے پوچھتی
اور اس قدر قریب آجاتی کہ اس کے جسم کی بو ایلی کی ناک پر یورش کر دیتی اور نذیراں کا سانس
اس کے منہ سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا اور نذیراں ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی
بانہیں ایلی کی طرف بڑھتیں اور گھبرا کر ایلی پیچھے ہٹ جاتا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" وہ اس کی طرف بڑھنے لگتی۔

"یہیں۔ یہیں۔ ذرا باہر گیا تھا۔" وہ کنی کترا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتا اور پھر بھاگ کر
اوپر چڑھ جاتا۔ اسے یوں اوپر چڑھتے ہوئے دیکھ کر دادی اماں پوچھتیں۔

"کیا ہے تمہیں ایلی۔ یوں بھاگ کر کیوں چڑھتے ہو سیڑھیاں جیسے کوئی پیچھا کر رہا ہو۔"

ایلی ڈر کر پیچھے دیکھتا کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہی۔؟

"کیا ہے ان سیڑھیوں میں؟" وہ پھر پوچھتیں۔

"کچھ نہیں دادی اماں کچھ نہیں۔"

نذیراں کو دیکھ کر اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انکرا ینڈی ماباؤں کا کھیل
کھیل سکتا ہے اور ڈسپنسری کے بغیر ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ اسے ریشمی رومال کی ضرورت
ہے اور نہ شعروں کی کتاب کی۔ لیکن اس کے ذہن میں کامیابی کی نہ تو آرزو تھی اور نہ یہ شعور
تھا کہ کامیابی کا مطلب کیا ہے' اُسے وہ لڑکیاں بے حد پیاری لگتی تھیں جو دور کسی کھڑکی سے
جھانکتیں اور مسکراہٹ بھری نگاہ چھلکا کر کھڑکی بند کر لیتیں۔ اسے وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جن کے
چہروں پر اداسی چھائی ہوتی۔ ایسی لڑکیاں جن کی صورت روئی روئی ہوتی جو ہائے اللہ کہہ کر بھاگ
جاتیں وہ نہیں جو آگے بڑھ کر اسے گھیر لیتیں اور پوچھتیں کہاں سے آئے ہو۔

مُکلاوا

ایک دن جب وہ حسب معمول نذیراں سے خوف زدہ ہو کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو ابا نے
اسے آواز دی۔ "ایلی" وہ گھبرا گیا نہ جانے ابا نے کیوں بلایا تھا کہیں وہ سیڑھیوں کی بات سے
واقف تو نہ تھے۔

ایلی ڈرتے ڈرتے قریب گیا "آج تم شمیم کے ساتھ شام کوٹ جا رہے ہو سمجھتے جاؤ تیاری

کر لو۔" علی احمد نے کہا۔ خوشی سے ایلی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ایک نئی جگہ جائے گا۔ شام کوٹ۔

شام کوٹ کے نام سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ صفیہ شام کوٹ کی رہنے والی ت[illegible] اگرچہ اسے وہاں جانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسی روز وہ شام کوٹ کو روانہ ہو گیا۔ شام کوٹ [illegible] نئے محلے میں اپنی نئی ماں کا گھر دیکھ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی ایک ڈیوڑھی کے پیچھے ایک چ[illegible] سا تنگ و تاریک صحن تھا جس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت چا[illegible] باندھے بیٹھی تھی۔ چادر میں وہ کس قدر بھدی لگ رہی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا انداز بھی تو عج[illegible] تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو بلکہ کوئی بے حس گنوار مرد بیٹھا ہو۔

ایلی کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ "خیر سے بسم اللہ" اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگ[illegible] "بیٹھ جا۔ سنا علی احمد کا کیا حال ہے۔ آپ کیوں نہیں آیا وہ۔ بہت بننے لگا ہے اب پہلے تو یہ با[illegible] نہ تھی۔ دو سال میری منتیں کرتا رہا۔ میری دہلیز پر بیٹھا رہا۔ میری بیٹی کشمیر میں پلی ہے ہاں بڑ[illegible] نازک ہے وہ۔ اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ ورنہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے بھی ساری ع[illegible] سرکاری نوکری کی ہے۔ عمر بھر استانی کا کام کیا ہے۔ تم آئے ہی تھے نا۔ ہمارے سکول میں یاد[illegible] نا تمہیں۔"

دفعتاً ایلی کو یاد آیا۔ ہوں! یہ تو وہی استانی تھی۔ جو اس روز پردے کے پیچھے کھڑی عل[illegible] احمد سے باتیں کر رہی تھی۔ ایلی نے گھن سی محسوس کی۔ کیا سبھی استانیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں[illegible] کیا ان میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ کیا وہ مردوں کی طرح چادریں باندھتی ہیں۔

"لڑکے ذرا حقہ تو بھرنا۔" استانی نے کسی کو آواز دی اور پھر اپنی تقریر جاری کر دی۔ "م[illegible] نے پورے پندرہ سال ملازمت کی ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت نہ تھی۔ نوکری کرنے کا بڑ[illegible] شوق تھا پڑھانے کا شوق۔"

اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے محکمہ تعلیم کی بجائے پولیس کی نوکری ک[illegible] ہو۔ علی احمد کی بات کرتے ہوئے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کماحقہ واقف ہو۔ جیسے علی احمد کے متعلق بات کرتے ہوئے اسے تکلفات کی ضرورت نہ ہو۔ ا[illegible] کے باوجود یا شاید اسی لئے اس کی گفتگو میں نفرت کی جھلک تھی۔ بات بات پر وہ اپنے گھرانے ک[illegible] عظمت کا ذکر چھیڑ دیتی اپنی بڑائی جتاتی اور بالآخر اپنی بیٹی کی نزاکت طبع کی طرف اشارہ کرکے ا[illegible]

کو متنبہ کرتی کہ اس کی بیٹی کو احتیاط سے گھر میں رکھیں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ "قاسم" اور ایک جوان لڑکا باہر آ گیا۔ "یہ تیرا ماموں ہے۔" وہ بولی۔ ایلی نے ماموں کو سلام کیا لیکن وہ حیران تھا کہ جس قدر استانی کا چہرہ اور انداز نسائیت سے خالی تھا' اس قدر قاسم کا مردانہ پن سے محروم تھا۔

دو ناگ

اس گھر میں سب سے زیادہ قابل قبول شخصیت اس کی نئی امی شمیم کی ہی تھی۔ شمیم میں نہ تو استانی کی سی بیباکی تھی اور نہ قاسم کی سی مجہولیت۔ البتہ ایلی کو ایک تکلیف ضرور تھی۔ جب بھی شمیم اس کے پاس آتی تو اس کی چادر سے دو حنا مالیدہ ہاتھ نکل آتے۔ جن کی سفیدی کی وجہ سے حنائی سرخی اور بھی شوخ دکھائی دیتی اور حنا کی سرخی کی وجہ سے ہاتھوں کی سفیدی اور بھی دودھیا۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان جانے میں وہ محسوس کرتا جیسے کوئی جرم ہو' گناہ کر رہا ہو۔ شمیم محبت جتانے کے لئے اپنے حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی اور ایلی انہیں اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر سہم جاتا اور دور ہٹنے کی شدید کوشش کرتا مگر بالآخر وہ دو حنائی ناگ اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ حنا کی بو سے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ گرد و پیش دھندلا جاتے اور پھر —— شرم سے اس کا سر جھک جاتا وہ اپنی نگاہ میں ننگا ہو جاتا۔ ننگا اور شرمسار۔

اس طرح اس کی زندگی میں ہاتھوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ماں کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کے ذہن میں حنائی رنگ کا جنسی زندگی سے تعلق استوار ہوتا گیا۔ ان کے گھر میں جو عورت آتی تھی۔ اسے براہ راست یا باپ سے تعلق ہوتا تھا اگر وہ ان کے بند کمرے میں جا پہنچتی تو بھی اور اگر وہ اس کی زد سے بچنے کی کوشش کرتی تو بھی۔ بہر صورت ہر عورت جو اس مکان میں آتی تھی اسے علی احمد سے تعلق ہوتا اثباتی یا منفی تعلق۔

لیکن اس زمانے میں اسے اثبات نفی کا شعور نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا کہ بند کمرے کے طلسم کو توڑ کر ٹین کے سپاہی کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کو نجات دلائے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی خواہ مخواہ چند ایک خیالی تصاویر اس کے ذہن میں اتر آتیں اور وہ لاحول پڑھنے سے مخلصی نہ ہوتی۔ پھر وہ اس خیال کو بھولنے کی کوشش میں لگ جاتا۔ لیکن ٹین کے سپاہی سے مخلصی پانے والی حسین ماں جسے چھوڑ کر وہ بھاگ رہا ہوتا اپنی گود سے حنائی ہاتھ

نکال کر اشارے کرتی۔ "ایلی۔ ایلی ٹھہرو مجھے ساتھ لے جاؤ۔ ایلی" —— اور حنائی ہاتھ اس
طرف بڑھتے چلے آتے۔

شمیم کے حنائی ہاتھوں سے ڈر کر وہ قاسم کے پاس جا بیٹھتا گرچہ اسے قاسم قطعی طور پر پ
نہ تھا۔ پھر بھی اسے وہاں سکون و اطمینان تو میسر ہو جاتا تھا نہ جانے قاسم میں کیا تھا۔ اس کے
پر بال نہ تھے اور یہ بات ایلی کو ناگوار تھی۔ اس کا صاف سنہرا جسم دیکھنے سے وہ کتراتا تھا
قاسم قمیض پہنے بغیر بیٹھا رہتا۔ اب وہ قاسم کو قمیض پہننے پر کیسے مجبور کر سکتا تھا پھر اس کی
استانی بھی تو بدن کو ڈھانپنے کے متعلق محتاط نہ تھی اس کی قمیض کے بٹن اکثر کھلے رہتے تھے
جس میں لٹا ہوا پامال جسم کسی بند کمرے اور ٹین کے سپاہی کی غمازی کرتا تھا۔

بڑھیا کے جسم کی طرف دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی۔ اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں
دیکھ اسے غصہ آتا۔ اسے حنا سے ہاتھ رنگنے کا کیا حق تھا۔ اسے ان بوتلوں کو لٹکانے کا کیا
تھا۔ شدید نفرت سے گھبرا کر وہ اندر کمرے میں جا گھستا جہاں وہ لڑکی شاد چپ چاپ بیٹھی کام میں
مشغول ہوتی۔ شاد' عجیب نام تھا اس کا لیکن اس کا رنگ زرد کیوں رہتا تھا۔ حالانکہ چلنے پھر
اور کام کرنے میں وہ بے انتہا تیز تھی۔ کس پھرتی سے کام کرتی تھی وہ —— سارے گھر میں
صرف شاد ہی ایسی لڑکی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک وجوہ
تھیں۔ ایک تو وہ پتلے دبلے جسم کی لڑکی تھی۔ دوسرے اس کا رنگ سفید نہ تھا اور تیسرے اس
کے ہاتھ حنا مالیدہ نہ تھے۔ حنا مالیدہ ہاتھ اس کے لئے صرف اس صورت میں پریشان کن ہو
کرتے تھے' جب ان کا رنگ گورا ہو اور دیکھنے میں وہ گدگدے محسوس ہوں۔

چند دن شام کوٹ رہنے کے بعد وہ مکلاوا لے کر واپس علی پور پہنچ گیا اور چند ہی دنوں
کے بعد علی احمد اپنے حنائی ناگ لے کر واپس نوکری پر چلے گئے اور ایلی علی پور میں اکیلا رہ گیا۔

اس بات پر اسے بے حد مسرت ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ اسے علی
نے بند کمرے' ٹین کے سپاہی اور حنائی ناگوں سے نجات مل گئی ہے اور وہ مجرم نہیں ہے۔ اس
نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

لیکن اس کے باوجود محلے میں کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہو جاتا' جس سے اس کے دل میں
ہاتھوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اس کے دل میں پھر لذت اور گناہ کا احساس ابھرتا۔

چوزے اور گدھ

حنائی ہاتھوں کے سحر سے بچنے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتا اور گھومتا پھرتا۔ ارجمند' جمیل

سعیدہ کے گھر پہنچ جاتا۔ سعیدہ ایلی کی خالہ زاد بہن تھی۔ حسن دین کی بیوی ہونے کے باوجود وہ
حسن دین سے کس قدر مختلف تھی۔ حسن دین محکمہ ڈاک میں ملازم تھے اور اکثر علی پور سے باہر
رہا کرتے تھے۔ لیکن اگر علی پور میں ہوتے تو بھی ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ باہر ہوں۔ ان کی
موجودگی اور غیر موجودگی میں چنداں فرق نہ تھا۔ اول تو وہ بات کرنے کے قائل ہی نہ تھے اور
کرنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ مکمل نہ ہو سکتی بلکہ ادھوری رہ جاتی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نظر سعیدہ کی طرف ڈالتے اور پھر مسکرا دیتے۔ یہی ان کی
سب سے بڑی بات ہوتی جسے صرف سعیدہ سمجھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان کا احساس کمتری
ادھوری کوشش اور سعیدہ سے قلبی تعلق سبھی کچھ واضح ہو جاتا پھر وہ اپنی حاضری کے باوجود گویا
مکان سے ناپید ہو جاتے اور سعیدہ اس مسکراہٹ سے اخذ شدہ احساس برتری میں پھولے نہ
سماتی۔

سعیدہ کے مکان میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اسے بھیڑ رکھنے سے بے حد دلچسپی تھی۔
وہ اپنی کھڑکی سے آتے جاتے کو آواز دیتی۔ "رفیق کہاں جا رہا ہے تو۔" "فرحت تو آج آئی نہیں
ادھر" "زبیدہ لو تم کہاں جا رہی ہو —— بازی نہیں لگے گی کیا" "آؤ نا ایلی آج تو پارٹی کا
بندوبست ہونا چاہئے۔"

سعیدہ' زبیدہ اور آصفہ تینوں سگی بہنیں تھیں۔ زبیدہ رحم علی سے بیاہی جا چکی تھی اور
آصفہ مولانا عبداللہ سے ویسے تو تینوں بہنیں مزاج کی رنگین واقع ہوئی تھیں۔ مگر سعیدہ میں بہت
زیادہ مجلسی عنصر تھا۔ اس کا گھر بھی محلے کے مرکزی مقام پر تھا۔ وہ ادھر ادھر سے لوگوں کو بلا کر
اپنے گھر میں اکٹھا کر لیا کرتی اور پھر وہاں تاش کی بازی شروع ہو جاتی۔ چور سپاہی یا بھابھی دیور کا
کھیل چلتا۔ چور سے باقاعدہ ایک اکنی بطور جرمانہ وصول کی جاتی اور پھر یہ اکنیاں اکٹھی کر کے کچھ
منگایا جاتا یا پکایا جاتا اور بالآخر سب لوگ مل کر کھاتے پیتے۔ اس شغل کے دوران سعیدہ کا گھر
قہقہوں سے گونجتا۔ ایک دوسرے سے مذاق کئے جاتے۔ فقرے کسے جاتے۔

ویسے سعیدہ کے گھر میں تو روز ہی ہنگامہ رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ خصوصی طور پر مولود
شریف کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ فرش پر سفید چادریں بچھائی جاتیں۔ گلاب چھڑکا جاتا۔ کھانے کو
الائچیاں اور پان مہیا کئے جاتے۔ شام کو عورتیں اکٹھی ہو کر نعتیں پڑھتیں اور مرد دور کسی جگہ

بیٹھ کر سنتے یا قریب ہی کسی مقام پر چھپ کر دیکھتے۔ گانے کے علاوہ سعیدہ کو ناچنے کا بھی بے
شوق تھا۔ اکثر وہ چند ایک قریبی بہنوں اور بھائیوں کو بلا کر گانے کی محفل جما لیتی اور پھر
ٹلے دار ٹوپی پہن کر ڈھولک کے ساتھ ناچتی اور اپنے حنائی ہاتھوں کو عجیب انداز سے لہراتی
ایلی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہو اور حنائی ہاتھ کوئی جیتا جاگتا طلسم ہوں اس وقت اس
نگاہ میں گرد و پیش دھندلانے لگتے اور وہ چپکے سے وہاں اٹھ کر اپنے گھر دادی اماں کے پاس
لیٹنے کے لئے آجاتا۔

دادی اماں اسے تھپک کر سلاتی "کچھ بھی تو نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں سو جا اب" لیکن دا
اماں کی تسلیوں کے باوجود یا شاید ان تسلیوں کی وجہ سے وہ محسوس کرتا کہ کچھ ہے۔ نہ جا
کہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل کے نچلے پردوں میں لہر
لے رہا ہے۔ طوفان بپا کر رہا ہے۔ لیکن دادی اسے تھپکے جاتی۔ "سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔
جا۔" اور بالآخر وہ سو جاتا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے سامنے حنائی ناگ لپکتے اور ایک بھا
بھرکم جسم ناچتا ناچتا اس کی طرف بڑھتا اور پھر دھڑام سے اس کی چھاتی پر آگرتا اور اس کا دم رک
جاتا اور وہ چیخ مار کر جاگ اٹھتا۔ دادی اماں اٹھ بیٹھتیں۔ "کیا ہے تجھے ایلی۔ ڈر گیا ہے کیا۔
جانے سارا دن کہاں کہاں کھیلتا ہے۔ کس کس مقام پر بیٹھتا ہے تو۔ تجھے جو کہا ہے میں نے کہ
سخت مقام پر نہ جایا کر۔ رات کو تو ڈرنا ہی ہوا اس وجہ سے' اب سو جا۔" دادی اماں کو کیا معلو
تھا کہ وہ عمر کے کیسے سخت مقام پر آپہنچا ہے۔

صبح سویرے ایلی پھر باہر نکل جاتا اور محلے کی زندگی کی گہما گہمی میں کھو جاتا بوڑھی عورتیں
اس کی طرف اپنے جھلی دار پنجے بڑھاتیں۔ "ایلی ہے جیتا رہ بیٹے۔ خدا عمر دراز کرے۔ تیری ا
کا کلیجہ ٹھنڈہ رہے میں کہتی ہوں۔" وہ راز دارانہ طور پر ایلی پر جھک جاتیں۔ "اللہ رکھے جائیدا
کا وارث تو ہی ہے۔ تو ہی گھر کا مالک ہے اور یہ جو آتی جاتی ہیں۔ کلمو نہیاں یہ سب چڑیلیں
ہیں۔ سب دفعان ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ تو ہی گھر کا مالک بنے گا۔ کھیلنے جا رہا ہے۔ تو جا بچے
دو گھڑی کھیلنا اچھا ہی ہوتا ہے۔" عورتوں سے بچ کر وہ محلے کے کسی بوڑھے کے ہتے چڑھ جاتا۔
"میاں ایلی کہاں ہیں وہ تیرے ابا آج کل۔ نیا بیاہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔ وہ دماغ پھر
ہے اس کا لیکن بھئی ایک خوبی ضرور ہے۔ اس میں محلے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔ خیر ا
اعمال کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھ۔ اپنے ابا کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ سمجھے۔

اچھا لڑکا ہے۔ لیکن اب محلے کے لڑکوں کے ساتھ مل کر تو بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ اچھا جا کھیل جا۔"

ارجمند ایلی کو دیکھ کر ریشمیں رومال لہراتا "ارے یار بس تم تو سوئے ہی رہتے ہو۔ ابھی ابھی کیپ اور کپ سکول جا رہی تھیں۔ کیا بتاؤں آج کیا ٹھاٹھ تھے۔ غضب ہو گیا۔ سرخ قمیص جیسے خون سے رنگی ہو۔" دفعتاً" پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکتا۔ "آخا" وہ بات کاٹ کر کہتا "ارے وہ دیکھو تو میاں پہلوان بھی آگئے وہ دیکھو کنوئیں کے پاس۔"

"وہ دیکھا سلام کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کیا سمجھے یہ ماتھے سے مکھی نہیں اڑائی جا رہی۔ اس وقت مکھی کہاں۔ کیوں ایلی ہے نا اور ذرا کورا ڈکورا تو دیکھو جب تک اس کلاک پر ماؤس نہیں چڑھے گا۔ یہ ٹن ٹن ہی کرتی رہے گی۔" اور پھر وہ ننھے چوزوں کی طرح سر جوڑ کر کیپ کپ کی باتیں کرنے میں دیر تک مصروف رہتے۔

ارجمند سے ملنے کے بعد وہ رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا۔ رفیق تو زیادہ وقت سودا خریدنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر چچی پھوپھا اور خالہ کے گھر جا کر پوچھتا۔ "خالہ جی کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دیجئے۔" "چچی بازار سے کچھ منگوانا ہے کیا۔" پھوپھا جی میں بازار جا رہا ہوں۔ دیر تک وہ بازار جانے کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے گلابی پھوار اڑتی رہتی اور نگاہیں چوری چوری گرد و بیش کا جائزہ لیتی رہتیں پھر وہ سودے اکٹھے کر کے اپنا ریشمی رومال جیب میں ڈال اور غزلوں کی کاپی تھام کر بازار چلا جاتا جب سودا سلف سے فارغ ہوتا تو وہ جلیل کی طرف جا پہنچتا اور پھر وہ تنگ گلی کی لڑکی اپنے گھر کی دہلیز اور گلی میں جھاڑو دیتی اور چلا چلا کر باتیں کرتی اور رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی اور جلیل وحشت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا اور لڑکی مسکرائے جاتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی دلچسپ سازش کر رہے ہوں۔

پھر یوسف آنکلتا یوسف کے آنے پر نقشہ ہی بدل جاتا کیونکہ یوسف لڑکیوں کے وجود سے بے نیاز تھا وہ ان مسکاتے ہوئے جھانکتے ہوئے لجاتے ہوئے چٹے سفید چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے آتے ہی تمسخرانہ حرکات کا طوفان امڈ آتا۔ جلیل اور رفیق اسے بناتے اور وہ جان بوجھ کر بنتا۔ جیسے کسی کارٹون میں جان پڑ گئی ہو۔ ایلی محسوس کرتا۔ جیسے یوسف کو بنانے سے جلیل کا مقصد صرف اس لڑکی کو محظوظ کرنا ہوتا تھا جو نہ جانے کیوں گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جھاڑو دینے پر تلی رہتی تھی۔

دوپہر کے وقت جلیل اور ایلی محلے میں لوٹ آتے۔ اس وقت محلے کی بوڑھی عورتیں چوگان میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کیا کرتی تھیں۔ کوئی ازار بند بنتی۔ کوئی تاگے کے گولے بناتی۔ چوگان سے گزرتے ہوئے رفیق کی گردن جھک جاتی۔ اس کی آنکھوں کی بوندا باندی ختم ہو جاتی۔ اس کے ہونٹوں کا گیت ختم ہو جاتا اور اس کے چہرے پاس جا بیٹھتا صفدر کی گردن تو ہمیشہ اکڑی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہروقت عجیب سی سرخی پھیلی رہتی اس کے بازو عجیب انداز سے لٹکتے رہتے اور ہونٹوں پر تبسم گیت کا سماں طاری رہتا۔ وہ مضطربانہ طور پر ادھر ادھر ٹہلتا ادھر ادھر دیکھتا اور پھر تھیٹر کے گیت کا کوئی بول ان جانے میں اس کے منہ سے نکل جاتا "حافظ خدا تمہارا۔" اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی سے رخصت ہو رہا ہو۔ اس پر ایلی کی نگاہوں تلے ایک پارسی حسینہ آکھڑی ہوتی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ صفدر سے پوچھے کہ وہ پارسی لڑکی کیا ہوئی اور وہ گیت کیا پارسی لڑکی گایا کرتی تھی اور صفدر کی آنکھیں سرخ کیوں رہا کرتی تھیں اور اس کے بازو لہرایا کیوں کرتے تھے مگر ایلی کو صفدر سے بات کرنے کی جرات نہ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ صفدر محلے کے بڑے لڑکوں میں سے تھا اور چھوٹے لڑکے بڑے لڑکوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ صفدر کے انداز میں وہ معززپن نہ تھا جو عام طور پر بڑے لڑکوں میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس صفدر میں بے باکی تھی۔ خلوص تھا پھر بھی ایلی کو یہ باتیں پوچھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔

صفدر کی اسی بے باکی کی وجہ سے محلہ والیاں اسے بہت برا سمجھتی تھیں اور دادی اماں تو صفدر کا نام سنتے ہی غصے سے چلانے لگتی۔ "بدمعاش کہیں کا شرابی۔ دفع کر اسے۔ نام نہ لے مردود کہیں کا۔" اور صفدر بھی دادی اماں کے نام سے چڑتا تھا۔ "مردود بڑھیا۔ کھڑکی میں گدھ کی طرح بیٹھی رہتی ہے مرتی بھی نہیں۔" اور مینگنل پوٹاش کا پٹاخہ بناتے وقت اس کی آنکھوں میں یوں مسرت لہراتی جیسے بڑھیا کو وہ اس پٹاخے تلے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا ہو اور دیوار پر پٹاخہ یوں مارتا کہ ایلی محسوس کرتا۔ جیسے دیوار کی بجائے بڑھیا کے سینے پر پھینک رہا ہو۔

آصفی محلے کی زندگی محلے کی تنگ و تاریک گلیوں، کوٹھڑیوں اور نانک چندی اینٹوں کی رنگین ہوئی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے احاطے میں مخصوص انداز سے دھڑکتی تھی۔

محلے کی بوڑھیاں صبح سویرے ہی بیدار ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں چوکیوں پر گدھوں کی طرح آبیٹھتیں۔ جوان لڑکیاں کوٹھڑیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں تاریک دالانوں میں برتن مانجھنے آٹا

گوندھنے اور سر کا پلو سنبھالنے میں شدت سے مصروف رہتیں۔ اس تاریک اور گھٹی فضا کی وجہ سے ان کے رنگ زرد تھے۔ چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور انداز سے بے حسی ٹپکتی تھی۔ اگر کبھی کبھار ان کے چہرے پر جوانی کی چمک لہراتی بھی تو وہ کونے کی طرف منہ موڑ کر اپنا آپ سنبھال لیتیں اور پھر آٹا گوندھنے میں یا برتن مانجھنے میں مصروف ہو جاتیں۔

آصفی محلے میں صرف چند ایک مخصوص قسم کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیوں کی آوازیں ان کے چرخوں کی گھمر گھمر، تاریک دالانوں میں برتنوں کی کھنک، چوگان میں بچوں کا دبا دبا شور محلے کی مسجد سے تکبیریں مردوں کی کھنکاریں اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں۔ بند ہوتے ہوئے نانک چندی دروازوں کی چراؤں ٹھک چمگادڑوں کی چیخیں جو شام کو چوگان پر منڈلایا کرتیں اور پھر ضعیفوں کے خراٹے۔

ان جملہ آوازوں میں صرف ایک آواز ایسی تھی جو محلے کی نفسیت سے مختلف تھی۔ وہ بالا کا گراموفون تھا۔ جو کبھی کبھار بالا کے آسیب زدہ کمرے میں گانے کی کوشش کیا کرتا تھا اگرچہ اس ماحول میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جایا کرتی تھی۔

جب پہلی مرتبہ بالا کے گراموفون پر جانکی بائی الہ آبادی کے گیت کی آواز محلے میں سنائی دی تو محلے کی گدھیں جھٹ کر کھڑکیوں میں آگئیں۔

"میں پوچھتی ہوں یہ کون چلا رہا ہے۔"

"نہ جانے کہاں سے آواز آرہی ہے۔"

"اے ہے یہ تو عورت ہے کوئی۔"

"لو چاچی وہ تو بالا نے لگایا ہے کوئی رکاٹ۔ اے ہے محلے میں باجہ بجاتا۔"

"توبہ ہے ماں آج تک تو یہ بات سننے میں آئی نہیں تھی۔"

"میں کہتی ہوں اس لڑکے کا دماغ چل گیا ہے۔"

"لڑکے کا کیوں بہن۔ قصور تو داڑھی والے کا ہے۔ جس نے اسے باجا خرید کے دیا۔"

اس روز محلے کی گدھیں دیر تک سر اٹھا کر پھڑپھڑاتی رہیں۔ لیکن بالا سے کچھ کہنا ممکن بھی ہوتا؟ بڑی سے بڑی جھاڑ جھپٹ سن کر بالا ہنس دینے کا عادی تھا۔

"ہی ہی ہی ہی۔ چاچی سنا تم نے یہ توؤں والا باجا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ اچھا ہے نا۔ پورے دو سو میں لیا ہے اور یہ ریکارڈ جانکی بائی الہ آباد والی کا ہے۔ بڑا اچھا گاتی ہے۔ ماں جی ہی ہی ہی۔

سنو تو ابھی اپنا نام بولے گی میں ہوں جانکی' بائی الہ آباد والی۔ ہاں۔"

بالا کی بات پر بوڑھیوں کے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی۔ "اے چھوڑو چاچی۔ اس لڑکے پر تو آسیب کا سایہ ہے ساری رات جنوں کی محفل لگی رہتی ہے اس کے تخت پر۔"

"ہاں ماں اس کے بس کی بات بھی ہو۔ انگلیاں تو سونگھو اس کی پلاؤ کی خوشبو آتی ہے ہاں۔"

بالا کی جگہ اگر اور گراموفون خریدتا تو شاید اسے بجانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بالا کون روکتا۔ آسیب زدہ بالا کو محلے میں خصوصی درجہ حاصل تھا۔

بیاہ

بالا کے گراموفون کے علاوہ کبھی کبھار بیاہ شادی کے موقعوں پر محلے کی فضا میں تبدیلی واقع ہوتی' لیکن اس میں بھی آوازوں کی نوعیت نہ بدلتی تھی۔ ڈھولک تو بجتی تھی اور ڈھولک کی ضرب میں جوان لڑکی کی مضطرب انگلیوں کی تڑپ بھی گونجتی لیکن گانے زیادہ تر بوڑھیاں ہی گاتیں اور ان کی دھنیں اس قسم کی ہوتیں۔ وہ گانے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ انہیں سن کر محسوس ہوتا جیسے بہت سی چگادڑیں بھیانک آواز میں چیخ رہی ہوں۔ جیسے کسی کی موت پر کوئی بین کر رہا ہو۔ دھیمی آواز میں لمبے سرگونجتے اور محلے کی فضا کو اور بھی تاریک کر دیتے۔

اگر کوئی نوجوان لڑکی کوئی گیت گانے کی کوشش کرتی تو اس کی آواز اس قدر بیگانی سنائی دیتی تھی کہ وہ جلد ہی شرما کر یا گھبرا کر اس ناکام کوشش کو چھوڑ دیتی اور بوڑھیاں اپنی عظمت کو از سر نو محسوس کر کے پھر سے لمبی اداس سروں میں رونے لگتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شادی کے موقع پر کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور وقوع پذیر ہوتی۔ ناتک چندی دیواروں کی سیاہی گھل کر صاف ہو جاتی۔ کھڑکیوں میں سرخ دوپٹے لہراتے اور علی پور کا بینڈ باجا کچی حویلی میں نغمے بجاتا۔ اس روز محلے کے لڑکے بوڑھی گدھوں کے منحوس سائے کو اپنے سروں پر محسوس نہ کرتے۔ گیس کی روشنی میں لڑکوں کے ریشمیں رومال لہراتے۔ سیاہ بودے چمکتے۔ جیبوں سے پریم سندیس۔ کتابیں باہر نکل آتیں لڑکوں کی نگاہیں کھڑکیوں کے ارد گرد ناکام منڈلاتیں لیکن یہ سب باتیں بیکار تھیں۔ کیونکہ محلے کی لڑکیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ کھڑکیوں یا دروازوں میں آکھڑی ہوں۔

لڑکے کچھ دینے کچھ لینے کچھ کہنے کے بہانے بیاہ والے گھر میں جا داخل ہوتے۔ تاریک ڈیوڑھیوں میں چھپ کر انتظار کرتے بھیڑ میں راستہ بنانے کے بہانے اندھیرے میں چٹکیاں بھرنے کی کوشش کرتے۔ اس افراتفری میں چوڑیاں کھنکتیں۔ مہندی والے ہاتھ کپڑوں میں لپٹ جاتے۔ جسم سمٹتے "ہائے میں مرگئی۔" کی نحیف آوازیں سنائی دیتیں "لیکن ان معمولی مگر دلچسپ باتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔

بیاہ شادی کے موقع پر ایلی کے لئے گھر جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنی اندھیری ڈیوڑھی میں پہنچتا تو ایک دھندلی سی شکل ڈیوڑھی کے کسی کونے سے نکل آتی۔ گھبرا کر وہ رک جاتا اور دھندلی شکل گھوم کر اس کا راستہ روک لیتی۔

"کون ہے؟" وہ چلاتا۔

بھدی سی ہنسی سنائی دیتی۔ "ڈر گئے۔" نذیراں کی آواز آتی اور وہ مڑ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا اور ارجمند کو ڈھونڈھ نکالتا۔

"ہیلو ایلی ہے۔" ارجمند چلاتا "سراسر بے معنی ہے۔ ایلی۔ برات والے گھر جانا بے معنی ہے۔ بیکار ہے بالکل بیکار میں نے چٹکی بھری تو ظالم کہنے لگی۔ کہوں چاچی سے۔ ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی پھر مسکرانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اگر واقعی کے سے حج کر کے آئی ہیں یہ لڑکیاں تو پھر دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں اور مسکراہٹ بھی خالص ڈسپنسری والی اور چٹکی بھرو تو چاچی سے کہہ دوں گی۔ لاحول ولا قوۃ۔ چلو کپ اور کیپ کی طرف چلیں۔ محلے سے بات بنتی ہے۔ آج بانسری پر ایک دھن سیکھ کر آیا ہوں۔ واہ کیا دھن ہے۔ بس سمجھ لو کچا دھاگا ہے جس سے سرکار بندھی آئے گی۔ آؤ سناؤں تمہیں۔"

نہ جانے کیوں ایلی نے نذیراں کی بات کبھی ارجمند سے نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ڈرتا تھا کہ ارجمند کو نذیراں کی بات کا پتہ نہ چل جائے۔ تاکہ وہ رنگین انکرائینڈی ماباؤں کا کھیل حقیقت کا روپ نہ دھارے ایلی کو ہلتی ہوئی چقوں سے دلچسپی تھی۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ معنی خیز انداز سے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن عورت یا لڑکیوں کا قرب اس کے لئے سوہان روح تھا۔ اسے ڈر تھا کہ نذیراں کی بات سن کر ارجمند کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی تو وہ رنگینی ختم ہو جائے گی۔ اور نہ جانے کیا شروع ہو جائے۔ اس کے ذہن میں قرب کا مفہوم تاریکی تھا۔ پر اسرار خوفناک تاریکی۔

ایلی کے گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بات سمجھ میں نہ آتی
تھی۔ لیکن کچھ ہونے والا ضرور تھا۔ اسی لئے تو علی احمد چھٹی لے کر علی پور آگئے تھے۔ اور
دادی اماں کو پاس بٹھا کر اس سے پوچھ پوچھ کر نہ جانے رجسٹر میں کیا لکھ رہے تھے اور ہاجرہ
کوٹھڑی میں کھڑی رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ یوں رونے کی عادی نہ تھی۔

علی احمد نے تو کبھی دادی اماں سے بات نہ کی تھی۔ ماں بیٹے اس مکان میں اجنبیوں کی طرح
زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ دادی اماں سارا دن سیدہ کے قریب اکڑوں بیٹھی رہا کرتی تھی اور علی
احمد اندر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے تھے اور رجسٹروں میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ دونوں کی آپس
میں کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ ایلی اکثر حیران ہوا کرتا کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں ایک دوسرے سے
بات بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی دادی اماں سے علی احمد کی شکایت کرتا تو وہ اطمینان سے جواب
دیتیں۔ "علی احمد کی تو عادت ہی ایسی ہے۔" اور پھر مسکرا دیتیں جیسے اظہار ناراضگی کے باوجود
انہیں علی احمد کی وہ بات پسند ہو اور علی احمد کبھی دادی اماں کو بلاتے بھی تو پوچھتے۔ "بھئی وہ فلاں
کام کرنا ہے کیا رسمیں ادا کرنی ہوں گی۔" اس کے سوا انہوں نے کبھی دادی اماں کو نہ بلایا تھا۔

اندر دادی اماں کپڑوں اور زیور کی بات کر رہی تھی نہ جانے کس کے کپڑوں اور زیور کی
بات ہو رہی تھی۔ لیکن اماں ان کی بات سن سن کر رو کیوں رہی تھی۔ کپڑے اور زیور کی بات
رونے کا کیا مطلب۔ پھر اتفاق سے سعیدہ آگئی اور اماں پھوٹ پڑیں۔

"لو لڑکی کی قسمت ہی پھوٹ گئی میں تو جانتی ہی تھی وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر میری بچی
پھینک دے گا۔ سو وہی ہوا۔ میری بچی کو فیروز کے بیٹے اجمل کے پلے باندھ رہے ہیں۔ ہائے
میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔

اجمل ایلی کی پھوپھی کا لڑکا تھا وہی اجمل جو روہتک میں چند ایک ماہ کے لئے ان کے ہاں
ٹھہرا تھا۔ جسے علی احمد نے بال بنانے اور بن ٹھن کر رہنے پر مار کر نکال دیا تھا۔ ایلی کو جبھی
اجمل سے ہمدردی تھی۔ اس کی شکل و صورت بھی ایلی کو بہت بھاتی تھی اور پھر اس کا لڑکوں
سے میل جول اور باہمی ربط بھی ایلی کو بے حد پسند تھا اور اب تو وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور وہ کئی
سال ایران میں نوکری کرنے کے بعد لوٹا تھا۔ نہ جانے اماں کو اجمل کیوں ناپسند تھا نہ جانے ماں
روتی کیوں تھیں۔ آخر اجمل میں کیا برائی تھی۔ اماں کا مسلسل روئے جانا ایلی کے لئے باعث
حیرانی تھا! اماں بھی تو عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک طرف تو اس بات پر اس قدر ناخوش

اور دوسری طرف انتظامات میں مشغول تھی۔ جیسے بہت دلچسپی لے رہی ہو۔ فرحت کے کپڑے
سیتی دولہا کی چیزیں بھی تیار کرتی جاتی۔ علی احمد کے احکامات بھی دوڑ دوڑ کر سنتی اور ساتھ ساتھ
آنسو بھی چھلکائے جاتی۔ عجیب عادت تھی اماں کی پھر ہر آتی جاتی سے شکایت بھی کرتی جاتی کہ
فرحت کا بیاہ زبردستی کیا جا رہا ہے۔

ادھر فرحت کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ فرحت کی عمر کچھ زیادہ نہ
تھی اس نے آٹھویں جماعت تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی پھر علی احمد نے دفعتاً اعلان کر دیا
تھا کہ اسے سکول جانے کی اجازت نہیں بچیوں کے لئے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ اس پر فرحت
پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ہاجرہ نے اس کے ساتھ مل کر آنسو بہائے تھے۔

مگر علی احمد کا حکم اٹل تھا ان دونوں کے آنسو کام نہ آئے اور فرحت کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ
گیا۔ آٹھ سال سکول میں پڑھنے کے باوجود فرحت ابھی بچی ہی تو تھی وہ اکثر محلے کے چوگان میں
جا کر کِکلی کلیر دی ناچتی رہتی۔ ساتھ ساتھ کچھ گنگناتی اور محلے کے بزرگ اس کی طرف
دیکھ کر مسکراتے۔ "فرحتو گھومنی۔" اور بوڑھیاں مسکرا کر کہتیں "فرحت تو فرحتو ہی رہی۔" ایلی
نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ فرحت بڑی ہو گئی ہے اسے بھی وہ فرحتو ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس
میں عورت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر فرحت نے چوگان میں جانا بند کر دیا۔ اب وہ خالہ کے گھر بھی نہ
جاتی تھی۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود اس میں وہ بات پیدا نہ ہوئی تھی جو جوان لڑکیوں میں ہوتی
ہے۔

پھر وہ دن آ پہنچا جب ان کے گھر کے سامنے باجے بجنے لگے اور گھر میں مہمان آ جمع ہوئے
اور ہاجرہ کام کاج میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ آنسو بہانا بھی بھول گئی اور محلے کے لڑکوں نے
بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور برتن بجنے لگے۔ حنائی ہاتھ ریشمی دوپٹوں میں سے
باہر نکلنے اور چھپنے لگے اور گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالآخر فرحت کو ڈولی میں بٹھا دیا گیا اور
ایلی اور ہاجرہ دونوں ڈولی کے ساتھ ایک نئے گھر میں چلے گئے۔ یہ نیا گھر اجمل کا گھر تھا۔ چونکہ
اجمل کی ماں مدت سے فوت ہو چکی تھی۔ اور بہنیں سب اپنے اپنے گھر اور بچوں والی تھیں اس
لئے فرحت کی خدمت کرنے کے لئے خود ہاجرہ کو اجمل کے ہاں جانا پڑا۔

اجمل کا گھر ایلی کے گھر کے پاس ہی تھا۔ چوگان کے شمال کی طرف ایک چھتی گلی، جسے

گلیارہ کہتے تھے سے گزر کر ایک اندھیری ڈیوڑھی کو پار کر کے اس نئے گھر کی سیڑھیاں آتی تھیں
لیکن اس اندھیری ڈیوڑھی کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بھی اس
ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس گھر کے ایک طرف ایلی کے ماموں حشمت علی
رہتے تھے اور دوسری طرف اس کی خالہ کا کنبہ آباد تھا۔ یہ تینوں گھر دراصل ایک ہی بڑی حویلی
کے حصے تھے جسے کسی زمانے میں آصفی بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگر چوبارے سے دیکھا جائے تو
نیا گھر علی احمد کے مکان سے ملحق تھا۔ درمیان میں صرف ایک چھت پڑتی تھی۔ اس لئے ایلی
عام طور پر ملحقہ کوٹھے سے گزر کر دیوار پھاند کر نئے گھر چلا جایا کرتا تھا تاکہ اسے اندھیری ڈیوڑھی
سے گزرنا نہ پڑے۔

اجمل کے والد کسی زمانے میں انکم ٹیکس کے دفتر میں افسر تھے اب بھی ان کے بشرے اور
انداز سے تحکمانہ جاہ و جلال کے آثار ہویدا تھے ان کے چہرے پر حکومت اور صحت کی سرخی
جھلکتی تھی۔ اگرچہ انہیں عہدہ چھوڑے کئی سال گزر چکے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں ایک
طوائف جانکی سے محبت تھی۔ جس کے عشق میں انہوں نے سبھی کچھ کھو دیا تھا اور نوکری سے
فارغ ہو کر جانکی کے یہاں جا مقیم ہوئے تھے۔ اجمل کی والدہ بھی عرصہ دراز سے لقمہ اجل ہو
چکی تھیں۔ اجمل کی تین بہنیں بقید حیات تھیں۔ سیدہ، رابعہ اور انور، سیدہ نہ جانے کس سے
بیاہی ہوئی تھی۔ مگر دادی کے پاس رہتی تھی۔ رابعہ ایلی کے خالہ زاد بھائی پرویز کی بیوی تھی اور
انور کی شادی ہمدانی سے ہو چکی تھی جو کسی دور دراز مقام پر کسی مدرسے میں اتالیق تھے۔ ان
حالات میں اجمل کا گھر ویران پڑا تھا۔ اس کے بیاہ پر اس کے والد آئے۔ بہنیں بھی اکٹھی ہوئیں
لیکن جلد ہی وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور اجمل کے گھر میں صرف فرحت ہاجرہ اور ایلی رہ
گئے تھے۔ اسی لئے ایلی نے محسوس نہ کیا کہ وہ گھر بیگانہ ہے۔ اکثر وہ والدہ کے ساتھ وہیں رہتا
رابعہ سے باتیں کرتا رہتا یا پڑوس میں رفیق کے گھر چلا جاتا اور یا دوسری طرف پرویز کے والد
محسن علی کے پاس جا بیٹھتا۔

"آؤ ایلی آؤ۔" محسن اسے دیکھ کر چلاتے۔ "کہو علی احمد کیسے ہیں۔ کوئی نئی شادی کرنے کا
تو نہیں سوچ رہے۔" اور وہ ہنسنے لگتے۔

ایلی کو محسن علی بے حد پسند تھے ان کی باتوں سے سچائی اور خلوص ٹپکتا تھا۔ بزرگ ہونے
کے باوجود ان میں تصنع نام کو نہ تھا۔ محسن علی کے مکان سے ملحق دالان میں پہلی مرتبہ اس کی

ملاقات شریف سے ہوئی تھی۔

شریف

شریف ایک پتلا دبلا کمزور اور اداس شخص تھا۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے کا
عادی تھا۔ دیوار سے سر لگائے کمبل اوڑھے وہ حقہ پینے میں مصروف رہتا۔ اس کی آنکھیں نہ
جانے کہاں لگی رہتی تھیں جیسے کہیں لگی ہوں اور وہ خلا کو حسرت بھری نگاہوں سے گھورتا رہتا۔
کچھ دیر کے بعد ایک موہوم سی آہ بھر کر ایک نگاہ غلط انداز سے گردوپیش کی طرف دیکھتا اور پھر
اپنی دنیائے خیال میں لوٹ جاتا۔ اس کا سر دیوار پر ٹک جاتا اور نگاہیں اسی طرح خلا کو گھورنے
لگتیں۔

"آؤ ایلی۔" شریف نے اسے سرسری طور پر بلایا۔ "بیٹھ جاؤ۔" ایک نظر اس نے ایلی کی
طرف دیکھا اس کی نگاہ میں عجیب سی چمک تھی جو آن کی آن میں لہرا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس
ایک ہی چمک میں سب کچھ تھا۔ خلوص، محبت، سادگی۔ ناکامی، وہ چمک کبھی کبھی عیاں ہوتی تھی
جیسے ابر آلودرات کو کبھی کبھار چاند ایک ساعت کے لئے مسکرا کر منہ چھپا لیتا ہے۔

وہ ایک چمک نہ جانے ایلی سے کیا کہہ گئی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے محبت کا پیمان کر گئی۔ ایلی
بیٹھ گیا۔ شریف بیگانہ ہونے کے باوجود بیگانہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے
وہ شریف سے مدتوں سے واقف ہو۔ جیسے وہ دونوں پرانے دوست ہوں۔

"ایلی۔" شریف نے آہ بھری "کیا وہ ڈائن ابھی تک جیتی ہے بتا۔" اس کے ہونٹوں پر زہر
خند تھا۔

"ڈائن" ایلی نے حیرانی سے دہرایا "ہاں وہ بڑھیا۔ تمہاری دادی۔" شریف نے کہا۔ ایلی کو
یہ بات سخت ناگوار گزری۔

"کیا وہ ڈائن کبھی نہ مرے گی۔ کیا وہ اسی طرح دوسروں کی زندگی تباہ کرتی رہے گی"۔

شریف کے چہرے سے حسرت و بربادی ٹپکتی تھی۔ ایلی کے دل میں شریف کے لئے جذبہ
ہمدردی ابھر آیا۔ اس نے ان جانے میں محسوس کیا کہ شریف مظلوم تھا۔ اس پر ظلم توڑے گئے
تھے۔

نہ جانے لوگ دادی اماں کو ڈائن کیوں کہا کرتے تھے نہ جانے صفدر اس کے سینے میں

پٹاخے کیوں پھینکا کرتا تھا اور محلے کے تمام لڑکے اس سے خائف کیوں تھے۔ یہ تو ایک حقیقت
تھی کہ وہ بچوں کا شور سن کر کھڑکی میں آ بیٹھتی اور انہیں جھاڑ جھپاڑ کیا کرتی تھی۔ لیکن مز
اس بات پر اسے ڈائن کہنا تو روا نہ تھا وہ اس کے کردار کے دوسرے پہلو سے کیوں واقف
تھے۔ انہیں اس کی بناوٹی تیوری کے نیچے دبی دبی مسکراہٹ کیوں نہ دکھائی دیتی تھی۔ ایلی
لئے وہ بوڑھی ڈائن گھر کے پھیلے ہوئے صحرا میں واحد نخلستان تھی۔ محبت کا چھوٹا سا ڈھکا چ
چشمہ جو شور مچا کر اپنے وجود کے اعلان کرنے کا عادی نہ تھا بلکہ چپ چاپ بے آواز بہے جاتا تھا

"نہیں۔ نہیں۔ وہ نہیں مرے گی۔" شریف نے یاس بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "ابھی ا
نہ جانے کن کن کے درمیان دیوار بننا ہے۔" شریف کی باتوں سے ظاہر تھا جیسے شریف کی زندگی
تباہ کرنے میں صرف دادی اماں کا ہاتھ ہو مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شریف کی زندگی کس انداز
سے برباد ہو چکی تھی اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ شریف اس چینی کی پیالی کی مانند تھا جس
میں بال آ چکا ہو۔

پہلی ہی نشست میں ایلی شریف کا دوست بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شریف کا راز
دان ہے اگرچہ اسے شریف کے راز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

شریف سعیدہ کا دیور تھا اور جب کبھی علی پور آتا تو وہ سعیدہ کے یہاں ٹھہرتا کھیل و تفریح
کی اس محفل میں جو اکثر سعیدہ کے یہاں لگتی تھی۔ شریف کی موجودگی عجیب سی لگتی جیسے طرب
راگ میں بے برجستہ سر لگا ہو۔ ایک بات بہر طور واضح تھی کہ شریف عشق کا مارا ہوا تھا۔ ا
کو عشق کے مفہوم سے پورے طور پر واقفیت نہ تھی۔

عشق بھی عجیب چیز ہے۔ ایلی سوچتا جو شریف کی آنکھوں سے حزن و ملال بن کر جھلکتا
ہے۔ صفدر کی آنکھوں سے رنگ کے چھینٹے بن کر اڑتا ہے۔ اور ارجمند کی آنکھوں میں شرارت
بن کر کوندتا ہے۔ آخر یہ چیز کیا ہے۔؟

پھر احاطے کی بند کھڑکی سے دادی اماں کی آواز گونجتی۔ "اے ہے آج تم نے یہ کیا محفل
رکھی ہے۔" اور شریف سرد آہ بھر کر کہتا "وہ گدھ بولی۔ چلا رہی ہے۔ اسے زندگی بھر
آوازیں اچھی نہیں لگتیں اسے ویرانہ پسند ہے۔" اس پر ہاجرہ خود کھڑکی کھول کر کہتی "سعیدہ
نے آج مولود شریف کروالیا ہے۔" یہ سن کر دادی اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ پھر سب
اصرار پر سعیدہ ٹوپی پہن لیتی اور گانے لگتی۔ مدینے میں مورے سیاں بالا ہے رے۔ نہ جانے ا

نے یہ بول کہاں سے سن رکھے تھے۔ ایلی کو اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر بغور
سننے میں منہمک رہتا مگر بار بار اس کی توجہ شریف کی طرف منعطف ہو جاتی جو چارپائی پر بیٹھا حقہ
تھامے بار بار آہیں بھرتا کروٹیں بدلتا اور محروم نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھے جاتا۔

بکھری ہوئی کہانی

نئے گھر میں آنے سے ایلی کا دائرہ ملاقات وسیع ہو گیا تھا اس لحاظ سے وہ نیا گھر اس کے لئے
باعث فرحت ثابت ہوا تھا۔ وہاں اسے بہت سے لوگوں سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہتے
تھے۔ سعیدہ اور شریف سے تو وہ روز ہی ملتا تھا۔ اسے شریف کے متعلق عجیب و غریب تفصیلات
کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ اکھڑے اکھڑے واقعات بکھری بکھری تفصیلات۔ محلے کی عورتیں بھی تو
شریف کے متعلق دبی دبی آواز میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اگرچہ شریف میں وہ خصوصی دلچسپی
نہیں لیتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی۔ سانپ تو گزر چکا تھا
لیکن لکیر ابھی باقی تھی اور محلہ والیوں کو سانپ کی نسبت لکیر سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب ایلی کسی
کے منہ سے شریف کے متعلق کوئی بات سنتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ اس بات کو
احتیاط سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا اور پھر جب وہ رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو سنی ہوئی
باتوں کے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔

سعیدہ آہ بھر کر بولی "شریف نے تو جان بوجھ کر اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ جوانی کو روگ
لگا رکھا ہے۔ ایسا بھی کیا کہ کوئی اپنا آپ تباہ کرے۔ لو خالہ بھلا اس بڑھیا سے توقع کی جا سکتی تھی
کہ وہ ہماری تکلیف کا احساس کرے وہ تو بلکہ ہماری بربادی میں خوش ہے۔ اسے تو موقع ہاتھ آیا
تھا اور اب کان پھڑوا کر میاں رانجھا بنا بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنی ہیر کے خیال میں غرق رہتا ہے اور
کھیڑے ہیر کو کب سے لے بھی گئے بات ختم ہو چکی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔
اسے کون سمجھائے۔"

رابعہ بولی "ویسے نام کا شریف ہے لیکن کرتوت دیکھو۔ خواہ مخواہ اس بھولی بھالی لڑکی کو بھرما
لیا۔ اس بیچاری معصوم کو کیا پتہ تھا کہ یہ چال صرف اسے بدنام کرنے کے لئے چلی جا رہی ہے۔
بیچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ توبہ
ہے ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو دادی اماں نے بچا لیا ورنہ جانے کیا ہوتا۔"

چچی کہنے لگی۔ "بہن آہستہ بات کر۔ یہاں تو عشق لگا ہوا ہے۔ اس شریفے کو دیکھا ہے
نے یہ تو پاگل ہو رہا ہے اس کے عشق میں۔ اس لڑکی نے پاگل کر دیا ہے سامنے کھڑی ہو
کے۔ دیوانی ہو رہی تھی وہ تو نہ کسی کی شرم نہ لحاظ اور اب اب یہ لڑکا کسی کو گھر بسائے گا
اونھوں توبہ ہے بہن دیکھ لو اپنی بیوی کو رلا رلا کے مار دیا۔ بیچاری کی خبر تک نہ پوچھی۔ اب ا
کون دے گا اپنی لڑکی۔ اسے تو انوری کی دھن لگی ہے۔ سارا دن آہیں بھرتا رہتا ہے اور آنکھ
موند کر پڑا رہتا ہے اسے تو انوری کھا گئی اے ہے۔ کیسا جوان نکلا تھا۔ پر اب تو دیکھا ہی ہے
نے۔"

دادی اماں نے ایلی کو پاس بٹھا لیا "اے ہے ایلی اب تو ادھر آتا ہی نہیں ایسا ہی جی لگا
ہے تیرا اس گھر میں۔ اللہ رکھے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ لوگ اپنے ہی گھر میں رہتے اچھے لگتے ہیں
ایلی تو ادھر نہ جایا کر۔ شریف کی بری صحبت میں نہ بیٹھا کرنا تو نے۔ چھوڑ اس کلمو ہے کو۔
بھی نہیں۔ وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ دشمن نے ہماری عزت کو تباہ کر کے رکھ دیا"۔

شریف نے آہ بھر کر کہا "لاہور جاؤ گے ایلی۔" اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی
بھری۔ "اس شہر میں رہو گے تم۔ جہاں وہ رہتی ہے۔ آہ۔ اس کے قریب رہو گے۔ اس
ملنے جایا کرو گے کتنے خوش نصیب ہو تم۔ انہوں نے اسے زبردستی ہمدانی سے بیاہ دیا۔ زبرد
اسے ڈولی میں ڈال دیا۔ روتی چیختی چلاتی ہوئی کو ڈولی میں ڈال دیا۔ ایلی ان ڈائنوں نے اسے
جی مار دیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری ہے اس کی منور روشنی میرے لئے ہی مخصوص ہے۔ کتنی
ہے اس میں، کتنی پاکیزگی ہے۔ تم وہاں رہو گے جہاں وہ رہتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم
اس نے لمبی آہ بھری اور آنکھیں موندلیں۔

محلے میں شریف کی داستان کے ٹکڑے جا بجا بکھرے تھے اور ایلی انہیں جوڑنے م
مصروف تھا۔ نہ جانے انوری کون تھی۔ جس سے شریف کو عشق تھا نہ جانے وہ حسینہ کون ت
جس نے خاندان کے ننگ و ناموس کو تباہ کر دیا تھا۔ بہرحال اسے شریف سے ہمدردی تھی۔
چاہتا تھا کہ شریف اسے اپنا قصہ سنائے مگر شریف کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنے کی ہ
نہ پڑتی تھی۔ بہرحال شریف کی آنکھوں کی چمک اور اس کا دکھی انداز اسے بے حد پیارے
معلوم ہوتے تھے۔

ظاہر تھا کہ شریف اپنے گزشتہ ناکام عشق کی محرومی میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا اس نے شا

بھی کی تھی مگر اس کی بیوی شریف کے گھر کے ویرانے میں رہ کر تپ دق کا شکار ہو کر مر گئی تھی
یہ کوائف تو ایلی کو معلوم تھے۔ مگر ان جزئیات سے کیا ہوتا ہے اسے تو کل سے دلچسپی تھی۔
ہر وقت حقے کی نلی منہ میں دبائے شریف دیوار سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتا رہتا اور
ساتھ ساتھ موہوم آہیں بھرتا اس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب خمار سے چھلکتیں اور اس کے
منہ سے رال گرتی رہتی۔ "آؤ ایلی آؤ بیٹھ جاؤ۔" وہ ایلی کی طرف دیکھ کر اسی محروم انداز سے
کہتا اور پھر ایلی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کی طرف
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں کھو جاتا۔ ایلی بیٹھے بیٹھے کسی نامعلوم جذبہ کی شدت سے بھیگ جاتا۔ وہ
محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ شریف کے خلوص سے بھرا ہوا ہو۔ جیسے کمرے کی دیواریں احساس
احترام سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ جیسے کھڑکیاں منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔
شریف کی آمد سے ایلی کو انکرا ینڈی ماباؤں سے خاص دلچسپی نہ رہی تھی وہ محسوس کرنے لگا
تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی عظمت عشق ہے۔ پاکیزہ عشق۔ محروم عشق اور چلتی لڑکیوں کو
دیکھنا تو بچوں کا کھیل ہے۔ اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ عشق کا مطلب کیا ہے۔ مرد عورت سے
کیوں محبت کرتا ہے مگر نہ جانے کیسے اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عشق سے بڑھ کر اور کوئی چیز
قابل حصول نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس سے عشق کرے۔ کیسے عشق کرے لیکن
ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ کسی سے عشق شروع کر دے اور پھر ناکام ہو
کر شریف کی سی جاذبیت پیدا کر لے اور دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کو گھورنے میں زندگی صرف
کر دے۔ اسے شریف کی زندگی کا یہ پہلو بے حد پیارا لگتا تھا لیکن اس سے ہٹ کر شریف کی
باقی ماندہ شخصیت سے اسے گھن آتی تھی۔ مثلاً شریف کا ڈھیلا ڈھالا پن۔ اس کی چال ڈھال
اسے قطعی پسند نہ تھے اور اس کے منہ سے رال سی ٹپکتی دیکھ کر تو وہ کراہت سے منہ موڑ لیتا
تھا۔ اس کے لئے شریف کی تین خصوصیات بے حد پیاری تھیں۔ شریف کی محبت بھری نگاہیں،
غمناک نگاہیں جن میں ایک مٹھاس اور محرومیت بھرا نشہ رواں دواں رہتا تھا۔ شریف کا بے پناہ
خلوص اور شریف کی دوست نوازی ——

حاجی شریف کی رخصت ختم ہو گئی اور وہ واپس اپنی نوکری پر چلا گیا۔ شریف کے جانے کے
بعد ایلی کئی ایک دن اکھڑا اکھڑا رہا۔ ارجمند کے اصرار کے باوجود کیپ اور کپ کی طرف متوجہ نہ
ہوا نہ ہی اس نے انکرا ینڈی ماباؤں کے کھیل میں حصہ لیا۔ اسے صرف ایک دھن لگی تھی کہ وہ

کسی سے باقاعدہ عشق کرے کسی سے عہدو پیمان کرے اور پھر اسے نبھانے کے لئے زندگی وقف کر دے۔ لیکن کوئی بھی تو نہ تھی جو اس سے عہدو پیمان کرنے پر مائل نظر آتی ہو کوئی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ بڑی عورتیں اسے قابل التفات نہ سمجھتی تھیں اور چھوٹی لڑکیوں میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد ہی شریف کا وہ اثر معدوم ہو گیا اور ایلی پھر سے ارجمند کے ساتھ کھیل میں حصہ لینے لگا۔ لیکن یہ شمولیت محض ایک فریب تھا ایک دکھاوا تھا در اصل ایلی کی عشق کرنے کی خواہش سمٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔

میٹریکولیشن

پھر دسویں کے امتحانات قریب آ گئے اور ایلی کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ پھر بام آباد کیلئے عازم سفر ہو گئے۔ بام آباد پہنچ کر آہستہ آہستہ شریف اس کے ذہن سے خارج ہو گیا بام آباد میں اب وہ اکیلے نہ تھے۔ ان کے ساتھ شمیم تھی۔ اس کے حنا مالیدہ ہاتھ۔ فیروزی چادر اور چٹے سفید چوڑے چہرے سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کبھی کبھار اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے صفیہ پھر سے جی اٹھی ہو۔ اس خیال پر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ شمیم کے خوابیدہ چہرے کو دیکھ کر۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں کو دیکھ کر جن میں عجیب سی بے ربطی تھی' ایلی مایوس ہو جاتا "نہیں یہ صفیہ تو نہیں۔ اس میں وہ بات ہی نہیں۔" اس احساس کو شدت سے محسوس کر کے ایلی کی نگاہ میں شمیم کے ہاتھوں کا رنگ اڑ جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ سفید نہیں بلکہ پیلے ہیں اور وہ پیلا پن رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بے جان ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ باہر گھنشام اور ایشور لال کی طرف نکل جاتا اور پڑھنے کے بہانے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتا رہتا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا کہ اسے ان سے عشق ہے' عشق پیارا۔ دن وہ ایشور لال یا گھنشام کے پاس گزارتا اور پھر شام کو کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی وہ رک جاتا۔ کہیں علی احمد نہ دیکھ لیں کہیں وہ نہ پوچھ لیں کہ تم نے آج کیا پڑھا' علی احمد کا ڈر اس کے دل پر بوجھ بن جاتا حالانکہ گھر میں علی احمد نے اسے کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ کبھی چلم بھرنے کے لئے اسے بلاتے یا بازار سے سودا لانا ہو تو اسے آواز دیتے

یا کبھی مہمان ہوتے تو دونوں انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا یا کوئی اور کھانے کی چیز پکڑ کر چلاتے "ایلی یہ لے۔ ایلی۔" اس کے علاوہ کبھی ایلی کی طلبی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں ان کے قریب چند ایک گز کے فاصلے پر ایک لڑکا ایلی بھی رہتا تھا۔

شمیم کے آنے کے بعد چند ایک دن کے لئے تو علی احمد کے کمرے میں شمیم شمیم کی آوازیں گونجتی رہیں اور شمیم کی آواز مدھم سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر وہ سرگوشیاں معدوم ہوتی گئیں اور بالآخر ایلی کو اس کمرے سے سسکیاں سنائی دینے لگیں اور شمیم کا انداز محرومیت کا غماز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور علی احمد کی کھنکھار میں درشتی کا انداز واضح ہوتا گیا۔ جلد ہی کور پھر سے آ موجود ہوئی اور بند کمرے کے پیچھے اس کے دانت چمکنے لگے۔ "بابو جی کے مزاج ٹھیک ہونے والے ہیں۔" وہ پنکھے کی رسی گھما کر کہتی اور شمیم باورچی خانے میں حیران نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی جیسے کہیں کھو گئی ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس پر دوسرے کمرے میں ہاجرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقاں مسکراتی اور اپنا بدن سکیڑ کر ہاجرہ سے کہتی "ہائے اب کیا ہو گا۔" اور ایلی غصے سے کھولتا اور اس کا جی چاہتا کہ چلا چلا کر کہے "اب میں دسویں جماعت میں ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہاں کون آتی ہے۔"

"ایلی کور کے لئے پانی لاؤ۔ ایلی" علی احمد کی کھنکھار سن کر اس پر سکتے کا عالم چھا جاتا۔ جسم پر سوئیاں سی چلنے لگتیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ——— "آیا جی۔" اس وقت وہ یہ حقیقت بھول جاتا کہ وہ دسویں میں ہے اور گھر میں عورتوں کا آنا جانا برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بوتل اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس کے حواس درست ہوتے۔ دھندلکا دور ہو جاتا اور شمیم کے حنا مالیدہ ہاتھ فضا میں لٹکتے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں کا فرق اس قدر نمایاں ہو جاتا کہ وہ چونک پڑتا اور محسوس کرتا۔ جیسے وہ ایلی کی مدد مانگ رہی ہو۔ جیسے وہ ایلی کی پناہ لے رہی ہو۔ اس خیال پر وہ کنوئیں پر بوتل رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ "میں دسویں جماعت میں ہوں۔ میں اب بچہ نہیں میں دیکھوں گا اس گھر کو کون ناپاک کرتا ہے۔" پاؤں کی ٹھوکر سے وہ بوتل کو گرا دیتا جو کنوئیں کی منڈیر پر لڑھک لڑھک کر نیچے جا گرتی "مجھے دسویں پاس کرنا ہے۔ مجھے ضرور دسویں پاس کرنا چاہیئے۔ ورنہ یہ گھر کبھی پاک صاف نہ ہو سکے گا۔ مجھے دسویں پاس کرنا ہی ہو گا۔"

اگر ایلی کو گھر کی بلاکی کا خیال نہ ہوتا اگر شمیم کے حنا مالید ہاتھ اس کے سامنے فضا م
محرومیت سے نہ لٹکتے اگر کور کے سفید دانتوں سے اسے شدید نفرت نہ ہوتی تو شاید ایلی کبھ
دسویں پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ سکول میں وہ ایک نالائق لڑکا تھا نہ تو اسے پڑھنے کا شو
تھا نہ وہ ذہین تھا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے اور استاد اس کی نالائقی پر قہ
لگایا کرتے تھے۔

جوں جوں امتحان قریب آتا گیا' شمیم کی نگاہیں اور بھی محروم ہوتی گئیں۔ کور کے دانت ا
بھی چمکیلے ہوتے گئے۔ علی احمد کی کھنکھار میں اور بھی درشتی پیدا ہوتی گئی اور ایلی کا عزم اور
تقویت حاصل کرتا گیا۔ اب وہ رات کو چپکے سے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور چوری چوری اسے
کرتا رہتا۔ علی احمد کی الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ گرائمر' یو سیج' پریپوزیشنز' ہر چیز پر علیح
کتاب تھی اور وہ باری باری انہیں الماری میں سے نکالتا اور چوری چوری پڑھتا۔

اس کے باوجود وہ امتحان کا نتیجہ سن کر حیران رہ گیا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ پاس ہو
ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے پرچے بھی تو اچھے نہ کئے تھے لیکن زیادہ تعجب کن بات یہ
کہ دسویں جماعت پاس کرنے کے باوجود وہی ایلی تھا۔ جیسے پہلے تھا۔ اس میں ذرا بھی تو فرق
آیا تھا کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ علی احمد کی کھنکھار سن کر اس کا حلق ویسے ہی سوکھ جاتا تھا
جسم پر ویسے ہی چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں اور جی ہاں کہہ کر وہ اسی طرح بوتل اٹھا کر کنوئیں
طرف چل پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے شمیم کے حنا مالیدہ ہاتھ اسی طرح بے بسی سے لٹکتے ت
اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ کور کی بوتل کو ٹھوکر مار کر گرا دے اور کور کی بوتل میں تھو
دے۔

دسویں پاس کرنے کے بعد وہ علی پور آ گیا اور پھر دادی اماں کے پاس رہنے لگا۔ دادی
کے پاس رہنے میں کس قدر آرام تھا۔ اسے نماز پڑھتے اور تسبیح کے دانے پھیرتے دیکھ کر ا
کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ دادی اماں کا گھر کس قدر پاکیزہ تھا۔

دادی اماں کے گھر کی پاکیزگی پر مسرور ہونے کے باوجود وہ ارجمند سے انکر اینڈی ماباؤں
مصروف ہو جاتا اور جب وہ کنوئیں کے پاس جا کر ریشمی رومال ہلاتے اور بانسری بجاتے تو کب
کھڑکی کی چق میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو جاتی۔ ایک آنکھ ابھرتی مگر ایلی کو نہ جانے کیوں
سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ذہن میں تو حنائی ہاتھ رقصاں تھے۔ اگرچہ حنا کا رنگ دیکھ

اور اس کی بو محسوس کر کے اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی تھی اور جسم کا بند بند لرز جاتا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں حنائی ہاتھ لٹکتے تھے۔ اس کی جانب بڑھتے۔ وہ گھبرا کر سمٹتا اور پھر ایک جھرجھری اسے جھنجھوڑتی ایک ہوائی سی چل جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیوں۔ اس کا دل چوری چوری خواہش کرتا کہ وہ ہاتھ اسے تھپک تھپک تھپک کر سلا دیں' اور ایک بھرا ہوا جسم اس پر جھک جائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کیپ کی بجائے کوئی بڑے سے جسم اور گدے جیسے گول گول رنگین ہاتھوں والی اس چق کے پیچھے کھڑی ہو اور وہ محسوس کرے کہ ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن بھرے جسم والیاں تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتی تھیں نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں وہ ایلی۔ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا اور پھر گھبرا کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا اور بالآخر ان کے پاؤں کو گھورتا لیکن انہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے انہیں کام کاج سے اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ ایلی کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے لے جائیں۔ اپنا آپ سمیٹیں۔

ہاکی سٹک

اسے چپ دیکھ کر دادی اماں چلائی۔ "ایلی کیا ہے تجھے یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تجھے یا تو سارا دن اللہ مارے لڑکوں کے ساتھ لگا رہتا ہے یا گھر میں آ کر یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے۔" ایلی یہ سن کر دادی اماں سے لپٹ جاتا۔ انہیں دیکھ کر سر گھٹنوں میں دے کر مسکراتی اور دادی اماں چیختی۔ "اے ہے اب تجھ سے لڑائی کون لڑے توبہ ——— کتنا بڑا ہو گیا ہے تو ——— ابھی کل اتنا سا تھا اور آج دیکھو ——— شرم تو نہیں آتی۔ تجھے بوڑھی جان کی ہڈیاں توڑتے ہوئے۔ جا ——— کھیل جا کے اس سے تو کھیلنا ہی اچھا۔"

دادی اماں کو چھوڑ کر وہ سیدھا رضا کی دوکان پر جا پہنچتا۔ اب رضا اس کا دوست بن چکا تھا۔ رضا کی دوکان محلے کے اونچے بازار میں تھی میلے سے دروازوں کے پاس دھندلی دیواروں کے درمیان کئی ایک گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے' جن میں مختلف اشیاء پڑی تھیں۔ ایک میں ربڑ کے گیند تھے' ایک میں بچوں کے چوسنے کی مٹھائی۔ ایک میں لڑکیوں کے بالوں کے لئے پنیں اور

کلپ تھے۔ دو ایک گتوں پر چمکدار بٹن لگے ہوئے تھے۔ ایک گتے پر لوہے کی چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی اور ربڑ کے چند کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں کے پاس رضا بوریئے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے قریب ہی اس کا پکڑ کر چلنے والا سونٹا پڑا ہوتا تھا اور سونٹے کے پاس اس کا مضحکہ خیز جوتا۔ اس جوتے کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی کیونکہ اس کا ایک پاؤں تو عام جوتے کے سائز کا تھا اور دوسرا ٹیڑھا اور بچکانہ۔ رضا کی ٹانگوں کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہر نوارد چونکتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اپنی ٹانگ کے پاس اس نے لکڑی کی ایک مڑی ہوئی کھونٹی ڈال رکھی ہو۔ لوگوں کو اپنی ٹانگ کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ چلاتا۔ "میری طرف دیکھئے بابو جی۔ میری طرف۔ یہ کھونٹی بکاؤ نہیں۔" اور پھر منہ پکا کر لیتا یا ہنس کر کہتا "پسند ہے یہ تو ایک تم کو بھی دلا دوں۔" رضا اپنی لنگڑی ٹانگ پر شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتا تھا "یار" وہ دوستوں کے درمیان کھونٹے کے سہارے کھڑا ہو کر لنگڑی ٹانگ کو گھما کر کہتا "اللہ میاں نے مجھے تو ایک ہاکی دے رکھی ہے کیا سمجھا ہے تم نے اسے کسی سے لڑتے وقت رضا کو اپنے حریف کو پچھاڑتے ہوئے دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے لنگڑا ہونا خصوصی نعمت ہو۔ رضا یوں حریف سے چمٹ جاتا۔ جیسے جزیرے کا بڈھا پیر تسمہ پا ہو اور پھر اس مڑی ہوئی کھونٹی سے واقعی یوں کام لیتا گویا وہ ہاکی سٹک ہو۔

لیکن رضا طبعاً لڑنے سے گریز کرتا تھا ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی قابلیت گویا اس نے ورثے میں پائی تھی اور پھر اس کی باتیں سن سن کر محلے کے لڑکے ہنس ہنس کر پاگل ہو جایا کرتے تھے۔

ایلی رضا کے پاس جاتا تو وہ اٹھ بیٹھتا "آؤ ایلی آؤ۔ میاں بیٹھو" وہ دکان کے اندر ایک بوریا بچھا دیتا۔ "تاش کھیلیں۔ سیر کرو گے تو چلتے ہیں دکان بند کر کے چلتے ہیں۔ چلو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" ایلی چلاتا "میں تو ویسے ہی آیا تھا بیٹھنے کے لئے۔"

"اچھا تو ٹھیک ہے۔" اور وہ دونوں بیٹھ جاتے انہیں پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ چپ چاپ دونوں بیٹھے رہتے اور رضا حسب معمول ساتھ والے حکیم تمباکو فروش اور بیڑی فروش پر پھبتیاں کستا رہتا اور ایلی ہنستا رہتا۔ پھر جمیل ادھر نکلتا۔

"اے بھائی جمیل۔ جمیل۔ کہاں جا رہے ہو۔" رضا چلاتا۔ "کچھ مٹھائی فنڈ ہے نا آج تو ہم بھی چلتے ہیں۔ ایلی بھی بیٹھا ہے۔ میاں اندر دکان میں ہے۔"

مٹھائی فنڈ کا نام سن کر جمیل غصے سے گھونسہ گھماتا۔ "لنگڑے دوسری ٹانگ کی جانا۔ اے چاہئے۔" جمیل اندر داخل ہوتا۔

پھر وہ تاش کی بازی شروع کر دیتے اور دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ حتیٰ کہ کوئی آکر ایلی کو خبردار کر دیتا کہ دادی اماں کھڑکی میں بیٹھی ہر آتے جاتے سے اس کے متعلق پوچھ رہی ہے اور محلے کے تمام لڑکوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ پھر ایلی چپ چاپ اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

راستے میں کنوئیں کے قریب یا لالٹین کے پاس ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ ایلی آج تو وہ ہمارے گھر آگئی۔ ظالم نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نیلا سوٹ اور سفید رنگ۔ توبہ ہے۔"

"میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔" ایلی جواب دیتا۔

"پاگل ہو۔" ارجمند چلاتا "آج ـــــ اور گھر وہی بات ہوئی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ بھئی آج خاص دن ہے۔ آج نہیں جا سکتے تم تمہیں پتہ نہیں اس کی سہیلی آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو وہ ـــــ سبحان اللہ کیا سہیلی ہے۔ کمبخت۔ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ یہ گھر آج آہا۔ وہ دیکھو۔ چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ ذرا چق اٹھا کر میری جان۔ منہ دھوئے بغیر کیا پھبن ہے "جلم کریں توری اکھیاں۔"

نہ جانے کیوں ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ ارجمند محض گڑیوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ بے جان گڑیاں جو لجاتیں جھینپتیں، ظاہر ہوتیں اور چھپ جاتیں اور پھر کھلکھلا کر ہنستیں اور چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ اس وقت ایلی کی نگاہوں تلے دو بھرے بھرے بازو لٹکتے۔ مخروطی بانہوں کی جاذبیت فضا پر چھا جاتی۔ اور بھرے بھرے جسم میں خاموش بجلیاں سی رواں دواں ہوتیں۔

یوں محلے میں صبح سے شام ہو جاتی اور رات کو بستر پر پڑے پڑے وہ سوچتا۔ کس سے عشق کروں۔ کس سے۔

***

شہزاد

لاہور

ایلی کو علی پور میں رہتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی احمد آ گئے اور آ
ہی بولے "ایلی کالج میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ کل ہم جا رہے ہیں۔" ایلی کے ج
میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ لاہور وہ لاہور جہاں وہ اپنے ماموں قیوم کے ساتھ گیا تھا وہاں
اخبار محلے میں جہاں قیوم رہتا تھا۔

شام کے وقت جب قیوم اسے تانگے میں بٹھا کر سیر کو لے گیا تھا۔ سفید گھوڑی والا تا
جس کا کوچوان بوڑھا ہونے کے باوجود اس قدر زندہ دل تھا "موتی بیٹی۔ آج بابو جی کو سیل کر
ہے ——— چل بیٹی دولہن کی چال چلیو۔ چل۔" اور موتی یوں چلنے لگی تھی جیسے اس کی ٹانگو
تلے چھوٹے چھوٹے پہیے لگے ہوئے ہوں۔ گردن کے بال لہرا رہے تھے۔ نیچے سڑک پانی
دھارے کی طرح بہہ رہی تھی اور یہ دھارا چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور چوڑا۔ اور چوڑا۔ سڑک
دونوں کناروں پر سرسبز درخت اور اونچی عمارتیں ناچ رہی تھیں۔

پھر مکانات اور عمارتیں کم ہوتے گئے۔ ان کی جگہ دونوں طرف گھاس کے سبز قطعے آ
گئے جن میں سے رنگ رنگ کے پھول سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ سرسبز درخت جھوم ر
تھے۔ خاکستری ٹیلے لڑھک رہے تھے۔ سڑک بھورے فیتے کی طرح چل رہی تھی۔ سبز
کھمبوں پر بتیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں جیسے جگنو چمک رہے ہوں ——— وہ لاہور!

لاہور کا نام سنتے ہی وہ اٹھ بھاگا۔" دادی اماں میری قمیص کہاں ہے دادی اماں میرا

———" دادی اماں پوچھ رہی تھیں۔ "لڑکے میٹھی روٹیاں پکا دوں تجھے۔ ساتھ لے جانا۔ اے
ہے گاڑی میں بھوک لگے گی تو کیا کرے گا۔"

چند ایک گھنٹوں میں ایلی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ سنبھالنے
میں دیر لگتی۔ دو قمیص چار ایک پاجامے ایک پرانا کوٹ اور ایک گھسا ہوا جوتا۔

لاہور پہنچ کر علی احمد نے اسے تانگے پر بٹھایا وہ تانگہ انہیں گندے اور بھیڑ سے بھرے
بازاروں میں سے گھماتا ہوا بھاٹی دروازے لے گیا۔ یہ کیسا لاہور تھا۔ کیا یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں
موتی نے اسے سیر کرائی تھی۔ یہ لاہور اس لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اسے تسلی تھی کہ وہ لاہور آ گیا ہے اب اسے گھر میں دبک کر
رہنے کی کوفت سے نجات مل جائے گی۔ اب اس سے کوئی نہ کہے گا "ایلی حقہ بھر دو۔" اب
اسے کنوئیں سے بوتل میں پانی بھرنا نہیں پڑے گا اور علی احمد کا کمرہ دور ہو گا۔ بہت دور ———
اب کوئی آسا صحن میں بیٹھ کر تنکے سے زمین پر لکھنے میں مصروف دکھائی نہ دے گا اور نیم وا
دروازے سے رضامندی بھرے سفید دانت نہ چمکیں گے۔ اب اسے ہر چیز خریدنے کے لئے علی
احمد کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں گے۔ جب وہ علی احمد سے پیسے مانگتا تھا تو ——— توبہ ہے
وہ ایک جملہ کتنا دوبھر ہو جاتا تھا اور ——— اور جب وہ کچھ کہہ چکتا تو علی احمد کے جواب دینے
سے پہلے دنیا پر سناٹا چھایا رہتا۔ زندگی گویا جم کو برف کی سل بن جاتی اور پھر جب علی احمد اچھا کہتے
تو گویا "کن" کی آواز آتی اور وہ انجماد اور تعطل ختم ہو جاتا اور چاروں طرف زندگی از سر نو
بیدار ہو جاتی۔ لیکن علی احمد اچھا کہاں کہتے تھے۔ اب اس کی اپنی جیب میں پیسے ہوں گے اور وہ
مونگ پھلی خرید سکے گا اور گڑ کی ریوڑیاں ——— کتنی کڑاکے دار ہوتی ہیں گڑ کی ریوڑیاں۔
عیش خالص عیش۔ اتنی آزادی۔ اتنی آزادی اسے مل جائے گی کیا۔ وہ حیران تھا۔

گلیاں ہی گلیاں

رات علی احمد اور ایلی نے ایک عزیز کے یہاں بسر کی اور صبح سویرے ایلی کو ساتھ لے کر
علی احمد کالج کی طرف چل پڑے ——— "ہائیں یہ ابا کدھر جا رہے ہیں۔" ایلی سوچنے لگا۔ یہ تو
گلیاں ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں ——— کیا کالج گلیوں میں ہوتے ہیں اور گلیاں فضول گھومے جا
رہی تھیں۔ لیکن وہاں کالج تو نہ تھا کوئی۔ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کھڑکیوں سے لٹکتی

ہوئی عورتیں۔ منڈیروں سے جھانکتی ہوئی عورتیں۔ چوکیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں۔ بال بنا[...] ہوئی ـــــ دانتوں پر دنداسہ ملتی ہوئی دوپٹے سنبھالتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی۔ گھورتی ہوئی۔ چیخ[...] ہوئی۔ چلاتی ہوئی عورتیں ـــــ اور وہ گلیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ایک ختم ہوتی [...] دوسری شروع ہو جاتی۔ ایک مڑ جاتی تو دوسری کھل جاتی۔ گلیاں ہی گلیاں۔ تنگ گلی۔ بو[...] گلیاں۔ جہاں علی احمد کے سوا مرد گردن جھکائے گزرتے تھے اور مٹیاریں سینہ ابھار کر چل ر[ہی] تھیں ـــــ وہ تھک گیا مگر گلیاں چلے جا رہی تھیں اور ان میں علی احمد سر اٹھائے منڈیروں [کی] طرف دیکھتے ہوئے شاہانہ انداز سے یوں چل رہے تھے جیسے باغ میں ٹہل رہے۔ دفعتاً گلیا[ں] ختم ہو گئیں۔ چوڑی سڑک آ گئی۔ "وہ تمہارا کالج ہے۔ ایلی" علی احمد نے سامنے والی سر[...] عمارت کی طرف اشارہ کیا "اور دیکھا یہ۔" وہ گلیوں کی طرف اشارہ کرکے بولے "یہ لاہور [...] لاہور۔ خوب جگہ ہے لاہور۔" وہ ہنسنے لگے۔

ماں کا لال

علی احمد دو دن وہاں ٹھہرے۔ ایلی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ جلد رخصت ہوں اور اسے آزا[دی] حاصل ہو لیکن جب سب کام مکمل ہو گیا۔ فیسیں ادا کر دی گئیں۔ کتابیں مہیا کر دی گئ[یں] بورڈنگ میں 17 نمبر کے کمرے میں اس کی چارپائی رکھوا دی گئی اور علی احمد رخصت ہونے [لگے] تو نہ جانے کیوں وہ گھبرا گیا۔

بورڈنگ میں لڑکے ہی لڑکے بھرے پڑے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے۔ اونچے لمبے بھر[ے] بھرے جسم کے مرد نما لڑکے عجیب سے چہروں والے لڑکے بڑی رعونت سے گھورنے کے علا[وہ] تھے۔ جو ڈانٹ کر یوں بات کرتے جیسے تھانے دار ہوں۔ "اے لڑکا۔ ادھر آؤ۔" اور "اے کون ہو۔ کون ہو تم۔" وہ ہر وقت مونچھیں مروڑتے۔ اپنے تہہ بند جھاڑتے رہتے۔ [...] پاجاموں کی جگہ انہوں نے بڑی بڑی چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ جن کے تلے طلائی جوتے [...] جن کی نوکیں نکلی رہتی تھیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ عمر رسیدہ نوکر تھے جو انہیں حقہ پلانے [کے] علاوہ مٹھی چاپی میں مصروف رہتے۔ ایلی انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور پھر سہم کر سترہ نمبر کے [...] کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔

"اے تو کون ہے؟" ایک لمبا تڑنگا لڑکا کمرے میں آ گھسا "کون ہے تو؟"

"جی۔ جی۔ جی۔۔" ایلی گھبرا گیا۔

"جی جی کیا۔ سیدھی بات کرو۔"

وہ چلا گیا تو ایلی اٹھ بیٹھا۔ اس کے ارد گرد دیواریں گھوم رہی تھیں۔ ہوسٹل میں ہر طرف اونچے لمبے جاٹ قسم کے لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ "ٹھہراو لونڈے۔ کہاں جا رہا ہے تو مار رہے تھے۔ منہ چڑا رہے تھے۔" ایلی بھاگنے لگا۔ ایک بھدی سی آواز پیچھے سے چلا رہی تھی۔ "ٹھہراو لونڈے۔"

ارے یہ لڑکیاں کہاں سے آ گئیں۔ "ایک لڑکا ایلی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے زبردستی ایلی کی ٹھوڑی پکڑ لی اور اس کے منہ کو چاروں طرف گھما کر بولا "یہ دیکھو ماں کا لال۔ ابھی ماں کا دودھ پینا نہیں چھوڑا اور آئے ہیں یہاں کالج میں داخل ہونے کے لئے۔ ماں کے پیٹ ہی سے دسویں کرکے آتے ہیں۔"

خوف سے ایلی کی حرکت قلب بند ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں "جا اپنی ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔" اس نے دھمکی دے کر کہا "دوڑ امی کی گود میں جا کر بیٹھ۔" پھر ایلی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے وہ زیر لب ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ "ماں کی پیٹ سے دسویں پاس کرکے آتے ہیں۔" "یہ دیکھو مائی کا لال۔ ہا ہا ہا۔"

سارا لاہور اس کے راز سے واقف تھا۔ سبھی اس پر ہنس رہے تھے "پکڑ لو۔ پکڑ لو۔" وہ پھر بھاگ اٹھتا۔ لڑکیاں نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ عورتیں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ تانگے والے اس کا مضحکہ اڑا رہے۔ تھے۔ "ہٹ بابو۔"

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر دادی اماں کے پاس جا پہنچے اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلا دے۔ "کیا ہے تجھے ایلی۔ سو جا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" اور پھر مطمئن ہو کر وہ رضا کی دکان میں جا بیٹھے۔ "آؤ بابو ایلی۔ بیٹھ جاؤ۔" اور وہ پر وقار انداز سے بیٹھ جائے یا ارجمند کے پاس جا کھڑا ہو۔ "ایلی وہ دیکھو بین بجی اور ناگ مست ہوا ہے نا۔" وہاں اس کی اہمیت تھی۔ وہاں لوگ اسے ماں کا لال نہیں سمجھتے تھے وہاں اس کی باتیں ایک حیثیت رکھتی تھیں۔

بازار میں جگہ جگہ چھابڑی والے مونگ پھلی' ریوڑیاں اور چنے بیچ رہے تھے لیکن اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چاروں طرف بھیانک دھندلکا چھایا ہوا تھا اونچے اونچے کھمبے سروں پر

ٹمٹماتی ہوئی بتیاں اٹھائے ناچ رہے تھے۔

نہ جانے کب تک وہ بازاروں میں آوارہ گھومتا رہا لیکن آخر کار اسے واپس ہوسٹل میں آنا ہی پڑا۔ واپس آنے کو اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ اس گنوار خانے کی نسبت سٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھ کر وقت کاٹنا کہیں بہتر تھا۔ لیکن سٹیشن بھی تو ایک اجنبی مقام تھا جہاں پولیس کے سپاہی بیٹھے اور لیٹے ہوئے مسافر کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے کسی عزیز کے گھر کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ بورڈنگ میں جا داخل ہوا وہاں برآمدوں میں گراؤنڈ میں جگہ جگہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑگڑا رہے تھے۔ سفید چادریں جھاڑی جاری تھیں۔ "او نذیرے۔ او فتے۔" کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چپ چاپ وہ کمرہ نمبر سترہ میں جا پہنچا۔ ہائیں وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کا ٹرنک۔ نہ سوٹ کیس۔ نہ بستر نہ چارپائی کمرے کے دروازے کے قریب برآمدے میں ایک جاٹ کو بیٹھے دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

"جی۔ جی۔" اس کا دل دھڑک رہا تھا "یہاں اس کمرے میں یعنی کمرہ نمبر سترہ میں یہ میرا سامان بستر۔"

جاٹ نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا اور کھانس کر بولا "معلوم نہیں۔"

دو مونچھوں والے جوان سامنے کوٹھے پر چارپائیوں پر پڑے تھے۔ وہ ان کے قریب چلا گیا لیکن ان سے بات کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

"کیوں بھئی۔ کیا دیکھتا ہے۔" ایک نے چلا کر کہا۔

"کچھ نہیں جی۔ کچھ نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"ہوں۔ کون ہے۔ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔"

"جی میں سترہ نمبر میں میں فرسٹ ایئر میں۔ میں۔ میں۔" اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ "جی میرا بستر چارپائی۔ ٹرنک، سب غائب ہیں۔"

"ہائیں۔ کیا مطلب کیا ہم چور ہیں۔" ایک نے مونچھ مروڑتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ جی۔ نہیں۔" ایلی نے جھٹ انہیں یقین دلانے کی کوشش کی "یہ تو اپنے ہوسٹل نئیں ہے۔" ایک نے اسے کھنکھار کر کہا "ادھر آ بے۔" "چوری کرنے آیا ہے تو۔"

"جی جی نہیں۔ میں تو۔"

"بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولیس کو بلائیں گے۔ دوڑ۔"

ایلی پھر بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کس طرف۔ لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس مین کے سامنے پہنچ کر وہ گھبرا جاتا اور آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو چور سمجھنے لگا تھا۔ آوارہ۔ چور پلیٹ فارم پر وہ ایک بنچ پر پڑ گیا۔ اسے مسافر خانے کے بنچ پر پڑے دیکھ کر پولیس والا آ دھمکا۔

"ہے۔ کون ہے۔ تو۔ کہاں جائے گا؟"

"جی جی۔" وہ اٹھ بیٹھا۔

"کہیں بھی نہیں۔" وہ بولا

"تو یہاں کیوں پڑا ہے؟"

"میں۔ میں۔" وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ نہ جانے اسے کیا کہنا چاہئے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"بھاگ یہاں سے۔" حوالدار نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ ویران لاہور کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جہاں خوفناک شکلوں والے کتے بھونک رہے تھے۔ ہر قدم پر وہ ٹھٹھک جاتا۔ رک جاتا۔ نہ جانے کہاں سے کوئی آنکلے گا۔ کتا بھونکے گا یا کوئی حوالدار مونچھ مروڑ کر اسے گھورے گا۔ توبہ کس قدر ویران شہر تھا وہ کتنی چوڑی سڑکیں تھیں وہاں اور وہ کھمبوں پر ٹنگی ہوئی بتیاں یوں ٹمٹا رہی تھیں۔ جیسے کسی ڈائن کی آنکھوں کی پتلیاں ہوں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا آخر وہ پولیس والا یہی پوچھتا تھا نا کہ کہاں جائے گا۔ ٹکٹ کہاں ہے تیرا ــــ اس خیال پر وہ پھر سٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ بکنگ آفس سے اس نے ٹکٹ خریدا اور ویٹنگ روم کی طرف چل پڑا۔

پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی علی پور کی طرف فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

پناہ گاہ

علی پور پہنچ کر وہ اپنی تمام گزشتہ تکالیف کو بھول گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ویرانی ختم ہو

گئی ہو اور وہ پھر سے ایک حیثیت سے مالک ہو گیا ہو۔

"ایلی۔ ایلی۔ ایلی۔" چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"ایلی۔" دادی اماں چلا رہی تھی۔ "تیرا دل لگ گیا تھا وہاں لاہور میں۔ توبہ اتنی دور تن تنہا
جانا۔ نہ بھئی میں تو نہیں چاہتی تو وہاں اکیلا جائے۔"

"ایلی۔" ارجمند چلا رہا تھا۔ "تم آ گئے۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ تم چلے جاتے ہو تو سب گڑ بڑ ہو
جاتا ہے۔ اسسٹنٹ نہ ہو تو بیچارہ ہیڈ کیا کرے۔ بڑی چیز ہوتی ہے اسسٹنٹ۔ ہاں تم نہیں جانتے
دفتروں میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور پھر یہاں انکرائینڈی آفس ہے۔"

"آ گئے بابو۔" رضا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو گھماتے ہوئے کہا "آؤ بیٹھو۔ اب تو کالج والے
بن گئے۔ بابو بن گئے تم۔"

"ایلی۔" جمیل اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "آؤ اونچی گلی میں آؤ وہاں آج لالہ نے
گلاب جامن بنائے ہیں۔ آؤ۔"

"تو آ گیا ایلی۔" سعیدہ نے اپنا خوشبودار دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا "آ جا' آج رات کو
سیاہی کی بازی لگے گی۔ آئے گا نا تو ——"

"ہاں۔ ہاں۔" ایلی نے کہا "ضرور آؤں گا۔"

"ایلی —— اب تو کالج کے ٹھاٹھ ہیں نا۔" حکیم صاحب اسے دیکھ کر طنزاً" مسکرائے۔
چودھری یہ سن کر بولا "کیا فرق ہے حکیم صاحب۔ یہ تو جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب
ہے۔ وہی رضا کی دوکان۔ وہی تاش کی گڈی۔"

چچا عظمت رک گئے "کیا کہا چودھری۔ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لنڈوروں
آتا ہی کیا ہے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔" رضا ہنسا "یہی میں کہہ رہا تھا۔ چچا عظمت۔"
عظمت نے رضا کی طرف انگلی سے یوں شست باندھی جیسے اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہوں
نے تو لچ پنے کا اڈہ بنا رکھا ہے۔ یہ دکان تو محض ایک بہانہ ہے۔"

"ہاں۔" رضا ہنسا "چچا جی یہی بتا رہا تھا میں انہیں۔ لیکن ان احمقوں کی سمجھ میں آئے
بات' بالکل بھس بھرے ہیں یہ سب اور اور یہ ایلی ——"

علی پور آ جانے سے ایلی کی ایک حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ محلے کے بزرگ

بوڑھیاں اکثر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑے رہتے پھر بھی علی پور تھا اور لاہور۔ لاحول ولا قوۃ وہ تو ایک
ویرانہ تھا۔ کھوے سے کھوا چھلنے کے باوجود ویرانہ۔

لاہور کا خیال آتے ہی ایلی گھبرا جاتا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چھوٹ جاتا۔ لیکن وہ دل ہی دل
میں جانتا تھا کہ اسے لاہور جانا ہی ہو گا۔ علی پور میں رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی جتنے دن وہ علی پور
رہ سکتا تھا۔ غنیمت تھا۔

"اے ہے تیری چھٹی ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔" دادی اماں اسے چوتھے ہی روز گھورنے
لگی۔ "اب تو واپس بھی جائے گا یا یہیں آوارہ گردی کرتا رہے گا۔ میں تیرے ابا کو کیا جواب
دوں گی۔"

"لیکن میں وہاں بورڈنگ میں جا کر بھوکوں مروں۔" ایلی کو سوجھی "لو وہاں تو بلکہ کھانے کو
میوے ملتے ہیں تیرے ابا کہہ رہے تھے اس روز تو بھی پاس ہی تھا۔" دادی اماں نے جواب دیا۔

"ہونہہ میوے۔ وہاں تو روٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑے لڑکے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ فرسٹ
ائیر والوں کو کون پوچھتا ہے۔"

پہلے تو دادی اماں نے ایلی کی بات کا اعتبار نہ کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے نام پر
ایلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں تو اسے یقین آ گیا۔

"نہ بھئی میں تو ایلی کو بورڈنگ میں نہ بھیجوں گی۔ اے ہے اپنا فیروز جو رہتا ہے۔ وہاں
لاہور میں پھر لڑکا بورڈنگ میں بھوکوں کیوں مرے۔ نہیں بھئی میرا ایلی وہاں نہ رہے گا کبھی بھی۔
اپنا گھر نہ ہو تو بھلا مجبوری ہوئی۔ لیکن فیروز کے ہوتے ہوئے لڑکے کو بھوکوں مارنا۔"

قہقہہ اور نعرہ

فیروز کی جوانی دیر سے ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس کے رخساروں پر سرخی کی جھلک ابھی تک
نمایاں تھی۔ جسم بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پر وقار ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں بے جان سا محسوس ہوتا
تھا۔ شانے چوڑے تھے چال ایستادہ تھی اور جسم تنومند اور مضبوط تھا۔ لیکن اس کے باوجود
فیروز کو دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے اس کی عظمت ماضی سے تعلق رکھتی ہو۔ جیسے وہ گزشتہ جاہ و
حشمت اور عیش و عشرت کی ایک داستان ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور وقار دونوں
خصوصیات بہ یک وقت موجود تھیں۔ لیکن ان میں ایک بے نام سی بے حسی کی جھلک تھی۔

مبہم سی اکتاہٹ اور محرومی۔

فیروز کی زندگی اس ویرانی اور محرومی کے باجوود متوازن تھی۔ جسے پابندی اوقات سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ صبح سویرے جاگ اٹھتا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر چہل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا۔ واپسی پر چائے پینے کے بعد تھوڑا سا مطالعہ کرتا اور پھر کھانا کھا کر کپڑے اتار کر آرام کرتا حتیٰ کہ چائے کا وقت ہو جاتا اور چائے پینے کے بعد وہ پھر کپڑے پہن کر باہر سیر کو چلا جاتا اور واپسی پر کھانا کھا کے لیٹ جاتا۔

فیروز کو باتیں کرنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی خاموشی کسی دلخراش المیہ کی شاہد تھی۔ فیروز کے کمرے کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں اس کی ہمشیرہ صابرہ رہتی تھی۔ وہ ہر وقت چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے سر پر ایک خاکستری رنگ کی چادر پڑی رہتی۔ جس میں اس کا سرخ و سپید چہرہ یوں دکھتا۔ جیسے کسی نے اندھیری کوٹھری میں کوئلے دہکا رکھے ہوں۔ اس کے سیاہ لمبے بال عام طور پر کھلے لٹکے رہتے۔ "بیٹھ جاؤ۔" وہ نووارد کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی اور پھر دفعتاً" اس کا قہقہہ گونجتا ایک بے پروا بے نیاز پروقار قہقہہ۔ وہ ہر تکلیف اور پریشانی پر قہقہہ مار کر ہنستی اور نووارد محسوس کرتا جیسے وہ دنیاوی تفکرات پر خندہ زن ہو۔ صابرہ کا چہرا بڑا پروقار اور بارعب تھا۔ اس کا انداز بے حد پر اثر تھا۔

اس کوٹھڑی کے اردگرد کئی ایک کوٹھڑیوں میں صابرہ کی بیٹیاں رہتی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی نیفہ کی شادی کسی سید سے ہونے والی تھی جو کسی گاؤں میں زمیندار تھا۔ سرور کا خاوند ایک معمولی دوکاندار تھا جس کی دوکان لوہے کے کباڑ خانے پر مشتمل تھی وہ روز حسرت زدہ امید سے خاوند کا انتظار کرتی کہ کب دوکان سے چار پیسے کما کر لائے اور وہ ہانڈی روٹی کا انتظام کرے۔ سرور دن بھر کپڑے دھوتی بچوں کو پیٹتی اور خاوند کو زیر لب برا بھلا کہتی رہتی۔ بچے چپ چاپ حیران نگاہوں سے کبھی ماں اور کبھی سیڑھیوں کی طرف دیکھتے۔

ایک کوٹھڑی میں خاور اجلے کپڑے پہنے کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا سرور کے بچوں کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی۔ نیفہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اس گھر کی فرد نہ ہو۔ اس کے انداز میں نہ تو مایوسی تھی اور نہ بے نیازی اس ویرانے میں نیفہ ایک سرسبز خطے کی طرح تھی۔ اس کے ہاتھ حنا کے رنگ سے چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے رہتے اور لبوں پر کسی نا کسی ڈھولک گیت کی دھن ناچتی۔ جب وہ ڈھولک کے ساتھ گاتی تو ایسا معلوم ہوتا

جیسے بہار آ گئی ہو۔

اوپر والی منزل میں انور اور اس کی بیٹی مینا رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں انور چولہے کے سامنے بیٹھی دیوار کی طرف تکتی رہتی۔ جیسے دیوار کے پار دور ——— بہت دور نہ جانے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کی لٹ جھٹک کر منہ پر آگرتی آنکھوں میں ان بہے آنسو چھلکتے اور وہ بار بار آہ بھرتی اور ننھی مینا گڑیا تھامے کبھی ماں کی طرف دیکھتی اور کبھی دیوار کی طرف۔ یہ وہ مکان تھا جہاں لاہور میں ایلی کو قیام کرتا تھا۔

فیروز ایلی کا پھوپھا تھا۔ پھوپھی مر چکی تھی اور اب فیروز تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی زندگی میں وہ محکمہ پولیس میں اچھے عہدے پر فائز تھا پھر شاید وہ مسلسل حکومت سے اکتا گیا اور اس کے دل میں محکومیت کی آرزو چٹکیاں لینے لگی یا شاید یہ سب راگ رنگ اور رقص کا اعجاز ہو۔ مسلسل عیش و طرب انسان کے دل میں نسائی آرزوئیں پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال اسے ایک رقاصہ سے محبت ہو گئی اور ایک روز شراب کے نشے میں خود کشی کی عملی مگر ناکام کوشش کی وجہ سے وہ ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا اور بالآخر ظہور اس رقاصہ کے چوبارے پر جا بیٹھا۔ بائی نے کئی ایک سال اس کی خدمت کی۔ پھر بائی کی اچانک موت پر وہ اپنی ہمشیرہ کے گھر آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب وہ سب اکٹھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ فیروز خاموشی سے میز پر بیٹھا رہتا یا چارپائی پر لیٹ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔ ملحقہ کمرے میں صابرہ بیٹھی تسبیح کے دانے گنتی رہتی اور کبھی کبھار ایک بے نیاز اور پر جلال قہقہہ لگاتی۔ ساتھ ایک نعرہ بھی "داتا۔" اس قہقہے میں بے نیازی اور زندگی تھی اس نعرے میں جذبہ اور جوش تھا۔ وقار سے بھرپور زندگی احترام سے بھرپور جذبہ۔

اوپر والی منزل میں انور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتی اور پھر آہ بھر کر کہتی "ایلی تم نہیں جانتے ساس اور نندوں نے مینا کے ابا کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور میاں آپ بھی تو جانے کس مٹی کے بنے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔ ہائے ایلی ماں باپ نے مجھے کہاں جھونک دیا۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔" اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور وہ انہیں پلو سے پونچھ کر پھر دیوار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ اس پر ننھی مینا اور بھی سہم جاتی اور اسے گڑیا کا کھیل بھول جاتا اور ایلی سوچنے لگتا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ روئی روئی خوبصورت عورت، وہ سپنے دیکھنے والا سرخ و سپید بزرگ، اور ایک

دوسرے سے بے خبر بے نیاز، بہنیں اور ان کے بلکتے ہوئے بچے ——— وہ حیران ہوتا اور پھر
سوچ میں کھو جاتا۔ پھر دفعتاً صابرہ کا قہقہہ گونجتا اور داتا کا نعرہ بلند ہوتا جیسے وہ غربت اور ان
مصائب کا جو اس گھر پر مسلط و محیط تھے۔ تمسخر اڑا رہی ہو۔

فیروز کے مکان کے متصل بھنگی رہتے تھے۔ جن کی لڑکیاں گایا کرتی تھیں۔ ان کے یہاں
روز ایک نہ ایک تقریب رہتی۔ نہ جانے کیوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ ڈھولک بجتی اور عورتیں
دیر تک گاتیں۔ جسے سن کر فیروز چپ چاپ پتھر کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا اور صابرہ کی تسبیح اور
بھی تیزی سے چلتی اور انور کے دوپٹے کا پلو بالکل ہی تر ہو جاتا اور خاور ناک سیکڑ کر کہتی "توبہ
ہے کس قدر چیختی ہیں یہ بھنگنیں۔ کیسا واہیات محلہ ہے یہ۔" اور نیفہ شوق سے شاہ نشین پر جا
بیٹھتی اور ان کے گیت سننے میں محو ہو جاتی یا مسحور ہو کر چلانے لگتی "ہائے آپا کیسی اچھی ڈھولک
بجاتی ہیں یہ ہائے میں کیا کروں۔"

دھندلکا

صبح سویرے ایلی منہ ہاتھ دھو کر کالج کی طرف چل پڑتا۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اسے جوں
جوں وہ کالج کے قریب پہنچتا اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے۔ دبی دبی گھبراہٹ ابھرتی اور اسے
چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ کالج کی طرف چلتے ہوئے ہر قدم پر اس کی حیثیت کم تر ہو جاتی۔ حتیٰ
کہ کالج میں پہنچ کر وہ ایک ٹھنگنے میں بدل جاتا اور پھر چاروں طرف بڑے بڑے گلیور اس کے گرد
گھومتے اسے گھورتے اور اس کا تمسخر اڑاتے۔ ایلی کی نگاہیں جھک جاتیں اس کا جی چاہتا کہ کہیں
بھاگ جائے دور ——— بہت دور جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کا تمسخر نہ اڑائے۔ کوئی اسے
دھمکی نہ دے جہاں لوگ اس قدر اونچے لمبے اور ہیبت ناک نہ ہوں پھر نہ جانے کیا ہوتا اس کے
گرد و پیش ایک دھندلکا سا چھا جاتا اور وہ دھندلکا ان گلیوروں کو ایلی کی نظروں سے چھپا دیتا۔ ان
کے تمسخر بھرے قہقہے مدھم پڑ جاتے۔ پھر وہ دیکھتا کہ وہ بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ ان جانے
بازاروں میں۔ نئی نئی سڑکوں پر یہ دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان سا ہو جاتا۔ جیسے اس نے اپنی
اور اپنی زندگی محفوظ کر لی ہو۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

اس کے باوجود اس کے دل میں کھٹک سی لگی رہتی کہ وہ کالج میں حاضری نہیں دے رہا
کلاسز اٹنڈ نہیں کر رہا۔ بلکہ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ گناہ کا خیال

ہی اس کی نگاہوں میں دو حنائی ہاتھ لٹکنے لگتے اور وہ از سر نو مضطرب ہو جاتا۔ اس اضطراب سے
مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ وہ مونگ پھلی اور ریوڑیاں
کھانے میں مصروف ہو جاتا لیکن مونگ پھلی اور ریوڑیاں ایسی چیزیں صرف وقتی مصروفیت بہم
پہنچا سکتی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں سگریٹ کو بھی آزمایا تھا۔ مگر سگریٹ بھی مفید ثابت نہ
ہوئے تھے الٹا وہ تو گلے میں کھرکھری سی پیدا کرتے تھے۔ جس سے اس کا اضطراب اور بھی بڑھ
جاتا تھا ان سب باتوں سے اکتا کر سڑکوں پر بھٹکتے پھرنے سے تھک کر وہ کسی سینما ہال میں چلا جاتا
اور چار آنے کا ٹکٹ خرید کر دو ڈھائی گھنٹے تک ایلمو اور پیڈرو بہادر کے کارنامے دیکھنے میں کھو
جاتا۔ سینما ہال کا اندھیرا اسے لوگوں کی ٹٹولتی ہوئی جانچتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر
لیتا اور پھر اطمینان سے پیڈرو بہادر کا روپ دھار کر وہ بدمعاشی کو پیٹتا اور بالآخر حنائی ہاتھوں والی
حسینہ کو گھوڑی پر چڑھا کر ہوا ہو جاتا۔

لیکن سینما سے فارغ ہو کر جب وہ گھر پہنچتا تو وہ حنائی ہاتھ شہ نشین کو تھامے ہوتے۔ جھکی
جھکی نگاہوں سے وہ انہیں دیکھتا اور پھر چپ چاپ نگاہ اٹھائے بغیر چوبارے میں جا پہنچتا جہاں انور
چارپائی پر بیٹھی فضا کو گھور رہی ہوتی۔

اسے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ چونکتی۔ "ہائے ایلی میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا تھا اور کیا ہو
گیا۔ ایلی ——— انہوں نے اس قدر ظلم کیوں کیا مجھ پر۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔" اور وہ
ٹپ ٹپ رونے لگتی۔

پھر صابرہ کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی اور وہی نعرہ "——— داتا" اور پھر متصل کوٹھڑیوں
سے بھنگنوں کی ڈھولک اور گیت کی آوازیں بلند ہوتیں۔ "اگ بال کے دھوئیں دے بج روواں
لکوواں دکھ سجناں دا۔ ہائے سجناں دا۔"

لاہور کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ ایلی محسوس کرتا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ عالم خواب
چند روزہ ہو۔

وہ دھندلکا جو اس نے اپنے گرد و پیش بکھیر رکھا تھا۔ اس کے لئے کس قدر اطمینان بخش تھا۔
کیونکہ اس دھندلکے کے وجہ سے وہ دلخراش حقائق سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے
بچ سکتا تھا۔ لوگوں کو تو ہر آتے جاتے کو نگاہوں سے کریدنے کی بری عادت تھی۔ ایلی کے لئے
سب سے بڑی مشکل لوگوں کی نگاہیں تھیں۔ بازار میں چلتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ

وہ اپنی لٹکتی ہوئی بانہوں کو کیسے سنبھالے اور اکڑی اکڑی گردن کو کیسے قائم رکھے کہ لوگ اس تمسخر سے نہ ہنسیں۔

چار ایک لوگوں کے قریب سے گزرنا یا ان کے پاس کھڑا ہونا یا ان سے باتیں کرنا ایلی لئے بے حد مشکل تھا۔ بازار کے لوگ تو خیر اکثر بے پروائی اور بے توجہی سے اس کے پاس گزر جاتے لیکن کالج کا ہر لڑکا اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا اور لڑکوں کے گرد اس کا اڑاتے۔

اس زمانے میں کالج کے لڑکے بھی تو عجیب سے تھے۔ لڑکے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ لگتا جیسے بڑے بڑے زمیندار اور رئیس ہوں ——— جو پنچایت کے اجلاس پر آئے ہو ہوں۔

جب وہ گاؤں سے لاہور آتے اور پھر سٹیشن سے بورڈنگ تک تانگے میں پہنچتے تو ا عجیب منظر نظر آتا۔ تانگہ کے پائدان پر ان کا نوکر غلام علی۔ فتایا کریما بیٹھا ہوتا جو ایک ہاتھ تمباکو کا تھیلا دوسرے میں گھی کا پیپا تھامے ہوتا۔ چودھری سیٹ پر یوں اکڑفوں بیٹھا ہوتا۔ جیسے رئیسی تانگہ ہو۔ ایک ہاتھ سے مونچھ مروڑتا دوسرے سے سر کھجاتا۔ سیٹ پر ایک طرف م کا مرتبان ہوتا اور دوسری طرف فرشی حقہ جس کی نے بے حد لمبی اور چمکدار ہوتی تھی۔

ان کے قد اونچے لمبے ہوتے تھے۔ انہوں نے کالے اچکن اور بھاری بھرکم شلواریں ہوتی تھیں اور ان کے سر کی پگڑی کا طرہ گویا تانگے کی چھت کو اٹھائے ہوتا۔

اس کے برعکس ایلی کا چھوٹا اور پرانا کوٹ جو علی احمد کو الٹا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی سن مختصر سی پتلون اور معمولی سا جوتا۔ یہ تمام چیزیں صاف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایلی کا قد اور پندرہ سال کی عمر ——— شاید انہیں باتوں پر کالج کے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے تھے۔

وہ نہ بھی ہنستے تو بھی ایلی کے لئے کالج جانا مشکل ہوتا کیونکہ اس کے دل پر کمتری کا احساس اور محیط رہتا تھا۔ جو اس نے اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا اور جسے علی احمد کے گھر کے نے پالا پوسا تھا گرچہ یہ احساس کسی وقت دب بھی جاتا۔ لیکن مناسب وقت پر دفعتاً دل کونوں سے نکل کر اس پر یورش کر دیتا اس وقت اس کی انا کی ناؤ ڈولنے لگتی اور پھر وہ گویا ہستی سے معدوم ہو جاتا۔ عین اس وقت اس کے گرد وہی دھندلکا چھا جاتا جو اسے لوگوں کی رحم نگاہوں سے محفوظ کر لیتا تھا اور اس دھندلکے میں گھومتا گھومتا وہ سینما ہال میں جا پہنچتا

دھندلی دھندلی تصاویر اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دیتیں۔

پیڈرو بہادر

ویسے تو اس زمانے کے لاہور میں بھی خوبصورت عمارات اور سڑکیں تھیں خوشنما دکانیں اور ہوٹل بھی تھے۔ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جس لاہور میں ایلی رہتا تھا وہ لاہور عظیم الشان عمارتوں بڑے بڑے ہوٹلوں اور دوکانوں سے سجے ہوئے باغات اور خوبصورت سڑکوں سے قطعی طور پر خالی تھا۔ فیشن ایبل علاقے میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پسینے سے بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مال روڈ پر جانا اس کے لئے قطعی طور پر ناممکن تھا۔ وہاں لوگ اکڑ کر چلتے تھے اور انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے اس کی ڈولتی ہوئی ناؤ کسی عظیم الشان جہاز سے ٹکرانے لگی ہو۔ وہ سہم جاتا۔ پٹڑی پر چڑھ جاتا اور پٹڑی سے اتر کر سڑک کے کونے پر سمٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ سینما دیکھنے کے لئے وہ اس ہال میں جاتا جو عام سا ہو اور جہاں عام سے لوگ جاتے ہوں۔ جس کی عمارت عظیم الشان نہ ہو جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ گھبراہٹ محسوس نہ کرے۔

اس زمانے میں لاہور میں صرف چار ایک سینما ہال تھے ایک بھاٹی دروازے کے باہر ایک ہیرا منڈی میں اور ایک شاہ عالمی کے باہر اور یہ تینوں ہال معمولی اور گھٹیا قسم کے تھے جہاں وہ آسانی سے جا سکتا تھا۔

میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ایک ویران سڑک تھی۔ جس پر ایک بیٹھی سی عمارت میں ایرین سینما تھا۔ یہ عمارت اگرچہ چنداں عظیم الشان نہ تھی مگر وہاں جانے والے تماشائی قطعی طور پر مختلف تھے اور سینما کے ماحول سے انگریزیت اور فیشن کی بو آتی تھی۔ وہاں جانا ایلی کے بس کی بات نہ تھی۔ گیا تو وہ کئی ایک بار تھا۔ ایک روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ گھر تک پہنچ بھی تھا۔ مگر پھر وہی دھندلکا چھا گیا تھا اور پھر جب وہ دھندلکا چھٹا تھا تو وہ شاہ عالمی گیٹ سینما کے ٹین ہال میں بیٹھا مسٹریز آف مائرہ دیکھتے ہوئے مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ ان دنوں فلم خاموش ہوا کرتے تھے۔ ایک فلم مہینوں چلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سیریل فلم دکھائے جاتے تھے۔ ممکن ہے برٹ انسٹی چیوٹ اور ایمپائر ہال میں ایسے فلم بھی دکھائے جاتے ہوں جو

صرف دس بارہ ریلوں میں ختم ہو جاتے ہوں۔ لیکن اس تفصیل کے متعلق ایلی کو کچھ معلوم نہ
تھا۔ بہرحال شہر کے سینما گھر میں بارہ پندرہ ایسی سوڈ دکھائے جاتے تھے۔ جن کے اختتام پر ہیرو
کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس جاتا تھا اور بدمعاشوں کے نرغے میں ہیروئن اپنی عزت اور جان
بچانے کی خاطر ہیرو کی امداد کے لئے دعائیں مانگ مانگ کر اس کا انتظار کرتے کرتے ہار کر مایوس ہو
جاتی تھی۔

خاموش فلم دیکھنے میں ایک خوبی ضرور تھی۔ ہرچند ایک منٹ کے بعد چادر پر انگریزی میں
مکالمے یا بیانیہ عبارت آجاتی تھی اور ہال کے پچھلے حصے سے گنگناہٹ سی بلند ہوتی یہ مکالمے اور
عبارتیں ایلی کے لئے واحد ذریعہ تعلیم تھیں۔ کیونکہ کالج میں لیکچر میں حاضر ہونا یا سبق حاصل
کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ جماعتیں کہاں بیٹھتی ہیں اور کون
پروفیسر انہیں پڑھاتے ہیں۔

پہلے دو سال کے دوران میں ایلی کا نام کئی ایک مرتبہ کالج سے خارج ہوا لیکن ہر بار کسی نہ
کسی طرح علی احمد کو خبر مل جاتی اور وہ علی پور کے کسی عزیز کو اطلاع دے دیتے اور جلد ہی محلے
کا کوئی بزرگ علی پور سے آپہنچتا اور دو ایک دن لمبے چوڑے لیکچر پلا کر اور ایلی کی فیس ادا کر کے
واپس چلا جاتا اور ایلی کا نام ایک بار پھر کالج کے رجسٹر میں درج ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو خود علی احمد
اسے داخل کرانے کے لئے آگئے اور انہوں نے ایلی کو لیکچر پلانے کی جگہ ایک اور طریقہ اختیار
کیا۔ وہ باری باری ایلی کے تمام پروفیسروں اور کلرکوں سے ملے اور ایلی کو ان سب سے متعارف
کرایا۔ پروفیسر حیران تھے کہ یہ کون لڑکا ہے کیونکہ انہوں نے ایلی کو جماعت میں کبھی نہ دیکھا
تھا۔

اس واقعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایلی کی جھجک کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ دھندلکا اب
صرف کالج کے برآمدوں سیڑھیوں اور میدان تک محدود رہ گیا اور کلاس روم کا مطلع کھل گیا اب
وہ بھاگ کر برآمدے سے گزرتا اور کلاس روم کی آخری بنچ پر بیٹھ جاتا اور پھر جب جماعت ایک
لیکچر سے فارغ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی تو وہ پہلے ہی بھاگ کر کسی کونے میں جا کھڑا
ہوتا تاکہ لڑکوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود حاضری کے رجسٹر سے اس کا نام
کٹنا بند نہ ہوا۔

طالب خیریت

خط لکھنے میں علی احمد کو کمال حاصل تھا انہیں ہر اس بات پر دلچسپی تھی جو لکھنے سے متعلق

ہو مثلاً گھر میں ان کے لکھنے کے سامان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علی احمد میز پر بیٹھ کر نہیں لکھ
سکتے تھے۔ لکھنے کے لئے انہیں فرش پر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی دوات ہمیشہ تھالی میں رکھی
ہوتی۔ قلم کی نبیں گھس گھس کر اس قدر موٹی ہو جاتیں کہ دیکھنے والا شناخت نہ کر سکتا تھا کہ
تحریر کلک سے لکھی گئی ہے۔ یا ریلیف کے نب سے لیکن علی احمد کو گھسی ہوئی نب سے لکھنے کا
شوق تھا وہ ہر نئی نب کو گھس کر یا جانے کیسے موٹا کر لیا کرتے اور پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر
لکھا کرتے اور اس شغل میں اس قدر کھو جاتے کہ انہیں گردو پیش کا احساس ہی نہ رہتا۔ یہ تو
محض اتفاق کی بات تھی کہ لکھنے کے سلسلے میں ان کی توجہ حساب کتاب اور تاریخ پیدائش و وفات
اور شادی بیاہ تک محدود رہ گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیتے تو نہ جانے
کیا نتائج ظہور میں آتے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ان کی قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو خط میں وہ
مناسب القابات اور معقول انداز تحریر کے شدت سے قائل تھے۔ ہر بات کو مناسب جزئیات اور
حصوں میں تقسیم کرتے اور پھر باقاعدہ طور پر انہیں نمبروار تحریر کرتے۔ ایلی اپنے خط میں چلاتا
”جناب والا! آپ نے ابھی تک خرچ نہیں بھیجا میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کالج کی فیس ادا کرنا
ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ جیب میں پائی نہیں۔ از راہ کرم واپسی ڈاک خرچ بھیجئے تاکید مزید ہے‘
میں سخت تکلیف میں ہوں۔“

بواپسی ڈاک ان کا گرامی نامہ ایک کارڈ پر موصول ہوتا کیونکہ وہ لفافہ لکھنے کے قائل نہ تھے
”برخوردار الیاس تمہارا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم خیریت
سے ہو اور خوش و خرم ہو۔ یہاں سب خیریت سے ہیں اور ہم سب تمہاری خیریت کی خبر کے
طالب ہیں۔ علی احمد۔“

علی احمد کا خط پڑھ کر ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ غصے میں وہ پھر سے ایک لمبا
چوڑا خط لکھتا ”یہاں بالکل خیریت نہیں‘ حالات بالکل نامساعد ہیں۔ میں مرا جا رہا ہوں۔ میری خبر
لیجئے۔ اگر آپ نے خرچ نہ بھیجا تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ بواپسی ڈاک خرچ روانہ کیجئے۔“

بواپسی ڈاک علی احمد کی طرف سے کارڈ موصول ہوتا۔ برخوردار تمہارا خیریت نامہ ملا۔ اسی
طرح ہر دوسرے دن اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہا کرو تاکہ باعث فکر نہ ہو۔

اس زمانے میں ایلی کو علی احمد کی فنکاری کا احساس نہ تھا۔ ان خطوط سے محظوظ ہو
بجائے چڑ جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایلی کو مضحکہ خیز باتوں پر ہنسنا نہیں آتا تھا۔ وہ ایک
پر اپنا توازن کھو بیٹھتا تھا اس کی شخصیت میں توازن اور وضع داری سرے سے مفقود تھی۔
علی احمد ایلی کو خرچ ضرور بھیجا کرتے تھے اس کی ضروریات سے زیادہ بھیجتے مگر ا
پر انہیں تنگ بخشی کی عادت تھی وہ خرچ اقساط میں بھیجتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ پہلی
جیب میں اس امید پر اٹھائے پھرتا کہ دوسری قسط آنے پر فیس ادا کردے گا۔ لیکن جب
قسط موصول ہوتی تو پہلی خرچ ہو چکی ہوتی اور اسے تیسری قسط کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے
علی احمد کے خطوط سے جو دھندلکا پیدا ہو جاتا اسے صاف کرنے کے لئے بھی تو کافی خرچ ہو
تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے مالی حالات ہمیشہ بگڑے رہتے اور اس کا سینما
گنڈیریاں چوسنا مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانا اور بھی ضروری ہو جاتا۔
ان مسائل سے اکتا کر وہ انور کے پاس جا بیٹھتا۔ انور بال کھولے آنکھیں بنائے دیوار
طرف گھورتے ہوئے کہتی "ہائے ایلی کیا ہو گیا۔" ایلی کا دل چاہتا کہ وہ بھی کسی سے عشق کر
کر بیٹھ جائے اور علی احمد کے خطوط اور کالج کے دھندلکے سے نجات حاصل کرلے لیکن ا
سمجھ میں نہ آتا کہ عشق میں انور کی یہ کیفیت دیکھ کر کیسے عشق لگائے اتنی کوششوں کے با
کسی سے عشق نہ لگا سکا تھا۔ کسی کے سامنے جا کر تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ دل
دھک کرنے لگتا تھا اور زبان بند ہو جاتی تھی۔ پھر عشق کیسے لگتا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا
کرے۔

پھر اسے خیال آتا کیوں نہ نذیراں سے عشق لگا لوں۔ وہ نذیراں جو علی پور کی اس اند
ڈیوڑھی میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی اور جب وہ داخل ہوتا تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی "تو آ
میں ہوں۔ ایلی میں ہوں۔" اور پھر ایک خوشبودار جسم اس کی طرف بڑھتا دو سیاہ آنکھی
موٹے ہونٹ اور بھدا چہرہ اور وہ گھبرا کر بھاگتا۔
نہ جانے اسے نذیراں سے عشق کیوں نہ ہوتا تھا۔ نذیراں واحد لڑکی تھی جو اسے دیک
اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کرتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو اس کے وجود ہی سے منکر تھیں۔ ا
بھی کرتیں تو صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مصیبت یہ
کہ ایلی کو ان لڑکیوں سے ڈر لگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے بڑھتی تھیں اور وہ تمام لڑکیاں

پیاری لگتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں۔ عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلہ میں
اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ارجمند تھا۔ لیکن وہ تو اس معاملہ میں ایلی کی
بالکل مدد کر سکتا تھا۔ وہ تو انکرانیڈی ماباؤں کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور لڑکیوں سے یوں کھیلتا تھا۔
جیسے وہ کھلونے ہوں انہیں لبھاتا۔ چھیڑتا ان کا مذاق اڑاتا۔
اس کے برعکس ایلی ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں پاکیزہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے ان کی
پرستش کرنا چاہتا تھا۔ وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ
نہ ہو۔ لیکن وہ تعلق کیسے قائم کیا جائے اس کے بارے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔
دو سال کالج میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ حاضریوں کی کمی کی وجہ سے اسے
امتحان میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ یہ خبر سن کر گھبراہٹ تو ضرور ہوئی لیکن صرف اس خیال پر کہ علی
احمد کو کیا جواب دے گا' ویسے دل ہی دل میں اس نے خوشی محسوس کی کہ امتحان کی مصیبت سے
چھٹکارہ ہوا اور وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر علی پور روانہ ہو گیا۔ امتحان کے لئے نام نہیں جا سکتا
تو پھر لاہور میں رہنے کا فائدہ؟

واپسی

ایلی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی محلے والیوں نے شور مچا دیا ——— "کون آیا ہے؟"
"اے ہے ایلی ہے ماں جی اپنی ہاجرہ کا بیٹا۔"
"اچھا ہاجرہ کا بیٹا آیا ہے اللہ زندگی دراز کرے۔"
"اب تو بن بابو صاحب بن گیا ہے۔"
"بڑا لائق لڑکا ہے یہ ہاں میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اے ہے ادھر تو آ لڑکے شرماتا کس
سے ہے۔ تیری خالائیں اور پھوپھیاں بیٹھی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔"
"چاچی بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔ بڑا اچھا ہے اور یہ محلے کے چھوکرے۔ توبہ طوفان مچا رکھا ہے۔
انہوں نے۔"
"ابھی پیدا ہو ہی نہیں پاتے اور شرارتیں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔"
"لیکن ایلی ان لڑکوں سا نہیں۔" "اے ہے بہن" چاچی بولی۔ "ماں کے گھر کا چراغ اور وہ
علی احمد وہ تو بہن اپنی ہی دھن میں لگا ہے۔ بس ہر سال نئی نویلی ملے پرانی تو باسی ہو جاتی ہے
بلا"

نہ جانے محلے میں جب بھی ایلی کی بات شروع ہوتی تو جلد ہی علی احمد اور اس کے
تذکرہ کیوں چھڑ جاتا اور پھر لوگ مسلسل طور پر علی احمد کی باتیں کرتے رہتے جیسے ایلی کا
محض علی احمد کی بات چھیڑنے کیلئے ایک بہانہ ہو یا محض ایک تمہید۔ محلے کی عورتیں جب
احمد کی بات چھیڑتیں تو ایلی ان کی بات اور انداز میں عجیب تضاد محسوس کرتا۔ کہنے کو تو وہ
کے خلاف شکایات کرتیں اور ان کی بری عادت پر ہاتھ دھرتیں مگر ان کے انداز سے معلوم
جیسے وہ علی احمد کو سراہ رہی ہوں جیسے ان کی وہ خصوصیت بے حد پیاری ہو اور علی احمد کا
شروع کرنے کے بعد وہ اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ان کی آنکھ
میں چمک لہراتی ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کھل جاتے اور ہلکی سی سرخی نہ جانے کہاں سے
کر رخساروں پر جھلکتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی نکتہ چینی تھی۔ کہتی کچھ اور
کچھ اور سمجھاتی کچھ تھیں۔ اثر کچھ اور لیتی تھیں۔

ہاجرہ سے جب وہ ہمدردی جتاتیں تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ وہ ہمدردی کے پردے
درحقیقت اس پر ترس کھا رہی ہیں "ہائے بیچاری ہاجرہ۔" اماں کہتی "لیکن اس کو کیا پروا
احمد جو چاہے کرے۔ اس کی بلا سے لگاتا پھرے عشق جہاں اس کا جی چاہے۔"

"وہ تو رنگیلا راجہ ہے۔" دوسری مسکراتی۔

اس پر ایلی محسوس کرتا کہ جیسے وہ در پردہ ہاجرہ پر ہنس رہی ہوں اور علی احمد کی اس
خصوصیت پر پھولے نہ سماتی ہوں۔ اس مرتبہ ایلی نے پہلی دفعہ محلے والیوں کی اس دو رنگی
شدت سے محسوس کیا۔ ایلی کے احساسات میں عجیب قسم کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ روز بروز
زود حس ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے چبھنے لگی تھیں۔

پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ محلے والیوں نے ان کا مذاق بنا رکھا ہے۔ انکا ہاجرہ
سستی ہمدردی جتانا درحقیقت اپنی عظمت کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ تھا وہ ہاجرہ کے لئے کچھ
کر سکتی تھیں نہ ہی وہ علی احمد سے شکایت کر سکتیں۔ شکایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انہیں
الٹا ان کی یہ عادت پسند تھی۔ علی احمد کی شخصیت پسند تھی اور اخلاق کے متعلق تو وہ صرف
فرمانا جانتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے محلے والیوں کی باتوں سے اپنی توجہ ہٹالی۔

شریف کی وہ

اتفاق سے انہیں دنوں رخصت لے کر شریف علی پور آ گیا اور وہ پھر سے شریف مل

گیا۔ شریف نے ایلی کی طرف دیکھا اور اپنی نیم وا آنکھیں ایلی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ایلی نے
حیرانی سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ویسے ہی چپ چاپ
اس کے منہ کی طرف تکتا رہا۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں چیونٹیوں کی
طرح اس کے جسم میں دھنسی جا رہی ہیں۔ اس کی نس نس میں رینگ رہی ہیں۔

شریف کے ہونٹوں پر تبسم چھلکا "گھبرا گئے۔" وہ بولا "ابھی سے گھبرا گئے۔" اور وہ پھر اس
طرح ٹکٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھنے لگا اس کی نگاہوں میں عجیب سی مستی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

"تم نہیں جا سکتے ایلی۔" شریف مسکرایا "تم میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ یہیں
بیٹھے رہنا ہو گا۔ میرے روبرو میری نگاہوں کے سامنے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ
میری آنکھیں پانی ہو کر بہہ جائیں۔ تم نے اس کو دیکھا ہے؟ تم اس کے پاس رہے ہو۔ یوں ہی
تم اس کے روبرو بیٹھا کرتے ہو گے اور وہ تمہیں دیکھا کرتی ہو گی۔ تم نے اس مکان میں دو سال
بسر کئے جس میں وہ رہتی ہے۔ تم اس فضا میں سانس لیا کرتے تھے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں
جو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔" شریف کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح
ایلی کو گھورے جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے حسب معمول رال بہہ رہی تھی۔ چہرے پر
حسرت و یاس کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنی روئیداد کہے جا رہا تھا۔

"کیا وہ وہاں تن تنہا رہتی ہے۔ اتنی بھیڑ میں تن تنہا رہتی ہے ظالموں نے اسے وہاں قید کر
رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے بازو کاٹ دیئے اور وہ تڑپ تڑپ کر وقت گزار رہی ہے۔ اس
نے تم سے کچھ کہا تھا میرے بارے میں۔" یف رک گیا۔

ایلی کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر شریف نے لمبی آہ بھری "وہ کسی سے بات نہیں
کرے گی۔ انہوں نے اسے اس قدر ڈرا دیا ہے کہ وہ گھٹ کر مر جائے گی مگر کسی سے دل کی
بات نہ کہے گی اور ـــــ اور ـــــ" وہ جوش میں اٹھ بیٹھا "یہ سب اس ڈائن کی شرارت
ہے۔ جسے تم دادی اماں کہتے ہو۔ اس خبیث بڑھیا کی۔ وہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر
حائل ہو گئی۔ اس نے وہ کھڑکیاں کیلوں سے بند کروا دیں جو اس طرف کھلتی تھیں۔ وہ روزن
اینٹوں سے بھروا دیئے تھے۔ جن سے اس کی آواز مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔" شریف بولے جا رہا

تھا اور ایلی حیران اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے کس طرح اپنی ہمدردی کا اظہار کرے۔

دفعتاً سعیدہ داخل ہوئی۔ "شرم نہیں آتی تجھے۔" اس نے حنا مالیدہ ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "اس بچے کو سامنے بٹھا کر روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس بیچارے کو کیا سنا رہی ہے تو قصہ۔ اسے کیا معلوم کیا ہوتی ہیں یہ باتیں۔ خواہ مخواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے۔ تو تو عورتوں سے ہو گیا۔ اے ہے مرد ہزاروں جگہ آنکھیں لڑاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ میاں ہیں کہ مجنوں بنے ہوئے ہیں۔ چاہے دوسرے کو ذرا احساس نہ ہو۔ یہ اپنی جان ہلکان کئے جائے گا۔ جا ایلی تو اپنے گھر۔" اس نے حنا مالیدہ ہاتھ سے اس کا منہ سہلاتے ہوئے "یہ میاں تو مجنوں بننے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔"

اس وقت ایلی کو سعیدہ کے ہاتھ کا لمس ناگوار گزرا۔ اسے شریف کے پاس سے چلے آنے سے دکھ بھی ہوا۔ لیکن اس دکھ میں خوشی کا دبا دبا عنصر بھی تھا۔ کیونکہ شریف کی باتیں سن سن کر اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اکٹھا ہو چکا تھا۔ جو اسے مضطرب کئے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں اکیلے میں جا کر رو دے۔ شریف کے دکھ پر نہیں بلکہ اپنے دکھ پر اپنی بدقسمتی پر کہ وہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔

ماں کا آنسو

اگلے روز جب وہ شریف کی طرف جانے کو تیار ہوا تو اماں نے اس کا بازو تھام لیا "ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔" ایلی گھبرا گیا۔ کیا اماں بھی شریف کے خلاف ہیں۔ کیا وہ بھی نہیں چاہتیں۔ کہ میں اس سے ملوں۔

"ذرا ٹھہر جا۔" اماں بولی۔ "بیٹھ یہاں ابھی میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔" وہاں بیٹھا سوچتا رہا نہ جانے اماں نے اسے وہاں کیوں بٹھایا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ تو ہمیشہ بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی نہ کہا تھا۔ ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔

کچھ دیر کے بعد اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے نیچے لے گئی۔ نچلی منزل میں اس کے ایک کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگائی پھر وہ ایلی کی طرف بڑھی۔ ایلی کا دل دھک دھک کر

رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کہنے والی تھیں۔

"ایلی۔" وہ بولی۔ "میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو میری بات مان لے تو میں سرخرو ہو جاؤں گی اور اگر تو نے انکار کر دیا تو بس سمجھ لے کہ آئندہ سے تو ماں کا نہیں باپ کا بیٹا ہو گا۔"

ایلی حیران تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اماں کی عزت کیسے بچا سکتا تھا۔ آخر وہ کونسی بات تھی۔ جس پر اماں کی عزت کا دار و مدار تھا اور اس کی عزت ہی کیا تھی گھر میں۔ اس کی حیثیت تو نوکروں کی سی تھی۔ پھر عزت کی بات کرنا اور عزت بچانے کا سوال، ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "پھر تم جو چاہے کر لینا ایلی اپنی بات پر قائم رہنا یا بدل جانا لیکن اس وقت ہاں کر دو اگر تم نے ہاں نہ کی تو تمہارے ابا تمہیں اپنے رشتہ داروں کی جھولی میں ڈال دیں گے اور تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔"

"لیکن اماں یہ سب کیا ہے؟" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔ "کچھ بتاؤ تو مجھے پتہ چلے۔"

"تمہارے بھلے کی کہتی ہوں بیٹا۔" وہ بولی "اگر میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو وہ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ تو تو انہیں جانتا ہی ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں تو تو جانتا ہی ہے بیٹا۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

"لیکن بات کیا ہے اماں۔" وہ گھبرا گیا۔

"تو وعدہ کرے گا تو میں بتاؤں گی۔" اماں نے جواب دیا۔ "بس سمجھ لے کہ تیری بہتری ہی کی بات ہے۔

بھلا میں کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں جو تیرے لئے اچھی نہ ہو۔ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔"

"اچھا اماں جو آپ کی مرضی۔" اس نے بات سمجھے بغیر ہی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے کہہ دیا جو اس پر مسلط ہوئی جا رہی تھی۔

"اللہ عمر دراز کرے۔ خوشیاں نصیب کرے۔" ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ "میں جانتی تھی تو میری بات رد نہ کرے گا۔ میں جانتی تھی تو مجھے چھوڑ کر ابا کی طرف نہ جائے گا۔ تو دیکھ مجھے تیرے لئے ایسی اچھی دولہن چنی ہے میں نے جو لاکھوں میں ایک ہے۔ لاکھوں میں۔ محلے

میں اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔ کل تیری منگنی ہو جائے گی اور پھر تیرے ابا کے لئے نا
ہو جائے گا کہ وہ تجھے اپنے رشتہ داروں کے باندھ دیں۔"

ایلی حیرانی سے اماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ آخر اماں اس با
کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھیں۔ اتنی سی بات کو اس قدر اہم کیوں سمجھ رہی تھیں۔ اس
ذہن میں تو ان دنوں اس معاملے کی اہمیت نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق تھا جس پر
اور ازدواجی زندگی کا کوئی مبہم نقش بھی مرقوم نہ تھا۔

"لیکن اماں۔" اس نے بصد مشکل کہا "میں مہندی نہیں لگاؤں گا۔ میں انگوٹھی ن
پہنوں گا۔" اس کے ذہن میں منگنی اور شادی کے متعلق سب سے بڑی مشکل مہندی اور انگو
تھی۔

"تو کچھ بھی نہ کیجیو ۔ جیسے تیرا دل چاہے۔ میں کوئی رسم بھی نہ ہونے دوں گی۔
مجھے تو صرف تجھے نامزد کرنا ہے۔ تیرے ابا کے رشتہ داروں سے بچانا ہے اور میرا کوئی مق
نہیں۔"

چند دنوں کے بعد محلے کے چوگان میں علی پور کا بہترین بینڈ بج رہا تھا۔ ایلی اور کلثوم
گھروں کے درمیان آنے جانے والیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عورتیں مرصع اور ریشمیں کپڑ
پہنے ادھر سے ادھر مٹک رہی تھیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر "اوئی اللہ" کہہ کر گھونگھٹ
چھپ جاتیں۔ بوڑھیوں نے شاید تبسم کو چھپانے کے لئے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی تھ
محلے کی چودھرانیاں مٹھائی کے تھال اٹھائے گھر گھر لڈو بانٹ رہی تھیں۔ محلے میں منگنی پر
مرتبہ بتاشوں کی بجائے موتی چور کے لڈو بانٹے جا رہے تھے اور ایلی اس ہنگامے سے دور
دوکان کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لوگوں کے روبرو جاتے ہوئے شرم
تھی۔ اس کے باوجود آتے جاتے لوگ رضا کی دوکان پر رک جاتے اور ایلی کی منگنی کی با
دیتے۔

منگنی

"بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے کیوں نہ ہو بھئی اکلوتا بیٹا ہے ماں کی کوئی
خواہش آج تک پوری نہیں ہوئی تو اسی بہانے سہی۔ مطلب تو خوشی دیکھنا ہے نا بھئی۔"

اس پر رضا نے ہنستے ہوئے چھپے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا اور بظاہر بڑی سادگی سے باآواز بلند کہا "اور چچا جی لڑکا بھی تو گدڑی میں لعل ہے۔"

"لیکن وہ چھپا کہاں ہے آج دکھائی نہیں دیتا۔" چچا مسکرائے۔ "تمہاری دوکان کی گدڑی میں تو نہیں چھپا ہوا۔" چچا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پردہ اٹھا دیا اور ایلی کو چھپا دیکھ کر ہنسنے لگے۔ "بھئی واہ ایلی تم یہاں چھپے ہو اور محلے میں تمہاری منگنی کے چرچے ہیں۔ واہ بھئی واہ عجب معاملہ ہے باپ شادی کا شوقین ہے اور بیٹا منگنی پر شرم کے مارے چھپا ہوا ہے۔"

ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ سمٹ کر پرانے ڈبوں کے انبار کے پیچھے سرک گیا اور چچا ہنستے ہوئے چل پڑے۔

پھر رضا نے شور مچا دیا۔ "سن لیا گدڑی کے لعل اب چھپے ہی رہو گے کیا۔" ایلی کا جی چاہتا تھا کہ رضا کو گالیاں دے لیکن گالی دینا اس کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ گالی دینے کی جرات نہ رکھتا تھا "بہت برے ہو تم۔ بہت برے جو راز کھول دیتے ہو۔" وہ غصے میں چلایا۔

رضا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا "شرمیلو میاں راز تو ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں کھولا جائے اور لڑکیاں ہوتی ہیں اس لئے کہ انہیں پھانسا جائے آج تو تمہیں مونچھوں پر تاؤ دے کر چلنا چاہئے آج تم ——— لیکن تمہارے منہ پر مونچھ بھی ہو۔"

پھر کوئی محلے والی آنکلی ادھر "ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے۔" اس نے رضا سے کہا "یہاں بیٹھا ہے تو اور تیرے دوست کی منگنی ہو رہی ہے آج تو تیری پانچوں گھی میں ہونی چاہیں "فی الحال تو سر کڑھائی میں ہے۔ اماں۔" رضا نے سنجیدگی سے جواب دیا "اے ہے۔" ماں مسکراتے ہوئے بولی۔ "بات کرنے سے نہ چوکے گا تو۔ ایک رگ زیادہ ہے نا۔ سچ کہا ہے کسی نے لنگڑے کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔"

"ایک نہیں ماں یہاں تو کئی زیادہ ہیں۔" رضا نے جواب دیا اور بڑھیا ہاتھ چلاتی آنکھوں سے گھورتی اور ہونٹوں سے مسکراتی چلی گئی۔

پھر ارجمند آکر چلانے لگا "ارے لنگڑے کہاں چھپایا ہے اس گدڑی کے لعل کو۔ نہیں بتائے گا سالے تو دوسری بھی لنگڑی کر دوں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ لیٹنے کے لئے لنگڑی لاجواب ہے۔" رضا نے جواب دیا۔

"یہ لیٹن ویٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔"

"وہیں کہیں ہو گا شرم سے منہ چھپائے ہوئے۔" رضا نے اشارہ کیا۔

"یہ لپٹن وپٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔"

"ابے تو یہاں ہے۔" ارجمند اندر آکر بولا "بس ناس کر دیا تو نے یہ لیبل لگا کے ستیاناس ہو
گیا۔ اینٹ الجبر کی قسم تمہاری اس حرکت نے سارا انکرایندی ختم کر کے رکھ دیا۔ اب نہ پریم
کام آئے گا نہ پریم سندیس اور نہ پریم پتر سب بدک کر بھاگ جائیں گی تیرے اس لیبل کو د
کر۔ دوست تو ہمیں بھی لے ڈوبا آٹے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ چل میاں چھپ کے کیا
بیٹھا ہے۔ چل وہ کپ کیپ اور کوری ڈکوری جمع ہیں۔ بھئی واہ کیا پھبن ہے چل اب پھنس گ
تو پھڑکن کیسا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

عین اس وقت جمیل آگیا "چلو بھائی۔" وہ چلایا "کیا یاد کرو گے کہ دوست کی منگنی پر کچھ
کھلایا۔ آج جو جی چاہے کھاؤ۔ چلو تنگ گلی کے حلوائی نے تازہ پیڑے بنائے ہیں۔"

"ارجمند کو تو کیپ کپ کی لگی ہے۔ چلو ہم تینوں چلتے ہیں۔" رضا نے شرارت سے لنگ
ٹانگ کی ہاکی جھلا کر کہا۔

"اچھا بھئی اگر پنچوں کی یہی مرضی ہے تو آج کے دن ہم بھی پیڑے کھا کر گزارہ کر لی
گے کیا کیا جائے۔" ارجمند بولا۔

مجبوراً ایلی ان کے ساتھ چل پڑا مگر اسے رہ رہ کے خیال آتا کہ اگر کسی نے اسے مٹ
کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے لوگ کہ اپنی منگنی کی خوشی منا رہا ہے۔ بہانہ بنا کر اس
جست لگائی تاکہ رستے میں وہ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔

ارجمند ہنسا "بڑی بے صبری ہے بھئی آج ـــــ بیچارے کو کیا معلوم کہ ابھی تو م
سیٹ ریزرو ہوئی ہے۔ ریشمیں گٹھڑی تو نصیب سے ملے گی۔"

رضا ـــــ ارجمند اور جمیل سے کنی کاٹ کر وہ چھپتا چھپاتا سیدھا شریف کے پاس جا
تاکہ وہاں اطمینان سے بیٹھ سکے۔ شریف اسی طرح منہ میں حقے کی نے لئے چھت کی طرف
رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کلثوم کے یہاں تقریب منانے کے لئے جا چکے تھے۔ اس لئے
سنسان پڑا تھا۔

"آ گئے تم۔" شریف مسکرایا "مجھے معلوم تھا۔ تم آؤ گے۔ ان ظالموں نے تمہیں

دیا۔ تمہاری قسمت پر بھی مہر ثبت کر دی۔" اس نے لمبی آہ بھری "ان کی خوشی اسی میں ہے کہ
لوگوں کی تقدیروں سے کھیلیں۔" ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ منگنی کرنے میں
تقدیر سے کھیلنے کی کیا بات تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ دبی آواز سے بولا "اماں نے تو مجھے صرف نامزد کیا ہے تاکہ ابا اپنے
رشتہ داروں کی جھولی میں نہ ڈال دیں۔"

"وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ ایلی وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ وہ یونہی بھولے نوجوانوں کو دام میں
پھنسایا کرتے ہیں اور تم ان کے دام میں پھنس گئے ہو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" ایلی چلایا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ شریف اسے بچہ سمجھتا ہے۔ ایلی
کی خواہش تھی کہ شریف اسے دوست سمجھے اور کھل کر اس سے باتیں کرے۔ اپنی زندگی کے
راز بتائے۔ یوں مشورے دے جیسے کہ دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔

"نہیں۔ نہیں" وہ بولا "اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں
آنسو تھے۔"

شریف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حقے کی نے اس کے منہ سے نکل کر نیچے گر پڑی ـــــ
"ماں کے آنسو۔" وہ ہنسا قصائی کی چھری تو مفت میں بدنام ہے۔ وہ ذبح کرتی ہے ایلی مگر اس نے
کبھی روپ نہیں بدلا۔ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں پیش نہیں کیا۔ لیکن ماؤں کے آنسو۔"
اس نے دانت بھینچ کر کہا "وہ اسی طرح ہاتھ جوڑتی ہیں۔ آنسو بہاتی ہیں اور پھر جب شکار پھنس
جاتا ہے تو اس پر سواری کرتی ہیں۔ ماں کے آنسو۔" شریف نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت سعیدہ آگئی۔ "ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے ایلی۔" وہ چلائی۔ "خدا کے واسطے۔"
اس نے شریف کے آگے ہاتھ جوڑے۔ "خدا کے لئے اب ایلی کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ اپنی تو برباد
کر لی۔ اب اس پر رحم کر۔ تجھے نہیں معلوم خالہ کی تمام امیدیں اور امنگیں ایلی سے وابستہ
ہیں۔" سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میری طرف دیکھ۔" شریف نے ایک دیوانہ وار
قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا "ماں کی آرزوئیں پوری ہوں۔ بہنوں کی امنگیں پوری ہوں مگر۔" بات ختم
کئے بغیر وہ خاموش ہو گیا اور چھت کی طرف گھورنے لگا۔

"تم نے اس کی ماں کے آنسو نہیں دیکھے۔" سعیدہ غصے میں چلائی۔

"تمہارے بھی دیکھ رہا ہوں۔" شریف نے مسکرا کر کہا "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ادھر آ ایلی۔" سعیدہ نے ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا "جا گھر جا۔ ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر کیا حاصل ہو گا تجھے۔ جا گھر جا۔"

ایلی چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیری ڈیوڑھی میں وہ رکا باہر عورتیں باتیں کر رہی تھیں۔

"اچھا ہی کیا چاچی ہاجرہ نے جو بیٹے کو ابھی سے جکڑ لیا ورنہ بڑے ہو کر یہ قابو میں آتے ہیں کیا۔"

"توبہ کر لڑکی کوئی زمانہ آیا ہے۔"

"پر میں کہتی ہوں چچی بات بگڑتی ہو تو بگڑ کر ہی رہتی ہے۔ چاہے جو کر لو آخر اس کے ابا کا بیاہ بھی تو جھٹ پٹ میں ہی ہوا تھا۔ ہاجرہ سے۔ اب دیکھ لو اس نے کیا کر دکھایا۔"

"ٹھیک کہتی ہے تو غیب کی بات کون جانے پر میں کہتی ہوں آخر ہے اسی کا بیٹا۔ یہ کیا گل کھلائے گا۔"

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ اماں کے آنسو یا شریف کا قہقہہ۔

ڈیوڑھی سے نکل کر وہ چپکے سے دادی اماں کے پاس چلا گیا۔ دادی نے اسے دیکھ کر تیوری چڑھا لی۔

"اے ہے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے تو۔ ادھر تیری ماں اپنا چاؤ پورا کر رہی ہے۔ آخر وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کی رضا مندی تو لی ہوتی تیری ماں نے۔ رضا مندی نہ سہی اس سے بات تو کی ہوتی آخر گھر کے مرد سے بات کرنی ہی چاہیے تھی۔ ہاجرہ کی یہ سینہ زوری توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔ یہ دیکھ لو علی احمد کی چٹھی۔ میرے خط کے جواب میں کیا لکھا ہے۔ اس نے۔" دادی اماں نے تخت سے چٹھی اٹھا کر اسے دی۔ بولی "وہ تو لکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ ایلی کی منگنی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو رہی ہے۔ ایلی کی ماں ہی جانتی ہو گی۔" وہ اپنی مرضی کر رہا ہے یہ اپنی مرضی کر رہی ہے اور تو میرے لال تو خواہ مخواہ ان چکی کے پاٹوں میں پسا جا رہا ہے۔ آ بیٹھ یہاں میرے پاس۔ دیکھ تو میں نے تیرے لئے کیا منگوایا ہے۔ غضب خدا کا ادھر علی احمد آنکھیں دکھا رہا ہے ادھر یہ بی بی آنسو چھلکا رہی ہے۔ آ بھی جا اب۔"

یہ پہلا دن تھا جب اس نے محسوس کیا کہ دادی اماں پریشان ہے۔ اس کے ماتھے پر تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ ویسے وہ گھورتی تو وہ روز ہی تھی۔ جب محلے کے لڑکوں پر گرجتی تھی تو وہ

بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ مگر ایلی کے لئے گویا وہ تیوری محض دکھاوے کی ہوتی تھی۔ تیوری ہونے کے باوجود وہ تیوری تلخی کی حامل نہ ہوتی تھی اور ایلی اسے دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا لیکن اس روز دادی اماں تیوری چڑھانے کے بغیر ہی گھور رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو گھور رہی ہو۔ اپنی بے بسی پر تلملا رہی ہو ——

باہر بینڈ بج رہا تھا۔ دور کلثوم کے گھر میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔

"نی متھا تراچند ورگا بودی کنڈلاں والی او۔"

ایلی کی منسوبہ ثمرہ اس کی خالہ زاد بہن کلثوم کی لڑکی تھی۔ کلثوم کے گھر وہ اکثر جایا کرتا تھا اور دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اس دوران کئی بار ثمرہ بھی وہاں آتی یا ادھر ادھر کام میں مصروف رہتی۔ اس کے باوجود اسے ثمرہ کی شکل و صورت کے متعلق کچھ اندازہ نہ تھا۔ منگنی کے روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے ثمرہ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ثمرہ کو غور سے دیکھے۔ کیسی ہے۔ لیکن کسی کے گھر جا کر لڑکی کو غور سے دیکھنا ایلی کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی اور لڑکیاں بھی تو عجیب ہوتی ہیں پاس جا کر دیکھو تو یوں چزی سنبھال کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے بے جان گڑیاں ہوں۔ دور سے کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھو تو مورنیوں کی طرح دم پھیلا پھیلا کر ناچتی ہیں۔ چڑیوں کی طرح پھدکتی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں کس قدر لطف آتا تھا۔ لیکن قریب سے اب تو ثمرہ کو قریب سے دیکھنا بالکل ہی ممکن نہ رہا تھا۔ اب تو اس گھر میں پاؤں دھرنا بھی مشکل تھا۔

ایلی کی نظر میں کلثوم کے گھر کے مناظر یوں چلنے لگے جیسے فلم چلتی ہے۔ دم پھیلا کر ناچتی ہوئی ثمرہ سرخی اور پاؤڈر سے تھپے ہوئے چہرے والی کلثوم جس کے گلے میں پھولوں کے ہار لٹکا کرتے تھے اور مرجھائے ہوئے چہرے والا رحم علی جو کلثوم کا خاوند تھا —— جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ مظلوم ہو۔ جیسے وہ کلثوم کا میاں نہیں بلکہ نوکر ہو۔ دفعتاً ایلی کی نگاہوں تلے روغنی چہرے والی ثمرہ گلے میں ہار ڈالے آکر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ گال پچک گئے منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور صورت رحم علی کی سی ہو گئی اور وہ ثمرہ کی چوکی کے قریب یوں جا کھڑا ہوا جیسے رحم علی ہو۔ ایک مظلوم فرد' نوکر' ایلی چونکا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہے تجھے۔" دادی اماں چلائی "اتنا بے قرار کیوں ہے تو۔ لیٹ جا آرام سے۔ لیٹ جا۔"

پھر ایلی کی نگاہوں تلے چچا ہنسنے لگے "بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے۔"

"ستیا ناس کر دیا۔ سوا ستیاناس۔" ارجمند چلایا۔ "لیبل لگا کے کیوں مری مٹی خراب
ساری انکرایئنڈی ملیامیٹ ہو گئی۔"

پھر ہاجرہ اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میری عزت
ہاتھ ہے۔"

اچھا کیا چھٹپٹن میں ہی جکڑ لیا۔" ایک عورت بولی۔

ماں کے آنسو۔ ہاہاہا۔ شریف کا قہقہہ سنائی دیا۔ ماں کے آنسو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" دادی اماں نے گویا شریف کی ہاں میں ہاں ملائی
ہے تجھے۔" وہ بولی۔

دور لڑکیاں گا رہی تھیں۔ "بیٹھی ہنجواں دے ہار پرو داں۔"

تھیلی میں مینڈک

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو اکیلے میں لے گئی۔ کہنے لگی "شریف کی باتوں میں نہ
وہ تو خواہ مخواہ تجھے گمراہ کر رہا ہے۔ لو کوئی بات ہے بڑا ایدیشک دیکھ لو۔ شادی کے خلاف
کرتا ہے۔ بھلا خود کیوں اپنی شادی کروا رہا ہے۔ سعیدہ سے منتیں کیوں کرتا ہے۔ کیوں
سامنے ہاتھ جوڑتا ہے۔"

"ہاتھ جوڑتا ہے؟" ایلی نے حیرانی سے پوچھا "وہ کس لئے؟"

"کہتا ہے میرا بیاہ کرا دو۔ میں اپنا گھر بساؤں گا۔ دیکھ لو۔ خود تو اتنا چاؤ ہے دوسرا بیاہ
اور تمہیں منگنی کے خلاف اکسا رہا ہے۔ توبہ کوئی حد ہوتی ہے زمانہ سازی کی۔"

زمانہ سازی اور شریف۔ ایلی کو یقین نہیں آرہا تھا "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا
سکتا۔" وہ اٹھ بیٹھا "نہیں اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ چلایا "پوچھ دیکھ تو اس سے
چمک کر بولی۔ "میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔"

ہاجرہ کے جانے کے بعد وہ سیدھا شریف کے گھر پہنچا اور جاتے ہی بات چھیڑ دی
شادی ہو رہی ہے کیا" اس نے شریف سے پوچھا۔

شریف کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا چھت کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے

"شادی"۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی وہ اس میں مسرت کی بجائے دھمکی تھی خوفناک دھمکی
جیسے وہ شادی کی بجائے انتقام لے رہا ہو۔ اس کے قہقہے میں ایک تسلسل پیدا ہو گیا خوفناک
تسلسل اور آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ اس قدر بلند ہو گئی کہ گھر کے سب لوگ بھاگ کر اس
کے گرد جمع ہو گئے۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے۔" مگر شریف کسی کو جواب دیئے بغیر اسی
طرح قہقہہ مار کر ہنسے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ منہ سے رال کے تار نکل
رہے تھے۔ چہرا سرخ ہو رہا تھا۔

"اب کیا محلے والوں کو تماشا دکھانا ہے۔" سعیدہ چلائی۔ "یا کوئی نیا کھیل ہے۔"

"اللہ رکھے اگلے ہفتہ برات لے کے جانا ہے۔ بہن شادی کی خوشی ہے ہنس لینے دو۔"
رابعہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا اور پھر ایلی کا ہاتھ پکڑ کر بولی "آ تجھے دکھاؤں کیسے اچھے کپڑے
بنوائے ہیں اس کی دولہن کے لئے۔" وہ گھسیٹ کر ایلی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔

"لیکن خالہ۔" اس نے رابعہ اور سعیدہ سے پوچھا "کہاں ہو رہی ہے شریف کی شادی؟"

"بہت دور" رابعہ نے کہا "بہت دور جہاں وہ نوکر ہے وہاں نہ جانے کیا نام ہے اس جگہ
کا۔"

"مگر بہن۔" سعیدہ نے کہا "ہیں تو وہ خرم آباد کے رہنے والے نوکری نور پور میں کرتے
ہیں نا لڑکی کے ابا بہت بڑے افسر ہیں۔ غلام علی نام ہے۔" دوسرے کمرے میں شریف کا قہقہہ
ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کھانس رہا تھا جیسے تھک کر ہار گیا ہو۔

"دیکھا۔" رابعہ نے زیر لب مسکرا کر کہا "اکیلے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ کھانس رہا
ہے تم تو بہن اس کی دیوانگی کو اور بھی ہوا دیتی ہو۔"

"لو مجھے کیا معلوم کہ ایسی ہوتی ہیں یہ باتیں۔" سعیدہ بولی "میں ذرا جا کر دیکھوں۔" ایلی
نے دبی زبان سے کہا اور پھر چپکے سے شریف کے پاس جا بیٹھا۔ شریف آنکھیں مونڈے ٹیک
لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

پھر دفعتاً اس کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ ہونٹوں پر تبسم لہرایا "شادی" وہ مدھم آواز میں بولا
"اب شادی کیا ہو گی۔ جب شادی کی آرزو تھی۔ تب تو یہ سب میرے راستے میں دیوار بن کر
کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ انور اور شریف کی شادی ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ ظالموں
نے مجھے قید کر لیا اور اسے شہر سے دور نہ جانے کہاں لے گئے۔ اب کیا ہے"۔ اس نے لمبی آہ

بھری۔ "یہ سمجھتے ہیں میں شادی کر رہا ہوں۔ ان کو کیا معلوم ایلی۔ ان میں احساس نہیں
سمجھیں گے۔" پھر وہ ایلی کے قریب تر ہو گیا اور راز دارانہ انداز میں بولا "انہیں نہیں
ایلی کہ میں صرف اس لئے شادی کر رہا ہوں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ
جیسے میری زندگی تباہ ہوئی تھی اور وہ کتنی معصوم ہے تم دیکھو گے تو اندازہ ہو گا تمہیں اس
کو کیا معلوم کہ محبت کسے کہتے ہیں۔" شریف نے جھرجھری لی۔ "نہ جانے اسے کیا نظر آیا
مجھ میں۔ نہ جانے اسے کیا خوش فہمی ہے۔ کاش وہ کسی جیتے جاگتے نوجوان کو چنتی۔ مجھ ایسے
شخص میں اب کیا رہ گیا ہے۔ جو تھا وہ لوگوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب کیا دھرا ہے۔
اسے کون سمجھائے۔ جو ابھی دہلیز پر کھڑی مسکرا رہی ہو اسے کیا معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے۔
جانے محبت نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے۔ واقعی ہی وہ شہزادی ہے۔ اسم بامسمیٰ ہے۔
چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دہلیز سے باہر آ گئی۔ میرے روبرو اور اس
ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔"

"مینڈک کے ذریعے محبت۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت۔" شریف ہنسنے لگا۔ "اس نے مینڈک کو ایک تھیلی
ہی رکھا تھا جب میں سو رہا تھا تو اس نے وہ تھیلی مجھ پر پھینک دی۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا وہ
لگی۔" شریف نے ہنستے ہوئے کہا "محبت بھی اظہار کے انوکھے طریقے پیدا کرتی ہے۔ انوکھے
وہ رک گیا اور طویل خاموشی کے بعد بولا "مجھے اس کی محبت کا احترام ہے اسے تو شاید میں
دیتا۔ مگر محبت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ میں نے خود محبت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبت کیا
ہے۔ عجیب چیز ہے محبت۔ عجیب' تم محبت کرو ایلی۔ کسی سے کرو مگر محبت کرو۔" اس نے
طویل آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

آٹھ روز کے بعد وہ سب برات لے کر نور پور جا رہے تھے۔ اس انوکھی لڑکی کو دولہن
کے لانے کیلئے جس میں اتنی جرأت تھی کہ گھر کی دہلیز سے باہر نکل کر شریف پر مینڈک پھینک
سکتی تھی۔ وہ لڑکی جسے ایسا انوکھا اظہار محبت سوجھ سکتا تھا۔

محلے میں تو ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جس میں مذاق کرنے کی صلاحیت ہو یا جس میں
جرأت ہو۔ انہیں تو دبے پاؤں چلنے۔ چھپ چھپ کر جھانکنے اور منہ پر پلو لے کر مسکرانے
سوا کچھ نہ آتا تھا۔

لڑکے چوگان میں کھڑے ہو کر ریشمیں رومال ہلاتے ہلاتے اور بال ٹھیک کرنے کے بہانے
سلام کرتے کرتے تھک جاتے مگر وہ یوں بے حس و حرکت کھڑی رہتیں۔ جیسے پتھر کی بنی ہوئی
ہوں چند ایک جن پر محلے کا اثر زیادہ نہ تھا لڑکوں کو دیکھ کر دوڑتیں بھاگتیں۔ ایک دوسری کو
پکڑتیں۔ پلو جھٹکتیں۔ اسے سنبھالتیں سبھی کچھ کرتیں مگر اظہار محبت کرنا تو کیا انہیں پیغامات
محبت کو مناسب طور پر وصول کرنے تک کا شعور نہ تھا۔

جس دن سے شریف نے ایلی کو اپنا راز بتایا تھا اسی دن سے بیٹھے بٹھائے ایلی کی نگاہوں تلے
ایک شوخ متبسم حسینہ آ کھڑی ہوتی۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ
دہلیز سے باہر نکل آئے اور پھر تھیلی میں سلا ہوا مینڈک دھپ سے اس کے سینے پر آ گرے اور وہ
گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور فضا میں ایک مدھم مگر رنگین قہقہہ یوں گونجے جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

اس روز برات کے ساتھ نور پور جاتے ہوئے وہ غیر معمول طور پر خاموش تھا۔ کھڑکی سے
باہر ٹیالے ٹیلے دوڑ رہے تھے۔ کبھی کوئی گہرا کھڈ منہ پھاڑے آ نکلتا جس کے تلے دور پانی کی ندی
ناچتی۔ پھر وہی ٹیلے اور ان پر یہاں وہاں خشک ٹنڈ منڈ درخت۔ ایلی کی نگاہیں اس گلابی افق میں
کھوئی ہوئی تھیں جو اس کے اندازے کے مطابق ان کی منزل تھا اور وہاں گلابی متبسم چہرہ اسے
دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے براتی اپنی باتوں میں مگن تھے۔ ہر چند منٹ کے بعد ایک قہقہہ
گونجتا۔ کسی پر آوازہ کسا جاتا اور ایلی چونک کر ادھر دیکھتا۔

ایک طرف محلے کے بزرگ تھے دوسری طرف جوان اور تیسری طرف اس کے اپنے
ساتھی۔ ارجمند' رضا اور رفیق۔ ہر گروہ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک تھا۔ صرف دو فرد اکیلے
چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شریف تھا جو مسلسل گاڑی کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔
دوسری طرف ایلی تھا۔ جو کھڑکی سے باہر کسی رنگین افق کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ ممکن ہے۔
ریل کی چھت میں شریف بھی وہی رنگین افق دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کو منزل کا خیال لگا ہوا تھا۔
دونوں کے سینوں میں مینڈک کود رہے تھے دونوں کی نگاہوں میں رنگین تبسم جھلملا رہے تھے۔

ہر چند منٹ کے بعد غالباً اپنے تخیل اور محسوسات کی نوعیت سمجھ کر ایلی احساس ندامت
سے گھبرا جاتا۔ اس خیال پر ندامت محسوس کرتا کہ اپنے دوست کی بیوی کو تاک رہا ہے۔ محسوس
کرتا کہ وہ مجرم ہے پھر گھبرا کر لاحول پڑھتا اور کسی اور بات کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش

کرتا۔ پھر دفعتاً" اس کے تخیل میں شہزادی پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی چھوٹی بہن آگے بڑھ
شاید اس میں بھی دہلیز پار کرنے کی جرأت ہو۔ شاید اسے بھی مینڈک پھینکنے سے دلچسپی ہو۔
خیال پر وہ اطمینان کا سانس لیتا اور پھر سے اپنے رنگین خواب میں کھو جاتا۔

ایلی کے ذہن میں ایک نئی امید کروٹ لے رہی تھی۔ ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔
سامنے ٹیلے کی اوٹ میں مینڈکوں کی جھیل کے کنارے ایک دوشیزہ اسے دیکھ کر مسکراتی۔ ا
اشارے کرتی ایلی کے جسم پر چیونٹیاں رینگتیں سینے میں مینڈک پھدکتے اور دل میں نہ جانے
کیا ہوتا۔

شریف بھی بار بار چونکتا جیسے وہ بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔ جب وہ اس رنگین منزل
خیال میں کھویا ہوا ہوتا تو ایک سوگوار چہرہ اس کے روبرو آکھڑا ہوتا۔ ستا ہوا منہ کھلے پریشان
ہونٹوں پر زہرخند۔ اسے دیکھ کر شریف کو احساس ہوتا کہ وہ انور سے بے وفائی کر رہا ہے۔ ا
کی زندگی تباہ کر کے خود رنگین افق آباد کر رہا ہے۔ اس خیال پر وہ گھبرا جاتا۔ پھر اس کی آنکھ
میں حزن و ملال کی گھٹائیں ابھرنے لگتیں دل سے آواز بلند ہوتی۔ نہیں نہیں میرا کیا ہے
سب تو اس لئے ہے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔

براتی دولہا میاں کی حالت کو دیکھ کر مسکراتے۔

"دیکھ لو بھئی یہ دولہا میاں ہیں یوں اپنی برات لئے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی دار پر چڑ
ہو۔"

علی احمد قہقہہ لگاتے "میاں دار ہی تو ہے۔ اس حقیقت کو کوئی کوئی سمجھتا ہے۔"

جوان قہقہہ لگاتے "جبھی تو علی احمد دار پر چڑھتے چڑھتے نہیں تھکتے۔"

نوجوان چھپ چھپ کر مسکراتے سرگوشیاں کرتے اور پھر ارجمند با آواز بلند کہتا "مبار
تم تو یوں بیٹھے ہو جیسے کوئی دار پر چڑھنے والا ہو۔"

"کیوں میاں اسے شوق نہیں کیا۔ بیٹا کس کا ہے۔"

اور سب علی احمد کی طرف دیکھ کر ہنستے اور گاڑی چیختی چلاتی ہوئی دوڑے جاتی۔

بالآخر ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم پر گاڑی رک گئی۔ "لو بھئی نور پور آگیا۔" کیا

ایلی کا دل اچھل کر حلق میں آپھنسا۔

وہ ایک عجیب سا سٹیشن تھا۔ جیسے ایک وسیع و عریض ریس کورس ہو۔ پلیٹ فار

چوڑائی اور لمبائی عام پلیٹ فارموں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سٹیشن کے احاطے کے چاروں طرف
قد آدم فصیل تھی۔ جس میں ایک پھاٹک لگا تھا۔ جس سے ریل اندر داخل ہوتی ایک طرف
سرخ رنگ کا ایک اونچا قلعہ بنا ہوا تھا جس کی دیواروں میں بندوق کی نالیوں کے لئے سوراخ
چھوڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سٹیشن کے سٹاف کے رہائشی کوارٹر تھے۔ بیٹھے بیٹھے سے
معمولی کوارٹر اور قلعہ کے پیچھے اونچے سیاہ پہاڑ ایستادہ تھے۔

ایلی نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں ان کوارٹروں کی طرف مرکوز ہو
گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے مینڈکوں سے بھری ہوئی
تھیلیاں رکھی ہوں۔

باہر سٹیشن کے احاطے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مینڈک دستیاب ہو سکتے ہوں۔
مینڈک کیا وہاں تو تالاب یا چھپڑ کا نام و نشان تک نہ تھا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ بھنے اور تلے ہوئے مرغ مسلم
رکابیوں میں پڑے تھے۔ قسم قسم کے چاول اور گوشت۔ وہ حیرانی سے ان بھرے قابوں کی طرف
دیکھ رہا تھا جو گوشت سے لدے ہوئے تھے۔ علی احمد قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے۔ محلے والوں کی
باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور شہزاد کے والد کی آنکھوں میں گویا پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔

"کیا جوڑی ہے۔" چچا چلانے لگے۔ "بھائی غلام علی اور علی احمد کی واہ وا۔"

"وہ کہتے ہیں نا" کسی نے آوازہ کسا "ساجن سے ساجن ملے کر کر لمبے ہاتھ۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بھائی غلام علی۔" علی احمد ہنسے اور پھر مسلم مرغ پر پل
پڑے۔

پھر ایک نوکرانی آکر چلانے لگی "ایلی کو اندر بلایا ہے۔" اندر بلا رہے ہیں ایلی کو۔ ایلی کو
اندر بلایا ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک بھیانک دف بجنے لگی۔ ایلی کی
رگوں میں کوئی دھمکی بجانے لگا نگاہوں میں ارد گرد کی چیزیں دھندلا گئیں۔

اندر جاتے ہی نہ جانے اسے کیا ہوا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ حلق آواز سے خالی ہو گیا۔
بازو لٹکنے لگے۔ چاروں طرف سے بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی مگر وہ گردن نہ اٹھا سکتا تھا۔

"اپنے علی احمد کا ایلی ہے" محلے والی کی مکروہ آواز سنائی دی۔

"اچھا بھن جیتا رہے"۔ دو بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کے سر کو گرفت میں لے لیا اور پھر

وہ بھاگا۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا تھا۔ کیوں جب وہ منزل پر پہنچتا تو اس کے پاؤں میں چلنے کی سکت
رہتی۔ اس کے بازو شل ہو جاتے۔ نگاہیں احساس ندامت سے دھندلا جاتیں۔ ایسا کیوں ہوتا
جب وہ تخیلے میں اپنے تخیل کی دنیا میں واپس پہنچتا تو اندھے کی طرح منزل سے چمٹ جا
اس کی گرفت میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہو جاتا تھا۔

مونگیا گٹھڑی

——پھر وہ نور پور سے واپس آ رہے تھے اور ایلی احساس ناکامی کی وجہ سے خاموش
اس کے تخیل کے پر گویا کٹ چکے تھے۔ بازوؤں میں طاقت پرواز نہ رہی تھی۔ اس کے سا
کوئی افق نہ تھا۔ مٹیالے ٹیلے۔ ٹنڈ منڈ درخت اور پھیلی ہوئی ویرانی۔

پھر ارجمند اسے جھنجھوڑ رہا۔ "ابے او مردے۔" وہ چلّایا۔ "تو پہلے ہی فوت ہو گیا بڑا ہا
ہوا۔ ورنہ آج ہماری طرح حرام موت مرتا بچ گیا یار۔ تو ہمیشہ ہی بچ جاتا ہے۔"

ارجمند کی بات سن کر ایلی حیران ہوا۔ ارجمند نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے اند
میں کبھی مایوسی نہ دیکھی تھی۔ پھر اسے کیا ہوا۔ وہ یوں سر کو ہاتھ سے تھامے بیٹھا تھا۔ جیسے قطع
طور پر تباہ ہو چکا ہو——

"بیٹا ہمارا تو کلیان ہو گیا۔" وہ دبی آواز میں بولا۔

"آخر بات کیا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"بات۔" ارجمند ہنسا۔ "دیکھ لو رفیق کی آنکھوں میں۔ دیکھ لو وہ بات۔ دیکھ لو کیا بیتی ہم
یار ہم اس لائق تو نہ تھے۔" ایلی نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا بیر بہو
رینگ رہی تھیں۔

"ہے ہے۔" ارجمند بولا "بس سمجھ لو وہ منظر جو کپ نے چھ سال کے بعد چھلک کر دکھا
آج دیکھ لیا ہے میں کیا کروں۔" اس نے لمبی آہ بھری۔ "اب تو یہی ہے کہ چوہے کی طرح
ٹکڑے کو کترتے رہیں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے سوکھے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا نکالا
اسے کترنے لگا۔ پھر ایلی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "ہے ہے دے تو دوں تجھے بیٹا مگر جو ڈال
توڑ کر کھانے میں بات ہے وہ کہاں اور پھر اپن کے یہ ہاتھ بھی دیکھ لے جیسے کوہڑی کے ہوں

وہ ہاتھ جن سے اس بھکاری کو یہ ٹکڑا ملا ہے۔ ہے ہے۔ اچھا چل تو بھی کرے دیوی کے درشن۔
کیا چیز ہے خدا کی قسم۔ آتو بھی کیا یاد کرے گا۔" وہ اسے گھسیٹ کر ڈبے سے باہر لے گیا اور پھر
ملحقہ زنانہ ڈبے میں اسے زبردستی ٹھونس کر چلانے لگا "یہ آیا ہے ایلی خالہ سعیدہ کہتا ہے میں
خالہ سے ملوں گا۔"

"آ ایلی" خالہ بڑے تپاک سے بولی "میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایلی ہے۔
میری خالہ ہاجرہ کا بیٹا۔" اس نے مونگیا گٹھڑی سے کہا جو پاس ہی سیٹ پر دھری تھی۔

مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیگے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے۔ تازہ
خون کی بو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے۔ دو گلابی جھیلیں
چھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ سارے منہ پر مخملی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ پھر
ایک چھلکا ہوا تبسم۔ ایلی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گرد و پیش جھلملا کر معدوم ہو گیا۔

سعیدہ نہ جانے ہاتھ ہلا ہلا کر کیا کہہ رہی تھی۔ باہر پلیٹ فارم پر ارجمند آنکھ بچا کر چھاتی
پیٹ رہا تھا۔ رفیق ریشمیں رومال ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پرے
علی احمد حسب دستور کولہوں پر ہاتھ رکھے ڈبے پر نگاہیں گاڑے کھڑے تھے جیسے کوئی چیل پر تول
رہی ہو۔ ان کے قریب ہی صفدر انگلیوں میں سگریٹ تھامے چٹکی بجا بجا کر گنگنا رہا تھا۔ "اے
دلربا میں ہوں فدا۔" ایلی خاموش کھڑا تھا۔ نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہ
تھا کہ کب مونگیا گٹھڑی کے پٹ بند ہوئے۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کھڑکی کے باہر ٹیلے بھاگ رہے تھے۔ یا سر سبز میدان پھیلے ہوئے
تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ دل میں ایک شور برپا تھا۔
رگوں میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سینے میں دھلکی بج رہی تھی۔ سامنے ایک لق ودق ویرانہ پھیلا
ہوا تھا اور اس ویرانے میں ایک مونگیا گٹھڑی پڑی تھی۔ اور دو خون آلود ہاتھ ——اور گاڑی
ہونکتی ہوئی جا رہی تھی۔

شہزاد

محلے میں شہزاد کی آمد یوں اثر انداز ہوئی جیسے جوہڑ میں پتھر گرتا ہے۔ محلے کے بند پانی میں
چاروں طرف چھینٹے اڑے جیسے سوڈے میں کسی نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔ پھر لہریں جوہڑ کے

طول و عرض تک دوڑ گئیں۔

عورتوں نے اسے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ بوڑھوں
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مردوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ بوڑھے اسے دیکھ کر چپ چاپ
مسجد کی طرف چل پڑے اور وہاں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔

محلے کے بڑوں میں صرف دو رنگیلے آدمی تھے جو عمر میں بڑے ہونے کے باوجود خوش
مزاج تھے اور زندگی میں لہریں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ علی احمد اور محمد اعظم' انہیں لاحول
پڑھنے۔ گردن جھکانے کھانسنے یا مسجد میں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے سے قطعاً' دلچسپی نہ تھی
منہ سے گنگنانے کی بجائے سبحان اللہ' ان کی آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ جھجک کر پیچھے ہٹ
جانے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر کوئی بات چھیڑ دیتے۔

"لڑکی تو اداس تو نہیں ہو گئی یہاں آکر۔" محمد اعظم مسکراتے۔ "گھبرا نہیں دل لگ جا
گا۔" اور پھر ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوتا کہ دل لگ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

صبح سویرے ہی محمد اعظم آ پہنچتے۔ "کیوں شہزاد کچھ پکانے کھانے کا بھی فکر ہے یا نہیں۔
خولی شہزادگی نہیں چلے گی یہاں' بول کیا منگوانا ہے بازار سے۔ ہائیں بینگن کھائے گی۔ آج
بینگن اونہوں بینگن نہیں کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھلائے گی بینگن۔ لیکن
اس طرح کب تک گزارہ ہو گا۔" اور وہ قہقہہ مار کر ہنستے۔ "اچھا چائے کا پیالہ تو پلا ایک
کمیشن ادا کرنے کے بغیر نہیں لایا جاتا سمجھی' ہائیں تو بروک بانڈ پیتی ہے۔ اونہوں لڑکی جا
لپٹن کی۔" اور ان کی متبسم نگاہیں کسی رنگین پیالی سے لپٹ جاتیں اور انداز سے معلوم ہو
جیسے بینگن کھا کے آئے ہوں۔

محمد اعظم کا طریق کار گھریلو انداز کا حامل تھا۔ ان کی باتوں میں اپنا لینے کا پہلو واضح ہوتا۔
کر کے پہلو بدلتے۔ پہلو بدل کر پھر بات کرتے اور اس دوران میں نگاہوں سے جانچتے۔ اس کے
علی احمد چل کر جانے کے قائل نہ تھے نہ انہیں سودا لا کر دینے کی بات پسند تھی اور نہ
چائے کا پیالہ مانگنے کے قائل تھے۔ ان کی باتوں میں اشاریت کا پہلو ہوتا تھا۔ وہ دور کھڑے
چیل کی طرح منڈلاتے پھر آواز دیتے۔ باتوں سے رجھاتے اور تمام تر بات زبان کی مدد کے
نگاہوں ہی میں طے کر لیتے اور بالآخر بر سبیل تذکرہ آواز دیتے۔ "میں نے کہا چاچی۔
آ جائیں گے چچا۔ مسجد ہی میں گئے ہیں تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔" اور جب چاچی ہنس کر

جھپٹ کرتی تو کہتے میں نے کہا۔ یہ شریف کے گھر کی کھڑکی میں کون کھڑی ہے۔ کوئی اندھی بہری
معلوم ہوتی ہے نہ سلام نہ دعا نہ بات نہ چیت ——— اچھا تو تو ہے شہزاد میں سمجھا شاید اندر
گیس جلا رکھا ہے۔ تو آئی نہیں کبھی۔ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ نہ جانے کن مشاغل میں کھوئی رہتی
ہے۔"

علی احمد شہزاد کی آواز سنتے تو شمیم کے چوبارے سے ملحقہ جنگلے میں نکل آتے اور شمیم کو
یوں آواز دیتے جیسے شمیم سے بے حد ضروری کام پڑ گیا ہو۔ جب سے شہزاد نے محلے میں قدم
رکھا تھا علی احمد کو بار بار شمیم سے کام پڑ رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ان کے اس ضروری کام کی
نوعیت سے واقف تھے۔ ایسے وقت سیدہ گھٹنوں میں منہ دے کر ہنستی۔ دادی اماں مسکرا کر
کہتی۔ "توبہ اس لڑکے کو تو اپنی سُدھ بُدھ نہیں رہتی۔" شمیم چوبارے میں ان کی آوازیں سنتی
اور تیوری چڑھا کر اپنے آپ سے کہتی۔ "میں جانتی ہوں ان کے ضروری کام کو اچھی طرح
معلوم ہے مجھے۔ کون نہیں جانتا۔" شہزاد جنگلے کے سامنے کھڑی ہوتی تو فوراً اسے آواز دیتے۔
"شہزاد ہے۔" وہ جنگلے سے چلاتے۔ "سنا کیا حال ہے۔ نور پور تو نہیں یاد آتا۔ کھلے میدانوں میں
کلیلیں کرنے والیاں جب گھر میں قید ہو جاتی ہیں تو جی گھبراتا ہے نا۔ ہی ہی ہی۔" اور وہ اپنی
بات پر ہنسنے لگتے اور دیر تک ہنسے جاتے۔

شہزاد کو دیکھ کر صفدر اپنے گُدے ہوئے بازو کو بھول جاتا۔ اسے بال جھٹک کر سہلانا بھی
یاد نہ رہتا اور اپنا محبوب گیت حافظ خدا تمہارا' جو وہ پارسی لڑکی کے ساتھ سٹیج پر گایا کرتا تھا قطعی
طور پر بھول جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں کھو جاتا۔

محلے کے جوان تو شہزاد کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اس کی ہر بات نرالی معلوم ہوتی تھی۔
اس کا انداز بے حد انوکھا تھا۔ چق کی آڑ میں کھڑی ہونے کی بجائے وہ چق کو لپیٹ دیتی اور چھپ
کر دیکھنے کی بجائے اطمینان سے کھڑکی کے زیریں سہارے پر پاؤں رکھ کے بے تکلفی سے ادھر
اودھر دیکھتی۔ وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور سادہ کپڑے پہننا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا دوپٹہ
لاابالیانہ شانوں پر گرا رہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شانوں سے متعلقہ لباس ہو۔ اس کے بال نیم کھلے
رہتے اور آنکھوں کے کونوں میں دور کنپٹیوں تک سرمے کی دھار صاف دکھائی دیتی۔

مفتی اسے دیکھ کر گھبرا جایا کرتا۔ اس کی گردن جھک جاتی۔ اس کی نگاہیں احاطے کے فرش
پر آوارہ ہو جاتیں اگرچہ ان میں ہوائیاں سی چلتی رہتیں۔ اور اس کے ہونٹ نہ جانے کیا

گنگناتے۔ پھر وہ چپکے سے شہزاد کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ "چچی کوئی سودا تو نہیں منگوانا" اور اس کی
آنکھوں سے گلابی شرارے پھوٹتے اور ہونٹوں سے اف اف کی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے اسے بہت
کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو اور شہزاد بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتی اور "نہیں" کہہ کر بڑی
بے پروائی سے کسی کام میں لگ جاتی جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ رفیق کو اتنا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔
ارجمند انکرائینڈی کا تمام تر سامان لے کر چوگان میں کھڑا ہو جاتا اور بہانے بہانے شہزاد کی
کھڑکی کی طرف دیکھتا ریشمیں رومال ہاتھوں میں اچھالتا۔ احتیاط سے بنائے ہوئے بالوں کو
ریشمیں رومال سے سنبھالتا اور پھر بانسری ہونٹوں تلے رکھ کر سر اٹھا کر یوں اوپر کی طرف دیکھتا
جیسے سپیرے کے ٹوکرے سے سانپ نکلنے والا ہو۔

لیکن نہ جانے شہزاد کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس نے ارجمند کی حرکات کو کبھی درخور
اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ کھڑکی میں آتی ہر راہ چلتی ہوئی محلے والی سے کوئی بات چھیڑ لیتی۔ ہر آتے
جاتے سے ہنس ہنس کر بات کرتی مگر اس نے کبھی ارجمند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔
ارجمند کی ساری کی ساری انکرائینڈی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر وہ اکتا کر کچی حویلی کی طرف
متوجہ ہو گیا تھا۔ جہاں کپ اسے دیکھ کر چھلکتی اور کیپ یوں پھدکتی جیسے پارے کو آگ دکھائی
گئی ہو۔ کچی حویلی میں پہنچ کر اس کے انکرائینڈی میں از سر نو تاثر ہو جاتا تھا اور چہرے پر رونق
آجاتی۔

احاطے میں ایلی کے کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اول تو اس میں اتنی جرأت
تھی کہ ارجمند سے سیکھے ہوئے داؤ کو آزما سکے۔ لیکن کبھی ارجمند کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا تو
حویلی یا باہر کنوئیں کے قریب محلے کے احاطے میں کھڑے ہونا ایلی کے لئے ناممکن تھا اور پھر
شہزاد کے لئے کھڑے ہونا۔

جب سے ایلی نے ریل گاڑی میں اس مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھول کر اس کی طرف دیکھا
تھا۔ اس پر شہزاد کا اس قدر رعب پڑ گیا تھا کہ اس کی آواز سن کر نگاہیں جھک جاتیں اور وہ وہاں
سے بھاگ لیتا۔ شہزاد کے رو برو جانا تو الگ بات تھی۔

شہزاد کے سامنے ایلی کے شانوں پر منوں بوجھ پڑ جاتا۔ نسوں میں گویا خون جم جاتا۔ دل
دھک دھک کرتا۔ جی چاہتا کہ دوڑ کر کسی کونے میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ شہزاد
تو یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ جیسے وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی ہو جس

کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس لئے گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی شہزاد کی
طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے قریب تر جانے کی آرزو کو دل میں بسا کر گھٹنوں
اس کے قدموں میں بیٹھ رہتا۔ اسے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ آرزو کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔
اسے تو بس شہزاد کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے اور اسے دیکھ
کر شہزاد کی آنکھوں میں ایسی پھلجھڑیاں چلیں جیسے شریف کو دیکھتے ہوئے چلا کرتی تھیں۔ مگر یہ نا
ممکن تھا اور ممکن ہوتا بھی تو لیکن کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کی آرزو
کرے۔ کتنی بری بات تھی۔ کتنی ناجائز۔ اس بات کو بھلانے کے لئے اس نے اپنی توجہ دوسری
باتوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

چند ایک دنوں کے بعد ارجمند نے بھی محلے کے چوگان میں کھڑا ہونا موقوف کر دیا۔ "نہ
بھئی۔" وہ چلانے لگا۔ "اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنے تو پر جلتے ہیں اور بھئی ایلی بات یہ ہے کہ
پکا پکایا کھانا اپنے نصیب میں نہیں۔ اپنے نصیب میں تو انتظار کرنا لکھا ہے۔ بس چھ سال کی بات
ہے۔ صرف چھ سال۔ پھر کپ کو جھلکتے دیکھنا۔ اف غضب ہو جائے گا اور دوست رام تو ہم پہلے
ہی کر لیں گے۔ اگر مناسب وقت پر رام نہ کر لیا جائے بھائی تو یہ بلا قابو میں نہیں آتیں۔ بس
حبابوں کی کٹوریوں میں گلاب آیا تو سمجھ لو کہ دنیا ہی بدل گئی۔ یوں آنکھیں پھیر لیتی ہیں جیسے
جانتی ہی نہ ہوں اور وہ شہزاد۔ ارے وہ تو ظالم بے عزتی کر دیتی ہے بالکل بے عزتی۔ اس روز
مجھ سے پوچھنے لگی۔ "کس داؤ پر کھڑا ہے تو ــــــ کچھ کامیابی کی بھی امید ہے یا ایسے ہی ظالم
نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا اللہ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی گنتی میں شمار نہیں اور پھر یوں
کاٹ کے رکھ دینا۔ بھئی واہ۔ نہ بھئی اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن تم آزادی سے آجا سکتے ہو۔
دوست تم مزے میں ہو۔"

ارجمند اور ایلی دونوں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے کپ اور کیپ میں دلچسپی کا اظہار
کرنے لگتے۔ ایلی کہتا "چلو وہاں چلیں تمہارے گھر میں ہکوری ڈکوری دیکھیں گے۔" ارجمند مسکرا
کر چلاتا "کیوں دوست ابھی سے چوہا گھڑی پر چڑھنے لگا۔" اور وہ دونوں کھڑکی کی درزوں سے
مقابل کے گھر میں جھانکتے۔ سبز جنگلے کا دروازہ کھلتا اور ایلی محسوس کرتا جیسے کسی مونگیا گٹھڑی کے
پٹ کھل گئے ہوں۔ اس کے شانوں پر بوجھ پڑ جاتا۔ بند بند میں دھنکی سی بجنے لگتی اور وہ گھبرا کر
کھڑکی سے ہٹ جاتا۔

"ارے کیا ہے تجھے۔" ارجمند اسے یوں بے توجہی برتتے ہوئے دیکھ کر کہتا "میاں ا
موقع پر میدان چھوڑنا مردوں کا کام نہیں۔"
اس پر ایلی لاجواب ہو کر بھاگ آتا اور اپنے چوبارے کے کونے میں بیٹھ کر اپنی کمتر
شدت سے محسوس کرتا۔ اس کی نگاہوں میں فرار کی رنگین راہیں کھلتیں اور وہ ان میں کھو جا

***

سانوری

دولت پور

کچھ روز کے بعد دولت پور سے علی احمد کا خط موصول ہوا۔ جس میں ایلی کو ہدایت کی گئی تھی کہ خط کو دیکھتے ہی وہ فوراً دولت پور آ جائے۔ خط پڑھ کر ایلی چونکا اسے ڈر تھا کہیں ابا اسے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے لاہور کے کسی کالج میں داخل کیا جائے۔ کیونکہ لاہور میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن جب سے علی احمد کا تبادلہ دولت پور نہیں ہوا تھا ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں علی احمد اسے دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ علی احمد کے مکان سے ایک مرتبہ چھٹکارہ حاصل کرنے کے بعد وہ از سر نو وہاں مقید نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ علی احمد کے کمرے سے ڈرتا تھا۔ اسے کشمیر کے سیبوں پر پلی ہوئی ماں کی حنا مالیدہ ہاتھوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اسے علی احمد کے کمرے سے نفرت تھی۔ جہاں کوئی نہ کوئی کوریا خانم موجود رہتی تھی۔

لیکن علی پور میں رہ کر اپنی زندگی تباہ کرنا بھی تو اسے گراں ہو رہا تھا۔ ایک ان جانی کشمکش اسے چکی کے پاٹوں کی طرح پیس رہی تھی۔ اس لئے اس نے دولت پور جانا منظور کر لیا۔ کیونکہ علی پور سے مخلصی پانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا اور وہ مانگے کے سوٹ کیس میں اپنی چند ایک لودھیانے کی قمیض ڈال کر دولت پور کی طرف چل پڑا۔

دولت پورہ میں علی احمد کے مکان کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ایک پختہ چوبارہ تھا جو ایک جنگلے

دو کمروں اور ایک کمرہ نما صحن پر مشتمل تھا۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مکان گھر نہیں تھا بلکہ تر علی احمد کا کمرہ تھا۔ گھر تو بام آباد میں تھا۔ جہاں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس کے پہلو میں چار کمرے تھے۔ ایک دوسرے سے الگ۔ ایک دوسرے سے دور جہاں علی احمد کے رہتے ہوئے بھی ان سے دور رہنا ممکن تھا۔ جہاں ایلی ٹین کے سپاہی کے میدان جنگ کی سے دور رہ سکتا تھا۔ جہاں وہ اپنی انفرادیت کو بحال رکھ سکتا تھا اور پانی کی بوتل بھرنے کے اپنے ذہن کو اس کمرے کے تاثرات سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن دولت پور کا گھر تو سب ایک کمرہ تھا۔ جسے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جیسے کبوتروں کے رہنے لئے ڈربے بنے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیواروں کے پردے کھڑے تھے۔ اس کے باوجود کسی کمرے کی انفرادی حیثیت نہ تھی۔

دولت پور کا چوبارہ دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اسے ٹین کے سپاہی اور ربڑ کی چیخنے والی گڑیا کے ساتھ رہنا پڑے گا۔ نہیں نہیں وہ دولت پور کے کالج میں میں تعلیم نہیں پائے گا۔ کبھی نہیں۔

صحن میں چولہے کے سامنے شمیم بیٹھی تھی۔ کشمیر کا وہ سیب جو پکنے سے پہلے ہی سڑا ہوا تھا۔ وہ شمیم۔ اس کے گرد کباڑی کی دوکاڑی کی مانند کھانے پینے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کی ننھی بچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی بڑی لڑکی حوائج سے فارغ ہونے میں مشغول تھی۔ شمیم روٹیاں پکاتے ہوئے ننھی کی ناک پونچھتی۔ بڑی لڑکی کے جسم کو کپڑے سے صاف کرتی۔ پھر انہیں ہاتھوں میں آٹے کا پیڑا اٹھا کر روٹی پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ والے کمرے میں علی احمد میلی سی دھوتی باندھے ایک بڑے سے رجسٹر میں آلو اور پیاز کا حساب لکھنے میں مصروف تھے۔ بغلی کمرے میں چیزیں گڈ مڈ پڑی تھیں۔

ایلی پر ایک گھبراہٹ طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس مکان سے نکل بھاگے۔ اس لئے وہ عقبی کھڑکی میں کھڑا ہو کر پچھواڑے کے مکانات کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ سامنے کوٹھے پر کوئی شخص منتظر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں امید کی کرن واضح تھی۔ اس کے انداز سے بے صبری عیاں تھی۔ چند لمحات کے لئے وہ کوٹھے پر ٹہلتا رہا۔ پردے کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا۔ نگاہیں اس کھڑکی پر مرکوز ہو جاتیں جس میں ایلی کھڑا تھا۔ چند منٹ ایلی وہاں کھڑا رہا پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور شمیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شمیم کے رہنے سہنے کا انداز دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا کیا میٹریکولیٹ ایسی ہوتی ہیں۔

کشمیر میں پلی ہوئی عورتوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ــــــ ایلی کی نظروں میں شمیم کی آنکھوں کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ شمیم کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ "بیچاری۔" وہ سوچنے لگا "اس کی زندگی عام بیویوں سے کس قدر مختلف ہے اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ جب چینی کی گڑیا آکر چیختی ہوگی اور ٹین کا سپاہی میدان کارزار گرم کرتا ہوگا تو شمیم اس بغلی کمرے کی چارپائی پر بیٹھ کر کیا سوچتی ہوگی۔" اس کے دل میں پہلی مرتبہ شمیم کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی لیکن اس جذبہ ہمدردی میں ترس کا عنصر نمایاں تھا۔

سارا دن ایلی پریشان رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ صحن میں شمیم کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کی طبیعت مالش کرنے لگتی اور وہ دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا ــــــ کھڑکی سے کور جھانکتی۔ "بابو جی کہاں ہیں۔" دروازے سے استانی تہہ بند جھاڑتی ہوئی داخل ہوتی۔ ادھر سے خانم مسکراتی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بالآخر وہ بغلی کمرے کی کھڑکی سے اس بے قرار نوجوان کو دیکھنے میں کھو جاتا جو نہ جانے کس کے لئے دن بھر چھت پر بادیہ پیمائی کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کے بازاروں میں بے مصرف گھومتا۔

دولت پور دوسرے شہروں سے کس قدر مختلف تھا۔ بام آباد کی تو اور بات تھی وہ تو شہر تھا ہی نہیں بلکہ محض ایک نو آبادی تھی۔ جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن دولت پور تو پرانا شہر تھا۔ پھر اس کے بازاروں میں اس قدر ویرانی کیوں تھی۔ اس کی دوکانوں میں وہ بھڑک نہ تھی جو بڑے شہروں کی دوکانوں میں ہوتی ہے۔

بازاروں میں آتے جاتے لوگ سادہ طبیعت کے تھے۔ ان کے لباس میں دکھاوے کا عنصر نہ تھا۔ ان کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی معصومیت تھی۔ وہ اپنی غربت کا اظہار کرنے سے گھبراتے نہ تھے۔ ایک پیسے کا سودا لینے کو عار نہ سمجھتے تھے۔ دولت پور لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

سلفر اور پٹاخہ

دولت پور کی زندگی کا مرکز پنواڑی کی دوکان تھی جو عوام کے جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔ ہر دوکان پر چار ایک نوجوان جمع رہتے جو پان کھاتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کستے اور پھر سیٹھ گردھاری لال یا مدن لال بھابھڑہ کے تازہ ترین معاشقے پر ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگتے۔ ایلی دور

سے ان کی باتیں سنتا اور پھر آگے نکل جاتا اس کے لئے ایسی دوکان پر جانا ممکن نہ تھا۔ جہاں لوگ کا جمگھٹا لگا ہو۔ پان خریدنے کے لئے وہ ایسی دوکان پر جایا کرتا تھا جہاں کوئی گاہک نہ ہو۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ سودا خریدنے کے دوران میں گاہک آجاتے اور مجمع لگ جاتا۔ ایسے مواقع کی اسے دولت پور کی مجلسی زندگی کے متعلق چند ایک باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کی حیثیت اب وہ نہیں رہی تھی جو کبھی پہلے تھی اور اب اس نے ساجو سے تعلقات پیدا کر رکھے تھے۔ اور ساجو ان کی یہاں آتی جاتی تھی اور دولت پور میں ایسا کون تھا جو ساجو سے واقف نہ ہو۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ سلفے کی چلم ہے اگرچہ اب چلم میں راکھ رہ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی شوقین اسے چوستے تھے اور اس کا دھندا چلتا تھا۔

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کون ہے اور ساجو کس کا نام ہے اور وہ سلفے کی چلم کیوں ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ ساجو کوئی ہے۔ ہو گی کوئی اور سیٹھ گردھاری لال اسے چوس رہے تھے۔ لیکن اسے اس بات سے کیا تعلق۔

کئی مرتبہ حلوائی بازار کی طرف جاتے ہوئے جب وہ گلی میں سے گزرتا تو اسے خیال آتا کہ شاید یہی مکان ہو سیٹھ گردھاری لال کا۔ شاید یہی شخص جو چلا آرہا ہے سیٹھ گردھاری لال ہے کیونکہ دولت پور کے سیٹھوں اور عوام میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک سے ہی معلوم ہوتے تھے۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ دولت پور میں ایک نیا فتنہ بیدار ہوا ہے۔ جس کی شکل پٹاخہ سی ہے اور جو مست ہاتھی کی طرح چلتی ہے اور شوقین راستے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس سلفے کی چلم اور اس نئے فتنے کے باوجود ایلی کو دولت پور میں رہنے سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی اور بالآخر مجبور ہو کر علی احمد سے کہنے لگا "میں یہاں داخل نہیں ہوں گا۔ میں تو لاہور میں پڑھوں گا۔" علی احمد نے ایک ساعت کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولے "اس وقت اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے اس لئے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے کل دفتر آجانا وہاں یہ مسئلہ طے کرلیں گے۔"

داخلہ

دفتر میں علی احمد کی حیثیت افسر کی تھی۔ ان کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس میں

بیٹھ کر وہ کام کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن ایلی اطمینان سے ان کے دفتر جا پہنچا اور بے تکلفی سے اسلام و علیکم کہہ کر کرسی پر بیٹھ گیا جو علی احمد کے میز کی دوسری جانب رکھی تھی۔

"ہوں۔" علی احمد بولے "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "مجھے لاہور داخل کروا دیجئے کیونکہ لاہور میں ——"

"ہوں۔" انہوں نے ایلی کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بید کی چھڑی اٹھائی جو پاس دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

"تو تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے زن سے سوٹی اس کے سر پر دے ماری۔

"ارے۔" وہ گھبرا گیا۔ اسے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔

"ہوں۔" علی احمد نے کہا۔ "تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" اور سوٹی کی ایک اور ضرب لگائی۔ ایلی گھبرا گیا۔

"دیکھئے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔" وہ بولا۔

"ہوں تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو"۔ انہوں نے ایک اور ضرب لگائی۔ "میں کہتا ہوں آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ"۔

زن سے ایک اور ضرب پڑی۔ نہ جانے اس وقت ایلی کو کیا ہوا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے اور علی احمد اس کے والد ہیں۔ اس نے ایک جست لگائی اور اس میز پر چڑھ گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان بچھی ہوئی تھی۔ جھپٹ کر علی احمد کے ہاتھ کی سوٹی کو پکڑ لیا۔ ایک کھولتی ہوئی نگاہ باپ پر ڈالی۔

"تو تم دولت پور کے کالج میں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔" علی احمد نے وہی فقرا پھر دہرایا ایلی نے ایک جھٹکا دے کر بید کی سوٹی علی احمد کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے توڑ موڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ چند ساعت کے لئے وہ علی احمد کے روبرو کھڑا رہا۔ جیسے ان کا حریف ہو اور پھر میز سے اتر کر چپکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دو ایک گھنٹے نہ جانے وہ کہاں گھومتا رہا۔ بھاگ جانے کے خوفناک منصوبے بناتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کس طرح وہ سمندری جہاز میں داخل ہو کر چھپ جائے گا اور جب جہاز گہرے سمندر میں

پہنچ جائے گا تو وہ باہر نکلے گا۔ اور جہاز والے بالآخر اسے رکابیاں دھونے پر ملازم رکھ لیں گے کہ جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں لنگرانداز ہو جائے گا۔ پھر چپکے سے جہاز سے باہر نکل جائے گا جو اس کے ایک عزیز نے کیا تھا۔

لیکن یہ دلچسپ تفصیلات سوچنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اس میں بھاگ جانے کی جرأت نہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بھاگ جانے کی تفصیلات بھی نہ سوچے۔ جب وہ گھر واپس پہنچا تو علی احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ "غلام محمد" انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ "اسے ڈاکٹر رام داس کے پاس لے جاؤ۔"

ڈاکٹر سے دوا لگوانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ کر فیصلہ کرتا رہا کہ دولت پور کے کالج میں داخل نہیں ہو گا چاہے کچھ ہو جائے لیکن تیسرے روز جب علی احمد نے اپنے ہیڈ کلرک کے ساتھ اسے دولت پور کینٹ کالج میں داخل ہونے کے لئے بھیجا تو وہ یوں چپکے سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ جیسے دولت پور کالج میں داخل نہ ہونے کا اس نے فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔

چند ایک دن تو ایلی چوبارے کے ان دونوں کمروں میں پریشان حال گھومتا رہا پھر قانع ہو کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب شام کے وقت شمیم کھانا پکانے لگتی اور ناظمہ حوائج میں مصروف ہو جاتی اور انجم کی ناک بہتی تو وہ چپکے سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کی گلیوں میں گھومتے ہوئے سوچتا کہ یہ مکان سیٹھ گردھاری لال کا تو نہیں اور یہ عورت جو کھڑکی میں کھڑی ہے۔ دولت پور کا نیا فتنہ ہے یا سلنے کی چلم۔

وہ یونہی گھومتا رہتا تاکہ وہ شمیم کو کھانا پکاتے ہوئے نہ دیکھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ کس طرح وہ جہاز میں چھپنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور پھر کس طرح جہاز کا کپتان اسے رکابیاں دھونے پر نوکر رکھنا منظور کر لے گا اور پھر بصرہ کی بندرگاہ میں کس طرح سے چوری چوری جہاز سے اترے گا۔ وہ مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تاکہ کھانے کے دوران یہ خیال نہ آئے کہ یہ وہی کھانا ہے جسے شمیم نے پکایا ہے۔

جمعہ شاہ

پھر ایک روز علی احمد کے یہاں بالا اور اس کی چچی آ گئے۔ آگے آگے بالا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اور اس کے پیچھے اس کی چچی دیواروں کا سہارا لیتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی

تھی۔

"سلام کہتا ہوں جی۔" بالا شمیم سے مخاطب ہو کر بولا "اپنے پھوپھا جان کہاں گئے ہیں۔ ہوں گے! ہوں گے باہر سیر کو۔ ہائیں ایلی بھائی بھی یہاں ہیں۔ مزاج تو بخیر ہے نا۔ شکر اللہ کا میں تو بالکل خیریت سے ہوں۔ علی پور میں سبھی خیریت سے ہیں ہاں"۔ اس نے یوں کہا جیسے یہ ایک افسوس ناک امر ہو۔ "سبھی یاد کرتے ہیں آپ کو۔" وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ خود ہی سوال کرتا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دینے لگتا۔ اس کی نگاہیں نہ جانے کس طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ جیسے دیواروں کے پار کچھ دیکھ رہا ہو۔ اس کی چچی بالا کی طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں بالا اس کی نگاہ سے اوجھل ہونے دیا گیا تو وہ پراسرار طریقے سے گم ہو جائے گا۔

جلد ہی شمیم اور ایلی کو معلوم ہو گیا کہ بالا اور اس کی چچی وہاں دو ایک مہینے ٹھہرنے کے لئے آئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید علی احمد کے زیر اثر رہنے سے بالا میں دسویں پاس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگرچہ علی احمد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ انہیں قطعی طور پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ ان کے آنے سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

بالا اپنے جواہرات کے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتا۔ "یہ دیکھو ایلی ——" وہ اسے اکساتا۔ "یہ نیلم جو ہے یہ کوہ سفید کے سوا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا ہاں۔ کیونکہ وہی ایک پہاڑ ہے جہاں پریوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پریوں کو نیلم سے محبت ہوتی ہے۔ ہاں۔ پھر جب چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے نا تو اس کا رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور ——"

ایلی کو اب بالا کے قیمتی پتھروں سے وہ دلچسپی نہ تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایلی اس کی باتیں سن کر مسکراتا اور پھر سوچتا کہ کس طرح بالا کے طلسمی پتھروں سے مخلصی پائے لیکن اعلانیہ بالا کی بات کاٹ کر چلے جانا یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ بہرحال وہ بالا کی باتیں سنتا جمائیاں لیتا اور نہ سننے کی آرزو کرتا۔

پھر دفعتاً بالا اٹھ بیٹھتا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ "ابھی آتا ہوں۔ بھئی۔ ابھی آیا میں۔ وہ بلا رہے ہیں نا مجھے۔" اس کے اشاروں میں رازدارانہ اور پر اسرار انداز جھلکتا۔ اس کی مسکراہٹ میں احساس برتری کی جھلک ہوتی۔ جیسے وہ حالات کو بہتر

طور پر سمجھتا ہو جیسے وہ فطرت کے راز سے کماحقہ واقف ہو۔ "ذرا انتظار کرو میں ہو آؤں"
ایلی سے کہتا اور پھر چپ چاپ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھے
زیر لب باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ پھر وہ لوٹ آتا لیکن سیڑھیاں اترتے وقت وہ
رکتا جیسے کسی نے اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "نہیں نہیں یوں
نہیں۔ جیسے میں نے کہا اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "نہیں نہیں
یوں نہیں۔ جیسے میں نے کہا تھا ویسے۔" اور پھر مسکراتا ہوا نیچے اتر آتا۔ شمیم اور ایلی حیرانی سے
اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ اسے آتا دیکھ کر شمیم گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور انجم کو کلیجے سے لگا
ناظمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا انہیں محفوظ کر لیتی۔

پھر وہ گھبرا کر پوچھتی۔ "بالا تم کس سے باتیں کیا کرتے ہو۔"

بالا مسکرا دیتا ہے۔ "آپ نہیں جانتی پھوپھی۔ آپ انہیں نہیں جانتیں۔ اپنی ہی ہیں وہ
بڑے اچھے ہیں بیچارے"۔

بالا جواب دیتا۔ "کہاں نہیں ہیں۔ ان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ ہر
مکان میں جنگل میں میدان میں۔ لیکن بڑے اچھے ہیں وہ بیچارے بار بار مجھے بلا لیتے ہیں۔ ہی ہی
ہی۔" وہ ہنستا۔

"اس وقت تو اپنے جمعہ شاہ کو نہیں جانتے بڑے زبردست ہیں وہ جو چاہیں کر دیں۔ جو
چاہیں جسے چاہیں بلا لیں تو یہ بھئی کس میں ہمت ہے کہ ان کی بات رد کرے۔ لیکن میں ہی ہی
ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگتا "میری اور بات ہے۔ میرا ہم زاد بڑا زبردست ہے نا۔ اس لئے۔ لیکن
تمہیں کیا معلوم پھوپھی میں نے کئی بار کہا ہے انہیں کہ ——"

اور بالا اسی طرح ایک قصہ چھیڑ دیتا۔ جس کے دوران میں وہ بار بار مسکراتا اور انہیں یوں
سمجھانے کی کوشش کرتا جیسے دونوں بچے ہوں پھر جب رات پڑ جاتی تو وہ کتاب سامنے رکھ کر
دیوار کے پار دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب قسم کی دیوانگی جھلکتی۔

ایلی کو بالا کی طرف دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس لئے وہ کوشش کیا کرتا کہ اس کی طرف نہ
دیکھے۔ دوسری جانب بالا کی چچی یوں بیٹھی رہتی جیسے کپڑوں کی گٹھڑی پر کسی ڈائن کا سر کاٹ کر
رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں بالا پر مرکوز رہتیں اور وہ مسلسل طور پر پیار بھری سیاہ ذار نگاہوں
سے اسے گھورتی رہتی۔ حتیٰ کہ بالا کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور سر کتاب پر جھک جاتا اور ٹانگیں

یوں بکھر جاتیں۔ جیسے معاملے سے بنے ہوئے باوے کا اندرونی تاگا لوٹ گیا ہو۔

اس پر دفعتاً کپڑوں کی گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوتی اور چچی اٹھ کر بالا کے بکھرے ہوئے
اعضا کو سمیٹتی اور بصد مشکل اس لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ اس وقت ایلی سوچتا کیا یہ
وہی بالا ہے جو فطرت کے تمام رازوں سے کماحقہ واقف ہے۔ کیا یہ بے ہوشی بھی کوئی راز
ہے۔ یہ سوچتے سوچتے ایلی اونگھنے لگتا اور پھر چپکے سے اٹھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور علی احمد کے قلم
کی چراؤں چراؤں کو غور سے سننے میں مصروف ہو جاتا جو ملحقہ کمرے میں حسابات کے رجسٹر پر
کرنے میں مصروف رہتے۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں علی احمد یہ نہ پوچھ لیں۔ "ایلی
تم ابھی سے سو گئے کیا سارا دن آوارہ پھرتے ہو اور سر شام ہی پڑ کر سو جاتے ہو کیا وجہ ہے۔"
لیکن علی احمد کو حساب کتاب لکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ رجسٹر سامنے رکھ کر دنیا و مافیہا
سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

آتشیں میزائل

رات کو خواب میں عجیب و غریب اشکال ایلی کے پیچھے دوڑتیں اور وہ ڈر کر بھاگتا۔ خوف
سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ دل دھڑکتا۔ مگر وہ دوڑے جاتا۔ پھر بالا نہ جانے کہاں سے
اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا اور مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عجیب قسم کی ہمدردی سی
محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔" بالا مسکرا کر کہتا ٹھیک ہو جائے گا۔ بالا کا چٹا
سفید ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتا اور اسے تھپکنے لگتا۔ ایلی جاگ اٹھتا اور اپنے آپ کو کمرے میں
دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ از سر نو اس پر خوف مسلط ہونا شروع ہو جاتا۔
اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا —— دفعتاً اسے محسوس ہوتا
کہ کوئی چیز اس کے جسم سے چھو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔

پہلی مرتبہ جب اس نے یہ محسوس کیا تھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔
صرف بالا کا بازو چارپائی تلے یوں لٹک رہا تھا۔ جیسے قصائی کی دوکان پر بکرے لٹکا کرتے ہیں۔ یہ
بات تعجب خیز نہ تھی۔ کیونکہ اکثر بالا کے اعضا چارپائی سے لٹکا کرتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اس
کا بازو اور ٹانگ چارپائی تلے دیکھے تھے اور بالا کی چچی تو اکثر رات کے وقت چلایا کرتی۔ "بالا تیری
دوسری ٹانگ کہاں ہے۔ بالا کہاں ہے۔ تیری دوسری ٹانگ۔ پھر وہ اٹھ کر بالا کی دوسری ٹانگ

سیمٹتی اور گٹھڑی بن کر بالا کی پائنتی کی طرف پڑ جاتی اور بالا اسی طرح سویا رہتا یا زیر لب گا کر آنکھیں یوں بند کر لیتا جیسے نیند میں ہو۔

بالا کے جسم کے متعلق ایلی کے لئے دو تین باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو اس کا جسم سفید ملائم تھا۔ جیسے عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر حسا تھے کہ ایلی کو حیرت ہوتی تھی۔ انگلیاں مخروطی تھیں اور جلد پر یوں گلابی جھلک سی چمکتی تھی جی نائلون کی باریک جھلی چڑھا رکھی ہو۔

اس روز بالا کا ہاتھ چارپائی سے لٹکتے دیکھ کر ایلی کو تعجب نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے نیند نہ آتی تھی۔ نہ جانے نیند کو کیا ہو گیا تھا کمرے کے اندھیرے سے نجات پانے کے لئے اس نے سیٹھ گردھاری لال کے متعلق شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے سیٹھ گردھاری لال کیسا ہو گا۔ اس کے سلفے کی چلم ساجو اور وہ پٹاخہ نہ جانے کون تھی۔ وہ ——— جو دولت پور میں پٹاخہ سمجھی جاتی تھی۔ کوئی ہو گی۔ پڑی ا کرے۔ ایلی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے پھر وہی لمس محسوس کیا۔ وہی جی جیسے کوئی مخملی بیر بہوٹی چل رہی ہو۔ وہ پھر چونکا۔ بیر بہوٹی رک گئی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر چلنے لگی۔ اگرچہ وہ جنبش چونکا دیتی تھی۔ لیکن اس قدر مدھم تھی۔ وہ لمس اس قدر مخملی تھا ایلی میں عجیب سی لذت بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے رنگین جھولنے چپکے سے اس کی رضائی م گھس گئے ہوں۔ بیر بہوٹی کی ہر جنبش پر وہ بدکتا اور اس کے بدکتے ہی وہ جھولا رک جاتا۔ وہ لم جامد ہو کر رہ جاتا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود ایلی کا جی چاہتا کہ وہ جنبش پھر رواں ہو جائے بہوٹی پھر چلنے لگے۔ اس لمس کی وجہ جاننے کے لئے اس نے رضائی سے باہر دیکھنے کی خوا محسوس کی تاکہ اسے معلوم ہو کہ بالا کا بازو کیا وہیں لٹک رہا ہے۔ لیکن چین اس وقت وہ جن پھر رواں ہو چکی تھی۔ ایلی نے رضائی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے کی خواہش کو دبا لیا کہ مبادا وجہ سے وہ بیر بہوٹی رک نہ جائے۔

بیر بہوٹی سرک رہی تھی۔ سرک رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ان جانے مرکز چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وقت گویا تھم چکا تھا۔

پھر دفعتاً ایک گرداب اٹھا۔ وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدل گئیں۔ آتشیں میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر ایٹم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑ

تھیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بہے جا رہا ہو اور چاروں طرف تھکی ہاری لہریں رینگ رہی ہوں۔

اس روز پہلی مرتبہ اسے اس تلاطم کا تجربہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت میں رنگین طوفان پنہاں ہیں۔ اگلے روز وہ بالا کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا شفاف ہاتھ تھا وہ کس قدر مخملیں۔ اسے دیکھ کر ایلی کو بیک وقت نفرت اور دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت کا احساس غالب تھا۔ مگر اس نفرت کے باوجود رات کی تاریکی میں اس چھائی ہوئی خاموشی کے پس منظر پر وہ مخمل لمس رواں دواں ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا گویا کسی بربط کے تار لرز رہے ہوں۔ اس وقت وہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا۔ لیکن جلد ہی ان جانے میں وہ پھر کروٹ بدلتا ——— اور پھر مخملی لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں افق پر خونیں چھینٹے اڑتے ایک میزائل شوں سے آسمان کی طرف لپکتا۔ پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی ویرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر پڑا ڈبکیاں کھاتا اور کسی ان جانے احساس سے شرابور ہو جاتا۔ دن بھر وہ کالج سے متعلقہ مشاغل میں مصروف رہتا۔ شدت سے مصروف رہتا تاکہ اس کے ذہن میں بالا کا خیال نہ آ جائے۔ بالا کے رو برو جانے سے بھی اسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ روحانی تکلیف۔ بالا اس کے ذہن میں ایک رستے ناسور کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن ———

پیس میموریل

دولت پور کا کالج ایک وسیع احاطے میں طویلا نما عمارت میں واقع تھا۔ احاطے کے چاروں طرف ایک منزلہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ چلا گیا تھا اور درمیان میں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس میں دو ایک پلاٹ دو ایک ٹینس اور بیڈمنٹن کے کورٹ تھے اور درمیان میں کنکر بچھے ہوئے راستے بنے ہوئے تھے۔

احاطے کا شرقی پہلو تعلیم و تدریس کے لئے مخصوص تھا اور باقی تین پہلوؤں میں بورڈنگ طلبا کے رہائشی کمرے تھے جو زیادہ تر خالی پڑے رہتے۔

اس کالج کی حیثیت محض ایک سکول کی سی تھی۔ احاطے کے دونوں پھاٹکوں میں سٹولوں پر

بیٹھے چوکیدار اونگھتے۔ کالج ونگ کے برآمدے میں ڈھیلے ڈھالے چپڑاسی ہاتھوں میں
ننگے پاؤں یوں گھومتے پھرتے جیسے بھکشو چل رہے ہوں۔ دفتر میں لالہ رام لال ہیڈ کلرک
ناک کی چونچ پر رکھے بڑے بڑے رجسٹروں میں اندراج کرنے میں مصروف دکھائی دیتے۔
اردگرد کم سن کلرک حساب کتاب کے کھاتے کھولے بیٹھے رہتے۔

جماعتوں میں پروفیسر گنگنی آواز سے پڑھاتے اور لڑکے بنچوں پر بیٹھ کر اونگھتے۔
کے ویران کمروں میں الگنیوں پر دھوتیاں لنگوٹیاں اور پرنے سوکھتے۔ رسوئی میں
کڑاہیاں بجتیں۔ چولہے سے پھلکے اڑتے اور باہر بچھی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر لڑکوں کے
صبرے ہاتھ انہیں کیچ کرنے کے لئے بڑھتے۔

دولت پور کالج کا نام پیس میموریل کالج تھا جو کسی بڑے سیٹھ نے لوک رکشا کے لئے
کیا تھا۔ شاید اسی لئے کالج میں پیس صلح اور شانتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے شانتی سے
چپڑاسی آواز پیدا کئے بغیر برآمدوں سے چلتے پھرتے۔ دفتر میں ہیڈ کلرک کے قلم کے
چراؤں کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

اس پیس میموریل کالج میں صرف ایک گروپ ایسا تھا جو اس چھائی ہوئی خاموشی کو
کی کوشش کرتا۔ لیکن بسا اوقات ان کی یہ کوشش بری طرح سے ناکام ہو جاتی۔ یہ گروپ
پور کے شہر کے مسلمان لڑکوں کا تھا۔

شہر کے لڑکے صبح سویرے اپنے بائیسکل سنبھالتے اور چھاؤنی کی طرف چل پڑتے
واقع تھا۔ شہر سے نکلتے تو تعداد کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے سائیکلوں کا ایک جلوس
سائیکلوں کی ریس ہو رہی ہو۔ یہ جلوس گپیں اڑاتا۔ شور مچاتا۔ شانوں پر ہاتھ رکھے
چھوڑے قطار در قطار چلے جاتا۔ ان کے اس طور پہ چلنے سے چھاؤنی اور شہر کے درمیان
سڑک کا ٹریفک رک جاتا۔ تانگے والے چیختے رہے بابو۔ بچ کے بابو۔ بیل گاڑی والے
ٹریفک کے سپاہی سیٹیاں بجاتے۔ ویران کوٹھیوں میں سے صاحبوں کے کتے نکل کر
لیکن وہ جولس بے نیازی اور بے پروائی سے چلے جاتا۔

ان کی زبانیں قینچیوں کی طرح چلتی تھیں۔ نگاہیں کوند کی طرح چپک جاتیں۔
شوخیاں جھلکتیں بھوؤں میں مستیاں لہراتیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھرتیں۔ ایک دوسرے کو
بنانے کی کوشش کرتا۔ دوسرا دل پھینک عاشق کا روپ دھار لیتا۔ ایک شریف کی سی

بناتا۔ دوسرا علی احمد کی طرح میدان میں آکودتا۔

ایک کہتا "کیوں میری جان دیکھو گے یا مار ہی ڈالو گے۔"

دوسرا کہتا۔ "کیوں بے سالے ہماری ہی بلی اور ہمیں سے میاؤں۔"

"کیوں سالے۔ ہم سے تو چھپتا ہے اور دوسروں سے آنکھیں لڑاتا ہے۔"

"بھئی ہم تو سرکار کے نوکر ٹھہرے۔"

"تو مشق ناز کر بے خون دو عالم ہماری گردن پر۔"

"ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ جان من۔"

ہر کسی کو شوق تھا کہ وہ عاشق کا رول ادا کرے اور دوسرے کو معشوق بنا کر رکھ دے۔
دولت پور کے لڑکوں کا صرف یہی ایک مذاق تھا۔ ان کے پاس بات کرنے کے لئے صرف یہی
ایک موضوع تھا۔ جسے بات کرنی آتی تھی۔ جو چوٹ کر سکتا تھا۔ فی البدیہہ چست جواب دے
سکتا تھا' وہ ہیرو بن جاتا اور جو لڑکے ازلی طور پر گنگے تھے وہ نکو بن کر رہ جاتے۔

ایلی ازلی طور پر ایک گونگا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے لئے ان کی باتیں بے حد پریشان
کن ہوتی تھیں۔ اور وہ جلوس خاصہ اذیت دہ۔ اس لئے وہ اکثر کوشش کرتا کہ ایسے وقت کالج
جائے جب لڑکوں کے جلوس میں شامل ہونے کا ڈر نہ ہو۔

یہ جلوس جب کالج کے دروازے پر پہنچتا تو اور بھی شور مچاتا۔ لیکن ان کا وہ شور بے جان
ہو کر رہ جاتا کوشش کے باوجود اس میں تسلسل پیدا نہ ہو سکتا۔ اس راہب خانہ نما احاطے میں
عجیب خصوصیت تھی۔

اس احاطے میں بڑی سے بڑی شوخ بات بے جان ہو کر رہ جاتی۔ بڑی سے بڑی پھبتی فلیٹ
ہو جاتی جیسے صحرا میں جھاڑیوں کی سبزی خشک ہو کر اڑ جاتی ہے۔

یہ جلوس احاطے میں داخل ہوتے ہی بے جان ہو جاتا۔ لڑکوں کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔
انکے حلق کی آوازیں جم جاتیں اور وہ چپ چاپ کلاس روم میں بیٹھ کر اونگھنے لگتے اور چھٹی کا
انتظار کرتے تاکہ ایک بار پھر حرکت کر سکیں۔

پیس میموریل کے پروفیسر بھی عجیب تھے۔ ان میں شوخی یا بانکپن نام کو نہ تھا ان کے لباس
بھڑکیلے نہیں بلکہ بدرنگ تھے۔ ان کی حرکات اس حد تک مدھم تھیں جیسے سلو موومنٹ پر فلم
چل رہا ہو۔ ان کی آوازیں احاطے کی خاموشی کو تقویت دیتی تھیں۔ ان کے لیکچروں میں بھی علمی

نمائش مفقود تھی۔ لیکچر دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے معلومات کا پرچار کرنے کے بجائے وہ اپنے
علم کے عجز کا اظہار کر رہے ہوں۔ لڑکے ان کے اس انداز پر تمسخر سے ہنستے تھے۔ اگرچہ چوری
چو.ی ہنستے تھے۔ لیکن پروفیسروں کے برتاؤ کو محسوس کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کی جگہ
ایک بودھی راہب خانہ ہو جہاں لوگ علم کی بجائے شانتی کا اپدیش سیکھ رہے ہوں۔

ایلی کے لئے وہ کالج خوش کن نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہاں احساس کمتری کی وجہ سے
اسے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کالج میں باقاعدہ جاتا۔ اگرچہ اس نے
کبھی پروفیسر کے لیکچر کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ جماعت میں وہ اونگھتا۔ ر-یس میں لڑکوں کی
باتیں سنتا اور خالی پیریڈ میں انہیں کسی ویران کمرے میں تاش کھیلتے ہوئے دیکھتا رہتا یا کالج سے
نکل کر چھاؤنی کے بازاروں میں گھومتا۔

کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچتا اس کا
دل بیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہو گی۔ نہ جانے شمیم کی بچیاں صحن میں بیٹھی
کیا کر رہی ہوں گی۔ سارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں وہ الگ تنہائی میں بیٹھ سکا
ہو۔

کچی گری

پھر دولت پور میں پنکھے کے میلے کا دن آگیا۔ شہر کے پنواڑیوں کی دوکانوں پر بھیڑ لگ گئی
لوگ پان کھاتے پیکیں تھوکتے ایک دوسرے پر فقرے کستے۔ مذاق اڑاتے اور بالآخر شہر
سیٹھوں اور پٹاخوں کے متعلق بات شروع کر دیتے۔

"کیوں بھئی غلام محمد کون کون آرہی ہے اب کے پنکھے کے میلے ماں ——"

"اپنی زہرہ ہے دلی والی۔ علی جان ہے اور پٹیالے کی نرالی بانو ہے۔"

"بڑی اچھی اچھی آئیں گی۔ اب کی بار بڑا ٹھاٹھ رہے گا۔ تو دیکھیو تو۔"

"کیوں رے بڑا تان سین آیا ہے تو سمجھنے والا راگ ودیا کا۔"

"اچھا خاصہ تو گاتی ہے وہ اور جب ہاتھ اٹھا کر کولہے مٹکاتی ہے تو دیکھ لیجو تیرے جیسا
کے دل کو نہ ہوا کچھ کچھ تو کہنا۔"

"ارے یار تو بھی بس لفاٹو ہی رہا۔ یہاں گانے میں اپنی زہرہ کا جواب نہیں ، اور پھر دیکھنے

بھی تو چھپن چھری ہے نری۔"

"ہونہہ دیکھنے میں تو وہ ہے جو آج کل شہر کی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی اے اور بھئی ہے بھی
یوں سمجھ لو کچی گری ——— رضائی میں پڑ کر چباتے رہو۔ ہاں۔"

پھر وہ سب اس کچی گری کو چبتے اور اپنی تخیل میں کھو کر پان کی پیک نگل جاتے اور پھر
کھانستے اور چلاتے۔

"کیوں بھئی غلام محمد بڑا تیج ہے۔ تیرا تمباخو کہاں سے منگوایا ہے اب کی مرتبہ۔"

غلام محمد ایک شان بے نیازی سے چلاتا "ابے کیا سمجھا ہے تو نے اپنی دوکان پر چیج وہ آتی
ہے۔ جو اول درزے کی ہو۔ ہاں۔"

میلے کے دن شہر میں گھومتے ہو۔ ۓ راج چوک میں مرزا کی دوکان کے قریب ایلی ان کی
باتیں سن کر ٹھٹھکا۔

"ابے وہ سامنے تو ہے وہ شیخ کی دوکان کے اوپر جھرمٹ لگا ہے نا اس میں تو غور سے تو
یکھ۔ آنکھیں ہیں تیری یا بٹن جو کہ دیکھنے کی چیج رکھتی ہی نہیں۔"

"وہ تو اپنی بالیاں والی ہے۔ پٹاخہ کہاں رکھتا خود کو نہیں الٹا ہمیں جھٹلائے ہے۔"

"ہاں ہاں بالیان والی کے ساتھ ہی تو ہے۔ بائیں ہاتھ کو ابے کیا ابھی سے آنکھوں پر چنا
لیا۔ کہا جو ہے تجھ سے بیسیوں بار چھوڑ دے یہ جیا دتیاں۔ اندھا ہو کر راج چوک میں لاٹھی نہ
ٹیکی تو نے تو اپنا نام مرجا نہیں۔"

ایلی غور سے دوکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھڑکیلے ستے کپڑے
پہنے چند سانولی عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن کے انداز میں نمائش کے علاوہ عریانی کی جھلک تھی۔
ں نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب بکاؤ ہوں۔ جنہیں سستے داموں خریدا جا سکتا ہو۔ تو کیا یہی تھی
دولت پور کی پٹاخہ جو ہوائی بن کر چھوٹی ہوئی تھی شہر میں۔

"دیکھ لیا۔" مرزا قہقہہ مار کر ہنسا "بڑے جوروں میں ہے آج کل یہ لمڈیا۔ اپنی لطیفن کی
یا ہے یہ اے وہی لطیفن جو منڈی میں دانے چھانتی ہے۔ اپنے سیٹھ مجید الرحیم کی دوکان پر
ہنیں ہیں۔ بڑی نے سیٹھ گردھاری لال کو سنبھال رکھا ہے اور"

"اور کیا بے سلفے کی لاٹ کو کون نہیں جانتا۔ جانتا ہوں اسے اچھی طرح یوں۔"

"پر یار اس جالم پٹاخہ نے چکر دیا ہے سارے شہر کو۔"

ایلی حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کس
سے انہیں پرکھتے تھے۔ نہ جانے کس نقطۂ نظر سے انہیں عورتیں حسین نظر آتی تھیں۔
پور کے پنواڑیوں کی بات تو خیر الگ تھی۔ اپنے علی احمد کے خیالات بھی اس سلسلے میں
تھے۔ ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ان عورتوں کو گھور رہا تھا جو شیخ کی
پر بیٹھی پنکھوں کے جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"تو یہاں کیا دیکھ رہا ہے؟" علی احمد کی آواز سن کر وہ چونکا۔

"جی۔ جی۔ یونہی دیکھ رہا تھا۔"

"اس طرح پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے۔" علی احمد نے کولہوں پر ہاتھ رکھ
شیخ کی دوکان پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف بڑے انہماک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ابھی جلوس یہاں نہیں پہنچا ہوں۔" انہوں نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
دیر میں پہنچے گا یہاں ہوں۔"

پھر وہ اسی طرح کولہوں پر ہاتھ رکھے وہاں ٹہلنے لگے۔ علی احمد نے نہ جانے کیا کیا
دوکان پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک نے بامعنی انداز سے دوسری کو کہنی ماری اور پھر مسکرا
بیٹھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر علی احمد بولے۔ "آؤ ایلی ذرا ادھر سے ہو آئیں۔ اس طرف۔"
ایلی کو لے کر چوک کے عقب کی اندھیری گلیوں میں گھس گئے اور ایک جگہ رک کر
انتظار کرنے لگے۔

ان گلیوں میں عورتوں کے گروہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے ——— نہ جانے کیوں ایلی کو
پور کی عورتوں سے گھن آتی تھی۔ ان کا انداز چال ڈھال، طور طریقہ گھٹیا قسم کا تھا۔
کپڑے پہنتی تھیں۔ ستے اور بھڑکیلے ان کی حرکات میں کوئی حسن نہ تھا ——— ان کا
تو بالکل ہی گنوار پن کا مظہر ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا رنگ عموماً کالا تھا اور
سے ایلی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔

بلوری پاؤں

دولت پور میں کہیں کہیں سفید رنگ کے لوگ بھی نظر آتے تھے مگر ان کی تعداد بہت
تھی مثلاً علی احمد کے چوبارے کے سامنے جو بیٹھا بیٹھا سا کچا گھر تھا۔ اس میں وہ لڑکی جو کبھی

کوٹھے پر چڑھا کرتی تھی اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھا کرتی تھی اس کا رنگ کتنا سفید
تھا۔ اس کے انداز میں نمائش کا نشان تک نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب ایلی نے اسے دیکھا تھا تو وہ
حیران رہ گیا تھا۔ پردے کی جالیوں کے پیچھے دو بلوری پاؤں گویا بڑی نفاست سے چارپائی پر رکھے
ہوئے تھے اور ان کے روبرو دو مخروطی ٹانگیں جو میلے لٹھے کے پاجامے میں ملبوس تھیں۔ ایلی
نے پہلی مرتبہ پاجامے کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ چوڑی دار پائجامہ تو اس نے اکثر دیکھا تھا مگر
اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے وہ پتلے پتلے بانسوں پر چڑھا ہو۔

دولت پور کی عورتوں کا انداز اتنا بھدا تھا۔ ان کی حرکات اس قدر بے ڈھب تھیں۔ ان کی
نگاہیں حجاب سے اس قدر بے بہرہ تھیں کہ ایلی نے ان کے لباس کی خوبی پر کبھی غور ہی نہ کیا
تھا۔ اسی لئے اس روز اس لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ کتنی متناسب ٹانگیں تھیں اور پھر
بلوری پاؤں پھر دفعتاً" ایک سریلی دبی دبی آواز میں گونجی۔ "آتی ہوں۔" اور وہ جھک کر چھپتے
چھپتے پردوں کی اوٹ لیتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اندھیری گلی میں ان آتے جاتے جاننی سایوں کو دیکھنے
سے علی احمد کا مقصد کیا تھا۔ وہ وہاں کس لئے کھڑے ہر آتے جاتے کو تاکنے کی بے معنی کوشش
میں مشغول تھے۔

میلہ

"تم ہو بابو جی ———" قریب ہی سے آواز آئی۔ ایلی چونکا۔

اندھیرے میں علی احمد کے دانت چمکے۔ "تم آ گئیں۔ ہی ہی ہی۔" ٹین کا سپاہی اپنے
مخصوص انداز میں ہنسا۔

"پھر تم نے جو اشارہ کیا تھا۔" ربڑ کی گڑیا کی آنکھوں کی سفیدیاں چمکیں۔

"ہی ہی ہی ——— تو تو نے دیکھ لیا ———" وہ بولے۔ "میں تو سمجھا تھا شاید۔ ہی ہی
ہی۔"

"کیسے نہ دیکھتی۔" وہ چمک کر بولی۔

اس کا دھیان تو تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ قریب ہی چادر میں لپٹا ہوا ایک مرد گنگنایا۔

اس کی آواز سے سیلز مین شپ کی بو آتی تھی۔

"تو خواہ مخواہ ——" وہ لاڈ سے غرائی۔ "تو نہ بول بیچ ماں۔"

علی احمد یوں ہنسے جا رہے تھے۔ جیسے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو۔ "اچھا تو" وہ بولے "چلے گی اب۔"

"اب ——" وہ چونکی۔ "نہ بھئی ہم تو پنکھا دیکھ کر جاویں گے۔"

"بڑی متوالی ہے پنکھے کی۔" سیلز مین ہنسا۔

"متوالی ہی تو ہے۔" ٹین کے سپاہی نے گویا پھر وار کیا۔

"میلہ دیکھ کر پہنچوں گی۔ ہاں۔ سچی بات کہوں گی۔"

"میلہ تو تم خود ہو۔" علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ "دنیا دیکھ رہی ہے۔"

"اوں۔ جھوٹ۔" اس نے لاڈ سے گویا شکایتاً" کہا "کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔"

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "وہ تو انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ تمہاری طرف۔"

"پڑے اٹھائیں۔ اپنی بلا سے ——اور وہ میری چیج لائے ہو۔"

ٹین کے سپاہی کا قہقہہ یک قلم موقوف ہو گیا۔ "اوہ مجھے یاد نہیں رہا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"وہ کیوں یاد رہنے لگا۔" وہ بگڑ کر بولی۔

"بھیج دیں گے۔ بگڑتی کیوں ہو۔"

"کیوں نہ بگڑوں بس ایک ہی بات یاد رہتی ہے تمہیں۔"

"ایلی کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ یہ ایلی ہے میرا لڑکا۔"

"اچھا تو یہ ہے ایلی۔" وہ لاڈ سے چلائی۔ "پڑھتا اے تو۔"

"صبح مل لینا اس سے اپنی چیز بھی لے لینا۔" علی احمد بولے۔ "چلو ایلی۔"

اس کے جانے کے بعد وہ بولے "چلو تمہیں میلہ دکھا دیں۔ دیکھو گے نا۔"

اگلے روز صبح سویرے ہی علی احمد نے ایلی کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک دس کا نوٹ دے کر ایک گٹھڑی سی تھما دی۔ "یہ ادھر لے جا۔" وہ بولے۔ "غلام محمد چپراسی باہر ہے وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ نوٹ جیب میں ڈال لو گر نہ جائے اور یہ گٹھڑی اسے دے دو غلام محمد کو وہ اٹھا لے گا۔ سمجھے۔ غلام محمد۔" انہوں نے چپراسی کو آواز دی۔ "ایلی کو لے جاؤ۔"

ادھر کا نام سن کر شمیم تڑپ اٹھی۔ اس کی ناک پر حقارت آمیز جنبش ہوئی اور وہ گویا انتقاماً" پچھواڑے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس کے عقب میں کوٹھے پر وہ نوجوان کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ جھنجھوڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر میاں کھانس رہے تھے۔ کھڑکی میں بیگم مسکرا رہی تھی۔ پلنگ پر پڑی ہوئی بچی ماں کی طرف دیکھ کر رو رہی تھی اور ننھی فاطمہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے گرد و پیش کے حالات سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی ہو اور ایلی اچھلتے ہوئے دل سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

جونکیں اور جسم

بازاروں اور گلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر ایلی کا رہبر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

صحن میں ایک سیاہ فام بڑھیا جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ابلے ہوئے انڈے کی طرح جامد و ساکت تھا۔ پیشانی پر شکن تھے۔ انہیں داخل ہوتے دیکھ کر وہ رک گئی اور بے باکانہ طور پر انہیں گھورنے لگی۔ پھر کولہوں پر ہاتھ رکھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے ہاتھ کی جھاڑو سے تواضع کرنے کیلئے تیار ہو۔

"آ گئے تم۔" بڑھیا غرائی۔

"کون ہے ماں" اندر سے آواز آئی۔ ماں۔ ایلی گھبرا گیا کیا یہ اس کی ماں تھی۔ ماں

"تیرے ہی کچھ ہوں گے مجھے کیا مالوم۔" وہ غرائی۔

"اے گرمی کیوں کھا رہی ہے تو ماں۔"

"گرمی تو تیری ٹھنڈی ہونے میں نہیں آتی۔"

"تو تجھے کیا تکلیف ہے تو مکے کی حاجن بن کر بیٹھ رہ آرام سے۔"

"لہو لگا ہے تجھے لہو' اندھی ہو رہی ہے ہر آتے جاتے سے بخرملاتی ہے۔" بڑھیا چیخنے لگی۔

"اوہ غلام محمد تو ہے۔ آجا۔ اندر آجا۔" کمرے سے کسی نے جھانک کر کہا۔

"بس لگاتی جا تو سینے سے۔" بڑھیا غرائی۔ "اور تیرا کام ہی کیا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ گود میں کتیاں پال رہی ہوں۔ کتیا یہ سب اس حرامی ساجو کا کام ہے اس شکارن نے سب کے منہ لہو لگا دیا۔ لہو چوستی ہیں۔ لیکن کب تک۔" اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

"بڑی گرم ہے بڑھیا آج راجو۔" غلام محمد نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"اس کا کیا ہے۔ یونہی بولتی بکتی رہتی ہے۔" راجو نے نخرے سے جواب دیا۔ غلام محمد ا سے قریب تر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی چپراسی کی آ میں نہیں ہوتی۔

"ساجو کو کوستی ہے۔" وہ ہنسا "تجھے نہیں۔"

راجو نے ایک انداز سے زبان ہونٹوں میں لے لی اور دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی عور کی طرف دیکھا۔

دوسرے کونے میں ایک پست قد فربہ سیاہ فام عورت چارپائی پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ابھرے ابھرے گالوں میں یوں رینگ رہی تھی جیسے ڈبل روٹی میں سیاہ دراڑیں پڑی ہوں۔

"ابھی ساجو کا کیا دیکھا ہے اس بڑھیا نے۔" وہ بولی "ابھی تو دیکھے گی۔ غضب خدا کا ا گھی کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ سوکھے ٹکڑوں کے بغیر جی نہیں سکتی یہ۔"

ساجو کے ابھرے ہوئے گالوں اور موٹی انگلیوں پر گویا جلی حروف میں حرص و ہوس ک تھا۔ اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے جونکیں ہوں۔ نہ جانے کیوں ایل لگ رہا تھا۔ جیسے ساجو سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا ہو۔

اس کے قریب ہی سب سے چھوٹی بہن آجو بیٹھی تھی۔ جیسے کسی سوکھے درخت سے ٹ ہوئی شاخ ہو۔ اس کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی ہو۔ ہاتھ ٹنڈ سے تھے۔ جیسے انگلیاں ٹوٹی ہوں۔ عمر بہت چھوٹی تھی لیکن چہرا معصومیت سے ف تھا۔

ان تینوں میں سے صرف راجو ہی کو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جوانی کے سوا میں کیا تھا اور جوانی بھی وہ جو نسائیت اور معصومیت سے یکسر خالی تھی۔ ایلی نے وہ نوٹ جیب نکال کر راجو کے سامنے رکھ دیا۔ ساجو نے نوٹ دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

غلام محمد نوٹ دیکھ کر مسکرایا بولا "میرا حصہ ری۔"

"تیرا حصہ۔" راجو نے پیار بھری نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اپنی طرف یوں دیکھا اس کا حصہ سمجھا رہی ہو۔

"اور ہمارا نام ہی نہیں لیتا کوئی۔" زمین پر بیٹھے ہوئے سیلز مین نے اپنی چادر اتار کر مسکرا کر کہا۔

"بڑا سیٹھ مارا ہے نا اس لئے۔" ساجو نے ہاتھ چلا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔

دفعتاً ایلی کو یاد آیا ساجو۔ سلفے کی لٹ ساجو۔ سیٹھ گردھاری لال کی ساجو ——— اور اس نے پھر سے غور سے ساجو کی طرف دیکھا۔ کیا سیٹھ اس طرح کی داشتہ رکھتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے سامنے ننگی بیٹھنے سے نہیں گھبراتی۔ پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ دولت پور کی پٹاخہ راجو ——— اس کی دانست میں تو وہ چلا ہوا پٹاخہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات ——— اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لے اور صحن میں جا کر اس بڑھیا کے ساتھ مل کر چلائے۔

وہ اٹھ بیٹھا "میں اب جاتا ہوں۔"

"لے پان تو کھا جا۔" ساجو نے بازاری انداز میں للکارا۔

آجو سہم کر کونے میں لگ گئی اور راجو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ "یہاں آیا کرنا تیرا اپنا گھر ہے یہ۔"

باہر بڑھیا چیخ رہی تھی۔ "حرام کاری کی لت پڑی ہے۔ انہیں خون چوسنے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ جونکیں ہیں جونکیں۔"

نہ جانے بڑھیا کی بات نے ایلی پر کیا اثر کر دیا کہ گھر لوٹتے ہوئے تمام منظر ہی اس کی نگاہوں میں بدلا ہوا تھا۔ دوکانوں پر بیٹھے ہوئے لالے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے مکڑے شکار کی تاک میں بیٹھے ہوں۔ سودا بیچتے ہوئے بھابڑے چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی طرح مسکرا رہے تھے۔ تماش بینوں نے اپنی نگاہوں کے جال بچھا رکھے تھے۔

پنواڑیوں کی دوکان پر مسکراتے ہوئے کھجاتے ہوئے انسان پلپلے کیڑوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے لعاب دہن میں پھنسا رہے تھے۔ گھر میں علی احمد حساب کے رجسٹروں کا خون چوس رہے تھے اور کھڑکی میں کھڑی شمیم یوں حسرت سے ان ویران کوٹھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو چوبارے کے عقب میں صحرا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اسی بات کی متمنی ہو کہ کوئی جونک اپنے ہونٹ اس پر گاڑ دے۔ اس کے سر پر آسمان نیلے بازو پھیلائے ایک عظیم گدھ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ایک جونک ہو جسے خون چوسنے کے لئے کسی جسم کی تلاش ہو۔

جب ایلی گھر پہنچا تو بالا قیمتی پتھروں کا ڈبا کھولے بیٹھا تھا۔ "ہاں بھائی صاحب یہ لعل
چاندنی میں یہ پکھراج بدل جاتا ہے اور پھر بندر اس کی چمک کو دیکھ کر اسے اٹھالاتے ہیں۔
کے سفید مخملیں ہاتھ لعل کو یوں تھپک رہے تھے۔ جیسے اس کی سرخی چوس رہے ہوں اور
کے قریب وہ بوڑھی جونک اس کی چچی بالا پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب تھی
جونکیں جونکیں اور اجسام اور ارد گرد پھیلا ہوا چھایا ہوا ویرانہ۔

پھر ایلی کی زندگی کے بھیانک جمود میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ماموں زاد بھائی ر
اور یوسف تار کا کام سیکھنے کے لئے دو ماہ کے لئے دولت پور آ گئے۔ ان کے آنے سے ایلی
لئے اس صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا۔

کچھ اور بھی

سیٹھ جمنا داس کے یتیم خانے میں ایلی دن گزارتا۔ جس کا نام کالج رکھ دیا گیا تھا۔۔۔
شام کے وقت کالج سے سائیکل پر پاؤں مارتا ہوا گھر پہنچتا پھر رفیق اور یوسف کے ہمراہ بازار
کے چکر کاٹتا اور رات کو گھر آ کر پڑا رہتا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا صرف جونک اور
کے اجتماع کا نام نہ تھا وہاں جونکوں اور جسموں کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ بے نام سا کچھ جس
پاکیزگی کی جھلک تھی۔ مثلاً رفیق اور یوسف مثلاً سامنے چوبارے میں دو بلوریں پاؤں چست پا
یا وہ سیاہ آنکھ جو کبھی کبھار ان جنگلوں میں سے طلوع ہوتی تھی۔ جس کا مقصد نہ دیکھنا تھا نہ د
جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ حسین ہے کیف آور ہے اور چھلکتی ہے۔ ایلی اسے دیکھنا تھا
جتائے بغیر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے طرف مائل کرنے کی کوشش کے ب
اسے دیکھنا تھا۔ اور پھر اس اضطراب سے بچنے کے لئے جو اسے دیکھنے سے ایلی پر طاری ہوتا
وہ رفیق اور یوسف کو دیوانہ وار تلاش کرتا تھا۔

رفیق اور یوسف کے آنے سے اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ انہوں نے ان جانے میں ا
علی احمد کے گھر سے رہا سہا تعلق بھی توڑ دیا۔

شام کو کھانے کے بعد وہ چپکے سے ایلی سے کہتے ایلی چلو ذرا گھوم آئیں۔ پہلی مرتبہ
انہوں نے ایلی کو گھومنے کی دعوت دی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر دے لیکن اپنی طبی
کے خلاف وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

گھومنے پھرنے کے بعد جب وہ بڑے ڈاک خانے کی طرف سے مڑے تو وہ سوچنے لگا کہ
ادھر جانے کا مطلب۔ وہ تو گھومنے پھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں تو وہ بازار تھا۔ جہاں لوگ دیکھے
جانا پسند نہیں کرتے۔

وہ ایک دودھ کی دوکان پر رک گئے۔ "دودھ پیو گے ایلی۔؟" رفیق نے پوچھا۔

"نہیں۔" ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اچھا بھئی۔" رفیق بولا "پیو یا نہ پیو گھر جا کر بتانا نہیں۔"

"اور بتا بھی دو گے تو کیا ہے۔" یوسف اپنے سپاہیانہ انداز میں چلایا۔ "میرا تو بھوک کے
مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ ڈالنا میاں آدھ سیر دودھ میں دو بن۔" اور وہ دونوں اپنے پیالے
لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر رفیق نے یوسف کو اشارہ کیا۔

"توبہ ہے۔" یوسف چلایا "شمیم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کیسے کھا لیتے ہو تم ایلی۔"

"اسی ہاتھ سے بچوں کو پونچھتی ہے اور اسی ہاتھ سے آٹے کا پیڑا اٹھا لیتی ہے۔" رفیق نے
آہ بھری۔

"اب کیا دودھ بھی حرام کرو گے تم۔" یوسف چلایا۔

اس کے بعد ایلی کے لئے بھی شمیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مشکل ہو گیا اور وہ تینوں جھوٹ
موٹ گھومنے پھرنے کا بہانہ کر کے رات کے اندھیرے میں پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ بن
کھاتے اس وقت ایلی کے کان ملحق بازار پر لگے رہتے۔ جہاں سے سارنگی کے سر گونجتے اور طبلے
کی تھاپ کے ساتھ ساتھ ایلی کا دل دھک دھک کرتا اور وہ حسرت سے ان چوباروں کی طرف
دیکھتا جہاں جانا اس کے لئے ممنوع تھا اور جہاں جانے کی تمنا روز بہ روز اس کے دل میں بڑھتی جا
رہی تھی۔

سسٹر سارہ

رفیق اور یوسف کی ٹریننگ کلاس میں چار ایک عیسائی لڑکے بھی تھے، جن سے ان کی راہ و
رسم تھی۔ خصوصاً وکٹر اور جان سے تو ان کی دوستی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ وہ دولت پور کی
عیسائی لڑکیوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور رفیق لڑکیوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ
سے وہ انہیں اکثر دودھ پلانے کے لئے پہلوان کی دوکان

وکٹر اور جان آتے ہی رومانس کی بات چھیڑ دیتے۔ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد مر
رومانس تھا اور انہیں اس لئے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ روئے زمین پر رومانس کا سلسلہ ختم نہ ہو
دیں۔ وکٹر مس بھاگو اور مس پھتو کا دیوانہ تھا جان کو مس رجی مس چاند اور مس بالو کی گر
تھی اور وہ دونوں اس بات کے خواہش مند تھے کہ ہر جان پہچان والے کو عیسائی احاطے میں
جاکر اسے اپنی محبوبائیں دکھائیں بلکہ ان کو انٹروڈیوس کرائیں۔

دو ایک مرتبہ رفیق یوسف اور ایلی بھی عیسائی احاطے میں گئے تھے۔ انہوں نے مس جا
اور بھاگو کو دور سے دیکھا تھا اور مس پھتو سے ان کا تعارف بھی کرایا گیا تھا۔ ایلی کو عیا
احاطے میں جاکر بے حد مایوسی ہوئی تھی وہ سمجھتا تھا کہ یہ مسیں اگر میموں کی سی نہیں تو ان
لگ بھگ ضرور ہوں گی۔ لیکن رنگ کالا تھا۔ اور نقش بے حد بھدے تھے۔ شاید دا
تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا۔ لیکن ان کی آوازیں بے حد کرخت اور حرکات بھونڈی تھیں
عیسائی احاطے کو دیکھ کر ایلی کو جان اور وکٹر کی باتوں میں قطعی طور پر دلچسپی نہ رہی۔ بلکہ
یوسف اور رفیق پر غصہ آنے لگا۔

ایک روز وکٹر اور جان بھاگے بھاگے ان کے پاس آئے۔ آتے ہی انہوں نے ایک شو
کر دیا۔ ”حد ہو گئی یار۔“ وکٹر چلایا۔

”اتنی ونڈر فل گرل آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔“ جان بولا۔

”بالکل میڈونا کا سافیس ہے۔“ وکٹر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر آہ بھری۔

”اور پھر کس طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھتی ہے۔ ہرنی سی آنکھیں ہیں۔ بے وجنگ آ
جان نے کہا۔

”لیکن نہ جانے کس ظالم نے اسے تباہ کر دیا اسے بچہ ہو گیا۔ یعنی پروف مل گیا اور
راہبہ بننا پڑا۔“ وکٹر نے آہ بھری۔ ”اگر وہ راہب خانے میں نہ ہوتی تو ——“

وہ دونوں اس نئی راہبہ کیتھی کے لئے پاگل ہو رہے تھے۔

کئی ایک دن تک وہ کیتھی کے سوا کوئی تذکرہ نہ کر سکے رفیق اور یوسف کا اشتیاق بڑ
حتیٰ کہ یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ خود کیتھی کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔

نہ جانے کیتھی کیسی ہو گی۔ ایلی سوچتا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ اتنی ہی خوبصورت
بہر حال ایلی ان کی باتیں سنا کرتا۔ کیتھی کو دیکھنے کا شوق رفیق کے دل میں اس قدر بڑھ

نے ایک روز صاف کہہ دیا۔ ”یار ہمیں بھی دکھاؤ۔“

ایلی کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ بڑا عاشق مزاج تو دیکھو۔

”دیکھ لیں گے کیا حرج ہے۔“ یوسف بولا۔

”لیکن کیا فائدہ۔“ وکٹر چلایا ”خالی دیکھنے سے کیا فائدہ۔“

”وہ تو ایک ابھتریل چیز ہے۔ ابھتریل“ جان آہیں بھرتا۔

”کیا واقعی۔“ رفیق اور یوسف حیرانی سے پوچھتے۔

”وہ تو جیسے میڈونا کی جیتی جاگتی مورت ہے۔“ وکٹر چلاتا۔

”ہائے میں کیا کروں۔“ جان آہ بھرتا۔ ”وہ تو کسی کی طرف دیکھتی نہیں۔ مسکاتی نہیں۔
بات نہیں کرتی بیچاری بڑی دکھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔“

”جی چاہتا ہے۔ جس نے کیتھی کو خراب کیا ہے اسے جان سے مار دوں“ وکٹر گھونسا چلاتا
”بیچاری کو بچہ ہو گیا۔ اس لئے راہبہ بننا پڑا۔ ورنہ راہب خانے میں نہ ہوتی تو ہم اس سے ملا
کرتے۔ بس پروف دے دیا —— ورنہ“

پھر ایک روز جان اور وکٹر کے اصرار پر رفیق یوسف اور ایلی کیتھی کو دیکھنے کے لئے گرجا گھر
گئے۔ اس روز رفیق کی آنکھوں میں گلابی بوندیاں اڑ رہی تھیں۔ یوسف کچھ زیادہ ہی قلانچیں
بھر رہا تھا اور ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہو رہا تھا —— گرجے میں ہجوم تھا۔ عیسائی احاطے کے
نوجوان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راہب خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عیسائی لڑکیاں
ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ بوڑھا پادری وزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً راہب خانے کا دروازہ کھلا۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سات راہب لڑکیاں نگاہیں
جھکائے گرجے میں داخل ہوئیں —— ”وہ ہے وہ۔“ جان نے دبی آواز میں کہا۔ جوانوں کی
بھوکی نگاہیں آخری لڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ ہونٹوں
سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سر لٹکا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہی
تھی۔

”ہائیں“ دفعتاً رفیق کی چیخ سی نکل گئی اور وہ حسب دستور ”سی سی“ کرنے لگا جیسے کہ
اس کی عادت تھی۔ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ادھر سے یوسف زیر لب چلایا ”وہی
تو ہے یہ سارہ —— سارا —— ایلی۔“ ایلی نے غور سے کیتھی کی طرف دیکھا۔ سارا کی

آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ مسٹر نے آکر اسے تھام لیا۔

اندھا کنواں

پھر گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو گیا۔ یوسف اور رفیق کی ٹریننگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ علی احمد سے اجازت لے کر ایلی رفیق اور یوسف کے ساتھ علی پور آ گیا۔

گرمی کی چھٹیوں میں محلے کی زندگی میں ایک عجیب و غریب گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ محلے کے ملازم پیشہ لوگ انہی دنوں چھٹی لے کر آیا کرتے تھے تاکہ محلے والوں سے میل ملاپ قائم رہے۔ اگر وہ خود چھٹی پر نہ آ سکتے تو وہ ایک ماہ کے لئے بچوں کو ضرور علی پور بھیج دیتے۔ اتنی دیر باہر رہنے کے بعد عورتیں نرالی سج دھج کے ساتھ علی پور میں داخل ہوتیں اور اپنے نئے حاصل کردہ فیشن اور خیالات کو اک شان سے محلے کے عوام کے سامنے پیش کرتیں۔ اپنی عظمت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

"نہ بہن بچے کو ڈرایا نہیں کرتے اس طرح بچے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں میں تو پیٹ لیتی ہوں۔ اپنے سیدی کو لیکن ڈرانا ——— اونہوں!"

دوسری بولتی نہ بہن یہ چمکدار ساٹن نہ چلے گی اس شلوار کے ساتھ۔ اب تو بہن چمکدار چیز کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جمپی بوسکی کی قمیضیں سلوائی ہیں۔

جوان لڑکیاں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر محلے کی کھڑکیوں کے سامنے اپنے لباس کی نمائش کرتیں۔ لڑکے اپنے دوستوں سے مل کر نئی سیکھی ہوئی باتوں کا ریکارڈ چلاتے۔

محلے کے بوڑھے ان کی باتیں سن کر مسکراتے جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوں پھر وہ کھنکارتے اور زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے مسجد کا رخ کرتے۔

بوڑھیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتیں اور پھر "توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔" کہتی ہوئیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتیں۔

محلے کی جوان لڑکیاں حسرت بھری نگاہوں سے ان نوواردوں کی طرف دیکھتیں ——— ان کا جی چاہتا کہ باتیں کرتی رہیں اور وہ سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں گویا شوق کے دیئے روشن ہو جاتے۔

اس لحاظ سے محلہ ہر سال موسم گرما میں کینچلی بدلا کرتا تھا۔ جس طرح خزاں میں درخت پرانے پتے گرا دیتے ہیں اور نیا سبز جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اس کے باوجود آصفی محلے کی زندگی بنیادی طور پر ویسے ہی اپنے صدیوں پرانے محور پر گھومتی رہتی محلے میں تبدیلی آتی تو تھی۔ لیکن کچھوا چال سے کسی کیڑے کے رینگنے کے مترادف تھی۔ درحقیقت اپنی مخصوص کہنہ کج رفتاری کی وجہ سے وہ محلہ لوگوں کو پیارا تھا۔ چونکہ وہاں جا کر وہ اپنے عظمت جتا سکتے تھے۔ نئے حاصل شدہ خیالات سے محلے والوں کو مستفید کرنے کے عمل میں یہ خوش فہمی دل میں رچا سکتے تھے کہ وہ نئے خیالات سے کماحقہ واقف ہیں۔ درحقیقت آصفی محلہ وہ اندھا کنواں تھا۔ جہاں کوئی سمندری مینڈک داخل نہ ہوا تھا۔ جہاں جوہڑ کے مینڈک پھدکتے تھے اور وہ کبھی اس قدر نہ پھولے تھے کہ اپنے آپ میں سما نہ سکیں۔

سٹیشن کے قریب انہیں رضا مل گیا۔ "بھئی واہ۔" وہ چلایا۔ "آ گئے جناب۔ بھئی کیوں نہ آتے۔ اب بھی نہ آتے تو کب آتے ساون آیا اور مینڈک نہ ٹرائیں۔"

یہ کہہ کر وہ ایلی سے بات کئے بغیر لاٹھی گھماتا ہوا کچہری کی طرف چل پڑا۔ ابھی آتا ہوں ذرا کچہری جانا ہے۔" وہ کھٹ کھٹ چلتے ہوئے چلایا۔ "ہو گی ملاقات دوکان پر۔"

برساتی نالے کے پل پر انہیں چچا عماد ملے "ہوں۔" انہوں نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا "آ گئی یہ بھجن منڈلی۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کب سے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔" یہ کہہ کر زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے وہ سٹیشن کی طرف چل دیئے۔

"اس اللہ لوگ کو مندر کی گھنٹیوں کی کیا سوجھی۔" ایلی نے رفیق سے کہا۔

"بس جو منہ میں آیا چلا دیا۔" یوسف نے بے پروائی سے کہا۔

"کوئی بات ضرور ہے۔" رفیق اپنے بھیگے بھیگے انداز میں بولا۔

چوراہے کے قریب چچی اماں کو دیکھ کر ایلی نے جھک کر سلام کیا۔ "جیتے رہو۔" وہ بولی چھٹی پر آئے ہو نا۔ اچھا ہے۔ اچھا کیا۔ دیکھ لو تم بھی رونق چار دن کے لئے دن ہیں ہمارے۔"

چاچی اماں کی بات سن کر ان کا ماتھا ٹھنکا ضرور کوئی بات ہے۔ نہ جانے کیا ہے۔ مگر ہے ضرور جبھی تو وہ سب اشارتا" انہیں سمجھا رہے تھے کچھ رفیق بھی گھبرا گیا۔ لیکن یوسف قہقہے مار رہنستا رہا "ارے یار خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔"

ڈیوڑھی میں ارجمند نے اسے پکڑ لیا "ارے تم ہو ایلی تم۔ ارے پٹ گئے۔ تباہ ہو گئے برباد ہو گئے۔" پھر اس نے رفیق اور یوسف کو دیکھا اور دفعتاً" پہلو بدلا۔ پہلو بدلنے میں ارجمند کو کمال حاصل تھا۔

"السلام علیکم بھائی صاحب مزاج اچھے ہیں صاحب اپنا حال تو تباہ ہو رہا ہے اس ایلی کے کم بخت منہ موڑتا ہے تو پھر ادھر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور فرمایئے آپ تو خیریت سے ہیں نا۔"

رفیق مسکرا کر آگے کو چل دیا۔ تو ارجمند نے ایلی کو رکنے کا اشارہ کیا "ابے ٹھہر بے مجھ سے ملے بغیر دادی اماں کی جھولی میں کیسے جا سکے گا تو۔"

وہ اور وہ

رفیق اور یوسف کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارنے شروع کر دیئے۔ "تباہی بربادی۔ تباہی بربادی۔ ارے یار وہ سارا اینٹ البحر کا دفتر بے معنی ہو کر رہ گیا وہ انگریزی خاک میں مل گیا اور یہ پریم ٹونا اور پریم پھریرا۔ اس نے اپنی بانسری اور ریشمیں رومال کی طرف اشارہ کر کے کہا "سب فیل" وہ تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی نہ جانے وہ ناگ کس بین پر مست ہو۔ ارے ارے کوئی ناگ سا ناگ ہے۔ اف' اف' اف کی پھبن ہے۔ کیا دم خم ہے۔ کیا ٹھسا ہے۔ ایک نگاہ دیکھ لے تو دن بھر سرور نہیں جاتا۔ اور سانورا رنگ جیسی گوکل کا کنہیا ہو۔ بولو وہاں اس خاکسار کی بانسری کیا کر سکتی ہے۔ بیچاری" "آخر بات بھی کرو گے۔" ایلی نے بگڑ کر پوچھا۔

"لو بھئی۔" ارجمند نے سر پیٹ لیا "اور یہ کیا بکواس کر رہا ہوں۔ میاں دیکھو گے تو اڑ جائیں گے وہ چیز ہے جو دیکھے بنا تصور میں نہیں لائی جا سکتی۔ اللہ اللہ کیا چیز ہے۔ خدا کی اس مسجد پر ایک ——— بھرپور نگاہ ڈال دے تو ایک آن میں سالی آپ ہی بت بن جائے لو جو کرنا ہے۔ ہئے۔ ہئے۔"

ضیا کو آتے ہوئے دیکھ کر ارجمند ایک ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ "لو بھئی۔" وہ زیر لب بولا۔ "آ گئی بھٹنڈا لائن لہٰذا اپنی گاڑی رک گئی۔"

اپن کی تو مین لائن ہے بھائی۔ سیدھے روٹ پر چلنا جانتے ہیں ہم۔ ہمیں تو جو واسطہ ہے غلانوں کی بات بھٹنڈا لائن سے پوچھو۔" ضیا حسب معمول آنکھوں میں مسکرانے لگا۔

"ان کی پانچوں گھی میں ہیں آج کل۔" ارجمند بولا "اور ہمارا سر کڑھائی میں ہے۔"

"کیوں بھئی یہ ٹھیک کہتا ہے ارجمند ———" ایلی نے بات سمجھے بغیر ضیا سے پوچھا۔

"بکتا ہے۔" ضیا ہنسا "وہ تو میرا بھائی بن گیا ہے۔ ایمان سے۔" اور پھر چوگان کی طرف چل پڑا۔

"ہے۔" ارجمند نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ "وہ ہماری بہن ہی بن جاتی۔" وہ ضیا کی طرف دیکھ کر چلایا۔ پھر ایلی سے مخاطب ہو کر بولا "اچھا بیٹا تو جاؤ دادی اماں کے چرن چھو آؤ۔ خاکسار کچی حویلی کی لالٹین کے نیچے ڈیوٹی دے رہا ہو گا۔ دادی اماں کے بنے ہوئے لڈو کھانے نہ بیٹھ جانا ورنہ خاکسار کی آہ پڑے گی تم پر۔"

ایلی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھی اور وہ کون تھا اور محلے والوں کے اوسان کیوں خطا ہو رہے تھے ارجمند اور ضیا کی تو اور بات تھی مگر چچی اماں اور چچا عماد ظاہر تھا کہ چچا عماد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ایسا کون تھا وہ۔

چوگان میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا مگر محلے والیوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا اور محلے والیاں حسب دستور اسے دعائیں دے رہی تھیں۔

"اللہ بڑا مرتبہ نصیب کرے ———

"کون آیا ہے چاچی۔" ———

"اے ہے اپنا ایلی آیا ہے۔"

"جیتا رہے بی بی ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔"

ڈیوڑھی میں جا کر وہ ڈر گیا اس کے سامنے نذیراں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "تم آ گئے۔ اب چلے نہ جانا"۔

"ہائے کون ہے؟" دادی اماں چلائی۔ "دیکھ تو سیڑھیوں میں لڑکی جیسے کسی کی پٹائی ہو رہی ہو۔ ہائیں ایلی تو ہے۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ کیا ایسے چڑھا کرتے ہیں سیڑھیاں۔ کب آیا تو۔ راضی تو رہا نا۔ علی احمد کیسا ہے۔ بچے کیسے ہیں۔ وہ خود نہیں آیا چھٹیاں کب ہوں گی اسے؟"

سعیدہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے دادی اماں کے پاس بیٹھی تھی۔ "اماں سے ملا تو دادی لال نے کہا۔ "وہ ادھر ہی رہتی ہے۔ فرحت کے پاس۔ اچھا مل لیجو جا کر ذرا بیٹھ تو۔ اب تو اتنا

بڑا ہو گیا ہے تو منہ پر داڑھی نکل رہی ہے۔" دادی اماں نے حیرانی سے اس کا جائزہ لیا
کھائے گا۔ تیرے لئے بہت کچھ رکھا ہوا ہے۔ میں نے ہاں۔ اے حمیدہ رشیدہ لڑکیو، تم کیا
رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔" وہ ان دو لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جو دروازے میں
غور سے ایلی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رشیدہ اور حمیدہ سیدہ کی بہن نیاز کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھی اور
دونوں دادی اماں کے پاس آ گئی تھیں "جا رشیدہ جا کر وہ کمرہ صاف کر دے۔ حمیدہ تجھے تو
ہے ابھی برتن مانجھنے ہیں۔"

"اچھا ایلی۔" دادی اماں بولی "علی احمد نے میرا خرچ نہ بھیجا۔ کیا اسے خود خیال نہیں
اے ہے میں کیوں یاد کراؤں۔ خدا نہ کرے۔ مجھے کوئی بے اعتباری ہے۔" ایلی نے بڑھ کر
اماں کو گود میں لے لیا۔ "اے ہے چھوڑ۔" وہ چلائی۔ "جیسے کوئی دس سال کی بچی ہو تو
ہڈیاں توڑ دے گا۔ توبہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے بڑے ہو جاتے ہیں یہ ہاتھوں کے جنے۔ اچھا
اور بات سنا۔ وہاں کیسے رہتا ہے تو۔" وہ بولے جا رہی تھی اور ایلی سوچ رہا تھا کتنی پیاری
دادی اماں۔ اس کے پاس آ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے بچہ گھونسلے میں آ گیا ہو۔ دادی اماں کے پاس
کر وہ بھول جاتا کہ ارجمند کچی حویلی میں اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ کون تھا جسے ضیا نے بلا
لیا ہے۔ وہ سانوری کون ہے جو کسی بین پر مست نہیں ہوتی۔

بیگم

نہ جانے وہ کب تک دادی اماں کی ہڈیوں سے چمٹ کر بیٹھا رہا حتیٰ کہ ہاجرہ آ گئی۔
"ایلی آیا ہے۔" ہاجرہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں "ایلی آ فرحت تیرا انتظار کر رہی ہے۔"
"جا مل آ۔" دادی اماں بولی۔ اور وہ اٹھ کر اماں کے ساتھ فرحت کی طرف چل پڑا۔
ابھی وہ فرحت سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ اوپر کی سیڑھیوں میں شور ہوا۔ "سنا ہے ایلی
ہے۔" شہزاد کی آواز دور سے گونجی۔ شہزاد کی آواز کی سرتال ہی نرالی تھی۔ اس کا ہر انداز
والیوں سے مختلف تھا۔ ایلی نے شوق سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سامنے شہزاد کھڑی مسکرا
تھی۔ مونگیا گھگھری کے پٹ پورے طور پر کھل چکے تھے۔
شہزاد کی ہر بات میں عورت اور لڑکی کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو

کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھیلنے پر
اکساتی تھی۔
ایلی نے شہزاد کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ "جی ہاں۔" وہ بولا۔ شہزاد کے رو برو اس کے جسم و
روح کارواں رواں جی ہاں کہہ کر سر جھکا لیا کرتا تھا۔
"وہ بلاتے ہیں تم کو چائے پر۔" شہزاد مسکرائی۔ "چلو میرے ساتھ۔" اور ایلی چپ چاپ
اس کے ساتھ ہو لیا۔
"تم آ گئے" شریف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چھت پر لگی ہوئی
تھیں۔ البتہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ایلی کی نگاہ میں شریف کس قدر خوش نصیب تھا۔ جسے
شہزاد نے اپنایا تھا۔ جس کی زندگی شہزاد کی روشنی سے منور تھی۔ لیکن بظاہر شریف پر اس کا کوئی
اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی انور کے خیال میں ویسے ہی مست رہتا تھا۔ کتنا وفا شعار سچا عاشق ہے۔
اس کی محبت کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں شہزاد سی مونگیا گھگھری کھل کر
بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔
"ہوں تم کیسے ہو ایلی۔" ——— ایک باوقار حسین عورت اس کے رو برو آ کھڑی ہوئی۔
ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ "سلام کہتا ہوں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔
"یہ ایلی ہے اماں۔" شہزاد نے اس عورت سے کہا۔
"مجھے یاد ہے۔" وہ بولی۔ "برات کے دن اندر آیا تھا۔ وہی تو ہے۔" ایلی نے اس کی
طرف ڈرتے ہوئے دیکھا۔ اونچا لمبا قد۔ فربہ جسم اور پر وقار چہرہ۔ اس کے خدوخال میں حسن و
وقار کی عجیب آمیزش تھی۔ آنکھوں میں حکومت کی چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا۔ اس کی
انگلیوں میں عجیب قسم کی انگوٹھیاں تھیں۔ جن میں نگ کلی کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔
"بیٹھ جاؤ۔" اس نے گویا ایلی کو ڈانٹا سنا۔ تیرے باپ کا کیا حال ہے۔ اب تو کشمیر کے سیب
سے بھر گیا ہو گا اس کا دل کوئی نئی نویلی چڑھی ہے نگاہ میں۔"
"جی جی۔" ایلی بن سوچے سمجھے کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا وہ اس کے رو برو
بیٹھا رہے اور انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہے۔ اس وقت وہ شہزاد کو بھی بھول چکا تھا۔ اور
شریف تو بالکل ہی ذہن سے اتر چکا تھا۔
پھر ملحقہ کمرے سے کسی نے آواز دی اور بیگم بولی "پھر بیٹھوں گی کسی وقت تیرے پاس۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور طلسم ٹوٹ گیا۔

ملحقہ کمرے سے شہزاد کی سی کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں او روہ محسوس کر
تھا۔ جیسے چمن میں بہار آگئی ہو۔ لیکن وہ چمن ایلی کے لئے ممنوع تھا۔ ممنوع نہ بھی ہوتا تو ہم
اس کی جرات نہ ہوتی کہ وہاں جاکر دیکھتا کہ وہ آوازیں کن کی تھیں۔ جرات ہوتی بھی کیسے
اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ چہرہ کارٹون سا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا۔ رنگ
تھا۔ کوئی بھی تو ایسی خصوصیت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو درخور اعتنا سمجھ
امید رچاتا اور جرأت کو کام میں لاتا۔

سامنے شریف لیٹا ہوا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ نگاہیں
کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ ایلی دنیا میں کھویا ہوا ہے۔ اور اس کی بات
نہیں سن رہا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی اس کی بات سنے۔ اسے تو کہنے سے غرض تھی
اور بات کہنے کے لئے اس نے ایلی کو چن لیا تھا اور ایلی سننے کا انداز قائم کئے کچھ سوچ رہا تھا
اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ اپنے محسوسات کو اپنا کے
شاید اسے ندامت ہوتی اس لئے اس نے اپنے محسوسات کو واضح طور پر کبھی نہ اپنایا تھا اور قریب
ہی کسی چمن میں رنگین چڑیاں چہک رہی تھیں دور کچی حویلی کی لالٹین کے نیچے انکرائنڈی کا
شیدائی پریم سندیس تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کار اور خاکسار

اگلے روز صبح سویرے ہی ارجمند آگیا۔ "اویزید کے چیلے۔" وہ آتے ہی چلایا "کل سارا دن
مجھے کچی حویلی کے صحرا میں پیاسا مارا اور خود گوکل کے بن میں سانوری سے رنگ
پچکاری کھیلنے میں مصروف رہا۔ تف ہے تیری دوستی پر۔"

جب ایلی نے سانوری کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ارجمند قہقہہ مار کر ہنس پڑا
"ہمیں بناتا ہے یار ہمیں جنہوں نے پریم دویا پر بالپن ہی میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ اجی وہ
جنہوں نے پانی پت کی ڈسپنسری کی میزوں پر پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کی ہوئی ہے۔ کہو تو سند دکھا
دیں۔ سند یافتہ لوگوں کو چٹکیوں میں اڑانا آسان نہیں۔ اچھا تو بیٹا کل کی رپورٹ دو۔ کونسے
مراحل طے کر لئے اور کون کونسے باقی ہیں۔ لیکن یار کیا رنگ ہے کیا انداز پایا ہے۔ اور پھر

اللہ حساس اور سمجھدار۔ ہلکی سی جنبش بھی نوٹ کئے بغیر نہیں رہتی۔ رومال کی ہلکی سی جنبش کی
یوں۔ مطلب خاکسار ابھی حاضر ہوا۔ فوراً بات پالی لیکن کیا مجال کہ چتون سے ظاہر ہو۔ صرف
ایک لطیف مسکراہٹ اور پھر فوراً جتا بھی دیا۔ ہم سمجھ گئے۔ خاکسار ہو آئے اجازت ہے جب
تک ہمیں چوگان سے کوئی دلچسپی نہیں "اور پھر چوگان سے کوئی دلچسپی نہیں" اور پھر چوگان سے
منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک خاکسار واپس نہ آیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ واہ واہ کیا
ذہانت ہے۔ جتنی بڑی بے پروا ہے۔ اتنی ہی چھوٹی حساس ہے۔ واہ واہ اپنا انکرائنڈی وہ چلا ہے
کہ بس کیا بتاؤں۔" وہ رک گیا۔

"لیکن سب بیکار ہے۔" اس نے پینترا بدلا "سب بیکار انکرائنڈی کا ہوش بھی رہا ہو۔ کس
کافر کو ہوش رہے گا۔ میاں کب تک مچھلی کانٹے پر لگی تڑپتی رہے اب تو وقت ہے کہ سرکار
ڈوری کھینچیں۔ لیکن سرکار بھی کیا کریں ایلی وہ تو خود مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں وہ
کیسے کھینچیں اور خاکسار کے لئے یہ رنگ محل ممنوع ہوا۔ وہاں جائے تو کس بہانے جائے اسی فکر
میں تھا خاکسار کہ اللہ نے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا یعنی تم آگئے اور تم یہاں پہنچتے ہی یزید بن کر رہ
گئے۔ ہئے ہئے۔"

سانورے کنہیا

"ہاہاہا" دفعتاً" ارجمند چیخ کر بولا۔ "ہم اپنی رام کہانی میں لگے ہیں اور وہ دیکھو وہ۔ اس
کھڑکی میں ارے اندھے وہ والی جو اندھیری ڈیوڑھی کے اوپر کھلتی ہے۔ نہ جانے سانورے کنہیا
کب سے اپنی گوپیوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اے ٹھہر تو۔ اتنا بے صبر کیوں ہوا جا رہا ہے۔
مجھے پرنام تو کر لینے دے۔" اور وہ درشن کے بن ترس گئی اکھیاں گنگنانے اور رومال ہلانے لگا۔

کھڑکی میں ایک اونچی لمبی لڑکی لمبی لمبی پلکوں سے سیاہ خوابیدہ آنکھوں کو ڈھانپے کھڑی تھی۔
اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرے پر انوکھی سی ریشمیں ملاحت کا شفاف سا نقاب پڑا تھا۔ جیسے
کوئی سنڈریلا ہاتھ میں شیشے کا سلیپر لئے حیران کھڑی ہو۔ "لیکن یہ ہے کون؟" ایلی چلایا۔

"کیا واقعی۔" ارجمند نے حیرانی سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بنا رہا ہے
ہمیں۔ ارے بھائی یہ سب تمہاری اس مونگیا گٹھڑی سے نکلے ہوئے فتنے ہیں۔ جب سے وہ
پنڈورا یہاں آئی ہے رنگین مصیبتوں کا ایک صندوق کھل گیا ہے۔ اب کر لو جو کرنا ہے اور ابھی

دیکھا گیا ہے ابھی تو وہ گلاب کا پھول اور رس گلا بھی ہیں۔ اف! وہ گلاب کی کلی جب کھلے
دنیا پر رنگ کی وہ قیامت ٹوٹے گی کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ چھ سال کی عمر میں یہ کیفیت
کہ مسکراتی ہے تو فضا میں قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ان کا بھائی شوکت جیسے موم
ہو۔ ضیا تو اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے بد معاشی سے توبہ کر چکا ہے اور جمیل پیڑے کھلانے
شغل کو بھول چکا ہے خیر اپنے کو تو بھٹنڈا لائن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپن کو تو بار یہ ساونو
کنہیا لے ڈوبے اور حضور گاتے بھی ہیں واہ وا کیا گاتے ہیں۔ چار ایک دن ہوئے بھجن منڈلی
براجمان ہوئے تھے۔ وہ رنگ جمایا کہ بس کیا پوچھتے ہو۔ محلے کے لڑکوں کے دل کانوں میں
ہو گئے اور نبضوں نے وہ تال دی کہ بس اے ہے۔" وہ چھاتی پر دو ہتڑ مارنے لگا۔

عین اس وقت سیڑھیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی نیزے پر ناچ رہا ہو اور
چھم سے شہزاد داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر اڑ رہا تھا۔ منہ پر
جھلملا رہی تھی۔ "ایلی ایلی۔" وہ بولی "کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے سامنے رکھ
چلو۔ جلدی آؤ۔" یہ کہہ کر وہ واپس دوڑ گئی۔

ارجمند از سرنو سر پیٹنے لگا "ہائے اللہ کیا کریں ہم کدھر جائیں ہمیں کوئی نہیں بلاتا جا
کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ میاں کون ہو۔ سیر ہو یا پاؤ ہو۔ اچھا بھئی جاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ اپن کا
ہے۔ جیسے تیسے وقت بتالیں گے بس یہی فرق ہے نا کہ تم سنگ ساتھی ہو اور ہم پردیسی۔ پر یا
رکھو دوست۔ سنگ ساتھی کو کبھی وہ رتبہ نہیں ملا جو پردیسی کو ملتا ہے۔ آخر میں بازی پردیسی
کے ہاتھ میں رہتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک حریفانہ سلوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ روز صبح سویرے چائے کیلئے شریف کی طرف سے بلاوا آ
پہلے فضا میں گھنگرو بجتے پھر چھم سے شہزاد اتر آتی۔ دوپٹہ اس کے شانوں پر یوں لٹکتا جیسے
ہوائی ڈاک کا اشتہار ہو۔ بانہیں فضا میں لہراتیں جیسے رفتار ظاہر کرنے کے لئے مصور نے
خطوط لگا دیئے ہوں۔ "وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ ہنستی ـــــ گھنٹیاں بجتیں۔

چائے پر شریف اسی طرح چھت پر نگاہیں گاڑے رہتا اور ہر دو منٹ کے بعد ایک لمبی آ
بھرتا اور پھر جوش میں دبی آواز سے کہتا "کسی سے محبت کرو ایلی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو بس مح
کرو۔"

دوپہر کو جمیل شوکت کو بلا لاتا ہے۔ وہ تینوں برساتی میں بیٹھ کر گپیں اڑاتے۔ جس

دوران میں ایلی اس آئینے کی طرف دیکھتا رہتا جو جمیل نے ایسے زاویئے پر لگا رکھا تھا کہ نیچے سے
آتا ہوا ہر شخص پہلے ہی نظر آجائے۔

جمیل شوکت سے باتوں میں مشغول رہتا۔ شوکت نہایت معصومیت سے جمیل کی طرف
دیکھتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ روز اسے اتنی مٹھائی کیوں کھلاتا ہے اور ایلی اس آئینہ پر کیوں
جھکا رہتا ہے۔

دوپہر کے وقت شہزاد کی والدہ آجاتی جسے سب بیگم کہتے تھے اور وہ تھی بھی تو بیگم۔ ایلی اکثر
محسوس کرتا تھا کہ اس کے سر پر چھوٹا سا تاج بھی ہونا چاہئے تھا۔ جیسے بیگمات پہنتی ہیں۔ اس کے
انداز میں بلا کا رعب تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی۔

بیگم کو آصفی محلہ بالکل ناپسند تھا "یہ کیا ہیں تمہارے محلے کے مکانات۔" وہ ایلی سے کہتی
"اندھیرے کونے اجڑے ہوئے چوبارے جیسے گلی سڑی پیاز کے چھلکے ہوں ایک دوسرے کے
اوپر۔ دوسرا تیسرے کے اوپر توبہ ہے ہمارے یہاں تو صاف ستھرے کمرے ہوتے ہیں اور شہزاد
کے ابا۔ تو ایک دن بھی نہ ٹھہریں یہاں بڑے صفائی پسند ہیں وہ اور یہ جو تمہاری محلہ والیاں پکاتی
ہیں۔ جسے تم لوگ کھانا کہتے ہو۔ ان کے سامنے رکھا جائے تو طوفان اٹھادیں۔ تمہارے محلے کے
مرد تو بدھو نہیں بدھو۔ مردوں کی سی بات نہیں ان میں۔ کبھی ہمارے یہاں آؤ تو تمہیں دکھاؤں
میں۔"

ایلی مسحور ہو کر بیگم کی باتیں سنتا۔ اس وقت اسکی نگاہوں میں نور پور کا وسیع میدان پھیل
جاتا اور قلعے کے برج ابھرتے اور وسیع فراخ کمرے کھلتے اور بالاخر ایک زرد مینڈک اور دو حنائی
انگلیاں اس کی طرف بڑھتیں۔

پھر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے کے لئے مغرب میں اترتا تو ایلی کوٹھے پر چڑھ
جاتا اور کتاب ہاتھ میں لے کر وہاں ٹہلتا جیسے سبق یاد کر رہا ہو تاکہ متصل کوٹھے پر سانوری کو دیکھ
سکے اور متصل کوٹھے پر ہلکے رنگوں میں ملبوس سانوری یوں ٹہلتی جیسے اسے ایلی کی موجودگی کا
احساس ہی نہ ہو۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں دور کسی افق پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس کا دوپٹہ یوں لٹکتا جیسے تاج
پوشی کی تصاویر میں شہزادیوں کے پیچھے ریشمیں کپڑے لٹکتے ہیں۔ ٹک ٹک ٹک۔ اس کی اونچی
ایڑی والی گرگابی بلمپت لے میں تال دیتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ گردو پیش کے دھندلے

مکانات سبز پیراہن پہن لیتے اور چوبارے یوں دکھائی دیتے جیسے تنکوں سے بنے ہوئے
جھونپڑے ہوں اور پھر دور سے بانسری کی سریں بلند ہوتیں اور کرشن کنہیا گوکل کے
ٹہلتے اور ان کے چہرے کے رشمیں سانولے پن میں اشیر باد کی مدھم روشنی چمکتی اور
چوگان میں کوئی راکشش ارجمند کے روپ میں چلاتا۔ "نند گاؤں والے اب او گوکل کے
لو بھئی یہ حضرت ہاتھ سے گئے۔ نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ نہیں رہا
جتاؤ۔ اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر۔"

گل حکمت کا متوالا

پھر ـ بیٹھے رفیق کو سوجھی۔ رفیق کو ہمیشہ ہی سوجھا کرتی تھیں اگرچہ بظاہر وہ
خاموش لڑکا تھا۔ رفیق کی تمام تر قوت اس کی آنکھوں اور گالوں میں سمٹ کر آ گئی تھی۔
تک زبان کا تعلق تھا وہ گونگا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بات بھی کرو تو وہ مسکرا دیتا اس کی مسکرا
میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی بات کرو جو اسے ناپسند ہو تو اس کے ہونٹ ہلکے سے کھل جا
اور اس کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ایسی بات چھیڑ دو جو اس کے لئے تکلیف
ہو تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے اُف اُف کی آواز نکلتی جیسے اس نے کوئی گرم چیز منہ
ڈال لی ہو اور اس کی حرکات اضطرابی رنگ اختیار کر لیتیں۔

بے زبان ہونے کے باوجود رفیق بے حد حساس تھا۔ اس کی طبیعت میں دبی دبی ر
تھی۔ صبح سویرے ہی وہ شریف کے یہاں جا پہنچتا "چچی کوئی چیز تو نہیں منگانی۔" اور پھر جب
رنگین اشتہار کی طرح اس کے سامنے آتی تو وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ جاتا اس کی آنکھیں
جاتیں اور کوئی رنگین سر گلے میں پھنس جاتا شدت تاثر سے وہ اُف اُف سی سی کرتا آنکھوں
بوندا باندی اور تیز ہو جاتی۔ رفیق دبی دبی آنچ کو پسند کرتا تھا۔ وہ گل حکمت کا متوالا تھا
بھڑک کر جلنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کردار میں دو پہلو نمایاں تھے رنگینی اور جھجک

آن ملا تھا

اس کے باوجود رفیق کو اکثر سوجھتی تھیں۔ اب کی بار اسے لاجواب بات سوجھی اور
کے لڑکے بات سن کر متفقہ طور پر جھومنے لگے۔

"میں کہتا ہوں۔" وہ بولا ——— "اگر ہم ایک ڈرامہ کھیلیں تو۔"
"ڈرامہ۔" ایلی کے دل میں گویا ایک رنگین ہوائی چل گئی۔
"ڈرامہ آہا۔ کیا بات ہے۔" ارجمند چلایا۔ کرشن کنہیا ٹھیک رہے گا۔ آہاہا ادھر گائیاں ادھر
گوپیاں اور بیچ۔ میں بندرا بن کا گوکل۔"
"ڈرامہ۔" صفدر نے ایک لمبی آہ بھری اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر شانے پھیلا کر گنگنانے
لگا۔ "حافظ خدا تمہارا۔"
یوسف سپاہیانہ ہنسی ہنسا "یہ بھی کر دیکھو۔" وہ بولا
رضا نے اپنی لنگڑی ٹانگ جھلا کر کہا "میاں کوئی بادشاہ کا پارٹ ہو تو ہمیں دے دینا۔ باقی
سب خیریت ہے۔"

صفدر کے دالان میں پردوں کی جگہ کھیس اور چادریں لٹکائی گئیں۔ کیونکہ اس کے سامنے
صحن کے اوپر کی چھت گیلری کا کام دے سکتی تھی۔ جہاں سے محلے کی عورتیں ڈرامہ دیکھ سکتی
تھیں۔ آغا حشر کے کھیل "خوبصورت بلا" کا ایک رنگین ٹکڑا کھیلنے کے لئے چنا گیا۔ رفیق نے
گلخیرو کا پارٹ سنبھال لیا۔ ارجمند کو زٹیک کا کام ملا اور اسی طرح سب ہی پارٹ محلے کے
بڑے لڑکوں نے سنبھال لئے اور وہ سب شدت سے ریہرسل میں مصروف ہو گئے۔

اس رات صحن کھچا کھچ لڑکوں سے بھرا تھا اوپر گیلری میں بیس تیس عورتیں بیٹھی تھیں۔
بستر کے لٹکے ہوئے کھیسوں اور چادروں کے پیچھے گلخیرو کی آنکھوں میں گلابی رنگ کی
بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ارجمند زٹیک کے بھیس میں پریم پتر اور پریم ٹونا سنبھالے کھڑا تھا۔ صفدر
ہدایت کار کی حیثیت سے شانے پھیلائے۔ "اے دلربا میں ہوں فدا۔" گنگنا رہا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ ایکٹریوں منہ اٹھا کر باتیں کر رہے تھے' جیسے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام
ہوں۔ گلخیرو لقہ کبوتر کی طرح سینے کو دہرا کئے کھڑا تھا۔ زٹیک چھت سے باتیں کر رہا تھا۔
پرامٹ کرتے والوں کے لئے کتاب پر نظریں جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پٹاخہ بجا بھی دیتے تو
پردہ کھینچنے والے کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اسے پردہ کھینچنا چاہیے۔

ادھر زٹیک سامنے منظر کی وجہ سے اس حد تک مست ہو گیا تھا کہ ان جانے میں اس نے
ڈنڈے کو یوں تھام لیا تھا جیسے وہ ایک بانسری ہو۔ صرف ایلی کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ اسے
زنانہ پارٹ کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔

تماشائی بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ گیلری کے دھندلکے میں سفید سفید دانت چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی رو پہلی گھنٹیاں بج رہی تھیں جنہیں سن کر اداکار اور بھی چہکتے اور ان کے لئے اپنے پارٹ پر محدود رہ جانا مشکل ہو جاتا اور وہ اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر مکالمے بولتے۔ آخر گانے پر زبردست تالیاں پیٹی گئیں۔ گیلری سے دبا دبا واہ وا کا شور بلند ہوا۔ اس پر گانے والا اور بھی چہکے اور وہ جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے اور وہ اپنے بازو جھلاتے ہوئے چلایا "آن ملا تھا۔ اک پردیسی پیاری بھول نہ جانا۔" جیسے گیلری میں کسی سے مخاطب ہو۔ اس پر تالیوں کا طوفان اور بھی تیز ہو گیا۔ گیلری سے با آواز بلند نعرے سنائی دیئے اور آخری ڈراپ گرا دیا گیا۔

کون خوش نصیب

اگلے روز جب ایلی چائے پینے کے لئے شریف کے گھر بیٹھا تھا اور شریف دو ایک منٹ کے لئے اسے اکیلا چھوڑ کر خود کوٹھے پر گیا ہوا تھا تو دفعتاً قریب ہی سے اک سریلی آواز اس کے کان میں پڑی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی گا رہی تھی۔

"آن ملا تھا اک پردیسی پیارے بھول نہ جانا جی۔" اس نے لپک کر ملحقہ کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سانوری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سانورے رنگ میں مخملی چمک تھی اور کھڑے ہونے کے انداز میں واضح سپردگی ایلی کا دل اچھل کر اس کے گلے آ اٹکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے اس سے پوچھے "تم سانوری ہو۔ کیا واقعی۔" مگر اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

شام کو ایلی جب دولت پور جانے کی تیاری میں مصروف تھا تو دفعتاً وہ چونکا۔ "ارے" وہ چلایا۔ "اس نے تو کہا تھا۔ پیارے بھول نہ جانا جی۔ پیارے ہاں ہاں یقیناً اس نے پیارے کہا تھا۔ لیکن گیت میں تو پیاری تھا۔ ہاں ہاں۔ پیاری بھول نہ جانا جی۔ پھر سانوری نے پیارے کیوں کہا تھا۔ پیارے سے اس کا مطلب کیا تھا۔ کس سے مخاطب تھی وہ۔ اس وقت کمرے میں کوئی بھی نہ تھا اور وہ کھڑکی میں تو نہ تھی۔ کھڑکی سے دور اس دروازے کے قریب جو گھر میں کھلتا تھا۔" ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی "شاید" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا "نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ مجھ میں ہے ہی کیا لاحول ولا قوۃ مجھے

یہ جملہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ پھر سانوری کہے۔"

"لیکن پھر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "نہ جانے کون تھا۔ کوئی خوش نصیب ہو گا۔"

اس کی چھٹیاں کیسے نازک وقت پر ختم ہوئی تھیں۔ اگر وہاں کچھ دیر اور رہتا کاش —— کم از کم اسے یہی معلوم ہو جاتا کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔

پھر جب وہ شریف کو خدا حافظ کہنے کے لئے شہزاد کے گھر گیا تو اس نے دیکھا کہ سانوری کھڑکی میں کھڑی تھی۔ خاموش اداس' ایک ساعت کے لئے اس کی پلکیں اٹھیں اس نے ایک ساعت کے لئے نگاہ بھر کر ایلی کی طرف دیکھا۔ ایک واضح آہ بھری پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سانورے رنگ کی لمبوتری انگلی نے یوں رخسار کو چھوا جیسے آنسو پونچھ رہی ہو پھر اس نے منہ موڑ لیا۔

"تم جا رہے ہو ایلی۔" شریف مسکرایا "جاؤ چلے جاؤ۔ اس اندھے کنوئیں سے بھاگ جاؤ۔ جاؤ وہاں جہاں لوگ محبت کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے جاؤ محبت کرو ایلی جاؤ۔"

ڈیوڑھی میں رفیق سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ سی سی کی مدھم آواز سنائی دی۔ "میں بھی جا رہا ہوں ایلی" وہ بولا "نوکری مل گئی ہے۔ مجھے اب جانا ہی ہو گا۔" وہ یوں آہیں بھر رہا تھا جیسے نوکری کا مل جانا بدقسمتی ہو۔

لالٹین کے قریب ارجمند کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ "یہ تم نہیں جا رہے ایلی۔" وہ بولا "تمہیں کون خاطر میں لاتا ہے ——" وہ رک گیا۔

"لیکن کیا۔" ایلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"پچکاری سے رنگ جا رہا ہے۔ بانسری سے نغمہ جا رہا ہے" ارجمند نے آہ بھر کر کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔" ایلی نے اسے گھورا۔

"ہاں۔" اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی "سچ کہتا ہوں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"سانوری کنہیا نے پاگل کر دیا ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

گوپیوں کے بغیر کنہیا کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں اتنا بھی نہیں جانتے تم۔ ارجمند نے پینترا بدلا "چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں جاؤ۔ مابدولت کا فرمان بجا لاؤ۔ جاؤ ——"

تم اور ہم

قرب کی آرزو

اب کی بار دولت پور میں پہنچ کر ایلی کے خیالات اور حسیات بدل رہے تھے۔ اس
احساسات میں نئی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جسم کے
تقاضے ابھر رہے تھے۔ اس کے دل میں عورت کے قرب کا شوق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس
چاہتا تھا کہ عورت کے قریب جائے۔ اسے قریب سے دیکھے اسے پیار کرے مگر یہ کیسے ممکن
سکتا تھا۔ آصفی سماج میں کسی عورت کے قریب جانے کا امکان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو ا
اتنی جرأت کہاں؟ بہرحال اس کی خواہش تھی کہ کسی کی بانہہ پکڑ لے اور پھر رو دے۔ پھر
اس کوچے کا خیال آتا جہاں سے سارنگی کی سریں گونجا کرتی تھیں۔ لیکن —— اگر بفرض
وہاں چلا بھی جاتا تو ان عورتوں کو دیکھ کر عجیب سی کراہت محسوس ہوتی جو لالٹین جلائے
بیٹھی مردوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ درحقیقت وہ انہیں عورتیں ہی نہیں سمجھتا تھا۔

اس کوچے میں پہنچے بغیر کسی عورت سے قرب ممکن نہ تھا کسی کو بلوریں پاؤں
ہوئے دیکھتا یا کسی کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے اور بھی مضطرب کر
پھر عورت سے قرب کی آرزو کیسے پوری ہو سکتی تھی۔

پھر دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔ ایک مکروہ بھیانک خیال —— اور وہ لرز گیا مگر
تھا اس کا مسلسل طور پر اس خیال پر لاحول پڑھنا بیکار تھا کیونکہ ابتداء سے ہی یہ خیال اس

دل کی گہرائیوں میں بیٹھ چکا تھا جب وہ ابھر کر ایلی کے شعوری ذہن کی طرف یورش کرتا تو ایلی
اسے پھر دبا دیتا اور اس طرح اپنی دنیا کو محفوظ کر لیا کرتا مگر وہ دبایا ہوا خیال اندر ہی اندر دل کو
متعفن کیے جا رہا تھا۔

جنسیاتی محور

ایلی کی تمام تر جنسیاتی زندگی علی احمد کے محور کے گرد گھومتی تھی جب کوئی جونک ان کے
گھر آ کر علی احمد کا خون چوسنے کے شغل میں مصروف کار ہو جاتی تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔
علی احمد کو ایسی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں۔ اسے ٹین کے سپاہی کا کردار ادا کرنے کا کوئی حق
نہیں۔ اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا اسے ایسی سستی
قسم کی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی —— وہ اس بات پر پیچ و تاب کھاتا۔
اور اگر سارہ صبورہ سی باعزت لڑکیاں علی احمد کے رنگین جال میں پھنس جاتیں تو بھی اسے غصہ
آتا۔ کیا اسے اپنی عمر کی عورتیں نہیں ملتیں۔ کیا اسے اس قسم کی سستی عورتیں نہیں مل سکتیں
جو روپے کے عوض خریدی جا سکتی ہوں۔ ہر صورت میں اسے علی احمد پر غصہ آتا اور غصے کے
بہانے اس کے جنسی پہلو میں ابال آ جاتا اور پھر وہ چوری چوری سوچتا کہ عورت سے قرب حاصل
کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک واحد امید اور پھر ایک عمر رسیدہ عورت بادلوں سے جھانکتی اور اس
کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اسے اپنی طرف بلاتی اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر
رو دے۔ روتا رہے حتیٰ کہ جسم کا درد دور ہو جائے۔ ہڈیوں میں جو چیونٹیاں سی چلتی تھیں
چٹکیاں لیتی تھیں ان سے نجات حاصل ہو نسوں میں جو تناؤ سا اسے پریشان رکھتا تھا وہ ختم ہو
جائے لیکن دفعتاً وہ گود میں پڑے ہوئے محسوس کرتا کہ وہ اس بھرپور عورت کو جانتا ہے اس
کی شکل و صورت مانوس سی دکھائی دیتی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی۔ اور وہ اپنی آنکھیں
بند کر لیتا اور پھر معدوم ہونے کی کوشش میں کھو جاتا۔

ہائے ایلی!

اب کی بار جب وہ دولت پور میں آیا تو اس کے خیالات کی دنیا میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو
گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک رنگین سی آواز اس کے کان میں پڑتی پیارے بھول نہ جانا جی۔ ایک

ملیح تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملاتی۔ پھر ایک با معنی ہنسی۔ واضح اور رنگین اور پلکیں مژگاں کے دو گھنے چھتر جھک جاتے اور ایک لمبی سی مخروطی پر نم انگلی فضا میں ابھرتی۔ پھر چھم سے کوئی آجاتا اور منظر یوں بدل جاتا جیسے پتھر گرنے سے جھیل کے ساکت پانی میں کے ایوانوں کے دھندلے مگر حسین نقوش دفعتاً" پاش پاش ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف اٹھنے لگتیں۔ پھر فضا میں چاروں طرف مرکری دیوتا کے ٹخنوں پر لگے ہوئے ننھے بازو پھڑ پھڑاتے بلوریں پاؤں رقص کرتے اور بال دوپٹہ اور مژگاں ایک زناٹے سے اس کے قریب سے جاتے اور دور دور ——— دور ایک مدہم حسین آواز گنگناتی ہوئی سنائی دیتی "ہائے ایلی وہ چاہنے والے انتظار کر رہے ہیں۔" اس وقت ایلی چونکتا اور شرم سے سر جھکا لیتا۔ ایک مبہم سا احساس جرم اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ دور ایک ننھی سی حسین عورت سفید آنچل پھیلائے اڑے جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ کہیں سر رکھ کر رو دے اتنا روئے کہ کوئی ہاتھ لپک کر اسے تھپکنے پر مجبور ہو جائے۔ قریب ہی سے شریف کا مدہم قہقہہ گونجتا ۔ ایلی محبت کرو۔ محبت کرو چاہے کسی سے کرو محبت کرو۔ محبت کیے بغیر تم کچھ بھی نہیں؟ وہ اپنا سر لحاف میں گاڑ دیتا آنکھیں بند کر لیتا۔ نہیں نہیں میں مجرم نہیں ہوں میں جرم نہیں کروں گا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے بلوریں ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور ہمدردی بھرے لمس سے اسے تھپکنے لگتے اور وہ یوں روتے روتے سو جاتا جیسی کوئی بچہ کسی کھلونے کو حاصل نہ کرنے پر روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے۔

چھجو کا چوبارہ

خوش قسمتی سے انہیں دنوں ایلی کا بہنوئی اجمل دولت پور میں آگیا۔ اسے دولت پور کچہری میں ایک نوکری مل گئی تھی۔

ایلی کو اجمل سے بہت ہمدردی تھی۔ کیونکہ کئی ایک پہلوؤں سے اس کی اپنی زندگی سے ملتی جلتی تھی اس کے علاوہ اجمل نے اوائل عمر میں ہی بصرہ اور کابل سے دور دراز کے سفر کیے تھے جن کی وجہ سے اس کے دل میں اجمل کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔

اجمل اونچے لمبے قد کا لڑکا تھا جس کی قابلیت پر ایلی فخر محسوس کیا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر اسے اجمل کی رنگین طبیعت بہت پسند تھی۔ ہاجرہ کی نکتہ چینی کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے اسے اجمل بہت پسند تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اجمل اس کا دوست ہے۔

اجمل کے دولت پور آجانے سے ایلی کو ایک سہارا مل گیا کیونکہ اجمل نے وہاں پہنچتے ہی اپنے اثر و رسوخ سے علی احمد کے گھر سے ملحقہ چھجو کا چوبارہ کرائے پر لے لیا اور ایلی کے لیے اجمل کا گھر ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اجمل کے آجانے سے ایلی نے شمیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے نجات پالی اب اسے پہلوان کی دوکان پر جاکر دودھ اور بن کھانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

ادھر علی احمد نے ایک بار پھر ——— پرانے انداز کو اعلانیہ اپنا لیا تھا شاید اس لیے کہ کشمیر کا سیب اپنی تمام تر رنگینی کھو چکا تھا۔ اب علی احمد کو ان بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزر کر اتنی دور راجو کے گھر جانا نہیں پڑتا تھا بلکہ راجو خود ان کے یہاں آزادی سے آتی جاتی تھی اور علی احمد کا کمرہ ایک مرتبہ پھر وہی بام آباد کا کمرہ بن گیا تھا جہاں ربڑ کی گڑیا چیختی۔ اور ٹین کا بکتر بند سپاہی جنگ کے نعرے لگاتا اور پھر رنگین ہنسی کی آواز سنائی دیتی جسے سن کر شمیم غصے سے بل کھاتی اور پھر انتقاماً" عقبی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی اور آنسو پونچھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

اگرچہ اب بھی ایلی علی احمد سے ڈرتا تھا گھبراتا تھا لیکن اب وہ علی احمد کے کمرے سے خائف نہ تھا اب نہ تو اسے بوتل اٹھا کر کنوئیں پر جانا پڑتا تھا اور نہ ہی چیختی ہوئی ربڑ کی گڑیا یا ٹین کے سپاہی کی آوازیں سننا پڑتی تھیں اس لیے کہ جب علی احمد کے کمرے میں میدان کار زار گرم ہوتا تو ایلی چپکے سے اجمل کے چوبارے میں جا بیٹھتا اور وہاں پہنچ کر گہری سوچ میں کھو جاتا۔

نہ جانے کیوں

نہ جانے کیوں عورتیں ربڑ کی گڑیوں کی طرح کیوں چیں چیں کرتی ہیں اور مرد ٹین کے سپاہی کیوں بن جاتے ہیں۔ کیا سبھی مرد ٹین کے سپاہی بن جاتے ہیں کیا سبھی عورتیں ربڑ کی گڑیوں کی طرح چیں چیں کرتی ہیں۔ ان کے منہ سے بچوں کی طرح لاڈ بھری توتلی باتیں کیوں نکلتی ہیں۔ ویسے عام بات کریں تو ان کا لہجہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ ذرا توتلا پن نہیں ہوتا آواز میں لوچ نہیں ہوتا۔ ان امور کے علاوہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد کس معیار کے مطابق عورتوں کو چنتے تھے۔ مثلاً۔ وہ کور تھی۔ یہ راجو تھی۔ ان میں کوئی کشش بھی تو نہ تھی۔ کوئی بات بھی تو نہ تھی جسے قابل ستائش یا دلکش سمجھا جا سکتا۔ کیا حسن و خوبصورتی کی

خصوصیات کے وسیلے کے بغیر عورت بذات خود قابل حصول ہوتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے
کچھ عورتوں کو دیکھ کر تو ایلی کو گھن آتی تھی۔

ایلی محسوس کرتا جیسے عورت ایک معمہ ہو ایک ایسا معمہ جو بند کمرے کے بغیر حل نہ ہو
سکتا ہو اس خیال پر اسے شدید خواہش محسوس ہوتی کہ ایک بار اسے بھی کسی عورت کے ساتھ
کمرے میں بند ہونے کا اتفاق ہو اور اس کے روبرو بھی وہ اسرار کھل جائیں صرف ایک بار
ایک بار۔

وہ راجو یہ راجو

ایک روز رات گئے جب ایلی گھر پہنچا تو علی احمد کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھکا
کمرے سے ٹین کے سپاہی کے نعروں اور ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں کی بجائے عجیب سی آوازیں آ
رہی تھیں کوئی کراہ رہی تھی کوئی مدہم آواز میں ہمدردی جتا رہا تھا۔

ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہوا تھا کہ دفعتاً علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس
سے ہنستی کھیلتی راجو کی جگہ نحیف و نزار راجو برآمد ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ علی احمد کے کندھے
پر رکھا ہوا تھا اور بصد مشکل سہارا لے کر چل رہی تھی۔

"ایلی" انہوں نے باہر نکلتے ہی ایلی کو آواز دی۔ "ادھر آؤ ذرا۔ ہمارے ساتھ چلو۔"

"اس وقت اتنی رات گئے۔" شمیم زیر لب بولی۔

"ضروری کام ہے ابھی لوٹ آئیں گے۔" انہوں نے بے رخی سے جواب دیا "چلو ایلی"

"اس بیچارے کو کیوں ساتھ خراب کرتے ہو۔" شمیم نے کہا۔

"چلو ایلی" علی احمد نے شمیم کی بات نہ سنی قافلہ چل پڑا۔ برقعے میں لپٹی ہوئی راجو علی احمد
کے ساتھ گھسٹ گھسٹ کر چل رہی تھی۔ اور علی احمد نے اسے یوں سہارا دے رکھا تھا جیسے
بیمار ہو پیچھے پیچھے ایلی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔ نہ جانے کمرے سے یہ کون
راجو نکل ہے۔ راجو ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو کتر کتر باتیں کیا کرتی۔ آنکھیں مٹکاتی نخرے کرتی
راجو تو روئی روئی سی تھی۔ نہ جانے وہ کدھر جا رہے تھے۔ کیوں جا رہے تھے اور چلتے ہوئے
راجو گھسٹ کیوں رہی تھی راجو اپنے گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور علی احمد ان کی
دوسری چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ "رحیمن دوڑو دوڑو۔ دیکھو راجو کو کیا ہو

گیا ہے۔ کیا ہے۔" چاروں طرف سے عورتیں راجو کی طرف لپکیں اور یک آن میں بھیڑ لگ
گئی۔

صرف وہ بڑھیا دور کھڑی چلاتی رہی۔ "کیا پاکھنڈ مچا رکھا ہے تم دونوں نے۔ میں مرتا ہوں۔
میں مرتی ہوں اور مرتا کوئی بھی نہیں نخرے دکھانے شروع کر رکھے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ شخص
کیوں آتا ہے اس گھر میں اور یہ مرنے جوگی اس سے کیوں ملتی ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مر
جائے خس کم جہاں پاک۔"

"پاگل ہو گئی ہو ماں" راجو چلائی "لڑکی بے ہوش ہے ہاتھ سے جا رہی ہے اور تو کھڑی وعظ
کر رہی ہے جیسے مکے سے آئی ہو۔"

"تو مجھے ماں نہ کہا کر ڈائن" رحیمن چیخی۔

راجو حیرانی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ چھاتی پر پڑے تھے منہ
خوف سے اور بھی بدنما ہو گیا تھا۔

راجو کے رخسار پھول رہے تھے جیسے باسی ڈبل روٹی میں ابال آگیا ہو۔

سیلز مین نے بڑھ کر راجو کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ ساجو نے اس کی مدد کی علی احمد نے سرسری طور
پر سہارا دیا لیکن بیٹھنے کی بجائے وہ ڈھیر ہو کر گر پڑی۔

یہ دیکھ کر علی احمد گھبرا گئے "کاغذ کہاں ہے دوات دوات۔" وہ چلانے لگے کچھ دیر تلاش
کرنے کے بعد انہوں نے کاغذ اور دوات علی احمد کو دے دی۔ علی احمد نے کاغذ پر کچھ لکھا اور
چادر میں لپٹا ہوا سیلز مین اسے لے کر بھاگا۔

چھوٹے کمرے میں رحیمن کھڑی چلا رہی تھی قریب ہی ساجو غصے سے گھور رہی تھی۔ باہر
دالان کے ایک کونے میں آجو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس سے پرے ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایلی بیٹھا
سوچ رہا تھا نہ جانے کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ راجو کیوں چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی ہے اس کی ماں
بیٹی سے ہمدردی کرنے کی بجائے ان سب کو صلواتیں کیوں سنا رہی ہے اور علی احمد اس قدر
گھبرائے کیوں ہیں۔

پھر دروازہ کھلا اور چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی آواز سنائی دی "ڈاکٹر صاحب آگئے۔"

"ڈاکٹر" ایلی نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کہیں ڈاکٹر پہچان نہ لے۔ اس مکان میں دیکھ نہ

لے لیکن علی احمد علی احمد بھی تو اسی گھر میں تھے اور علی احمد کا کیا ہو گا۔ اگر علی احمد کو پہچان لیا تو۔

علی احمد کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے "ہی ہی ہی ڈاکٹر صاحب مریضہ بے ہوش ہے یونہی سے یونہی پڑی ہے۔" "اسے اندر لے چلو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ سب راجو کو اٹھانے دوڑے۔

بو کا ریلا

اس دوران میں ساجو آگئی اور ایلی کے قریب بیٹھ کر پان لگانے لگی اندھیرے میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔

"گڈی گڈے کا کھیل بنا رکھا ہے انہوں نے۔" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا اپنا ہی ہوش ہے دوسرے جائیں جہنم میں اب تم ہی بتاؤ انہیں ایسا کرنا چاہئے تھا کیا۔ گئی۔ پھر آپ ہی آپ بولی۔ "راجو کے خصم کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔ اسی بات کا خیال ہوتا انہیں دولت پور میں وہ کونسا چوک ہے جہاں ان کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ڈھنگ سے بات کریں تو ہے۔ نا وہ ایک رات بھی اس کے بغیر نہیں رہتی اور اگر رہ بھی یہ بڈھا بچوں کی طرح بلکنے لگتا ہے۔ اور رہی سہی بات اس بڑھیا نے ڈبو رکھی ہے کولہوں پر رکھ کر چیختی ہے جو کسی نے نہیں سنی بات تو یہ اللہ کی بندی اسے سنا کر رہے گی۔ ہاں گے۔" وہ ایلی کے قریب سرک آئی۔

قریب بہت ہی قریب ساجو کے میلے دانت چمکے بو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی نے محسوس کیا اسے کسی گندے نالے میں دھکیل دیا گیا ہو۔ جہاں گلے سڑے گوشت کا ڈھیر لگا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ "پان تو کھالے" ایک سیاہ بازو اس کی طرف لپکا۔

"نہیں نہیں۔" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش۔

"کاٹتا ہے کیا۔" وہ عجیب انداز سے بولی "اچھا بیٹھ تو جا۔" اور وہ اس سے دور ہٹ کر چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

نیا عقدہ

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ڈاکٹر باہر نکلتے ہوئے بولا "اسے اکیلے پڑا رہنے دو۔ شاید

ہو جائے۔ کل صبح مجھے اطلاع دینا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک بار پھر سب نے چھوٹے کمرے کی طرف یورش کر دی اور وہاں لڑنے جھگڑنے لگے نہ جانے کیا بات تھی جس پر وہ جھگڑ رہے تھے۔ بڑھیا چلا چلا کر رو رہی تھی۔ جیسے غصے سے بھرا ہوا بلیڈر پھٹ گیا ہو۔ ساجو طعنے دے رہی تھی۔ سیلز مین شاید اپنے ذریعہ تجارت کو تباہ ہوتے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور علی احمد اضطراب میں ٹہل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک صحرا ہو۔ ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے تھے ٹوپی ماتھے پر الٹی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوتا گیا۔ بڑھیا کی ہچکیاں مدھم پڑ گئیں ساجو کے طعنے نفرت بھری نگاہ تک محدود ہو گئے۔ آجو دروازے کے باہر چوکھٹ کے قریب سہمی ہوئی کھڑی تھی اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رحیمن راجو کی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گئی۔ آجو باہر کھاٹ پر ڈھیر ہو گئی ساجو پاندان سامنے رکھے بکری کی طرح جگالی کرتی رہی علی احمد ویسے ہی گھبراہٹ بھرے انداز میں ٹہلتے رہے پھر راجو کراہنے لگی علی احمد اور ساجو دوڑ کر اندر چلے گئے کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ساجو کولہے مٹکاتی ہوئی باہر نکلی۔ پھولے ہوئے جسم میں سفید سفید دانت اور آنکھیں چمکیں۔ پیچھے پیچھے علی احمد تھے ایلی کو دیکھ کر وہ چونکے۔

"تم۔ تم یہاں تم۔" جیسے وہ ایلی کو ساتھ لانے کی تفصیل بھول چکے ہوں "اچھا اچھا خیر۔" دفعتاً" وہ گھبرا کر رک گئے۔ "اب اس وقت تو گھر جانا ٹھیک نہیں۔" انہوں نے ایلی سے کہا "رات بہت گزر چکی ہے۔ یہیں لیٹ کر سو رہو۔ صبح سویرے چلے جائیں گے۔"

زہر

علی احمد کے انداز میں غیر معمولی ملائمت پیدا ہو گئی تھی نہ جانے کیوں؟ "اور دیکھنا" علی احمد اس کے قریب بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے "گھر جا کر یہ نہ کہنا کہ راجو بیمار تھی۔ کہ راجو نے زہر کھا لیا تھا۔"

زہر ——— ایلی سکتے میں رہ گیا۔ کیا واقعی راجو نے زہر کھا لیا تھا۔ مگر کیوں کیا اسے علی احمد سے محبت تھی؟ کیا راجو بھی محبت کی اہل تھی لیکن۔ وہ سیلز مین اور وہ دس کا نوٹ جو اس روز وہ راجو کے لیے لایا تھا۔ اس کی وہ نگاہیں جو اس نے غلام محمد پر ڈالی تھیں۔ نہیں اسے محبت نہیں

ہو سکتی۔ پھر اس نے زہر کیوں کھایا تھا۔ ایلی کے لیے یہ ایک نیا عقدہ تھا۔

"ساجو" علی احمد نے منت سے کہا "بھئی ایلی کا کچھ انتظام کر دو۔ دن چڑھنے میں لب
ایک گھنٹے ہی ہوں گے پڑ رہے گا کہیں۔" یہ کہہ کر وہ راجو کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اند
سے دروازہ بند کر لیا۔

محبت ——— نہ جانے محبت کیا ہوتی ہے۔ مگر نہیں محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایلی
سوچنے لگا۔ نہ جانے لوگ عورت کے پیچھے اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ عورت میں
کونسی کشش ہے۔ راجو جیسی سیدھی سادھی گنوار لڑکی نے علی احمد کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ایلی
کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ عورت کو قریب سے دیکھے اسے عورت کا قرب حاصل
ہو۔ مگر کیسے حاصل ہو۔ کوئی صورت بھی ہو اس نے چوری چوری اپنے گرد نگاہ دوڑائی۔ ایک
طرف ٹوٹی ہوئی کھٹولی پر وہ پتلی دبلی لڑکی آجو پڑی تھی جس کی آنکھوں میں زرد زرد میل لگا رہتا
تھا اور جس کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے جھرجھری محسوس کی۔ آجو میں کوئی بھی ایسی
بات نہ تھی کہ اسے عورت سمجھا جا سکے۔

بدلاؤ

"آؤ ایلی۔" ——— ساجو چارپائی بچھاتے ہوئے بولی "یہاں آ جاؤ۔" ایلی اٹھ کر اس چارپائی
پر جا پڑا ایلی نے ساجو کی طرف دیکھا۔ نہیں نہیں وہ عورت نہیں۔ ایلی کے لیے تو عورت ایک
لطیف اور پاکیزہ چیز کا نام تھا۔ وہ سوچنے لگا نہیں نہیں یہ عورتیں نہیں یہ تو جونکیں ہیں اور وہ
چپ چاپ پڑ گیا۔

ساجو نے ایک عجیب سی دھن گنگنانی شروع کر دی۔ عجیب سی دھن تھی وہ جیسے کوئی کم
ویرانے میں تنہا بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اس دھن سے جسم کی بو آتی تھی۔ وہ دھن جو
لالٹین جلا کر بیٹھنے والی عورتیں ہی گنگنا سکتی ہیں۔

نفرت سے ایلی نے منہ موڑ لیا آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ گنگناہٹ لحظہ بہ لحظہ تیکھی ہوتی
گئی جیسے کوئی آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہا ہو۔ پھر چارپائی کھینچنے کی آواز سنائی دی لیکن
وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اسے کسی ربڑ کی گڑیا کی چیں چیں سنائی دے رہی تھی۔ اس کی
نگاہوں تلے ٹین کا سپاہی ابھر رہا تھا ——— بڑھ رہا تھا۔

"بابو جی۔" کوری کی مکروہ آواز سنائی دی۔ سفید دانت اندھیرے میں چمکے وہ سہم گیا۔ لیکن
عین اس وقت خانم کے ہاتھ نے بڑھ کر کوری کو پرے دھکیل دیا اور پھر وہ حسین بازو ایلی کی طرف
بڑھا۔ اس لمس کی وجہ سے اندھیرے میں ایک الاؤ روشن ہو گیا سرخ سرخ چھینٹے اڑے۔ چاروں
طرف چیونٹیاں رینگ رہی تھیں ۔ اس نے گھبرا کر پہلو بدلا۔ بوکاریلا۔ اس کا دل دھک سے رہ
گیا ساجو کی چارپائی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور ایک حریص تھوتنی اس کی طرف بڑھ رہی تھی
گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا اور گرم غلیظ جسم کے ایک
جھٹکے نے اسے آغوش میں لے لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھے اور اس نائٹ میئر سے
اپنے آپ کو محفوظ کر لے لیکن اس کے برعکس نہ جانے کیوں اس دیوانگی کے تحت جو اس پر
مسلط ہو چکی تھی اس نے اس غلاظت بھرے جوہڑ میں چھلانگ لگا دی۔ ایک لمس۔ ایک ڈبکی۔
آتش فشاں سے لاوے کا ایک ریلا نکلا جس نے ایلی کو تنکے کی طرح بہا کر نہ جانے کہاں پھینک
دیا۔

قریب ہی سے تمسخر بھری مدہم آواز سنائی دی بس ——— اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس
پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ ایک کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ رینگ رہا تھا پھر سیاہ ہمدردانہ
اندھیرے نے اپنا دامن پھیلا کر اسے چھپا لیا۔

نائیٹ میئر

"ایلی۔ ایلی۔" آواز سن کر ایلی نے آنکھیں کھول دیں ارے میں کہاں ہوں۔ پھر علی احمد
کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور اس غیر مانوس جگہ کو دیکھ کر وہ
سوچ میں پڑ گیا۔ ساتھ والی چارپائی پر ایک مبہم سی حرکت ہوئی اس نے ادھر دیکھا ساجو ———
دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ ننگا ہے اور کوئی ڈائن اس کا پیچھا کر رہی ہے اس کا مضحکہ اڑا رہی
ہے۔ اور وہ بھاگ رہا ہے۔

سامنے افق پر لمبی مژگاں سے ڈھکی ہوئی دو پرنم آنکھیں تھیں۔ سانولی انگلی گرا ہوا آنسو
پونچھ رہی تھی۔ نہیں ایلی۔ شریف مسکرا رہا تھا نہیں نہیں۔ محبت کرو چاہے کس سے کرو۔ کوئی
بھی ہو لیکن محبت کرو ——— اور ایلی کا جی چاہتا تھا کہ شریف کے گلے سے لگ کر روئے۔

ایلی کے لیے وہ رات بھیانک خواب یا نائٹ میئر کی حیثیت رکھتی تھی جس کی یاد سے وہ لرز

جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے ا
آپ کو قعرِ ذلت میں دھکیل دیا ہو اور وہ تمسخر اور تحقیر سے بھرا ہوا قہقہہ۔ کیا یہی عورت کا ق
تھا کیا علی احمد کو اسی قرب کا شوق تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟ عورت کے قرب کا مطلب غلا
کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھانا نہیں ہو سکتا ——— نہیں نہیں۔

کئی ایک دن وہ اس نائٹ میئر کے تاثرات میں کھویا رہا اس کے دل میں صرف ایک
خیال تھا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں اس میں وہ اہلیت ہی نہیں ورنہ وہ تمسخر بھرا ق
جس کی وجہ سے وہ ایک کیڑے کی طرح رینگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نہیں نہیں۔ شریف کی آواز سنائی دیتی۔ یہ نہیں محبت کرو محبت پھر وہ دیوانہ وار ادھر ا
گھومتا کس سے محبت کروں۔ کیسے محبت کروں اور اس کے دل میں جستجو کی ایک لہر دوڑ
جاتی۔

وہ بلوریں پاؤں واقعی اس قابل تھے کہ ان سے محبت کی جائے لیکن اسے اتنا بھی معلوم
تھ کہ وہ پاؤں کس کے ہیں۔ وہ کون ہے جو ان پاکیزہ پاؤں کی مالکہ ہے۔ اس نے کئی بار ا
دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر تنگ پاجامہ ایک سیاہ آنکھ اور دو بلوریں پاؤں کے علاوہ اسے کچھ دکھا
نہ دیا تھا۔

ان حالات میں محبت کرنا کیسے ممکن تھا اس بھیانک خواب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اس کے د
میں عورت کے قرب کا خوف جاگزیں ہو گیا اور اپنی نا اہلیت کا خیال یقین کی حد تک مستحکم

***

بے زاری

دولت پور میں اب ایلی کی زندگی نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے صبح و شام ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگے تھے کالج اس کے لیے دلچسپی سے خالی تھا۔ اگرچہ اب وہ کالج جانے سے بالکل نہ گھبراتا۔ لیکن اس کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ تحصیل علم کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایلی کے لئے کالج محض ایک تفریح گاہ تھی۔

کالج سے واپس آتے ہی وہ کتابیں گھر میں پھینک کر اجمل کی طرف چلا جاتا اور وہاں کسی نہ کسی شغل میں مصروف ہو جاتا۔ گھر میں تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو اس کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔

علی احمد حساب کا رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہتے یا کسی نہ کسی بات پر شمیم سے جھگڑا شروع کر دیتے۔ شمیم دو ایک منٹ چیختی چلاتی ہاتھ چلاتی اور پھر تھک کر رونا شروع کر دیتی۔ اسے روتا دیکھ کر اس کی دونوں بچیاں چیخنے لگتیں اور گھر میں کہرام مچ جاتا۔

راجو آجاتی تو علی احمد کی حساب کتاب سے دلچسپی ختم ہو جاتی۔ رجسٹر بند کر کے وہ راجو کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بات بات پر ہنستے چہچہاتے۔ نہ جانے کیوں راجو کے آنے پر وہ بہانے بہانے شمیم کو بلاتے اس سے کچھ پوچھتے یا اس کی تعریف کرتے۔ شاید شمیم کو تنگ کرنے میں مزا

آتا ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی ازلی تماش بینی ہو۔ راجو کو دیکھ کر غصے کی وجہ سے ان کی آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں ہو جاتا اور اس کی شکل و صورت بالکل ہی مضحکہ خیز ہو جاتی۔

بالآخر ٹین کا سپاہی قلعہ بند ہو جاتا اور "کشمیر کا سیب انتقاما" ملحقہ کمرے کی عقبی کھڑکی لٹک جاتا۔ بند کمرے میں ربڑ کی گڑیا چیختی اور مٹی کا پہلوان گرتا اور پھر ایستادہ ہو جاتا۔ پھر گرتا ایستادہ ہو جاتا۔ گڑیا تالیاں پیٹتی قہقہے لگاتی۔ نیچے سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ان قہقہوں کو سن کر رک جاتے پھر پنواڑی کی دوکان پر بات چل نکلتی۔

"ہاں میاں روج آوے ہے اس چوبارے والے بابو کے پاس۔"

"ٹھیک کہے ہے یہ میں آپ دیکھے ہوں روج یہاں سے گجرتے وے۔ یہاں آکر آنکھ جھکالے ہے میں نے کبھی نہیں جتایا۔"

"کیا کہا یہاں اس چوبارے ماں۔" "ارے نہیں بھائی عقل کی بات کرو۔"

"ارے ماں کھوب جانوں یہ چوبارے والا بابو بڑا گھاگ ہے یہ بابو۔ چار روج ماں اس نے اب وہ چلاوا پٹاخہ ہے۔ چلاوا۔"

شام پڑتی تو راجو رخصت ہو جاتی اور علی احمد پھر سے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔ جب رات کے آٹھ بجتے تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتے۔ "اوہ مجھے تو آج انسپکٹر صاحب نے بلایا تھا۔ یاد ہی نہیں رہا۔ حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے کپڑے پہننے لگتے۔

چار ایک منٹ بل کھانے کے بعد شمیم گویا اپنے آپ سے کہتی "جیسے میں جانتی ہی نہیں ان کے انسپکٹر صاحب کو۔"

علی احمد ہنس پڑتے "تو تو بالکل پگلی ہے راجو کی طرف جانا ہوتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"توبہ اتنا نڈر بھی نہ ہو کوئی چوری اور پھر سینہ زوری شرم نہیں آتی۔" شمیم جواب دیتی

"بے وقوف شرم تو عورتوں کے لیے ہے۔" وہ ہنسنے لگتے۔ "مردوں کے لیے نہیں۔"

اس پر شمیم خاموش ہو جاتی اور چھوٹے کمرے سے سسکیوں کی آواز آنے لگتی "بس ابھی آیا۔" کہہ کر علی احمد باہر نکل جاتے اور پھر آدھی رات تک راجو کے یہاں پڑے رہتے۔ ان کی واپسی پر گھڑی دو گھڑی تو میاں بیوی کی لڑائی ہوتی۔ شمیم بات بڑھانے کی کوشش کرتی

علی احمد اسے چٹکیوں میں اڑا کے لیٹ جاتے۔

"ٹھیک ہے" وہ کہتے "تو لڑنا چاہتی ہے تو میں ضرور تیری خواہش پوری کروں گا لیکن حقے کی چلم پئے بغیر لڑنا۔ نہ بھئی یہ مشکل ہے تو ذرا چلم بھر دے پھر لڑیں گے کیوں نہیں لڑیں گے تو چاہے اور ہم نہ لڑیں۔ بھئی واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس پر شمیم روتے ہوئے چلم بھرنے لگتی اور علی احمد کپڑے بدلتے ہوئے گنگنانے لگتے۔

گزشتہ خفت

جب بھی علی احمد باہر جانے لگتے تو ایلی گھبرا جاتا کہ کہیں علی احمد کو اسے ساتھ لے جانے کا خیال نہ آ جائے۔ ان کے ساتھ باہر جانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس مکان سے ڈرتا تھا جہاں اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ اس سیاہ فام عورت سے ڈرتا تھا جس کا تحقیر بھرا قہقہہ اب تک اس کے کانوں میں گونجتا تھا۔ وہ اس قرب سے ڈرتا تھا جس کا وہ ایک بار سزاوار ہو چکا تھا۔

علی احمد باہر جانے لگتے تو وہ گھبرا جاتا۔ راجو ان کے گھر آتی تو وہ چپ چاپ دبے پاؤں باہر نکل جاتا۔ راجو کی زیر لب مسکراہٹ سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایلی کی گزشتہ خفت سے کماحقہ واقف ہو جیسے وہ جانتی ہو جانے بغیر سمجھتی ہو جیسے ساجو نے اسے اس تمسخر بھرے قہقہے سمیت ساری بات بتا دی ہو۔ اس کی مسکراہٹ ایلی کے سینے میں دھار بن کر اتر جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

"اچھا تو جناب بھی اس میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ واہ واہ بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔" اس پر وہ گزشتہ خفت از سر نو اس پر طاری ہو جاتی۔

کبھی تو راجو کو دیکھ کر ایلی کے دل میں ایک عجیب سی وحشت بیدار ہو جاتی اور اس کا دل چاہتا کہ بڑھ کر اس کی قمیض تار تار کر دے اور پھر چلا چلا کر کہے "میں تمہیں جانتا ہوں تم جونک ہو جونک۔" پھر وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کھو جاتا اور بالآخر چپکے سے گھر سے باہر نکل جاتا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے شریف کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی "نہیں نہیں ایلی محبت کرو محبت۔"

تین راہگیر

ایک روز راجو کے آنے پر جب وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر رہا تھا تو علی احمد نے آواز دی

"ایلی۔ جانا نہیں۔"
وہ رک گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا "نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔"
"ایلی ادھر آؤ۔" علی احمد نے پھر آواز دی۔
راجو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی "اب تو نظر ہی نہیں آتا ایلی۔" اس نے لاڈ بھرے انداز سے کہا "جی نہیں چاہتا تیرا ملنے کو۔" ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بات طنزاً کہی گئی ہو۔
"ایلی ذرا ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔ ابھی چلتے ہیں ذرا ٹھہرو" علی احمد بولے۔
"میں نہیں جاؤں گا۔" ایلی نے باآواز بلند کہنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اپنی بے بسی پر بل کھا کر خاموش ہو گیا۔
کچھ دیر کے بعد علی احمد تیار ہو گئے "چلو ایلی" وہ بولے اور پھر علی احمد، راجو اور ایلی سیڑھیاں اترنے لگے۔
علی احمد اور راجو کے ساتھ دولت پور کے بازار سے گزرنا ایلی کے لیے بہت بڑی مشکل تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے لوگ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ان کے متعلق زیر لب باتیں کرتے تھے۔ اس وقت ایلی کی حیثیت سیلز مین کی سی ہوتی تھی۔ اسے یہ بات بے حد ناگوار گزرتی لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔
وہ تینوں راہ گیر عجیب انداز سے چلے جا رہے تھے۔
علی احمد کو تو لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا راہ چلتے ہوئے انہوں نے کبھی راہگیروں یا پنواڑیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ انہیں ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوتی وہ تو گردن اٹھا کر چلنے کے عادی تھے اور ان کی گردن کا زاویہ ایسا ہوتا تھا کہ سڑک نگاہ سے اوجھل رہتی بلکہ مکانات کی نچلی منزل کی طرف دیکھنا۔
ان کے لیے ممکن نہ رہتا اور دو رویہ بنے ہوئے چوباروں یا کوٹھوں کو منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے جاتے۔ ان کے عقب میں راجو برقعہ پہنے ہوئے گرگابی بجاتی ہوئی یوں چلتی جیسے وہ دولت پور کی راجو نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہو جیسے اسے کوئی جانتا ہی نہ ہو اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا سینہ تن جاتا قدموں میں شوخی لہراتی اور جالی کے پیچھے سے لپکتی جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ ان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والے لوگوں سے کہے "میں ہی

دولت پور کا پٹاخہ میں ہی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے جہاں میرا جی چاہے جاؤں گی جس کے ساتھ جی چاہے رہوں گی کر لو میرا جو کرنا ہے۔" اور دور پیچھے ایلی یوں چلا آتا جیسے بازار سے کوئی سودا خریدانے کے لیے جا رہا ہو اور اسے اس میلے برقعے میں ملبوس ٹھک ٹھک کرتی ہوئی عورت اور چوبارہ نگاہوں والے مرد سے کوئی تعلق نہ ہو۔
اس روز ان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دعائیں مانگ رہا تھا یا اللہ کہیں وہ اس گھر میں نہ جا رہے ہوں جہاں میلے پنڈے کی بو کے ریلے آتے ہیں اور وہ سیاہ گوشت میں میلے دانت۔ وہ اس کے روبرو کیسے جائے گا نہیں نہیں۔
موڑ پر جا کر علی احمد رک گئے۔ "اچھا راجو تو چل گھر۔ لیکن جلد اس جگہ پہنچ جائیو۔ سمجھی ہم انتظار کریں گے۔"
اچھا کہہ کر راجو چلی گئی اور علی احمد اور ایلی مڑ کر دوسری سڑک کو ہو لیے۔ کئی ایک راستوں سے ہوتے ہوئے بالآخر وہ ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

بے بی شو

"آؤ ایلی آؤ۔ یہاں آج بے بی شو ہے۔" علی احمد نے ایلی کی طرف دیکھا "ارے بے بی شو نہیں جانتے اور کہنے کو کالج میں پڑھتے ہو۔" وہ ہنسنے لگے "واہ یہ بھی لاجواب بات ہے۔ دیکھو بے بی کا مطلب ہے بچہ یعنی دودھ پیتا بچہ یعنی وہ بچہ جو ماں کا دودھ پیتا ہے آج یہاں ان بچوں کا شو ہو گا میونسپل ہال میں جو بچہ سب سے زیادہ تندرست ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی یعنی۔" وہ ادھر ادھر تاکتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ بچوں کی نمائش ہے سمجھے اور سرکار یہ نمائشیں اس لیے مروج کر رہی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ بچوں کی صحت کی طرف مبذول ہو۔ ہی ہی ہی۔" وہ نہ جانے کس کی طرف دیکھ کر ہنسے۔ اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔
"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ ہاں بے بی شو۔ شو کا مطلب ہے۔ مظاہرہ مطلب ہے دکھانا۔ سی یعنی الیس ڈبل ای۔ مطلب دیکھنا اور سی سے شو۔ یہ ناؤن ہے۔ سمجھے ——" پھر خاموش ہو گئے۔
"ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔" وہ پھر کسی طرف دیکھنے لگے۔
حفظان صحت اور زچہ و بچہ کا لیکچر تو محض جملہ معترضہ تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اس احاطے

میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کے بہانے اردگرد کے مجمع میں کسی کو تاکا جائے۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے بچوں کے بہانے وہ عورتوں کی نمائش ہو اور پھر دولت پور کی عورتیں بھی تو ایسی اچھی نہ تھیں ان میں وہ امرتسر اور لاہور والی بات ہی نہ تھی۔ سیاہ رنگ کی دبلی پتلی عورتیں جن کی ہلال نما ٹانگوں پر میلے تنگ پاجاموں کے غلاف چڑھے تھے اور جن کی گودیوں میں انسانی ڈھانچے لٹک رہے تھے۔

ہر جملے کے بعد علی احمد چاروں طرف دیکھتے اور ہر برقعہ پوش کو نگاہوں سے ٹٹولتے جیسے اسے تول رہے ہوں اور پھر ہنسنے لگتے۔

"ہی ہی ہی۔ تم انفینٹ مارٹیلیٹی کو بھی نہیں جانتے تمہیں کالج میں پڑھاتے کیا ہیں وہ۔ دیکھو ہم تمہیں سمجھاتے ہیں" —— "آیئے خان صاحب آیئے۔ کہئے مزاج کیسے ہیں۔" وہ ایک اجنبی سے کہنے لگے۔ "ہاں ہاں میں ایلی کو سمجھا رہا تھا کہ انفینٹ مارٹیلیٹی کے کئے ہیں بچے کو باتیں سمجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے تہوار دکھائے جائیں۔ ہی ہی ہی۔ اور خان صاحب کے جانے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ "ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میں یعنی مطلب ہے۔ ——"

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطلب کیا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں پر واضح کر دے کہ مطلب کیا ہے بلکہ خود انہیں بتا دے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطلب کیا ہے۔

سفید دھبہ' بھوری لٹ

"ہائیں تم ہو تسلیم۔ تم۔" علی احمد ایک اجلے برقعے کی طرف بڑھے تم یہاں۔" برقعہ پوش گھبرا کر رک گئی۔ "تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگے "بھئی میں علی احمد ہوں علی احمد اپنے آغا صاحب اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں تو تھے۔ آج کل کہاں ہیں آغا صاحب۔"

"امرتسر گئے ہوئے ہیں۔" ایک باریک سی سہمی سی آواز سنائی دی "ہاں ہاں امرتسر ہی گئے ہوں گے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا ہی ہی۔"

"پرانے دفتر سے چھٹی لی ہے کیا۔"

"استعفے دے دیا ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے "ہاں ہاں استعفے دینے ہی کو تو کہتے تھے ——"

"اور۔ اور تم یہیں ہو ابھی۔"

"ہم بھی جا رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"اوہ تو تم بھی جا رہی ہو۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا روک ٹوک کہدو۔ آغا صاحب اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہمارے پرانے دوست ہیں ور پھر خاندانی تعلقات ہیں ہی ہی ہی۔"

جھوٹ جھوٹ۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مکڑا اپنے پنجے پھیلا رہا ہو ہی ہی کے تار سے جال بن رہا ہو اور مکھی قریب ہوئی جا رہی ہو اور قریب ——

ایلی کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ علی احمد چھوٹی سی لڑکی سے بھی ہی ہی کیے بغیر نہ رہتے۔ کتنی چھوٹی عمر تھی اس کی جب کہ وہاں علی احمد کے برابر کی عورتیں موجود تھیں پھر ——

شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کسی نوجوان کی توجہ کے لائق تھی۔ پھر دفعتاً" اسے سارہ اور صبورہ یاد آ گئیں اور اسے علی احمد کی آواز سنائی دی۔ سارہ سو گئی کیا۔ ہی ہی۔

"شرماؤ نہیں تسلیم" علی احمد اسے بھرمار رہے تھے "ہاں ہاں برقعہ اٹھا لو کیا حرج ہے۔ ڈرو نہیں۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں"

دفعتاً" سفید رنگ کا ایک دھبہ ایلی کی آنکھوں تلے ابھرا اور گھنگھریالے بالوں کی ایک لٹ لہرائی اور اس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

علی احمد کو تسلیم کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے شدید صدمہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہو۔ ایلی کی نگاہوں میں وہ نمائش دھندلی پڑ گئی۔ بے بس غصے سے اس نے علی احمد کی طرف دیکھا اور پھر مٹھیاں بھینچ کر چل پڑا جیسے اس کے دل میں ایک عزم قائم ہو چکا ہو۔ جیسے اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہو۔

"نہیں نہیں میں اسے سارہ نہیں بننے دوں گا۔ اس کی زندگی تباہ نہیں ہوگی۔ اسے اپنی عمر راہب خانے میں بسر نہیں کرنی پڑے گی نہیں نہیں" وہ چلا رہا تھا۔ اس کے گرد لوگ شور مچا رہے تھے۔ ٹانگے والے چلا رہے تھے۔ عورتیں سینے سے بچے چمٹائے بھاگی جا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ایک ارادہ تھا۔ سامنے شریف مسکرا رہا تھا ہاں۔ ایلی

ہاں۔ محبت کرو۔ چاہے کسی سے کرو لیکن محبت کرو۔

اچھا تو

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا غصے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو
گئے۔ ان آنسوؤں کے دھندلکے میں شریف تحسین بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا "محبت
کے بغیر تم کچھ بھی نہیں ایلی ـــــ کچھ بھی نہیں۔"
اجمل دفتر سے آیا تو ایلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "ایلی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے لڑائی
ہو گئی کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔
"تو کیا شمیم نے کچھ کہا ہے۔"
"نہیں تو" ایلی کی ہچکی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اسے
ہچکیاں کیوں نکل رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی، مگر اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ
کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے اس کا دل چاہتا تھا کہ راز دارانہ انداز میں اجمل کو ایک طرف
لے جائے اور اس سے کہے "مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔"
ایلی بار بار کوشش کرتا کہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھو جائے لیکن ایک سفید سادہ
بھورے بالوں کی گھنگھریالی لٹ کے سوا کوئی اور تفصیل اس کے تصور میں نہ آتی بلکہ یہ
بھی دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کتنا پیارا نام تھا اس کا تسلیم۔ اور آواز۔ کتنی میٹھی کتنی رسیلی
ایلی کی باتیں سن کر اجمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی "ہوں" اس نے ایک آہ
کہا۔ "اچھا تو ایلی کو محبت ہو گئی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ کسی خیال میں کھو گیا اور اس
آنکھوں تلے نجو کا بلوریں جسم منور ہو گیا بجو الہڑ رقاصہ جو اس کے باپ کے داشتہ جاتی کا
تھی اور جسے اس نے کئی ایک سال آنکھوں کا تارا بنائے رکھا تھا۔ وہ نجو جس کو بھلانے کے
اس نے بصرے کی خاک چھانی تھی اور کابل کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی اور جسے بھولنے کی
کوشش میں وہ اب تک ملحقہ چوباروں میں نہ جانے کس کی تلاش کیا کرتا تھا۔

کچھ نہیں سے..... بہت کچھ

اس حادثے کے بعد ایلی کا دولت پور میں رہنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا اس نے وہ آخری
مہینہ بڑی مشکل سے گزرا۔ اب اس کی نگاہ میں علی احمد کی حیثیت ایک راکھش کی رہ گئی تھی
جس کا کام صرف یہ تھا کہ سیتاؤں کو اپنی لنکا کی بھینٹ چڑھاوے اور راجو ساجو تو غلیظ ڈھیروں کے
سوا کچھ نہ تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے ایلی کو گھن آنے لگی تھی۔
البتہ اب جب شمیم عقبی کھڑکی کا سہارا لیتی تو ایلی کو غصہ نہ آتا بلکہ اس کے دل میں
ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی بیچاری جو اس خوفناک لنکا میں بیکار بے مصرف مقید تھی۔ جو جھوٹے
سہاروں پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی جس کے لیے زندگی صبح و شام کے تواتر کے سوا کچھ
نہ تھی۔

ایک ماہ کے لیے کالج میں امتحان کی تیاری کے لیے چھٹیاں ہو چکی تھیں ایلی کتابیں لے کر
اجمل کے پلنگ پر پڑ جاتا۔ ایک گھنگھریالی لٹ اس کی آنکھوں تلے لٹکتی۔ ایک سفید سادہ چاند
کی طرح چمکتا اور وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا اور نگاہوں کو مست بنانے کی شدید
کوشش کرتا چھت سے شریف کی متبسم آواز آتی۔ تم محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں ایلی۔ کچھ بھی
نہیں۔" اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بہت کچھ ہے بہت کچھ ـــــ پھر اسے امتحان دینے کیلئے اجلا
ریاست میں جانا پڑا۔

ریاست اجلا

اجلا ایک ویران شہر تھا۔ جس میں یہاں وہاں آبادی کے ٹکڑے تھے۔ اور کہیں کہیں
خوبصورت محل اور باغات تھے۔ اجلے کا بڑا بازار کا ایک وسیع اور غلیظ کوچہ تھا جس میں سیاہ فام
چست و چالاک قسم کے لوگ ادھر ادھر گھومتے پھرے تھے۔ جن کی زبان کچر کچر چلتی اور جن کی
آواز میں نہ تو دلی کی سی رنگینی تھی اور نہ لاہور کی سی مٹھاس۔ باتوں میں عجیب سی کرختگی تھی۔
انداز میں عمومیت سی تھی جن کی باتیں گویا ننگی تھیں۔ بھونڈی اور ننگی۔
اس بازار کے ادھر ادھر پرانی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ جن پر ویرانی اور اداسی

چھائی رہتی تھی اور جن کی اندھیری لمبی ڈیوڑھیوں میں اونچے لمبے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرا
کرتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان پرانے محلوں میں مہاراج کی وہ رانیاں مقیم تھیں جو مہاراجہ کا
ختم ہو جانے پر ان محلات میں منتقل کر دی گئی تھیں اور زندگی کے باقی دن نوکروں اور اہل کاروں
کی نگاہ التفات کے سہارے بسر کر رہی تھیں۔

ایلی محلات کے نوکروں کو مسرت کی نظر سے دیکھتا۔ دفعتاً" اسے مہاراج پر غصہ آنے لگا
پھر علی احمد کی آواز سنائی دیتی۔ "شرمانے کی کیا بات ہے تسلیم۔ ہم کوئی بیگانے تو نہیں۔" ایلی کی
نگاہوں تلے ایک سفید دھبہ جھلملاتا ایک بھوری لٹ لہراتی اور وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھنے
لگتا اور محسوس کرتا جیسے وہ سبھی کچھ ہو۔

مہاراج

مہاراج کا موتی محل دیکھ کر ایلی سہم گیا۔ کتنے حسین کمرے تھے۔ کتنا خوبصورت سا
سامان تھا ایلی کے لیے اتنی خوبصورتی اور فراوانی قابل حصول نہ تھی۔ زیادہ عالی شان چیزیں
دیکھ کر اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو جاتا تھا ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔

شاہی حمام کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ یہاں رانیاں اور مہاراج نہاتے تھے تالاب میں خوشبو
دار پانی بھر دیا جاتا تھا پھر غلام گردش پر وہ ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔ پھر جب اسے معلوم ہوا
کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت مہاراج سہارا لیتے ہیں تو اس کے دل میں مہاراجوں کے خلاف نفرت
پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا غریبوں کی شرافت اور محبت کی وجہ سے قائم
تھی۔

واپسی پر سندر محل کے دروازے کے قریب وہ رک گئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی
دروازے پر سنتری سے بات کریں۔

ظالم یا مظلوم

"کیوں بھئی یہاں کیوں کھڑے ہو۔" سنتری نے للکارا۔

"جی جی۔" ایلی بولا "یہ محل دیکھنا چاہتے ہیں ہم۔"

"یہ محل نہیں دیکھا جا سکتا۔" وہ بولا۔ مہاراج آ رہے ہیں۔ یہاں اب بھاگ لو

ہے۔"

مجید جو ان سب میں شوخ طبیعت کا لڑکا تھا چلا کر کہنے لگا "وہ جو بوڑھا اور نوجوان لڑکی وہاں
بیٹھے ہیں۔"

تو اس نے اندر باغیچے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کیوں بیٹھے ہیں جی۔"

باغیچہ کے اندر ایک کونے میں ایک بوڑھا اور اس کی نوجوان بیٹی چپ چاپ گھاس پر بیٹھے
تھے۔

سنتری مسکرایا "تم کون ہو بھئی۔" وہ بولا "ہندو ہو یا مسلمان" "الحمد اللہ" مجید نے شوخی سے
کہا۔

سنتری قریب آ گیا "تم نہیں جان سکتے یہ بات۔" اس نے مسکرا کر رازدارانہ انداز سے کہا
"یہ کام نہ تم کر سکتے ہو نہ جان سکتے ہو۔ یہ بڈھا بڑی امید لے کر مہاراج کے دربار میں آیا
ہے۔"

"تو کیا یہ جو اس کے ساتھ لڑکیا ہے اس کی امیدیں ہیں۔ الطاف نے اس گوری نوجوان لڑکی
کی طرف دیکھ کر کہا جس کی نگاہ خمار آلود تھی۔

"ہاں۔" سپاہی ہنسا "اس لڑکی کو اس نے ۱۲ سال تک گائے کا دودھ پلا پلا کر جوان کیا ہے۔
کہتا ہے میں نے لڑکی کے پنڈے پر حلوہ باندھ باندھ کر اسے پالا ہے اس امید پر کہ مہاراج یہ
نزرانہ منظور کر لیں۔"

"اوہ" —— مجید ہنسا "تو یہ نذر نیاز کا معاملہ ہے۔" ایلی نے غور سے اس لڑکی کی
طرف دیکھا جو نو عمر ہونے کے باوجود جوانی سے بھرپور تھی۔ ایلی سوچنے لگا کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا
ہے۔ کیا عورت کے معاملہ میں ہر مرد ہی مہاراج ہوتا ہے۔ وہ۔ وہ کور تھی۔ وہ بھی تو بھائی کو
ملازمت دلوانے کیلئے آئی تھی اور پھر وہ خانم تھی جسے وہ باداموں کی گٹھڑیاں دینے جایا کرتا تھا اور
بالآخر راجو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مہاراج ظالم تھا یا وہ بوڑھا باپ۔

ویرانہ

امتحان سے فارغ ہو کر وہ پھر علی پور آ گیا اس کا خیال تھا کہ علی پور وہی علی پور ہو گا جہاں
سے وہ چند ماہ پہلے گیا تھا جہاں بندرابن کی رنگینی چھائی رہتی۔ کرشن کنھیا بانسری بجاتے اور
ساوری کوٹھے پر ٹہلتی تھی جہاں کپ چھلکتے تھے کیپ بڑے طمطراق سے اپنی نمائش کرتی تھی اور

کچی حویلی کی کبڑی لالٹین کے نیچے علی پور کا جادوگر اپنا سامان لے کر اینکرانیڈی کا ام
پڑھتا تھا مگر اب کی دفعہ وہ علی پور پہنچا تو وہ ایک ویرانہ تھا۔ لق و دق ویرانہ۔

رنگ محل کی عمارت ویران پڑی تھی شریف اور بیگم اپنے کنبے سمیت واپس نور پور
تھے رنگ محل کے جنوبی حصے میں صرف رابعہ اور اس کا ننھا بیٹا ساحر مقیم تھے۔ مغربی حصے
فرحت اور ہاجرہ رہتی تھیں شمال میں اس کے ماموں حشمت علی اور ان کا بڑا بیٹا مفرور رہ
تھے۔ حشمت علی پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں مشغول رہے
ان کا بیٹا پرانی یادوں کو بار بار دل میں دہرانے اور "حافظ خدا تمہارا" کی دھن الاپنے میں مم
رہتا اور کبھی کبھی اپنے نانا سے روپے ہتھیا کر چوری چوری شراب پینے کے شغل میں وقت
کرتا تھا۔

پرویز

رابعہ۔ سیدہ اور انور اجمل کی بہنیں تھیں۔ رابعہ کی شادی نو عمری میں اس کے خالہ
بھائی پرویز سے ہو چکی تھی جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی
تھا اور جس نے دوران تعلیم ہی میں حلقہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ کہا جاتا
کہ مذہب کی اس تبدیلی کا سبب کسی نوجوان لڑکی کا حسن و جمال تھا لیکن اس کے متعلق وثوق
سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ پرویز کی زندگی ایک پر اسرار معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ والد
کا بے حد لاڈلا تھا اسی وجہ سے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی حالانکہ وہ صاحب
شخص نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے بیٹے کی ہر بات پوری کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ
متوسط درجے کے والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود فیشن ایبل حلقوں میں رہنے کا عادی ہو
ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کی سی عامیانہ زندگی بسر کرنے سے نجات حاصل کرنے کی غرض
اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

پرویز کی تبدیلی مذہب گھر والوں کے لیے ایک گہرا صدمہ تھی اس کی والدہ نے اس خبر
اور یوں خاموش ہو گئی جیسے کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ والد نے سنا تو وہ اضطراب
ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ "نہیں نہیں۔" وہ چلائے "ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں پرویز ایسا لڑکا نہیں

اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ خبر درست ہے تو انہوں نے پہلو بدلا "عیسائی ہو گیا تو کیا ہوا۔"
انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال وہ پرویز ہے وہ ہمارا بیٹا
ہے نہیں نہیں اس کا کیا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مگر ان کے انداز سے واضح تھا کہ فرق
پڑتا ہے۔ ایسا فرق جو ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔

پرویز کے متعلق یہ خبر اس کی بیوی رابعہ نے سنی تو اس نے لپک کر ننھے ساحر کو اپنی گود میں
اٹھا لیا اور حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کھو گئی ہو۔ رابعہ نوجوان تھی حسین تھی اور
زندگی کی راہ میں ابھی نو آموز تھی۔

رابعہ کو دیکھ کر ایلی کو پرویز پر غصہ آنا شروع ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ضرور پرویز کے
ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جیسا سارہ کے ساتھ آیا تھا ورنہ عیسائیت کا سہارا کیوں لیتا۔

کیا ہے تجھے

سارہ کا خیال آتے ہی اسے علی احمد یاد آ جاتے اور پھر بے بی شو کا وہ میدان دکھائی دیتا اور
ایک اجلے برقعہ والی لڑکی اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی۔ ایک سفید دھبہ ایک گھنگھریالی لٹ۔ پھر وہ
چپ چاپ گھر جا کر بیٹھ جاتا اور دادی اماں پوچھتی ایلی کیا ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے۔
ایلی۔ ایلی کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔

محلے کا احاطہ ویران پڑا تھا اس لیے کہ ارجمند نہ جانے کہاں کس نوکری پر چلا گیا تھا اور
انکرانیڈی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ایلی گھبرا کے ارجمند کے گھر چلا جاتا جہاں
تخت پر ارجمند کی بانسری پڑی دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ یا کسی وقت جب وہ نگاہ بچا کر مقابل کے
مکان کی طرف دیکھتا اور وہاں کھوری ڈکوری کا کوئی ایڈیشن نظر آتا تو دل پر ٹھیس لگتی۔ پھر وہ کچی
حویلی کی کبڑی خمیدہ لالٹین تلے چلا جاتا لیکن وہاں کھڑا ہونا تو بالکل بیکار تھا۔ اگرچہ کیپ فوراً
کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی اور مسکرا مسکرا کر کسی نہ کسی سے با آواز بلند باتیں کرنے لگتی لیکن ایلی
کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کس طرح ہاتھ ہلائے' رومال لہرائے۔ وہاں بت کی طرح بے
حس و حرکت کھڑے رہنا بھی تو بے معنی بات تھی اور پھر لوگ —— پھر وہ رضا کی دوکان پر جا
بیٹھتا اور رضا اسے دلچسپ باتیں سناتا اور ہر آتے جاتے کو چھیڑتا اور بالآخر ایلی پر فقرے کسنے

شروع کر دیتا۔ "ہوں تو ایلی بابو کو محبت ہو گئی ہے۔ بڑا خطرناک مرض ہے یہ۔ اللہ ہی بچانے والا ہے ورنہ ایسے مریض بچتے نہیں۔" اور ایلی کو اس کی باتوں کے علاوہ اپنی حماقت پر غصہ آتا کہ اس نے اپنی محبت کی بات رضا کو کیوں بتا دی تھی مگر رضا کو بتائے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا علی پور میں اور کون تھا جس سے وہ راز دل کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک رضا تھا نا۔ رفیق بھی تو نوکری کے سلسلے میں کہیں جا چکا تھا۔

حمیدہ رشیدہ

محلے میں اس کے لیے دلچسپی کی کوئی صورت نہ تھی گھر میں بوڑھی دادی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سیدہ تو بالکل ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت دادی اماں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جوان ہونے کے باوجود وہ ازلی طور پر بوڑھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا خاوند اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار سال دو سال کے بعد رات کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ آجاتا پھر اگلی صبح جب ایلی بیدار ہوتا تو اسے خبر ملتی کہ فاضل صاحب آئے ہوئے ہیں وہ دور سے ہی اسے دیکھتا۔ سیاہ فام بھاری بھرکم سا مرد جس کے بال کالے ہونے کے باوجود سفید دکھائی دیتے تھے اور جس کی جھکی ہوئی کمر سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شانوں پر صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا یہاں تک کہ گھر والوں کو اس کو کھسر پھسر سے اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں محبت بھری باتیں کر رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں البتہ جب کبھی ایلی اس کے پاس جاتا تو وہ ایک نہ ایک دلچسپ بات شروع کر دیتا اور ایلی کو یقین نہ آتا کہ اس شکل و صورت کا شخص ایسی چمکیلی اور دلچسپ بات بھی کر سکتا ہے۔

ایلی کے گھر میں سیدہ کے علاوہ سیدہ کی مرحوم بہن نیاز کی بیٹیاں حمیدہ اور رشیدہ بھی رہتی تھیں مگر وہ تو بالکل بچیاں تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام نقی تھا اور جس کے چہرے پر بہت بڑا داغ تھا۔

حمیدہ اور رشیدہ کے آنے سے ایلی کو چند ایک سہولیات ضرور حاصل ہو گئی تھیں کیونکہ اسے دو چھوٹی بہنیں میسر ہو گئی تھیں جو اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتی تھیں اور اس کا کام کرنے میں حقیقی مسرت محسوس کرتی تھیں مگر ان باتوں کے باوجود اسے گھر میں

کوفت ہوتی تھی اور وہ ہر ممکن موقعہ پر رضا کے پاس جا بیٹھتا اور رضا اسے اداس دیکھ کر کہتا "آؤ تمہیں گھما لائیں۔ کیا یاد کرو گے بابو۔"

وہ اپنی لاٹھی سنبھال کے ساتھ ہو لیتا اور جب وہ علی پور کی فصیل کے باہر چکر لگا کر تھک جاتے تو وہ اسے پہلوان اور طفیل کے پاس لے جاتا۔ پہلوان اور طفیل آصفی محلے کے پڑوس میں رہتے تھے پہلوان ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ "آیئے بابو جی۔" اور پھر اپنی تمام تر معصومیت کو لیے ہوئے بیٹھا مسکراتا رہتا۔ طفیل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا جس کی طبیعت میں رنگینی اور تیزی دونوں عنصر موجود تھے۔ وہ دونوں ایلی کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ ایک بلند و برتر ہستی ہو۔ پھر وہ شیخ ہمدم کی طرف جا بیٹھتے جو چمڑے کا سوداگر تھا۔

شیخ ہمدم

پہلی دفعہ شیخ ہمدم کو دیکھ کر ایلی بہت متاثر ہوا تھا۔ شکل و صورت سے معزز دکھائی دینے کے باوجود اس کے خیالات نوجوانوں کے سے تھے اور طبیعت میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ ہمدم پہلا شخص تھا جو عمر اور مرتبے میں بڑا ہونے کے باوجود ایلی سے دوستانہ حیثیت سے ملتا تھا۔ "آیئے الیاس صاحب" وہ اسے دیکھ کر مسکراتا "تشریف رکھیے یہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس چار ایک منٹ میں سودا طے ہو جائے گا اور پھر بیٹھ کر گپ اڑائیں گے۔ "ہاں جی چودھری جی۔" وہ اپنے گرد بیٹھے ہوئے بیوپاریوں سے کہتا "بس جو کہہ دیا ہے نا میں نے وہ عین مناسب ہے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے چودھری صاحب۔ سو کے پیچھے ایک آنہ اور سہی۔ بس چودھری صاحب اب تو مطمئن ہو جانا چاہیے آپ کو۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے اچھا تو سلام علیکم ہاں جی الیاس صاحب۔ تو رہے گی شطرنج کی بازی۔ مگر ابھی تو آپ ناپختہ ہیں اس فن میں بہرحال چلئے۔ ہو ہی جائے ایک بازی۔ ہاں کیا پئیں گے آپ نہیں چائے تو واہیات ہے۔ او لڑکے دودھ والے۔ آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلو کر لانا۔ ذرا بالائی زیادہ ڈالنا۔ الیاس صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی شیخ سے پالا پڑا تھا۔ بابو الیاس صاحب دودھ پیجئے۔ بالائی کھایئے اور ورزش کیجئے ورزش۔ یہی عیش ہے آپ کی قسم۔ ہاں تو کہئے کیسی گزرتی ہے آج کل۔"

شیخ ہمدم میں زندگی تھی۔ جوانی تھی اور اس کے علاوہ وہ معزز شہری سمجھے جاتے تھے اور یہ سب باتیں علی پور میں ایلی کو نصیب نہ تھیں گھر اور محلے والے اسے کھلنڈرہ لڑکا سمجھتے تھے اور

بس وہ اس قابل نہ تھا کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔ اس میں ذہنی چمک تو تھی مگر وہ ڈر اور
خوف کے دبیز پردوں میں دم توڑ رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کفیل نہ تھا جیسے
شیخ ہمدم تھے۔ جب شیخ ہمدم اسے الیاس صاحب کہتے تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا اور اسے محسوس
ہوتا کہ وہ بھی ایک حیثیت کا مالک ہے، باعزت فرد ہے ایک ایسا شخص جو بالغ العقل ہے۔

ان باتوں کے باوجود ایلی زیادہ دیر تک شیخ ہمدم کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا کیونکہ جلد ہی اس
پر احساس کمتری چھا جاتا اور وہ وہاں سے چلے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتا۔ گھر آکر
چارپائی پر لیٹ جاتا اور شریف کی سی آنکھیں بنا کر چھت کو گھورنے لگتا چھت پر ایک سفید
دھبہ چمکتا اور ایک بھوری لٹ لٹکتی دو سیاہ آنکھیں ڈولتیں۔ بار بار آہیں بھرتا اور پہلو بدلتا اور
محسوس کرتا کہ زندگی ایک مسلسل کوفت ہے ایک دکھ بھری کیفیت۔

نتیجہ

ایلی کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اپنی تعلیم
کا ناکامی کو ایسی چابکدستی سے ناکامی محبت کی طرف مبذول کر دیا کہ اسے فیل ہونے کا کوئی
صدمہ نہ رہا۔ وہ الجھی ہوئی لٹ اور پر پیچ ہو گئی اور اس سفید دھبے میں دل کے خون کی ہلکی سی
سرخی شامل ہو گئی۔

نتیجہ کے اعلان کے بعد علی احمد کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایلی کو مختصر طور پر ہدایت
کی گئی تھی کہ وہ امرتسر جا کر ایڈورڈ روڈ پر روشن لال سے ملے خط میں علی احمد نے یہ نہ لکھا تھا
کہ یہ روشن لال کون تھے اور ان سے ایلی کو ملانے کا مقصد کیا تھا۔ ایلی صرف اس حد تک سمجھ
سکا تھا کہ روشن لال علی احمد کے دوست تھے اور انہوں نے کسی نجی کام کے لیے اس سے روشن
لال سے ملنے کو کہا تھا۔

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ روشن لال امرتسر آریہ کالج کے پرنسپل تھے اور علی احمد کا مقصد اس
ملاقات سے صرف یہ تھا کہ روشن لال ایلی کو امرتسر آریہ کالج میں داخل ہونے پر رضامند کر لیں
اور وہ لاہور میں آوارگی کرنے سے محفوظ ہو جائے انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایلی کی سب سے
بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ امرتسر جائے وہاں ایک سال رہتا تو بہت بڑی خوش نصیبی تھی
شاید انہیں بے بی شو کا وہ معمولی واقعہ یاد ہی نہیں رہا تھا ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری

پڑی تھی اس لیے انہوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن ایلی کے لیے اب بے بی شو کا
وہ دن ایک تاریخی دن تھا ایک ایسا دن جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔

پرنسپل

روشن لال خوش شکل اور جوان قسم کے آدمی تھے ان کے بشرے سے ذہانت اور بے تکلفی
ٹپکتی تھی۔

"ہوں ——" وہ بولے "تو تم علی احمد کے لڑکے ہو۔ جانتے ہو علی احمد میرے
دوست ہیں لنگوٹیے دوست مگر تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ علی احمد کے بیٹے کو گھبرانا زیب
نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ چائے پیو گے نا۔ اوہ تو تمہیں مجھ سے زیادہ ان سنہری مچھلیوں سے دلچسپی
ہے۔" ایلی کو بلور کے مرتبان میں تیرتی ہوں مچھلیوں کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ ہنسنے
لگے۔

"اچھا تو الیاس یہ بتاؤ کہ جب مرتبان کا پانی گندہ ہو جائے اور مچھلیوں کو تازہ پانی بہم پہنچانا ہو
یعنی مرتبان کا پانی بدلنا ہو تو کیا کریں گے۔

ایلی سوچنے لگا "ہاں ہاں سوچ لو۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں۔
سائنس پڑھی تھی نا تم نے دسویں میں۔"

ایلی ان کی بے تکلف باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اس کا تو خیال تھا کہ روشن لال اسے کوئی
ضروری پیغام دیں گے اور بزرگانہ انداز میں کچھ فرمانے کے بعد یہ ملاقات ختم ہو جائے گی مگر وہ تو
اس سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ علی احمد کی بجائے خود ایلی کے دوست ہوں۔

"اچھا تو الیاس تمہارے مشاغل کیا ہیں؟"۔ وہ پوچھنے لگے۔ "سنا ہے فی الحال فیل ہونا تمہارا
شغلہ ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا تو میرا بھی یہی شغل تھا۔ کئی ایک سال میں کامیابی سے
فیل ہوتا رہا۔"

ایلی حیران تھا کہ انہیں کیا جواب دے وہ بڑے شوق سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا
رہا تھا "اچھا بھئی" بالآخر وہ بولے "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم تمہیں اپنے کالج میں داخل کر
لیں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ کیوں۔"

"آپ کا کالج"۔ ایلی نے خوشی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" وہ بولے "ایک چھوٹا سا کالج ہے اور اسے چلانا میرے ذمہ ہے تم اگر میرے کالج میں داخل ہو جائیں تو بڑا اچھا ہو۔"

"جی ہاں۔" ایلی خوشی سے جھوم گیا۔ ایک تو امرتسر اور پھر روشن لال صاحب صورت اور کیا ہو سکتی تھی اور وہ داخل ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

ہال دروازے میں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یہاں رہتی ہے اس شہر میں بیٹھتی ہو گی اس نے بازار میں چلتے ہوئے تانگوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ان سڑکوں پھرتی ہو گی کتنی خوش نصیب ہیں یہ سڑکیں یہ راستے یہ تانگے یہ ہوا۔ ایک سفید سا نگاہوں تلے چمکنے لگا اور گھنگھریالی لٹ لہرا لہرا کر اسے بلانے لگی۔ اللہ کرے ابا روشن لال مان لیں اور میں امرتسر کالج میں داخل ہو جاؤں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ تجویز تو خود تھی جسے روشن لال نے اپنی جانب سے پیش کیا تھا تاکہ ایلی کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے میں داخل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لاہور میں داخل ہونے کا مطالبہ نہ کرے۔

دس دن کے اندر اندر علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں اسے امرتسر میں داخل اجازت دے دی گئی اور وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر امرتسر آ پہنچا اور آریہ کالج میں داخل اور پرنسپل روشن لال نے اسے بورڈنگ میں داخل ہونے کی خصوصی اجازت حاصل کیونکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔

آم اور سانپ

بورڈنگ شہر سے بہت دور نہر کے کنارے آموں کی کوٹھی میں واقع تھی۔ آموں کی ایک ویران جگہ تھی زرد رنگ کی یہ پرانی عمارت چاروں طرف سے آم کے درختوں سے ہوئی تھی جہاں رات بھر زمین پر سانپ رینگتے اور دن بھر الو بولتا۔ مغرب کی جانب سڑک تھی جس کے پرے امرودوں کا ایک باغ تھا جنوب کی طرف نہر بہتی تھی اور طرف ویران زمین تھی۔

کوٹھی سے ایک پختہ سڑک شہر کی طرف نکل گئی تھی۔ سڑک کا یہ ویران ٹکڑا تھا جس کے دونوں طرف اونچے لمبے درخت لگے تھے اور وہ اتنے گھنے تھے اور تعداد میں زیادہ تھے کہ اچھی خاصی جنگل کی شکل بن گئی تھی۔ سڑک کے اس ویران ٹکڑے

کمپنی باغ اور ٹھنڈی کھوئی تھی۔

اڑتے پھلکے

بورڈنگ میں تقریباً بارہ تیرہ کمرے تھے جن سے ہٹ کر دو کمرے تھے جو باورچی خانے کے لیے مخصوص تھے جن میں چار ایک غلیظ باورچی اور نوکر ہر وقت کام کاج میں مصروف رہتے تھے۔ کوٹھڑی کے مشرق میں دو بڑے کمرے بنگالی پروفیسر بیز جی کے لیے مخصوص تھے جو بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور اکثر چوری گھر میں مچھلی پکا کر کھایا کرتے تھے کیونکہ بورڈنگ میں گوشت مچھلی اور انڈا پکانا قانونی طور پر منع تھا۔ بورڈنگ کے باورچی خانے میں آلو ساگ بھنے ہوئے ٹنڈے بینگن کا بھرتہ اور دالیں پکتی تھیں۔ سوئی کے باہر ایک لمبی میز پڑی تھی یہ میز لڑکوں کا ڈائننگ ہال تھی۔ بندو باورچی چھوٹے چھوٹے پھلکے پکا کر انہیں باورچی خانے سے پر اسرار رکابیوں کی طرح ہوا میں پھینکتا اور باہر میز پر بیٹھے ہوئے لڑکے انہیں دبوچتے۔

"بندو پھلکا۔" رام لال چلاتا اور بندو ایک زرد زرد سا پھلکا فضا میں چھوڑتا جو رام لال کے ہاتھوں میں آ گرتا۔ ایلی بندو کی چستی اور نشانے پر حیران رہ گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ باورچی خانے کے باہر سفید زمین پر ایک لمبی غلیظ میز پر دس بارہ لڑکے کٹوریاں سامنے رکھے بیٹھے تھے اور بندو کے پھلکے کبوتروں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"بندو پھلکا" اور ایک ساعت میں ایک پھلکا پکارنے والے کے ہاتھ میں آ گرتا۔

"بندو دال۔" ایک لڑکا چیختا اور ہنستا ایک کٹوری لے کر بھاگتا۔

ایلی کے لیے کھانے کی میز کا یہ منظر بالکل نیا تھا۔ نیا اور انوکھا۔ لیکن اسے اجازت نہ تھی کہ وہ اس میز پر بیٹھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان کے لیے جنرل ٹیبل پر بیٹھنا منع تھا اس کے لیے کچن کے برتنوں کو استعمال کرنا ممنوع تھا۔ خوش قسمتی سے اس سال بورڈنگ میں دو اور مسلمان لڑکے داخل ہو گئے تھے جنہیں خصوصی وجوہ کی بناء پر وہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی اور ان تینوں کا فرض تھا کہ یا تو وہ سب سے پہلے کھانا کھا لیں اور یا سب کے بعد اور یا کمرے میں بیٹھ کر جب جی چاہے کھائیں بشرطیکہ اس وقت کوئی نوکر فارغ ہو جو ان کے لیے کھانا لا سکے۔

کٹوریاں

نوکر ان زرد کٹوریوں میں کھانا لے آتا اور پھر کٹوریوں میں انگلیاں ڈال کر بڑی بے تکلفی

سے دال یا سبزی ان کے ذاتی برتنوں میں انڈیل دیتا۔ اس عمل کے دوران میں وہ احتیاط رکھتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ان کے برتنوں سے چھوکر بھرشٹ نہ ہو جائے اور پھر وہ تینوں باری باری چلاتے۔ "بندو پھلکا" اور پھلکے ہوا میں اڑتے اور برتن بجتے اور وہ تینوں ایلی شفیع اور مولا داد شور مچاتے۔

ہفتے کو سر شام ہی سے کچن سے باہر دودھ کی بڑی بڑی گاگریں قطار میں پڑی دکھائی دیتیں نہ جانے وہ گاگریں کہاں سے آتی تھیں۔ شام کو ہر آدھ گھنٹے بعد کوئی مہرا سر پر گاگر اٹھائے تیزی سے نیم چلتا نیم بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ اس کا جسم میل سے بھرا ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں گاگر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور کہنیوں تک بازو دودھ میں تر ہوتے دودھ کی چھلکتی ہوئی گاگر لیے بھاگا آتا اور پھر بسنتے یا رامو کی مدد سے گاگر اتار لی جاتی۔

ہفتے کی رات بندو بڑے بڑے کڑاہے چولہوں پر رکھ کر آگ جلا دیتا اور پھر رات بھر ان کڑاہوں میں چمچہ چلانے کی آوازیں آتیں اور بندو باری باری بسنتے اور رامو کو ڈانٹتا۔ اگلے روز بڑی بڑی زرد تھالیوں میں کھیر ڈال دی جاتی اس پر لڑکے خوشی سے پھولے نہ سماتے اور پھر میز پر بیٹھ کر کھیر بھری انگلیاں چاٹتے۔ اس روز بندو کے پھلکے ہوا میں نہ اڑتے اور کٹوریاں باورچی خانے کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی جاتیں۔

معزز آدمی

شفیع۔ مولا داد اور ایلی بورڈنگ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ شفیع پتلا دبلا دراز قد لڑکا تھا جس کے خدو خال سے چستی اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کے والدین امرتسر کے قریب کسی گاؤں کے زمیندار تھے۔ مولا داد کوتاہ قد اور جسیم تھا۔ خدو خال سے وہ کالج کا لڑکا معلوم نہ ہوتا تھا اور گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی گاؤں کا جاٹ بھول کر شہر میں آ نکلا ہو۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا۔ کم از کم ایلی کے لیے تو وہ لباس بہت ہی انوکھا تھا اس کے لباس کو دیکھ کر پہلے ہی روز پرنسپل نے اسے دفتر میں بلا لیا اور کہنے لگے۔

"مولا داد یہ کیا حلیہ بنایا ہے تم نے۔"

"حلیہ" مولا داد نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا پرنسپل صاحب میں تو اپنے گاؤں کا ایک معزز آدمی ہوں اور جناب حلیہ تو مجرموں کا ہوتا ہے۔" مولا داد کی آواز لہجہ

انداز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور معصومیت تھی۔

"نہیں۔ نہیں یہ تہ بند کالج میں نہیں چلے گا۔ کوئی شلوار نہیں ہے تمہارے پاس پہننے کے لیے۔"

"مل جائے تو پہن لوں گا۔" وہ بولا۔

اس پر پرنسپل نے کسی فنڈ سے اسے دو شلواریں سلوا دی تھیں۔ اس کے بعد بورڈنگ سے چلتے وقت مولا داد ایک شلوار اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر لے جاتا۔ جب کالج کی گھنٹی بجتی تو وہ تہ بند اتار کر جھٹ شلوار میں داخل ہو جاتا اور جماعت میں جا بیٹھتا جہاں خالی پیریڈ آتا وہ شلوار کاغذ میں لپیٹ لیتا اور تہ بند باندھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔

"بھئی اب کرو بات۔" وہ چلاتا۔ "یار اس شلوار میں تو دم گھٹتا ہے۔"

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مولا داد کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا اس نے کبھی اپنے گاؤں اور والدین کا ذکر ہی نہ کیا تھا البتہ اسے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا اور اس کے زیادہ تر اخراجات کالج والے خود ادا کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کرکٹ کا ایک نہایت عمدہ کھلاڑی تھا اور بائیں ہاتھ سے گھگی گیند پھینکنے کی وجہ سے کالج والے اس کی عزت کیا کرتے تھے۔

شفیع یا تو سانپ مارنے کے شوق میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور یا ہاکی کھیلنے کے متعلق گپیں سناتا رہتا۔ مولا داد تہ بند جھاڑتا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے ہفتے میں اس نے لنگوٹا باندھ کر جبڑے پر رومال باندھ کر ہاتھ میں لٹھ لے لیا اور رات کے وقت سڑک پر دو رویہ درختوں میں جا چھپا۔ جب بھی کوئی بورڈنگ سے متعلقہ لڑکا سڑک پر آتا دکھائی دیتا تو وہ لٹھ لے کر درختوں سے باہر نکل آتا۔

رکھ دے یہاں جو بھی تیرے پاس ہے وہ ڈاکو بن کر انہیں ڈانٹتا۔ اس طرح پہلی رات اس نے کئی پنسلیں۔ چاقو۔ گھڑیاں اور سات روپے بارہ آنے نقد جمع کر لیے تھے اور بورڈنگ کے لڑکوں کے دل میں سڑک کے اس ویران حصے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

میں ہوں!

سویرے وہ تینوں تیار ہو کر کالج کی طرف چل پڑتے اور دو گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد کالج پہنچتے کیونکہ انکے پاس بائیسکل نہ تھے اور تانگے پر جانے کی توفیق نہ تھی۔ راستے میں

مولا داد بار بار تہہ بند جھاڑتا جاٹوں کی طرح چنگھاڑتا اور عجیب و غریب حرکات کرتا۔

شفیع یا تو مست انداز میں کوئی دھن گنگناتا رہتا یا ہاکی کے میچوں کے متعلق قصے سناتا
چپ چاپ اپنے خیالات میں کھویا چلا جاتا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ جانے اسے معلو
ہے یا نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس کا پتہ لگائے اسے صرف یہی معلو
کہ اس کے بھائی پہلے کسی دفتر میں ملازم تھے اور اب ان کا ارادہ تھا کہ ملازمت چھوڑ
شروع کر دیں اور ان کا نام آغا صاحب تھا۔ آغا غلام بخش۔"

وہ امرتسر میں آوارہ پھرتے ہوئے بڑے غور سے لوگوں کے بورڈ پڑھتا رہتا کہ شاید کہیں
غلام بخش کا بورڈنگ ہو مگر کئی روز تک وہ بے کار گھومتا رہا اور اسے وہ بورڈ نظر نہ آیا۔

ایلی کے دل میں تسلیم کے متعلق نقوش دھندلے پڑتے جا رہے تھے اور جوں جوں
دھندلے پڑتے ڈوبتے کے مانند وہ ان تنکوں سے شدت سے چمٹے جاتا جس قدر وہ نق
دھندلے تھے اسی قدر اس کا جذبہ محبت بڑھتا جا رہا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کہیں وہ شکل اس کے دل
محو نہ ہو جائے اور اسے محبوبہ کی از سرنو جستجو کرنی پڑے کہیں ایک مرتبہ "سب کچھ" ہو
کے بعد وہ پھر سے "کچھ بھی نہ" نہ رہ جائے۔

برقعہ میں لپٹی ہوئی ہر عورت کو وہ امید بھری نگاہ سے یوں دیکھتا جیسے اسے توقع ہو کہ
سے اس کے پاس چلی آئے گی اور قریب آکر برقعہ اٹھا کر رازدارانہ انداز سے جھانکے گی او
بھرے لہجے میں کہے گی۔ تسلیم میں ہوں۔"

ہر برقعہ پوش لڑکی جب اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتی تو اسے دکھ سا محسو
لیکن جلد ہی دور سے آتی ہوئی کوئی اور برقعہ پوش اس کی امید کا مرکز بن جاتی اور وہ بڑ
سے اسے ٹٹولتا شاید وہ نورانی دھبہ اور گھنگھریالی لٹ اس برقعے میں ملفوف ہو۔ اکثر مرتبہ ا
ہوتا کہ کمپنی باغ میں ٹہلتے ہوئے اسے لڑکیوں کے گروہ دکھائی دیتے جنہوں نے برقعے
ہوتے اور اسے کئی ایک سفید دھبے اور گھنگھریالی بھوری لٹیں دکھائی دیتیں اور اس کی سمجھ
آتا کہ ان میں سے کون سی تسلیم ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کی طرف دیکھے
سبھی گوری چٹی لڑکیاں حسین معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب
اور رازدارانہ انداز میں نہ کہتی۔ "تسلیم۔ میں ہوں۔" یہ صورت حال بے حد تکلیف
اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ امرتسر میں وہ کسی سے دل کی بات نہ کہہ سکتا تھا۔

شفیع تو صبح و شام سانپ مارنے۔ اچھلنے کودنے۔ گنگنانے اور بالآخر ہاکی کی دلچسپی میں کھویا
رہتا تھا اور مولا داد کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ اس سے کوئی رنگین بات بیان ہی نہ کی جا
سکتی تھی۔ کالج میں بیسیوں لڑکے تھے مگر وہ ان سے اچھی طرح واقف نہ تھا مثلاً مدھوک تھا۔
اونچا لمبا پیارا سا ساتھی۔ جس کے انداز سے بے پناہ ہمدردی ٹپکتی تھی اور جس کی آنکھوں پر
گھنی اور لمبی بھویں عجیب ہیبتناک اثر رکھتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ایلی کے لیے
مدھوک سے ایسی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر وہ پست قد بشیر تھا مگر وہ تو سراسر مسخرہ تھا اس سے
کوئی سنجیدہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ آصف تھا۔

آصف——

آصف ایک خوبصورت اور دراز قد لڑکا تھا جو بات بات پر شرما جانے کا عادی تھا اور جس کے
جذبات ہر لحہ اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی صورت میں ناچتے رہتے تھے۔ معمولی سی بات پر
اس کے رخساروں پر ایک گلابی لہر دوڑ جاتی۔ نگاہیں جھک جاتیں آنکھوں میں پھلجھڑیاں سی چلتیں
اور جسم بید کی طرح جھولتا۔

آصف زیادہ باتیں کرنے کا شوقین نہ تھا اور نہ ہی محفل میں جانے کا دلدادہ جب بھی لڑکے
خالی پیریڈ میں کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے وہ مسکراتا ہوا آنکلتا اور چپکے
سے ایلی کو اشارہ کرتا اور وہ دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے اور یا تو پہلوان کی دوکان پر
بیٹھ کر پوری کچوری کھاتے یا راموپان والے سے پان سگریٹ خریدتے۔ بازاروں میں گھومتے
پھرتے ہوئے جب بھی کوئی عورت قریب یا دور سے گزرتی جس کے سینے پر سلوٹ پڑے ہوتے
تو آصف ایلی کو کہنی مار کر چپکے سے کہتا۔ "وہ دیکھو۔ ادھر‘ وہ ادھر۔"

آصف کو کپڑے کی سلوٹوں اور متناسب جسم کے دائروں سے بے پناہ دلچسپی تھی جسے اس
نے عام لڑکوں کے سامنے کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اس کے احساسات بے حد پاکیزہ اور لطیف تھے اور
زبان میں شاعرانہ رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن عورت کے جمال کے علاوہ اسے اس سے
کوئی اور دلچسپی نہ تھی بلکہ عورت کے قرب کا ڈر اس کے دل میں خطرناک قسم کی شدت اختیار
کر چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کے جمال کو دیکھے۔ اس کے جسم کے خم و پیچ کو جانچے چوری
کی حس سے محفوظ ہو مگر دیکھے جانے والی کو احساس نہ ہو جائے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔

نگاہیں چار نہ ہو جائیں اگر کوئی شوخ راہ گیر نگاہ بھر کر اسے دیکھ لیتی تو آصف کو پسینہ آ
آنکھیں پلکوں تلے غروب ہو جاتیں اور رخساروں پر یوں ہوائیاں سی چلتیں جیسے غروب آ
کے وقت بادلوں میں گلابی نقوش بنتے بگڑتے ہیں۔

آصف کی طبیعت ایسی تھی کہ دیر تک اس سے دل کا راز نہ کہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے
نے ایک روز ٹہلتے ٹہلتے اس سے اس دھبے اور گھنگھریالی لٹ کا راز کہہ دیا۔ ایلی کا قصہ سن
آصف نے ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں
گلابی بوندیوں کی پھلوار پڑنے لگی "تم تو چھپے رستم ہو۔" وہ مسکرانے لگا۔

آصف سے درد دل کہنے کا ایلی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ کسی لڑکی نے نقاب پلٹ کر
"تسلیم میں ہوں۔" اور نہ ہی کسی بورڈ پر آغا غلام بخش لکھا نظر آتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ
ایلی لڑکوں میں کھڑا ہوتا تو آصف چپکے سے آکر کہتا "تسلیم" اور ہاتھ اٹھا کر سر جھکا کر
مسکرائے جاتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھا رہا ہو جتا رہا ہو۔

گلابی جھینپ

ایک روز حسب معمول آصف اور ایلی دونوں کالج گراؤنڈ کے درمیان کھڑے مہر کو
دیکھ رہے تھے جو کالج کا حسین ترین نو عمر لڑکا تھا۔ مہر بھاگتا ہوا آرہا تھا دفعتاً اسے ٹھوکر لگی
اس کی ٹوپی دور جا پڑی۔ گھنگھریالے بال بکھر گئے۔ اس پر آصف مدہم آواز میں گنگنایا "کہیں
تو نہیں تمہاری تسلیم" اور ایلی نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا پھر محسوس کرنے لگا جیسے
ہم شکل ہو۔

اس کے بعد کی تمام تر بکھری بکھری توجہ مہر پر مرکوز ہو گئی اس کے ذہن میں تسلیم
روپ دھار لیا۔

علی الصبح ایلی بڑے شوق سے کالج آتا اور پھر آتے ہی اس دروازے پر کھڑا ہو جاتا جہاں سے
مہر داخل ہوا کرتا تھا اور وہاں کھڑا مہر کا انتظار کرتا رہتا۔ مہر آجاتا تو ایلی کے جسم میں بجلی
کرنٹ سی دوڑ جاتی اور پھر وہ سارا دن یہ سوچتا رہتا کہ کس مقام پر کھڑا ہو۔ اور کس
دیکھے تاکہ مہر کا مسکراتا ہوا چہرہ پورے طور پر اسے نظر آتا رہے۔ دوپہر کے وقت جب
ہوتی تو آصف اور ایلی کالج کے دروازے کی طرف بھاگتے جس سے گزر کر مہر گھر جاتا

گزر جاتا تو دونوں پہلوان کی دوکان پر پوریاں کھاتے نسائی خم و پیچ دیکھتے۔ مہر کی واپسی کا انتظار
کرتے۔ اگرچہ مہر کی حیثیت محض نعم البدل کی تھی لیکن اس سفید دھبے اور بھوری لٹ کی
نسبت جسے ڈھونڈ نکالنے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ یہ نعم البدل ایک مثبت اور ٹھوس حقیقت
تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جس پر ایک خواب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ چونکہ مہر نہ تو گردن
اٹھانے کا عادی تھی۔ نہ قریب آکر بات کرنے کا۔ اس کے برعکس وہ ایک دور کا موہوم تبسم اور
گلابی جھینپ کی آمیزش تھا۔ لہٰذا چاہے وہ لڑکا تھا یا لڑکی ایلی کے لیے چنداں فرق نہیں پڑتا تھا۔

کالج کے بعد ایلی اور آصف امرتسر کے بازاروں اور باغات میں گھومتے رہتے یا آصف کے
گھر جا بیٹھتے۔ آصف گھومنے کا بہت شوقین تھا مگر اسے اپنے والدین کی عزت اور اپنی نیک نامی کا
بہت خیال رہتا تھا۔ بازاروں میں چلتے ہوئے وہ ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تاکہ اس کے رویے سے
آوارہ پن ظاہر نہ ہو نہ ہی وہ ایسے علاقوں میں جانے کے لیے تیار ہوتا جہاں پائے جانے پر بدنامی
کا خدشہ ہو مثلاً وہ کٹڑہ رنگین میں کبھی داخل نہ ہوتا حالانکہ یہ کٹڑہ ان کے مکان کے قریب ہی
تھا۔

کٹڑہ رنگین

کٹڑہ رنگین میں رقاصائیں رہتی تھیں اور وہاں سے ہر وقت دلکش آوازیں آیا کرتیں۔
کبھی دور سے سارنگی بین کرتی ہوئی سنائی دیتی کبھی ستار رقص کرتی اور کبھی طبلہ کی تھاپ سن کر
ایلی کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس وقت ایلی کا دل چاہتا کہ ایک بار کٹڑہ رنگین میں سے
گزرے اور ان آوازوں کو قریب سے سنے۔ آصف بھی ان آوازوں کو سن کر مسکراتا اور اس کی
آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑتی لیکن وہ ایک لمبی آہ بھر کر کسی اور طرف مڑ جاتا۔ ایلی
آصف کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے وہ بھی کبھی اس کٹہڑے میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہاں اکیلے جانا
بھی تو مشکل تھا اس نے کئی بار ادھر کا رخ کیا تھا مگر موڑ پر جا کر وہ گھبرا جاتا اور اس کا دل دھڑکنے
لگتا۔

کئی ایک مرتبہ شیخ ہمدم کے ساتھ بھی اسے امرتسر کے بازاروں میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔
ہمدم تجارت کے سلسلے میں امرتسر آتے رہتے تھے اور ہمیشہ آنے سے پہلے خط کے ذریعہ ایلی کو
اطلاع دے دیتے "الیاس صاحب میں آرہا ہوں شام کو تین بجے مجھے کمپنی باغ کے مرکزی پلاٹ

میں ملیے۔ وہاں سے ہم سینما جائیں گے۔

ہمدم ایلی سے ملتے ہی مخصوص انداز میں چلانا شروع کر دیتے "ایلی صاحب یہ کیا مصیبت ہے آپ ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے قیامت ٹوٹی ہوئی ہو' عشق تو نہیں ہو گیا کہیں۔ عشق سے بچنے کا بہترین طریقہ ہم بتائیں گے۔ آیئے آیئے نا صاحب۔" اور وہ اسے دودھ کی دوکان پر لے جاتے۔ ہاں پہلوان ذرا آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلونا۔ بس الیاس صاحب صبح و شام کھاؤ پیو انشاء اللہ عشق قریب نہیں پھٹکے گا۔ اس مرض کے لیے دودھ ہی تریاق ہے اور سگریٹ اور چائے سے پرہیز لازم ہے۔ آیئے اب سینما چلیں۔ سینما دیکھنا صحت کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے آیئے رام باغ میں مسٹریز آف نورا کی فلم لگی ہے۔ اور وہ دونوں سینما چلے جاتے وہاں سگریٹ پیتے پوریاں کھاتے اور پھر شیخ ہمدم رات کی گاڑی سے واپس علی پور چلے جاتے اور ایلی آموں والی کوٹھی کا رخ کر لیتا۔ ایلی کے دل میں ایک دبی دبی امید تھی کہ شاید کسی روز شیخ ہمدم یاسمین سینما ہاؤس جانے کا ارادہ کر لیں جو کٹڑہ رنگین میں واقع تھی لیکن ہمدم نے کبھی اس ہال میں جانے کی بات نہ کی تھی۔

پھر ایک روز امرتسر میں دو مشہور شاعر تشریف لائے۔ جن سے آصف کے گہرے تعلقات تھے ان کی آمد پر آصف کو امرتسر میں ایک عظیم مشاعرے کا انتظام کرنا پڑا اور حسن اتفاق سے وہ مشاعرہ یاسمین سینما ہال میں ہونا قرار پایا۔ جو اس ممنوع کٹڑہ میں واقع تھا آصف نے پہلے تو بہت کوشش کی کہ مشاعرے کا انتظام کسی اور جگہ ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بہر حال آخر کار اسے کٹڑے میں جانا ہی پڑا۔

کٹڑہ رنگین امرتسر کے خوب صورت ترین بازاروں میں سے تھا اس کی لمبائی ایک فرلانگ سے زیادہ نہ تھی ویسے کافی فراخ تھا۔ سڑک کے دورویہ خوبصورت چوبارے بنے ہوئے تھے جن کے چھجے بڑھے ہوئے تھے جن پر رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ ان چھجوں کے پیچھے فراخ چوباروں میں چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹکتے دکھائی دیتے تھے۔ جنگلوں میں خوب صورت رقاصائیں دیدہ زیب ملبوسات پہنے بڑے طمطراق سے بیٹھی غلط انداز سے نیچے بازار کی طرف دیکھتی رہتیں۔ ان کی حرکات جمیل تھیں آوازیں لوچدار تھیں۔

ایلی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کبھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ ناچنے گانے والی عورتیں

قدر لطیف انداز اختیار کر سکتی ہیں خصوصاً وہ چوبارے جو اس کے متصل اور ملحق تھے ان کی مکین تو بے حد جاذب نظر تھیں۔ بازار میں دورویہ خوبصورت دوکانیں تھیں جن میں پنواڑیوں کی کثرت تھی۔

پنواڑیوں کی دوکانوں پر آتے جاتے پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے اور پھر عاشقانہ نظروں سے چوباروں کی طرف دیکھتے۔ ان کے متعلق فقرے چست کرتے یا عریاں اشارے کرتے جس پر چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصائیں لطیف تبسم سے منہ پھیر لیتیں۔

شام کے وقت اس کوچے میں گویا بہار آجاتی تھی۔ چوبارے والیاں شام سے پہلے ہی نہا دھو کر نیا جوڑا بدلتیں سنگار کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر جنگلے میں آبیٹھتیں۔

رات پڑتے ہی محفل ہائے نشاط آراستہ ہو جاتیں۔ کٹڑہ موسیقی کی آوازوں سے گونجتا سارنگیاں چھڑ جاتیں گھنگھرو بجتے لے بلمپت سے شروع ہو کر درت ہوتی جاتی اور جوں جوں رات بھیگتی گیت کے بولوں کی ادائیگی میں عریانی کا عنصر بڑھتا جاتا۔

نیچے بازار میں محروم مگر شوقین مزدوروں کی پلکوں سی سڑک اور دیواریں رنگی جاتیں اور ان کے نعرے بلند ہوتے جاتے۔

"میری جان۔"

"ایک نظر ادھر بھی۔"

"ڈھول کھنا دل پرد۔ سیاں دارا جی رکھنا۔"

بالآخر ان کی محرومی اضطراب میں بدل جاتی اور کسی معمولی سے بہانے پر یہ اضطراب شدت اختیار کر لیتا اور پھر آپس میں گالی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی اور کٹڑہ میں لڑائی شروع ہو جاتی کسی کا سر پھٹ جاتا کسی کا پیٹ چاک کر دیا جاتا پھر پولیس میدان عمل میں آپہنچتی۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ کی سی نگاہیں ڈالتے ہوئے چوباروں میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اس ہنگامے سے گھبرا کر میراثیوں کو برخواست کر دیتے اور رقاصہ کا قرب حاصل کر کے خود کو ایک شدید تر ہنگامے کے حوالے کر دیتے تاکہ کٹڑے کے ہنگامے سے نجات حاصل کر سکیں۔

مجسم شعر

ایلی یاسمین سینما کی فراخ ڈیوڑھی میں کھڑا حیرانی سے کٹڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سینما

کے مقابل کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی رقاصہ کس قدر حسین و جمیل تھی۔ اس کی حرکات
قدر متوازن اور دلفریب تھیں۔ اس کا وہ بے پروائی اور بے نیازی بھرا انداز اسے اور بھی
صورت بنا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رقاصہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکت سے
ستا پن۔ عریانی یا نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آصف سینما ہال کے اندر چھپا ہوا تھا تا کہ کوئی اسے وہاں دیکھ نہ پائے۔ ایلی ڈیوڑھی
کھڑا چوری چوری چوباروں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے دائیں بائیں کھڑے سبھی لوگ
تکلفی سے طوائفوں کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ادھر دیکھتے ہوئے اس کا
دھڑکنے لگتا ایک ان جانا سا خوف طاری ہو جاتا حالانکہ وہ سب ادھر دیکھنے میں اس حد تک
مصروف تھے کہ انہیں ایلی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور اگر فرصت ہوتی بھی تو وہ
کے اس فعل کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے۔

دفعتاً ایک اور گروہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس کے پیش پیش ایک نوجوان تھا جس
بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں میں مستی جھلک رہی تھی اور چہرے سے شگفتگی اور ذہانت
تھی۔

"اخاہ ——" وہ سامنے کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف دیکھ کر بے تکلفی
سے چلایا "سبحان اللہ۔ حضور تو مجسم شعر ہیں۔ واہ وا۔ واہ وا۔" وہ ٹکٹکی باندھ کر دیوانہ وار
رقاصہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی مسکرانے لگے۔

"واہ واہ کیا انداز دلبری ہے حسن بذات خود انگشت بدناں ہے۔" رقاصہ نے شور سن کر
ایک بھرپور نگاہ اس نوجوان پر ڈالی۔

نوجوان عالم مستی میں سینما کے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رقاصہ کی طرف دیکھ دیکھ کر
چلانے لگا۔ "اللہ کی قسم۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔" آصف بھاگتا ہوا ہال سے
باہر نکلا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر چلایا "یہ کیا کر رہے
ہیں آپ لوگ کیا کہیں گے۔"

آغا

"بھئی واہ۔" بے خود حیرانی سے چلایا۔ "اس میں کہنے کی بات کیا ہے۔ کیوں بھئی تم

کہتے ہو کیا۔" اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اور طوائف کی طرف ٹکٹکی باندھ کر با
آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگا۔

نظر کو ہے عادت تماشا!
جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو

کوئی یہ حسنِ ازل سے کہہ دے
کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو

شعر سن کر سب لوگ جھومنے لگے اور آصف گھبرا کر ایلی کی طرف بڑھا۔
"ہائیں۔ آصف ایلی کے پاس کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر بولا آپ ہیں آغا صاحب آپ
یہاں۔

آغا صاحب۔ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ درمیانے قد کا شخص تھا چہرے پر
متانت کے آثار تھے اور انداز سے خلوص ٹپکتا تھا۔

"یہ ہیں الیاس میرے ہم جماعت اور دوست۔" آصف نے آغا سے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" آغا صاحب نے ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا
"آپ امرتسر کے رہنے والے ہیں۔"

"جی نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں تو علی پور کا ہوں۔" "علی پور" آغا صاحب نے
دہرایا "وہاں میرے ایک عزیز دوست علی احمد رہتے ہیں۔ بڑے رنگین مزاج ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"یہ انہیں کے بیٹے ہیں۔" آصف مسکرا کر بولا۔

"علی احمد کے بیٹے۔" آغا صاحب نے پھر ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "کتنی خوشی
ہوئی آپ سے مل کر خاکسار کو آغا غلام بخش کہتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب میرے گہرے
دوست ہیں اور مہربان بھی۔"

آغا غلام بخش۔ ایلی کی نگاہ میں گرد و پیش دھندلا گئے۔ نہ جانے وہ جوان شاعر سیڑھیوں پر
بیٹھا کیا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے چوبارے میں بیٹھی ہوئی گلابی کریپ میں ملبوس رقاصہ کیسے مسکرا
رہی تھی۔ ایلی کی نگاہوں تلے اس شور بھرے دھندلکے میں آغا صاحب کے علاوہ سبھی معدوم ہو
چکے تھے اور آغا صاحب کے عقب میں ایک گھنگھریالی لٹ لٹک رہی تھی اور ایک رنگین دھبہ

مسکرا رہا تھا۔

"تسلیم" آصف نے مسکرا کر ایلی کی طرف بامعنی انداز سے کہا "تسلیم" آغا صاحب
عقب میں کسی تبسم چہرے نے گھنگھریالی لٹ جھٹک کر کہا۔

ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خوشی سے ناچنے لگے اور چیخ چیخ کر کہے "تسلیم
اچھے ہیں۔"

"تسلیم آپ آغا صاحب ہیں۔" تسلیم مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔
"____"

آغا صاحب کا مکان یاسمین سینما کے قریب ہی کٹہرہ رنگین میں واقع تھا مکان کے باہر
سنار کی دوکان تھی جس کے پیچھے ایک دالان تھا جس میں مک کھلتا تھا جسے ملاقاتی کمرے کے لئے
استعمال کیا جاتا تھا اور جس کے ایک پہلو میں ایک زینہ اوپر کو چلا گیا تھا۔ آغا کے گھر کے
اوپر چوبارے میں رہتے تھے اور یہ چوبارہ کٹہرے کے باقی چوباروں کی طرح تھا۔ فرق صرف
قدر تھا کہ اس کے آگے بالکونی نہ تھی اور چوبارے کی تین کھڑکیوں پر چقیں پڑی ہوئی تھیں
ان کھڑکیوں سے کبھی کسی نے باہر نہ جھانکا تھا۔

ایلی اس بات پر حیران نہ ہوا کہ وہ اس چوبارے میں کیوں رہتے تھے اور اگر رہتے
کٹہرے کی رسم کے مطابق وہ کھڑکیاں چقوں سے خالی کیوں نہ تھیں یہ باتیں غیر اہم
اس لیے یہ تفصیلات اس کی توجہ کو جذب نہ کر سکیں اور وہ اپنی امیدوں کے اس گہوارے
دیکھنے میں کھو گیا۔

تیم نیم

آغا کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے تھے وہ اس
پر مسرت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی مکان میں بیٹھا ہے جہاں وہ رہتی ہے اسی چھت تلے
جس کے اوپر نہ جانے وہ کس کام میں مصروف ہے آغا سے باتیں کرنے کے باوجود اس
ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو اوپر سے آ رہی تھیں۔ "ہائے میں کیا کروں۔ لو میں
یوں ہوتا ہے۔" ان آوازوں میں لے تھی راگ تھا۔ شوخی تھی۔ ان قدموں کی آواز
ترنم تھا۔ اوپر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان سب کا ایک ہی سا انداز تھا

میں ڈھلی ہوں۔ نہ جانے اس کی آواز کون سی تھی۔
جب دالان کے اوپر جنگلے سے کوئی پلو لہراتا ہوا نکل جاتا تو ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ان
پلوؤں کی اڑان کتنی حسین تھی۔ بظاہر وہ آغا سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کا دل کسی اور ہی لے پر
ناچ رہا تھا اور آغا میں بھی کتنی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک دبیز تہہ چڑھی ہوئی
تھی۔ سکون اور اطمینان۔ گویا وہ یوں اپنے آپ میں مگن تھا جیسے کوئی ناؤ کسی ساکن جھیل میں
چپوؤں کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ رواں ہو۔

"اچھا بھئی میں ذرا نہا لوں۔" آغا صاحب اٹھ بیٹھے۔ "ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوا۔" وہ
قریب ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

ایلی موقع غنیمت جان کر بلا تکلف اوپر دیکھنے لگا جہاں سفید سفید آنچل لہرا رہے تھے "بھائی
جان۔" ایک سریلی آواز سنائی دی۔ معصوم گلابی چہرہ جھکا۔ ایک تبسم جھلکا۔ "بھائی جان۔" پھر
آواز آئی۔

چند ساعت کے بعد نو دس سال کی ایک حسین چینی کی گڑیاں نیچے اتر آئی۔ اس نے ایلی کی
طرف دیکھا اور پھر ایک متبسم مسکراہٹ سے شرما کر منہ موڑ لیا وہ صابون اور تولیہ غسل خانے
کے دروازے پر رکھ کر بھاگ گئی اور پھر دروازے کی درز سے مسکرا مسکرا کر جھانکنے لگی۔

"رکھ دیا نیم۔" آغا نے پوچھا۔

"جی دروازے میں ہے۔" وہ بولی اور پھر بامعنی انداز سے مسکرا کر بھاگ گئی۔

آہستہ آہستہ ایلی اور نیم دوست بن گئے۔ جب ایلی زینے میں کھڑے ہو کر آواز دیتا "آغا
صاحب" تو بالائی منزل کے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ پھر نیم مسکراتی ہوئی نیچے اتر
آتی۔

"وہ کہاں ہے نیم۔" ایلی اس سے دبی آواز میں پوچھتا۔

"ہے" وہ کہتی "وہاں دروازے کی اوٹ میں۔" وہ زیادہ تر اشاروں میں جواب دیتی تھی۔
اس کے اشارات میں عجیب شان بے نیازی تھی۔

"اس سے کہو سامنے آئے۔" ایلی کہتا۔

"ہونہہ۔ وہ نہیں آتی ہم کیا کریں۔"

"تم نے کہا بھی تھا۔"

"کہہ رہی ہوں کہا تھا کہا تھا اور کیا کرتی۔"

"پھر کیا کہتی ہے وہ۔"

"بس ہنسے جاتی ہے۔ چھوڑو اسے۔" وہ ہونٹ نکال کر جواب دیتی "مجھے سائیکل کراؤ نا۔ کراؤ گے۔" وہ زبردستی اپنی بات چھیڑ دیتی۔

"لے چلوں گا۔ لے چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کیا وہ باہر نہیں نکلتی۔ کہیں جاتی نہیں۔ پر یا ویسے۔"

"ہونہہ وہ کیا جائے گی۔" وہ تحقیر سے ہونٹ نکالتی۔ "چھوڑو اسے۔"

ہوتا ہے' ہوتا ہے

"پہلے جا کر اس سے کہو کہ دروازے سے جھانکے۔ بڑی پیاری ہے نیم۔ جاؤ نا" بڑ مشکل سے اوپر جانے کیلئے تیار ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی پھر اوپر کے درواز رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دیتے اور بالآخر دروازے سے ایک سفید باز کر لہراتا اور انگلیاں یوں ناچتیں جیسے کتھا کلی کے کسی مندرا کی مشق کر رہی ہوں۔ پھر لٹ اڑتی۔

لو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہنس کر کہتی۔

بالآخر نیم نیچے اتر آتی۔ "وہ نہیں آتی سامنے کہتی ہے ہم کسی کے سامنے نہ کرتے۔" وہ منہ بنا کر کہتی۔

ایلی روز جان بوجھ کر ایسے وقت آغا کے یہاں جایا کرتا تھا جب وہ گھر پر نہ ہوں اور ڈرتے ڈرتے دیر تک سیڑھیوں میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ شام کے وقت دوبارہ وہاں جاتا اور صاحب کے پاس بیٹھا رہتا اور اوپر سے عجیب و غریب بامعنی آوازیں سنائی دیتیں۔ پلو لہرا کبھی کبھی موقعہ پا کر لوہے کی سلاخوں سے سفید بازو جھولتے اور کوئی کہتی "لو اس سے کیا ہوتا ہے۔" اور کوئی جواب دیتی۔ "ہوتا ہے ہوتا ہے۔" اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس آواز میں پھر وہ سوچنے لگتا کہ آخر کس بات سے کچھ ہوتا ہے اور وہ دیر تک سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ آغا نہا کر باہر نکل آتے اور کپڑے پہننے لگتے اور پھر وہ دونوں باہر گھومنے کے لیے چلے جاتے شام کے وقت حئی آ جاتا۔ حئی آغا کا چھوٹا بھائی تھا مگر اس کی طبیعت آغا صاحب

طور پر مختلف تھی۔ جسمانی طور پر بھی ان دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ حئی کا جسم پتلا دبلا تھا اس کے چہرے پر شوخی اور اضطراب چھائے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حئی کے خدوخال بے حد جاذب نظر تھے۔ ایلی نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت وہ گرم چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز چادر میں خوب صورت خدوخال کو دیکھ کر ایلی نے سمجھا جیسے کوئی خاتون غلطی سے مردانے میں آ گئی ہو۔

حئی بہت جلد ایلی سے مانوس ہو گیا۔ اس کی باتیں عجیب تھیں "ایلی۔" وہ چلاتا آؤ ایلی تمہیں عیش کرا لائیں۔ آؤ تمہیں تمہاری ہم نام کے پاس لے چلوں۔ اتنی رسیلی آنکھ ہے کہ اگر اس کی ایک نگاہ پڑ گئی تم پر تو طبیعت صاف ہو جائے گی اور کیا جسم ہے۔ شعلے نکلتے شعلے۔ چلو ملا لاؤں تمہیں۔ اپنے پر تو مرتی ہے لیکن بڑی اچھی ہے چلو۔"

ایلی حیرانی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر گھبرا کر کہتا "پھر سہی کبھی۔" اور حئی منہ بنا کر کہتا "اچھا بھئی تو پھر میں تو چلا"۔ اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر ایلی اوپر ٹک کی طرف دیکھتا اور نیم کو اشارے کرتا اور نیم تسلیم کا بازو پکڑ کر اسے سیڑھیوں کی طرف کھینچتی اور تسلیم ہنسے جاتی جاتی حتیٰ کہ بوڑھی دادی شور مچانا شروع کر دیتی "لڑکیو یہ کیا غل غپاڑہ ہے۔ آرام سے بیٹھو۔" اور لڑکیاں خاموش ہو جاتیں اور ایلی چپ چاپ محروم اور مایوس انداز سے باہر نکل کر بورڈنگ کی طرف چل پڑتا۔

گھماگھمی

بورڈنگ کی اس ویران کوٹھی میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ کیا یہ محبت ہے کیا یہی وہ محبت ہے جس کے متعلق شریف اسے خبردار کیا کرتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے احساس تشنگی ہوتا۔ بلت کسی لحاظ سے بھی تو کمل نہ تھی۔ نہ تو تسلیم نے کبھی تھیلی میں سلا ہوا مینڈک اس پر پھینکا تھا اور نہ کسی اور طریقے سے ایلی کی محبت کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ تسلیم کے رویے کو دیکھ کر ایلی سوچتا تھا کہ وہ تو بچوں کا کھیل کھیل رہے تھے محبت نہیں کر رہے تھے۔ کیا محبت بچوں کا کھیل ہوتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنی عظیم چیز بچوں کا کھیل کیسے ہو سکتی ہے۔

اسے یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر مولا داد چلاتا۔ "یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ایلی۔ کیا ہماری زندگی بھی حرام کرو گے چلو باغ سے امرود چرا کر کھائیں۔ کیوں شفیع؟"

شفیع ہنس کر جواب دیتا "دیکھو تو اپنی صورت۔ دیکھنے میں تو ڈاکو نظر آتے ہو اور کر
چوریاں اور وہ بھی امرودوں کی۔"

پھر وہ دونوں ایلی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

"اسے کیا ہے۔"

"کیا ہے بے تجھے۔"

"عشق کا روگ لگا ہے کیا۔"

"وہ مہر لڑکا ہے نا کالج میں اس پر مرتا ہے تو۔"

"لو اس میں کیا ہے۔" مولا داد پیار سے کہتا۔ "کہو تو اٹھا لاؤں اسے یہاں اس
میں۔"

"پاگل ہوئے ہو۔" ایلی چلاتا۔

ایلی نے تسلیم کے متعلق مولا داد اور شفیع سے کبھی بات نہ کی تھی یہ راز صرف آ
تک محدود تھا۔ جب کبھی وہ آصف سے ملتا اس کا جی چاہتا کہ وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھے
آصف محبت کیا ہوتی ہے۔ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ایک بار آصف سے یہ
پوچھا تھا مگر مسکرانے کے سوا آصف نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔

ہنگامہ

پھر خبر آئی کہ شریف چھٹی پر علی پور آیا ہوا ہے اور ایلی کی آنکھوں میں خوشی کے
ٹمٹمانے لگے۔ "میں جاؤں گا۔" اس نے آصف سے کہا۔

"تم نہیں جا سکتے۔" آصف مسکرایا "تم اسے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو۔"

لیکن آصف کے اعتراض کے باوجود وہ گرمی کی چھٹیوں سے دس روز پہلے علی پو
اب کی بار علی پور ویران نہ تھا وہاں شریف تھا۔ شہزاد تھی رفیق اور ارجمند تھے۔
تھے۔ علی پور پہنچ کر خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ محلے میں پہنچنے سے پہلے ہی
مل گیا جو ایلی کو دیکھ کر چلانے لگا۔

"کیوں بھئی فرہاد۔ وہ نہر کھودنے کا کام ختم ہو گیا۔"

"کیا بکتا ہے تو۔" ایلی نے اسے گھورا۔

"ہمارے محلے والے کہہ رہے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ امرتسر میں عشق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کالج تو محض بہانہ ہے۔ اس قدر
قریب رہتے ہوئے بھی اب علی پور آنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

رضا سے مل کر جب وہ محلے میں پہنچا تو اس نے محسوس کیا جیسے سبھی لوگ اس کی طرف
دیکھ دیکھ کر تمسخر سے ہنس رہے ہوں۔

"ہائیں" چچا امداد چلائے "کیوں بھئی ایلی آگیا تجھے بھی ہوش پڑ گیا اسی چاؤ کے چکر میں آخر
بیٹا کس کا ہے شاباش" غصے سے ایلی کے کان سرخ ہو گئے۔

"اے ہے یہ تو ایلی ہے اپنا" محلے کی عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔

"اللہ عمر دراز کرے۔ جیتا رہے۔ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے۔"

"ہائے ایلی تو اب عید کا چاند ہو گیا۔" "جوان ہو گیا ہے نا" دوسری مسکرا کر بولی۔

"ہمارے لیے تو وہی ایلی ہے۔" ایک مسکرائی۔

"کیوں ایلی کیا امرتسر میں جی لگ گیا تیرا۔ اب تو علی پور کی طرف رخ ہی نہیں کرتا۔"

"پڑھائی سے فرصت بھی ہو۔" ایک نے طنزاً کہا۔

"تو آیا ہے ایلی۔" ہاجرہ شور سن کر بھاگی بھاگی آئی "آ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی
تھی"۔

"اب اس کا انتظار کیا کرے گی تو۔" چچی نے مسکرا کر کہا "اللہ رکھے اب جوان ہو گیا
ہے"۔

دادی اماں اسے دیکھ کر کھڑکی سے چلائیں "کب آیا تو۔"

"جا دادی اماں سے مل لے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔" ہاجرہ نے کہا۔

دادی اماں کو دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

"کیا کرتا ہے تو۔" وہ چلائی "وہی جاٹ کا جاٹ ہی رہا تو۔" اور وہ کھانسنے لگی۔

"کیوں دادی اماں۔ بیمار ہو کیا؟"

"نہیں تو۔" وہ بولی "اچھی بھلی ہوں۔"

"دمے کا دورہ پڑتا ہے۔" سیدہ نے کہا۔

"کیوں دادی اماں۔" اس نے دادی سے پوچھا۔

"اب بھی نہ پڑے گا دمے کا دورہ تو کب پڑے گا۔" وہ ہنسی۔

عین اس وقت تیزی سے کسی کے سیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور چھم سے شہزاد
کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ "سنا ہے ایلی آیا ہے۔"

ایک ساعت کے لیے ایلی شہزاد کو دیکھ کر بھونچکارہ گیا جالی کے سیاہ دوپٹے پر سفید پھول
چمک رہے تھے اور وہ اس کے شانوں پر یوں اڑ رہا تھا۔ جیسے پر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ اس کے
ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔ ایسا تبسم جو اس سے پہلے ایلی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نگاہوں میں غیر
معمولی چمک تھی اور گالوں پر سرخی جھلک رہی تھی جیسے لجا رہی ہو۔ وہ تو کبھی لجائی نہ تھی اس
کے انداز میں تو ہمیشہ بے نیازی کی جھلک ہوتی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے دفعتاً شہزاد نے
کینچلی بدل لی ہو۔

"ایلی آؤ نا۔" وہ بولی "تمہیں بلا رہے ہیں وہ جلدی آؤ۔" وہ مسکرائی۔

ایلی کے جسم پر چیونٹیاں چلنے لگیں۔

"اے ہے۔" دادی اماں بولی "تو سن ہو کر کیوں رہ گیا۔ دیکھو تو یوں کھڑا ہے جیسے ہوش
میں نہ ہو۔ جانا ہے ادھر تو جا ہو آ۔ میری طرف کیا دیکھتا ہے۔"

"تمہیں مبارک ہو ایلی۔" شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا "تم پہلے امتحان میں پاس ہو
گئے۔"

"کونسا امتحان" ایلی نے پوچھا۔

شریف نے ایک بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی "پہلے امتحان میں تم پاس ہو گئے اور انشاءاللہ
دوسرے امتحان میں بھی تم پاس ہو جاؤ گے۔"

"میں تو ایف اے میں فیل ہو گیا ہوں۔" ایلی نے گھبرا کر کہا۔ شریف قہقہہ مار کر ہنسا
اور پاس کھڑی شہزاد کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے سفید پھولوں کے درمیان ایک گلاب
ہوا تھا۔ "سنتی ہو۔" وہ بولا "ایلی کی باتیں سن رہی ہو۔"

"سن رہی ہوں۔" وہ بولی "اب تو میں بھی ایلی کی باتیں بڑے غور سے سننے لگی ہوں۔"

"وہ کیسے۔" شریف مسکرایا۔

"اب اس کی نگاہیں تو دیکھو ذرا۔" وہ بولی۔

"اس کی نگاہ" شریف تالی بجا کر اٹھ بیٹھا "اس کی نگاہ سے تم کیسے دیکھ سکتی ہو۔ ہر کسی کی
نگاہ الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور۔ اور۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری۔
"دوسرے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔"

"مجھے کیا معلوم۔" شہزاد منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

ایلی سوچنے لگا نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے وہ دونوں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ
شہزاد کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نگاہ سے جس سے شاید شریف نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔
لیکن شہزاد نہ جانے اسے کسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔

"لیکن آپ تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔" اس نے شریف سے کہا۔

"دنیاوی امتحانات کی بات نہیں۔" شریف شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میں تو اس
امتحان کی بات کر رہا ہوں۔" "اچھا تو پھر کون ہے وہ۔ کیسی ہے۔ سنا ہے بڑی خوب صورت
ہے۔" شہزاد نے ایلی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ "خوب صورت۔" شریف ہنسا۔ "خوب
صورت تو وہ ہے ایلی جسے کوئی دیکھنے والا مل جائے۔"

شہزاد نے چتون چڑھا کر کہا "آپ نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے خوبصورتی۔"

"پاگل نہ بنو۔" وہ آہ بھر کر بولا "زخموں کو طنز سے نہیں کریدا کرتے۔" ایک ساعت کے
لیے شہزاد کی آنکھیں گویا کسی نامعلوم جھیل پر تیرنے لگیں پھر دفعتاً وہ مڑی اور کمرے سے باہر
نکل گئی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے۔

"اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔" شریف نے کہا "اب تو لوگ تمہیں دیکھنے لگے ہیں
بس دو ہی باتیں ہیں صرف دو۔ باقی سب ہیچ ہے۔ سب ہیچ! یا تو تم میں خود دیکھنے کی اہلیت ہو یا
دوسروں کی توجہ جذب کرنے کی۔ اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دونوں خصوصیات رکھتے
ہو۔"

ایلی گھبرا گیا۔ "نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ "میں نہیں سمجھا۔"

"سب سمجھ میں آجائے گا۔" شریف ہنسنے لگا۔ "بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ آج تم سے مل کر بڑی
راحت ہو رہی ہے مجھے۔ تمہاری قسم بڑی راحت۔"

شریف سے ملنے کے بعد جب وہ احاطے میں پہنچا تو اسے ارجمند مل گیا اسے دیکھتے ہی ارجمند
چلایا "اے ایلی۔ تم وہی تیلی کے تیلی رہے نا ہمارا سارا اینکرائیڈی تم نے تباہ کر دیا بھئی۔ واہ

عجیب آدمی ہو۔ اتنا ٹرین کیا تھا تمہیں۔ سب اکارت گیا۔ سنا ہے محبت لگا بیٹھے ہو۔ ارے بے
وقوف محبت لگانا مردوں کا کام نہیں۔ مردوں کا کام تو پھول پھول پر بیٹھ کر لطف اندوز ہونا ہے۔
ہم لوگوں کی دوستی ملاحظہ ہو یار جب سے شاہ کاکو کی فیکٹری میں ملازم ہوا ہوں ہر ساعت یہ
خیال رہا ہے کہ گاؤں کی گوریاں چن چن کے پھنسا رکھوں۔ اپنے لیے نہیں۔ تمہاری قسم یہ
اس خیال سے کہ یار لوگوں کو بلا کر کبھی عیش کرا دوں۔ وہ محفل جماؤں کہ سالے عمر بھر یاد
رکھیں۔ مگر یار ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تم نے یہ عشق کی بیماری لگا کر۔ آخر تیلی ہی ہے نا۔
کہتے ہیں نا کہ کتے کی دم کو بیس سال لوہے کی نالی میں رکھو پر نکالو گے جب تو سالی ٹیڑھی ہی نکلے
گی۔"

چھ بھائی

ارجمند کو شاہ کاکو کی فیکٹری میں نوکری کرتے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس قلیل
عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ اول تو اس کا قد بہت لمبا ہو چکا تھا۔ ارجمند کے تمام بھائی دراز قد
تھے۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو قد میں ان کی برابری کر سکتا ہو۔ ان بھائیوں میں تین عجیب
خصوصیات تھیں ایک تو وہ سب غیر معمولی طور پر دراز قد تھے۔ دوسرے تمام کے تمام بھائی خوش
مزاج تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال دیا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی مصیبت
ہنس کے برداشت کرنے کے عادی تھے۔

ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ والد کے زیر سایہ انہوں نے بڑی ناز و نعمت سے بچپن گزارا تھا
والد کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا دور آیا۔ وہ گھر میں چھپ کر چٹنی سے روٹی کھاتے اور
باہر نکل کر یوں مونچھیں سنوارا کرتے جیسے کوفتے کھا کر آئے ہوں۔ لیکن ان کی تیسری
خصوصیت بہت الم انگیز تھی۔ بچپن گزر جانے پر وہ دفعتاً" اونچے لمبے جوان بن جاتے
یہاں تک کہ عام دروازوں سے گزرنا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا لیکن جوانی اپنے ساتھ
پیغام اجل لے آتی جوان ہوتے ہی وہ یا تو ٹی بی کا شکار ہو جاتے یا کسی اور وجہ سے "آناً فاناً"
جاتے۔ باپ کی وفات کے بعد ارجمند کا بڑا بھائی بھرپور جوانی میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی
ان کے گھرانے کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اب ارجمند جوان ہو رہا تھا۔
ارجمند کی بوڑھی ماں جو مصائب کی وجہ سے جیتے جی گویا پاگل ہو چکی تھی ارجمند کو

دیکھ کر اپنے دل میں فخر محسوس کرتی مگر دفعتاً" نہ جانے اسے کیا خیال آتا کہ وہ مسرت بھری نگاہ
حسرت میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ منہ موڑ کر آنسو پونچھتی۔ اس پر ارجمند
قہقہہ مار کر ہنستا اور کہتا۔ "اماں رو رہی ہو تم۔ واہ اماں رونے کی اس میں کونسی بات ہے۔ ما
بدولت اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو اب سکھ چین کا زمانہ آ
گیا۔ چٹنی کی جگہ ما بدولت کے حکم سے چاپیں اور کوفتے ہوں گے اور سوکھی روٹی کی جگہ
پراٹھے۔" وہ جھک کر ماں کو آغوش میں لے لیتا۔ "اب تو کوئی رونے کی بات نہیں اماں۔" وہ
ہنستا۔ "نہیں اماں ہم مریں گے نہیں۔ اللہ میاں نے جو تیسویں پارے میں صاف لکھا ہے کہ
ارجمند نہیں مرے گا جب تک اس کے یہاں بارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں پیدا نہ ہو جائیں گی اور
اس کی داڑھی دو فٹ گیارہ انچ تک نہ بڑھ جائے گی۔ واہ تم ویسے ہی روتی ہو اماں۔"
ان کی جواں مرگی کے متعلق تمام محلے میں چرچا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کی جوانی
پیغام اجل لاتی ہے حالانکہ اب تک صرف ایک بھائی ہی فوت ہوا تھا اور پانچ بھائی بچپن کے
مختلف مدارج طے کر رہے تھے۔

سچا عاشق

نوکر ہونے کے بعد ارجمند نے اعلانیہ طور پر احاطے میں کھڑے ہو کر انکرائینڈی کے شغل
میں مصروف رہنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ احاطے میں کھڑا ہوتا تو تھا مگر اس کے انداز میں
ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا اگرچہ اس کے جذبات وہی پرانے تھے اور اس کا طریق کار بھی نہ بدلا
تھا۔

لیکن ایلی کے لیے اب اس شغل میں حصہ لینا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ کیسے احاطے میں کھڑا ہو
سکتا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ محبت لگانے کے بعد اس کا لڑکیوں کو دیکھنا مناسب نہیں۔
لوگ سمجھیں گے کہ اس کا عشق محض ایک ڈھونگ ہے۔ جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ
اور پھر وہ ہنس کر کہیں گے کیوں نہ ہو آخر بیٹا کس کا ہے۔
ایلی کو جس قدر نفرت اس ایک جملے سے تھی کسی اور چیز سے نہ تھی۔ اسے خود علی احمد
کے طریقہ کار سے نفرت تھی شاید اس لیے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے اسے بہت دکھ
سہنا پڑا تھا۔ اس کی ماں کی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ ان کا گھر برباد رہا تھا پھر وہ اس انداز کو کیسے اچھا

سمجھ سکتا تھا اس لیے اس نے اس طریق کار سے پہلو بچانے کے لیے دل میں یہ ایمان پیدا کر لیا تھا کہ محبت کو جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محبت اور جسم دو متضاد باتیں ہیں۔ وقت کٹی کے لیے لڑکیوں کی طرف دیکھنا اس کی نظر میں جرم تھا۔ دل لگی کے لیے انکرانیڈی کا کھیل کھیلنا اسے گوارا نہ تھا اور اب جب محلے بھر میں اس کے عشق کے چرچے ہو رہے تھے۔ اب تو اس کے لیے احاطے میں کھڑے ہونا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ سچے عاشق کا کام یہ نہیں کہ چوگان میں کھڑے ہو کر نوجوان لڑکیوں سے آنکھیں لڑائے۔ اس کے برعکس سچے عاشق کو تو چاہیے کہ چارپائی پر لیٹ کر مست نگاہوں سے چھت کی طرف گھورتا رہے اور جب تھک جائے تو ٹھنڈی آہ بھر کر پہلو بدل لے۔

طوفان بدتمیزی

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے جب وہ نیم کی سرگوشیوں کے متعلق سوچ رہا تھا تو اس نے پاؤں کی ہلکی سی آہٹ سنی جیسے نیم سیڑھیاں اترا کرتی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ تصور میں کتنی توانائی تھی کیسی وضاحت سے آواز آرہی تھی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا جیسے نیم کھولا کرتی تھی۔ "مجھے بائیسکل کی سیر کرا دو۔"

ایک اونچی لمبی نیم کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

شہزاد ہنس پڑی "ڈر گئے۔"

"اوہ آپ ہیں خالہ جی۔" ایلی اسے خالہ کہا کرتا تھا۔

"ابھی سے سو گئے۔" وہ پھولدار پروں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

بیٹھ جاؤ خالہ جی۔ کہہ کر وہ گھبرا گیا۔ اسے بٹھائے کہاں۔ کمرے میں ایک چارپائی کے سوا بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

"کہاں بٹھاؤ گے۔" شہزاد ہنسی

ایلی ٹھٹھکا شہزاد دل کی بات کس طرح بھانپ لیتی تھی کیا وہ اس کے دل کی سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اس خیال پر وہ لرز گیا کیونکہ اپنے دل کی سب باتوں کو اپنانے یا ان پر سوچنے کی اسے کبھی جرات نہ ہوئی تھی۔ کئی بار اپنی کسی پوشیدہ خواہش کی ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ گھبرا جایا کرتا تھا اور پھر دوسرے امور پر غور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی اسے بٹھانے کے

متعلق نہ جانے کیا خیال آیا تھا۔ اس کے دل میں اکثر شہزاد کو دیکھ کر طوفان سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا طوفان بدتمیزی۔

ایک طرف موتیا گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ دوسری طرف نیلی جھیل میں کنول سا ابھرتا۔ مینڈک ملہار گانے لگتا ادھر دو سفید سے بازو لہراتے ادھر دو رنگین خونیں ہاتھ اس کی طرف لپکتے اور کہیں سے شریف کی متبسم آواز سنائی دیتی۔ "ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے پگلی۔" اور پھر وہ اس طوفان بدتمیزی کو سمیٹنے کی شدید کوشش کرتا۔

اس طوفان بدتمیزی پر اسے شدید غصہ آتا تھا۔ اپنے آپ پر غصہ آتا۔ وہ محسوس کرتا تھا جیسے علی احمد بنا جا رہا ہو۔ پھر اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے "کہاں بٹھاؤ گے۔" اسے خاموش دیکھ کر شہزاد نے اپنی بات دہرائی۔ "اسے نہ بٹھا سکے تو مجھے کیسے بٹھاؤ گے۔" وہ پھر ہنسی۔ اس کی ہنسی شرارت آمیز تھی۔

نہ جانے شہزاد کس قسم کی لڑکی تھی۔ ایک انوکھی عجیب سی لڑکی۔ جس کی ہر بات نرالی تھی۔ جس کی ہر حرکت گویا مفہوم سے بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے شہزاد کی ہر بات چھیڑ کیوں دیتی تھی۔ اس کی ہر نگاہ دل میں کھب کیوں جاتی تھی۔ اور یہی نہیں اس کا طرز عمل دو دھاری تھا۔ وہ ایک نگاہ سے یوں چھیڑتی جیسے اسے چھیڑ دینے سے دلچسپی ہو اور دوسری نگاہ سے یوں الگ تھلگ ہو جاتی جیسے ان باتوں سے بلند تر ہو۔ جیسے اسے فانی مخلوق سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایک ساعت میں وہ اس قدر قریب آجاتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ "میں کہاں بیٹھوں۔" اور دوسری ساعت میں اس قدر دور ہو جاتی۔ دور ——— اس افق سے بھی دور جہاں گلابی جھیلوں میں نیلے مینڈک پھدکتے تھے۔ ایک وقت اس کا تبسم گویا دل کو کاٹ کر رکھ دیتا اور پھر دوسری ساعت میں اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی سلوٹ پیدا ہو جاتی اور محسوس ہوتا جیسے وہ مذاق اڑا رہی ہو۔ تضحیک کر رہی ہو۔ رنگینی کے باوجود اس میں بے نیازی کا عنصر بہت واضح تھا۔ ایلی اسے بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا جس کے متعلق ایسی ویسی بات نہیں سوچی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ کیا مصیبت تھی کہ ایسی ویسی بات نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں آگھستی اور وہ شرمندہ ہو کر کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی شدید کوشش کرتا۔

طوطا اور مینا

لیکن اس روز تو شہزاد کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا اور اس کا رات کے وقت وہاں اکیلے

آنا۔ اور پھر پوچھا۔ "کہاں بٹھاؤ گے۔"

وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ "ایلی۔" وہ بولی "میں پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تمہیں محبت ہو گئی ہے۔"

ایلی گھبرا گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے۔

"اس خبر کی تو محلے میں دھوم مچی ہے آج کل پھر تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو۔"

"چھپاتا تو نہیں۔" ایلی نے بمشکل کہا۔

"تو بتاؤ نا۔ یہ سچ ہے کیا۔"

ایلی نے اثبات میں سرہلا دیا اور چپ رہا۔

"کتنے بدنصیب ہو تم ایلی۔" شہزاد کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ "بہت بدنصیب ہو تم ایلی اگر تم کچھ دیر صبر کرتے اگر تم جلد بازی نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" ایلی نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ "اب سمجھنے کا کیا فائدہ۔ اب تو نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔ جب میں پہلے پہل یہاں محلے میں آئی اور تمہیں دیکھا تو میں سمجھی کہ ایلی ایک عام سا لڑکا ہے۔ مجھے یہ خیال تک پیدا ہوا تھا کہ تمہیں دیکھ کر کسی کے دل میں اتنا گہرا اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ تو آپے ہی میں نہ رہی۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بے کار ہے اب۔ بیچاری"۔ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

ایلی حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"خالہ" ایلی بولا۔ "یہ کیا طوطا مینا کی کہانی سنا رہی ہیں آپ۔"

"ہاں۔" وہ مسکرائی "میں سمجھتی تھی۔" وہ بولی "یہ طوطا معمولی طوطا ہے جیسے ہوتے ہیں طوطے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ طوطا بولتا بھی ہے۔ اب تو ہمیں طوطے سے ڈر آنے لگا ہے" پھر ہنسی۔

"جبھی یہاں آگئی ہو اس وقت اکیلی۔" ایلی نے پہلی مرتبہ شہزاد سے مذاق کرنے کی کوشش کی۔

"اونہوں" وہ سنجیدگی سے بولی "میری بات چھوڑو۔ یہ تو مینا کا خیال تھا جو مجھے یہاں لایا ہے"۔

"مینا کون ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"وہ بھی تھی بیچاری۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ اس کی سدھ بدھ جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا طوطے کو مینا کی کہانی سنا دینا ایک بار۔ شاید اس کہانی کو سن کر سمجھ جائے مگر بیکار ہے مجھے معلوم نہ تھا کہ طوطا بن بولے باتیں کرتا ہے اور اس کا اثر اس حد تک ہو سکتا ہے تو یہ ہے۔" شہزاد نے جھرجھری لی۔ "اچھا۔" وہ کھڑی ہو گئی۔ "میں چلتی ہوں ناحق تمہیں بے آرام کیا۔ صبح آؤ گے نا۔"

"لیکن ذرا ٹھہرو تو۔" ایلی نے کہا۔

"نہ بھئی۔" وہ ہنسی "اب تو تم سے ڈر آنے لگا ہے۔" اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

ایلی دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طوطا کون تھا۔ مینا کون تھی اور بے پروا بے نیاز شہزاد کو اب ڈر کیوں آنے لگا تھا۔ ایلی کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ایلی کو یہ معلوم بھی کیسے ہوتا کہ شہزاد کو کل کے بن کی سانوری کے متعلق بات کر رہی ہے۔ وہ سانوری جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ایک سہانا خواب ہے ایک دلکش تصویر۔ وہ خواب بھلا حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو محلے کی لڑکیاں تھیں جو چقوں کے پیچھے چھپ چھپ کر مسکراتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں۔ لیکن سانوری تو یوں بے نیازی سے کوٹھے پر ٹہلا کرتی تھی جیسے گردو پیش ایک ناقابل توجہ منظر پیش کر رہا ہو۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کی مینا سانوری تھی جس نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا جو اسے قابل التفات ہی نہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایلی نسائی دورخی سے واقف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت بھی اسی طرح ہوتی ہے جیسے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی بظاہر بے نیازی محض ایک پردہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے وہ طوطا مینا کی کہانی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ سانوری نے اسے ایسا مرتبہ بخشا ہے تو وہ خوشی سے ناچنے لگتا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک بار ڈنکے کی چوٹ سے تسلیم کے عشق کا اعلان کر چکا تھا۔

عشاق تو ایک بار محبت لگا کے پھر نہیں بدلتے۔ سچی محبت کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے نزدیک وفا تھی۔ سرد مہری کے باوجود وفا۔ بے پروائی کے باوجود وفا۔ اگر اسے طوطا مینا کی کہانی کا مفہوم معلوم ہو جاتا تو الٹا وہ کشمکش میں گرفتار ہو جاتا کہ کس طرح تسلیم کو چھوڑ کر سانوری

سے عشق لگائے۔

ایک اور

اگلے روز صبح ہی علی احمد کی آمد کا شور مچ گیا۔ چچا امداد جو کسی کام سے سٹیشن گئے ہوئے تھے واپسی پر احاطے میں آکر چلانے لگے "بہن نواب۔ بہن نواب۔"

دادی اماں ان کی آواز سن کر بولیں "اے ہے لڑکیو سنو تو امداد کی آواز آرہی ہے۔ کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتی ہو۔"

"بہن نواب سے کہہ دو۔" چچا امداد چلائے "علی احمد آ رہے ہیں میں نے انہیں سٹیشن پر دیکھا ہے کھانا دانا تیار رکھے اور سیدہ بیٹی" وہ ہنس کر بولے: "کہنا ساتھ شمیم بھی ہے بچے بھی ایک اور بھی۔" وہ ہنسنے لگے۔

"اے ہے چچا" ایک بولی۔ "یہ ایک اور کون ہے۔"

چچا ہنسے۔ "ہربار ہوتی ہے ساتھ ایک اور نئی بات ہے کیا۔"

"کیوں نہ ہو ایک اور ساتھ"۔ دوسری بولی "علی احمد کے ساتھ ایک اور نہ ہو تو کوئی کیسے جانے کہ علی احمد ہیں"۔

"مگر چچی اب کی بار کون ہے؟"۔

"ہوگی کوئی ترکھانی یا نٹنی"۔

"اے ہے یہ نہ کہو سنا ہے شریف زادیاں بھی آتی ہیں۔"

"نہ بھئی میں تو نہیں مانتی۔ وہ شریف زادی ہی کیا ہوئی جو آگئی۔ اور بہن بولی چلے آتے ہیں اور اطمینان سے انگلی پکڑے آتا ہے یہ علی احمد۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے میلے سے مٹی کی گوجری خرید کر لا رہا ہو۔ ذرا نہیں شرماتا ذرا نہیں سوچتا کہ محلے میں جا رہا ہوں محلے والے کیا کہیں گے"۔

"ہونہہ۔ محلے والے۔ محلے والوں کی بہن وہ پروا کرتا ہے کیا جو سچ پوچھو تو شرافت تو ہم ہی میں رہ گئی ہے علی احمد کے پاس اللہ کے فضل سے چار پیسے ہیں۔ اچھے عہدے پر لگا ہے اسے محلے والوں کی کیا پروا۔"

علی احمد کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا تو محلے کے مکانوں کی تمام کھڑکیاں بھری ہوئی تھیں

بوڑھیاں چوگان میں کھڑی تھیں لڑکیاں، چھتوں کے پیچھے دبکی ہوئی تھیں، جیسے علی احمد کی آمد ایک عظیم واقعہ ہو۔

"علی احمد" ایک بولی۔ "سنا ہے پھر ایک اور ساتھ لے آیا ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" علی احمد ہنسے۔ "چچی وہ تو شمیم کی سہیلی ہے۔"

"ہمیشہ سہیلی ہی بن کر آتی ہے پہلے پہل۔" ایک چلائی۔

"اے ہے علی احمد تیرے بہانے نہ گئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے تو" دوسری نے کہا۔

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے "تو اور کیا صاف صاف کہدوں تمہارا لحاظ بھی نہ کروں چاچی۔"

"اے ہے۔ یہ اچھا لحاظ ہے علی احمد" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

علی احمد ہی ہی کرتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور محلے والیوں کی نگاہیں ان کے پیچھے چلتے ہوئے قافلے پر مرکوز ہو گئیں۔

"چچی ہے تو اونچی لمبی۔" ایک بولی۔

"ہو گی تو ویسی ہی کالی کلوٹی۔ ایسی ہی لایا کرتا ہے۔ یہ علی احمد" دوسری نے کہا۔

نہ جانے کیا چاؤ ہے اس کو۔ گلی سڑی اٹھا لاتا ہے۔" تیسری نے منہ بنا کر کہا۔

"ہائے ری۔" ایک چلائی "میں مرگئی یہ تو نٹنی معلوم ہوتی ہے۔"

"نٹنی ہے تو اور بھی اچھا ہے اپنے علی احمد کو ناچ نچائے گی۔"

"اے یہی تو وہ چاہتا ہے۔" چچی نے جواب دیا۔

"اتنی عمر بیت گئی پر ابھی یہ جنون اس کے سر سے نہ گیا۔"

"وہ جنون ہی کیا ہوا اماں جو چلا جائے۔"

دادی اماں نے اپنے کمرے سے آنکھ بچا کر دیکھا پھر دھڑم سے تخت پر گر پڑی۔ جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ پھر بات کیے بغیر تخت پوش پر گنڈھ ہو کر پڑی رہی جیسے سجدے میں پڑی ہو۔

شمیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار کر پھینک دیا اور تیزی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا آنکھیں رو رو کر ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں۔

معذرت

علی احمد اور نووارد وہ چپ چاپ اطمینان سے الگ ایک کمرے میں جا بیٹھے جیسے کوئی بات

ہی نہ ہو باہر محلے والیوں کا جمگھٹا لگ گیا۔

"ایلی"۔ علی احمد نے آواز دی۔ "ایلی بھئی یہ راجو تم سے ملنے آئی ہے۔ ہی ہی ہی تھی کہ علی پور دیکھوں گی۔ اب یہ کام تمہارا ہے ایلی کو اسے گھماؤ پھراؤ۔ ایلی تو علی پور کے چپے سے واقف ہو نا۔ ہی ہی ہی۔ کیوں ایلی۔ اچھا تو ہاجرہ کہاں ہے اسے راجو سے ملائیں۔"

"سیدہ۔ کیا کر رہی ہے۔ تو۔ ادھر آنا ادھر دیکھ یہ راجو تجھ سے ملنے آئی ہے اور تو یہاں چولہے کے پاس بیٹھی ہے۔ یہ دولت پور کے رہنے والے ہیں۔ راجپوت ہیں۔ اپنی دو کانیں ہیں زمینیں ہیں سبھی جانتے ہیں انہیں وہاں دولت پور میں مشہور خاندان کے ہیں۔ راجپوت بڑے عزت والے سمجھے جاتے ہیں۔ آجاؤ۔ آجاؤ بیٹھ جاؤ۔ سیدہ راجو یہ سیدہ ہے میری بہن کی بیٹی میری بیٹی ہی سمجھو۔ اپنے یہاں ہی رہتی ہے۔ اور کہو سیدہ کیا حال چال ہے۔ ہاجرہ نہیں آئی۔ شمیم کیا ہوئی۔ سفر کی وجہ سے تھک کر جا پڑی ہو گی اپنے کمرے میں ہی ہی ہی۔ اچھا بھئی یہ ذرا چلم میں دو کوئلے تو رکھ دینا۔ واقعی سفر میں انسان تھک جاتا ہے۔"

وہ مسلسل بولتے گئے جیسے خاموشی سے ڈرتے ہوں جیسی آواز کے تنکے کا سہارا لے کر ڈوبنے سے بچنا چاہتے ہوں اور پھر ہر بات پر ان کا قہقہہ گونجتا رہا کھوکھلا کھسیانہ قہقہہ جیسے راجو کو لانے پر معذرت کر رہے ہوں۔

"اماں۔" وہ بھاگے بھاگے اپنی والدہ کی طرف آئے۔ "اماں تمہارا کیا حال ہے؟" "اچھی بھلی ہوں علی احمد" بڑھیا نے جواب دیا "ذرا دم کی تکلیف ہے۔ رک جاتا ہے۔"

"پھر تو بہت تکلیف ہوئی۔"

"اب یہی کچھ ہونا ہے نا۔ کچھ وقت بیت گیا کچھ بیت جائے گا مگر علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔" دادی اماں نے آہستہ سے کہا۔

"او ہو اماں۔" وہ ہنسے "بہت دبلی ہو گئی ہو۔ کوئی دوا دارو کر رہی ہو۔" علی احمد کو یوں بات بدلتے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی "علی احمد تیری عادت نہ بدلی اور دوا کا کیا پوچھتے ہو۔ اب تو دعا کرو۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولے "میں ڈاکٹر کو بلاؤں گا اس سے پوچھوں گا۔" اور پھر راجو کے پاس یوں جا بیٹھے جیسے وہ خود مریض ہوں اور ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر علی احمد

کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

گورو دیو مہاراج

راجو کے آنے پر چار ایک دن محلے میں یہی شغل رہا ایک مسکرا کر پوچھتی "علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔"

علی احمد مسکرا کر جواب دیتے "چچی یہی تو مجھے تم سے پوچھنا ہے یہ میں کیا لایا ہوں۔ خسارہ کا سودا تو نہیں۔"

دوسری پوچھتی "علی احمد یہ کیا لے آیا تو دیکھنے میں تو کچھ بھی نہیں"۔

علی احمد ہنس کر کہتے "ہاں بہن دیکھنے میں کچھ نہیں۔"

پھر کوئی محلے والا چلاتا۔ "علی احمد اب تمہارے دن نہیں رہے۔"

"ہاں بھئی صاحب۔" وہ ہنستے "جبھی تو راتیں منا رہا ہوں۔"

ایلی بھی راجو کو دیکھ کر حیران تھا اس میں وہ بات ہی نہ تھی۔ کوئی بھی تو بات نہ تھی اس میں۔ بالکل چلا ہوا پٹاخہ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو۔

اگلے روز جب ایلی نے ارجمند سے بات کی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "بھئی واہ ایلی تم تیلی کے تیلی ہی رہے صرف علی احمد ہی سیانے آدمی ہیں باقی تو سب الو کے پٹھے رہتے ہیں۔ یہاں وہ ہاتھی کے دانت نہیں پالتے جو کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوں سمجھے میاں۔ پیٹ کی بھوک آنکھیں سیراب کرنے سے نہیں مٹتی۔ سمجھے مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم تو ہوئے تیلی کے تیلی۔ مطلب یہ ہے بیٹا وہ کہا ہے سیانوں نے کہ عورت دیکھنے کے لیے نہیں لائی جاتی گھر میں۔ پھر صورت پر کیا جانا۔ تمہارے ابا تو گرو دیو مہاراج ہیں۔ دھن ہیں گرو دیو مہاراج وہ انگرائنڈی سیکھ رکھا ہے کہ واہ وا۔ یوں اڑی چلی آتی ہیں جیسے شمع پر پروانہ آتا ہے۔ آہا کیا گر سیکھ رکھا ہے تمہارے ابا نے بیٹا اپنے ابا کی قدر و منزلت اس خاکسار سے پوچھو۔ اپنے خادم سے پوچھو۔ خاکسار پرانا کھلاڑی ہے۔ خاکسار نے یہ کھیل ڈسپنسری کی میزوں پر سیکھا تھا اور آج اتنے سال کے بعد جب خاکسار شاہ کاکو گیا اور جناب یوں سمجھ لو کہ ایک طرف شاہ گاؤں ہے اور دوسری طرف کاکو گاؤں اور درمیان میں بروزے کی فیکٹری ہے جہاں خاکسار سٹور کیپر ہے۔ ادھر سے شاہ کی شہزادیاں آتی ہیں اور ادھر سے کاکو کی کراریاں۔ خاکسار ایک نظر ادھر رکھتا ہے۔ دوسری

ادھر۔ اس قدر چاق و چوبند رہنے کے باوجود نتیجہ کیا ہے۔ بالکل فیل۔ چھ ماہ میں صرف
تھیں اور وہ بھی سمجھ لو مجبوری سے۔ لیکن تمہارے ابا۔ سبحان اللہ گرو دیو جی
انکرانیڈی چلاتا ہے بڈھا کہ دولت پور سے علی پور چلی آتی ہیں۔ واہ وا۔ بیٹا بڑے ہو کر
گے اس بڈھے کے کارناموں پر۔ مگر یار اس سے وہ نسخہ تو لے لو جو وہ استعمال کرتا ہے۔
یہ کام کرو گے تو سدا سکھی رہو گے۔"

اب تو محلے کے سبھی لوگ اس بارے میں ایلی سے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بے
رہے تھے۔

ایک کہتا "میاں ایلی مبارک ہو۔"

دوسرا کہتا "کہو نئی ماں پسند آئی۔"

تیسرا کہتا "کیوں ایلی تم کب تک دیکھتے رہو گے میاں اب تو تمہارے دن آگئے۔"

کوئی کہتی "ایلی تیرے ابا کا چناؤ کیسا ہے۔"

ایک بولتی۔ "ایلی تو نہ اس راہ پر چلیو چھوڑ اس کو۔ اس نے تو اپنی جندگی تباہ کرلی۔"

پھر اتفاق سے محلے میں دو ایک شادیوں کا اہتمام شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ علی
راجو سے ہٹ کر شادیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔

❀❀❀

سفینہ اور نُور

میراثین

انہی دنوں علی پور میں میراثنوں کا ایک نیا ٹولہ آیا تھا۔ ان میں ایک میراثن زہرہ غضب کی رسیلی تھی۔ جب وہ گاتی اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت چھا جاتی ایسی کیفیت کہ دیکھنے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے۔

محلے کے جوان بیچارے انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی بہانہ ہاتھ آئے تو وہ میراثنوں کو بلائیں اور چھت پر چاندنی بیٹھ کر زہرہ کو گاتے دیکھیں۔

کوٹھے پر ایک طرف عورتیں بیٹھ جاتیں۔ درمیان میں میراثنوں کے لئے جگہ مقرر کر دی جاتی۔ دوسری طرف محلے کے جوان بیٹھ کر زہرہ کی طرف متبسم نگاہوں سے دیکھتے۔ جب وہ عورتوں کی طرف دیکھتی تو اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوتی۔ لیکن جب وہ جوانوں کی طرف آنکھ اٹھاتی تو دفعتاً "گویا سوکھا ہوا پھول از سرنو تازہ ہو جاتا اس پر جوانوں کے ہاتھ چپ چاپ جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگتے۔ زہرہ کے ساتھیوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور ان کی تنوں میں جوش پیدا ہو جاتا۔

محلے کی عورتیں میراثنوں کو پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں کہ ان کے آنے سے محلے میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریب میں چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر نوجوانوں کا مسکرا مسکرا کر زہرہ کی طرف دیکھنا اور روپے پر روپے دیتے جانا انہیں

بے حد ناپسند تھا۔

محلے میں صرف چند ایک لڑکیاں ایسی تھیں جو محلے کی عام عورتوں کے برعکس ایسے
خوش دکھائی دیا کرتی تھیں ان میں شہزاد پیش پیش تھی۔ ڈھولک کی آواز سن کر اس کی
میں گلابی چھینٹے اڑنے لگتے شانوں پر ریشمیں دوپٹے کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بازو یوں
لہراتے جیسے کتھا کلی کے مندرا ادا کر رہی ہو۔ اس کی تو آواز بھی بدل جاتی تھی۔
چڑھ جاتے اور بات میں تھا۔ لوچ پیدا ہو جاتا۔

ہرنی ہے ہرنی

شہزاد کی اس بات پر محلہ والیوں میں چہ میگوئیاں ہوتی۔ دبی دبی آوازیں سنائی دیتیں۔
"آخر خاندان کا اثر نہیں جاتا بہن۔"
"خود بھی تو گاتی ہے۔ سنا تھا۔ جب دولہن بن کر آئی تھی خود اپنے بیاہ پر گانے لگی
توبہ ذرا نہ جھجکی۔"
"میں کہتی ہوں چاچی یہ چیزیں خون میں ہوتی ہیں ہاں کہے دیتی ہوں۔"
"سچ کہتی ہو بیٹی۔ زمانے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔"
"ابھی تو دیکھتی جاؤ چاچی۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔"
"نہ اللہ نہ کرے۔ اب تو خدا اٹھا ہی لے تو اچھا ہے بہن۔"
"ہے اور وہ میراثن توبہ یوں دیکھتی ہے۔ جیسے آنکھوں کی جگہ میخیں ہوں۔
ہے نگاہیں۔"
"آج کل کے نوجوانوں کو تو یہی پسند ہے بہن۔"
"توبہ وہ تو ان میخوں پر بچھے جاتے ہیں۔"

جب سے شہزاد محلے میں آئی تھی۔ محلہ والیاں اسے حیرانی سے دیکھتی تھیں اور
انگلی ڈال کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ مگر شہزاد نے کبھی اس تفصیل کو اہمیت نہ دی
محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہیں اور اس کی حرکات کا بغور
ہیں۔

وہ چلتے چلتے چاچی کی طرف دیکھ کر شور مچا دیتی۔ "سنا چاچی کس کا انتظار کر رہی ہو

کر اب آتے ہی ہوں گے۔ چچا۔" اور پیشتر اس کے کہ چاچی جواب دیتی وہ اس کے پاس سے
نکل جاتی اور کسی اور سے جا کر بات کرنے لگتی۔
"بابا عمرو ہیں۔ سلام کہتی ہوں بابا۔ نماز پڑھ کر آئے ہو۔ یہ کس وقت کی نماز ہوئی۔ دن
میں تو نمازیں پڑھتے ہو گیا۔" اور پیشتر اس کے کہ بابا کچھ کہیں وہ کسی بچے سے بات شروع کر
دیتی۔

شہزاد کی عادتیں انوکھی تھیں جو محلے والیوں کی نگاہوں میں کھٹکتیں مگر اس کی ہنس مکھ
طبیعت کی وجہ سے۔

رفیق اور سکینہ

محلہ والیاں خاموش رہتی تھیں۔ پھر بھی دبی دبی رہنے کے باوجود بات نہ دبی اور محلہ والیوں
کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ "ہرنی ہے ہرنی۔" وہ اسے دیکھ کر کہتیں "کلیلیں بھرتی ہے۔" شاید
اس لئے کہ اکیلی شہزاد کے متعلق سرگوشیاں کرنا آسان نہ تھا۔ جب تک دو نام منسلک نہ ہوں
سرگوشیوں میں لذت پیدا نہیں ہوتی۔

اس لئے آہستہ آہستہ ان سرگوشیوں میں شہزاد کے ساتھ رفیق کا نام شامل کر لیا گیا اور محلے
والیاں رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاید رفیق کی طرف انگلیاں نہ اٹھتیں مگر
مشکل یہ تھی کہ رفیق کی شادی ہو چکی تھی اور وہ بچپن ہی میں سکینہ کا خاوند بن چکا تھا جو اس کی
ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور اس کی ہر جنبش میں مقصد ڈھونڈتی تھی۔ رفیق کی آنکھوں
میں بوندا باندی ہوتی دیکھ کر اس کے کپڑوں میں عطر کی خوشبو محسوس کر کے وہ ایک گہری سوچ
میں پڑ جاتی۔

رفیق اور سکینہ ایک قدامت پسند گھرانے کے افراد تھے۔ خاوند بیوی ہونے کے باوجود ایک
دوسرے سے آزادانہ طور پر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے بھی
انہیں بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور پھر موقعہ اور محل کو دیکھنا پڑتا۔ رفیق کو رومال دھلوانا ہوتا تو وہ
رومال پکڑ کر چھت کی طرف گھورتے ہوئے یوں گنگناتا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ "میں کہتا ہوں
اسے دھو ڈالنا آج۔" یہ کہتے ہوئے وہ سکینہ کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھتا اور چولہے کے قریب
بیٹھی ہوئی، سکینہ ہنڈیا میں جھانکتے ہوئے گنگناتی "رکھ دیجئے۔" پھر رفیق رومال کو جھاڑ کر یوں گرا

دیتا جیسے مداری تماشا دکھا رہا ہو۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور سکینہ لمبا گھونگٹ سنبھالے آتی اور گرا ہوا رومال اٹھالیتی اور اس سمت قطعی طور پر نہ دیکھتی۔ جس سمت کو رفیق گیا ہوتا۔ ان حالات میں سکینہ اپنے شوہر کو نیچی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے برعکس رفیق شہزاد سے سر اٹھا کر ملتا تھا۔ اگرچہ بات عزت سے کرتا تھا۔ لیکن اس کا بہانے بہانے شہزاد سے
"چچی کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ چچی ایسے اچھے چاول آئے ہیں۔ بنواری لال کی دوکان پر منگوانے ہیں کیا۔ چچی چائے سستی ہو گئی ہے۔ چچی بڑا اچھا کپڑا منڈی میں آیا ہے۔"

دن میں رفیق دوبار شہزاد کی طرف جاتا اور پھر دیر تک آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا۔ اور باتوں کے دوران میں سی سی کرنے کے علاوہ جھجکتا اور گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے پھلجھڑیاں چلتیں اور کانوں پر سرخ چیونٹیاں رینگتیں۔

رفیق کی بیوی سکینہ اسے شہزاد کی طرف آتے دیکھ کر اپنے لمبے گھونگٹ سمیت کوٹھے پر چڑھ آتی اور ان کی طرف کھڑکی چھت یا طاق سے چوری چوری جھانکتی۔ انہیں قریب قریب کھڑے دیکھ کر رفیق کے متعلق نہ جانے کیا کیا اندازے لگاتی۔ پھر اکیلے میں بیٹھ کر آنسو بہاتی اور محلے والیاں اسے اداس دیکھ کر چہ میگوئیاں کرتیں اور ان کی سرگوشیوں میں رفیق اور شہزاد کے نام سنائی دیتے۔

ایلی نے بھی کئی ایک بار انہیں یوں قریب کھڑے، باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور خواہ مخواہ اس کے دل میں بھی جلن پیدا ہوئی تھی۔ پھر تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا رہا تھا "رفیق اثر پیدا کرتا ہے تو کیا ہے۔" اس نے لاحول پڑھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن یہ تو اس زمانے کی بات تھی جب اسے تسلیم سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اب تو جب بھی وہ شہزاد کی طرف دیکھتا اس کی نگاہوں میں شہزاد کے خدوخال دھندلے پڑ جاتے اور اس رنگین دھندلکے میں سفید دانت چمکتے اور گھنگھریالے بالوں کی لٹ لہراتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ شہزاد نہیں بلکہ تسلیم ہو؟ تسلیم نے بھیس بدل رکھا ہو۔

ڈبل ایجنٹ

علی پور کے ان مشاغل میں ایلی کی چھٹیاں گویا چشم زدن میں ختم ہو گئیں۔ اور وہ علی پور سے امرتسر چلا آیا کالج جانے سے پہلے وہ آصف کے گھر گیا اور دیر تک اسے آوازیں دیتا رہا

ان کا نوکر نیچے آیا۔ "آصف صاحب ہیں۔" اس نے پوچھا۔ "جی میں دیکھتا ہوں۔" وہ بولا "آپ کا نام کیا ہے؟" آصف نے تو کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ جب بھی ایلی اس تنگ گلی میں کھڑا ہو کر آواز دیتا تو کھڑکی سے آصف جھانکتا اور مسکرا کر کہتا "آیا ابھی۔" اس سے پہلے نوکر نے کبھی نیچے آکر نہ کہا تھا "جی میں دیکھتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے۔"

نوکر دوسری بار آیا "جی آیئے۔" وہ بولا۔ وہ اسے بیٹھک میں لے گیا۔ "بیٹھئے وہ ابھی آتے ہیں۔" وہ بیٹھک بہت ہی مختصر سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں پلنگ پڑا تھا اور دوسری جانب ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' دو بڑی کھڑکیاں اور روشندان گلی میں کھلتے تھے۔ ایلی نے آصف کی بیٹھک کو دیکھ کر محسوس کیا جیسی وہ بدلی بدلی سی ہو۔ پہلے تو اس میں اتنا اندھیرا نہ ہوتا تھا نہ ہی وہ اس قدر ویران تھی۔ پہلے روشندانوں میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن اب ان پر ٹاٹ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آصف داخل ہوا اس کا چہرہ زرد تھا آنکھیں روئی روئی نظر آتی تھیں اور انداز میں جھجک تھی۔ ایلی کی طرف دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے حد اداس تھی۔

"تم آگئے۔" وہ بولا "میں محسوس کر رہا تھا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے اور کالج ہمیشہ بند پڑا رہے گا اور ——— اور ———" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم بیمار ہو گیا؟" ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ ہاں بیماری سمجھ لو۔" وہ بولا۔

"کیا تکلیف ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"تکلیف۔" آصف مسکرایا "تکلیف نہیں روگ لگا ہے۔" وہ ایلی کے قریب تر ہو کر زیر لب باتیں کر رہا تھا۔ جیسے اپنی آواز سے ڈر رہا ہو۔

"آخر بات بھی تو بتاؤ نا؟" ایلی نے چیخ کر کہا۔

آصف گھبرا گیا۔ "خدا کے لئے آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔"

"کون سن رہا ہے تمہاری بات۔" ایلی نے پوچھا۔

"سن رہا ہے۔ سن رہا ہے۔" اس نے روشن دانوں کی طرف اشارہ کیا۔

عین اس وقت گلی میں کسی نے قہقہہ لگایا۔ ایلی چونکا: "یہ کون ہنس رہی ہے؟"

چلو یہاں سے چلیں۔ وہ گھبرا کر بولا: "لیکن ایسے نہیں تم پہلے جاؤ میں آ جاؤں گا۔ بازار
ملوں گا۔ جلدی کرو جلدی"۔
اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ "کھڑکی کھول دو"۔ قریب ہی سے پھر اک عجیب
غریب آواز آئی۔
"یہ ہے کون؟" ایلی نے پوچھا۔ آصف کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ "تم
کے لیے بازار میں میرا انتظار کرنا۔ شاید مجھے دیر ہو جائے"۔
عین اس وقت ایک ڈبل اینٹ روشندان کے ٹاٹ سے ٹکرا کر دھڑام سے گلی میں گری۔
باہر نکلتے ہوئے ایلی نے چوری چوری ایک نظر مقابل کے چوبارے پر ڈالی۔ کھڑکی میں
کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
"اس سے کہو باہر نکلے۔" وہ چلائی۔
ایلی ڈر کر بھاگا کہ کوئی اینٹ اس کے سر پر نہ گر جائے۔

کوئی نہیں کسی سے نہیں

بازار میں وہ دیر تک ٹہلتا رہا مگر آصف نہ آیا اس کا جی چاہتا تھا کہ پھر سے گلی میں داخل
جائے اور جا کر اسے آواز دے مگر جرأت نہ پڑتی تھی۔ نہ جانے وہ اینٹ کس نے ماری تھی
جانے وہ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور حالات کیا تھے۔ دیر تک وہ
سوچتا رہا اور پھر ان جانے میں اس نے اپنا رخ آغا کے گھر کی طرف موڑ لیا اور پھر جو اس نے
اٹھا کر دیکھا تو وہ تسلیم کی سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔ غیر از معمول اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن
گویا ویران پڑا تھا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ڈیوڑھی زینہ اور بیٹھک سب ویران پڑے
اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دور سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔
"کون ہے؟" تسلیم کی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دروازے میں تسلیم کا
دوپٹہ لہرایا اور پھر ایک گھنگھریالی لٹ جھلکی۔
"تسلیم۔" ایلی نے زیر لب کہا۔
"اوئی اللہ۔" وہ چلا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔
"گھر کوئی نہیں۔" وہ ہنستی ہوئے بولی۔ اس کی ہنسی میں واضح اشارہ تھا۔

"مجھے کوئی نہیں سے ملنا ہے۔" ایلی نے کہا۔
"کوئی نہیں۔ کسی سے نہیں ملتے۔" وہ پھر ہنسی۔
"ہاں ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "میں کسی سے نہیں ہوں۔"
"بڑے ہو۔" وہ تنک کر بولی۔ "ہم کیا کریں۔"
"یہی تو تمہیں بتانے آیا ہوں"۔ "وہ بولا۔ کہ تم کیا کرو۔"
"نہ جی۔" وہ کہنے لگی۔ "ہمیں نہ بتایئے کچھ۔ ہم نہیں سنتے ایسی ویسی بات۔ کہو کام کیا
ہے؟"
"کام وہ آن پڑا ہے۔" ایلی گنگنانے لگا "خدا کے لئے ذرا دروازے میں تو آؤ۔"
"نہ میں نہیں آتی۔"
"ضروری بات ہے۔" وہ منتیں کرنے لگا۔
"بڑی ہو۔" وہ بولی۔
ایلی نے دروازہ کھول دیا۔ "اچھا تو میں آتا ہوں۔" "خدا کے لئے۔ خدا کے لئے۔" وہ
چلائی۔ "وہ آنے ہی والے ہیں۔"
"تو پھر وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملو گی۔" ایک فاتح کی طرح اس کی باچھیں کھل گئیں۔
"ملنے سے مطلب!" وہ بولی۔
"تمہیں دیکھنا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔
"دیکھنا ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی "دیکھ کر کیا لیں گے۔"
"کیا لینے دینے کے بغیر دیکھا نہیں جا سکتا۔"
"بس جی بس۔" وہ چڑ کر بولی۔ "اب جانے دو ورنہ۔"
"ورنہ۔" وہ چلایا۔ "میں اندر آ رہا ہوں۔"
"نہیں نہیں۔" اس نے منت کی۔
"تو پھر ملنے کا وعدہ کرو جلدی۔"
"ملوں گی، ملوں گی۔"
"کب؟"
"کہہ جو دیا ملوں گی۔ جاؤ نا اب۔ جاؤ بھی۔" وہ چڑ کر بولی۔

ایلی سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر وہ اوپر سے ایک ڈبل اینٹ مارے یا ٹھڑی
تو زندگی کتنی دلفریب ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے کوئی شرارت۔ کوئی شرارت
حرکت۔ جس سے زندگی زندگی بن جائے چاہے جو کچھ بھی ہو یہ سوچتا ہوا وہ چپ چاپ اپنی
کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

پٹھو

جونہی وہ بورڈنگ میں پہنچا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے شانوں پر اٹھا
لگا۔ ایلی نے شور مچایا۔ ٹانگیں چلائیں۔ لیکن بے کار۔ اللہ داد نے اسے اٹھائے رکھا
شفیع اب بن گئی بات۔ اب تو وہ باؤنڈری لگائیں گے کہ یہ مہاشے یاد کریں گے۔" شفیع
کرنے کے بعد وہ دونوں ویسے ہی ایلی کو اٹھائے ہوئے جلوس کی صورت میں ہر کمرے
گھومنے لگے۔

"لو بھئی ہو جاؤ تیار ہرنام سیاں اور گوبند رام ذرا آجاؤ میدان میں ہمارا پٹھو بھی
وہ باؤنڈری لگے گی کہ یاد رکھو گے۔"

ہرنام سنگھ نے انہیں دیکھ کر مونچھ مروڑی "واہ گرو۔" وہ دھاڑنے لگا۔ "وہ ہتھ
کہ یاد کرو گے ــــــ"

اللہ داد نے طنز بھرا قہقہہ لگایا "تو آجاؤ میدان میں میرے یار۔"

پھر وہ رام گوپال کے کمرے میں جا گھسے "نکل آبے رامو۔" اللہ داد چلایا "دیکھیں
تیرے ہاتھ ابے مسلوں کے سامنے کیا ٹھہرو گے تم۔ آدم خور ہوتے ہیں ہاں۔"

رام گوپال نے ایک نعرہ لگایا جسے کالی ماتا جسے بجرنگ بلی اور چھلانگ مار کر باہر نکل آیا
یونہی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعرے
لڑکوں کو نکال کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں

"علی ــــــ مولا علی" اللہ داد نے نعرہ لگایا۔ بنگالی بابو گھبرا کر باہر نکل آیا اور
جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔

"ارے یہ کیا گڑبڑ ہے بھئی۔" بنگالی بولا۔

"باہر نکلئے صاحب۔" لڑکے ایک زبان ہو کر چلائے وقت ہو چکا ہے وہ مقابلہ

رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔"

"وہ ہاتھ دکھاؤں گا صاحب کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" رام گوپال چلایا۔

"واہ گرو۔" ہرنام سنگھ کی آواز گونجی۔

"علی۔ حیدر" اللہ داد چیخنے لگا۔

"شور نہ مچاؤ۔" بنگالی بابو مسکرانے لگا "چلو ہم آتا ہے۔" لڑکے جانے لگے تو اس نے انہیں روک لیا۔

"ٹھہرو"

"ہاں بھئی۔" بنگالی سپرنٹنڈنٹ نے کہا "تم سب کو رولوں کا کھبر ہے۔"

"مسلمانوں کو گوشت منگانے کی اجازت دی جائے۔" شفیع بولا۔

"نو۔ نو۔ نہیں نہیں۔" چاروں طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "نہیں نہیں۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ اس کی اجازت نہیں ہو سکتی۔"

"کچھ پروا نہیں۔" اللہ داد بولا "لیکن ہم تین مسلمان ہیں۔ ہم مل کر مقابلہ کریں گے۔ ہمارا حساب اکٹھا رکھا جائے۔ بعد میں اسے تین پر تقسیم کر دیا جائے۔"

"نو۔ نو۔" لڑکے چلائے۔

"اس میں کوئی حرج نہیں۔" سپرنٹنڈنٹ بولا "ہرے۔ ہرے۔" شفیع اور اللہ داد چیخنے لگے۔

"آدھ گھنٹے کے بعد مقابلہ شروع ہو جائے گا اب تیاری شروع کرو۔" بنگالی بابو نے کہا۔

مقابلہ

سپرنٹنڈنٹ کی اس بات پر نعروں اور چنگھاڑوں کے بعد جلوس بکھر گیا۔ اللہ داد ایلی کو شانوں پر اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں آیا۔

"ابے کیسا مقابلہ ہوگا۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔" ایلی نے اللہ داد سے پوچھا۔

"ہائیں تمہیں معلوم نہیں کیا۔" اللہ داد نے غصے میں دھم سے ایلی کو چارپائی پر پھینک کر
اچھلا

"ارے بدھو آج مسلمانوں کے امتحان کا دن ہے۔ آج انہیں کفار کو نیچا دکھانا ہے۔ بیٹا آج

تمہیں ہماری لاج رکھنی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ہوتے ہوئے "پیٹو" کا خطاب کسی اور کو ملا تو
بھئی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔" اللہ داد بولا۔

"اتنا کھاؤ آج۔ اتنا کھاؤ کہ اس اسلامی پیٹ کے صحرا میں بندو کے پھلکے ریت کے ذرے
بن جائیں۔" شفیع نے اپنا ادبی انداز دکھایا۔

"ارے چھوڑو یہ صحرا وہرا۔" اللہ داد بولا "یوں کہہ کہ اتنا کھاؤ اتنا کھاؤ کہ میز سے اٹھانے
کے لئے چار آدمی بلانے پڑیں۔ یہ بنگالی بابو کیا یاد کرے گا سالا کہ مسلے کبھی آکر ٹھہرے تھے
بورڈنگ میں۔"

کالج کے بورڈنگ کی رسم کے مطابق ہر سال ایک مرتبہ کھانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔
کے کھانے پر باہر میزیں لگا دی جاتیں۔ تمام امیدوار اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ درمیان میں
سپرنٹنڈنٹ کی کرسی رکھ دی جاتی تاکہ وہ فیر اور فاؤل کا فیصلہ کر سکے۔

کچن میں اس روز دو چار اچھے اچھے سالن پکائے جاتے۔ اتنی مقدار میں پکائے جاتے
امیدواروں کے لئے کافی ہوں کیونکہ مقابلے کے روز ہر امیدوار کوئی سا سالن طلب کر سکتا تھا۔
جب مقابلہ شروع ہو جاتا تو ہر امیدوار کے پاس دو ریفری کھڑے ہو جاتے جو پھلکوں کی تعداد
جاتے اور ہر نئے پھلکے پر آواز دیتے "رام گوپال بارہواں۔" "لینا سیاں پندرہواں۔"
درمیان میں بیٹھے ہوئے منشی ہر امیدوار کے نام کے سامنے تعداد لکھتے جاتے۔ ان ریفریوں کے
ساتھ مختلف پارٹیوں کے لڑکے کھڑے رہتے تاکہ تعداد لکھنے والے شرارت نہ کریں اور
ضابطی پر سپرنٹنڈنٹ کو پکارا جاتا۔ "پوائنٹ آف شکایت لالہ جی۔" جو لڑکا اس مقابلے میں
سے زیادہ پھلکے کھاتا اسے "پیٹو" کا خطاب دیا جاتا اور گلے میں ہار ڈال کر اس کا جلوس نکالا
جس کی ساتھ مناسب قسم کے نعرے لگائے جاتے۔

مقابلے کے دن کے لئے باورچی بندو پہلے ہی پھلکے پکا رکھتا تاکہ پھلکوں کی کمی کی وجہ
میچ میں خلل نہ پڑ جائے پھر مقابلے کے وقت بندو، رامو، ہرنامہ اور کرشا رسوئی میں بیٹھ کر
ہوئے پھلکے سینکنے میں مصروف ہو جاتے اور رامو۔ کھمیا اور بڈھا چوکیدار باہر میزوں پر
کرنے کے لئے تیار رہتے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ رسوئی کی کھڑکیوں اور دروازے سے پھلکوں کی بوچھاڑ شروع ہو
ایلی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے رسوئی اور میزوں کے درمیان سفید کبوتر اڑ رہے ہوں

پھلکا" ہرنام سنگھ چیختا "آٹھ" اس کے سر پر کھڑا ریفری چلاتا اور پھر ادھر سے رام گوپال شور مچا
رہتا "بندو ادھر، پندرہ، بندو "پھلکی" اللہ داد چیختا ساتھ ہی شفیع اور ایلی چیخنے لگتے۔ "پھلکاری
پھلکاری۔" "ستاسٹھ۔ ستاسٹھ۔" کی آواز سن کر رام گوپال چونک جاتا۔ ارے پھر دفعتاً" اسے یاد
آتا کہ اللہ داد شفیع اور ایلی کے پھلکوں کا حساب اکٹھا ہو رہا ہے اور ستاسٹھ کا مطلب تھا ستاسٹھ بٹا
تین یعنی بائیس فی کس۔ اسی قسم کی چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ چاروں طرف سے
شاباش رام گوپال اسکے ادے ہرنامے۔ علی حیدر کے نعرے گونج رہے تھے اور ہر لحظہ سکور بڑھتا
جا رہا تھا۔ مقابلے میں صرف سات امیدوار تھے۔ رام گوپال، ہرنام سنگھ امرت لال، گوچرن
سنگھ ان کے علاوہ مسلمانوں کا ایک گروپ تھا۔ جس میں اللہ داد شفیع اور ایلی تھے۔ صحن میں پانچ
چھ میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر امیدواروں کے سروں پر ریفری اور لڑکے کھڑے گنتی میں
مشغول تھے۔ درمیان میں چھ لڑکے؟ کی حیثیت سے حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جن
کے پاس ہی آرام کرسی پر بنگالی بابو سپرنٹنڈنٹ جج کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔

تین پیٹو

"ایک سو ستاون۔" مسلمانوں کے گروپ کے ریفری نے آواز دی۔

"علی حیدر۔" اللہ داد چلایا۔ "بندو چٹنی۔"

"پوائنٹ آف آرڈر۔" رام گوپال کھڑا ہو گیا۔ "سپرنٹنڈنٹ صاحب اللہ داد صرف چٹنی کھا
رہا ہے۔"

"علی حیدر۔" اللہ داد دھاڑنے لگا۔ چارون طرف شور مچ گیا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔" بیزجی بولے۔ "چٹنی پر کوئی پابندی نہیں۔"

"علی حیدر۔" اللہ داد غرایا اور رام گوپال میز سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے
بعد شفیع اور اللہ داد دیر تک چنگھاڑتے رہے پھر آہستہ آہستہ گوچرن نے بھی ہاتھ روک لیا اور
سب سے آخر میں ہرنام سنگھ کی طبیعت مالش کرنے لگی "علی حیدر۔" تینوں مسلمان ہیرو ایک سو
ستاون پر اٹھ بیٹھے اور بورڈنگ والوں پر گویا اوس پڑ گئی۔

"اجی یہ فاؤل ہے یہ مسلے چٹنی سے روٹی کھاتے رہے ہیں یہ اصول کے خلاف ہے" لیکن
ان کی ہربات پر اللہ داد "علی حیدر" کا نعرہ لگا کر ان کا منہ چڑاتا اور بیزجی مسکرا کر کہتے "چٹنی کھانا

اصولوں کے خلاف نہیں۔" اور اللہ داد پھر سے تازہ دم ہو کر چنگھاڑتا۔ "علی حیدر"
پیٹو کا لقب تو انہوں نے حاصل کر لیا۔ لیکن رات بھر ان تینوں کی بری حالت رہی
چارپائیوں پر پڑے وہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اور پھر اللہ داد اٹھ بیٹھا اور کلن پر ہاتھ رکھ کر
گانے لگا اور پھر دفعتاً چلا کر بولا۔

"ارے یارو۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ نیند تو آج تمہارے باپ کو بھی نہ
آئے گی۔ بیکار پڑے ہو۔ آؤ چلو امرودوں کے باغ سے امرود توڑ کر لائیں۔ بڑے ہاضم ہوتے
ہیں۔ تمہاری قسم۔"

صبح سویرے اللہ داد نے پرنسپل کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضور چھٹی لینے کا نہ
ہمارا ارادہ ہے۔ اور نہ چھٹی میں کوئی دلچسپی ہے از راہ کرم چار آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں اٹھا
کالج لے آئیں۔

دوپہر کے وقت پرنسپل اپنی لینڈو میں آیا اس کے ساتھ آصف تھا "ہیلو" پرنسپل بولا
مبارک ہو تمہیں۔ پیٹو بولو کیا حال چال ہے تمہارا۔" اللہ داد نے اٹھ کر ہاتھ جوڑے "حضور
آپ کا دیا سب کچھ ہے صرف اتنی ارج ہے کہ چار دن کے لئے چار آدمی مقرر کر دیئے جائیں
ہمیں اٹھا کر گھما پھرا لایا کریں۔" پرنسپل نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر "شاباش ویل ڈن" کہتا ہوا
رخصت ہو گیا۔

اداس شام

پرنسپل کے جانے کے بعد آصف نے ایلی کو اشارہ کیا۔ ذرا یہاں تک چلنا میرے ساتھ
اس وقت اللہ داد اور شفیع اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ایلی چپکے سے آصف کے
ساتھ چل پڑا۔ آصف کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر مسکراہٹ
میں تازگی نہ تھی۔ اسے ملتے ہی ایلی نے ایک سانس میں کئی ایک سوال کر ڈالے۔

"کل تم کیوں نہ آئے وہ کون تھی جس نے ڈبل اینٹ ماری تھی۔ وہ تمہیں گھور رہی
تھی۔ تم سہمے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہے تمہیں آصف بولو بھی نا۔"

لیکن آصف چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ تھی اور رنگ اڑا
رہا تھا۔

پھر ایلی بھی خاموش ہو گیا اور دیر تک وہ دونوں درخت تلے خاموش بیٹھے رہے۔ ہر چند
منٹ کے بعد آصف ایلی کی طرف دیکھ کر بے بسی بھرے انداز سے مسکرا دیتا۔

آخر وہ بولا۔ کہنے لگا "ایلی اگر میں زہر کھا لوں تو تم برا تو نہ مانو گے۔"

"زہر۔" ایلی نے پوچھا "آخر کیوں؟"

"یہ نہ پوچھو۔" آصف نے کہا "اب زندگی بیکار ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے مرجانا بہتر
ہے۔"

"اگر میں کہوں کھا لو تو کیا کھا لو گے تم۔" ایلی نے شرارت سے پوچھا "ہاں۔" وہ بولا
"کھا لوں گا۔"

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ آصف چپ چاپ نہر کے پانی کو گھورنے لگا۔ دور کوئی رہٹ رو رہا
تھا۔ سامنے ندی کا پانی گویا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ ارد گرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں پودے سر
جھکائے کھڑے تھے اور وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

وہ یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج مغرب میں جا ڈوبا اور آسمان پر سرخ دریاں
پھیل گئیں اور رہٹ رو رو کر چپ ہو گیا۔ کتنی اداس شام تھی وہ۔

ایلی اٹھ بیٹھا "نہیں" وہ بولا "ابھی تم زہر نہ کھاؤ۔"

"کیوں۔" آصف نے پوچھا "کیوں نہ کھاؤں۔"

"بس ابھی نہیں کہہ جو دیا ہے میں نے۔"

"اچھا۔" آصف نے آہ بھری۔ "پھر میں کیا کروں۔"

"انتظار کرو۔" ایلی بولا۔

اچھا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر بورڈنگ میں جانے کی بجائے شہر کو چل پڑا "میں
اب چلتا ہوں۔"

"اچھا۔" ایلی بولا "کل پھر ملیں گے۔ ——"

ساری رات ایلی سوچتا رہا کہ آصف زہر کھانے پر کیوں آمادہ تھا وہ کونسی بات تھی جس کی
وجہ سے دکھی تھا۔ وہ لڑکی کون تھی وہ چلا کیوں رہی تھی اس روز کیا آصف کو اس سے محبت
تھی۔ پھر اس نے آصف کی بیٹھک پر اینٹ کیوں پھینکی تھی اور چلا کر کیوں کہا تھا۔ سامنے بلاؤ
لے اگر انہیں محبت تھی تو۔ لیکن محبت ایسے تو نہیں کی جاتی محبت تھی تو پھر زہر کھانے کی کیا

ضرورت تھی۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

آصف

آصف ایک خاموش اور شرمیلا نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کی بے پناہ جاذبیت کا کیا راز تھا۔ شاید اس کی وجہ اسکی خاموشی اور شرمیلا پن ہو یا شاید اس کا سفید رنگ جھکی جھکی آنکھیں رخساروں پر جھلکتی ہوئی سرخی کو اس سے کوئی تعلق ہو بہر صورت یہ امر مسلمہ ہے کہ محلے کی لڑکیاں اس کے لئے بے قرار رہتی تھیں۔ قرب و جوار میں رہنے والیاں بار بار کوٹھے پر چڑھتیں کہ شاید ایک نظر آصف کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ کئی ایک تو گھنٹوں کوٹھے پر ٹہلتی رہتیں اور کالج جانے یا وہاں سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ گلی کی کھڑکیوں میں آکھڑی ہوتیں۔ کئی ایک چھپ کر دیکھتیں۔ کئی ایک ایسی بھی تھیں جو بے پروائی کے پردے میں اپنی نمائش کرتیں کہ ایک نظر آصف انہیں دیکھ لے اور چند ایک تو دیوانہ وار چقیں اٹھا لیتیں یا کھڑکیوں سے لگ جاتیں۔ شوخ لڑکیوں نے کئی بار اعلانیہ طور پر اسے سلام بھی کئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلانیہ بات کی تھی۔ مگر گلی میں چلتے ہوئے آصف نے کبھی گردن نہ اٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر نظر گاڑے جلدی جلدی گلی میں سے گزر جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کوٹھے پر اس کا رویہ مختلف ہوتا تھا وہ اوپر چڑھتے ہی نیچی نظر سے چھتوں کا جائزہ لیتا اگر بزرگ صورت مرد یا عورت قرب و جوار میں نہ ہوتے تو وہ لڑکی پر بھرپور نظر ڈالتا اور پھر سے سامنے سے ہٹ جاتا غالباً اس کی یہ بھرپور نظر اس کی تمام تر مشکلات کی وجہ تھی۔

اسے لڑکیوں سے دلچسپی ضرور تھی۔ لیکن اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ لوگ کیا کہیں گے والدین کیا سمجھیں گے نہ جانے والدین کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے زہد و تقویٰ کا رعب جمانے کے لئے۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اپنی برتری کا عملی طور پر اظہار کرنا چاہتا ہو۔ چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو وہ اکثر کوٹھے سے اتر کر ماں کی طرف جاتا اور کسی نہ کسی لڑکی کی شکایت کرتا "دیکھو اماں آج اس نے مجھے سلام کیا ہے۔" اور اس کی ماں نہ جانے کس مصلحت یا حماقت کی وجہ سے جھٹ نوکر کو بھیج کر لڑکی کے والدین تک شکایت پہنچا دیتی۔

ایسی شکایت محلے کی کئی ایک لڑکیوں کے والدین تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب اس عادت سے نالاں تھیں۔ والدین تو پہلے ہی اپنی بچیوں کی معصومیت پر یقین رکھنے کے

خواہشمند ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی اولاد بے حد معصوم اور پاکباز ہے البتہ دوسروں کے بچے انہیں گمراہی کی طرف راغب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ـــــ آصف کی ان شکایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں نے آنسو بہا بہا کر والدین کو یقین دلا دیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں اور محلے والوں کے دلوں میں آصف کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔

اگلے روز جب وہ کالج میں ملے تو آصف کے چہرے پر حقیقی انبساط کی جھلک تھی اور اس کے تبسم میں شگفتگی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر وہ حسب معمول اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر بولا "تسلیم۔" ایک ہی نظر میں ایلی کو محسوس ہو گیا کہ یہ آصف کل والا آصف نہیں تھا وہ آصف جو تین گھنٹے یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

"زہر تو نہیں کھا لیا تم نے۔" ایلی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا "تم نے جو کہا تھا انتظار کرو۔"

"تو انتظار کر رہے ہو۔" ایلی نے اسے چھیڑا۔

"نہیں۔" وہ بولا "اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ ادھر تنہائی میں گھومیں یہاں لڑکے آ جاتے ہیں۔ اکیلے میں بتاؤں گا تمہیں۔" اور وہ دونوں میدان کی طرف نکل گئے۔

سفینہ

آصف نے بات شروع کی۔ "اس لڑکی نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ایلی۔" آصف نے مسکراتے ہوئے کہا "وہی جو اس روز مقابل کے چوبارے میں کھڑی تھی۔ جس روز تم آئے تھے۔ جس نے روشن دان پر اینٹ پھینکی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر ہمارے گھر کی طرف جھانکا کرتی تھی۔ میں نے دو ایک مرتبہ اماں کی معرفت شکایت بھی بھجوائی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ الٹا اس نے گھنٹوں اعلانیہ کوٹھے پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ سارا دن کوٹھی پر دھوپ میں کھڑی رہتی۔

خیر وہ دن بھی گزر گئے پھر گرمیاں آئیں تو ہم کوٹھے پر سونے لگے۔ ان کے کوٹھے پر ہماری طرح پردے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح سویرے وہ اٹھ بیٹھتی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہمارے کوٹھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ رہتی۔ جب تک میں نہ جاگتا وہ اسی طرح بیٹھی رہتی پھر جب میں بیدار ہو جاتا تو وہ منہ سے ہاتھ ہٹاتی اور مجھے سلام کر کے مسکراتی۔ ایسے معلوم ہوتا

جیسے اس نے صبح سویرے مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھنے سے پہلے
منہ سے ہاتھ نہ ہٹاتی تاکہ کوئی اس کے روبرو نہ آئے۔ گھر والوں نے اس بات پر اسے مارا پیٹا
مگر اپنی ہٹ سے باز نہ آئی۔ آخر گھر والے ہار گئے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ محلے والے کیا کہیں گے۔ میں
سوچتا رہتا۔ محلے کے لوگوں کو دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے
وہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ لیکن اب۔ اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا
ہے۔ گویا وہ اپنے بس میں نہیں رہی اب اسے ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے یا وہ پاگل ہو چکی ہے۔ چند
ایک دن سے اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ منہ سوجا ہوا ہے اور اسے قطعی پروا نہیں کہ وہ کیا کر
رہی ہے اسے کسی بڑے چھوٹے کی پروا نہیں۔ وہ کوٹھے پر چڑھ کر باآواز بلند میرا نام لے لے
کر پکارتی ہے۔ آوازیں دیتی ہے۔ آصف آصف جی۔ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے
ہیں۔ پھر وہ مقابل کے چوبارے میں آ جاتی ہے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر باآواز بلند باتیں کرتی
ہے۔ اگر میں سامنے نہ جاؤں تو پتھر پھینکتی ہے۔" آصف نے آہ بھری اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں
اور وہ خاموش ہو گیا۔ ایلی یہ روئیداد سن کر خوشی کی ایک لہر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش نصیب
ہے اُف۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے کسی کی محبت حاصل ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے کوئی منہ پر ہاتھ
رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آصف اس بات پر آبدیدہ کیوں ہو رہا ہے۔
اس بات پر زہر کھانے کا مطلب۔

"اور ——— اور۔" آصف نے پھر بات شروع کی۔ "اس نے اپنا نام بھی بدل لیا ہے
اب وہ سفینہ کی بجائے اپنے آپ کو آصفہ کہتی ہے۔ آصفہ توبہ کتنی جرات ہے۔ لیکن اب وہ
چلی گئی ہے۔" آصف نے کہا "اس کے والدین زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ نہ جانے کہاں
تاکہ بدنامی نہ ہو۔ اللہ کرے وہ کبھی واپس نہ آئے۔

"کیا واقعی اسے تم سے محبت ہے۔" ایلی نے حسرت ناک انداز سے پوچھا۔

آصف ہنسنے لگا "مجھے کیا معلوم۔" وہ بولا کہ محبت کیا ہوتی ہے اگر یہی محبت ہے تو خدا
بچائے توبہ کتنی بدنامی ہوئی ہے۔ کتنی رسوائی۔ "کیا تمہیں بھی اس کا خیال ہے؟" ایلی نے
پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ متبسم نگاہوں سے ایلی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں تسخیر کی مسرت

تھی۔

"کیا وہ خوبصورت ہے آصف؟" ایلی نے پوچھا۔

"خوبصورت" آصف سوچنے لگا اور پھر ہنس کر بولا "یہ سبھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔"

اس روز ایلی آصف کی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر عجیب باتیں تھیں آصف کی۔
شریف سے کس قدر مختلف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر محبت کے متعلق ہر ایک کا
نظریہ مختلف کیوں تھا اور محبت کی حقیقت کیا تھا۔ وہ تو اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اسے تسلیم سے
محبت ہے اور محلے والوں کے سامنے اسے تسلیم کرنے میں ذرا نہ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آصف۔

دن بھر ایلی بورڈنگ میں بیٹھے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کے سر پر آموں کے درختوں کی ٹہنیاں
ہوا میں جھولتی رہیں۔ کھیت گویا بال پھیلائے سوگ مناتے رہے اور دور رہٹ کراہتا رہا۔ یونہی
دوپہر سے شام ہو گئی اور مغرب میں بادل کسی ان جانے غم سے سلگنے لگے۔ آگ کے شعلے لپکنے
لگے۔ ایک اضطراب۔ دکھ بھری بے قراری۔ خاموش غم فضا سے چھنتا رہا۔

بادلوں کے ان ٹکڑوں میں تسلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی لٹیں الجھی
ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور تسلیم نے گول مٹول صورت اختیار کر لی۔ جیسے
گٹھڑی ہو۔ پھر سبز گٹھڑی کے پٹ کھل گئے اور چھم سے کسی نے جھانکا۔ "مجھے تم سے ڈر آتا
ہے ایلی۔" ایک متبسم آواز سنائی دی اور پٹ پھر سے بند ہو گئے۔ وہ چونک پڑا۔ توبہ ہے۔ وہ
زیر لب بولا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جلد ہی ایک بدلی نے
کرشن کنہیا کا روپ دھار لیا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دو بڑی بڑی
سیاہ کشتیاں ڈول رہی تھیں۔ دور کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ کتنی اداس تھی۔ وہ شام۔ اداس اور
خاموشی۔

پگلی بہن

اگلے روز تسلیم کے گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اگر تسلیم کو بھی کچھ ہو جائے جیسے آصفہ
کو ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے چق اٹھا کر سامنے آ کھڑی ہو جیسے اس روز آصفہ کھڑی تھی اور پھر اسی
طرح کہے "تم سامنے کیوں نہیں آتے تو کیا زندگی بن جائے۔ یا جب وہ وہاں پہنچے تو تسلیم
آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرائے "سلام" اور پھر ہنس کر اندر

بھاگ جائے۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار۔ روز نہ سہی صرف ایک بار۔ صرف ایک
صرف ایک بار کا ورد کرتا ہوا وہ ان کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال ہوا کہ
منزل پر پہنچ چکا ہے۔ مگر منزل ویران پڑی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ سیڑھیاں خالی تھیں۔ دیر
تک وہ وہاں کھڑا مایوس و محروم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ چپکے سے لوٹ آئے اور
نہر والی کوٹھی میں آموں کے درختوں تلے بیٹھ کر جی بھر کر روئے۔ روتا رہے حتیٰ کہ اس کے
جسم کے بند بند میں وہ چلچلاتا ہوا درد ختم ہو جائے جو ان دنوں وہ محسوس کرنے لگا تھا۔

"ہائیں۔ تم ہو ایلی۔" حئی اسے دیکھ کر چلایا "یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جیسے پٹ کے
آئے ہو' آؤ۔ آؤ۔ تمہارا دل بہلاؤں۔ اس کے پاس جا کر سب دکھ بھول جاتے ہیں۔ نہ
نہیں گھبراؤ نہیں۔ اس کے یہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ اس نے دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیسے کہ
دھندہ۔ ہمارے عشق میں مری جا رہی ہے اور ایلی ایمان سے وہ تو ازلی طور پر گھریلو عورت ہے
خالص پدمنی۔ اس کے پاس بیٹھ کر ایسے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ماں کی گود میں بیٹھا ہوں۔
آرام و سکون ملتا ہے وہاں' آؤ۔ آؤ لے چلوں تمہیں۔"

"آہا ایلی۔" آغا بال بناتا ہوا باہر نکلا۔ "بھئی اب تو آتے ہی نہیں تم اس طرف۔ کون سے
نئے مشاغل پیدا کر لئے ہیں اور وہاں ——"

"کیوں ایلی چلو گے؟" حئی نے آغا کی بات کو کاٹ کر کہا۔

"نہ۔ نہ بھئی"۔ آغا نے حئی سے کہا "اس پر تو کرم ہی کر۔" اس پر حئی منہ بنا کر چلا گیا
اور ایلی آغا کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ حئی اسے وہاں لے جائے جہاں ماں
کی آغوش کا سا سکون میسر ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہو جو محبت کے لئے دھندہ چھوڑنے کی جرأت
رکھتی ہے۔ جو روپوں کی جھنکار کو محبت پر قربان کر سکتی ہے۔

"کس سوچ میں کھوئے ہوئے ہو آج؟" آغا بولا "بہت اداس ہو۔"

جواب میں ایلی ہنس دیا "نہیں تو اداس تو نہیں۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"تو کوئی بات سناؤ۔" آغا نے کہا۔

"کوئی بات ہو بھی۔"

"اوہ ——" آغا مسکرا دیا اور پھر دانت صاف کرنے لگا۔

ایلی نے چوری چوری اوپر کی طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی پلو دکھائی نہ دے رہا تھا۔

جانے اس قدر خاموشی کیوں چھائی ہوئی تھی۔

"حئی کی بات سنی تم نے؟" آغا نے بات شروع کی "حد ہو گئی اس کا نام الماس ہے۔ نئی نئی
آئی ہے۔ یہاں اچھی خاصی ہے۔ نوجوان ہے۔ نہ جانے حئی نے کیا کر دیا ہے۔ بیچاری نے
دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے جواری میراثی بھوکے مر رہے ہیں اور حئی کے خون کے پیاسے ہو
رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے ڈرے۔ توبہ کرو۔ ڈر تو اس کی گھٹی ہی میں نہیں۔ سارا دن وہاں جا
کر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اس کی جرابیں دھوتی ہے پتلونیں استری کرتی ہے۔ چائے بنا بنا کر پلاتی
ہے۔ عجیب جذبہ ہے محبت کا۔" آغا ہنسنے لگا۔ دھندہ کرنے والیوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ کوئی
معصوم نہیں ہے وہ اناڑی نہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہے۔ جانتی ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔
حئی محض وقت کٹی کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ فریب کھائے جاتی ہے۔ عجیب بات ہے۔" آغا ہنسنے
لگا۔ "آؤ آج تمہیں سیر کرا لائیں' آؤ۔"

جب وہ چلنے لگے تو دفعتاً اوپر سے نیم کی آواز آئی "بھائی جان میں آ رہی ہوں۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" آغا نے ہنس کر کہا۔

"میں آ جو رہی ہوں۔" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

"خواہ مخواہ۔ مجھ سے کام ہے کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

"تو پھر میں کیا کروں۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تو پھر چلا کیوں رہی تھی تو۔"

"بس چلا رہی تھی۔ یونہی۔"

"اچھا شور نہ مچاؤ ہم جا رہے ہیں۔ آؤ ایلی۔"

آغا بات کر رہا تھا تو چھوٹی نیم اس کی پشت کے پیچھے سے یوں ہونٹ ہلا رہی تھی جیسے کچھ
کہہ رہی ہو جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو۔ لیکن ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب آغا چلنے لگا تو وہ پھر چلائی۔ "کہتی ہوں کوٹھے پر بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"بلا رہے ہیں کیوں۔"

"کیا معلوم۔" وہ پھر ہونٹ ہلا کر ایلی کو اشارہ کرنے لگی۔

"اس وقت نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔" آغا نے گھور کر کہا۔

"اچھا تو اچھے بھائی جان ہمیں ایک پان لے دو۔"

"اوہ ——— تو یہ بات ہے۔" آغا ہنسنے لگا۔ "خود لے لینا یہ لو پیسے۔"

"ہم تو پان لیں گے پیسے نہیں۔" وہ لاڈ سے بولی۔

"پاگل ہو گئی ہے کیا۔" آغا ہنسا۔

"ہاں۔" نیم نے سنجیدگی سے کہا "پاگل ہو گئی ہوں۔"

آغا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "یہ بہنیں بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اچھا میں لاتا ہوں پان۔ ز
بھاگ نہ جائیو"۔

"نہیں بھاگتی۔" وہ مسکرائی۔

آغا باہر نکلا تو وہ ایلی کے قریب تر ہو کر بولی "اپنا بائیسکل نہ لے جانا یہیں چھوڑ جانا اور
شام کو تین بجے آ کر کہنا بائیسکل دو" اس نے ایلی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔
روز پہلے دن ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ننھی سی معصوم بچی ایک مکمل عورت تھی جس کے
کئی آغوش مادر چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ اوپر کی طرف بھاگی۔

"ہائیں۔" ایلی چلایا "اور وہ پان۔"

"پان۔" وہ ہنسی۔ "میں نہیں کھاتی پان وان۔ نہ بھئی۔"

عین اس وقت آغا داخل ہوا۔ "ہائیں چلی گئی اور یہ پان۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا
ہی۔ یہ بہنیں بالکل ہی پگلی ہوتی ہیں۔" اور وہ پان منہ میں ڈال کر ہنسنے لگا۔

"سائیکل لے لو چلیں۔" آغا نے ایلی سے کہا۔

"نہیں۔" ایلی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہیں ہی پڑا رہے گا کل لے لوں گا
وقت ————" "اچھا یوں ہی سہی۔" آغا نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔

اتنی ساری

اس روز جب ایلی بورڈنگ میں پہنچا تو وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کئی ایک دنوں سے ایک
نام سا درد اس کے بند بند میں چیونٹیوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے
وجود ایک تکلیف دہ چیز ہو۔ اس کے گرد نیلا آسمان روز بروز پھیکا پڑتا جاتا تھا اور دنیا یوں

دینے لگی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ طویل و عریض ویرانہ۔ بے مقصد پھیلاؤ۔ ایک اذیت دہ
ٹھہراؤ چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس صحرا میں وہ خود ایک ناؤ تھا۔ جس کے گرد ریت کی
لہریں بھتنوں کی طرح ناچ رہی تھیں۔

جب بھی ایلی کی توجہ اپنی جانب مبذول ہوتی تو وہ اس ٹھہراؤ کو شدت سے محسوس کرتا
لیکن جب اس کی توجہ ریت کی لہروں کی طرف منعطف ہوتی تو اسے حرکت کا احساس ہوتا۔ جب
وہ بستر پر لیٹا تو اس کا خیال نیم کے پیغام پر مرکوز ہو گیا۔ نہ جانے نیم کا مطلب کیا تھا۔ مطلب تھا
بھی یا محض تفریح یا کچھ اور پھر بائیسکل رکھنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے اور اسے واپس لانے کی
سکیم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دیر تک وہ اس پگلی لڑکی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن گتھی نہ
کھلی۔ وہ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز کئی دفعہ اسے خیال آیا کہ سائیکل وقت مقررہ پر لانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔
کسی وقت بھی لے آؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں امید کی ایک کرن روشن ہو
جاتی۔ شاید فرق پڑ جائے پھر جلد ہی وہ کرن بجھ جاتی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ لیکن اس
کشمکش کے باوجود وہ مقررہ وقت پر آغا صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوبارے کی
کھڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ سیڑھیوں کی طرف دیکھا مکان گویا ویران پڑا تھا۔ بے دلی سے اس نے
دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" بڑھیا نے آواز دی۔

"میں ہوں ایلی۔" وہ چلایا۔

"کوئی گھر نہیں ہے نہ آغا ہے نہ حئی۔" بڑھیا نے رونے کے انداز میں کہا۔

"اپنا سائیکل لینے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"سائیکل؟" بڑھیا خاموش ہو گئی۔ پھر مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ "سائیکل ساتھ والے
گھر میں کھڑا ہے۔ یہ جو ادھر ہے۔ پنواڑی کے پیچھے والا سمجھ گیا نا۔ لے لے جا کر ادھر سے۔"

یہ انتہا تھی۔ اتنی بے رخی تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں برتی جاتی۔ خیر بڑھیا کی عادت ہی
ایسی تھی۔ لیکن وہ نیم کیا ہوئی۔ کم از کم اسے تو موجود رہنا چاہیے تھا' کچھ دیر تو وہ ڈیوڑھی میں
کھڑا سوچتا رہا۔ اس امید پر کہ شاید ابھی دروازہ کھل جائے اور نیم جھانکے۔ لیکن دروازہ بند ہی
رہا۔ پھر وہ مایوس ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کون پتہ لگائے کہ وہ مکان کونسا ہے۔ جس میں

بائیسکل پڑا ہے۔ چھوڑو بائیسکل لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اتنی دور آہستہ
کوٹھی تک واپس پیدل جائے۔ اس خیال پر وہ پنواڑی کی دوکان پر جا کھڑا ہوا۔ "کیوں صاحب،"
بولا "آپ کے پچھلے مکان کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔"

"یہ ہے۔" پنواڑی نے قریب ہی ایک ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

"انہوں نے کہا ہے۔ میرا بائیسکل وہاں رکھا ہے۔ اس مکان میں کون رہتا ہے؟" اس نے
پنواڑی سے ملتجیانہ انداز سے پوچھا پنواڑی نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا پھر بولا "کوئی نہیں
رہتا خالی پڑا ہے۔"

جھجکتے ہوئے اس نے ڈیوڑھی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ آواز تک نہ
آرہی تھی۔ پھر جرات کر کے وہ اندر داخل ہوگیا۔ صحن کے عین درمیان میں سائیکل کھڑا
اور مکان ویران پڑا تھا۔

مکان کے درمیان ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے ارد گرد چاروں طرف دالان بنے ہوئے
تھے۔ جن میں بہت سے دروازے اور فراخ کھڑکیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سائیکل کی
طرف بڑھا اور اسے سٹینڈ سے اتارنے لگا۔ جب وہ اسے گھسیٹنے لگا تو دفعتاً" چاروں طرف دالانوں
سے کئی ایک جوان لڑکیاں جھانکنے لگیں۔ وہ سب ہنس رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ
دالانوں سے نکل کر باہر صحن میں آگئیں اور آن کی آن میں اس صحن میں رنگین آنچل لہرانے
لگیں۔

بیچارہ

"لے جاؤ بائیسکل" ایک پتلی لمبی لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔

"کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" دوسری نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈانٹا اور پھر ہنس دی۔

"یہ ہے کون؟" ایک اور چمک کر بولی۔

"پوچھو نیم سے۔" عقب سے ایک شوخ آواز آئی اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

چاروں طرف سے ان لڑکیوں نے گویا ایلی پر یورش کر دی۔ خوشبو کا ایک ریلا آیا۔
اڑتے ہوئے آنچل۔ اس کی طرف لپکے جیسے کالے ناگ زبانیں نکالے جھپٹ رہے ہوں
سے بالی کا سر جسم سے الگ ہو کر فضا میں اڑا جیسے بارود کا بنا ہوا ہو۔ رنگین

شعلوں کی طرح اسے چاٹنے لگے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں تلے دھند چھا گئی۔
گورے چٹے متبسم چہرے۔ سیاہ ڈولتی آنکھیں۔ لہراتی ہوئی چوٹیاں اس سے ٹکرائیں۔ پھر دفعتاً"
نیم نیم کا شور بلند ہوا اور وہ سب بھاگیں اور ایک مقام پر یوں گڈ مڈ ہو گئیں۔ جیسے جمناسٹک
گروپ دفعتاً" ایک نئی ترتیب میں تشکیل ہو جاتا ہے۔" "نیم نیم" وہ کسی پر جھکی ہوئی چلا رہی
تھیں۔ پھر وہ کسی کو گھسیٹتی ہوئی ایلی کی طرف بڑھیں اور ایلی رنگین آنچلوں، گوری گوری
بانہوں، ریشمی چوڑیوں اڑتی ہوئی خوشبو دار لٹوں اور دلنواز قہقہوں کے انبار میں دب گیا۔

"پکڑ لو۔ پکڑ لو اسے۔" وہ ایلی کو للکار رہی تھیں "سنبھالو اپنی پیاری کو اب پکڑ بھی لو نا۔"
کئی ایک گوری بانہیں اس کی طرف لپکیں اور بالآخر دو بازو اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے۔
ایک قہقہہ گونجا اور پھر وہ سب ہنستی ہوئی اس زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے
کوٹھے کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے پر رنگین آنچل لہرائے قہقہوں کی آوازیں گونجیں اور پھر
خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھامے تن تنہا کھڑا ہے اور فرش پر رنگین
کپڑوں کی ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کو کیا کرے اور
اس گٹھڑی کو کس طرح کھولے "نیم نیم" اس نے بازوؤں کو جھنجھوڑا۔ "نیم ادھر دیکھو۔" اس
نے گٹھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گٹھڑی اور بھی سمٹ گئی۔ وہ اس بند گٹھڑی سے گویا کشتی
لڑنے میں مصروف ہوگیا۔ مگر اس کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گٹھڑی کے پلو اور بھی لپٹ
گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازو بھی کہیں گم ہو گیا اور وہ گٹھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن
کر رہ گئی۔ "نیم نیم" وہ چلایا مگر کوئی جواب نہ ملا "نیم ——" اوپر سے بڑھیا کی آواز سنائی
دی۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ تڑپ کر وہ گیند اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔
ایک ساعت کے لئے زینے میں رنگین پلو لہرایا پھر کوٹھے سے ایک سرخ چہرے نے اس کی طرف
مڑ کر دیکھا۔ جیسے وہ بلغا کا بنا ہوا ہو پھر اس مکان پر موت کا سکوت چھا گیا۔ دالانوں کے خاموش
کونے گویا باہر نکل آئے اور اس پر ہنسنے لگے۔ اس کا تمسخر اڑانے لگے۔ "تم تم" اور کوٹھے کے
پردے جھک جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے "بیچارہ۔ بیچارہ۔"

دفعتاً" اس نے محسوس کیا کہ اس کا راز کھل چکا ہے۔ وہ سب جان گئی ہیں کہ وہ کچھ بھی
نہیں۔ ایک گٹھڑی تک کو نہیں کھول سکتا۔ دو بازوؤں کو نہیں سنبھال سکتا۔ بیچارہ اس نے
محسوس کیا کہ وہ سب دالانوں کی دیواروں کے پیچھے کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں اور اوپر کوٹھے پر نیم

مایوس و محروم کھڑی ہے۔ اور اس کا چہرہ جذبہ تحقیر سے سرخ ہو رہا ہے۔ صحن میں پڑا
سائیکل سرک کر پرے ہٹ ہٹ گیا۔ جیسے وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار
ہو۔ ایلی کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور وہ سائیکل اٹھا کر بھاگا۔ بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے
اسے اپنی بزدلی اور حماقت کا احساس ہوتا اور محسوس کرتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اتنا اچھا موقع ملنے
کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہاں اتنی لڑکیاں تھیں۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ
سکا حتیٰ کہ وہ نیم کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اس واقعے کی یاد کانٹا بن کر چبھنے
اس طرح وہ واقعہ اس کے لئے ایک تلخ اور خوشگوار واقعہ بن گیا۔ "بیچارہ۔ بیچارہ۔ بیچارہ"
سائیکل کا فری ویل چلا رہا تھا اور سڑک پر دھندلی اشکال اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

اس واقعہ کے بعد مدت تک ایلی کے آغا کی گھر جانے کی جرات نہ ہوئی۔ جب بھی آغا کے
مکان کے متعلق اسے خیال آتا تو وہ محسوس کرتا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے' اس کوچے کی تمام
نوجوان لڑکیاں چوباروں میں کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں۔ اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہیں "وہی ہے
وہی۔" اس خیال کے آتے ہی اسے پسینہ آ جاتا۔

کھلاڑی

پھر اتفاق سے کالج میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی' جس نے ایلی کی توجہ کو جذب کر لیا۔
یہ تحریک ایک ڈرامہ کھیلنے کی تحریک تھی۔ مگر اس تحریک کی ابتدا انوکھی تھی اور اس کی تمام
ذمہ داری اللہ داد پر عائد ہوتی ہے۔

اللہ داد فطری طور پر ایک مسخرہ واقع ہوا تھا اور اس کا مذاق اس قدر سنجیدگی کا پہلو لئے ہوئے
کہ انسان کو بے اختیار ہنسی آجاتی مثال کے طور پر کالج میں اس کا داخلہ بھی انوکھے انداز سے ہوا
تھا۔ ایک روز چادر باندھے ایک تھیلا سی قمیص پہنے اور شانے پر ایک بڑا سا رومال ڈالے وہ کالج
کی کمپاؤنڈ میں کھڑا حسرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے پرنسپل اس طرف
گزرا پرنسپل اسے کھڑا دیکھ کر سمجھا کہ کوئی جاٹ کالج کی حدود میں آگھسا ہے۔ پرنسپل اس کے
قریب آ کھڑا ہوا۔ اس پر وہ جھجک محسوس کئے بغیر وہیں کھڑا رہا۔

"اے چودھری۔" پرنسپل نے کہا "یہاں کیا کر رہا ہے تو؟"

"میں۔" وہ چونکا۔ "دیکھتا نہیں کہ کھڑا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہا۔" یہ کہہ کر وہ

لڑکوں کو دیکھنے لگا جو کمپاؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔

"کسی سے ملے گا کیا؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"انہوں بھئی۔ دیکھ رہے ہیں۔ کرکٹ کا یہ کھیل۔"

کرکٹ کا لفظ سن کر پرنسپل چونکا۔ "پڑھے لکھے ہو کیا؟"

"اور تو کیا دیسے ہی کھڑے ہیں۔" وہ بولا

"یہاں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔" پرنسپل بولا "یہ کالج گراؤنڈ ہے۔"

"اچھا۔" وہ بولا "اجازت نہیں تو چلے جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھلانگ کر کالج کی چار
دیواری پر چڑھ گیا اور دیوار پر بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے لگا۔

اس پر پرنسپل کو بے حد طیش آیا اور اس نے قریب جا کر کہا "اب دیوار پر بیٹھ گئے۔"

"تم نے جو کہا تھا کہ گراؤنڈ میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب کیا یہاں بیٹھنے کی بھی
اجازت نہیں۔" وہ تنک کر بولا۔

پرنسپل کو اس کی دہقانیت پر ہنسی آگئی۔ بولا "تم اس کھیل کو سمجھتے ہو کیا۔"

"سمجھتے۔" اس نے پرنسپل کی طرف دیکھا۔ "ہم نے تو اس کھیل کو کھیل کھیل کر چھوڑ دیا
ہے۔ اب کسی زمانے میں کھیلا کرتے تھے۔"

"کہاں کھیلا کرتے تھے؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"مدرسے میں اور کہاں۔"

"اچھا تو مدرسے میں پڑھتے رہے ہو۔"

"ہاں" وہ بولا "دس پاس کی ہیں۔"

"اور اب کیا کرتے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کرکٹ کھیلو گے آؤ تمہیں کھلائیں۔"

اللہ داد نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگا "واہ کھڑا ہونے تو دیتے نہیں اور کہتے ہو کہ
کرکٹ کھلائیں گے۔"

پرنسپل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور پھر اسے پکڑ کر ٹیم میں لے گیا۔ "لو بھئی ایک نیا پلیئر لائے
ہیں ہم۔" وہ بولا۔ اللہ داد نے گیند اٹھا لیا اور بائیں ہاتھ سے بال کرنا شروع کر دیا ایک ہی اوور

میں اس نے کالج کے دو بہترین کھلاڑیوں کی وکٹیں اڑا دیں تو پرنسپل نے واہ وا کا شور مچایا
پرنسپل اسے اپنی لینڈو میں بٹھا کر گھر لے گیا اور اگلے ہی روز اسے کالج میں داخل کرلیا۔
کی تمام فیسیں معاف کردی گئیں بلکہ پوّر فنڈ میں سے اس کے لئے کتابیں خریدی گئیں
جوڑا کپڑوں کا بنا کر دیا گیا تاکہ وہ مناسب کپڑے پہن کر کالج آسکے۔

مسخرا

ایک روز اللہ داد برآمدے کے کونے پر کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ گیارہویں
چھوٹا سا لڑکا بھاگتا ہوا ادھر آنکلا اور اللہ داد سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے
"نہ بیٹا۔" وہ بزرگانہ انداز میں بولا "اندھا دھند بھاگا نہیں کرتے۔" اللہ داد نے اس کے
جھاڑے اور پھر اس کا منہ چوم کر کہا: "نہ برخودار ایسے نہیں کیا کرتے۔" اس پر اردگرد
سب لڑکوں نے تالیاں پیٹ دیں اور بہت ہنگامہ برپا کیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے
لڑکے نے جاکر پرنسپل سے رپورٹ کردی۔ اس رپورٹ پر پرنسپل غصے میں آگیا اور اس نے
داد کو فوراً دفتر میں طلب کیا۔ "اللہ داد تمہارے خلاف شکایت پہنچی ہے ہمیں۔" انہوں نے
میں کہا: "جی کیسی شکایت؟" اللہ داد نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ تم نے گوبند کا منہ چوما ہے؟" وہ طیش میں بولے۔ "جی ہاں"
داد نے سر جھکا لیا۔

"ہوں۔" پرنسپل غرایا۔ "تو تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔"

"غلطی ہو گئی مجھ سے جناب۔" اللہ داد بولا۔

ممکن ہے اللہ داد کا یہ قصور بھی معاف کر دیا جاتا اور اسے آئندہ کے لئے سرزنش
جاتی۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ ہر بات میں پرنسپل اللہ داد کی رعایت کیا کرتے
تھے۔ بلکہ ایک روز اللہ داد کی شرارت پر تو پرنسپل صاحب نے اعلانیہ قہقہہ مار کر کہا
"اللہ داد کو معاف نہ کروں تو اور کیا کروں اگر جرمانہ کر دوں تو وہ جرمانہ بھی کالج کے کسی
ہی ادا کرنا پڑے گا۔ بھئی اس کے پاس کچھ ہو بھی۔" پرنسپل کی یہ بات سچی تھی۔ اللہ داد
کچھ بھی تو نہ تھا۔

لیکن اس روز پرنسپل بے حد غصے میں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی

اسے پانچ روپے جرمانہ کر دیا۔ اللہ داد نے تو جرمانہ ادا نہ کیا۔ بہرحال دفتر نے جرمانے کی ادائیگی کے لئے تقاضہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اللہ داد کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ جرمانہ ادا کرنا ہی ہو گا۔

ایک روز وہ شفیع سے کہنے لگا "یار شفیع اب تو اس جرمانے کا کچھ کرنا ہی ہو گا۔"

"کرنا کیا ہے؟" شفیع بولا "پانچ روپے دے دو اور کیا۔"

"اچھا بھئی۔" اللہ داد نے کہا۔ "تو مجھے دس روپے قرض کے طور پر دے دے یار۔"

"ہاں یار دس ہی دے دو۔" اس نے کہا۔ "یا تو یہ زائد پانچ اصل کو بھی واپس لے آئے اور نہیں تو دسوں ہی گئے۔ یہ جوا کھیل ہی دیکھوں۔"

اگلے روز اکاؤنٹنٹ نے پرنسپل سے جاکر شکایت کی کہ اللہ داد پانچ کی بجائے دس روپے جرمانہ ادا کرنے پر مصر ہے یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔

اللہ داد کو طلب کیا گیا۔ "یہ کیا حماقت ہے؟" پرنسپل نے پوچھا۔ "جرمانہ تو تمہیں پانچ روپے ہوا ہے اور تم دس ادا کر رہے ہو یہ کیا حماقت ہے۔"

اللہ داد نے سر جھکا لیا۔ "نہیں حماقت نہیں جی۔" وہ بولا۔ "تو پھر کیا ہے؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"صاحب پانچ روپے تو جرمانہ دیا ہے اور پانچ روپے جمع کرا دیئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"جی کسی وقت پانچ روپے ہوتے ہیں۔ کسی وقت نہیں ہوتے اور ان برخورداروں کا کیا اعتبار نہ جانے کب آکر الجھ جائیں۔"

اللہ داد نے یہ بات کچھ ایسی سنجیدگی اور معصومیت سے کہی کہ پرنسپل قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ "تو مطلب یہ ہے کہ پانچ ایڈوانس کے طور دے رہے ہو۔ ہا ہا ہا۔" وہ ہنسے۔ "حد ہو گئی۔ اللہ داد تمہیں تو تھیٹر کا مسخرا ہونا چاہیئے خواہ مخواہ کالج میں پڑھ کر وقت گنوا رہے ہو تم۔ ہی ہی ہی۔"

"حضور میرا کیا ہے۔ آپ نے کالج میں داخل کر لیا تو کالج میں داخل ہو گیا۔ تھیٹر میں داخل کر دیتے تو تھیٹر میں داخل ہو جاتا۔ میرا کیا ہے۔"

"اچھا تو تمہیں تھیٹر میں داخل کرا دیں گے۔" پرنسپل ہنستا ہوا چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اللہ داد کا جرمانہ معاف کر دیا گیا اور دوسرے کالج کی مجلس تمثیل کا

اجرا ہو گیا۔ اور چند ہی دنوں میں کالج میں سشکنتلا کے کھیل کی ریہرسل شروع ہو گئی۔

شبھ لگن

ایلی کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ گانے کی آواز سن کر اس کے دل میں چوہے دوڑنے لگتے۔ دل بیٹھ جاتا ایک رنگین اداسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ جب شکنتلا کی ریہرسل شروع ہوئی تھی' اس کے لئے بورڈنگ میں جانا مشکل ہو گیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ عام لڑکوں کو ریہرسل دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور ریہرسل کے وقت ان لڑکوں کا داخلہ ممنوع تھا' جن کو ڈرامہ کھیلنے کے لئے نہیں چنا گیا تھا۔ اس لئے جب ریہرسل شروع ہوتی تو وہ ہال سے باہر دروازے کے شیشے سے لگ کر دیکھتا رہتا اور جب سازندے دھن بجاتے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ چند ہی یوم میں ایلی کو تین چار مرتبہ سنتے پکڑ لیا گیا اور آخر کار ڈرامے کا انچارج اسے پرنسپل کے پاس لے گیا۔ پرنسپل نے پہلے اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ پھر دفعتاً نہ جانے اسے کیا سوجھی بولا۔ "ہوں اگر تمہیں ڈرامے سے دلچسپی ہے تو عملی طور پر ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔"

"عملی مدد" ایلی سوچنے لگا۔

"تم گا سکتے ہو؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ناچ سکتے ہو؟"

"جی نہیں۔"

"یہ اچھی دلچسپی ہے۔" وہ ہنسنے لگے "گا نہیں سکتے۔ ناچ نہیں سکتے مگر ڈرامے سے دلچسپی ہے۔"

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو پروفیسر انچارج کے حوالے کر دیا گیا کہ جو مناسب کام کر سکتا ہے لیا جائے اور ایلی کو ریہرسل کے دوران ہال میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

جب "حمد" کی مشق شروع ہوتی اور میراثی طبلے پر ہاتھ چلاتا تو ایلی کا دل ڈوب جاتا اس کے جسم پر بیر بہوٹیاں رینگنے لگتیں۔ خاص طور پر جب ربابیوں کا وہ چھوٹا سا لڑکا نور میٹھی سی آواز میں "تو جگ کا ہے۔" کہتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا وہ سب کچھ

تمام تلخ یادیں محو ہو جاتیں یہاں تک کہ وہ بائیسکل والا واقعہ بھی بھول جاتا جب وہ کپڑوں کی گٹھڑی کے بل کھولنے سے قاصر رہا تھا۔ اس وقت اسے شہزاد کا چھم سے آنا بھی بھول جاتا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ موسیقی اسے تلخ یادوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ خصوصاً جب نور کیسی شبھ لگن سے بہار آئی گاتا تو ایلی یہ بھی بھول جاتا کہ وہ ایلی ہے کہ وہ علی احمد کا بیٹا ہے اور علی احمد کو ٹین کا سپاہی بننے سے دلچسپی ہے اسے سبھی کچھ بھول جاتا اور وہ حیرانی سے اس سانورے سے چھوٹے سے نور کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا۔ دیکھتے چلا جاتا۔ اس وقت نور کے چہرے کے گرد ایک ہالا سا نمودار ہوتا آنکھوں میں چمک لہراتی۔ بازو رقص کرنے لگتے۔ اس وقت اسکی آنکھیں باتیں کرتیں اس کے چتون اظہار سے چھلکتے۔ ان کا پیغام کس قدر حسین ہوتا۔

نور کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ایلی کو نزہت کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا گیت سن کر اس نے محسوس کیا جیسے واقعی بہار آ گئی ہو اور وہ شبھ لگن جس کی وجہ سے بہار آئی تھی۔ نور بذات خود ہے۔

اس کے بعد ایلی کئی ایک دن شبھ لگن اور بہار میں کھویا رہا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تھک جاتا۔ لیکن کالج کا وقت ختم ہونے میں نہ آتا۔ خدا خدا کر کے ریہرسل کا وقت ہوتا اور نور ٹھمکتا ہوا ہال میں داخل ہوتا اور ایلی کے لئے بہار آتی۔

معصوم فاحشہ

لیکن چند ہی دن کے بعد ایلی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس پتلے دبلے سانورے لڑکے میں دو شخصیتیں کام کر رہی ہیں۔ دو مختلف متضاد شخصیتیں۔ ایک وہ نور جو گاتے وقت اس میں بیدار ہوتا۔ وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی۔ جس کے گلے میں سے گویا پگھلی ہوئی چاندی کا ایک فوارہ چھوٹتا۔ لیکن جونہی وہ گانا ختم کر دیتا تو اس کی آنکھوں میں عریانی بھرا پیغام جھلکتا اور اس کی حرکات سے سستے پن کا مظاہرہ ہوتا۔

نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی۔ جو کٹڑا رنگین میں دوسرے درجے کے چوباروں میں بیٹھتی تھیں۔ نور کی ان باتوں کو دیکھ کر ایلی کو دکھ سا محسوس ہوتا اور وہ جلد ہی کسی اور بات کی طرف توجہ منعطف کر لیتا تاکہ خیال بٹ جائے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں

کانٹا سا چبھا رہتا۔ پھر وہ شدید کوشش سے تصور کے زور پر اس نور کو گانے والے نور میں بدل دیتا اور یوں وہ عریاں منظر شبھ لگن میں تبدیل ہو جاتا اور بہار آجاتی۔

جب آصف کو ایلی کی اس نئی دلچسپی کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا کہنے لگا "اچھا بھئی آج دیکھیں گے تمہارا نور۔" اس شام کو آصف گال ہتھیلی پر رکھے بیٹھا نور کا گانا سنتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی مچھلیوں میں بدل گئیں اس کے ہونٹوں کی وہ تمسخر آمیز سلوٹ دور ہو گئی اور پاؤں انجانے میں تال دینے لگے۔

اس کے بعد آصف اور ایلی فارغ وقت میں نور کو لے کر آموں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایلی کسی پیڑ تلے بیٹھ جاتا۔ آصف ندی میں پاؤں لٹکا لیتا اور نور گاتا اور اس شبھ لگن میں ایلی کی نگاہوں تلے گھنگھریالی لٹ لہراتی اور آصف کی آنکھیں جھیلوں میں تیرتیں اور سوکھے ہوئے درختوں پر ہریاول یورش کرتی اور ندی کا پانی ناچتا اور آسمان پر پرندے رقص کرتے۔

گانے کے اختتام پر نور کی آنکھ میں وہ نورانی چمک بجھ جاتی اور ایک رنڈی کپڑے اتار ننگی ہو کر ان کے روبرو آکھڑی ہوتی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ہونٹ جونکوں کی طرح ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے اور سوچتے کہ کس طرح اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں۔ اس وقت انہیں یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کوئی انہیں نور کے ساتھ دیکھ نہ پائے لیکن جونہی وہ نور سے جدا ہوتے تو وہ اس کے خیال میں کھو جاتے۔ شبھ لگن پھر کب آئے گا۔

اتفاق سے ایک روز شیخ ہمدم بھی آگئے اور ان تینوں نے مل کر شبھ لگن منائی لیکن شیخ ہمدم خاموش ہو گئے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: "یہ سب ٹھیک ہے۔ الیاس صاحب لیکن امرتسر کے ربابیے لڑکے سے نہر کے کنارے پر گانا سننا اور پھر ماشاءاللہ گانے والے جناب صاحب ہوں بات ذرا خطرناک ہے۔"

"خطرناک ہے۔" ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات خطرناک کیوں تھی۔ اس میں خطرے کی کیا بات تھی۔ نوران کے ساتھ بے حد مانوس ہو چکا تھا اور اب تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ اس کا مقصد موسیقی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا پاؤں ٹھمکانا، آنکھیں مٹکانا اور ہونٹ نکالنا قطعی طور پر بے کار تھا۔ ایلی نے اب سے پہلے کبھی اتنے چھوٹے بچے کو ایسی عریاں حرکات کرتے ہوئے

نہیں دیکھا تھا۔

نور چند ایک روز کے لئے تو ان کا منہ تکتا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا یہ نیا تعلق اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تعلق ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سمجھ میں آتی تو بھی اسے یقین نہیں پڑتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا ایک روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"خدا کے لئے مجھے بچالو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں یہ زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ امید بھری نگاہوں سے ایلی اور آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر سوکھے ہوئے درخت جو شبھ لگن سے ہرے ہو چکے تھے۔ پھر سے سوکھ گئے۔ ندی کے پانی کی روانی تھم گئی۔ جیسے وہ ایک جوہڑ بن گئی ہو اور ان کے ارد گرد ایک وسیع ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

بیگانے دوست

ایک روز آصف بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"ایلی" وہ بولا۔ "وہ۔ وہ سفینہ پھر یہاں آ رہی ہے۔ اگر وہ آگئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ چلو ہم امرتسر سے بھاگ چلیں ایلی۔"

"لیکن جائیں کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔

"نہیں آصف۔" ایلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اگر وہاں بھی لڑکیوں نے تمہیں سلام کرنے شروع کر دیئے تو۔"

"تو ——— تو ———" آصف سوچنے لگا۔ "تو میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے ہاتھ چلایا۔

"تم ان کی شکایت کرنا چھوڑ دو۔" ایلی نے سوچ کر کہا "شکایتوں کی وجہ سے وہ چڑ جاتی ہیں۔ ضد پیدا ہوتی ہے۔ تم خود انہیں سلام کرنا شروع کر دو تاکہ وہ خود تمہاری شکائتیں کریں۔"

"میری شکائتیں۔" آصف گھبرا کر بولا۔ "نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اگر تم انہیں سلام کرنا شروع کر دو گے تو ان کا برتاؤ محبوب کا سا ہو جائے گا۔" ایلی نے
کہا۔ "اور وہ تم سے دور بھاگنے لگیں گی۔ انہیں دور بھگانے کی یہی ایک ترکیب ہے۔"

"اچھا۔" آصف نے تالی بجائی۔ "کیا یہ چلے گی۔ پھر تو بہت اچھا ہے۔"

آصف سمجھ رہا تھا کہ ایلی اسے مشورہ دے رہا تھا۔ حالانکہ در حقیقت مشورے کے پردے
میں وہ اپنی مشکل بیان کر رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو صبح سویرے اٹھ کر
اسے سلام کرتی ہو۔ کوئی بھی تو نہ تھی جو اس کے لئے بیقرار ہو۔ بلکہ قریب آ کر بھی وہ چھوئی موئی
کی طرح سمٹ جاتی تھیں اور کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکتی تھیں۔

"لیکن لیکن آصف۔" ایلی نے کہا "ایسا کیوں ہوتا ہے اگر تم ان کی تلاش میں سرگرداں ہو
جاؤ تو وہ دور بھاگتی ہیں اور اگر تم ان سے دور بھاگو تو وہ تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔"

"ہاں" آصف گنگنایا "مگر میں ان کی تلاش میں کیسے کھو جاؤں۔"

اس کے برعکس ایلی سوچ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنی تلاش میں کیسے سرگرداں کرے۔ کس
طرح انہیں تلاش پر مائل کرے۔

وہ دونوں بہترین دوست تھے لیکن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک
دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ کس قدر بیگانہ۔ ان کی مشکلات ایک دوسرے سے کس قدر
مختلف اور متضاد تھیں۔

"اچھا۔" آصف نے کہا۔ "تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظاہر کروں کہ میں ان کا
متلاشی ہوں۔"

"تم صبح اٹھ کر ان کو سلام کرنا شروع کر دو۔" ایلی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اور کبھی کبھی
دوپہر یا شام کو کوشش کر کے کوٹھے یا کھڑکی سے اسے دیکھ لیا کرو۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔" آصف بولا۔

اور ایلی نے دل میں سوچا اچھا میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اپنے لئے سرگرداں کرنا
مائل جستجو کروں۔

وہ کوچہ

ایلی اب محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں بہتا ہوا تنکا ہو۔ خصوصاً جب وہ ان کے
[illegible]

میں جاتا تو یہ احساس اس کی رگ و پے میں بس جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرنے لگتا جیسے زندگی
ایک گرداب ہو جس میں افراد کی چھوٹی چھوٹی قندیلیں اپنی اپنی دھن میں سلگ رہی ہوں اور
گرداب کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار گھوم رہی ہوں۔

جب کبھی شام کے وقت ایلی آغا سے ملنے ان کے یہاں جاتا تو آغا ایلی کو لے کر ڈیوڑھی
کے باہر کھڑے ہو جاتے تاکہ کٹڑے میں چلتے پھرتے لوگوں کا تماشا کر سکیں۔ کٹڑے میں لوگ
پان کھاتے، سگریٹ کے کش لیتے اور نگاہوں کی انگلیوں سے چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصاؤں کو
چھیڑتے۔ اشارے کرتے۔ تماشین تانگوں پر بیٹھ کر چوباروں کی طرف گرم نگاہیں ڈالتے ہوئے
گزر جاتے۔ مزدوروں کے گروہ کوچے میں ٹہلتے۔ تاجر نگاہیں جھکائے قدم اٹھاتے ہوئے نکل
جاتے۔ شوقین مزاج دوکانداروں کی نگاہیں گاہکوں اور رقاصوں کے درمیان یوں گھومتیں جیسے
گھڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔

ہر چند گھنٹوں کے بعد کٹڑے میں کوئی ایسا شخص بھی آنکلتا جسے دیکھ کر لوگوں کی نگاہیں
چوباروں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتیں۔ بازار میں ایک مدھم سی سرگوشی ابھرتی۔

"کون ہے۔"

"ہائیں یہ ہے وہ۔"

"کیسے دیکھ رہا ہے۔"

"یارانہ ہے اس سے کیا؟"

اور وہ سرگوشی برف کی گیند کی طرح لڑھکتی۔ لڑھکے جاتی۔ حتیٰ کہ سارا کٹڑا اس کی لپیٹ
میں آجاتا۔ رقاصائیں بھی اپنے بے نیازانہ انداز کو چھوڑ کر بچوں کی طرح بازار کی طرف دیکھنے
لگتیں اور چند ساعت کیلئے انہیں یاد نہ رہتا کہ وہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا آپ دکھانے کے
لئے وہاں بیٹھی ہیں۔ اس وقت رقاصاؤں میں نسائیت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور محسوس ہونے
لگتا کہ وہ گڑیاں نہیں بلکہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔

لکھنؤ، الہ آباد یا مدراس کا کوئی مشہور سازندہ آجاتا یا کوئی پیرا نوکھا لباس پہنے اپنے ساتھیوں
کے ساتھ کٹڑے میں داخل ہوتا۔ وہاں مشہور ڈاکو اور لٹیرے آیا کرتے تھے۔ کروڑ پتی اور
گویئے تو اکثر آتے۔ لیکن کٹڑے میں سب سے زیادہ دھوم انسپکٹر رؤف کی تھی۔

انسپکٹر رؤف

اگر انسپکٹر رؤف آجاتا تو فوراً بازار پر سناٹا چھا جاتا۔ [illegible] سہم کر پیچھے ہٹ جاتے۔

دوکاندار چوباروں کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے۔ راہ گیر نگاہیں جھکا لیتے۔ ادھر چوباروں پر سرخی بھرے چہرے زرد پڑ جاتے۔ نگاہوں میں شوخی کی جگہ گھبراہٹ دوڑ جاتی۔ رقاصائیں یکایک چپ، چاپ گردن جھکائے بیٹھ جاتیں جیسے طبیعت ناساز ہو۔

اس زمانے میں کٹڑے پر رؤف کی حکومت تھی۔ وہ کٹڑا اس کی ریاست تھی۔ جب وہ شام کے وقت وردی پر سیٹی پیٹی لگائے۔ سر پر طرے دار پگڑی باندھے اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کٹڑے میں نکلتا تو ایک سرگوشی ابھرتی اور تیزی سے یہاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور اپنے عقب میں بھیانک خاموشی چھوڑ جاتی۔

پنواڑی چوباروں کی طرف تاڑنے کا شغل چھوڑ کر شدت سے پان بنانے میں مصروف ہو جاتے۔ دوکان پر کھڑے شوقین نظریں لڑانے کا خیال موقوف کر دیتے۔ جنرل مرچنٹوں کے سیلزمین حساب کتاب کے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔

انسپکٹر رؤف کی آمد کی خبر سن کر چوباروں میں سازندوں کے ہاتھ لرز کر ممنوع سروں پر پڑتے دکھ بھری سروں پر قیام لمبے ہو جاتے۔ سارنگیاں ناچنا چھوڑ کر رونا شروع کر دیتیں اور مسکراتی ہوئی رقاصائیں گھبرا کر گانا چھوڑ دیتیں اور کھوئے ہوئے انداز میں پان لگانے بیٹھ جاتیں۔

انسپکٹر رؤف تمہید کے طور پر کٹڑے کے دو تین چکر لگاتے۔ پھر کسی چوبارے کے دروازے پر اپنے سپاہی کو متعین کر دیتے اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچتے۔ ان کے سیڑھیاں چڑھتے ہی وہ طلسم گویا ٹوٹ جاتا۔ اس وقت کوئی پنواڑی نعرہ لگاتا "علی" اس کا وہ نعرہ کٹڑے بھر میں گونجتا اور کٹڑے میں رکی ہوئی زندگی پھر سے حرکت میں آجاتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں بے باکی سے کھڑکیوں پر منڈلانا شروع کر دیتیں۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے شوقین شرارت سے رقاصاؤں کو تاڑنے لگتے۔ رقاصاؤں کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تبسم لہراتا اور ان کے دل سے بوجھ اتر جاتا۔

البتہ جس چوبارے پر انسپکٹر رؤف چڑھ جاتے تھے وہاں لوگوں کی حالت بدتر ہو جاتی۔ محفل برخواست ہو جاتی۔ سیٹھ اور تاجر چپکے سے نیچے اتر آتے۔ میراثی ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔

پھر اگر رؤف کے حکم کے مطابق وہاں راگ رنگ ہوتا بھی تو سارنگیاں گانے کی بجائے

کو تین طبلہ سر پیٹتا۔ پھر کچھ دیر بعد چوبارے سے انسپکٹر رؤف کے دھاڑنے کی آوازیں آتیں جو سارے کٹڑے میں گونجتیں۔ وہ نشے میں چیختا چلاتا دھمکیاں دیتا۔ غلیظ گالیاں دیتا اور پھر ایسے لگتا جیسے چوبارے میں دنگا فساد ہو رہا ہو۔ وہ بالاخر بتیاں بجھ جاتیں اور سکوت چھا جاتا اور کٹڑے والے محسوس کرتے جیسے اس گہری خاموشی سے کراہوں کی آواز آرہی ہو۔

انسپکٹر رؤف کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت جو کٹڑے پر اثر انداز ہوتی تھی، پیر سبز پوش کی تھی۔ جب بھی وہ کٹڑے میں داخل ہوتے تو ایک تعجب اور خاموشی بھری سرگوشی بلند ہوتی۔ پنواڑی پان لگانا چھوڑ دیتے۔ تماش بینوں کی نگاہیں چوباروں سے ہٹ کر پیر صاحب کے چہرے اور لباس پر مرکوز ہو جاتیں۔ سیلزمین دوکان کے اندرونی حصے سے دوڑ کر باہر آکھڑے ہوتے اور رقاصائیں جنگلوں پر کھڑی ہو کر نیچے دیکھنے لگ جاتیں۔

پیر صاحب کے سبز ریشمیں پیراہن پر ان کی لانبی سیاہ زلفیں لٹکتیں ان کے سر پر ریشمیں سبز رومال عربی انداز سے بندھا ہوتا اور ان کا حسین نسائی چہرہ چمکتا اور رسیلی سیاہ آنکھیں جھکی رہتیں۔ ان کے خدوخال ستواں تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والی نہیں بلکہ دکھنے والی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی حسین عورت جوگی لباس پہنے چوبارے سے اتر کر تفریحاً کٹڑے کے بازار میں گھوم کر اپنی نمائش کر رہی ہو۔

آنچل اور گٹھڑیاں

اس کوچے کو دیکھ کر نہ جانے ایلی کو کیا ہو جاتا۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگتیں اور پھر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔

اب اس کے لئے آغا کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ وہاں بیٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس پر ہنس رہا ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک رنگین آنچل لہراتا دکھائی دیتا اور پھر بہت سے کپڑے لپٹ لپٹ کر گٹھڑی کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ گٹھڑی لڑھکتی اور کوئی ہنستا جیسے مذاق اڑاتا۔ ایلی گھبرا کر اٹھتا اور زینے کی طرف بھاگتا زینے میں کھڑی نیم کے ہونٹوں پر پراسرار تبسم ہوتا "آگئے، آگئے۔" وہ آنکھیں مٹکا کر کہتی۔ ایلی کو اس کی آواز میں بلا کا طنز محسوس ہوتا پھر وہ باہر نکل جاتا اور بازار کے کسی کونے میں کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف دیکھنے

میں کھو جاتا۔

کالج میں جب آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا "ایلی تسلیم۔" تو ایک ر گٹھڑی دھم سے ان کے درمیان آگرتی اور اس کا راز کھول دیتی۔ وہ محسوس کرتا کہ آصف کے راز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایلی ایک ریشمیں گٹھڑی کھولنے کی ہمت بھی نہ رکھتا۔

پھر شام کو وہ دونوں آموں کی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے نور سے ملتے اور نور کی کے نیچے بیٹھ کر گاتا اور شبھ لگن سے بہار آجاتی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ نور لئے شہر سے اتنی دور چل کر آموں کی کوٹھی تک پہنچنا مشکل تھا اور نور کو اس کے گھر سے ممکن نہ تھا۔ کیونکہ نور محلے کے لڑکوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ ایلی کر گھر سے اسے بلائے۔ نور سے ایک جگہ مقرر کرلی جاتی اور ایلی مقرر وقت پر وہاں جا کر اپنے بائیسکل پر بٹھا کر بورڈنگ میں لے آتا۔ ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ نور کو یوں بائیسکل پر لا خطرے سے خالی نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نور کو یوں بائیسکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں ا معلوم نہ تھا کہ کسی لڑکے سے دوستی کی وجہ سے عداوت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک روز جب ایلی سفید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا تو ایک پہلوان قسم کا شخص اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ "دیکھ بابو تو نور کا پیچھا کرنا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا۔ تیری کھلڑی سی اتر جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے غصے میں نل پر ایک گھونسہ مارا۔ پانی کا ایک چھوٹا اور ایلی کے کپڑے بھیگ گئے۔

اس روز آصف اور ایلی تن تنہا نہر کے کنارے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ سورج کی دھاریاں دھندلی پڑ گئیں۔ اور دور شہر کی بتیاں روشن ہو کر ناچنے لگیں۔ مگر شبھ لگن سے بہار آئی۔ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر ایلی نے کہا۔ "آصف میرا یہاں جی نہیں لگتا۔"

"اچھا۔" آصف نے مسکرا کر پوچھا۔ "تو پھر کیا کیا جائے۔"

"تو پھر میں علی پور سے ہو آؤں کیا۔" ایلی نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا۔"

"پتہ نہیں۔" ایلی بولا "شاید ———"

"اچھا۔" آصف نے آہ بھری۔ "لیکن میں کہاں جاؤں۔"

"کیوں۔ تم تو یہاں خوش ہو۔"

"ہاں خوش ہوں۔ بڑا خوش ہوں لیکن۔" آصف نے آہ بھری "لیکن کیا۔" ایلی نے کہا۔

"معلوم نہیں۔" آصف نے سر جھکا لیا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اب یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ جیسے کچھ باقی نہیں رہا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔"

"اب تو وہ یہاں نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی تنگ نہیں کرتی۔" ایلی نے طنزاً کہا۔ "ہاں۔" آصف نے آہ بھری۔ "اب مجھے کوئی تنگ نہیں کرتی۔"

"پھر بھی تم اداس ہو۔ عجیب بات ہے۔" ایلی بولا۔

"ہاں ———" آصف نے اثبات میں سر ہلایا۔ "عجیب بات ہے۔ اچھا تم ہو آؤ علی پور سے۔" اس نے آہ بھری۔ "کاش کہ میرا بھی کوئی علی پور ہوتا۔"

اس روز وہ دونوں دیر تک اندھیرے میں نہر کے کنارے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ داد لکڑی اٹھائے ان کی تلاش میں آپہنچا۔

"ارے یہاں بیٹھے ہو تم دونوں۔" وہ چلایا۔ "اور میں سمجھا شاید نہر میں ڈوب گئے جو ابھی تک نہیں آئے۔ "ہاں۔" وہ انہیں خاموش دیکھ کر چلایا "کیا کر رہے ہو میاں۔ یوں چپ چاپ بیٹھنے سے مطلب چلو ایلی چلو۔"

رات کے وقت لیٹے ہوئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شبھ لگن گزر گئی ہو اور بہار کے بعد چاروں طرف خزاں کی ویرانی چھا گئی ہو۔ چاروں طرف ایک لٹی ہوئی دنیا تھی۔ دور ندی کا دھارا اداس آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لہریں ہچکیاں لے رہی تھیں۔ درخت شائیں شائیں بھر رہے تھے۔ رسوئی میں رامو بھدی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا اور چاروں طرف گھپ اندھیرا لہریں مار رہا تھا۔

اس کا خیال نیم کی طرف منعطف ہو گیا۔ ایک گٹھڑی سی لپٹ گئی۔ ایک قہقہہ بلند ہوا اور زرد و اداس چہرے ستونوں کی اوٹ سے نکل کر جھانکنے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تمسخر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

گھبرا کر اس نے باورچی خانے کے نل کو گھورنا شروع کر دیا۔ ——— کتنا غلیظ نل ہے۔ اس نے جھرجھری لی۔ نہ جانے رامو کہاں ہے کس کام میں لگا ہے۔ شاید برتن صاف کر رہا ہو۔ شاید

رسوئی میں بیٹھا ہو۔ اس کی نگاہ پھر نل پر رک گئی۔ اگر اس کے گرد اینٹوں کا چبوترا
اس کی نگاہ میں نل کے گرد ایک صاف ستھرا چبوترہ بن گیا۔ "اور بابو۔" ایک بدمعاش
طرف لپکا" کھلڑی اتر جائے گی تیری۔ ہاں۔" ایلی نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔
ہونے لگا کہ نل سے چھینٹے اڑ رہے ہیں اور وہ شرابور ہو چکا ہے۔

رینگتی دیواریں

اگلے روز ایلی گاڑی میں علی پور جارہا تھا۔

بخار کی وجہ سے اس کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ دل میں ڈھنکی بج رہی تھی۔
ہرے بھرے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ یہاں وہاں سبز گٹھڑیاں بندھی پڑی تھیں۔

ایک گٹھڑی قریب آتی۔ دفعتاً" اس میں سے دو حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف لپکتے
شمیم کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی۔ "ہی ہی ہی" علی احمد قہقہہ مارتے۔ "کشمیر کے سیبوں
ہے ہاں۔"

دوسری گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ بھوؤں کے عین درمیان ایک تارہ چمکتا
روشن بندی ہو۔ پھر سیاہ جھیلوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے۔

"رے رے رے رے۔" ارجمند چھاتی پیٹتا۔ "جب سے اس پنڈورا کی گٹھڑی کے
کھلے ہیں اک قیامت ٹوٹ پڑی ہے محلے پر۔"

لڑھکتی ہوئی ایک اور گٹھڑی قریب آجاتی اور کھلنے کی بجائے مزید لپٹے جاتی۔ پٹ اور
ہو جاتے۔ پھر چاروں طرف سے حسین چہرے جھانکتے۔ ایک قہقہہ ابھرتا۔ "بے چارہ
چارہ۔"

ایلی چونک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑتا۔ لیکن گزشتہ خفت کا احساس اس کے دل
ہو جاتا۔ پھر سبز گٹھڑی قریب آکر کہتی۔

"اسے بھول جاؤ ایلی۔ بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو۔ میری طرف۔"

گھبرا کر وہ لاحول پڑھنے لگتا۔ "یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ "تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو ایلی۔ تم میں جرات
ہے۔" "ہاں ہاں" شہزاد کہتی۔ "اب تو ایلی سے ڈر آنے لگا ہے۔" اور وہ گھبرا کر

دفعتاً" ایلی دیکھتا کہ وہ اس پر جھک گئی ہے اور سیاہ جھیلوں پر کنول سے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو شام پڑ چکی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی ویران پڑی تھی چوگان میں کوئی نہ
تھا چپکے سے وہ گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دادی اماں کے کمرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ
چپکے سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ دادی اماں کا تخت جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی' خالی پڑا تھا۔
دادی اماں چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور سیدہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حمیدہ اور
رشیدہ چپ چاپ ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ "دادی اماں" سیدہ نے
مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا دادی اماں میں
حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نحیف و نزار آواز میں کہا۔ "ایلی ہے اچھا اچھا۔" اور پھر خاموش ہو
گئیں۔

اس پر ایلی سیدہ سے چمٹ گیا۔ "تم اس طرح سے کیوں بیٹھی ہو۔ دادی اماں کو کیا ہے وہ
لیٹی ہوئی کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو۔" "سیدہ نے ایلی
کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اشارے سے بولی۔ "چل اس کمرے میں یہاں نہیں۔"

جب وہ اس کمرے میں پہنچا تو وہاں ماں کو دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

"ایلی آیا ہے۔" ہاجرہ چلائی۔ "کب آیا تو۔"

"دادی اماں کو کیا ہوا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اس کی حالت اچھی نہیں۔"

"بیمار ہے؟"

"ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ تو جا ادھر فرحت کی طرف۔ ادھر سو جا کے۔ یہاں ہم
تو ہیں۔"

"لیکن مجھے دادی اماں۔"

"اسے اپنا ہوش نہیں۔ بہت تکلیف میں ہے جا شاباش۔" ہاجرہ نے منت کی۔ "سیدہ" وہ
اس کے داخل ہونے پر چلا کر بولا۔ جواب میں سیدہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا ——
"شور نہ مچا ہوش آتا ہے تو وہ مچھلی کی طرح تڑپتی ہے۔ تین دن ہو چکے ہیں۔ بڑے عذاب میں

مبتلا ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔" سیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آؤ ایلی ——" ہاجرہ بولی۔ "آؤ ادھر چلیں۔" اور وہ دونوں چپ چاپ فرحت کے
کی طرف چل پڑے۔

"تیری دادی کی حالت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کب آنکھیں بند کر لے۔" ہاجرہ نے کہا

"لیکن۔" ایلی نے پوچھا۔ "کیا بیماری ہے؟"

"بیماری؟ اب میں اس کا جواب دوں۔" ہاجرہ مسکرائی۔ "عمر کا تقاضہ ہے آخر ایک نہ
دن جانا ہی ہے سب کو۔"

ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دادی اماں بہت ضعیف ہے لیکن اس کے مرنے
متعلق اسے کبھی خیال نہ آیا تھا اور اب اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

"سب انتظامات کر چکی ہے اپنے ہاتھوں سے وہ" —— ہاجرہ نے کہا۔ "کپڑا لتا غریبوں
بانٹ چکی ہے۔ قل کے لئے چنے منگوا کر رکھ لئے ہیں۔ کل خود ہی ختم دیا۔ کفن کا کپڑا بھی
کر رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو گھڑی پل کی بات ہے۔ جبھی تو میں رات کو ادھر ہی رہتی ہوں
لیکن ایلی تو ادھر فرحت ہی کی طرف سوئیو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤں گی۔"

"ہوں۔" ایلی خاموش ہو گیا۔

"تو دادی کے پاس سو کر کیا کرے گا۔" ہاجرہ نے کہا۔ "اسے تو اپنا ہوش نہیں اس کا
بگڑتا ہے۔ تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اسے۔ تو کیا خدمت کرے گا اس کی۔ اس نے تو کبھی
سے خدمت نہیں کرائی آج تک۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ علی پور نہیں بلکہ امرتسر ہی میں ہو۔ چاروں طرف اداسی
ہوئی تھی۔ محلے کے اونچے لمبے مکانات خاموش کھڑے تھے۔ نانک چندی اینٹوں کی دیواریں
رینگ رہی تھیں۔ دیواروں پر چمگادڑیں منڈلا رہی تھیں وہ یوں چیخ رہی تھیں جیسے اس کی
پر قہقہے لگا رہی ہوں۔ کھڑکیاں ویران پڑی تھیں۔ جن پر سیاہ تیلیوں کے پردے جھول رہے
دور کچی حویلی میں کڑی لال ٹین سر جھکائے سوچ رہی تھی۔

فرحت کی طرف جاتے ہوئے ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے علی پور ایک ویرانہ ہو اس
ایک دھندلی اور لٹی ہوئی دنیا تھی۔ جس میں کوئی بات بھی جاذب نظر نہ تھی وہ محسوس کرتا
جیسے جینے کے لئے کوئی جواز باقی نہ رہا ہو۔ جیسے زندگی اپنی تمام رنگینی اور دلچسپی کھو چکی ہو

گلال پچکاری

ہائیں۔ وہ گھبرا کر رک گیا اس کے روبرو چوبارے میں شہزاد بیٹھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا
رہی تھی۔ تخت پر سینے کی مشین پڑی تھی۔ جس کے ایک جانب دو بلوریں پاؤں قرینے سے
رکھے تھے۔ سیاہ جالی کے دوپٹے سے دو سفید بازو نکل کر مشین کو تھامے ہوئے تھے۔ ریشمیں
ملبوس کے اوپر ایک متبسم چہرہ' دو نوکیلی آنکھیں اور ان پر پیشانی کا سیاہ تل۔ گھبرا کر ایلی نے نگاہ
جھکا لی۔

شہزاد کے سرخ حنا مالیدہ ہاتھوں نے جیسے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ سرخ بوندیاں
ناچنے لگیں۔ ایلی لڑکھڑا گیا۔

"تو آگیا ایلی؟" شہزاد نے مسکرا کر پوچھا۔ دادی کی بیماری کی خبر سن کر آیا ہے؟"

"نہ۔ نہ نہیں تو۔" ایلی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "آپ یہاں ہیں۔"
دفعتاً" اس غیر متحرک تصویر میں جنبش ہوئی۔ ایک چمک لہرائی بجھتی ہوئی چمک "ہاں۔"
شہزاد مشین چلاتے ہوئے بولی۔ "اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے کہا کچھ دیر
یہاں رہ لوں بیٹھ جا تو ——"

"کھڑا کیوں ہے تو؟"

ایلی بیٹھ گیا اور شہزاد کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ شہزاد سر اٹھا کر دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر
ایک مسکراہٹ چمکتی عجیب سی مسکراہٹ ایسے محسوس ہوتا کہ گلال بھری پچکاری چل گئی ہو جیسے
شہزاد بہت قریب آگئی ہو بہت قریب۔ اتنی قریب کہ قرب کی وجہ سے ایلی کے بند بند میں بتیاں
سی روشن ہو گئی ہوں جیسے اس نے نہ جانے کیا پالیا ہو لیکن جب شہزاد آنکھیں جھکا لیتی تو ایلی
محسوس کرتا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو چاروں طرف ویرانی اور اداسی چھا جاتی اس وقت ایلی
کو شہزاد کے حنا مالیدہ ہاتھوں سے گھن آنے لگتی اس وقت وہ محسوس کرتا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے
اس کا وجود باعث ننگ ہو۔ احساس ندامت سے اس کا سر جھک جاتا اور وہ دل ہی دل میں لاحول
پڑھنے لگتا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوتی کہ شہزاد ایک بار پھر
نگاہ اٹھا کر دیکھے۔ اس منور پیشانی سے بجلی چمکے چھوٹی چھوٹی بتیاں یوں روشن ہو جاتیں جیسے گلال
بھری پچکاری چل گئی ہو اور شہزاد کے حنا مالیدہ ہاتھوں کی پچکاری سے گلال کی پھوار پڑے۔ شہزاد

کا انداز عجیب سا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو فضا میں انبساط کی پھلجھڑیاں چل جاتیں۔ لیکن جب سنجیدہ ہو جاتی تو بے نیازی کا دبیز پردہ پڑ جاتا اور پھر وہ گویا ایلی کی موجودگی اور گویا وجود سے ہی بے تعلق ہو جاتی۔ نہ جانے یہ کیا سحر تھا یوں لمحہ بھر میں اس قدر قریب آجاتا اور پھر دوسرے لمحے میں جیسے کوئی کوسوں دور ہو۔

ایلی اکثر سوچتا تھا کہ وہ خصوصی مسکراہٹ کیا تھی جو قرب کا احساس دیتی تھی۔ نہ جانے اس کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا۔ جیسے کوئی ان جانی شبھ شگن آگئی ہو۔ اس نے کئی بار رفیق کی بیوی کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی تھی مگر رفیق پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ گلال کی اس پچکاری تلے کھڑے ہو کر بھی وہ ویسے ہی خشک رہتا اور پھر تیوری چڑھا کر خشک آواز میں اسے ڈانٹتا "دوپٹہ سنبھالو۔ سر ننگا ہوا جا رہا ہے۔" اور پھر باہر نکل جاتا۔

کئی بار شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہزاد کی آنکھوں میں وہی تبسم کی لہر چمک رہی ہے اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے شہزاد واضح الفاظ میں اپنے خاوند سے گویا کر رہی ہو۔ جیسے دور کھڑے رہنے کے باوجود اس کے قریب آگئی ہو۔ اس کی گود میں بیٹھ گئی ہو۔ شریف اس کے جواب میں گھورتا تو نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرت کی جگہ ایک جھلکتی حسرت اور اداسی' اور پھر شہزاد اس کی حسرت بھری اداسی کو محسوس کر کے چونکتی۔ وہ لہر بجھ جاتی' اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ ایسی چمک اس نے مردوں کی آنکھوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاں عورتوں کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی تھی' لیکن عورتوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ نگاہ کیا تھی' مسکراتی تو وہ ویسے بھی تھیں لیکن ہر مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہوتی تھی۔

شہزاد اکثر مسکرا مسکرا کر ایلی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ محض سطحی ہو لیکن شریف کی طرف دیکھ کر مسکراتی تو ایلی تڑپ اٹھتا۔ مسکراہٹ عام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی طرف بھی وہی مسکراہٹ لہرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ سے دیکھے۔ ان دنوں ایلی کی سب سے بڑی آرزو اور حسرت وہ مسکراہٹ تھی۔

ایلی کے جسم کا بند بند اس نگاہ کا بھوکا تھا اور پھر شہزاد سے "میرے ایسے نصیب کہاں" وہ سوچتا کہ شہزاد میری طرف وہ نگاہ ڈالے۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ محسوس کرتا کہ وہ گلال بھری

پچکاری چلا ہی چاہتی ہے اور وہ شرابور ہوا ہی چاہتا ہے۔ لیکن دفعتاً" نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بات بگڑ جاتی' گلال کی جگہ دو ایک پھول پتیاں برستیں اور پھر مطلع غبار آلود ہو جاتا۔ پھول پتیوں کا کیا تھا وہ تو ہر تبسم پر اڑا کرتی تھیں۔

کچھ دیر ایلی شہزاد کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ شہزاد نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار تھا۔ بے حسی تھی۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ "اچھا اب میں جاتا ہوں فرحت انتظار کر رہی ہو گی۔"

"اچھا تو مل آ اسے۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "لیکن چائے یہاں پینا نیچے جانو بنا رہی ہے۔"

"اچھا تو میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ فرحت کی طرف چل پڑا۔

احساسِ عظمت

نیچے صفدر اندھیری کوٹھری کے ساتھ والا کمرہ صاف کر رہا تھا۔

"ہائیں ایلی ہے۔" صفدر اسے دیکھ کر چونکا "چھٹی لے کر آئے ہو؟"

"دادی اماں۔" صفدر نے دانت پیسے۔ "وہ نہیں مرے گی وہ کبھی نہیں مرے گی وہ مرے تو میں پارٹی دوں گا۔ ضرور دوں گا ایمان سے مذاق نہیں۔"

ایلی کو صفدر کی بات اچھی نہ لگی۔

"آؤ۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ ایلی۔" صفدر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

ایلی بہت خوش تھا کہ محلے کا ایک بڑا لڑکا اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا اور پھر وہ لڑکا جسے تھیٹر کی پارسی لڑکی سے عشق تھا۔

"تم مجھ سے کبھی نہیں ملتے ایلی۔ میرے پاس بھی آکر بیٹھا کرو۔ اوروں کے پاس بیٹھتے ہو تو ہمارے پاس بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔"

ایلی کو صفدر کی باتیں سمجھ میں نہ آرہی تھیں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ اس کے بازو عجیب انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں بازو پر نیلے حروف میں کچھ کھدا ہوا تھا۔ شاید اس پارسن کا نام ہو ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان نیلے حروف کے متعلق صفدر سے پوچھے لیکن اس میں ہمت نہ پڑی۔

اگرچہ صفدر اس وقت کمرے کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ رک
اور اس کی آنکھوں میں چمک لہراتی۔ سرخ بوندیاں اڑتیں۔ لیکن جلد ہی وہ چمک ماند پڑ جاتی
محرومیت کے بادل چھا جاتے وہ ایک آہ بھرتا۔ اس کے ہونٹوں میں وہی جنبش ہوتی۔ "
تمہارا۔" کی جنبش' پھر وہ تڑپ کر مڑتا اور ایلی سے کہتا "ایلی تم شریف کے پاس بیٹھا کرتے
لیکن میرے پاس تم کبھی نہیں آئے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا رشتہ زیادہ قریب کا ہے
اچھا۔ اچھا آج چائے اکٹھے پئیں گے۔"

عین اس وقت چوبارے سے شہزاد کی آواز آئی۔ "ایلی۔" ——— شہزاد کی آواز سن
صفدر چونک پڑا اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کا بند بند رقص
کر رہا ہو۔

"ایلی چائے تیار ہے آؤ بھی نا ———" شہزاد کی آواز گونجی۔

شہزاد کی آواز سن کر سبھی چونک جاتے تھے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا اثر تھا۔ اس کی
آواز محلے والیوں کی آواز سے قطعی طور پر مختلف تھی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا جیسے دور
میں کوئی اڑتا ہوا پنچھی تان اڑا گیا ہو' یا جیسے گھور گھٹا میں سورج کی کوئی کرن چمک گئی ہو۔
کی آواز سن کر محلے کے بزرگ بھی چونک پڑتے تھے اور پھر کسی سے پوچھتے۔ "یہ شہزاد ہے؟"

صفدر نے ایلی کی طرف محروم نگاہ سے دیکھا۔ "ہاں بھئی۔" وہ بولا "اب میں کیا کہہ
ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ کون کچھ کہہ سکتا ہے۔" اس نے ایلی سے یا اپنے آپ سے کہا "اچھا"
وہ بولا "کبھی تو ہم دونوں اکٹھے چائے پئیں گے۔"

ایلی صفدر کے کمرے سے باہر نکلا تو فرحت کھڑی تھی۔ "ایلی تو کب آیا؟ مجھے تو پتہ
نہیں تھا کہ تو آیا ہے۔" وہ حسرت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ "اگر میں شہزاد کی آواز نہ سنتی
مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ تو آیا ہے چلو شکر ہے کہ ہم تیرا نام تو سن لیتے ہیں شہزاد کی زبانی ہی
سہی۔ چائے تو ہمارے یہاں بھی تیار ہے۔"

"مگر ———" اس نے شہزاد کے چوبارے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا "جب
فرصت مل جائے تو آئیو آئے گا نا۔ ضرور آنا۔" فرحت کی آنکھوں میں نمی نمی سی دیکھ کر ایلی
لرز گیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ سب ایلی کی طرف سے اس قدر مایوس کیوں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا
ان کی ان کہی شکایات کا کیا جواب دے مگر ان جانے میں ایلی میں ایک احساس برتری لہرا

رہا تھا۔ اسے اپنی عظمت کا احساس ہوا جا رہا تھا اگرچہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ احساس
عظمت کس وجہ سے ہے اور وہ سب اس سے مایوس کیوں تھے اور ان کا انداز حسرت زدہ کیوں
تھا۔ یہ سوچتا ہوا وہ شہزاد کی طرف چل پڑا۔

بے نیاز درزن

جب وہ داخل ہوا تو شہزاد اسی طرح بیٹھی مشین چلا رہی تھی اور اس کی نگاہ ریشمیں کپڑے
پر جمی ہوئی تھی۔

"آگئے تم۔" اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ "دیکھو تو کب سے چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی
ہے۔"

میز پر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چند ایک ساعت تو ایلی منتظر رہا کہ ابھی شہزاد آنکھ
اٹھا کر اس کی طرف دیکھے گی لیکن وہ جوں کی توں کام کرتی رہی۔ آخر وہ سوچنے لگا کہ آنکھ اٹھا کر
دیکھنا نہ سہی لیکن اٹھ کر چائے تو بنائے گی مگر جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

"اب پی بھی لو نا چائے۔" وہ بولی۔ "مجھے بھی ایک پیالہ بنا دو۔" ایلی کے تمام سہانے خیال
صابن کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے گرد و پیش دھندلا رہے ہوں۔ جیسے وہ گرا جا رہا ہو۔ بلندیوں سے
نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو وہ احساس برتری کافور ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا "میں چائے کا بھکاری تو
نہیں جو میز پر رکھی ہے۔" اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے اور اپنے آپ کو اس برتر اور بے
نیاز درزن سے محفوظ کر لے' لیکن اٹھ کر بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پھر دفعتاً" اسے یاد آیا کہ
اس نے کہا تھا کہ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ' ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ میرے لئے بھی
بنا دو ایک پیالہ۔ اس ایک فقرے میں جادو تھا کتنی اچھی ہے شہزاد ——— وہ محسوس کرنے لگا اور
پھر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی شہزاد چھم سے آنمودار ہوئی۔ "چلو ایلی۔" وہ بولی۔ "میں کب
سے انتظار کر رہی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"یہاں جو بنی ہوئی ہے۔" فرحت بولی۔ "دونوں بیٹھ کر یہیں کیوں نہیں پی لیتے۔" فرحت
کے انداز میں طنز تھی۔

"یہاں نہیں۔" شہزاد تن کر بولی۔ "چائے کا مزا اکیلے میں آتا ہے۔"

"تو جبھی ایلی کو بلانے آئی ہو۔" فرحت نے پھر وار کیا۔

"ہاں۔" شہزاد نے قہقہہ لگایا۔

"مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" فرحت بولی۔

"نہ بھائی۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایلی کو تمہیں سونپ گیا ہے۔"

"ہاں۔" شہزاد مسکرائی۔ "وہ کہہ گئے ہیں ایلی کو چائے پر ضرور بلایا کرنا۔"

"اوہ" فرحت شہزاد کی دلیری پر گھبرا گئی اور ایلی چپ چاپ شہزاد کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچے تو شہزاد حسب معمول مشین کے سامنے بیٹھ گئی۔

"ایک پیالہ مجھے بھی بنا دو۔" اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔

دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا اور شہزاد کپڑے سینے میں منہمک رہی۔ چائے پی کر
جب وہ نیچے اترا تو اندھیری کوٹھڑی میں صفدر کھڑا حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے
ہونٹ بھنچے ہوئے تھے جیسے "حافظ خدا تمہارا۔ گنگنانا بھول چکے ہوں۔ ایلی کو دیکھ کر اس نے
ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ آ گئی۔ نہ جانے وہ کیوں اس کی
طرف حسرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر کہے۔ "نہیں نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ
سے چائے بنا کر پی ہے۔ میرے ساتھ میز پر کسی نے چائے نہیں پی۔" لیکن اس میں اتنی جرأت
نہ تھی۔ چوگان میں عورتوں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"اے ہے۔" ایک بولی۔ "ایلی آیا ہے۔"

"میں کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔" چاچی بولی۔ "دادی تیری اس طرف پڑی
پڑی ہے۔ بہن تیری ادھر ہے تو اس ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا ہے۔"

"ہائے چاچی۔" دوسری نے کہا۔ "آج کل کے لڑکے گھر پر کہاں بیٹھتے ہیں۔"

"نہ لڑکی۔" چاچی نے پینترا بدلا۔ "ہمارا ایلی ایسا نہیں۔ ہو گا کوئی کام آخر پڑ جاتا ہے لوگوں کو
لڑکی۔" اس نے کان سے منہ لگا کر کچھ کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

"دیکھ لو زمانے کے رنگ ہیں چاچی۔"

"یہی تو دیکھ رہی ہوں۔ توبہ کیا زمانہ آیا ہے مگر ہمارا ایلی ایسا نہیں۔"

کیا کروں

پھر رضا آ گیا —— "ٹھیک ہے بابو اب کیوں ہمارے پاس آنے لگے تم۔ اب تو بس
چوباروں میں بیٹھ کر چائے اڑتی ہے۔ لوگ بلا بلا کر پلاتے ہیں۔ مگر بابو جب اونچے چوباروں سے
کوئی گرے تو ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے ہاں۔" اس نے اپنی لنگڑی ٹانگ دکھاتے ہوئے کہا۔
"یقین نہ آئے تو یہ دیکھ لو۔"

"بکواس بند کرو۔" ایلی نے بات مذاق میں ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"کیسے کروں بند۔" رضا ہنسنے لگا "اپنا تو کام ہی بکنا ہے۔ سنا امرتسر والوں کا کیا حال ہے۔ اب
تو مزے ہیں نا۔"

رضا اسے چھیڑنے لگا۔

"بیٹھ جا۔" وہ بولا "بیٹھ جا میاں۔"

"اونہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

بیٹھنے کو بھی نہیں چاہتا چل کہیں گھومیں پھریں۔ واہ دل خوش کر دیا رضا نے لاٹھی پکڑی اور
چل پڑا۔ دیر تک وہ دونوں فصیل سے باہر گھومتے رہے پھر ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔

"رضا"۔ ایلی بولا؟ "میرا جی نہیں لگتا"۔

"جی لگ جائے بابو تو پھر بھی نہیں لگتا"۔

"کیا مطلب؟" ایلی نے پوچھا۔

"سارے محلے میں تیری تسلیم کی باتیں ہو رہی ہیں"۔

"لیکن رضا تسلیم تو میرے سامنے نہیں آتی کئی جتن کر دیکھے"

"تسلیمیں سامنے نہیں آیا کرتیں ایلی۔ سامنے آ کھڑی ہوں تو پھر بات ہی کیا ہے۔"
رضا نے کہا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔" پھر ایلی امرتسر کی باتیں سناتا رہا اور رضا قہقہے مار کر ہنستا رہا۔

سیر کر کے جب وہ واپس آئے تو رضا سے رخصت ہو کر ایلی دادی اماں کی طرف گیا
دروازے میں ہاجرہ کھڑی تھی۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے۔" وہ بولی۔ "جا فرحت کی طرف دوڑ جا
بلاتی ہے"۔ "کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"کہا جو ہے تم سے۔" وہ بولی۔ "وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ آنکھیں کھولنے کی
سکت نہیں رہی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اپنا دل برا کرے گا تو۔ جا فرحت تیرا انتظار کر رہی ہو گی
وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑا۔

شام کو جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو چوبارے سے ملحقہ چھت پر پانچ چھ چارپائیاں
بچھی ہوئی تھیں اور فرحت اور شہزاد چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"تو آ گیا ایلی۔" فرحت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اچھا کیا تو نے کہ چلا آیا۔ ...
اماں کی حالت اچھی نہیں۔ نہ جانے کب۔"

——وہ رک گئی۔ "اماں تو کئی راتوں سے ادھر ہی رہتی ہیں' آج کی رات——شاید
مجھے بھی جانا پڑے اسی لئے میں نے یہاں چارپائیاں بچھوا دی ہیں تاکہ بچے اکیلے نہ رہیں۔ کیوں
ہے نا شہزاد——"وہ ہے تیری چارپائی ایلی۔ وہ کونے والی۔"

***

شہزاد

سانپ اور سپیرا

رات کو شہزاد کی طرف دیکھے بغیر ایلی اپنی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔ صحن میں چاندنی۔ چنکی ہوئی تھی رو پہلی چاندنی میں شہزاد کے دو بلوریں پاؤں کہیں رکھے ہوئے تھے اور سیاہ جالی دار دوپٹے میں اس کی دودھیا پیشانی پر ایک سیاہ بیر بہوٹی چمٹی ہوئی تھی۔ لانوکیلی آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ گھبرا کر ایلی نے دیوار کی طرف منہ موڑ لیا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دادی اماں کی طرف سے ہاجرہ نے فرحت کو آواز دی۔ "ادھر آنا۔ جلدی۔"

"خدا خیر کرے۔" فرحت نے گھبرا کر کہا اور ملحقہ کوٹھا پھلانگ کر دادی کی طرف چلی گئی۔

فرحت کے جانے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ جانے شہزاد بیٹھی کیا کر رہی تھی۔ ایلی نے شہزاد کی طرف نہ دیکھنے کا عزم کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہوں تلے سیاہ جالی دار ڈوپٹے کا پلو اڑ رہا تھا۔ شفاف پیشانی پر سیاہ بیر بہوٹی رینگ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اسے احساس ہوتا کہ وہ شہزاد کے متعلق سوچ رہا ہے پھر وہ گھبرا کر اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

"سو گئے ایلی۔" قریب ہی شہزاد کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا "نہیں تو

جاگ رہا ہوں۔"

"اوہ ——— میں سمجھی سو گیا ہے۔ لیکن یوں چپ کیوں پڑا ہے تو" وہ بولی "اور گیا تو ناچوں۔" ایلی نے جل کر کہا۔

وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی "ناچ تجھے کون منع کرتا ہے۔"

"اکیلے میں تو ناچا بھی نہیں جاتا۔" وہ بولا۔

"تو کیا اکیلا ہے۔" شہزاد نے اشارتاً اسے امرتسر یاد دلانے کی کوشش کی۔

"اکیلا ہی تو ہوں۔" ایلی نے لمبی آہ بھری۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ "اوہ میں سمجھی امرتسر یاد آ رہا ہے تجھے۔"

"امرتسر؟" ——— وہ گھبرا گیا۔

"تسلیم۔" شہزاد نے جھک کر اسے آداب کیا اور پھر ہنسنے لگی۔

ایلی کا منہ فق ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد امرتسر اور تسلیم کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔

"کبھی تسلیم سے ملاقات بھی ہوئی ہے؟" شہزاد نے اس کے قریب آ کر پوچھا اور پھر اس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ایلی کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں اسے محسوس ہونے لگا جیسے گرمی کی ایک لہر اس طرف بڑھ رہی ہے۔ ان جانا اضطراب اس پر چھائے جا رہا تھا۔ ایک سرخ دھندلکا اس کی کنپٹیوں میں تھرک رہا تھا۔ صحن میں زرد چاندنی اور گدرے سایوں کی عجیب سی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔ پاس ہی چوبارے میں اندھیرا رینگ رہا تھا۔ مسجد کے گنبد کے اوپر چمگادڑیں چیخ رہی تھیں۔

"یاد آتی ہے تمہیں۔" شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھ کر پوچھا "جبھی یوں چپ چاپ پڑا ہے تو۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔

شہزاد اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ سفید ہاتھوں پر حنائی رنگ اسے [illegible] دکھائی دے رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ بولا

"اچھا۔" وہ ہنسی "اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟"

"فائدہ ———" اس نے شہزاد کی اڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔

"اچھی محبت ہے یہ۔" وہ بولی۔

"ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے وہ قرب نہ جانے کیا کر رہا تھا جیسے اسے چھیڑ رہا ہو۔ اس کی قوت عمل دھندلائی جا رہی تھی' نہ جانے قرب کی وجہ سے یا کسی ان کہے ڈر سے جو اس کی نسوں میں دھنکی کی طرح بج رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے بات کرنے کی کوشش کی تو اس کی آواز کی لرزش راز فاش کر دے گی۔

"میں پانی پی لوں۔" ایلی نے گھبرا کر کہا۔

"میں پلاتی ہوں تمہیں پانی۔" شہزاد اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بہانہ بھی بے کار ہو کر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا گھڑے کے پاس شہزاد گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور اندھیرے کی بساط بچھی ہوئی تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ "یہ لو۔" شہزاد کا حنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی جھجک کر پیچھے ہٹا۔

"لو بھی" ہاتھ اور قریب آ گیا ایلی کا جی چاہتا کہ پانی کے گلاس کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑے اور پھر پھر ——— مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا ——— ایک سرخ دھندلکا ———

چچ چچ ——— ایک چمگادڑ کہیں قریب سے ایلی کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شہزاد نے گلاس چھوڑ دیا ایلی شرابور ہو گیا۔ شہزاد کی سریلی ہنسی سے فضا گونجنے لگی۔

"بالکل ہی مجنوں بن گئے۔" وہ چلائی۔ "لاؤ میں پونچھ دوں۔" وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔ سرخ ناگ پھن پھلائے پھر اس کی طرف لپکا بو کا ایک ریلا آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سرخ دیوانگی اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نے لپک کر اس رنگین سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جسے وہ سپیرا ہو۔ اسے اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی وجہ سے۔ محبت سے۔ نفرت سے یا اس خوف کی وجہ سے جو اس پر مسلط و محیط تھا۔ اس کی دیوانگی اور بھی شدید ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ جھٹکا دے کر دیوانہ وار اسے اپنی طرف کھینچا۔ یوں بے دردی سے کھینچا۔ جیسے شہزاد محض ایک رنگین گڑیا ہو۔ شاید وہ اسے دانتوں سے کاٹنا چاہتا تھا تاکہ کاٹے جانے سے پہلے اس کی گردن چبا لے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے لیکن اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونٹ جلنے لگے اور ان جانے

میں اس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزاد چارپائی پر یوں گر چکی تھی جیسے ایک بار پھر موتیا کٹھڑی میں تبدیل ہو گئی ہو۔

"ایلی تم ——؟" وہ ہونک رہی تھی۔

ایلی کی نگاہ میں وہ زرد چاندنی سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے فضا میں گلال کی پچکاریاں چل رہی ہوں۔

عین اس وقت ملحقہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت چلاتی ہوئی آ رہی تھی ——"تم سو گئے کیا؟"

فرحت کی آواز سن کر وہ خونیں طلسم ٹوٹ گیا۔ ایلی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ کٹھڑی لپک کر کھڑی ہو گئی اور ایلی لیٹ کر یوں چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے عرصہ دراز سے سو رہا ہو۔

"تم آ بھی گئی۔" شہزاد نے کہا۔

"اماں نے بھیج دیا۔" فرحت بولی۔

"کیا حال ہے اب۔"

"اچھا نہیں۔ شاید آج کی رات ——"

"بیچاری کی جان چھٹے۔"

"میں سمجھی تم سو چکے ہو گے۔" فرحت نے کہا۔

"نہیں تو۔" شہزاد بولی۔ "ابھی تو جاگ رہے ہیں۔"

"اور ایلی تو غالباً سو چکا ہے۔" فرحت نے ایلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ابھی تو باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے۔" شہزاد کی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہ تھی۔ وہ یوں کوٹھے پر ادھر ادھر گھوم رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اگر۔ لیکن

ایلی پسینے میں شرابور تھا۔ اسے اپنے کئے پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا۔ کیا کیا۔ اگر شہزاد نے فرحت سے کہہ دیا تو۔ اگر اس نے شریف کو بتا دیا تو وہ کیا کہے گا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ دونوں مل کر تمسخر سے ہنسیں گے۔ اس تمسخر کو محسوس کر کے اس کا سانس رک گیا۔

لیکن شاید شہزاد کسی کو نہ بتائے۔ شاید وہ اس راز کو چھپا لے۔ ابھی تک تو اس نے فرحت سے اس بارے میں بات نہ کی تھی۔ شاید وہ موقعہ کی تلاش میں تھی کہ کب ایلی کہیں جائے اور وہ ایلی کی حماقت کا قصہ بیان کرے۔ فرحت اور ہاجرہ سن کر کیا کہیں گی۔ کہیں گی۔ آخر بیٹا کس کا ہے۔ اس خیال پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لیکن شہزاد کا رویہ بے نیازی اور بے پروائی کا مظہر تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے ایلی کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا اگر نہ بھی بتائے تو بھی وہ اپنے دل میں اسے ذلیل سمجھے گی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر رنجیدہ ہو گی۔ ممکن ہے اب کبھی اس کے قریب نہ آئے اور آئے بھی تو نفرت سے ناک سکیڑ لے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی چھم سے محروم ہو جائے گا۔ کیا وہ اسے دیکھ کر کبھی نہ مسکرائے گی۔ اس کی آنکھوں میں ننھی بتیاں روشن نہ ہوں گی اور وہ گلال بھری پچکاری ——نہیں نہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ شہزاد فرحت سے شکایت کر دے۔ ہاجرہ سے کہہ دے۔ شریف سے کہہ دے۔ جس سے جی چاہے کہہ دے مگر اپنا انداز نہ بدلے ہاں ہاں۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا اور جب وہ معاف کر دے گی تو منت کر کے کہوں گا۔ "میری ایک بات مان لو خدا کے لئے۔ صرف ایک بات۔ اپنے ہاتھوں پر مہندی نہ لگایا کرو اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنا ہاتھ میرے اس قدر قریب نہ لایا کرو۔"

چارپائی پر پڑے پڑے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر اندھیرے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا منڈلا رہا تھا اور شیش محل کی سب سے اونچی منزل ٹمیالی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

شہزاد کی ہنسی سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ ہنس کیوں رہی تھی۔ وہ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخور اعتنا نہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ کانپ گیا۔ اگر اس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تو ——اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور وہ اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگا۔

"لو یہ اور دیکھو۔" شہزاد ہنسی۔ "ویسے سویا ہوا ہے لیکن کروٹیں لئے جا رہا ہے۔"

فرحت نے سنجیدگی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا سوتے میں ہمیشہ کروٹیں لیتا ہے۔"

"اچھا۔" شہزاد کی آواز میں طنز تھی۔ سوتے میں جاگتے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جاگتے میں سوتے کی سی۔ عجیب بات ہے۔"

فرحت شہزاد کی بات سمجھ نہ سکی۔ البتہ ایلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے وہ سوچنے لگا کہ شہزاد کی آواز میں کتنی طنز تھی۔ ضرور اس نے اس کی اس حرکت کا برا مانا تھا۔ ضرور برا مانا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ اس گھر میں آنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ شکر ہے اس نے کچھ تو مانا اسے اچھا نہ سہی برا سہی درخور اعتنا تو سمجھا۔ اگر وہ کچھ بھی نہ سمجھتی تو ـــــ اس خیال پر اسے خوشی تو ہوتی، مگر پھر وہی فکر سوہان روح ہو جاتا۔ نہ جانے اب وہ کیا کرے گی۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شہزاد کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ان کی باتوں میں وقفے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

وہ چونک کر جاگ پڑا۔ اس نے مڑ کر چوری چوری فرحت اور شہزاد کی چارپائیوں کی طرف دیکھا انہیں چپ چاپ پڑے دیکھ کر وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ بیٹھا۔ فرحت چارپائی کے ایک پہلو پر سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس سے پرے شہزاد چارپائی پر یوں بچھی ہوئی تھی جیسے پلنگ پوش بچھا ہوتا ہے اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ ایک ہاتھ ساتھ والی چارپائی پر ننھی صبیحہ پر پڑا تھا۔ جیسے تھپکتے تھپکتے سو گئی تھی۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کاش وہ صبیحہ ہوتا اور شہزاد کا ہاتھ اسے تھپکتا۔

دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ ہاتھ اسے تھپک رہا ہو اس کے بدن میں چیونٹیاں چلنے لگیں۔ سرخ ناگ پھن اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔ ایلی کسی شدید جذبہ سے متاثر ہو کر شہزاد کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس رنگین پھن سے لپٹ جائے اور پھر ڈسے جانے کے بعد اس خوابیدہ حسینہ پر گر کر ڈھیر ہو جائے۔ لیکن عین اس وقت فرحت نے کروٹ لی اور وہ گھبرا کر رک گیا اور پھر چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔

ندامت یا ڈر

اگلے روز ایلی سارا دن اس کوشش میں لگا رہا کہ شہزاد کے روبرو نہ جائے۔ وہ شہزاد سے ڈرتا تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھ کر وہ باہر نکل گیا اور کوٹلی جا کر قبرستان اور تالاب کے گرد بے

مصرف گھومتا رہا۔ واپس آ کر چپکے سے اندھیری ڈیوڑھی سے گزر کر سیدھا فرحت کے گھر آ پہنچا حالانکہ عام طور پر وہ ہمیشہ شہزاد کے مکان سے گزر کر فرحت کی طرف آیا کرتا تھا۔ پھر جب دوپہر کو وہ گھر بیٹھا فرحت سے باتیں کرنے میں منہمک تھا تو سیڑھیوں سے طبلے کی تھاپ سنائی دی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اسے بھول گیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔ کیا کہنا چاہتا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھا "اچھا میں ہو آؤں۔" چھم سے شہزاد اس کے قریب آ رکی۔ ایلی نے نگاہیں جھکا لیں۔

"ایلی ہے۔" شہزاد نے لاپروائی سے کہا "نظر ہی نہیں آیا آج کہاں رہا۔" وہ ہنسی اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔

چوگان ویران پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو چوگان میں کھیل رہے تھے، مٹی کے پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ پرانی حویلی کی خمیدہ لال ٹین کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔ کپ کی کھڑکی کی چق لٹی لٹی دکھائی دے رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس رہنے والی کشمیرن یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوکی پر زرد رنگ کے گوشت کا ڈھیر لگا رکھا ہو۔

پھر وہ دادی اماں کے پاس جا بیٹھا۔ مگر وہ خاموش چارپائی پر پڑی تھی۔ "تو آگیا۔" سیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ "نہیں نہیں۔" وہ چلائی۔ "جا۔ جا کر کھیل۔ یہاں نہ بیٹھ بیمار کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔" کچھ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ فرحت کے ساتھ شہزاد کے کوٹھے پر سونے کے لئے گیا تو اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے محسوس کیا کہ شہزاد مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔ نفرت بھری مسکراہٹ۔

"تو ابھی یہیں ہے ایلی؟" ـــــ وہ بولی۔ "میں سمجھی چلا گیا ہے واپس امرتسر۔"

"نہیں تو۔" شہزاد کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" ـــــ وہ بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔" ایلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

مہر سکوت

اگلے روز وہ بہت دیر سے بیدار ہوا۔ اس نے کوٹھے پر چاروں طرف دیکھا۔ فرحت جا چکی
تھی۔ شہزاد کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ صرف صبیحہ پڑی سو رہی تھی۔ موقعہ کو غنیمت جان کر
جلدی سے اٹھا تاکہ شہزاد کے آنے سے پہلے ہی فرحت کی طرف چلا جائے۔ جب وہ دروازے
میں داخل ہوا تو کسی نے زور سے اس کی قمیض پکڑ لی۔ "کہاں جاتا ہے تو؟ ـــــ آؤ
چائے پی کے جانا۔" شہزاد کو دیکھ کر اسے پسینہ آ گیا۔

"نہیں نہیں۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ادھر آکر بات کرنا۔" وہ اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا کر
بے نیازی سے میز پر چائے کے برتن رکھنے میں یوں مصروف ہو گئی جیسے ایلی سے کوئی واسطہ
نہ ہو جیسے وہ اسے پکڑ کر لائی نہ ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔

"پی چائے۔" وہ یوں گھور کر بولی جیسے بچے کو دوا پلا رہی ہو۔ "پی سانپ سونگھ گیا
تجھے کیا۔"

"ہاں۔" وہ بولا "سانپ سونگھ گیا ہے۔"

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "پھر تو تو بڑا ڈھیٹ ہے کہ اب تک اچھا بھلا چلتا پھرتا ہے۔"

"لوگ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔" وہ بولا۔

"اتنی پروا کرتا ہے تو لوگوں کی۔"

وہ لاجواب ہو گیا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "ایلی۔" وہ بولی۔ "وہ کیا حماقت تھی۔ مجھے تجھ سے ایسی توقع نہ تھی
ایلی۔" اس نے آہستہ سے کہا "تجھے شرم نہ آئی۔"

ایلی کی ناک پر پسینہ آ گیا اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا
جواب دے۔ "اور پھر تو ایسی بات کرے۔ تو ایلی۔" وہ بولی "کوئی اور کرتا تو مجھے افسوس نہ
ہوتا۔"

ایلی کے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس میں ہمت نہ تھی پھر اس

پاؤں پر گر کر معافی مانگ لے لیکن پاؤں پر گرنا بھی تو مشکل تھا۔ اس نے شہزاد کے پاؤں کی
طرف دیکھا کتنے خوبصورت تھے۔ جیسے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوں۔

شہزاد نے کروٹ سی لی اور اس کا ایک بازو کرسی سے نیچے لٹکنے لگا۔ "مجھے تم سے ایسی توقع
نہ تھی۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔ اس رنگین ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی کی نگاہیں اوپر اٹھ
گئیں۔ اس کے چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی ـــــ وہ اٹھ کر شہزاد کی طرف لپکا اور اس
کے لٹکتے بازو سے یوں لپٹ گیا۔ جیسے کوئی نیولا سانپ سے لڑ رہا ہو۔

اس نے شہزاد کو چپ کرانے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہ جانے کیا محسوس
کر کے وہ شہزاد کے بلوریں پاؤں سے لپٹ کر اپنے ہونٹ ان پر ملنے لگا "شہزاد۔ شہزاد" وہ گنگنایا۔
"مجھے تم سے محبت ہے۔"

لیکن ایلی دیوانہ وار اس کے پاؤں سے لپٹا رہا۔ آہستہ آہستہ شہزاد کی آواز مدھم پڑتی گئی۔

"مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے ـــــ"

ایلی کی آواز بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایلی نے بڑھ کر شہزاد کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی۔ اس
گھڑی کے پٹ از سر نو بند ہو گئے۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ مژگاں نے ان سیاہ شراروں کو
ڈھانپ لیا اور اس کے بازو فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ممکن ہے۔ شاید

ایلی نے جواب میں یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جواب دینا
ممکن نہ تھا۔ معافی مانگ لینے کا امکان تو تھا۔ مگر اس میں اس کی بے عزتی تھی اگر وہ معافی مانگ
لیتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ حرکت اس نے کسی مذموم خیال سے کی تھی۔ سستی عیش و
عشرت کے خیال سے یا رنگین وقت کٹی کے لئے۔ اس کے علاوہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر
معافی مانگ لی تو وہ شہزاد سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ کس منہ سے اس کے رو برو جایا
کرے گا۔ بے شک اسے شہزاد سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جایا کرتا
تھا مگر یہ اضطراب بے نام اور بے مقصد تھا۔ اس نے کبھی شعوری طور پر شہزاد سے محبت کرنے
کی آرزو محسوس نہ کی تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی سوچا تھا کہ شہزاد سے وہ اس قسم کا تعلق پیدا کر
سکتا ہے۔ الٹا وہ تو اسے اس قدر بلند اور عظیم ہستی سمجھتا تھا کہ اس کے قرب کی آرزو دل میں

رچانے کے خیال ہی سے گویا اس کی جان نکلتی تھی۔

اگر اس مٹیالی چاندنی میں وہ تنہائی میں اس کے قریب نہ بیٹھتی یا اس کے ہاتھوں پر رنگ نہ ہوتا یا حنا میں وہ بو نہ ہوتی جو ایلی کو مشتعل کر دیا کرتی تھی یا وہ ہاتھ از راہ اتفاق طرح پھن نہ اٹھاتا اور ایلی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے اپنی حفاظت کرنی ہے تو وہ کبھی شہزاد اپنی گرفت میں نہ لیتا۔

اگر شہزاد بار بار اسے نہ بلاتی تو اس کی گردن جھکی ہی رہتی اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا یا اگر شہزاد تنہائی میں اس سے اس کے رویہ کے متعلق استفسار کر کے اسے لاجواب نہ کر دیتی تو وہ اپنی گزشتہ حماقت کا اعادہ نہ کرتا اس کی زندگی میں شہزاد کا رنگین بھنور پیدا ہی نہ ہوتا اور اس کی داستان حیات سراسر مختلف ہوتی۔

ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات نے مل کر ایلی کی زندگی کے دھارے کا رخ پھیر دیا۔ طرح ایلی کے لئے وہ رنگین ہاتھ تنکا بن گئے اور وہ ان رنگین ناگوں سے دیوانہ وار چمٹ گیا ہاتھوں سے چمٹنے کے لئے صرف ایک جواز ہو سکتا تھا۔ صرف ایک "مجھے تم سے محبت ہے" مجھے تم سے محبت ہے۔" اپنی لغزش پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس جملے کو دہراتا گیا حتیٰ کہ وہ مکان اس کے اس جملے سے گونجنے لگے۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔" نہ جانے ان الفاظ نے یا اس بڑھتی ہوئی شدت نے جس سے وہ ادا کئے جاتے تھے یا ان کی ادائیگی کے تواتر نے شہزاد کی عقل و خرد کو مغلوب کر دیا یا ممکن ہے کہ اس میں قوت دماغ باقی نہ رہی ہو۔ ممکن ہے شہزاد ان الفاظ کی بھوکی ہو اور شریف نے ہمیشہ اسے اس جملے سے محروم رکھا ہو۔ اس لئے نے انجانے میں ایلی کو وہ الفاظ کہنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید شہزاد اپنے خاوند کے رویے سے چکی ہو، جو ہر وقت ٹکٹکی لگائے چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ جو کبوتر کی سی آنکھیں بنا کر لیٹا رہتا تھا جو ہر بات پر آہ بھرتا تھا اور انور کی محبت کے خود ساختہ فریب میں ڈبکیاں لینے میں لذت محسوس کرتا تھا اور شہزاد اس کے قریب اس بات کی تمنا میں گھلتی رہتی تھی کہ وہ ایک نظر اس کی طرف دیکھے۔ ایک بار ماضی کے دھندلکے سے نکل کر حال کی طرف متوجہ ہو۔ ممکن ہے کہ شہزاد شریف کی سچی محبت کے اکتا دینے والے تسلسل سے بیزار ہو گئی ہو اور اس کے دل میں ان جانے میں بیدار ہو چکی ہو کہ وہ بھی کسی کی انور بن جائے۔ بہر صورت اس کی کوئی

ہو نتیجہ یہ ہوا کہ شہزاد کو فریب دینے کے بعد ایلی نے ان جانے میں اپنے آپ کو فریب دینا شروع کر دیا اس نے حقائق کو اپنے خود ساختہ جذبات کے ایندھن میں جلا جلا کر سرخ کر لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے۔

گودی کا گیند

اس روز وہ سارا دن شہزاد کے قدموں میں بیٹھا روتا رہا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ اظہار محبت نہ کروں۔ تمہیں ناراض نہ کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تم ناراض ہو جاؤ تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ شہزاد تم ناراض تو نہیں۔ شہزاد۔ بولو تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہارے قابل نہیں شہزاد میں تمہارے قریب آ جاؤں تو تم میلی ہو جاتی ہو۔ تم چاند ہو شہزاد اور میں بے وقوف بچہ۔ میں تمہارے قابل کہاں۔ مجھے برداشت کرو گی شہزاد۔ بولو شہزاد۔"

شہزاد حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ابتدا میں تو اس کی حیرانی میں بیگانگی کا عنصر غالب تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بے تکی باتیں وہ احمقانہ شدت۔ وہ بے مصرف پگلا پن جو ایلی کی باتوں اور چہرے سے ہویدا تھا" اس کے دل پر نہ جانے کیا اثر پیدا کر گیا۔ ایلی کی بے تکی باتیں اس کے کانوں سے داخل ہو کر چہرے پر رینگنے لگیں گالوں پر سرخی بن کر جھلکنے لگیں آنکھوں سے پرنم مستی بن کر جھانکنے لگیں۔

"تم میری حماقت کسی کو بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ میری دیوانگی اپنے تک محدود رکھو گی نا۔ وعدہ کرو شہزاد' اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو میرا کیا ہو گا۔ پھر میں اس گھر میں کیسے آسکوں گا اور تم سے دور رہ کر زندگی کیسے کٹے گی۔ شہزاد غصہ نہ کرنا۔ میں مجبور ہوں شہزاد۔"

شہزاد کے چہرے پر حیا کی سرخی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھکنے لگیں۔ اس کی ناک پر پسینہ آنے لگا اور پھر اس کے بازو بے جان ہو کر لٹکنے لگے جیسے سپردگی کے شدید جذبے سے شل ہو چکے ہوں۔

مگر ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کے منہ پر حیا کیوں جھلک رہی ہے۔ اس کی ناک پر پسینہ کیوں موتیوں کی طرح ابھرتا آ رہا ہے اور اس کے بازو لٹک کیوں رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زینے کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم جمانے کی جدوجہد میں دیوانہ وار مصروف تھا۔

"تم بتاؤ گی تو نہیں شہزاد ——— تم مجھے معاف کر سکو گی۔ میں تمہیں دور سے دیکھا کروں گا۔ دور سے بس۔ اتنا تو تم برداشت کر لو گی۔ نا۔"

ایلی عورت سے واقف نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی بے تکی باتوں نے شہزاد کو کر دیا ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ تمام کا تمام زینہ گر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہے پہلی سیڑھی پر قدم جمانے کی کوشش میں کھوئے رہنا بیکار ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ ہوئے رنگین ناگ اس کی الڑ گرفت کے لئے منتظر تھے۔ بے تاب تھے اور وہ ڈولتی ہوئی شربتی آنکھیں اس انتظار میں کھلی ہوئی تھیں کہ کوئی لمس انہیں بند کر کے راحت بھرا بخش دے اور وہ رنگین گٹھڑی جو ہر لحہ بند ہوئی جا رہی تھی اس بات کی خواہشمند تھی کہ اسے اٹھا کر گودی کا گیند بنا لے۔

اسے ان باتوں کا احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارہ عورت اور محبت کی دنیا کی راہ بھی واقف نہ تھا۔ اس کا مقصد تو صرف اس قدر تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا لے حماقت کو نشر نہ ہونے دے اپنے خود ساختہ راز کو محفوظ کرے۔

عین اس وقت اگر ہاجرہ نہ آجاتی تو نہ جانے وہ دونوں کب تک یوں ہی بیٹھے رہتے۔ کے پاؤں کی چاپ سن کر اس منتظر مونگیا گٹھڑی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھی۔

"اچھا تو چائے۔ بناؤں تیرے لئے۔" وہ بولی۔

"چائے۔" وہ گبھرا گیا۔ چائے کی تو بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"نہیں نہیں۔" شہزاد بولی۔ "اب تو چائے پی کر ہی جانا۔"

ہاجرہ کے آنے پر شہزاد کا انداز ہی بدل گیا وہ یوں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی کوئی بچی انتہائے معصومیت میں اظہار مسرت کرتی ہے۔ ایلی چپکے سے اٹھ بیٹھا اور چوری سے باہر نکل گیا تاکہ کوئی اسے روک نہ لے۔ جوں جوں وہ شہزاد کے چوبارے ہوتا گیا توں توں اس کے دل میں از سر نو یہ ڈر پیدا ہوتا گیا کہ شہزاد اماں کو وہ بات شکایت نہ کر دے۔ اگر اس نے شریف سے کہہ دیا تو نہ جانے اس نے اسے معاف کیا کہ نہیں۔

فرار

باہر جا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس امرتسر چلا جائے گا تاکہ پھر شہزاد کے سامنے

خدشہ نہ رہے۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں اکٹھی کیں اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکلا۔ صحن میں فرحت ہنڈیا پکا رہی تھی۔ "میں جا رہا ہوں فرحت۔" وہ بولا۔

"جا رہا ہے تو کیا واقعی جا رہا ہے۔" وہ بولی۔ "کہاں جا رہا ہے تو؟ ——— ہائیں۔ اتنی جلدی۔" وہ حیران رہ گئی۔ "تمہیں تو ابھی چار دن اور رہنا تھا۔"

"نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔" ایلی بولا۔

"آخر بات کیا ہے؟" فرحت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے کیا؟"

"اونہوں۔"

"نہ جانے تو ہم سے کیوں ناراض رہتا ہے۔ ایلی۔ ہمارا کیا قصور ہے؟"

"نہیں تو۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"تو کیا شہزاد نے کہا ہے کچھ؟"

"میں کہتا ہوں۔" وہ چڑ کر بولا۔ "کچھ بھی نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔"

"تو میں شہزاد کو بلاؤں۔ وہی تمہیں روک سکتی ہے۔" فرحت نے مخلصانہ طور پر کہا۔

"نہیں نہیں۔" شہزاد کا نام سن کر وہ ڈر گیا۔ "مجھے امرتسر سے خط آیا ہے۔"

"خط آیا؟"

"ہاں میرا دوست بیمار ہے۔"

"اوہ۔" اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تو پہلے کہا ہوتا مجھ سے۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔"

"لیکن اماں سے تو مل کر جا اور تیری دادی اماں۔ وہ بھی تو بیمار ہے اس کی حالت۔"

یہ کہہ کر وہ چپکے سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ راستے میں اس کا کوئی دوست نہ مل جائے۔ اگر رضا مل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ اسے تنگ کرے گا۔ لیکن خوش قسمتی سے چوگان میں بچوں کے سوا کوئی نہ تھا اور رضا سے بچنے کے لئے وہ ایک اور راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

ـــــــریل میں بیٹھے ہوئے وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس
دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ گویا نئے انداز سے لہرا رہا تھا۔ بوٹے عجیب شان سے
کھڑے تھے۔ پھول بہت ہی شوخ تھے۔ جیسے رنگین دیئے ٹمٹا رہے ہوں۔ کھیتوں میں کام کر
ہوئے کسان انوکھی رومان بھری فضا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑی یوں چلی جا رہی تھی جیسے
چھاتی پھلا کر پرواز کر رہا ہو۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مناظر کے حسن پر رو دے۔

امرتسر پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آ پہنچا ہو' جسے اس نے پہلے نہ
دیکھا ہو۔ سٹیشن کے گنبد الف لیلےٰ کے کسی پر اسرار منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ سڑکیں خوشی سے
ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں لوگ آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب پر اکٹھے ہو رہے ہوں۔

لیکن بورڈنگ میں وہی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ رامو بیٹھا برتن صاف کر رہا تھا۔ بندو …
کی بوریوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ ہرنام سنگھ' گورچرن سنگھ اور جیون ایک درخت کے نیچے بیٹھے
اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ کمرے میں اللہ داد کرسی پر اپنی قمیض پھیلائے خود فرش پر بیٹھا
آم کی خشک گٹھلی رگڑ رہا تھا۔

"ارے۔" اللہ داد اسے دیکھ کر چلایا۔ "تو آ گیا۔ بیٹا چار روز پہلے ہی ماں کی گود چھوڑ آیا۔
اونہوں یہاں تیرا جی نہیں لگے گا۔"

"بک نہیں۔" ایلی نے بناوٹی غصے سے کہا۔

"اچھا بھئی۔" اللہ داد چلایا۔ "ایک تم ہو کہ ماں کی گود نہیں چھوڑتے ایک وہ شفیع ہے
سارا سارا دن یوں سانپ مارنے میں لگا رہتا ہے۔ جیسے کالج میں سانپ مارنا سیکھنے کے لئے داخل
ہو۔ بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ محنت کرنے کے لئے۔" یہ کہہ کر اس نے مظلومانہ انداز
پر آم کی گٹھلی رگڑنی شروع کر دی جیسے امتحان پاس کرنے کے لئے سر پر آم کی گٹھلی رگڑنا …
ہو۔

ایلی دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اسے اللہ داد کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ جانے کیا
تھا اسے' دفعتاً اسے اس بورڈنگ' کالج اور شہر سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ کمرہ بیگانہ …
ہو رہا تھا اور اللہ داد یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہو۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ گٹھلی رگڑتے رگڑتے اللہ داد نے ایک نظر ایلی
طرف ڈالی اور پھر چپکے سے بولا۔ "ارے بھائی پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ایلی بابو ماں کی گود …

… آپ رہتا ہے۔ اس لئے بار بار گھر کو بھاگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا
پھر آپ ہی آپ بولا "لیکن آخر وہ بھی تو گود ہے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔" اللہ
داد نے لمبی آہ بھری۔ "وہ بھاگاں بھری تھی اپنی۔ اللہ جانتا ہے اس کی گود میں پڑ کر مجھے بے بے
بھول جاتی تھی۔" ایلی یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اس کم بخت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ـــــــ اسے
غصہ آنے لگا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اور اللہ داد کی معصوم مسکراہٹ کے جواب میں غصہ کرنا
بالکل ہی بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا نہر کے کنارے پر جا پہنچا
دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ اچانک نور سے ملاقات ہو جائے اور پھر شبھ لگن آ جائے۔ اس کے
دل کے نچلے پردوں میں ایک شبھ لگن جھلک رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ دل کی گہرائیوں سے نکل
کر وہ اس پر مسلط و محیط ہو جائے اور پھر وہ پودوں کی اوٹ میں بیٹھ کر چپکے چپکے رو دے۔ آنسو
اس کے گالوں پر ڈھلکیں اور نور پوچھے۔ "کیا ہے جی۔" جیسے اس کی عادت تھی اور وہ جواب
دے۔ "کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

"ہائیں۔" نہر کے کنارے آصف کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں وہی
پھوار پڑ رہی تھی لیکن یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ خوشی سے سرخ ہو رہی ہیں یا غم کی وجہ سے۔

"آ گئے تم ـــــــ" اس نے دبی دبی اداس مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں۔" ایلی نے آہ بھری۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نور کا انتظار کر رہے ہو کیا؟"

"اونہوں۔" آصف نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر" ایلی نے پوچھا۔ "سیر کرنے آئے تھے۔"

"سیر ـــــــ" آصف نے زہر خند سے کہا۔ "میں کہاں جاؤں ایلی۔"

"کیوں۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

کوئی جگہ بھی تو نہیں رہی۔"

"کیوں۔" ایلی چلایا۔

دیس نکالا

"وہ ـــــــ وہ واپس آ گئی ہے۔" آصف نے آہ بھر کر کہا۔

"واپس آ گئی ہے۔"

"ہاں۔" ——— وہ بولا۔ "جیسے انتقام لینے آئی ہو۔"

"انتقام۔" ایلی نے دہرایا۔

"اب وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور ایلی اب تو وہ اعلانیہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے گھر والے بیچارے ہار گئے ہیں۔ محلے میں کہرام مچا ہوا ہے اور میں گھر سے بھاگا پھرتا ہوں۔ اب ہو ایلی۔ کیا کروں میں۔"

——— ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں مشکل کونسی تھی۔ یہ تو بلکہ اس کی خوش نصیبی تھی۔ عجیب آدمی تھا آصف بھی۔

"دیوانوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے۔"

"دیکھتی ہے تو دیکھنے دو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اتنی رسوائی اتنی بدنامی ہو رہی ہے کہ"۔ آصف نے جھرجھری لی۔ "میرا تماشا بنا رکھا ہے اس کے گھر والے کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ لڑکی ہوش و حواس کھو چکی ہے اور اگر اس پر ———"
وہ خاموش ہو گیا اور پھر حسرت و یاس بھری نگاہ سے اُس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

"میری طرف محلے والے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مجرم ہو۔ جیسے اس کی دیوانگی میرا سے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کر آزاد ہو گئی ایلی مجھ سے تو وہی اچھی ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرا گھر میں آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو دیس نکالا مل گیا ہے۔"

"اچھا۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر تم کہو تو میں تمہارے بورڈنگ میں آ رہوں۔" آصف نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔"

"تو میں کل آ جاؤں۔" آصف کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ایلی کا سہارا پا کر خوش ہو گیا ہو۔

"آ جاؤ۔" ایلی خوشی سے چلایا۔ "کتنا اچھا رہے گا۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہیں گے۔"
آصف نے اس کا ہاتھ دبایا اور نہ جانے کب تک وہ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ پکڑے نہر کے کنارے بیٹھے رہے۔ آصف اپنے خیالات میں مگن تھا مگر ایلی کے روبرو کچھ اور ہی تھا ایک گورا بازو اس کی طرف بڑھتا اور حنا مالیدہ ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ "ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟" ——— دو گلابی آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں، گلال بھری پچکاری چلتی اور دل

شرابور کر جاتی۔ وہ ایک نگاہ کس قدر مدہوش کن تھی۔ ایک نگاہ ——— اس نگاہ کو حاصل کرنے کے لیے ایلی دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ آصف سے وہ راز کہہ دے کسی سے کہہ دے اور اپنے آپ کو محفوظ کر لے مگر وہ شہزاد کا راز تھا وہ اسے کس طرح افشا کر سکتا تھا اور پھر آصف سے وہ راز کہتا جو اس غم میں گھل رہا تھا کہ ایک حسینہ اس کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ بھلا شہزاد کی مست کن نگاہ کو آصف کیسے سمجھ سکے گا۔ ایلی بات کہتے کہتے رک جاتا اور پھر آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی کو دیکھنے میں کھو جاتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شہزاد کے گالوں سے اتر کر وہ سرخی آسمان پر پھیل گئی ہو اور اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا دھبہ کہہ رہا ہو۔ "تم لوگوں کی پروا کرتے ہو۔ تم ایلی۔" اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں پرنسپل کے گھر چلے گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ آصف کو ایک ماہ کے لئے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت دے دے۔

پرنسپل نے ان کی بات سن کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"آصف کیا بات ہے۔" وہ مسکرایا۔

"بات تو کوئی نہیں پرنسپل صاحب ———" آصف کے چہرے پر گھبراہٹ کا طوفان آ گیا جو اس کی بات کو اعلانیہ جھٹلا رہا تھا۔ پرنسپل مسکرانے لگا۔ "بھئی ایک بات کرو۔ زبان سے کہہ رہے ہو کہ کچھ نہیں اور نگاہیں کہہ رہی ہیں بہت کچھ ہے۔" ایلی نے گھبرا کر سچی بات کہہ دینے کی غرض سے منہ کھولا۔ "جی بات یہ ہے۔" وہ بولا۔ آصف نے بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی اس نگاہ میں ایک طوفان تھا۔ غصہ تھا۔ بے بسی تھی۔ منت تھی۔ دھمکی تھی۔ ایلی سہم کر خاموش ہو گیا۔
پرنسپل نے ان دونوں کی طرف تعجب سے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"نہیں نہیں۔" وہ ہنس کر بولا "پڑھائی کا بہانہ نہ کرنا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے تو بہتر ہے کہ صاف کہہ دیا جاتا کہ اس کی وجہ بتانے سے ہم قاصر ہیں۔ بہرصورت مجھے یقین ہے کہ تم شرارت کے درپے نہیں ہو اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو گی جو کالج کے لئے باعث بدنامی ہو۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہ ہو گی۔" آصف بولا۔

"اچھا تو اجازت ہے۔" پرنسپل نے کہا۔ "اب تم جاؤ اور آرام کرو مجھے صورت حال اچھی نہیں دکھتی اگر تم مجھے دوست سمجھ کر بتا دیتے تو شاید میں مدد کر سکتا۔ لیکن خیر ———"

جب وہ بورڈنگ میں پہنچا تو لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ "ایلی' ایلی۔ ارے ... آیا ہے۔"

دادی اماں

تار ــــــ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ تار آیا ہے۔ اسے زندگی بھر کبھی تار نہ آیا تھا۔ ... راز کھل گیا۔ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ شہزاد نے وہ بات بتا دی۔ اس روز کہتی جو تھی۔ ایلی ... سے ایسی توقع نہ تھی۔ تم نے یہ کیا کیا ایلی۔ ہائے تم نے یہ کیا کیا ــــــ ایلی کے پاؤں ... زمین نکل گئی۔ اب کیا ہو گا اور وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

"ارے جا کر پتہ بھی لگائے گا کہ نہیں۔" شفیع چلانے لگا۔

اللہ داد بولا "بھئی تار والا ادھر ہی تو گیا ہے تمہیں دیکھنے کے لئے۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔ جہاں تار والا اسے تلاش نہ کر سکے تاکہ ... خفت سے بچ جائے مگر اسے تار والے کی تلاش کرنا ہی پڑی۔ اللہ داد کیا کہے گا۔ لوگ ... سمجھیں گے اس کے باوجود وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ تار والا جا چکا ہو۔

تار والے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ اسے ... بت بنے دیکھ کر اللہ داد نے تار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تار کھولتے ہوئے بولا۔ "ملا ... لاڈلے کی فرقت میں اداس ہو گئی ہو گی۔" دفعتاً" اللہ داد خاموش ہو گیا۔ اس کی ... اضطراب سے تار کو پھر تہہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ "ابے" شفیع نے اس سے پوچھنے ... لئے کچھ کہنا چاہا مگر اللہ داد کا چہرہ دیکھ کر اس میں ہمت نہ پڑی دیر تک برآمدے میں خاموشی ... رہی۔ پھر آصف آہستہ سے بولا۔ "ایلی تمہاری دادی اماں ــــــ"

"دادی اماں۔" ایلی نے حیرانی سے دہرایا۔

"ہاں۔ تمہاری دادی اماں چلی گئیں۔" آصف نے کہا۔

"چلی گئیں؟ ــــــ" ایلی نے گھبرا کر تار کی طرف دیکھا اس کے منہ سے ایک ہچکی ... اور پھر دور سے آواز آئی۔ "نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

جب وہ محلے کے چوگان میں پہنچا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ چوگان کے عین درمیان ... پڑا تھا۔ چاروں طرف محلے والے کھڑے تھے۔ محلے والیاں سینکے چلاتے ہوئے ...

رہی تھیں۔ محلے والے جنازے کے متعلق یوں تفصیلات طے کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عام سی تقریب ہو۔ جس میں غم یا دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔

ایلی کو دیکھ کر کوئی چلائی "اے ہے لڑکے کو تو آ لینے دو اپنی دادی کے قریب۔"

"ہائیں آ گیا تو ایلی۔ شکر ہے آ گیا تو۔"

"ہائے بہن اس کے بغیر تو دم نکلتا تھا اس کی دادی اماں کا" ــــــ"

"اس کے سوا اور تھا ہی کون اس کا۔ علی احمد نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں۔"

"آخری دم تک یاد کرتی رہی تجھے۔ لے دیکھ لے اس کا منہ۔"

ایلی دادی اماں کی طرف دیکھنے سے ڈر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مری ہوئی دادی کی طرف دیکھے۔ نہیں نہیں وہ جیتی ہے مری نہیں۔ اس کے تخیل میں وہ ابھی تک جیتی تھی۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ایلی نے نگاہ پھیر لی اور دادی اماں کی طرف دیکھے بغیر ہی وہاں کھڑا رہا۔

جنازہ

چاروں طرف لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا ہر کوئی دوسرے سے بات کر رہا تھا ــــــ ان کی باتوں پر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ کیا انہیں دادی اماں کی موت کا غم نہیں۔ کیا انہیں اس کی موت پر دکھ نہیں ہوا یوں شوخی سے ایک دوسرے سے باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ناگاہ ایلی کی نگاہ علی احمد پر پڑی۔ وہ چپ چاپ بت بنے کھڑے تھے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ دکھ محسوس کر رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ایلی کو خیال آیا کہ ان کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ انہیں بھی کسی کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی عزیزوں کے دکھ سکھ کا احساس ہے۔ یہ احساس ایلی کے لئے بالکل نیا تھا اور اتنا عجیب تھا کہ اس نے جلد ہی اس سے مخلصی پانے کی کوشش کی۔ پھر چار بزرگوں نے بڑھ کر جنازے کو اٹھا لیا اور وہ سب ان کے پیچھے پیچھے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

علی پور کے بازار میں جنازے کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے تھے۔ دوکاندار سودا سلف تولنا چھوڑ کر ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے گاہک بازار سے ہٹ کر کسی بند دوکان کے تختے پر چڑھ جاتے۔ کھیلتے ہوئے بچے سہم کر رک جاتے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرانی سے اس جلوس کی طرف دیکھتے۔

بازار سے نکل کر وہ کھیتوں میں جا پہنچے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان انہیں دیکھ کر کام
چھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑے۔

"کیوں بھائی کس کا جنازہ ہے۔"

"مائی کس کی والدہ تھی۔"

"اچھا وہ جو دفتر کے بابو ہیں۔"

"آیا کرتے ہیں کبھی اس طرف۔"

"کیا تکلیف تھی۔"

"جی ہاں۔" وہ تو بہانے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔
جنازے کے آگے محلے کے بوڑھے آخ تھو آخ تھو کرتے کھانستے چلے جا رہے تھے۔ کبھی
کبھار کوئی کھانسنے کے علاوہ مدھم آواز میں چلاتے "یارب العزت یا اللہ" —— "قادر مطلق
——" ان کے پیچھے پیچھے محلے کے جوان تھے اور سب سے آخر میں محلے کے نوجوان جو چلتے
ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے' چٹکیاں بھرتے تھے' پھر یوں سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے
جیسے وہ ایسی حرکت کے اہل ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھار نوجوانوں کی قطاروں سے دبے دبے قہقہے بلند
ہوتے جس پر محلے کے بوڑھے آخ کہہ کر رک جاتے اور تھو کرنے کی بجائے غضب ناک
نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھتے۔

لیکن اس روز ایلی سب سے پہلی قطار میں چل رہا تھا اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھے معنی
خیز انداز میں آخ تھو آخ تھو کر رہے ہیں یا جوان دزدیدہ نظروں سے کھیتوں میں بنے ہوئے
گھروندوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ فام مگر نوجوان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں یا نوجوان کہنیاں
مار مار کر ایک دوسرے کو کسی قابل توجہ منظر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اس روز ایلی کا
ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر ایک پریشان کن تعطل مسلط اور محیط تھا۔
گھبراہٹ تھی نہ پریشانی نہ خوشی تھی نہ غم۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔
دادی اماں کی موت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔
چلے جا رہا تھا خاموش بے حس!

وہ مر گئی

جنازے کی نماز کے بعد قبرستان میں دیر تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا جہاں کھڑے ہو کر اس

نماز پڑھی تھی اور جہاں پاس ہی چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر دادی اماں پڑی تھیں۔ وہاں بیٹھے
ہوئے اس نے اللہ سے بڑی عجز بھری دعائیں مانگی تھیں۔ "یا اللہ یہ کیا ہو گیا یا اللہ دادی اماں اب
مجھے کبھی نہ ملیں گی۔ یا اللہ۔" اس نے بن سوچے سمجھے یہ سب دعائیں مانگی تھیں۔ اسے یہ
خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ دعائیں مانگ رہا ہے یا وہ دعائیں نہ تھیں بلکہ سوالات تھے۔ عجیب
سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ دعائیں مانگ کر وہ وہیں بیٹھ کر زمین کریدتا
رہا تھا حتیٰ کہ اسے اس مقام سے وحشت ہونے لگی۔ دور لوگ قبر کھودنے میں مصروف تھے۔
قبرستان میں یہاں وہاں محلے والے ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے دبی دبی آوازوں میں باتیں کر رہے
تھے۔ جوان دور پختہ تالاب کی طرف نکل گئے تھے اور نوجوان نہ جانے کہاں تھے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور پھرتا پھراتا ان کچی قبروں میں جا پہنچا جہاں محلے کے عام آدمی دفنائے جاتے
تھے۔ وہ گھبرا کر رک گیا۔ سامنے صفدر ایک پیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ اپنی ہی
دھن میں بیٹھا کیا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ بازو لٹک رہے تھے
اور ہونٹوں پر کوئی بول نہ تھا ——

"تم ایلی" —— وہ اسے دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "آؤ آؤ۔ تالاب کی طرف چلیں۔
آؤ۔ ابھی قبر میں اتارنے میں دیر ہے۔ آؤ۔" اس کی آواز روئی تھی۔

وہ دونوں چپ چاپ تالاب کی طرف چل پڑے۔ "تم آگئے ——" وہ بولا تم تو چلے گئے
تھے نا اچھا کیا آگئے۔" وہ بولا۔ "بہت اچھا کیا۔ میں بھی جا رہا تھا مگر نہ گیا۔ محض اتفاق ہے ورنہ
چلا جاتا۔" اس کا گلا خشک ہو گیا۔

دیر تک صفدر خاموش رہا۔ پھر زیر لب بولا۔ "مر گئی ——" اور چپ ہو گیا جیسے گلا آواز
سے خالی ہو۔ پھر دفعتاً اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر دور پھینک دیا۔
ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو حافظ خدا تمہارا جیسے دادی اماں پارسی لڑکی ہو اور اس کے
چلے جانے پر صفدر کا گلا آواز سے خالی رہ گیا ہو۔

"تم کہتے تھے وہ مرتی بھی نہیں۔" ایلی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"ہاں۔" صفدر بولا۔ "کہتا تھا۔ مگر وہ مر گئی۔ مر گئی۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صفدر کا وہ ایک لفظ داستان کو چھپائے ہوئے ہو۔

"ہاں مر گئی۔"

صفدر کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ ایلی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آ گئے مگر صفدر اپنی دھن میں گنگنائے چلا جا رہا تھا اور ہر دس قدم کے بعد چپکے سے کہتا "مر گئی۔"

بھیانک اداسی

دادی اماں کو دفنانے سے فارغ ہو کر وہ محلے میں واپس پہنچے چوگان میں چاروں طرف کھڑکیوں اور منڈیروں پر عورتیں کھڑی تھیں اسے علم نہ تھا کہ شہزاد بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ دوپٹے میں ستارے چمک رہے ہیں بازو دوپٹے سے الجھے ہوئے ہیں۔ لمبی ترچھی آنکھ پر مژگاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اسے شہزاد کے وجود کا ہی احساس نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ یاد ہی نہ تھا کہ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

"ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو! ——— تم ایلی؟"

چوگان سے وہ ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں اب کیا دھرا تھا۔ کچھ بھی تو تخت ویران پڑا ہو گا۔ چولہے کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے کوئی بیٹھا نہ ہو گا۔ کوئی اس سے کہے گا۔

"تو آ گیا۔ میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ ہنڈیا میں۔"

کوئی نہیں چیخے گا "ہے تو نے تو میری ہڈیاں توڑ دیں۔"

کسی کا جھریوں بھرا ہاتھ اسے تھپکے گا نہیں۔ "کچھ بھی تو نہیں ایلی۔" وہ رک گیا سیڑھیاں اترنے لگا۔

"دادی اماں۔ دادی اماں۔" وہ قبر پر بیٹھا رو رہا تھا۔ "دادی اماں یہ کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا یہ۔" ایک بوڑھا چہرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا وہ جھلی وار بازو اس کی طرف بڑھے نہیں ایلی۔ کچھ بھی تو نہیں۔" چاروں طرف بھیانک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کوئی کراہ رہا تھا۔ دور چکی ہونک رہی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

قبرستان سے اٹھ کر ابھی اس نے چند ایک قدم اٹھائے تھے کہ رضا آ گیا۔ "تم ایلی" رضا کی طرف تعجب سے دیکھا۔

"چل۔" رضا بولا "تیرے ابا بلا رہے ہیں۔" وہ خاموشی سے ایلی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایلی کا جی نہیں چاہتا کہ گھر جائے لیکن وہ چپ چاپ رضا کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "بیٹھ جاؤ ایلی۔ تم کہاں آوارہ گھوم رہے ہو۔ فضول ——— ایلی کی ماں۔" انہوں نے ہاجرہ کو بلایا "اس کا بستر بچھا دو یہاں۔ آج یہ یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس ———"

ایلی تم۔ تم ایلی

اگلے روز صبح سویرے ایلی چپکے سے علی پور سے امرتسر چلا آیا۔ نہ جانے اس کے لئے علی پور میں رہنا کیوں ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ علی پور سے چلا جائے اس مکان سے دور بھاگ جائے اس کے لئے اس تخت کی طرف دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا جہاں دادی اماں بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

وہ رات علی پور میں اس نے یوں کاٹی جیسی کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ دادی اماں فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ دادی اماں فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تخت پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو اور ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر اس کے سرہانے آ بیٹھے گی اور اپنے جھلی دار ہاتھوں سے اسے تھپکنے لگے گی۔ "سو جا ایلی سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

اس خیال پر ایلی کو خوف سا محسوس ہوتا کہ دادی مر چکی ہے اور اب وہ کبھی آ کر اس تخت پر نماز نہیں پڑھے گی۔ اسی بے نام ڈر کی وجہ سے اب کی بار علی پور میں رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ علی الصبح وہ اٹھ بیٹھا۔ سیدہ کھڑکی کے پاس بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھی۔

"خالہ۔" اس نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں جا رہا ہے تو۔" سیدہ نے سرسری طور پر پوچھا "جا رہا ہوں۔" اس نے سر کی جنبش سے ظاہر کرنے کوشش کی۔ "میں پوچھ رہی ہوں کہاں جائے گا تو اس وقت" سیدہ چڑ گئی۔

"امرتسر" وہ یوں بولا جیسے امرتسر اس مکان کے کسی کمرے کا نام ہو۔

"امرتسر؟" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا "مجھے جانا ہی چاہئے۔"

"اپا سے تو پوچھ لے۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"نہیں۔" وہ بولا "پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں۔"

"نہیں نہیں یہ مناسب نہیں۔" وہ بولی۔ "بڑوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔"

ایلی نے گویا سیدہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

سیدہ نے شور مچایا۔ "ایلی امرتسر جا رہا ہے میں کہتی ہوں سنا آپ نے ایلی جا رہا ہے۔" اور وہ اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

علی احمد کی آواز سن کر وہ رک گیا اور اسے ان کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔

"مجھے امتحان کے لئے تیاری کرنی ہے۔" اس نے کہا "مجھے جانا ہی چاہئے۔"

یہ بات سن کر علی احمد خاموش ہو گئے۔

"یہ تو بلکہ اچھا ہی ہے" سیدہ بولی: "پڑھائی میں لگ جائے گا"۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ خلا جو اس مسلط اور محیط تھا اب ختم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اب غم بوند بوند اس کے بند بند میں سرائت کر تھا۔

ایلی کی نفسیات کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ کسی تکلیف دہ واقعہ پر اس کے دل کو دھچکا نہیں لگتا تھا بلکہ ایسے واقعہ کی خبر سن کر اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو اس کے تخیل اور احساسات کو شل کر دیتا۔ دیر تک اس پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جیسے وہ عالم خواب میں گھوم پھر رہا ہو۔ پھر بوند بوند غم اس کے دل میں سرائت کرتا۔ اداسی چاروں طرف سے کرتی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے ساری دنیا ایک بے معنی پھیلاؤ ہو طرف سے اداسی امڈی آ رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں دادی اماں اس کی طرف مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ایلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "اے ہے کیا ہے تمہیں۔ کچھ بھی ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔" لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ کچھ ہو۔

ایلی نے آہ بھری۔ "اب مجھے کون تھپک کر سلائے گا۔"

دفعتاً اس کی نگاہ تلے گھاس کی سبز گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ شہزاد کا متبسم چہرہ نمودار پھولدار دوپٹے سے گورا چٹا بازو برآمد ہوا۔ "میں جو ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "میں جو ہوں۔"

بھول گئے گیا۔"

شہزاد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ "ہائیں" گھبرا کر اس نے شہزاد کی طرف دیکھا شہزاد تو بالکل اس کے ذہن سے مفقود ہو چکی تھی۔ اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہ تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے علی پور میں رہنے کے باوجود اس کے ذہن میں شہزاد کا خیال نہ آیا تھا اس نے محسوس کیا گویا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہو۔ علی پور ایک دن رہنے کے باوجود اسے شہزاد کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ جیسے شہزاد اس کے لئے ایک دم معدوم ہو گئی ہو۔ شہزاد کے گھر کی دیواروں کی طرف دیکھنے کے باوجود اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود اس کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ اپنی اس دیوانگی پر وہ بوکھلا گیا۔ نہ جانے وہ دل میں کیا کہتی ہو گی ہو سمجھتی ہو گی کہ اس روز اس کے بازو پکڑ کر جو کچھ ایلی نے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا محض وقتی دل بہلاوا تھا۔ اس پر اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ شہزاد دل میں کیا کہتی ہو گی۔ اف ایلی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

پھر اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ شاید شہزاد کو اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔ شاید اس نے ایلی کو قابل توجہ ہی نہ سمجھا ہو۔ شاید اس کی وہ مسکراہٹ وہ جملہ۔ "تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟ ایلی تم؟" محض ایک مذاق ہو ایک ادا ہو۔ پھر اسے اس تمام واقعہ کی حقیقت پر شک پڑنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ میرے دماغ کی اختراع ہو۔ ورنہ شہزاد میری پروا کرے؟ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شہزاد سی رنگین حسینہ مجھے دنیا کے روبرو کھڑے ہونے کی شہہ دے۔ نہیں نہیں یہ سب خوش فہمی ہے۔ محض خوش فہمی!

یہ سوچ کر ایلی گھبرا گیا۔ اس کی گرد و پیش سرسبز کھیت ویران ہونے لگے سرسوں کے پھول خزاں زدہ پتے دکھائی دینے لگے ——— پھر دور ایک ٹیلے پر کھڑی ہو کر کوئی مسکرانے لگی۔ اس کے بازو ایلی کی طرف بڑھنے لگے۔ حنا مالیدہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھلیں۔ "ایلی تم؟" وہ مسکرا کر بولی۔ "تم ایلی؟" وہ آواز گاڑی کے پہیوں میں گونجنے لگی۔ ایلی تم، تم، تم ایلی۔" گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی ——— ساری کائنات پھولدار آنچل میں لپٹی جا رہی تھی۔

اکتاہٹ

بورڈنگ کی سڑک پر نہر کے قریب اسے مہر اور نور ملے وہ دونوں بورڈنگ سے واپس آ

رہے تھے۔

وہ دونوں ایلی کے قریب سے گزر گئے۔ چار ایک قدم چلنے کے بعد وہ رک گئے مڑ کر آ... گیا اور نور ایلی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی خم تھا۔ آنکھوں میں وہی نگاہ تھی۔ اسے دیکھ کر ایلی ندامت سے زمین میں گڑ گیا مگر کیا کہے گا۔ وہ ایلی کے متعلق کس قدر غلط اندازہ لگائے گا۔

"آ گئے۔" نور نے ترچھی نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

"کب آئے۔" نور کی نگاہوں نے ایلی کے چہرے پر پنجے گاڑ دیے۔

"ابھی۔"

"وہ مجھے ادھر آنے نہیں دیتے۔" اس نے شکایت کی۔

"کون؟"

"وہی۔" وہ مسکرایا "محلے والے۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں۔" نور نے ہونٹ بٹوہ سے بنائے۔

"اچھا۔" ایلی چل پڑا۔

"وہ شک کرتے ہیں۔" اس نے ایلی کا راستہ روک لیا۔

"ہوں۔" ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

"پھر؟" نور نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ان کے شکوک کو پورا کیوں نہیں کرتے۔

"پھر کچھ نہیں۔" ایلی نے جواب دیا اور بورڈنگ کی طرف چل پڑا جیسے وہ نور کی بات ہی نہ ہو' نہ چاروں طرف اکتاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آموں کی کوٹھی کے میدان میں بہت سے لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رسوئی کے پھلکوں کی بارش ہو رہی تھی۔

"آ گئے بابو جی۔" راموا سے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے غلیظ دانت چمکے۔

کمرے میں آصف ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ "تم آ گئے۔" وہ ایلی کو دیکھ کر بولا اللہ ہو

نے سر اٹھایا اور تہمد جھاڑ کر کہنے لگا: "یہ تو جاتا آتا ہی رہتا ہے۔"

شفیع نے اللہ داد کو ڈانٹا "بک نہیں۔ دادی اماں کی موت کو تو کیا جانے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" اللہ داد نے زیر لب کہا "نہ اپنی کوئی دادی اور نہ اماں۔ وہ جو کٹڑے میں رہتی ہے نا خورشید بائی اس کے پاس گیا تھا۔ بہتیری منتیں کیں کہ مجھے بیٹا بنا لو لیکن سالی نے بات سنی ہی نہیں الٹا میراثیوں سے کہہ کر مجھے باہر نکلوا دیا۔ لو بولو۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔"

شفیع ہنسنے لگا۔ "میں بتاؤں۔" وہ بولا۔ "بس چپ چاپ بیٹھا رہ تو۔"

اللہ داد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد آصف اور ایلی چہل قدمی کے لئے باہر نکل گئے۔ فضا بے حد اداس تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں دھندلی سڑک ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔ چپ چاپ وہ دونوں کمپنی باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً" آصف گویا اس خاموشی سے اکتا کر بولا "ایلی۔"

"جی۔" ایلی نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

"میرا کیا ہو گا ایلی۔"

"کیوں؟"

"میرا انجام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔" وہ بولا

"خواہ مخواہ۔"

"خواہ مخواہ نہیں۔" آصف نے کہا۔ "میں محسوس کرتا ہوں۔"

"کیا محسوس کرتے ہو۔"

"جیسے جیسے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

"آخر بات تو اتنی ہے نا کہ وہ آ گئی ہے۔"

"نہیں یہ نہیں۔" آصف نے آہ بھری۔

"پھر؟"

"اس کی بات نہیں۔" بس

"تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟"

"میں کہتا ہوں۔ یہ لڑکیاں مجھے تنگ کیوں کرتی ہیں؟" اس نے آہ بھر کر پوچھا۔

"تنگ تم خود ہوتے ہو آصف۔" ایلی نے کہا "وہ نہیں کرتیں۔"

"تمہیں نہیں معلوم۔" آصف نے جواب دیا "اب دیکھو نا کتنی بدنامی ہو رہی ہے نہ جانے اس نے وہاں گھر میں کیا طوفان بپا کر رکھا ہے۔ اماں کیا کہتی ہوں گی اور پھر محلے والے پہلے ہی کہتے تھے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔"

"تو انہیں کہنے دو تمہارا کیا جاتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں نہیں۔" آصف چلایا "تم ایسا نہ کہا کرو۔"

"تو بتاؤ کیا کہوں میں۔"

"یہ بتاؤ کہ میرا کیا ہو گا؟" آصف نے پھر آہ بھری۔

"مجھے کیا معلوم۔" ایلی چڑ گیا۔

"نہ جانے کیا ہو گا؟" آصف نے ہاتھ مل کر کہا۔ کچھ دیر کے لئے وہ دونوں خاموش چلتے رہے پھر آصف نے بات بدلی۔

"ایلی۔" وہ بولا "تم نیم سے نہیں ملے؟"

"نیم۔" ایلی چونک پڑا۔ وہ نیم کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

"مجھ سے چھپاتے ہو۔" آصف ہنسا۔

"نہیں تو۔" ایلی نے کہا۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دل میں آئی کہ آصف سے دل کی بات کہہ دے لیکن اس میں جرأت نہ ہوئی۔ آصف سے بات کرنا ممکن نہ تھا ایلی محسوس کرتا تھا۔ جیسے طبعی رنگینی کے باوجود آصف ایک ملا تھا۔ جس سے دل کی بات نہ کہی جا سکتی تھی۔

اگلے روز کالج سے فارغ ہو کر ایلی آغا کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کوچے سے دلچسپی تھی' ان چہروں سے تو اسے ڈر لگتا تھا جو کھڑکیوں اور جنگلوں میں بنے سنورے دکھائی دیتے تھے۔ لیکن کنڑے والیوں کی لوچدار آوازیں سن کر ایلی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا محسوس ہوتا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہو۔ اس میٹھی جلن میں کس قدر لذت تھی۔ پھر جب کسی ایک چوبارے میں بین کرتی اور طبلہ سر پیٹتا تو ایلی پر کیفیت طاری ہو جاتی۔

ابھی وہ چوک میں ہی تھا کہ حئی نہ جانے کہاں سے آ دھمکا۔ "ارے تم ایلی؟" وہ بولا تو جیسے کھو گئے۔ کیا ہوا تمہیں۔"

"دادی اماں فوت ہو گئیں تھیں"۔ ایلی نے روتی آواز میں کہا۔

"اوہ۔" ایک ساعت کے لئے حئی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ مخصوص انداز سے مسکرانے لگا۔

"دادی مائیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ان کی تو عادت ہی ایسی ہے اب چھوڑو بھی۔ تم نے تو ایسا حال بنا رکھا ہے۔ جیسے دنیا تیاگ دو گے۔ آؤ تمہیں اپنی عاشق کے پاس لے چلوں۔ اسے دیکھ کر سب کچھ بھول جاؤ گے۔ شرط لگا لو۔ نہ بھولو۔ تو اپنا ذمہ۔ میں اپنے دکھ وہاں اٹھا کر لے جاتا ہوں اور وہ ایسی اچھی ہے کہ ایک نظر دیکھ لے تو سب بھول جاتا ہے آؤ۔" ایلی کا جی چاہتا تھا کہ حئی اسے زبردستی ساتھ لے جائے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں ڈر چھپا ہوا تھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں حئی اس کے احتجاج کو تسلیم نہ کر لے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ لیکن حئی اسے کھینچتا ہوا چوبارے پر چڑھنے لگا۔

بائی۔ اور "ہے نا۔"

پھر زینے میں حئی نے آواز دی۔ "ہے نا۔ ادھر آؤ بھاگ کر میں ایک شخص کو پکڑ لایا ہوں۔ بھاگ نہ جائے دوڑ کر آؤ نا۔" وہ چلا آ گیا۔

"ہے نا۔" کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رقاصہ کی طرح بنی سنوری ہوئی عورت ہو گی' اس کے کپڑوں میں وہی بھڑک ہو گی۔ اس کے بال ویسے ہی بنے ہوں گے۔ ان سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہوں گی۔ لیکن وہ تو گویا باورچی خانے سے دال بھگارتی ہوئی اٹھ کر آئی تھی۔ کپڑے عام سے تھے۔ جن میں اجلا پن نام کو نہ تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ آستینیں یوں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے روز کپڑے دھوتی ہو اور چہرے پر جوانی کی شگفتگی کے سوا سنگار کا کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ بھاگی بھاگی آئی اور سوچے سمجھے بغیر ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے لگی۔ ایلی نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے صدیوں سے اسے جانتی ہو اور اس کا جسم یوں بے تکلفی ایلی سے چھو رہا تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔

پھر چند ہی منٹوں میں وہ ایلی کے پاس ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بلا تکلف باتیں کر رہی تھی "حئی نے مجھے کئی بار تمہارے متعلق بتایا ہے۔ حئی کہتا ہے تم اس کے دوست ہو۔ مجھے حئی کے بھی دوست پیارے ہیں۔" وہ مسکرائی اور پھر ہم۔ ہم نام بھی تو ہیں۔ تم الیاس ہو اور

میں الماس کچھ زیادہ فرق تو نہیں۔ ہے نا تو حسی مجھے پیار سے کہتا ہے میرا اصلی نام [illegible]
ہے۔"

"بکتی ہے یہ۔" حسی چلایا۔ "الماس ولماس کوئی نہیں یہ۔ وہ تو نمائشی چیز ہوتی ہے۔ یہ
نا۔ تو خالص گھر کی رانی ہے۔ کیوں ایلی؟"

"ہاں۔" ایلی نے اثبات میں سرہلایا۔

"کیوں ایلی۔" حسی نے پوچھا۔" ہے نا الماس بائی ہو سکتی ہے کیا؟"

"ہے نا۔" کی آنکھیں پرنم ہو گئیں ـــــ وہ مسکرائی۔ "گھر کی رانی کو کبھی کچھ میسر
ایک گھر نہیں۔ اور نہ ہو گا۔" اس کے گالوں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔

"پاگل پاگل۔" حسی غصے سے چیخنے لگا۔ "پھر وہی حماقت۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ہے نا نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ گھر نصیب
ہو گا تم چاہے لاکھ کہو۔"

"میں کہتا ہی کیا ہوں۔" حسی ہنسا۔

"چاہے کہو بھی۔ لیکن جو لکھا ہے ہو کر رہتا ہے یہ چند دن تو میں گھر بنا کر رہ لوں گی
چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ چند روز۔" اس کی آواز بھر آئی۔ "ایلی تم بھی یہاں میرے پاس رہ
رہو گے؟ چند روز تو ہیں۔ صرف چند روز پھر ایک دن الماس بائی کو چوبارہ میں جانا ہی پڑے گا۔"
ہے نا نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ وہیں جا بیٹھے گی جہاں سے آئی ہے۔" ہے نا نے [illegible]
کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پاگل۔" حسی چلایا۔

"کیوں ایلی رہو گے میرے ساتھ؟ جب حسی چلا جاتا ہے تو یہ گھر ویران ہو جاتا ہے۔ [illegible]
اکیلی بیٹھی گھبرا جاتی ہوں۔ تم آجاؤ تو ہم اکٹھے رہا کریں گے تمہیں بہت سی باتیں سنایا کروں گی
میں ـــــ بہت سی آؤ گے نا؟"

"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے ہے نا کے پاس [illegible]
وقت چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس [illegible]
باتیں سن کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب۔ اور پھر [illegible]

اس کے زانو پر رکھ کر سو جائے۔ اسے اپنی اس خواہش پر ندامت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس
کے باوجود وہ خواہش اس کے دل سے نکلتی نہ تھی۔

دفعتاً کٹڑے میں شور سنائی دیا۔ حسی تڑپ کر اٹھا۔ "کیا ہے کیا ہے؟" وہ چلایا۔

"ہونا کیا ہے۔" ہے نا بولی۔ "وہی جو اس بازار میں ہوتا رہتا ہے اور کیا۔"

"کیا ہوتا رہتا ہے یہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"دیکھ لو چل کر۔" وہ بولی۔ "چلو۔"

"یہاں تو بھیڑ لگی ہے۔" ایلی نے بازار میں جھانک کر کہا۔

"وہ تو لگی ہی رہتی ہے۔ یہ بازار بوتل کی طرح چڑھ جاتا ہے۔" وہ بولی۔

"ہے نا ہے۔" حسی دوسری کھڑکی میں سے چلایا "سنا تم نے رؤف گرفتار ہو گیا۔" "ہائیں"
ہے نا نے سینہ تھام لیا۔ "وہ سیٹی پٹی والا راجا گرفتار ہو گیا کیا۔" "ہاں" حسی سیڑھیوں کی طرف
بھاگتے ہوئے بولا۔ "وہی۔ میں ابھی آیا۔" اور پھر زینہ اترنے لگا۔

ہے نا کھڑکی میں ایلی پر جھک گئی حتیٰ کہ اس کا تمام تر جسم ایلی سے چھونے لگا ایلی نے حیرانی
سے ہے نا کی طرف دیکھا مگر وہ اپنی ہی دھن میں نیچے دیکھ رہی تھی اسے احساس ہی نہ تھا کہ اس
کا جسم ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی پاکیزگی وہی گھر کی دیوی پن واضح تھا لیکن
ایلی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس جھکی ہوئی عورت کا دودھ پیتا بچہ
ہو جسے اس نے چھاتی سے لپٹا رکھا ہو۔

دفعتاً ہے نا نے محسوس کیا کہ ایلی سمٹا جا رہا ہے۔

"ہیں یہ تم سمٹے کیوں جا رہے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"تم بہت قریب ہو نا اس لئے۔" ایلی نے ڈرتے ڈرتے اسے چھیڑا۔

"تو پھر کیا ہوا۔" وہ ہنسی اور اس نے ایلی کو دونوں ہاتھوں سے آغوش میں لے کر بھینچ لیا۔
"تم تو ہمارے اپنے ہو۔" وہ یوں بولی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو آغوش میں لے کر اس کا منہ چوم
لیتی ہے۔

یہ محسوس کر کے ایلی احساس ندامت میں ڈوب گیا اور ہے نا پھر سے اس کے وجود سے بے
خبر ہو گئی۔

"یہ سیٹی والی پٹی والا کلموہنہ میرے پاس بھی آیا تھا۔ سمجھتا تھا کہ ڈر جائے گی۔ مگر میں کیا

سمجھتی ہوں ایسوں کو۔ وہ ڈانٹا میں نے کہ پھر کبھی میرے گھر کا رخ نہیں کیا۔"

"لیکن اسے قید کیوں کر لیا گیا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"کچھ کر دیا ہو گا نشے میں۔" وہ بولی۔ "کسی کو قتل نہ کر دیا ہو۔"

اسی وقت ایک ساعت کے لئے "ہے نا" کی جگہ بائی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے۔ ہونٹ بٹوہ سے بن گئے اور آنکھ میں چمک لہرائی۔

"سمجھتا تھا۔" وہ بولی۔ "کہ اسے بھی دھمکی دے کر گرا لوں گا ——— بڑا بنتا تھا۔"

ایلی الماس کو دیکھ کر گھبرا گیا ——— "ہے نا۔" وہ بولا۔ "پانی پلاؤ گی۔"

"پانی۔" وہ چونک پڑی اور دفعتاً" بائی کی جگہ ہے نا مسکرانے لگی۔ "تم بھی مجھے تنگ کرنے لگے ہو۔" وہ چلائی اور اندر جا داخل ہوئی۔

"ایلی یہاں آؤ۔ یہاں نیچے بازار میں۔" حسی چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ الماس کے چوبارے میں تھا۔ اسے شرم آنے لگی۔ گھبرا کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا اور پھر دفعتاً" اسے خیال آیا کہ حسی کو خاموش کرنے کے لئے اسے نیچے جانا ہی پڑے گا جب وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو ہے نا بھاگی بھاگی آ گئی۔

"یہ لو اپنا پانی۔" وہ بولی اور اپنے آپ کو یوں سنبھالنے لگی۔ جیسے گاؤں کی الھڑ گوریاں بولا کے بعد تھک کر آنچل اور اپنا آپ سنبھالتی ہیں۔

"میں جا رہا ہوں۔" ایلی نے کہا اور زینہ اترنے لگا۔

"پھر آؤ گے نا۔" وہ بولی۔ "ضرور آنا۔ میں یہاں اکیلی بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔ ضرور آنا۔ ضرور۔" اس کی آواز گونج رہی تھی اور ایلی بازار میں پہنچ چکا تھا۔

انوکھی تحقیق

کٹڑے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ جگہ جگہ گروہوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے پنواڑیوں کی دوکانوں پر لوگ جمع تھے۔ پان کی پیک تھوک کر یا سگریٹ کا لمبا کش لگا کر وہ سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف دیکھتے اور پھر چہ میگوئیاں کرنے لگتے۔

چوباروں میں رقاصائیں منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھیں اس وقت انہیں بناؤ کا ہوش نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے بال پریشان ہو رہے ہیں۔ چہروں پر تھکن کی

پڑی ہیں۔ گال پاؤڈر اور روغن سے خالی ہیں یا پاؤں ننگے ہیں۔ غالباً" اس وقت انہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ رقاصائیں ہیں۔ اس وقت تمام بائیاں ہے نا ہوئی تھیں۔ جیسے دفعتاً" باورچی خانے کے کام کرتے کرتے بھاگ کر جنگلے میں آ کھڑی ہوں۔

وہ سب حیرانی سے سبز جنگلوں کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سبز جنگلہ ویران پڑا تھا۔

بازار میں لوگ حیرانی سے چلا رہے تھے:

"بھئی حد ہو گئی۔ وہی سیٹی پٹی والا راجہ ——— حد ہو گئی۔" ایک بولا۔

"سالہ نخوت کرتا تھا یاں کٹڑے پر۔"

"حکومت سی حکومت سنا ہے سیٹھ جمناداس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے روبرو۔"

"بھئی کیوں نہ جوڑتا۔ دل کا معاملہ تھا۔"

"سیٹی پٹی والا چاہتا تو سالہ چار موٹر کاریں مانگ لیتا۔ سیٹھ سے۔"

"موٹر کیا ہے جو چاہتا سو لیتا ہاں۔"

"پر اسے تو میاں "شادی" کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ وہ اس کے سر پر سوار تھی۔"

"وہ شادی سالی ہے بھی تو بند بوتل چڑھ جاتی ہے ایک دم۔"

"پر اب تو بابو کھل گئی وہ بند بوتل۔ کیوں بھئی۔"

"پر مالم کیسے ہوا پہلوان کو کہ سالہ ویسے ہی راجہ بنا ہوا ہے جھوٹ موٹ کا۔"

"بس ہو گیا۔ کاٹھ کی ہنڈیا کب تک چڑھتی ہے۔ ہاں۔"

"بھئی ہنڈیا تو آٹھ مہینے چڑھی رہی۔ میرے بھائی۔"

"اور میں کہتا ہوں یہ تو چڑھی ہی رہتی اگر اپنے بابو کی بنی کو نہ چھیڑتا وہ۔"

"کون بنی؟"

"ارے کی سبز جنگلے والی۔"

"وہ جو سانوری سلونی سی ہے؟"

"ہاں ہاں بڑی مرچیلی ہے وہ۔ بابو اس کے ہاں آتا جاتا ہے نا۔"

"کون بابو؟"

"بابو کو نہیں جانتے۔ بھئی وہ گورا چٹا۔ یہیں کٹڑے میں رہتا ہے۔ سرداراں کے چوبارے کے پچھواڑے کی گلی میں۔ کھفیہ پولیس میں ہے وہ بابو اپنا۔"

"لیکن کیسے معلوم ہوا کہ سیٹی پٹی والا بناوٹی افسر بن کر تحقیق کر رہا ہے۔"

"بس جی بابو نے پہلے تو اس بہروپیے کی منتیں کیں۔ تم جانتے ہو ایک محکمے کے آدمی ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہیں اپنے بابو نے کہا بھئی جس پر جی چاہے ہاتھ رکھ ڈالو اپنے تعلق نہیں پر "بی" پر ہاتھ نہ ڈالنا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"بات تو کھری کہی بابو نے پیارے۔"

"ہاں بھئی صاف بات اچھی ہوتی ہے۔"

"پر وہ تو گویا نفلوں کا بھوکا تھا۔ اسی شام کو وہ "بی" کے چوبارے پر چڑھ گیا اور بابو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر بابو نے جا کر دفتر سے مالومات لیں۔ اس سے پوچھا اس نے اپنی پوری تیخیخ کی اور مالوم ہوا کہ سرکار نے تفتیش کے لئے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور صاحب آج بابو میاں دوخان پر آیا اور بولا استاد آج کہیں سرکنا نہیں وہ تماشہ دکھاؤں گا کہ یاد کرو گے ایسا تماشہ کٹڑے والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو گا اور اس وقت وہ اوپر "بی" کے چوبارے پر ہے اور ساتھ پلس ہے تاکہ سیٹی پٹی والے کو ہتھکڑی لگا لے۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔"

"بھئی شاباشے بابو کا۔"

"بڑا مجے کا آدمی ہے وہ اگرچہ ہے کھفیہ پلس کا پر اپنا یار ہے۔"

عین اس وقت آغا آگیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے نیازی برس رہی تھی۔

"تم ہو ایلی؟" آغا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سرسری انداز سے بولا۔ "آ گئے تم۔ اب کی مرتبہ تو دیر کر دی تم نے یہ تماشہ دیکھا ہو گا ہو گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انکوائری محض ڈھونگ ہے اور وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر دراصل ایک موقوف شدہ پلسیہ ہے۔ پٹھے نے آٹھ مہینے کٹڑے میں عیش کئے ہیں۔ دعوتیں اڑائی ہیں مجرے دیکھے ہیں۔ گانے سنے ہیں اور جس کی سیج پر چاہا لیٹا ہے۔ خدا کی قسم ایسا ستم ظریف تھا چوٹی کی بائیوں سے چلمیں بھرواتا رہا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لیکن۔" ایلی نے پوچھا "پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ہاں۔" آغا ہنسا۔ "میں سمجھا شاید تم جانتے ہو اس معاملے کو کٹڑے کا تو بچہ بچہ جانتا ہے۔"

آغا ہنسنے لگے۔ "کیا واقعی۔" ایلی نے کہا۔

"یہ سیٹی پٹی والا انسپکٹر پہلے پولیس میں تھا۔ پھر نہ جانے کس وجہ سے برخواست ہو گیا۔ اس کے بعد اس شخص نے ایک جعلی حکمنامہ بنایا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں شخص نے حکومت کا ایک لاکھ روپیہ غبن کیا ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے زیادہ تر روپیہ امرتسر کٹڑہ رنگین میں اپنی محبوبہ بنام سردار دیا بہار و پر صرف کیا ہے۔ انسپکٹر رؤف کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقعہ پر جا کر اس امر کی تحقیق کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔" آغا صاحب ہنسنے لگے۔

"کمبخت کو کیا بات سوجھی اور پھر اس نے رقاصاؤں کے جو دو نام لکھے اس خط میں وہ بہت سوچ کر لکھے۔ چونکہ کٹڑے میں ان ناموں والی بہت سی رقاصائیں ہیں اور وہ سب اوپر کے درجے کی ہیں۔ بس تو اس نے وہ خط یہاں کے ایس پی کو دکھایا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس کے بعد اس نے تفتیش کے پردے میں وہ کیا جس کا جواب نہیں۔"

"آخاہ آخاہیں۔" ایک نوواردان کی طرف بڑھا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف چل دیئے۔

ایلی نے آغا کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھا وہاں نیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نیم کو اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر ایلی کا دل ڈوب گیا۔ معاً اسے خیال آیا شاید نیم بھی وہیں کہیں موجود ہو گی۔ وہ تڑپ کر مڑا مگر آغا کے چوبارے کی کھڑکیاں جوں کی توں بند تھیں۔ چقیں بے جان انداز سے لٹک رہی تھیں اور حرکت سے قطعی طور پر بے گانہ تھیں۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر کسی بازو کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے نیم کی طرف دیکھا جو ویسے ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی خوشخبری اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی ہو۔

باادب باملاحظہ ہوشیار

ایلی نے آغا کی طرف دیکھا وہ دور جا چکا تھا۔ حسی پان کی دکان پر کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ ادھر ادھر دیکھا اور پھر حالات کو سازگار سمجھ کر نیم کی طرف بڑھا۔ اسے آتے دیکھ کر نیم کے ماتھے پر پیارا شکن پڑ گیا۔ بھویں کمانوں کی طرح ہوتی گئیں۔

"ہم نہیں بولتے تم سے۔" وہ ایک انداز سے زیر لب بولی۔

"کیوں؟" ایلی نے نگاہیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"بس تم نے کھو دیا۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

"کیا کھو دیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"سب کچھ۔" وہ بولی "تم تو بس کھو ہی دیتے ہو۔ میں بتاتی ہوں بات اور تم بگاڑ دیتے ہو۔"

"آخر بتاؤ بھی نا۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر تم آتے کیوں نہیں ہمارے یہاں۔" وہ بولی۔

"تمہاری آپا جو چھپی رہتی ہے۔" اس نے پینترہ بدلا۔ "دیکھ لو آج بھی چھپی بیٹھی ہے۔"

"اوں۔" وہ بولی۔ "وہ تو نہیں چھپتی پر دادی اسے باہر آنے بھی دے۔"

"کیوں دادی کیا پکڑے رکھتی ہے اسے۔"

"سائے کی طرح سوار رہتی ہے۔ آپا کہتی تھی ——" وہ رک گئی۔

"میرے متعلق کچھ کہتی تھی۔ بتاؤ۔" ایلی نے منت کی۔

"نہیں بتاتی۔" اس نے بسور کر کہا۔ "مجھ سے ملتے جو نہیں تو بتاؤں کیوں۔"

"تم بڑی پیاری ہو۔" وہ اس کے قریب تر ہو گیا۔

"جھوٹ۔" نیم نے اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "چھوڑو ہمیں۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ چھوٹی سی لڑکی در حقیقت ایک بالغ عورت ہو۔ ایک عورت جو لبھانے کے انداز سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر اس حوالگی کے باوجود اپنا منہ موڑ رکھا تھا۔

عین اس وقت ایک شور اٹھا اور کٹڑے میں کھڑے تمام لوگ سبز جنگلے والے مکان کی طرف بھاگے۔

"ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔" حسی نے بڑھ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "وہ اسے نیچے لا رہے ہیں۔"

حسی ایلی کو دیوانہ وار گھسیٹنے لگا۔

وہاں ایک کہرام مچ گیا۔

"جوتے مارو جوتے۔"

"کہاں ہے بہروپیہ؟"

"پکڑ لیا گیا۔"

"اسے لا رہے ہیں۔"

"پہلوان ذرا دیکھنا دوکان کو میں آیا۔"

سب لوگ دیوانہ وار سبز جنگلے والے چوبارے کی طرف لپکے۔ حسی نے دو ایک کو گرایا دو ایک کو پچھاڑا اور وہ دھاڑتا ہوا ایلی سمیت سبز جنگلے والے چوبارے کی سیڑھیوں کے سامنے جا پہنچا۔ چند ایک سپاہی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے اپنے چابک چلانے شروع کر دیئے۔ "ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔" لوگوں نے بڑی مشکل سے راستہ دیا۔ حسی یہ دیکھ کر اس دوکان کی طرف لپکا جو ان سیڑھیوں سے ملحقہ تھی اور اس نے ایلی کو چھجے پر گھسیٹ لیا۔

سپاہیوں کے پیچھے سیٹی پٹی والا رؤف ہتھکڑی پہنے بڑے وقار سے آرہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ اس نے بڑے غیور انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر بارعب انداز سے بولا۔ جیسے اپنی رجمنٹ کو حکم دے رہا ہو۔

"اے ہمارے لئے موٹر بھی نہیں لائے تم۔ ہم موٹر کے بغیر کیسے جائیں گے۔"

بابو نے ایک زہرخند مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ سپاہی مسکرائے۔

"اور دیکھو۔" ملزم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ہمیں سگریٹ چاہئیں پہلوان "وہ چلایا۔" سگرٹ کا ایک ٹین۔"

"سگرٹ کا نہیں۔" پہلوان پنواڑی چلایا۔ "اب تو بیٹے ویسے ہی ٹین پاٹ ہو گا۔"

"سالا موٹر مانگتا ہے۔" ہجوم سے آواز آئی چل تو سہی تھانے میں تیرا ایکسیلیٹر دبائیں گے تو ہوش آجائے گا۔"

"ارے او سیٹی والی پٹی۔"

"خاموش" ملزم نے انہیں ڈانٹا۔ "ہمیں نہیں جانتے تم۔"

بابو ہنسنے لگا "اب سالہ دیوانہ بنتا ہے۔"

"بکار خویش ہشیار ہے۔"

وہ جلوس آہستہ آہستہ کٹڑے میں چلنے لگا۔ ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ لوگ بیڑیوں کے ٹکڑے اس معزول شدہ راجہ پر پھینک رہے تھے۔ اوپر رقاصائیں جنگلوں سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں کئی

ایک ہاتھ مل رہی تھیں۔ کئی ایک شرمندگی محسوس کر رہی تھیں کہ انہیں دھوکہ دے کر لوٹ لیا گیا اور وہ سیٹی پیٹی کا متوالا تحکمانہ انداز سے احکامات جاری کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"ہٹ جاؤ یہ ہمارا جلوس ہے باادب باملاحظہ ہوشیار۔"

اس روز شام کو جب ایلی واپس اپنے بورڈنگ ہاؤس کو جا رہا تھا تو وہ محسوس کر رہا تھا جیسے خود سیٹی پیٹی کا بہروپ ہو اور ایک روز اسے بھی یونہی جلوس میں چلتے ہوئے پکارنا ہو گا "باادب باملاحظہ ہوشیار۔"

الوداع

پھر وہ سب امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ شفیع صبح سویرے ہی اپنی ہاکی سٹک اور کتابیں اٹھا کر قریب کے باغ میں جا بیٹھتا اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور ایلی نہر کے کنارے جا بیٹھتے۔ جہاں آصف پڑھنے کے علاوہ ٹھنڈی آہیں بھرتا اور بار بار ایلی سے پوچھتا "ایلی اب کیا ہو گا" اور ایلی یہ سن کر سونے لگتا اس وقت اس کے روبرو شہزادی آ کھڑی ہوتی اس کے حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتے اور پھر ایک رنگین آواز سنائی دیتی۔ "ایلی تم مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی"۔

"ایلی اب کیا ہو گا۔" آصف کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایلی کے سامنے وہ سیٹی پیٹی کا روپ آ موجود ہوتا اور تحکمانہ انداز سے چلاتا "باادب باملاحظہ ہوشیار۔"

اللہ داد سارا دن کمرے میں بیٹھا رہتا اور پڑھنے کے علاوہ سر پر آم کی گٹھلی رگڑتا رہتا اور پھر با آواز بلند بنگالی بابو کو گالیاں دیتا جس کی وجہ سے وہ گوشت کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔

"ان ہندوؤں کو اللہ غارت کرے یا مہاتما بدھ ان پر اپنا قہر نازل فرما کہ انہوں نے ایک مومن پر گوشت کھانا حرام کر رکھا ہے۔"

رام ان کو بن باس دے کہ انہوں نے مجھے دال کھلا کھلا کر تباہ کر دیا ہے میرا معدہ ہر وقت لاحول پڑھتا ہے۔"

اللہ داد کا شور سن کر ہر نام اور لیناسیاں آجاتے اور وہ سب مل کر شور مچاتے ہوئے بنگالی سپرنٹنڈنٹ اللہ داد کی بد دعائیں سنتا اور چوری چوری مسکراتا کیونکہ وہ خود مظلوم تھا۔

والوں نے اس پر بھی مچھلی کھانے کے خلاف پابندی لگا رکھی تھی۔

جب وہ سب امتحان سے فارغ ہوئے تو اللہ داد نے سکھوں کے ساتھ مل کر بورڈنگ میں ایک جلوس نکالا۔ وہ جلوس تین لڑکوں پر مشتمل تھا ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ' اللہ داد خود اس جلوس کا لیڈر تھا۔ وہ ہر کمرے میں جا کر نعرہ لگاتے۔

"جے ہندو دھرم کی جے۔"

"اے ہندوؤ۔" اللہ داد چلاتا۔ "خدا تمہارا کلیان کرے۔ تم نے سال بھر ہمیں دالیں کھلا کھلا کر اندر باہر سے خوشبو دار بنا دیا ہے۔" اس پر باقی لڑکے چلاتے۔ "جے ہندو دھرم کی جے۔"

اللہ داد کے نعرے سن کر رسوئی کے تمام نوکر مسرت سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ واقعی اندر باہر سے خوشبودار ہونا ایک قابل تعریف امر ہے۔ ہندو جذبات کے اثر سے بھیگی ہوئی تحسین بھری نگاہوں سے اللہ داد کو دیکھ رہا تھا۔ دور بنگالی بابو زیر لب مسکراتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ ادھر آصف اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا "اب کیا ہو گا اب میں گھر کیسے جاؤں گا ایلی؟"

عین اس وقت پرنسپل اپنی لینڈو میں آموں والی کوٹھی میں آدھمکا۔ چند ایک ساعت کے لئے پودوں کے پیچھے چھپ کر وہ لڑکوں کی باتیں سنتا رہا پھر معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر مسکرایا اور وہیں سے چلانے لگا۔ "او اللہ داد یہ کیسا شور ہے؟" جلوس پرنسپل کو دیکھ کر تھم گیا۔ سکھ دفعتاً اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ رامو اور لالو بھاگ کر رسوئی میں برتن صاف کرنے لگے۔ اللہ داد ایک ساعت کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر اسے سوجھی۔ اس نے جیب سے آم کی خشک گٹھلی نکالی اور اسے اپنے سر پر رگڑنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو اللہ داد۔" پرنسپل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"سلام پرنسپل جی۔ سر سے خشکی نکال رہا ہوں۔"

"ہوں۔ لیکن تمہاری سر کی خشکی کبھی نہ جائے گی۔ خشکی آم کی گٹھلی سے نہیں جاتی عقل سے جاتی ہے۔" اس پر سب لڑکے ہنس پڑے۔

"حضور۔" اللہ داد نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اسی عقل کے کھوج میں اس کالج میں آیا تھا پر یہاں بھی نہیں ملی۔"

"اچھا لڑکو۔" پرنسپل نے بات کا رخ بدلا۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" اس پر چاروں
طرف سے لڑکے بھاگے بھاگے آئے اور پرنسپل کے گرد جمع ہو گئے۔

"آج تم امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر جا رہے ہو۔ تم میں سے کئی لڑکے اب
اس کالج میں نہیں آئیں گے اسی لئے میں تم سب سے الوداع کہنے آیا ہوں۔"

اس پر سب لڑکوں نے تالیاں بجائیں اور پھر پرنسپل سے مصافحہ کرنے کے لئے قطار باندھ
کھڑے ہو گئے۔ اس اثناء میں بنگالی سپرنٹنڈنٹ بھی آ گیا اور وہ دونوں باری باری لڑکوں سے ہاتھ
ملانے لگے۔

دو بھگوڑے

پرنسپل کے جانے کے بعد بنگالی بابو کے کہنے کے مطابق وہ سب اپنا بستر بوریا باندھنے لگے،
پھر باری باری تانگوں میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگے۔ ایلی کو بستر باندھتے دیکھ کر آصف نے
سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایلی۔" اس کی آواز میں منت تھی۔ "تم چلے گئے تو میں کیا کروں گا۔ ایلی۔"

ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب تو مجھے جانا ہی ہو گا۔" وہ بولا۔

"کیوں یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے۔ تمہاری تسلیم بھی تو یہیں ہے۔"

"میری تسلیم۔" ایلی چونکا لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا "ہاں وہ۔"

"تو پھر تم کیوں علی پور جاتے ہو فضول۔ یہیں رہو ایلی میرے ساتھ۔ یہاں نور ہے
لگن ہے مہر ہے سبھی تو یہاں ہیں۔ یہیں رہو میری خاطر۔ ایلی۔"

"لیکن یہاں رہیں گے کہاں۔ تمہارے گھر میں؟"

"نہیں نہیں۔" وہ چلایا "گھر میں میں کیسے جا سکتا ہوں۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہم یہاں کوئی مکان کرائے پر لے لیں گے۔" آصف نے جواب دیا۔

ایلی امرتسر میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ اسے آصف اور سفینہ کی کہانی میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔
دلچسپی ہوتی بھی کیسے۔ اگر آصف لڑکی میں اثباتی دلچسپی محسوس کرتا۔ اگر وہ اسے

منصوبے باندھتا۔ اگر وہ اسے خطوط لکھنے اور وہاں تک پہنچانے کی ترکیبیں سوچنے کے فکر میں
گھلتا اور ایلی سے ان امور میں مدد چاہتا۔ تو شاید ایلی کو اس رومان میں دلچسپی محسوس ہوتی۔ سفینہ
سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے میں ایلی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن آصف سے انکار کرنا بھی تو ممکن
نہ تھا اور ویسے بھی شہزاد کی کشش کے باوجود ان حنائی ناگوں کے سحر کے باوجود وہ علی پور جانے
سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزاد کے قرب سے ڈرتا تھا وہ ان لٹکتی ہوئی گوری بانہوں سے ڈرتا تھا۔ جن میں
الجھنے کی زبردست آرزو اس کے سینے میں سلگ رہی تھی۔

درحقیقت اس وقت وہ دونوں آصف اور ایلی "بھگوڑے" تھے اور ان کا وہ انوکھا فرار ان
الجھنوں کا حامل تھا جو بندھنوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ وہ دونوں زندگی سے دور بھاگ رہے تھے۔
انسان کی بنیادی خواہشات سے منکر تھے اور زندگی کے دھارے سے ہٹ کر کنارے کے بند اور
متعفن پانیوں کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ وہ بھگوڑے دراصل مریض تھے۔ جنہیں یہ
احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں جنہیں شعور نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا گلا
گھونٹ رہے ہیں اور مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہاتھی کو ٹٹولنے والے دو اندھے۔

وہ چوبارہ جو انہیں رہنے کے لئے کرائے پر ملا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھا جو ہال بازار
سے نکل کر رام باغ کے بازار میں جا ملتی تھی۔ اس گلی کی نچلی منزل میں تمام تر دوکانیں تھیں جو
سر شام ہی بند ہو جاتی تھیں۔ اوپر کی منزل میں زیادہ تر گودام تھے جو دن رات بند رہتے اس وجہ
سے گلی ویران اور سنسان رہتی۔ لیکن ان کے چوبارے کے جنگلے کی کھڑکیوں کے عین مقابل میں
ایک نوجوان رقاصہ کی بیٹھک کا پچھلا حصہ تھا۔ بیٹھک کی کھڑکیاں رام باغ کے بازار میں کھلتی
تھیں۔ صدر دروازہ بھی اسی بازار میں تھا مگر —— پچھلے حصے کی کھڑکیاں اس چوبارے کے
مقابل کھلتی تھیں۔

اس چوبارے میں وہ دونوں بے سرو سامان حالت میں جا بیٹھے۔ ان کی پاس ایک ٹوٹے
ہوئے ٹرنک اور دو بستروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے پاس انہوں نے زمین پر بستر بچھائے
اور موم بتیوں کا پیکٹ دیا سلائی سگریٹ سرہانے رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند ایک منٹ کے
لئے وہ اس اجنبی ماحول کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔ خاموشی گہری ہوتی گئی
اور گلی کی ویرانی اور اس کے عقب میں بازار کا دبا دبا شور خوفناک صورت اختیار کرتے گئے۔ حتیٰ
کہ رات کے اندھیرے نے اسے اور بھی بھیانک بنا دیا۔

"ایلی۔" آصف نے لمبی آہ بھری۔

"ہاں۔"

"اب کیا ہو گا؟"

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب میں کیا کروں گا؟ کیسے گھر جاؤں گا؟"

"تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو کیا گھر چلا جاؤں۔" آصف نے پوچھا۔

"تمہارا اپنا گھر ہے۔" ایلی بولا۔

"لیکن محلے والے کیا کہیں گے۔"

"پڑے کہیں تم نے کوئی جرم کیا ہے کیا۔" ایلی نے چمک کر کہا۔

"لیکن میں اس سے نجات کیسے پاؤں گا؟"

"نجات پانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دیکھتی ہے تو پڑی دیکھے۔ تمہارا کیا لیتی ہے۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے۔"

"سچ" آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اور کیا" ایلی نے تن کر کہا۔

"اور اگر وہ آوازے کسے تو؟"

"تو کیا کسنے دو؟"

"مگر اس کا انجام کیا ہو گا؟"

"انجام اچھا چاہتے ہو تو اس پر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔"

"لیکن کیسے ظاہر کروں۔"

"تم اس کی طرف دیکھو۔"

"بس اتنی سی بات ہے۔" آصف نے مسکرا کر پوچھا۔

"اور کیا وہ مطمئن ہو جائے گی اور تمہیں تنگ نہ کرے گی۔" ایلی نے وثوق سے کہا۔

"سچ۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا"۔

"اس کے بعد آصف خاموش ہو جاتا اور کسی گہرے خیال میں کھو جاتا اور دیر تک وہ دونوں

چپ چاپ لیٹے رہتے۔ پھر دفعتاً آصف چونکتا۔

"مگر ایلی" آصف مدھم آواز میں کہتا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "اس طرح تو بات بڑھ جائے گی۔"

"ہاں بات تو بڑھ جائے گی۔"

"تو پھر کیا ہو گا؟"

"تو پھر ——" ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔

"اگلے روز صبح سویرے ہی آصف نے ایلی کو جگایا۔

"ایلی ایلی۔" اس نے اسے جھنجھوڑا۔ ایلی کے بیدار ہونے پر وہ مسکرانے لگا اس کی آنکھوں میں عجیب سی پھوار پڑ رہی تھی۔ "ایلی۔" وہ چلایا۔ "چلو میں تمہیں دکھاؤں۔ چلو اوپر کوٹھے پر۔"

"اوپر" ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولا۔ "وہ کوٹھے پر کھڑی ہے۔"

"وہ ——؟ یہاں اس کوٹھے پر۔"

"اپنے گھر کے کوٹھے پر یہاں سے صاف نظر آتا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔"

"لیکن وہ کون۔" ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بھئی وہی۔ آؤ نا۔"

"وہی تمہارے والی سفینہ۔"

"ہاں ہاں وہی۔ کوٹھے سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ہے۔"

"لیکن تمہارا محلہ تو دور ہے یہاں سے۔"

"نہیں تو اس چوبارے کے عین پچھواڑے میں ہے۔ یہ ہال بازار کے پیچھے اس کٹڑے کے بائیں ہاتھ۔"

"لیکن ——" ایلی کو یقین نہ آتا تھا۔

"راستہ گھوم پھر کر جاتا ہے ویسے یہاں سے قریب ہے چلو نا۔ بیچاری کھڑی میری راہ دیکھ رہی ہو گی ابھی تک ہمت نہیں ہاری حالانکہ مجھے گھر سے نکلے اتنی دیر ہو چکی ہے۔ حد کر دی اس نے یہ تو میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔"

کوٹھے سے ایلی نے اس طرف نگاہ دوڑائی جدھر آصف اشارہ کر رہا تھا۔ چاروں طرف منڈیروں کوٹھوں اور چھتوں کا ایک طوفان پھیلا ہوا تھا اور وہ منڈیریں اور چھتیں ایک دوسرے سے شانے جوڑ کر کھڑی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کا سہارا لے رہی ہوں ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے مکانات مسمار ہونے کے بعد ملبے کے ڈھیر بن گئے ہوں اور ان ڈھیروں میں چند بالشتیے چل پھر رہے ہوں۔

"وہ دیکھو وہ" آصف شرماتے ہوئے بولا۔ "وہ جو نیلی برساتی کے پاس زرد رنگ کی منڈیروں والی چھت ہے اور اس کے قریب میلے سے کوٹھے پر وہ جس کے پیچھے بڑے بڑے سوراخ ہیں دیوار میں ان پردوں کے پاس وہ سفید کپڑوں میں ملبوس لڑکی ہے نا آئی نظر بس وہ ہے۔ دیکھا۔"

غور سے دیکھنے کے باوجود ایلی کو چھتوں کے انبار کے سوائے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن آصف کے اصرار سے بچنے کے لئے اسے کچھ دیر کے بعد "ہاں ہاں ——— وہ" کہنا ہی پڑا۔

"اب دیکھ لو۔" آصف بولا۔ "یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بت کھڑا ہو۔"

"ہاں۔" ایلی بولا۔ "تم نے تو اسے پتھر کا بنا دیا۔"

"سچ؟" آصف نے مسکراتے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا۔ "وہ بھی یہی کہتی ہے۔"

"سچ کہتی ہے وہ۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تم بھی یہی سمجھتے ہو کیا۔" آصف نے آہ بھر کر پوچھا۔

"تم اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر رہے ہو آصف۔" ایلی غصے میں بولا۔

"میں؟" آصف نے مظلوم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں تم۔" ایلی چلایا۔

"نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔" آصف نے منت کی۔

"اسے تم سے محبت ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔ "اسی لئے تم اسے ذلیل کر رہے ہو۔"

"کیا واقعی محبت ہے اسے؟" آصف نے پوچھا۔

"ظاہر ہے اور کیا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا مقصد صرف مجھے بدنام کرنا ہے۔"

"تم پاگل ہو آصف۔"

"کیوں؟" وہ چلایا۔

"کیا اس طرح وہ خود بدنام نہیں ہوتی"

"اسے بدنامی کی پروا نہیں۔"

"لڑکی ہو کر بدنامی کی پروا نہیں؟ کتنی عجیب بات کرتے ہو تم۔"

"ہاں عجیب سی ہی معلوم ہوتی ہے۔" آصف سوچ پر پڑ گیا۔

اس قسم کی بے ڈھنگی باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔ آصف نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتا اور ایلی کا جی چاہتا کہ اس کا بھی کوئی انتظار کرے اس کے لئے بھی کوئی چھت پر کھڑی رہے حتیٰ کہ صبح سے شام ہو جائے۔ اس کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کو ٹھکرانے کے لئے بے تاب تھا۔

پھر دفعتاً ایک دھندلی سی شکل ایلی کی نگاہوں تلے واضح ہونے لگتی۔ دو سفید بانہیں لٹکتیں۔ دو شنگرفی ہاتھ بڑھتے اور ماتھے کے عین درمیان میں ایک سیاہ تل ابھر آتا۔ شہزاد مسکراتی اور کہتی "ایلی تم کیا تم دنیا والوں کی پروا کرتے ہو؟" اس وقت ایلی خاموش ہو جاتا اور آصف کی آواز سن کر چونک پڑتا اور اس کا وہ حسین خواب ٹوٹ جاتا۔

اس طرح ایک دوسرے سے دور ایک دوسرے سے بیگانہ وہ دونوں قریب قریب بیٹھ رہتے اور دیوانوں کی طرح اس اجڑے ہوئے منڈیروں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے رہتے۔

نرالی تجویز

ایک روز آصف بولا۔ "ایلی کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا کہ وہ جھوٹی ثابت ہو جائے اور میں اسے طعنہ دے سکوں۔"

ایلی کو بات سمجھ میں نہ آئی۔ "میں نہیں سمجھا۔" وہ بولا۔

"مطلب یہ ہے کہ میں اسے کوئی ایسی فرمائش کروں جو وہ پوری نہ کر سکے اور پھر میں اس سے کہوں بس دیکھ لی تمہاری محبت۔"

"یہ تو سیدھی سادھی بات ہے۔" ایلی چلایا۔ "اسے کہہ کہ یوں اعلانیہ تم سے اظہار محبت نہ کرے۔"

"اونہوں" آصف نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ وہ نہیں مانتی۔ کوئی اور بات ہو۔"

"کوئی اور بات" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے پھر دفعتاً ایلی نے چٹکی بجائی۔ بن گئی بات۔

"کیا؟" آصف نے پوچھا۔

"اس سے بہتر تجویز نہیں ہو سکتی۔" ایلی نے خوشی سے اچھل کر کہا۔

"کیا تجویز ہے؟" آصف شوق سے ایلی کے قریب تر ہو گیا۔

"لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے تمہیں گھر جانا پڑے گا۔" ایلی بولا۔

"ہاں۔" آصف بولا۔ "میں چلا جاؤں گا۔ بتاؤ تو۔"

"جب تم گھر جاؤ تو کوٹھے پر چلے جانا۔" ایلی نے گرمجوشی سے کہا۔

"گھر جاتا ہوں تو کوٹھے پر تو ضرور جایا کرتا ہوں اگرچہ لوٹا لے کر جاتا ہوں۔ ویسے دکھانے کو۔" آصف بولا۔

"اور وہ کوٹھے پر آ جائے گی۔ آ جائے گی نا۔"

"ہاں۔ وہ تو اکثر کوٹھے پر ہی رہتی ہے اور مجھے دیکھتے ہی اعلانیہ سلام کرتی ہے بڑے بڑے ادب سے۔" آصف ہنسنے لگا۔

"اب کی مرتبہ وہ سامنے آئے تو اسے اشارہ کر کے اپنی قمیض کے نچلے کونے کو پکڑ کر اٹھانا۔ یہاں تک کہ بازو سر کے اوپر انگڑائی کی صورت معلق ہو جائیں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" آصف نے پوچھا۔

"اس سے قمیض کا اگلا حصہ اوپر اٹھ جائے گا۔"

"پھر؟" آصف اس کے قریب تر ہو گیا۔

"پھر تمہارا سارا جسم ننگا ہو جائے گا۔"

"لیکن اس کا فائدہ۔"

"پھر اسے اشارہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ اشارے سے کہنا میری خاطر۔"

"یوں کرنے سے تو اس کا جسم بھی ننگا ہو جائے گا۔" آصف گھبرا کر بولا۔

"ہاں۔" ایلی نے بڑے فخر سے کہا۔

"لیکن وہاں کوٹھے پر اسے ننگا کر دینا" ——— آصف ہچکچا کر بولا۔ "نہیں نہیں"

"یہی تو بات ہے" ایلی نے کہا۔ "وہ عورت ہے۔ حیا مانع ہو گی۔ وہ مجبور ہو گی اور فرمائش پوری نہ کر سکے گی۔"

"ہوں۔" آصف بولا ——— "لیکن اگر اس نے قمیض اٹھا دی تو ———"

قمیض اٹھا دی تو ——— ایک ساعت کے لئے ایلی گھبرا گیا اس نے اس امکان پر غور ہی نہ کیا تھا پھر وہ بولا۔ "نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی خصوصاً کوٹھے پر کھڑی ہو کر ایسا نہ کر سکے گی پھر تم تمسخر سے ہنس دینا بس یہی ہے تمہاری محبت۔"

"لیکن تمسخر سے کس طرح ہنسوں گا میں۔" آصف نے پوچھا۔

"جیسے تمسخر سے ہنستے ہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں تمسخر سے ہنسنے کی کوشش کرنے لگے۔

سنگ مرمر کا مجسمہ

اگلے روز صبح سویرے ایلی نے بصد مشکل آصف کو گھر جانے پر مجبور کر دیا تاکہ وہ گھر جا کر اس کی نئی تجویز پر عمل کر سکے۔ نئی تجویز پر عمل کرنے کے لئے آصف گھر جا چکا تھا اور ایلی رد عمل کی تفصیلات جاننے کے لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لڑکی آصف کے کہنے پر اپنی قمیض نہیں اٹھائے گی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے عریاں نہ کرے گی۔ مگر دفعتاً اس کا سلسلہ خیال ٹوٹ جاتا اور دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ وہ قمیض اٹھا لے تاکہ آصف واپس گھر جانے پر مجبور ہو جائے اور اس ویران چوبارے میں رہنے سے نجات مل جائے۔ پھر وہ لا حول پڑھنے لگتا اور اسے احساس ہوتا کہ وہ کمینہ ہے جو اپنے فائدہ کے لئے آصف کو گھر جانے پر اکسا رہا ہے۔ پھر وہ چلا اٹھتا۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہو گا۔"

اس نے اپنے پیچھے آہٹ سنی۔ "آصف" وہ چلایا۔ "تم آ گئے۔" آصف ایک بت کی طرح اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ بازو لٹک رہے تھے۔

"آصف" ایلی اس کی طرف مڑا۔ "کیا ہوا آصف؟"

آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

"لیکن وہ۔ وہ" وہ رک گیا۔ "وہ لڑکی۔"

آصف نے اثبات میں سرہلانے کی کوشش کی۔

"اس نے کیا کیا بولو۔" ایلی اضطراب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

آصف نے پھر اثبات میں سرہلا دیا اور اس کا سر ایلی کی چھاتی پر لٹک گیا۔

"خدا کے لئے بولو۔" ایلی چلایا۔

"ہاں اس نے قمیض اٹھا دی۔" آصف زیر لب بولا اور اس کے گالوں پر دو موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

"بالکل ہی اٹھا دی؟" ایلی نے دیوانہ وار پوچھا۔

"ہاں۔ بالکل۔"

"پھر؟" ایلی کا سر بھڑ کے ڈنک کی طرح بھن بھن کر رہا تھا۔

"ڈر سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔" آصف نے جواب دیا "اور میں بھاگا کہ کوئی وہاں دیکھ نہ لے۔"

"اور وہ۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہ ویسے ہی کھڑی تھی جیسے سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ ہو۔ سر کٹا مجسمہ"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ایلی تنکے سے زمین کریدنے لگا اور آصف دیوار سے سہارا لگا کر [illegible] گیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

"ایلی۔" دیر کے بعد آصف گنگنایا۔

"ہاں۔" ایلی چونکا۔

"اس کا جسم اتنا خوبصورت ـــــ" شدت جذبات سے آصف کی آواز رک گئی۔

"آصف۔" دفعتاً ایلی اٹھ بیٹھا۔ "تم اب جاؤ۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"ایلی" ـــــ آصف چلایا۔

"اب تمہیں جانا ہی ہو گا۔ میں شام کی گاڑی سے علی پور جا رہا ہوں۔"

"ایلی۔ ایسا نہ کرو۔" آصف نے منت سے کہا۔ "میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"نہیں۔" ایلی بولا۔ "اب تمہیں اسے اپنانا ہی ہو گا۔" اور وہ نیچے اتر کر سامان باندھ

"ایلی ـــــ" آصف نے آخری بار اسے پکارا۔ لیکن وہ زینہ میں پہنچ چکا تھا۔

"اگر تم سیدھے گھر نہ گئے آصف تو میں تم سے کبھی نہ بولوں گا۔" یہ کہہ کر ایلی گلی میں اتر گیا۔

آصف نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

✻✻✻

دیوانگی

زندگی کا موڑ

اس روز آصفی محلے کی طرف جاتے ہوئے ایلی پہلی مرتبہ لوگوں کی نظریں بچا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اگرچہ طبعی طور پر وہ لوگوں پر چڑھنے سے گھبراتا تھا لیکن محلے کی اور بات تھی۔ محلے میں وہ اہمیت محسوس کیا کرتا تھا۔ جب محلے کے کسی لڑکے کی آواز سنتا!

"آگئے بابو جی۔"

تو خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

محلے کے بازار میں سب سے پہلے حکیم بوٹا کی دوکان تھی۔ بوٹے کے انداز میں سکنجبین کی سی ترشی تھی۔ وہ ہمیشہ طنز بھری بات کرتا۔ لیکن ایلی کو بری نہیں لگتی تھی۔ بوٹے کے بعد حلوائی کی دوکان تھی ایلی کو دیکھتے ہی اس کے زرد دانت باہر نکل آتے۔

"آگئے بابو جی۔ نمستے مہاراج۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیتا۔

اس روز نہ جانے ایلی کو کیا ہوا تھا۔ ان جانے میں وہ چھپ چھپ کر گھر جا رہا تھا۔ کہ حکیم نہ دیکھ پائے۔ چاند دکان پر موجود نہ ہو۔ چاند اور حکیم کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ تھا کیونکہ رات پڑ چکی تھی۔ لوگ دکانیں بڑھا چکے تھے۔ بہرصورت نھو تمباکو فروش کی دکان پر حسب معمول جمگھٹا تھا اور وہ سب اندر بیٹھے ہوئے چوپٹ کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ پھر منہ دوسری طرف موڑ کر چپکے سے آگے نکل گیا۔ نھو کی دکان کی مشکل تو حل ہو گئی اب سردار دودھ والے کی دکان سے گزرنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس روز اس کی دکان پر کوئی بھی نہ تھا۔ بنچ خالی پڑا تھا جس پر محلے کے لوگ اکثر دیر تک بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپ ہانکا کرتے تھے۔ سردار خود بازار کی طرف پیٹھ کئے دودھ کی کڑاہی صاف کر رہا تھا۔

مسجد کے قریب پہنچ کر ایلی شاہ ولی کی خانقاہ کی چار دیواری کے سائے میں چلنے لگا تاکہ مسجد سے آتا ہوا کوئی بزرگ اسے نہ دیکھے۔ چوگان ویران پڑا تھا جس کے اوپر محلے کی کھڑکیاں یوں ٹمٹما رہی تھیں جیسے قبرستان میں یہاں وہاں دیئے جل رہے ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ وہاں رکا اور پھر ایک ہی جست میں چوگان کو پار کر کے چھتی گلی میں جا گھسا۔ اتنی رات گئے فرحت کے گھر کی اندھیری ڈیوڑھی سے گزرنا تو ممکن نہ تھا کیونکہ وہ دروازہ تو گھر والے سرشام ہی بند کر لیا کرتے تھے۔ شہزاد کی طرف سے جاتے ہوئے وہ گھبراتا تھا کیونکہ شہزاد کے چوبارے کی نچلی منزلیں میں سعیدہ رہتی تھی اور سعیدہ کے سامنے اوپر جانا' یہ اسے گوارا نہ تھا۔ سعیدہ کیا کہے گی۔ منہ سے نہ بھی کہے تو دل میں کہے گی۔ اللہ کرے سعیدہ کا دروازہ کھلا ہو تاکہ اسے کھٹکھٹانا نہ پڑے۔

دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چند ایک ساعت کے لئے نچلی منزل کا جائزہ لینے کے بعد وہ سائے کی طرح لپک کر اوپر کے زینے میں جا پہنچا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہ سیڑھیاں نہ جانے کتنی دیر میں طے کیں تاکہ سعیدہ یا شہزاد کو پاؤں کی چاپ سنائی نہ دے۔

سیڑھیوں میں چھپ کر اس نے ایک نگاہ شہزاد کے چوبارے پر ڈالی۔ چوبارے کے دروازے کے عین درمیان میں ایک چوکی پر سلائی مشین رکھے وہ کچھ سینے میں مصروف تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سیاہ تاروں والا دوپٹہ ایک شان بے نیازی سے اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ سیاہ دوپٹے میں اس کا سفید چہرہ کسی انجانی مسرت سے چمک رہا تھا۔ سیاہ سرمگیں آنکھیں لد آڑی ترچھی قندیلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور ماتھے کے عین درمیان میں سیاہ تلک آویزاں تھا۔ آدھی آستینوں والے بھرے بھرے بازو مشین پر لٹک رہے تھے۔

شہزاد کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھک سے رہ گیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ سنگ مرمر کا مجسمہ ہو۔ جیتا جاگتا مجسمہ۔ وہ ایک سپنا تھی۔ سندر سپنا۔ ایسا سپنا جس کی تعبیر کے متعلق اسے خود بھی علم نہ تھا۔

آہستہ آہستہ وہ شہزاد کی طرف بڑھا اور چپکے سے آنکھ بچا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور پھر اس کے لٹکتے ہوئے بازو کو گرفت میں لے کر دیوانہ وار چومنے لگا۔

شہزاد اسے دیکھ کر ڈر گئی۔

"ہائے تم ہو۔" وہ چلائی۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

ایلی نے اپنا منہ اس کے گورے ہاتھوں میں گاڑ دیا۔

"یہ کیا حماقت ہے۔" وہ اسے گھورنے لگی لیکن اس کی شیریں آواز میں مسکراہٹ واضح جھلک تھی۔ جیسے تیوری محض دکھلاوا ہو۔

"یہ کیا پگلا پن ہے۔" شہزاد نے اسے گھورا۔

"ہے پھر۔" وہ بولا۔ "کرلو جو کرنا ہے"۔

وہ ہنس پڑی: "اب پاگلوں سے کون لڑے۔"

"لڑ کر دیکھ لو۔ اگر ہمت ہے تو۔" ایلی نے کہا۔

"اونہوں"۔ شہزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا: "چپ وہ ——"

"کون ہے۔" ایلی گھبرا اٹھا۔ "کون ہے؟"

"جانو۔" وہ زیر لب بولی اور اس نے صحن کے پرلے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ اچھی جائے گی میں نے اسے گھر کا کام کرنے کے لئے پاس رکھ لیا ہے۔"

ایلی کی تمام تر مسرت مفقود ہو گئی اور وہ چپ چاپ یوں بیٹھ گیا جیسے اسے شہزاد کی ان ترچھی آنکھوں اس کے سیاہ دوپٹے اور گورے بازوؤں سے کوئی تعلق نہ ہو۔

"آخر آ ہی گئے تم۔" شہزاد زیر لب بولی۔

"آنا ہی پڑا"۔ ایلی نے کہا۔

"اور جو اتنی دیر وہاں ٹھہرے رہے۔ امتحان کے بعد وہ ——" شہزاد مسکرائی۔ "بولو —— جواب دو"۔

"تم نے جو کہا تھا۔ میں شکایت کردوں گی۔ یاد ہے کہا تھا ناں۔" ایلی ہنسا۔

شہزاد نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

"جھوٹ کہا تھا کیا۔" وہ آنکھیں چمکا کر بولی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو دو شمعیں روشن ہو گئی ہوں۔

وہ نگاہ اس کے لئے ایک نئی چیز تھی جس میں چمک کے علاوہ عجیب سی گرمی تھی جس کے زیر اثر اس کے خون میں حدت پیدا ہو جاتی تھی۔ کنپٹیاں تھرکنے لگتیں۔ آنکھوں میں خمار آتا اور پلکیں بوجھل ہو کر جھک جاتیں۔ اس ایک نگاہ سے ایلی نے محسوس کیا جیسے گردوپیش کو ایک سنہرے دھندلکے نے لپیٹ میں لے لیا ہو۔ جیسے تمام کائنات منور ہو گئی ہو۔ جیسے زندگی نے ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ وہ اس ایک بے پایاں نگاہ کے نشے میں سرشار نہ جانے کب تک بیٹھا

رہا۔ حتیٰ کہ جانو ہاتھ میں لوٹا لئے باہر نکلی اور اسے دیکھ کر چلائی:۔

"ایلی ہے۔ کب آیا ہے۔ کیا سکول چھوڑ دیا یا ویسے ہی چھٹی پر آیا ہے۔ اے ہے بولتا نہیں"۔ وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

"بولتا تو ہوں۔ کیا کہتی ہے تو۔" ایلی نے کہا۔

"کہاں بولتا ہے تو جیسے مدھک پی رکھی ہو۔ آنکھیں تو دیکھ اپنی"۔ جانو نے ہنس کر کہا۔

ایلی کو بات ٹالنے کی ترکیب نہ سوجھی' بولا: "تجھے دیکھ کر نہ جانے کیا ہو گیا ہے آنکھوں کو۔"

"کسی کی جرأت ہے کہ میری طرف دیکھے"۔ وہ غرائی۔ "دیدے نہ پھوڑ دوں۔ آج تک تو جرات نہ ہوئی کسی کو میری طرف دیکھنے کی۔"

شہزاد کی آنکھوں میں پھوار پڑنے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی: "یہ تو دیکھ رہا ہے روک لے اسے ورنہ سر چڑھ جائے گا۔ بات بڑھ جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ نفرت سے بولی۔ "یہ کیا سر چڑھے گا۔"

"ناک نہ چڑھا جانو۔" ایلی قہقہہ مار کر بولا: "پہلے ہی تیری ناک تلوار کی طرح تیز ہے۔"

"لے کر لے بات۔" شہزاد نے پھر وہی نگاہ ایلی پر ڈالی۔

"دفع کر ان آجکل کے چھوکروں کو۔ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے کے پرلے کونے کی طرف چل پڑی اور بڑبڑاتی ہوئی کام میں مصروف ہو گئی۔

شہزاد نے پھر وہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ ہونٹوں میں نہ جانے کیسی مقناطیسی جنبش پیدا ہوئی اور پیشانی کا تلک دفعتاً منور ہو گیا۔ ایلی کے دل میں نہ جانے کیا ہونے لگا اس کے جسم سے پھلجھڑی کی طرح انگارے نکلنے لگے۔

ایلی کا سر شانوں پر بھن بھن کر رہا تھا۔ شہزاد یوں انہماک سے سوئی میں تاگا پرو رہی تھی جیسے احساس ہی نہ ہو کہ پاس کون بیٹھا ہے۔ ایلی کی نگاہوں تلے شہزاد کے سر کے گرد ایک سنہری ہالہ چمک رہا تھا۔ دور جانو نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔

اس روز ایلی کو اپنی گزشتہ زندگی ایک دھندلا خواب محسوس ہونے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ از سر نو پیدا ہوا ہو۔ شہزاد کے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک نئی زندگی سے نوازا گیا ہو۔ جیسے اس نے زندگی کا پہلا موڑ طے کر لیا ہو اور اس کے طے کرتے ہی زندگی کی شکل کلیتہً بدل

گئی ہو۔ اتنی سی بات نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ صرف اتنی سی بات کہ اس نے
ہوئے بازوؤں کو تھام لیا تھا اور خفت سے بچنے کے لئے محبت کا ڈھونگ رچالیا تھا۔ زندگی
قدر عجیب تھی اور وہ زندگی کا موڑ کس قدر حسین تھا۔

جانو

نہ جانے شہزاد کو کیا ہے۔ ایلی سوچنے لگا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اس قدر قریب آ جاتی ہے
کہ نسوں میں تھرکتی محسوس ہوتی ہے۔ پہلو میں دھڑکتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ گرمی کی
طرح بند بند میں رینگتی ہے اور کبھی یوں دیکھتی ہے جیسے کوسوں دور ہو۔ جیسے اسے ایلی کے
کا بھی شعور نہ ہو۔ احساس ہی نہ ہو کہ ان دونوں میں کوئی بندھن ہے۔

صرف نگاہ ہی نہیں اس کی خاموشی بھی ایسے ہی اثرات کی حامل تھی۔ کبھی وہ آنکھیں
کر کام میں لگ جاتی تو کبھی ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اس پر جھکی ہوئی ہو جیسے اس کے جسم
گرمی اسے پگھلا رہی ہو۔ جیسے اس کا نرم و گداز جسم اس سے مس ہو رہا ہو۔ مگر کبھی جب
آنکھیں جھکائے کام میں مصروف ہوتی تو گویا وہ برف کا ایک تودہ بن جاتی۔ اس کے انگ انگ
سے بیگانگیت کی لہریں نکلتیں اور ایلی کو منجمد کر دیتیں۔ اور وہ اضطراب اور گھبراہٹ سے پہلو
بدلنے لگتا۔ نہ جانے یہ خصوصیت صرف شہزاد میں ہے یا سبھی عورتوں میں ہوتی ہے
بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا کیا سبھی عورتوں کے کئی ایک روپ ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب آن میں
بن جاتی ہیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب شہزاد سے قرب کا احساس حاصل ہوتا تو
کے لئے سانس لینا بھی پر لذت ہو جاتا لیکن جب وہ بیگانگیت کا روپ دھارتی تو ایلی کے دل
از سر نو احساس کمتری جاگ اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے آپ کو کوستا۔

"اب تو چائے پیئے بغیر نہ جائے گا کیا؟" جانو نے اس کے قریب آ کر کہا۔

وہ چونکا۔

"تو ابھی تک یہیں ہے"۔ ایلی نے پوچھا۔

دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر جانو سر ہلانے لگی۔

"تو کیا چلی جاؤں۔ اچھی نہیں لگتی تجھے"۔

"نہیں نہیں۔ اچھی لگتی ہے تو۔" ایلی نے پینترا بدلا۔ "بہت اچھی لگتی ہے۔"

"نہ مجھے نہیں اچھا لگتا یہ مذاق۔" جانو بولی۔

"تجھ سے نہ کرے تو کس سے کرے مذاق۔" شہزاد نے کہا۔

"کیوں۔ کیا ماں بہن سے کرے گا مذاق۔ سچ ہے آخر بیٹا کس کا ہے۔ علی احمد کا ہی ہے نا"

"کیوں۔" وہ چمک کر بولا۔ "علی احمد نے کیا کیا تھا مذاق۔"

جانو گالیاں دینے لگی۔

"شرم نہیں آتی جو منہ میں آیا بک دیا۔"

"تو پلا دے اسے چائے تو خاموش ہو جائے گا۔" شہزاد نے ویسے ہی بے پرواہی سے کہا۔

اور جانو چائے بنانے لگی۔

جانو عرصہ دراز سے آصفی محلے میں مقیم تھی۔ وہ آصفی نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں سے تھی
جو باہر سے آ کر محلے میں رہنے لگے تھے۔ جانو کا خاوند عرصہ دراز سے فوت ہو چکا تھا۔ اور اب
دونوں ماں بیٹی کا گزارہ محلے والوں کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی
ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ کام کاج نہ بھی ہوتا تو بھی محلے والے جانو کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔

جانو کا رنگ کھلا کھلا تھا۔ نقوش ستواں تھے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ جوانی کے دنوں
میں بے حد حسین ہو گی۔ اگرچہ اب اس کے حسین نقوش پر ضبط کی کرختگی کی مہر لگی ہوئی
تھی۔ محلے والے جانو کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے کے باوجود اس
نے اپنی تمام زندگی پاکبازی میں گزاری تھی۔ محلے میں کسی شخص نے کبھی اس پر انگلی نہ اٹھائی
تھی۔ محلے والے اس کی شرافت کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے اور جانو اپنی اہمیت کا احساس اس پاک
دامنی سے اخذ کرتی تھی اور اسی وجہ سے ہر کسی سے پاک دامنی کا مطالبہ کرنے کی عادی ہو چکی
تھی۔ اس کی آواز میں کرختگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے مزاج میں درشتی اور لاابالیت تھی۔ محلے
کے لوگ اس کی سخت مزاجی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ خصوصیات انہوں نے بذات
خود اس میں پیدا کی تھیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار سے جانو پر عائد
کر دیا تھا کہ وہ کسی سے ملائمت اور التفات سے بات نہ کرے کیونکہ اس کی تمامتر عظمت
اجتناب پر قائم کی جا چکی تھی۔ بہر حال جانو کو یہ احساس نہ تھا کہ لوگوں نے اس کے متعلق ایک
رائے قائم کر کے دراصل اسے زندگی کے اثباتی پہلوؤں سے محروم کر دیا ہے۔

چونکہ جانو کی تمامتر اہمیت "دامن ترکمن ہشیار باش" پر مبنی تھی اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی

کہ وہ "دامن تر مکن ہشیار باش" کی تلقین کرنے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے۔ اپنی
زندگی کو سنوارنے کے بعد اب وہ دوسروں کی زندگی کو سنوارنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اسی
سے ہر جوان لڑکی یا مٹیار حسینہ کو بات بات پر ہدایت کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی عادت
وجہ سے محلے کی بوڑھیاں اسے بہت اچھا سمجھتی تھیں اور محلے کی جوان عورتیں اس کی
محتاط ہو جاتی تھیں۔ اور ایسا برتاؤ اختیار کر لیتیں کہ وہ زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہرے
واضح اشارات کا جانو پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان خصوصیات کو رکاوٹ
جن پر اس کی اہمیت کا تمام تر دارومدار تھا۔

مطعون محبوبہ

شہزاد محلے کی فضا میں پل کر جوان نہ ہوئی تھی اس لئے وہ محلے کی رسومات اور آمنی
کی تفصیلات سے نہ تو واقف تھی اور نہ انہیں اہمیت دیتی تھی۔ وہ طبعاً ان تفصیلات سے بے
نیاز تھی اور اپنی طبیعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی قائل تھی۔ شہزاد کو کبھی نہ سوجھی تھی
ماحول کا تقاضا کیا ہے۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کیا اندازہ لگائیں گے۔
لوگوں کی اہمیت کا شعور ہی نہ رکھتی تھی۔ رکھتی بھی کیسے اس کے اپنے میاں برائے نام ہی
بلکہ طبعاً شریف واقع ہوئے تھے اور شریف خاوند اسے کہتے ہیں جو بیوی کی ہر بات پر سر تسلیم
خم کر دے۔

شریف نے سر تسلیم خم کرنے کا ایک انوکھا بہانہ ایجاد کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ
حقیقی میں ڈوب کر اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ
باتوں پر غور کر سکے۔ اگرچہ شہزاد کا حسن دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہراتی تھی اور ہونٹوں
لعاب ٹپکنے لگتا تھا لیکن وہ تو قطعی طور پر اور بات تھی۔ دلچسپی کے اس فقدان کے علاوہ شریف
شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو شہزاد کے دل میں اس کی عظمت کا احساس پیدا کرتی
شریف کی خوشنودی کے لئے ذاتی محسوسات کے چکر سے نکلنے پر مجبور کرتی یا شریف کو
ابھارتی۔ وہ تو شہزاد کی آمد سے پہلے جیتے جا چکے تھے اور اس حد تک جیتے جا چکے تھے کہ
سرِ نو جیتنے کی کوشش سراسر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر وہ یہ ظاہر کیا کرتے کہ
کے عادی ہو چکے ہیں مگر وہ محض ایک دل بہلاوہ تھا۔ درحقیقت وہ طبعاً سر جھکا دینے

عملی طور پر شہزاد کے سامنے بھی سر جھکا چکے تھے۔
نے لور عرصہ دراز سے
لن حالات میں شہزاد کو اپنی ذات سے ہٹ کر سوچنے یا سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے
آمنی محلے میں آ جانے کے باوجود وہ محلے کے تقاضوں سے بے نیاز رہی۔ محلے والوں کو دیکھ کر
اس نے کبھی دوپٹہ یا نگاہیں سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ بات کرنے سے پہلے کبھی نہ سوچا کہ سن
کر لوگ کیا کہیں گے اور غالباً اسی وجہ سے وہ محلے بھر کی محبوبہ بن چکی تھی۔
نوجوان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے اور سر دھنتے۔ وہ محسوس کرتے کہ شہزاد میں وہ زندگی
کو صحیح شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ دکھلاوے اور رسم سے آزاد بے پروا بلند و بے نیاز۔
محلے کی لڑکیاں حیرت سے اس کی طرف دیکھتیں اور منہ میں انگلی ڈال کر رہ جاتیں۔ ابتدا
میں تو محلے کی بوڑھیاں بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں احساس
ہونے لگا کہ جوانی کے قائم کردہ اصولوں پر نہ چلے وہ اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود
شہزاد کی معصومیت اس کے اخلاق اور اس کی طبعی فیاضی کی وجہ سے انہیں شہزاد سے مل کر ان
اصولوں کے باوجود خوشی محسوس ہوتی تھی۔ پھر جب وہ چلی جاتی تو ان کو غصہ آنا شروع ہو جاتا۔
—— توبہ کتنی بے پروا لڑکی ہے —— وہ محسوس کرتیں جیسے انہیں دھوکا دیا گیا ہو اور فریب
سے خوش کر لیا گیا ہو۔ پھر ان کی زبانیں حرکت میں آ جاتیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ کسی
نہ کسی بہانے شہزاد کی بے پروائی اور جرات پر نکتہ چینی کرتیں۔

"توبہ۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ اب تو کل کی چھوکریاں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے لگی ہیں۔
ابھی یہاں تھی اور یہ لو اب اوپر چوبارے سے بول رہی ہے جیسے پاؤں تلے پہیے لگے ہوئے
ہوں۔"

"اور بن اللہ ماری یہ سیڑھیاں جو ہیں۔ انہیں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر چڑھنا بھی تو ممکن
نہیں۔"

"یوں چڑھ جاتی ہے جیسے پانی کا گلاس پی لیا۔"

"توبہ ماں یہ تو بھلا سیڑھیاں ہیں۔ وہ تو نگاہوں پر چڑھی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر بات کرتی ہے۔ ذرا نہیں جھجکتی۔"

"کوئی زمانہ آیا ہے ماں۔ پر شکر ہے اپنے محلے کو ہوا نہیں لگی۔"

"اللہ بچائے لڑکی۔ یہاں پھر بھی اللہ کا فضل ہے بس یہ باہر سے آنے والیاں ہی جل کو گندا

کرتی ہیں ہاں میں تو سچ کہوں گی۔"

نہ جانے شہزاد کو ان باتوں کا علم تھا یا نہیں لیکن اس کے برتاؤ سے کبھی ظاہر نہ ہوا تھا
کی عورتوں کو دیکھ کر وہ یوں کھل جاتی جیسے نوخیز کلی ہو۔ ان کی ہر ضرورت کو فراخدلی سے
کرتی لیکن اس کے علاوہ اسے ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف دو چار گھرانوں سے اس کا میل
جول تھا اور وہ بھی محض سرسری۔ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ کوئل کی طرح چہکتی:

"کیوں چچی۔ آج تو بہت مصروف نظر آتی ہو۔ کیا چچا امرتسر سے آ گئے۔"

چچی منہ میں انگلی ڈال لیتی:

"ہائے اللہ۔ اس لڑکی نے کیا کہہ دیا۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔" اس کے باوجود اس
حقیقت کا اظہار سن کر چچی کے چہرے پر مسرت کی ایک رو دوڑ جاتی۔

محلے والیوں کے لئے شہزاد کی باتیں انوکھی ہونے کی وجہ سے بے حد جاذب تھیں اور اسی
جاذبیت کی وجہ سے وہ اس پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔

جانو کے شہزاد کے گھر میں آنے کو ایلی نے بہت برا مانا۔ جانو کی موجودگی کی وجہ سے اس
شہزاد کے پاس بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جانو کیا کہے گی۔ یہ یہاں کیوں بیٹھ رہتا ہے۔ اپنے گھر کیوں
نہیں جاتا۔ اور پھر جانو تو منہ پر کہہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ وہ تو براہ راست
سے کہہ دے گی۔ اسے نہ لگایا کر منہ ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ اللہ رکھے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔
کیا بچہ ہے جو ہر وقت تجھ سے چپکا رہتا ہے' لیکن شہزاد کو یہ بات سوجھی تک نہ تھی۔ شہزاد
کی بات کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی جب وہ ایسے مسائل چھیڑ لیتی تو شہزاد چپکے سے کسی کام
مشغول ہو جاتی۔ غالباً" اس نے کبھی جانو کی بات کو سنا ہی نہ تھا اگرچہ اس وقت وہ بے توجہی
ہاں ہاں کرتی رہتی۔

ادھر جانو جب سے شہزاد کے پاس آئی تھی اس کی یوں رکھوالی کرنے لگی تھی جیسے شہزاد
کی ایجنٹ ہو اور شہزاد کو نظر بد سے بچانے کے لئے متعین کی گئی ہو۔ وہ شہزاد کی آدمی
کو دیکھ کر ناک منہ چڑھاتی:

"اے ہے۔ یہ کیا ننگی باہیں لئے پھرتی ہو تم خواہ مخواہ اپنا گورا رنگ چمکاتی ہو
آستینیں تو پوری ہونی چاہئیں جو باعزت عورتوں کو سجتی ہیں۔"

اس پر شہزاد مسکرا کر کہتی:

"ہے نا۔ اچھی لگتی ہیں نا۔ وہ بھی کیا کہ آستینیں جو ہاتھوں پر لٹکتی رہیں۔ اچھا اب چائے بنا
جا کر۔"

شہزاد کے اس انداز کو پہلے پہل تو جانو سمجھ نہ سکی۔ شہزاد کی باتیں سن کر اسے سمجھ میں
نہیں آتا تھا کہ جواب میں کیا کہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ شہزاد کے انداز سے مانوس ہوتی گئی اور
آپ ہی آپ بڑبڑانے میں وقت بسر کرنے لگی۔

ایلی حیران تھا کہ شہزاد کی باتوں پر سیخ پا کیوں نہیں ہوتی۔ اسے غصہ کیوں نہیں آتا۔ وہ بات
ہنس کر کیوں ٹال دیتی ہے۔ پیشانی پر شکن تک نہیں آتا بلکہ بسا اوقات وہ اس کی بات سنتی ہی
نہیں جیسے جانو جھک مار رہی ہو۔

دکھیا مینا

چائے بنانے کے بعد جانو اپنا کھانا برتن میں ڈال کر گھر چلی گئی اور وہ دونوں اس دالان میں
اکیلے رہ گئے۔ شہزاد کے ساتھ اپنے آپ کو اکیلے پا کر ایلی کا دل دھڑکنے لگا لیکن اس کے باوجود
شہزاد خاموشی سے اپنے کام میں یوں لگی رہی جیسے اسے ایلی کے وجود کا علم ہی نہ ہو۔

"شہزاد۔" ہر دو منٹ بعد ایلی زیر لب اسے آواز دیتا۔ "شہزاد"۔

"ہوں۔" وہ جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیتی۔ "کہو۔ کیا کہتا ہے۔" اس کی آواز میں
عجب سی بیگانگی ہوتی جیسے وہ شہزاد ہی نہ ہو جس نے اس پر وہ نگاہ ڈالی تھی۔

"ادھر دیکھو ناں"۔ وہ منت سے کہتا۔

"کیا دیکھوں؟" وہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ "کیا ہے دیکھنے کو یہاں؟"

"اخوہ۔ ایلی چلاتا۔ "اتنی بے پرواہی۔"

"کیا ہے؟" کچھ دیر کے بعد شہزاد نے سر اٹھایا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ زمین میں
گڑا ہوا ایک پتھر ہو۔

"بتاؤ نا کیا کہتا ہے۔"

ایلی نے جھپٹ کر اس کا بایاں بازو تھام لیا۔

"بس یہی کام تھا۔" وہ خشک آواز سے بولی اور بائیں بازو کو اس کے حوالے کر کے یوں کام
میں منہمک ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں کاٹھ کا

بازو ہو۔ بے کار۔ بے جان

"یہ کیا حماقت ہے۔" وہ بولی۔

"کیا حماقت؟" ایلی نے پوچھا۔

"اور کیا حماقت نہیں تو۔" شہزاد نے بازو کھینچ لیا۔ "بیٹھ کر باتیں کرو نا۔"

"کیا بات کروں؟" ایلی نے پوچھا۔

"کوئی بھی ہو۔" شہزاد بولی۔

اچھا۔" ایلی کو سوجھی۔ "تم اتنی پیاری کیوں ہو شہزاد؟"

"ہوں پھر۔ کرلو جو میرا کرنا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"کاش——— میں کچھ کر سکتا۔" ایلی نے آہ بھری۔

"کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بس!" وہ ہنسنے لگی۔

"مجھے اکسا رہی ہو۔" ایلی غصے میں بولا۔

"پیاریوں سے لڑا بھی کرتے ہو تم؟" شہزاد نے پوچھا۔

"لڑائی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں نہیں لگتی کیا؟"

"کس سے لڑوں۔ کوئی ہو بھی لڑنے کے لئے۔"

مجھ سے لڑو نا۔"

"تم سے کیا لڑنا۔" شہزاد مسکرائی۔

"اس سے لڑتی ہو کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"وہ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کی ہنسی میں تحقیر کی دھار تھی۔ "اسے آہیں بھرنے سے فرصت بھی ہو۔ وہ کیا لڑے گا۔ اور آجکل تو وہ ابا جان کے پاس گیا ہوا ہے۔"

"کیوں"۔ ایلی نے پوچھا۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں۔" وہ بولی۔ "بکرے کی جان گئی پر کھانے والی کو مزہ نہ آیا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" وہ منت سے بولا۔

وہ مسکرانے لگی: "تم کیا سمجھو گے؟"

"آخر بات کیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔" ایلی نے محسوس کیا جیسے بات اس کی ذات سے متعلق ہو۔

"میں کیا بتاؤں۔ انہیں سے پوچھ لینا کبھی۔"

"کس سے؟"

"ان سے یا سانوری سے۔" شہزاد نے ایک خصوصی انداز سے کہا۔

"سانوری سے؟"

"ہاں ہاں اسی سے۔ اب کیا بھول گئے اسے۔ ان دنوں جب وہ اس کوٹھے پر ٹہلا کرتی تھی اور تم ادھر چھت پر منہ پر کتاب رکھے پڑھنے کے بہانے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے کیا معلوم نہیں۔"

"شہزاد۔" ایلی ندامت سے چلایا۔

"اس بے چاری کو کیا پتہ تھا۔ وہ تو تمہارے تھیٹر پر ہی مر مٹی۔" شہزاد ہنسنے لگی۔ "تمہاری دھنیں گا گا کر رویا کرتی تھی۔"

"رویا کرتی تھی؟" ایلی حیران ہو رہا تھا۔

"اپنی طرف سے تو وہ محبت لگا بیٹھی تھی تم سے۔ اسے کیا معلوم تھا کیسے لگائی جاتی ہے محبت نہ جانے کونسی بات پسند آگئی تھی اسے تمہاری۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو وہ سب اسے چھیڑنے لگے۔ اس وجہ سے وہ اور بھی ضد میں آگئی اور اس نے اماں سے صاف کہہ دیا میں ایلی سے شادی کروں گی۔" شہزاد ہنسنے لگی۔ "ان دنوں مجھے کیا خبر تھی کہ ایلی"۔ وہ بامعنی انداز سے رک گئی۔ پھر اس نے بامعنی نگاہ اس پر ڈالی۔ "کیا پتہ تھا۔" وہ ہنسنے لگی۔

ایلی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ شہزاد ہنسنے لگی۔

"بے چاری نے بڑے بڑے طعنے سنے تمہارے لئے۔ سارے گھر والوں کی نکو بن کر رہ گئی۔ اماں تو اسے آنکھیں دکھاتی تھی۔ تمہارا نام سن کر اماں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ نہ جانے کیوں جیسے تم سے کوئی بیر ہو۔"

"کیوں۔ میں نے تمہاری اماں کا بگاڑا تھا۔" ایلی نے کہا۔

"جب تو نہیں بگاڑا تھا مگر اب تو ———" اس نے ایک بار ایلی کو پھر اسی نگاہ سے دیکھا۔ دو روشن دیئے اس کی طرف لپکے۔

"شہزاد۔" اس کے بازو کا سہارا لینے کے لئے ایلی آگے بڑھا۔

"پھر بات ابا تک پہنچ گئی۔" شہزاد نے دفعتاً انداز بدلا۔ "اور انہوں نے فوراً مشورہ کر کے

سانوری کا رشتہ کر دیا۔ زبردستی۔"

"کس کے ساتھ۔" ایلی نے پوچھا۔

"نہ جانے کون ہیں۔ کہتے ہیں کوئی ایس ڈی او کا لڑکا ہے مگر مجھے تو نہیں دکھتا ایس ڈی او
تمہارے شریف صاحب نے بھی ابا کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اب وہ بے چاری اپنی قسمت کو
رہی ہے وہاں۔"

"میں تم سے کیا مذاق کروں گی۔" وہ بولی۔ "مذاق تو اس بے چاری کا اڑ گیا جو تم سے
کی بات بھی نہ کہہ سکی۔ بے چاری نے کئی ایک بار خط بھی لکھا تھا مگر تمہارا پتہ معلوم نہ تھا
وہ ڈرتی تھی کہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ پھر جب اس نے سنا کہ تم اس امرتسر والی لڑکی
کے لئے پاگل ہو رہے ہو تو دل ٹوٹ گیا۔ میرے پاس رویا کرتی تھی۔"

"شہزاد" ایلی نے اپنا سر اس کے بازوؤں پر رکھ دیا۔

"اور آج تم میرے بازو سے لپٹے ہو۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ
قہقہہ اسے چھری کی طرح چیرتا جا رہا ہو۔

"مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" دفعتاً شہزاد کا انداز بدل گیا۔

"تمہیں میرا کوئی خیال نہیں کیا۔" اس نے پوچھا۔

"مجھے کسی کا بھی خیال نہیں"۔ وہ بولی۔

"تمہیں شریف کا خیال ہے ناں۔ میں جانتا ہوں۔" ایلی کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی
تھیں۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اس کا کلیجہ چاٹ رہا ہو۔

"تمہیں شریف سے محبت ہے نا؟؟"

"یونہی سمجھ لو۔" ایلی چلایا۔ "میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔"

"سیانے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔" شہزاد بولی۔

"سیانا ہوتا تو تمہارے لئے یوں پاگل نہ ہوتا۔" ایلی نے کہا۔

"سچ ایلی۔ ایک بات پوچھوں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "تمہیں مجھ سے محبت جتانے کی کیا
سوجھی؟"

"تمہارا مطلب ہے میں فریب کر رہا ہوں۔" ایلی نے بناوٹی غصے سے کہا۔

"نہیں نہیں۔" وہ چلائی۔ "میرا مطلب ہے۔" اور پھر رک گئی۔

"میں سمجھتا ہوں تمہارا مطلب۔" وہ اٹھ بیٹھا اور فرحت کی طرف چل پڑا۔

"ایلی۔" شہزاد نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا۔

مگر ایلی کے لئے واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا۔

اتنے قریب اتنے دور

اس رات وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کے شکوک اور
توہمات بھڑوں کے چھتے کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ سینہ سلگ رہا تھا۔ کلیجہ کوئی مسل رہا تھا۔ چاروں
طرف سے لہریں سی اٹھ رہی تھیں جو ہر ساعت مزید شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ کیا یہی
محبت ہے جس کے لئے وہ اس قدر بیتاب تھا۔ کیا یہی وہ محبت ہے جس کی شریف اسے تلقین کیا
کرتا تھا۔

"محبت کرو ایلی محبت۔" وہ اس کے روبرو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "محبت کرو ایلی چاہے کسی سے
کرو۔"

لیکن شریف کی اپنی کیفیت تو ایسی نہ تھی۔ وہ تو اس طرح کروٹیں نہیں بدلتا تھا۔ وہ تو بڑے
اطمینان سے منہ میں حقے کی نے لیے لیٹا چھت کو تکتا رہتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مبہم
مسکراہٹ کھیلا کرتی تھی۔ اور اس کی آنکھیں گویا ہر وقت نشے میں رہتی تھیں۔ —— نہیں
نہیں یہ محبت نہیں۔ نہ جانے کیا ہے محبت۔ نہیں محبت تو ایک خمار ہوتی ہے۔ ایک نشہ' ایک
کیفیت!

دراصل اسے شہزاد کے برتاؤ کے متعلق کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی وقت تو وہ ایلی سے
اس قدر قریب آ جاتی کہ وہ محسوس کرتا جیسے دونوں ایک جان دو قالب ہوں۔ اس وقت اس کے
دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ فاتح ہو۔ جیسے اس نے دنیا کی بہترین
نعمت' بہترین لذت کو پا لیا ہو۔

لیکن جلد ہی منظر بدل جاتا اور دوسری ساعت میں شہزاد اس سے کوسوں دور چلی جاتی۔ جیسے
اس کے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ جیسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور
پر بیگانہ ہوں۔ اس بیگانگیت کو وہ روح کی گہرائیوں میں شدت سے محسوس کرتا اور اس کا جی

چاہتا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دے۔ چیخیں مار مار کر رو دے اور پھر کوئی اکتارہ پکڑ کر دنیا کے
کونے کونے میں بے وفائی کے گیت گاتا پھرے۔

اسے خیال آتا کہ شہزاد کا محبت کا روپ محض ایک دکھلاوا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ لاحول
آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ ایک بدصورت بے ڈھنگے چھوکرے سے محبت کرے۔ کوئی کم عمر
لڑکی ہوتی تو بھی بات قابل قبول ہوتی۔ لیکن شہزاد —— وہ تو جس کو چاہتی اپنے روبرو جھکا
تھی۔ شاید اس کا مقصد صرف لوگوں کے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ لوگوں کو تسخیر کرنے
کے علاوہ کوئی مقصد نہ ہو۔ اس خیال پر ایلی کے تصور میں شہزاد کرشن بھگوان کی طرح مرلی اٹھائے
ایک انداز سے کھڑی ہو جاتی اور اس کے گرد سینکڑوں سر جھکے دکھائی دیتے۔ اور پھر ایلی ان
دیکھے سروں کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ یہ خوش نصیب کون ہے۔ وہ کون ہے
اس کے دل میں وہم اٹھتے اور وہ سوچنے لگتا شاید رفیق وہ خوش نصیب ہو۔ جبھی تو شہزاد اسے
دیکھ کر مسکرایا کرتی ہے اور گھنٹوں کسی کونے میں' سیڑھیوں پر' منڈیر یا جنگلے پر اس کے سامنے
کھڑی رہا کرتی ہے۔ مگر کسی وجہ سے اسے یقین نہ پڑتا کہ رفیق شہزاد کے لئے جاذب توجہ ہو سکتا
ہے۔ اس کی جیب کے ریشمیں رومال' پریم شاستر اور سینٹ کی شیشی اور اس کی آنکھوں سے
پڑتی ہوئی بنفشی پھوار کے باوجود جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ رفیق میں تھا ہی کیا —— نہیں نہیں
—— تو پھر؟ —— ایک سوالیہ نشان اس کے روبرو آ کھڑا ہوتا۔ پھر وہ نشان شریف کی شکل
اختیار کر لیتا۔ ضرور اسے شریف سے محبت ہے جبھی تو اس پر مینڈک پھینکا گیا تھا۔ جبھی تو اس کی
آمد پر شہزاد کی چال تک بدل جاتی ہے اور وہ سیڑھیاں اتر کر چھم سے رک جاتی ہے:

"ایلی وہ بیٹھے چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

اس پر ایلی احساس رقابت سے لوٹنے لگتا اور اس کے سینے میں ایک جلن سی ہونے لگتی۔
رات بھر وہ اسی طرح دیوانہ وار کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے قریب تھک کر سو گیا۔
جب وہ چائے پی رہا ہوتا تو سیڑھیوں میں —— چھم کی آواز سنائی دیتی اور شہزاد رقص کرتی
ہوئی اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی اور مسکرا کر کہتی:

"وہاں کب سے چائے بنی ہوئی ہے اور ایلی تم یہاں بیٹھے ہو۔ آؤ نا۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرا کر وہی نگاہ اس پر ڈالتی اور وہ اپنے تمام وہم اور عزم بھول کر پالتو کتے کی
طرح اس کے پیچھے چل پڑتا۔

اس پر فرحت چلاتی:
"لے تو تو ایلی کو انگلی سے پکڑ کر لے چلی نا۔" اس کی بات میں دھار ہوتی تھی۔
مگر شہزاد گویا بہری بن جاتی تھی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ "اپنی خیر منا۔" وہ چلاتی۔ "کسی روز تجھے
انگلی سے پکڑ کر نہ لے جاؤں۔"
"مجھے کون انگلی پکڑ کر لے جاتا ہے جی۔" فرحت زیر لب کہتی۔
"تم تو آنکھیں دکھاتی ہو ورنہ لے ہی چلوں کبھی۔" شہزاد ہنستی۔
اور بات ہنسی میں ٹل جاتی۔
پھر ہاجرہ مظلوم انداز میں شہزاد کے چوبارے کی چوکھٹ پر آ کھڑی ہوتی:
"کب آئے گا تو ایلی؟"
"نہیں ویسے پوچھ رہی تھی۔ جلدی آ جانا ایلی۔ فرحت کھانے پر انتظار کرتی رہتی ہے۔"
"ٹھیک تو ہے۔" شہزاد ہنس کر کہتی۔ "یہاں قحط پڑا ہوا ہے۔ کھانے کو تو صرف وہیں ملتا
ہے فرحت کے ہاں۔"

اور وہ دونوں دو بچوں کی طرح بیٹھ کر گپیں مارتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔
اور جانو انہیں دیکھ کر باورچی خانے کے برتنوں کو گھورتی اور آخر زیر لب کہتی۔ "لو بیٹھو
گے بھی چھنو منو۔ یوں بھاگے دوڑے پھرتے ہیں جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ میں کہتی ہوں
لوگ دیکھ کر کیا کہتے ہونگے۔"

"جو ان کے جی چاہے وہ کہیں۔ جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے۔" شہزاد ایلی کی طرف
وہی نگاہ ڈالتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس ایک نگاہ کے سہارے وہ ساری دنیا کے خلاف یدھ
کرنے کے لئے تیار تھا۔ جانے اس نگاہ میں کیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایلی کو سبھی کچھ بھول جاتا تھا۔
اسے رات بھر کی گریہ وزاری بالکل ہی بھول جاتی۔ اس کے ذہن میں کوئی سوالیہ نشان نہ رہتا
اور وہ سمجھتا کہ زندگی واقعی قابل زیست ہے۔
جانو شہزاد کا جواب سن کر بظاہر چپ ہو جاتی مگر وہ شکایت دن بھر اس کے انداز میں گویا بوند
بوند رستی رہتی۔ اس کی چال سے' اس کے سر ہلانے کے انداز سے' اس کے ہونٹوں کے خم
سے' اس کی ہر بات سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں جانتی مگر وہ دونوں جانو کے
اس اظہار سے بے نیاز بیٹھ کر چائے پیتے اور گپیں ہانکتے اور بہانے بہانے ایک دوسرے کو دق

کرتے۔ پھر جونہی جانو کسی کام کے لئے چوبارے سے نیچے اتر جاتی تو دفعتاً" ان کی
باتیں ختم ہو جاتیں۔ ایلی شہزاد کی طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے بچہ ہو۔ اور اس کے سامنے
مٹھائی کی ایک تھالی۔ اس کی بدلتی ہوئی نگاہ دیکھ کر شہزاد دفعتاً" سنجیدہ ہو جاتی اور پھر کسی
مصروف ہو جاتی اور یوں ایلی کے وجود سے بے نیاز ہو جاتی جیسے اس سے کوئی واسطہ نہ
دیکھ کر ایلی کے دل میں غصے کا ایک طوفان کھولتا اور وہ پاگلوں کی طرح شہزاد کی طرف

"خدا کے واسطے۔" وہ زیر لب سنجیدگی سے کہتی۔ "جانو آ جائے گی۔"

"نہیں نہیں۔" ایلی چلاتا۔ "وہ تو ابھی گئی ہے۔"

"کوئی اور آ جائے گا۔ ہوش کرو۔" شہزاد اسے گھورتی۔

"اور تم تو کہتی تھیں۔ ایلی کیا لوگوں سے ڈرتے ہو۔ یاد ہے؟" ایلی کہتا۔

"تم سمجھتے تو ہو نہیں۔" شہزاد کی آواز میں درشتی پیدا ہو جاتی۔

اس پر ایلی کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ گہرے فکر میں پڑ جاتا اور ایک سوالیہ نشان
کے سامنے ابھرنے لگتا۔

اس طرح تخلئے میں وہ دونوں بیگانہ وار ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے رہتے۔ شہزاد
جانے کونسے افق میں کھوئی رہتی اور ایلی اس کی طرف پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا
اس کا بازو تھام لیتا اور وہ اسے یوں اس کے حوالے کر دیتی جیسے بچے کو بہلانے کے لئے
کھلونا ہو اور خود بے نیاز ہو جاتی جیسے وہ بازو اس کا اپنا نہ ہو۔ کچھ دیر تک تو وہ اس بے جان
سے کھیلتا رہتا۔ پھر اسے احساس ہونے لگتا کہ اس بازو سے شہزاد کا دور کا واسطہ نہیں۔ پھر
ایک اضطراب گھیر لیتا اور وہ شہزاد کے قریب بیٹھ کر محروم محسوس کرتا اور محرومیت کی وجہ
قرب کی بنا پر کروٹیں بدلتا اور کڑھ کڑھ کر اپنی جان ہلکان کر لیتا حتیٰ کہ کوئی آ جاتا اور شہزاد
کی چاپ سنتے ہی اس سے اپنا بازو چھڑا کر دور ہو بیٹھتی اور پھر ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ اس کی
طرف خاص انداز سے دیکھتی۔ وہی انداز۔ اس طرح وہ تنہائی میں قرب کے باوجود ایک
سے دور رہتے اور محفل میں دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے۔

ایلی کی صرف ایک خواہش تھی کہ وہ شہزاد کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب
شہزاد اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہی مسکراہٹ۔ باہمی سازش کی مسکراہٹ۔ اور تنہائی
بھی وہ اس کے اس قدر قریب ہو جاتی کہ دونوں میں ذرا فرق نہ رہے۔ اس کے علاوہ

طور پر کوئی آرزو نہ تھی۔

ایلی کو کسی مخصوص جسمانی قرب کا خیال نہ تھا بلکہ اسے اس قرب سے ڈر لگتا تھا۔ وہ
محسوس کرتا تھا کہ وہ اس قابل نہیں کہ شہزاد کے ساتھ وہ قرب حاصل کر سکے۔ اسے اپنے آپ
پر بھروسہ نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس قربت کی نوبت آ گئی تو وہ بری طرح سے ناکام رہے گا۔
اور پھر شہزاد کیا کہے گی۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اسے ایسے قرب سے نفرت تھی۔ اس کے خیال
میں ایسا قرب محبت کے جذبہ کے لئے باعث ننگ تھا۔ محبت کی توہین تھا۔ پھر شہزاد سی پاکیزہ دیوی
سے۔ نہیں نہیں ——— یہ کبھی نہیں ہو سکتا ——— اس خیال پر ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔

صبح چائے پی کر وہ دیر تک شہزاد کے پاس بیٹھا رہتا حتیٰ کہ مظلوم صورت بنائے ہوئے ہاجرہ
نمودار ہوتی:

"اے ہے فرحت کب سے انتظار کر رہی ہے کہ کھانا کھا لو۔"

"میں ابھی آیا۔" کہہ کر وہ ماں کو ٹال دیتا۔

اس پر جانو بڑبڑانے لگتی:

"توبہ کیا زمانہ آیا ہے اولاد کے دل میں ماں کا لحاظ نہیں رہا۔"

آدھ ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ پھر آ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ مجبور ہو کے اٹھ بیٹھتا اور بادل نخواستہ
ماں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

جب ایلی کھانا کھا رہا ہوتا تو سیڑھیوں میں وہی دھماچوکڑی کی آواز سنائی دیتی اور پھر چھم سے
شہزاد ہاتھ میں سالن کی پلیٹ لئے مسکراتی ہوئی آ موجود ہوتی۔

"وہ کریلے پکائے ہیں آج کہ چکھ لو تو طبیعت سنور جائے۔" وہ چلاتی۔

"کیوں نہ ہو جی ان ہاتھوں میں جادو ہے۔" فرحت طعنہ دیتی۔

"لوگوں کی تو ویسے ہی طبیعت سنور جاتی ہے۔" ہاجرہ فرحت کی ہاں میں ہاں ملاتی۔

"کیوں نہ سنورے جی۔" شہزاد یوں قہقہہ مار کر ہنستی جیسے اسے طنز کا احساس ہی نہ ہو پھر
شہزاد سیدھی ایلی کے پاس پہنچتی اور پھر چوری چوری وہی مسکراہٹ چھلکا کر زیر لب کہتی۔
"مہمان کیوں آیا ہے تو ———" پھر باآواز بلند چلاتی: "لے کھا کر دیکھ اپنی انگلیاں نہ چاٹ لیں
تو۔"

اس وقت چپکے سے شہزاد کا جناتی ہاتھ ایلی کے پہلو سے نکل کر اس کا گال سہلاتا اور ایلی کی

آنکھوں تلے تارے ناچنے لگتے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی: "دیکھ لے فرحت ایک ہی لقمے میں اُگلم اگل آئی ہیں ایلی کی۔"

فرحت زیر لب کہتی: "نہ جانے کیسا لقمہ دیا ہے تم نے۔"

"یہی تو ایک راز ہے۔" شہزاد نظر بچا کر ایلی کے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ "یہ کیسے ہلالہ اچھا میں چلی۔" اور وہ بھاگ کر سیڑھیوں میں غائب ہو جاتی۔

ایلی بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا گولا آ کر اس کے منہ پر لگتا اور ایلی کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ محسوس کرتا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ تلے سوالیہ کی بجائے استفہامیہ نشانات رقص کرتے۔

شہزاد کا وہ التفات بھرا لمس اس کے گال میں جذب ہو کر خون میں جا ملتا اور اس کی رگوں میں یوں لہریں لینے لگتا جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے پتھر پھینک دیا۔ ایلی کے لئے ہر کا لقمہ نگلنا مشکل ہو جاتا اور جلد ہی وہ کوئی بہانہ بنا کر شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑتا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگتا تو فرحت کوئی طنز بھری بات کہہ دیتی یا ہاجرہ مظلومیت بھرے انداز میں اسے ٹوکتی جس پر وہ غصے سے بھوت بن جاتا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔

جونہی ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچتا تو اس کی توقع کے خلاف وہاں کوئی اور ہی شہزاد بیٹھی ہوتی جیسے اس شہزاد سے دور کا کوئی واسطہ نہ ہو جو چھم سے زینے سے اتری تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ حنا مالیدہ ہونے کے باوجود بے جان ہوتے۔ اس کی آنکھیں دور نہ جانے کن مناظر میں کھوئی ہوتیں۔ وہ پتھر کے بھگوان کی طرح بیٹھی رہتی جیسے اسے ایلی کی آمد کا احساس تک نہ ہوا۔ ایلی اس پتھر کے بھگوان کے روبرو بیٹھ کر نہ جانے کہاں کھو جاتا یا اس بے جان کھلونے کی طرح جو شہزاد کے شانوں سے لٹکا کرتا تھا۔

دورخی

ان دنوں ایلی سارا سارا دن گھر میں چھپا رہتا اور گھر میں بھی وہ کھڑکی میں کھڑے ہونے سے احتراز کرتا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ نہ جانے کیوں دفعتاً اس کی زندگی میں پردہ داری کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ وہ علی پور آیا ہوا ہے۔ کوئی اس کا راز نہ پائے لیکن علی پور میں کسی بات کو چھپے رہنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

علی پور تو ایسی جگہ تھی جہاں سیاہ نانک شاہی اینٹیں آنکھیں موند کر سب کچھ دیکھتی رہتیں۔ اور پھر رات کے پردے میں بڑھا چڑھا کر ایک دوسری سے سب کچھ کہہ دیتیں۔ اینٹوں کی بات دروازے چاؤں چاؤں کر کے دہراتے جنہیں سن کر آوارہ کتے قہقہے لگاتے اور چمگادڑیں خوشی سے رقص کرتیں اور اندھیرے کونے باہر نکل نکل کر چمگادڑوں کی کتھا کلی دیکھتے۔ مسکرا کر پھر سے چھپ جاتے۔ پھر جب سورج کی پہلی کرن محلے کے مکانات کو روشن کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوتی تو محلے والے وہی بات چھیڑ دیتے۔ دبی دبی زبان سے بات پھسل نکلتی۔ انگلیاں ذرلالی انداز سے ابھر کر ہونٹوں پر ٹک جاتیں۔

"ہائے اللہ۔ یہ بات ہے؟"

"توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔"

"لو وہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی ناں۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔"

"پر سن لو تم بہن یہ کاٹھ کی ہنڈیا چار دن چڑھے گی بس۔"

"پر میں کہتی ہوں اسے شرم نہ آئی۔"

اگر ایلی اس راز کو اتنی اہمیت نہ دیتا تو شاید بات نہ بگڑتی۔ اور اگر بگڑتی بھی تو اس میں تعفن پیدا نہ ہوتا۔ اگر ایلی اس سلسلے میں محض ایک تفریح جانتا اور دیوی کی بجائے شہزاد کو محض ایک رنگین تتلی سمجھتا یا خوب صورت کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا تو بات یوں گل حکمت ہو کر خطرناک ہیولے پیدا نہ کرتی لیکن ایلی کو پیدائشی طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ایسے تفریحی تعلقات گناہ کے مترادف ہوتے ہیں۔ علی احمد کے کمرے کے خلاف اس نے جو بغض پال رکھا تھا اس کے اس خیال کو اور بھی مستحکم کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے تعلقات یا ایسی خواہشات کو جائز بنانے کے لئے انہیں حقیقی شکل عشق دینا ضروری ہوتا ہے اور حقیقی عشق میں لازم ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو تباہ کر دے۔ زندگی کو ایک روگ بنا لے۔ وصال کے تمام راستے اپنے ہاتھوں سے مسدود کر دے اور پھر عمر بھر یاس و حرمان کا سہارا لئے ایک اپاہج بنا رہے، اسی وجہ سے ایلی نے اس تفریحی تعلق کو جو اس اداس شام کو اس معمولی سی لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ ماحول سے اخذ کئے ہوئے اعتباروں کی وجہ سے ایک لامتناہی اور تباہ کن الجھن میں بدل دیا۔ اور شہزاد کو دیوی بنا کر خود اسکے روبرو تپسوی بن کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ شہزاد کو دیوی کی بجائے ایک جیتی جاگتی حسین عورت سمجھتا۔ مرد کی حیثیت سے اس کی آرزو کرتا تو شاید شہزاد میں بھی دورخی پیدا نہ ہوتی اور اس کا قرب قرب ہوتا اور بعد، بعد مگر اب ان

الجھے حالات میں شہزاد بھی الجھ کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے ایلی ان سوالیہ نشانات سے واقف ہو
اور اس کی زندگی بے پناہ مسرت اور بے پایاں الم کے چکر میں پس کر رہ گئی۔

وہ راز

ایلی نے اس راز کو اس قدر متبرک بنا دیا کہ محلے کی نانک شاہی اینٹیں جلترنگ کی طرح
لگیں دروازے آہ و زاری کرنے لگے کتے کسی آنے والی مصیبت کے مبہم احساس سے مضطرب ہو
چیخیں مارنے لگتے اور محلے والیوں کے کان کھڑے ہوگئے:

محلے والیاں ایلی کو دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں:

"ہائے ایلی تو کیا یہاں ہے۔ لو—— اور میں سمجھ رہی تھی کہ لڑکا سکول میں پڑھنے گیا
ہے۔"

"لو ہمیں کیا معلوم کبھی دیکھا بھی ہو باہر چوگان میں۔ پہلے تو اللہ مارے ارجمند کے ساتھ بیٹھا
لالٹین تلے کھڑا رہتا تھا اور اب گویا کسی تہ خانے میں چھپا رہتا ہے۔ کیا ہو گیا تری عقل کو۔"

کوئی کہتی:

"اے ہے لڑکے تو تو اب شکل دکھانے سے بھی رہا۔ ایسا بھی کیا۔ نہ لڑکے اپنوں سے ملتے
رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

کوئی مسکرا کر کہتی:

"اپنوں سے تو ملتا رہتا ہے لال۔ اپنے وہی ہوتے ہیں ناں جسے کوئی سمجھے۔ ہم بوڑھیوں کو
کیسے سمجھے۔ ماشاءاللہ اب جوان ہے۔ اب تو اس کی ماں کو چاہئے کہ شادی کر دے اس کی۔"

"نہ جانے باپ کی طرح کتنی عورتیں گھر لائے گا۔"

"نہ بہن دعا کرو۔ اللہ ہدایت دے۔"

محلے والیاں تو پھر بھی بات اشارتاً کرتی تھیں لیکن محلے کے لڑکے تو کھلے بندوں اس سے بات
کرتے تھے:

"کیوں بھئی۔ کیا پھر سے ماں کی گود میں پڑ گئے۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کون نے پکڑ
پھنسے ہو۔ اب تو اونچی ہواؤں میں اڑنے لگے ہو نا۔"

وہ خود بھی انہیں ملنے سے کتراتا تھا۔ باہر تو وہ نکلتا ہی نہ تھا اس لئے اس کے پکڑے جانے کا

احتمال ہی نہ تھا اور گھر پر آواز دینے سے وہ ہچکچاتے تھے۔ اگر کوئی آ کر آواز دیتا بھی تو ایلی خاموش ہو
رہتا کہ وہ سمجھے گھر پر نہیں اور واپس چلے جائیں۔

ان دنوں رفیق اور جمیل تو علی پور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ارجمند کو لاہور کے قریب تارپین
کے تیل کے کارخانے میں ملازمت مل گئی تھی۔ یوسف بھی وہاں نہیں تھا۔ لے دے کے رضا تھا۔ وہ
لکڑی ٹیکتا ہوا آ پہنچتا اور معصوم سا منہ بنا کر نیچی نگاہوں سے شہزاد کی کھڑکیوں تلے کھڑا ہو کر آواز دیتا:

"ایلی!"—— "ایلی!!"

ایلی آواز سن کر خاموش ہو رہتا۔

جانو آگ بگولہ ہو جاتی:

"سدھ بدھ نہیں رہی کیا۔ سنائی نہیں دیتا کوئی آواز دے رہا ہے۔"

ایلی مسکرا کر خاموش ہو رہتا اور شہزاد تو یوں اپنا کام میں منہمک دکھائی دیتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔
جانو دو ایک منٹ کے لئے کبھی ایلی اور کبھی شہزاد کی طرف دیکھتی اور پھر بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی میں جا
کھڑی ہوتی——

"کون ہے؟" جانو چلاتی۔

"ایلی ہے کیا؟" رضا اوپر دیکھے بغیر چلاتا۔

"بیٹھا ہے۔" جانو غصے میں چیختی۔

"اچھا۔" رضا جان بوجھ کر بہرا بن جاتا۔ "جب وہ آئے تو دکان پر بھیج دینا۔"

جانو پھر سے یوں چلاتی جیسے رضا کی بجائے اڑوس پڑوس والوں کو سنا رہی ہو۔

"میں کہتی ہوں یہیں بیٹھا ہے بولتا نہیں۔"

"اچھا۔" رضا چلتے ہوئے کہتا۔ "جب وہ آئے تو دکان پر بھیج دینا۔"

جانو کا منہ غصے سے تپنے لگتا۔ "عجب احمق ہے میں کچھ کہہ رہی ہوں اور وہ اپنی ہی کہے جاتا
ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو جانو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا؟" ایلی اسے ستانے کے لئے معصوم انداز میں
پوچھتا۔

"لو اب اسے بھی آ گیا ہوش۔ کب سے چلا رہی تھی کہ رضا نیچے بلا رہا ہے۔ سنتے ہی نہیں۔ اور
اب یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔"

"ہائیں۔ مجھے بلا رہا تھا"۔ ایلی بن کر کہتا۔

"لو ـــــــ" جانو چلانے لگتی اور خرافات بکنا شروع کر دیتی۔

پھر جب وہ تھک کر خاموش ہو جاتی تو شہزاد چپکے سے کہتی:

"کیا بات ہے جانو۔ آج تو خاموش کیوں ہے۔ بات ہی نہیں کرتی کوئی؟"

اس پر جانو کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر چلاتی۔ شہزاد آنکھ بچا کر ایلی کی طرف دیکھ کر بامعنی انداز سے مسکراتی۔ اس پر ایلی کے جسم میں خوشی کی رو دوڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ دونوں بچے ہوں اور مل کر جانو کے خلاف سازش کر رہے ہوں۔

"مجھے کیوں ستا رہے ہو۔ اپنا سر کھاؤ۔ چاہے جو جی میں آئے کرو۔ مجھے کیا واسطہ میں تمہارے ہی بھلے کی کہتی ہوں کہ یوں سارا دن ایک جگہ بیٹھ رہنا اچھا نہیں۔ لوگ ایسے ہیں کہ بات کئے بغیر نہیں رہتے۔ چاہے کوئی کتنا ہی پاک پرہیزگار کیوں نہ ہو۔ لیکن تم نہ سنتے۔ میری تو نہ سہی۔ مجھے کیا غرض۔" جانو بکے جاتی۔

جب وہ ایک لمبا چوڑا لکچر پلا کر فارغ ہوتی تو شہزاد چپکے سے بات ٹالنے کے لئے کہتی:

"جانو! آج چائے نہیں پلاؤ گی کیا؟ تم بالکل ہی بھوکا مارو گی ہمیں ـــــ کیوں ایلی پیو گے نا؟"

ایلی ہنس کر کہتا:

"لو چائے بھی نہ ملی تو میں پیاسا مر جاؤں گا۔" اور شہزاد چھپ چھپ کر مسکراتی۔ اس کی مسکراہٹ کا راز ایلی کی روح میں ناچتا اور وہ چھپا کر رکھنے کی اور بھی شدت سے کوشش کرتا۔

ایسی باتیں کیسی باتیں

لیکن آصفی محلے کی سیاہ اینٹیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ بھینچنے کی کوشش کرتیں اور آصفی مکانات کے دروازے زیر لب چوں چوں کر کے مسکراتے، ہنسنے اور رات کے اندھیرے میں محلے کے کتے روتے، چمگادڑیں چیختیں اور ان تہہ خانہ نما مکانات میں رہنے والیاں سر جوڑ کر باتیں کرتیں اور پھر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتیں۔

ایلی کے شب و روز میں اس کی علاوہ صرف ایک بات تھی۔ ہر روز یا ہر دوسرے روز

آصف کا ایک نہ ایک خط آ جاتا جس میں تباہی اور بربادی اور ایلی کے امرتسر نہ آنے کے متعلق شکوے اور شکایات ہوتیں۔ تباہی اور بربادی کے ان قصوں میں کوئی خاص بات نہ ہوتی اور ایلی قطعی طور پر اندازہ نہ لگا سکتا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ آصف تفریحاً" بربادی کا رونا رو رہا ہے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آصف کی تمام تر زندگی جھجک کے محور کے گرد گھوم رہی ہے اور اس کی محبت "لوگ کیا کہیں گے" کے سوا کچھ نہیں اس لئے ایلی کو یقین تھا کہ آصف آگے قدم رکھنے کی جرأت نہ کرے گا اس لئے اس کا کسی خطرے میں گرفتار ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا بربادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ بربادی ہو سکتی تھی کہ محلے میں اس کی بدنامی ہو جائے یا وہ چنچل لڑکی اسے خوش کرنے کے لئے عام مجمع میں قمیص اٹھا کر چلانے لگے:

"اب شرما کر بھاگ کیوں رہے ہو؟"

ویسے بھی تو وہ اس کی بیٹھک کے روشندانوں پر لگے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑوں پر خشت باری کیا کرتی تھی اور اعلانیہ چلاتی:

"انہیں اتار دو ان پردوں کو ہٹا دو۔ ان رکاوٹوں کو دور کر دو اور خود میرے سامنے آرام کرسی پر بیٹھ جاؤ ورنہ میں ماروں گی اینٹ۔"

ایلی کا خیال تھا کہ آصف محبت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ایلی کے نزدیک تو محبت وہ تھی جس میں انسان محبوبہ کے سوا اور کسی کی پروا نہ کرے۔ اس لئے ایلی آصف کی طرف سے مطمئن تھا اور اسے یقین تھا کہ کچھ بھی نہ ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ شہر چھوڑ کر وہ بھاگ جائے گا اور اپنے باپ کے پاس جا پناہ لے گا جو کسی دور دراز مقام پر ایکسائز انسپکٹر تھے۔

پہلے چار خطوں کا تو ایلی نے جواب بھی دیا تھا۔ اسے بار بار تاکید کی تھی کہ حالات تفصیل سے لکھے۔ ایلی کو آصف کے معاملے میں بہت دلچسپی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ایک بار اپنی آنکھوں سے اس نڈر عاشق کو دیکھے جو لڑکی ہونے کے باوجود اس قدر بے باک اور دلیر تھی کہ اپنے بھائیوں، باپ اور دیگر وارثوں کے سامنے بھی اظہار محبت سے نہ گھبراتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اسے بھی کوئی ایسا ساتھی مل جائے اور وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے افق کی طرف چل پڑیں اور ایک دوسرے کے لئے تمام دنیا کو ٹھکرا دیں۔

پہلے تو اس کے دل میں شہزاد کے کہنے پر "ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟" بڑی بڑی

امیدیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن پھر جلدی ہی وہ سب گارے کی دیواروں کی طرح دھڑام سے نیچے
گریں۔ اب بھی جب شہزاد اس پر وہ نگاہ ڈالتی یا جب وہ فرحت کی طرف آ کر فرحت یا احمد
کسی طعنے کے جواب میں ظاہر کرتی جیسے لوگوں سے قطعی طور پر بے نیاز ہو۔ جب وہ لوگوں کی
موجودگی کے باوجود آنکھ بچا کر ایلی کا گال سہلا جاتی یا چلتے چلتے چپکے سے اسے چٹکی بھر لیتی یا
ہی باتوں میں آنکھ بچا کر اسے گھورتی یا زبان نکال کر اس کا منہ چڑاتی اس وقت ایلی کا سینہ چوڑا ہو
جاتا اور شانے ابھر آتے۔ وہ محسوس کرتا کہ وہ خوش قسمت شخص ہے جسے شہزاد کی ساتھی بن
ہے مگر جونہی وہ تنہائی میں شہزاد سے ملتا تو اس کی تمام امیدیں اور مسرتیں خاک میں مل جاتیں۔

ایلی نے آصف کے دو ایک خطوں کے جواب بھیجے تھے بار بار مطالبہ کیا تھا کہ تفصیلات لکھ
کر بھیجے۔ لیکن آصف میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ کاغذ پر دل کا راز لکھ بھیجتا۔ اس نے تو اپنی
شخصیت کو یوں چھپا رکھا تھا کہ خود اسے جاننے سے محروم ہو چکا تھا۔ تفصیلات کی بجائے وہ
اور بربادی کے راگ الاپتا رہا اور بار بار ایلی کو امرتسر بلاتا رہا۔ "خدا کے لئے ایک بار آ کر مجھے
بربادی سے بچا لو۔" ...... مگر ایلی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ آصف سے ملنے جاتا۔ وہ تو فرحت
میں اپنا آپ کھو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ شہزاد اس کے سامنے بیٹھی مشین چلاتی رہے اور وہ اس
کی ڈولتی آنکھوں اور لٹکتے ہوئے بھرے اور گورے بازوؤں کو دیکھتا رہے۔ اس کے حنا لیا
ہاتھوں کا منتظر رہے۔ شہزاد چھم سے زینے سے اترے اور کہے:

"ایک۔"

"ایک لقمہ کھاؤ تو زندگی سنور جائے۔"

اس بات کا متمنی تھا کہ شہزاد زبان نکال کر ایلی کا منہ چڑائے اور پھر سنجیدگی سے جانو
کہے:

"جانو۔ تم آج بات ہی نہیں کرتیں۔ ناراض ہو گیا؟"

اگر ایلی کو احساس ہو جاتا کہ آصف شہر چھوڑ کر جانے کے علاوہ کچھ اور کرنے کی بھی اہلیت
رکھتا ہے تو حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے لیکن ایلی کو تو یقین تھا کہ آصف خطرے میں کود نہیں
سکتا چونکہ اس میں آگے قدم رکھنے کی جرأت نہیں۔ ایلی کو کبھی خیال نہیں آیا تھا۔ وہ فرحت
پیچھے ہٹا سکتا ہے جو خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اسے اس بات کا ذرا بھی احساس ہوتا
شاید وہ آصف کو ملنے کے لئے امرتسر چلا جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

بربادی اور تباہی کے اعلان کم ہوتے گئے۔ شاعری کا عنصر نہ رہا جس سے اس کے پہلے خط
لبریز ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے خطوط میں صبر اور ضبط کی جھلک واضح ہو گئی اور نفس
مضمون میں اختصار پیدا ہوتا گیا اور آخرش ایلی کو آصف کا وہ خط موصول ہوا جس میں صرف
ایک جملہ لکھا تھا:۔

"میں تادم تحریر زندہ ہوں۔"

ایلی نے وہ خط دیکھا۔ اسے بار بار پڑھا لیکن اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر تادم تحریر زندہ
ہوں سے اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات تو ایک حقیقت تھی۔ ایک ایسی حقیقت جسے کوئی جھٹلا نہیں
سکتا تھا۔ انسان اپنے مستقبل کے متعلق کیسے جان سکتا ہے۔ وہ صرف حال کے متعلق ہی جانتا
ہے اور حال کیا ہے۔ ایک ساعت' ایک مختصر ترین ساعت۔ ایلی نے لاشعوری طور پر ان باتوں کا
جائزہ لیا۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ایک اداس شام شہزاد کی موجودگی کے باوجود اداس' اس کی سیاہ
آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت کے باوجود اداس۔ وہ چپ چاپ شہزاد کے پاس جا بیٹھا۔

"شہزاد" وہ بولا۔ "یہ دیکھو تو؟"

"کیا ہے؟" وہ بولی۔ "کیا دیکھوں تو؟"

"یہ خط میرے دوست کا ہے۔" ایلی نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔

"عجیب خط ہے۔" وہ بولی۔ "اس سے تو بہتر تھا اپنی تصویر ہی بھیج دیتا" وہ ہنسنے لگی۔

"تم نہیں جانتیں۔" ایلی نے کہا۔ "اسے ایک لڑکی سے محبت ہے۔"

"اچھا۔" وہ مسکرائی۔ "محبت ہے —— پھر؟"

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" ایلی نے کہا۔ "کہیں وہ مر نہ جائے۔"

"محبت میں مر جائے۔" اس نے پوچھا۔ "کیا لڑکی کو اس کی پروا نہیں۔"

"وہ جان دیتی ہے اس پر۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ جان دے۔" شہزاد مسکراتے ہوئے بولی۔

"شاید ——" ایلی سوچ رہا تھا۔

"واہ۔" وہ ہنسی۔ "محبت کرنے والے کبھی نہیں مرتے۔ وہ تو امر ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا امر ہو جاتے ہیں کیا۔ تو مجھے بھی امر کر دو شہزاد۔"

"امر ہوتے ہیں۔" وہ بولی۔ "کبھی نہیں جاتے۔"

"تو کیا میں امر ہو گیا ہوں؟" ایلی نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر دفعتاً" سر اٹھا کر بولی۔

"ایلی؟"

"جی۔" ایلی نے امید افزا نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایلی کیا تم واقعی ——" پھر دفعتاً" وہ رک گئی۔

"بولو نا۔" ایلی نے شہزاد کا بازو جھنجھوڑا۔ "کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

کچھ نہیں۔" شہزاد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"نہیں نہیں۔" وہ ضد کرنے لگا۔ "ضرور بتاؤ مجھے۔"

"کچھ ہو تو بتاؤں میں ——" وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ نمناک تھی۔

"اچھا تو کچھ بھی نہیں کیا۔" ایلی نے بات کا رخ بدلا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر دفعتاً" اس نے سر اٹھایا۔

"شہزاد۔" وہ بولا۔ "تمہارا کچھ بھی نہیں میرے لئے دنیا بھر کے سبھی کچھ سے زیادہ ہے ——"

شہزاد نے تڑپ کر ایلی کی طرف دیکھا اور پھر ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسی باتیں نہ کیا کرو ایلی۔" وہ بولی۔

"کیسی باتیں؟" ایلی نے پوچھا۔ شہزاد خاموش رہی۔

"کیوں نہ کیا کروں؟" ایلی نے پھر پوچھا۔

"بس نہ کیا کرو ایلی ---- میری خاطر۔" شہزاد نے منت سے کہا۔

"تمہاری خاطر میں سبھی کچھ کر سکتا ہوں شہزاد مگر یہ مطالبہ نہ کرو کہ تمہاری خاطر میں کچھ نہ کہوں۔"

"اچھا۔" وہ ہنسنے لگی ——— "میری خاطر تم کیا کیا کر رہے ہو؟"

"جو میں اپنی خاطر نہیں کر سکتا تمہاری خاطر کر سکتا ہوں صرف تمہاری خاطر۔"

"چپ۔" وہ چلائی۔ اور اس کی حنائی انگلی ایلی کے ہونٹوں پر ٹک گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب تخلیئے میں شہزاد نے ایلی سے اظہار التفات کیا تھا۔ اس اظہار التفات

کے بعد آصف کا وہ خط بے معنی ہو کر رہ گیا۔ ایلی کے لئے تمام کائنات شہزاد سے بھر گئی۔ ان جانے میں ایلی کا سر جھکا اور بازو کی بجائے شہزاد کے بلوری پاؤں پر ٹک گیا اور شہزاد نہ جانے کس افق پر کھو کر رہ گئی۔

بلاوا

اگلے روز ایلی جب چوبارے میں بیٹھا ہوا حسب معمول شہزاد کے پاؤں کا جائزہ لے رہا تھا تو دفعتاً" چوگان سے شور سنائی دیا۔

"کون ہے تو؟"

"ویر کسے ملے گا تو؟" کوئی محلہ والی بولی۔

"کون آیا ہے بہن؟" دوسری چلائی۔

"میں کہتی ہوں کوئی آیا ہے کیا؟"

"ہاں ہاں۔ کوئی امرتسر سے آیا ہے۔"

"کس کے ہاں آیا ہے؟"

"اپنے علی احمد کے ہاں۔"

"اچھا بسم اللہ۔ سو بار آئے۔ کوئی مہمان ہو گا لیکن علی احمد تو آج کل نوکری پر ہیں۔"

"کہتا ہے ایلی سے ملنا ہے۔"

"ایلی سے ملنا ہے؟"

ایلی گھبرا گیا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور کھڑکی کی درز سے دیکھنے لگا۔ چوگان کے عین درمیان میں ایک اونچا لمبا جوان کھڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کون ہے؟ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کے باوجود وہ اسے پہچان نہ سکا۔

"بیٹے! کیا نام ہے تیرا؟" مائی حاجاں پنکھا چلاتے ہوئی چلا کر بولی۔

"کیا کہا شفیع ——— اللہ تیرا بھلا کرے۔ ابھی آ جاتا ہے ایلی یہیں ہو گا۔"

"اے ہاجرہ۔ اے لڑکی فرحت میں کہتی ہوں لڑکی کیا نام ہے تیرا؟ ——— "ہے مجھے تو اللہ مارا نام ہی بھول جاتا ہے۔ ہاں اپنی جانوں ---- اے جانوں ——— ذرا ہاجرہ کو آواز تو دینا ——— کہتا کوئی ایلی سے ملنے آیا ہے۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے کہلوادے کہ ایلی گھر پر نہیں اور اس اجنبی سے ملاقا
کوفت سے جان بچالے لیکن اس وقت تک محلے میں چاروں طرف شور مچ چکا تھا۔ محلے وا
اجنبی کے متعلق سن کر گدھوں کی طرح کھڑکیوں اور منڈیروں پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان
پنکھیاں چل رہی تھیں ہاتھ چل رہے تھے۔ زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ اب ان
سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بادل نخواستہ نیچے اتر گیا اور ڈرتے ڈرتے چوگان میں پہنچا۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

چاروں طرف سے محلے والیوں نے ایلی کو دیکھ کر شور مچادیا۔

"ہائیں تم شفیع۔" —— شفیع کو دیکھ کر ایلی —— حیران رہ گیا۔ شفیع اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے پوری طرح واقف تھا۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ اس نے شفیع کا پہچانا کیوں نہ تھا اور فرض کیجیئے دوری کی وجہ سے پہچان نہ سکا تھا تو بھی اس کے لئے جانے پر وہ اسے کیوں نہ پہچان سکا؟

"آؤ آؤ۔" وہ گرمجوشی سے بولا۔ "اوپر چلو۔"

"نہیں۔" شفیع بولا۔ "مجھے جلدی ہے۔"

"جلدی ہے تو کیا بیٹھو گے نہیں۔" ایلی نے پوچھا۔ "کیسے آئے ہو؟"

"تمہیں لینے آیا ہوں۔" شفیع نے جواب دیا۔

"مجھے لینے آئے ہو؟"

"ہاں۔" وہ رک کر بولا: "میرے ساتھ امرتسر چلنا ہے تمہیں۔"

"کیوں؟" ایلی کے منہ سے یوں نکل گیا جیسے اسے شفیع کی بات بری لگی ہو۔

ایک ساعت کے لئے شفیع گھبرا رہا پھر مسکرا کر بولا: "آصف نے بلایا ہے تمہیں۔" اس کی مسکراہٹ حسرت آلودہ تھی۔

"آصف نے بلایا ہے۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ کہتا تھا اسے ساتھ لے کر آنا۔"

"تم کسی اپنے کام سے آئے ہو گے یہاں؟" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ صرف تمہارے لئے۔"

"صرف مجھے لے جانے کے لیئے خیریت تو ہے؟" ایلی گھبرا گیا۔

"آصف کی حالت اچھی نہیں۔" شفیع نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"حالت اچھی نہیں —— کیا مطلب؟"

"اس نے کہا تھا میری طرف سے کہہ دینا حالات اچھے نہیں اور ساتھ لے کر آنا۔" شفیع نے بصد مشکل جملہ ختم کیا۔

"ہوں۔ تو حالات اچھے نہیں۔ یہ کہو نا۔ اس کے حالات تو کبھی اچھے نہ ہوں گے۔" ایلی چمک کر بولا۔

"چلو اب راستے میں باتیں کریں گے۔" شفیع بولا۔

"اگر میں دوسری گاڑی میں آ جاؤں تو؟" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں۔" شفیع بولا۔ "ابھی چلنا ہو گا۔ ضروری ہے۔"

"اچھا تو میں تیار ہو آؤں۔" ایلی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"دیر نہ لگانا۔" شفیع نے اسے تاکید کی۔

بے معنی کہرام

ایلی تیار ہو کر آیا تو وہ سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ محلے سے باہر نکلتے ہی ایلی نے سوالات کی بھرمار کر دی:

"آصف تمہیں کیسے مل گیا؟ کیا تم چھٹیوں میں باہر نہیں گئے تھے کہیں؟ خود کیوں نہ آیا آصف؟ تمہیں گھر کا پتہ کیسے مل گیا؟ مجھے اس نے کیوں بلایا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟"

شفیع ایلی کے سوالات سے گھبرا گیا۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کا جواب نہ دیا بلکہ جواب دینے کی بجائے اس نے اپنا قصہ چھیڑ دیا کہنے لگا۔

"بات یہ ہے کہ آصف کو ایک لڑکی سے محبت تھی"۔ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"ہاں اسے محبت ہو گئی تھی۔" شفیع نے کہا۔

"لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق۔" ایلی نے منہ پکا کر لیا۔

"کسی سے بات کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں تھا۔" شفیع نے آہ بھری۔

"پھر اس نے تم سے بات کیسے کی۔ تمہیں یہ راز کیسے بتا دیا آصف نے؟"

"بے چارہ مجبور ہو گیا ہو گا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے پوری بات نہیں کی۔" شفیع نے کہا۔

"کیا بات کی تھی تم سے آصف نے؟" ایلی اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھ سے ——" شفیع خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک آیا۔

"شفیع۔" ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم رو رہے ہو؟"

"نہیں۔" شفیع نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "دراصل میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ پانی آ رہا ہے۔ آصف نے مجھے گھر بلا بھیجا تھا کہنے لگا۔ شفیع کیا تم ایلی کو بلا سکتے ہو۔ اگر ایلی نہ آیا تو۔ تو ——" وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح وہ بات کرتا ہے تم جانتے ہی ہو۔" شفیع نے پھر بات شروع کی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" ایلی نے کہا۔ "اچھی طرح معلوم ہے۔"

"پھر اس نے میری منتیں کیں۔" شفیع کہنے لگا۔ "لیکن میں نہ مانا۔ میں نے کہا جب تک بلانے کی وجہ نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گا۔ پھر اس نے بتایا مجھے کہنے لگا میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایلی نہ آیا تو سمجھ لو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔"

"بے وقوف۔" ایلی چلایا۔ "محبت لڑکی سے ہے لیکن ایلی نہ آیا تو سمجھ لو زندگی ختم ہو جائے گی...... عجیب بے تکی سی بات ہے۔"

"نہیں ایلی۔" شفیع نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "وہ واقعی تکلیف میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔"

"حالت اچھی نہیں۔" ایلی چلایا۔ "اچھا خاصا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ حالت اچھی کیوں نہیں۔"

"نہیں۔" شفیع رک رک کر کہنے لگا۔ "اب تو بے چارہ ختم ہو گیا۔ منہ زرد ہو گیا ہے۔ آنکھیں نکل آئی ہیں۔ پہچانا تک نہیں جاتا۔" شفیع نے کہا۔

"کیا واقعی؟" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں —— اب شاید وہ بچ نہ سکے۔" شفیع نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بچ نہ سکے۔ تم بھی حد کرتے ہو ——" ایلی بولا۔

"سچ ایلی۔" شفیع نے سر جھکا لیا۔

شفیع کے انداز کی سنجیدگی کی وجہ سے ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شفیع کی بات کی پھبتی اڑا دے مگر ہمت نہ پڑی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی طاقت گویائی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ جیسے اس کی رگوں میں خون جم گیا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور وہ دونوں نہ جانے کب تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایلی گاڑی کی کھڑکی کے باہر دوڑتے ہوئے دیہات کے منظر کی طرف کھوئے کھوئے دیکھتا رہا اور شفیع کی دکھتی آنکھ سے قطرے گرتے رہے۔

دفعتاً گاڑی کو دھچکا لگا اور وہ رک گئی۔ امرتسر کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ امرتسر جا رہا ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ شہزاد اس وقت بیٹھی مشین چلا رہی ہو گی۔ اسی طرح سر جھکائے بازو لٹکائے۔ اس وقت ایلی کے ذہن میں ایک وسیع خلا پھیلا ہوا تھا۔

سٹیشن سے وہ دونوں تانگے میں سوار ہو گئے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے جیسے انہیں ایک دوسرے سے کچھ نہ کہنا ہو۔

جب وہ آصف کے گھر کے قریب پہنچے تو شفیع نے مہر سکوت توڑا۔

"ایلی۔" وہ بولا۔

"جی۔" ایلی چونکا۔

شفیع رک گیا جیسے اسے یاد نہ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ "آصف کی حالت بہت خراب تھی۔ بہت خراب۔ اس حد تک کہ شاید ......"

"سب ٹھیک کر لوں گا میں۔" ایلی چمک کر بولا۔

"شاید وہ ......" شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"شاید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ایلی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی ایلی حیران رہ گیا۔ وہ تنگ گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھڑکیوں میں منڈیروں پر عورتوں کا ہجوم تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہاں غدر ہو گیا ہو۔ لوگ چلا رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ہٹ کر شفیع سے پوچھا۔

شفیع نے ایلی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو چیرتا ہوا آگے نکل

گیا۔ آصف کے مکان کے نیچے وہ رکا جہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"ایلی آگیا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔

"ایلی آگیا ہے۔" اوپر سے زنانہ آوازیں آئیں اور پھر دفعتاً لوگوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں:

"وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے۔"

"ایلی آگیا ہے مگر تو چلا گیا ہے۔ لے بیٹے آگیا ہے تیرا دوست۔ اب اس سے تو بات کر۔ آصف تیرا دوست تجھ سے ملنے آیا ہے۔ ہم سے تو تو نے کبھی بات نہ کی کیا اس سے بھی بات نہ کرے گا۔ ایلی بیٹے! تیرا آصف چپ ہو گیا ہے۔ اب وہ نہیں بولتا۔ اب وہ کبھی نہ بولے گا۔"

پھر وہی چیخیں سنائی دینے لگیں جنہیں سن کر ایلی سن ہو کر رہ گیا۔ جیسے وہ ایک بے جان بت ہو۔ اس کے گرد چاروں طرف چیخوں سے بھرا ہوا ایک ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ اسے نیالے دھبے سے دکھائی دے رہے تھے۔ دور کوئی بین کر رہا تھا اور سینکڑوں مدھم مدھم آوازیں کراہ رہی تھیں۔

ننگی رقاصہ

پھر دفعتاً کوئی چلایا: "ہٹ جاؤ جنازہ آرہا ہے"۔

اور وہ دھبے ہوا میں تیرنے لگے۔ چاروں طرف سے عجیب عجیب آوازیں بلند ہوئیں۔ بے معنی آوازیں پھر وہ سب ایک کھلے میدان میں کھڑے تھے جہاں ایک خوف ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آسیب زدہ مکان میں بھوت پریت چل پھر رہے تھے۔ میدان میں قبروں کے درمیان کھلے بالوں والی ایک خوبصورت ڈائن کھڑی تھی۔ اس نے اپنی چھاتیوں پر سے قمیض اٹھا رکھی تھی۔ اس کے گھنگھریالے بال چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے اور وہ رقص کر رہی تھی۔ مسرت بھرا رقص...... وحشت بھرا رقص۔ لوگ اس کے رقص سے بے خبر سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے۔

پھر دفعتاً ایک شور برپا ہوا۔ وہ دلدوز چیخیں وہ ہچکیاں کراہیں بند ہو گئیں۔ وہ نہ جانے کدھر کو چل پڑے۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ان کے آگے آگے وہی ننگی رقاصہ ناچتی جا رہی تھی۔

پھر وہ نماز پڑھ رہے تھے اور وہ امامت کر رہی تھی۔ وہ لاش کو دفنا رہے تھے اور وہ قہقہے لگا رہی تھی۔

"ایلی۔" شفیع نے اسے آواز دی۔ "چلو گھر چلیں۔"

ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو کیا تم علی پور جاؤ گے؟" شفیع نے پوچھا۔ "اس وقت؟"

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو چلو میں تمہیں سٹیشن پر چھوڑ آؤں گا"۔ وہ بولا۔

دفعتاً ایلی نے شفیع کی طرف دیکھا:

"شفیع۔" وہ بولا۔ "کیا واقعی آصف مر گیا؟"

شفیع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن لیکن ـــــ تم تو کہتے تھے ـــــ۔" ایلی رک گیا۔

"میں میں۔" شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن......"

"تمہیں معلوم تھا کہ؟" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کی دکھتی آنکھ سے پانی جاری ہو گیا۔ "آصف نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ تمہارے آنے سے پہلے اس کا جنازہ نہ اٹھایا جائے۔"

ایلی تڑپ کر مڑا۔ وہ پھیلا ہوا دھندلکا دفعتاً ختم ہو گیا۔ اس کے گرد اونچے لمبے لوگ بھاگ رہے تھے۔ ڈراؤنے مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

"وصیت۔" ایلی گنگنایا۔

"ہاں۔" شفیع بولا۔ "آصف نے کل رات زہر کھا لیا تھا۔"

"زہر؟" ایلی کے ہونٹ ہلے۔

"رات کے دو بجے وہ مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ جب تک تم نہ آؤ جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ صبح اس کے گھر والوں نے مجھے بلا کر علی پور بھیج دیا تاکہ تمہیں لے آؤں۔"

"زہر کھا لیا؟" ایلی اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا تھا۔

"کہتے ہیں۔" شفیع نے کہا۔ "اس لڑکی نے آصف کو خط لکھا تھا۔ آؤ ہم اکٹھے زہر کھا لیں۔

فلاں دن فلاں وقت اور دونوں مرجائیں۔"

"اور وہ بھی مرگئی کیا؟۔" ایلی نے پوچھا۔

انتقام ---- انتقام

"نہیں۔" شفیع بولا۔ "وہ نہیں مری۔ کوئی کہتا ہے اسے کھانے کو زہر نہیں ملا۔ کوئی کہتا ہے وہ دراصل آصف سے انتقام لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے اسے دھوکا دیا۔ اس لڑکی کی حد بدنامی ہوئی تھی نا۔ اور اس کے بھائیوں نے اسے باندھ کر پیٹا تھا۔ پھر وہ اس محلے سے لے گئے تھے۔ دور کسی اور محلے میں سفید کنڑے کے قریب لیکن سچی بات کے متعلق کچھ نہیں معلوم۔" شفیع نے کہا۔ "میرا خیال تھا شاید تمہیں معلوم ہو گا۔"

"مجھے ----" ایلی سوچ میں پڑگیا۔ "سب بیکار ہے بالکل بے کار۔ کوئی فائدہ نہیں۔" ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ خود آصف کی موت کا ذمہ دار ہو جیسے اسی نے آصف کو مارا ہو۔ ان اونچی عمارتوں کے اوپر ایک حسین لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کے دامن کو نیچے کونوں سے پکڑ لیا اور پھر بازو اوپر اٹھائے۔ اوپر اور اوپر۔ حتیٰ کہ وہ ننگی ہو گئی اور آصف اسے دیکھ کر چلانے لگا ——— "نہیں نہیں نہیں نہیں۔" ——— پھر اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ بھوت بن گیا اور لوگوں نے اسے سفید لٹھے میں لپیٹ دیا۔ اور کسی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ "ہٹ جاؤ۔ جنازہ آ رہا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" شفیع بولا۔ "اس لڑکی نے واقعی آصف سے انتقام لیا ہے کیونکہ آصف نے اس کی طرف التفات نہ کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ دونوں چار ایک بار چوری چوری ملے بھی تھے۔ کچھ کہتے ہیں نہیں لڑکی کی شوق ملاقات سے تڑپتی رہی لیکن آصف نے اپنی بے توجہی سے اسے بھسم کر دیا اس لئے وہ انتقام پر تل گئی۔ کہتے ہیں اگر لڑکی کے پیار کو ٹھکرا دو تو وہ انتقام لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر اس کی آرزوئیں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہے۔" شفیع نے وضاحت کی۔

"انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔"

گاڑی کا انجن چلاتا ہوا جا رہا تھا۔

کھیتوں میں ایک برہنہ عورت ناچ رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ چھاتیاں ابھری ہوئی

تھیں۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے۔

"انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔" انجن گویا ایلی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ "انتقام لیتی ہے ___ انتقام لیتی ہے۔"

دفعتاً برہنہ عورت کے چہرے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایلی نے اسے پہچان کر چیخ سی ماری:

"شہزاد۔" اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

"کیا ہے تمہیں بابو۔" اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بیمار ہو بھائی؟۔" دوسرے نے پوچھا۔

ایلی گھبرا گیا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔" انہوں نے زبردستی اسے لٹا دیا۔

وہ برہنہ عورت تیرتی ہوئی کھیتوں سے گاڑی میں آ گھسی اور اس کی چھاتی پر بیٹھ گئی

"انتقام۔ انتقام۔" گاڑی چلائے جا رہی تھی۔ تڑپ کر وہ اٹھ بیٹھا "انتقام' انتقام" شفیع دور سے مسکرا کر بولا۔ "اگر اس کی خواہشات پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔"

برہنہ شہزاد کے کھلے بال ایلی کے چہرے سے مس کر رہے تھے۔ "انتقام۔ انتقام۔" انجن اسے خبردار کر رہا تھا۔ ڈبے کے سبھی مسافر حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں نہیں۔" وہ چلایا "نہیں نہیں۔"

"کیا ہے تمہیں؟۔" کسی نے قریب آکر پوچھا اور اس کے جسم کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "اسے تو بخار ہو رہا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" ایلی چلایا۔ "بخار نہیں بخار نہیں۔"

پھر اسے ہوش آیا تو وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گرد کئی ایک دھند لائے ہوئے چہرے تھے۔ دفعتاً ایک چہرہ اس کے قریب تر ہو گیا کھلے بالوں میں گھرا ہوا۔ گھبرایا ہوا۔

"شہزاد۔" اس کے ہونٹ کھلے۔ اسے دیکھ کر وہ جوش میں آ گیا۔ "تم مجھ سے انتقام لو گی۔" اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

شہزاد ہنسنے لگی: "کیا کہہ رہے ہو تم؟۔"

"نہ جانے بیہوشی میں کیا بول رہا ہے۔" ہاجرہ بولی۔ "دیکھو تو بخار سے بدن تپ رہا ہے۔"

"کیا ہے تمہیں ایلی؟۔" شہزاد نے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" ایلی خاموش ہو گیا۔
پھر جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے شہزاد کو آواز دی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
"کیا ہے ایلی؟۔" وہ قریب آ کر بولی۔
"تم مجھ سے انتقام تو نہ لو گی۔۔" ایلی نے پوچھا۔
"انتقام ۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟۔" شہزاد گھبرا گئی۔
ایلی نے شہزاد کا بلوری پاؤں پکڑ لیا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
"ہائیں۔" شہزاد چلائی۔ "تم رو رہے ہو؟۔"
"وعدہ کرو شہزاد۔ وعدہ کرو۔" وہ منت کرنے لگا۔ "تم مجھ سے انتقام نہ لو گی۔ وعدہ کرو۔"
"پاگل نہ بنو۔" وہ بولی۔
"نہیں نہیں۔ وعدہ کرو۔" ایلی نے منت کی۔
"نہیں۔ میں تم سے انتقام نہ لوں گی۔" شہزاد بولی۔ "اب نہ روؤ۔" وہ اسے تھپکنے لگی اور
وہ اس کے بلوری پاؤں پر سر رکھے روتا روتا سو گیا۔

نئی الجھن

شہزاد کے اس وعدے کے باوجود ایلی کے دل میں انتقام کا خوف جوں کا توں قائم رہا۔
اگرچہ شفیع نے اس روز وہ بات سرسری طور پر کی تھی مگر ایلی کے دل میں وہ بات گھر کر
گئی۔ اور پھر نہ جانے آصف کی موت کی وجہ سے یا امرتسر کے لوگوں کی سرگوشیوں کی وجہ سے
وہ بات ایلی کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔
جب بھی ایلی شہزاد کے پاس جاتا تو شفیع نہ جانے کدھر سے آ نکلتا اور مسکرا کر کہتا
"اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں ———۔" دفعتاً اس کی مسکراہٹ خوف
ناک سنجیدگی میں بدل جاتی اور ساری دنیا پر سکوت طاری ہو جاتا۔ خوف ناک سکوت۔ اور
فاصلے پھیلتے اور شہزاد کوسوں دور ہو جاتی اور وہ بڑبڑاتی جانو منظر سے خارج ہو جاتی۔
اکثر اکیلے میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ مجھے اچھا سمجھے۔ چاہے؟ شہزاد
ہی اور ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا خاوند ہی جو چھت پر آنکھیں گاڑنے کے باوجود

ہر بات پر مسکرا دیتا ہے اور جب بھی اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے ہونٹوں سے لعاب کا تار
نکل آتا ہے جیسے شہزاد مٹھائی کی ٹوکری ہو۔ ایسے خاوند کو چھوڑ کر ایلی سے محبت کرنے میں اسے
کیا فائدہ ہے۔ ایلی کا ناک نقشہ حسین نہ تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ رنگ سیاہ تھا
جس میں چوڑے چوڑے زرد دانت نہایت بدنما لگتے تھے۔
ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس دور میں ایلی کے
خیالات روایتی رنگ لئے ہوئے تھے۔ بہت سے روایتی اعتبار اس کے دل میں جاگزیں تھے جن
کی صحت کے متعلق اسے کبھی شک نہیں پڑا تھا۔ شک بھی کیسے پڑتا؟ یہ دور اس عمر کا وہ دور تھا
جب کہ اس کے والدین' اس کے بزرگ اور محلے کے بوڑھے اسے ایک بچے سے زیادہ حیثیت
دینے کے لئے تیار نہ تھے۔
یہ وہ زمانہ تھا جب تجربہ سب سے بڑی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ جب علم اور فکر کی کوئی
حیثیت نہ تھی اور انفرادیت دیوانگی کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں شادی ہو جانے
کے بعد دفعتاً" لوگ معزز بن جاتے تھے اور انہیں یہ حق حاصل ہو جاتا کہ وہ جملہ حقائق پر تبصرہ
کریں اور کنواروں کو صراط مستقیم کے متعلق سمجھائیں۔
اس کے والد علی احمد جب بھی ایلی کے متعلق اظہار رائے فرمایا کرتے تو ان کے انداز سے
تحقیر کا عنصر واضح ہوتا۔ ان حالات میں وہ بھلا زندگی کے مسائل کے متعلق خود سوچنے کی جرات
کیسے کر سکتا تھا۔ اسے کیسے یقین آ سکتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ ایسی
صورت میں اس کے نزدیک شہزاد کے قرب کی آرزو کرنا بھی جائز نہ تھا۔ اس خیال پر ہی وہ
چونک جاتا اور ندامت محسوس کرتا۔ چونکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے شہزاد کو چھوا تو وہ میلی ہو
جائے گی۔ ناپاک ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ایلی کی خواہش تھی کہ وہ شہزاد کو دور سے پیار کرے
ایلی کے سجدے' شہزاد کے لٹکنے والے بازوؤں' اس کے رنگین گدے سے ہاتھوں اور اس کے
بلوری پاؤں تک محدود رہے مگر اب اس کی محبت کی راہ میں ایک نئی مشکل حائل ہو گئی تھی۔
ایک ایسی مشکل جس نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

جلتا بجھتا سائن بورڈ

جب وہ شہزاد کے پاؤں پر سر جھکاتا تو چپکے سے شفیع کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے قریب آ جاتا۔

اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سفید کفن میں
لپٹا ہوا آصف منہ سے پلو اٹھا کر یوں بے بسی سے مسکراتا جیسے شفیع کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ ایلی
چونک کر اٹھ بیٹھتا اور پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر اس کی بے نیازی اور بے پرواہی کو محسوس کر
کے یہ سمجھنے لگتا کہ شہزاد کی آرزوئیں پوری نہیں ہو رہیں۔ پھر وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ ایلی
جبھی وہ تخلیہ میں اس سے دور ہو جاتی ہے اور دوری میں اسے اکساتی ہے جبھی وہ تنہائی میں
بے پرواہ ہو جاتی ہے جیسے ایلی کے وجود کا اسے احساس ہی نہ ہو۔ اور فرحت، ہاجرہ اور جانو کے
سامنے بہانے بہانے اس کا دامن کھینچتی ہے۔ چوری چوری اس کا گال سہلا جاتی ہے یا چلتے چلتے
چٹکی بھر لیتی ہے۔ ظاہر ہے وہ سوچتا کہ تخلیہ میں ایلی کو چرن تپسیہ کرتے دیکھ کر وہ مایوس ہو
جاتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں پھر سے امید کا دیپ جلا لیتی ہے۔

ان دنوں ایلی یہ نہ جانتا تھا کہ عورت کے لئے محبت محض ایک ماحول ہے۔ چرن تپسیہ
بھری نگاہوں اور رومان بھرے خوابوں سے بنا ہوا ماحول۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ عورت کو
مردانہ جسم کی خواہش ضمنی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک محبت ایک ذہنی تاثر ہے۔ جسم کو وہ محض
اس لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ طلسم نہ ٹوٹے۔ وہ تپسیہ بھری نگاہیں گم نہ ہو جائیں لیکن
ایلی شہزاد کی بے نیازی کو مایوسی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ بے نیازی احساس تسخیر و مسرت کا بے پایاں
اظہار تھی۔

ایلی ان باتوں کو سمجھتا بھی کیسے؟ اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ زبان خلق نقارہ خدا ہوتی ہے۔ اور
خدا کا نقارہ کبھی دروغ بیانی کر سکتا ہے بھلا ——— ؟ اس نے اپنے دوستوں کے علاوہ کئی بار چھپ
چھپ کر بزرگوں کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ عورت کی آرزوئیں پوری نہ
کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اور ان آرزوؤں کے متعلق کئی بار علی احمد ہنس کر کہا کرتے تھے:

"ان عورتوں کی کیا پوچھتے ہو میاں۔ یہ تو تب تک تمہاری ہیں جب تک تمہاری گرفت
میں ہیں۔ ہاتھ سے نکل گئیں تو پھر تم کون ہم کون؟"

اس نقارہ خدا کے باوجود ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے حقیقت تسلیم کرلے۔ کیا عورت
کی آرزو یہی ہوتی ہے؟ کیا شہزاد یہی چاہتی ہے؟ ——— نہیں نہیں۔ وہ جھلا اٹھتا۔ شہزاد ایسی
نہیں۔ وہ عام عورت نہیں وہ کبھی ایسی بات کی آرزو نہیں کر سکتی۔

اس کے باوجود دل ہی دل میں ایلی لوگوں کی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اس کشمکش

کش میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ٹٹولتا رہا لیکن دوسری ساعت میں سورج کی
منور کرنیں اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتیں اور وہ پھر سے اندھا ہو جاتا۔ اس کی کیفیت اس
بجلی کے سائن بورڈ کی سی تھی جو ایک ساعت میں روشن ہو جاتا ہے اور دوسری ساعت میں بجھ
جاتا ہے۔

عزم

نقارہ خدا کے شور کے باوجود شاید ایلی کبھی اس راہ پر گامزن نہ ہوتا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں
شہزاد اکتا کر اسے اپنے ہاتھ سے پھینک نہ دے۔ وہ سبھی کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر شہزاد سے
قطع تعلق اسے گوارا نہ تھی۔ اگر شہزاد کی آرزوؤں کو قرب سے تعلق نہیں تو قرب کی کوشش
سے وہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہوگی نا مایوس تو نہ ہوگی ——— اس کے دل میں ایک خاموش
عزم پیدا ہو گیا۔ گویا ایک نہتے زخمی سپاہی نے حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

کئی ایک روز وہ سوچتا رہا۔ اس کا یوں سوچتے رہنا شہزاد کے لئے خاصا پریشان کن تھا۔ وہ بار
بار پوچھتی "ایلی کیا ہے تجھے؟"

"کچھ نہیں۔" ایلی جواب دیتا۔

"نہ۔" شہزاد اشارہ کرتی۔ "یوں سوچ بچار میں نہیں پڑا کرتے۔ جب سے امرتسر سے
آئے ہو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

شہزاد کو آصف کی موت کا پتہ تھا اور اسی لئے وہ ایلی کے متعلق فکر مند تھی۔ وہ دن میں کئی
ایک بار فرحت کے ہاں آتی تاکہ ایلی کا پتہ لگ سکے۔ ہر بار وہاں آنے کے لئے وہ نئے سے نیا بہانہ
تلاش کرتی۔ اور ہر بار فرحت طنزاً بات کرتی جسے سن کر شہزادی ہنس دیتی۔ پھر وہ ایلی کے قریب
آ جاتی:

"کہو جی۔ کیا ابھی تک جنون نہیں گیا؟" وہ ہنس کر پوچھتی۔

ایلی مسکرا دیتا۔ "جنون بھی کبھی جاتا ہے؟"

"اچھے امرتسر گئے تم۔ اب چارپائی چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔" وہ ہنستی۔

"ہٹ۔" ہاجرہ کہتی۔ "وہ تو اس حالت میں بھی تمہاری طرف جانے کے لئے بے تاب رہتا

"پتہ نہیں۔" فرحت مسکرانے لگتی۔ "شہزاد نے کیا جادو کر رکھا ہے ہم سب پر۔"

"جادو تو ہو گا۔" شہزاد آنکھیں چمکا کر کہتی۔

"مجھے بھی سکھا دو۔" فرحت بات بدلنے کی کوشش کرتی۔

"اونہوں۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ تم سے اتنا تو ہو نہیں سکتا کہ خاوند کو کلّے سے لگا سکو۔"

"سچ کہتی ہو۔" فرحت جل کر کہتی۔ "یہ منہ اور مسور کی دال۔"

"اونہہ۔" شہزد آنکھیں چمکاتی۔ "خالی منہ سے کیا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی شکل و صورت والیاں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی ہیں۔" پھر وہ بات بدلتی۔ "یہ ایلی پڑے پڑے کیا سوچتا ہے؟" "تمہارے متعلق ہی سوچتا ہو گا"۔ فرحت پھر وار کرتی۔

"کیوں ایلی میرے متعلق سوچتے ہو؟۔" شہزاد ایلی پر وہی نگاہ ڈالتی۔ "جواب دو۔"

"ہاں تمہارے متعلق۔" ایلی ہنستا۔

"اب کی بار آلیں وہ۔ ان سے شکایت کروں گی۔ پھر مکر نہ جانا۔" شہزاد سنجیدگی سے کہتی۔

"ان کو تو تم نے جان بوجھ کر باہر بھیج رکھا ہے۔" فرحت چیختی۔

"ہے نا۔" شہزاد ہنستی۔ "اب تو مجھے مانو گی نا۔"

"اب تو بہت دیر ہو گئی۔ کب آئے گا شریف؟" ہاجرہ بات بدلنے کی خاطر پوچھتی۔

"کیا معلوم کب آئیں گے۔" شہزاد مسکراتی۔

شریف کا نام سن کر ایلی کا احساس گناہ جاگ اٹھتا۔ اس کے سینے پر ایک ٹھیس لگتی اور وہ مزید سوچ میں پڑ جاتا۔

سوچ بچار

امرتسر سے واپسی کے بعد چار ایک دن ایلی نے چارپائی پر گزار دیئے۔ ویسے تو وہ چل پھر سکتا تھا اور شہزاد کی طرف جا سکتا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر ادھر جانے سے احتراز کیا اور جانے میں رکھا ہی کیا تھا۔ وہاں شہزاد کے قریب پہنچ کر تو وہ بالکل ہی معدوم ہو جایا کرتا۔ بھلا ادھر جانے سے فائدہ —— اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ ادھر نہ جاتا تو شہزاد بار بار فرحت کی طرف آیا کرتی —— اس کی نگاہ کی اس اذیت و بے التفاتی سے نجات ملی ہوتی تھی۔

مسلسل سوچ بچار کے بعد ایلی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خوشی سے وہ اچھل پڑا۔ اور پھر اطمینان سے تفصیلات پر غور کرنے لگا۔

"واہ واہ کیا تجویز ہے۔"

وہ حیران تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔

پھر از سر نو اس کے دل میں خدشات پیدا ہونے لگے۔

"اگر شہزاد نے برا نہ مانا تو —— اگر وہ ناراض ہو گئی تو —— اگر کسی نے دیکھ لیا تو —— اگر بات شریف تک پہنچ گئی تو!۔"

شہزاد تیسری منزل پر چوبارے میں رہتی تھی لیکن سب سے نچلی منزل میں ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی جو شریف کے قبضے میں تھی اور جہاں انہوں نے گھر کا سامان بند کر رکھا تھا۔ بیٹھک عرصہ دراز سے بند پڑی تھی۔۔۔۔ کبھی کبھار شہزاد وہاں کوئی چیز رکھنے یا لانے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ایلی نے بیٹھک میں کپڑے کی آرام کرسیاں رکھی ہوئی دیکھی تھیں۔

دوپہر کو جب شہزاد آئی تو ایلی نے چپکے سے اس کی چابیاں اڑالیں۔ جب وہ چلی گئی تو وہ چپکے سے اٹھا۔ شہزاد کی بیٹھک کا قفل کھلا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی اندر سے چٹخنی کھول دی۔ لیکن پٹ جوں کے توں بند رہنے دیئے۔ پھر بیٹھک کے دروازے پر تالہ لگا کر واپس آ گیا۔

اگلی روز جب شہزاد آئی اور حسب معمول قریب آ کر زیر لب بولی:

"ادھر نہ آؤ گے کیا؟۔"

"آؤں گا۔" ایلی نے جواب دیا۔ "بشرطیکہ۔"

"اوہ۔ اب شرطیں لگانے لگے۔" شہزاد نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "شرطیں ہی لگائیں گے۔"

"اچھا۔" شہزاد ہنسنے لگی۔ "کیا شرط ہے؟۔"

"وہاں میں کپڑے کی ایک آرام کرسی میں بیٹھوں گا۔" ایلی نے معصوم انداز سے کہا۔

"بس۔ اتنی سی بات ہے۔ میں ابھی جانو کو بھیجتی ہوں نیچے سٹور میں وہاں رکھی ہیں دو کرسیاں۔ ابھی لے آئے گی۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

ایلی نے نفی میں سر ہلایا:

"جانو کو نہ بھیجنا۔ وہ باتیں بنائے گی۔ خواہ مخواہ طعنے دے گی۔"

"اچھا تو۔" شہزاد بولی۔ "میں خود لے آتی ہوں۔ اتنی سی بات تھی۔"

ہنستے ہنستے وہ اٹھی اور فرحت کو چھیڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ اسے جاتے پہلے تو ایلی کا دل گھبرا گیا۔ پھر ہمت کر کے دیوانہ وار اٹھا اور دوسرے راستے بیٹھک کی طرف تاکہ شہزاد کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کھلی کھڑکی کے ذریعے کمرے کے اندر جا پہنچے۔

ایلی کی تجویز کارگر ہو چکی تھی لیکن عین موقعہ پر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کی لا گہرائیوں سے نفرین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ تذلیل کر رہا ہو۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ دوسرے سے محبت کی جذبات وابستہ کرنا اس کے نزدیک قابل نفرین نہ تھا۔ مگر محبت میں جسمانی ملاپ خواہش کرنا یقیناً" گناہ تھا۔

ذہنی طور پر ایلی سمجھتا تھا کہ محبت دراصل ایک فطری تقاضا ہے۔ ایسا فطری تقاضا جس جسمانی قرب ضروری ہے مگر جذباتی طور پر وہ سمجھتا تھا کہ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایک ایسا لگاؤ جو جسم کی آلائش سے قطعی پاک ہے۔ یوسف زلیخا، ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے قصے سے اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں محرومی کا عنصر لازم ہوتا ہے اور جس کا نتیجہ موت ہوتا ہے۔ ان قصوں کے علاوہ علی احمد کے کمرے کے قرب میں رہ کر اسے جسمانی محبت سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی محبت جس نے اسے والد کے قرب اور اس کی محبت سے محروم رکھا تھا۔

بند بیٹھک

ان خیالات کے باوجود ایلی دیوانہ وار شہزاد کی بیٹھک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں شہزاد کے حسین جسم کا شوق نہ تھا بلکہ جب بھی اسے اس کا خیال آتا تو وہ گھبراہٹ محسوس کرتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ چاند کو میلا کر رہا ہو۔ اسے اپنے جسم سے نفرت تھی۔ اسے اپنی جسمانی کمتری کا شدت سے احساس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے روبرو شفیع مسکرا رہا تھا: "ان کی آرزوئیں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہیں۔"

بیٹھک کے پاس پہنچ کر اس نے دھڑکتے دل سے کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے احتیاط سے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور کباڑ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، چند میزیں کرسیاں اور دیگر سامان گرد سے اٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ کمرہ بند پڑا تھا۔ جگہ جگہ مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ مکڑے بڑی بڑی ٹانگیں پھیلائے دیواروں پر بیٹھے تھے۔ ہر جگہ گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ ایک بچھی ہوئی چارپائی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کوئی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

"اونہوں۔ پاؤں کی چاپ میں بھدا پن واضح ہے وہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدموں کی چاپ میں ایک لے ہوتی ہے۔"

پاؤں کی چاپ قریب تر ہو گئی ——— پھر وہ آواز مدھم پڑ گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دل کا ایک حصہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

وہ غور سے اوپر کی منزل کی آوازیں سننے لگا۔ شہزاد کا چوبارہ اوپر تیسری منزل پر تھا اس لئے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ درمیانی منزل میں عام طور پر سعیدہ رہا کرتی تھی جوان دنوں اپنے خاوند کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اب وہاں اکیلی رابعہ رہتی تھی۔

رابعہ اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ "خبردار۔ اسے ہاتھ نہ لگانا---- نہ تجھے جو کہا ہے بڑا پیارا بیٹا ہے یہ۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اسے اس بند کمرے سے خوف آنے لگا۔ باہر چوگان کی طرف سے شور سن کر وہ چونکا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے وہاں چھپنے کا راز آشکار ہو چکا ہو۔ اور وہ سب اس کمرے کی طرف آ رہے ہوں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس مٹی سے اٹے ہوئے کباڑ خانے میں ایلی ایک قیدی کی طرح دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ان حالات میں وہ اپنی محبوبہ شہزاد کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کی آرزوؤں کو پورا کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے۔ اور محبوبہ بھی وہ جو پہلے سے ہی کسی اور کی تھی جو ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بن

چکی تھی اور اس کا اپنا دل اس کے اپنے ارادوں پر نفرین بھیج رہا تھا اور دل ہی دل میں چوری چوری دعائیں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

دفعتاً شہزاد کی آواز سنائی دی۔ اس کی پیٹھ پر گویا ایک چوہا پھدکا۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ شہزاد کی آواز میں نہ جانے وہ لوچ کیسے آ جاتا تھا۔ اس کے گلے میں تار ہی تار تھے۔ اور اس کی ہر بات میں مینڈ سی سنائی دیتی تھی۔ شہزاد کی آواز سن کر اس کے جسم میں جھانجریں بجنے لگیں۔

مگر اس وقت وہ آواز اسے یوں سنائی دی جیسے موت کی گھنٹی بج رہی ہو۔ ایلی کا حلق خشک ہو گیا۔ دل میں دھنکی بجنے لگی اور جسم منوں بوجھل ہو گیا۔

"کیا ہو رہا ہے رابعہ؟" اوپر کی منزل سے شہزاد کی آواز سنائی دی۔

"کہاں جا رہی ہے تو؟" رابعہ نے پوچھا۔ "چابیوں کا گچھا اٹھائے۔"

"ذرا نیچے بیٹھک میں جا رہی ہوں کچھ چیزیں لانے کے لئے۔"

"جانو کو بھیج دیتی۔ وہاں تو ایک منٹ کے لئے ٹھہرا نہیں جاتا۔" رابعہ کہہ رہی تھی۔

"جانو باہر گئی ہے۔" شہزاد بولی۔

"تو انتظار کر لیا ہوتا۔"

شہزاد ہنسی:

"وہ کہاں کرتی ہے ایسے کام۔" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

اپنے احساس کمتری کو دبانے کے لئے' احساس گناہ کو معطل کرنے کے لئے اور اس آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک طریقہ تھا جیسے گھرے ہوئے کبوتر کے لئے عقاب سے بچنے کا ایک ہی طریق ہوتا ہے۔ وہ مڑ کر عقاب پر جھپٹتا ہے اور یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ ایک کبوتر ہے۔

جوں جوں آواز قریب تر ہوتی گئی۔ ایلی اپنے آپ میں وہی خود ساختہ وحشت پیدا کرنے کی سعی کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں۔ بند بند جوش سے تھرکنے لگا۔ اور وہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے اور مرد وہ ہوتا ہے جس میں وحشت اور بربریت ہو۔ وحشت اور بربریت عورتوں کو محبوب ہوتی ہے۔

دروازہ کھلا۔ شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے ڈر

کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی: "تم یہاں۔"

ایلی کی خاموشی' اور وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

"خدا کے لئے۔" وہ چلائی۔ "ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔"

وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

"ضرور تم پاگل ہو گئے ہو" وہ بولی۔ "تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔"

"ہاں ——۔" ایلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا —— "نہیں ہوں۔"

"ایلی۔ کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔"

ایک رنگین دھندلکا ایلی کے قریب تر آتا گیا۔ اور قریب اور قریب۔ اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جونک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو منہ سر جسم' وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چومنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر وہ تھک ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔ بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی۔

"چرار —— چرار ——" ریشمیں کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"ایلی۔ پاگل نہ بنو۔" ایک بار پھر مرمریں جسم میں حرکت ہوئی۔ "پاگل نہ بنو۔"

مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ ——— ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ اور معاً گردوپیش تاریک ہو گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ شکست، ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اڈا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور شہزاد کے بند بند کو چومنے لگا۔ اور بالاخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا:

"مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے ......"

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی۔ اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد اسے تھپک رہا ہو۔

فرار

پسپائی

جب وہ واپس گھر پہنچا تو وہ تھکا ہارا محروم و ناکام ایلی تھا۔ چپکے سے چور کی طرح وہ اندر داخل ہوا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اپنی چارپائی پر گر گیا۔ اس نے اپنا منہ تکیے میں گاڑ دیا اور مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اگر ایلی اس پہلی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کی تمام تر زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔ ممکن ہے محبت اور عورت کے متعلق اس کے خیالات از سر نو ترتیب پاتے۔ جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایلی کا احساس کمتری اور بھی شدید ہو گیا۔ دل میں جسم کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ عورت کا ڈر اس کی روح پر خوفناک پر اسرار سائے کی طرح مسلط ہو گیا۔ اور محبت کے تخیل میں چھوٹی روحانیت کی ایک اور کلی لگ گئی۔

نہ جانے کب تک ایلی اسی طرح تکیے میں منہ گاڑے پڑا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ اس پر ثابت ہو چکا تھا کہ اس میں آرزوئیں پوری کرنے کی صلاحیت سرے سے ہی مفقود ہے اب شہزاد کا انتقام اور بھی یقینی ہو چکا تھا۔ اب وہ کس منہ سے شہزاد کے سامنے جا سکتا تھا۔ کس برتے پر اس سے محبت جتا سکتا تھا۔

"نہیں نہیں میں اس کے روبرو نہیں جاؤں گا کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں مجھ میں کوئی ایسی خوبی نہیں جو محبت کا حق دار بنا سکے۔

میری تمام تر زندگی ہی بے کار ہے۔"

آصف نے لٹھے کی سفید چادر کو منہ سے ہٹا کر ایلی کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ گویا مسکراہٹ جیسے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ اسے بلا رہا ہو۔ "آ جاؤ ایلی آ جاؤ۔"

وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ بھاگ جائے کہیں دور بھاگ جائے۔ شہزاد کے چوبارے سے دور اس بیٹھک سے دور جہاں وہ شکست کھا کر منہ میں گھاس پکڑے سکندر کے روبرو حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ حضور مجھ سے ایسا سلوک کیا جائے جو بادشاہ بھکاریوں سے کرتے ہیں۔

اسے چوگان سے گزرتے دیکھ کر محلے والیاں چلانے لگیں۔

"کون ایلی ہے بسم اللہ۔"

"شکر ہے تو بھی گھر سے باہر نکلا۔"

"نہ بیٹا۔" ایک بولی "اپنے باپ کے قدموں پر نہ چلنا۔ اسے ہی گھر میں بیٹھے رہنے کی عادت ہے۔"

دوسری بولی "لو ماں تم بھی حد کرتی ہو یہ آج کل کی لڑکیاں تو راہ چلتے کو بلاتی ہیں۔ جادو کر دیتی ہیں اس بیچارے کا کیا دوش ہے' بس پتھر کا بنا کر چولہے پر رکھ لیتی ہیں۔"

"نہ بیٹا تو نہ پڑنا ان کے فریب میں۔"

"اللہ تعالیٰ کا فضل ہے بہن ابھی اس محلے کی لڑکیوں پر اللہ اپنا فضل ہی رکھے۔"

ایلی چوگان سے نکلا ہی تھا کہ سامنے رضا لاٹھی ٹیکتا ہوا آ نکلا۔

"نکل آئے تہہ خانے سے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "کیسے آنے دیا۔ اماں نے گود کے پٹ بند کر لئے کیا۔"

"بکو نہیں۔" وہ بناوٹی غصے میں چلایا۔

"بیٹا کچھ دن اور یونہی اندر رہے تو لاٹھی کے سہارے چلنا پڑے گا۔ تجربے کی بات کر رہا ہوں۔" رضا نے قہقہہ لگایا۔

"شرم تو نہیں آتی تمہیں۔" ایلی نے کھسیانے ہو کر کہا۔

"اونہوں۔" رضا چلایا "شرم شروع شروع میں آتی ہے' جب لکڑی اٹھا لو گے تو شرم نہیں

آئے گی۔"

"جا کہاں رہے ہو؟" ایلی نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"ابھی آتا ہوں۔ تمہیں فرصت ہو تو بیٹھنا ذرا دوکان پر۔" رضا بولا۔

رسوائی

رضا کی دوکان تک پہنچتے پہنچتے کئی ایک لوگ اسے ملے وہ سب درپردہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور باتوں ہی باتوں میں سبھی شہزاد کا طعنہ دے رہے تھے۔ اس نے اس روز پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ راز جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا تمام محلے میں زبان زد خلق ہو چکا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ لرز گیا لیکن اب کیا تھا اب تو سب ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ شہزاد کے روبرو نہیں جا سکتا تھا۔ اس خیال پر اس کے دل کو ڈھارس سی ہو گئی۔

کپ کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر اسے ارجمند یاد آ گیا جو نہ جانے اس تیل کے کارخانے میں کیسے دن گزار رہا تھا۔ کھڑکی میں کپ کھڑی نہ جانے کس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ رک گیا اور کپ کو دیکھنے لگا۔ کپ نے اسے دیکھتے ہی کھڑکی کے پٹ زناٹے سے بند کر دیئے۔

"اوہ۔" اس نے سوچا۔ "تو بات اس حد تک پہنچ چکی ہے۔"

کنوئیں کے قریب دو منزلہ مکان کے دروازے میں اپنی منگیتر کو کھڑے دیکھ کر ایلی چونکا۔

"جوان ہو گئی ہے پچھلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو بچی سی تھی۔ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ رنگ کتنا نکھر گیا ہے اور اعضاء میں نہ جانے کیا بھر گیا ہے جیسے آٹے میں خمیر اٹھ گیا ہو۔"

"ارے۔" وہ تعجب سے چلایا۔ اسے دیکھ لینے کے باوجود ثمرہ اسی طرح بازو اوپر اٹھائے ہوئے کھڑکی میں کھڑی رہی جیسے وہ ایلی کی حیثیت سے منکر ہونے کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھ کر ناک سکوڑی۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں طنز دبی ہوئی تھی ایلی کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر وہ گویا اکتا گئی۔ اس نے بے پروائی سے مگر بامعنی انداز سے تھوک دیا اور پھر اند

"ہوں۔" ——— ایلی نے مسکرانے کی کوشش کی "ہوں تو اب بات یہاں تک

اگرچہ ایلی نے بار بار چلا چلا کر لوگوں سے کہا تھا کہ منگنی محض ایک بچوں ن کا جی

اماں نے صرف اس لیے رچایا تھا کہ اس کا دل کا چاؤ پورا ہو جائے۔ اور اعلان ت حاصل ... ز اس کے

بیاہ نہیں کرے گا مگر اس وقت اپنی منگیتر کی بے پروائی اور اظہار تحقیر کو دیکھ کر اسے تکلیف محسوس ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کی توہین کی گئی ہو۔ اس خیال پر اس کا وہاں رکنا مشکل ہو گیا اور وہ سیدھا رضا کی دوکان پر پہنچا اور چپکے سے دوکان کے عقب میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

اس روزہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ محلے کے سبھی لوگ اس سے شاکی تھے۔ شہزاد کی بات دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ نہ جانے بات کیوں نکل گئی تھی۔ اس کا صرف یہی تصور تھا کہ وہ سارا دن گھر بیٹھا رہتا تھا کیا اتنی سی بات پر وہ سب اس سے بدظن ہو چکے تھے کیا اتنی سی بات سے انہوں نے وہ سب کچھ اخذ کر لیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی۔ پھر اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے نہیں نہیں اتنی سی بات سے سب کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ شاید کسی نے انہیں دیکھ لیا ہو ——— تو کیا بیٹھک ———؟ اس خیال پر اسے پسینہ آ جاتا۔ محبت کے راز کا کھل جانا اور بات تھی۔ مگر اس کی شکست کی بات کا کھل جانا ———؟

"ارے ایلی تو یہاں؟۔" ——— کسی کی آواز سنائی دی۔

گھبرا کی اس نے سر اٹھایا۔ سامنے صفدر بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی رم جھم کا عالم تھا اور ہونٹوں پر طنز تھی۔

"گھبراؤ نہیں۔" وہ بولا۔ "میں ہوں لیکن تم نے کبھی ہمیں جانا بھی ہو' سمجھا بھی ہو۔ تمہاری آواز تو اکثر سن لیتے ہیں بھئی لیکن ملنا کبھی کبھار ہوتا ہے۔"

"جی۔ جی۔" ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔

"میں آج کل نچلی بیٹھک میں ہوتا ہوں نا۔" صفدر بولا "اس کے چوبارے کے عین نیچے تمہاری آوازیں آتی رہتی ہیں ہم تو بھئی آوازوں کے سہارے جی رہے ہیں۔"

اس کی آواز میں مایوسی اور حسرت محسوس کر کے ایلی اور بھی گھبرایا۔

"مل لیا کرو ایلی۔" وہ بولا "کبھی ہم سے بھی مل لیا کرو۔ مانا کہ آج کل اونچی فضاؤں میں "بیناس کی آواز نمناک ہو گئی۔ "خدا کی قسم مجھے خوشی ہوتی ہے اس بات پر مگر ہم سے ہوں۔" رضا۔ بک نہیں۔ آیا کرو گے نا۔" یہ کہہ کر وہ بازو ہلاتا ہوا یوں دوکان سے باہر نکل گیا

"شرم تو نہ ادا کر کے جا رہا ہو۔

"اونہوں۔ نے نہ پایا تھا کہ رضا لاٹھی ٹیکتا ہوا آ پہنچا۔ "بیٹھے ہو۔" وہ باہر سے چلایا

تو ہم پر کرم ہو رہا ہے یا اس نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ آخر کب تک خاکسار سے بات چھپاؤ گے ارے دائی سے پیٹ چھپانا ——— اس ٹمیار کے دام میں پھنسے ہو بیٹا جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔"

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ان دنوں اسے یہ معلوم نہ تھا کہ راز کو محفوظ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اہمیت نہ دی جائے جھٹلایا نہ جائے۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ راز کو محفوظ کرنے کے لیے شک کرنے والے کے روبرو قسمیں کھانا ضروری ہوتا ہے اس لیے اس نے قسمیں کھانا شروع کر دیا۔

"ایمان سے ایسی تو کوئی بات نہیں تم سے کیا چھپانا ہے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" رضا نے لنگڑی ٹانگ جھلا کر کہا۔ "پر یار چاہے کتنا ہی رنگ روغن کیوں نہ ہو اندھیرے میں سب ٹمیالی دکھائی دیتی ہیں اور سب سے پسینے کی بو آتی ہے۔"

"بکو نہیں۔" ایلی نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"جو جی چاہے کہو پر بات سوچنے کی ہے پلے باندھ لو کیا یاد کرو گے کہ رضا نے نسخہ بتایا تھا پر بار کسی اور چھوکری سے لگاتے تو ہم بھی ساتھ دیتے تم کہتے تو سالی کو اٹھا کر لے آتے یہ کیا گڑبڑ ڈال دی تم نے ہماری پرواز اتنی اونچی نہیں اور پھر بعد میں نہ حاصل نہ حصول وہ تو بڑوں بڑوں کے کان کترتی ہے توبہ اک قیامت ہے سمٹی ہوئی۔" اس نے کہا "بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے میرے یار نے۔"

ایلی خاموش ہو گیا۔ رضا کے سامنے قسمیں کھانا بے کار تھا۔ بالکل بے کار۔ رضا کے پاس وہ ایک گھنٹے بیٹھا وہ بھی بادل ناخواستہ' پھر وہ واپس گھر آ گیا۔ کئی ایک مرتبہ اسے خیال آیا کہ رضا سے ساری بات کہہ دے لیکن شہزاد کی عزت کا سوال تھا۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو وہ رضا سے دل کی بات کہہ سکتا تھا یا اگر اس کا مقصد محض تفریح ہوتا تو بھی تھا۔ محبت کی بات کرنا اس قدر دشوار نہ تھا لیکن وہ اس خفت کا تذکرہ کیسے کر سکتا تھا جس کی وجہ سے ایلی تباہ حال محسوس کر رہا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر ایلی نے رضا سے بات نہ کی۔ اس کے باوجود اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ رضا سے ساری بات کہہ دے اور دل کا راز کہہ کر اس گھٹن سے نجات حاصل کرے جس کی وجہ سے وہ مضطرب تھا۔ جو اس کے بند بند میں رچی ہوئی تھی۔ وہ راز اس کے لیے ایک پھوڑا بن چکا تھا۔

اس کشمکش سے مخلصی پانے کے لیے وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں اب جاتا ہوں۔"

"ہاں بھائی۔" رضا نے مسکرا کر کہا "اب تو میرے پاس کیوں بیٹھنے لگا۔"

"رضا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔" ایلی نے منت سے کہا۔ "تیرے منہ سے ایسی
مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"میرے منہ سے تجھے کوئی بات اب اچھی لگے گی کیا۔" رضا نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔

"پھر وہی بات۔" ایلی چلایا۔ "تم سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اچھا میں جاتا
ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔

"جانے کے لیے بہانہ مل گیا نا۔" رضا نے چلا کر کہا۔ لیکن ایلی نے اس کی بات کی
پروا نہ کی---

ماں اور بیٹا

بڑی ڈیوڑھی میں ارجمند کو دیکھ کر وہ خوشی سے چلایا۔ "ارے تم کب آئے؟"

لیکن ارجمند کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ گال پچکے ہوئے تھے
چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

ایلی کی آواز سن کر ارجمند نے شور مچانے کی کوشش کی۔ "اماں کیا سمجھا ہے تم نے
لیکن کھانسی کی وجہ سے وہ پوری بات نہ کر سکا۔

چھاتی لرز رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ "کیا بات
ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "تم بیمار تو نہیں ہو؟"

ارجمند کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اس نے مسکرانے کی شدید کوشش کی "اپن کھانسی وانسی کی
پروا نہیں کرتے۔" وہ بولا۔ "کھانسی کا کیا ہے۔ اور بیماری۔ نہ بھئی اس خاکسار کو لگ بھی جائے
تو سالی کو حاصل کیا ہوگا۔ واہ یار۔"

لیکن ایلی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تمہاری یہ حالت کیا ہو رہی ہے؟"

"ہاں بھئی یہ تو ہے۔" ارجمند بولا۔ "وہ کہا ہے نا استاد نے ہمارے
میں گھل گھل کے بن گئے ہاتھی۔ استاد کی بات عین صادق آتی ہے اپن پر۔ پر تم فکر نہ کرو

آپ کیا حال ہے۔ رپورٹ دو۔ ساری کیس ہسٹری سنیں گے اپن تو کس حال میں ہیں یار
ان وطن ——— مثلاً" اس نے اشارہ کیا۔ لیکن کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ دیوار کا
سہارا لے کر کھڑا رہا لیکن دورے کی شدت کی وجہ سے اسے بیٹھنا پڑا جب دورہ ختم ہوا تو ارجمند
نے ایک بار پھر مسکرانے کی شدید کوشش کی۔

"یہ کھانسی بھی اپن سے مذاق کرتی ہے۔ اپنا سارا کھیل غارت کر کے رکھ دیا سالی نے۔
ادھر ہم نے پریم سندیس سے لڑکی پر جادو کیا ادھر اس کمبخت نے سر نکالا۔ اپنا جادو ٹونے کا کھیل
مکمل کریں یا بیٹھ کر کھانسیں---- سب ملیامیٹ کر دیا۔ اپنے گاؤں میں ایک ایسی مٹیار آئی ہے
ارے رے کیا بتاؤں کیا چیز ہے۔ سمجھ لو گھی کی مٹکی ہے اور گھی بھی وہ جیسے کچی گری ہو۔ کچی
گری کیا پھبن ہے کیا بانکپن ہے۔ اور پھر چال۔ یوں چلتی ہے جیسے ناگ رانی ہو۔" اس کی
آنکھوں میں پھر سے وہی چمک لہرانے لگی چہرے پر وہی انبساط دمکنے لگی۔

دفعتاً گلی سے ارجمند کی ماں نے سر نکالا جیسے وہ وہاں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ ماں کو
دیکھ کر ارجمند نے پینترا بدلا۔ "ارے یار۔" وہ بولا "سنائیں گے کسی وقت تمہیں یہ قصہ ارے
کبھی وہاں آؤ تو دکھائیں تمہیں سارے گاؤں کو مرید بنا رکھا ہے۔ تمہارے اس خاکسار نے۔ نام
جپتے ہیں لوگ۔" پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "اماں تو کیوں یہاں کھڑی ہے۔ کوئی کام
ہے تو حکم کر کسی سے ملنا ہے تو میں ڈھونڈ کر لے آؤں۔"

"میں تو تجھے دیکھ رہی تھی۔" ماں نے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ آنکھیں پرنم
تھیں۔

"مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیوں۔ میرے لائق کیا حکم ہے ماں۔" وہ چلانے لگا۔

"کام تو کوئی نہیں۔" وہ بولی "ویسے ہی دیکھ رہی تھی تجھے۔"

"اچھا تو صرف دیکھنا ہے۔ تو دیکھ لو۔ دیکھ لو۔ ادھر سے اور ادھر سے بھی۔" اس نے اپنا
منہ گھماتے ہوئے کہا۔

ماں ہنس پڑی۔ "تو تو مذاق کر رہا ہے۔" وہ بولی۔ "چل اب گھر چل آرام سے لیٹ تیری
طبیعت اچھی نہیں۔" "لو ماں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "ہٹا کٹا تو ہوں۔ دیکھ تو میری طرف۔" یہ کہتے
ہوئے ارجمند کو پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اسے روکنے کی شدید کوشش کی لیکن بے سود وہ
دہرا ہو کر دیوار کا سہارا لے کر کھانسنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گرنے لگے۔

"کسی کا دوش نہیں۔" وہ بولی۔ "میرے نصیب؟۔" اس نے ماتھے پر زور سے ہاتھ
"میرے نصیب وہ اس سے بڑا لڑکا تھا نا۔" اس نے ایلی سے مخاطب ہو کر کہا۔
پور جوانی آئی تھی اس پر بیٹے آنکھ نہیں ٹکتی تھی۔ اور قدیوں نکلا تھا جیسے سرسوں کا پودا
بس نظر کھا گئی اسے۔ کہتے تھے دق ہو گیا ہے۔ اونہوں دق نہیں اسے تو نظر کھا گئی۔
یہ۔" اس نے ارجمند کی طرف اشارہ کی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

ارجمند کو دورہ ختم ہوا تو اس نے بڑھ کر ماں کو آغوش میں لے لیا۔ "اونہوں ماں!
نہیں لگے گی۔ میں تو نظر بٹو ہوں۔ اور دق میں تو سینکڑوں دق ہضم کر جاؤں۔ اپن مرنے
نہیں۔ موت کی کیا مجال ہے جو ادھر ہماری اور آنکھ اٹھا کر دیکھ۔ تم تو ویسی ہی جی برا کر
اپنا۔" ارجمند نے یہ کہہ کر ماں کو آغوش میں اٹھالیا اور ایلی سے بولا۔ "ملو گے نا شام کو
کرنے چلیں گے۔" اور خود گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کی ماں چیخ رہی تھی "اب مجھے چھوڑ دے۔ چھوڑ بھی دے۔" اور وہ ہنسے جا
"کیسے چھوڑ دوں بڑی مشکل سے قابو میں آئی ہے تو۔"

یہ دن وہ دن

ارجمند کے جانے کے بعد ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ محلہ ایک ویرانہ ہو۔ ایک
ویرانہ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ گھر جانا تو اس کے لیے قطعی
ناممکن ہو چکا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ کیا کہیں گی شہزاد تو خیر اب ان کے ہاں کبھی نہ آئے گی
اس کا نہ آنا بھی تو بذات خود ایک واضح اشارہ ہو گا۔ اور فرحت کو تو طعنے دینے کی عادت
بڑی معصومیت سے کہے گی۔

"نہ جانے اب شہزاد کیوں نہیں آتی ادھر۔ کیوں ایلی کیا بات ہے؟۔" اور اس کے
میں بلا کا تمسخر ہو گا۔ شہزاد کے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس کی نگاہ میں
تحقیر ہو گی۔ "آ گئے تم۔ بڑی مردانگی کا زعم لئے پھرتے تھے۔ میری بات ہی نہیں سنتے تھے
منتیں کیں میں نے کہ نہ یہ خیال نکال دو اپنے دل سے لیکن سر پر بھوت سوار تھا
ایلی نے جھرجھری لی۔ "توبہ ہے۔" وہ بولا اور پھر سے چونکا۔ "کہاں جاؤں میں کیا کروں"

"ارے تم یہاں ایلی۔" صفدر کی آواز سن کر ایلی چونکا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو تم، تمہیں
باہر نکلنے کی فرصت مل گئی کیا۔ لیکن یار۔" اس نے پینترا بدلا "بڑے خوش نصیب ہو تم، خدا کی
تم تمہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بس صرف یہ التجا ہے کہ کبھی ہمیں بھی ملاقات کا
شرف حاصل ہو جائے۔ تمہیں نہیں معلوم ایلی۔" صفدر اپنے مخصوص انداز میں یوں کہنے لگا
جیسے سٹیج پر ڈرامہ کھیل رہا ہو۔ "زندگی میں مجھے بھی بڑے بڑے موقعے ملے ہیں۔ ایسے موقعے
کہ لوگ میری طرف دیکھا کرتے تھے۔ سر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے جیسے آج میں تمہاری
طرف دیکھ رہا ہوں لیکن ان دنوں ہم ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک عجیب شان تھی اپنی،
کسی کی آنکھ کا تارا بننے میں عجیب شان ہوتی ہے اور پھر اس کی آنکھ کا تارا جو خود زمانے بھر کی
آنکھ کا تارا ہو، جسے دنیا آنکھوں پر بٹھائے، اس کی آنکھوں کا تارا تم جانتے ہی ہو لیکن اس زمانے
میں مجھے یہ معلوم نہ تھا کبھی آنکھ سے گر کر دنیا کے پاؤں میں روندا جاؤں۔ سو آج ہم تو پاؤں میں
روندے جانے کے قابل رہ گئے ہیں۔ تم بھی روند لو۔ "لیکن بھائی ہر کسی کو۔" صفدر آہ بھر کر
بولا "وہ دن بھی میسر آتے ہیں اور یہ دن بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔" اس نے پر معنی انداز سے کہا۔
پھر دفعتاً" چونک کر بولا۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو۔ انتظار کر رہے ہو کیا۔ فرصت ملے تو آ جانا کبھی
میرے پاس اسی چوبارے کے قدموں میں پڑا رہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ یوں چل پڑا جیسے مکالمہ ادا
کر کے سٹیج سے جا رہا ہو۔

صفدر کے جانے کے بعد دنیا ایلی کی نگاہ میں اور بھی تاریک ہو گئی۔

وہ چپ چاپ محلے سے باہر نکل گیا اور شہر کی فصیل سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔
اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کس مقصد کے لئے جا رہا ہے۔ اسے صرف ایک
دھن تھی کہ شہزاد سے دور اس محلے سے دور۔ کہیں جنگل میں چلا جائے لیکن وہاں جا کر کیا کرے
یہ اسے معلوم نہ تھا۔

کوٹلی پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور کنکر اٹھا کر تالاب میں پھینکنے لگا۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا
رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے اور آسمان پر شفق کی سرخ دھاریاں دوڑ گئیں۔ پھر بھی اس میں گھر
جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ گلی کی عورتیں اسے دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اس سے پوچھیں گی
"ہے ایلی آج تو سارا دن باہر کیسے رہا۔"

کاش کہ

پھر جب شفق کی شنگرفی دھاریاں سیاہی مائل ہو گئیں تو وہ اٹھا اور محلے کی طرف چل پڑا۔

چھتی گلی کے پاس جا کر وہ پھر رک گیا۔ شاید وہ چھتی گلی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن چھتی گلی ویران پڑی تھی۔ شہزاد کے مکان کی نچلی منزل میں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ رک کر سننے لگا۔

دفعتاً" اسے خیال آیا کہ کہیں وہ باہر نہ نکل آئیں اس خیال پر وہ ڈر کر بھاگا۔

اندھیری ڈیوڑھی میں وہ دھم سے کسی چیز سے ٹکرایا۔

"ہائے۔" کسی نے چیخ سی ماری۔

اس کا دل ڈوب گیا۔

"کون ہے کون؟ " اس نے چلا کر کہا مگر اس اندھیری ڈیوڑھی پر خاموشی طاری رہی۔ پھر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی دھندلی شکل اس کے قریب ہی کھڑی ہو۔

"کون ہے کون ہے۔" وہ پھر چلایا۔ اس نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے ہاتھ چلایا۔ نرم و گرم لمس سے گھبرا کر اس نے وہ لٹکتی ہوئی چیز تھام لی۔ اس کے سامنے شہزاد کی ڈولتی ہوئی کشتی نما آنکھیں ابھر آئیں۔

"اوہ۔" —— اس نے گھبرا کر شہزاد کا بازو چھوڑ دیا۔ اور بھاگنے لگا۔

"ایلی۔" —— شہزاد کی آواز میں منت تھی۔ "ایلی افسوس ہے تم پر۔" اس نے اس کا کوٹ پکڑ لیا وہ تڑپ کر مڑا اور سمجھے سوچے بغیر وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگا۔ "میں نے جرم کیا ہے شہزاد۔ میں نے چاند پر —— وہ بات پوری نہ کر سکا شہزاد خاموشی سے بت بنی کھڑی رہی۔ "میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد نہیں ہوں۔ کاش کہ میں تم سے کبھی نہ ملتا۔ میری نگاہ تم پر کبھی نہ پڑتی۔ مجھے، زمین جگہ دے دیتی اور میں اس میں سما جاتا۔"

"ایلی۔" وہ چلائی۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ "

لیکن ایلی اس کی بات سنے بغیر بچے کی طرح روتا اور چلاتا رہا۔ "شہزاد تم اپنے دل میں کیا کہتی ہو گی۔ تم کیا سمجھتی ہو گی۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ تمہیں اپنی بنا سکتا۔ میں نے تمہیں اپنی ملکہ بنایا تھا۔ میں نے تمہیں اپنی دیوی بنایا تھا مگر میں تمہاری پوجا نہ کر سکا۔ میرے پاس ہی کیا جو تمہیں ملکہ بناؤں۔ مجھے معاف کر دو شہزاد شہزاد۔"

"ایلی۔" وہ مسکرائی اس کی آنکھیں گویا جھیلوں میں تیر رہی تھیں "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔" وہ چلانے لگا۔ "میں ۔میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میرے غلیظ ہاتھ تمہارے پاکیزہ جسم کو چھونے کے قابل نہیں۔" ایلی نے شہزاد کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے وجود سے تمہاری زندگی کو ویران نہیں کروں گا۔ صرف ایک بار' ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میری حماقت کو معاف کر دو ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا پھر میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔ چپ چاپ اور چاہے میری زندگی تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے میں کبھی بھول کر بھی —— "

"ایلی۔" وہ چلائی۔ "تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ از سر نو منتیں کرنے لگا۔ "مجھ سے غلطی ہوئی میں تسلیم کرتا ہوں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" وہ بولی۔ "ایلی میری طرف دیکھو۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ کس قسم کی عورت سمجھتے ہو مجھے کیا میں —— ؟ "

"نہیں نہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔" وہ از سر نو گھبرا گیا۔

شہزاد نے بڑھ کر اس کے بازو پکڑ لیے۔ "تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے خواہش۔" وہ رک گئی اس کی آنکھوں سے آنسو گرا۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ کیوں رو رہی تھی وہ۔

"کاش تم اس قسم کی غلطی نہ کرتے۔" وہ بولی۔ "کاش تم میرے لیے صرف ایلی ہی رہتے پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ مجھے صرف تم پیارے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں۔" وہ پھر رونے لگی۔

اگرچہ ایلی نے کبھی اس بات کو واضح طور پر تسلیم نہ کیا تھا کہ اسے شہزاد کے جسم کی ہوس تھی۔ اگرچہ وہ اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر یہ تاثر اس قسم کا نہ تھا جسے عشق کہا جا سکتا۔ خوب صورت عورتیں تو اس نے کئی ایک دیکھی تھیں لیکن اسے ان سے عشق پیدا نہ ہوا تھا۔ یہ تاثر عملی طور پر اس حد تک صرف اس لیے بڑھ گیا تھا کیونکہ اسے شہزاد کا قرب حاصل تھا کیونکہ اسے شہزاد کے قریب رہنے کے مواقع حاصل تھے۔ شاید دل ہی دل میں سوچا ہو

کہ وہ شہزاد سے تفریح کے چند لمحات حاصل کر سکتا تھا کیونکہ ایک تو شہزاد محلے والیوں کی ا
پتھر دل نہ تھی۔ اور اس لیے اس سے دل کی بات کہی جا سکتی تھی اور دوسرے چونکہ وہ مح
تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز تھی شاید اس کا خیال ہو کہ شہزاد اس کی جرات اور جسارت کا
نہ مانے گی۔

"کاش کہ تم مجھے سمجھ سکتے۔" شہزاد نے بمشکل کہا۔ "کاش کہ تم جانتے۔" یہ کہہ کر وہ
پڑی اور وہ چپ چاپ حیران وہیں کھڑا رہا۔

دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ شاید اس
خیال تھا جب وہ شہزاد سے معافی مانگے گا تو شہزاد اسے تھپک کر کہے گی اب تو معاف کر دیتی ہوں
آئندہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔ مگر شہزاد کے برتاؤ سے تو مع
ہوتا تھا جیسے وہ کسی بات پر دکھ محسوس کر رہی ہو۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں اس اعتبار پر کھڑا رہا کہ وہ دونوں اس اندھیری ڈیوڑھی میں بچوں کی
طرح آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اس کا خیال تھا کہ شہزاد وہیں کہیں چھپی کھڑی ہے اور چوری
چوری اسے دیکھ رہی ہے۔ اس صورت میں تو اسے فوراً جانا نہیں چاہیئے آخر وہ کیا سمجھے گی کہ
ایلی کا جذبہ اس قدر کمزور ہے کہ گرنے کہ بعد فوراً ہی سنبھل جاتا ہے۔ اس میں اور کوئی خو
نہ تھی بس ایک محبت ہی تھی نا صرف محبت اس لیے اس کے محبت کے جذبے میں تو اس
کمزوری نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اندھیری ڈیوڑھی میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں
اندھیرا بھی وہ جس میں نہ جانے کیسے کیسے کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے اس خیال کے آتے
وہ گھبرا گیا اور آخری مرتبہ ڈیوڑھی کا جائزہ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر جا کر دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ کیا واقعی شہزاد کو اس سے شکایت تھی۔ مگر اس
کے انداز میں غصے کی نسبت دکھ کی جھلک تھی۔ اس نے اسے دکھ تو نہیں پہنچایا تھا۔ پھر اس کی
آنکھوں میں آنسو کیوں تھے' وہ رو کیوں رہی تھی کیا وہ ایلی کی خفت پر رو رہی تھی مگر ایلی کی
خفت پر اسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ اس لیے رو رہی تھی کہ ایلی سے اسے وہ بات
میسر نہ ہو سکتی تھی۔

دراصل شہزاد کے متعلق ایلی کے خیالات اور جذبات متضاد قسم کے تھے ایک طرف وہ

اسے ایک بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا۔ ایسی ہستی جو اس قابل تھی کہ اسے دیوی بنا کر پوجا جائے۔
دوسری طرف وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک مشاق کھلاڑی تھی ورنہ وہ کبھی اس رات اس کا ہاتھ تھامنے
کی جرأت نہ کرتا اگرچہ اس خیال کو اس نے شعوری طور پر کبھی نہ اپنایا تھا وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد کا
تبسم دیکھنے والے کو شہہ دینے کی غرض سے ہونٹوں پر آتا ہے اس کی چال اس کا ہر انداز اس کی
تقریباً اس کی ہر چھوٹی جنبش دعوت تھی' صدائے عام تھی۔ اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ
شہزاد کسی کی ایسی لغزش پر دکھ محسوس کر سکتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ محلے کے تمام
نوجوان شہزاد کے گرد پروانوں کی طرح گھوما کرتے تھے اور وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر بات کرنے
کی عادی تھی۔ رفیق ریشمیں رومال ہلاتا ہوا اور جھجکتا ہوا پوچھتا۔ "میں نے کہا پوچھ آؤں شاید
کوئی سودا منگوانا ہو میں نے کہا پوچھ آؤں۔"

"ہوں تو آ گئے تم۔ میں بھی کہتی تھی۔" میں نے کہا پوچھ آؤں "صبح سے نہیں آیا۔ اچھا
تو۔" میں نے کہا پوچھ آؤں "ذرا بیٹھ جاؤ۔" پھر وہ اپنی سیاہ آنکھیں گھما گھما کر اس کی طرف
دیکھتی اور مسکراتی۔ اس وقت ایلی محسوس کرتا جیسے اس کے پوچھنے کی عادت پر مذاق اڑا رہی ہو۔
اور اسے تلقین کر رہی ہو کہ پوچھنے کی عادت چھوڑ دے اور بنا پوچھنے کی جرأت پیدا کرے۔
یا جب کبھی صفدر اس کی نظر پڑ جاتا۔ تو وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر چلاتی۔
"میں نے کہا کس خیال میں کھڑا ہے تو۔ وہ یار سن نہیں بھولی ابھی تک لیکن میں کہتی ہوں
لب آہیں بھرنے سے کیا حاصل۔ جب موقعہ تھا تب کھو دیا نا۔"

جب شہزاد اس قسم کی بے تکلف باتیں کرتی تو ایلی محسوس کرتا جیسے وہ لوگوں کو اکسا رہی ہو
— متوجہ کر رہی ہو۔ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ ایک کھلاڑی ہے۔ لیکن جب وہ پرنم
آنکھوں سے ایلی کی طرف دیکھتی اور کہتی "ہے ایلی یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے مجھے کیا سمجھتا
ہے۔" اس وقت وہ محسوس کرتا کہ اس کی بظاہر شوخی محض ایک دکھلاوا ہے اور درحقیقت وہ
ایک عظیم شخصیت کی مالکہ ہے۔

شہزاد کے دل کی گہرائیوں کو محسوس کر کے ایلی اس سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس میں
پوجا کا عنصر تھا۔ اس وقت ایلی کی نگاہ میں شہزاد دیوی کا روپ دھار لیتی تھی وہ پجاری بن کر اس
کے قدموں میں گر جاتا۔

لیکن جب شہزاد میں شوخی کا عنصر بیدار ہوتا اور وہ دوسروں سے چہک کر بات کرتی تو ایلی

آتش رقابت میں جلتا۔ اس کا دل یوں سلگنے لگتا جیسے کسی نے بھس میں آگ لگا دی ہو۔
شہزاد اس کی نگاہ میں قلو پطرہ کی حیثیت اختیار کر لیتی اور وہ سمجھتا کہ شہزاد کو اس سے کیا
نہیں وہ صرف اس سے کھیل رہی ہے جیسے وہ اک کھلونا ہو۔ وقتی تفریح کا سامان۔

اس روز اندھیری گلی میں شہزاد کا برتاؤ دیکھ کر ایلی کو بے حد تعجب ہوا آخر وہ ایلی کے
رویے پر اس قدر پریشان کیوں تھی۔ اسے دکھ کیوں ہو رہا تھا۔ ایلی کے خیال کے مطابق
اسے فرحت کے گھر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور اگر آتی بھی تو اس کے انداز میں تمسخر اور تحقیر کا
عنصر ہونا چاہئے تھا۔

ایلی گھر پہنچا تو فرحت نے اسے دیکھ کر کہا۔ "تو کہاں رہا آج سارا دن ایلی شہزاد سارا دن
تجھے تلاش کرتی رہی آج۔ توبہ ہے صبح سے اب تک بیسیوں مرتبہ آئی ہو گی ادھر۔"

"کہاں چلا گیا تھا تو۔" ہاجرہ دبی زبان سے بولی۔ "میں تو ڈر گئی۔ "کیوں خیر تو ہے۔" اس
نے پوچھا۔ "بولتا کیوں نہیں۔"

"ویسے ہی باہر چلا گیا تھا۔" ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو تو کبھی نہیں نکلا باہر۔" فرحت نے کہا۔ "ہر وقت وہیں گھسا رہتا ہے شہزاد کے پاس۔"

"اے ہے کیا کہہ رہی ہے تو۔" ہاجرہ نے فرحت کو ٹوکا۔ "چاہے کہیں رہ بیٹا لیکن یوں گھر
سے باہر نکل جانا بتائے بغیر۔ تیری تو عادت ایسی تو نہیں۔"

"لڑائی تو نہیں ہو گئی تمہاری آپس میں۔" فرحت بولی "بیچاری صبح سے سرگرداں پھر رہی
تھی۔"

"جا جا کر اسے مل آ۔ اسے معلوم ہو کہ تو آ گیا ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"نہ اس وقت میں تھکا ہوا ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔"

"اے ہے وہ بیچاری۔" ہاجرہ نے اس کی منت کی۔

"چھوڑ بھی ماں۔" فرحت بات کاٹ کر بولی۔ "زبردستی کیوں کرتی ہو۔ اس کا جی نہیں چاہتا
تو نہ سہی۔ خواہ مخواہ۔ ایسا بھی کیا ہے صبح ہو آئے گا۔"

رات کو دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ "نہیں نہیں وہ مجھے کبھی اچھا نہیں سمجھ سکتی
اور محبت۔ محبت کس برتے پر کی جاتی ہے زبانی دعوے کون خاطر میں لاتا ہے۔ بے کار
باتیں۔" اس وقت رات کے اندھیرے میں دو رنگین بازو اس کی طرف بڑھتے۔ "ایلی۔"

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔" ایلی کو پسینہ آ جاتا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ وہ پھر سے
آواز آتی۔ "آخر وہ عورت ہے اور عورت کو صرف مرد سے محبت ہو سکتی ہے۔ مرد سے۔" پھر
سوچنے لگا۔ ڈولتی ہوئی پرنم آنکھیں اس کی طرف تمسخر بھری نگاہوں سے دیکھتیں۔ "ایلی تم مجھے کیا سمجھتے
ہو۔ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے۔" نہ جانے کب تک وہ یونہی پڑا سوچتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ
گئی۔

جادو کا کھیل

صبح سویرے ناشتہ کیے بغیر وہ چپکے سے باہر نکل گیا تاکہ ہاجرہ یا فرحت اسے کچھ کہہ نہ
سکیں۔ وہ سیدھا ارجمند کے ہاں پہنچا۔

"ارے تم۔ اتنی سویرے۔" ارجمند اسے دیکھ کر چلایا۔ "کہیں تم نمازی تو نہیں بن گئے
اپنے اپدیش کا الٹا اثر تو نہیں ہو گیا۔ آؤ آؤ اماں رک کیوں گئے۔ بیٹھ جاؤ آج وہ چیز دکھائیں گے
تمہیں کہ قسم ہے عمر بھر نہ دیکھی ہو کبھی۔ کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست تھا اپنا۔ یہ کھڑکی کھولنا
ذرا۔ یہ جو سرہانے کی طرف ہے۔"

"ارے رے رے۔" وہ چلایا۔ "تم نے تو بالکل ہی کھول دی۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر
کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اماں کوئی ہوا تھوڑی کھانی ہے کہ پٹ کھول دیں۔ اپن
نے تو محض دیوی درشن کرتے ہیں اور چوپٹ کھلی ہو تو دیویاں چوکنی ہو جاتی ہیں اور پھر درشن
میں وہ بات نہیں رہتی۔ یہ اتنی درز کافی ہے اب دیکھو۔ اونہوں گھبراؤ نہیں۔" ارجمند بولا۔
"ماں لوہر نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی ہے اور باقی سب سو رہے ہیں بے تکلف دیکھو۔ سامنے
چوبارے میں ساری چھوریاں اور ڈکورے۔ باری باری جاگیں گے اور پھر جاگتے ہی ہر کوئی پہلے
آئینے کے سامنے آ کھڑی ہو گی یہ ان کی ریت ہے۔ جاگتے ہی پہلے آئینے میں اپنا آپ دیکھتی ہیں
کہ جوبن رات کو چوری تو نہیں کر لیا کسی نے آنکھیں ملیں گی۔ انگڑائیاں لیں گی۔ آہاہا۔" وہ
چلایا۔ "عورت کو دیکھنا ہو تو صبح سویرے دیکھو۔ آہاہاہا۔ کیا جوبن ہوتا ہے۔ جب وہ سو کر اٹھتی
ہے۔ آنکھوں میں خمار بال الجھے ہوئے۔ جسم گدرایا ہوا۔ اور پھر انگڑائیاں۔ وہ کہا ہے نا استاد
نے ہاتھ انگڑائی کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی۔ آہا ہا کیا کیفیت ہوئی ہے۔ واہ واہ واہ ——
لو رے۔" ارجمند چلایا۔ "وہ گئی۔ ارے دیکھ بھی۔ میرے منہ کی طرف کیا دیکھتا ہے یار۔ یہاں تو

کچھ نہیں وہ تو ادھر ہے سامنے چوبارے میں آہا۔ کیا چال ہے کیا انداز ہے۔ ہے میری جان تجھ پر قربان۔ بولو۔ وہ انگڑائی شروع ہوئی واہ واہ واہ۔ کیا انگڑائی لینے کا سلیقہ آتا ہے ان کو بوٹی بوٹی تھرک جاتی ہے سبحان اللہ۔"

اور وہ دیر تک کھڑکی کی درز سے مقابل کے چوبارے کی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھ رہا حتیٰ کہ سورج چڑھ آیا گھر کے سب لوگ بیدار ہو گئے۔ لیکن ارجمند ان باتوں میں بہت تاک وہ کب آڑے آنے والا تھا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور چلا کر لگا۔ "ماں ادھر کوئی نہ آئے۔ میں ایلی کو جادو کا کھیل دکھانے لگا ہوں۔" پھر وہ دبی آواز میں "اب دیکھ بے جادو کا کھیل واہ واہ کیا جادو گرنی ہے موسیٰ کو پاگل نہ بنا دے تو اپنا ذمہ۔" اور با آواز بلند کہنے لگا۔ "دیکھو بھئی ایلی یہ انڈا ہے انڈا۔ عام مرغی کا انڈا اس میں نہ تو بجلی ہے اور نہ اس کے اندر کوئی گیس چھپا ہے اب میں اس کو روشن کرتا ہوں۔ انڈایوں چمکنے لگے جیسے اندھیرے میں جگنو چمکتا ہے۔ ہے ہے۔" پھر وہ زیر لب چلایا۔ "ارے ادھر دیکھ نا کیا جگنو چمک رہے ہیں اندھیرے میں۔"

مرلیا باجی رے

"چاچی۔" ——— نیچے سے شہزاد کی آواز سن کر ایلی کا دل ڈوب گیا۔ "میں نے کہا گھر پر ہی ہے نا تو۔" وہ پھر چلائی۔

وہی ہے ایلی کے دل میں کسی نے کہا۔ شہزاد کی آواز محلے بھر سے الگ تھی اس میں لوچ تھا۔ ایک شوخی تھی۔

"ارے۔" ارجمند چلایا۔ "مرلیا کہاں باجی رے۔"

باہر ارجمند کی ماں کہہ رہی تھی۔ "تو شہزاد۔ تو ادھر کیسے آ نکلی۔ کہیں راستہ تو نہیں بھول گئی۔ شکر ہے تو میرے گھر آئی۔ ہے کتنی خوشی ہوئی ہے مجھے۔"

"ویسے ہی جا رہی تھی ادھر غفور کی طرف تو میں نے کہا چاچی کو دیکھ آؤں۔ سنا ہے لڑکا آیا ہوا ہے۔"

"رام رام رام رام۔" ارجمند بولا۔ "دیوی کے منہ پر واس کا نام آیا۔ ارے بے وقوف بھاگ کر دروازے کی کنڈی کھل دے کیا معلوم نام جو اپنا لیا ہے تو شاید درشن بھی ہو۔"

ارے دیکھتا کیا ہے۔" ایلی کو چپ بیٹھے دیکھ کر ارجمند نے چھلانگ لگائی اور دروازہ کھول کر پھر بستر کی طرف لپکا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ "یہ مٹی کے دیئے جھاڑ فانوس کے روبرو کیا حیثیت رکھتے ہیں۔"

ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شہزاد اس کے لیے وہاں آئی ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے لئے شہزاد اتنی دور چل کر ارجمند کے گھر آئے۔ جہاں پہلے وہ کبھی نہ آئی تھی۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ اس کشمکش میں کھویا ہوا تھا۔

"ارے او تجھے کیا ہو گیا ہے۔ زبان کیوں بند ہو گئی تیری۔ دیکھتا نہیں باہر گوکل کے کنہیا آئے ہیں واہ واہ اس کنہیا کی ہر بات نیاری ہے۔ بولتے میں جیسے تان اڑی ہو' چلتے میں جیسے راس رچائی ہو اور بات۔ ہے ہے کیا بات کرتے ہیں۔"

شہزاد کو دروازے میں کھڑی دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا اور گویا بھیڑئے کی کھال اتار کر بھیڑ کے روپ میں آ گیا۔ "سلام کہتا ہوں۔" وہ ادب سے بولا۔

"کب آیا تو۔" شہزاد نے ایلی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔

"چار روز کی چھٹی پر آیا ہوں جی۔" وہ بولا۔

"تو یہاں ہے ایلی۔" وہ ایلی کے قریب آ کھڑی ہوئی "اور وہاں گھر میں تیری تلاش ہو رہی ہے میں نے تو کہا تھا ڈھنڈورا پٹوا دو ایسے نہیں ملے گا۔"

شہزاد کے کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشبو کا ریلا آیا اور ایلی اسے محسوس کر کے مدہوش ہو گیا۔ نہ جانے شہزاد سے وہ خصوصی خوشبو کیوں وابستہ تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی خوشبو استعمال نہ کی تھی۔ اور وہ خوشبو بھی عجیب سی تھی جیسے سحر کے وقت فضا سے باس آتی ہے جسے نہ تو بو کہا جا سکتا ہے اور نہ خوشبو۔

پھر دفعتاً شہزاد نے بڑھ کر ایلی کا منہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کیا ہے تجھے جواب کیوں نہیں دیتا۔" وہ بولی دبا ہوا آتش فشاں پھٹ گیا۔ ایلی کا سر ہوائی بن کر اڑ گیا۔ اور وہ خود لٹو کی طرح گھومنے لگا اس نے جھپٹ کر شہزاد کے بازو پکڑ لیے۔ اور پھر مڑ کر شہزاد کی طرف دیکھا اس کی ابلی ہوئی آنکھوں میں منت تھی' آہ و زاری تھی۔

شہزاد نے ایک رنگین قہقہہ لگایا۔ "اوہو۔" وہ بولی "یہاں تو حالات بہت بگڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔" اور وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

کمرے پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر سیڑھیوں میں وہی چوکڑی بھرنے کی آواز سنائی دی چھن چھن چھن کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"ارے رے رے۔" ارجمند چلایا۔ "ہاہا۔ مندر میں گھنٹیاں بجیں دیوی آئی اور تو ابے او حرامی تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ سالے تو اندھا ہے۔ بدنصیب ہے۔ گدھا ہے تم ایک بار وہ اپن کا منہ سہلا دے تو دنیا تیاگ کر یوگی بن جاؤں۔ ارے دیوی سی دیوی ہے کے روبرو سب ہیچ ہیں۔ ایسا چاند ہے جو چمک کر سب تاروں کو ماند کر دیتا ہے۔ دلوا یا ہے۔ اور تو۔ تو وہاں رہتا ہے اس کے پڑوس میں۔ اور وہ تیرے منہ کو ہاتھوں سے سہلاتی اور تجھ سے اشاروں میں باتیں کرتی ہے۔ اور پھر اتنی قریب۔ رام رام رام۔ ارے دھوکے ہی میں رکھا آج تک۔"

"کیا فضول بک رہا ہے تو۔" ایلی نے چیخ کر کہا۔ "چھوڑ ــــــ" "ارے کیا چھوڑوں۔ بھنورا پھول کو چھوڑ دے چکور چاند کو چھوڑ دے پر اپن دیوی پوجا نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر دیوی بھی وہ جس کے چرنوں میں سکھ ہے شانتی ہے۔ گود نہیں چرنوں میں۔ گود والی دیویاں بیسیوں پھرتی ہیں۔ ان کی بات اور ہے۔"

شہزاد کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہاجرہ آ گئی۔ "ہے ایلی تو یہاں بیٹھا ہے سب وہاں ڈھونڈ کر پاگل ہو رہے ہیں۔" وہ چلانے لگی۔ "کسی کو بتا کر آیا ہوتا یہاں۔ کوئی بندش لگا رکھی ہے تیرے آنے جانے پر۔ نہ کھایا نہ پیا نہ کسی کو بتایا کہ میں ارجمند کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے بہن ناحق پریشان ہو رہی ہے وہ تو اللہ بھلا کرے شہزاد کا نے ڈھونڈ نکالا تجھے۔"

"ارے۔" ارجمند زیر لب بولا۔ "تو تجھے ڈھونڈنے آئی تھی۔ اپن سمجھے اپن کی قسمت پڑی۔"

"اور دیکھ بہن ویسے تو یہ اپنا ہی گھر ہے جس وقت چاہے آئے جائے لیکن بہن آنا۔" پھر وہ کمرے میں آ داخل ہوئی۔ "کیا کر رہا ہے تو چل اب گھر چل پھر آ جائے گا پاس ارجمند۔"

"سلام عرض کرتا ہوں۔" ارجمند اٹھ بیٹھا۔

"کب آیا ہے تو۔ نوکری کا معاملہ تو ٹھیک ہے نا۔" ہاجرہ نے پوچھا اور جواب سنے بغیر ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ چل بھی نا فرحت انتظار کر رہی ہے تیرا چل اٹھ پھر آ جانا۔"

مہادیو

جب وہ گھر پہنچا تو چھن سے شہزاد اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ "ماں کے کہنے پر آ گیا تو۔ اور جب میں گئی تھی اس وقت تو یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ جیسے جسم میں جان نہ ہو۔"

"آ گیا ایلی۔" فرحت اسے دیکھ کر بھاگی آئی۔ "اے ہے۔ چائے تو پی کر جاتا۔ کب سے رکھی ہے اب تو ٹھنڈی بھی ہو گئی ہو گی۔ گرم کر دوں یا پھر سے بنا دوں۔"

"مجھے بھوک نہیں۔" ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

"تو چائے ہی پی لے۔" ہاجرہ بولی۔

"میرا جی نہیں چاہتا۔" وہ روکھی آواز میں بولا۔

شہزاد نے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ اور اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ "چل جو تیرا جی چاہتا ہے وہ کھلاؤں تجھے چل۔"

فرحت نے شرارت بھری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ "تم ہی جانو کیا جی چاہتا ہے اس کا۔ اپنے بس کی بات تو نہیں۔"

"جبھی تو لیے جا رہی ہوں اسے۔" شہزاد نے ہنس کر کہا۔ "تم بیچاری کیا جانو۔"

"ہاں ہاں۔" ہاجرہ بولی "لے جا اسے لے جا بس خوش رہے میں تو یہی چاہتی ہوں۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی۔"

پہلے تو ایلی نے بازو چھڑانے کی خفیف سی کوشش کی لیکن شہزاد سے بازو چھڑانا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے گیند کی طرح لڑھکتا چل پڑا۔

"توبہ ہے۔" وہ اکیلے میں کہنے لگی "بڑے نخرے آ گئے ہیں تجھے۔ مانتا ہی نہیں کسی صورت۔ دو روز سے پاگل کر رکھا ہے مجھے۔"

"لے بیٹھ یہاں۔" شہزاد نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اسی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "توبہ ہے دو روز سے کیا حال کر دیا ہے۔ میری طرف دیکھ۔" اس نے ایلی کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام

لیا شہزاد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا ایلی۔" اس نے پوچھا۔

شہزاد کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایلی کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ وہ دھم سے اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ "میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد۔" وہ بولا۔ "میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ میں نااہل ہوں ہیچ ہوں ہیچ۔" اس کی گھگھی بندھ گئی۔ شہزاد نے اس کا سر اپنے جسم سے لگا لیا اور تھپکنے لگی۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھو۔ جو حالت میری ہوئی ہے تمہارے بغیر میں ہی جانتی ہوں۔"

"میں کچھ کھا کر مرجاؤں گا۔ زندگی بے کار ہے اب۔" ایلی نے کہا۔

"چپ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم مرجاؤ گے تو میرا کیا ہو گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے ایلی۔ مجھے تمہاری لگن ہے صرف تمہاری تم سے کچھ نہیں چاہئے۔ بس تم میرے پاس رہو۔ میرے سامنے رہو اور کچھ نہیں مانگتی میں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ چلایا "میں اپنی زندگی ختم کروں گا۔ اگر تم سے محبت نہیں کر سکتا تو دنیا ہیچ ہے ہیچ ہے۔"

"محبت اسے نہیں کہتے پگلے۔" وہ بولی۔ "مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ مجھے صرف ایلی چاہئے۔ صرف ایلی۔" اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرا۔

ایلی سسکیاں بھرنے لگا۔ "تم اتنی حسین ہو تم اتنی پیاری ہو۔ دنیا تمہارے روبرو ہیچ ہے شہزاد تم اتنی رنگین ہو کہ تمہیں دیکھ کر میں نشے میں جھومنے لگتا ہوں۔ تمہیں محسوس کر کے میری کائنات بدل جاتی ہے اور میں میں ایک ذلیل نااہل شخص ہوں۔ ہیچ ہوں۔"

"تمہیں کیا معلوم۔" وہ بولی "تم کیا ہو۔ چھوڑو اب۔ معاف کر دو مجھے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے یوں ہاتھ جوڑے کھڑی دیکھ کر وہ دیوانہ وار اٹھا اور شہزاد کا بند بند چومنے لگا۔ جانو کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ الگ ہو گئی۔ اور کھڑکی میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے روز ازل سے وہاں کھڑی ہو۔ پھر جانو آئی تو شہزاد بولی۔ "کیا کر رہی ہے تو جانو کچھ خبر بھی ہے تجھے کتنی محنت سے ایلی کو تلاش کر کے لائی ہوں اب اگر تو نے اس مہادیو کی خاطر تواضع نہ کی تو پھر روٹھ کر چلا جائے گا۔"

"بڑا مہادیو ہے منہ تو دیکھو۔" جانو نے کہا۔ "نخرے کرتا پھرتا ہے اول تو گھر سے باہر نہیں نکلتا

اور باہر نکل جائے تو پھر اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دیکھ تو چوہے کی صورت۔"

"اونہوں ایسی باتیں نہ کر۔" شہزاد نے جانو سے کہا۔ "تیری ایسی باتوں کی وجہ سے تو ناراض ہوا تھا یہ۔"

"ہونہہ میری باتوں سے۔" جانو چلائی "میری باتوں سے جو ناراض ہوتا ہے تو پڑا ہو میں تو سچی بات کرنے سے نہیں چوکوں گی۔"

"اچھا بابا تو نہ چوک سچی بات کرنے سے پر اب تو جا کر چائے بنا لا ساتھ کچھ کھلا بھی دے۔ کیا یاد کریں گے تجھے۔ کیا کھائے گا تو ایلی۔ آج جو مانگے گا ملے گا۔ پر چیز کھانے والی ہو۔" اس نے اعلانیہ طور پر آنکھیں مٹکا کر کہا۔ "کیوں جانو۔ ہے نا۔" شہزاد ہنسی۔

نہ میں نہیں سمجھتی تمہارے یہ اشارے اللہ ماری آنکھوں آنکھوں میں بات کہہ جاتی ہو مجھے نہیں پتہ چلتا کچھ۔ تو جانے اور تیرا ایلی جانے۔"

"کیوں ایلی کیا جانے ہے تو۔" شہزاد نے اس سے پوچھا۔ "اور جانو میں تو کچھ جانتی ہی نہیں جانتی تو تو ہے۔ جبھی تو تیرا نام جانو ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

جانو ہنستی اور چلاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

جانو کے جانے کے بعد شہزاد پھر اسی طرح ایلی سے دور بے نیاز بے خبر ہو کر بیٹھ گئی اور سلائیوں کے کام میں مصروف ہو گئی۔ اور ایلی دیوانوں کی طرح اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

جوشِ رقابت

اگلے روز جب وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے بہت دور بیٹھے تھے تو شریف آ گیا۔ شریف کو دیکھ کر ایلی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو وہ گھبرا کر اٹھا۔ بات کرنے کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے تھے زبان میں گویا قوت گویائی مفقود ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بازوؤں کو کیسے سنبھالے جو ٹکٹک کر گویا زمین سے جا لگے تھے اس نے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی باچھوں پر گویا تالے لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس حد تک کھل گئی تھیں کہ کوشش کے باوجود وہ انہیں قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

"میں میں ایں۔ آپ آپ۔ یعنی میں۔" اس نے شریف کے آنے پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔

شہزاد اطمینان سے بیٹھی اپنی کام میں یوں مصروف رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے شریف کا آنا یا نہ آنا۔ ایلی کا اس قدر قریب بیٹھے ہونا یا نہ ہونا سب برابر ہو۔

"کیوں ایلی۔" شریف نے کہا۔" خوش ہو تم بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔ جاؤ ذرا حقہ تو بھرنا۔"

"چائے بھی تو بنا دو جانو۔" شہزاد بولی۔ "اور کھانا بھی تو کھائیں گے۔"

شریف نے بیک وقت متبسم اور مغموم نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ لیکن شہزاد اپنے کام میں مصروف تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے کھسک جانا چاہیے اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کے گھر میں محسوس کیا جیسے اس کی حیثیت جملہ معترضہ کی ہو۔ کچھ دیر وہ وہاں بادل ناخواستہ بیٹھا رہا پھر اٹھا۔ "ابھی آؤں گا۔" وہ بولا "ذرا گھر سے ہو آؤں۔"

"اچھا۔" شریف نے جواب دیا۔ "لیکن آنا ضرور تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔" ایلی نے سوچا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شریف صورت حالات سے پورے طور پر واقف ہے جیسے اسے علم ہے کہ ایلی وہاں کیوں آتا ہے اور اس نے اسی بارے میں باتیں کرنی ہیں۔

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا۔

"کیوں کیا ہوا؟۔" ہاجرہ دوڑتی ہوئی آئی۔ "خیر تو ہے۔ پھر کوئی بات تو نہیں ہوگئی۔"

"بات کیا ہوئی ہے۔" فرحت نے ہنس کر کہا۔ "گھر والے اپنے گھر آگئے اور کیا۔"

"کیا مطلب ہے تیرا فرحت؟۔" ہاجرہ نے پوچھا۔

"شریف چھٹی لے کر آیا ہے اور کیا۔" فرحت بولی۔

"ہائیں شریف آیا ہے۔" ہاجرہ نے حیرانی سے دہرایا "لیکن اس میں کیا ہے۔"

"پوچھو ایلی سے۔" وہ بولی "آخر اس نے تو گھر آنا ہی ہوا۔"

اس وقت ایلی اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے فرحت کی بات کا برا نہ مانا اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شریف کی آمد پر اسے دکھ کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ شریف کو تو وہ بہت اچھا سمجھتا تھا وہ تو ایلی کا پیارا دوست تھا پھر اس کی آمد اس قدر ناگوار کیوں ہو رہی تھی خواہ مخواہ غصہ کیوں آ رہا تھا۔ [illegible] ویران کیوں ہو [illegible]

دیر تک وہ چارپائی پر پڑا کروٹیں لیتا رہا۔ پھر سیڑھیوں میں چھن چھن کی آواز سن کر چونکا۔

"ایلی کہاں ہے۔" شہزاد مجسم تبسم بنی ہوئی سامنے کھڑی تھی۔

اسے اکیلا دیکھ کر وہ بولی "تم بھاگ کیوں آئے۔ خواہ مخواہ چلے آئے۔ واہ یوں کسی کو اکیلا نہیں چھوڑا کرتے۔ چل اٹھ۔"

"میں نہیں جاتا۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"کیسے نہیں جاتے۔" اس نے اس کے گال سہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں جاتا۔" وہ غصے میں اس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "تم جاؤ۔ اپنے میاں کا دل بہلاؤ جا کر میں آؤں یا نہ آؤں تمہیں کیا پڑی ہے۔"

"اوہو۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ میرا وہاں کیا کام۔ کوئی آئے یا جائے مجھے کیا۔"

"پاگل ہوگئی ہو۔" وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ "یہ سب لوگ کیا کہیں گے۔"

"پڑے کہیں۔" وہ بولی "مجھے نہیں پروا۔"

"میاں سے پٹو گی تم۔" ایلی نے مصنوعی غصے سے کہا اگرچہ شہزاد کی باتیں سن کر اسے ایک ان جانی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی خاطر شہزاد سبھی کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ دنیا بھر سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھی۔

"پٹو نگی۔" وہ چلائی۔ "مجھے کون پیٹ سکتا ہے جی۔" وہ تمسخر سے بولی۔ "وہ بیچارا کیا کرے گا اس کی کیا مجال ہے۔ چلو اٹھو ——— ورنہ ———"

"ورنہ کیا؟۔" ایلی نے پوچھا۔

"ورنہ میں بھی یہیں لیٹ جاؤں گی تمہارے ساتھ۔"

ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "پاگل ہوگئی ہو۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں ہوگئی ہوں۔" وہ بولی۔

"کون ہو گیا ہے پاگل۔" فرحت نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں اور کون۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "تم سب تو سیانیاں ہو۔ پاگل تو ایک میں ہی ہوں۔"

"کیوں ہوتی ہو پاگل۔" فرحت بولی "حکیم نے کہا ہے کیا۔"

"حکیم نے تو نہیں کہا۔" وہ اٹھ کر بولی۔ "البتہ تم ایسے سیانوں کو دیکھ کر جی چاہتا ہے
ہو کر کہیں نکل جاؤں۔"

شہزاد کے انداز تکلم میں غضب کی دھار تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم
تھا۔ "اب آؤ گے بھی یا نہیں۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اب آ بھی جاؤ۔ وہ انتظار
رہے ہیں چائے سامنے رکھی ہے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

ایلی وہاں پہنچا تو شریف چائے کا پیالہ سامنے رکھے اسی طرح چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے
بیٹھ تھا۔ ایلی کو دیکھ کر اس نے اپنی مخصوص حسرت زدہ مسکراہٹ سے کہا۔ "نہ جانے کیا بات
ہے جسے چاہو وہی دور بھاگتا ہے۔ اب یہ ایلی بھی محبوب سے نخرے کرنے لگا۔ اپنی قسمت ہی
ایسی ہے۔"

"نہیں نہیں۔" ایلی چلایا "میں تو وہاں ——— "

انوکھے اظہار

"اب چھوڑو ان بہانوں کو۔" شریف نے کہا۔ "یہ بہانے اپنے لیے نئی چیز نہیں تم سے کہ
طبیعت ملی تھی سوچا تھا خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے لیکن اب تم بھی کنی کترانے لگے۔ ہاں
یاد آیا۔ یہ تو بتاؤ امرتسر والی کا کیا حال ہے کچھ بات بنی یا نہیں۔ اسے علم ہوا یا نہیں۔ کیوں نہ ہو
گا علم محبت اثر کیسے بغیر رہ سکتی ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے بڑھ
کر اور کوئی طاقت نہیں۔ تو بتاؤ نا ہمیں۔ کیا وہ بھی مضطرب ہے۔ کیا اسے بھی خیال ہے۔ ضرور
ہو گا۔ لیکن اس کا اظہار بھی ہوا ہے یا نہیں۔ تمہارے جذبے کی آزمائش ہے ایلی۔ دیکھنا
تمہارے جذبے میں کتنا اثر ہے۔" ایلی کو خاموش دیکھ کر شریف نے کبوتر کی سی آنکھیں پھیلاتے
ہوئے کہا۔ "کیوں تمہیں تو معلوم ہے کچھ۔" اس نے شہزاد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"سارے محلے میں چرچا ہے۔" شہزاد بولی "سنا ہے حسن میں جواب نہیں اس کا جبھی تو ان
کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ دیکھو تو اس کی طرف مجھ سے کہتا تھا۔" وہ ہنسی بے تحاشہ ہنسی چلی
گئی۔ "مجھ سے کہتا تھا کہ زہر کھا لوں گا۔" ایلی نے غصے سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

"اب دیکھ لیجئے کیسے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ پر ایمان سے کہنا ایلی تم نے کہا نہیں تھا مجھ
سے میں زہر کھا لوں گا۔"

ایلی حیرانی سے شہزاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے باکی دیکھ کر وہ گویا سکتے میں
آگیا تھا۔

"اونہوں۔" شریف مسکرایا۔ "زہر کھانا مردوں کا کام نہیں۔"

"یہی میں نے اس سے کہا تھا۔" شہزاد قہقہہ مار کر ——— ہنسی "لیکن یہ کہتا ہے میں مرد
نہیں۔ کوئی پوچھے کیسے نہیں۔ میں تو مرد سمجھتی ہوں اسے۔"

"زہر کھانا یا مر جانا مرد کا کام نہیں۔" شریف بولا۔ "میری طرف دیکھو جی رہا ہوں۔ اتنا کچھ
جھیل کر بھی جی رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ اس کو بھی خیال ہے تمہارا یا نہیں۔"

شہزاد نے پھر قہقہہ لگایا۔ "وہ تو مرتی ہے۔" وہ بولی "اسی کو یقین نہیں آتا یہ سمجھتا ہے کہ
اسے ذرا بھی پروا نہیں۔ اب وہ بیچاری کیا کرے۔"

"کیوں ایلی۔" شریف نے پوچھا۔

ایلی شہزاد کی دو دھاری باتوں پر طیش میں آ رہا تھا۔ لیکن ان باتوں میں جو کنایہ کی مدد سے
ایلی سے کی جا رہی تھیں ایک عجیب سی لذت تھی۔

"کیوں مذاق کر رہی ہیں آپ۔" ایلی نے شہزاد کو گھورا۔

"مذاق۔" وہ بولی۔ "اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی اس
قدر سنجیدگی سے بات نہیں کی۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہیں یقین نہیں آتا اب میں کیا کروں۔"
شہزاد کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایلی گھبرا گیا۔ وہ شریف کی موجودگی میں براہ راست اس
سے وہ باتیں کر رہی تھی جو اس نے ایلی سے کبھی تخلیئے میں بھی نہ کی تھیں۔
اور شریف بھولا بھالا شریف مسکرا رہا تھا۔ "ٹھیک کہتی ہے یہ۔" وہ شہزاد کی طرف اشارہ کر
کے کہہ رہا تھا۔ "ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے کی بات کا یقین نہیں آتا۔" "بس ایلی کو
یقین ہی نہیں آتا۔" شہزاد بولی۔ "اب میں کیسے یقین دلاؤں اسے۔"

"ہاں ہاں۔" شریف نے کہا ——— پھر اس نے آہ بھری لیکن وہ بولا "جب عشق پرانا ہو
جاتا ہے تو پھر دنیا ہی بدل جاتی ہے نہ شکوک نہ گلہ نہ بے یقینی۔"

"نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔" شہزاد نے حسرت ناک آواز میں کہا۔

"کب آئے گا؟۔" شریف چونک پڑا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس کر بولا۔ "اچھا تو تم ایلی کے
متعلق کہہ رہی ہو۔ میں سمجھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"اور کیا آپ کے متعلق کہہ رہی ہوں۔" شہزاد قہقہہ مار کر بولی۔ اس کی بات اور لہجہ
دونوں میں بلا کی تحقیر تھی۔ ایلی کانپ گیا۔

شہزاد اس کے نزدیک ایک معمہ تھی۔ اس میں بلا کی جرأت تھی اور وہ بات اعلانیہ کہنے
سے ہچکچاتی نہ تھی اور سب سے عجیب ترین بات یہ تھی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں
ایلی سے اس قدر قریب ہو جاتی تھی جیسے اس کی گود میں بیٹھی ہو۔ اس کے اشارات کس قدر
واضح اور رنگین ہوتے تھے اس کی حرکات سے محبت آمیز شرارت یا شرارت آمیز محبت ٹپکتی تھی
لیکن تنہائی میں اس کا انداز قطعی طور پر بدل جاتا تھا جیسے وہ ایلی کے وجود ہی سے منکر ہو۔ اس
کے خدوخال پر سرد مہری کا دبیز پردہ پڑ جاتا اور اس کا حسن بے جان ہو کر رہ جاتا تھا۔ رات کو
جب ایلی اپنے بستر پر پڑا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل کر شریف کو دھوکا دے رہے ہیں اس
کا مذاق اڑا رہے ہیں اور معصوم اور پیارا شریف بے خبری میں دھوکہ کھائے جا رہا ہے دونوں کے
ایک دوسرے سے اظہار محبت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ایلی کو یہ باتیں سوچ کر دکھ ہو رہا تھا وہ محسوس کر
رہا تھا کہ وہ ایک مجرم ہے۔ اسے شریف سے ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی جب
اسے یہ خیال آتا کہ شریف اس وقت شہزاد کے قریب بیٹھا ہو گا۔ وہ اس سے اظہار محبت کر رہا
ہو گا۔ اور شہزاد اپنے خاوند کی آمد پر شوق محبت سے بے تاب ہوئی جا رہی ہو گی تو اس کے سینے
پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور اسے شریف سے نفرت ہونے لگتی۔ "لاحول ولا قوۃ کیا بیہودہ آدمی ہے
بے وقوف جس کے منہ سے ہر وقت رال ٹپکتی ہے۔ جو ہر وقت کبوتر کی طرح آنکھیں پھاڑ کر
چھت کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ جو شہزاد سی رنگین شخصیت کے قریب بیٹھ کر بھی
گذشتہ عشق کی محرومی پر آہیں بھرتا رہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ شہزاد کے قابل نہیں۔ انہیں ایک
دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی اور موت کی طرح وہ دونوں متضاد چیزیں ہیں
شہزاد زندگی ہے رنگینی ہے اور شریف مایوسی حسرت اور موت۔" لیکن اس کے بعد اسے خیال
آتا "شہزاد اسے کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ کیوں برداشت کرتی ہے۔" پھر اسے شہزاد کے خلاف
غصہ آنا شروع ہو جاتا اور اس کے تخیل میں شہزاد اور شریف کے قرب کی عجیب تصاویر رقص
کرتیں اور دل میں رقابت کی جلن محسوس ہوتی۔

کروٹیں

اس روزہ وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ جب کبھی

بھی اس کی آنکھ لگتی تو گویا کوئی اسے جھنجوڑ کر جگا دیتا۔ "اٹھو وہ قریب آ رہے
ہیں ایک دوسرے کے قریب۔" وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا اس کے ذہن کی چادر پر پھر سے تصاویر
متحرک ہو جاتیں۔ شہزاد برہنہ حالت میں آ کھڑی ہوتی اس کا چہرہ خواہش کی شدت سے بھیانک
ہو جاتا اس کا جسم غلاظت کے کیڑے کی طرح گندگی کی طرف رینگتا۔ اس کی آنکھوں میں
وہاں شعلے لپکتے۔ اور وہ شریف کی طرف بڑھتی جاتی۔ ایلی کے دل میں درد بھری ٹیسیں اٹھتیں
اور وہ بے تاب ہو کر تڑپتا۔

ساری رات وہ پہلو بدلتا رہا ساری رات وہ تڑپتا رہا۔ رقابت اور تکلیف کا یہ احساس اس
کے لیے بالکل نیا تھا۔ نیا اور بے حد تکلیف دہ اگلے روز جب شہزاد اسے بلانے آئی تو ایلی نے
خشک انداز میں جواب دیا۔ "تم جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

لیکن شہزاد نے اصرار کیا۔ "میں تو ضرور ساتھ لے کر جاؤں گی کوئی بات ہے۔ تمہارا کیا
اعتبار بات کر کے مکر جاؤ۔" شہزاد نے اس بات پر اس قدر ہنگامہ مچایا کہ ہاجرہ کے اصرار پر ایلی کو
جانا ہی پڑا۔

"سیڑھیوں میں جب وہ اکیلے تھے تو شہزاد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور وہ بولی "پارہ بہت چڑھا
ہوا ہے آج۔"

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔" ایلی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"کیوں کیا ہے اس ہاتھ کو۔" شہزاد بولی۔

"اس ہاتھ سے شریف کے منہ کی رال کی بو آتی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"شریف کے منہ کی رال۔ ہونہہ۔" وہ نفرت سے کہنے لگی۔ "تم نے کیا سمجھا ہے مجھے۔"

"کیا ہو تم۔" ایلی نے پوچھا۔

"میں میں ہوں۔" وہ سینہ تان کر بولی۔

"اور وہ تمہارا خاوند ہے نا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہو گا۔" وہ بولی۔ "پڑا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"رات بھر محفل گرم رہتی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ہونہہ محفل گرم رہتی ہے۔" وہ بولی۔ "وہ بیچارہ کیا محفل گرم کرے گا۔" تو تم کرتی ہو

گی۔" ایلی نے کہا۔

"کبھی کروں گی ہی نا۔" شہزاد نے آہ بھر کر کہا۔ "دیکھ ایلی میری بات سن۔" شہزاد نے
دونوں شانوں سے پکڑ کر کہا۔ "کسی کو مجال نہیں ہے جو مجھے ہاتھ لگائے۔ تم تو ناحق جلتے ہو۔"
"لیکن وہ تمہارا مالک ہے۔ تمہیں ہاتھ لگانے کے لیے ہی چھٹی لے کر آیا ہے۔
ملنے کے لیے۔ تمہاری آرزو لیے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ "چلو چل کر مالک کی
صورت دیکھ لو پہلے۔" یہ کہہ کر ہنستی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

پھنس گئی تو پھڑکن کیسا

"معلوم ہوتا ہے۔" شریف نے ایلی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "اب تمہیں بھی میرا خیال
نہیں رہا مجھ سے محبت نہیں رہی کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ ہماری قسمت میں تو انتظار
لکھا ہے۔" نہ جانے کیوں شریف نے نیچی نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ جو اس وقت
مشین پر بیٹھی کام میں مصروف ہو چکی تھی جیسے گرد و پیش کے متعلق کچھ خبر ہی نہ ہو۔ "یہ
باہر جا کر ہی ہنستی ہے۔" شریف نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا "ہمارے ساتھ کوئی بھی
ہنستا۔"

"روتوں کے ساتھ کون ہنسے۔" شہزاد بولی۔ "سن رہے ہو ایلی۔ سچ کہہ رہی ہوں نا"
"یہ بھی ٹھیک ہے۔" شریف نے آہ بھر کر کہا۔ روتوں کے ساتھ کون ہنسے۔ "چلو نہ ہنسو
روتے کو تسلی تو دو اس کے آنسو تو پونچھو اس سے ہمدردی تو کرو۔"
"نہ جی۔" شہزاد بولی "یہ یتیم خانہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ہر وقت روتوں کو چپ کراتے
رہیں۔"

"سن لیا تم نے۔" شریف نے ایلی سے کہا "یہی خوش نہ ہو سکی تو کس کو خوش کر سکتا
ہوں میں۔ اپنے اپنے نصیب ہیں بھائی۔ تم پر امید باندھی تھی تم نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ میں
بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کب ایلی آئے۔ شاید تمہارا بھی میرے پاس بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔
ٹھیک تو ہے ہری کونپلیں سوکھے پتوں سے کیسے لگاؤ رکھیں۔ ہم تو اب سوکھے پتے ہو
ہو چکے۔" اس نے پھر سے چھت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اور باتیں کرتے ہوئے اس کے
منہ سے رال کے تار لٹکنے لگے۔

شریف نے ٹھنڈی آہ بھری "کبھی ہم بھی ہری کونپل تھے۔ کبھی ہم میں بھی زندگی تھی۔
لیکن زمانے نے وفا نہ کی۔ محبت راس نہ آئی۔ لوگ سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں لیکن یہ
برداشت نہیں کر سکتے کہ دو محبت کرنے والے ملیں۔ زمانے کا رنگ ہی ایسا ہے لیکن۔" وہ یک دم
جلال میں آ گیا۔ "وہ محبت کو زندگی سے خارج نہیں کر سکتے صرف محبت کرنے والوں کو ایک
دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔
کیوں ایلی ٹھیک ہے نا۔" شریف نے مسکرا کر ایلی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم بھی ان
سے ڈرنا نہیں۔ ان کی پروا نہ کرنا۔ اپنے آپ میں جرأت پیدا کرنا۔ سچائی میں جرات ہوتی ہے
ایلی۔"
"نہ۔" شہزاد بولی "اس کا تو ڈر ڈر کر برا حال ہو رہا ہے۔ اس سے دلیری کی امید رکھنا
لاحاصل ہے۔" شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔
"کیوں ایلی ٹھیک کہتی ہے یہ تم ڈر جاؤ گے کیا؟۔" شریف نے پوچھا۔
"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔
"لو دیکھ لو۔" شہزاد ہنسی۔ "یہ تو اتنی سی بات پر گھبرا جاتا ہے۔"
شریف نے شہزاد کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "لیکن یہ بتاؤ ایلی کیا اسے تمہاری پرواہ ہے۔
کیسی ہے وہ۔"
"وہ۔" ایلی نے دہرایا۔ اور پھر پہلی مرتبہ اس نے جرأت سے کہا "اتنی رنگین ہے وہ۔" وہ
معنی خیز نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"اتنی رنگین ہے اتنی شوخ ہے اتنی پیاری ہے کہ میں کیا بتاؤں۔"
"لیکن کیا وفادار بھی ہے یا نہیں۔" شریف نے پوچھا۔
"وفادار ——" ایلی نے پھر شرات سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہ بھر کر بولا
"پیاریوں میں وفا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ بلند و بالا جو ہوئی۔ وہ بیچاری وفا کیا جانے۔"
"جھوٹ۔" اتنی وفا ہے اس میں۔" شہزاد نے مشین چلاتے ہوئے کہا۔ "کہ کیا بتاؤں۔"
"تم کیسے جانتی ہو اسے،" شریف بولا "خواہ مخواہ۔"
"واہ میں نہیں جانتی تو کون جانتا ہے۔" "وہ قہقہہ مار کر بولی "وہ تو ——"
"لیکن ——" ایلی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ایلی کے لیے وہ سلسلہ گفتگو ناقابل برداشت اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر
تھا کہ وہ براہ راست محبت کی باتیں کر رہے تھے عہد و پیماں کر رہے تھے اور وہ پردہ جس کے
انہوں نے اپنے جذبات کو چھپایا ہوا تھا۔ ہر ساعت باریک سے باریک تر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن
کاٹنے کے بعد وہ گھبرا گیا اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔

پھر گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ "لیکن مجھ میں کونسی خوبی ہے کہ وہ مجھ سے
کرے۔ میری شکل و صورت ملاحظہ ہو۔"

شہزاد ہنس پڑی۔ "سبھی عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں۔" وہ بولی "وہ شکل و صورت نہیں
جانتیں۔ خوبیاں نہیں تلاش کرتیں۔ سمجھ لو پھنس جاتی ہیں اور بس پھنس گئی تو پھڑکن کرا
وہ ہنسی اور پھر بولی۔ "اور پھنس جائیں ایک بار تو پھر باہر نکلنا پسند نہیں کرتیں۔ عورتوں کا
ہے۔" شہزاد نے آہ بھر کر کہا "ڈٹ جائیں تو دنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں کو
چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں۔ تو نالی کے کنارے بیٹھ کر رو دیتی ہیں۔"

"بڑی سیانی ہو گئی ہو تم۔" شریف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ایلی کے لیے اس موضوع پر باتیں کرنا بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا
تھا۔ شہزاد کی ہر بات ہر حرکت واضح طور پر ایلی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ اس قدر اشارات
واضح ہو چکے تھے۔ ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔" وہ بولا "مجھے ارجمند کی طرف جانا ہے وہ آج واپس جا رہا ہے
اس کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اسے مل کر واپس آؤں گا۔"

"کب آؤ گے؟" شریف نے پوچھا۔

"اور اگر نہ آئے۔" شہزاد بولی "تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے سنا تم نے۔"

سیڑھاں اترتے ہوئے ایلی سوچنے لگا۔ کہ کہاں جائے۔ ارجمند نے واقعی اس روز علی پور
سے جانا تھا۔ اور اس نے ایلی سے تاکید کی تھی کہ اسے ملے۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں
عجیب و غریب جذبات چھلک رہے تھے۔ شہزاد کی ایک ایک بات جو اس نے اشارتاً اس سے کہی
تھی اس کے دل میں طوفان بن کر کھول رہی تھی۔ دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی ویرانے
میں جا کر رو دے۔ کسی کھیت میں اوندھے منہ پڑ کر چیخیں مارے۔ حتیٰ کہ شام ہو جائے اور پھر
رات کے اندھیرے میں چپکے سے چارپائی پر پڑ کر شہزاد کے تصور میں اپنا آپ کھو دے۔

واقعی شہزاد سے محبت ہو چکی تھی۔
وہ سلسلہ جو محض ایک تفریحی حرکت سے شروع ہوا تھا ایک عظیم جذبے میں تبدیل ہو چکا
تھا یا تو اپنے اس خود ساختہ اعتبار کو جذبات کی بھٹی میں ڈال کر ایلی نے اسے اس قدر آگ
دکھائی تھی کہ وہ واقعی کندن بن چکا تھا۔ اور یا شہزاد کی رنگینی نے اس کے کردار کی عظمت میں
شامل ہو کر شہزاد کی کشش کو ہزاروں گنا بڑھا دیا تھا۔ اور اب وہ سچے دل سے اس سے محبت
کرنے لگا تھا۔ بہرحال حقیقت چاہے کچھ بھی ہو اس کے دل میں شہزاد کے لیے جذبات کا ایک
سمندر کھول رہا تھا۔

بھتاریپ

جب وہ ارجمند کی گلی میں پہنچا تو ارجمند سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا اور اس
کی ماں اس کے قریب کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی۔

"آ گئے تم۔" ارجمند اسے دیکھ کر بولا۔ "چلو آ تو گئے۔" وہ حسرت آلود مسکراہٹ سے
بولا۔ "اتنا کرم کیا کم ہے۔ نہ آتے تو اپن کیا کر لیتے تمہارا کیوں ماں۔" پھر اسے کھانسی کا دورہ پڑ
گیا۔ اور وہ دیوار سے سہارا لے کر کھانسنے لگا۔

"آخر تم جاتے ہی کیوں ہو۔" ارجمند کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "چھٹی نہیں ملتی تو
چھوڑ دو نوکری کو اے ہے جان ہے تو جہان ہے جان ہی نہ ہوئی تو نوکری کو کیا کرنا ہے۔"

"واہ اماں۔" ارجمند نے کہا۔ "معمولی کھانسی سے اپن گھبرانے والے نہیں۔ اور پھر ماں
تیرے بیٹے ہیں ہم۔ بڑی بڑی تکلیفیں ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکیں یہ تو معمولی کھانسی ہے۔ تم تو خواہ
مخواہ گھبراتی ہو۔"

"گھبراتی نہیں میں۔" ماں بولی "مجھے معلوم ہے میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں مجھے
نظر آ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارجمند نے بڑھ کر اس کو آغوش
میں لے لیا اور یوں تھپکنے اور پیار کرنے لگا جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔

"دیکھو ماں میں ترقی کرتے کرتے پتہ ہے کیا بنوں گا۔ فیکٹری کا مینجر بنوں گا معلوم ہے اس
کی تنخواہ کیا ہوتی ہے ڈیڑھ ہزار۔ یعنی پندرہ سو۔ اعتبار نہ ہو تو یہ دیکھ لو میرا ہاتھ۔" اس نے اپنا
دایاں ہاتھ زبردستی ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ "یہ دیکھو یہ لکیر عمر کی لکیر ہے یہ۔ اور کر لو حساب

یہاں تک ہوئے چالیس برس یہاں پچپن ختم ہوئے اور یہ اسی سے اوپر کا حصہ ہے چڑ ہو نوے تک جیویں یا سوا سو تک۔ اور یہ دیکھو یہ ستارہ جو بنا ہے تلیہ والا اس کا مطلب ہے بڑا بہت بڑا عہد یعنی فیکٹری کا مینجر اور سمجھ لو پچاس کے لگ بھگ ملے گا۔ یہ عمدہ اور تم ابھی سے اپن کے ٹین پاٹ کا فکر کر رہی ہو۔ بھئی حد ہو گئی۔"

ماں سے جدا ہو کر اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور حسرت زدہ نگاہ سے کچی کی طرف دیکھا۔ پھر ایلی کی طرف دیکھا۔ یوں چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔ کہنے لگا "یار کروں اپن تو مرنے ورنے سے ڈرتے نہیں۔ بھئی آخر کیا ہو گا وہ کہا ہے نا استاد نے۔ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اور جہاں تک اپن کا خیال ہے لال بہلات اڑایا وہاں جا بیٹھا۔ یہاں کپ کیپ ہیں اور رکھوری' ڈکوری ہیں اور وہاں حوریں ہوں گی یار انکرانیڈی پر محنت کرنی پڑتی ہے وہاں محنت کیے بغیر سب ملتا ہے۔ اپن کے ایسے نصیب کہاں ابھی سے حوروں کی دنیا کا پاسپورٹ مل جائے۔ اپن کہاں مرتے ہیں میاں مگر اماں کو جو اپنا موت کا فکر لگا ہے کہیں اس غم سے نہ مرجائیں ہم ویسے کھانسی تو اپن کا کچھ نہیں بگاڑ سکی لیکن یار۔" وہ کچھ وقفے کے بعد بولا۔ "ایک بات کا افسوس رہ جائے گا۔"

"کس بات کا۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ ملال رہ جائے گا کہ تم نے وہاں فیکٹری ——— میں آ کر اپنی شہنشائی نہ دیکھی۔ گاؤں کی گوریاں جب ہاتھ جوڑ کر اپنے حضور میں کورنش بجا لانے کے لئے آتی ہیں کبھی اڑانے کے بہانے سلام ہوتے ہیں گھڑا اٹھانے کے بہانے کورنش بجا لائی جاتی ہیں ہے کھیل کے بہانے پھلیں پیش کی جاتی ہیں اور مابدولت ملاحظہ فرماتے ہیں اور دھنباد دیتے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ؟" اس نے آہ بھری "تم نے اگر یہ نظارے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تو بے کار ہے بس یہی ایک ملال لے جاؤں گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ملال لے جاؤں گا۔ کیا مطلب۔" ایلی نے پوچھا۔

ارجمند نے دفعتاً پینترا بدلا۔ صاف تو ہے۔" وہ بولا۔ "مابدولت اس وقت جا رہے ہیں۔ اور یہ ملال لیے جا رہے ہیں۔ مگر یار تم کیسے آ سکتے ہو وہاں تم تو خود مصروف ہو۔ پروت کیا ہاتھ مارا ہے۔ واہ واہ کیا چیز پائی ہے تم نے۔ آخر ہمارے شاگرد ہو نا۔ بیٹا۔ اُف کیا چیز ہے چال ہے کیا انداز ہے کیا بات ہے۔ جواب نہیں بڑے بڑے کھلاڑیوں کے دانت کھٹے کر دیئے تم

نے آخر اپن کے بالک ہو نا۔"

"لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" ایلی نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

"ہم کچھ نہیں کہہ رہے بیٹا۔" اس نے اپنے انداز میں کہا "ہم تمہیں دھنباد دے رہے ہیں تم نے اپنے گرو کی لاج رکھ لی۔ مگر پتر صرف ایک بات کا کھٹکا ہے۔ ستاروں سے کھیلو گے تو کھلاڑی رہو گے اور اگر سورج کو پا لینے کی کوشش کرو گے تو پر جل جائیں گے اور پھر اڑنے کی شکتی نہ رہے گی۔ اپنے گرو کے اس قول کو یاد رکھو۔ پتر کھلاڑی بنو۔ پروانہ نہیں اپنے پر نہ جلاؤ۔"

ورنہ کیا

ارجمند کو یکے میں بٹھانے کے بعد ایلی سوچنے لگا۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ شریف اور شہزاد کی طرف جائے۔ فرحت کے پاس جانا بھی اسے پسند نہ تھا۔ فرحت کی محبت بھری باتوں میں طنز کا عنصر شامل ہوتا تھا اور وہ بات بات پر شہزاد کا طعنہ دیتی تھی۔ رضا یا صفدر کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ بھی گفتگو کی ابتداء شہزاد سے ہی کرتے تھے جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں اسے رضا ملا۔

"ایلی۔" رضا نے اسے للکارا۔ "دیکھ میری طرف' جب تک میرا دم میں دم ہے تو چاہے کسی سے محبت لگا اور اگر کوئی تیری طرف نظر بھر کر دیکھے تو بس مجھے بتا دینا سمجھے وہ پاگل لمبا وہی تیرا دوست جسے ابھی یکے میں بٹھایا ہے اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو اس ہاکی سے اس کی کھوپڑی توڑ دوں گا۔" اس نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو یوں چلایا جیسے وہ ہاکی سٹک ہو۔ "سمجھے۔ لیکن یار۔" وہ اس کے قریب ہو کر بولا۔ "ایک بار ہمارے سامنے تسلیم تو کر لے کہ تو اسے پیار کرتا ہے۔ بڑی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے۔ دوست اپنے کو تو ان باتوں میں دلچسپی نہیں مگر تو نے تو بڑے بڑوں کے دانت کھٹے کر دیئے خدا کی قسم جی چاہتا ہے تجھے جھنڈا بنا کر لہراتا پھروں۔ ہاں تو پھر کیسے رام کر لیا تو نے اسے اور صرف اسے ہی نہیں ساتھ ہی اس کے مالک کو بھی پچھاڑ دیا ہے سالہ بول نہیں سکتا بول۔ بول۔ بول۔ بتا دے اچھا یار نہیں بتاتا تو نہ سہی۔" رضا نے ایلی کو خاموش کھڑے دیکھ کر کہا "پھر بھی ہم تیرے ساتھ ہیں ہاں۔" یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مڑ کر اس ہاکی والے کو پکڑ لے اور اس کے سامنے رو کر سارا حال کہہ

سنائے' اس کا جی چاہتا تھا کہ دل کی بات چیخ چیخ کر لوگوں کو سنائے اور اس طرح دل کا بوجھ
لے۔ مگر جب بھی وہ بات کہہ دینے کا ارادہ کرتا تو چھن سے شہزاد اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی
ناؤ سی آنکھیں ڈولتیں اس کے ہونٹ عجیب سا خم کھا کر کچھ کہتے اور وہ مسکرا دیتی
نہیں۔" ایلی چلاتا" میں کسی سے نہ کہوں گا میں تم سے بے وفائی نہ کروں گا میں تمہارا راز
نہیں کروں گا۔" اور ایلی کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ جاتا۔

"ایک نا ایک روز تم ضرور بتاؤ گے۔" شہزاد آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی
"تم اپنے دوستوں سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ اچھا تمہاری خوشی۔ میری بدنامی میں تم
خوش ہو تو ایسا ہی سہی۔" شہزاد کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ بھاگتا اس ہاکی والے سے دور بازار
سے دور اور دور۔ کہیں وہ کسی سے کہہ نہ دے کہیں اس کے دل کی بات زبان پر نہ آ جائے

جب وہ شہزاد کے پاس پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھی عین اسی طرح جس طرح بازار میں
سے اس کے سامنے آ کر مسکرانے لگی تھی۔ "وہ کہاں ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

شہزاد نے منہ بنایا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ "کہاں بھاگ گئے تھے تم۔" وہ بولی۔

"کہاں جاؤں گا۔ جا سکتا ہوں کیا؟"

وہ از سر نو مسکرانے لگی۔ "بھاگ جاؤ۔" وہ ہنستے ہوئے چلائی "دور۔ بہت دور۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ورنہ۔" شہزاد نے اپنے سڈول بازو اس کی طرف بڑھا کر اسے تھام لیا "ورنہ تم پکڑے
جاؤ گے۔ قید کر لیے جاؤ گے۔" اس کے بال اڑ کر ایلی کے منہ پر آ پڑے دم رک گیا
تالی پیٹ کر بولی۔ "بات کرنے سے بھی گئے بولو۔ بولتے نہیں۔" ایلی کی آنکھیں گویا
اس نے شہزاد کو اپنی گرفت میں لینا چاہا مگر وہ بازو چھڑا کر بھاگ گئی۔ "اونہوں۔" وہ
وار پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر بولی "وہ اوپر ہیں اگر ______۔" پھر مگ پر کھڑی ہو کر
باتیں کرنے میں یوں مشغول ہو گئی جیسے آن کی آن میں ایلی کے وجود کو قطعی طور پر بھلا
ہو جیسے احساس ہی نہ ہو کہ قریب ہی ایلی انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہے
سرخ ہو کر ایلی جا رہی ہیں۔

ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ شریف کے پاس جائے یا نہ جائے۔ کہ محلے کی ایک بوڑھی
عورت نیچے شور مچاتی ہوئی بولی۔

نئی یا پرانی

"اے ہے ہاجرہ کہاں گئی میں کہتی ہوں رابعہ' شہزاد تم کہاں ہو۔" دفعتاً" مگ سے اس کی
نگاہ ایلی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر چلانے لگی۔ "اے تو یہاں کھڑا ہے ایلی۔ لڑکے جا جا کر اپنے
باپ کو لا۔ تو اسے سٹیشن پر ملنے نہیں گیا۔ سنا ہے علی احمد آ رہا ہے۔" ایلی اس کی بات سن کر
بھونچکا رہ گیا۔ نہ جانے وہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی۔ شاید وہ علی احمد کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

"میں نے کہا ماں بات تو سن۔" وہ شور مچاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ تو آندھی کی طرح
چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی ابھی سٹیشن سے آیا ہے کہتا ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا
ہوں۔ اب کی مرتبہ ایک اور ساتھ ہے۔"

"کون آیا ہے ماں برکتے" جانو کھڑکی سے چلانے لگی۔

"اے ہے اپنا علی احمد آیا ہے۔"

"ساتھ کون ہے" جانو نے پوچھا۔

"کہتے ہیں اب کی بار کوئی نئی نویلی ساتھ ہے۔" برکتے نے شور مچایا۔

"اے بہن" مائی حاجاں دوڑی دوڑی چھتی گلی سے باہر نکلی۔ "اس کے ساتھ تو ہمیشہ کوئی
نہ کوئی ہوتی ہے بہن۔ نئی ہو یا پرانی تمیز نہیں بس ساتھ ہو۔"

"ہوں نئی" بی بی فاطاں کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ "نہ جانے کہاں سے گلی سڑی ہوئی اٹھا
لایا ہے۔ اسے آج تک معلوم نہیں ہوا کہ نئی کیا ہوتی ہے اور پرانی کیا۔"

"اے ہے اپنی طرف سے تو نئی ہی لاتا ہے۔ پر کیا کرے نصیب ہی میں پرانی لکھی ہیں۔"
مائی حاجاں بولی۔

"پر بہن" برکتے نے کہا "حماد کہتا ہے اب کے تو حد ہی کر دی علی احمد نے۔"

"کیا کیا ماں برکتے۔ بات بھی تو کرنا ماں۔ وہ تو ہر مرتبہ ہی حد کرتا ہے۔" چاروں طرف شور
مچ گیا۔

"پر لڑکی کیا بتاؤں میں۔" ماں برکتے نے ہاتھ مل کر کہا۔ "اب کی مرتبہ جسے لایا ہے اس کی
گود میں بچہ ہے۔ ہاں بچہ۔ لو کر لو بات۔"

"ہائیں بچہ' کیا کہا ماں۔ بچہ گود میں ہے۔" چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج تک بچے والی نہ آئی تھی۔"

"ابھی تو دیکھو بہن۔ وہ کشمیر کا سیب ایک سال تک نہ چل سکا تو یہ بیچاری کب تک چلے گی۔"

"میں نے کہا ماں برکتے۔" شہزاد کھڑکی میں آ کر چیخنے لگی۔ "کیا واقعی بچے والی لایا ہے علی احمد یا مذاق کر رہی ہو۔"

"لو میں کیا تم سے مجاک کروں گی۔" ماں برکتے بولی۔ "اسے ہے حماد نے بتایا ہے۔"

"اے لو۔" بی بی نھو بولی۔ "قافلہ تو آ بھی پہنچا" اس نے کچی حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے لڑکی۔" ماں حاجاں شہزاد سے کہنے لگی۔ "سانچ کو کیا آنچ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

حاجاں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ علی احمد سینہ تانے چوگان میں داخل ہوئے۔

"علی احمد مبارک ہو۔" ایک بولی۔

"میں نے کہا باقی قافلہ کہاں ہے تیرا۔"

"اے چتی پر آیا ہے کیا۔ اچھا کیا جو آ گیا۔ تیرے بغیر یہاں رونق نہیں ہوتی۔"

"اے علی احمد اب کی بار سنا ہے نئی لایا ہے تو۔"

علی احمد چوگان میں ہیرو کی طرح کھڑے مسکرا رہے تھے جیسے ہیروئین کو دیو کے چنگل سے چھڑا کر لائے ہوں۔

"لو ماں" وہ بولے "کون کہتا ہے نئی ہے ماں ہم تو پرانی کے پجاری ہیں وہ کہتے ہیں نا نئی نو دن پرانی سو دن اور اگر اکیلا آتا تو سواگت کے لئے تم سب یہاں نہ ہوتیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ میں آیا ہوں۔"

"اے ہے لڑکے" حاجاں مائی بولی "تو کیا ہمیں پتہ دینے کے لئے لاتا ہے تو۔"

"اور تو کیا اپنے لئے لاتا ہوں۔" وہ قہقہہ مار کے بولے "تم بھی کتنی بھولی ہو بی بی نھو۔ اپنا شوق تو مدت سے ختم ہو چکا اب تو محلے کی نفری بڑھانے کے لئے لے آتا ہوں۔"

"جبھی اب کے بچے والی لایا ہے" جانو کھڑکی سے چیخنے لگی۔

"اور کیا جانو" علی احمد ہنسے۔ "تو تو آپ سیانی ہے۔"

پر علی احمد" مائی حاجاں کہنے لگی "تجھے کوئی لڑکی نہیں ملتی کیا۔"

"لڑکی" علی احمد ہنسے "لڑکی کو کیا کرنا ہے مائی حاجاں کام کی وہ ہوتی ہے جو تجربہ کار ہو۔"

"پر علی احمد" نھو بی بی نے ہنستے ہوئے کہا "کام کی تو تو لایا نہیں کبھی۔ کباڑ خانہ ہی اکٹھا کر رکھا ہے۔ لے ماں برکتے ایمان سے کہنا دیکھنے میں ہے کوئی کام کی۔"

"تو سن لو بی بی کی بات" علی احمد ہنسے۔ "میں کیا دیکھنے کے لئے لاتا ہوں بی بی میں کیا بچہ ہوں کہ دیکھ کر ریجھ جاؤں وہ دن گئے بی بی۔ اور ہاتھی دانت لانے کا فائدہ۔ تمہاری آنکھیں چکا چوند ہو جائیں تو اپنا کیا فائدہ ہوا اس میں۔ کیوں بی بی۔" وہ چوگان میں کھڑے ہو کر ہیرو کی طرح ہنسنے لگے۔

"ہائے علی احمد" ایک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ رکھ کر کہا۔

"توبہ ہے علی احمد" دوسری ہنستے ہوئے چلائی۔

"کچھ شرم کیا کر بات کرتے ہوئے۔" تیسری قہقہہ مار کر بولی۔ چوگان ان کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اور علی احمد فاتح کی حیثیت سے گھر کی طرف چل پڑے جیسے سٹیج پر ایک خوب صورت جملہ کہہ کر ایکٹر باہر نکل جاتا ہے۔ اور تماشائی تالیاں پیٹتے رہ جاتے ہیں۔

علی احمد کے پیچھے پیچھے وہی پرانی راجو نیا برقعہ لئے آ رہی تھی گود میں دو سال کا بچہ تھا اور وہ یوں چل رہی تھی جیسے مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہو۔

"اے ہے" ماں برکتے بولی۔ "ہم سے بھی پردہ ہے کیا۔ لڑکی برقعہ تو اٹھا لے۔"

"ماں ہمیں سے تو پردہ ہے۔" نھو بی بی نے کہا۔ "یہ نیا زمانہ ہے اپنوں سے پردہ غیروں سے ___ تم جانتی ہی ہو ماں۔"

جانو بولی۔ "اے بی بی ڈرتی ہے کہیں نظر نہ لگ جائے ہماری۔"

اس کے پیچھے پیچھے تانگے والے کے ہاتھ میں سامان تھا اور آخر میں شمیم ایک لڑکی اٹھائے اور دوسری کو انگلی لگائے آ رہی تھی۔

شمیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھوئیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھ کا فرق بے حد نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے محلے والیوں کو دیکھتے ہی پیٹنا شروع کر دیا۔

"اے ماں برکتے دیکھ لے میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ میری طرف کیا دیکھ رہی ہو میں تو تماشہ بن کر رہ گئی ہوں اپنے ہی گھر میں۔"

"اے تم کیوں دلالہ بنو۔" تم تو اللہ کے فضل و کرم سے سہروں سے بیاہی ہوئی ہو اور یہ
فصلی بٹیروں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔"
"نہ ماں یہ نہ کہو اس کھیت میں تو خالی فصلی بٹیرے ہی پلتے ہیں۔" شمیم بولی "یہاں تو آنے
جانے والیاں ہی چلتی ہیں۔ تم اس گھر کو کیا جانو۔"
"غم نہ کرو" بی بی نھو نے کہا "یہ دور بھی گزر جائے گا۔"
"یہ چاہے گزر جائے۔ اپنا دور نہیں آئے گا یہاں ہاں۔" وہ بولی۔ "لکھ لو میری بات یہاں
تو سوکنیں ہی آئیں گی۔ اپنے نصیب میں سکھ نہیں۔"
"اب تو ایلی پر بھی سوکن آ گئی" شہزاد اپنی کھڑکی سے چلائی۔
اے ہے ایلی پر کیوں سوکن آنے لگی۔" ماں برکتے نے کہا۔
"اب تو ایک ننھا ایلی بھی آ گیا۔" وہ ہنسی۔
"لو یہ بھی کوئی بات ہے۔" بی بی نھو نے کہا۔ "نہ بہن، ایلی ایلی ہی ہے۔ جو مرتبہ ایلی کا
ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا میں تو سچ کہوں گی۔"
"نہ جانے ایلی جوان ہو کر کیا گل کھلائے گا۔" برکتے نے کہا۔
"آخر بیٹا کس کا ہے۔" حاجاں بولی۔
"وہ کہتے ہیں نا۔" نھو چلائی۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ابھی تو لڑکے نے ابتدا کی
ہے۔ کیوں شہزاد ٹھیک کہتی ہوں نا میں۔" نھو نے اسے طعنہ دیا۔
"تو جو کہتی ہے بی بی تو ٹھیک ہی کہتی ہو گی۔" شہزاد بولی۔ "تجھ سے بڑھ کر تجربہ کسے،
ان باتوں کا۔"

یہ سن کر چوگان میں قہقہہ گونجا۔ "تو نہ اس سے نپٹ سکے گی۔" ماں حاجاں نے کہا۔
مائی برکتے کہنے لگی "نہ مائی اس سے کون نپٹے ایسی تیج کہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔"
"پر ماں" ایک نے مدہم آواز سے سرگوشی کی "بری نہیں محبت سے ملتی ہے کھانا تو ہو گیا
ہے۔ بیچاری بڑی اچھی ہے۔ بس صرف یہی اللہ مارا اک شوق ہے۔"
ماں حاجاں قریب تر ہو گئی "ہو گا شاید تم ٹھیک کہتی ہو لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ محلے
والے بھی تو جینے نہیں دیتے۔"
"اے ہے" بی بی نے کہا "مجھے کیوں دیتے ہیں جینے۔"

"تو اپنی بات چھوڑ، بی بی نھو۔" اور وہ ایک دوسری کے قریب تر ہو گئیں۔

ہے ہمت

محلے والیوں کی باتیں سن کر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ شہزاد کے خلاف بات کرنے سے بھی نہ
چوکتی تھیں حالانکہ شہزاد کے تعلقات محلے والیوں سے بے حد اچھے تھے وہ انکی عزت کیا کرتی تھی
اور ان سب کی حد سے زیادہ خاطر و مدارت کیا کرتی۔ کسی نہ کسی بہانے وہ انہیں گھر بلا لیتی۔
جھوٹ موٹ مشورہ لینے کے لئے یا کوئی دوا دارو پوچھنے کے لئے یا کوئی اور بات نہ سوجھتی تو کہتی
"ماں چل تو ذرا مجھے بتا کہ میٹھی سویاں کیسے پکاتے ہیں۔ ہائے مجھ سے تو ہر بار خراب ہو جاتی ہیں
اصل میں مجھے یہ نہیں معلوم کہ میٹھا کتنا ہونا چاہئے اور سویاں کتنی۔" گھر لے جا کر وہ جانو سے
کہتی "لے جانو ذرا لا تو ایک پلیٹ ماں کے لئے۔" اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہتی "دیکھ تو کھا
کے اسے تاکہ معلوم ہو کیا خرابی ہے۔ نہ جانے کیا نقص رہ جاتا ہے۔"
حالانکہ شہزاد پکانے میں بے حد ماہر تھی۔ اور پکانے کے معاملے میں محلے والیاں تو بالکل
جاہل تھیں۔ جب میاں ہی کھانے کے شوقین نہ ہوں تو بیویاں بھلا کیسے اچھا پکا سکتی ہیں۔ لیکن
اس کے باوجود شہزاد نے کبھی اپنی چیز کی تعریف نہ کی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ شہزاد کی بڑھتی
ہوئی بدنامی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کے شہزاد کے ہاں رہنے کی وجہ سے سب اس سے بدظن
ہو چکے ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد کا رنگ انوکھا تھا۔ اس میں عجیب سا بانکپن تھا ایک شوخی
تھی رنگینی تھی اس لئے وہ محلے میں آتے ہی محلے والیوں کی نگاہ پر چڑھ گئی تھی —— لیکن
اس کی اس خصوصیت نے بدظنی کی فضا پیدا کی تھی۔ بدنامی کی نہیں اور اب ایلی کی وجہ سے وہ
بدنام ہوئی جا رہی تھی۔
اس خیال سے ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مجرم ہے۔ اور اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے
لئے چپ چاپ اوپر چوبارے کی طرف چل پڑا۔
"آ گئے تم" شریف اس کی طرف دیکھ کر بولا "ہم تو کب سے انتظار کر رہے تھے۔"
پیچھے کھڑا علی احمد کو کوئی نہیں پوچھتا محلے میں یہ جتنے جلوس چاہے نکالے جسے چاہے لے
آئے جائز ہو یا ناجائز۔" شریف نے آہ بھری "ہمیں تو ظالموں نے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔"

"جس میں جرأت ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔" شہزاد بولی اور اس نے ایک جرأت فصا نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "کیوں ایلی" وہ بولی "ٹھیک ہے نا۔"

"مجھے کیا معلوم۔" ایلی نے جواب دیا۔

تو پھر تمہارا حشر بھی ایسے ہی ہو گا جیسا ان کا ہوا ہے۔" شہزاد نے شریف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سچ کہتی ہو تم" شریف نے آہ بھری "دراصل وہی ڈرتے ہیں جن کی محبت سچی اور پاکیزہ ہو۔"

ہونہہ سچی اور پاکیزہ" شہزاد نے کہا۔ "بزدلی کو سچائی کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا۔

"اب یہ نئی کون ہے' جیسے علی احمد نے تو اپنے گھر کباڑی کی دوکان کھولی ہوئی ہے۔ کہاں سے لائے گا۔ وہ کشمیر والی نئی لایا تھا بالکل بے کار پھولی ہوئی روئی کی طرح۔ ۔۔۔ پچک کر رہ گئی۔"

"میرے خیال میں" ایلی بولا "وہی راجو ہے دولت پور والی۔ دولت پور میں ۔۔۔ تھے۔"

"پٹاخہ" شہزاد ہنسی۔ "چلا ہوا نا۔"

"کون ہے وہ۔" شریف نے پوچھا۔

"نام ہی سے پتہ چل رہا ہے۔ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے کیا۔" شہزاد نے کہا۔ تمہاری نگاہ میں تو کوئی جچتی ہی نہیں۔" شریف مسکرا کر بولا۔ "سوائے اپنے" اس نے نگاہیں جونک کی طرح شہزاد پر گاڑ دیں۔

"جھوٹ ہے کیا" وہ قہقہہ مار کر بولی۔ "میری برابری کون کر سکتا ہے۔ اور پھر اس گھر میں جہاں سب کاٹھ کباڑ بھرا ہے۔ کیوں ایلی کیا یہ جھوٹ ہے" وہ ایلی کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔

کھانا کھا کر ایلی علی احمد سے ملنے کے بہانے وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے کیوں شہزاد کی موجودگی میں وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا حالانکہ شریف کی موجودگی میں شہزاد کا التفات ۔۔۔ جاتا تھا وہ ہر بات پر کوئی نہ کوئی اشارہ کرتی۔ کبھی ہاتھ بڑھا دیتی جیسے کہہ رہی ہو آگے بڑھ کر پکڑ لو۔ کبھی اپنا بلوری پاؤں ننگا کر کے دکھاتی اور کبھی یوں بازو پھیلا دیتی جیسے اسے

لینے کے لئے بے تاب ہے۔

شاید انہی اشارات کی وجہ سے اس کے صبر کا پیانہ چھلک جاتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے جانے پر مجبور ہو جاتا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ شریف کی موجودگی میں بار بار محسوس کرتا تھا کہ وہ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے اور احساس جرم اس قدر شدید ہو جاتا تھا کہ اس کے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔

اجلے کی راجپوتنی

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد قہقہہ پر قہقہہ لگا رہے تھے "دیکھو ناسیدہ" وہ کہہ رہے تھے "پہلے بھی آئی تھی راجو پر پہلے تو وہ شمیم کی مہمان تھی نا پرانی سہیلیاں ہیں یہ دونوں۔"

"ہونہہ" شمیم چلائی "جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔"

علی احمد نے شمیم کی بات گویا سنی ہی نہیں۔ "اور اب تو بہنیں بن گئی ہیں۔"

"لو نہہ بہن" شمیم چلائی۔

"تو اس کی باتیں نہ سن" علی احمد نے ہنس کر شمیم کی بات کاٹ دی "ایسے مذاق یہ راجو سے کیا ہی کرتی ہے بے تکلفی جو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں بہنیں بنی ہوئی ہیں تو انہیں اکٹھا ہی کر دو سو میں نے راجو سے نکاح پڑھوا لیا۔ پوچھ لو شمیم سے غلط بات نہیں کہہ رہا ہوں" اور پیشتر اس کے کہ شمیم کوئی بات کرے وہ معاً ایلی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہائیں ایلی تم یہاں۔" پھر خود ہی بولے "اور ٹھیک تو ہے تو تو اب امتحان سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لیکن تم نے اپنی امی کو سلام نہیں کیا۔ تو تو اچھی طرح واقف ہے راجو سے۔ ان کی بڑی دوستی ہے ایک زمانے سے جب یہ دولت پور میں تھا تو اکثر جایا کرتا تھا راجو کے ہاں" وہ ہنسنے لگے۔ "راجو سا جو بھی سے واقف ہے ایلی حکیمن کو بھی جانتا ہے کیوں ایلی۔" وہ ہنسنے لگے۔ "اور ایلی تو بہت خوش ہو گا۔ مفت کا ایک بھائی مل گیا ہے اسے۔ تم نے شیرو کو نہیں دیکھا ایلی آ۔ مجھے شیرو سے ملائیں۔ لا بھئی راجو لانا ذرا شیرو کو۔ جاؤ بھئی تم دونوں کھیلو چوگان میں لے جا اسے ایلی سیر کرا لا ذرا۔"

ایلی کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ حمیدہ رشیدہ کو بلانے لگے۔ "لو بھئی تم لے جاؤ اسے ایلی تو شرماتا ہے۔ شرماتا تو ہوا۔ کبھی چھوٹا بچہ اٹھایا بھی ہو۔"

اتنے میں محلے والیاں اکٹھی ہو گئیں۔ "کیا لایا ہے اب کی بار دکھا تو" ایک نے کہا۔

"اے ہے یہ تو وہی پرانی راجو ہے میں سمجھی پہلے کشمیر کا سیب لایا تھا اب نہ جانے کہاں سے لایا ہو گا۔"

"سیب ہی تو ہے" علی احمد بولے۔ "وہ کشمیر کا تھا یہ کلو کا ہے۔ وہ دکھانے کا ہوتا ہے یہ کھانے کا' ذرا ترشی ہوتی ہے اس میں ماں' بلکہ ترشی کی وجہ سے اچھا ہوتا ہے یہ۔"

"میں نے کہا یہ دلہن چھپی ہوئی کیوں بیٹھی ہے۔" دوسری بولی۔

"دلہنیں چھپی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں بی بی۔"

"کیا شرماتی ہے ہم سے" شہزاد داخل ہو کر بولی۔

"شرماتی تو ہے" وہ بولے "تمہارے مقابلے کی ہو تو میدان میں آئے۔"

وہ سب ہنسنے لگیں "اب کر بات" ایک چلائی "ہم سے ہی باتیں کر لیا کرتی ہے تو" شہزاد ہنسنے لگی۔ "اس بیچاری کا کیا قصور ہے یہ تو لانے والے کی سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔"

"سنا ہے شہزاد وہ تیرا سوجھ بوجھ والا شریف آیا ہوا ہے۔"

محلے والیوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ "باہر کیوں نہیں نکلتا میدان میں۔" علی احمد نے قہقہہ لگا کر کہا "لیکن وہ بھی سچا ہے گھر میں دھن دولت کے انبار لگے ہوں تو باہر کا فائدہ۔" یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہو گئے اور راجو سے ہی ہی کرنے لگے۔

"اے ہے بہن" نقو بی بی داخل ہوتے ہوئے بولی "ابھی تک اپنے علی احمد کا چاؤ نہیں اترا کیا جو ہر بار نئی لے آتا ہے۔"

"اونہوں نئی۔" شمیم نے ہونٹ نکالے۔ "وہی پرانی تو ہے۔"

"میں نے کہا دیکھوں تو اب کی بار کیا گل کھلایا ہے اپنے علی احمد نے۔" نقو بی بی یہ کہتے ہوئے علی احمد کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"اندر کیسے جائے گی بی بی۔" شمیم بولی۔ "اندر تو دونوں میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔"

"ہاہاہا" علی احمد کی آواز آئی۔ "ہم سے زور آزمائی کرے گی تو راجپوتنی جو ہوئی اجلے کی راجپوتنی۔ ہاہاہا لیکن ہم بھی علی پور کے ہیں ہاں۔"

"تو اندر جا کر کیا کرے گی بی بی نقو۔" سیدہ بولی "تو بھی کیا اجلے کی راجپوتنی ہے جو لڑنے جائے گی۔"

"میں کیوں ہونے لگی اجلے کی راجپوتنی۔" نقو بی بی جوش میں بولی۔ "پر میں کیا علی احمد سے ڈرتی ہوں جو یہاں کھڑی رہوں گی۔" یہ کہہ کر نقو بی بی شور مچاتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ "ہے ہے علی احمد یہ کیا دھینگا مشتی شروع کر رکھی ہے تو نے۔"

یہ صورت حالات دیکھ کر ایلی چپکے سے باہر نکل آیا۔ اندر علی احمد قہقہے لگا رہے تھے۔ "ہی ہی ہی بی بی نقو تم ہو۔ کہو کیا حال چال ہے۔ ہاہاہاہا"

دل کیا چاہتا ہے

جب وہ چوگان میں پہنچا تو رضا لاٹھی ٹیکتا ہوا چھتی ڈیوڑھی سے نکلا "کیوں بابو" وہ بولا "مفت کا بھائی ہاتھ لگا ہے۔ سیدھے ہاتھ سے کھلا دو مٹھائی ورنہ۔"

"کچھ نہیں" ایلی چلایا۔ "خواہ مخواہ میری بے عزتی کرتے ہو۔"

"ابھی تو بے عزتی نہیں کی میں نے۔ ابھی تو عزت کر رہا ہوں بابو۔ جب بے عزتی کرنے پر آؤں گا تو رو دو گے تم۔ چلو سیدھے چلو میرے ساتھ۔ ادھر کا رخ کیا تو یہ ہاکی سٹک چلاؤں گا یار میرا چت پڑا ہو گا میدان کے بیچ۔ ارے بابو کے بچے۔ لاکھ بار تجھے سمجھایا کہ چھوڑ دے ہم سے چالاکی مگر تو سنتا ہی نہیں لاتوں کا بھوت بھلا باتوں سے مانتا ہے ابھی۔ چل تجھے گھر لے کر جاؤں گا۔ لال نے مکی کی میٹھی روٹی پکائی ہوئی ہے۔ دونوں کھائیں گے۔"

رضا کے گھر پہنچ کر وہ دونوں ایک طرف اکیلے میں جا بیٹھے۔

"دیکھ بھائی۔" رضا نے بات شروع کی "پہلے تم اور ارجمند کیپ اور کپ کو پھانسنے میں لگے رہے اور ہم دیکھتے رہے۔ یہ کھیل اپنے بس کا نہیں۔ تم تماشہ کرتے رہے اور ہم دیکھتے رہے پھر تجھے امرتسر والی کا چکر پڑا۔ اور تو اس کے عشق میں گھلتا رہا۔ اور تو نے آ کر ہم سے ساری بات کہہ دی۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ ہم سے کہہ دو گے یار تو ہم ٹوکیں گے کیا۔ الٹا ہماری مدد تمہارے ساتھ ہو گی۔ کہو تو اٹھا کر لے آئیں اس امرتسر والی کو۔ کیا ہے دو سال کی سزا ہو جائے گی نا جھیل لیں گے تمہیں تو وہ سالی مل جائے گی۔ تم تو مزے کرو گے نا۔ کیا یاد کرو گے کہ ہاکی سٹک والا یار ملا تھا۔"

"لیکن یہ جس معاملے میں اب پھنسے ہو تم یہ ہمیں پسند نہیں۔ اول تو وہ بچوں والی ہے دوسرے اس کا میاں تمہارا دوست ہے اور ——— پھر چلو یہ بھی مان لیتے ہیں لیکن بشرطیکہ تم

اپنے منہ سے کہہ دو اپنی زبان سے مانو اور کہو بھئی مجبور ہوں پھنس گیا ہوں۔ پھر ہم
تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالاکی سے کام نہیں چلے گا ایلی۔ ہمارے ساتھ جس نے
سالہ منہ کے بل گرا۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔" ایلی نے منہ پکا کر کے کہا۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے۔" رضا بولا "سارے محلے
ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔"

"کون سی بات؟" ایلی نے پوچھا۔

"تم جو سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔ تمہارے
لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے پکتے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندھے نہیں
علی پور میں بات چھپتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیور پہچانتی ہیں۔"

"تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا۔" ایلی نے غصے میں کہا۔ "اچھے دوست ہو تم۔ مجھے
سمجھتے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔"

"ایمان سے کہتا ہوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چھپا رہے ہو۔
چھپا مجھ سے نہ چھپا۔ ظالم اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک
ہوتی میں نے۔"

"رضا۔" ایلی آنکھوں میں آنسو چھلکا کر بولا "میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں
سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی۔ "دیکھ ایلی۔" وہ بولا "میں تیرا دوست
بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہو نا جائز ہو۔ روپیہ چاہیے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر کے
لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہہ دے۔ اسے ایک
شک نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں مانے گی وہ
جان ہے جو ہمارے یار کی بات رد کرے جینا مشکل کر دوں گا۔ اور نہ مانے گی تو
طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ

رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی "مجھے معلوم
وہ بولا "میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کو

کیوں ہے۔ تمہارا خیال کیوں رہتا ہے مجھے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

ایلی کے دل میں اک بھیڑ لگ گئی۔ رضا کے اظہار محبت پر اسے شدت سے احساس ہو رہا
تھا کہ وہ اس کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رضا کے گلے لگ کر رو پڑے
اور اسے ساری بات بتا دے لیکن جب وہ بات کرنے کے لیے منہ کھولتا تو شہزاد سامنے آ کھڑی
ہوتی۔ مجھے بدنام نہ کرنا ایلی۔ کھلونا بنا کر مجھ سے کھیلنا نہیں۔ اس وقت شہزاد کی تمام تر رنگینی
اور شوخی غم و حسرت میں بدل جاتی اور ایلی بات کہتے کہتے رک جاتا۔ نہیں میں تمہیں بدنام نہیں
کروں گا۔ تم کھلونا نہیں ہو شہزاد تم تو رانی ہو ملکہ ہو۔ تم سے بھلا کون کھیل سکتا ہے لیکن اس
کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجرم ہے جو اپنے عزیز دوست رضا کو دھوکا دے رہا ہے۔

مہارانی یا مہترانی

دیر تک وہ دونوں خاموشی سے مکی کی میٹھی روٹی کھاتے رہے پھر دفعتاً ساتھ والے مکان
سے شہزاد کی حسین آواز یوں گونجی جیسے کوئی کوئل تان اڑا رہی ہو۔ اس آواز کو سن کر ایلی
چونک پڑا اس کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"ہاں وہی تو ہے" رضا ہنسنے لگا۔ "اس کی آواز سن کر تمہاری کیا حالت ہو جاتی ہے۔"

"کیا حالت ہو جاتی ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔" وہ بولا "سنو سنو فضول باتیں نہ کرو۔"

شہزاد کا قہقہہ پھر سنائی دیا۔ اس کے ساتھ بھدی سی آواز میں کوئی ہنس رہا تھا۔

"اس محلے کے جوہڑ میں یہ اکیلی ایک ہی راج ہنس ہے۔ چلتی ہے تو جیسے پانی کی لہر اٹھ رہی
ہو بولتی ہے تو جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ مگر ایلی"
رضا بولا "میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہارانی ہے اور یا ——— یا مہترانی۔"

"کیا مطلب؟" ایلی نے پوچھا۔

"بس یا تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا نیچ ہے بے حد نیچ۔ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے۔
اور یا ———"

"ہر دوسرے چوتھے روز یہ اس گھر میں آتی ہے جہاں اس وقت ہنس رہی ہے۔" رضا نے
سلسلہ کلام جاری رکھا اور غفور یا ظفر کے ساتھ وہ وہ مذاق کرتی ہے وہ قہقہے لگاتی ہے اور پھر با

آواز بلند ذرا نہیں جھجکتی ڈرتی نہیں۔ یا تو بڑے صاف دل والی ہے اور یا بڑی چالاک ہے۔ اللہ کرے رانی ہی ثابت ہو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

"ہونہہ" شہزاد کی آواز سنائی دی۔ "ان کا کیا ہے وہ تو کبوتر کی طرح آنکھیں موند کر نے منہ میں دبا کر بیٹھ رہتے ہیں۔ وہ کہاں آتے جاتے ہیں۔ ان کا یہاں چھٹی پر آنا بھی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

"سن لیا" رضا بولا "وہ گدھ کہاں اس لائق تھا کہ اسے مورنی مل جائے۔ بے وقوف لیکن تمہیں کیا۔ تم مجھ سے جھوٹ تو بولتے ہی نہیں۔"

رضا کے گھر سے نکل کر وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چلا آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کر چارپائی پر لیٹ جائے۔ رضا کی بات اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی تھی۔ اور شہزاد باتوں اور قہقہے نے ان شبہات کو ہوا دی تھی شہزاد کے رویے اور رضا کی باتوں کی وجہ سے کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔

ایلی کو غفور سے خدا واسطے کی نفرت تھی۔ اسے انکے سارے خاندان سے نفرت تھی۔ کے چار بھائی تھے۔ ان کا تمام ترکنبہ محلے والوں سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا۔ ان کی روایات مختلف تھیں۔ وہ محلے کے آصفیوں سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتے تھے چونکہ ان کے والد آکر وہاں مقیم ہوئے تھے البتہ ان کی والدہ محلے ہی کی لڑکی تھی جو رشتے میں ایلی کی دادی کی تھی۔

غفور ایلی سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا۔ غفور کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ گوشت کا لوتھڑا ہو۔ اس کی شخصیت میں جسم کا عنصر بے حد غالب تھا۔ نگاہوں سے محسوس تھا جیسے وہ روح کی روشنی سے محروم ہو۔ جب وہ کھجاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں گرسنا جھلک دکھائی دیتی تھی اور وہ اکثر نامناسب مقامات پر کھجایا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کی نگاہیں تندی سے بھری ہوتی تھیں۔ بات کرتا تو اس میں جلال عنصر جھلکتا ایلی کی غفور سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایلی میں کمتری کا احساس تھا اور رویہ جھوٹی عظمت اور زعم کا حامل تھا تمام بھائیوں میں صرف غفور کی شخصیت میں یہ بھائی الگ رہنے کے باوجود شوکت نفس سے بھرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ سب خود نالاں تھے۔ اور بوڑھا باپ تو اس کی وجہ سے سراسر زچ تھا۔

شہزاد کا غفور سے ملنا ایلی کو قطعی طور پر ناپسند تھا لیکن شریف کی سگی ہمشیرہ غفور کے بھائی [illegible] سے بیاہی ہوئی تھی لہٰذا شہزاد کو وہاں جانے سے روکنا ممکن نہ تھا۔

شہزاد کو دوسروں سے بے تکلفانہ بات کرتے ہوئے سن کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اس کی باتوں میں وہی دو دھاری مفہوم ہو جس کا اظہار وہ ایلی سے کیا کرتی تھی اور اس کے اشارات اور کنایات اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں وہ محسوس کیا کرتا تھا جیسے شہزاد ہر کسی سے وعدے کرتی ہے اور اپنے خصوصی انداز میں اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے اس خیال پر وہ ایک عجیب وحشت میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کا اپنا احساس کمتری شکوک کو ہوا دیتا اور وہ آتش رقابت میں جلتا۔

صحرانوردی

شہزاد کی باتیں سننے کے بعد اس کے لیے رضا کے پاس بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ اٹھ بھاگا۔ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جانے کے لیے کوئی جگہ بھی تو نہ تھی۔ علی احمد کے گھر میں ٹین کا سپاہی ربڑ کی گڑیا سے کھیلنے میں مصروف تھا باہر شمیم آنسو بہا رہی تھی۔ ہاجرہ چپکے سے کونے میں کھڑی تھی جیسے اس گھر کے تمام افراد کی زر خرید غلام ہو۔ سیدہ چپ چاپ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ وہ یا تو نماز پڑھتی اور یا گھٹنوں میں سر دے کر آلو چھیلنے میں مصروف رہتی۔ بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی اس پر کوئی اثر نہ رکھتا تھا جیسے آندھی میں کوئی چھوٹا سا پودا جھک کر زمین پر لیٹ جاتا ہے چمٹ جاتا ہے حتیٰ کہ آندھی کا زور کم ہو جاتا اور وہ پھر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا تھا جیسے کسی بہت زور دار آندھی نے اسے ہمیشہ کے لیے ہموار کر دیا ہو اور اب یہ چھوٹے چھوٹے ہنگامے اس کے لیے بے معنی ہو چکے ہوں۔

علی احمد کے گھر میں وہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ایلی کے لیے جاذب توجہ تھا۔ وہ کمرا جس میں دادی اماں رہا کرتی تھی۔ دادی اماں کی موت کے بعد وہ کمرا جوں کا توں پڑا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ تخت ویسے ہی کونے میں بچھا ہوا تھا جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی اور اس کے پاس ہی وہ کھوکھا تھا جس میں وہ ایلی کا گیند یا دوسری چیزیں سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ چارپائیاں اسی طرح پائے ستون پر لگی ہوئی تھیں جن کے نیچے مٹی کے برتنوں کی قطاریں تھیں اور ٹوٹے پھوٹے صندوق رکھے ہوئے تھے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر ایلی کا دل بھر آتا تھا اس کمرے میں جانا ایلی کے لیے تکلیف
فرحت کا گھر تھا۔ وہاں فرحت کے علاوہ اجمل کے والد فیروز مقیم تھے۔ نیچے فرحت اور
تھیں اوپر چوبارے میں فیروز رہا کرتے تھے۔ فیروز کو وقت پر نہانے وقت پر چائے پینے
اور وقت پر سیر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ان مقررہ کاموں کے علاوہ یا تو وہ سارا
پر پڑے رہتے اور یا رمل اور نجوم کی جنتریوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ نیچے فرحت
دھونے یا سینے یا کھانا پکانا میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ایلی کے لیے وہاں بیٹھنا بے حد مشکل
اول تو وہ کمرے بے حد اداس تھے۔ دوسرے فرحت جوش محبت کی وجہ سے ہر بات میں
بھلائی اور بہتری کا تذکرہ کرنے کی عادی تھی۔ اور ایلی کی بھلائی اور بہتری کے متعلق فرحت
خیالات سے ایلی کو قطعی طور پر اتفاق نہ تھا۔ فرحت ایلی کی لاتعلقی کو محسوس کر کے شہزاد
چھیڑ دیتی تھی اور طنز میں فرحت کا جواب نہ تھا۔

محلے میں وہ کسی کے ہاں جانے کا عادی نہ تھا۔ اسے دوسروں کے گھر میں جاتے ہو
وحشت ہوتی تھی محلے والیاں اگرچہ بڑی محبت اور ہمدردی سے اسے ملا کرتی تھیں۔ لیکن
ہمدردی میں ترس کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ لوگوں کی نگاہوں سے گ
کرتا تھا۔ چاہے ان میں ہمدردی ہو یا تحسین اس کے لیے باہر نکلنا بھی مشکل تھا چونکہ آصفی
کے ڈیوڑھیوں میں عورتوں کا جمگھٹا ضرور ہوتا تھا۔ چوگان میں بیٹھ کر عورتیں اپنے کام کاج
کرتی تھیں جیسے وہ گھر کا صحن ہو۔

عورتیں بالے کے مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی تھیں یا تو وہ اپنے اپنے کام میں مشغول
ہوتیں اور یا خالی بیٹھ کر باتوں میں مصروف رہتیں۔ محلے میں آزار بند بننا سب سے بڑا مشغلہ تھا
اور آزار بند بننے میں محلے کی عورتوں کو اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ ان کی انگلیوں پر
کھیلتے تھے۔ نگاہیں آوارہ رہتی تھیں اور زبانیں یوں چلتی تھیں جسے قینچیاں ہوں۔ اندر
اندھیرے کمرے میں بالا تخت پر اپنی چیزیں رکھے بیٹھا آپ ہی آپ باتیں کرتا رہتا۔

اس روز ایلی نے سوچا چلو بالا کے ہاں جا بیٹھو کچھ وقت گزر جائے گا۔ جب وہ چوگان میں
پہنچا تو شہزاد کے چوبارے کی کھڑکی میں کسی نے اشارے سے اسے بلایا۔ نہ جانے کون ہے
نے سوچا۔ شاید جانو ہو۔ پھر اس نے شریف کی آواز پہچان لی کھڑکی میں شریف کھڑا
تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے وہ سوچنے لگا۔ بہر صورت شریف سے انکار کرنے کی اس میں ہمت

تھی۔ چوبارے میں شریف اکیلا بیٹھا تھا۔ "وہ تو محض اتفاق سے میری نگاہ پڑ گئی۔" شریف نے
کہا "ورنہ تم تو شاید آتے ہی نہ۔ کیا بات ہے ایلی۔" شریف نے ملتجی نگاہوں سے اسے دیکھتے
ہوئے کہا "تم ہم سے اس قدر گریز کیوں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تنہائی
میں شاید تم مجھے اپنی بیم کا قصہ سنا سکو شہزاد کے سامنے تو ہچکچاتے ہو نا۔ بتاؤ کبھی ملی بھی ہے تم
سے۔"

ایلی مسکرا دیا۔

"ڈرو نہیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا" وہ بولا "گھبراؤ نہیں۔"

ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے "ملے نہ ملے" وہ بولا "مطلب تو جذبے سے ہے
نا۔"

"بالکل بالکل" شریف کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا اگر جذبے میں خلوص ہے تو سمجھ لو بیڑا پار
ہے سچ کہتے ہو سچ کہتے ہو" شریف نے ٹھنڈی آہ بھری "چاہے تباہ ہو جاؤ۔ لیکن جذبہ میں
خلوص اور شدت قائم رہے۔ ایسی تباہی پر سینکڑوں آبادیاں قربان ہیں۔ اچھا اس کے عزیزوں کو
علم ہے کیا؟"

"معلوم نہیں" ایلی نے کہا "شاید علم ہو۔ لیکن کیسے معلوم ہو سکتا ہے انہیں۔ میں نے تو
کبھی کسی سے بات نہیں کی اور ابا کو تو ابھی اپنے چاؤ سے فرصت نہیں۔"

شریف ہنسنے لگا۔

"اسے اپنے چاؤ سے فرصت کیسے ملے" شہزاد داخل ہو کر بولی "سارا محلہ چھان مارا میں نے
لیکن تمہارا پتہ نہ چلا۔ پہلے بالے کے ہاں گئی پھر ارجمند کے گھر گئی ادھر غفور کی طرف جا پہنچی
ایلی نہ ملا تو میں نے کہا شاید اپنے ابا کے پاس بیٹھا ہو۔ آخر اپنی نئی اماں کو بھی تو سلام کرنا تھا۔"

"دیکھ لے ہم نے بیٹھے بیٹھے تلاش کر لیا" شریف نے کہا "کچے دھاگے سے بندھا آیا ہے۔
چاہے پوچھ لے اس سے خود نہیں آیا یہ۔"

شہزاد نے آہ بھری "ہمیں یہ کچا دھاگا نصیب نہ ہوا۔ ہم نے اپنی زندگی ویسے ہی کھو دی۔
ہمیں اللہ نے عشق نصیب ہی نہ کیا۔ اپنے اپنے نصیب ہیں جس کے ساتھ ہماری سنجوگ ملے وہ
پہلے ہی سے کسی اور کے ہو چکے تھے——"

"اچھا ——" شریف بولا اس کے انداز میں احتجاج تھا۔

"غلط کہہ رہی ہوں کیا" شہزاد چمک کر بولی۔ "میاں اپنی دھن میں بیٹھے رہتے ہیں اِ... دھن میں آوارہ رہتا ہے۔ ایک میں ہوں جو بغیر کسی دھن کے کوے کی طرح یہاں سے وہاں جا بیٹھی۔"

"اب پنچھیوں کو بھی کوے —— بننے کا شوق چرایا" ایلی بولا۔

"پنچھی۔" شہزاد نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا "کبھی تھے ہی پنچھی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" شریف بولا۔

"نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔" شہزاد ہنسنے لگی۔ "محسوسات کی دنیا میں رہنے والوں کو سمجھنے کی کیا ضرورت۔"

"اچھا بھئی تم جو کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔" شریف آہ بھر کر بولا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔

کروٹیں اور قہقہے

رات کے وقت جب ایلی چارپائی پر لیٹتا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے احساسات... شہزاد اور شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اسے شریف پر ترس آتا تھا۔ اس وقت شریف کی حیثیت ہیچ ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور شہزاد کی باتیں اور اس کے اشارات ایلی کے دل میں پختہ یقین پیدا کر دیتے تھے کہ وہ اس سے کھیل نہیں رہی بلکہ اس کی لگن میں بری طرح سے سرشار ہے۔ لیکن جونہی وہ اکیلے میں لیٹتا تو شہزاد کی باتیں دھندلی پڑتی جاتیں اور ارجمند اور رضا کی آوازیں بلند ہوتیں۔ میں بتاؤں ایلی یا تو وہ مہارانی ہے اور یا مہترانی۔ مہترانی مہترانی۔ دور کوئی چلاتا پھر... بھدی آواز ابھرتی اور شہزاد چیخ کر کہتی ان کا کیا ہے ان کا یہاں چھٹی پر آنا نہ آنا برابر ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ کھلاڑی! محلے کی مسجد کے گنبد سے کوئی الو چیختا کھلاڑی دور کوئی چمگادڑ اس کا منہ چڑاتی۔

پھر ایک رنگین اور شوخ کھلاڑی اس کے روبرو آ کر کھڑی ہو جاتی اور وہ شریف کو اشارے کرتی۔ اپنی طرف بلاتی۔ اور اس کا جسم ابھرتا سمٹتا جیسے شدید خواہش اسے بلوا رہی ہو۔ پھر اس کے کپڑے دھجیاں بن کر اڑ جاتے اور وہ برہنہ رہ جاتی۔ اس وقت ایلی محسوس کرتا جیسے وہ... ہو۔ اس خیال پر اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی۔ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک کرب...

اور جسم کے روئیں روئیں کو یوں دھنکتا جیسے روئی کا گالا ہو۔ وہ دیوانہ وار چارپائی پر کروٹیں بدلتا۔

ساری رات وہ چارپائی پر تڑپتا رہتا حتیٰ کہ صبح کاذب کا وقت ہو جاتا اور پھر تھک کر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ پھر بھی اس سونے کو نیند سے تعلق نہ ہوتا۔ جیسے کوئی مریض کسی خوف ناک تکلیف کے تحت کچھ عرصے کے لیے تھک ہار کر بے جان ہو کر پڑ جاتا ہے۔

اسی لیے صبح جب وہ جاگتا تو وہ تازگی محسوس نہ ہوتی۔ جو نیند کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔ بند بند درد کرتا اینٹھن کی وجہ سے اعصاب دکھتے۔ اور چہرے پر پژمردگی چھائی ہوتی۔ ابھی وہ رات کی واردات کی تعلق سوچ رہا ہوتا کہ سیڑھیوں میں کسی کے پاؤں کے رقص کی آواز گونجتی اور چھن سے شہزاد اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی۔

"چل اٹھ وہ چائے کے لیے کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی لاٹ صاحب جاگے بھی نہیں۔ کیا زندگی ہے جیسے کوئی نواب زادہ ہو۔" وہ ہنستی۔

شہزاد کی باتیں سن کر اس کی تمام تر تھکن فرو ہو جاتی۔ اس کی ہر بات محبت کا پیغام ہوتی اور یہ پیغامات ایسی شوخی اور رنگینی سے ایلی تک پہنچائے جاتے کہ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور رات کے شکوک اور بے خوابی گویا اسے یاد ہی نہ رہتے۔ اگر کسی وقت اسے رات کے کرب کا خیال آتا بھی تو وہ ہنس دیتا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں وہ سوچتا جو خواہ مخواہ کے شکوک پال لیتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود پھر جب رات پڑتی تو دن کے وہ لطیف اور رنگین پیغامات اس کے ذہن سے مٹ جاتے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہی بھیانک تصاویر متحرک ہو جاتیں اور وہ شدت کرب سے تڑپتا اور کروٹیں لیتا۔ تڑپتا اور کروٹیں لیتا حتیٰ کہ صبح کاذب کے وقت تھک کر بے ہوش ہو جاتا۔

اس طرح اس کی زندگی دوزخی حیثیت اختیار کر گئی اس کے ساتھ ہی شہزاد کی شخصیت اس کے نزدیک رادھا اور راہو دونوں کی خصوصیات سے مزین ہو گئی۔ وہ بیک وقت اسے پاکیزہ ترین معصوم محبوبہ اور چالباز کھلاڑی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ساعت میں ایلی اسے خلوص بھرے سجدے کرتا تھا۔ دوسری ساعت میں ناگن سمجھ کر اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔

یہ کیفیت ایک دیوانگی کی حیثیت اختیار کر گئی حتیٰ کہ اس کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ آیا

وہ اس حسین اور پاکیزہ دیوی کی وجہ سے وہاں سیس نوانے پر مجبور تھا یا اس دلکش ناگ کے ڈسے جانے کے شوق نے اسے وہاں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کربناک شدید لذت جو وہ رات کے وقت محسوس کیا کرتا تھا اسے شہزاد سے محبت کرنے پر مجبور کر رہی ہو اور ایذا پرستی کا جنون اس کے سر پر سوار ہو۔

بہرحال یہ تو ایک مسلم امر ہے کہ اگر شہزاد صرف حسین و جمیل عورت ہوتی تو شاید ایلی کے دل میں اس کے لیے اس قدر عظیم جذبہ پیدا نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اسے اس قدر دوام حاصل نہ ہوتا۔

جرگہ

کچھ دن کے بعد ایلی کا نتیجہ نکل آیا وہ ایف ۔ اے میں پاس ہو گیا۔ علی احمد نے اسے فورتھ ائیر میں داخل کرانے کے لیے لاہور بھیجنے کا فیصلہ کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایلی کو بہت لمبا چوڑا لکچر دیا۔

ایلی ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا جب وہ سب داؤ اور گر بتا چکے تو ایلی نے کہا "دیکھیے ابا جان آپ کے فرمان بالکل درست ہیں لیکن آپ مجھے اسلامیہ کالج میں داخل نہ کرائیں چونکہ وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ وہاں میں اطمینان سے نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ ان بے ضابطگیوں کا اعادہ نہ ہو جو پہلے مجھ سے سرزد ہوئی ہیں تو مہربانی سے مجھے گورنمنٹ یا مشن کالج میں داخل کرا دیجیے۔"

"ہاں ہاں" وہ بولے "ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے۔"

اس کے بعد انہوں نے مختلف لڑکوں کو ادھر ادھر بھیجا تاکہ وہ تینوں کالجوں کے پراسپکٹس لے آئیں۔ پراسپکٹس مہیا کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے بڑے رجسٹر لے کر چٹائی پر بیٹھ گئے اور سارا دن مختلف کالجوں کی فیس اور دیگر اخراجات جوڑتے رہے انہوں نے رقمیں بار بار لکھیں بار بار انہیں جمع کیا ایک میزان کو دوسرے میزانوں سے ملایا۔ اور کئی ایک گھنٹوں کے بعد انہوں نے سر اٹھا کر بولے "ٹھیک تو ہے تم کل ہی لاہور روانہ ہو جاؤ اور جا کر اسلامیہ کالج میں داخل ہو جاؤ۔"

"لیکن آپ نے تو کہا تھا" ایلی بولا "کہ آپ مجھے کسی اور کالج میں داخل کریں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ ننگے پیٹ کو کھجاتے ہوئے بولے "سیدہ او سیدہ۔ ذرا ادھر آنا۔ آنا ذرا ایک منٹ کے لیے" اور جب سیدہ آئی تو کہنے لگے "بھلا بتاؤ تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایلی کو مشن کالج میں داخل کرائیں۔ جب اپنا اسلامی کالج موجود ہو تو عیسائیوں کے کالج میں کیسے داخل کرائیں کیوں سیدہ ایمان سے کہنا۔"

"ہے" سیدہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی "اس عیسائی کالج میں جہاں اپنے محسن کا لڑکا پرویز ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بس عیسائی ہو گیا اور نتیجہ کیا ہوا ماں نے اسی غم میں جان دے دی اور باپ کا جو حال ہو رہا ہے وہ کس سے چھپا ہے۔"

"دیکھو سیدہ" وہ بڑی سنجیدگی سے بولے "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے گورنمنٹ کے کالج میں داخل ہو جائے یا عیسائیوں کے کالج میں دس ایک روپے کا فرق پڑ جائے تو کیا ہوا۔ مطلب تو یہ ہے کہ تعلیم اچھی ہو جائے لڑکے کی۔ بس صرف یہ خیال آتا ہے کہ اگر اپنا اسلامی کالج موجود ہے تو پھر کیا ہمیں ایلی کو عیسائیوں کے کالج میں داخل کرانا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تم پر رہا۔ جو تم کہو وہی کروں گا میں ذرا شمیم کو بھی بلا لوں نا اس کی مرضی بھی پوچھ لیں۔ اور ہاجرہ کہاں ہے اس کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں سیدہ"۔

سیدہ شمیم کو بلانے گئی تو وہ اٹھ کر جنگلے میں جا کھڑے ہوئے اور چلا چلا کر محلے والیوں کو بلانے لگے۔ "میں نے کہا مائی برکتے ذرا آنا تو ایک منٹ کے لیے اے بی بی نھو تو کیا کر رہی ہے۔ ہر وقت آزار بند ہی بنتی رہتی ہے کبھی اللہ اور رسولؐ کا کام بھی کر لیا کر۔ آ ذرا یہاں تیرا مشورہ لینا ہے۔ بہت ضروری بات ہے۔"

علی احمد نے شور مچا کر محلے والیوں کو اکٹھا کر لیا اور پھر اس جرگے کے سامنے ایلی کے داخلے کا مقدمہ نہایت خوب صورتی سے پیش کر دیا۔ محلے والیاں یک زبان ہو کر علی احمد کی رائے پر عش عش کر رہی تھیں۔ اور وہ بار بار چلا رہے تھے "دیکھ ماں برکتے میرا کیا ہے مجھے تو لڑکے کو داخل ہی کرنا ہے نا یہاں نہ کیا وہاں کر دیا۔ کیا فرق پڑتا ہے اول تو اخراجات میں کمی زیادتی ہوتی نہیں اور اگر ہو بھی بی بی نھو تو کیا ہے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کون ہوتا ہے۔ انہیں کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں ہم اور پھر جہاں سو وہاں سوا سو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب سوچ لو تم ایک تو عیسائیوں کا کالج ہے جہاں عیسیٰ مسیح کی بائبل پڑھتے ہیں اور دوسرا ہے اپنا اسلامی کالج جہاں اللہ

اور رسولؐ کے احکامات اور اسلام کے ارکان کی تعلیم دیتے ہیں۔ اب تم ہی فیصلہ کر لو ہاں۔"

جوں کے فیصلے کے بعد علی احمد نے ایک بار پھر رجسٹر میں اندراج شدہ رقوم کے میزان دیکھے۔ ایک بار پھر رقمیں جمع کیں اور پھر یوں فاتحانہ انداز سے مسکرانے لگے جیسے کوئی سوداگر بہت بڑے منافع کا سودا نپٹا کر گردو پیش پر نگاہ ڈال رہا ہو۔

اگلے روز سیڑھیوں میں دھما چوکڑی کی آواز کے بغیر چھن چھنانن کیے بغیر شہزاد چپکے سے داخل ہوئی۔ "تو جا رہا ہے" وہ بولی "سنا ہے کالج میں داخل ہونے کے لیے جا رہا ہے۔"

"ہاں" ایلی نے کہا۔ "تمہارے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"پڑتا ہے۔" وہ بولی "صرف ساٹھ میل کا فرق ہے۔ چار گھنٹے کا فرق سمجھ لو۔"

"اچھا۔" وہ ہنسا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ ——"

"یہ سمجھ کی بات نہیں ہاں" وہ بولی "یہ احساس کی بات ہے۔ چلو وہ چائے پر بلا رہے ہیں۔"

ایلی بگڑ گیا "میں نہیں جاتا۔ وہ بلانے والے کون ہیں۔"

"بلانے والے کا خیال نہ کرو۔ بلاوی کا تو خیال کرو۔ میری طرف دیکھو۔" وہ بولی۔

"نہ میں نہیں دیکھتا۔" وہ منہ پھیر کر بولا۔

"دیکھے بغیر رہ بھی سکو گے۔" وہ ہنسی۔

فرحت چپکے سے داخل ہو کر جھٹ سے بولی "کون کسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکے گا۔"

"میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔" شہزاد ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"کسے دیکھے بغیر" اس نے پوچھا۔

"تمہیں اور کسے" شہزاد ہنسے چلی گئی۔

"مجھے؟"

اور کیا ایلی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس ایلی کے۔ ذرا اپنے بھائی کی صورت تو دیکھو نہ جانے بھائیوں کے متعلق بہنیں غلط فہمیاں کیوں پال رکھتی ہیں۔"

"چلو بھی نا اب کہ مجھے فرحت سے پٹوا کے رہو گے" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی "چلو بھی نا" اور ایلی چپکے سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

ایلی کا خیال تھا کہ شریف کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ لاہور جائے گا تاکہ ایک بار

شہزاد سے اکیلے میں مل سکے مگر شریف نے چپکے سے اپنی چھٹی بڑھالی تھی اس لیے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ادھر علی احمد تقاضا کر رہے تھے کہ جلد جائے لہٰذا اسے اپنی مرضی کے خلاف لاہور جانا ہی پڑا۔ جاتے وقت اس نے ان بہے آنسوؤں سے شہزاد کی طرف دیکھا اور ہونٹ ہلائے بغیر اشاروں کی مدد سے شہزاد سے اظہار درد دل کیا اور رخصت ہو گیا۔

✿✿✿

تیاگ

حسن منزل

گاڑی علی پور کے سٹیشن سے روانہ ہوئی تو ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ جا رہا ہے۔ شہزاد سے دور جا رہا ہے۔ اس کے گورے چٹے ہاتھوں سے دور۔ اس کے لٹکتے ہوئے بازوؤں سے دور۔ ناؤ سی ڈولتی آنکھوں اور ماتھے کے تلک سے دور۔ پھر اسے ان رنگین اور شوخ عہد و پیمان کا خیال آیا جو انہوں نے شریف کے روبرو لطیف کنایوں اور رنگین اشارات کی مدد سے ایک دوسرے سے کئے تھے۔ اس کے دل میں اضطراب کھولنے لگا۔

کیا میں ان رنگینیوں سے محروم ہو جاؤں گا؟

کھڑکی سے باہر شہزاد مسکرا رہی تھی ——— "کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ ہنس رہی تھی۔ "چند گھنٹے کا فرق" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

ایلی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

"میری ہے تو پھر کیا غم!" اس نے سوچا۔ پھر اسے شہزاد کی وہ بات یاد آ گئی جب ایلی نے اکیلے میں شہزاد سے کہا تھا۔

"شہزاد اگر میں وہاں سے نہ آسکا تو پھر میں تمہیں کیسے دیکھوں گا۔ اتنی دیر دیکھے بنا رہوں گا۔"

یہ سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔

"اتنی دیر نہ رہنا دیکھے بنا اور کیا۔"

اور اس نے جواب میں کہا تھا: "اگر رہنا پڑے تو؟"

تو وہ بے پرواہی سے بولی تھی: "تو کیا ہوا۔ تم نہ آسکو گے تو میں آجاؤں گی۔"

"تم آؤ گی لاہور۔" ایلی نے حیرت سی شہزاد کی طرف دیکھا تھا۔

"کیوں۔" شہزاد ہنس کر بولی تھی۔ "اس میں کیا مشکل ہے۔ ایک گاڑی سے آؤں گی۔ دوسری سے لوٹ آؤں گی۔ تم دیکھ لینا جی بھر کے۔"

کتنی جرأت تھی اس میں۔

ریلوے سٹیشن سے وہ سیدھا کالج پہنچا اور علی احمد کی ہدایات کے مطابق دفتر میں داخلہ اور فیس ادا کرنے کے بعد حسن منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ جہاں اسے رہنے کے لئے جگہ ملی تھی۔

اس نے کوشش سے حسن منزل میں جگہ لی تھی کیونکہ ریواز ہوسٹل میں رہنا پسند نہ تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ریواز ہوسٹل سے گزشتہ کئی ایک تلخ یادیں وابستہ تھیں اور وہاں اب بھی گاؤں کے چودھری بھرے پڑے تھے۔ وہی چودھری جن کے ساتھ گاؤں کے کمیں نوکر ہوتے۔ حقہ اور تمباکو کی تھیلیاں ہوتیں اور جو شلوار کی جگہ چادریں باندھے یوں بورڈنگ میں گھومتے پھرتے جیسے ریواز ہوسٹل ان کے گاؤں کا کھیت ہو وہ چلا چلا کر بات کرتے۔ بات بات پر کھنکارتے۔ بورڈنگ کے نوکروں کو گالیاں دیتے۔ دھمکاتے اور ہر نئے لڑکے کو گھورتے۔

اسلامیہ کالج کے اب تین بورڈنگ تھے۔ ریواز ہوسٹل اور رحیم بلڈنگ تو کالج کی عمارت کے پہلو میں واقع تھے اور حسن منزل کافی فاصلہ پر تھی۔ کالج والے حسن منزل کے قریب کوپر روڈ پر ایک نیا بورڈنگ بنوا رہے تھے لیکن یہ باکرینٹ ہوسٹل ابھی زیر تعمیر تھا۔

تانگے میں بیٹھے ہوئے ایلی غور سے لاہور کے ان علاقوں کو دیکھتا رہا۔ جنوب کی طرف ایک وسیع میدان تھا جس میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ اس وسیع میدان میں دو ایک مکانات زیر تعمیر تھے۔ بیڈن روڈ پر چند ٹوٹے پھوٹے ویران سے مکانات تھے۔ میکلوڈ روڈ ویران سڑک تھی جس کے دونوں طرف کوئی عمارت نہ تھی۔

میکلوڈ روڈ، کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کے وسیع ویرانے کے عین درمیان میں حسن منزل واقع تھی۔ اس وسیع اور ویران علاقے میں وہ واحد دو منزلہ بلڈنگ تھی۔ میکلوڈ روڈ پر آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک سڑک جس کے غربی حصے میں یہاں وہاں اکا دکا عمارت

کھڑی تھی۔ کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کا تمامتر علاقہ ویران تھا جہاں رات کے وقت گزرنا آسان نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں چوری اور ڈکیتی کی واردات عام تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر صرف ایک سینما ہال تھا جس کا نام ایمپرس سینما تھا اور جہاں زیادہ تر تانگے والے فلم دیکھتے تھے۔ فلم کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے۔ مونگ پھلی کھاتے اور متحرک مگر خاموش تصاویر میں ہیروئن کی ٹانگیں دیکھ کر چمگادڑوں کی طرح چیخیں مارتے تھے۔

حسن منزل ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی جس کی نچلی منزل میں ایک ہوٹل تھا اور اوپر کی منزل کالج نے کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس منزل کے پچھواڑے میں ایک پرانا تکیہ اور اکھاڑہ تھا۔ منزل کے عین مقابل میں ایک پرانی کوٹھی جس میں ایک پارسی شراب بیچتا تھا۔ اس کے گاہک زیادہ تر تانگے والے تھے جو ڈھائی آنے میں ڈرافٹ بیئر کا گلاس خریدتے تھے۔ اور ایک گلاس سے دو بوتل کا نشہ حاصل کرنے کے لئے شور مچاتے دنگا کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔

حسن منزل کی اوپر کی منزل کالج والوں نے اس لئے کرایہ پر لے رکھی تھی تاکہ بورڈروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ دی جا سکے۔ غالباً کالج کے ناظموں کو بورڈروں میں صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ ان کی وجہ سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا ورنہ حسن منزل کو کالج کے نوجوانوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ سمجھتے۔ حسن منزل تو کیا ریواز ہوسٹل بذات خود کالج کے لڑکوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ رہا تھا کیونکہ اس کے گرد بہت سے مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ ریواز ہوسٹل کے مقابل کالج کے مشرقی سرے پر جو عمارت بورڈنگ کے طور پر خریدی گئی تھی اس کی کھڑکیوں سے تو گرد و نواح کے تمام مکانات کے اندرونی حصے تک دکھائی دیتے تھے۔

حسن منزل کے جس کمرے میں ایلی کو جگہ ملی وہاں کل تین سیٹیں تھیں۔ ایلی کے علاوہ وہاں دو لڑکے تھے ایک کا نام جمال اور دوسرے کا ریاضت تھا۔ ریاضت ایک دبلا پتلا طالب علم تھا جس کی ناک چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور جس کی آنکھیں روئی سی تھیں۔ جب وہ چلتا تھا تو اس کا سرا جسم جھولتا تھا۔ اعضاء اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے تھے جیسے وقتی طور پر گزارہ کرنے کے لئے فٹ کئے بغیر جوڑ دیئے گئے ہوں۔ وہ خود بات کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن کوئی بات کرتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے کانوں کے اوپر کے حصے ذرا سا خم کھا لیتے تھے تاکہ بات کا کوئی حصہ کان سے ٹکرا کر باہر نہ نکل جائے۔ بات سنتے وقت اس کی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ بات کو قطعی طور پر نہیں سمجھ رہا۔ اس کے چہرے پر کبھی

خوشی غصہ یا شرارت کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ دائمی طور پر اس کے چہرے پر ایک کیفیت گویا کندہ کر دی گئی تھی جیسے کہہ رہا ہو۔ "معاف کیجئے بات سمجھ میں نہیں آئی" ——— بات کو سننے اور سمجھنے کے باوجود اس کے چہرے پر لاعلمی اور بے بسی کے ملے جلے جذبات طاری رہتے تھے۔

جمال اونچے لمبے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ رنگ گورا تھا بال سنہرے تھے آنکھیں بھوری اور خد و خال ستواں ہونے کے باوجود مردانہ قسم کے تھے۔ اس کا جسم بھرا ہوا اور اعضاء میں ایک لچک تھی۔

جمال لائلپور کے کسی چک کا رہنے والا تھا۔ اس کی عادات دیہاتی رنگ لئے ہوئے تھیں۔ مثلاً وہ تہہ بند باندھنے، ململ کا کرتہ پہننے اور پھر بھرپور قہقہے لگانے میں خاص مسرت محسوس کیا کرتا اور اسے جسم کھجانے کی عادت تھی۔

چار ایک روز وہ تینوں ایک دوسرے سے جھجک محسوس کرتے رہے اور تکلف برتتے رہے لیکن جلد ہی جمال ایلی سے کھل کر باتیں کرنے لگا۔ جمال اور ایلی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ریاضت کے ان سے گھل مل جانے کی توقع بے سود ہے کیونکہ وہ اپنی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہے۔

کالج سے واپسی پر ایلی اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور خیالات کی دنیا میں کھو جاتا۔ کمرے کی مشرقی دیوار آہستہ آہستہ سرکتی۔ ایک زینہ نمودار ہوتا۔ پھر اس زینے سے دھما چوکڑی کی آواز آتی اور چھن چھنانن سے کوئی اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی ———

"چلو: وہ چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

ایلی چونک پڑتا اور گھبرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا۔ ریاضت چپ چاپ دیوار سے ٹیک لگائے ہاتھ میں کتاب لئے چھت کی طرف گھور رہا ہوتا۔ جمال اپنے کپڑوں کو تہہ کر کے سرہانے تلے جمانے میں شدت سے مصروف ہوتا۔ ایلی سوچنے لگتا شاید انہوں نے شہزاد کے گھنگھروؤں کی آواز سن پائی ہو۔ شاید وہ اس کے راز سے واقف ہو گئے ہوں شاید ———

پھر وہ اپنے احمقانہ خدشات پر ہنس دیتا "میں بھی پاگل ہوں۔" وہ سوچتا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر اسے خیال آتا۔ نہ جانے ان دونوں پر کیا بیت رہی ہے۔ اس کمرے میں ہوتے ہوئے نہ جانے یہ کہاں کہاں گھوم رہے ہیں۔ بیچاروں کو اپنی
پڑتا ہے

نامی

ریاضت کو چھت کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اسے شریف یاد آ جاتا شاید ریاضت بھی ایک شریف ہو جو کسی انور کے خیال میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا ہو۔ نہ جانے اس پر کیا گزری ہے۔ اس کے محلے والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ یہ شریف بن گیا ہے۔ جمال ریشمیں رومال سے منہ پونچھتے ہوئے دیکھ کر اس کی نگاہ تلے ریشمیں رومال سے گورے گورے ہاتھ نکلتے۔ مخروطی انگلیاں اس کے گالوں کو سہلاتیں لیکن جلد ہی جمال کا بھونڈا قہقہہ اسے چونکا دیتا۔

"ارے یار۔" وہ ہنستے ہوئے کہتا: "مجھے اچھے رومال کی پہچان نہیں۔"

ایلی کی نگاہوں میں وہ رومال پھیلنا شروع ہو جاتا۔ اس میں سوراخ ہو جاتے اور ان سوراخوں سے کیپ اور کپ اس کی طرف جھانکنے لگتے اور ارجمند مسکرا کر کہتا:

"ہاں۔ اس کھیل میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ اسے تھامنے رکھو۔ یوں گال سہلاؤ اور یوں ہوا میں اڑا دو یوں۔ مطلب ہوا آنا ذرا ادھر بھی مری جان کبھی کبھی"

اور پھر شہزاد چھن سے ادھر آ جاتی اور ارجمند کپ کیپ سب ماند پڑ جاتے۔ وہ مسکرا کر کہتی۔: "صرف ساٹھ میل کا فرق ہے صرف ساٹھ میل کا۔"

رومال کو منہ پر رکھ کر جمال انگڑائی لیتا اور پھر تہہ بند کھجاتا اور دو ایک گرم گرم آہیں بھر کر باہر برآمدے میں نکل جاتا۔ چند ایک منٹ کے بعد وہاں سے وہ ایلی کو پکارتا:

"اندر کیا کر رہے ہو تم۔ بے کار بیٹھ رہتے ہو یار! یہاں آؤ۔ یہاں نیچے اتنے سارے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سالوں نے پی رکھی ہے اور دیکھو تو کیا کیا حرکتیں کر رہے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنستا اور جوش میں مٹھی بھر کر کھجاتا۔ تہہ بند جھاڑتا اور گرم گرم آہیں بھرتا۔

"وہ دیکھو سامنے ——— ارے ارے وہ بھاگے وہ بھاگے سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ بھاگ کیوں رہے ہیں سالے۔ اس موٹر سائیکل کو دیکھ کر ڈر گئے ہیں کیا۔ کیوں ایلی۔ یہ موٹر سائیکل کو دیکھ کر بھاگتے کیوں ہیں؟"

"جب بھی موٹر سائیکل آتا ہے۔ یہ سب یوں بھاگ لیتے ہیں جیسے ——— اور یہ ہوٹل والا دیکھا تم نے۔ یہ جو نچلی منزل میں ہوٹل ہے۔ گاہک آتے کبھی دیکھا نہیں کسی نے پہلے

سالوں نے ہوٹل کھول رکھا ہے اور پھر یہ ہوٹل کا مالک شام کے وقت برآمدے میں ٹہلتا رہتا ہے اور اندر ہوٹل خالی پڑا رہتا ہے۔ اچھا کاروبار ہے یہ یار میں ذرا موٹر سائیکل دیکھ آؤں۔"

یہ کہہ کر جمال کھجاتا ہوا اور تہہ بند جھاڑتا ہوا نیچے اتر جاتا اور ——— پھر سیڑھیوں سے شہزاد چپکے سے ہنستی ہوئی آتی۔

"چلا گیا وہ۔ ایلی تم ہر وقت اسے کیوں پاس کھڑا کر لیتے ہو۔ خواہ مخواہ بھیڑ لگا لیتے ہو۔ کوئی بات بھی نہیں کر سکتا۔"

ایلی چونک کر دیکھتا۔

شہزاد ہنس کر غائب ہو جاتی اور وہ پھر سے اندر چارپائی پر جا بیٹھتا۔

پھر وہ کرسی پر آ بیٹھتی اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ دور جا چکی ہو۔ بہت دور۔ جیسے وہ قریب آ کر بہت دور ہو گئی ہو۔ ساٹھ میل قریب آ کر چھ ہزار میل بلکہ لاکھ میل دور ہو گئی ہو۔

ابھی انہیں اکٹھے رہتے چند دن ہوئے تھے کہ جمال نے اپنا پٹارہ کھول لیا۔ وہ ایلی کے پاس آ کر رازدارانہ انداز سے کہنے لگا:۔

"ایلی کچھ کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہاں اپنی زندگی کیسے بسر ہو گی۔ دن کیسے کٹیں گے۔"

"زندگی!" ایلی کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ "زندگی تو گزر رہی ہے۔" اس نے کہا۔ "زندگی گزرنے میں دقت کیسی؟ نہ جانے جمال کیا کہہ رہا تھا۔

"یہاں کس مصیبت میں آ پڑے ہیں؟" جمال نے ہاتھ بھر کر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہر دوسرے دن کے بعد اس کا خط آ جاتا ہے اور پھر ٹرنک کھولتا ہوں تو ہر چیز سے اس کی یادیں لپٹی ہیں۔ اس کا ریشمیں رومال ہے۔ آزار بند ہے۔ اس کا ایک دوپٹہ بھی میں اٹھا لایا تھا۔ چوری سے اٹھا لایا تھا۔ وہ چیختی رہی اے ہے میرا دوپٹہ کیوں لے جا رہے ہو میرے پاس پہلے ہی کم ہیں۔ لیکن میں اٹھا لایا اور اس کی سرمہ دانی غلطی سے آ گئی۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔"

وہ ایلی کو اپنے صندوق کے پاس لے گیا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ریشمی رومال کھولتے ہوئے کہا: "اسے سونگھو نا ذرا۔ کیسی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے اور یہ دیکھو یہ اس کا کلپ ہے۔ سالی کلپ پہنتی ہے۔ گاؤں والوں سے چوری کیونکہ کوئی دیکھ لے تو نہ جانے کیا فتوے صادر کر دے اس لئے رات کو سونے کے وقت پہنتی

ہے اور صبح اتار کر رکھ دیتی ہے۔ کہ کوئی دیکھ نہ لے اور یہ دیکھو یہ اس کی خط
تین۔ یہاں آئے ابھی دس دن ہوئے ہیں اور دس دنوں میں تین خط لکھے ہیں اس
ارے نہ نہ نہ ——" "ایلی کو خط کھولتے دیکھ کر وہ چلایا —— "نہ یار
پرائیویٹ خط ہیں۔ آج تک ایک دن کے لئے مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھی۔
ہے۔ ہر خط میں لکھتی ہے کسی اور کے پاس نہ جانا۔ بھلا پوچھو۔ یہاں کوئی ہو تو
نے شدت سے جسم کھجایا اور پھر تہہ بند جھاڑنے لگا۔

"توبہ کتنی گرمی ہے"۔

ریاضت کے آنے پر جمال خاموش ہو گیا اس نے ایلی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا
میں رکھی ہوئی چیزوں کو سنوارنے لگا۔ پھر اس نے ایلی کے ہاتھ میں ایک تصویر تھما دی

"یہ دیکھو۔" وہ زیر لب بولا۔" یہ اس کی تصویر ہے۔ سالی ہر وقت ہنستی ہے۔
دانت نکالے رکھتی ہے۔"

وہ ایک عام سی جوان لڑکی تھی۔ چہرہ گول تھا جس پر دو بڑے بڑے ابھرے ہوئے
تھے اور دو گول آنکھیں۔ ناک بیٹھی ہوئی تھی یا شاید اس لئے کہ منہ گوشت سے بھرا ہوا
ناک بیٹھی بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہونٹ موٹے تھے اور آنکھوں کے قریب یوں لکیریں
ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ ابھی ہنس پڑے گی۔ یا جیسے ہنسی ضبط کر کے
اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہو۔

"اچھی ہے؟" جمال نے پوچھا۔

"ہاں۔" ایلی نے تکلفاً کہا "اچھی ہے۔"

حالانکہ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہو۔ جوانی اور
وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں ایلی کو بھرپور جوانی اور بھرے بھرے جسم
نہ تھی۔ اسے کتابی چہروں سے لگاؤ تھا۔ ایسے چہروں سے جن پر گوشت نہ ہو۔
کی طرح ڈولتی ہوں۔ ہونٹ خم آلود ہوں۔ آنکھوں میں چمک ہو۔

"باہر چلو۔" جمال نے آہستہ سے کہا "یہاں بات نہ ہو سکے گی۔" اس نے
طرف اشارہ کیا۔ "باہر برآمدے میں کھڑے ہوں گے۔ آؤ۔"

برآمدے میں جا کر اس نے ایک ہاتھ میں وہ تصویر پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ

تصویر کو گھورتا اور کھجاتا رہا۔ پھر جوش میں کہنے لگا:

"میرے بغیر چین نہیں پڑتا اسے دو منٹ کے لئے بھی ادھر ادھر ہو جاؤں تو ڈھونڈتی پھرے
جیسے کچھ کھو گیا ہو اور چاہے کہیں بیٹھا ہوں آ کر ایسی شرارت کرے گی۔ چوری چوری چٹکی
ایسی چھیڑ خانی کرے گی کہ کسی اور کو پتہ نہ چلے لیکن اپنی حالت غیر ہو جائے۔ اور پھر
اپنا بس چلتا ہے تو گن گن کر بدلے لیتا ہوں۔" اس نے تہہ بند جھاڑتے ہوئے کہا۔

اس وقت جمال کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں کوئلوں کی طرح دہک رہی تھیں اور وہ
وار کھجائے جا رہا تھا۔

"اب ہمارا گزارہ کیسے ہو گا یہاں۔" وہ چلانے لگا۔

"وہ دیکھو۔" اس نے شراب والی کوٹھی میں ٹامیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "حرامی یوں
اکڑے ہیں جیسے ناک لگائے ہوئے ہوں۔ نہ جانے کس ناک میں ہیں۔ نہ جانے ان کا گزارہ
کیسے ہوتا ہے۔ بندر کہیں کے دیکھو تو کیسے منہ بناتے ہیں۔ وہ سنا۔ تم نے سالے چیخ رہے ہیں۔
انہیں منکا رہے ہیں۔ یار میں ابھی آیا۔" جمال نے چیخ کر کہا "ذرا انہیں قریب سے دیکھوں"
کہتے ہوئے وہ دیوانہ وار سیڑھیاں اترنے لگا۔

اس کے جانے کے بعد ایلی برآمدے میں کھڑا سوچتا رہا۔ اسے جمال اور ان ٹامیوں میں ایک
عجیب سی مناسبت دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے بال بھی سنہرے تھے۔ ان کا رنگ بھی گورا تھا۔
ان کے قد بھی لمبے تھے۔ اس کے علاوہ انکے لئے بھی زندگی گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ
وہ کھجلاتے نہیں تھے۔

نہ جانے وہ لڑکی کون تھی جو خالص گوشت کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جس کے بشرے
سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔

مولانہ جھپٹ

وہ جمال کو دیکھ کر رشک محسوس کیا کرتا تھا۔ کس قدر حسین جوان تھا وہ جیسے سانچے میں
ڈھلا ہو۔ اس کا رنگ صرف سفید ہی نہیں تھا بلکہ اس میں سرخی کی آمیزش تھی جیسے گلابی رنگ
کے ہمہرے کی جھلک ہو اور اس کے بال کتنے حسین تھے اور ان میں وہ ہلکا سا گھنگھریالہ پن اور وہ
کس قدر چمکتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ اس کا مردانہ جوش۔ جب وہ کھجاتے ہوئے ہے

ہئے کہہ کر شانے ہلاتا تھا تو ایلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دھکا دے کر برآمدے سکتا ہے اور جب جمال نے اس لڑکی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے کہا تھا:

"اور پھر جب اپنا بس چلتا ہے تو گن گن کر بدلے لیتا ہوں۔"

اس وقت اس کے چہرے پر عجیب وحشت ابھر آئی تھی جیسے واقعی گن گن کر ہو۔ اس وقت ایلی کو دکھ محسوس ہوا تھا۔ کاش وہ بھی گن گن کر بدلہ لے سکتا دیوانہ وار جھپٹ سکتا۔ اس کے خیال میں مردانگی دیوانہ وار جھپٹنے کی صلاحیت کا نام تھا۔

نہ جانے کیوں مگر ایلی کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا ہوا تھا کہ عورت مرد سے محبت کرتی ہے اور صرف اسی کی عزت کرتی ہے جس میں جھپٹنے کی صلاحیت ہو جس میں بے رحمی اور تشدد کی جھلک ہو۔ اسے علی احمد پر بھی یہی گلہ تھا کہ اس میں صلاحیت نہ تھی اور وہ صرف ٹین کا سپاہی بننا جانتے تھے اور جھوٹ موٹ کی لڑائی لڑ کر ہوا وقار حاصل کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے اور اس سعی لاحاصل سے الٹا رہا سہا کھو دیتے تھے۔

ایلی کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ خصوصی قسم کی عورتیں علی احمد کی طرف کھنچی تھیں۔ علی احمد میں ایک بے نام کشش تھی جس کی وجہ سے عورت ان کی جانب آنے پر مجبور پاتی تھی۔ ایلی اس اسرار کو نہ سمجھ سکا تھا کہ آخر علی احمد میں وہ کیا خصوصیت تھی جو بے پناہ کشش کی ذمہ دار تھی۔ ان کے خدوخال میں کوئی خصوصی بات نہ تھی۔ انداز میں کوئی کشش نہ تھی۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتی تھیں لیکن باتیں تو قریب ہونے کے بعد اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ دور سے کھینچ کر قریب نہیں لا سکتیں۔ اب البتہ احساس ہو چکا تھا کہ عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنا ایک بات ہے لیکن اسے اپنے اثر دوسری بات ——— اس کا خیال تھا کہ علی احمد میں عورت کے لئے کشش تو ہے لیکن اپنے اثر میں رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس کا اندازہ تھا کہ وہ ان کے کردار میں دخل نہ تھا۔ ان میں وہ جھپٹ نہ تھی۔

جمال کو دیکھ کر وہ اس جھپٹ کا اندازہ لگاتا تھا۔ جمال میں کس قدر اضطراب تھا۔ جب نے ایلی سے کہا تھا:

"یوں زندگی کیسے گزرے گی؟"

تو اس نے محسوس کیا تھا کہ جیسے جمال میں بے پناہ طاقت اپنا اظہار کرنے کے لئے مضطرب

اس وقت اسے شہزاد کی بند بیٹھک کا خیال آگیا۔ اس روز وہ کتنے جوش و خروش سے اٹھ کر گیا تھا۔ کس قدر خود ساختہ دیوانگی سے اس نے جھپٹنے کی کوشش کی تھی۔ شہزاد کی منتوں نے گویا اسے اور ابھارا تھا مگر ——— ایلی کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا ——— اس نے وہ بیتی ہوئی بے عزتی پھر سے شدت سے محسوس کی۔ اور پھر حسرت و تحسین بھری نظروں سے جمال کی طرف دیکھا جو بالکونی کے ستون کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے ایک ہی جھٹکا دینے سے وہ بھاری ستون ٹوٹ کر دو حصے ہو جائے گا۔

دیر تک وہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ شام کی شفق اندھیرے میں تبدیل ہو گئی اور ننھی ننھی بتیاں ٹمٹمانے لگیں۔

نری پاس

سیڑھیوں میں قدموں کی آواز سن کر ایلی چونکا جمال فاتحانہ انداز سے برآمد ہوا۔ "ارے" جمال نے ایلی کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیئے "علی" اس نے ایک نعرہ بلند کیا "ایلی کمال ہو گیا" وہ چلایا "حد ہو گئی ایلی حد ہو گئی۔"

جوش مسرت میں وہ پاگل ہو رہا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ "میں نے کہا ایلی کمال ہو گیا ہم بھی پاگل رہے پاگل" وہ اسے دو ہتڑ مار کر بولا "بے وقوف بے وقوف" اس نے نعرہ مارا اور پھر کھجاتے ہوئے بولا "کنوئیں کے کنارے پر بیٹھ کر ہم پانی کو ترستے رہے ہیں۔ کوئی اتنا بڑا احمق۔ حد ہو گئی۔ ایلی حد ہو گئی۔ ہم ایک تلاش کر رہے تھے اور وہاں ایک نہیں پانچ چھ ہیں پوری پانچ چھ۔ بہت اعلیٰ قسم کی چیزیں ہیں صرف گزارہ نہیں اور گزارہ کہاں یار ایک کو تو میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ سالی کا جسم یوں تھا جیسے جیسے چکنی مٹی کا بنا ہوا اور زرد رنگ جیسے بسنت بہار آئی ہوئی ہو۔ یار حد ہو گئی۔"

ایلی کو جمال کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سامنے کوٹھی سے پی کر آیا ہو۔ یوں بے کار مہمل قسم کی باتیں کرنا اور پھر دو ہتڑ چلانا اور نعرے لگانا۔ اس کی ہر بات شرابی سی تھی۔ ایلی نے دو ایک بار اس کے منہ کو سونگھنے کی کوشش کی لیکن بو نہ

آئی۔ اس وجہ سے اس کی حیرانگی اور بھی بڑھ گئی۔

"نہ جانے کیا کہہ رہے ہو" ایلی نے جمال سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آیا کچھ
تم پی کر آئے ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ جمال گویا دفعتاً" ہوش میں آ گیا "ایسا کام کبھی نہیں کیا میں نے
لیکن" وہ پھر بدمست ہو گیا۔ "سمجھ لو پی کر ہی آیا ہوں۔ شراب نہیں پی۔ لیکن سمجھ لو پی
ہوں۔ بند بوتل تو نہ تھی پر بڑی نشیلی تھی۔" وہ چلایا "سمجھ لو کمال ہو گیا۔ آؤ میں تمہیں
واقعہ سناؤں۔" وہ ایلی کو گھسیٹنے لگا۔ "یہاں نہیں یہاں بات کی تو ریاضت سن لے گی
کرو اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔" وہ رک کر جسم کھجانے لگا اور پھر بولا۔

"ویسے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے بھس بھرا ہو مجھے نہیں اچھا لگتا نہ۔"

جمال اسے کھینچ کر نیچے سڑک پر لے گیا۔ "وہ دیکھو۔ وہ" اس نے اشارہ کر کے کہا "ہوٹل
مینجر ٹہل رہا ہے میں بھی سوچتا تھا کہ یہ کس قسم کا بزنس ہے کہ کوئی گاہک آتا نہیں
ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔ اب تو میرا دوست بن گیا ہے۔" وہ رک گیا۔

"سلام علیکم" ہوٹل کے مینجر نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا جمال نے ہنس کر اس کی طرف
دیکھا۔

مینجر مسکرانے لگا "سیر کر رہے ہیں آپ" اس نے جمال سے کہا۔

"ہاں ذرا یہاں تک جا رہے ہیں۔" جمال نے جواب دیا۔

مینجر سے دور نکل کر جمال پھر ہنسنے لگا۔ "اب تو مزے ہو گئے۔ اب زندگی کٹے گی
میں۔"

"آخر کچھ پتہ بھی چلے۔" ایلی نے پوچھا۔ "اب کیا ہو گیا ہے۔"

"میں بھی روز سوچا کرتا تھا۔" جمال نے کہا "کہ جب موٹر سائیکل والا آتا ہے تو
میں تو یہ ٹامی بھاگتے کیوں ہیں۔"

"تو کیا پتہ چلا۔" ایلی نے پوچھا۔

"موٹر سائیکل والا ڈنڈا گورا ہے۔" جمال بولا

"ڈنڈا گورا۔" ایلی نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں۔ ان ٹامیوں کا سارجنٹ ہے وہ' اسے ڈنڈا گورا کہتے ہیں یہ سالے اس پر

شراب پیتے ہیں اور ہوٹل والے نے اپنے ہاں پانچ چھ لال بیبیاں رکھی ہوئی ہیں۔"

"لال بیبیاں؟" ایلی نے تعجب سے جمال کی طرف دیکھا۔

"ارے وہی۔ ہیرا منڈی کی عورتیں اور کون" جمال مسکرانے لگا۔

"کیا مطلب۔" ایلی نے حیرانی سے کہا۔ "اس ہوٹل میں جو بورڈنگ تلے واقع ہے۔"

"ہاں۔ یہ ہوٹل تو محض بہانہ ہے دراصل مینجر کا کاروبار ہی یہی ہے۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر کیا" جمال ہنسا۔ "میں نے گوروں سے کہا میں نے کہا سالو ڈنڈا گورا آئے گا تو بتاؤں گا
میں کہ تم بدمعاشی کرتے ہو۔ پہلے تو وہ بات کو مذاق میں ٹالتے رہے پھر کہنے لگے اور تم یہاں
کیوں آتا۔ تم بھی تو لال بی بی کے لیے آتا ہوٹل میں۔" جمال ہنسنے لگا۔ "میں نے کہا: "ہم
رپورٹ کرے گا کہ تم نے گند مچایا ہے یہاں۔ اور ایلی کچھ دیر کے بعد ایک جیب سے چاکلیٹ
نکالا اور مجھے دیکر کہنے لگا اچھا بتاؤ نہیں چاکلیٹ دیتا ہم تم کو۔ میں نے کہا نہیں سالو چاکلیٹ دے
کر ٹالتا ہے ہمیں۔ ہم رپورٹ کرے گا ضرور کرے گا۔ پھر وہ بولا کیا لے گا۔ بس میں نے کہا
اب پھنسے سالے۔ میں نے کہا ہم کو لال بی بی کے پاس لے چلو۔ اس پر وہ ہنسنے لگے بہت ہنسے
بولے۔ "اچھا ول ول تم بھی جاتا مانگتا۔" پھر ان میں سے دو مینجر کے پاس گئے اور کچھ دیر تک
اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا اور ہوٹل والا مجھے اندر لے
گیا۔

"ارے ایلی۔" جمال نے تہہ بند جھاڑ کر کہا۔ "سالی کا جسم یوں تھا جیسے گاچنی سے بنی ہوئی
ہے۔ زرد زرد جیسے زردے کی پلیٹ اتنا گتھا ہوا کہ انگلی نہ چبھے واہ واہ اور وہ ہنستی تھی مجھے دیکھ
دیکھ کر مسکراتی تھی۔"

"اچھا۔" اچھا۔" ایلی کا حلق بند ہوا جا رہا تھا۔

زردہ

اور جب میں باہر نکلا تو مینجر نے سوچا۔ شاید بخشیش دے گا۔ میں نے الٹا جھاڑ دی۔
میں نے کہا "لڑکوں کے بورڈنگ تلے تم ایسا کام کرتا ہے۔ ہم رپورٹ کریں گے۔ اس پر وہ ڈر
گیا اور منتیں کرنے لگا۔ اور مالوم ہے اس نے کیا کہا۔"

"کیا؟" ایلی کی آواز بیٹھ چکی تھی۔

کہنے لگا "نہیں جی رپورٹ نہ کرنا۔ جب جی چاہے آجایا کرو۔" اس نے قہقہہ مارا
اب ہم کو فری پاس مل گیا ہے۔ اور اس کے پاس ایک نہیں چھ ہیں۔ چھ۔" اس نے
جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اب مزا آئے گا۔ سمجھ لو زندگی بن گئی۔"

"اور اور ——— وہ لڑکی" ایلی نے پوچھا۔

"کون لڑکی۔"

"جس کی تصویر تم نے مجھے دکھائی تھی۔" ایلی نے کہا۔

"لڑکی۔" جمال نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ "ارے ایلی وہ لڑکی نہیں وہ تو میری بیوی ہے۔ ارے اس کی کیا بات ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ مگر یہ زردہ بھی خاصی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔" پھر کھجانے لگا۔ "اگرچہ اس میں گڑ کی آمیزش ہے۔ لیکن ایلی اس میں کڑاکا ہے۔ یار کل شام کب پڑے گی۔ دعا مانگو کل شام ابھی ہو جائے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "اور دیکھو ایلی۔" اس نے
سے ایلی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بھی لے چلوں گا کسی روز۔ ذرا اپنے پاؤں جمالوں پھر
چلو گے نا۔"

"لاحول ولا قوۃ" ایلی چلایا

"کیوں لاحول کی اس میں کیا بات ہے ارے کیا تم بھی ریاضت کی طرح مولوی ہو۔ ایسا
دکھنے میں تو نظر نہیں آتے۔ ارے بے وقوف یہی تو زندگی ہے۔"

"نہ نہ" ایلی بولا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ تم جایا کرو۔"

"لیکن کیوں؟" جمال نے پوچھا

"بس میرا جی نہیں چاہتا۔"

ویسے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ زبردستی اسے لے جائے اس کمرے میں بند کردے اور وہ لال بی بی جس میں گڑ کی آمیزش تھی چاروں طرف سے زبردستی اسے گھیر لے حتیٰ کہ فرار کی تمام راہیں بند ہو جائیں ——— لیکن دفعتاً اسے شہزاد کی بند بیٹھک کا خیال آگیا ——— لال بالیاں قہقہہ مار کر ہنسی۔ بس بابو۔ بس۔ اس کی آواز میں بلا کی تحقیر تھی۔

"نہیں نہیں" ایلی چلا کر بولا۔ "میں مجبور ہوں، بالکل مجبور۔"

اگلے روز سارا دن جمال بے تابی سے شام کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب سورج غروب ہو گیا

اور میکلوڈ روڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں تو جمال کھجاتا ہوا ایلی کے پاس آیا۔

"ایلی میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑ بڑ ہو جائے تو خیال رکھنا۔"

اس کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا۔ سارا دن جمال بڑی بے تابی سے شام کا انتظار کرتا۔ جوں جوں دن ڈھلتا اس کے کھجانے کی شدت بڑھتی جاتی اور پھر جب شام کا دھندلکا چھا جاتا اور میکلوڈ روڈ پر بتیاں ٹمٹمانے لگتیں تو جمال کپڑے بدل کر تیار ہو جاتا اور مسکراتا ہوا نیچے اتر جاتا۔ اور ایلی چپکے سے اپنی چارپائی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دلت پور میں ہو۔ اور بالا کی چارپائی اس کے قریب ہو۔ اور پھر بالا کے ہاتھ جنبش میں آجاتے۔

ایک روز جمال خوشی خوشی ایلی کے پاس آیا۔ "ایلی۔" وہ چلانے لگا۔ "ذرا باہر آؤ نا۔ تمہیں کچھ بتاؤں۔ باہر برآمدے میں۔" اس نے ایک ریشمی رومال جیب سے نکالا۔ "یہ دیکھو۔" وہ بولا "کتنا خوبصورت ہے، ہے نا۔ یہ اس نے دیا ہے۔"

"کس نے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اسی نے جو زرد رنگ کی ہے جسے میں پہلے روز ملا تھا۔" جمال بولا۔

"اچھا۔"

"آج جب میں باہر آنے لگا تو برآمدے میں اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کہنے لگی آپ تو ملتے ہی نہیں۔ اچھا میری نشانی تو لیتے جاؤ۔ کیا بتاؤں تمہیں اس کی آنکھوں میں کیا عالم تھا اس وقت جیسے بتیاں روشن ہوں۔ کمبخت نے ایسی محبت بھری نظر ڈالی کہ میری ہڈیاں چٹخنے لگیں میں بتاؤں تمہیں۔" ——— جمال دفعتاً رک گیا۔

"بتاؤ نا" ایلی نے کہا

"اسے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔" جمال نے رومال لہراتے ہوئے کہا۔

"ان کو بھی عشق ہوتا ہے کیا۔" ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم۔" جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔ "جب ان کو عشق ہوتا ہے تو مزہ آجاتا ہے۔ جس سے عشق ہو جائے۔ اپنا آپ بیچ کر اسے دے دیتی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" ایلی نے پوچھا۔

"تمہاری قسم" جمال نے چھاتی نکال کر کہا "ان کے عشق کی کیا بات ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ یار کبھی تم بھی چلو تمہیں دکھاؤں۔ واقعی زردے کی پلیٹ ہے اتنی مٹھاس ہے لگتا ہے کہ حد ہو گئی یار" وہ جوش میں کھجانے لگا۔ "کسی روز جب مینجر ادھر ادھر ہو جائے گا تو میں تمہیں لے چلوں گا۔"

"نہیں نہیں" ایلی چلایا۔

"ویسے نہیں۔" جمال نے کہا۔ "یونہی دکھانے کے لیے۔ بڑی پیاری باتیں کرتی ہے وہ اور پھر یہاں نہ لین نہ دین۔ مجھ سے کیا لالچ کرنا ہے اس نے۔ میں تو فری پاس والا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

جمال کی باتیں سن کر ایلی کو خیال آتا کہ کاش وہ بھی فری پاس والا ہوتا۔ اسے بھی کوئی نشانی کے طور پر رومال دیتا۔ لیکن کس برتے پر۔ وہ سوچتا مجھ میں وہ جھپٹ بھی ہو۔ وہ مردانہ جھپٹ، وہ جوش جس کے بغیر عورت کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔ پھر اسے شہزاد کا خیال آجاتا۔

نہ جانے شہزاد کیا کہہ رہی ہو گی۔ نہ جانے شریف وہیں ہے یا جا چکا ہے۔ اگر شریف وہیں ہے تو وہ اسے لبھانے میں مصروف ہو گی۔ آخر وہ اس کا خاوند ہے۔

"نہیں نہیں" وہ گھبرا کر چلاتا "شریف وہاں نہیں ہے۔ وہ تو کب کا جا چکا ہو گا اس کی چھٹی عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہو گی آخر سرکار ان گنت چھٹیاں تو نہیں دیتی اپنے ملازمین کو کیسے دے سکتی ہے۔ ورنہ کام کیسے چلے۔" اس خیال پر اس کی تسکین سی ہو جاتی لیکن پھر اس کے تخیل میں رضا سونٹا ٹیکتے ہوئے آکر چلاتا۔

"ہنچ ــــــ ہنچ۔"

پھر ارجمند کی آواز سنائی دیتی۔

"ارے اندھے یہ وہ دیوی ہے کہ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ لے اس کا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ تیاگ کر سادھو بن جائے۔ واہ واہ کیا جادو ہے۔"

پھر شہزاد غفور کے ساتھ کوٹھے پر ٹہلنے لگتی۔ "ہی ہی ہی ہی" اس کے رنگین قہقہے گونجتے اور غفور کی بھدی آواز سنائی دیتی۔ اور پھر دفعتاً خاموشی چھا جاتی اور خاموشی معنی خیز بن جاتی اور اس کا مفہوم ایلی کی آنکھوں کے سامنے کئی ایک منظر پیش کر دیتا۔ جنہیں دیکھ کر اس پر وہی دیوانگی طاری ہو جاتی۔ وہ یوں کروٹیں بدلتا جیسے دار پر چڑھا ہوا ہو۔ اس وقت جمال آہستہ سے آواز دیتا۔

"تم جاگ رہے ہو ایلی۔ مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ کمبخت کا خیال سونے نہیں دیتا۔ لیکن نہیں کیا ہے تمہیں نیند کیوں نہیں آتی۔"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں" ایلی جواب دیتا۔

"کچھ بھی نہیں پھر بھی نیند نہیں آتی"۔ جمال ہنستا "وہ دیکھو ریاضت یوں پڑا ہے جیسے کل کا مرا ہوا ہو۔"

ہنگامہ

اسی طرح ان کی زندگی حسن منزل میں گزرتی رہی۔ لیکن ایک روز جب شام کے وقت ایلی برآمدے میں گھوم رہا تھا اور جمال بن سنور کر نیچے جا چکا تھا تو سڑک پر شور و غل ہوا۔ بہت سے سپاہیوں نے ہوٹل پر یورش کر دی۔ ایلی کو معلوم نہ تھا کہ آیا جمال ہوٹل میں ہے یا کہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر وہ ہوٹل میں ہے تو کس طرح اسے باہر نکال لائے۔ اسے اس بات کے متعلق بھی علم نہ تھا کہ پولیس کے سپاہی وہاں کیوں کھڑے تھے۔ اور گورے بھاگ کر پارسی کی کوٹھی میں کیوں داخل ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر جی کڑا کر کے نیچے اترا کیونکہ بورڈنگ کے تمام طلباء برآمدے میں آکھڑے ہوئے تھے اور وہاں ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر پہلے تو وہ سپاہیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا لیکن ایک سپاہی نے اسے روک دیا۔ "اونہوں آگے جانے کا حکم بند ہے۔"

وہ ڈر کر رک گیا دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سپاہی مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کوپر روڈ پر تکیے کی طرف چل پڑا ابھی وہ چار ایک قدم چلا تھا کہ تکیے کے قریب سے جمال نے سر نکالا۔

"ارے ایلی ارے ایلی۔" وہ آہستہ سے چلایا "تم ہو کیا۔" وہ رک گیا۔

"شکر ہے۔" جمال بولا "تم آگئے ہو۔ ارے یار میں تو پھنس گیا۔ اور اگر پولیس پکڑ لیتی تو ـــــ میں غسل خانے میں تھا کہ وہ آگئے۔ میں نے جو شور سنا تو فوراً" پچھواڑے کے دروازے کی طرف سے نکل کر تکیے میں آگیا۔ وہ ادھر تو نہیں آ رہے۔"

"نہیں تو۔" ایلی نے کہا۔ "وہ تو ادھر کھڑے ہیں۔ آجاؤ آجاؤ۔"

"یار حد ہو گئی پولیس نے ریڈ کر دی شکر ہے بچ گیا میں۔"

وہ دونوں باہر نکل کر ویران سڑک پر یوں ٹہلنے لگے جیسے اتفاقاً" سیر کرتے کرتے ادھر آ نکلے ہوں۔

اس ڈر کے مارے کہ کہیں پولیس بورڈنگ میں آ کر تفتیش نہ شروع کر دے وہ دیر تک آوارہ گردی کرتے رہے۔ اور آخر تھک ہار کر اپنے کمرے میں جا پہنچے اور اپنی اپنی چارپائی پر پڑ کر لیٹ گئے۔

اگلے روز کالج جاتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ وہاں تالہ پڑا ہوا تھا۔

"ارے" جمال چلایا۔ "یہ لوگ کہاں چلے گئے۔"

"جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے بابو۔ اور کہاں جائیں گے۔" گنڈیری والے نے کہا۔

"کہاں" جمال نے پوچھا۔

"وہیں ہیرا منڈی یا موتی بازار میں اور کہاں جائیں گے۔ کبھی دھندا بھی چھٹا ہے۔" وہ بولا

"اور یہ جگہ؟" جمال نے پوچھا۔

"یہ جگہ" گنڈیری والا ہنسا۔ "یہ جگہ کسی تیل صابن والے نے لے لی ہے۔ دکان کھولے گا یہاں"

راستے میں جمال بار بار ایلی سے کہتا۔ "اب کیا ہو گا ایلی اب ہم کیا کریں گے زردے کی پلیٹ کیسے ملے گی۔ کیا خوب چیز تھی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس کے گن تو اب کھلنے لگے تھے مجھ پر اب کیا کروں ایلی۔"

وہ بار بار ایلی سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان معاملات میں ایلی سے بڑھ کر کوئی اتھارٹی نہ ہو۔ اور ایلی چپ چاپ اس کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ درحقیقت اسے خود دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ زردہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر بھی امکان تو تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی روز چپکے سے نیچے اتر جائے اور پھر زردہ سے مل کر کہے "نہیں نہیں میرا یہاں آنے سے کوئی مقصد نہیں میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔"

اس وقت ایک زرد رنگ کی نوجوان لڑکی اس کے روبرو آ کھڑی ہوتی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایلی کی طرف دیکھتی جو صرف اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ پھر اس کی حیرت بھری نگاہیں احساس تحسین سے چھلکتیں اور ایلی دفعتاً" ہیرو بن جاتا اور وہ زرد رو لڑکی اس کی منتیں کرتی۔

"لیکن ذرا بیٹھئے تو۔ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کرو گے۔" صرف دیکھنے کے لئے اس کے بازو ایلی کے گرد حمائل ہو جاتے اس کی آنکھوں میں وہ نگاہ چمکتی رہی نگاہ جس کی وجہ سے وہ شہزاد کو بھول نہ سکتا تھا۔

ہوٹل کے بند ہو جانے کے بعد جمال کی توجہ پھر اسی تصویر پر مرکوز ہو گئی جسے وہ ہوٹل میں جانے سے پہلے دیکھ دیکھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔

"آج کوئی خط نہیں آیا ایلی' آج پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس طرح زندگی کیسے کٹے گی میں نے کہا میں دو روز کی رخصت لے کر گھر سے نہ ہو آؤں۔ یہاں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اور وہ کیا کہے گی کہ گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا سمجھے گی۔ اسے کیا معلوم کہ یہاں اس کے بغیر وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔" جمال شدت سے کھجانا شروع کر دیتا۔ "دراصل ایلی مجھے اس سے بہت ہی محبت ہے۔ بے حد۔ اس کے بغیر چلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ کیا کروں۔"

پھر وہ یکدم پینترہ بدل کر کہتا۔ "ایلی۔ وہ زردہ کیا کہے گی کہ مجھے بھی نہیں ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"لیکن وہ تو چلی گئی ہے یہاں سے۔" ایلی نے کہا

"لیکن وہیں گئی ہے نا ہیرا منڈی میں۔ اسے ڈھونڈنا کیا مشکل ہے۔ یار مجھے اس کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیئے کم از کم۔"

"تو پھر" ایلی نے پوچھا۔

"تم مانو تو دونوں چل کر اسے ڈھونڈیں۔"

"لیکن ڈھونڈیں گے کیسے۔" ایلی نے پوچھا۔

"لو یہ بھی کیا مشکل ہے کیا اس کوچے سے گزرتے جائیں گے اور دیکھتے جائیں گے اگر وہ وہاں ہے تو کھڑکی یا دروازے میں بیٹھی ہو گی۔ چھپ کر تو نہیں بیٹھتیں۔ ان کا تو کام ہی ایسا ہے۔"

ایلی کو پسینہ آ گیا۔ "یار" وہ بولا "مجھے تو نہ لے کر جاؤ اپنے ساتھ۔"

"لو اس میں کیا ہے۔" جمال کہنے لگا۔ "وہاں کوئی اپنا جان پہچان تو ہو گا نہیں پھر ڈر کیسا۔"

"مجھے تو ڈر آتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تو پگڑی باندھ لینا تاکہ کوئی پہچانے نہیں۔"

اس روز وہ دونوں راستے میں اسی بحث میں الجھے رہے۔ ایلی کو اس کے کوچے میں جانے سے ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے جمال اسے زبردستی لے جائے اور جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح بیٹھتی ہیں۔ کس طرح اپنی نمائش کرتی ہیں اور پھر اگر زردہ مل جائے تو وہ اس سے کہے گا۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں لیکن جمال کو نہ بتانا۔ میں اب چلتا ہوں صرف دیکھنے کے لئے۔ زردہ کی نگاہوں میں تحسین جھلکے گی۔ اور وہ بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لے گی اور کہے گی۔ نہیں میں جمال کو کیوں بتانے لگی۔

اس کوچے میں

ہفتے کو شام ہی سے جمال نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ پہلے اس نے ایک طویل غسل کیا پھر ٹرنک کے پاس بیٹھ کر دیر تک پہننے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتا رہا۔ بالآخر کپڑے پہن کر خوشبو لگائی۔ سنہرے بالوں کو بڑے اہتمام سے بنایا۔ منہ پر کریم کی مالش کی بوٹ چمکایا اور پھر وہ تیار ہو بیٹھا جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہا ہو۔

شام کے قریب وہ دونوں چل پڑے تھے۔ بھاٹی دروازے پر وہ تانگے سے اتر گئے تاکہ تانگے والے سے یہ نہ کہنا پڑے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

اس علاقے میں گھومتے گھومتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کوچہ کہاں واقع ہے۔ جہاں چوباروں میں راگ رنگ کی محفلیں ہو رہی تھیں۔ ساز بج رہے تھے۔ بائیاں تانیں اڑا رہی تھیں لوگ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ کسی سے پوچھے بغیر اس بازار میں پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس کوچے میں پہنچنا بے حد مشکل تھا۔

دیر تک وہ چکر لگاتے رہے اور اس امر پر بحث کرتے رہے کہ آخر وہ کیسے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔

اس کوچے کے متعلق کسی سے دریافت کرنے کی ان دونوں میں ہمت نہ تھی۔ اور دریافت کیے بغیر وہاں پہنچنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ ایک بائی کے چوبارے کے نیچے

والے ہوٹل میں چائے پینے کے بہانے بیٹھ گئے لیکن چائے کا پیالہ لے کر وہاں دیر تک بیٹھنا آسان نہ تھا۔

وہاں سبھی لوگ بلا تکلف بائیوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

"اس منی بائی کے متعلق سنا تھا تم نے استاد۔ کہتے ہیں سیٹھ جمنا داس سے مینڈی کھلوانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"اور بھئی اس نے تو بیس ہجار دیا ہے بڑی بائی کو مینڈی کھلوانے کے لیے۔"

"کیوں نہ لے بیس ہجار چیج بھی تو غضب کی ہے۔"

"پر گانا وانا نہیں آوے ہے لڑکی کو۔"

"اجی قدرت بھی حساب سے دیتی ہے۔ کسی کو گلا دیوے ہے تو کسی کو جوبن، کیوں بابو۔"

اس نے جمال کو کہنی مار کر پوچھا۔

ایلی اور جمال نے دانت نکالے "ٹھیک ہے میر صاحب۔"

"بس کما لے دو ایک سال پھر وہاں گلی میں جا کر بیٹھ جائے گی۔" استاد ہنسنے لگا۔ "بازار میں تو اسی کا ٹھکانہ رہ سکتا ہے جس کا گلا اچھا ہو۔ کیوں فضلے۔"

فضلے ہنسنے لگا "ٹھیک ہے استاد۔ گلی میں ہی بیٹھے گی اور کیا۔"

"کونسی گلی میں۔" ایلی نے فضلے کے قریب ہو کر پوچھا۔

"اجی اسی میں۔" پھر اس نے غور سے ایلی اور جمال کی طرف دیکھا۔ "تم پردیسی ہو بابو۔"

"ہاں ہاں۔" جمال بولا۔ "امرتسر سے آئے ہیں۔"

"ہی ہی ہی" فضلے ہنسنے لگا جبھی گلی کا پتہ نہیں۔

"پھر بھی کہاں ہے وہ" جمال نے دوبارہ پوچھا۔

"یہ تھانے کے سامنے جو ہے۔ پر بابو یہاں کا مال اچھا نہیں۔ بس دو تین ہی کام کی ہیں باقی سب بھرتی کا مال ہے۔"

چائے ختم کر کے وہ پھر اسی چکر میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اب مشکل حل ہو چکی تھی۔ اب وہ کسی راہ گیر سے پوچھ سکتے تھے کیوں میاں تھانہ کدھر ہے اس علاقے کا۔"

دفعتاً" ایلی خوشی سے چلایا۔ "تھانے کا بورڈ تو میں نے پڑھا تھا۔ کسی چوک کے قریب تھا۔ یاد نہیں رہا کس چوک کے قریب تھا"۔

تھانہ تلاش کرنے میں انہیں چنداں دقت نہ ہوئی۔ تھانے پہنچ کر اس گلی کو نہ دیکھنا ناممکن تھا کیونکہ بہت سے لوگ ادھر سے آ رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے آنکھیں چمکا رہے تھے۔ کئی ایک تو باآواز بلند گا رہے تھے۔

وہاں پہنچ کر ایلی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ گلی میں داخل ہو۔ بازار کی بات اور تھی۔ وہ تو دوسرے بازاروں کی طرح ایک عام گزر گاہ تھی۔ وہاں چلتے ہوئے لوگوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ رنڈیوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں یا انہوں نے چوبارے میں جانا ہے۔

لیکن اس گلی میں جانا تو اعلانیہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان عورتوں کے لیے آئے ہیں اور پھر گانے والیوں کو دیکھنا یا ان کا گانا سننا برا نہ تھا۔ گلی کی رنڈیوں کو دیکھنا ایلی کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ لیکن اتنی دور آنے کے بعد اب گلی میں جانے سے انکار کرنا بھی تو ٹھیک نہ تھا۔

"میں کہتا ہوں۔" اس نے جمال سے کہا۔ "میں اندر جا کر کیا کروں گا۔ تم جا کر اسے لے لو۔ میں تمہارا یہاں انتظار کروں گا۔ اسی جگہ۔"

"نہیں یار۔" جمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "اکٹھے چلتے ہیں۔"

"لیکن" ایلی نے کہا۔ "اگر وہ مل گئی تو میں وہاں کیسے انتظار کروں گا۔"

"ہاں۔" جمال سوچ میں پڑ گیا۔ "مل گئی۔" اس نے کہا "تم پھر تم یہاں آ کر انتظار کرنا۔ چلو نا۔" وہ اسے گھسیٹ کر لے چلا

گلی میں بے حد ہجوم تھا لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ بھونڈے مذاق کر رہے تھے۔ رنڈیوں سے بحث کر رہے تھے۔ انہیں چھیڑ رہے تھے۔ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جیسے وہ رنڈیاں ہی نہ ہوں۔ ایلی یوں جمال کے ساتھ چل رہا تھا جیسے اسے گلی سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ ہو۔ جیسے وہ وہاں زبردستی لایا گیا ہو۔ ہر راہ گیر کی طرف وہ کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے اسے ذہن نشین کر رہا ہو کہ میں تو ویسے ہی آیا ہوں ان کے ساتھ دلچسپی تو صرف انہیں ہے مجھے نہیں۔

خود جمال وہاں پہنچ کر بھول چکا تھا کہ وہ دو گھنٹے کی تیاری کے بعد آیا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس نے نئے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہیں اور ان پر خوشبو لگا رکھی ہے اسے وہ دو نوں ریشمیں رومال بھی یاد نہ رہے تھے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

دراصل وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور نگاہوں میں گھبراہٹ تھی۔

کافی دیر تک تو ایلی نے آنکھیں اٹھا کر ان بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ پھر جب اس نے محسوس کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو اس نے ایک سرسری تحقیر بھری نگاہ رنڈیوں پر ڈالی۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ لاحول ولا قوۃ اس نے زیر لب کہا۔

اس تنگ و تاریک بل کھاتی ہوئی گلی میں وہ لالٹینوں کی بتیوں کے نیچے بن سنور کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے مویشیوں کی میلے میں بھینسیں دیکھ رہا ہو۔ ان کی جوانیاں لٹی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوج رہی تھیں۔ ہونٹ یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے جونکیں ہوں۔ چہروں پر تھپا ہوا پاؤڈر اور سرخی انہیں اور بھی بھیانک بنا رہا تھا۔ ایلی نے جھرجھری لی۔ وہ بازار حسن نہیں تھا بلکہ سڑے ہوئے بدبودار گوشت کی منڈی تھی۔

رنڈیوں کے چہروں پر ترو تازگی اور معصومیت نہ تھی۔ بلکہ حزن و ملال اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی حرکات بھونڈی تھیں۔ آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے پھٹے ہوئے ڈھول بج رہے ہوں اور وہ اعلانیہ لوگوں کو بلا رہی تھیں۔ یا یوں بازو اٹھاتیں جیسے کسی کو گلے لگنے کی خواہش میں بے قرار ہو رہی ہوں۔ ایک انگڑائیاں لیے جا رہی تھی۔ لیکن اس کی انگڑائیوں میں اکتاہٹ اور حسرت تھی۔ دوسری رونی لے میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ اس کا گیت دکھ بھرا تھا۔ زیادہ تر عورتیں چپ چاپ بیٹھی انتظار کر رہی تھیں کہ کب کوئی آ کر ان سے سودا کرے۔

مردوں کے گروہ ان کے سامنے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ ان کے جسموں کو ٹٹول رہے تھے ان کے ناک نقشے پر پھبتیاں اڑا رہے تھے۔ ان کی عمروں کے متعلق اندازے لگا رہے تھے اور ان سے فحش مذاق کر رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں سنتی تھیں لیکن انہیں ان سنی کر دینے پر مجبور تھیں۔ وہ ان کی مضحکہ خیز نگاہوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی نکتہ چینی کے جواب میں مسکرانے پر مجبور تھیں۔

دفعتاً ایلی نے محسوس کیا کہ عورت کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ لوگ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے کولھوں، چھاتیوں اور جسم کے نقائص گنیں یا اس کے حسن و جمال یا عمر کے متعلق پھبتیاں اڑائیں۔

پھر وہ وہاں کیوں بیٹھی تھیں۔

اس کا خیال تھا کہ جسمانی ہوس پوری کرنے کے لئے عورتیں اس کے لو میں جاگتی
جسمانی لذت "یہ بیچاریاں" وہ سوچنے لگا "ان کے چہرے تو دکھ بھرے ہیں۔ ان کے ہونٹ
صرف آہیں بھرنے کے لیے بنے ہیں۔ اور ان کے لٹے ہوئے اپاہج جسم، جسمانی لذت کا
ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایک ضعیف عورت کو وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوا "یا اللہ یہ اس عمر میں یہاں
ہے۔" وہ رک گیا۔ بڑھیا کے سامنے دو جوان مزدور کھڑے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

ایک مزدور بڑھیا کے قریب تر ہو گیا اور اسے چھیڑنے لگا "اماں تو یہاں کس امید پر
ہے۔"

بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا اور ویسے ہی بیٹھی حقہ پیتی رہی۔

مزدور کے ساتھی نے قہقہہ لگایا۔ "مائی تیرے پاس کوئی آتا بھی ہے کیا۔"

"تو ہی آجا بیٹا جو تجھے اتنا درد ہے میرا۔" بڑھیا نے نفرت سے کہا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے گندگی میں دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ اس کا دل الٹ
رہا تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سارے جسم میں جھن جھن سی ہو رہی تھی۔ جیسے اس
جسم کا بند بند کراہ رہا ہو۔ اس کے لیے اس کوچے میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال
کہہ دے میں جا رہا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

"ایلی ایلی" کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا "ایلی وہ مل گئی۔"

ایلی نے مڑ کر دیکھا۔ جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "وہ مل گئی ایلی اس
نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور رومال سے اشارہ کر کے مجھے بلا رہی ہے۔ وہ دیکھو۔" جمال نے ایک
کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو جو سرخ قمیض پہنے ہوئے ہے۔ جس کے ہاتھ میں
رومال ہے۔ وہ دیکھا وہ مسکرا رہی ہے۔ ارے" وہ چلایا "لو وہ مجھے بوسے پھینک رہی ہے"

ایلی نے اس طرف دیکھا ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے دروازے میں سرخ قمیض میں
ایک دبلی پتلی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے کلوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں جھریاں
پڑی تھیں۔ اور آنکھیں یوں کھنچی ہوئی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہی ہو

"اچھا تو میں چلتا ہوں ——" وہ بولا۔ "گلی کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔"

گلی کے باہر انتظار کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا لیکن اس میں سوچنے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔
شدید نفرت کی وجہ سے اس کے جسم کا بند بند کانپ رہا تھا۔ گلی کے بدصورت چہرے اس کے
سامنے تھے۔ ان کے سوجے ہوئے منہ۔ پھٹی پھٹی آنکھیں اور مجروح جسم ایلی کے دل میں نفرت
کی ڈھنکی بج رہی تھی۔ اور یہ نفرت اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ
بھاگ کر دیوانہ وار گلی میں جا داخل ہو۔ اور کسی بدصورت ڈائن کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر کہے
میں آگیا ہوں میں آگیا ہوں مجھے اپنی غلاظت سے بھر دے۔ مجھے اس گندگی سے شرابور کر
دے۔ میری ہڈیاں توڑ دے، مجھے فنا کر دے۔ اور پھر اس کے غلیظ جسم پر ڈھیر ہو جائے۔

ایلی کے دل میں عجیب متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ کسی وقت اس تضاد کو محسوس کر
کے گھبرا جاتا اور اسے خیال آتا کہ اس کی سرشت میں نہ جانے کیا خامی ہے کہ اس کے دل میں
بیک وقت ایسی متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ بسا اوقات اسے شک پڑتا کہ وہ دیوانگی کا شکار
ہے۔

ان خیالات سے بچنے کے لیے دیر تک وہ تھانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ بازار کو غور سے
دیکھتا رہا۔ راہ گیروں کو جانچنے کی کوشش میں شدت سے مصروف رہا۔ لیکن جب وہ ذرا بے خبر
ہوتا تو اس کی نگاہ کے تلے اسی گلی کے چہرے نمودار ہو جاتے ان کی کریہہ مسکراہٹیں اسے
چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کے تباہ شدہ لٹے ہوئے جسم اس کی طرف بڑھتے دل میں نفرت
کی ڈھنکی بجنا شروع ہو جاتی۔ اور پھر وہی دیوانہ پن اس پر مسلط و محیط ہو جاتا۔

"کس خیال میں پڑے ہو" جمال نے اس کے قریب آکر اسے جھنجوڑا۔ "سنتے ہی نہیں"

"اوہ تم آگئے" وہ چونکا۔ "مل آئے زروہ سے" اس نے پوچھا۔

"ارے نہیں وہ تو کوئی اور ہی نکلی لیکن اچھی تھی بیچاری۔ اتنی اچھی تھی کہ میں تمہیں کیا
بتاؤں کہتی تھی مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ ایمان سے یہی کہتی تھی دیکھتے ہی پیار ہو گیا اور اس
قدر شوق محسوس کیا میں نے کہ اگر تم اشارے سے نہ آتے تو خود آکر تمہارا ہاتھ پکڑ لیتی"۔

ایلی نے حیرانی سے جمال کی طرف دیکھا۔ خوش قسمت تھا وہ جو بھی اسے دیکھتی تھی اسے
پیار کرنے لگتی تھی۔ کاش ایلی نے آہ بھری۔

راستے میں جمال اسے اپنے اس نئے عشق کے قصے سنا رہا تھا۔ تفصیلات بتا رہا تھا لیکن ایلی
اپنے ہی خیالات میں مگن چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمال میں کون سی بات ہے جس کی وجہ

سے وہ اس سے عشق کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ا
مردانہ جھپٹ ہوتی۔ کاش۔

چار ایک روز کے بعد جمال بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ "ایلی!" اس نے متفکر
کہا" یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" مجھے کچھ ہو گیا ہے"۔

"کیا ہو گیا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے ٹیس پڑتی ہے اور میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ کہتا ہے
بیماری ہو گئی ہے۔"

"بیماری کونسی بیماری" ایلی نے پوچھا۔

"وہ بیماری" جمال بولا۔ اس کے چہرے پر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ "اگر میں یہ
تمام لڑکوں کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے چلا جو نہیں جاتا۔ اس لیے میں گاؤں جا رہا ہوں"

"گاؤں جا رہے ہو"۔

"ہاں ہاں" وہ بولا۔ "اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں مجھے جانا ہی ہو گا" یہ کہہ کر ا
ایلی کے ہاتھ میں چھٹی کی عرضی تھما دی۔ اور بات کی وضاحت، کیے بغیر اپنے ٹرنک میں
قرینے سے رکھنے لگا۔

"لیکن" ایلی نے کہا "آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ گے بھی یار"۔

"ابھی اس نے جملہ مکمل نہ کیا تھا کہ ریاضت داخل ہوا اور جمال نے اشارہ کر کے
خاموش کر دیا۔

اوٹ میں شانتی

جمال کے جانے کے بعد ایلی بالکل ہی تنہا رہ گیا۔ دوپہر تک وہ کالج میں وقت کاٹنا
جماعت میں چلا جاتا تھا لیکن ابھی تک اس نے ہم جماعتوں سے کوئی رسم و راہ پیدا نہ کی
اکیلا برآمدوں میں گھومتا رہتا خالی پیریڈ میں یا تو باہر لان میں ٹہلتا اور یا بازار کی طرف نکل
ان مقامات پر جانے سے احتراز کرتا جہاں کالج کے لڑکے جمع ہوتے۔

جماعت میں وہ آخری بنچوں میں بیٹھ جاتا اور جب پروفیسر لیکچر شروع کر دیتا تو وہ کئی
لڑکے کے پیچھے ہو کر تخیلات کی دنیا میں کھو جاتا۔

انگلش ڈرامہ پڑھانے والے پروفیسر کی مونچھوں سے اسے ڈر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ
محسوس کیا کرتا تھا کہ کسی سکول کے ماسٹر نے پروفیسر کا چغا پہن رکھا ہو۔ اس لیے ڈرامے کے
پیریڈ میں ایلی بیٹھنے کے لیے خاص طور پر ایسے مقامات تلاش کرتا تھا جہاں پروفیسر کی نگاہ نہ
پڑے۔ ڈرامہ کے پروفیسر کے پڑھانے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ سبق کی ابتدا میں تو پروفیسر کی
طرح بات شروع کرتا۔ پھر بتدریج جوں جوں وقت گزرتا پڑھانے کے بجائے پلیٹ فارم پر ڈرامہ
کھیلنا شروع کر دیتا۔

وہ ایکٹروں کی طرح ہاتھ چلاتا۔ منہ بناتا۔ پروفیسر کو ایکٹنگ کرتے دیکھ کر اسے علی پور کا وہ
فراخ صحن یاد آ جاتا جہاں انہوں نے ڈرامہ کھیلا تھا اور پھر سانوری اس کے سامنے آ بیٹھتی اور
زینک اسے دیکھ کر جوش میں آ جاتا اور اپنا ڈنڈا بے پرواہی سے گھماتا اور سٹیج پر کھڑے دیگر
ایکٹرز زیر لب چلاتے۔ "ابے خیال سے بے کہیں زخمی نہ کر دینا کسی کو۔" اور ناظرین زینک کی
بھونڈی حرکات کو دیکھ کر تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کا شور مچ جاتا۔

یا ایلی کو امرتسر کی آم والی کوٹھی یاد آ جاتی اور نور اپنی تمام تر رعنائی سے ٹہلتے ہوئے گانے
لگتا پھر شبھ لگن سے بہار آ جاتی۔ ندی کا پانی رک جاتا اور ندی ایک وسیع نیلی جھیل میں تبدیل
ہو جاتی اور درختوں پر کوئل کوکتی۔ کھیتوں میں سرسوں لہلہاتی اور آصف مسکرا کر اس کی طرف
دیکھتا اور آہ بھر کر کہتا آ جاؤں ایلی یہاں شبھ لگن ہے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ جب وہ جماعت میں اپنے تخیل میں کھویا ہوتا تھا تو اس کے ساتھی
نے اس جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ جماعت کے تمام لڑکوں کی نگاہیں اس پر مرکوز
تھیں اور مونچھوں والا ایکٹر پروفیسر اس پر پھبتیاں کس رہا تھا۔

اکنامکس کے پیریڈ میں ایسا حادثہ ہر لحظہ ہوا تھا۔ اسی لیے اکنامکس کے پیریڈ میں کبھی کسی کا
ڈر محسوس نہ ہوا تھا۔ اکنامکس کے پروفیسر ہر لحاظ سے انگلینڈ ریٹرنڈ قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔
اگرچہ وہ انگلستان سے ڈگری لے کر واپس آ چکے تھے۔ مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان
ہی میں مقیم ہو چکے تھے۔ وہ خوبصورت لباس پہن کر جماعت میں داخل ہوتے تھے اور آتے ہی
رجسٹر کھول کر حاضری لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ حاضری لگاتے وقت انہوں نے کبھی سر
اٹھا کر لڑکوں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکے لیس سرکنے کے
بعد جماعت سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے

پیریڈ میں حاضر رہنا چاہتے ہیں یا بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ الٹا وہ بھاگنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا
کرنے کے قائل تھے۔ انہیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے لیکچر کو سمجھ رہے ہیں یا
نہیں۔ آیا وہ اسے سمجھنا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان کا انداز بالکل پروفیسرانہ تھا باقی پروفیسر تو بیچارے
بات بات پر کان کھڑے کرنے کے عادی تھے جیسے سکول ماسٹر ہوں۔

بہر حال ایلی جماعت میں ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ حاضری لگوا کر بھاگتا نہیں تھا۔ اس لیے نہیں کہ
اسے تعلیم سے دلچسپی تھی یا لیکچر سننے کی خواہش تھی بلکہ صرف اس لیے کہ جماعت کے باہر کوئی
ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ بیٹھ سکتا ہو۔ جہاں اسے کالج کے لڑکوں سے پناہ مل سکتی ہو۔ جماعت کا
کونہ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ جہاں وہ اپنے تخیل سے کھیل سکتا تھا۔

کالج میں وہ ایک گمنام لڑکا تھا۔ حتیٰ کہ جماعت کے پروفیسر اور لڑکے اس سے واقف نہ تھے
اگر تھے بھی تو سرسری طور پر جب وہ ایلی کی طرف دیکھتے۔ تو ان کی نگاہ میں تحقیر بھری ہوتی جسے
محسوس کر کے ایلی کو ایک جھٹکا سا لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔ ان تمسخر
بھری کریدتی ہوئی نگاہوں سے دور بھاگ جائے اور پھر چھم سے شہزاد اس کے روبرو آ کھڑی ہو
اور اپنی دونوں بانہیں اٹھاتی اور وہ اس کی آغوش میں گر جاتا۔

ان دنوں حسن منزل کے قریب کالج والے ایک نیا بورڈنگ تعمیر کر رہے تھے جس میں
صرف کیوبیکل بنے ہوئے تھے۔ یہ خبر عام تھی کہ حسن منزل کو خالی کر دیا جائے گا۔ اور حسن
منزل کے لڑکوں کو ریواز یا نئے بورڈنگ میں جگہ دی جائے گی۔ جو کالج کی عمارت کے ساتھ ملحق
تھے۔ یہ خبر ایلی کے لیے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ ایلی کو حسن منزل کی تنہائی اور خاموشی بے
حد پسند تھی۔ وہ ریواز ہوسٹل میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں لڑکے بے حد ہنگامہ پسند تھے۔

ایلی کی خواہش تھی کہ اسے ایک کمرہ مل جائے جہاں وہ تنہائی میں اطمینان سے رہ سکے لیکن
الگ کمرہ ملنا آسان نہ تھا۔ نئے ہوسٹل کے کیوبیکل خصوصی طور پر سیکنڈ اور فورتھ ائیر کے لڑکوں
کے لیے بنائے گئے تھے ایلی تو تھرڈ ائیر میں تھا اس کے لیے کیوبیکل حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا اور
پھر یوسف اعظم سے جو کالج کے نئے پرنسپل بن کر آئے تھے اور جنہوں نے آتے ہی نظم و نسق
کی وجہ سے کالج میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔

ایک روز جب ایلی اپنے کمرے میں بیٹھا جمال کی اس عجیب و غریب بیماری کے متعلق سوچ
رہا تھا جو ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے اس نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی

تھی تو ریاضت فاتحانہ انداز سے کمرے میں داخل ہوا۔ آتے ہی کہنے لگا۔
"میں نئے ہوسٹل میں جا رہا ہوں۔ مجھے وہاں ایک کمرہ مل گیا ہے۔"
"نئے ہوسٹل میں" ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔ "تھرڈ ائیر کو نئے ہوسٹل میں کس طرح کمرہ
مل گیا"
ریاضت مسکرا کر کہنے لگا "میرے ابا ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے پرنسپل کو لکھا ہے۔ اس لیے
دراصل بات یہ ہے۔" وہ گھبرا کر بولا "اگر میں شور و شغب میں رہوں تو مجھے قبض کا عارضہ ہو
جاتا ہے۔"
ایلی نے حیرانی سے ریاضت کی بات سنی۔ شور و شغب سے قبض' یہ بات اس کے لیے
انوکھی تھی۔ سارا دن وہ سوچتا رہا کہ وہ بھی ایسا ہی کوئی بہانہ تراش لے تو شاید اسے بھی نئے
ہوسٹل میں جگہ مل جائے اور وہ ریواز ہوسٹل میں جانے سے بچ جائے۔

ولٹ ناسن

دو روز کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک عرضی لکھی جس میں درج تھا کہ میں
ذہنی انتشار کا مریض ہوں اور شور و شغب میں تعلیم کی طرف توجہ دینے سے معذور ہوں۔ لہٰذا از
راہ کرم مجھے ایک کیوبیکل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

عرضی ہاتھ میں پکڑے وہ دیر تک پرنسپل کے چپڑاسی کے ساتھ دفتر کے باہر بیٹھا رہا۔ پھر
پرنسپل نے اسے بلایا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مؤدبانہ سلام کیا اور عرضی پرنسپل کے سامنے
رکھ دی۔

"ول ول" عرضی پڑھ کر پرنسپل غصے میں بولا۔ "تم نیوراسس کا مریض ہے؟"
"جی ہاں جی ہاں۔" ایلی نے نیوراسس کا مطلب سمجھے بغیر سر ہلایا۔
"ول ول" پرنسپل بولا۔ "تو تمہیں کالج میں کس نے داخل کیا۔ نیوراسس کے مریض کا
کالج میں کیا کام۔"
"جی جی۔" ایلی گھبرا گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔
"ہم تمہیں کالج میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک تم فٹنس کا سارٹیفکیٹ
نہ پیش کرو۔ سمجھا۔"

"جی جی۔" ایلی کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پرنسپل نے گھورا۔

"جی جی۔ ایلی۔ ایلی جی ہاں ایلی۔"

"ایلی۔" پرنسپل نے حیرانی سے دہرایا "یہ کیسا نام ہے۔"

"جی نام تو الیاس ہے الیاس ویسے ایلی ایلی کہتے ہیں۔"

اس پر پرنسپل نہ جانے کیوں ہنسنے لگا۔ "تم کالج میں پڑھتا ہے۔ اس کالج میں۔" اس وقت چھت کے گارڈر پر بیٹھے ہوئے کبوتر نے بیٹ کی جو پرنسپل کے سر پر گری۔

"ہے۔" وہ چلانے لگا۔ "واٹ نان سینس ۔ اے چوکیدار۔ چوکیدار۔" اس نے بجانی شروع کر دی۔ اور پھر غصے میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ایلی ڈر کر دیوار سے لگ گیا۔ چوکیدار بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ "حضور حضور" کہاں تھا تم۔ کہاں تھا۔ وائس پرنسپل کو بلاؤ۔ وائس پرنسپل کو فورا"۔"

چوکیدار باہر بھاگا پرنسپل دیوانہ وار کمرے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ چھت کی طرف دیکھتا اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا وہ مسلسل چلائے جا رہا تھا۔ "واٹ نان سینس دس از آفس آر اے ہول دس از نو خانقاہ۔" وہ کبوتر کو دیکھ کر کہتا۔

موچھوں والا پروفیسر گھبراہٹ میں داخل ہوا۔

"اے وائس پرنسپل۔ واٹ از دس۔ یہ کالج ہے یا خانقاہ ہے۔"

"خانقاہ۔" وائس پرنسپل نے تعجب سے دہرایا۔

"ول ول وو پجن دیکھو۔ وہ چھت پر وہ۔" اس نے اشارہ کیا۔ "سی دیٹ اٹ از ریموو" "ابھی ابھی۔ دس از پرنسپل روم نان سس اس نے چوکیدار اور وائس پرنسپل کو مخاطب کر کے کہا چوکیدار باہر سے ایک لمبا بانس لے کر آیا اور وائس پرنسپل اور چوکیدار کبوتر کو نکالنے میں مصروف ہو گئے۔

دفعتا" پرنسپل کی نظر ایلی پر پڑی۔ "ول تم یہاں کیوں ہے۔"

"جی وہ عرضی۔" ایلی نے کہا۔

"عرضی۔ کیسی عرضی۔" وہ عرضی کی طرف لپکا۔

"آپ نے کہا تھا۔ آپ نے یعنی۔" ایلی گھبراہٹ میں بولا۔

"ول ول چھٹی مانگتا ہے۔"

"جی جی یعنی میرا مطلب ہے۔" ایلی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

پرنسپل نے جیب سے پن نکالا اور عرضی پر کچھ لکھ کر ایلی کے ہاتھ میں عرضی تھما دی۔ رن اوے ران اوے وہ ایلی اور کبوتر سے مخاطب ہو کر چلانے لگا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ایلی نے عرضی میز پر پھینک دی۔ اور خود چارپائی پر پڑ گیا نہ جانے اب کیا ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہیں وہ کالج سے نہ نکال دیں۔ اسے پرنسپل نے کہہ جو دیا تھا کہ تمہیں کالج میں کس نے داخل کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرضی پھاڑ دوں گا مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی کو دکھاؤں یہ عرضی۔

وہ سوچنے لگا کیا کالج کے پرنسپل ایسے ہوتے ہیں اور پھر یوسف اعظم کتنا مشہور آدمی تھا وہ ساری دنیا میں اس کے علم کا چرچا تھا۔ انگریزی کا عالم گنا جاتا تھا۔ کیا بڑے آدمی اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اور وہ یوں کمروں میں کبوتر اڑاتے ہیں۔

کمرے میں دوسری جانب ریاضت اپنا سامان اکٹھا کر رہا تھا کیونکہ اسی روز وہ نئے بورڈنگ میں جا رہا تھا۔

"یہ کاغذ یہ کاغذ" اس نے میز سے کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ میرا کاغذ ہے کیا؟"

"پتہ نہیں۔" ایلی اس کی بات سمجھے بغیر بولا۔

"ارے ہائیں۔" ریاضت چلایا۔ "یہ تو تمہاری عرضی ہے۔"

"میری عرضی" "ایلی اٹھ بیٹھا۔ "میری عرضی۔ ہاں ارے" اسے یاد آیا۔ "اسے مجھے دے دو۔ اسے پڑھو نہیں یہ تو پرائیوٹ کاغذ ہے۔ وہ ریاضت کی طرف لپکا۔

ریاضت گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ "میں نے تو پڑھ لی ہے۔" وہ بولا "مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں بھی نئے بورڈنگ میں کمرہ دے دیا گیا ہے۔"

"کمرہ دے دیا گیا ہے۔" ایلی نے حیرت سے ریاضت کی طرف دیکھا "کس کو کمرہ دے دیا گیا ہے۔"

"یہ دیکھ لو اس پر جو لکھا ہے۔" ریاضت نے عرضی اس کی طرف بڑھا دی۔

ایلی نے حیرانی سے عرضی کی طرف دیکھا تھا۔ یس او کے نیچے پرنسپل کے دستخط جو تھے۔ خوشی سے ایلی کی چیخ نکل گئی۔ "ارے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ارے وہ کبوتر اڑانے والا مسخرا۔

حد ہو گئی۔ واٹ نان سنس وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

ابھی ایلی کو نئے ہوسٹل میں کمرہ ملے صرف ایک دن ہوا تھا کہ کالج دس روز کے لیے بند ہو گیا اور وہ اپنا سوٹ کیس اٹھائے علی پور روانہ ہو گیا۔

جب وہ سٹیشن پر پہنچا تو وہاں رضا اسے ملا۔

"ارے تم" رضا نے خوشی سے اپنی ہاکی کی سٹک گھمائی۔ "تم یہاں کیسے۔"

"چھٹیاں ہو گئی ہیں نا اس لیے آگیا ہوں۔"

"تو بڑے وقت پر آتا ہے ایلی۔ بڑے وقت پر آتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان شادیوں میں اگر تو نہ آیا تو کیا مزا آئے گا۔ بالکل بے کار۔"

"شادیاں۔" ایلی نے پوچھا۔ "کس کی شادی؟"

"ایک ارے بابو وہاں تو پوری چار شادیاں رچی ہیں اپنے محلے میں روز ڈھولک بجتی ہے۔ عورتیں گاتی ہیں میراثنوں کی بیٹھک ہوتی ہے۔ وہ رنگ جما ہوا ہے محلے میں کہ دیکھو گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ مندر بنا ہوا ہے۔ مندر۔ اور وہ تمہاری۔" رضا رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر اور زبان ہونٹوں میں لے کر کہنے لگا۔ "توبہ ہے توبہ ہے۔ وہ تو سچ مچ اس مندر کی دیوی ہے اور ایلی گاتی ہے وہ ہے کیا گلا پایا ہے اور جو گاتے ہوئے اسے دیکھ لو تو خدا کی قسم آنکھیں ابل آتی ہیں۔ پاگل ہو جاتا ہے دیکھنے والا چلو۔ محلے میں چلو تو ——— لیکن" دفعتاً رضا رک گیا۔ "تم تو وہاں جا کر اس کے ہو رہو گے تمہارے لیے تو نیچے اترنا مشکل ہو جائے گا اور ہمارے لیے تمہارا آنا نہ آنا برابر ہو جائے گا۔" "پاگل ہو گئے ہو۔" ایلی نے جھوٹ موٹ اسے ڈانٹا۔

"تم چاہے ڈانٹ لو۔ جو جی میں آئے کہہ لو لیکن" رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ "انہوں نے تمہیں ہم سے چھین لیا ہے اور وہ ارجمند۔ وہ بھی نہیں آرہا اب کی بار۔"

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"بیمار ہے کھانسی بڑھ گئی ہے۔ سنا ہے اب تو ہر وقت بخار رہتا ہے۔ وہاں گاؤں میں چارپائی پر پڑا ہے۔"

"رضا" ایلی نے اسے کہا۔ "چلو کبھی وہاں چلیں۔ ارجمند سے مل آئیں۔ تمہیں نہیں معلوم وہ بڑی منتیں کرتا تھا کہتا تھا۔ دو ایک بار میرے پاس آؤ صرف ایک بار۔" ایلی پر رقت

طاری ہو گئی۔ "کہتا تھا" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے صرف یہی حسرت ہے کہ تم اپنی راجدھانی دیکھنے کے لیے نہ آئے۔ کہتا تھا" اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "گاؤں کی گوریاں جو اپنے چرن چھو چھو کر جیتی ہیں کب سے راہ دیکھ رہی ہیں تمہاری۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"تو پھر چلو۔" ایلی نے پوچھا۔

"تو میرا کیا ہے۔" رضا نے کہا "آج کہو تو آج ہی جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"ضرور چلیں گے۔" ایلی بولا۔

جب وہ محلے کے قریب پہنچے تو ایلی کہنے لگا "لو میں ذرا گھر ہو آؤں مل آؤں پھر آؤں گا۔"

"کون سے گھر جاؤ گے؟" رضا ہنسنے لگا۔

"اپنے گھر جاؤں گا اور کہاں ایلی نے منہ پکا کر لیا۔

"تمہاری ماں اور فرحت تو آٹھ دن سے کابل چلے گئے ہیں اور تمہارے ابا اپنی نئی نویلی کو لے کر واپس نوکری پر چلے گئے ہیں تو کس سے ملنے جائے گا وہاں" پھر وہ خود ہی بولا۔

"تیرے تو کئی گھر ہیں اور تو اتنا خوش قسمت ہے کہ وہ تیری راہ دیکھتی ہے۔ خدا کی قسم ایلی اگر وہ ایک بار میری طرف پیار سے دیکھ لے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ سب کو چھوڑ دوں۔"

ایلی پاگلوں کی طرح چلانے لگا "تم تو فضول باتیں کرتے ہو بے کار باتیں، چھوڑو مجھے۔" وہ جھوٹے غصے میں چیخنے لگا۔ اور غصے کا بہانہ بنا کر وہاں سے چل پڑا۔

محلے کا چوگان لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ بوڑھے کھانس رہے تھے۔ بچے کھیل رہے تھے وہ رک گیا۔

کھلاڑی یا بھکارن

محلے والیوں کی نگاہیں ایلی پر مرکوز ہو گئیں۔

"اپنا ایلی آیا ہے۔" ایک بولی

"اے ہے کیوں نہ آئے۔ اب بھی نہ آتا کیا۔"

"کیوں اب کیا ہے ماں۔"

"اے ہے یہی تو موقعہ تھا" ماں ہنسنے لگی۔ "اللہ رکھے سیانا لڑکا ہے کوئی بیوقوف ہے کیا۔"

آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔"

وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

"آجا آجا تو رک کیوں گیا۔ ایلی اماں صدقے۔"

"پر ماں تو ہے ہی نہیں جو صدقے ہو۔ کیوں ماں" ایک ہنس کر بولی۔

"اس کی تو اللہ رکھے ان گنت مائیں ہیں کیوں ایلی۔"

عین اس وقت کھڑکی میں سے شہزاد نے سر نکال کر کہا "کب آیا تو ایلی۔"

دوسری بولی "ایک تو یہ بولی۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایلی پسینے میں شرابور ہو گیا۔

"ماں" شہزاد کھڑکی سے چلانے لگی "جو بولنے میں مزا ہے وہ چپکے چپکے چوری چوری ملنا نہیں۔"

"ہائے ری لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو" ماں نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ "جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔ ذرا نہیں جھجکتی۔"

"جھجکنے کا زمانہ ماں گزر گیا۔ بات پرائی ہو جائے تو جھجکنا کیسا۔"

"لو سن لو بہن یہ لڑکی تو بس حد ہے۔" وہ پھر سے ہنسنے لگیں لیکن یہ ہنسی سے کس قدر مختلف تھی۔ ایلی کا پسینہ سوکھ گیا۔

"آ تجھے چائے پلاؤں۔ بالکل تیار ہے ایلی۔" شہزاد نے با آواز بلند کہا۔

"جا چا پی اس کی تو۔" ماں نے پھر بات شروع کی۔

"اچھے موقعے پر آیا ہے تو محلے میں ایک نہیں چار شادیاں" ایک نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

"اے بی بی" ماں بولی "اب تو اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔"

"سن رہی ہے تو" ایک نے شہزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "کوئی اس کے بارے میں بھی فکر کر۔"

"ایسی بیوی لاؤں گی اس کی" شہزاد نے گھبراہٹ کے بغیر کہا "کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔"

"کوئی ایسی نہ لے آنا۔" ماں نے شہزاد کو طعنہ دیا۔ "جو اپنی ہی برات میں ناچنا شروع کر دے۔"

"اور کیا منہ میں گھنگھیاں ڈال کر بیٹھ رہے۔ نہ بھئی ایسی کس کام کی۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"بس کام کی تو تو ہی آئی محلے میں۔" وہ پھر ہنسنے لگیں۔

"کیوں ماں دیکھ تو کام کی نہیں ہوں کیا۔" اس نے سینہ تان کر کہا۔

شہزاد کی ہنس مکھ جرات اور بات کی رنگینی انہیں خاموش کر دیتی تھی۔ اور وہ سب دل ہی دل میں شہزاد کو برا سمجھنے کے باوجود داد دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ شہزاد کی اس بات پر وہ سب ہنسنے لگیں۔ اور ایلی کو موقعہ مل گیا۔ انہیں مصروف دیکھ کر وہ سیدھا شہزاد کی طرف چل پڑا۔

نیچے ڈیوڑھی میں اسے مائی حاجاں مل گئی۔ "آجا کبھی ہماری طرف بھی آیا کرو۔" اس نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کبھی ہم سے بھی کر لیا کر بات۔ اے ہے اتنی بے اعتنائی بھی اچھی نہیں ہوتی۔"

وہ اسے پکڑ کر اپنے گھر لے گئی۔ اور صحن میں چلاتی ہوئی کمرے کی طرف چلی۔ صحن میں کئی ایک عورتیں بیٹھی تھیں۔ دبلی پتلی، زرد رو میلی عورتیں۔

"نہ لڑکی یہ خود تو نہیں آیا میں زبردستی لائی ہوں اسے۔ یہ کہاں آتا ہے کسی کے ہاں یہ تو صرف کوٹھے پر ہی چڑھنا جانتا ہے چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جیسے چور دبے پاؤں آتے ہیں۔"

مائی حاجاں کا کمرہ بہت چھوٹا اور تاریک تھا۔ اس میں ایک طرف ایک پرانا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے مٹی کے برتن نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک میلا سا تخت پڑا تھا۔

مائی حاجاں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور خود ایک چوکی لے کر بیٹھ گئی کہنے لگی "اے ہے میں تو دیر سے سوچ رہی تھی کہ کبھی تو اکیلا مل جائے تو بات کروں۔ آخر میں نہ کروں تجھ سے بات بیٹا تو کون کرے گا۔"

ایلی کا ماتھا ٹھنکا نہ جانے کیا کہنے کے لیے وہ اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ ضرور کوئی بات ہو گی۔ وہ گھبرا گیا۔

"اے ہے۔" بولی "لوگ تو ویسے ہی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں درد نہیں ہوتا۔ لیکن میرے لیے تو تو اپنا ہے بلکہ اپنوں سے بھی بڑھ کر عزیز۔"

"مجھے معلوم ہے ماں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اے ہے۔ برا نہ مانیو میری بات کا میں تو تیرا ہی بھلا چاہتی ہوں۔" ماں نے تمیز سے
پر کہا۔

"ہاں ہاں ماں" وہ بولا

"اور دیکھو یہ نہ سمجھنا کہ میں کسی خیال سے کہتی ہوں۔ نہ بھئی مجھے کوئی خیال نہیں
خوش رہ میں صرف یہی چاہتی ہوں چاہے جہاں مرضی ہے رہ بس میری خوشی تو اسی میں ہے
لڑکے آخر دنیا دنیا ہے۔ دنیا کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ جب لوگ تیرے متعلق باتیں کرتے
تو دل دکھتا ہے اور دیکھنا۔ پھر یہ لڑکی ہے کیا نام ہے اس کا آج کل کے نام بھی تو عجیب ہو
ہیں۔ میں اسے برا نہیں کہتی بیچاری بڑی اچھی ہے ہنس مکھ ہے اور ایمانداری سے کہتی ہوں
چلا جائے۔ اس قدر محبت سے ملتی ہے اور اتنی خاطر تواضع کرتی ہے کہ میں کیا بتاؤں۔" لا
ساعت کے لیے وہ چپ ہو گئی پھر خود ہی بولی "لیکن تو جانتا ہے کہ آخر اصل اصل ہے اور نو
نقل ہاں خون خون کی بات ہوتی ہے۔ ہم غریب سہی مگر ہمارا خاندان اصلی ہے۔ اس میں کوئی
ملاوٹ نہیں تو جانتا ہی ہے۔ خاندان بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہاں اور سچ پوچھ تو وہ کبھی چھپا نہیں رہتا
تم ہی کہو کیا اپنے بیاہ پر کبھی کسی کو گاتے سنا ہے۔ ایمان سے کہنا۔ توبہ ہے آخر لاج بھی کوئی چیز
ہے۔ ہے نا اپنے ہی بیاہ پر گاتی رہی اور محلے والیاں سب منہ میں انگلیاں ڈالے حیرت سے دیکھ
رہی تھیں۔" وہ خاموش ہو گئی۔

"سو بیٹا" وہ پھر بولی۔ "اس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلتا گیا تو کیا ہو گا یہ رکھنا یا
نہیں۔ اس کے لیے تو گھڑی بھر کا تماشا ہو جائے گا۔ کھلاڑی کو تو کھیل چاہیے پر تیری ساری
جندگی حرام ہو جائے گی ہاں کہے دیتی ہوں میں تجھے۔ آگے تو جانے جو کر ہمارا کام تو مرتی تجھے
دینا ہے۔ آخر تو ہاجرہ کا بیٹا ہے اور ہاجرہ سے بڑھ کر ہمیں اور کون عزیز ہے اور ایلی دیکھ
مرضی ہے کر پر اپنے ابا کے قدموں پر نہ چلنا نہ بیٹا۔ یہ راستہ اچھا نہیں۔ نہ اللہ رسول کو پسند
ہے۔ اور نہ کسی اللہ کے بندے کو تو تو بڑا ہی اچھا لڑکا ہے۔ اب بتا کیا بناؤں تیرے لیے چائے
گا یا شربت؟"

"نہیں ماں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ تو تکلیف نہ کر"۔ ایلی اٹھ بیٹھا۔

"اے ہے بیٹھ تو سہی کچھ دیر کے لیے۔"

"پھر آؤں گا ماں۔" وہ بولا

"میری بات کا برا تو نہیں مانا تو نے۔"

"نہیں ماں۔"

"مان بھی لے تو کیا ہوا" وہ بولی "ہم تو سچی بات کرنا نہیں چھوڑیں گے چاہے تو برا ہی
مانے ہمارا تو کام ہے کہ اپنے بچوں کو بھلائی کا راستہ بتائیں۔ ہاں۔"

بکارن سے دیا

ابھی وہ صحن میں ہی پہنچا تھا کہ چھن سے شہزاد ناچتی ہوئی آ پہنچی۔

"ہے میں نے کہا۔" وہ بولی "نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ میرے سامنے تو چل پڑا تھا
دوکان سے پھر چلا کہاں گیا۔ حیرت کی بات تھی' کیوں ماں۔"

"تو کیا اس کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتی ہے لڑکی۔" ماں نے ہنس کر طعنہ دیا۔

"کیوں نہ رکھوں ماں" وہ ہنسنے لگی "رکھنا پڑتا ہے۔ ذمہ داری کی بات جو ہوئی۔"

"اب تو میرا ہی مہمان ہے یہ۔ جب فرحت اور ہاجرہ ہوتی تھیں جب اور بات تھی۔ اب
میں نہ دھیان رکھوں گی تو وہ آکر کیا کہیں گی۔"

"اب تو ان کا بہانہ نہ بنا۔" ماں بولی۔

"بہانے بھی بنانے ہی پڑتے ہیں۔" وہ رازدارانہ انداز سے کہنے لگی۔

"ہائے ری کیا کہہ رہی ہے تو" ماں نے انگلی منہ میں دبا لی۔ "تیری یہ باتیں لے ڈوبیں محلے
والوں کو۔"

"لو ماں" وہ پھر ہنسنے لگی۔ "فی الحال تو مجھے ہی لے ڈوب رہی ہیں۔"

"تو نہ ڈوب کس نے تجھ سے کہا ہے کہ جو منہ میں آیا بک دینا۔" ماں نے ہنس کر کہا۔

"چل اب جو چائے ٹھنڈی ہو گئی تو پھر سے کون بنائے گا چائے تیرے لیے چل" وہ ایلی
سے کہنے لگی۔

"بس تیری چائے پیتا ہے یہ۔ میں نے کتنی ہی منتیں کیں کہ یہاں پی لے۔ پر اس لڑکے
نے نہ کی رٹ لگائے رکھی۔"

جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ایلی نے شہزاد کا پلو پکڑ لیا۔

"ذرا بات تو سن" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

لیکن شنزاد قہقہے لگاتی ہوئی ہوائی کی طرح اوپر چڑھ گئی۔

اوپر جا کر وہ چیخنے لگی۔ "اب آؤ گے بھی یا دو مزدوروں کو بلاؤں اٹھانے کے لیے"

دوپٹہ ایلی کے ہاتھ میں رہ گیا۔

اس کی بات سن کر رابعہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ "کس کو اٹھوانا پڑے گا۔ کیا باتیں کر رہی ہو تم۔"

"تمہارا ہی بھائی بند ہے کوئی۔ اوپر چڑھنے کا نام ہی نہیں لیتا" شنزاد ہنسی۔

"اوہ تمہارا دوپٹہ کیا ہوا۔" رابعہ نے پوچھا۔

"پوچھو اسی سے" وہ بولی "اس کا کیا اعتبار ہے آج میرا دوپٹہ اتار لیا ہے۔ اس نے کل جانے زیور اتارنے کے لیے کان مروڑ لے۔ نہ بھائی یہ تمہارے رشتے دار مجھ سے نہیں سنبھالے جاتے۔"

"سلام کہتا ہوں۔" ایلی نے اوپر آ کر رابعہ سے کہا۔

"تو ہے ایلی" وہ بولی "میں سمجھی نہ جانے کس سے کشتی لڑتی ہوئی آئی ہے۔"

"یہ تیرا بھائی بند کیا لڑے گا کشتی۔" شنزاد ہنسی۔ "اس کی صورت تو دیکھو۔"

"صورت تو اچھی بھلی ہے۔" رابعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو۔" وہ بولی "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی رو دے گا۔"

ایلی کو شنزاد پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس کی باتیں سن کر اور اس کی ہنسی دیکھ کر وہ بھی ہنسنے لگا۔ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے اوپر چوبارے میں چلے گئے۔

چوبارے میں جانو کھڑی تھی۔

"کیوں جانو چائے بھی بنائی یا نہیں۔ دیکھ تو مہمان عین سر پر پہنچ گیا ہے۔" شنزاد نے پوچھا۔

"بڑا مہمان تو دیکھو۔" جانو بولی۔ "ایسوں کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔"

"تو کیا سمجھتے ہو ہمیں بھی بتاؤ بھئی۔" اس نے جانو سے کہا۔

"یہ تو بے ایمان ہے۔ مہمان تو دو دن کا ہوتا ہے۔" جانو نے کہا۔

"کیوں تم سے کوئی بے ایمانی کی ہے اس نے۔ شرماتی کیوں ہو بتا دے میں کسی کو بتاؤں گی تھوڑی۔"

"اے ہے مجھ سے کیوں کرے بے ایمانی تم جو ہو۔" جانو غصے میں آ گئی۔

"... ایلی مجھ سے کر اس سے نہ کریو۔ یہ تو رو پڑی۔" شنزاد نے کہا۔

جانو نیچے چائے بنانے کے لیے گئی تو ایلی نے پھر سے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"شنزاد" وہ بولا "شنزاد میری طرف دیکھو۔"

"بس تم تو بھکاری ہی رہے۔" وہ پھر سے ہنسنے لگی "ہاتھ پھیلانے کے علاوہ تمہیں کچھ سوجھتا بھی ہے"

"نہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ کچھ مل جائے ہمیں۔" ایلی نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"بھکارن سے دیا مانگتے ہو۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے۔" شنزاد نے آہ بھری۔ "سبھی کچھ ... ن گیا۔ اب بھکاری آیا بھی تو کیا آیا۔ اب اسے کوئی کیا دے' کیا دے۔" شنزاد نے بھرپور نگاہ ... ے ایلی کی طرف دیکھا۔

"شنزاد" ایلی دیوانہ وار اس پر جھپٹا "میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ہو جاؤ ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔" شنزاد ہنسنے لگی۔

ایلی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ اور شنزاد یوں کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر دیکھنے لگی جیسے اس ہاتھ سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔

جانو چائے لائی تو وہ چونکی۔ ٹرے لے کر شنزاد نے میز پر رکھ دیا۔ اور زبردستی ایلی کو کرسی پر بٹھا کر کہنے لگی "لو اب یہاں بیٹھ کر چائے پیو۔ میرے سامنے بیٹھے رہو اور میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔" اور پھر اس کے سامنے تخت پر بیٹھ کر یوں سلائی کے کام میں مصروف ہو گئی جیسے ... ے ایلی سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ ایلی پاگلوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ ... بازو اور ماتھے کے تل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت پر نثار ہوئے جا رہا تھا۔

... دور باہر صحن میں جانو بیٹھی ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

آخر جانو سے نہ رہا گیا وہیں سے چلا کر بولی "اے لڑکے کیا ہو گیا ہے تجھے' یوں دیکھ رہا ہے جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ ہوش میں آ۔"

"لو نہوں" شنزاد سر اٹھائے بغیر بولی۔ "سب بے کار ہے جانو۔ پاگل کبھی ہوش میں نہیں آیا کرتے۔ تم کیوں اپنا جی جلا رہی ہو۔"

"تو نے ہی اسے کر دیا پاگل" جانو غصے میں پھنکارنے لگی۔

"اونہوں۔" وہ ویسے ہی بے پرواہی سے بولی۔ "میں کیا کروں گی پاگل جانو۔ تمہارا
میاں کو پاگل نہ کر سکی۔"

"وہ تو پہلے ہی پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی کیا بات" جانو بولی۔

"توبہ پھر" شہزاد نے ہنس کر کہا "یہ بھی پہلے ہی سے پاگل ہے۔"

"توبہ ہے۔" جانو نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "اب تجھ سے کون سر کھپائے"
کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر نیچے چلی گئی۔

"تو نے مجھے بدنام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ ہے نا"۔ شہزاد نے آنکھیں اٹھائے بغیر
مخاطب کیے بغیر کہا۔

"سبھی مجھے طعنے دیتے ہیں میں سمجھتی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں میں لیکن کیا کروں تو
نے مجھے یہاں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

"میں بہت برا ہوں۔" ایلی نے خلوص سے کہا۔

"ہو گا۔" شہزاد نے بے پروائی سے کہا "لیکن مجھے نہ جانے کیوں اچھا لگتا ہے۔ میرا جی چاہتا
ہے تجھے سامنے بٹھائے رکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں تیری خاطر میں ان کے ساتھ
نہیں گئی ہے کتنی منتیں کی تھیں انہوں نے میری اب کی بار لیکن میرا جی ہی نہیں چاہا۔ میں نے
کہا چلی گئی تو پھر نہ جانے کب ملاقات ہو تم سے اور پھر تم نے آنے میں اتنے دن لگا دیے
انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں۔" شہزاد نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں
آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "نہ جانے کیا ہو گیا ہے ایلی۔" وہ بولی "ہائے میں تو انجانے ہی میں ماری
گئی اور یہ سب محلے والیاں مجھے تمہارے طعنے دیتی ہیں۔ جلی کٹی سناتی ہیں۔ ہر روز ہر وقت"

"شہزاد۔" ایلی اچھل کر اس کے قریب آ گیا۔

دفعتاً" وہ طلسم ٹوٹا اور شہزاد گویا جاگ پڑی۔

"نہ" وہ بولی "ایسا نہ کر ایلی میری اپنی نگاہ میں تو میری عزت رہنے دے۔ مجھے اپنی نگاہ سے
نہ گرا تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا ایلی میں اپنے آپ سے جاؤں گی۔"

"تو میں کیا کروں۔" ایلی نے گھبرا کر کہا۔

"وہیں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کر۔ میری باتیں سن۔ میں اپنی بات کسے سناؤں۔ تو نے ہی نہ
سنی تو کون سنے گا۔ ایلی۔" وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ "لیکن تم نے مجھے سمجھا

تمہیں تو تو صرف ہاتھ پھیلانا جانتا ہے۔ تجھے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے۔ کچھ بھی تو
نہیں کیا مانگتا ہے مجھ سے تو جس کے پاس دینے کو کچھ بھی نہ ہو اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا
فائدہ ایلی۔" اس نے اپنا سر دوپٹے میں لپیٹ لیا اور گٹھڑی بن کر پڑ گئی۔

گوشت کا لوتھڑا

شام کے وقت شہزاد نے کپڑے بدلے اور بڑے اہتمام سے بناؤ سنگار کر کے بیٹھ گئی۔ ایلی کو
یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ اہتمام اس کی آمد کی وجہ سے ہے۔ شہزاد کے اس اہتمام کی وجہ سے وہ
بے حد خوش ہو رہا تھا۔

شہزاد کی طبیعت میں بلا کی بے نیازی تھی۔ اس نے کبھی سنگار کے لیے سرخی یا پاؤڈر استعمال
نہ کیا تھا اس زمانے میں عورتیں سرخی پاؤڈر استعمال کرنے کو باعث عار سمجھتی تھیں۔ کیونکہ بڑے
بوڑھے اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں سرخی پاؤڈر لگا کر اپنی نمائش کریں۔ اگرچہ
خوبصورت کپڑے اور زیور پہننے کو معیوب نہ سمجھا جاتا۔ کپڑا اور زیور پہننا تو عورت کا ازلی حق
ہے۔

شہزاد ہمیشہ خوبصورت کپڑے پہنے رکھتی تھی اگرچہ اس کی پوشاک میں نمائش کی جگہ سادگی
کا عنصر ہوتا تھا اس کی آنکھیں لمبی اور خوبصورت تھیں اور اس کے ماتھے پر قدرتی طور پر ایسے
مقام پر تل تھا جہاں ہندو عورتیں ٹیکا یا بندی لگاتی ہیں۔ اس کی پیشانی اور آنکھیں اس قدر جاذب
نظر تھیں کہ ہونٹوں کا موٹا پن اس کے حسن میں کبھی حارج نہیں ہوا تھا۔

ایلی اس کے سیاہ جالی دار دوپٹے جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے کو دیکھ دیکھ کر حیران
ہو رہا تھا۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ شام کے وقت شہزاد کا کپڑے بدل کر بیٹھ جانا۔ اس کی آمد کی
وجہ سے تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی میرے لیے اس قدر پروا کرے۔ میرے لیے بنے
سنورے۔ پھر بھی چوری چوری دل ہی دل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی کے لیے ہے' شام کے
کھانے سے فارغ ہو کر وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ نیچے سے شور بلند ہوا۔ چھتی گلی سے عورتیں
پکار رہی تھیں۔ بلا رہی تھیں۔

"اب تو جلدی بھی کرے گی یا نہیں۔" جانو نے شہزاد سے کہا "تو یہاں اپنی دھن میں لگی
ہے اور سب نیچے تیرا انتظار کر رہی ہیں۔"

"انتظار کر رہی ہیں۔ کون انتظار کر رہی ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"اے ہے محلے کی عورتیں اور کون۔ شادی والے گھر گانے کے لیے نہ جائے گی؟ سمجھتا ہے یہاں تیرے سرہانے بیٹھ رہے گی کیا۔"

"شادی والے گھر۔" ایلی نے گھبراہٹ بھری شرمندگی سے کہا۔ وہ شادیوں کی بابت طور پر بھول چکا تھا۔

"اور کہاں" جانو بولی۔ "تیری شادی ہو گی تو تجھے معلوم ہو گا ناکہ شادی والے گھر کے لیے جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں۔"

"اے ہے کیوں خواہ مخواہ مغز چاٹ رہی ہو۔" شہزاد جانو کو کوسنے لگی۔ "جانو چلو جلدی آجاؤں گی میں۔" وہ ایلی سے کہنے لگی۔ "تو جب تک کوئی اپنی کتاب پڑھنا" اس نے ایلی پر ایک نگاہ التفات ڈالی اور پھر سیاہ پھولدار دوپٹے کے سر پر لے کر یوں آنکھیں بنا کر ایلی کی طرف دیکھنے لگی کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ اور پھر جب جانو سیڑھیوں میں ہو گئی تو شہزاد نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو سہلاتے ہوئے بولی "سو نہ جانا۔ میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں میں داخل ہو گئی اور ایلی گیا۔

دیر تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شادی والا گھر تو وہی ہے جہاں غفور رہتا ہے۔

اسے بچپن ہی سے غفور سے نفرت تھی۔ صرف غفور ہی سے نہیں ان کے سارے کنبے سے نفرت تھی۔ اگرچہ وہ آصفی محلے میں رہتے تھے اور آصفیوں سے گہرے تعلقات تھے بھی غفور اور اس کے پانچوں بھائی آصفیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور خود کو کہلواتے تھے۔

وہ محلے سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جسمانی لحاظ سے بھی ان کی ساخت الگ ہی تھی کے جسم بھرے ہوئے تھے قد چھوٹے اور چہرے گول تھے انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا جیسے وہ گوشت کے لوتھڑے ہوں ایسے غلیظ ننگے لوتھڑے جیسے علی پور کے بوچڑ خانے میں نے بارہا دیکھے تھے۔ جہاں گائیاں اور بھینسیں ذبح کی جاتی تھیں۔ حالانکہ غفور کے علاوہ باقی بھائی بہت شریف سمجھے جاتے تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے محلے میں داخل ہوتے اور

سر جھکائے باہر نکل آتے۔ اول تو وہ محلے میں آتے ہی نہیں تھے کیونکہ ان کا مکان محلے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ یہ کونہ بازار سے عین ملا ہوا تھا اور انہوں نے براہ راست بازار سے آنے جانے کا راستہ بنا رکھا تھا جو محلے کی ڈیوڑھی سے بھی ہٹ کر تھا۔ لہٰذا انہیں گھر آنے جانے کے لیے محلے کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ سب ویسے نہ ہوں جیسے وہ دوسروں کے روبرو دکھائی دیتے تھے جھکے ہوئے سر کے باوجود ان کی نگاہوں میں محلے والوں کے لیے تمسخر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹوں میں تحقیر کا احساس دبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ ادب و احترام سے کسی کو سلام علیکم کہتے تھے تو محسوس ہوتا جیسے محض دکھاوے کے لیے بات کر رہے ہوں اور اگر ان کے ہاں کوئی محلے دار چلا جاتا تو اس کی آمد پر یوں خاموشی چھا جاتی جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ حتیٰ کہ نووارد کو محسوس ہونے لگتا کہ بگانوں کی محفل میں بیگانہ آگیا ہے۔ وہ سب کان سے منہ جوڑ کر بات کرنے والے تھے۔ ان کی شکلیں دکھانے کی محسوس ہوتی تھیں اور ان کی باتیں ہاتھی دانت۔ ممکن ہے ایلی کے یہ احساسات دراصل ایلی کے من گھڑت بغض ہوں۔ ممکن ہے کسی وجہ سے ایلی نے کوئی لاشعوری الجھن پال رکھی ہو۔ اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے ایسے احساسات اختراع کر رکھے ہوں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی کہ ایلی کو غفور اور اس کے بھائیوں سے بغض تھا۔ بھائیوں کی بات چھوڑیئے غفور کی ذات سے تو اسے بے انتہا چڑ تھی اور محلہ میں ہر کوئی جانتا تھا کہ غفور کے رویے سے خود اس کے بھائی بھی نالاں تھے۔

عام طور پر ایلی کی غفور سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی ہوتی تھی تو کچی حویلی کے قریب چونکہ عام طور پر غفور محلے کی مسجد میں نہانے جایا کرتا تھا نہانے کے لیے وہ اس راستے سے باہر نکلتا تھا جو محلے کے اندر کی چھوٹی گلی میں کھلتا تھا۔ ایلی نے چھوٹی گلی میں ہاتھ میں صابن دانی اور تولیہ پکڑے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بے حس انداز میں آگے بڑھے چلا جاتا۔ اور ہر عورت اور لڑکی کی طرف ایسے بے باکانہ دیکھتا جیسے اس کے جسم کو جانچ رہا ہو۔ جیسے قصائی بوچڑ خانے میں گائیوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ جسم کھجاتا۔ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بورا بھالو ہو اور اوپر نیچے سے اپنے جسم کو تسکین دے رہا ہو۔ یا کسی کو کچھ سمجھا رہا ہو۔ یہ محسوس کر کے ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا لیکن غفور طاقت میں ایلی کے مقابلے میں پہلوان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بے بسی بھرا غصہ ایلی کے

احساس کمتری پر تازیانے کی حیثیت رکھتا وہ کھولتا۔ اور پھر بھاگ لیتا۔

اس روز شہزاد کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ایلی سوچ رہا تھا کہ وہ بیٹھی گا رہی ہوگی
وقت وہ کتنی پیاری لگتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے اس کی آنکھوں میں ننھے
روشن ہو جاتی ہیں اور ان سے چھن چھن کر شعاعیں نکلتی ہیں۔ عورتیں تعجب سے اس کی
دیکھتیں تھیں۔ اس وقت رنگین دوپٹوں کے اس ڈھیر کے قریب ایک بھورا بھالو آکر
اس کی نگاہیں شہزاد پر مرکوز ہو جاتیں۔ اور پھر اس کا پنجہ اٹھتا۔ اور وہ کھجانے لگتا۔ اتنے زور
کھجاتا کہ اس کے بال اکھڑ جاتے اور نیچے سے ننگے غلیظ گوشت کا لوتھڑا نکل آتا۔

ایلی غصے سے کھولنے لگتا۔

پھر وہ لاحول پڑھ کر اپنی توجہ کسی اور طرف منعطف کرنے کی کوشش کرتا مگر جلد ہی
اس گانے والیوں کے رنگین جھرمٹ سے وہی بھالو ابھرتا اور وہی بھیانک منظر حقیقت بن کر
کے روبرو آکر کھڑا ہوتا۔

ٹن ——— گھڑی نے ایک بجایا۔

ایک، اس نے گھڑی کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑھے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کون
ہے اس نے سوچا۔

عین اس وقت نیچے چوگان سے اسے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شکر ہے اس نے
یقیناً" وہ بھی ان کے ساتھ ہی آ رہی ہوگی۔ بس پہنچا ہی چاہتی ہوگی۔ وہ منتظر ہو کر بیٹھ گیا۔ اب
وہ آکر آواز دے گی اور میں جھٹ سے دروازہ کھول دوں گا اور کہوں گا دیکھا یوں کیا کرتے ہیں
انتظار۔ آواز دیئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ پاؤں کی چاپ سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے مجھے
عورتوں کی آواز مدھم پڑ گئی۔ دروازوں پر دستکیں دی گئیں۔ دروازے کھلے اور بند ہو گئے اور
محلے پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا لیکن شہزاد کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی۔

دفعتاً" ایلی کی نگاہ کے سامنے وہ تنگ گلی آ گئی جس میں غفور صابون دانی اور تولیہ لئے
ہوئے کھجاتا ہوا گزرا کرتا تھا۔ گلی میں ایک طرف شہزاد سہمی ہوئی کھڑی تھی دوسری طرف ایک
بھالو کھجا کھجا کر گوشت کے لوتھڑے بنائے جا رہا تھا۔ پھر وہ شہزاد کی طرف لپکا اور گلی کے اس
پر تاریکی اور بھیانک خاموشی چھا گئی۔

ایلی پاگلوں کی طرح اٹھ بیٹھا اور دیوانہ وار ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ بے بسی اور غصے میں اس کی

آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن محلہ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔

میں یہاں اس کے انتظار میں پاگل ہو رہا ہوں ایلی نے سوچا۔ جب جی چاہے آئے مجھے کیا۔
چاہے ساری رات گلی کے اس تاریک کونے میں بسر کر دے آخر مجھے اس سے کیا غرض یہ سوچ
کر وہ لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نگاہوں تلے بھالو ناچ رہا تھا۔ قریب ہی ایک رنگین
ڈھیر سا پڑا تھا اور گلی خوف کے مارے بھیانک اور سنسان ہو رہی تھی۔

ہنستے روتے

دروازہ بجا تو چونکا۔ بھاگ کر اس نے کنڈی کھول دی اس وقت وہ بھول گیا کہ شہزاد کے
آنے یا نہ آنے سے اسے کیا غرض تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ عرصہ دراز تک اس
نے یوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے مدت سے سو چکا ہو۔

شہزاد گھر پہنچتے ہی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ "توبہ ہے۔" وہ بولی "گا گا کر ہلکان ہو گئی
سر یوں بھن بھن کر رہا ہے جیسے بھڑوں کا چھتہ ہو۔"

"لو" جانو چلائی "تو کیا اب کپڑے بھی نہ بدلو گی۔"

"اپنی جان کھائیں کپڑے۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت بھی ہو۔" یہ کہہ کر وہ سرہانے تلے بازو
رکھ کر ایلی کو بلائے بغیر یوں سو گئی جیسے ایلی وہاں موجود ہی نہ ہو جیسے ایلی نہ جانے کون ہو۔

اور ایلی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رنگین ڈھیر کو دیکھتا اور کمرے کے دروازے سے باہر
اندھیرے کونے میں بھالو ناچتا رہا۔ اور سرخ گوشت کے لوتھڑے ابھرتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح کی
سپیدی جھلکنے لگی اور تھک ہار ایلی کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز جاگتے ہی شہزاد نے ایلی کے کان میں تنکے چبھونے شروع کر دیئے۔

"گھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا اب جاگو گے بھی یا نہیں۔ دیکھو تو دن چڑھ آیا ہے۔" شرم
نہیں آتی" ایلی چلایا۔ "ساری رات انتظار کرایا اور اب تنگ کر رہی ہے۔" توبہ ہے۔" "وہ
ہنسی" جب کوئی موجود نہ ہو بیٹھ کر انتظار کرتا ہے اور جب موجود ہو۔" وہ ہنستے ہنستے رک گئی۔

"تو پڑا خراٹے لے کر سوئے جاتا ہے۔"

اس بات پر ایلی کو اور غصہ آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد اپنی غلطی تسلیم کرلے گی اور اس
سے وعدہ کرے گی کہ آئندہ وہ کبھی اتنی دیر باہر نہ رہے گی۔ لیکن شہزاد اس معاملہ میں بالکل

مجبور تھی۔ نمائش کا جذبہ آن کی آن میں اس میں یوں ابھرتا تھا جیسے بوتل سے جن نکلتا ہے۔ اور پھر وہ اپنا آپ بھول جاتی۔ اور دیوانہ وار اس جذبے کی تسکین کے لیے مضطرب ہو جاتی۔

اس روز جب وہ ایلی کو سمجھا رہی تھی۔ ”نہ پیارے اس طرح بات بات پر نہیں کڑھا کرتے۔ یہ کیا بگڑنے کی بات ہے چلو تم برا مانتے ہو تو میں آج سے گانے نہ جاؤں گی لیکن معلوم ہے میں نہ گئی تو محلے والیں کیا سمجھیں گی کیا کہیں گی۔ ایک دوسری سے گانا تو کوئی بری چیز نہیں ذرا دل لگا رہتا ہے۔ ہم بھی دو منٹ کے لیے جی لیتے ہیں۔ اگر تو برا مانتا ہے تو نہ سہی۔“

عین اس وقت نیچے ڈیوڑھی سے نائن کی آواز آئی۔ ”بی بی حسن دین کے گھر سے بلاوا ہے۔ آکر بری کی چیزیں دیکھ لو۔“

”بلاوا ہے۔“ شہزاد اپنے آپ بولی۔ ”بری کی چیزیں دیکھنے کا بلاوا ہے“۔

بری کی بات سن کر شہزاد کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور گرد و پیش دھندلا کر رہ گئے۔ یکلخت ایلی کا وجود اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا اور ایلی سے کیے ہوئے تمام وعدے فراموش ہو گئے۔ لپک کر اٹھی اور ٹرنک کھول کر کپڑے نکالنے لگی اور پھر آئینے کے سامنے سنگار میں مصروف ہو گئی۔ ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”تم جا رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

شہزاد نے خالی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو کچھ۔“ اس نے ایلی سے پوچھا۔ اس بے تعلقی کے اظہار پر ایلی کا منہ غصے میں لال ہو گیا۔ لیکن شہزاد نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس وقت وہ ٹرنک سے اپنا محبوب سوٹ نکال رہی تھی۔ پھر وہ بات کیے بغیر غسل خانے میں داخل ہو کر کپڑے بدلنے لگی۔

جلدی جلدی وہ تیار ہو کر یوں سیڑھیاں اترنے لگی۔ جیسے جانے کے سوا کسی اور بات کی سدھ بدھ نہ ہو۔ سیڑھیوں میں پہنچ کر وہ چلائی۔ ”جانو تو ہنڈیا چڑھا دینا میں ابھی لوٹ آؤں گی۔“

شہزاد کے جانے کے بعد ایلی دیر تک غصے سے کھولتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شہزاد کو بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا تھا۔ کہاں وہ محبت بھری باتیں کرنے والی شہزاد جو محلے میں اس کی تلاش میں سرگرداں پھرتی تھی اور کہاں یہ شہزاد جو اس کے وجود ہی سے منکر تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان دونوں میں سے اصلی شہزاد کون سی ہے۔

دیر تک وہ غصے میں کھولتا رہا اور پھر اپنی حماقت پر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ جانو اسے ہنستے دیکھ کر

چلانے لگی۔ ”معلوم ہوتا ہے تیرا دماگ بھی چل گیا ہے۔ تم دونوں ہی کا پتہ نہیں چلتا۔“ وہ بولی ”بے وجہ ہنسے ہو بے وجہ روتے ہو۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”اچھا میں ذرا باہر جاؤں گا۔“

”ہاں ہاں۔“ جانو کرائی ”اب تو یہاں کیوں بیٹھنے لگا جا کر بری دیکھ تو لوگ بری دیکھیں گے۔ تو اسے دیکھنا یہاں بیٹھا کیا کرے گا۔“

جب وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ تو جانو اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ کر بولی۔ ”ماں واری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے تو تجھے کس چیز کی کمی ہے۔ جیسی چاہے گا ویسی مل جائے گی۔ یہاں سے تجھے کیا حاصل ہو گا۔ پھر کیوں اپنا ایمان گنوا رہا ہے تو یہاں۔“

جلو

چوگان میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے خلا میں چل پھر رہا ہو۔ اس کے لیے سارا علی پور ایک ویرانہ تھا لق دق ویرانہ جس میں صرف ایک قندیل روشن تھی۔ اور جب وہ رنگین قندیل نگاہ سے دور ہو جاتی تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

”ابے تو ہے۔“ رضا اسے یوں کھڑے دیکھ کر چلایا۔ ”یہاں کیا کر رہا ہے تو جیسے کوئی کھو گیا ہو۔“

”کوئی نہیں“ ایلی نے جواب دیا ”میں خود کھو گیا ہوں رضا۔“ وہ پہلا دن تھا جب اس نے رضا کے روبرو اس بات کا اقرار کیا تھا۔ اگر اس وقت رضا اس کی بات نہ کاٹتا تو غالباً“ وہ اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر رو دیتا۔ اور رو رو کر اپنی داستان کہہ دیتا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیوں رضا خود کسی رنگین اضطراب میں کھویا ہوا تھا۔

”ارے یار“ وہ بولا ”آج وہ رونق ہے وہ مشغلے ہیں کہ حد ہے۔ ہر لڑکا کسی نہ کسی داؤ پر لگا ہے۔ لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آ جا رہے ہیں۔ تانک جھانک ہو رہی ہے۔ لوگ ڈیوڑھیوں اور تنگ گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں اور تو۔ تو یہاں کھڑا ہے جیسے۔“

ایلی چپ کھڑا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر رضا بولا ”آ میں تجھے سائیں کے پیڑے کھلاؤں کیا یاد کرے گا تو چل اب۔“ اور وہ دونوں سائیں کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے ایلی اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اور رضا کسی اپنی ہی بات میں مگن تھا۔

فرق یہ تھا کہ ایلی کی خاموشی مایوسی بھری تھی اور رضا میں ایک امید بھرا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

دفعتاً ایلی رک گیا۔ "رضا ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" رضا نے اپنا سونٹا زمین پر ٹیک کر لنگڑی ٹانگ اٹھائی "کہو۔" وہ بولا۔

اس وقت ایلی کو احساس ہوا کہ اس نے رضا سے کچھ کہا ہے۔ شاید وہ اپنا راز بتانے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

"کہو نا" رضا بے تابانہ بولا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ وہ ایک ساعت کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا

"رضا میرا جی نہیں لگتا۔"

"تو پھر" وہ بولا

"پھر" ایلی نے دہرایا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھر کے جواب میں کیا کہے۔

"یہاں سے کہیں چلے جائیں؟" ایلی کے منہ سے نکل گیا۔

"لیکن جائیں کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔" رضا بولا پھر دفعتاً وہ چلایا "ارے وہ ارجمند جو ہے بیچارا کب سے ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ بیمار پڑا ہے۔ کہتے ہیں دق ہے۔ اس کا بڑا بھائی تو جوانی میں دق سے مرا تھا۔"

"ہاں ارجمند جو ہے۔" ایلی نے محسوس کیا کہ اس کا علی پور سے جانے کا شوق مدھم پڑتا جا رہا ہے۔

"تو کب چلیں؟" رضا نے پوچھا۔ "آج ہی سہی۔ چاہے ابھی چلو۔"

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

رضا نے سونٹا دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "اب آپ ہی بات کر کے پیچھے ہٹتا ہے۔" وہ اسے گھورنے لگا۔

ایلی بھی جوش میں آ گیا "تو چل ابھی سہی۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا لاؤں۔" "ہوں سوٹ کیس" رضا چلایا اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ بابو بنا پھرتا ہے۔"

"اچھا تو ابھی لا سوٹ کیس اپنا میں انتظار کروں گا۔"

"تو نہیں جائے گا گھر اطلاع دینے۔" ایلی نے پوچھا۔

"اپنا کیا ہے۔" وہ بولا "کسی کے ہاتھ کہلا بھیجوں گا کہ مال لینے جا رہا ہوں۔" تو جا۔ بھاگ۔"

جب ایلی گھر پہنچا تو اس کا دل دو متضاد خواہشات میں بٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں اسے خیال آتا اسے بتائے بغیر میں کیسے جا سکتا ہوں۔ جب اسی معلوم ہو گا تو وہ کیا کہے گا۔ اور پھر آٹھ چھٹیاں ضائع کر دینا پھر نہ جانے کب علی پور آنا نصیب ہو۔

دوسرے لمحے میں وہ سوچتا یہاں کیوں بیٹھا اس کا انتظار کھینچتا رہوں اور وہ یوں گانے میں اور بری جہیز دیکھنے میں مصروف رہے۔ گانا تو محض بہانہ ہوتا ہے۔ مقصد تو اپنی نمائش کرنا ہوتا ہے۔ اور اور پھر اس وقت اس کی نگاہوں تلے وہ کھچاتا ہوا بھالو آ کھڑا ہوتا۔ شہزاد ڈگڈگی بجا بجا کر گاتی اس خیال پر ایلی کو از سر نو غصہ آ گیا۔ اس نے لپک کر سوٹ کیس اٹھا لیا اور چپکے سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ راستے میں کئی بار جی چاہا کہ لوٹ جائے۔

علی پور سے نکلتے ہی ایلی کو وہاں سے چلے آنے پر افسوس ہونے لگا۔ دل میں درد ہونے لگا۔ گاڑی چھکا چھک چلے جا رہی تھی۔ دور ہرے بھرے کھیتوں کے پرے شہزاد اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ "نہ جاؤ نہ جاؤ تم کیوں چلے گئے ہو ایلی کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔"

"ایلی۔" شہزاد چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

سٹیشن پر اترنے کے بعد ایلی نے ان چند کچے گھروندوں پر نگاہ ڈالی جو ریلوے سٹیشن کے پاس ڈھیر ہو رہے تھے۔

چمار کی دوکان پر چار ایک آدمی کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

ان کے قریب ہی دو آدمی زمین پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بائیں ہاتھ کیکر کے درخت تلے ایک گدھا کھڑا تھا جس پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اس کے قریب ہی کوئیں پر چار ایک بھدی اور میلی عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچے گھروندوں کے چاروں طرف دور دور تک بنجر زمین کا وسیع پھیلاؤ۔

گاؤں دیکھ کر ایلی گھبرا گیا۔ "کیا یہی گاؤں ہے" اس نے رضا سے پوچھا۔ "یہ تو محض ویرانہ ہے۔"

"اور کیا ہو پیارے۔" رضا چلایا۔ "گاؤں تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"لیکن لیکن ارجمند تو کہتا تھا۔"

رضا نے قہقہہ لگایا "اسے تو بکنے کی عادت ہے بکے جاتا ہے۔" "وہ تو بندرابن بنائے بیٹھا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھ لو بندرابن" رضا ہنسنے لگا۔

"وہ تو کارخانے میں کام کرتا ہے نا۔" ایلی نے پوچھا۔

جلو کا تارپین کا کارخانہ گاؤں سے میل کے فاصلے پر تھا۔ سٹیشن سے ایک چھوٹی سی لائن کارخانے کی طرف جاتی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی ٹرالیاں چلتی تھیں۔

کارخانہ ایک وسیع چوگان میں تھا جس میں عمارتیں اور مشینیں تو کافی تھیں لیکن بیشتر عمارتیں ویران پڑی تھیں اور اکثر مشینیں بے کار کھڑی زنگ آلود ہو چکی تھیں۔

کارخانے کے جنوبی حصے میں مزدوروں اور ملازمین کے لیے کوارٹروں کی چند ایک قطاریں بنی ہوئی تھیں۔ بہت دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں ارجمند کا گھر ملا۔

مرلی کا رسیا

وہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ مختصر سے صحن میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور غسل خانہ بنا ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پر ارجمند لیٹا ہوا تھا۔ چارپائی کے قریب اس کی ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف ارجمند کی ہمشیرہ چپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی۔ چارپائی پر ارجمند کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ایلی نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا "یا اللہ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔" اس کے قریب رضا لاٹھی زمین سے ٹیکے چپ چاپ کھڑا تھا۔

دفعتاً ارجمند کی ماں نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لیے انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر چونکی۔ اس نے مسکرانے کی شدید کوشش کی۔ لیکن اس کی ہچکی نکل گئی۔ اور پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"دیکھ تو بیٹا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "تیرے دوست تجھ سے ملنے آئے ہیں۔ دیکھ تو ادھر آنکھیں تو کھول۔"

لیکن ارجمند اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

وہ ایلی اور رضا سے مخاطب ہو کر بولی "اسے تو اپنی سدھ بھی نہیں رہی۔ بس یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ہے۔ نہ خود بات کرتا ہے۔ نہ کسی کی بات سنتا ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ دیکھ لو اپنے دوست کا حال۔"

وہ دونوں چپ چاپ چوکیوں پر بیٹھ گئے ماں پھر سے اپنے بیٹے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے میں کھو گئی اور کوارٹر پر ایک خوفناک خاموشی مسلط ہو گئی۔

نہ جانے کب تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔

رضا نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ ایلی غور سے ارجمند کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ اس میز پر پڑی جو ارجمند کے سرہانے پڑی تھی۔ میز پر ایک موٹی سی مجلد کاپی تھی جس کے سرورق پر خوش خط حروف میں انکرائنڈی ماباؤں لکھا ہوا تھا۔ ایک طرف بانسری دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کے قریب ہی سستی خوشبو کی چند خالی شیشیاں تھیں اور اشعار کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑی تھیں اپنی انکرائنڈی پریم سندیس پریم پتر اور پونم رُتا سے بے نیاز گوکل کے بن کا وہ کنہیا آنکھیں بند کیے ہوں بے حس لیٹا ہوا تھا جیسے اس میں حرکت کی سکت نہ رہی ہو۔"

اس منظر کو دیکھ کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو دے۔

دفعتاً ارجمند کو کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور اس کا سارا جسم کھانسی کی شدت سے لرزنے لگا۔ سینے میں دھنکی سی چل رہی تھی۔ ہڈیاں چیختی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ماں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ بہن چونے بھرا پیالہ اٹھا کر پاس آ کھڑی ہوئی تاکہ اسے تھوکنے میں وقت نہ ہو۔ دیر تک ہڈیوں کا ڈھانچہ یوں ہلتا رہا۔ جیسے روئی سے بنا ہوا ہو۔ پھر اس نے منہ کھول دیا اور بستر پر خون کی پچکاری سی چل گئی۔ ماں نے اسے لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں دیکھنے کی سکت نہ تھی ماں چلانے لگی۔ "بیٹا دیکھ تو تیرے دوست آئے ہیں۔" مگر وہ جوں کا توں پڑا رہا۔

پھر ایلی اٹھ کر اس کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا۔ "ارجمند" اس نے اسے آواز دی۔ "ارجمند ارجمند۔" ارجمند کی نگاہ میں ایک چمک سی لہرائی۔

"میں ہوں ارجمند میں اور رضا بھی آیا ہے۔" ایلی نے رضا کی طرف اشارہ کیا۔ ارجمند نے

گردن موڑنے کی کوشش کی اپنی بے بسی محسوس کرکے اس کی آنکھیں پرنم سی ہوگئیں۔

"کوئی بات کر ان سے بیٹا۔" اس کی ماں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"کیا حال ہے تیرا۔" ایلی نے چلا کر کہا۔

ارجمند نے بعد مشکل اپنا ہاتھ اٹھایا اور یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو "ٹھیک ہوں میں۔"

"جلد جلد صحت یاب ہونا۔" وہ بولا۔

ارجمند مسکرا دیا۔

دو روز انہوں نے وہاں قیام کیا۔ پہلے دن تو ارجمند ان سے کوئی بات نہ کر سکا مگر اگلے دن اس کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی تھی۔

"تم اچھے ہونا۔" ارجمند نے اشاروں کی مدد سے ایلی سے پوچھا۔

"تم اپنی بات کرو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"مزے میں ہوں۔" وہ بولا "لیکن تم دیر سے آئے ہو۔ بہت دیر سے۔" ارجمند نے رک رک کر کہا۔

"کیوں اب کیا ہے۔" رضا نے پوچھا۔

"اب۔ اب۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "اب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ تمہیں بندرا بن کون دکھائے گا۔ اور اور وہ۔" رک گیا۔

"ابے مسخرے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے تو نے۔" رضا نے شرارت سے کہا۔

"ڈھونگ رچائے بنا رہے ہیں کبھی۔" وہ بولا "اماں ڈھونگ بھی نہ ہو تو ہو کیا۔"

"اب جلد ٹھیک ہو جانا۔ اور علی پور آؤ۔ بیاہ ہو رہے وہاں۔"

"کپ کیپ کی سناؤ۔" ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مری تو نہیں جا رہی اپنے فراق میں۔"

"تو شرارت سے کب باز آئے گا۔" رضا چلایا۔

"اونہوں" ارجمند بولا "باز آنا اپن کا کام نہیں۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"وہاں جا کر بھی یہی کام کروں گا۔" ارجمند نے کہا۔

"کہاں جا کر۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہاں" وہ بولا "بڑا مزا رہے گا وہاں۔"

"بکواس نہ کر۔" رضا چلایا۔

"اونہوں" وہ ہنسا "یہ بند نہ ہو گی۔"

دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر ایلی اور رضا اٹھ بیٹھے "اچھا اب ہم جاتے ہیں۔"

"اونہوں۔" ارجمند نے سر ہلایا۔

"پیچھے دوکان اکیلی ہے۔" رضا بولا۔

"ہمیں اب اجازت ہی دو۔" ایلی نے کہا۔

ارجمند نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ اور جب ایلی رضا مصافحہ کرنے لگے۔ ارجمند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما تو اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر رخسار پر بہہ گیا۔

"دل برا نہ کرو ارجی۔" ایلی نے کہا "پھر ملیں گے۔"

ارجمند کی آنکھ میں عجیب سی مایوسی تھی۔ بے بسی بھری مایوسی۔

"اچھا خدا حافظ" رضا نے کہا۔ اور وہ دونوں چپ چاپ باہر نکل آئے۔

سٹیشن تک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ ان کے دلوں پر بوجھ پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف اداسی چھائی ہوئی تھی۔ فضا بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ رینگتا ہوا ویرانہ پھیل کر کیا لامتناہی ہوا جا رہا تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔

"کنویں سے پانی نہ پی لوں تھوڑا سا۔" رضا نے کہا۔

"پی لو۔" اور وہ دونوں کنویں کی طرف چل پڑے۔

کنویں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔

"بہن پانی پلانا ذرا۔" رضا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ پانی پی کر وہ دونوں چل پڑے۔

کنویں پر عورتیں ان کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔

"کون تھے یہ؟" کوئی پوچھ رہی تھی۔

ایک مرد کہہ رہا تھا۔ "کارخانے میں کسی کے مہماں آئے تھے۔ وہ پتلا دبلا چھوکرا شوٹر والا۔"

"اچھا وہ سودائی سا" ایک ہنسنے لگی۔

"ہاں ہاں وہی۔"

"سنا ہے آج کل بیمار پڑا ہے۔ بڑا روگ کہتے ہیں۔"

"تت تت تت تت بیچارہ۔"

ایلی کے روبرو ارجمند کھڑا مسکرا رہا تھا سمجھے ہو اس کو کہتے ہیں لاج گوکل کی دیویاں اتنی ہیں۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اندر ہی اندر محبت کی آگ سے پھلک مریں گی۔ لیکن لب تک بات آجائے اونہوں۔ دھنیا ہے گوپیوں نے آج کرشن کنہیا کی بھی لاج رکھ لی۔ کیا کہے۔ کہہ کر وہ مرلی کا رسیا بانسری بجانے لگا۔

کنویں پر کھڑی وہ مٹیار ہنس رہی تھی۔ "تیری طرف ہی دیکھ دیکھ کر آنکھیں مٹکایا کرتا تھا اور پھر یوں مرلی بجانے لگتا جیسے بڑا بین کار ہو پر خاک بھی نہ بجتی تھی اس سے۔"

کا کا کا کائیں درخت پر بیٹھا ہوا کوا یوں بولنے لگا جیسے کسی مرلی کے رسیا کی نقل اتار رہا ہو۔ دور گاؤں کی چکی ہو نک رہی تھی۔ اور کھیتوں میں کوئی ماہیا گا رہا تھا۔

"اساں کل ترونجناں تساں راہ پئے تکنے نی۔"

ان جانا تیاگ

دیر تک وہ دونوں سٹیشن کے بنچ پر اس رینگتے ہوئے ویرانے میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ایک بار رضا نے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ بات اس مسلط اور محیط اداسی کے پھیلاؤ میں یوں بے کار ہو کر رہ گئی تھی جیسے ریگستان میں پانی کی ایک بوند گر گئی ہو۔

پھر جب گاڑی کی گھنٹی بجی تو وہ چونکے۔ "میں ٹکٹ لے آؤں۔" رضا نے کہا۔

"صرف ایک لانا۔" ایلی نے کہا۔

"ایک" رضا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں" ایلی نے رضا کی طرف دیکھے بغیر کہا "ایک۔"

"کیوں۔؟"

"بس۔"

"تم کیا یہیں بیٹھے رہو گے باقی عمر" رضا نے پوچھا۔

"نہیں۔" ایلی بولا۔

"تو پھر۔"

"میں علی پور نہیں جاؤں گا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو کہاں جاؤ گے۔؟"

"لاہور۔" ایلی سوچے سمجھے بغیر بولا۔ اس چھائی ہوئی اداسی اور ویرانی نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا تھا۔ اس کی نگاہ میں شہزاد اور اس کی تمام رنگینیاں عبث ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے ساری دنیا کو تیاگ دیا ہو۔ اور سادھو بن کر باہر نکل آیا ہو۔

"لیکن۔" رضا بولا۔ "محلے میں تو اتنی شادیاں ہیں۔"

"شادیاں۔" ایلی نے برا سا منہ بنایا "ہونے دو۔"

"اور اور۔" رضا نے پوچھا "اور وہ۔"

"وہ" ایلی نے تعجب سے پوچھا "وہ کون۔"

"کیا اسے نہ ملو گے۔؟" رضا نے پوچھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔" ایلی نے سمجھے بغیر آہ بھری۔

"اور تمہاری چھٹیاں۔"

"چھٹی ہی چھٹی ہے اب اور کیا۔" ایلی بولا۔

"اوہ۔" رضا خاموش ہو گیا۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

جب گاڑی آئی تو رضا نے ایک مرتبہ پھر ایلی کی منت کی۔ "چلو اکٹھے چلتے ہیں۔"

"اوں ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔" رضا نے پوچھا۔

"جو جی چاہے کہہ دینا۔" ایلی نے آہ بھری۔

"وہ مجھ سے ناراض ہو گی۔"

"مجھ سے کون سی خوش ہے وہ۔" ایلی سمجھے سوچے بغیر باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ رضا اس کے متعلق بات کر رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ کسی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔

لاہور پہنچ کر ایلی یوں چارپائی پر لیٹ گیا جیسے اس وسیع دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہو

جیسے دنیا محض ایک ویرانہ ہو لق و دق ویرانہ۔

نیا بورڈنگ خالی پڑا تھا۔ لڑکے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔ صرف چند ایک لڑکے ہالز میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی پرانے قلعے میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔

چار روز وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں تیر رہا ہو علی پور شہزاد تیم نیم گویا اس کی زندگی سے معدوم ہو چکے تھے۔

کریسنٹ ہوسٹل

پھر آہستہ آہستہ کریسنٹ ہوسٹل میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ نئے ماحول میں کھو گیا۔

کریسنٹ ہوسٹل ریواز سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر شخص کو ایک الگ کمرا حاصل تھا۔ جب بھی وہ چاہتا اپنے کمرے میں جا کر لوگوں کو اپنی زندگی سے خارج کر سکتا تھا اور جب چاہتا کمرے سے باہر نکل کر بھیڑ میں شامل ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بھیڑ میں شامل ہونے کی خواہش اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی اس کے برعکس ریواز ہوسٹل میں کمرے کے اندر اور کمرے کے باہر ہر جگہ بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس بھیڑ سے بچنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔ لیکن یہاں اس نئے ہوسٹل میں کمرے سے باہر بھی بھیڑ نہ تھی۔ یہاں باہر بھی افراد تھے ایسے افراد تھے جو اس کی طرح ازلی طور پر اکیلے تھے تنہا تھے۔

کریسنٹ ہوسٹل میں پہنچ کر اس نے غالباً" پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بیشتر افراد اکیلے اور تنہا ہونے کی وجہ سے لوگوں کے شور و شغب سے دور بھاگتے ہیں۔ اس احساس کو رد کرنے کے لیے ہنگامہ پیدا کرتے ہیں اور بھیڑ کی طرف بھاگتے ہیں یا بھیڑ لگا لیتے ہیں۔

کریسنٹ ہوسٹل میں جا کر اسے تسلی سی ہو گئی۔ اب وہ دوسرے طالب علموں سے اس حد تک نہیں ڈرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بھیڑ لگانے والے خود احساس تنہائی اور احساس کمتری سے عاجز آئے ہوتے ہیں ـــــ اس کے علاوہ اب وہ فسٹ ایئر کا نہیں بلکہ تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود کالج کے بیشتر پروفیسر اور لڑکے اس سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔

بہرصورت اس نئے ہوسٹل میں اسے تنہائی میسر تھی اور اس لیے ہوسٹل کے لوگوں کی نگاہیں اس کی آمد و رفت میں دخل انداز نہیں ہوتی تھیں اسے چھیڑتی نہ تھیں اس پر تمسخر

نہیں۔ جب بھی ایلی پر شہزاد طاری ہو جاتی تو وہ اپنے کمرے میں جا گھستا اور دروازہ بند کر کے چارپائی پر لیٹ کر بیتی ہوئی باتیں از سر نو بیتنا شروع کر دیتا۔ یوں زندگی کی ویرانی کو بر طرف کرنے کے لئے تخیل کا سہارا لیتا۔ اور جب اس سے بھی تسکین نہ ہوتی تو چپ چاپ اٹھ کر کسی سینما میں بیٹھ کر ایلمو اور پیڈرو بہادر کے کارنامے دیکھتا اور پھر واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر لیٹ کر اپنی لیڈنگ لیڈی کو اس قید خانے سے چھڑانے کی تجاویز سوچتا تخیل میں ان تجاویز کو عملی صورت دیتا۔ اس کی زندگی میں شہزاد سے بڑھ کر کوئی عشرت نہ تھی۔

لیکن جب سے وہ ارجمند سے مل کر آیا تھا۔ یہ خوش فہمی پیدا کرنے کی کوشش میں شدت سے لگا ہوا تھا کہ شہزاد کی بے پروائی کے پیش نظر اسے اس سے چنداں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اس پر غصہ آتا تھا کہ جب شہزاد اس کی طرف سے اس حد تک بے پروا ہو سکتی ہے تو وہ اس کا محتاج کیوں ہے۔ اس کے دل میں شہزاد کے لیے اس حد تک نیاز کیوں ہے۔ اس خیال پر اسے دکھ ہوتا اور اس دکھ کی کسک سے مخلصی پانے کے لیے وہ یہ اعتبار پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اسے بھی شہزاد کی چنداں پروا نہیں پروا تو تھی لیکن صرف اسی صورت میں کہ شہزاد کو بھی اس کی چاہ ہو۔ وہ بھی اس کا انتظار کھینچے۔ وہ بھی اس کے بغیر نہ رہ سکے۔

کریسنٹ کے نئے ماحول میں اس نے اس اعتبار کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ جونہی اس کی توجہ شہزاد کے بھنور سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ بھاء اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

بھا اور جاہ

بھا کی مسکراہٹ میں تمسخر نام کو نہ تھا۔ الٹا اس میں تو بلا کا خلوص ہمدردی اور اک ان جانی سی ہلکی سی گرمی تھی۔ محبت تھی۔ ایسی محبت نہیں جیسی اسے شہزاد سے تھی جو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ بلکہ ایک ایسی گرمی جس کے تحت سکون ملتا ہے۔ ٹھنڈی مٹھاس بھری مدھم گرمی۔

بھا دوسروں کو کڑی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ الٹا وہ تو نگاہیں جھکا لیتا تھا اور پھر بن دیکھے دوسرے کے قرب کو محسوس کرتا اور مسکراتا جیسے کہہ رہا ہو میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری مشکلات کا حل ہوں۔ میں تمہاری آماجگاہ بن سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔ ورنہ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔"

بھا کی عادت تھی کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ وضو کر کے اکثر نماز پڑھتا نظر آتا اور ہاتھ دھوتا تو اس کا مسلسل شغل تھا۔ اسے ہاتھ دھوتے دیکھ

کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سمجھتا ہو کہ اس کے ہاتھ کبھی صاف نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ وہ
میں شیشے کی طرح صاف اور چمکدار تھے پھر نہ جانے کیوں بار بار بھا کی توجہ ہاتھوں کی طرف
مبذول ہو جاتی اور وہ کہتا "اچھا تو میں ذرا ہاتھ دھولوں۔" ہاتھ دھونے کے بعد دیر تک وہ
صاف ستھرے ہاتھوں کو تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہتا۔

بھا کی طبیعت میں مٹھاس کے علاوہ ایک نظم بھی تھا۔ اس کی ہر بات قاعدے کے مطابق
ہوتی۔ ہر کام پروگرام کے تحت تکمیل پاتا تھا۔ نظم کے اس شدید جذبے کی وجہ سے لوگ اسے
ایسی کام سونپ دیا کرتے جو باقاعدگی اور سلیقے کے بغیر سرانجام نہیں دیئے جاسکتے اور جو مسلسل
توجہ چاہتے ہیں۔ اگر کسی کا پن خراب ہو جاتا تو وہ اسے بھاہ کو دے دیتا۔ "بھا یہ ذرا دیکھنا تو اس
قلم میں کیا گڑبڑ ہے۔" اگر کسی کی گھڑی صحیح وقت نہ دیتی ہو تو وہ بھی بھاہ کو سونپ دی جاتی۔
ایسی چیز بھا کو دیتے ہوئے تاکید توجہ یا احتیاط سے متعلق ہدایات دینا بالکل عبث تھا۔ چیز
دکھانا ہی کافی تھا۔ "بھایہ ذرا دیکھنا۔" اور پھر بھا کی تمام تر توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی اس حد تک کہ
وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا اور راہ چلتے یا فرصت کے وقت بیٹھے ہوئے اسے ٹھیک کرنے میں
شدت سے مصروف رہتا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی تو دفعتاً اس چیز سے بھا کی دلچسپی ختم ہو
جاتی۔

بھا کو ٹوٹی ہوئی یا بگڑی ہوئی چیزوں کو بنانے سنوارنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن ایسے محسوس
ہوتا تھا جیسے وہ خود ایک ٹوٹی ہوئی چیز ہو۔ لیکن اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کی اس نے کبھی
کوشش نہ کی تھی۔ اسے بننے سنورنے سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس
ہوتا تھا جیسے مٹی کا دیا ہو جو مدھم لو جل رہا ہو۔ بھا نے کبھی بھڑک کر جلنے کی کوشش نہ کی تھی۔
اس کی شخصیت اس فروعی چمک سے عاری تھی جو کالج کے لڑکے اپنی طرف توجہ منعطف کرنے
کے لیے پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

ویسے بھڑک کر جلنے کی خواہش جاہ میں بھی نہ تھی بنیادی طور پر وہ بھی جھونپڑے کا
چراغ تھا۔ لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سی جھجک تھی۔ وہ ہر نووارد کی آمد پر ٹھٹھک کر
رہ جاتا۔ پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ہونٹوں پر تحقیر کی ہلکی سی لرزش پیدا ہوتی۔ اور پھر وہ گویا ریشم
کے کیڑے کی طرح اپنے کوئے میں گھس جاتا۔ لیکن اس عمل کی وجہ سے اسے کوئے میں بیٹھے
رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اور بسا اوقات وہ تنہائی میں بھی بے حسی اور بے پروائی کے خول

میں دبکا بیٹھا رہتا لیکن کبھی کبھار اس کی حقیقی شخصیت کی مختصر سی جھلک ایک رنگین اور رنگین
بھری مسکراہٹ کی صورت میں ہویدا ہوتی جیسی برکھا رت میں بادلوں میں سے سورج کی
کرنیں پھوٹ نکلتی ہیں اور ایک ساعت کے لیے منظر پر رنگین دھاریاں دکھائی دیتی ہیں۔
جھجک اور ڈر کا بظاہر کوئی جواز دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کی شدت سے ظاہر
ہوتا تھا کہ یہ نقوش کسی شدید ذہنی طوفان کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی
شخصیت کا دھارا خارجی سمت کی طرف بہنے کی بجائے داخلیت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اور اس طرح
وہ اپنی ہی انا کا بھنور بنا کر اس میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

کتابیں

خارجیت سے ہٹ کر جاہ کی توجہ کتابی دنیا کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اور اس کتابی دنیا
نے حقیقی دنیا کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں وہ جیتا تھا کتابی کرداروں سے جھجکے بغیر ملتا تھا۔
ان سے تعلقات پیدا کرتا تھا۔ اپنے ارد گرد ان کی بھیڑ لگا کر بیٹھ رہتا تھا کریسنٹ ہوسٹل میں ایلی
کے لیے بھا اور جاہ دو پناہ گاہیں تھیں۔ اس لیے روز بروز وہ ان دونوں بھائیوں کے قریب تر ہو
گیا۔ ایک تو ان دونوں کے کیوبیکل ایلی کے کمرے کے پاس ہی واقع تھے۔ دوسرے وہ دونوں طنز
اور تمسخر سے عاری تھے اور ان میں دوسروں کا مذاق اڑانے کی عادت نہ تھی۔ ان سے مل کر ایلی
کا احساس کمتری ابھرنے کی بجائے دب جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جاہ سے ایک بعد سا محسوس
کرتا۔ جاہ کی بظاہر سرد مہری ایلی میں جھجک پیدا کرتی تھی۔

جب بھی ایلی جاہ کے کمرے میں جاتا تو وہ یوں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا جیسے پوچھ رہا
ہو۔ تمہارا یہاں آنے کا مطلب؟ جاہ کے ماتھے پر تیوری چڑھ جاتی۔ ایک ساعت کے لیے وہ ایلی
کی طرف دیکھ کر گھورتا اور پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا اور ایلی جاہ کے قریب بیٹھے ہونے
کے باوجود تنہا رہ جاتا۔ ابتدا میں تو ایلی جاہ کے اس رویے پر گھبرا جاتا تھا اور کچھ دیر جاہ کے کمرے
میں بیٹھنے کے بعد چپکے سے وہاں سے کھسک آتا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ جاہ کی اس عادت سے
مانوس ہو گیا۔ مانا کہ جاہ کی بے رخی اور بے پروائی وہ تھی لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح اس کی
نگاہیں ٹٹولتی تو نہ تھیں۔ اور جب بھی وہ جاہ کی بے حسی سے گھبرا جاتا تو آزادانہ طور پر وہاں سے
اٹھ کر آ سکتا تھا۔

جاہ نے کبھی اس سے نہ پوچھا تھا کہ تم جا رہے ہو یا تم کیوں یا کہاں جا رہے ہو۔

باہر برآمدے میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر بھاگتا۔ "ایلی۔ آؤ یار میں تو اس گھڑی کے چکر میں پڑا ہوں نہ جانے کیا خرابی ہے۔ یہ ٹھیک وقت نہیں دیتی۔ وہ سعید ہے نا اپنا چوہدری کرم دین کا بیٹا اس کی ہے یہ گھڑی۔ کیا وقت ہو گا بھئی اوہ یہ تو چار بج گئے۔ اچھا تو میں وضو کر لوں" جاہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھتا اس کی نگاہ میں شکوک اور اعتراض نمایاں ہوتے لیکن پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا حتیٰ کہ اسے احساس ہی نہ رہتا کہ کوئی شخص کمرے میں بیٹھا ہے۔

جاہ کا کمرہ کتابوں اور رسائل اور تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ ہر ماہ کتابوں اور رسائل کا ایک بڑا گٹھا آ جاتا۔ اور جاہ ان کے مطالعہ میں کھو جاتا۔ صبح سے شام تک جاہ کو ان کتب اور رسائل کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی پڑھتے پڑھتے وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ "خوب خوب" وہ گویا اپنے آپ سے کہتا۔ "یہ شخص بھی عجیب مسخرا ہے ہی ہی ہی۔"

ایلی ہنسنے لگتا۔ کون مسخرہ ہے ایلی کی موجودگی کو محسوس کر کے دفعتاً" جاہ کا انداز بدل جاتا کون مسخرہ ہے جاہ دہراتا "ہوں ہوں" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر سے کتاب میں کھو جاتا اور پھر کچھ دیر کے بعد آپ ہنسنے لگتا۔ "جروم کے جروم بھی عجیب ہے عجیب ہے عجیب ہے" انگلیاں چٹخاتے ہوئے جاہ مدھم آواز میں بولے جاتا اور پھر سے بھول جاتا کہ اس کے کمرے میں کتابوں کے شلف کے قریب کوئی بیٹھا ہے ایلی وہاں بیٹھ کر کوئی کتاب یا رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور چپ چاپ ورق گردانی میں مصروف رہتا۔

اس سے پہلے ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ کتاب کو کالج یا امتحان کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے جاہ سے مل کر اسے پہلی مرتبہ کتاب کا احساس ہوا۔ پہلی مرتبہ اسے کتاب کی ورق گردانی کا موقعہ ملا لیکن اس کے باوجود کتاب کے نفس مضمون کی اہمیت کا اسے احساس نہ تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ جاہ اپنے کمرے میں ایلی کی موجودگی کے احساس سے مانوس ہوتا گیا لیکن اس کے باوجود طنز بھری نگاہ جوں کی توں قائم رہی اس کی بے اعتنائی کچھ بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ آشنائی اور مسرت کے ان لمحات کی تعداد بھی بڑھ گئی جب وہ اپنے کوئے سے باہر نکلتا تھا۔

علی پور سے آنے کے بعد ایک ہی بار ایلی کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھر آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد کے خیال کے بھنور سے نکل جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شہزاد کا سحر اس حد تک مسلط اور محیط ہو چکا ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں لیکن شہزاد کی بے پروائی کی وجہ سے اس کے دل میں ایک کرب پیدا ہوتا تھا ایک ایسا کرب جو اس کی روح کو یوں بلوتا جیسے دہی کا ایک برتن ہو بسا اوقات سوتے وقت جب اسے شہزاد کا خیال آتا تو اس کے ذہن میں شہزاد کا بھرے ہوئے تاروں سے بھرا ہوا نقاب آ جاتا اور وہ ان ابھرے ہوئے تاروں کو گنتا۔ اس وقت ایک گوشت کا لوتھڑا غفور کی شکل اختیار کر لیتا۔ "ہی ہی ہی" وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہنستے ہنستے اس کا منہ نبات کا رنگ اختیار کر لیتا۔ بازو اور ٹانگیں کٹ جاتیں اور وہ چلاتا۔ "ایلی تم ایلی۔" ایلی کی نگاہ تلے اس وقت وہ اندھیری بند بیٹھک ابھر آتی بیٹھک کے وسط میں آب زم زم کی ایک جھیل ابھرتی اور جھیل میں سے شہزاد سر نکال کر کہتی ایلی تم۔ اس وقت شہزاد کے انداز میں طنزیہ تمسخر کا ایک طوفان کھولتا اور ایلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ پھر گوشت کا ٹنڈ منڈ لوتھڑا قہقہہ لگاتا "تم۔ تم۔"

اس وقت مختلف شکلیں ایلی کے روبرو آ کر ناچتیں گاتیں بھیڑیئے کی کھال اتر جاتی اور اندر سے علی احمد ہنستے "شہزاد یہ تم کیا بچوں کو اکٹھا کر کے بیٹھ رہتی ہو کبھی ہمارے ہاں بھی آؤ نا کیا کہتی ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔"

تھیٹر کا پردہ اٹھتا اور صفدر ایک ڈرامائی انداز سے داخل ہو کر کہتا۔ "ایلی ایلی میری طرف دیکھو ایلی میں یہیں رہتا ہوں اس رنگین چوبارے کے نیچے میں یہاں دہلیز پر پڑا ہوں کبھی مجھے بھی مل لیا کرو۔ کبھی مجھے بھی مل لیا کرو کبھی مجھے بھی کبھی ——" پھر وہ گانے لگتا۔ "اے دلبر ہوں میں فدا۔" گاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گلابی پھوار پڑنے لگتی پیشانی پر دیا روشن ہو جاتا۔ اور گاتے ہوئے شہزاد کی طرف مسکرا مسکرا دیکھتے ہوئے وہ سٹیج سے باہر نکل جاتا۔

پھر شہزاد اٹھ بیٹھتی اور ٹرنک کھول کر سفید پھول دار دوپٹہ لے کر کہتی۔ "ہاں ہاں مجھے جانا ہے۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ میں جاؤں گی۔ میں جا رہی ہوں۔" اور گوشت کا لوتھڑا قہقہے لگاتا۔ ایکٹر مسکراتا اور علی احمد ہنستے "ہی ہی ہی۔" اور ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ سب اس پر ہنس رہے

ہوں اور شہزاد در پردہ ان کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ ساری رات ایلی کروٹیں بدلتا آہیں بھرتا۔
شدت سی کوشش کرتا کہ ان خیالات کو اپنے دامن سے جھٹک دے لیکن ان خیالات سے چھٹکارا
پانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس روحانی کرب کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ شہزاد کی گرفت سے
نکل جائے لیکن اس کے ساتھ ہی شہزاد کے تصور کی رنگینی شہزاد کی جاذبیت اور شہزاد کی تحریر
عظمت بے پناہ کیف کے حامل تھے۔

صبح کے وقت شہزاد کے سحر سے بچنے کے لیے وہ جاہ کے کمرے میں جا پناہ لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ
سے اس نے جاہ کی سرد مہری اور بے رخی کو گوارا کر لیا تھا۔ جاہ کی شکوک بھری نگاہوں سے بچنے
کے لیے اس نے ان رسائل اخبارات اور کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی تھی جن کا جاہ کے
کمرے میں ڈھیر لگا رہتا تھا۔ ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ مطالعہ امتحان کے خیال سے ہٹ
کر بھی ممکن ہے پہلے پہل اس کی توجہ تصاویر کی طرف مبذول ہوئی تھی اور تصاویر کا تفصیلی
مفہوم سمجھنے کے لیے اس نے ان کے نیچے لکھے اشارات پڑھنے شروع کر دیئے تھے پھر آہستہ
آہستہ اس کی توجہ رسائل کے مضامین کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

ایلی کو کتابوں اور رسالوں کی طرف متوجہ دیکھ کر جاہ کی سرد مہری تمسخر میں بدل گئی۔ "تم یہ
رسالہ پڑھ رہے ہو کیا۔ اونہوں کتاب کو یوں نہ موڑو۔ پہلے کتاب پڑھنے کا سلیقہ سیکھو یہاں اور
جریدہ یہ دنیا کے عظیم نقوش کا مجموعہ ہے اسے دیکھ کر تم کیا سمجھو گے۔"

لیکن ایلی کے لیے جاہ کی باتیں ہاتھی دانت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ وہ باتیں تلخ تھیں
لیکن تلخ تر حقائق کی یاد ایلی کے دل سے محو کرنے کا ذریعہ تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ ایلی کی ہٹ دھری کی وجہ سے ان کے قرب کے لمحات بڑھتے گئے۔ "کتاب
کے مطالعہ سے تھک کر دفعتاً" جاہ ایلی کی طرف دیکھتا ہے۔ "تو تم برٹرنڈ رسل کا مضمون پڑھ
رہے ہو۔ اچھی چیز ہے۔ بڑی دیر کے بعد رسل نے اپنے انداز کی چیز لکھی ہے۔ معلومات کا
ایک پٹارہ ہے یہ محض حد ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ رسل کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑ دیتا
جسے ایلی حیرت سے سنتا۔ وہ اس وقت یوں منہ کھولے بیٹھا ہوتا کہ دفعتاً" جاہ رک جاتا۔ "اور تم
——؟" وہ انگلیاں جھٹکاتے ہوئے چلاتا اور پھر وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا "تم
میاں تم کوئی سیدھی چیز شروع کرو کوئی داستان کوئی کہانی اور وہ بھی مینس فیلڈ کی نہیں وہ تو
اشاروں میں بات سمجھاتی ہے پلو مار کے دیا بجھاتی ہے۔ کیا چیز لکھتی ہے۔ واہ واہ واہ لو اور پھر

یوں ساکت و جامد ہو جاتا جیسے پتھر کا بنا ہو۔ اور ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا دیکھے جاتا جاہ کی
باتیں سن کر ایلی کو دفعتاً" یہ احساس ہوتا جیسے کوئی کنویں کا مینڈک پھدک کر سمندر میں جا گرا
ہو۔ جاہ کی مینس فیلڈ رسل ولز فرائیڈ شا اور برگسان کی دنیا عجیب دنیا تھی اور ایلی کے لیے یہ دنیا
جاہ کے مرکز کے گرد گھومتی تھی۔

پھر جب ایلی واپس اپنے کمرے میں پہنچتا تو چھن سے شہزاد آسن جما کر سامنے آ کھڑی ہوتی۔
"کس بات پر بگڑے ہو مہاراج وہ پوچھتی۔ کب تک غیر حاضر رہو گے۔ کب تک پناہ گاہوں میں
چھپے رہو گے کب تک مانولزا میں کھوئے رہو گے میری طرف دیکھو مانولزا میں ہوں میں۔"
اس کے چہرے پر ایک پر اسرار مسکراہٹ جھلکتی "دیکھو نا۔ یلدرم نے میرے بارے میں لکھا ہے
ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو" اس وقت شہزاد کے ماتھے کا تل نگ سے یوں روشن ہو جاتا جیسے بجلی
کا ہنڈا ہو۔ اور آنکھیں ناچتیں اور رسل ولز شا اور فیس فیلڈ ازروئے ادب ایک طرف قطار لگا
کر کھڑے ہو جاتے اور پھر چپکے سے ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل جاتے اور شہزاد وہاں
اکیلی رہ جاتی اور اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی۔ ایک طرف میڈونا کا جمال اس کے گرد
ہالہ بنا دیتا اور دوسری جانب ڈائنا کا خیال۔ اس میں وقار بھر دیتا۔ اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ سگ
لیلیٰ ہو اور وہ دم ہلاتا ہوا ڈائنا کے قدموں میں جا بیٹھتا۔

رازی اور زو

ایک روز جاہ کے کمرے میں کیوپڈ اور سائیکی۔ بولا کٹ آؤٹ، رینس ڈی مائیلو کی تصاویر
دیکھنے کے بعد جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اور لحاف لے کر لیٹا اور حسب معمول چھن سے
شہزاد روبرو آ کھڑی ہوئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ارے کیا شہزاد کے ناچ میں آواز پیدا ہو گئی۔ وہ
اٹھ کر سننے لگا۔ چھن چھن گھنگھرو کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی واقعی ناچ رہا تھا۔ ایلی ڈر گیا۔
کیا اس کے حواس اس حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس کے تخیل کے ساتھ آواز کا عنصر کیسے
شامل ہو گیا تھا۔ یا وہ ناچ کسی متکلم فلم کا ایک ٹکڑا تھا۔

اس زمانے میں متحرک تصاویر نے ایک بار روپ بدلا تھا۔ انہی دنوں چند ایک ایسی نئی تصاویر
کی نمائش ہو رہی تھی جو پرانی تصاویر کی سیریل قسم کی نہ تھیں بلکہ کہانی ایک ہی نشست میں ختم
ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ

ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے
فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہوتی تھی۔ ایک نشست
میں کہانی کے صرف تین ایسی سوڈ دکھائے جاتے تھے اور ہر کہانی عموماً" پندرہ یا بیس ایسی سوڈ پر
مشتمل ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی ختم کرنے کی یہ نئی تحریک فلم دیکھنے والوں کے لیے
ایک انوکھی بات تھی۔ اور فلم سازوں نے صرف اسی بات پہ اکتفا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ان
مختصر فلمی کہانیوں کے ساتھ ایسے ریکارڈ بھیجنے شروع کر دیئے تھے جو کہانی کے مناسب مقامات پر
مناسب صوتی اثرات پیدا کرتے تھے۔ مثلاً بن حور فلم میں بحری لڑائیوں کے مناظر کے ساتھ
ساتھ توپوں اور طبل جنگ کی آوازیں اور پس منظر کی موسیقی یہ صوتی کلیاں فلم دیکھنے والوں کے
لیے عجیب تھیں۔ انہی دنوں میں جاہ کے ساتھ ایلی نے دو ایک ایسے فلم دیکھے تھے۔ فلم دیکھنے
میں جاہ کو بھی دلچسپی تھی لیکن جاہ چونکہ تمام زائد روپوں کی کتابیں اور رسائل خرید کر لیتا تھا
اس لیے روز فلم چل رہا ہے اور میرے پاس صرف آٹھ آنے ہیں۔ وہ آٹھ آنے میز سے اٹھا کر
کہتا "اگر دیکھنا ہو تو چلو میرے ساتھ۔"

اور وہ دونوں چپکے سے پیلس سینما کی طرف چل پڑتے جو میکلوڈ روڈ کے کونے پر نیا نیا بنا
تھا۔ اکثر وہ دونوں بہت لیٹ پہنچتے جب کہ چار آنے والے درجے کی تمام تر سیٹیں بھر چکی
ہوتیں۔ اور وہ حسب معمول اندھیرے میں چلتے چلتے ہال کی دوسری دیوار کے قریب پہنچ کر بند
دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ حسب معمول سینما میں لیٹ
پہنچے تھے اور حسب معمول سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اور انٹرول میں جب بتیاں جلی تھیں تو ایلی
نے دیکھا کہ چار آنے کے درجے کی تمام سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ اور ہال میں گنڈیریاں بیچنے
والے انہیں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے "ارے" ایلی چلاتا۔ "جاہ سیٹیں تو تمام
کی تمام خالی پڑی ہیں۔" "اچھا۔" جاہ اپنی بے اعتنائی سے کہتا تھا۔ اور پھر اپنے خیال میں کھو جاتا
تھا۔ جیسے سیٹوں کا خالی ہونا اور ان کا سیڑھیوں پر بیٹھنا کوئی قابل توجہ یا غور طلب امر نہ ہو۔

"تو چلو وہاں چل بیٹھیں۔" ایلی نے کہا تھا اور اس نے منہ بنا کر شانے جھٹک دیئے تھے اور
جوں کا توں بیٹھا رہا تھا۔

ہاں تو اس روز اپنے کمرے میں گھنگھروؤں کی آواز سن کر ایلی چونک پڑا اس نے محسوس کیا
جیسے فلم کی طرح اس کے تخیل کے ساتھ بھی کوئی ایسا ریکارڈ چل رہا تھا۔ لیکن بورڈنگ میں

گھنگھرو —— وہ اٹھ بیٹھا اپنے کیوبکل کا دروازہ کھولا۔ باہر ہوسٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی
بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ لیکن گھنگھروؤں کی آواز وضاحت سے سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کے
ساتھ ہی سریلا مگر مدھم ساز بج رہا تھا۔ دیر تک وہ کھڑا اس آواز کو سنتا رہا اور پھر اس کے کھوج
میں چل پڑا۔

آواز کونے کے کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ کونے کے کمرے کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر
کھڑا ساز سنتا رہا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھے یا دروازہ
کھٹکھٹا کر اندر داخل ہو جائے مگر اس میں ہمت نہ پڑی۔ اس لیے وہ وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ وہ ساز
کس قدر سریلا تھا اور دھن کس قدر جاذب پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ گھنگھرو۔"

دفعتاً" کمرے کا دروازہ کھلا کوئی شخص باہر نکلا۔

"کون ہو تم۔" وہ بولا۔

"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔ "میرا نام الیاس ہے۔"

"اوہ" نووارد نے ماچس چلائی۔

روشنی میں ایلی نے اس کا چہرہ دیکھا اور سہم گیا۔ اس کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر
محسوس ہوتا جیسے حبشی ہو۔

"یہیں کے ہو نا ہوسٹل کے۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "لو بھئی پھر اندر کیوں نہیں آجاتے۔ چلو۔" وہ ایلی کو گھورنے لگا۔ اس
کا قہقہہ سن کر ساز اور گھنگھرو بجنا بند ہو گئے۔ "کون ہے بھئی ذو۔" اندر سے آواز سنائی دی۔ ذو
نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"لڑکا ہے بورڈنگ کا۔" وہ بولا "باہر کھڑا سن رہا ہے۔"

"کون ہے۔" پھر آواز آئی۔

ایلی مجرموں کی طرح کمرے میں جھانکنے لگا۔

"جی میں ہوں الیاس۔" وہ بولا۔

"تمہیں دیکھا نہیں کبھی میاں۔" اس نے پوچھا۔

"جی میرا نمبر سترہ ہے۔"

"سترہ۔" وہ ہنسنے لگا۔ "یہ ساتھ والا کمرہ۔"

"جی ہاں۔" الیاس بولا "یہ ساتھ والا چھوڑ کر دوسرا۔"

"اچھا" اس نے حیرانی سے کہا۔

"ارے یہ جاہ کے ساتھ پھرا کرتا ہے۔" ذو بولا۔

"تم چپ رہو جی۔" اندر والے نے پھر ذو کو ڈانٹا۔ "آجاؤ بیٹھ جاؤ۔ لیکن اب بات جاہو میاں میاں کے سی آئی ڈی تو نہیں ہو۔"

"میاں میاں کے سی آئی ڈی۔" ایلی نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا "میں نہیں سمجھا۔"

"پھر ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اندر والے نے کہا "بیٹھ جاؤ۔" اور ایلی چپ چاپ کرے میں بیٹھ گیا۔

"میرا نام رازی ہے۔" وہ بولا اور "یہ حضرت ذو ہیں۔"

رازی ایک دبلا پتلا خوبصورت لڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی جاذبیت تھی پیشانی فراخ تھی اور خدوخال نہایت موزوں اور تیکھے تھے اس کے سامنے ایک پاؤں کا ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔ اور سامنے کونے میں بچھے ہوئے کمبل پر طبلوں کی جوڑی پڑی تھی۔

ایلی نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا لیکن کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ ایلی کو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ طبلہ اور ہارمونیم تو ٹھیک تھے لیکن وہ رقص وہ رقاصہ کیا ہوئی کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسی لیے جھجک رہا تھا کہ نہ جانے اندر کون ہے اور اب اندر داخل ہونے کے بعد اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رازی نے بڑے اطمینان سے باجہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی پیاری دھن بجا رہا تھا ذو طبلے کی جوڑی کے قریب کمبل پر چادر میں لپٹا ہوا جھوم رہا تھا جیسے حال کھیل رہا ہو۔

دفعتاً "گھنگھرو بجا۔ ارے ایلی کے دل سے گویا ایک چیخ سی نکل گئی۔ "یہ تو از چھن ———— کہاں سے آئی۔" چھن چھنا چھن۔ گھنگھرو پھر بجے۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ "لیکن وہاں رازی اور ذو کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ "شاید اسے چارپائی تلے چھپا رکھا ہے" ایلی نے سوچا "لیکن چارپائی تلے ناچنا کیسے ممکن ہے۔"

دفعتاً" ذو نے گویا ایک چنگاڑ ماری۔ علی اور چادر پرے پھینک کر وہ طبلے کی جوڑی پر پل پڑا۔ دھاگدی گھنا' دھاگدی گھنا دھاگدی گھناہ دھا۔

ارے وہ چونکا۔ چھن چھنانانا چھن چھنانانا چھن رقاصہ گویا چارپائی تلے سے نکل کر میدان میں آگئی۔

"شاباش بیٹا۔" رازی ذو کی طرف دیکھ کر چلایا۔ کمرے میں موسیقی کی لہروں کا ایک طوفان آیا اور ایلی کے رہے سہے حواس بھی معطل ہو گئے۔

جی کے اور ایم کے

ذو اور رازی سے متعارف ہونے کے بعد ایلی کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ سارا دن وہ جاہ کے کمرے میں رسائل اور کتابوں کے صفحات الٹتا پلٹتا رہتا یا جاہ کے لیکچر سنتا یا شام کے وقت وہ دونوں سینما ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فلم دیکھتے اور رات کے وقت چپکے سے رازی کے کمرے میں جا پہنچتا اور وہاں بیٹھ کر گانا سنتا رہتا۔

یہ مشاغل اسے اس لیے پسند تھے کہ ان میں مصروف ہو کر وہ شہزاد کی دسترس سے دور ہو جاتا تھا یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ مشاغل شہزاد کو اس کے سامنے لا کھڑا کرتے تھے۔

جاہ کے کمرے میں رسائل دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ کسی نہ کسی ایسے مشہور عمل پر پڑ جاتی جسے دیکھتے ہوئے انجانے میں شہزاد کے ساتھ مناسبت کے اجرتی مونالزا کو دیکھتا تو اس کے ہونٹوں کے کونوں میں شہزاد مسکراتی وینس کو دیکھ کر شہزاد کے جسم کے پیچ و خم ابھرتے۔ کیوپڈ اینڈ سائیکی کو دیکھ کر وہ محسوس کرتا جیسے شہزاد اپنی شریر آنکھیں موندھ کر بیٹھ گئی۔ اور رازی کے کمرے میں پہنچ کر اسے محسوس ہوتا جیسے دھن کے ساتھ شہزاد ناچ رہی ہو۔

ان کے علاوہ اس کے دو نئے دوست بنے تھے ناک ہی ناک اور جلتی آنکھیں۔ ناک ہی ناک مشن کالج کا طالب علم تھا۔ جو ان دنوں بم اے ریاضی میں تعلیم پاتا تھا۔ ایلی کو اس سے جاہ نے متعارف کیا تھا۔ ایک روز جب وہ دونوں ورلڈ گریٹ پینٹنگز کا نیا شمارہ دیکھنے میں شدت سے مصروف تھا۔ تو ایلی نے کہا۔

"یہ تصویر تو فریم کرنے کے قابل ہے۔"

اس پر جاہ بولا "ہاں ہو سکتا ہے ہو سکتا ہے۔" اور پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس روز شام کو سینما جانے کی بجائے وہ دونوں مشن کالج کے بورڈنگ میں جا پہنچے۔ اندر جا کر جاہ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک پتلا دبلا لڑکا مطالعہ میں مصروف تھا۔ "یہ جی کے

ہے۔" جاہ نے کہا "اور یہ ہمارے دوست الیاس صاحب ہیں۔" یہ کہہ کر وہ الیاس صاحب کی موجودگی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ "ہم اس لیے آئے ہیں۔" جاہ بات کرتے ہوئے رکا۔ "دراصل میں سوچ رہا تھا کہ جو ورلڈ گریٹ پینٹنگز جریدے کی صورت میں آرہی ہیں تم نے تو دیکھی ہی نہیں وہ۔"

"نہیں تو۔" جی کے نے جواب دیا۔

"میں سوچ رہا تھا اگر ہم انہیں فریم کرلیں تو کیسا رہے۔ بازار سے تو بات نہ بنے گی۔ کیوں نہ فریم بنائیں۔"

"ٹھہرو۔" جی کے نے گویا اپنی تمام تر توجہ ناک پر مرکوز کردی۔ اس کی ناک لمبی اور چونچ دار تھی۔ انداز میں بلا کی پھرتی تھی اور ذہانت میں تیزی تھی۔

جی کے قاعدے اور اصول کا آدمی تھا۔ وہ قاعدوں اور اصول میں سوچتا تھا۔ خشک اور کوری دلیلیں دینے کا عادی تھا۔ دوسروں کو خشک اصولوں پر پرکھنے کا متوالہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بنیادی طور پر حزن و ملال کی گہرائی جھلکتی تھی۔ چہرے سے غم خوری ٹپکتی تھی لیکن وہ اپنے آپ پر خوشی اور انبساط کے شدید لمحات طاری کرسکتا تھا۔ اور اپنی بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر نہایت چمکیلی اور جاذب توجہ باتیں کرنے کا اہل تھا۔

"ٹھہرو۔" کہہ کر جی کے یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے کوئی بیوپاری لین دین کے حساب میں کھو گیا ہو۔ دیر تک اپنی ناک کو گھورتا اور پھر سر اٹھا کر کہنے لگا۔ "ہاں چلے گا ضرور چلے گا۔ نو من تیل کے بغیر رادھا ناچے گی۔"

"اچھا" جاہ نے بچوں کی طرح تالی بجائی "کیسے۔"

"سانچہ ہم خود بنالیں گے۔" وہ بولا۔ "آری مل جائے گی۔ بس فریم کی لکڑی شیشہ اور کیل خریدنے پڑیں گے۔"

"اگر کچھ خریدے بغیر فریم بنا سکیں ہم تو بہتر نہ ہوگا۔" جاہ نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جی کے کی ناک اور بھی لمبی ہوگئیں۔

"چلو یہ دھندا ابھی طے ہو جائے۔ جاہ اٹھ بیٹھا اور وہ تینوں انار کلی کی طرف چل پڑے۔ جب وہ واپس آئے تو جی کے کے کمرے سے باہر برآمدے میں ایک لڑکا بیٹھا تن تنہا شطرنج کھیل رہا تھا۔

"ارے۔" جی کے چلایا۔ "اپنے آپ ہی کھیل رہے ہو۔"

"تمہیں اعتراض ہے کیا۔" وہ چمک کر بولا۔

"ہم نے تو سنا تھا میاں۔" جاہ نے کہا "کہ یہ کھیل دو کے بغیر نہیں کھیلا جاتا۔"

"سنی سنائی بات کا کیا بھروسہ۔" لڑکا بولا۔

"یہ میرا دوست ایم کے ہے۔" جی کے نے ایلی سے کہا "بڑے معرکے کا آدمی ہے۔" دو کا کھیل اکیلا کھیلتا ہے۔ اکیلے کے کھیل کے لیے ساتھی ڈھونڈتا ہے۔" جی کے ہنسنے لگا۔

ایلی نے ایم کے کی طرف دیکھا وہ ایک اونچا لمبا دبلا پتلا نوجوان تھا اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ گویا ثبت ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ابل رہی تھیں۔ "جو بھی آتا ہے اپنی بے عزتی کرتا ہے۔" ایم کے نے قہقہہ لگایا۔

"تمہیں کیا خطرہ" جی کے نے اپنی ناک کو گھورتے ہوئے کہا "تمہاری بے عزتی کیسے ہو سکتی ہے کوئی عزت ہو تو بے عزتی کا امکان ہوتا۔ لگاؤ یار اس سے کوئی بازی" جی کے نے ایلی اور جاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اونہوں" جاہ نے انگلیاں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس کھیل کے لیے وقت کہاں سے آئے قانونی طور پر جوانوں کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ بوڑھوں کا کھیل ہے۔ جب انسان کو کوئی کام نہ ہو تب۔"

"اور تم کہاں کے جوان ہو۔" ایم کے نے جاہ سے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" جاہ بولا "جوان تو نہیں لیکن ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔ "تم خود کیوں نہیں کھیلتے اس کے ساتھ۔" اس نے جی کے سے پوچھا۔

"اونہوں۔" وہ بولا "مجھ سے تو روز پٹتا ہے۔"

ایم کے نے قہقہہ لگایا اور سر کھجانے لگا "بات تو ٹھیک ہے۔"

تصویریں

جی کے اور ایم کے سے ملاقات کے بعد ایلی کے مشاغل بڑھ گئے جاہ کی سرد مہری سے اکتا کر وہ سیدھا نیوٹن ہال چلا جاتا جہاں وہ دونوں رہتے تھے۔ یا تو ایلی جی کے کے ساتھ بیٹھ کر تصاویر کے لیے فریم بناتا رہتا اور یا ایم کے کے ساتھ شطرنج کی بازی لگا لیتا۔ اسے ایم کے سے بے حد

دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس میں زندگی تھی جو ولولہ تھا جاہ کی طرح اس کی زندگی اصولوں کا سراغ
ڈھونڈتی تھی۔

اس کے بعد کئی ایک دن وہ سب تصاویر فریم کرنے میں شدت سے مصروف رہے۔
لکڑی کاٹنے اور اسے کیلوں سے جوڑنے کا کام جی کے کے سپرد تھا۔

جی کے وزیر آباد کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ٹیکنیکل کام کے لیے خوب
صلاحیت رکھتا تھا۔

تصویر کی پیمائش کرنے کے بعد جی کے فریم کی لکڑی سانچے میں رکھ کر آری سے اسے کاٹتا
اور پھر ان لکڑیوں کے سرے جوڑ کر ان میں کیل ٹھونک کر فریم تیار کرتا۔ جاہ اس دوران
اس خصوصی تصویر اور تصویر کار کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا اور تصویر کے خصوصی پہلوؤں پر
روشنی ڈالتا۔ ایلی مناسب سائز کے مطابق گتہ کاٹتا ایم کے ہتھوڑی اور کیل اٹھائے رکھتا تاکہ
مناسب وقت پر جی کے کو بہم پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ سرکس کے مسخرے کی طرح اپنی
سیدھی حرکات سے ان کا دل بہلاتا رہتا۔

تصاویر فریم کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو خیال نہ آیا کہ ان میں بیشتر تصاویر برہنہ
تھیں اور انہیں ہوسٹل کے کمرے میں آویزاں کرنا قابل اعتراض سمجھا جا سکتا تھا۔ جاہ کے متعدد
لیکچر سننے کے بعد ان سب کی توجہ اس حد تک تصاویر کے معانی پر مرکوز ہو چکی تھی کہ انہیں
خیال بھی نہ آیا کہ بیشتر نقوش ملبوسات سے معرا تھے حتیٰ کہ بھاجب نماز پڑھنے کے بعد فریم
بنانے کے کام کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے فریم شدہ تصاویر کی طرف دیکھتا تو اسے بھی لاحول
پڑھنے کا خیال نہ آتا۔

پھر جب انہوں نے اپنے اپنے کمرے میں وہ تصاویر آویزاں کر دیں اور ہوسٹل کے لڑکوں
نے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ شدت سے جسم کھجانے لگے تو ایلی
نے محسوس کیا کہ وہ تصاویر برہنہ تھیں۔ اس نے جاہ سے بات کی "جاہ یہ تصاویر تو ——"
رک گیا۔

"ہوں۔" جاہ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے۔" ایلی گھبرا کر بولا "یعنی تو ——"

"ہوں۔" جاہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تصاویر تو برہنہ ہیں۔" ایلی نے بعد مشکل جملہ مکمل کیا۔

"تصاویر ——" اس نے کمرے میں ٹنگی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہ میں
تمسخر جھلکا "برہنہ" اس نے حقارت بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ جیسے اس کی نگاہ میں کمرے کی جملہ
اشیاء میں سے صرف ایلی کا وجود عریانی اور برہنگی کا مظہر ہو۔ تمسخر اور نفرت کے اس اظہار پر ایلی
وہاں سے بھاگا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ برآمدے میں بھا وضو کر رہا تھا۔ ایلی
کا جی چاہتا تھا کہ بھا کے گلے لگ کر رو پڑے۔ لیکن بھا اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔

"بھا" وہ بولا "یہ تصویریں جو ہم نے کمروں میں آویزاں کی ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" بھا پاؤں دھوتے ہوئے بولا۔

"وہ عریاں ہیں۔ میرا مطلب ہیں برہنہ ہیں۔"

بھا سوچ میں پڑ گیا۔ "ہاں ہاں" وہ بولا "مجھے بھی کئی بار شک سا پڑا ہے۔"

"وہ انہیں دیکھ کر کھجاتے ہیں۔" ایلی بولا "اور پھر کمرے سے باہر نکل کر چنگھاڑتے ہیں۔
نعرے لگاتے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں۔"

"ہاں ہاں۔" بھا بولا۔ "مجھے اب خیال آتا ہے کہ۔"

"اور وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ میاں میاں۔"

میاں میاں سن کر بھا اچھل کر کھڑا ہو گیا "ہاں۔" وہ بولا "میاں میاں مجھے خیال ہی نہیں
آیا۔"

"لیکن میاں میاں کا مطلب کیا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"میاں میاں کا مطلب" بھا نے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔

میاں میاں

میاں میاں در حقیقت کالج میں فارسی پڑھانے والے مولانا کا تکیہ کلام تھا۔ مولانا کا نام محمد
ارتضیٰ۔ وہ کالج میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ کالج میں وہ اپنی چار ایک نمایاں خصوصیات کی وجہ
سے مشہور تھے۔

ان کا حلق ایک ایسے وسیع ہال کی مانند تھا جہاں ہلکی سے ہلکی آواز گونج کر پھر گونجتی۔
اس لیے ان کی معمولی سے معمولی بات بھی یوں سنائی دیتی تھی جیسے کوئی مجاہد حملہ کرنے

سے پہلے سپاہیوں کو جوش اور غیرت دلا رہا ہو۔

مسلسل طور پر جوش اور جذبہ محسوس کرتی رہنے کی وجہ سے مولانا کے خدوخال نے
ترتیب اختیار کرلی تھی کہ ان کا چہرہ احتجاج اور جذبے کی آمیزش بن کر رہ گیا تھا۔ ان کے
کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے جملہ نامناسب باتوں کے خلاف ایک گھونسہ کسا ہوا ہو۔

مولانا کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ معمولی سے معمولی نامناسب بات پر وہ غضب
جاتا اور اس شدت سے احتجاج کا اظہار کرتے کہ لڑکے محسوس کرتے کہ نہ جانے وہ کیا کر
گے۔ لیکن اس شدت بھرے احتجاج کے بعد وہ ہر نامناسب بات کو یوں برداشت کر لیتے
کوئی بات ہی نہ ہو جیسے نامناسب باتوں کو برداشت کرنا ان کی عادت ہو۔ اور وہ اپنی اس
وجہ سے مجبور ہوں۔

مولانا کی آخری خصوصیت ان کا تکیہ کلام تھا۔ وہ جماعت یا افراد سے میاں میاں
مخاطب ہوتے۔ اسی وجہ سے لڑکوں میں وہ میاں میاں کے نام سے مشہور تھے۔ جماعت
داخل ہوتے ہی وہ گونجتے "میاں میاں یہ کیا شور ہے۔" اس پر لڑکے خاموش ہو جاتے۔
مسخرا چپکے سے سیٹی بجاتا اور اس پر مولانا چونکتے "لاحول ولا قوۃ" سارا کالج مولانا کے اس
نعرے سے گونجتا۔ پھر چاروں طرف سے پراسرار آوازوں کی یورش شروع ہو جاتی ایک
میں چکی ہونکتی۔ دوسری طرف ریل گاڑی چھکا چھک کرتی اور تیسری طرف مینڈک ٹرا
کوکتی۔ اور مولانا دفعتاً" ان آوازوں کے وجود سے بے نیاز ہو کر صاحب کے اشعار پڑھنے
مصروف ہو جاتے۔

کریسنٹ ہوسٹل کے اجراء کے بعد وقتی طور پر مولانا کو ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا
بورڈنگ کی مین بلڈنگ سے باہر ملحقہ عمارت کے ایک کمرے میں مقیم تھے جو کھانا کھا
کمرے کے قریب تھا۔

لڑکے ڈائننگ ہال کی طرف جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بورڈنگ میں موجود ہیں
عام طور پر مولانا نماز پڑھتے ہوئے یا وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ البتہ کوئی غیر مناسب
وقوع میں آتی تو مولانا کا لاحول ولا قوۃ ملحقہ بلڈنگ سے ابھر کر ہوسٹل کی مین بلڈنگ میں
گونجتا اور لڑکے چونک کر اٹھ بیٹھتے اور انہیں یہ امر یاد آتا کہ میاں میاں اس بورڈنگ
سپرنٹنڈنٹ ہیں اور ملحقہ بلڈنگ میں کوئی مناسب بات وقوع میں آئی ہے۔ اس پر

سی ایک سرگوشی ابھرتی۔ "میاں میاں۔" اور ہر کمرے میں دہرائی جاتی حتیٰ کہ ساری بلڈنگ
"میاں میاں" سے گونجنے لگتی۔

مولانا دن میں صرف ایک بار مین بلڈنگ میں آتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر
بارہ بجے کے قریب وہ حاضری کا رجسٹر بغل میں دبا کر مین بلڈنگ میں داخل ہو جاتے۔ اور
کھلے کمرے میں جھانکتے اور بند کمرے پر دستک دے کر کہتے "میاں میاں۔" جس پر لڑکے
"یس سر" کہہ دیتے اور مولانا حاضری لگا کر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتے۔

لاحول ولا قوۃ

حاضری کے وقت کریسنٹ ہوسٹل میں خاصہ ہنگامہ رہتا تھا چونکہ کئی ایک حاضر لڑکوں کو کئی
ایک غیر حاضر لڑکوں کی حاضریاں لگوانی ہوتیں تھیں۔ مثلاً" کمرہ نمبر ایک کا لڑکا پہلے اپنی حاضری
لگواتا پھر باری باری کمرہ نمبر ۱۴، ۲۲ اور ۵۶ میں داخل ہو کر لیس سر بول کر اپنے دوستوں کی
حاضری لگواتا۔ لڑکا چاہے موجود نہ ہو لیکن کمرہ ضرور اندر سے بند ہو۔ کمرے میں بتی جلائے
رکھنا ضروری ہوتا۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ باہر تالہ نہ پڑا ہو۔ جب مولانا سولہ نمبر پر
دستک دیتے تو سولہ نمبر کا لڑکا اندر سے لیس سر کہہ دیتا اور جب وہ سترہ نمبر پر دستک دیتے تو سولہ
نمبر والا پھر سے لیس سر چلا کر سترہ نمبر والے کی حاضری لگوا دیتا۔

ایک روز وہی ہوا جس کا اپلی کو ڈر تھا جس وقت مولانا نے حاضری کے وقت جاہ کے
دروازے پر دستک دے کر میاں میاں کہا اس وقت جاہ نہ جانے داستو دسکی یا ٹامس مین کے
مطالعہ میں اس حد تک مصروف تھا کہ یاں میاں کے جواب میں لیس سر کہنے کے بجائے بے
دھیانی میں اس نے کہا "کم آن۔"

دستور کے مطابق مولانا کو چاہیئے تھا کہ آواز سن کر رجسٹر میں حاضری لگائیں اور اگلے کمرے
کی طرف چل پڑیں۔ چونکہ دستور کے مطابق اہم بات یہ تھی کہ اندر سے آواز آجائے۔ لیس
سر کم ان یا گو اوے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیئے تھا لیکن جاہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑے
کھڑے نہ جانے مولانا کو کیا ہوا۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہ حاضری کے لے راؤنڈ کر رہے ہیں ممکن
ہے جاہ کے انگریزی لب و لہجہ کو بھی اس سے تعلق ہوتا۔ بہرحال مولانا سمجھ بیٹھے کہ وہ پرنسپل
کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ لہٰذا جاہ کے کم اِن پر وہ انجانے میں پٹ کھول کر اندر داخل ہو

گئے۔

اس چھوٹے سے کیوبیکل میں ان اٹھائیس تصاویر کی طرف دیکھ کر مولانا لڑکھڑائے، ان کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ ایک ہی جست میں وہ باہر برامدے میں پہنچ گئے اور احتجاج اور غم و غصہ حسب معمول اس مجاہدانہ نعرے میں گونجا۔ "لاحول ولا قوۃ"

یہ پہلا موقعہ تھا کہ مین بلڈنگ میں مولانا نے لاحول کی للکار لگائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس روز ہوسٹل کے کمروں میں میزوں پر پڑے ہوئے گلاس جل ترنگ کی طرح بجے تھے۔ اور لڑکے گھبرا کر کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ میاں میاں کہنا یا تمسخر سے چلانا بھول گئے تھے۔

باہر نکل کر لڑکوں نے دیکھا کہ مولانا ہوسٹل کے صدر دروازے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اور حاضری کے رجسٹر کے ورق ہوسٹل کے صحن میں اڑ رہے ہیں۔ مولانا حاضری لگانا بھول گئے تھے۔ اور انہیں حاضری کے رجسٹر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اس روز کریسنٹ ہوسٹل کے جملہ لڑکوں میں سے صرف جاہ واحد لڑکا تھا جو اس حادثہ سے بے خبر اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھنے میں منہمک رہا تھا۔

اگلے روز نیوٹن ہال میں بیٹھے ہوئے جب بھا اور ایلی گزشتہ رات کے واقعہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ تو جاہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اچھا میں نے خیال نہیں کیا۔" وہ انگلیوں سے کھیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ایم کے نے قہقہہ لگایا "اچھا ہوا۔" وہ بولا "اپنی بھی روز بے عزتی ہے۔"

"تم چپ رہو جی۔" جی کے نے اسے ڈانٹا۔

"اچھا بھئی۔" وہ بولا "تو کوئی اور بولے اب۔"

بھا نے کہا۔ "لیکن اب ہو گا کیا۔"

"اللہ جانے کیا ہو گا۔" ایلی نے کہا۔

وہ سب خاموش ہو گئے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر دفعتاً" جاہ بڑبڑانے لگا "نہیں نہیں ——— نہیں نہیں۔"

سب کی نگاہیں جاہ پر مرکوز ہو گئیں۔

جاہ انگلیوں ہی انگلیوں سے کھیلتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ دفعتاً" اس نے اوپر دیکھا اور کہنے لگا "کیا ہم ایسی جگہ نہیں رہ سکتے جہاں مائیکل انجلو برنے جونز اور لارڈ لٹن پر لاحول نہ پڑھی جائے۔" "ضرور رہ سکتے ہیں۔ بالکل" وہ قطعی فیصلے کے انداز میں بولا۔

اور اس قطعی فیصلے کے بعد سب نے مل کر ایک پرائیویٹ لاج میں رہنے فیصلہ کر لیا۔

گوریاں

ناؤ گھر

ان کا نیا لاج ایک عظیم تکون نما بلڈنگ کے کونے کا ایک حصہ تھا جبھی انہوں نے اس کا نام ناؤ گھر رکھ دیا تھا بلڈنگ کی پہلی منزل میں گودام اور دوکانیں تھیں۔ کونے کے قریب تنگ سی سیڑھیاں دوسری منزل میں چلی گئی تھیں۔ جہاں غسل خانہ باورچی خانہ ایک والان اور دو کمرے تھے۔ جن کے ایک طرف جدھر سڑک واقع تھی لکڑی کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ جو اب بوسیدہ ہو چکا تھا۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے اوپر ایک نیم چھتی تھی۔ جس کا دروازہ اوپر کی سیڑھیوں کے درمیان کھلتا تھا اور اوپر تیسری منزل میں ایک کمرا ایک وسیع برساتی اور کچھ کھلی چھت تھی۔

ناؤ گھر میں پہنچتے ہی جاہ نے اعلان کر دیا کہ وہ دوسری منزل میں قیام کرے گا۔ "یہ کمرہ" وہ بولا۔ "ہمارا بیڈ روم رہے گا۔ دوسرا کمرہ سٹنگ روم اور اس والان کو ہم کھانے کا کمرہ بنا لیتے ہیں۔"

"کیوں۔ بھاجی نے پوچھا"

بھا نے والان سے ملحقہ جنگلے کی طرف دیکھا "بالکل۔" وہ بولا "یہ جنگلہ نماز کے لئے تو موزوں ہے۔ ہے ناپال۔"

وہ سب جی کے کو پیار سے پال کہا کرتے تھے۔

"بالکل۔" پال چلایا "اور جنگلے میں یہاں حمام رکھ دیا جائے تو وضو کی جگہ بھی بن جائے

گی۔ "اور ایلی۔" جاہ بولا "تم چاہو تو یہیں ہمارے ساتھ رہو۔ ہاں اور اگر وہ تمہارا دوست بخوشی آنا چاہے تو آ جائے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم کہتے ہو نا وہ اچھا لڑکا ہے تو اچھا ہی ہو گا اور اگر ایسا ہی ہے تو آ جائے کیا حرج ہے اوپر کا کمرہ ہم اس کے لئے مخصوص کر دیں گے۔ کیا نام ہے اس کا ہاں۔ جمال۔ جمال۔"

"آ جائے تو بہتر ہے۔" بھا بولا۔ "پانچ ہو جائیں گے تو کفایت رہے گی اور تم ایلی تم کہاں رہو گے۔"

"میں میں۔" ایلی نے کہا "میں تو نیم چھتی میں رہوں گا۔"

"نیم چھتی؟" جاہ کے ہونٹ حقارت سے کھلے "ہوں نیم چھتی۔" وہ انگلیاں چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اسے نیم چھتیوں سے دلچسپی ہے۔ کھلے کمروں سے نہیں بس ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جو ذہنی طور پر خود نیم چھتی ہو وہ ——" وہ خاموش ہو گیا۔

جاہ کے منہ سے ایسی بات سن کر ایلی نے کبھی برا نہ مانا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلی نے جاہ کی ذہنی عظمت کو سچے دل سے تسلیم کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں جاہ کے لئے محبت بھی تھی اور احترام بھی مگر جذبہ احترام اس حد تک حاوی ہو چکا تھا کہ اس کے بوجھ تلے محبت دب کر رہ گئی تھی۔ وہ جاہ کی بات سے ڈرتا تھا۔ تمسخر سے ڈرتا تھا۔ لیکن اس ڈر میں نفرت کا عنصر نہ تھا۔ ایلی جاہ کے قریب رہنے کی خواہش کے باوجود اس سے ذرا ہٹ کر رہنا پسند کرتا تھا۔ اس لئے ناؤ گھر کو دیکھتے ہی اس نے نیم چھتی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہیں جاہ اسے اپنے کمرے میں رہنے پر مجبور نہ کر دے۔ اس لئے جاہ کی بات سننے کے بعد ایلی نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے طوفان نکل گیا۔ مطلع صاف ہو گیا اور اب وہ اطمینان سے نیم چھتی میں اکیلا رہے گا اور شہزاد چھن سے سیڑھیوں سے اترے گی اور نیم چھتی میں جھانک کر کہنے لگی۔ چلو نا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

جمال تیسری منزل کے کمرے کو دیکھ کر ان تین کھڑکیوں کی طرف لپکا جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کو کھول کر وہ خوشی میں چلایا۔

"ارے یہاں سے تو سامنے محلے کے سارے مکانات نظر آتے ہیں۔ کتنے خوبصورت مکانات ہیں۔ کھاتے پیتے فیشن ایبل لوگ رہتے ہوں گے کیوں ایلی۔"

ایلی کو یہ بات نہ سوجھی تھی۔ "ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن۔" جمال نے ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے کہا "ذرا دور ہیں۔"

پھر وہ برساتی کی کھڑکیوں میں جا کھڑا ہوا۔ "یہاں سے تو اور بھی اچھا ہے۔" اس نے ایک پر مسرت بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "ذرا غور سے دیکھو نا۔" وہ چلایا اور جسم کھجانے لگا۔

پھر وہ مکان کی عقبی دیوار کے پردے پر جا کھڑا ہوا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اونہوں اس جانب تو امید کی کوئی صورت نہیں۔" "زردہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"زردہ۔" جمال نے قہقہہ لگایا۔ "توبہ ہے یار۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنا کان پکڑ لیا۔

"توبہ ہے یار۔ اتنی تکلیف ہوئی کہ جس کی انتہا نہیں۔ ایسی ظالم بیماری ہے یہ کہ توبہ ہے۔ بیوی کے سامنے سارا بھانڈہ پھوٹ گیا اور معلوم ہے ڈاکٹر کیا کہتا تھا۔ کہتا تھا یہ بیماری کبھی نہیں جاتی۔ کبھی نہیں۔ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا "بالکل توبہ کر لی ہے۔ لیکن یار۔ تم کتنے اچھے ہو۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"تمہارا جواب نہیں ایلی دوست ہو تو ایسا ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے ایلی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "ایسا اچھا کمرہ میرے لئے مخصوص رکھا جس کا جواب نہیں۔ جواب نہیں ایمان سے اور پھر محلہ کے عین مقابل اور محلہ بھی فیشن ایبل لوگوں کا بھئی واہ خوب گزرے گی۔ جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔" جمال نے پھر قہقہہ لگایا۔ "تم نیم چھتی میں اور میں چوبارے میں واہ واہ واہ اور وہ پچلی منزل والے دور۔ یار ایلی وہ تو کتابوں میں جیتے ہیں۔ کتابیں ہی کتابیں —— حد ہو گئی یار۔"

بانورہ ہوشمند

ابھی وہ نیم چھتی میں چیزیں لگانے میں مصروف تھا کہ کریسنٹ ہوسٹل کا باورچی دتّہ آ گیا۔

"بابو جی۔" وہ بولا "آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔"

نیچے بیڈ روم میں جاہ' بھا اور پال بیٹھے ایلی کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہاں بھئی۔" اسے دیکھ کر جاہ نے کہا "بیٹھ جاؤ۔ اچھا ہوا کہ جمال نے یہاں آنا پسند کر لیا اچھا ہوا۔ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خاصہ ہے خاصہ میرا مطلب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "گوارا قسم کا ہے' بشرطیکہ ناگوار ہونا نہ شروع کر دے۔ کیوں پال۔" جاہ کا مزاح اس

تک بک ہوتا تھا کہ اس کا ادراک مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن ایلی نے جاہ کی خصوصی مسکراہٹ سے بھانپ لیا کہ وہ اپنے مزاح کی داد کا طالب ہے۔ ایلی نے قہقہہ لگایا۔

"ہے نا۔" وہ ایلی سے مخاطب ہوا۔ "لیکن اس وقت مسئلہ در پیش یہ ہے کہ اپنا نوکر دتّہ اپنے ہمراہ ایک نوکر لایا ہے۔ نوکر تو ہمیں یہاں رکھنا ہی ہو گا۔ اس سے کہا تھا کہ بھئی کوئی جانا پہچانا نوکر لا دو۔"

"بالکل۔" پال نے کہا "نوکر کے بغیر کیسے ہو گا۔"

"لیکن دقت یہ ہے۔" جاہ نے کہا "کہ یہ نوکر جو وہ لایا ہے اس کا جانا پہچانا نہیں اور بندہ تو جاننے پہچاننے کے معاملے میں بیوقوف ہے۔" جاہ اس روز مزاح کے موڈ میں تھا۔

"جوڑنے یا نفی کرنے کی بات ہو تو میں حاضر ہوں۔" پال نے کہا۔

"یہ تو کھانا پکانے کی بات ہے۔" بھا نے کہا۔

"اچھا؟" جاہ تعجب سے بولا۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" پال کی ناک اور بھی لمبی ہو گئی۔

"کھانے کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں۔" جاہ نے کہا کہ نمک اور مرچ ہو تو کھانا ٹھیک ہوتا ہے اور نمک مرچ کی مجھے خوب پہچان ہے۔ وہاں کریسنٹ میں کھانے کی میز پر جب کوئی چلاتا۔ دتے نمک بھیجو۔ تو دفعتاً" مجھے احساس ہوتا کہ میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر کھانے میں کس بات کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔" ایلی نے قہقہہ لگایا۔ اس پر جاہ نے بڑے التفات سے ایلی کو مخاطب کر کے کہا "کیوں میاں ہے نا یہی بات۔"

لیکن بھا نے کہا۔ "معاملہ تو یہ ہے کہ نوکر کی تنخواہ مقرر کی جائے۔"

"ہنچ اجازت دیں۔" جاہ مسکرایا۔ "تو بندہ کتاب پڑھنے کا کام کرے چونکہ اس معاملے میں اپنا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ الٹا اپنا دخل دینا نقصان دہ ہو گا۔ کیوں پال۔" "لو جی یہ گیا غفار۔" دتّہ چلا کر بولا۔

غفار چلا دبلا سانولا نوجوان تھا۔ اس کے نقش تیکھے تھے اور بشرے پر ذہانت کے آثار تھے۔

"سلام علیکم۔" اس نے بے پروائی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر خود ہی بات شروع کی۔ "دیکھئے صاحب۔" وہ بولا "میرا نام گفار ہے۔"

"ذرا ٹھہرئے۔" جاہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کیا آپ اپنا نام نہیں بدل سکتے؟" غفار نے غور

سے جاہ کی طرف دیکھا۔

"آپ کا نام خاصہ بوجھل ہے۔" جاہ بولا "سارے حلق کو تکلیف ہوتی ہے۔ میرے لئے تو آپ کو بلانا مشکل ہو گا۔"

"جی صاحب۔" غفار نے مسکرا کر کہا۔ "نام تو گفار ہی ہے اگرچہ گھر کے لوگ مجھے پیار سے بانورہ کہتے تھے۔"

"اگر ہم بھی بانورہ کہیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کہیں گے محبت سے۔" جاہ مسکرانے لگا۔

"اجی محبت سے پکاریئے تو جو جی میں آئے کہئے۔" غفار بولا۔

"اچھا بھئی بانورے۔" بھا نے بمشکل مطلب کی بات شروع کی۔ "تمہیں پانچ آدمیوں کا کھانا پکانا ہو گا۔ سودا بھی خود ہی لانا ہو گا۔ تو یہ بتاؤ کہ تم لو گے کیا۔" بانورہ مسکرایا بولا "حضور ابھی پودا لگا نہیں اور پہلے ہی سے پھل پھول کی بات کرنا تو مناسب نہیں۔"

"کیا مطلب۔" پال چلایا۔

"معلوم ہوتا ہے۔" جاہ بولا "یہ بانورہ پوئٹری کا طالب علم ہے۔"

"مطلب یہ ہے حضور۔" بانورہ چمک کر بولا۔ "پہلے کام پھر دام۔"

"بھئی واہ۔" جاہ چلایا۔ "معقول بات ہے۔ جیسے آسکروائیلڈ کی لائن ہو۔"

"یعنی ——" بھا نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"واہ بھا۔" جاہ نے کہا "تم بھی حد ہو میاں پہلے بات اپری شیٹ کرو پھر سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو طریقہ ہوتا ہے۔"

"جی میرا مطلب ہے۔" بانورہ بولا۔ طریقے کے مطابق تو مناسب ہے کہ ایک روز کے لئے آپ میرا کام دیکھیں اور پھر اگر آپ کو میرا کام پسند ہو تو مجھ سے تنخواہ کی بات کریں۔ اگر میری مانگ آپ کو منظور ہو تو میں کام شروع کر دوں اور نہ ہو تو اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہو جاؤں۔"

"بات تو معقول ہے۔" پال نے ناک کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ زیادہ ہی معقول ہے۔" جاہ بولا۔

"اچھا میاں۔" بھا نے کہا "تو کل صبح آجانا۔"

"بہت اچھا صاحب۔" بانورہ مسکرایا۔ "اب مجھے اجازت ہے کیا۔ السلام علیکم۔" یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

"عجیب نوکر ہے۔" بھا نے کہا۔

پال ہنسنے لگا "کہتا ہے ابھی پودہ اگا نہیں تو پھل پھول کی بات کیسی۔"

"جبھی تو میں نے کہا تھا۔" جاہ بولا "کہ پوئیٹری کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل اس کا نہیں بلکہ ہمارا امتحان ہو گا اور نتیجے کا اعلان وہ کرے گا۔ بانورہ۔ یار اس کا نام ہوشمند ہونا چاہیے۔"

اگلے روز بانورہ آیا تو وہ سبھی جاہ کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔

"ہاں بھئی بانورے کیا پکائے گا تو۔"

"جو آپ چاہیں۔" بانورے نے جواب دیا۔

"بھئی مجھے تو بھنا ہوا گوشت پسند ہے۔" جاہ نے کہا۔

"وہ تو جی۔" بانورہ بولا "کھانے میں پسند ہے نا آپ تو پکانے کے لئے پکوا رہے ہیں۔"

"ہائیں۔" ایک نگاہ جاہ نے بانورے کی طرف دیکھا اور پھر یوں سر ہلانے لگا جیسے روئی کا باوا ہو۔

"چلو بھائی کریلے گوشت بناؤ آج۔"

"کریلے کھا کھا کر تو تھک گئے بھا۔ پالک نہ ہو جائے۔" پال نے کہا۔

"ہو جائے۔" بھا بولا۔

"ایک گجارس میں بھی کروں۔" بانورہ نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" بھا نے کہا۔

"ویسے پکانے کے لئے جو بھی چاہیں تیار کر دوں لیکن ایسے موقعہ پر مناسب رہتا ہے۔ کوئی ایسی چیز آج نمونے کے طور پر پکوائی جائے جسے پکانا مشکل ہو۔"

"اچھا بھائی تو کیا کیا چیز پکانی مشکل ہوتی ہے۔" پال نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔" جاہ بولا "ذرا لگے ہاتھوں یہ بھی بتا ہی دیجئے۔"

بانورے نے کہا "صاحب گوشت تو سبھی بنا لیتے ہیں لیکن کام پرکھنا ہو تو دال پکوائیے اور وہ بھی ماش کی۔ جو ایک زائد آنچ سے ڈھل جاتی ہے اور ایک آنچ کم ہو تو کھڑی رہتی ہے۔ ویسے

جو آپ چاہیں۔ اپنا کیا ہے۔"

"اچھا بھئی تو دال ہی پکاؤ۔" پال بولا۔

"ہاں۔" بھا نے کہا۔

جب ہنڈیا میں گھی ڈالنے کا وقت آیا تو بانورہ نے آکر کہا۔ "صاحب ایک گجارس ہنڈیا میں ڈالنے کے لئے گھی دیا جائے۔"

"واہ میاں۔" بھا نے جواب دیا۔ "گھی وہاں الماری میں پڑا ہے۔ ڈال لو۔"

"یہ تو درست بات نہیں صاحب"۔ بانورہ بولا۔

"کیوں پال۔" نے پوچھا۔

"ہجو رکھانے میں گھی ڈال کر اسے مجیدار بنانا تو مشکل نہیں اور جو پرکھنا ہو تو جروری ہے کہ کم گھی دیا جائے۔"

"ارے بھائی۔" جاہ کتاب رکھتے ہوئے بولا "بانورے کی بات رد کرنے کا خیال دل سے نکال دو پال کی حساب دانی یہاں کام نہ آئے گی۔"

روٹی پکانے سے پہلے بانورہ پھر آگیا بولا "حضور کھانا تیار ہے تشریف لائیے۔"

"اچھا بھئی۔" بھا نے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"میں تو میاں کچھ دیر کے بعد کھاؤں گا۔" جاہ نے کہا۔

"ہجور گجارس ہے کہ ایسے وقت یوں ہونا چاہئے کہ آپ سب باورچی خانے میں میرے پاس آ بیٹھیں ادھر آپ سب کھانا شروع کریں ادھر میں پھلکے اتارنا شروع کروں۔"

"ہوں۔" جاہ بولا۔

"دیکھنا تو یہ ہے صاحب کہ میں اس تیزی سے پھلکے اتار سکتا ہوں کیا کہ پانچ آدمی کھائے جائیں اور پھلکا کم نہ ہو۔ تار نہ ٹوٹے اور پھر پھلکے کچے نہ اتریں پھول کر اتریں اور کھانے میں اچھے ہوں۔ ہی ہی ہی ہی —— " وہ ہنسنے لگا۔

"کہو بھئی اس کے جواب میں کیا کہتے ہو۔" جاہ نے پوچھا۔

"بات تو معقول ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

اچھا بھئی ہم آتے ہیں۔" بھا نے کہا۔

جب بانورہ چلا گیا تو جاہ بولا "میاں میں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ بانورہ ہمیں کھانا کھلانے کے لئے نہیں آیا بلکہ عقل سلیم سکھانے آیا ہے۔ اونہوں۔ یہ بات نہ نبھے گی۔" وہ بولا "یہ ہروقت کی معقولیت اور بات بات پر طریقے سلیقے۔ مہنگا سودا ہے دوستو۔ آگے آپ مالک ہیں۔ اپنی تو صرف ایک گجارس ہے۔

اگلے روز جب ایک نیا نوکر گاما آیا تو اس کی حواس باختہ شکل کو دیکھ کر جاہ خوشی سے چلانے لگا "یہ ہوئی نا بات۔" وہ بولا "یہ تو اپنا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔ دیکھنے سے ہی تسلی ہو گئی۔"

"جی گوس روٹی پکا لیتا ہوں۔" پوچھنے پر نئے نوکر نے مختصر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" جاہ نے قہقہہ لگایا۔ "آہا گوس روٹی گوس روٹی سے بڑھ کر کیا چیز ہوگی۔ میاں۔ بات ہوئی نا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بلغ جوہڑ میں پہنچ گئی ہو" —— اور گامے کو نوکر رکھ لیا گیا۔

گوریاں

ناؤ گھر میں ایلی کی مصروفیات کریسنٹ ہوسٹل سے چنداں مختلف نہ تھیں۔ کالج سے واپس آکر وہ چپکے سے جاہ کی ایک کتاب اٹھا کر نیم چھتی میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا جب تک جاہ کے واپس آنے کا وقت نہ ہو جاتا۔ جاہ کے آنے سے پہلے ہی ایلی وہ کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھ دیتا۔ پھر کچھ دیر تک جاہ کے پاس بیٹھ کر اس کی ترش مگر بصیرت افروز باتیں سنتا اور پھر شام کے وقت وہ اور جمال دونوں سیر کو نکل جاتے اور جمال اسے "تفصیلا" بتاتا کہ سفید منزل میں ایک کالی کلوٹی مگر جوان دوشیزہ رہتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں بلا کی مستی ہے۔ پہلے مکان میں دو ادھیڑ عمر کی عورتیں ہیں جو سوکنیں معلوم ہوتی ہیں اور سامنے منزل میں دو چٹی سفید گوریاں رہتی ہیں جو اتنی گوری ہیں کہ توبہ ہے اور ہروقت ہنستی ہیں ہنسے ہی جاتی ہیں۔

جمال گوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے گالوں پر سرخی جھلکتی آنکھوں میں مستی چھلکتی اور وہ بار بار جوش میں کھجاتا پھر فرط جوش میں جمال ایلی کو اپنی آغوش میں لے لیتا۔

"یار ایلی۔" وہ کہتا "تم بڑے اچھے ہو۔ کیا جگہ دلوائی ہے مجھے واہ واہ۔ ناؤ گھر لاجواب گھر ہے بس اگر ذرا سا چپو چلا دو بھائی تو اپنی زندگی میں بھی حرکت پیدا ہو جائے۔ لیکن ایلی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے ایلی کے شانے پکڑ لیتا اور پھر مست آنکھیں بنا کر اس کی طرف دیکھ کر

پوچھتا۔" ایلی وہ اتنی گوری کیوں ہیں۔ بتاؤ نا۔ حد ہو گئی یار اتنی سفید جیسے کھوئے کی بنی ہوا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم۔" ایلی جواب دیتا۔

"پھر بھی ——— بتاؤ تو سہی۔"

یہ ہوتی ہی ایسی ہیں۔" ایلی کہتا۔ "اگر گوری نہ ہوں تو مرچیلی ہوتی ہیں اور مرچیلی نہ ہوں۔ تو میٹھی رس بھری۔"

"ہے نا۔" جمال قہقہہ مار کر ہنستا۔ "اور وہ زردہ تھی۔ وہ زرد ہو گئی تھی کتنی زرد تھی وہ۔"

"ہاں شکر کرو گلابی نہ تھی۔"

"گلابی تو یہ ہیں۔" جمال کہتا۔ "ضرور گلابی ہوں گی۔ جو دور سے خالی سفید دکھے وہ قریب سے گلابی ہوتی ہے۔ لیکن یار۔۔" وہ پھر ایلی کو شانوں سے پکڑ لیتا۔ "یار وہ اس قدر ہنستی کیوں ہیں۔ دیکھتی ہیں اور ہنستی ہیں۔ ہنستی ہیں اور دیکھتی ہیں۔ دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں۔"

"تو کیا تم چاہتے ہو کہ دیکھ کر رو دیں۔" ایلی پوچھتا۔

"ارے نہیں ———" جمال رک کر سوچنے لگتا۔

"شکر کر بھائی روتی نہیں وہ۔ جو رو دیں تو تمہاری زندگی حرام ہو جائے۔" ایلی جواب دیتا۔

"یار ایلی۔" جمال چلاتا۔ "کوئی ملنے کی صورت بتاؤ۔ پھر چاہئے ہنسیں یا روئیں۔"

"کیوں پھر کیا ہو گا۔" ایلی اسے چھیڑتا۔

"پھر ———" وہ قہقہہ مار کر ہنستا اور سر کھجاتا۔ "پھر بہت کچھ ہو جایا کرتا ہے۔" ہنتے ہنتے دفعتاً" وہ خاموش ہو جاتا۔ پھر سنجیدگی سے کہتا۔ "یار دقت یہ ہے کہ وہ دور رہیں اور مجھے دور سے پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سی ہے اور کونسی۔ کون بڑی ہے کون چھوٹی بڑی مشکل ہے۔"

"بڑی چھوٹی ہو یا چھوٹی بڑی کیا فرق پڑتا ہے۔" ایلی فلسفیانہ انداز سے بولا۔

"بڑا فرق پڑتا ہے۔" جمال کہتا۔ "چھوٹی چھوٹی ہی ہوتی ہے تمہیں کیا خبر۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"نہیں یار۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کہتا۔ "تجھے سب خبر ہے۔"

نہ جانے جمال کو یہ خیال کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کے معاملے میں ایلی ہر راز سے کماحقہ واقف ہے جمال سچے دل سے سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں ایلی بڑا سیانا ہے ایلی بھی اس کا

رویہ اختیار کر لیتا اس وقت وہ بھول جاتا کہ شہزاد کے روبرو اس کی اپنی کیا موجودگی میں سیانوں کا رویہ ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ بند بیٹھک سے کس شان سے باہر نکلا تھا۔

ہر روز شام کے وقت کسی نہ کسی بہانہ جمال اسے آ ملتا۔ اگر ایلی جاہ کے پاس بیٹھا ہوتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بناتا۔ "ایلی اگر فراغت ہو تو مجھے پوئیٹری کا خلاصہ تو خرید دو۔"

"خلاصہ۔" جاہ چونک کر اس کی طرف دیکھتا اور پھر جمال کے چہرے کا جائزہ لے کر کہتا "ٹھیک ہے۔ خلاصہ ہاں۔ بھئی تو لے دو انہیں خلاصہ۔ خود بھی خلاصہ پڑھ لو تو کیا حرج ہے۔ خلاصے کے بغیر امتحان پاس کرنا ——— اونہوں۔ خلاصے کے بغیر کیا ہوتا ہے جی۔"

جاہ کے انداز میں بلا کی طنز ہوتی۔ لیکن جمال نے اس کی بات کی دھار کو کبھی محسوس نہ کیا نہ ایلی کی طرح وہ بھی جاہ سے ڈرتا تھا۔ جاہ سے سبھی ڈرتے تھے اور سبھی اس کی عزت کرتے تھے۔ جاہ کو خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ شاید اسی لئے تاؤ گھر میں اس کی حیثیت لاڈلے اور بگڑے ہوئے بچے کی سی تھی اور کبھی کبھار تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ جاہ صرف اس لئے علم حاصل کر رہا ہے کہ فوقیت حاصل کر کے دوسروں پر رعب جما سکے۔

لیکن پال کی بات مختلف تھی۔ وہ کبھی جاہ کی بات سن کر اس قدر متاثر نہ ہوا تھا کہ اپنی حیثیت کھو دے۔ وہ مضبوط انفرادیت کا مالک تھا اپنی غلط رائے پر اڑ جانے کا عادی تھا۔ پال کو اپنی قابلیت پر ناز تھا اسے اپنے اصول فرد سے زیادہ پیارے تھے۔ دوسرے کی بات کو رد کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ تاؤ گھر میں ایلی بھا اور جمال تینوں جاہ اور پال کی بات کی عظمت کو تسلیم کرنے کے لئے ہر وقت کمربستہ معلوم ہوتا تھے۔ بھا تو محض رواداری کے خیال سے۔ "ہوں تو یہ بات ہے۔" کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ جمال طبعی طور پر خاموش آدمی تھا۔ بلکہ وہ ایسی معمولی باتوں کو اہمیت ہی نہ دیتا تھا۔ ایلی جی جی کہہ تو دیتا لیکن بعد میں اسے غصہ آتا۔ اس بات پر کڑھتا رہتا کہ لوگ دوسروں پر اپنی بات ٹھونسنے کے عادی کیوں تھے۔ ایلی کو خود پسند لوگوں سے بے حد نفرت تھی۔

بہرحال کسی نہ کسی بہانے جمال اسے وہاں سے نکال کر لے جاتا اور جونہی وہ اکیلے ہوتے وہ اپنے مخصوص معصوم انداز میں وہی بات چھیڑ لیتا۔

"یار ایلی۔" وہ چلاتا۔ "وہ اتنی شوخ ہیں اتنی نڈر ہیں کہ حد ہو گئی۔ اعلانیہ سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ سلام کرو تو اعلانیہ جواب دیتی ہیں حالانکہ اس وقت اور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔"

حد ہو گئی یار۔ آج تو دونوں نے بال کھول رکھے تھے۔ اتنے لمبے بال جیسے کسی بال تمل کا اشتہار
ہوں۔ یہاں سے وہاں تک اور پھر اتنے کالے اتنے کالے اور ان کالی زلفوں میں ان کے گورے
چہرے حد ہو گئی ایلی بالکل جیسے کچی گری کی بنی ہوئی ہوں۔ یار ایلی "وہ اس کے شانے پکڑ کر
کہتا۔ "اب میں کیا کروں۔"

ایلی کو بھی جمال کی یہ باتیں بے حد پسند تھیں۔ سارے ناؤ گھر میں صرف جمال ہی ایسی
ہستی تھی۔ جس کے روبرو ایلی کی حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جمال کے پاس جا کر دفعتاً وہ انجان
سے سیانا بن جاتا اور ان پڑھ سے عالم ہو جاتا۔ ایسی صورت میں اسے جمال کی باتیں کیوں نہ پسند
ہوتیں اور جمال کا بار بار کہنا یار ایلی تم ہی کچھ کرو گے تو بات بنے گی۔ تمہارے بغیر یہ بیل منڈھے
نہیں چڑھے گی۔ کچھ کرو نا ایلی۔ کچھ ہو جائے۔ اب تو یہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔
کیا کروں میں کیا کروں۔

جمال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کو جب وہ ایلی کو نیم چھتی میں چھوڑ کر اپنے چوبارے
میں چڑھ جاتا ہے تو سیڑھیوں میں سے چھن چھنانن کی آواز آتی ہے اور پھر چھن سے کوئی ایلی
کے روبرو آ کھڑی ہوتی ہے اور ایلی کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور وہ حواس گم قیاس گم کے
مصداق یوں اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے دیوی کی آمد پر باندیاں عزت اور احترام سے کھڑی ہو
جاتی ہیں اور پھر وہ حسرت بھری نگاہ سے ان کے بلوری پاؤں کی طرف دیکھتا ہے دیکھے جاتا ہے
اسے ہمت نہیں پڑتی کہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھے جہاں گلابی چاند جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہتا
ہے کہ بلوری قدموں پر اپنا سر رکھ کر رو دے۔ آنکھیں ملے اور کہے "دیوی میں تمہارے لائق
نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں میں۔ کیا کروں۔"

جمال کو معلوم نہیں تھا کہ گوریوں سے قرب حاصل کرنے کے لئے جس پر اس نے تمام تر
امیدیں استوار کر رکھی تھیں۔ اس میں اتنی حرارت نہ تھی اتنی سوجھ بوجھ نہ تھی کہ تخلیئے
میں بھی قرب حاصل کر سکتا۔ الٹا تخلیئے میں وہ اور بھی دور ہو جاتا تھا اور کوششوں اور تدابیر
کے باوجود گوری کو اپنا نہ بنا سکا تھا جو اعلانیہ اس کی ہو چکی تھی۔

جمال کی موجودگی میں ایلی کو بھی یہ تفاصیل بھول جاتی تھیں۔ گھڑی کی جھوٹی عظمت حاصل
کرنے کے لئے وہ شہزاد کو بھی بھول جاتا وہ شہزاد جو اس کے لئے زندگی تھی۔ سبھی کچھ تھی۔
جس کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جمال کی وہ بات بتنگڑ کی حیثیت اختیار کرتی گئی اس کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ اس کے قہقہے اور
تمنا شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ گوریاں جو اتنی دور رہتی تھیں اور جن کی حیثیت محض ایک
قصہ کہانی کی سی تھی قریب آتی گئیں اور قریب اور قریب حتیٰ کہ وہ نیم چھتی اور چوبارے پر
مسلط و محیط ہو کر رہ گئیں بن دیکھے بن جانے ایلی ان سے اس حد تک مانوس ہو گیا جیسے وہ بھی
ان کے ساتھ ناؤ گھر میں رہتی ہوں۔ مثلاً ایلی کو معلوم تھا کہ ان کی چال کیسی ہے ان کے بال
کس طرح گردن پر لٹکتے ہیں ان کی چوٹیاں کیسے بل کھاتی ہیں۔ ان کے دوپٹے کس رنگ کے
ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں کس طرح لہراتے ہیں اور ان کی آنکھیں کن کن زاویوں سے دیکھی
ہیں۔ ان میں کیسی کیسی چمک لہراتی ہے۔ ان کی ناکیں کتنی لمبی ہیں اور دہن کتنے چھوٹے۔ ان
کے متعلق کوئی بات بھی تو نہ تھی جو جمال نے تفصیل سے ایلی کو نہ بتائی تھی۔ صرف ایک عقدہ
باقی تھا جو جمال حل نہ کر سکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کون کونسی ہے اور اس بارے میں
ایلی بھی اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔

میل کرانی

ایلی تو اس معاملے میں جمال کی مدد نہ کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں جمال اس بات پر مصر تھا
کہ ایلی کے بغیر اسے گوریوں سے قرب حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ اس خلوص اور یقین کے ساتھ
بار بار یہ بات دہراتا رہا کہ ایلی کی بے تعلقی کے باوجود اس کے احساس کمتری کے باوجود ایلی
سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ کس طریقہ سے وہ جمال کی آرزو پوری کر سکتا ہے۔ کئی ایک روز وہ
سوچتا رہا لیکن کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آئی۔ آخر ایک روز جب وہ نیم چھتی میں پڑا سلیمانی
ٹوپی کے متعلق سوچ رہا تھا کیونکہ انہیں ایام میں اس نے ایچ جی ویلز کا ناول "دی ان وزیبل
مین" ختم کیا تھا کہ دفعتاً" اس نے آنکھ اٹھائی تو کھڑکی میں ارجمند کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں
پریم پتر تھا اور ہونٹوں سے پریم سندیس لگی ہوئی تھی۔ چند ایک ساعت تو وہ کرشن کنہیا کی طرح
مسکاتی آنکھوں سے کھڑا مرلی بجاتا رہا پھر مرلی کو ہونٹوں سے الگ کر کے بولا۔

"ارے نام روشن کرو نہ کرو پر نتو اپنے گرو کی لاج تو رکھ لو۔ ایک کلی میں کھو جائے بیٹا تو
بھنورے کا کلیان نہیں ہوتا دھرم پالن نہیں ہوتا۔" نروان نہیں ملتا۔ کلی کلی پتر کلی کلی اور بیٹا
کنہیا کے بھرے کا دوار کھٹکھٹاتا ہو تو ——" ارجمند مسکرایا اور اس نے پتر والا ہاتھ آگے بڑھا

دیا۔۔ ”پریم پتر۔ پریم پتر سے کواڑ کھل جاتے ہیں۔ مندر میں دیوتا براجمان ہو جاتا ہے اور پہچاننا کیا مشکل ہے۔ تم نے تو اپنے گرد کا اپمان کر رکھا ہے۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ پریم پتر وہ سوچنے لگا۔ پھر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور اس مکان کی طرف دیکھنے لگا جہاں گوریاں رہتی تھیں۔ اس نے اس مکان کی طرف کئی بار غور سے دیکھا تھا مگر اسے وہاں کوئی بھی تو جگہ نظر نہ آئی تھی جس کی راہ مکینوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی دیواریں حصار کی طرح کھڑی تھیں۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ کھڑکیاں ہمیشہ ہی بند رہتی تھیں۔ کیونکہ اس جانب مکان کا پچھواڑا تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی نہ جانے وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑا سنسان گلی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مکان کا عقبی دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ چونکا۔ نہ جانے کون ہے۔ ایک سیاہ فام ادھیڑ عمر کی عورت کو باہر نکلتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ کولہے مٹکاتی ہوئی ناؤ گھر کی جانب آ رہی تھی۔ ارے اس کے ہاتھ میں تو جھاڑو تھا۔ مہترانی ہے بڑی مٹک مٹک کر چلتی ہے ——— ہائیں حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مہرانی ناؤ گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ ارے مہترانی ——— اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

”ہوں۔“ سامنے درخت کے پتوں سے ارجمند جھانکنے لگا۔ ”بیٹا یہ تو انگرائنڈی کا پہلا سبق ہے۔ اسے مہترانی نہ سمجھو اینٹ البحر میں اس کا نام ”میل کرانی۔“ ہے جب تک اپنی جنم بھومی میں میل کرانی موجود ہے۔ بھنوروں کو غم کس بات کا۔“ پھر اس نے مرلی ہونٹوں سے لگائی اور پریم ودیا میں کھو گیا۔

ایلی جانتا تھا کہ چند ایک منٹ کے بعد مہترانی نچلی منزل میں صفائی کرنے کے بعد اوپر آئے گی۔ چونکہ بیت الخلا اوپر ہی تھا۔ لیکن اس سے بات کرنا۔ ایلی میں اتنی جرأت نہ تھی اگر اس نے جواب میں الٹی سی بات کہدی اگر اس نے شور مچا دیا تو جاہ کیا کہے گا بھلا حول پڑھے گا۔ پھر اس سے کس انداز سے بات کی جائے اونہوں یہ ایلی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن اسے خیال آیا بات کرنے میں جمال کا تو جواب نہ تھا خصوصاً“ اس قسم کی بات۔ اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور چوبارے کی طرف بھاگا۔

”میں نے کہا۔“ وہ چلایا۔ ”وہ آ رہی ہے۔“

”آ رہی ہے؟“ جمال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون آ رہی ہے۔؟“

”بھئی وہی۔“ ایلی نے کہا۔ ”مہترانی۔“

”مہترانی ———؟“ جمال نے پوچھا۔

”ہاں ہاں ہماری مہترانی۔“

”اچھا۔“ جمال کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کیا وہ نوجوان ہے۔؟“

”ارے نہیں یار۔“ ایلی نے غصے سے کہا۔

”تو پھر۔“ جمال نے حیرانی سے پوچھا۔

”ارے بھائی یہی مہترانی ان کے گھر کام کرتی ہے۔“

”ان کے گھر؟“ جمال نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”گوریوں کے گھر۔“ وہ بولا۔

”اچھا۔“ جمال نے خوشی سے تالی بجائی۔ ”کیا واقعی؟۔“

”ہاں ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

”تو دیکھ لو نا اور بات بھی کر لو۔“

”بات؟ کیا بات کروں میں اس سے پوچھوں میں کون کونسی ہے۔“

”تم بھی بے وقوف ہو۔“ ایلی نے سیانے کا پارٹ ادا کرنا شروع کر دیا۔

”پہلے اس سے ادھر ادھر کی بات کرو ویسے ہی گپ شپ اور اگر دیکھو کہ بات چیت کرنے والی ہے تو ———“ ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو کیا؟۔“

”تو اسے کہو کہ تمہارا خط پہنچا دے ان تک۔“

”خط؟۔“ جمال چلایا اس کا چہرہ یوں چمکنے لگا۔ جیسے کسی بچے کو نیا کھلونا مل جاتا ہے لیکن ایلی نے سیانوں کی طرح احتیاطی تدبیروں کی وضاحت شروع کر دی۔

”لیکن آج ہی بھانڈہ نہ پھوڑ دینا۔ آج تو ٹٹولو اسے۔“

عین اس وقت سیڑھیوں میں مہترانی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

”اچھا تو میں باہر کوٹھے پر جاتا ہوں تم یہیں بیٹھے رہنا۔“

”یہیں بیٹھا رہوں ———“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ ”نہیں نہیں میں چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ جمال نے کہا۔ ”مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔“

"اونھوں۔" ایلی نے کہا۔ "ایسی باتیں اکیلے میں کی جاتی ہیں اگر اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی سن رہا ہے تو اس پر لازم ہو جائے گا کہ اپنی پاکبازی کا ڈھونگ رچا بیٹھے۔"

"سچ۔" جمال نے کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں ہاں۔" ایلی بولا۔ یہ کہہ کہ وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیم چھتی کے دروازے کے قریب مہترانی آ رہی تھی۔ ایلی نے اسے دیکھ کر بظاہر آنکھیں جھکا لیں اور کنکھیوں سے دیکھنے لگا۔ ادھیڑ عمر کی عورت ہونے کے باوجود اس کا بانکپن واضح تھا۔ اس میں مرچیلا پن تھا اور نگاہ میں بے باکی کی جھلک تھی۔ گھبرا کر وہ نیم چھتی میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا نہ جانے کیا ہو گا اگر اس نے جمال کو تھپڑ مار دیا تو اگر ——— جاہ کیا کہے گا۔ جاہ کے ہونٹ حقارت سے کھل جائیں گے اور پال کی ناک سوج کر پکوڑہ ہو جائے گی اور وہ دونوں مل کر کہیں گے ہاں بھئی ایلی کا دوست تھا نہ وہ ایسی حرکت کر دی تو کیا تعجب ہے۔

جب مہترانی چلی گئی تو جمال بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔

"یار۔" وہ بولا۔ "وہ تو سمجھو پہلے سے ہی گرم ہے۔ محبت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تم تو مجھے خواہ مخواہ ڈرا رہے تھے۔"

"کس طرح بات کی تھی تم نے۔" ایلی پھر سے سیانا بن کر بیٹھ گیا۔

"کچھ بھی نہیں میں نے کہا تھا جمعدارن اگر جو چوبارے کے سامنے کا کوٹھا بھی صاف کر دیا کرو تو کیا حرج ہے۔ تمہارا تو کچھ بگڑے گا نہیں اپنی بات بن جائے گی۔"

"اس پر وہ تنک کر کہنے لگی۔ دیتے تو کل دو روپے ہیں اور کہتے ہیں سارا گھر صاف کرو۔ واہ جی۔"

"چلو کر دیا کرو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہ جی۔" وہ بولی۔ "اتنا سارا کام ہوتا ہے زائد کام کرنے لگیں تو کھائیں کیا۔" "اچھا" میں نے برا سا منہ بنا لیا "تو مجھ سے بھی ایک روپیہ لے لیا کرو۔" یہ کہہ کر میں نے ایک روپیہ جیب سے نکال کر دیوار پر رکھ دیا۔ میں نے سوچا جو ہتھیلی پر رکھا تو بدک نہ جائے۔ اس نے برا سا منہ بنایا اور چوبارے کے سامنے جھاڑو دینے لگی۔ پھر وہ آپ ہی آپ کہنے لگی۔ "لو یہ تو چوبارہ بھی صاف نہیں کیا کسی نے کبھی۔"

"تو کیا میں خود جھاڑو دیا کروں۔" میں نے ہنس کر پوچھا۔

اس پر ذرا مسکرائی، بولی "اچھا تو میں کر دیتی ہوں صاف۔" اس پر میں نے دہائی مچا دی۔ "نہ نہ بابا۔" میں بولا۔ "میں تو غریب آدمی ہوں ایک روپیہ اور کہاں سے دوں گا۔" اس پر وہ بالکل ہی ہنس دی، بولی۔ "نہیں میں اور نہیں مانگتی۔" لیکن میں نے اسے ایک اور روپیہ دے دیا میں نے کہا "نہ بھئی تمہارا حق تو میں دے کر رہوں گا اور اور ایلی میں نے دل میں کہا سالی اب تو رام ہو جائے گی نا۔ وہی ہوا۔ وہ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس کا نام گجری ہے بچہ وچہ کوئی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں بڑی گرم ہے۔ ایمان سے اور ہے بھی تو اچھی خاصی۔" جمال مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا گوریوں کی بات کی۔" ایلی نے پوچھا۔

"خود ہی تو منع کیا تھا تم نے اور اب خود ہی پوچھتے ہو مجھ سے۔"

"اچھا کیا تم نے" ایلی بولا۔

جمال ہنسنے لگا۔ "یار میرا خیال ہے کام بن جائے گا۔"

دوسرے روز ہی جمال ہنستا ہوا ایلی کے پاس آیا۔ "میں نے کہا یار۔" وہ بولا۔

"مجھے ایک خط لکھ دو نا۔"

"خط۔" ایلی نے پوچھا۔ "کیسا خط۔"

"وہی خط۔" جمال نے کہا۔ "گجری مان گئی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"گجری؟۔"

"وہی مہترانی۔ اس کا نام گجری ہے۔ کیا نام ہے۔ ہے نا۔"

"مان گئی ہے۔" ایلی نے دہرایا۔

خواہ مخواہ کا منشی

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔" جمال نے کہا۔ "اگر تم یہ راستہ نہ سمجھاتے تو مجھے کبھی خیال ہی نہ آتا۔ مجھے معلوم تھا تم کچھ نہ کچھ کرو گے تمہاری مدد کے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی ایمان سے۔" اس نے ایلی کے شانے پکڑ لئے اور فرط محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگا ——— "اب لکھ دو نا ایک خط کل بھیجنا ہے۔"

"میں لکھوں۔" ایلی چلایا۔

"اور کون لکھے گا۔"

"تم خود لکھو نا۔"

"نہیں یار میں اناپ شناپ لکھ دوں گا۔ پڑھ کر وہ کیا کہیں گی۔"

"میں نے تو کبھی نہیں لکھا محبت کا خط۔"

"نہیں یار۔" جمال اس کی منتیں کرنے لگا۔ "تم لکھ سکتے ہو۔ ایسی ایسی باتیں لکھو کہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔"

اس روز سارا دن جمال ایلی کے گلے کا ہار بنا رہا۔ "یار لکھ دو نا لکھا دو نا یار۔" ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھے۔ اس نے زندگی میں صرف ایک محبت نامہ لکھا تھا۔ وہ بھی ارجمند کی طرف سے جو انہوں نے صبورہ کے جوتے میں رکھ دیا تھا تو بہ کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ جب بھی اس کا خیال آتا تو ایلی کو پسینہ آ جاتا تھا اور وہ خط تھا بھی تو بے حد واہیات۔ اس خط کے خیال سے ایلی کو بے حد شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ نہیں نہیں وہ سوچتا میں نہیں لکھوں گا۔ میں کیوں لکھوں جسے کبھی دیکھا تک نہ ہو کیا اسے محبت نامہ لکھا جا سکتا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہیں کیسی ہیں اور پھر کیسی ہوں۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ میں خواہ مخواہ میں کیا منشی ہوں ان کا۔ واہ۔ خواہ مخواہ کا منشی بنا رکھا ہے کیا۔ لیکن ایلی کے دل کے کسی عمیق ترین کونے میں یہ آرزو چھپی بیٹھی تھی کہ ان پراسرار گوریوں کو خط لکھے۔ جو اتنی چٹی سفید تھیں جو ہنسے جاتی تھیں جن میں اس قدر [illegible] تھی۔ ایسا خط لکھے کہ وہ پاگل ہو کر باہر نکل آئیں۔ گلی کی کھڑکیاں کھول کر ان میں آ کھڑی ہوں اور لیکن اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

جمال مسلسل اصرار کئے جا رہا تھا "لکھو نا یار۔" ایلی کو لکھنے سے ڈر آتا تھا چونکہ لکھنے کے لئے اس کے ذہن میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ اس زمانے میں اس نے کئی ایک نظمیں اور غزلیں پڑھی تھیں اور کئی ایک تو اسے حفظ تھیں مثلاً" وہ تھی اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے۔ لیکن وہ تو گزری ہوئی دلچسپی کی یاد تھی۔ پھر وہ تھی مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں لیکن یہاں تو عشق ہے ہے کی ضرورت تھی۔ پھر وہ نظم تھی۔ ابھی تو میں جوان ہوں یا فرصت کی [illegible] میں اور یا وہ خوبصورت نقش ماتھے پہ بندی آنکھ میں جادو۔

وہ سب موقعہ کی چیزیں نہ تھیں۔ اس روز اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاعر کتنی بے ہودہ چیزیں لکھتے ہیں۔ نہیں، اس نے فیصلہ کیا۔ کیوں لکھوں۔ خود ہی لکھے وہ۔ وہ تو ہر ہفتے اپنی بیوی کو

خط لکھا کرتا ہے۔

"نہیں نہیں۔" جمال کہنے لگا۔ "بیوی کو خط لکھنا اور ہوتا ہے۔ وہ چیز ہی اور ہے یار تمہیں معلوم نہیں۔" جمال پھر اس کی منتیں کرنے لگا۔

رات بھر ایلی سوچتا رہا لیکن اسے کوئی بات نہ سوجھی۔ آخر تھک کر اس نے ایک پرزے پر ایک جملہ اور ایک شعر لکھا اور پھر سو گیا۔

صبح سویرے ہی جمال نے اسے آ جگایا۔ "لکھ لیا یار۔" وہ بولا۔

"ہاں۔" ایلی نے وہ پرزہ سرہانے سے نکال کر اسے دے دیا۔

"ارے۔" جمال چلایا۔ "بس اتنا۔"

دفعتاً" سیانا بیدار ہوا۔ "اور کیا۔" ایلی نے کہا۔ "بھئی پہلی مرتبہ تو لمبے قصے نہیں چلتے۔"

"واہ۔" جمال نے کہا۔ "پہلی مرتبہ ہی تو اثر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"تم تو پاگل ہو۔ پہلی مرتبہ تو صرف دیا سلائی دکھائی جاتی ہے۔ آگ تو بعد میں لگانی چاہیے۔ تمہیں کیا معلوم۔"

"اچھا یار۔" جمال کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ "تم جو کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔"

"تم پڑھو تو سہی۔" ایلی نے کہا۔ جمال اسے پڑھنے لگا۔

"گوریو کچھ کہو کچھ سنو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی ہو۔ واہ۔"

"ارے۔" جمال چلایا اس میں تو شعر بھی لکھا ہے تم نے۔

"یہ ہے دامن یہ گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا۔"

جمال نے کہا۔ "اس کا مطلب کیا ہوا؟۔"

"تم چھوڑو مطلب وطلب کو۔" ایلی نے کہا "تمہیں آم کھانے ہیں پیڑ گننے سے کیا کام۔"

"اچھا۔" وہ جوش میں کھجانے لگا اور پھر بولا۔ "اچھا یار میں یہ نقل کر کے بھیج دوں گا۔ تم ٹھیک کہتے ہو پہلے خط میں لمبی بات نہیں ہونی چاہیے یار ایلی اگر تم نہ ہو تو یہ باتیں مجھے کون بتائے۔" جمال نے فرط محبت اور انبساط سے ایلی کے شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ "اچھا میں اب جا کر لکھتا ہوں۔ ایسا اچھا کاغذ اور لفافہ خرید کر لایا ہوں میں کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جائے اور پھر سینٹ کی شیشی بھی۔ معطر کر کے بھیجوں گا۔

"ارے رے رے ایسا نہ کرنا۔" ایلی چلایا۔

"کیوں۔" جمال گھبرا گیا۔

"میرے یار تو پڑا کر رہے گا اپنی گوریوں کو۔"

"کیوں۔"

"ایک تو پرزے پر لکھنا۔ معمولی سے پرزے پر اور وہ کٹا ہوا نہ ہو بلکہ پھٹا ہوا ہو۔ اور دوسرے لفافے میں نہ ڈالنا۔"

"وہ کیوں۔"

"بھئی اگر کسی کے ہاتھ بھی لگ جائے تو خط معلوم نہ ہو۔"

"اچھا ـــــــ" جمال کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ "اور وہ سینٹ اور لفافے۔"

"جب بات چل نکلے گی۔ تب اب کی بار تو پرزہ ہی تھما دو۔"

"اچھا یار" کہہ کر جمال چلا گیا۔ لیکن اسے ایلی کی یہ بات اچھی نہ لگی۔

اگلے روز جمال فاتحانہ انداز سے داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک رنگین لفافہ تھا۔ "یہ دیکھو۔" اس نے گلابی لفافہ دکھایا۔ جس پر سنہری لکیر لگی ہوئی تھی۔ پھر جھٹ سے چھپا لیا۔

"دیکھا۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" ایلی نے بے تعلقی سے کہا۔ "اب تو خوش ہو نا۔"

"اور کیا تم نہیں۔" اس نے مضطربانہ انداز سے پوچھا۔

"مجھے اس میں نہ گھسیٹو۔" ایلی نے کہا۔

"کیوں۔"

"اونہوں۔"

"میں نے کہا۔" جمال چمک کر بولا۔ "وہ دو ہیں اور اگر تم بھی میدان میں آ جاؤ تو۔ اگرچہ میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی کو بھی ہاتھ سے جانے دوں ایمان سے کہتا ہوں ایلی۔ نہ جانے کیا ہے مجھے میرا جی چاہتا ہے کہ دونوں سے عشق لڑاؤں۔"

"تو لڑاؤ۔" ایلی نے ہنس کر کہا۔

"تم نے برا تو نہیں مانا ـــ؟"

"نہیں تو۔"

"لیکن یار تمہارا درمیان میں ہونا ضروری ہے۔"

"وہ تو میں ہوں ہی۔" ایلی نے کہا۔ "ہے نا۔"

"ہاں ہو تو سہی لیکن اس ہونے اور اس ہونے میں بڑا فرق ہے۔"

"وہ ہونا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

"لیکن کیوں۔" جمال تڑپ کر بولا۔

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"آخر کیوں نہیں۔؟"

"معلوم نہیں۔" ایلی نے آہ بھر کر کہا۔ اس وقت اس کے سامنے شہزاد کھڑی تھی۔

"عجب آدمی ہو تم بھی۔"

"جو ہے حاضر ہے۔ کیا کیا جائے۔"

"یہ دیکھو کیا لکھا ہے انہوں نے یار بڑی جرات ہے ان میں اور پھر ایلی ـــــــ" وہ رک گیا۔

"ہوں۔"

"وہ تو بڑی اونچی باتیں کرنے والی معلوم پڑتی ہیں۔ اپنے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"تو کیا میں نے کہا تھا کہ اونچی باتیں کرنے والیوں سے عشق لگا لو۔ اب جو لگایا ہے تو بھگتو۔"

"لیکن خط تو تمہیں ہی لکھنا ہو گا نا۔"

"نہ بھئی یہ بات مشکل ہے۔" ایلی نے کہا۔

جمال نے برا سا منہ بنا کر لفافہ ایلی کے سامنے رکھ دیا۔ لفافے کے اوپر لکھا تھا۔ "سنہرے بالوں اور شریر آنکھوں کے نام ـــ"

"کیوں بھئی سنہرے بال۔" ایلی نے جمال سے کہا۔ "آنکھوں سے شرارتیں کرتا ہے اور قلم اٹھانے سے ڈرتا ہے۔" ایلی نے یہ کہتے ہوئے لفافے میں سے کاغذ نکالا۔ لکھا تھا۔ "ہم سنتی ہیں آپ کہیں۔ موسم تو الٹا موزوں ہے۔"

"ارے۔" ایلی تعجب سے چلایا۔ "بڑا چست جواب دیا ہے۔"

"ہو گا ہمیں تو یار ست کر دیا اس جملے نے۔ اب اس کا جواب کون لکھے گا۔ مجھے تو سمجھ

میں نہیں آتا کچھ اور تم پلو چھڑا رہے ہو۔" جمال بولا۔

"ہاں بھئی۔" ایلی نے جواب دیا۔ "یہ تو بڑی مشکل پڑ گئی۔ میرا خیال تھا کوئی سیدھی بات لکھیں گی۔"

"تم نے شروع ہی میں بات الٹی چلائی ہے۔ اب تم ہی سنبھالو گے تو سلجھے گی۔ اپنا بھائی اس وقت شروع ہو گا جب آمنے سامنے کھڑے ہوں گے۔"

"اس کے جواب میں تو عام محبت نامہ نہیں لکھا جا سکتا۔" ایلی نے کہا۔

"تو بھائی لکھو جو جی میں آئے لکھو۔" جمال بولا۔

"لیکن مختصر ہی ہو سکتا ہے۔"

"مختصر ہی سہی یار۔ تم لکھو تو۔ بات رک نہ جائے۔"

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "لکھدوں گا۔"

جمال کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا۔ ایلی سوچ سوچ کر دو ایک چست اور چٹکیلے جملے گھڑ کر جمال کو دے دیتا۔ جمال رنگین معطر کاغذ پر انہیں نقل کر دیتا اور پھر گجری کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ جب دوپہر ڈھلنے لگتی تو جمال چوبارے سے نکل کر برساتی میں جا بیٹھتا چونکہ برساتی سے وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر شام تک وہ ایک دوسرے سے اشارے کرتے رہتے۔ اگلے روز صبح سویرے ہی دونوں جمال اور ایلی بے صبری سے جواب کا انتظار کرتے اور پھر اسے پڑھتے۔ سمجھنے کی کوشش کرتے۔

"ارے یہ تو فارسی کے شعر لکھتی ہیں۔" ایلی نے ان کی دوسرے خط پر شور مچا دیا وہ فارسی میں کورا تھا۔ "اب بتاؤ۔" وہ بولا۔ "اب تو کسی مولانا کو ساتھ ملانا پڑے گا ورنہ نہ ہماری سمجھ میں آئے گا نہ جواب سوجھے گا۔"

"میں بتاؤں۔" جمال کہنے لگا۔ "ایک لغات کیوں نہ خرید لیں۔"

"تو کیا میں سارا دن معانی دیکھتا رہوں گا۔"

"بھا سے پوچھ لیا کرنا اسے کیا معلوم کہ خط میں لکھا آیا ہے شعر۔"

تیسرے خط میں گوریوں نے سنہرے بالوں شریر آنکھوں تانک جھانک اور ان اشاروں کے متعلق جو جمال کیا کرتا تھا۔ ایک نظم لکھ بھیجی۔

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "یہ تو شاعر بھی ہیں اب بولو۔" لیکن اس کے باوجود ایلی کو ان کے لطیفوں کے جواب لکھنے میں مزا آنے لگا تھا۔ وہ ہر بات میں نکتہ پیدا کرتی تھیں اور ہر لطیف سے لطیف اشارہ کو خوب سمجھتی تھیں۔

"نہیں یار۔" جمال گھبرا گیا۔ "تمہارا ان سے تعارف کرائے بغیر کام نہ چلے گا۔ یہ تو اب کرانا ہی ہو گا۔ آج ہی سہی۔"

کلی کلوٹا

ایلی نے دو ایک بار تو انکار کیا۔ پھر خاموش ہو گیا دراصل دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے۔ ان کے قریب تر ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال زبردستی اسے کھینچ کر ان کے سامنے لے جائے۔

اس لئے اس روز دوپہر ڈھلنے کے وقت جب جمال ایلی کے انکار کے باوجود اسے کھینچتا ہوا برساتی میں لے گیا تو اس نے سرسری ضد کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا حتیٰ کہ وہ ان کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"وہ سامنے مکان کی عقبی دیوار ہے نا۔" جمال اسے سمجھانے لگا۔ "اس میں اینٹوں کی جالی بنی ہے یہ جالی ان کی سیڑھیوں میں ہے۔ جالی کے عین سامنے دروازہ ہے جس کے پرے ان کا کوٹھا ہے۔ دروزاہ کھلا ہو تو جالی میں سے صاف دکھائی دیتا ہے اور اگر بند ہو تو جالی اندھی ہو جاتی ہے۔ لو دیکھو۔" اس نے ایلی سے کہا۔ "وہ سامنے کھڑی ہے ایک حرامزادی مارک ٹائیم کر رہی ہے۔ بڑی شریر ہیں یہ۔" جمال ہنسنے لگا۔

پھر جمال نے عجیب سے اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ ایلی کے کندھوں پر بازو رکھ کر اسے اپنے قریب تر کھینچ لیا وہ اشاروں کی مدد سے گوریوں کو سمجھانے لگا۔ یہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔

ایلی کو بھی دھندلی دھندلی اشکال دکھائی دینے لگی تھیں۔ جیسے فضا میں دھبے سے تیر رہے ہوں۔

دفعتاً جمال چلایا۔ "ارے انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔"

ایلی نے دیوار کی جالی کی طرف دیکھا۔ وہاں تو مسلسل دیوار کھڑی تھی۔ "یہ کیا حماقت

ہے۔" جمال چلایا۔

"چھوڑ یار" ایلی بولا ——— وہ ہاتھ چھڑا کر نیم چھتی میں جا بیٹھا۔

اگلے روز غیر متوقع طور پر گجری گوریوں کا خط لائی حالانکہ اس روز جمال نے خط بھیجا نہ لکھا تھا۔

"کل آپ ایک کال کلوٹے کو کھینچ کھینچ کر ہمارے سامنے لا رہے تھے۔ یہ کیا حماقت ہے آپ نے ہمیں سمجھا کیا ہے۔ آئندہ سے ایسی حرکت نہ فرمایئے گا۔"

ایلی خط پڑھ کر قہقہہ مار کر ہنسا "دیکھا۔" وہ غصے میں چلانے لگا "تم کہتے تھے میں تمہارا تعارف کرا کے رہوں گا ہو نہ ہو گیا نا تعارف۔" اس نے جمال کو ڈانٹا اور پھر ہنسنے لگا۔ لیکن ایک قہقہے لگانے کے بعد دفعتاً" اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل بیٹھ رہا ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا ہے۔

رات کو جب وہ نیم چھتی میں لیٹا ہوا تھا تو سیڑھیوں میں شہزاد کھڑی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ "یوں گہری سوچ میں ڈوبنے سے فائدہ' فکر کرنے یا غم کھانے سے تم گورے تو نہ ہو جاؤ گے۔"

"تمہیں کیا۔" ایلی نے کھڑکی کی طرف منہ موڑ لیا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ وہیں کھڑی ہے ویسے ہی مسکرا رہی ہے۔

کھڑکیوں کے عین مقابل میں سہ منزلہ بلڈنگ میں گوریاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ "کال کلوٹا۔" ایک قہقہہ مار کر ہنسی "اونہوں۔" دوسری نے برا سا منہ بنایا۔ "نہیں چاہئے تمہیں چاہئے۔"

"انہیں کیا معلوم۔" سیڑھیوں میں شہزاد بولی۔

"سنہرے بال شربتی آنکھیں۔" سہ منزلہ بلڈنگ سے کوئی چلائی۔

"تم ان کی باتیں نہ سنو ایلی۔" سیڑھیوں میں کسی نے آہ بھری۔ "ابھی میلے پر جانے کا شوق ہے۔ رنگ روپ کا دور ہے نا۔"

ایلی نے تڑپ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ "کیا تم رنگ روپ میں مدہوش نہیں ہو۔ کیا تم میلے پر جانے کے لئے بیتاب نہیں ہو۔ بھول گئیں جب گانے کے لئے جاتی تھیں یہ بری دیکھنے کے لئے بلاوہ آیا تھا۔"

"تمہارا غصہ نہیں گیا ابھی۔" وہ بولی۔ "اچھا۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔ "آخر آؤ گے ہی کب تک بھاگے بھاگے پھرو گے۔ کب تک۔" یہ کہہ کر وہ چل پڑی۔

ایلی تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شہزاد کا پلو کھینچ لے چلا چلا کر کہے۔ "نہیں نہیں مجھے ساتھ لے جاؤ۔ شہزاد میں بھاگ بھاگ کر اکتا چکا ہوں۔ بھگوڑے کو گھر لے چلو۔" مگر وہ جا چکی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے ایلی اپنے سوٹ کیس میں کپڑے لگا رہا تھا۔ سامان اکٹھا کر رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بھا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ "کہیں جا رہے ہو ایلی ———؟" بھا نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ایلی چونک کر بولا۔

"اچھا۔" بھا نے کہا۔ "چیزیں جو اس طرح سنبھال رہے تھے میں سمجھا ———" یہ کہہ کر بھا اوپر چلا گیا۔ دفعتاً" ایلی کو خیال آیا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "ہاں۔" وہ بولا "میں جاؤں گا۔ میں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے مایوس ہو جائے گی تو ——— وہ کیا کہے گی۔ کیا کہے گی وہ نہیں نہیں میں جاؤں گا" ——— "کہاں جاؤ گے۔؟" جمال نے داخل ہو کر پوچھا۔

"علی پور جاؤں گا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ارے ارے نہ بھائی۔" جمال چلایا۔ "تم چلے گئے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

"کونسا معاملہ؟"

"وہی معاملہ اور کون سا بڑی مشکل ۔ ، چالو ہوا ہے۔ یار اب اسے آدھے رستے چھوڑ کر نہ چلے جانا۔"

"آدھے رستے۔ کیوں۔" ایلی نے غصے میں کہا۔ "اب تو بات چل پڑی ہے۔"

"نہ بھئی۔" جمال نے اسے فرط محبت سے آغوش میں لے لیا۔ "ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔"

"تو کیا میں اسے چلانے کا ذمہ دار ہوں۔"

"نہیں بھئی۔" جمال ہنسنے لگا۔ "ذمہ دار تو نہیں لیکن یار اگر نیّا پار لگا دو گے تو یاد کروں گا ساری عمر بس ایک مرتبہ ملاقات ہو جائے پھر میں سنبھال لوں گا۔ پھر چاہے چلے جانا۔"

"نہیں بھئی۔" ایلی چلایا۔ "جب انہیں دخل اندازی ناپسند ہے تو ــــــ"

"اونہوں۔" جمال بولا۔ "انہیں کیا پتہ کہ یہ دخل اندازی نہیں وہ تمہاری قدر کیا جانیں! مجھ سے پوچھو یار۔ اپنی قدر و منزلت مجھ سے پوچھو۔"

ایلی خاموش ہو گیا۔

"نہ جانا۔ خدا کے لئے۔" جمال نے اس کی منتیں شروع کر دیں۔ "کچھ دن ٹھہر جاؤ پھر چلے جانا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

سیڑھیوں میں شہزاد امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ چپ چاپ۔ اس کی نگاہ میں حسرت کی جھلک تھی۔ ہونٹوں میں گویا سسکی دبی ہوا تھی۔

جمال کی نگاہ میں منت تھی۔ عین اس وقت بھا اوپر سے آگیا۔ "کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سرسری طور پر جمال سے پوچھا۔

"ایلی گھر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔" وہ بولا۔ "میں کہتا ہوں نہ جا۔"

بھا ہنسنے لگا۔ "مجھے بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا۔ میں سمجھا ایلی جا رہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جا رہا چاہے پوچھ لو۔"

"ارے۔" جمال چلایا۔ "تم نہیں جا رہے۔"

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا یار؟۔" جمال نے فرط انبساط سے ایلی کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔ "تم تو کہہ رہے تھے۔ جا رہا ہوں۔"

"ویسے مذاق میں کہا ہوگا۔" بھا مسکرایا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

"تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا" جمال خوشی سے چلانے لگا۔ "تم بڑے ہی پیارے ہو لیکن مجھے تنگ کرتے ہو۔ یار بہت تنگ کرتے ہو۔ میں پہلے ہی تنگ ہوں۔" وہ کھجانے لگا۔ "تم جلتی پر تیل چھڑک کر تماشہ دیکھتے ہو۔ ہے نا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "بڑے تماش بین ہو۔"

"ارے۔" وہ دفعتاً چلایا۔ "ہمیں تو ان کے خط کا جوب دینا ہے۔"

"تو دو نا۔" ایلی نے کہا۔ "اب میں کال کلوٹے کے بارے میں کیا لکھوں۔"

"یار تم اپنی طرف سے ایک خط کیوں نہیں لکھتے۔"

"کیا فائدہ۔"

"بڑا مزہ رہے گا اور پھر تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔" ایلی نے کہا "پھر کس حیثیت سے لکھوں۔"

"برادرانہ طور پر لکھ دو۔"

"کیوں۔" ایلی نے غصے میں کہا جیسے جمال نے اس کی توہین کر دی ہو۔

"میں بھی لکھتا ہوں۔ تمہارے متعلق وضاحت کر دوں گا۔ لیکن یار تم میرا لکھا صحیح کر دینا مجھے نہیں آتا خط لکھنا۔ ٹھیک ٹھاک کر دینا۔ بے عزتی نہ ہو جائے کہیں۔"

اگرچہ بظاہر ایلی خط لکھنے پر رضامند نہ تھا لیکن دل میں شاید اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ اپنی طرف سے خط لکھنے کا موقعہ ملا۔ رومانی خط تو وہ لکھ نہیں سکتا تھا چلو مزاحیہ ہی سہی۔ کسی نہ کسی طور پر وہ اپنی شخصیت کا اظہار تو کر سکے گا۔ شاید اس کے دل کی گہرائیوں میں کال کلوٹا کا کانٹا لگا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ان پر اس حد تک اثر انداز ہو کہ اس کانٹے کا گھاؤ بھر جائے یا شاید یہ کہ انہیں بھی کانٹا لگ جائے۔

بہرحال پہلا خط جو ایلی نے لکھا بے حد مختصر تھا گوری سانورے کنہائی توری سدھ بسرائی۔

جمال نے اپنے خط میں ایلی کی عظمت کے گن گائے ہوئے تھے۔ ایلی کے بغیر میں ادھورا ہوں اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لئے اس سے ایسا سلوک نہ کرو۔ وہ میرا دوست ہے۔ بہت گہرا دوست۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو گوارا کر لیا گیا اور گوارا بھی نہیں بلکہ ہر بار دو چٹھیاں موصول ہوتیں۔ ایک سنہرے بالوں کے نام اور دوسری میں کال کلوٹے سے مذاق کئے جاتے اور آج کی فلموں کی طرح اس پریم کتھا میں جو چوباروں اور چھتوں پر کھیلی جا رہی تھی۔ ہیرو کے ساتھ ایک مسخرا بھی شامل کر لیا گیا۔ لیکن ادھر وہ دونوں گوریاں ہیروئن ہی رہیں۔ بلکہ جمال اور ایلی پر یہ عقدہ نہ کھلا کہ ان کو خطوط کون لکھتی ہے اور وہ خطوط دونوں کی جانب سے لکھے جاتے تھے یا ایک کی۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جمال کو معلوم ہو گیا کہ کون کون سی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ چھوٹی بے حد شریر ہے۔ اس کا چہرا ہنستا چہرا ہے اور بڑی کی شکل کتابی ہے اور اس کے انداز میں غم کی جھلک ہے۔

کوٹھے پر ان کے روبرو آزادانہ آنے جانے کے باوجود ایلی کے لئے وہ دونوں دھندلے دھبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ کوشش کے باوجود وہ ان کے خدوخال نہ دیکھ سکتا۔ نہ ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ کون کونسی ہے نہ ہی اسے اس میں کوئی دلچسپی تھی۔ کئی مرتبہ جب ایلی سمجھتا کہ ان میں سے ایک سامنے آئی ہے تو جمال شور مچا دیتا۔

"اونہوں مت دیکھو۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ یہ تو کوئی اور ہے۔ شاید ان کا بھائی ہے۔" اور ایلی گھبرا جاتا اور کئی بار جب وہ سامنے آتیں تو ایلی سمجھتا کہ ان کا بھائی آ گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے وہ سامنے کھڑا نہ ہوتا تھا تاکہ اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے ان جانے میں کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دے اور ویسے بھی اس کی حیثیت کال کلوٹے کے سوا کیا تھی۔

شاید اس ایک لقب یعنی کال کلوٹے کی بنا پر۔ گوریوں کو روزانہ محبت بھرے خطوط لکھنے کے باوجود ان کے رنگین اور رومان بھرے خطوط موصول کرنے کے باوجود وہ ان سے کوئی خاص دلچسپی محسوس نہ کر سکا۔

وہ مالم نہیں

پھر دفعتاً ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس کی وجہ سے ناؤ گھر میں ہلچل مچ گئی۔ ایک روز جب وہ کالج سے لوٹنے کے بعد کھانا کھانے میں مصروف تھے تو ان کا نوکر گاما اندر داخل ہوا۔ حسب معمول اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں آنکھوں میں وہی خصوصی بے بسی تھی۔

"جی جی۔" وہ بولا۔

"جی جی۔" جاہ نے ازراہ مذاق دہرایا۔

"یعنی۔" پال بولا۔ "یہ تمہید ہے اور گاما میاں بات کرنے کے موڈ میں ہیں۔"

"جی جی ——" گامانے دانت نکالے جیسے پال کی بات پر خوشی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ "اسے دیکھ کر مجھے ڈکنز یاد آتا ہے۔" جاہ نے کہا۔

"کیوں گامے کیا بات ہے۔؟" بھانے پوچھا۔

"جی ——" گاما کی باچھیں ازسرِنو کھل گئیں۔

"اتنی جلدی بات بتانے کا قائل نہیں ہے یہ۔" بھا ہنسنے لگا۔ "سسپنس پیدا کرنے میں صاحب کمال ہے۔ گویا دورِ حاضر کا شیکسپئر ہے۔"

"جی۔" گاما پھر ہنسا۔

"اسے بات بھی کرنے دو۔" بھانے کہا۔ "ہاں گامے۔"

"جی وہ آئے تھے۔ جی ہاں۔"

"کون آئے تھے۔؟" بھانے پوچھا۔

"وہ اور کون۔" پال بولا۔

"کون آئے تھے؟" بھانے اپنا سوال دہرایا۔

"جی مالم نہیں کون۔" گامانے کہا۔

"ہے اس کا کوئی جواب۔" جاہ ہنسنے لگا۔

"کس سے ملنے آئے تھے۔؟" بھانے پوچھا۔

"جی۔" گاما شرما کر بولا۔ "جی مالم نہیں۔"

"حد ہو گئی۔" بھا ہنسی ضبط نہ کر سکا۔

"سیدھی بات تو ہے معلوم نہیں آئے تھے معلوم نہیں کس سے ملنے آئے تھے۔"

"وہ کہتے تھے۔" گامے نے کہا۔ "ہمیں اس سے ملنا ہے۔"

"کس سے۔؟" بھانے پوچھا۔

"سنہرے بالوں سے۔" گامانے جواب دیا۔

"سنہرے بالوں سے۔" بھا کے منہ کا نوالہ اڑ کر باہر نکل آیا۔

"جی وہ کہتے تھے۔" گامانے بات کی وضاحت کی۔ "جن کے بال سنہرے ہیں' ان سے ملنا ہے۔" ایلی کا منہ فق ہو گیا۔

"کیوں بھئی کس کے بال سنہرے ہیں؟" جاہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ "میرے تو بھئی گہرے بھورے ہیں پال کے سیاہ ہیں اور ایلی تمہارے۔ اونہوں تمہارے بھی سنہرے نہیں اور وہ جمال۔"

"ہاں۔" بھانے کہا۔ "اس کے شاید سنہرے ہوں۔"

"وہ آیا نہیں آج۔" جاہ نے ایلی سے پوچھا۔

"میٹنگ میں بیٹھا تھا۔ ابھی آ جائے گا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی۔" جاہ پھر ہنسنے لگا۔ "اگر اس کے سنہرے ہوں تو اسے بتا دینا کہ معلوم نہیں اس سے ملنے آئے تھے۔"

"جی وہ پھر آئیں گے۔" گاما بولا۔ "کہتے تھے ہم پھر آئیں گے۔"

اس نامعلوم آنے والے کا واقعہ سن کر جمال بے حد مضطرب ہو گیا۔

"کیا واقعی۔" وہ چلایا۔ "یار حد ہو گئی۔ مگر وہ تھا کون۔؟"

"مجھے کیا معلوم۔" ایلی نے کہا۔

"شاید انہوں نے بھیجا ہو۔" جمال نے کھجاتے ہوئے کہا۔

"سنہرے بالوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"لیکن یار۔" جمال مضطربانہ انداز سے کہنے لگا۔ "یہ لوگ کیا کہیں گے۔ انہیں شک نہ پڑا ہو۔ تمہارے جاہ سے تو ڈر لگتا ہے۔ تو کیا وہ پھر آئے گا۔"

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "گاما نے تو یہی کہا تھا۔"

"تو پھر کیا کریں ایلی۔" جوش میں جمال اس سے لپٹ گیا۔

اس روز شام کے وقت برساتی میں کھڑے ہو کر جمال نے گوریوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ کیا انہوں نے کسی کو بھیجا تھا۔ لیکن اشارہ کرنے میں جمال اس قدر بھونڈا دکھائی دیتا تھا کہ ہاتھ ہلاتے وقت وہ سرکس کا جوکر معلوم ہوتا۔ وہ دیوانہ وار اشارے کرتا رہا اور ساتھ ہی ایلی سے پوچھتا رہا۔

"ارے یار یہ اشارہ تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیسے پوچھوں ان سے۔" ادھر گوریاں اس کے اضطراب پر ہنسے جا رہی تھیں، مسلسل ہنسے جا رہی تھیں۔

مغرب کے وقت نیچے دروازے پر دستک سن کر ایلی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کبھی کسی نے اس گھر کے دروازے پر دستک نہ دی تھی۔ دستک نہ دی تھی۔ دستک دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہاں کیا پردہ دار لوگ بستے تھے۔ وہ تو ایک لاج تھا۔ جو بھی آتا دستک دیئے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتا۔

ایلی نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوانہ وار سیڑھیاں اترنے لگا۔ کہیں گاما نہ جا پہنچے اور سنہری بالوں کا بھید نہ کھل جائے ایلی جاہ سے ڈرتا تھا۔ اس کی طنز آمیز باتوں سے ڈرتا تھا۔ جاہ کہے گا۔ "ہوں تو کوٹھے پر پریم دویا کھلی پڑی ہے۔ سنہرے بال اور گوریوں کا میل ہوا ہے اور تم ایلی تم مسخرے کا پارٹ ادا کر رہے ہو۔ رازداں مسخرہ بھئی واہ کیا رول ہے۔ بھئی ہمیں تو کھیل کھیلنا نہ آیا کبھی۔ بہتیرا سر پٹخا۔ اونہوں اپنے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ یہ تو صبر اور تحمل کا کھیل ہے کنڈی پر کیچوا لگایا اور ڈوری پھینک کر بیٹھ رہے۔ نہ بھئی اپنے میں اتنا صبر کہاں۔ اونہوں۔"

شام کے دھندلکے میں ایلی اچھی طرح سے اجنبی کا جائزہ نہ لے سکا جو ناؤ گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی۔ ایک بے ڈھب سا کوٹ پہن رکھا تھا اور ساتھ شلوار۔ انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کھو گیا ہو۔ اس لئے مضطرب ہو۔ "جی فرمایئے۔" ایلی نے کہا۔

اجنبی نے ٹوپی ماتھے پر سرکالی اور پھر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر کھڑا ہو گیا اور ایلی کی طرف دیکھے بغیر خالی سیڑھیوں کی طرف گھورنے لگا۔

"آپ کس سے ملیں گے۔؟" ایلی نے پوچھا۔

جواب میں وہ دیر تک خاموش رہا۔ پھر دفعتاً بولا۔ "ہم ملیں گے۔"

"کس سے ملئے گا۔؟" ایلی نے دوبارہ پوچھا۔

"وہ۔ وہ۔" گھبرا کر وہ ٹہلنے لگا۔ "وہ اسی گھر میں رہتے ہیں۔" پھر اس نے ایک نظر چوبارے کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ہاں یہیں تو رہتے ہیں۔"

"یہاں تو کئی ایک لوگ رہتے ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ کئی ایک لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"مگر وہ ہیں کون؟۔"

"وہ۔ وہ۔" اجنبی رک گیا۔ "اپنے عزیز ہی ہیں۔ قریبی رشتہ ہے۔"

"کیا رشتہ ہے؟۔"

"رشتہ؟۔" وہ چونکا۔ "کہا جو ہے قریبی رشتہ ہے۔" وہ رک گیا۔

"وہ جو سنہرے بالوں والے ہیں۔ وہ۔" اس نے چوبارے کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں وہی۔" دفعتاً" وہ جوش میں بولا۔

"دیکھئے۔" ایلی نے کہا۔ "آپ ذرا ادھر آ جایئے۔ دروازہ سے ہٹ کر۔ یہاں انتظار کیجئے میں ابھی بھیجتا ہوں انہیں۔"

"ہاں ہاں بھیج دیجئے۔ کہنا تمہارے رشتہ دار آئے ہیں ملنے کے لئے۔ پیغام دینا ہے ایک۔"

شمال کو نیچے بھیج کر ایلی خود جاہ کے کمرے کی طرف چل پڑا تاکہ جاہ بھا اور رپال کو باتوں میں مصروف کرلے اور وہ نیچے اترنے نہ پائیں۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو کمرا خالی تھا۔ بھا جاہ لہذا تینوں سینما گئے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ایلی نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر مطمئن ہو کر نیم چھتی میں جا بیٹھا اور جمال کا انتظار کرنے لگا۔

پون گھنٹے کے بعد جمال فاتح کی طرح نیم چھتی میں داخل ہوا۔

"کیوں کیا ہوا۔ کون تھا وہ۔؟" ایلی نے چلایا۔

"ہوں ہوں ہوں۔" جمال گنگنایا اور پھر سیڑھیوں میں منہ ڈال کر با آواز بلند چلایا۔" یہ
لے آؤ اوپر۔ ہاں ہاں۔ یہاں نیم چھتی میں۔"

اتنے سارے پھل

اس پر گاما ایک بڑا سا ٹوکرا اٹھائے ہوئے داخل ہوا۔

"یہیں رکھ دو۔" جمال نے کہا اور پھر ٹوکرا اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ گامے کے بعد
کے بعد ایلی نے پھر سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"اس ٹوکرے میں کیا ہے۔؟"

"پھل ہیں۔" جمال نے کہا۔

"اتنے سارے پھل۔"

"ہاں۔ انہوں نے بھیجے ہیں۔" جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہائیں۔"

جمال قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "وہ تو مسخریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنا بڑا ٹوکرا بھیج دیا جیسے ہم نے
پھلوں کی دوکان کھولنی ہو۔"

"لیکن وہ رومی ٹوپی والا کیا ہوا۔"

"وہی تو لایا ہے" اس نے کہا "ذرا ٹھہریئے میں ابھی آیا۔ میں وہاں انتظار کرتا رہا پھر جب وہ لوٹا
اس کے ساتھ ایک مزدور نے یہ ٹوکرا اٹھایا ہوا تھا۔"

"ارے اور وہ تھا کون رومی ٹوپی والا۔"

جمال نے ہنستے ہوئے تالی بجائی۔ "یار اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ عجیب باتیں کرتا تھا پہلے تو
بہت دیر تک میرے بالوں کی طرف دیکھتا رہا۔ "تم ہی ہو نا" وہ بولا۔ "ہمارے رشتہ دار وہ جو چوبارے
میں رہتا ہے۔ وہ وہاں اوپر۔ سنہرے بالوں والا۔" عجیب باتیں کرتا رہا۔ جمال نے قہقہہ مارا۔ "لیکن
معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ہے کون۔"

"لیکن کیا وہ انہیں کی طرف سے آیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔"

"لیکن یار۔ شاید ——"

"ارے۔" جمال چلایا۔ "ان کا خط بھی تو لایا تھا۔ میں تو بھول ہی گیا۔"

"خط ——"

"ہاں۔" یہ کہہ کر جمال نے وہ خط ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رنگین کاغذ پر دو مختصر سے فقرے
لکھے ہوئے تھے۔ "آپ بھی کیا کہیں گے کہ اپنے جنم دن پر کچھ کھلایا ہی نہیں خوب کھائیے۔ بے فکر
ہو کر کھائیے۔ ڈاکٹر کی ضرورت پڑے تو وہ بھی بھجوا دیں گے۔"

"ارے۔" ایلی ہنسنے لگا۔ "کیا شے ہیں یہ اور کیا دونوں کا جنم دن ایک ہی ہے۔"

"کچھ پتہ نہیں چلتا یار۔ لیکن چھوڑو اس بات کو۔" جمال نے ٹوکرے میں ہاتھ ڈالا۔

"پہلے پھل تو کھا لیں۔"

"ارے۔" پھل کھاتے ہوئے ایلی چلایا۔ "یہ تم نے کیا غضب کر دیا۔"

"کیا۔"

"یہ ٹوکرا گاما سے اٹھوایا تھا نا۔"

"ہاں ہاں۔"

"اور اس وقت وہ رومی ٹوپی والا وہیں تھا نا۔"

"ہاں۔"

"بس غضب کر دیا۔"

"کیوں۔"

"گاما انہیں بتا دے گا کہ وہی معلوم نہیں پھل کا ٹوکرا دے گیا ہے۔"

اگلے روز جب ایلی کالج سے لوٹا تو وہ سب دالان میں بیٹھے پھل کھا رہے تھے اور پھلوں کا ٹوکرا
ان کے سامنے پڑا تھا۔

"ارے بھئی آؤ جلدی آؤ۔" جاہ ایلی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "تمہیں بھی آج ہی لیٹ آنا تھا کیا' قسم
ہے اگر مجھے اس ٹوکرے کے وجود کا علم ہوتا تو آج سرے سے کالج جاتا ہی نہ۔ آ جاؤ آ جاؤ روٹی ووٹی کا
خیال چھوڑو۔ بس اسی پر گزارا کر لو۔"

"اتنا سارا پھل۔" ایلی نے بناوٹی تعجب سے کہا۔

"جمال کے چچا معلوم نہیں کو دعائیں دو۔" جاہ بولا۔ "اگر وہ گاؤں سے چل کر شہر میں نہ آتے ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ کیوں بھئی۔" اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

"کون چچا۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ تو نہ بھتیجے کو معلوم ہے نہ خود چچا کو اور ہم بیچارے کس شمار میں ہیں۔ میاں ہمیں پھلوں سے واسطہ۔ چچا معلوم ہو یا معلوم نہ ہو۔ کوئی بھی ہو۔ بہرحال یہ حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی کہ ہم پھل کھا رہے ہیں۔"

"اور پیٹ بھر کر کھا رہے ہیں۔" پال ہنسا۔

"ویسے۔" بھا نے ہنس کر کہا۔ "معاملہ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔"

"کوئی تعجب نہیں ہوگا۔" پال نے کہا۔ "اگر ابھی ناؤ گھر کا دروازہ بجے اور وہ میاں نام آکر کہیں کہ بھئی اب جو ہمیں یاد آیا تو ہمارے بھتیجے کے بال سنہرے نہیں بلکہ کالے ہیں۔" "کچھ پروا نہ کرو اگر ایسا ہوا۔" جاہ بولا۔ "تو ظاہر ہے جمال نہیں بلکہ تم اس کے بھتیجے ہو۔ چونکہ تمہارے بال کالے ہیں۔"

"بھئی جمال۔" بھا نے کہا۔ "تم نے ان سے پوچھا نہیں کیا کہ وہ پھر کب شہر میں آئیں گے ——"

"پوچھنے کی کیا بات ہے۔" پال بولا۔ "مہینے میں دو مرتبہ تو آئیں گے ہی ——"

"چونکہ ہر معقول چچا کو ایسا کرنا چاہئے۔" جاہ ہنسنے لگا۔

پھر وہ سب دیر تک پھل کھانے میں مصروف رہے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔" جاہ نے کہا۔ "جیسے یہ گھر اپنا گھر نہ ہو۔"

"کیوں۔؟" پال نے پوچھا۔

"یہاں عجیب سے واقعات ہونے لگے ہیں۔ جو اپنے گھر میں نہیں ہو سکتے۔"

"مثلاً۔" بھا نے پوچھا۔

"مثلاً۔" جاہ بولا۔ "یہ پھل ہی لو اتنا پھل ہمارے گھر میں دکھائی دے سکتا ہے کیا۔ یعنی۔" قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ "گویا پھل نہ ہوا کتابیں ہو گئیں۔"

"بات تو درست ہے۔" پال نے کہا۔

"مثلاً اور۔" ایلی نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا آج" جاہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "سوچ رہا تھا کہ یا تو یہ اپنا گھر نہیں رہا یا یہ عورت جو سیڑھیاں اتر رہی ہے وہ عورت نہیں جو پہلے یہی سیڑھیاں اترا کرتی تھی۔"

"عورت؟۔"

"ہاں ہاں بھئی۔" جاہ بولا۔ "تم چاہے اسے جمعدارن کہہ لو لیکن ہے تو وہ عورت۔"

"کیا مطلب ہے۔" پال نے کہا۔

"مطلب۔" جاہ بولا۔ "وضاحت سے مجھے خود بھی نہیں معلوم لیکن کچھ ہے ضرور پہلے وہ آیا کرتی تھی تو جیسے تھکی ہوئی اکتائی ہوئی ہو اور ماتھے پر یوں کڑی تیوری ہوتی کہ کچھ کہا تو نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "لیکن اب آتی ہے تو اک تازگی سے ہوتی ہے۔ دلچسپی سی۔ یعنی جیسے کہہ رہی ہو جو جی چاہے کہہ لو جی چاہے۔"

"مطلب یہ ہوا کہ گھر سے تازگی لاتی ہے۔" ایلی نے نکتہ پیدا کیا۔

"شاید گھر سے ہی لاتی ہو۔" جاہ بولا۔ "لیکن شاید اوپر سے لاتی ہو۔" جاہ ہنسا۔

"میاں الزام نہیں دھر رہا میں ویسے بات کر رہا ہوں اور پھر مجھے ایلی اور جمال بھی کچھ کچھ بدلے بدلے دکھائی دیتے ہیں۔"

"میں۔" جمال ہنس کر بولا۔

"تم تو خیر پہلے ہی سے بدلے ہوئے تھے لیکن ایلی۔"

"یہ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں خود محسوس کر رہا ہوں۔"

"اگرچہ مجھے خود نہیں معلوم کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ دنیا بدلی بدلی سی دکھنے لگی ہے۔" ایلی نے بات کی اہمیت کم کرنے کے لئے کہا۔

"ہاں بھئی اس عمر میں ایسے حادثات ہو جاتے ہیں۔" جاہ نے کہا۔

رات کے وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو جمال کہنے لگا۔ "یار ایلی ان گوریوں میں اس قدر جرات ہے۔ مجھے تو ڈر آنے لگا ہے۔"

"اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"لیکن یار اس قدر جرات۔ آخر وہ ٹوکرا گھر منگوایا گیا ہوگا۔ پھر اسے بھجوا دینا اور ایک معمر آدمی کے ہاتھ۔ مجھے تو وہ گھر کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔"

"شاید وہ گھر اکیلی ہوں اس وقت۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں تو۔" جمال بولا۔ "گھر میں میں نے ان کی والدہ اور ایک ضعیف عورت کو دیکھا ہے۔"

"اچھا۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"جبھی تو میں سوچتا ہوں اپنے بس کا روگ نہیں معلوم ہوتا اور پھر ان کے خطوط۔ خط کیا گویا ہیں پورے جواب مضمون ہوتے ہیں۔" جمال ہنسنے لگا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن الثا یہ بات تو تمہارے حق میں ہے۔"

"وہ کیسے۔" جمال نے پوچھا۔

"اگر ان میں اس قدر جرات ہے تو خود ہی ملاقات کی صورت پیدا کریں گی۔"

"اچھا یار؟۔" جمال نے تعجب آمیز مسرت سے ایلی کے شانے پر ایک بھرپور ہاتھ مارا "تو لکھو یار۔ اب کی بار خط میں لکھ دو۔"

"کیا لکھ دوں۔؟"

"لکھدو کہ ہم ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی لکھ دو۔"

گوریوں کا جواب پڑھ کر دونوں بھونچکے رہ گئے۔ لکھا تھا۔ "جسے ملاقات کا شوق ہے وہ کرے کوشش اللہ کارساز ہے۔ ہمیں تو ملاقات سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"بھئی بڑی تیز ہیں۔" جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔

ایلی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔

دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

باقی ملاقات پر

اس چند منٹ کی خاموشی کے بعد گویا ایک طوفان اٹھ آیا۔ ایلی نے اعلان کر دیا کہ ہڑتال کر دی جائے اور گوریوں کو کوئی خط نہ لکھا جائے جب تک وہ ملاقات پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس کا تو یہ خیال تھا کہ احتجاج کے تحت جمال کوٹھے پر ان کے روبرو کھڑا ہونا بھی موقوف کر دے۔ جمال کو ایلی کے خیال سے اتفاق نہیں تھا۔

"نہیں یار ایسا نہ کرو۔" وہ بار بار چلا رہا تھا۔ "کہیں اس ضد میں بات ہی نہ ٹوٹ جائے۔" جمال اس کی منتیں کر رہا تھا ہاتھ جوڑ رہا تھا مگر ایلی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"یہ میرا فیصلہ ہے اٹل فیصلہ۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں تو ملاقات

کرنے کی میری ذمہ داری نہیں۔" وہ جمال پر یوں دھونس جما رہا تھا۔ جیسے اس کی ذمہ داری ختم ہو جانے کے بعد گوریوں سے رسم و راہ ختم ہو جانا ایک طے شدہ امر تھا۔

ایلی کے فیصلے کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس جال سے کنارہ کش ہو جائے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس پتلیوں کے کھیل کو چھوڑ کر اپنی دیوی کی پاس چلا جائے۔ اسے وہ یاد آ رہا تھا جو کرسی سے لٹکا کرتا تھا۔ وہ پیشانی جس کے عین درمیان میں تلک لگا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں جو کشتیوں کی طرح ڈولتی تھیں۔

چونکہ ایلی جذباتی طور پر اس رومان سے بے تعلق تھا۔ اس لئے وہ اس معاملے میں بڑی سے بڑی جرات کر سکتا تھا اور اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ محبت میں ذہنی بے تعلقی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے اور انسان جس قدر متاثر ہوتا ہے اسی قدر ناکام رہتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عورت فطری طور پر اس مرد کی تسخیر پر شدت سے آمادہ ہوتی ہے جو ناقابل تسخیر نظر آئے اور جو دل و جان سے اس کا ہو چکا ہو اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتی۔

اسی وجہ سے جمال ہر ایسے اقدام سے ڈرتا تھا چونکہ اسے ان کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ گوریاں بگڑ نہ جائیں۔ اس کے برعکس چونکہ ایلی آرزو سے مبرا تھا اسے کوئی خدشہ نہ تھا اس لئے وہ چاہتا تھا کہ ان کو مجبور کر دے ان پر چھا جائے۔

اس روز رات گئے وہ دونوں لڑتے جھگڑتے رہے کئی مرتبہ جمال طیش کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ "اچھا تو میں خود خط لکھوں گا انہیں۔ میں خود بات چلاؤں گا ——" لیکن جلدی ہی وہ واپس آ جاتا اور ایلی کی منتیں کرنے لگتا۔

آخر جمال ہار گیا۔ "اچھا بھئی۔" وہ بولا۔ "جو جی میں آئے کرو لیکن یار میرے ان کے روبرو جانے پر کوئی بندش نہ ڈالو یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

اس روز کے بعد ایلی ان کے ہر خط کے جواب میں باقی ملاقات پر لکھ بھیج دیتا۔ پہلے تو وہ یہ الفاظ دیکھ کر ہنسیں انہوں نے مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ "باقی ملاقات پر صاحب کوئی بات کیجئے کچھ کہیئے کچھ سنیئے۔ آپ تو گرامو فون کی اٹکی ہوئی سوئی بن کر رہ گئے۔" پھر انہوں نے روٹھ جانے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں لیکن ایلی نے جواب میں اسی جملے کی رٹ لگائے رکھی۔ دھمکیوں سے اکتا کر وہ پھر مذاق اڑانے لگیں۔ "میاں مٹھو درزیں چہ شک کے علاوہ بھی کوئی بات آتی ہے کیا۔" اور آخر میں وہ ملاقات پر رضامند ہو گئیں۔

اس روز جمال کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگاتا اور جوش مسرت میں ایلی سے بغل گیر ہوتا اور پیار سے دھول مارتا اور پھر بے اختیار کھجاتا۔ کھجاتا ہی چلا جاتا۔ جمال کے اس جوش انبساط کو سب سے پہلے بھا نے محسوس کیا کیونکہ بھا اکثر اوپر نیم چھتی اور چوبارے میں آیا کرتا تھا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے۔؟" بھا نے پن کانب درست کرتے ہوئے جمال کی طرف دیکھے بغیر پوچھا "کیا تمہارے چچا پھر تو نہیں آ رہے شہر۔؟"

"نہیں تو۔" ایلی ہنسا۔

"میں سمجھا شاید۔" بھا مسکراتے ہوئے بولا۔ "بہرحال کوئی بات ضرور ہے۔"

"گھر سے خط آیا ہے۔" ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن جاہ کے سامنے ایلی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ جاہ نے ایک ساعت کے لئے غور سے جمال کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ "آج تو جمال یوں مسکرا رہا ہے جیسے جمعدارن مسکراتے ہوئے سیڑھیاں اترا کرتی ہے۔ اب تو کایا پلٹ گئی ہے اس کی۔"

"ہوں۔" جاہ نے کہا۔ "ان عورتوں کی کایا پلٹ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ایک نگاہ ایک جملہ کتنی مغرور اور محتاج ہے یہ مخلوق جس کی ایک نگاہ سے کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔"

"کیوں ایلی۔" پال نے چمک کر پوچھا۔ "تمہاری ہی نظر تو نہیں۔"

"ہاں۔" ایلی ہنسنے لگا۔ "میری ہی تو ہے۔"

جاہ نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور شانے جھٹک کر کہا۔ "بہرحال اپنی نہیں اپنی نظر تو اثر کرتی ہے۔" وہ ہنسا۔ "اگر کبھی ڈال دوں ایک نظر، تو جھاڑو نہ اٹھائے تو اپنا ذمہ۔"

اس روز تو جمال فرط انبساط سے بات بات پر قہقہے لگاتا رہا لیکن اگلے روز صبح سویرے اتنا لمبا چہرا لئے نیم چھتی میں آ گیا۔

"یار ایلی۔" وہ بولا۔ "مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔"

"کیسے آتی۔" ایلی نے کہا۔

"مذاق نہیں کر رہا۔" جمال سنجیدگی سے بولا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ ــــــ"

"یار ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے پہلو چھل گئے ہیں۔"

"عشق و محبت میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔" ایلی نے اسے چھیڑا۔

"لیکن یار میں سوچتا رہا ہوں۔"

"کیا۔؟"

"خالی یہ کہنے سے اچھا ملاقات ہوگی ملاقات تو نہیں ہو جاتی۔"

"بھئی بور آیا ہے تو پھل بھی لگے گا۔" ایلی نے فلسفہ بھگارنا شروع کیا۔

"لیکن ملاقات ہوگی کیسے۔" جمال نے پوچھا۔

"جب ہوگی تو کوائف خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔"

"شاید ان کا مطلب ہو کہ ہم انتظام کریں۔" جمال نے کہا۔

"بیوقوف نہیں ہیں وہ۔" ایلی بولا۔

"شاید وہ انتظام نہ کر سکیں۔"

"جو اتنا بڑا ٹوکرا بھیجنے کا انتظام کر سکتی ہیں وہ ــــــ" ایلی ہنسنے لگا۔

"لیکن یار یہ ٹوکرا بھیجنے کی بات تو نہیں اور شاید انہوں نے بات ٹالنے کے لئے کہہ دیا ہو۔"

سارا دن جمال نے اپنے شکوک اور وہم سے ایلی کا سر کھا لیا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ نیم چھتی میں آ موجود ہوتا۔ "یار ایلی اگر انہوں نے دفعتاً بلا لیا تو ہمیں تیار رہنا چاہئے۔ دیکھو تو یہ رومال کیسا رہے گا۔ یار یہ کچھ اچھا نہیں اور یہ خوشبو یہ میں نے بھائیوں کی دوکان سے لی تھی۔ لیکن یار بہت ہی مدھم ہے۔"

پھر آہستہ آہستہ جمال بات کا رخ بدلتا۔ "یار ایلی اگر ہم یہاں تیار بیٹھے رہیں اور کوئی ہمیں بلائے ہی نہیں تو کیا ہوگا۔"

جمال کی باتوں سے ایلی چڑ گیا۔ شام کے وقت جب جمال نے آ کر اپنے شکوک کو ہوا دی تو ایلی نے اس کے شکوک کو رفع کرنے کے بجائے انہیں تقویت دینے کی کوشش۔

"شاید وہ مذاق کر رہی ہوں۔" جمال نے کہا۔ "ہیں تو بلا کی مسخریاں۔"

"ہاں یار۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں سمجھتا ہوں مذاق کیا ہے انہوں نے۔"

"سچ۔؟" جمال کی آنکھیں ابل آئیں۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"لیکن تم تو کہتے تھے ــــــ"

"بکواس کرتا تھا میں۔" ایلی نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں۔" جمال بولا۔ "اب بکواس کر رہے ہو تم۔ وہ ملیں گی ضرور ملیں گی جو لڑکیاں بلاوا بھیج سکتی ہیں وہ ضرور کوئی انتظام کریں گی۔"

ایلی کی ہنسی نکل گئی۔ جمال نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ "یار تم نے تو میری جان نکالی لی یہ کہہ کر۔"

"تو کیا کہوں؟۔" ایلی چلایا۔ "یہ کہوں تو تم بحث کرتے ہو وہ کہوں تو چیختے ہو۔"

"یار میں پاگل ہو رہا ہوں۔" جمال ہنسا۔

"وہ تو ظاہر ہے۔" ایلی بھی ہنسنے لگا۔

جمال کا یہ پگلا پن تین دن جوں کا توں قائم رہا چوتھے روز گوریوں کا بلاوا آ گیا اور ایک بار پھر جمال کی باچھیں کھل گئیں۔

سفید منزل

گوریوں کے سہ منزلہ مکان کا نام سفید منزل تھا۔ سفید منزل کا پچھواڑا ناؤ گھر کی جانب تھا۔ ناؤ گھر کے عین مقابل ایک مختصر سی مگر فراخ گلی تھی۔ جس کے بائیں بازو میں چار مکانات اور دائیں بازو میں صرف سفید منزل تھی جو گلی کے پرلے سرے پر واقع تھی۔ اس سے پرے ایک مختصر سے قبرستان سے ملحقہ کچھ خالی زمین تھی اور بازار میں دو ایک ایک منزلہ دکانیں تھیں۔ اسی وجہ سے سفید منزل کا پچھواڑہ ناؤ گھر کے چوبارے اور نیم چھتی سے پورے طور پر دکھائی دیتا تھا۔ سفید منزل کے پچھواڑے میں صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ پہلی منزل میں کھلتی تھیں باقی دونوں منزلوں میں ان اینٹوں کے سوراخوں کے سوا جو سفید منزل کی سیڑھیوں میں بنے ہوئے تھے کوئی کھڑکی یا روشن دان نہ تھا۔ گوریوں نے جمال کو ان دونوں میں سے ایک کھڑکی میں آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ کھڑکی گلی کے عین قریب تھی۔ انہوں نے وضاحت سے لکھا تھا کہ مغرب کے وقت آپ اس کھڑکی کی طرف دیکھتے رہیں۔ جب کھڑکی میں روشنی دکھائی دے تو گلی سے ہوتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ جائیں۔ لیکن آپ کی آمد پر کھڑکی کی روشنی بجھ جائے گی۔

اس روز سارا دن جمال تیاری میں مصروف رہا اس نے دو ایک ریشمیں رومال خریدے ایک عطر کی شیشیاں حاصل کیں پھر وہ اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بار بار ایک جوڑا

لے رد کر دیتا اور دوسرا نکال کر بیٹھ جاتا شام کے قریب وہ بن ٹھن کر ایلی کے پاس آ بیٹھا "یار ایلی۔" وہ کہنے لگا۔ "کوئی مجھے وہاں کھڑا دیکھ نہ لے۔ تم چوکس رہنا اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میری امداد کو آنا کہیں میں اکیلا ہی نہ پٹ جاؤں۔"

مغرب کی نماز کے وقت کھڑکی میں بجلی سے چمکتی۔ "ارے۔" ایلی چلایا۔ "دیکھا۔"

"ہاں۔" جمال نے کہا۔ "عجیب سی روشنی تھی۔ چکا چوند کر دینے والی روشنی۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔"

"نیچے والوں سے خبردار رہنا۔" ایلی بولا۔ "اگر انہوں نے دیکھ لیا تجھے تو خیر نہ ہو گی۔"

جمال نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار تھے جیسے وہ گوریوں سے ملنے نہیں بلکہ دیوار پر چڑھنے کے لئے جا رہا ہو۔

جمال کے جانے کے بعد فوراً ہی سیڑھیوں میں شہزاد آ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرا ستا ہوا تھا بال کھلے تھے۔ ایلی اسے دیکھ کر چونکا۔ وہ واقعی شہزاد کو بھولا ہوا تھا۔

"یہ کیا حال بنایا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"دیکھ لو۔" وہ بولی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر گال پر بہہ گیا۔

ایلی کے دل پر ٹھیس لگی۔ لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"وعدہ تو پورا ہو گیا۔" وہ بولی۔

"وعدہ؟۔"

"جو تم نے کیا تھا۔ اب تو ملاقات ہو گی نا۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"شہزاد شہزاد۔" ایلی تڑپ کر اٹھا لیکن وہ جا چکی تھی۔

پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگا اب تو ملاقات ہو گئی۔ وعدہ پورا ہو گیا۔ چلو جان چھٹی۔ مجھے کیا لینا دینا ہے۔ خواہ مخواہ مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں۔ اب میں علی پور جا سکتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھا سوٹ کیس سے ٹائم ٹیبل نکالا۔ "ارے" وہ چلایا "نو بجے بھی تو جاتی ہے ایک گاڑی"۔ اس وقت سات بجے تھے۔ ایلی نے جلدی میں سوٹ کیس میں چیزیں رکھیں۔ پھر ایک رقعہ جمال کے نام لکھا "میں علی پور جا رہا ہوں۔ ملاقات مبارک ہو۔" یہ رقعہ چوبارے میں رکھ کر ایلی نے سوٹ کیس اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔

بے معنی بے مصرف

سٹیشن کی طرف جاتے ہوئے اس کے چاروں طرف دھندلے دھندلے نقوش
رہے تھے۔ جیسے اداس آسمان پر بادل تیر رہے ہوں گرد و پیش ان دھندلے دھبوں سے
تھا۔ بے معنی بے مصرف دھبے جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو گرد و پیش کی ہر چیز مفہوم سے خالی
وہ خود محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں ہو۔

پھر وہ ریلوے سٹیشن میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں علی پور
ٹکٹ تھا مگر وہ سمجھ رہا تھا۔ جیسے علی پور کروڑوں میل دور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں سے
ثریا کی دودھیا سفیدی سے دور۔

"ایلی۔ ایلی۔"

اپنا نام سن کر وہ چونکا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک بڑا سا دھبہ تیرتا ہوا اس کے قریب
"ایلی تم ہو۔" اس نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ پھر اس میلے سے دھبے نے واضح شکل اختیار کر
لی۔ اپنے روبرو چچا عماد کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ "آپ ہیں چچا۔" وہ بولا۔

"میں نے اتنی آوازیں دیں۔" چچا نے کہا۔ "لیکن تم تو قدرے اپنے آپ میں گم
تھے۔"

"میں میں۔" ایلی گھبرا گیا۔ "دراصل میں جلدی میں تھا مجھے گاڑی میں سوار ہونا تھا۔"

"گاڑی میں۔" چچا عماد نے دہرایا۔

"علی پور جا رہا ہوں میں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اوہ۔" چچا بولے۔ "خیر تو ہے۔"

"ایک ضروری کام ہے۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا۔" چچا عماد نے کہا۔ "میں تو اسی گاڑی سے آیا ہوں۔ علی پور سے۔"

اسی گاڑی سے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"محلے کا کیا حال ہے چچا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ویران پڑا ہے۔" چچا بولے۔ "شادیوں کے بعد سب لوگ چلے گئے اور محلہ

خوب۔" ایلی بولا۔

"ادھر علی احمد کا گھر ویران پڑا ہے۔ ادھر تیری ماں اور بہن ابھی کابل سے نہیں آئیں پھر
شریف بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا ہے۔ اب کی بار۔"

ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن وہ مصلحت کی وجہ سے خاموش رہا۔

"شریف آیا تھا نا۔ اس کے گھر والی کہتی تھی۔ میں ساتھ نہیں جاؤں گی مگر اسے کھانے کی
تکلیف تھی۔ اس لئے منتیں ونتیں کر کے وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے گیا۔"

ابھی وہ پل پر کھڑے بات کر رہے تھے کہ نیچے گاڑی کی کوک سنائی دی۔ "ارے۔" چچا
بولے۔ "تمہاری تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

"اچھا چچا۔" وہ بولا۔ "تو پھر ملوں گا۔" یہ کہہ کر ایلی بھاگا۔

پل سے نیچے اترتے ہی جب وہ پلیٹ فارم کی طرف مڑا تو اس کے روبرو سٹیشن کی گھڑی
تھی۔ "ارے سوا آٹھ ———" وہ رک گیا۔ ابھی تو پون گھنٹہ باقی ہے۔ وہ ایک خالی بینچ پر بیٹھ
گیا۔ سامنے گاڑی میں لوگ اور سامان گڈمڈ ہو رہے تھے۔ قلی بھاگ رہے تھے۔ بابو سلو مارچ کر
رہے تھے۔ دیر تک وہ وہاں اس خیال میں بیٹھا رہا کہ اسے علی پور جانا ہے۔ چچا کی بات اس کے
ذہن سے یوں نکل چکی تھی۔ جیسے کسی نے کہی ہی نہ ہو۔ وقت رینگ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں
رکی ہوئی تھیں۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ ناؤ گھر سے بھاگ کر آیا ہے کہ جمال قبرستان کے عقب
میں گوریوں کی کھڑکی کے سامنے کھڑا شدت سے کھجا رہا ہے۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ کھو گیا
ہے اور اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لئے علی پور جا رہا ہے۔ وہ علی پور جا رہا ہے وہ علی پور
جہاں شہزاد رہتی ہے۔ جس کا بازو کرسی سے نیچے لٹکتا ہے آنکھیں ڈولتی ہیں اور ماتھے کی بندی
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہے۔

ایلی نے سر اٹھایا۔ سامنے دیوار پر سائن بورڈ لگا ہوا تھا۔ "شہزاد سنو۔" ارے وہ چونکا۔
"شہزاد سنو۔" محلہ ویران پڑا ہے۔ شریف بیوی بچے لے کر چلا گیا ہے۔ چچا عماد چلانے لگا۔ ایلی
بلبلا کر تڑپ کر اٹھ بیٹھا جیسے کسی نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ شہزاد چلی گئی شہزاد چلی گئی۔ انجن نے
آہ ماری۔ محلہ ویران پڑا ہے ویران پڑا ہے۔ ویران پڑا ہے۔ گاڑی چلنے لگی۔ ایلی نے ان
جلدی میں سوٹ کیس اٹھا لیا اور نہ جانے کس طرف چل دیا۔

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ ٹی سٹال پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔

سٹیشن کے باہر پہنچ کر وہ بکنگ آفس کے سامنے رک گیا۔ "ایک ٹکٹ علی پور۔"

شخص چلا رہا تھا۔ "ایک ٹکٹ علی پور۔" ایلی نے اپنی مٹھی کھولی۔ ٹکٹ پر حسرت بھری نظر

پھر اس نے چپکے سے ٹکٹ اس آدمی کی مٹھی میں تھما دی اور باہر نکل گیا۔

تانگوں کے اڈے کے قریب وہ سٹیشن کے چھوٹے سے باغیچے میں پہنچ کر بیٹھ گیا

طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جس میں بتیاں ٹمٹمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ قریب ہی

لمبے درخت اداس کھڑے تھے۔ سامنے ایک ویران مسجد کے مینار گویا محو حیرت کھڑے تھے۔

کوئی چکی ہونک رہی تھی۔

دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ سڑک ویران ہو گئی۔ دوکانیں بند ہو گئیں

بھیڑ سے خالی ہو گیا۔ کتے بھونکنے لگے۔

"بابو جی چلو گے۔؟" ایک تانگے والا اس کے قریب آ کر کہنے لگا۔ "کہاں جاؤ گے

جی۔؟" وہ چونکا "کہاں جاؤ گے بابو جی۔؟" کتا رو رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اسے جانا

کہیں نہ کہیں جانا ہی ہو گا۔

"ہاں۔" اس نے تانگے والے سے کہا۔ تانگے والے نے بڑھ کر اس کا سوٹ کیس اٹھایا

اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ملاقاتیں

اگلے روز جب ایلی بیدار ہوا تو جمال اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔

"مار لے یار تم نے حد کر دی۔" وہ چلا رہا تھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے۔ شکر ہے تم علی پور

نہیں گئے یار مجھے منجدھار میں چھوڑ کر تو نہ جاؤ"۔ وہ چلائے جا رہا تھا۔ "تم بولتے کیوں نہیں

کیا ہوا ہے تمہیں۔"

"جمال مسلسل طور پر چلا رہا تھا لیکن ایلی خاموش تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے اسے

بال اور گوریوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی ہو۔ اس کے

آصف کھڑا مسکرا رہا تھا —— "آ جاؤ آ جاؤ ایلی۔" وہ اسے اپنے مخصوص انداز میں بلا رہا تھا

اس روز کئی مرتبہ جمال اس کے پاس آیا۔ کئی مرتبہ جمال نے کوشش کی کہ ایلی اس

پوچھ کہ ملاقات کیسی رہی۔ لیکن ایلی نے ہر بار اسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "یار میری طبیعت اچھی

نہیں" لیکن رات کے وقت جب ایلی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا تو جمال نے آ کر خود بخود قصہ چھیڑ

دیا۔ "یار ایسی ملاقات کا کیا فائدہ۔ وہ سلاخ دار کھڑکی کے اندر رہیں اور میں باہر اور پھر ہر آہٹ

پر یہ خطرہ کہ کوئی دیکھ نہ لے پوچھ نہ بیٹھے کہ میاں یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ ادھر وہ

اندھیرے میں کھڑی تھیں۔ اندر بتی بھی نہیں تھی۔ گھپ اندھیرا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن

یار ان کی آوازیں اتنی پیاری ہیں اور ان کی باتیں اتنی رنگین ہیں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بڑی

تیز ہیں وہ اور بڑی نڈر اور یار انہوں نے مجھے سگریٹ پلائے پان کھلائے میں نے بہتیری کوشش

کی کہ سگریٹ دیتے وقت ہاتھ سیخوں سے باہر نکالیں۔ لیکن وہ بڑی چالاک ہیں فوراً بھانپ

لیتیں اور قہقہہ مار کر ہنستیں۔ "ہم سے چالاکی نہیں چلے گی صاحب۔" وہ ہنسنے لگا۔ "وہ مسلسل

باتیں کیے جا رہی تھیں۔ اور میں حیران کھڑا تھا۔ بت بنا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہوں

اور وہ کہہ رہی تھیں آپ گونگے ہیں یا بات کیجئے کوئی یوں تصویر بن کر کھڑے رہنے سے فائدہ۔

ہاں یار۔" جمال چلانے لگا "انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہاں صاحب تو وہ باتی ملاقات پر جو لکھتے

تھے آپ بار بار اب بتائیے نا وہ باتی کیا ہے اب کیا ہو گیا آپ کو۔"

چار روز بعد پھر بلاوا آیا اور جمال نئی امیدیں لے کر نئے جوش اور نئی تیاریوں کے بعد کھڑکی

پر جا کھڑا ہوا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے شانے اندر دھنسے ہوئے تھے۔ گردن لٹکی ہوئی تھی۔ اس روز

وہ چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا اور گہری فکر میں کھو گیا۔ "یار وہ طعنے دیتی ہیں۔" وہ کچھ دیر کے بعد

بولا۔ "کہتی ہیں خطوں میں تو بڑی باتیں بگھارتے ہیں آپ۔ بڑے نکتے پیدا کرتے ہیں لیکن

سامنے آ کر کیا ہو جاتا ہے منہ سے بات نہیں نکلتی۔"

"لو ریار۔" کچھ دیر کے بعد وہ پھر جوش میں کہنے لگا۔ "اب تو سارا راز فاش ہو گیا۔ اس

سے تو بہتر تھا کہ ملاقات ہی نہ ہوتی۔"

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

چار روز کے بعد جب پھر بلاوا آیا تو جمال خوش ہونے کی بجائے برا سا منہ بنا کر کہنے لگا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔ جانے کا کیا فائدہ۔ البتہ تم ساتھ چلو تو ٹھیک ہے چلو گے۔"

"اونہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میرا وہاں کیا کام اور پھر جس کو بلایا جاتا ہے وہی جاتا ہے نا۔"

"لیکن میں ان سے کہدوں گا کہ میں اسے زبردستی لایا ہوں۔" جمال نے کہا۔

"اگر وہ پوچھیں کہ زبردستی لانے کا مطلب۔" ایلی نے پوچھا۔

"کہہ دوں گا باتیں کرنے کے لئے۔"

ایلی کی ہنسی نکل گئی۔ "بھئی واہ۔" وہ بولا۔ "خط میں لکھوں۔ باتیں میں کروں۔ پھر تم کیا کرو گے۔"

"ہاں یار بات تو درست ہے۔"

"میں بتاؤں۔" ایلی بولا۔

"بتاؤ۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ سودا خرید کر ہنڈیا پکا کر برتن میں ڈال کر میں تمہارے سامنے رکھوں اور پھر تم اسے کھاؤ۔"

جمال نے قہقہہ مار کر کھجانا شروع کر دیا۔ "یار بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

ایلی دفعتاً سنجیدہ ہو گیا۔ "دیکھو جمال اس کھیل میں سودا لانے اور ہنڈیا پکانے کی ہی دلچسپی ہوتی ہے کھانا اہم نہیں ہوتا۔"

"لیکن یار۔" جمال بولا۔ "میں کیا کروں میرا دل جو چاہتا ہے۔"

اس وقت ایک ساعت کے لئے ایلی نے جمال سے نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ لیکن خاموش رہا۔ شام کے وقت جب کھڑکی میں چمکدار روشنی نظر آئی تو ایلی نے زبردستی جمال کو اٹھایا اور پھر دھکیل کر نیچے لے گیا تاکہ ان سے ملے نیچے جا کر جمال نے ایلی کی منتیں شروع کر دیں۔

"اب آ بھی جاؤ یار۔ دس قدم تو ہے یہاں سے تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنی بات بن جائے گی۔" جمال کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ ایلی کو اپنے معاملے میں ڈال کر وہ بات بگاڑ رہا ہے۔ لیکن ایلی کو پورے طور پر احساس ہو چکا تھا کہ جمال بات بنانے کا خواہشمند نہیں وہ صرف ملاپ کا متمنی ہے۔ خصوصی ملاپ ایسا ملاپ جس میں لوہے کی سلاخیں حائل نہ ہوں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ گوریاں اس کی اس خواہش سے کماحقہ واقف ہو چکی ہیں۔

اس کے باوجود نہ جانے کیوں ایلی نے جمال کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

اس روز ان کی ملاقات کافی مختصر رہی۔ واپس آ کر نہ تو جمال نے کوئی بات کی اور نہ ہی خوشی یا تعجب کا اظہار کیا۔

اگلے روز گوریوں کا جو خط موصول ہوا وہ سارا کال کلوٹے کے نام تھا۔ جس میں اسے بار بار تاکید کی گئی تھی کہ ان سے ملنے کے لئے سنہری بالوں کے ہمراہ آئے اور اس سے پہلے وہ کیوں نہ آیا تھا اور کال کلوٹا ہونے پر جلتا کیوں ہے۔ منہ کیوں چھپاتا پھرتا ہے۔ روتا کیوں ہے اور نہیں روتا تو شکل ایسی کیوں ہے۔

اس خط پر ایلی حیران ہوا اتنا لمبا چوڑا خط اسے کبھی موصول نہ ہوا تھا اور پھر سارا کا سارا اس کے نام اس سے پہلے تو کبھی کبھار اس کا نام کا رقعہ ملفوف ہوتا تھا اور اس رقعے کی حیثیت ضمنی ہوتی تھی۔ حیرت کی بات تھی۔

ایلی سارا دن اس بارے میں سوچتا رہا پھر اسے قرائن سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جمال کے کہنے پر ہوا ہے۔ پچھلی ملاقات میں اس نے اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہ کی تھی۔

شام کے وقت جمال اس کے پاس آ بیٹھا اور سفید منزل کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مغرب کے وقت کھڑکی میں تیز روشنی دیکھ کر وہ اچھلا۔

"لو وہ بلا رہی ہیں۔" اس نے ایلی سے کہا۔

"ابھی تو تم کل ہی مل کر آئے ہو۔" ایلی نے کہا اور آج کے خط میں تو اس ملاقات کا ذکر نہ تھا۔"

"انہوں نے زبانی بتایا تھا مجھے۔" جمال بولا "کہ شام کو اگر روشنی جلے تو آ جانا ورنہ نہیں۔" پھر وہ ایلی کی منتیں کرنے لگا۔

ایلی حقیقتاً وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ غالباً وہ "کال کلوٹے" نے اس کی انا کو صدمہ پہنچایا تھا اس واسطے ایلی ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتا تھا۔ یا شاید اس کی کوئی اور وجہ ہو بہرحال اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ جمال اس کے بغیر اکیلا ہی چلا جائے لیکن جمال گویا اسے ساتھ لے کر جانے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو جمال کے ساتھ جانا پڑا۔

انڈر کانسیڈریشن

گلی سنسان تھی۔ قبرستان کے پیچھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہونا خصوصی طور پر خطرناک نہ

تھا۔ اول تو اس گلی میں آمد و رفت بہت کم تھی دوسرے گلی میں گزرتا ہوا شخص اگر لوہری تو
بھی تو اسے اندھیرے کی وجہ سے وضاحت سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وہ دونوں چپ چاپ قبرستان میں داخل ہو گئے اور پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے ایلی
نے دو ایک مرتبہ کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جگہ سنسان معلوم ہوتی تھی
اس نے سمجھا ابھی گوریاں نہیں آئیں اس لئے وہ جمال سے کہنے لگا۔

"میں نہیں سمجھتا آخر مجھے یہاں لانے سے کیا فائدہ۔"

"حرج بھی کیا ہے۔" جمال نے کہا۔

"واہ۔" ایلی چمک کر بولا۔ "تم تو بھلا عشق لڑاؤ گے۔ میں کیا کروں گا۔"

"آپ دیکھئے عشق کس طرح سے لڑایا جاتا ہے۔" کھڑکی سے آواز آئی۔

"ارے ——۔" ایلی چونکا۔ "یہ تو اندر ہی ہیں۔"

اندر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"یہ تو بڑی بے انصافی ہے۔" ایلی نے کہا۔ "کہ آپ تو سلیمانی ٹوپی پہنے رہیں اور ہم دونوں
سر سے پاؤں تک بیوقوف بنے کھڑے رہیں۔"

"تو کیا آپ یہاں انصاف کے لئے آئے ہیں یہ کیا جہانگیر کا مقبرہ ہے۔" آواز آئی۔

"نور جہاں بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔" ایلی نے کہا۔

"آپ ملنے آئے ہیں یا لڑنے کے لئے۔" اندر کوئی ہنسی۔

"ہاں پہلے یہ طے کر دیجئے کہ مجھے کس حیثیت سے بلایا گیا ہے۔ کیا اس لئے کہ میں ہیرو اور
ہیروئین کا تماشا دیکھوں۔ یا مسخرے کی طرح آپ لوگوں کو محظوظ کروں یا گورے کے لئے نظر بند
کا کام دوں۔"

"چلئے ہم نے آپ کو بھائی کا مرتبہ بخشا۔" آواز آئی۔

"سوچ لیجئے۔" ایلی نے کہا۔

"سوچ لیا۔" آواز آئی۔

"تو بھئی دونوں اپنی اپنے کان ننگے کرو اور میرے ہاتھ میں دے دو۔"

"کیوں۔" کوئی ہنسی۔

"تاکہ میں انہیں کھینچوں اور کہوں تم دونوں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو چلو گھر چلو

رت کا خیال ہے یا نہیں اور یہ سنہری بالوں والے ہمیشہ معصوم بچیوں کو پہلے ورغلاتے ہیں اور
پھر دھوکا دیتے ہیں۔"

"ارے۔" وہ ہنسنے لگی۔ "نہ صاحب ہم آپ کو بھائی نہیں بناتے۔"

"تو پھر پہلے یہ فیصلہ کیجئے کہ میں کس حیثیت سے بلایا گیا ہوں۔"

کچھ دیر وہ دونوں کھی کھی کر کے ہنستی رہیں۔

پھر ایک بولی۔ "چلئے آپ انڈر کانسیڈریشن سہی۔" یہ سن کر ایلی کو پسینہ آ گیا اور
اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"معلوم ہوتا ہے اب مطمئن ہو گئے ہیں۔" کوئی ہنسی۔

"دیکھئے۔" غصے میں ایلی نہ جانے کیا کہنے لگا۔

"ٹھہرئیے جی۔" وہ بولی۔ "انہیں بھی کوئی بات کرنے دیجئے اب —— یہ نہیں کہ آپ
ہی چہکتے رہیں باری باری موقعہ دیا جائے گا۔" ایلی کا غصہ یخ ہو گیا۔

"انہیں باتوں سے دلچسپی ہوتی۔" ایلی نے کہا۔ "تو مجھے نہ بلایا جاتا۔"

"اب آپ اس کا ناجائز فائدہ حاصل نہ کیجئے۔" اندر سے آواز آئی۔

ایلی خاموش ہو گیا محفل پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری رہی۔

"کرو نا کوئی بات بھئی۔" ایلی نے جمال سے کہا۔

"لیجئے اب تو سفارش کر دی آپ کے دوست نے۔" کوئی ہنسی۔

"میں تو جدائی کا مارا ہوا ہوں۔ میں کیا بات کروں۔" جمال کھجانے لگا۔

"دیکھ لیجئے۔" وہ بولی۔ "یہ پاس آ کر بھی جدائی کے مارے رہتے ہیں۔"

"یہ کیا ملاقات ہے۔" جمال نے آہ بھری۔

"اور ملاقات کسے کہتے ہیں جی۔" وہ بولی۔

جمال لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

"میں نے کہا۔" ایلی نے بات شروع کی۔ "اس کمرے کا دروازہ باہر گلی میں بھی تو کھلتا ہے
یہ والا۔ جس کے باہر تالا پڑا ہے۔"

"تو پھر اسے کھول لیجئے نا۔" وہ ہنسیں

"سچ۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"لیکن اندر کی چٹخنی۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہ نہیں کھل سکتی۔"

"کیوں؟۔"

"بس نہیں کھل سکتی۔ لیجئے سگرٹ۔" انہوں نے ایک سگرٹ سلاخوں سے باہر نکالا۔

"اونہوں۔" ایلی چلایا۔ "ہاتھ اندر کیجئے ہاتھ اندر کیجئے ورنہ نظر آ جائے گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔

جمال نے سگرٹ پکڑ لیا۔

پھر جب انہوں نے دوسرا سگرٹ باہر نکالا تو ایلی نے انکار کر دیا۔ "میں نہیں پیتا۔"

"جھوٹ کیوں بولتا ہے۔" جمال بولا۔

"وہ تو کبھی کبھار تفریحاً پیتا ہوں۔"

"یہ بھی تو تفریحاً ہی دیا جا رہا ہے۔" وہ بولی۔ "دوا کے طور پر نہیں۔"

"اچھا۔" ایلی بولا۔ "ضرور ہی پلانا ہے تو سلگا کر دیجئے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "جی نہیں۔" وہ بولی۔ "خود ہی تکلیف فرمایئے۔"

"ہم نہیں پیتے۔" ایلی کہنے لگا۔ "ایک تو تمہارے کہنے پر سگرٹ پیئیں اور دوسرے سلگاؤں بھی خود ہی یہ مہنگا سودا ہے۔"

"ارے۔" وہ چلائیں۔ "یہ باتوں کے دھنی معلوم ہوتے ہیں۔"

"خالی باتوں کا ہی ہوں۔ ڈریئے نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھا میں نے کہا نہ تھا۔" جمال ہنسنے لگا کہ اسے ضرور بلایئے۔

"آپ نہ جانیں کیا کیا کروائیں گے ہم سے۔" انہوں نے جمال سے کہا۔ "لیجئے پان کھایئے۔"

جمال نے لپک کر پان لے لیا۔ ایلی نے انکار کر دیا۔

"اب آپ کہیں گے کہ پان بھی چبا کر دیجئے۔"

"اگر تم انڈر کانسیڈریشن ہوتیں تو ضرور کہتا۔"

"یعنی آپ انتقام لے رہے ہیں۔ چھی چھی۔" وہ ہنسیں۔

"لیکن آپ ہیں کتنی۔" ایلی نے بات کا رخ بدلا۔ "ایک ہیں دو ہیں تین ہیں کتنی ہیں آپ۔"

"یہ راز نہیں بتایا کرتے۔" وہ بولی۔

"بولتی تو ایک ہی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"لیکن ہیں دو۔" جمال نے کہا۔

"دوسری کہاں ہے؟۔"

"دوسری ہی تو بولتی ہے۔" کسی نے ہنس کر کہا۔

"یوں نہیں دونوں ایک ساتھ بولو تو یقین آئے۔" ایلی بولا۔

عین اس وقت سڑک پر قریب ہی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔

"بھائی جان۔" اندر کوئی زیر لب چلائی۔ "اچھا اب آپ جایئے ——" کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے۔ اگلے روز جمال بے حد خوش تھا۔ "یار تم نے تو حد کر دی۔ جبھی تو میں کہتا تھا کہ ضرور چلو تمہارے جانے کے بغیر وہاں بات نہیں چلے گی۔"

"یار۔" ایلی نے کہا۔ "وہ تو بے حد تیز ہیں۔ وہاں تو اپنی دال بھی نہیں گلتی۔"

"دیکھا نا۔" جمال نے کہا۔ "جبھی تو میں اکیلا جانے سے گھبرایا کرتا تھا۔"

"لیکن جمال۔" ایلی نے کہا۔ "میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں۔"

"آخر کیوں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

اس روز سارا دن اسی بات پر ان کا جھگڑا ہوتا رہا۔ جمال اسے کہہ رہا تھا کہ اب تو جانا ہی پڑے گا۔ لیکن ایلی جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

دن میں چار ایک بار جمال نے ایلی سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن ایلی نے اسے روک دیا۔ "نہیں جمال میں نہیں جاؤں گا۔ اس میں بحث کی کوئی بات نہیں۔"

شام کے وقت ایلی چپکے سے نیچے اتر گیا اور جمال کے پاس جا بیٹھا۔ جمال نے باہر کھڑے ہو کر اشارات کئے لیکن ایلی نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس لئے جمال کو اکیلے ہی جانا پڑا۔

باتیں ہی باتیں

اگلے روز جمال کی حالت غیر تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ دوپہر تک وہ ایلی کے پاس نہ

آیا تو ایلی چوبارے میں گیا۔ "کیوں بھئی کیا ہوا کل۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بولا۔

"کچھ نہیں کا کیا مطلب۔" ایلی نے پوچھا۔

"انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کھڑکی بند کر لی اور کہنے لگیں جب تک اسے ساتھ نہیں لاؤ گے۔ اب کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔"

ایلی یہ سن کر حیران رہ گیا اس نے محسوس کیا جیسے اس کا کالا رنگ ڈھل کر گورا ہو گیا ہو۔

"اب تم کیوں جانے لگے۔" جمال نے کہا۔ نہ جانے جمال کی حالت دیکھ کر یا اس لئے کہ اس کا رنگ گورا ہو چکا تھا۔ اس نے جمال کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے معلوم نہ تھا جمال۔" وہ بولا "مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ ایسا کریں گی۔"

"میں جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔ تم دل برا نہ کرو۔" ایلی نے کہا۔

جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "اچھا۔" وہ بولا "تو تم جاؤ گے نا۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"پھر کبھی انکار نہ کرو گے نا۔"

"نہیں۔"

شام کو جب وہ دونوں کھڑکی کے قریب پہنچے تو آواز آئی۔ "آپ کس حیثیت سے آئے ہیں جی۔"

"انڈر کانسیڈریشن کی حیثیت سے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اوہ۔ اور کل کیوں نہیں آئے تھے جی۔"

"اس لئے کہ کل میں اپنے آپ کو ابھی 'کانسیڈریشن' سمجھتا تھا۔"

"تو کیا سزا ملنی چاہئے آپ کو۔" وہ بولی۔

"سزا تو ضرور ملنی چاہئے۔" ایلی نے کہا۔ "ایک تھپڑ کافی ہو گا کیا۔"

"ہاں۔" وہ بولی اور پھر جمال سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آپ انہیں ایک تھپڑ ماریئے۔"

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "آپ کو خود تکلیف کرنی ہو گی۔"

"کیوں کیا اس لئے کہ ہمارے ہاتھ سے چوٹ نہیں لگے گی۔ بتایئے۔"

"اونہوں۔" ایلی نے سر ہلایا۔

"تو پھر۔"

"بازو تو منظر عام پر آئے گا۔" ایلی نے کہا۔

"ارے۔" وہ ہنسی۔ "انہیں بازو دیکھنے کا شوق ہے۔ بچوں کی سی بات کرتے ہیں۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیا آپ بچہ ہیں۔؟" وہ بولی۔

"ہوں تو نہیں لیکن بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"کیوں۔" وہ بولی۔

"کہ شاید آپ میں ممتا جاگ اٹھے۔"

"ارے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور اندر کسی سے کہنے لگی۔ "یہ بھی انہیں کے ہم خیال معلوم دیتے ہیں۔"

"کن کے۔؟" ایلی نے پوچھا۔

"اپنے دوست کے اور کن کے آپ کے دوست کا خیال ہے کہ درمیان میں لوہے کی سلاخیں ہوں تو ملاقات نہیں ہو سکتی اور ہمیں معلوم ہے کہ اگر سلاخیں ہٹا دی جائیں تو یہ کیا مطالبہ کریں گے۔"

"پھر تو میں اپنے دوست کا ہم خیال نہیں ہوں۔"

"کیوں۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ ان سلاخوں کو ڈبل کر دیا جائے تاکہ میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھوں اور آپ کی قسم اگر یہ سلاخیں نہ ہوں تو مجھ سے بات بھی نہ ہو سکے۔"

"کیا مطلب۔" انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے وہ قصہ سنا۔" ایلی کو معاً ایسپ کی کہانی یاد آ گئی۔

"کونسا۔"

ایلی نے کہانی سنانا شروع کی "بھیڑیا گھوم پھر رہا تھا۔ وہ ایک سو فٹ اونچی دیوار کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ دیوار کے اوپر ایک بھیڑ کا بچہ بیٹھا ہے۔ بھیڑ کے بچے نے چلا کر کہا چچا جان سلام عرض کرتا ہوں۔ بھیڑیئے نے جواب دیا بیٹا یہ تو نہیں بول رہا یہ سو فٹ اونچی دیوار بول رہی ہے۔" ایلی نے کہا۔ "محترمہ یہ میں نہیں بول رہا۔ بلکہ لوہے کی سلاخیں بول رہی ہیں۔"

"یہ تو بکواس کر رہا ہے۔" جمال نے کہا۔

"تو پھر آپ بات کیجئے نا۔" وہ ہنس کر بولی۔

"انہیں بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" ایلی نے کہا۔ "یہ تو اندر کا نسپیریٹر ہیں۔" وہ ہنسیں۔ "یہ آپ کو بات نہیں کرنے دیں گے۔" انہوں نے جمال کو مخاطب کر کہا۔ "نہ جانے آپ انہیں ساتھ کیوں لے آتے ہیں۔"

"آپ نے تو خود ہی کھڑکی بند کر لی تھی کل۔" جمال نے کہا۔ "اور کہا تھا جب تک ساتھ نہیں لائیں گے کھڑکی نہیں کھلے گی۔"

"وہ تو اس لئے کہا تھا کہ آپ پر صرف ایک دھن سوار ہے۔ چونکہ آپ کے خطرناک ہیں۔ اس لئے تیسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔"

"نہیں نہیں خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔" جمال کھڑکی کے قریب تر ہو گیا۔

"اندر ہاتھ نہ ڈالئے۔" وہ بولی۔ "منہ زبانی بات کیجئے آپ کو تو کشتی کرنے کا شوق ہوتا ہے۔" ذرا انہیں پیچھے ہٹا دیجئے نا۔" انہوں نے ایلی سے اپیل کی۔

ایلی خاموش کھڑا رہا۔

"خدا کے لئے ذرا دیا سلائی تو جلائیے۔" جمال نے منت کی۔

"کیوں۔؟"

"یہاں بہت اندھیرا ہے۔" وہ بولا۔

"بس ان کو یہی ایک بات کر آتی ہے۔" وہ ایلی سے کہنے لگی۔

"خدا کے لئے"۔ جمال نے اپنا بازو سلاخوں کے اندر ڈال دیا اور وہ ٹارچ جلا دی جو وہ کر ساتھ لایا تھا۔ کمرے سے دو ایک ہلکی ہلکی چیخوں کی آوازیں آئیں دو ملفوف سی اشکال ہوئی بھاگیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک وہ دونوں وہاں چپ چاپ کھڑے رہے۔

"بھاگ گئیں آخر۔" جمال بولا۔ "وہ یونہی بھاگ جایا کرتی ہیں۔"

"لیکن یہ ٹارچ تم کیسے لے آئے تھے۔" ایلی نے پوچھا۔

"چھپا کر لایا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "یار اتنی دیر ہو گئی ہے ابھی تک ان کی شکلیں بھی نہ دیکھیں میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔"

اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ شام کے وقت جب کھڑکی میں تیز روشنی دکھائی دیتی وہ دونوں قبرستان کی طرف چل پڑتے۔ ان کی آمد پر وہ پوچھتیں آپ کے پاس ٹارچ ہے تو اسے رکھ دیجئے ورنہ کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یقین دہانی پر کھڑکی کھل جاتی اور کوئی نہ کوئی بات چل نکلتی وہ بیٹھے باتیں کرتے سگرٹ پیتے حتیٰ کہ ان کے جانے کا وقت ہو جاتا اور وہ شب بخیر کہہ کر کھڑکی بند کر لیتیں۔

ان ملاقاتوں میں ایلی باتوں میں پیش پیش رہتا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابھی تک وہ جذباتی طور پر گوریوں سے وابستہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جو جی میں آئے کہہ سکتا تھا اس کے دل میں ان سے مزید قرب کی آرزو نہ تھی۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی خواہش نہ تھی کہ ان کو روشنی میں دیکھے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ ایلی ان کی شخصیتوں سے متاثر نہ ہوا تھا۔

وہ ان کی ذہانت' جرأت اور علم پر حیران تھا۔ ان کی باتیں رنگین ہونے کے علاوہ پر معنی ہوتیں۔ ان کی زبان شستہ تھی۔ مذاق لطیف اور خیالات بلند تھے۔

ایلی نے اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ وہ صرف باتوں کی دلدادہ ہیں اور ان ملاقاتوں سے ان کا مقصد محفل آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ رنگین باتیں کرنے اور سننے کی شوقین تھیں اور انہیں بھونڈی باتوں سے نفرت تھی۔

ماہ رمضان کی آمد پر ملاقات کا وقت بدل گیا۔ اب شام کی بجائے وہ سحری کے وقت ملنے لگے۔ رات کے دو بجے کے قریب سفید منزل کے چوبارے میں روشنی چمکتی۔ جسے دیکھ کر دونوں گوریوں سے ملنے کے لئے چل پڑتے۔ اس تبدیلئی اوقات پر جمال چلا اٹھا۔

"یار یہ بہت مشکل کام ہے رات کے دو بجے کون جاگے۔"

چونکہ ناؤ گھر کے رہنے والے سب کے سب امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ بھا کے سوا ان میں سے کوئی روزہ نہ رکھتا تھا اس لئے سحری کے وقت ناؤ گھر میں کوئی نہیں جاگتا تھا۔ بھا نے بھی خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔ شام کے وقت وہ دو انڈے بنوا لیتا جو صبح ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر روزہ رکھ لیتا تھا۔ بھا سے یہ کہنا کہ ہمیں دو بجے جگا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ گھڑی کو دو بجے کا الارم لگانے سے بھی وہ ڈرتے تھے۔ تاکہ گھر والوں کو شک نہ پڑے۔ رات کے دو بجے اپنے آپ جاگنا بہت بڑی مشکل تھی۔

ان دنوں کالج امتحان کی تیاری کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہو چکا تھا اور بی اے کے امتحان

میں صرف ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ان حالات میں گوریوں کے سگنل کو دیکھنے کے لئے لازم تھا
جمال یا ایلی ان میں سے کوئی دو بجے تک جاگے۔ چونکہ جمال جاگنے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے
یہ ذمہ داری ایلی کو اپنے سر لینی پڑی۔ وہ دو بجے تک مطالعہ میں مصروف رہتا اور پھر روشنی
دیکھ کر جمال کو جگاتا اور پھر وہ دونوں مخصوص مقام پر پہنچتے اور وہاں اندھیرے میں اِدھر اُدھر کی
بات چل نکلتی اور ایلی بے تکی ہانکتا۔ گوریاں فقرے چست کرتیں اور ہنستیں لیکن جمال کھڑا
آنکھیں بنا کر گوریوں کی طرف دیکھتا۔ ان جانے میں کھجاتا اور جب ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ
جاتا تو بھکاری کی حیثیت سے سلاخوں کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ "خدا کے لئے خدا کے لئے"
چلاتا اور گوریوں کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے۔

دروازہ

دراصل جمال کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ وہ ان ملاقاتوں اور بے کار کی باتوں سے اکتا چکا تھا۔
اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھنٹوں کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہنے کا مطلب کیا تھا۔ اسی
سے وہ بار بار ایلی کو کہتا رہا۔

"ایلی یار کچھ کرنا چاہئے اگر ہم کسی طرح اس دروازے کو کھول لیں جو باہر گلی میں کھلتا ہے
تو اندر جا سکیں گے۔" ایلی کو یہ تجویز ناپسند نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے بیتاب بھی نہ تھا
درحقیقت دل ہی دل میں ایلی ان لڑکیوں کے قرب سے ڈرتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً اس کا وہ
کمتری تھا جو عورت سے متعلق اس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہو چکا تھا۔ شاید اسی
سے وہ جمال کے اس مطالبے کو ٹالتا رہا۔ لیکن آخر کار اسے جمال کی بات ماننا ہی پڑی۔

ایک روز گوریوں سے ملاقات کے اختتام پر وہ دونوں وہاں رک گئے۔ انہوں نے ٹارچ
کر تالے کی ساخت کو بغور دیکھا اور لیوروں کی تعداد معلوم کی اور بالآخر موم کے ایک گولے
جو وہ جاتے ہوئے ہمراہ لے گئے تھے تالے کے سوراخ کا نقش حاصل کر لیا۔

اس روز وہ دونوں بازار میں تالوں کی دکانوں پر گھومتے رہے اور انجام کار ویسے ہی
تالے خرید کر لے آئے۔ اگلے روز ملاقات کے بعد انہوں نے وہ چاروں چابیاں اس پر
آزمائیں خوش نصیبی سے ایک چابی لگ گئی اور تالہ کھل گیا۔ انہوں نے کنڈی کھولی اور
دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔

"اب کیا ہو گا۔" جمال کہنے لگا۔ "ساری محنت اکارت گئی۔ اگر ہم نے تالہ کھول بھی لیا

وہ اندر سے چٹخنی نہیں کھولیں گی۔"

"جلدی نہ کرو۔" ایلی نے جواب دیا۔ "یہ بات مجھ پر چھوڑو۔"

"یار کچھ کرو۔" جمال نے منتیں کرنا شروع کر دیں۔ "ایسی چالاکی کرو کہ بات بن جائے۔"

اگلی رات وہ دو بجے سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے انہوں نے تالہ اور کنڈی کھول دی۔
پھر وہ گوریوں کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایلی نے اچھی طرح جمال کو تاکید کر دی
کہ دروازہ کھولنے کے بارے میں گوریوں کا انتظار نہ کرے۔ جب وہ دونوں کھڑکی میں آئیں تو
ایلی نے حسب معمول اِدھر اُدھر کی بات چھیڑ دی اور دیر تک وہ یوں باتوں میں محو رہا جیسے
دروازے کی تفصیل بھول چکا ہو۔ پھر دفعتاً" وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

"ہائیں آپ بیٹھ کیوں گئے۔" وہ بولی۔

"ہوا لگتی ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہوا تو بلکہ اچھی لگتی ہے۔" وہ بولی۔

"اسے کل سے بخار آتا ہے۔" جمال نے کہا۔

"ارے۔" وہ بولی۔ "تو آپ نے بتایا کیوں نہیں۔"

"بتا دیتا تو کیا کرتیں آپ کیا دروازہ کھول کر اندر بلا لیتیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" وہ ہنسی۔

"جبھی تو بتایا نہیں۔ ڈر تھا کہ مجھے اندر نہ بلا لو۔"

"اگر باہر تالہ نہ پڑا ہوتا تو میں ابھی آپ کو اندر لے آتی۔"

ایلی نے قہقہہ لگایا۔ "آپ میں اتنی جرأت کہاں۔ آپ ———۔"

"کیوں۔" اندر سے آواز آئی۔

"بس۔ قرائن سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ آپ شاید اس خوش فہمی میں ہیں۔" وہ بولا۔ "کہ
آپ لڈو ہیں۔ اور ہم بھوکے جاٹ۔" وہ ہنسنے لگی۔ "بھوکے جاٹ نہیں البتہ بھکاریوں سے
سابقہ ضرور پڑا ہے ہمیں۔"

"تو بھکاریوں سے ڈرتی ہیں آپ۔" ایلی نے قہقہہ لگایا۔

"ہم تو کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔" وہ بولی۔

"تو پھر اندر کی چٹخنی کھول دکھائیے۔" اس گفتگو کے دوران میں جمال تھوکنے کے بہانے گلی
کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن ایلی جگہ پر جما رہا۔

"لو اس میں کیا ہے۔" اندر کوئی بولی اور پھر چٹخنی کھولنے کی آواز سنائی دی لور پیشتر اس کے کہ وہ اسے پھر سے بند کرلیتیں جمال نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔ دروازہ کھلتا دیکھ کر دونوں چیخیں مار کر بھاگیں اور ایک دوسری پر گرتی پڑتی نظر سے غائب ہو گئیں۔ سلاخ دار کھڑکی کے پیچھے وہ جگہ جسے وہ کمرہ سمجھتے تھے درحقیقت زینے کا نچلا حصہ تھا۔

سامنے ایک دروازہ عمارت کے اندر کھلتا تھا۔ دوسری طرف زینہ تھا۔ جس میں کچھ کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی میزیں کرسیاں کھوکھے اور جانے کیا کیا۔ دوسرے کونے میں اندر والے دروازے کے پاس دو پاٹ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہ تھی۔

اگلے روز دروازہ کھولنے کا جھگڑا از سر نو شروع ہو گیا۔ آخر میں وہ جلال میں آگئیں۔

"دیکھئے صاحب۔" ایک بولی۔ "ہمیں دروازہ کھلنے میں کوئی عذر نہیں آپ شوق سے تشریف لائیں لیکن ———۔" ایلی نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اگر اس لیکن کی وضاحت ہمیں اندر بلانے کے بعد کی جائے تو بہتر ہو گا۔"

جب دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئے تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "دیکھئے ممکن ہے آپ ہمارے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ شاید آپ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کو ملاقات کی دعوت دینے سے ہمارا کچھ مقصد ہے۔ یہ خوش فہمیاں دل سے نکال دیجیے تو بہتر ہو گا اور اگر آپ نے کوئی نامناسب حرکت کی تو ہمیں بے حد دکھ ہو گا۔"

"ذرا پیچھے ہٹ جایئے محترمہ مجھے بو آتی ہے۔" ایلی نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

"بو۔" وہ بولی۔ "نہیں یہ پاٹ تو خالی پڑے ہیں۔"

"نہیں پاٹ والی بو نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن ہم نے کوئی خوشبو تو لگائی ہوئی نہیں۔"

"لگائی ہو یا نہ بہر صورت آتی ہے۔" ایلی نے کہا۔ "آپ کی ساری قوم سے آتی ہے۔"

"بڑے بدتمیز ہیں آپ۔" وہ ہنسی

"یہ تو ٹھیک ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔ "الٹا مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ باتمیز ہیں۔"

عین اس وقت جمال نے دیا سلائی سے موم بتی جلائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور پھر اسے کمرے کے پرلے کونے میں رکھدیا۔

"ارے۔" وہ چلائیں۔ لیکن جلد ہی سنبھل گئیں۔

"تو آپ شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہیں ——— " کچھ دیر تک وہ خاموش رہی پھر ایک بولی۔

"کیوں پسند ہے آپ کو۔"

اس کے انداز میں اتنی طنز تھی کہ ایلی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ لیکن جمال ہنسے جا رہا تھا۔

"دونوں بالکل پسند نہیں۔" ایلی بولا۔ "معصوم اور پاکیزہ چٹ کپڑیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ ان سے کہیں بہتر ہیں جو آنکھیں مٹکاتی ہیں لجاتی ہیں شرماتی ہیں اور کولھے ——— "

"کیا مطلب ہے آپ کا۔" وہ بولی۔

"مطلب یہ ہے محترمہ کہ کم از کم مجھے باہر نکال دیا جائے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ اندر میری پوزیشن باہر کی نسبت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن یہاں آ کر تو اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ صورت حال خطرناک ہو گئی ہے۔"

"تو خود ہی باہر نکل جایئے۔" وہ جلال میں بولی۔

"خود نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا۔" کہہ کر وہ آگے بڑھی۔

"نہیں نہیں نہیں۔" ایلی نے شور مچا دیا۔ "خدا کے لئے مجھے چھونا نہیں میرا دل پہلے ہی کمزور ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "آپ بھی عجیب ہیں۔ لیکن آپ انہیں تو بات کرنے دیتے ہی نہیں آپ ان کی بات کیجئے نا۔" اس نے جمال کو مخاطب کر کے کہا۔

"جان من میں تو ——— " جمال نے آگے بڑھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"وہیں سے بات کیجئے۔" وہ بولی اور خود پیچھے ہٹ گئی۔

چھوٹی بڑی

اس روز روشنی میں ایلی نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا۔ شکل و صورت طبیعت اور انداز میں دونوں ایک دوسری سے مختلف تھیں بڑی کا چہرہ کتابی تھا نقوش ستواں تھے۔ جسم دبلا پتلا موٹی موٹی نیلی آنکھوں میں غم کی جھلک ہونٹ پتلے اور یوں بھینچے ہوئے تھے جیسے کراہ دبائے ہوئے ہو۔ چھوٹی کا چہرا جسم اور زندگی سے بھرپور تھا اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ ہونٹ یوں کھلے ہوئے جیسے کوئی لطیفہ سن کے بیٹھی ہو۔ بڑی خاموش تھی نہ تو وہ کھیل کی متمنی تھی نہ اس میں کھیلنے کی صلاحیت تھی چھوٹی میں جلال اور جمال کی عجیب آمیزش تھی دفعتاً ——— ہنستے ہنستے

وہ سنجیدگی اختیار کرلیتی اور پھر جلد ہی آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ ان دونوں کے لباس بظاہر سنگار سے عاری تھیں۔

"آپ بیٹھ کیوں گئے۔" چھوٹی نے کہا۔ "اٹھ کر کوئی بات کیجئے نا۔"

"اونہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "اب جمال کی باری ہے۔"

"انہیں تو صرف ایک بات آتی ہے۔" چھوٹی نے کہا۔

"وہ بھی سن لیجئے کیا حرج ہے۔ جب تک میری باچھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"باچھیں ٹھیک ہونے کا مطلب؟"

"محترمہ۔" وہ بولا۔ "بول بول کر میری باچھیں دکھنے لگی ہیں۔"

"ارے۔" وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

"میں گاؤں کا رہنے والا ہوں محترمہ۔" وہ بولا۔ "ہم تو کبھی کبھار عید شب برات کو بولتے ہیں۔ یا جب کبھی غصہ آ جائے۔ آپ سی اہل زبان کو ملنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا کبھی۔"

از راہ مذاق وہ پنجابی میں کہنے لگا۔

"ہن مینوں ساہ لے لین دیو۔"

"لے لو جی ساہ ڈھڈ بھر کے۔" وہ ٹھیٹھ پنجابی میں بولتے ہوئے ہنسی۔

"ارے۔" ایلی اٹھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "پنجابی؟"

"ٹھیٹھ —— پنجابی۔" وہ بولی

"پنجابی فارسی اردو انگریزی —— یا اللہ۔" ایلی مسخروں کی طرح منہ بنا کر چلایا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔" دفعتاً وہ غصے میں چلائی۔ "جمال صاحب ایسی فضول حرکت نہ کیجئے۔"

"میری جان۔" جمال بولا۔ "میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔"

"چلو باجی چلیں۔" اس نے بڑی بہن سے کہا۔ "چلو۔"

"خدا کے لئے۔" جمال چلایا۔ "میں تباہ ہو جاؤں گا ——۔" اور پھر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

"ارے۔" ایلی اس کی طرف لپکا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"دیکھیئے۔" چھوٹی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ "جب یہ ہوش میں آ جائیں تو انہیں یہاں سے اٹھا کر لے جایئے گا۔ خدا حافظ۔"

واپس جاتے ہوئے ایلی نے جمال سے کہا۔ "یہ کیا کیا تم نے۔ سارا کیا کرایا تباہ کر دیا۔"

جمال قہقہہ مار کر ہنسا۔ "یار ایلی یہ لڑکیاں یونہی کیا کرتی ہیں۔ تمہیں کیا خبر۔"

"نہیں یار۔" ایلی نے چڑ کر کہا۔ "وہ ایسی باتیں پسند نہیں کرتیں۔"

"وہ یہی ظاہر کیا کرتی ہیں۔" جمال نے پہلی مرتبہ ایلی کے خیال سے اتفاق نہ کیا۔ "تم اس کو نہیں سمجھتے۔ دو ایک بار احتجاج کریں گی پھر۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔

ایلی کو غصہ آ رہا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔

"تمہاری مرضی۔" وہ بولا۔ "آخر یہ ساری رچنا تمہاری ہی رچائی ہوئی ہے۔"

"بس تو۔" جمال بولا۔ "اس معاملے میں تم دخل نہ دو۔ بس دیکھتے جاؤ۔"

تین دن گزر گئے نہ تو گوریوں نے خط لکھا اور نہ انہوں نے رات کے وقت انہیں بلایا۔ جمال گھبرا گیا اور اس نے از سرِ نو برساتی سے انہیں دیوانہ وار اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ جمال کو دیکھ کر وہ ہنستے جاتیں اور جب وہ رات کی ملاقات کے لئے اشارہ کرتا تو نفی میں سر ہلا دیتیں۔

تیسرے روز ان کا ایک لمبا چوڑا خط موصول ہوا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ جب تک آپ یقین نہ دلائیں گے کہ بھونڈی اور قبیح حرکات کے مرتکب نہ ہوں گے ملاقات نہیں ہو گی۔ آپ کے دوست آ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ہمیں یقین دلائیں کہ وہ آپ کو ساتھ نہیں لائیں گے۔"

"ایلی۔" جمال نیم چھتی میں بیٹھ کر کہنے لگا۔ "یار تم مجھے چھپا کر ساتھ لے چلو میں صرف ایک بار ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"انہیں یقین کیوں نہیں دلا دیتے کہ تم ایسی حرکت نہ کرو گے۔"

"ایسی حرکت نہ کرنی ہو تو پھر راتوں کی نیند حرام کرنے کا فائدہ۔" وہ بولا۔

وہ دونوں اس موضوع پر سارا دن بحث کرتے رہے۔ جمال چاہتا تھا کہ ایلی اکیلا آنے کا وعدہ کر کے ساتھ اسے لے جائے۔ لیکن ایلی کو یہ بات منظور نہ تھی۔ آخر جمال کو ایلی کی بات ماننا پڑی اور انہوں نے ایک مختصر خط میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو گی جو انہیں ناپسند ہو۔

اس روز پہلی مرتبہ ایلی کا جی چاہا کہ وہ اپنی طرف سے بھی ایک رقعہ لکھے۔ نہ جانے کیوں

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ کہے۔ ایسی بات کہے جو تاروں کو چھیڑ دے ایسی بات جو ہلکی ہلکی
رہی ہو اور سبھی کچھ کہہ دے۔ اسے اس بات کا شعور نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہتا ہے
ایلی نے پہلی مرتبہ یہ خواہش محسوس کی کہ وہ جمال کو نہ بتائے بلکہ چپکے سے رقعہ لکھ
دے اور جمال کو علم بھی نہ ہو۔ چونکہ شعوری طور پر اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا اس لئے اس
نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ یہ تو محض چھیڑ چھاڑ ہے۔ لیکن دراصل اس
چھیڑ چھاڑ کے بہانے وہ اس محفل میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کر رہا تھا۔ اور جان بوجھ کر
بات کرتا تھا۔ ایسا انداز اپناتا تھا۔ جس سے جمال اور ایلی کا فرق نمایاں ہو۔ دونوں کا موازنہ ہو
جائے۔ ایلی نے کبھی اپنے آپ کو اس سلسلے میں مورد الزام نہ ٹھہرایا تھا نہ ہی اس نے محسوس کیا کہ
وہ چالاکی سے اپنے دوست کو بھونڈی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ اس کی ایسی حرکات اور
باتوں کا مقصد کیا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ شاید وہ گوریوں سے انتقام لے رہا تھا جنہوں
نے اس پر ناقابل التفات کا لیبل لگایا تھا۔ جو تمسخر سے اس پر ہنستی رہی تھیں یا شاید اس کی
وجہ ہو کہ ان کی رنگین باتیں سن کر ان کی خود داری اور ذہنی عظمت کو محسوس کر کے وہ
ان سے محبت کرنے لگا تھا۔

جب جمال خط نقل کر کے چوبارے میں چلا گیا تو ایلی اپنا رقعہ لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس
نے چار ایک سطور لکھیں۔ لیکن دوبارہ پڑھنے پر اس نے محسوس کیا کہ وہ سطور بے معنی تھیں۔
اس نے وہ ورق پھاڑ دیا اور پھر سے لکھنے لگا۔ لیکن سات آٹھ الفاظ لکھنے کے بعد اس نے
پھر محسوس کیا کہ مضمون تاثر سے خالی ہے۔

گھڑی نے ایک بجا دیا اور ابھی وہ اپنا رقعہ مکمل نہ کر پایا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب ایلی کے
لئے انہیں خط لکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ انہیں سوچے سمجھے بغیر بیسیوں خط لکھ چکا تھا۔
خطوں پر اسے سوچنا ضرور پڑتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی لکھے ہوئے خط کو پھاڑا نہ تھا۔ کبھی محسوس
نہ کیا تھا کہ خط کا مضمون تاثر سے خالی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلا دن تھا جب
ایلی گوریوں سے لگاؤ محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے اس لگاؤ کا شعوری احساس نہ تھا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ایلی نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی وہ کہنا چاہتا ہے اسے لفظوں میں
نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس نے صرف ایک سطر لکھ کر ایک چھوٹا سا پرزہ جمال کے خط میں رکھ
دیا۔ لکھا تھا۔

"اب نہ ملئے محترمہ! اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔ جب سے آپ سے ملاقات ہوئی

دعا مانگتا ہوں کہ ملاقات کا سلسلہ مسدود ہو جائے ورنہ ———— "
چلا ہی گیا۔ ایلی کا وہ رقعہ رنگ لایا اگلے روز دوران ملاقات جب ایلی نے کہا۔ "اللہ کرے اب کی بار
ذرا سی بات پر ناراض ہو جاؤ کہ ملاقاتوں کا امکان ہی ختم ہو جائے۔"
"کیوں؟" بڑی نے پوچھا۔ "آپ کو کیا تکلیف ہے؟"
"بڑی تکلیف ہے۔" ایلی نے کہا۔ "کتنے سادہ لوح ہیں ہم کہ آگ سے کھیلنے کے لئے گھر
سے چل کر آتے ہیں۔"
"کہاں ہے آگ؟" چھوٹی ہنسی۔
"اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔" ایلی نے کہا۔ "اور ———— "
عین اس وقت ایلی نے اپنے ہاتھ پر نرم سا دباؤ محسوس کیا۔
ایلی سمجھتا تھا کہ اس دباؤ کا مطلب اسے خاموش کرنا ہے، لیکن نہ جانے اسی دباؤ کی وجہ سے
یا اس خاموش یقین دہانی کی وجہ سے جو اس دباؤ میں پنہاں تھی۔
یا اس کو اپنانے کے جذبہ کی وجہ سے جو اس دباؤ سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایلی جوش میں آ گیا۔
"یہ کس نے مجھے چھیڑا۔ کون چھیڑ رہا ہے مجھے؟" اس نے دہائی مچا دی۔
"کون چھیڑ رہا ہے بھئی۔ مت چھیڑو نا نہیں؟" چھوٹی ہنس کر بولی۔ ساتھ ہی ایلی نے دباؤ پھر
محسوس کیا۔
دفعتاً اس نے بات کا رخ بدلا۔ "ساز نہ چھیڑو۔" وہ بولا۔ "مجھ میں تو پہلے سے ہی نغمے
بے قرار ہیں۔ مجھے کوئی نہ چھیڑے۔"
"اچھا۔" بڑی بولی۔ "بڑا زعم ہے آپ کو اپنے آپ پر۔"
"زعم تو نہیں، اگر میں گر کر بے ہوش ہو گیا تو پھر ہوش میں نہ آؤں گا اور لاش ———— "
اندھیرے میں کسی نے ایلی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
ایلی پر ایک نشہ سا طاری ہو گیا اور وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔
دیر تک کمرے پر خاموشی طاری رہی۔ جمال ادھر دوسرے کونے میں باجی کے پاس چپ
چاپ کھڑا تھا ایلی کے قریب چھوٹی کھڑی تھی۔
"کیا یہ خاموش کیوں ہو گئے؟" بڑی نے چھوٹی سے پوچھا۔
"پتہ نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہر مظلوم آدمی پہلے چلاتا ہے پھر خاموش ہو جاتا ہے۔" ایلی نے کہا۔ ہلکی سی ہنسی
آئی پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایلی کے سر پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے قریب ہی سلیپروں میں نیم چھپے دو پاؤں دھرے
ہیں۔ وہ جھک کر پاؤں دیکھنے لگا۔ اس نے پاؤں کو چھوا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپا چلائی۔

"مجھے خزانہ مل گیا ہے اسے کھود کر نکال رہا ہوں۔" وہ بولا۔

وہ ہنسی۔ "یہ زمین پر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟" وہ بولی۔ "آپ تو سراسر جاٹ ہیں۔"

ایلی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا بلکہ پاؤں سلیپر سے نکال کر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میرا پیر تو چھوڑیے۔" آپا چلائی۔

"اوہ —— میں سمجھا میرا پاؤں ہے۔" وہ بولا

آپ کی زبان قابل قطع ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ٹھیک ہے رنگ روپ اللہ نے نہیں دیا۔ رہی سہی ایک زبان ہے وہ آپ کاٹ لیجیے۔

وہ ہنسی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

"آج جمال صاحب نے اپنی بات نہیں دہرائی۔" آپا نے کہا۔

"دہرا رہے ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"دہرا رہے ہیں مگر منہ زبانی نہیں آج انہیں اپنا مقام مل گیا ہے۔"

آپا قہقہہ مار کر ہنسی۔ "ابھی تو انڈر کانفیڈریشن ہوں۔"

اس روز کمرے کی خاموشی بے حد متکلم تھی۔ اس خاموشی میں نہ جانے کیا کیا ہو رہا تھا
کوئی ہاتھ ایلی کے بالوں کو تھپک رہا تھا۔ منہ کو سہلا رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر عجیب
سی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کسی
کے ہاتھ کا جھنجھنا ہو اور اس اضطراب سے نجات پانے کے لئے جی چاہتا تھا کہ دروازہ کھول کر باہر
نکل جائے اور جاتے ہوئے کہے۔ "محترمہ ظلم کی حد ہوتی ہے۔"

اس روز جب وہ ناؤ گھر لوٹ رہا تھا تو پہلی مرتبہ اس کے دل میں کچھ ہو رہا تھا۔ اس روز
پہلی مرتبہ وہ بے تعلق فاتح کی حیثیت سے نہیں لوٹ رہا تھا۔ بلکہ جیسے اس کا کچھ حصہ وہیں

پیچھے میں رہ گیا ہو۔ دل میں کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ دل کے تاروں کو کوئی چٹا سفید گدگدا ہاتھ چھیڑ
رہا تھا اور جسم کے تار بج رہے تھے۔ اس روز اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اسے جمال کے برتاؤ کی
تفصیل پر بحث کرنا ہے۔ جیسے واپسی پر وہ روز کیا کرتے تھے۔ بلکہ اس روز وہ محسوس کر رہا
تھا جیسے وہ ٹھگا گیا ہو۔ جب جمال نے بات چھیڑی تو ایلی تو وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اس کھیل کا ہیرو
جمال ہے اور اس کی اپنی حیثیت کوئی نہیں۔

"یار میں تو بھولا ہی رہا۔" جمال نے ایلی کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ہوں ——" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"بڑی والی تو بہت ہی اچھی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے ہاں باجی؟ اور وہ آپا وہ تو ظالم کچھ کرنے
ہی نہیں دیتی تھی اور میں بھی ایسا بیوقوف ہوں کہ میں نے کبھی باجی کی طرف توجہ ہی نہیں کی
تھی۔"

"ہوں۔" ایلی اپنے خیال میں مگن تھا۔

"وہ اتنی تیز نہیں اور وہ چھوٹی آپا تو پولیس کی افسر معلوم ہوتی ہے!"

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔" جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"کہا تھا نا میرے بارے میں کہ آج اسے اپنا مقام مل گیا ہے۔ یار تم بات دیکھے بغیر بھانپ
لیتے ہو۔"

"میں نے تو ویسے ہی بکواس کی تھی۔"

"لیکن یار۔" جمال بولا۔ "خدا کے لئے وہاں ایسی بات نہ کیا کرو۔"

"کیوں؟"

"تمہاری بات سن کر وہ پیچھے ہٹ گئی اور پھر دیر تک ——" وہ ہنسنے لگا۔

"تو مبارک ہو۔" ایلی نے کہا۔ "تمہاری بات بن گئی نا؟"

"بات تو نہیں بنی۔" وہ بولا۔ "یار یہ دونوں عجیب لڑکیاں ہیں کسی کو قریب آنے نہیں
دیتیں۔ میں نے ایسی لڑکیاں آج تک نہیں دیکھیں۔"

"کیسی دیکھی ہیں؟" ایلی نے بے توجہی سے پوچھا۔

جمال نے قہقہہ مار کر ایک بھرپور ہاتھ ایلی کے شانے پر مارا۔ "یار لڑکیاں تو [illegible]
ہیں جھینپتی بھی ہیں، لجاتی بھی ہیں، نہ نہ بھی کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی چمٹی بھی جاتی ہیں"
قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"اچھا!" ایلی بولا۔ "ہمیں بھی پتہ بتاؤ کسی ایسی لڑکی کا۔"

"مذاق نہ کرو یار۔" جمال بولا۔ "یہ باجی بھی خاموش لڑکی ہے اور نہ نہ کرتے ہوئے
بہت کچھ برداشت کر لیتی ہے۔"

"تو یار۔" ایلی نے نہ جانے کس خیال سے کہا۔ "کل ہم اپنی اپنی جگہ بدل نہ لیں۔"

"نہ نہ نہ۔" وہ شور مچانے لگا۔ "آپا تو مجھے ڈانٹے گی۔"

"مجھے تو نہیں ڈانٹتی۔" ایلی نے کہا۔

"تمہاری بات اور ہے۔" وہ بولا۔

"وہ کیسے؟"

جمال ہنسنے لگا۔ "برا نہ ماننا۔ تمہیں دونوں ہی پسند نہیں کرتیں اس لئے۔"

"چلو یہ بھی اچھا ہے۔" ایلی بولا۔ "جان بچی لاکھوں پائے۔"

یہ باتیں ایلی شاید اس لئے کر رہا تھا کہ وہ بات کو راز بنا کر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کا
راز بنانا بذات خود اس بات کا شاہد تھا کہ وہ آپا سے تعلق محسوس کرنے لگا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ
جمال کے روبرو کوئی ایسی بات کرے جس سے آپا پر حرف آئے۔

اس روز ایلی سارا دن مضطرب رہا۔ وہ پہلا دن تھا جب اس نے اس کھیل کو اہمیت دی
تھی۔ ان کیفیات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اس نے سفید منزل کے زینے میں محسوس کی
تھیں۔ اس روز وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔

شام کو جب وہ دونوں نیم چھتی میں بیٹھے تھے تو نیچے سے بھا آیا۔ "یہ تمہارا تار ہے" بھا
نے تار جمال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بیوی بیمار ہے تمہیں بلایا ہے۔" لیکن یار۔ بھا
نے حیرت سے کہا۔ "تم شادی شدہ ہو جمال یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا؟"

"کئی لوگوں کو اب تک معلوم نہیں۔" ایلی نے بامعنی انداز سے کہا۔

جمال تار پڑھ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے کی حالت بدل گئی۔ "یار مجھے جانا ہوگا ابھی۔ بھا
کوئی گاڑی جاتی ہے اس وقت؟"

"لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بیماری عام سی معلوم ہوتی ہے۔"

"نہیں یار۔" جمال بولا۔ "مجھے اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے۔" اس کی آنکھیں پرنم
تھیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر پہلی مرتبہ جمال کو خیال آیا کہنے لگا۔ "یار ایلی تم تو شاید اب ان سے ملنے
جاؤ گے۔ لیکن ایک مرتبہ تو جانا ہی پڑے گا ضرور جانا کہیں ان سے یہ نہ کہہ دینا یار کہ بیوی
بیمار ہے بلکہ کہنا والدہ کی بیماری کا تار آیا تھا یار انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔"

ہولڈاپ

رات کو جب گوریوں نے دیکھا کہ ایلی اکیلا ہی آیا ہے تو باجی بولی۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"اسے گاؤں جانا پڑا" ایلی نے انہیں تار کے متعلق بتایا۔ پھر وہ باتوں میں مصروف ہو گئے
دونوں اس کے دائیں بائیں آ کھڑی ہوئیں۔

"یہ بات تو غلط ہے۔" اس نے شور مچا دیا۔ "آپ دو اور میں اکیلا۔" دونوں نے اس کے
شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"ہاتھ لگانا فاؤل ہے۔" وہ چیخنے لگا۔ پھر اسے دفعتاً سوجھی "دیکھیئے جی۔" وہ بولا۔ "شاید
آپ نے میرے متعلق کوئی خوش فہمی پال رکھی ہو۔ شاید آپ سمجھے بیٹھی ہوں کہ ملاقات سے
میرا کوئی خاص مقصد ہے مہربانی سے یہ خیال دل سے نکال دیں۔"

"انتقام لینے میں تو آپ کا جواب نہیں۔" آپا ہنسنے لگی۔

"نہیں نہیں انتقام کی بات نہیں۔ ابھی کل کی مصیبت سر سے نہیں ٹلی۔"

"کل کی مصیبت کیا۔" انہوں نے پوچھا۔

"کل رات کسی کی لاپرواہی سے ایک خوشبودار رنگین ہاتھ میرے چہرے سے چھو گیا تھا یا
شاید کسی نے شرارت کی ہو۔ ایمان سے ابھی تک جھنجھنا رہا ہوا ہوں۔ اصل میں میرا دل بہت
کمزور ہے اور محترمہ شاید آپ کو معلوم نہیں میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ زمین
پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ؟" وہ چلائیں۔ "زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اس طرح۔"

"آپ نے بندوقیں جو اٹھا رکھی ہیں [illegible] تو [illegible] میں رہتا ہوں۔"

"بندوقیں۔ کون سی بندوقیں۔" بڑی نے پوچھا۔

"جو آپ نے بغلوں میں دبا رکھی ——" ایلی رک گیا۔

"چپ چپ۔" چھوٹی چلائی۔ "آپ بھی غضب کرتے ہیں۔"

"لیکن ——" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

اندھیرے میں پھر وہی ہاتھ اس کے منہ پر آ ٹکا۔

"جھن جھن جھن جھن۔" وہ شور مچانے لگا۔

"کیا ہوا؟" باجی نے پوچھا۔ آپا نے چپکے سے ہاتھ اٹھا لیا۔

جھنجھنا بن گیا ہوں۔ مجھے بچایئے۔ خدا کے لئے مجھے کوئی بچائے۔"

دیر تک وہ ہنستی رہیں۔ پھر کسی نے چپکے سے اسے چٹکی بھری۔

"تمہارے گھر میں آیا ہوں جو جی میں آئے کر لیجئے اور پھر آج ہی کا تو دن ہے۔"

"کیوں؟" آپا بولی۔

"میں تو صرف یہ پیغام دینے آیا تھا کہ جمال نہیں آسکے گا کچھ روز کے لئے۔"

"لیکن آپ تو آئیں گے نا؟" چھوٹی نے پوچھا۔

"آنے کا مطلب؟" ایلی نے کہا۔

"تو کیا آنے کا کوئی مطلب نہیں؟" آپا بولی۔

آپا نے چٹکی بھری اور بولی۔ "آپ ہی بتایئے۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری حیثیت کھانے میں نمک کی سی ہے۔ کھانا نہ ہو تو خالی نمک پھانکنا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئیں۔ "اب آپ سے کون بحث کرے لیکن آنا پڑے گا روز آنا پڑے گا سمجھے آپ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"ورنہ کیا بتایا نہیں جاتا عمل میں لایا جاتا ہے۔" آپا ہنسی۔

اس وقت اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے بڑا سا برتن دیوار سے دے مارا ہو۔

"یہ کیا تھا باجی؟" آپا نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" باجی نے کہا۔ "میں دیکھتی ہوں ابھی آئی۔" کہہ کر وہ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

ایلی باہر کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ باہر تو کوئی نہیں۔

دفعتاً آپا نے پیچھے سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ارے۔" ایلی چلایا۔

"خاموش کھڑے رہیئے۔" آپا ہنس کر بولی۔

"لیکن یہ کیا ہے۔" ایلی نے بھولے بن کر کہا۔

"کچھ نہیں صرف آپ کو آنے کا مطلب سمجھا رہی ہوں۔"

"لیکن میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔" ایلی نے کہا۔

"یہ اور بھی اچھا ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے تو ایسے معلوم ہو رہا ہے جیسے اپنا ہولڈ اپ ہو گیا ہو۔ لیکن میری کمر میں دو پستول کی نالیاں رکھنے کا مطلب؟"

"خاموش۔" وہ ہنستے ہوئی بولی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایلی کے منہ پر رکھ دیئے۔

دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

پھر سیڑھیوں سے باجی کی آواز سنائی دی۔ "آپا جلدی آؤ۔ جلدی!"

اس نے ایلی کو زور سے بھینچا۔

"کل ضرور آیئے گا۔" وہ بولی۔ "ضرور۔"

"اور اگر نہ آؤں تو؟" ایلی نے کہا۔

"کیسے نہ آئیں گے آپ۔" وہ بولی۔ "نہ آئے تو میں خود ناؤ گھر آؤں گی۔"

"اتنی جرات۔" ایلی نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ۔" وہ بولی۔ آپ نے سمجھا کیا ہے؟"

"میں تو صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک خوبصورت شوخ رنگین اور دست دراز لڑکی ——"

"دست دراز۔ اچھا تو یہ لیجئے۔" اس نے پیار سے ایلی کے منہ پر چپت ماری۔ "ضرور آیئے" اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ایلی نے لپک کر اس کا دوپٹہ کھینچ لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ بولی۔

"بدتمیزی نہیں ضرورت ہے میں اس کے رومال بنواؤں گا۔"

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "تو بنوا لیجئے۔" اور سیڑھیوں میں گم ہو گئی۔

سارا دن ایلی سوچتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رومان کا کھیل جو تفریحاً شروع ہوا

تھا۔ یکدم کیسی کروٹ لے گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھیں وہ تو ان کے نام
سے بھی واقف نہ تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ان سے پوچھا تھا۔

"اپنا نام تو بتا دیجئے۔" اور جواب میں انہوں نے کہا تھا۔

"نام سے کیا فرق پڑتا ہے' جی کچھ سمجھ لو۔"

صرف یہ سمجھا ہوں کہ تم میں ایک ہاں جی ہے اور ایک نہ جی اب یہ تم خود فیصلہ کر لو کہ
ہاں جی کون ہے اور نہ جی کون۔"

سارا دن وہ سوچتا رہا تھا کہ اس ڈرامے میں جو سفید منزل کے زینے میں کھیلا جا رہا تھا اس کا
کردار کیا تھا۔ وہ ان گوریوں کے کردار کا معترف تھا ان کی جرأت ان کی علمیت اور رنگینی ان
کے ادبی ذوق پر متعجب تھا لیکن ——— ؟

ایلی اس لیکن کا جواب نہ دے سکتا تھا۔

نیم چھتی میں لیٹے ہوئے اس طرف کھڑکی میں سے چھوٹی جھانکتی۔ "لیجئے میں آ گئی ہوں گھر
میں آ گئی۔ آپ سے ملنے کے لئے نہیں ویسے ہی۔" اس کے چہرے سے عجیب سی مسرت تازگی
اور زندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ "اٹھیئے اٹھیئے آپ اداس کیوں ہیں؟ یوں لیٹے ہوئے ہیں۔ جیسے سب
کچھ ہار کر آئے ہوں۔ آپ نے کچھ بھی نہیں ہارا۔ جنہوں نے ہارا ہے ان سے پوچھئے۔"

اس طرف زینے میں شہزاد آ کھڑی ہوئی۔ اب کا چہرہ مغموم تھا۔ میں جانتی تھی۔ یہی انجام
ہو گا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ہماری کہانی ہی ایسی تھی۔ جس کا انجام نہیں ہو سکتا چلو اچھا ہوا
تمہیں مناسب ساتھ مل گیا۔"

ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور پھر سوچ میں پڑ جاتا۔

گھڑی نے نو بجائے تو وہ چونکا اور پھر سوچے سمجھے بغیر اس نے پہلی بار محبت بھرا خط لکھا اور
اسے پڑھتے وقت پہلی مرتبہ شدت سے محسوس کیا کہ اس کے دل میں کس قدر جذبات ابل
رہے تھے۔ خط لکھ کر اس نے اس کا گولہ سا بنا کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر لیٹ گیا۔

اس رات جب وہ سفید منزل میں داخل ہوا تو اکیلی چھوٹی موجود تھی۔

"تم اکیلی ہو کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ باجی کی طبیعت اچھی نہیں۔"

نہ جانے کیوں یہ سن کر ایلی گھبرا گیا۔

"کیوں آپ ڈرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "تم نہیں جانتی کہ میں تم سے کتنا ڈرتا ہوں۔ میں تمہارے حسن
سے نہیں ڈرتا تمہارے جسم سے نہیں ڈرتا۔" ایلی کی آواز بھرا گئی۔ "میں تمہاری نگاہ کرم سے
ڈرتا ہوں' میں تمہاری رنگینی سے ڈرتا ہوں میں تمہاری جرأت سے ڈرتا ہوں۔"

"آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "سچی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہم سچ سے اس قدر بیگانہ ہو چکے
ہیں۔"

"چھوڑئیے ان فلسفوں کو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "کوئی ہنسی خوشی کی بات کیجئے۔"

"آج مجھے سچی باتیں کہہ لینے دو پھر شاید کبھی موقعہ نہ ملے۔" ایلی کے انداز میں اس قدر
تاثر تھا کہ وہ خاموش بت بنے کھڑی رہی۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں مسخرا ہوں۔" وہ بولا۔ "مسخراپن تو خفت مٹانے کے لئے تھا۔ میرے
بال سنہرے نہیں نا اس لئے۔ میرا رنگ ——— "

"خاموش ہو جائیے۔" وہ چیخ کر بولی۔ "خاموشی ورنہ میں منہ پر ہاتھ رکھ دوں گی۔"

"منہ پر ہاتھ رکھنے سے دل کی بات تو نہیں کٹتی۔" ایلی نے کہا۔

"ہم نہیں سنتے آپ کے دل کی بات۔" وہ بولی۔

ایلی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔

"اچھا نہ سنو۔"

دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

"کوئی بات کیجئے نا۔" وہ چلائی۔

"کر تو رہا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"کہاں آپ تو خاموش کھڑے ہیں۔" وہ بولی۔

"یہ خاموشی بھی تو اک اظہار ہے۔" وہ بولا۔ "میرا منہ بند کر دو گی تو میرے ہاتھ بولیں
گے۔"

"یہ تو ساکت پڑے ہیں۔" اس نے ایلی کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"یہ اپنے ہاتھ اٹھا لو۔" وہ بولا۔

"کیوں؟۔"

"یہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور پھر سارا دن گھر بیٹھے ہوئے مجھے ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔"

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ چلائی اس کی آواز میں بلا کا اضطراب تھا۔ "تم کو گی تم پر بھی ایک ہی دن سوار ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ چلائی۔

"جیسے سنہرے بالوں کے بارے میں کہتی تھی۔" ایلی نے کہا۔ "مجھ کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کرو نا۔"

"نہیں تو۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "آپ تو بڑے ہی اچھے ہیں۔ جمال صاحب کی بات اور ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" ایلی نے طنز بھرا تیر چلایا۔

"ہائے اللہ کیا آپ مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔ جمال تو یہ سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم لولٹ ہوں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "اور وہ سوچتے ہیں کہ کس طرح منہ میں ڈال لوں۔ سگرٹ پئیں گے آپ۔" غالباً" وہ بات بدلنے کے لئے کہنے لگی۔

سلگا سگریٹ

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "پیوں گا بشرطیکہ تم سلگا کر دو۔"

"یہ کیا ضد ہے۔ آپ ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں۔"

"ضد تو نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "درخواست ہے۔"

"یہ کبھی ہو سکتا ہے کیا؟ "

"کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ بولا۔

"بہت زعم ہے آپ کو۔"

"جی ہے۔"

"تو پی کر دکھایئے وہ سگریٹ جو میں نے سلگایا ہو۔" وہ ہنسنے لگی۔

"مجھ سے ضد نہ کیجئے۔ میں بہت ضدی ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھیں۔" وہ بولی۔

"اچھا" وہ بیٹھ گیا۔ "اب یہاں سے اس وقت اٹھوں گا۔ جب آپ کا سلگایا ہوا سگرٹ میرے ہاتھ میں ہو گا۔"

"چلئے یونہی سہی۔" وہ جوش میں آ گئی۔ "تو لیجئے میں چلی خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ "اب بھی مان جاؤ ضد چھوڑ دو۔" وہ سیڑھیوں سے بولی۔

"سگرٹ سلگا دیجئے۔" ایلی نے کہا۔

کچھ دیر تک اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

پہلے تو اسے امید تھی کہ وہ ابھی لوٹ آئے گی۔ آخر وہ ان کے مکان میں بیٹھا تھا اور اس کا تحفظ ان کے ذمہ داری تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے دل میں شکوک پیدا ہونا شروع ہو گئے اگر وہ نہ آئی تو ——— اگر کوئی پاٹ استعمال کرنے کے لئے اس کمرے میں آ گیا تو ———

ایلی بنیادی طور پر بے حد ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ لیکن کبھی اس کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے تھے۔ جب وہ نتائج سے لاپروا ہو کر اسی حد تک نڈر ہو جاتا تھا' جس حد تک بنیادی طور پر وہ ڈرپوک تھا۔

کچھ دیر تک وہ بے حد متذبذب رہا پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس روز وہ اپنی بات منوانے میں ناکام رہا تو آپا کے دل میں اس کے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور اس رنگین لڑکی کے دل میں اپنے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا کرنے کی لئے وہ تیار نہ تھا۔ وہ اس بات سے خائف تھا کہ وہ کیا کہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ ڈر حاوی ہوتا گیا فوراً کسی کے آ جانے کا خوف مدھم پڑتا گیا حتیٰ کہ وہ وہاں یوں بیٹھا تھا جیسے سفید منزل نہیں بلکہ نیم چھتی ہو۔

ایک گھنٹہ گزر گیا دو گھنٹے گزر گئے دور کسی مسجد سے پہلی اذان کی آواز سن کر وہ ٹھٹھکا ارے وہ سوچنے لگا صبح ہو گئی۔ پھر چاروں طرف سے مؤذنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گلی میں دروازے کھلنے لگے۔ نمازیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

دفعتاً قریب ہی پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ ٹھٹھکا پھر کسی نے دیا سلائی جلائی باجی کو قریب کھڑے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟۔" باجی نے کہا۔ "آپ جاتے کیوں نہیں اگر کوئی آ گیا تو۔" اس کا ہ
خوف زدہ ہو رہا تھا۔

"ابھی چلا جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تو پھر جائیں نا۔ آپ کو ہماری عزت کا خیال نہیں کیا؟" وہ بولی۔

"سلگا کر سگرٹ پلا دیجئے تو ابھی چلا جاؤں گا۔" ایلی نے کہا۔

"یہ کیا فضول سی ضد ہے؟" وہ غصے میں بولی۔

"ہے کیا کیا جائے؟۔"

"لیجئے میں سلگائے دیتی ہوں سگرٹ۔" باجی نے کہا۔

"اونہوں"۔ ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں میری سلگی ہوئی پسند نہیں؟" اس نے عجیب انداز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم نے ہمارا احسان نہیں کیا" وہ یوں بولا جیسے جتی ستی یوگی ہو۔

"ہئے میں کیا کروں؟" وہ چلائی۔ "اوپر سادی ضد کئے بیٹھی ہے"۔

"سادی!" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں! گھر والے اسے سادی کہتے ہیں"۔ باجی نے کہا۔

"اور آپ کو مرصع کہتے ہوں گے؟"

"نہیں تو۔" وہ ہنسی۔ "مجھے تو باجی ہی کہتے ہیں۔ لیکن اب آپ جائیں گے بھی یا نہیں۔ یہ کیا بچوں کی سی ضد ہے۔"

"بچے کبھی نہیں سمجھا کرتے۔" ایلی نے کہا۔

"تو پٹتے بھی ہیں۔" وہ بولی۔

"پیٹنے کے لئے کوئی اور آئے گا۔" وہ بولی۔ "ہئے کوئی آ گیا تو سمجھے گا چور ہے۔"

"تو کہہ دینا ڈاکو ہے چور نہیں۔" ایلی بولا۔

"خدا کے لئے چلے جائیں۔" وہ منتیں کرنے لگی۔

"سلگا ہوا سگریٹ' سلگا ہوا سگریٹ۔" ایلی نے رٹ لگا دی۔

"مان جائیے۔" باجی نے منت کی۔

"سلگا ہوا سگریٹ۔" ایلی گویا وظیفے میں مشغول ہو گیا۔

آکر وہ چلی گئی اور ایلی تنہا رہ گیا۔

اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف پڑی۔ باہر صبح کی سپیدی پھیلی ہوئی تھی۔

اتفاقاً" اس کی نگاہ کھڑکی ... اب اس کا ڈر قطعی طور پر مفقود ہو گیا تھا چونکہ اب عزت کا معاملہ تھا اور وہ بھی ایک کے دل میں۔ اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سفید منزل میں داخل ہو کر چلا چلا کر کہا سکتا ہے میں چور ہوں مجھے پکڑ لو۔ میں چور ہوں۔

قریب ہی کسی گھڑی نے چھ بجائے۔ دفعتاً" اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں محبت نامہ تھا جو وہ لکھ کر گھر سے لایا تھا۔ جب وہ اس کی تلاشی لیں گے تو خط برآمد ہو جائے گا اور راز کھل جائے گا اس میں گوریوں کی عزت کا سوال ہے۔ نہیں نہیں میں ان کی عزت پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ اس نے خط کا وہ گولہ جیب سے نکالا اور قریب پڑے کاٹھ کباڑ میں اسے چھپا دیا اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

گھڑی نے سات بجائے وہ اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے سورج کی شعاعیں اندر داخل ہو رہی تھیں اس نے کھڑکی بند کر دی اور درز سے باہر دیکھنے لگا۔ قبرستان سنسان پڑا تھا۔ گلی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ پرلے بازار میں اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔ پاؤں کی آہٹ سن کر وہ مڑا زینے میں کوئی آ رہا تھا۔ وہ جھٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

اس کے روبرو سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "آپ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔" وہ بولی۔

"جو کچھ بھی ہوں حاضر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اب آپ جائیں گے کس طرح؟۔" سادی نے پوچھا۔

"جانے کا سامان ہو جائے گوری تو بھکاری چلے جائیں گے۔" ایلی نے کہا۔

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟۔" سادی بولی۔

"سمجھے گا بھکاری ہے بھکشا لے کر جا رہا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"شکل سے تو بھکاری نہیں دکھتے۔" وہ ہنستی۔

"ہاں شکل سے تو چور دکھتا ہوں۔ لیکن شکل کون دیکھتا ہے۔"

"آپ بڑے نڈر نکلے"۔ سادی کی نگاہ میں تحسین جھلک رہی تھی۔

"لو نہوں۔" ایلی نے کہا۔ "مقابلہ ایسے مہادیو سے تھا کہ اسے دیکھ کر اپنے میں بھی کچھ کچھ جرأت پیدا ہو گئی۔"

"آپ کی باتوں نے مجھے ــــــــ" وہ رک گئی اس کی آواز آبدیدہ تھی۔

"آپ کے انداز نے مجھے ——" وہ بھی رک گیا۔

"کیا؟" وہ بولی۔ "پوری بات کیجئے نا۔"

"مجھے کیا سے کیا کر دیا۔" اس نے کہا۔

"سگریٹ کہاں ہیں؟" وہ بولی۔

"مجھے کیا معلوم۔"

"میں سارا پیکٹ سلگا کر دوں گی۔" وہ سگریٹ سلگانے لگی۔

"دان کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"چپ کرو جی۔" وہ غصے میں بولی۔ اس کا غصہ پیار سے بھیگا ہوا تھا۔

"سادی۔" وہ کچھ دیر کے بعد کہنے لگا۔

وہ چونکی —— "سادی! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟۔"

"تمہاری اس دیا کے عوض میں ایک تحفہ پیش کروں۔"

"دیا۔" وہ ہنسی۔ "ہم تو ہر گئے۔"

"ہاں!" ایلی نے کہا۔ "کچھ لوگ ہار کر جیت جاتے ہیں اور کچھ۔" اس نے آہ بھری۔ "کچھ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ تمہارا ہاتھ کہاں ہے؟ دکھاؤ۔"

سادی نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایلی نے وہ کاغذ کا گولا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھا اور پھر مٹھی بند کر دی۔ "برگ سبز است ——" وہ بولا۔

"یہ لیجئے اپنے سگریٹ۔" وہ بولی۔ "اب آپ جائیں۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پھر نہ ایسا کیجئے گا کبھی وعدہ کرو۔"

"کیوں؟" وہ بولا۔

"میں بہت ضدی ہوں۔" سادی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے ڈر ہے کہ ——" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "وعدہ کیجئے۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تو خدا حافظ۔"

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "تم جاؤ پھر میں باہر نکلوں گا۔"

"نہیں۔" سادی نے کہا۔ "اگر کچھ ہو گیا تو میں قریب تو ہوں گی۔"

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "تم اوپر جنگلے میں جا کر کھڑی ہو جاؤ۔"

"نہیں۔" وہ چلائی۔ "پھر وہی ضد۔"

"اچھا۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔

ایلی چپ چاپ باہر نکلا کچھ دیر دروازے میں رکا۔ وہ وہاں سے یوں اطمینان سے نکلا جیسے اس کا اپنا گھر ہو۔ پھر خراماں خراماں گلی میں چل پڑا۔ دروازے کی درز میں سے ایک پرنم آنکھ اسے دیکھ رہی تھی۔

رنگِ سادی

اس سلگے ہوئے سگریٹ نے گویا آگ لگا دی اور اس گولے خط نے اس پر بارود چھڑک دیا۔ اگلے روز ایلی کے سامنے سادی کا خط پڑا تھا۔ ایسا خط پہلے انہیں کبھی موصول نہ ہوا تھا وہ خط سولہ صفحات پر مشتمل تھا۔ جس میں سادی نے سبھی کچھ شامل کر دیا تھا۔ کونسی بات تھی جو رہ گئی تھی۔ کبھی وہ اسے چھیڑتی' مذاق کرتی' کبھی بہلاتی پھسلاتی' کبھی جرات دلاتی کبھی تعریف کرتی کبھی ہنستی ہنساتی کبھی روتی رلاتی۔ وہ خط ایک کائنات تھی جسے پڑھ کر ایلی ساکت و جامد رہ گیا تھا وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ایک طوفانی رد بہہ رہی تھی۔ لیکن جھولا جھلا رہی تھیں تھپیڑے مارتی تھیں بڑھتی تھیں۔ سمٹتی تھیں ساکن ہو جاتی تھیں۔

خط پڑھ کر وہ شرابور ہو گیا۔ تحریر کس قدر برجستہ اور بے تکان تھی اشعار کس قدر موزوں اور بلند پایہ تھے۔ اشارے کس قدر رنگین اور لطیف تھے بات سے بات نکلتی تھی اور ہر بات کی اوٹ میں دو ان کہی بات چھپی تھی جو ان کے نئے تعلق کی مظہر تھی۔ بات بات میں وہ ان کہی بات عیاں تھی واضح تھی اجاگر تھی۔ اس حد تک واضح ہو جاتی تھی کہ کہی بات پس پشت پڑ جاتی۔

سارا دن وہ اس خط کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا رہتا رات کو وہ اس شوخ مگر خوددار شخصیت میں ڈوبا رہتا اور اگلے روز ایک نیا خط اس کے سامنے پڑا ہوتا۔

رات کو جب باجی اور سادی دونوں موجود ہوتیں تو وہ باجی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور باجی سے مخاطب ہو کر کنایہ کی مدد سے سادی سے باتیں کرتا۔ وہ مزاح کے پردے میں آنسو بہاتا حاضر جوابی کی اوٹ میں اپنے گنگے پن کا دکھڑا روتا اور سادی اس کی ہر بات کو پا جاتی اور

اس کے قریب ہوتے ہوئے تڑپتی۔ ماہئ بے آب کی طرح تڑپتی اور پھر چیخ کر کہتی آپ ایسی
کریں نہ کریں۔ لیکن اس کے اضطراب کا باجی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس کے
ہاتھوں تلے باجی پگھل کر چھلک رہی ہے۔ اس کی اس چھلکن کی وجہ سے ایلی پر چھینٹے پڑتے
اس کی لئے مشکلات پیدا کر دیتے آسانیاں نہیں۔ باجی چھلک چھلک کر ہار جاتی اور اس پر بھاری
جاتا اور پھر وہ محروم نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتی اور اس کی نگاہیں اور بھی لرزاں ہو
جاتیں۔

"آپ میری باجی کو تنگ کر رہے ہیں۔" سادی قریب تر آ جاتی۔ "چھوڑ دیجئے باجی کو یہ
بہت برے ہیں باجی ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ ان کی باتیں نہ سنو۔ ورنہ تم پانی ہو کر بہہ جاؤ گی یہ
وہ تیراک ہیں جو اس پانی میں تیر کر نکل جائیں گے۔ یہ ڈوبتے نہیں۔"

"ہاں!" ایلی نے کہا۔ "میں ڈوبتا نہیں بلکہ ڈوبے جاتا ہوں' ڈوبے جاتا ہوں۔ ڈوب
جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔"

"پھر وہی باتیں۔" سادی چلاتی اور پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیتی۔
"باجی آپ نے انہیں میرا نام کیوں بتایا؟"
ایلی جواب دیتا۔ "ہاں تم بھی انتقام لو باجی سے تم اس کا نام بتا دو مجھے۔"
سادی ہنستی۔ "کتنے چالاک ہیں آپ۔"
"سادی کیا نام ہے ——؟" ایلی چلایا۔
"مجھے بہت پسند ہے۔" سادی ہنس کر کہتی۔
"مجھے نہیں۔" ایلی منہ بنا دیتا۔
"کیوں؟"
"غلط نام ہے۔"
"غلط کیسے؟"
"رنگی ہونا چاہیے۔ رنگی کو سادی کہیں دیکھ کبیرا ہنسے۔" ایلی قہقہہ مار کر کہتا۔
اس طرح وہ بچوں کی طرح باتیں کرتے رہتے۔
اور اگر سادی اکیلی آتی تو ایلی کو پسینہ آ جاتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہے۔
اس کی آواز میں وہ بے پروائی بے نیازی ختم ہو جاتی اور وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولتا

ورے جملے بولے جاتا جیسے لکنت کا مریض ہو۔
"سادی جمل آئے گا تو۔"
"تو کیا؟"
"کیا ہو گا؟"
"کچھ بھی نہیں۔ باجی بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہیں۔"
"تم اور باجی اس قدر مختلف کیوں ہو؟"
"کیسے؟"
"تم نہ جی ہو وہ ہاں جی۔"
"میری باجی ایسی نہیں۔" وہ غصے میں بولی۔ "میں آپ کی سب باتیں سمجھتی ہوں۔"
"چلو کوئی ہمدرد تو ملا۔"
"ہمدرد؟" وہ چلاتی۔
"تو کیا ہو تم؟"
"آپ ہمیں نہیں جانتے۔ آپ نہیں سمجھتے۔ نہیں سمجھ سکتے؟" سادی چیختی
"معمہ ہو۔" ایلی پوچھتا۔
"نہیں۔"
"تو پھر۔"
"بس کہہ جو دیا آپ ہمیں نہیں سمجھتے۔"
"تو سمجھا دیجئے۔"
"اس گھر کی ہر موم بتی دونوں سروں پر جلتی ہے۔" سادی مسکرا کر کہتی۔
"تو کیا یہاں دیوالی ہے؟"
"ہاں ہر سے دیوالی ہے۔ میرے ہنستے چہرے پر نہ بھولئے۔"
"تو کیا آپ روتی ہیں؟"
"مجھے نسوے بہانا نہیں آتا۔ آنسو بہانا نہیں آتا۔"
"تو پھر۔"
"بند کیجئے اس موضوع کو۔ آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔"

"تو سمجھ کر کرنا ہی کیا ہے؟" ایلی کہتا۔ "تم تم ہو اور یہی کافی ہے۔"
پھر وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی اور ایلی چلاتا جھن جھن جھن جھن ———

واپسی

آٹھ روز کے بعد جب ایک روز ایلی نیم چھتی میں بیٹھا سادی کا تازہ خط پڑھ رہا تھا تو اس نے نگاہ اٹھائی زینے میں جمال کھڑا تھا۔ جمال کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا وہ آٹھ دنوں میں جمال کے وجود ہی کو بھول چکا تھا۔

جمال نے آتے ہی کئی ایک سوالات کر دیئے۔

"بتاؤ یار ان کا حال کیا ہے۔ لیکن تم تو صرف ایک بار اطلاع دینے گئے ہو گے۔ انتظار کر رہی ہوں گی۔ کوٹھے پر ٹہلتی ہوں گی دیکھنے کے لئے کہ آیا ہے یا نہیں اور تم برساتی میں جاتے ہی نہیں، تمہیں کیا معلوم کوئی چھٹی آئی ہے کیا۔ لیکن چھٹی کیسے آتی میں تو ... ہوا تھا۔ یار میرا جی تو چاہتا تھا کہ جلدی لوٹ آؤں لیکن کیا کرتا وہ مجھے آنے نہیں دیتی تھی میری بیوی اور تم جانتے ہو مجھے اپنی بیوی سے عشق ہے۔ ایمان سے۔"

جمال کی باتیں سن کر ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مجرم ہو۔ جیسے اس نے ایک بچے کو دھو... دیا ہو۔ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا اور مختصر جواب دیتا رہا۔

"آؤنا" آؤنا۔" جمال چلانے لگا۔ "وہاں برساتی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ذرا دیکھوں تو شاید وہ سامنے ہی ہوں۔ انہیں تسلی ہو جائے گی کہ میں آ گیا ہوں۔"

برساتی میں پہنچ کر جمال کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایلی ایک کونے میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ایلی کبھی کھڑکیوں میں نہ کھڑا ہوا تھا۔ دو ایک بار انہوں نے کہا بھی تھا۔ "آپ سامنے کیوں نہیں آتے اپنی برساتی میں۔" اس نے کہا تھا "ایک بار جو آیا تھا۔" "ہے اللہ" اس پر سادی بول تڑپی تھی۔ جیسے آتش بازی کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ درحقیقت ایلی وہاں کھڑے ہو کر اشارے کرنے کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں تاؤ گھر کا کوئی لڑکا دیکھ نہ لے۔ وہ جاہ سے ڈرتا تھا۔ جاہ کو معلوم ہو گیا تو وہ کہے گا۔ "ہاں بھئی یہ بھی ایک فن ہے اور اگر ایلی کو یہ فن پسند ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں ذرا یہ سنتا کام ہے میرا مطلب ہے چپ ہے۔" ایلی اس جملے لو... سے ڈرتا تھا اس کے علاوہ جب روز ملاقات ہوتی تھی اور وہ باتوں کے ذریعے اپنی نمائش کر سکتا

... کھڑی ہو کر بے کار اشارے کرنے سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس جمال کو یہ شغل اس لئے پسند تھا کہ وہاں کھڑے ہو کر اسے بات کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی ہی لئے وہ روز بلاناغہ برساتی میں حاضری دیا کرتا تھا۔

"تو نہیں اس دھوپ میں بھلا کون آتا ہے کوٹھے پر۔" وہ چلایا۔ "اور یار اب پھر دھندلکے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ پہلے تو مشق ہو گئی تھی نا اب آٹھ روز کے وقفے کے بعد پھر وہی روز اول والی بات ہے۔"

تین بجے کے قریب جمال دوڑتا ہوا نیم چھتی میں داخل ہوا اس کے باچھیں کھلی ہوئی تھیں ...نہ پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

"یار ایلی انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں آ گیا ہوں۔ ایک کو پتہ چلا تو وہ بھاگی دوسری کو خبر دینے کے لئے اور پھر وہ دونوں آ گئیں۔ میں نے سلام کیا بہت خوش ہوئیں مجھے دیکھ کر آج رات کو بڑا مزا رہے گا۔ میں پھر جاتا ہوں وہاں شاید وہ پھر آئیں۔"

سدود راہیں

آدھ گھنٹے کے بعد وہ پھر نیم چھتی میں آیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ بازو لٹک رہے تھے۔

"یار ایلی غضب ہو گیا۔ میں وہاں گیا تو سامنے کوئی بیٹھی تھی۔ میں نے سمجھا انہیں میں سے ایک ہو گی میں نے اشارے کرنے شروع کر دیئے وہ بھی اشارے کرتی رہی۔ پھر دفعتاً" اس نے دوپٹہ اتار کر رکھ دیا اور نیچے سے سوٹ والا ایک نوجوان نکل آیا غالباً" ان کا بھائی ہو گا۔ اب کیا ہو گا یار ایلی بتاؤ نا؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

رات کو وہ دونوں نیم چھتی میں بیٹھے روشنی کا انتظار کرتے رہے۔ تین بجے کے قریب ان پر اونگھ چھانے لگی اور ساڑھے تین بجے جمال کرسی میں بیٹھا بیٹھا سو گیا لیکن ایلی چپ چاپ غیر منزل کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھا رہا۔ وہ غم یا مایوسی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کچھ بھی محسوس نہ کر رہا تھا۔ اس کا ذہن قطعی پر خالی تھا ——— کھڑکی میں سادی ہنس رہی تھی۔ "کوئی بات کیجئے نا آپ تو ایسی باتیں کیا کرتے ہیں۔" زینے میں شہزاد کھڑی کہہ رہی تھی۔ "نہیں میں تو کچھ نہیں کہتی۔" درمیان میں جمال آرام کرسی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

اگلے روز سفید منزل کے چوبارے میں مزدور کام کر رہے تھے۔ سیڑھیوں والی دیوار پر
انیٹوں کے جنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے سیڑھیوں کا دروازہ کھلنے پر بالا گھر سے
منزل کے چوبارے کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا انہیں سیمنٹ سے پر کیا جا رہا تھا۔
"ایلی ایلی۔" جمال چلانے لگا۔ "یہ دیکھا تم نے انہوں نے وہ جنگلے بند کر دیئے ہیں۔ معلوم
ہوتا ہے معاملہ دور تک پہنچ گیا ہے۔"
"ہوں۔" ایلی نے کھڑکی کی درز سے دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں دیر تک خاموش کھڑے
رہے پھر جمال بولا۔
"لیکن شاید ملاقات پر پابندی نہ لگے گھر والوں کو اس کا علم تو نہیں ہوا ہوگا۔ اور ایلی وہ
وہ بھیجیں گی۔ ضرور بھیجیں گی۔"
جب جمعدارن آئی تو ایلی نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں بلکہ ماتھے پر
پرانی شکن پڑی تھی۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ اب خط و کتابت ممکن نہ ہوگی۔ کچھ دیر کے
بعد جمال آیا۔
"یار وہ جمعدارن تو بات ہی نہیں کرتی۔ کہتی تھی نہ بابو جی وہاں ان کے گھر میں تو زلزلہ
ہوا ہے۔ لڑکی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ دورے میں لڑکی کی ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اب بتاؤ؟"
جمال نے پوچھا۔
ان حالات کے باوجود وہ دل ہی دل میں امید رچائے بیٹھے رہے کہ شاید کوئی صورت پیدا ہو
جائے شاید وہ کوئی ترکیب لڑائیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ عید آ گئی لیکن گوریوں کی طرف سے نہ
کوئی پیغام موصول ہوا اور نہ ہی سفید منزل میں کسی جگہ ان کی جھلک دکھائی دی۔
جمال کو اس بات کا قلق ضرور تھا کہ ایک دلچسپی کی صورت ختم ہو گئی اس کے علاوہ اسے
کوئی دکھ نہ ہوا۔
جس روز وہ واقعہ رونما ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا سلسلہ ملاقات ٹوٹ گیا تھا۔ اس روز
ایلی نے محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ خالی الذہن ہو پھر حسب عادت دکھ بوند بوند اس کے دل میں بھرتا
گیا۔ دنیا ویران ہوتی گئی۔ چیزیں مفہوم سے خالی ہوتی گئیں مناظر دھندلے پڑتے گئے اور لوگ
یوں گھومتے پھرتے دکھائی دینے لگے۔ جیسے ویرانے میں بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔
وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نعمت عظمیٰ کھو دی ہو۔ جیسے امید کی کرن گم ہو گئی ہو

تھی کہ ایلی کو سادی سے وہ محبت پیدا نہ ہوئی تھی جس میں آرزو کا عنصر ہوتا ہے۔
بی کی بات شخصیت کی عظمت کا بے پناہ احساس تھا۔ اس کی رنگین باتیں اس کا ادبی ذوق اس
لے اس کی جرات سادی سے محروم ہو جانے پر وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کی تمام اچھی
کی بے پناہ سے محروم کر دیا گیا ہو۔ جیسے لطافت ختم ہو گئی ہو اور صرف دھندلی کثافت باقی رہ گئی ہو۔
چیزوں ایلی نے کبھی یہ آرزو محسوس نہ کی تھی کہ وہ سادی کو آغوش میں لے یا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
تھام لے یا اس سے حسن کی بھیک مانگے یا ملاپ کی خواہش کرے۔
ایلی روز سادی کے خط نکال لیتا اور انہیں پڑھتا۔ بار بار پڑھتا اور پھر حیرت میں ڈوب جاتا۔
نہ جانے یہ لڑکی کون ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے اونچے ہوں گے نہ جانے——پھر وہ شدت
سے کمتری کا جذبہ محسوس کرتا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا میل ہو سکے اور
ہو بھی جائے تو وہ جلد مجھ سے اکتا جائے گی۔ مجھ میں ہے ہی کیا جو اتنی بڑی شخصیت کو جذب کر
سکوں۔ ایلی نے سادی کو کبھی عورت کی حیثیت سے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آرزو کی تھی۔
اس لئے ایلی کا غم عجیب سا تھا۔ ایسا غم جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ یہ
محسوس نہیں کرتا تھا جیسے کھو گیا ہو بلکہ جیسے کچھ کھو دیا ہو جیسے روشنی کی کرن بجھ گئی تھی۔ جیسے
رنگ ختم ہو گئے تھے اور محض ایک خاکستری دھندلکا باقی رہ گیا تھا۔
دس روز کے بعد جمال کے نام پھر ایک تار آ گیا۔ لکھا تھا۔ "فوراً" پہنچئے۔"
"کیا بات ہے؟۔" ایلی نے جمال سے پوچھا۔ "یہ کیسا بلاوا ہے؟۔"
"بچہ ہونے والا ہے۔" جمال ہنسنے لگا۔ "میں کہہ آیا تھا مجھے تار دے دینا۔"
جمال کے جانے کے ایک دن بعد ایلی کو ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔
اس نے اس لئے خط کو کچھ اہمیت نہ دی۔ پتہ نامانوس خط میں لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا
خط ہے اس نے سوچا۔ طرز تحریر جانی پہچانی سے تھی لیکن——
دراصل اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ سادی اسے ڈاک کے ذریعے بھی خط لکھ سکتی ہے۔
لفافہ چاک کر کے اس نے خط باہر نکالا تو دفعتاً" حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ
گئیں ارے سادی کا خط۔ لکھا تھا:۔
"گھر والوں کو پتہ چل گیا ہے۔ ملاقات کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔ اب میں
بھلا نہیں رہ سکتی۔ سوموار کو رات کے دو بجے اسی جگہ میرا انتظار کیجئے اور مجھے ساتھ لے

جائیے۔ اگر آپ نہ آئے تو ـــــ ضرور آیئے گا ضرور ورنہ ـــــ"

ایک کونے میں جلدی میں چند الفاظ لکھتے تھے :۔

"جس روز آپ کو یہ خط ملے اسی روز رات کو بارہ سے ایک بجے تک اپنی برساتی کی جلائے رکھئے تاکہ مجھے علم ہو جائے کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہے۔ وہ بتی ہمارے ہیڈ کوارٹر سے دکھائی دیتی ہی۔"

خط پڑھ کر ایلی سن رہ گیا۔ اس کا ذہن پھر سے ایک خلا میں بتدیل ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا پھر برساتی میں ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر گھومنے لگا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔

سارا دن وہ آوارہ گھومتا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے کہاں جا رہا ہے۔ کس لئے سرگرداں ہے۔ اسے سادی کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ سوموار کو رات کے بجے اسے بلایا گیا ہے اور اسے کسی کو ساتھ لے کر چلے جانا ہے نہ جانے کہاں چلے جانا ہے کیوں چلے جانا ہے مگر چلے جانا ہے ورنہ۔

اس کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی کوئی فکر نہ تھا کوئی پریشانی نہ تھی۔ البتہ وہ بذات خود پریشان تھا۔ اس کی شخصیت گویا بکھر گئی تھی۔ شعور شل ہو چکا تھا۔ وہ دیکھتا تھا لیکن سمجھتا نہ تھا بلکہ اس کی دیکھنے کی قوت دھند لائی ہوئی تھی۔ کان بند ہو چکے تھے۔ وہ ایک مدھم مگر مسلسل شور سن رہا تھا۔ جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ جیسے سادی کائنات مکھیوں کے ایک عظیم چھتے میں تبدیل ہو گئی۔

دوپہر کے وقت وہ ایک ویران سڑک پر چل رہا تھا۔ پھر شام کو اس نے دیکھا کہ وہ باغ میں ایک بنچ پر بیٹھا ہے۔ پھر وہ سڑک کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک موڑ کے قریب کھڑا تھا اور اردگرد چند لوگ کھڑے تھے۔

بخشی بخاری

پھر دو شخص اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور چوک میں کھڑا سپاہی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

لمبا شخص اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

"تم الیاس ہو؟ " وہ پوچھ رہا تھا۔

الیاس ـــــ ایلی کو وہ لفظ کچھ مانوس سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں الیاس ایلی۔ علی پور کا ایلی۔

(شاید) آپ سے کہہ رہا تھا۔

"چلو۔" ٹھگنا شخص بولا۔ "سامنے چائے کی دوکان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

(تینوں) چل پڑے۔

ایلی نے غور سے لمبے آدمی کی طرف دیکھا۔ ہاں یہ شخص' اس نے محسوس کیا جیسے اسے (کہیں) دیکھا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کون تھا۔

"مجھے جانتے ہو نا۔" لمبے آدمی نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں!۔" ایلی نے سرہلایا۔ لیکن اس کا ذہن سر کے اشارے سے بیگانہ رہا۔ "میں تاؤ گھر کئی بار گیا ہوں۔"

"تاؤ گھر ـــــ" ایلی کے ذہن میں روشنی کی ایک اور کرن جھلملائی۔

"میں جاہ کا دوست ہوں۔" لمبا آدمی بولا۔

جاہ ـــــ ایک اور کرن۔

"مجھے جانتے ہو نا۔" لمبے آدمی نے دہرایا۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "جانتا ہوں ـــــ" لیکن اس کی نگاہیں اسے جھٹلا رہی تھیں۔

"نہیں نہیں۔" چھوٹے آدمی نے اشارہ کیا۔ "ابھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ہوش (میں) نہیں"۔

"تم نے کچھ استعمال تو نہیں کیا؟۔" لمبے آدمی نے ایلی سے پوچھا۔

"استعمال۔" ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو نہوں۔" چھوٹے آدمی نے اشارہ کیا۔ "یہ بات نہیں۔"

"تمہاری طبیعت تو اچھی ہے۔؟" لمبے آدمی نے چائے کی میز پر بیٹھتے ہوئے ایلی سے پوچھا۔

"ہاں نہیں مجھے تو کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔" ایلی نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بات (کر)نے کی کوشش کی۔

"ہم تمہارے دوست ہیں۔" چھوٹا بولا۔ "میرا نام بخشی ہے اور یہ بخاری ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" ایلی نے سرہلایا۔ "اور یہ کیا ہے۔؟" بخشی نے پوچھا۔

"یہ ——— " ایلی نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں [illegible]
کاغذ تھا جسے وہ ان جانے میں مروڑ رہا تھا۔ "یہ۔" ایلی نے کہا۔ "یہ تو کاغذ ہے۔ اس نے [illegible]
بخاری کو دیتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا جیسے انہیں دکھانا چاہتا ہو کہ واقعی وہ کاغذ ہے اور [illegible]
ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ وہ کاغذ سادی کا [illegible]

بخاری نے وہ کاغذ ایلی کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے دیکھنے لگا۔

"چائے پیئو۔" بخشی مسکرایا۔

ایلی چائے پینے لگا۔

"اب کیا گھر جاؤ گے۔؟" بخشی نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"تمہیں چھوڑ آئیں۔؟"

"نہیں میں چلا جاؤں گا۔" ایلی بولا۔

"اچھی بات ہے۔" بخشی نے کہا۔

"تم ذرا بیٹھو میں بل دے دوں۔" بخاری نے کہا۔

"میرے پاس ہیں۔" ایلی نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے پاس ہیں۔"

"نہیں میں دوں گا۔" بخاری نے مسکرا کر کہا۔

پھر بخاری نے بخشی کو اشارہ کیا۔ "ذرا ادھر آنا"۔ اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

ایلی کی نگاہوں میں اب چیزیں اور ان کا مفہوم ابھر رہا تھا اور وہ شرمندگی سی محسوس کرنے
لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بخشی اور بخاری دونوں واپس آ گئے۔ "چلو ہم بھی تمہاری ساتھ چلیں
گے۔" بخاری نے کہا۔

"نہیں نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔"

"نہیں۔" بخاری نے کہا۔ "ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔"

"اچھا۔" ایلی لاجواب ہو گیا اور تینوں چل پڑے۔

جب وہ ناؤ گھر کے مقابل میں پہنچے تو دفعتاً ایلی کو یاد آیا اور وہ دیوانہ وار اپنی جیبیں ٹٹولنے
لگا۔

"کچھ کھو گیا ہے کیا؟۔" بخاری نے پوچھا۔

"ہوٹل میں تم نے ایک کاغذ اس جیب میں ڈالا تھا۔" بخاری نے یہ کہتے ہوئے ایلی کے
کوٹ کی اوپر والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا۔

"یہی ہے نا؟۔" بخاری نے ایلی سے پوچھا۔

ایلی نے دیوانہ وار اسے کھولا۔ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ "ہاں یہی ہے۔" اس کی آنکھیں جذبہ
شکر گزاری سے پرنم ہو گئیں۔

"اچھا تو ہم کل صبح آئیں گے۔" بخاری نے کہا۔ "کہیں چلے نہ جانا ہمارے آنے سے
پہلے۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔ "میں کہاں جاؤں گا۔"

اگلے روز صبح سویرے ہی بخشی اور بخاری آ گئے۔

"آج تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے۔" بخاری نے بات شروع کی۔

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کل کیا ہوا تھا؟" بخاری نے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو کہاں گھوم رہے تھے تم؟"

"بس گھوم رہا تھا۔"

"کسی کام سے نکلے تھے کیا؟"

"نہیں تو ویسے ہی یہاں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی تھی۔ جدھر منہ اٹھایا چل پڑا۔" ایلی نے
ہنسنے کی کوشش کی۔

"آج تو نہیں گھبرا رہی طبیعت؟"

"نہیں تو۔" وہ ہنسنے لگا۔ "آج تو کوئی ایسی بات نہیں۔"

"کل کیا بات تھی؟" بخشی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شاید ہم کچھ مدد کر سکیں۔" بخاری نے کہا۔

"بات تو کوئی نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو اس بات کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟۔"

"کس بات کے متعلق؟ "ایلی نے پوچھا۔

"سوموار کو دو بجے۔" اس نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا پھر دفعتاً اسے یاد

"ارے یعنی میرا مطلب ہے یعنی میرا ——" ایلی گھبرا گیا۔

"دیکھو بھائی الیاس!۔" بخشی مسکرایا اس کی مسکراہٹ بڑی تسلی بخش تھی۔ "بات یہ

ہم نے وہ خط پڑھ لیا ہے۔"

"خط؟ "

"تم نے خود ہی تو دیا تھا ہمیں چائے کی دوکان میں۔" بخاری مسکرانے لگا۔

"میں نے؟ "

"گھبراؤ نہیں تمہارا راز ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔" بخاری نے اسے تسلی دی۔

ایلی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

"تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے کیا؟ "بخاری نے پوچھا۔

"محبت؟ مجھے معلوم نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہوں۔"

"تو کیا تم دو بجے وہاں جاؤ گے؟ "

"ہاں —— مجھے جانا ہی ہو گا۔"

"کیوں کوئی مجبوری ہے کیا۔" بخشی نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو پھر جانا ہی ہو گا کیوں؟ "بخاری نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔" ایلی نے جواب دیا۔ "اور اگر میں نہ گیا تو ——؟"

"تو کیا؟ "بخاری نے پوچھا۔

"تو وہ ورنہ ——" ایلی نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

"ورنہ؟ "

"ہاں۔" اس نے لکھا ہے ضرور آنا ورنہ ——"

"ورنہ تو یہ ہمیشہ ہی لکھتی ہیں۔" بخاری ہنسنے لگا۔

"نہیں۔" ایلی بولا۔ "تم اسے نہیں جانتے میں اسے جانتا ہوں اور اس کے ورنہ کو بھی۔"

"ہوں۔" وہ خاموش ہو گئے۔

"الیاس برا نہ مانو تو میں پوچھوں کہ وہ کون ہے؟ "بخاری نے پوچھا۔

"کون ہے ——؟ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟ "" ایلی نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے کس گھرانے سے ہے؟ "بخاری نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ مجھے اس کا علم نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

بخشی اور بخاری نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "اس کے رشتے داروں کے متعلق ——" بخشی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم؟ "ایلی نے بخشی کی بات کاٹ دی۔

"اچھا" وہ سوچ میں پڑ گئے۔ "تعجب کی بات ہے۔" کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔

"تو کیا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟ "بخاری نے پوچھا۔

"ہاں میں جاؤں گا۔" ایلی نے جواب دیا۔ "مجھے جانا ہی ہو گا۔"

"اس کے نتائج سوچے ہیں تم نے؟ "

"نہیں۔ مجھے نتائج کی پروا نہیں۔"

"اوہ —— "

"تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں اسے لے جا سکو؟ "

"نہیں۔"

"کوئی بھی نہیں۔"

"کونسوں۔"

"روپے کا انتظام ہے؟ "

ایلی ہنس پڑا۔ "میرے پاس روپیہ کہاں۔"

"کوئی دوست ہے؟ "

"کونسوں۔"

کچھ دیر تک وہ خاموش رہے بخشی کی آنکھوں میں غم کی گھٹائیں چھائے جا رہی تھیں۔ بخاری کے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔

"اور اگر تم پکڑے گئے تو؟ "

"پکڑا جاؤں گا اور کیا۔" ایلی نے کہا۔

"اور اگر لڑکی نے تمہارے خلاف بیان دے دیا پھر؟"

"نہیں۔" ایلی بولا۔

"نہیں کیا ——؟"

"وہ میرا ساتھ دے گی۔"

"تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں۔"

"اور اگر ——"

"اونہوں۔" ایلی نے بخاری کی بات کاٹ دی۔ "کوئی اگر مگر نہیں۔" کمرے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر کے بعد بخاری نے کہا۔ "بھائی الیاس مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔"

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"تم ان سوالات کا برا تو نہیں مان رہے۔"

"نہیں اب کیا ہے؟" وہ بولا۔

"اور اگر تم ہار گئے؟"

"تو کیا ہوا ——؟" ایلی نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" ایلی نے کہا۔ "اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں محسوس کروں گا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہو۔"

"اچھا۔" بخشی نے کہا۔ "ابھی تو دو دن باقی ہیں۔ آج ہفتہ ہے نا۔"

"اچھا۔" ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ابھی دو دن باقی ہیں۔

"اگر تم ہمیں سارا قصہ سنا دو تو کوئی حرج ہے؟" بخاری نے پوچھا۔

"اب کیا ہے؟۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن جاہ کو پتہ نہ چلے"۔

"اچھا تو کل ہم پھر آئیں گے۔ شاید کچھ ہو سکے۔۔"

"بھگوان کرے۔" بخشی بولا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

اگلے روز وہ دونوں اسے باغ میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ایلی نے مختصر طور پر موٹے موٹے

واقعات انہیں سنا دیئے اور ان کی خواہش پر واپسی پر سفید منزل انہیں دکھا دی۔

اللہ ہو اکبر

بخشی اور بخاری سے مل کر ایلی کو اک ان جانی تسلی ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس کی امداد کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ لیکن بخشی اور بخاری دو عجیب شخصیتیں تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اپنوں کے پاس ہو۔ بخاری کی باتیں تلخ تھیں۔ لیکن اس کے خشک رویہ سے محبت اور ہمدردی گویا رستی تھی۔ بخشی کی باتیں مٹھاس بھری تھیں اور وہ یوں جذبات سے سرشار رہنے کا عادی تھا۔ جیسے بھیگا ہوا کبوتر ایلی نے عجیب سے تسلی محسوس کی تھی۔ نہ جانے کیسے ایلی کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ دوستوں سے گھرا ہوا ہے۔ پکڑے جانے یا قید ہو جانے کے فکر سے تو ایلی آزاد تھا بلکہ ویسے ہی جیسے اس روز سلگتے ہوئے سگریٹ کے لئے وہ سادی کے زینے میں پانچ گھنٹے بیٹھا رہا تھا البتہ اسے ایک ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوموار کو رات کے دو بجے مقررہ جگہ پہنچ نہ سکے۔ گویا اس وقت اس کا مقصد حیات صرف یہ تھا کہ رات کے دو بجے وہاں پہنچ جائے اس کے بعد کیا ہو گا کیسے ہو گا اس کے متعلق اس نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد چاہے کچھ ہو جائے پڑا ہو۔

سوموار کے روز بخشی اور بخاری دونوں بار بار ایلی کے پاس آئے اور اسے موہوم سے تسلی دے کر پھر چلے گئے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتظامات میں مصروف ہیں۔ ایلی کے پاس آ کر کبھی وہ الگ ہو کر آپس میں بحث کرتے لڑتے جھگڑتے اور پھر کہیں چلے جاتے۔

شام کے وقت وہ دونوں ایلی کو باہر لے گئے۔

پارک میں پہنچ کر وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئے بخاری نے ایلی کے دونوں شانے پکڑ لئے۔

"دیکھو بھائی جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کر دیا ہے۔ اب غور سے سن لو اور اچھی طرح سمجھ لو۔ رات کو تم اکیلے جاؤ گے لیکن ہم تمہارے بالکل قریب ہوں گے۔ فکر نہ کرنا۔ اگر کوئی مشکل پڑی تو ......

اگر بات بن گئی تو تم ——اسے لے کر تاؤ گھر کی طرف نہ آنا بلکہ اس سے متضاد سمت کی گلی سے ہوتے ہوئے سڑک پر پہنچ جانا۔ سڑک وہاں سے چالیس پچاس قدم دور ہے۔ وہاں تمہارے لئے ایک موٹر کھڑی ہو گی یہ موٹر تمہیں سیدھی کراچی لے جائے گی۔ اگر تم کراچی بخیر و عافیت پہنچ گئے تو

پھر اللہ مالک ہے۔"

عین اس وقت قریب کی مسجد سے مؤذن للکارا۔ "اللہ اکبر۔"

ایلی کی نس نس میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے بخشی بخاری کی طرف دیکھا اور محسوس کیا۔ جیسے وہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہوں جو اللہ واسطے اس کی امداد کر رہے ہوں بے مقصد بے لاگ امداد۔ اللہ ــــــ اس کے دل میں پہلی مرتبہ ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شدت تاثر سے آنسو آ گئے۔

"میں میں" ایلی نے شکر گزاری سے ان کی طرف دیکھا۔ "یعنی۔" وہ بولا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ بخاری ہنس پڑا۔ "ہم یہ کام تمہارے لئے نہیں کر رہے۔" اس نے کہا۔ "یہ احسان مندی یا شکر گزاری کا کوئی موقعہ محل نہیں۔" بخاری نے ایک دبی دبی آہ بھری اور پھر گونج دار آواز میں بولا۔ "جو خود روشنی سے محروم کر دیئے گئے ہوں وہ دوسروں کو راہ دکھانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں۔"

ایلی نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا جیسے اس کے پہلو میں ایک لا انتہا خلا ہو جسے دنیا کی تمام نعمتیں اور مسرتیں پر نہ کر سکتی ہوں۔ اللہ ہو اکبر مؤذن اذان ختم کر رہا تھا۔

اللہ ہو اکبر ایلی کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ سامنے بخاری مسکرانے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی بخشی کی آنکھوں میں بوندا باندی ہو رہی تھی۔

تمام تفصیلات سمجھا کر وہ دونوں ایلی کو سفید منزل کی طرف لے گئے اور عملی طور پر اسے سمجھانے لگے "یہ گلی ہے۔ ادھر سے تمہیں آنا ہے۔ اس طرف کو۔ یہاں موٹر کھڑی ہوگی عین اس جگہ اور ہم تمہارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ پاس نہیں بلکہ قریب یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے ہو۔"

تمام تفصیلات سمجھانے کے بعد جب وہ ناؤ گھر پہنچے تو ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ سیدھے اوپر نیم چھتی کی طرف چل دیئے تاکہ جاہ بہادر پال کو ان کی آمد کا علم نہ ہو۔

حد ہو گئی

جب وہ نیم چھتی میں پہنچے تو دروازے میں جمال کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمال کو دیکھ کر ایلی کا دل بیٹھ گیا۔ جمال کو دیکھتے ہی یہ احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے جمال کو دھوکا دیا ہے۔ احساس گناہ سے اس کی گردن لٹک گئی۔

ایلی نے اس احساس سے مخلصی پانے کی شدید کوشش کی مگر ناکام۔ وہ احساس اس شدت سے اس پر طاری ہوا ــــ کہ اس دہاڑے میں ایلی کی شخصیت بہہ گئی ــــ وہ جمال کے روبرو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ نہ سکتا تھا۔

پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ اور پتھر بن کر کھڑا ہو گیا اس ڈر کے مارے کہیں جمال کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کے لئے منتیں کرنا شروع نہ کر دے۔

جمال ایلی کی طرف بڑھا۔ "ایلی سب ٹھیک ہے نا؟"

ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بخشی بخاری جی کیا حال ہے جاہ سے ملنے آئے تھے کیا۔" جمال نے ان سے بات کی۔

"ہاں۔" بخشی نے کہا اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"ان کا حال سناؤ ایلی۔" اس نے اشارتاً پوچھا۔

"ٹھیک ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"کوئی آیا تھا؟"

"نہیں۔"

"خط بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"پیغام؟"

"نہیں۔"

"تو بات ختم ہو گئی۔"

"ہاں۔"

جمال مایوس ہو گیا اور برساتی کے باہر کوٹھے پر ٹہلنے لگا۔

بخاری ایلی کے قریب تر ہو گیا۔ "یہ تمہارا ساتھی تھا؟"

"ہاں۔" ایلی بولا۔

"ساتھی کو اپنے خلاف کر لینا دانشمندی نہیں۔"

ایلی خاموش رہا۔

"اسے بتا دینا چاہیے۔" بخاری نے کہا۔

"لیکن میں ——— میں کیسے بتاؤں۔"

"اس سے بات چھپی نہ رہ سکے گی۔" بخاری بولا۔

"ہوں۔" ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ جمال کے سامنے اقبال جرم کرے۔ کچھ دیر کے بعد جمال مڑا۔ "ایلی انہوں نے بلایا تو نہیں تھا؟"

"ہاں۔"

"بلایا تھا؟" جمال نے دہرایا۔

"بلایا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کب؟"

"آج رات کے دو بجے۔"

"آج۔" جمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "دو بجے؟" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دو بجے۔"

"دفعتاً" جمال نے محسوس کیا کہ وہ بخشی کے سامنے ہی باتیں کئے جا رہا ہے۔ "اوہ۔" اس نے ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

"جمال بھئی۔" بخاری نے پہلی مرتبہ جمال سے بات کی۔ "الیاس آج جا رہا ہے۔"

"جا رہا ہے۔ کہاں؟۔"

"اس لڑکی کو ساتھ لے کر جا رہا ہے۔"

"کیا مطلب۔ تم جا رہے ہو ایلی؟" وہ ایلی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" ایلی نے سر ہلا دیا۔

"کس کے ساتھ؟"

"چھوٹی کے ساتھ۔"

"چھوٹی کے ساتھ۔" وہ حیرت سے سر کھجانے لگا۔ "حد ہو گئی۔" اس نے صحن میں ایک چکر کاٹا۔

"چھوٹی نے بلایا ہے کیا؟" جمال نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"حد ہو گئی' حد ہو گئی۔" وہ دیوانہ وار صحن میں گھومنے لگا۔

"کہاں جاؤ گے؟" جمال پھر رک کر پوچھنے لگا۔

"پتہ نہیں۔" ایلی بولا۔

"پتہ نہیں۔ حد ہو گئی۔" جمال چلایا۔

بخشی اور بخاری چپ چاپ دیوار کے قریب کھڑے تھے ایلی زینے کے پاس تیوری چڑھائے جمال کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جمال کوٹھے پر دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ "حد ہو گئی۔" وہ اپنے آپ چلا رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عجیب بات ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے؟۔"

دفعتاً جمال رکا۔ "خط آیا تھا کیا؟"

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"اسی کے ہاتھ؟"

"نہیں۔"

"رومی ٹوپی والا لایا تھا؟"

"نہیں؟"

"تو پھر؟"

"ڈاک سے۔"

"اوہ۔ ڈاک سے۔" جمال پھر مضطربانہ طور پر ٹہلنے لگا۔ پھر رکا۔ "اگر اگر میں میں یعنی۔" اس نے ملتجی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا اور لفافے سمیت سادی کا خط جمال کی طرف بڑھا دیا۔

جمال نے لپک کر وہ خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتہ دیکھا پھر بے صبری سے رقعہ نکالا اور لالٹین تلے کھڑا ہو کر اسے پڑھنے لگا۔

دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ خط پڑھا ہو گا۔ پھر گویا اس کے جسم کا تناؤ ٹوٹ گیا ہاتھ لٹکنے لگے گال ڈھلک گئے۔ "حد ہو گئی۔" اب اس نے اور انداز سے کہا۔ "اچھا بھئی۔" وہ ایلی کے قریب آ گیا۔ "تمہیں مبارک ہو۔" اس نے خط واپس دیتے ہوئے کہا

"جمال صاحب۔" بخاری نے کہا۔ "آپ تو انہیں جانتے ہیں۔ کیا وہ آئے گی؟"

"آئے گی؟" جمال نے دہرایا۔

"مطلب ہے کیا وہ بات کی پکی ہے۔" بخاری نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" جمال بولا۔ "ایلی کو معلوم ہے۔ میں تو اسی کے سہارے۔" اس نے
کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ بخشی گھبرا کر سی سی کرنے لگا جیسے اسے بہت
برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔

"مجھے تو کچھ علم نہیں۔ میں تو میں تو۔" جمال بولا۔ "میں تو حیران ہوں۔ مجھ کچھ سمجھ میں نہ
آ رہا۔"

بخاری بت بنا کھڑا تھا۔

ایلی احساس ندامت سے بھیگا ہوا تھا۔

بخشی چپ چاپ ظلم سے جا رہا تھا۔

جمال کبھی سوچ میں پڑ جاتا۔ کبھی سر لٹکا دیتا کبھی مسکرانے کی کوشش کرتا کبھی سر کھجاتا اور اپنے
آپ سے کہا۔ "حد ہو گئی۔" پھر دفعتاً "ایلی کی طرف دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا بھاگ کر وہ ایلی سے
لپٹ گیا۔

"ایلی۔ تم کمال ہو۔ تمہارا جواب نہیں ایلی تم نے حد کر دی۔ تم ہمیشہ حد کرتے ہو۔ لیکن یار تم
نے یہ کیسے کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے ایلی۔ بڑی خوشی ہے۔ مجھے تم پر یہی امید تھی۔" جذبات کی
شدت کی وجہ سے وہ رک گیا۔ ایلی کی گردن لٹک گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے واقعی وہ مجرم ہو۔

"آپ کو نہیں معلوم۔" وہ بخشی بخاری سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "ایلی نے شیر مارا ہے۔ ببر
ببر۔ آسمان کا تارہ توڑ لایا ہے۔ یہ جادوگر ہے۔ جادوگر۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں اس کے
جادو سے واقف ہوں۔"

بخشی۔ بخاری حیرت سے جمال کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اور وہ۔" جمال ہنسنے لگا۔ "وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ وہ معمولی لڑکی نہیں۔"

"اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کون ہے جو اسے روک سکے کون ہے جو اس کی
طرف ہاتھ بڑھا سکے۔" جمال ہنسنے لگا اس کی ہنسی میں ہسٹیریا کا عنصر تھا بخشی بخاری چپ چاپ
کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گھڑی نے بارہ بجا دیئے۔

"اچھا تو۔" جمال چلایا۔ "میرا دوست آج جا رہا ہے وہ کہتے ہیں نا کیا کہتے ہیں وہ۔ بامراد

مجھے یاد نہیں رہا۔" وہ بولا۔

"اچھا۔" بخاری نے کہا۔ "وقت کم ہے۔ ہم ذرا موٹر والے کو دیکھ آئیں جب تک تم تیاری
کر لو ایلی۔"

"تیاری۔" ایلی نے دہرایا۔ "میں کیا تیاری کروں گا؟"

"کوئی چیز ویز ——"

"میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

"جمال صاحب آپ ایلی کے ساتھ جائیں گے۔ میرا مطلب ہے صرف اسے لانے کے لئے۔"
بخاری نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" جمال چلانے لگا۔ "میں ساتھ جاؤں گا۔ میں اس کا ساتھی ہوں۔ اس نے میرا ساتھ
دیا تھا۔ اب میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میں انہیں خود موٹر میں بٹھاؤں گا۔ کیوں ایلی مجھ ساتھ لے چلو
گے نا؟"

ایلی ڈرتا تھا کہ بخشی بخاری کے جانے کے بعد وہ جمال کے ساتھ اکیلا نہ رہ جائے اس لئے وہ
نیچے اتر گیا۔

"میں ذرا جاہ اور پال سے مل لوں۔" وہ بولا۔

جاہ اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے ایلی ہچکچایا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید پھر
کبھی ملاقات نہ ہو۔

"جاہ جاہ۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

جاہ نے کروٹ لی۔ "جاہ۔" وہ چلایا۔ جاہ نے سر اٹھایا۔ "ہوں؟"

"میں جا رہا ہوں۔" ایلی بولا۔

"اچھا۔" وہ نیند میں بولا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا۔ "خدا حافظ۔"

ایلی نے جاہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے پناہ پیار سے اسے سہلانے لگا۔ لیکن جاہ پھر سو گیا تھا۔

پال ابھی پورے طور پر نہیں سویا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"گھر جا رہا ہوں۔"

"تو جاؤ۔ میں سمجھا شاید سات سمندر پار جا رہے ہو۔" پال بولا۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "سات سمندر پار جا رہا ہوں۔ وہیں گھر بتاؤں گا۔" پال اٹھ بیٹھا اور پھر

مذاق میں ایلی سے لپٹ گیا۔

"اس وقت کون سے گاڑی جائے گی؟" بھانے پوچھا۔

"جائے گی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کوئی سپیشل ہی ہو سکتی ہے۔" بھانے کہا۔

"ہاں سپیشل ہی ہے۔"

"اب یہ پوچھو بھا کہ سپیشل کے کون سے ڈبے میں بیٹھو گے؟" پال بولا۔

"اس سے پہلے تو کبھی ایلی یوں مل کر نہیں گیا۔" بھانے کہا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ اگر کچھ دیر کے لئے وہاں رکا تو وہ سب جاگ پڑیں گے اور باتیں شروع ہو گئیں تو ——— "اچھا تو خدا حافظ۔" وہ اٹھا اس کی آواز گلوگیر تھی۔

اٹیچی

عین پونے دو بجے جمال اور ایلی اس کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے وہ دونوں چپ چاپ کھڑے تھے۔ گلی ویران تھی۔ قبرستان کے پرلے سرے پر کوئی فقیر گدڑی میں لپٹا پڑا تھا ——— ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا دیر تک وہ کھڑے رہے۔ وہ پندرہ منٹ پندرہ گھنٹوں سے زیادہ طویل ہو گئے تھے۔

قریب ہی کسی گھڑی نے دو بجائے جمال بولا۔ "کیا دو بج گئے' واقعی دو بج گئے۔ کیوں ایلی تم نے"۔

"ایلی دو ہی بجے ہیں کیا؟" ایلی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دیر تک وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر سفید منزل سے یوں آواز سی آئی جیسے کوئی ٹرنک کھینچ رہا ہو۔ وہ چونکنے ہو گئے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر زینے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

"وہ۔ وہ۔" جمال بولا۔

ایلی نے آہستہ سے بند کھڑکی کو انگلی سے بجایا۔

اندر سے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔

وہ دونوں لپک کر دروازے کے مقابل جا کھڑے ہوئے۔ دروازے میں کوئی سیاہ نقاب میں لپٹا کھڑا تھا۔

"سادی؟" ایلی نے پوچھا۔

جواب میں اس نے لوہے کا ایک ٹیچی آگے بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" ایلی نے دبی زبان میں پوچھا۔

"میرا زیور ہے۔" سادی نے جواب دیا۔

"اونہوں۔" ایلی بولا۔ "اسے واپس رکھ آؤ۔"

"کیوں؟"۔

"یہ میں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

"یہ تو پاگل ہے۔" جمال بولا۔ "لاؤ مجھے دو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اٹیچی اٹھا لیا۔

"نہیں سادی۔" ایلی دروزے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔"

دھڑاڑ اڑا ——— ڑام

سفید منزل سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بڑا سا ٹرنک کسی نے اٹھا کر فرش پر دے مارا ہو۔

"ہائے اللہ۔" سادی نے ہاتھ سینے پر رکھ لئے ——— "باجی۔" ——— وہ بولی۔

پھر سفید منزل میں کہرام مچ گیا۔

چار ایک مردان کی طرف لپکے۔ وہ ایلی کے قریب آئے اور پھر نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر انہوں نے جمال کو دبوچ لیا۔ سادی نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر اندر گر پڑی۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ نیچے گلی میں وہ جمال کو پیٹ رہے تھے اوپر کوئی گرلو رہی تھی' کوئی بین کر رہی تھی۔ بند کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ پھر ایلی چلانے لگا۔

"میں ہوں میں میں ہوں میں' ادھر دیکھو ادھر دیکھو میں ادھر ہوں۔" لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہ ہوئے باری باری اس نے ہر شخص کو شانے سے جھنجھوڑا۔ "یہ نہیں میں ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔ میں ہوں میں۔" لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی وہ سب دیوانہ وار جمال سے کشتی لڑنے میں مصروف تھے۔

"کون ہے کون ہے۔ کیا ہوا۔" دو شخص ایلی کی طرف لپکے۔

"میں ہوں میں۔" وہ چلایا۔

"اچھا تو تم ہو۔" ان دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

پھر وہ دونوں ایلی کو کسی تنگ جگہ میں ٹھونس رہے تھے۔

ہوا کے چار ایک جھونکے لگے تو ایلی نے دیکھا کہ وہ موٹر پر سوار ہے اور اس کے پاس بخشی اور بخاری بیٹھے ہیں۔

"نہیں نہیں۔" وہ انہیں دیکھ کر چلایا۔ "مجھے جانے دو۔ مجھے جانا ہے۔" وہ چلاتا گیا لیکن موٹر فراٹے بھرتی چلتی رہی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو۔" "نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔"

"روک لو۔ روک لو۔" ایلی چیخ رہا تھا ——— دیر تک وہ چلاتا رہا پھر دفعتاً بخاری بولا۔ "کار روک لو۔"

گاڑی رک گئی۔

"مجھے جانا ہے بخاری جی مجھے جانا چاہیے مجھے جانا ہو گا۔" ایلی کے سر پر گویا جنون سوار تھا۔

"لیکن۔" بخشی بولا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر میں نہ گیا تو زندگی بھر ——— " وہ رک گیا ———

"زندگی بھر۔" اس نے پھر ناکام کوشش کی۔

"موڑ لو۔" بخاری نے ڈرائیور سے کہا۔

موٹر واپس جا رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش تھے۔

ایلی کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں واپس جا رہا ہے واپس جا کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اس وقت یہ بھی خیال نہ آیا کہ سادی خطرے میں تھی۔ اسے یہ بھی احساس بھی نہ تھا کہ جمال کو چھڑانا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ اس وقت فرض اور اخلاق ایلی کے لیے دو مہمل لفظ تھے۔ اسے صرف ایک خیال تھا کہ سادی کیا کہے گی کہ ایلی بھاگ گیا سفید منزل سے دور ہی انہوں نے اسے موٹر سے اتار دیا۔

"اچھا بھائی۔" بخاری نے کہا۔ "خدا حافظ۔"

ایلی نے اس کی بات نہ سنی اور دیوانہ وار سفید منزل کی طرف بھاگا۔

گلی میں کوئی نہ تھا لیکن سفید منزل کے اردگرد کے سبھی مکانات میں بتیاں جل رہی تھیں لوگ زیر لبی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔

سفید منزل کا پھاٹک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آ رہی تھیں کوئی کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ ایلی نے دونوں ہاتھوں سے پھاٹک بجانا شروع کر دیا۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" وہ رعب سے نہ جانے کسے ڈانٹ رہا تھا۔ جیسے کوئی سورما فاتح کی حیثیت سے قلعے میں واپس آیا ہو۔

اس کی دستک کا کسی نے جواب نہ دیا۔

اس نے دروازے پر دو ہتھڑ مارنے شروع کر دیئے اندر باتوں کا سلسلہ جوں کا توں جاری تھا۔

"میں ہوں میں" اس نے پھر دستک دی۔ میں ہوں میں۔ الیاس ہوں۔ ایلی میں واپس آ گیا ہوں۔ مجھ سے بات کرو۔ دروازہ کھولو۔"

اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے کیا کہہ رہا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ اردگرد کے مکانات کے لوگ کھڑکیاں کھول کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ اندر سے کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔

"کون ہے؟" ایک دبلے پتلے شخص نے پورا دروازہ کھولے بغیر درز سے باہر جھانکا۔

"میں ہوں میں" ایلی بولا۔ "ایلی جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ وہ ایلی۔"

"کون ہے؟" اندر سے کسی اور شخص کی غصے بھری آواز آئی ——— "پکڑ لاؤ اس بدمعاش کو" وہ گرجا۔

دبلے پتلے آدمی نے ایلی کا بازو پکڑ کر اسے یوں اندر گھسیٹ لیا جیسے تمباکو کی بوری ہو۔ "بدمعاش" وہ دانت پیسنے لگا اور پھر اسے ایک کمرے میں دھکا دے کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

چور

چند ہی ساعت میں کسی نے کنڈی کھولی ایک اجنبی نوجوان اندر داخل ہوتے ہوئے چلایا۔ "کون ہے تو؟"

"میں الیاس ہوں؟"

"کون الیاس؟"

"جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ میں واپس آ گیا ہوں۔ وہ غلط آدمی ہے جسے تم نے پکڑا ہوا ہے۔ مجھ سے کرو بات۔"

نووارد نے غصے میں ہاتھ اٹھایا۔ میں تمہاری ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔"

ایلی چپ چاپ کھڑا رہا۔ "توڑ دیجئے۔" وہ بولا۔

"تم نے کوئی دھوکا یا فریب کیا تو یاد رکھو میرے سرہانے تلے پستول پڑا ہے۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ میں نے احسان کیا ہے آپ پر۔" ایلی نے غصے سے بھڑک کر

"تو کس پر احسان کیا ہے۔" نوجوان چلایا۔

"کسی پر بھی نہیں"۔

"تم پہلے کبھی آئے اس گھر میں؟"

"نہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے مجھے جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

نوجوان خاموش ہو گیا اور ایک سگرٹ سلگا کر پینے لگا۔

ایلی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ درمیانہ قد بھرا بھرا جسم گدے سے ہاتھ پاؤں۔ سفید رنگ فراخ ماتھے پر تیوری تھی۔ خمدار ہونٹوں میں مسکراہٹ دبی ہوئی تھی۔ اس نے انگریزی طر سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔

وہ کمرہ نہایت مختصر تھا۔ دیواروں پر ہلکا گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ پلنگ پر جدید طرز کی چادر ہوئی تھی۔ سرہانے کا غلاف ہم رنگ تھا۔ تپائی پر دو ایک کتابیں پڑی تھیں۔ پانی کے لئے ا کانچ کی صراحی تھی۔ کارنس پر دو ایک چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

پلنگ پر لیٹے ہوئے سگرٹ کے کش لگاتے ہوئے نوجوان کبھی کبھی آنکھ بچا کر ایلی کی طر دیکھتا اور پھر یوں چھت کو گھورنے لگتا جیسے خوفناک ارادے قائم کرنے میں شدت سے مصرو ہو۔

دفعتاً اوپر سے چیخوں کی آواز سنائی دی کوئی چلا رہی تھی۔ کوئی ٹین کے ڈبے بجا رہا تھ کوئی کراہ رہی تھی۔ پھر کوئی قہقہہ مار کر ہنس رہی تھی۔

نوجوان چھلانگ مار کر اٹھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے اوپر جنگلے کی طرف دیکھ پھر رعب سے للکارا۔ "کیا ہو رہا ہے۔"

آوازیں بدستور جاری رہیں۔

پھر وہ ایلی کی طرف مڑا خبردار "نوجوان چلایا۔" اگر بھاگنے کی کوشش کی ——" اور پھر

ی زینے میں داخل ہو گیا۔

باس

ایلی اکیلا رہ گیا صدر دروازے سے ملحقہ کمرے میں سے چار ایک شخص باہر نکل کر

می میں کھڑے ہو گئے۔ ایلی غور سے ان آوازوں کو سن رہا تھا۔ جو اوپر سے آ رہی تھیں۔

نہ تو بلی اور نہ سادی کی آوز سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اوپر صورت حال

ہے۔ بہرحال صورت حال تسلی بخش نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس بات پر

محسوس کر رہا تھا کہ اوپر حالات تسلی بخش نہیں معلوم ہوتے تھے۔

خیال آیا وہ مڑا اوپر والے زینے کے مقابل میں ایک دروازہ تھا۔ ہوں اس نے سوچا تو یہ

کمرہ جس میں ہم ملا کرتے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھلا ہو۔

لا پاٹ پڑے تھے۔ اس کے قریب ہی کاٹھ کباڑ والا زینہ تھا۔ سلاخوں والی کھڑکی کے

ایک ان سلگا سگرٹ پڑا تھا۔

پھر ایلی دبے پاؤں زینے سے اتر رہی تھی۔ "خدا کے لئے۔" وہ بولی۔ "آپ اب جائیں

ئے۔"

چلا جاؤں گا چلا جاؤں گا۔ گھبراتی کیوں ہیں آپ اب جاتا ہی ہے نا۔"

ممکن نہیں۔" اوپر کوئی چیخ کر بولی۔

اچانک اوپر دیکھنے لگا۔

لی رو رہی تھی۔

اور دفعتاً نوجوان سیڑھیوں سے نکل کر اندر داخل ہوا۔ "آپ" ہ اس نے ایلی کی طرف

خاموش رک گیا ——

تم ——" کچھ دیر کے بعد نوجوان نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ تم نے میری

الم کر دی ہے۔" اس نے زور سے دروازے پر لات ماری۔ "تم نے وہ جرم کیا ہے کہ

تمہیں قتل بھی کر دوں تو کم ہے۔"

"ہاں" ایلی نے کہا۔ "میں نے چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"بکو نہیں۔" نوجوان کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں۔ "میں تمہاری ٹانگ توڑ کر رکھ دوں گا۔" وہ جوش میں ایلی کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ قریب آ کر نوجوان نے اپنی باہیں ایلی کے گرد حمائل کر دیں اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ نوجوان کی کراہیں سن کر ایلی پر بھی طاری ہو گئی۔

پہلے تو ایلی حیران کھڑا رہا۔ پھر اسے وہی خوشبو سی محسوس ہوئی جو سادی کے لباس میں تھی اور کمرے کی فضا میں اڑا کرتی تھی۔ وہ نوجوان کے قریب تر ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کا دامن پکڑے اور اسے اپنی آنکھوں پر ملے۔

دیر تک وہ دونوں بغل گیر رہے۔

خوش شکل جوان نے آنکھیں پونچھیں اپنا آپ قابو کر کے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"مجھے ساری بات بتا دیجئے۔" اس نے ایلی سے کہا۔ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔

"ساری بات؟" ایلی نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھ سے کوئی بات نہ چھپایئے۔" نوجوان نے منت کی۔

"لیکن۔" ایلی بولا "میں تو چور ہوں چوری کے لئے آیا تھا۔"

نوجوان خاموش ہو گیا۔

"ایک بات پوچھوں۔" کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بات کی۔

"فرمایئے۔"

"اگر ہم پولیس بلوا لیتے تو کیا آپ وہی بیان دیتے۔"

"بے شک۔" ایلی نے کہا۔

نوجوان پھر سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ نے اغوا کا فیصلہ کیسے کیا۔" نوجوان نے پوچھا۔

ایلی خاموش رہا۔

"کیا یہ تجویز آپ کی طرف سے تھی ——" نوجوان رک گیا۔

"میری طرف سے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"سچ کہہ رہے ہیں آپ" نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں۔" ایلی بولا۔

"آپ کا مقصد اسے گمراہ کر کے خراب کرنا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔" ایلی نے غصے میں نوجوان کی طرف دیکھا۔

"تو کیا مقصد تھا۔" نوجوان نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہمیں بلیک میل کرنا۔ ہوں۔" نوجوان کو پھر سے غصہ آ گیا۔

"یہ الزام ہے۔" ایلی نے دانت پیسے۔

"اوہ" نوجوان پھر جلال میں آ گیا"۔ دور ہو جایئے میری نگاہوں سے میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہماری زندگی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جایئے جایئے۔"

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"آپ نے ہمیں وہ دکھ پہنچایا ہے کہ ——" نوجوان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ لیکن یاد رکھئے اگر آپ نے پھر کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو —— جاؤ۔"

ایلی پھر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد نوجوان پھر لپک کر باہر نکلا "محمد علی۔" اس نے کسی کو آواز دی۔ "باہر نکال اسے۔"

چلا وبلا شخص صدر دروازے سے لپک کر آیا اور ایلی کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ پھر اس نے صدر دروازے کی بھاری چٹخنی کھولی اور ایلی کو باہر دھکیل کر اندر سے کنڈی لگا دی۔

باہر صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

کھڑکیوں سے لوگ سر نکال کر دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارے کر رہے تھے۔

"کون ہے؟"

"کدھر ہے؟"

ایلی چپ چاپ سر جھکائے یوں چل رہا تھا۔ جیسے رام باس کو جا رہے ہوں۔

سادی

بہتا تنکا

سفید منزل سے آنے کے بعد ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہو
جہاز کے پاش پاش ہو جانے کے بعد طوفان میں بہتا ہوا ایک ویران ساحل پر آ لگا ہو۔

لاہور کی وہ ہما ہمی گویا معدوم ہو چکی تھی۔ عمارتوں کا وہ پھیلاؤ سمت کر بے معنی تعمیر
بن گیا تھا۔ جسے چاروں طرف سے پھیکے نیلے آسمان نے گھیر لیا تھا سڑکوں پر دھول اڑتی تھی
مکانات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ جیسے دفعتاً زندگی سے حرکت مفقود ہو گئی ہو اور چادر پر ایک سا کن
تصویر رہ گئی ہو۔

سارا دن وہ نیم چھتی میں بیٹھ کر اونگھتا شام کو سوچتا کیا کروں کدھر جاؤں۔

اس کی اس تاریخی واپسی کے بعد صرف ایک دن کے لیے ناؤ گھر میں ہنگامہ سا ہوا تھا۔ نہ
جانے کیسے لیکن بھا جاہ اور پال کو اس رات کے ہنگامے کا علم ہو چکا تھا۔ ممکن ہے بختی بھٹیار
نے بات کہدی ہو یا خون بلغم کے لیب کے اس ڈاکٹر نے انہیں قصہ سنا دیا ہو جو سفید منزل کے
قریب ہی رہتا تھا۔ یا شاید بھانے ہنگامہ سن کر خود جا کر تحقیق کی ہو بہر حال اس روز وہ تینوں دیر
تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

بڑا ہنگامہ ہوا۔" بھانے کہا "سارے محلے والے جانتے ہیں۔"

"ہوں۔" جاہ نے منہ بنایا۔

...بھی کل رات ہم سے بغل گیر ہو رہا تھا۔" پال بولا

...بھا بولا۔ "میں نے بھی کہا بارہ بجے کونسی گاڑی جاتی ہے۔"

...مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایلی چھپا رستم ہے" جاہ نے کہا "انسان کو سمجھنا کس قدر مشکل
...ایک طرف تو وہ پایاب کنارہ اور دوسری طرف یہ عمق" وہ فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔ اس
...کراہٹ میں تحقیر کی جھلک تھی۔

...پال ہنسنے لگا "بھئی عشق و محبت کے دن ہیں۔"

...ہم پر تو نہ آئے یہ دن" جاہ نے کہا ایک سے ذرا سی راہ و رسم ہوئی تھی۔ لیکن یار یہ کام
...کا نہیں۔ کون سارا وقت ضائع کرے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"لیکن کیا واقعی وہ جا رہے تھے؟" پال نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" بھانے کہا۔

...حیرت ہے۔" جاہ بولا ایلی پر کوئی اس قدر مفتون ہو جائے کہ ——" وہ ہنسنے لگا "ہاں بھئی
...پر ہوتی تو بات بھی تھی اور پھر انصار منصر کا گھرانہ۔ کوئی معمولی گھرانا نہیں۔"

...انصار منصر" پال نے پوچھا وہ کون ہے۔"

...امیر تو خیر نہیں مگر بڑا مہذب متمدن گھرانا ہے اور منصر کی قابلیت کا بڑا چرچا ہے اصلیت کا
...ممکن مجھے شاید واقعی قابل ہو۔ ویسے اونچے ہوٹلوں میں بیٹھنے والا آدمی ہے۔"

...پھر تو بڑا آدمی ہوا۔" پال تمسخر سے بولا جاہ ہنسا "باقی اللہ جانے۔"

"ایلی سے پوچھیں تو ہی" بھانے کہا۔

...فضول" جاہ بولا جس بات کو اس نے ہم سے خود جان بوجھ کر راز رکھا ہے ——اور پھر
...کے پرائیویٹ معاملات میں دخل دینا ——"

...ایلی نے بھی پہلے روز تذکرہ چھیڑا تھا۔

...یار مجھے خواہ مخواہ پٹوا دیا۔" وہ بولا "میں چیختا چلاتا رہا کہ میں نہیں ہوں لیکن انہوں نے
...ایک نہ سنی۔ اور پھر اندر لے جا کر پھر سے پٹائی شروع کر دی پھر دھونس جمانے لگے میں
...بار بار کہا کہ حضور میں نہیں ہوں۔ آپ غلط آدمی کو پکڑ لائے ہیں لیکن وہ میری بات ہی
...سنتے تھے وہ تو شکر ہے تم واپس آ گئے اور تمہاری آواز سن کر میں نے شور مچا دیا کہ وہ ہے وہ
...اگر تم نہ آتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔"

یہ قصہ سنانے کے بعد وہ الیاس سے پوچھتا رہا کہ اس کے ساتھ سفید محل والوں
سلوک کیا۔ ایلی نے مختصر سی بات بتا کر قصہ ختم کر دیا۔

دو دن تو ایلی چپ چاپ اس وسیع ویرانے کو حیرت سے گھورتا رہا جو اس کے اردگرد
ہوا تھا۔ تیسرے روز اس دھندلکے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی ڈاک سے ایلی کے نام
کا ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا از راہ کرم مجھے شام کے وقت میرے دفتر میں ملیے
دفتر کا مفصل پتہ تحریر تھا۔

خط موصول ہونے کے بعد ایلی کے گرد و پیش پھر سے استوار ہو گئے۔ چیزیں پھر سے
اصلی روپ میں اجاگر ہو گئیں۔ آسمان سمٹا شہر پھیل گیا۔ نہ جانے کیوں بلایا ہے ایلی نے
شاید کیس پولیس کے حوالے کر دینے کا ارادہ ہو۔ یا شاید پھر سے تحقیق کرنی ہو۔ چاہے کچھ
ہو۔ چاہے اس ملاقات کی نوعیت ضرر رساں ہو۔ پھر بھی ملاقات تو ہو گی۔ چاہے حقیر سا
ایک تعلق تو استوار ہو گا۔ اور پھر منصر کا قرب اس کے گدرے سے ہاتھ پاؤں اس کے ہونٹ
خم۔ اس کا ذہانت بھرا حسین چہرا ——— ایلی بے حد خوش تھا۔

انصار منصر

شام کے وقت جب وہ دفتر پہنچا تو منصر نے اس کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔
"بیٹھیے۔" وہ بولا ذرا میں کام ختم کر لوں۔ سگرٹ پیجیے۔" اس نے پیکٹ ایلی کی طرف
دیا اور یوں کام میں منہمک ہو گیا جیسے اسے خصوصی طور پر بلایا ہی نہ گیا ہو۔

دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا وہ حیرت اور احترام بھری نگاہوں سے منصر کو دیکھتا رہا۔ پھر منصر
اٹھا۔

آپ کو زیادہ دیر کے لیے انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟" منصر نے اس کے قریب آ کر بے تکلفی
سے کہا ایلی اس کے رویئے پر حیران تھا۔

"آیئے" منصر نے کہا "اب چلیں۔"
لیکن" ایلی نے کہا۔ آپ نے تو مجھے بُلایا تھا۔"
"ہاں ہاں" منصر بولا چلئے ناگھو میں پھریں گے۔"
ایلی نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا۔

کسی جگہ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" منصر نے پینترا بدلا۔
منصر نے ایلی کو اپنے موٹر سائیکل کے پیچھے سوار کر لیا اور وہ دونوں چل پڑے۔
سٹفلز ہوٹل میں پہنچ کر منصر نے سرسری طور پر کہا۔
میں نے سوچا آج شام اکٹھے بسر کریں۔ آپ تو سارا دن مطالعہ کرتے تھک جاتے ہوں
شام کو ذرا سی تفریح ہی سہی۔"
ایلی سوچ رہا تھا کہ کہاں وہ باہر نکال دو اس بدمعاش کو۔ اور کہاں یہ اکٹھے شام بسر کرنے کی
اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دو گھنٹے اکٹھے رہنے کے بعد منصر نے اشارتاً بھی کسی ایسی بات
کا ذکر نہ کیا تھا جو گزشتہ واقعہ سے متعلق ہو۔ وہ نہایت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ایلی سے
باتیں کر رہا تھا۔ جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں۔
انصار منصر کی شخصیت کو دیکھ کر ایلی بھونچکارہ گیا۔ وہ ایک خوب صورت اور پیارا جوان
تھا۔ اس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود نفیس تھا۔ جس میں رنگوں کا حسین امتزاج تھا۔ اس کی
بات میں لے تھی۔ باتوں میں مزاح کی جھلک تھی۔ مزاج رنگین تھا اور شعر و سخن ادب اور
آرٹ سے لگاؤ تھا اور اس کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں۔
منصر نے جب ایلی کو ناؤ گھر کے دروازے پر موٹر سائیکل سے اتارا تو وہ کہنے لگا اگر اعتراض
نہ ہو۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو کوئی پروگرام نہ ہو اور تعلیم کا حرج نہ ہو تو کل شام کو دفتر
آ جایئے گا۔"

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ سارا دن وہ کتاب سامنے رکھ کر شام کے خواب دیکھتا
اور شام کو منصر کے دفتر میں پہنچ جاتا اور پھر جب منصر کام سے فارغ ہوتا تو وہ اس کے موٹر
سائیکل پر یوں بیٹھا تا جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ شاہ کا جلوس سڑکوں پر گھومتا۔ لوگ حیرت سے
ان کی طرف دیکھتے اور ادب سے صف آرا ہو جاتے کورنش بجا لاتے۔ جب وہ سٹفلز ہوٹل میں
پہنچتے تو بیرے تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔
اگرچہ منصر کی عادت تھی کہ وہ عالمانہ باتیں کرنے سے احتراز کرتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی
بات چلتے چلتے منصر کے منہ سے نکل جاتی جسے ایلی یوں حفظ کر لیتا جیسے وہ قرآن کریم کی آیت
ہو۔ عالمانہ بات چھوڑیئے منصر کوئی بھی ایسی بات کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ جس سے اس کی
برتری ثابت ہو۔ یا جو ایلی کو احساس کمتری دلائے۔ عجیب بات تھی یہ کہ منصر نے کبھی ایلی کو اس

حقیقت کا احساس نہ دلایا تھا کہ وہ سادی کا بھائی ہے یا اسے اس گھرانے سے کوئی تعلق ہے جہاں ایلی پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔ منصر نے اس دوران میں التزاماً" اپنے گھر کے متعلق صرف ایک بات کی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر کہنے لگا۔

"الیاس صاحب آپ سفید منزل کی طرف کبھی نہ جایئے گا۔ ورنہ بڑی قباحتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور ممکن ہے ———" وہ رک گیا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے کہنے لگا "مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حماقت نہیں کریں گے لہٰذا جملہ مکمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس کے علاوہ ایک روزان جانے میں منصر کے منہ سے گھر کی بات نکل گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سادی بیمار ہے اور کسی سپیشلسٹ کے زیر علاج ہے۔ اس پر ایلی چونکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر سے پوچھے کہ اسے کیا تکلیف ہے اور اب کیا حال ہے۔ لیکن منصر نے موضوع بدل دیا تھا اور ایلی میں پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی پھر کچھ دیر کے بعد وہ منصر میں اس حد تک جذب ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ سادی بیمار ہے۔

پھر شام گزارنے کے بعد رات کے گیارہ بجے جب منصر نے اسے اپنے موٹر سائیکل سے اتارا تھا تو ناؤ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً" ایلی کو یاد آیا تھا کہ سادی بیمار ہے۔ وہ تڑپ کر مڑا تھا کہ منصر سے پوچھے لیکن منصر جا چکا تھا۔ چند ایک روز کے بعد منصر نے خود ناؤ گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کبھی اوپر نہ آیا تھا۔ شام کے وقت وہ ناؤ گھر کے نیچے ہارن بجاتا اور ایلی فوراً نیچے اتر آتا۔ روز موٹر سائیکل کو ناؤ گھر آتے دیکھ کر بھا جاہ اور پال حیرانی سے ایلی کی طرف دیکھتے تھے اور جمال تو اسے دیکھ کر یوں کھل جاتا جیسے خربوزہ مٹھاس کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

"یار ایلی تم کمال ہو۔" وہ چلاتا "یار تم تو منزل تک پہنچ کر رہے۔ اب کیا ہے اب تو رام ہو گئے ہیں۔ کیوں۔"

لیکن ایلی کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ جمال سے اجتناب کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جمال کے روبرو ایلی احساس جرم محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جمال کے سفید رنگ اور سنہرے بالوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہو جیسے اس نے شکار کرنے کے لیے سنہرے بالوں کا دانا پھینکا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اس کی بات ٹال دے۔

نیم چھتی سے نیچے تو ایلی جاتا ہی نہ تھا۔ اگر کبھی جاتا بھی تو کوشش کرتا کہ جاہ سے دو چار نہ ہو۔

لیکن کبھی کبھار جاہ تک بات پہنچ ہی جاتی اور وہ منہ بنا کر کہتا۔

"ہاں بھئی آج کل ایلی صاحب اونچی ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ ہم رینگنے والے لوگ ان کی نظروں میں کہاں سماتے ہیں۔"

اور یہ ایک حقیقت تھی جب سے ایلی منصر سے واقف ہوا تھا اس کے دل میں جاہ کے لیے وہ جذبہ احترام نہ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگینی سے بے گانہ ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی علم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

کبھی کبھار جب وہ منصر کے پاس ہوتا تو اسے خیال آتا کہ اگر میں بی۔ اے نہ کر سکا تو کیا ہو گا یہ لوگ کیا سمجھیں گے شاید وہ ایک انڈر گریجویٹ کو درخور اعتنا نہ سمجھیں۔ اس روز گھر آ کر سنجیدگی سے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کتاب کے صفحات سے سادی جھانکتی۔ "میں بیمار ہوں"۔ منصر ہنستا "آپ مجھ سے بات کریں الیاس صاحب۔ براہ راست ان سے بات نہ کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہے۔" سادی چلاتی۔ اونہوں۔ ان کا آپ سے تعلق صرف میری وجہ سے ہے ان کی مہربانیاں میری وجہ سے ہیں۔ ان میں نہ کھو جایئے گا۔ یہ صرف آپ کی توجہ کو جذب کرنا چاہتے ہیں تاکہ مرکز ٹوٹ جائے۔"

ایلی کتاب بند کر دیتا۔ پھر اسے محسوس ہوتا کہ زینے میں شہزاد کھڑی حرماں بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ مڑتا۔ شہزاد آنکھیں جھکا لیتی اور زیر لب کہتی "نہیں میں نے کچھ نہیں کہا" اور پھر سیڑھیاں اترنا شروع کر دیتی۔

امتحان

ایک روز جب منصر اور ایلی دونوں ہوٹل میں بیٹھے تھے تو منصر نے غیر از معمول بیرے کو آرڈر دیتے ہوئے کہا "دو چھوٹا" ایلی چونکا۔ دو چھوٹا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے تو منصر نے کبھی دو کا آرڈر نہ دیا تھا۔ شاید بے خبری میں ——— لیکن منصر تو بے خبری میں بھی ہوشمندی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ اس میں عقل اور جذبے کی عجیب سی آمیزش تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جذبہ حاوی رہتا تھا لیکن اظہار کرنا منصر کے نزدیک سستا پن تھا۔ اس کا وقار اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

بیرے نے دونوں چھوٹے میز پر رکھ دیئے۔ منصر نے سگرٹ جھٹکتے ہوئے تعجب سے میز کی

طرف دیکھا۔ ارے کیا میں نے دو منگا لیے اچھا" وہ ہنسنے لگا"تو لیجئے"پھر دفعتاً" اس نے بات بدلی "چلو کیا حرج ہے آپ کوئی مولانا تو ہیں نہیں' آیئے میرے ساتھ شامل ہو جایئے۔"

"میں نے آج تک ـــــ" ایلی نے معذرت کے لیے منہ کھولا۔

"اوہ" وہ اک انداز محبوبیت سے بولا "خدارا اب مسائل بیان کرنے نہ شروع کر دینا۔"

"لیکن ـــــ" ایلی نے پھر کوشش کی۔

"آخر یہ لیکن ایک نہ ایک روز تو ٹوٹے گا ہی۔ چلئے آج ہی سہی۔" وہ مسکرایا مجھے معلوم ہے کہ آپ نے کبھی ـــــ ہاں ہاں اب کیا پردہ ہے۔"

اب کیا پردہ ہے۔ اب کیا پردہ ہے سڑک پر موٹر بھونکنے لگی۔ اب کیا پردہ ہے ہوٹل کے سازندے نے وائلن پر دہرایا۔ ہا ہا ہا۔ پاس بیٹھا ہوا ایک موٹا سکھ ہنسنے لگا۔"سب پردے ہٹا دو یہ ہے۔ کیا چیز ہے۔"

دفعتاً" ایلی کو خیال آیا کہ شاید منصر سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اسے پلا رہا ہے۔ پلانا چاہتا ہے تاکہ ـــــ اس کا دل ڈوب گیا۔ شاید وہ ایلی سے سادی کی ملاقاتوں کے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہشمند ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے انکار پر اصرار کیا تو منصر سمجھے گا کہ وہ اپنا راز محفوظ رکھنے کے لیے انکار کر رہا ہے اس سے ثابت ہو گا کہ راز کا وجود ہے۔ ایلی نے اپنا آپ پتھر بنانے کی شدید کوشش کی۔ اس نے اپنے تمام تر عزم کو للکارا کوئی بات زبان پر نہ آئے کوئی ایسی بات جس میں سادی پر حرف آئے۔ سادی کی عزت کا سوال ہے۔ پردہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ یہ دو گھونٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے نہیں بگاڑ سکتے۔ ایلی نے چھوٹا اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ ذرا نہ کانپا۔ اور وہ اسے یوں غٹ غٹ پی گیا جیسے چھوٹا نہیں بلکہ شربت کا گلاس ہو۔ ایک ساعت کے لیے منصر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر دفعتاً" مڑ کر چلایا بیرا دو چھوٹا اور۔"

چار چھوٹے نگلنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ اس کے اندر آگ لگی ہے۔ باہر ہوٹل پر ایک سرخ دھند لکا چھائے جا رہا تھا۔ اور وہ پورے عزم سے اپنے آپ کو پتھر بنانے میں مصروف تھا۔

"آپ کا امتحان کب ہو رہا ہے؟" منصر نے پوچھا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کہدے امتحان تو ہو رہا ہے ممتحن سامنے بیٹھا ہے۔

پندرہ روز کے بعد ہو گا" وہ بولا "مشن کالج میں سنٹر بنا ہے۔"

منصر نے کئی ایک بار کہا کوئی بات کیجئے الیاس صاحب۔ کچھ کہیئے۔

اس کے بعد اس نے خود کچھ کہنا شروع کر دیا۔" آپ نے وہ شعر سنا ہے؟"

نہ پوچھ حال میں وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

کچھ دیر تک وہ اسے گنگناتا رہا۔ پھر بولا" مجھے شعر بے حد پسند ہیں۔ اور میں محسوس کرتا جیسے سینکڑوں اشعار بے تاب ہوں اگرچہ میں آج تک اپنے خیال کو شعر کا جامہ نہیں پہنا سکا۔ ایک عظیم کیفیت کو چند الفاظ میں کہہ دینا بڑی بات ہے۔ ہم تو بہت سارے الفاظ میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو کونسا شعر پسند ہے؟" اس نے پوچھا۔

ایلی کو اس وقت کوئی شعر یاد نہ آرہا تھا۔

پھر دفعتاً" منصر نے بات کا رخ بدلا۔ "ہاں تو الیاس صاحب ذرا اس واقعہ کی تفصیلات تو بتایئے جو ہماری ملاقات کا موجب ہوا۔ میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" وہ بولا "کیونکہ میرے دل میں بے لاگ استفسار پیدا ہوا ہے کسی خاص مقصد کے تحت نہیں پوچھ رہا اور نہ ہی آپ کے بتانے پر کسی قسم کے نتائج پیدا ہوں گے۔"

ایلی نے شدت سے پتھر بننے کی کوشش کی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "دراصل بات وہی تھی جو انہوں نے آپ کو بتادی تھی۔" ایلی نے کہا"میں نے کوئی تفصیل چھپائی نہیں۔"

"ہوں" منصر نے کہا۔ "پھر بھی۔"

"آپ پوچھیئے کونسی خصوصی تفصیل ـــــ"

"کیا ادھر سے ابتدا ہوئی تھی؟" منصر نے کہا "یا آپ کی طرف سے۔"

"ادھر سے نہیں" ایلی نے کہا۔

"تو آپ نے ہی تحریک شروع کی تھی۔"

"ہاں۔"

"تو ادھر سے کیا رد عمل ہوا۔"

"اظہار نفرت۔" ایلی نے کہا۔

منصر ہنسنے لگا۔ "آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں"۔

"مجھے کل کلوٹے کا خطاب دیا گیا۔"

"ہوں۔ تو کیا آخری واقعہ کے متعلق وہ تجویز آپ کی ہی تھی؟؟"

"ہاں"

"اس سے آپ کا مقصد کیا تھا۔"

"جذبہ اور کیا۔ میں نے سوچا نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"آپ نے یہ نہ سوچا کہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"نہیں" ایلی نے کہا۔

"اور آپ کی تجویز منظور کیسے کر لی گئی؟؟"

میں نے خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس لیے۔"

منصر قہقہہ مار کر ہنسا۔

"اور وہ زیور۔ کیا آپ کے کہنے پر لایا گیا تھا۔"

"نہیں۔ بلکہ اگر وہ اٹیچی نہ ہوتا تو ہم جا چکے ہوتے۔"

"کیسے۔"

"میں نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔"

"پھر آپ موقعہ سے بھاگ کیوں گئے؟"

"مجھے میرے دو دوست زبردستی گھسیٹ کر لے گئے تھے۔"

"ہوں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا آپ بھی خوب ہیں الیاس صاحب۔"

"کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا اگر آپ لوگ چلے جاتے تو کیا کرتے۔"

"شادی ——" ایلی نے کہا۔

"ہوں۔" منصر نے ایک بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی۔

آپ کو امداد دینے والا کوئی تھا۔ میرا مطلب ہے جہاں سے امداد کی توقع لگائی جا سکے

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"آپ کے والدین زندہ ہیں۔"

"جی۔"

"تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے۔"

"اونہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیوں" منصر نے پوچھا۔

"والد صاحب کی تین بیویاں ہیں۔"

"ہوں۔ اور آپ کی اپنی والدہ۔"

"وہ ان کی پہلی بیوی ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ایلی اٹھ بیٹھا اس کا ضبط ختم ہو چکا تھا ہوٹل کا وہ کمرہ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ میز ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کسی نالی میں گر کر بے ہوش ہو جائے گا۔

منصر بار بار اسے کہہ رہا تھا کچھ کھائے نا لیکن تلے ہوئے آلوؤں کے علاوہ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹھئے نا" منصر نے کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"چلئے میں آپ کو ٹھیک کر دوں۔" منصر نے ایلی کو سائیکل پر بٹھا لیا۔ ایلی نے مضبوطی سے منصر کو پکڑ لیا۔ اور پھر ایلی کو اس وقت ہوش آیا جب سائیکل رک چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ تاؤ گھر آ گیا وہ بھونچکارہ گیا۔ شاید نشے کی وجہ سے اسے تاؤ گھر کا چھوٹا سا دروازہ پھاٹک دکھائی دے رہا تھا۔

"آئیے۔" منصر نے آکر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

ارے۔" حیرت سے اس نے منصر کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں سفید منزل میں داخل ہو رہے تھے۔

"ایک بات کہوں۔" منصر نے ہنس کر ایلی سے کہا۔ "پہلے تو ہم نے آپ کی بات تسلیم کر لی تھی لیکن اگر اب آپ کہیں کہ آج پینے کا آپ کا پہلا موقعہ تھا۔" تو وہ رک گیا۔" بات قابل قبول نہیں۔"

"بیٹھئے منصر نے کہا۔ ایلی نے کمرے کی طرف دیکھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ چند روز پہلے چور کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اور آج —— لیکن آج تو اسے اپنی حیثیت کا علم نہ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ واقعات پر اسرار طور پر رخ بدل رہے تھے نہ جانے کیا ہونے والا ہے نہ جانے کیا ہو گا۔ ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصر نے کئی بار اسے "تاکیداً" کہا تھا۔ "الیاس

صاحب آپ کا ہمارے گھر جانا یا کسی قسم کا کوئی رابطہ پیدا کرنا ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہو گا اور اب جب کہ ہمارے دوستانہ مراسم ہو چکے ہیں اگر آپ نے چوری چھپے کوئی بات کی یا کوئی بات مجھ سے چھپائی تو مجھے دکھ ہو گا"۔

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ یہاں آپ کو کیوں لایا گیا ہے۔ مجھے دفعتاً خیال آیا کہ اس حالت میں آپ کو اپنے لاج میں نہیں جانا چاہیے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لیجیے سگرٹ پیجیے۔ اوہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ آپ سگرٹ نہیں پیتے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں کیونکہ اس عمر میں کم و بیش لوگ سگرٹ پینا شروع کر ہی دیتے ہیں۔"

سائیکل پر ہوا کھانے کے بعد ایلی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کے تمام جسم میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ منہ سخت کڑوا ہو رہا تھا طبیعت مالش کر رہی تھی۔

"آپ کچھ دیر کے لیے یہاں آرام کیجیے۔ لیٹ جائیے۔" لیکن ایلی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ابھی آیا" کہہ کر منصر چلا گیا ور ایلی کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

پھر دفعتاً" اس کی طبیعت گھبرائی وہ باہر بھاگا۔ سامنے اس زینے کا دروازہ تھا جہاں وہ پہلے کئی ایک بار آچکا تھا لپک کر کنڈی کھولی اور اندر پہنچتے ہی شدت سے قے کرنا شروع کر دیا۔

قے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اس نے اس کمرے کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی۔ فرش پر ابھی تک سگرٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ سیڑھیوں پر ایک ماچس پڑی تھی۔ اسے ان ملاقاتوں کا خیال آگیا۔ یہاں وہ بیٹھ جایا کرتا تھا اور کوئی کہا کرتی تھی" آپ بیٹھ کیوں گئے۔ اٹھئے نا"

"آیئے نا۔" اس کی پشت پر منصر کھڑا تھا۔"یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ آپ۔"

اسی روز باتوں ہی باتوں میں منصر نے پردے کا موضوع چھیڑ دیا۔ "پردے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔"

"میں نہیں سمجھا ایلی نے کہا۔ میرا مطلب ہے۔" منصر نے کہا جہاں تک ہمارا تعلق ہے آپ کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے ایک بیگانے کی۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ آپ سے خصوصی سلوک کیا جائے۔"

ایلی کو منصر کی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

منصر کہنے لگا "اگر ہمارے لوگ آپ کے سامنے آئیں تو تخصیص کیوں کی جائے کیوں نہ وہ سر عام پر آئیں سب کے سامنے۔"

"میں نہیں سمجھا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا۔" منصر چلایا" اگرچہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں یہ مسئلہ اس قدر ٹیڑھا ہے کہ ——— اور میں نے آج تک اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب ——" وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں گرفتار ہے۔

"جی" ایلی نے کہا۔

"جی کیا۔" وہ بولا کیا سمجھے آپ۔"

"کچھ بھی نہیں۔" ایلی نے کہا۔ منصر نے ایک قہقہہ لگایا۔

"تعجب کی بات ہے" وہ بولا" ہم دونوں اس قدر قریب ہیں بہت قریب اتنے قریب کہ آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہم دونوں بیک وقت اس قدر بیگانہ ہیں اس قدر دور کہ ———"

منصر رک گیا۔ "سگریٹ پیجیے۔ اوہ ——— سگرٹ تو آپ پیتے ہی نہیں ——— ہاں تو میں کہہ رہا تھا ——— کیا کہہ رہا تھا میں ———" وہ ہنسنے لگا "ہاں ——— آپ نے داستو وسکی کا ناول برادرز کیراموزوز پڑھا ہے؟"

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا "میں نے صرف ایڈیٹ اور کرائم اینڈ پنشمنٹ پڑھے ہیں۔"

"ضرور پڑھئے۔ وہ بولا ——— اسے پڑھے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے۔"

"آپ کی کتنی ہمشیریں ہیں؟" منصر نے دفعتاً" بات بدلی۔

"ایک" ایلی نے کہا۔

"بڑی ہیں یا چھوٹی۔"

"بڑی۔"

"تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھوٹی بہن کا مفہوم کیا ہے۔" منصر نے جوش اور جذبے سے کہا۔

ایلی نے سوچا کہ شاید منصر نشے میں باتیں کیے جا رہا ہے۔ لیکن خصوصی طور پر آج کیوں؟

وہ یہ نہ سمجھ سکا "مجھے اپنی ہمشیرگان سے بے حد محبت ہے۔" منصر بولا آپ اندازہ نہیں کر سکتے
ہیں۔ بہرحال پردے کا تو میں قائل نہیں ہوں میرا مطلب رسمی پردے سے ہے۔ پردے کے
بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے ایلی سے پوچھا۔

"میں تو رسمی پردے کو فضول سمجھتا ہوں۔"

"ہاں۔" دفعتاً" منصر نے پھر بات کا رخ بدلا۔ آپ کو ٹینس سے دلچسپی ہے؟"

"جی ہاں کچھ کچھ ہوسٹل میں کھیلا کرتا تھا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب ٹینس چیمپین شپ کا فائنل ہو رہا ہے۔"

"جی نہیں۔"

تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کل شام کے چار بجے لارنس باغ کی گراؤنڈ میں یہ میچ ہو
اور آپ ہمارے ساتھ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ چار بجے وہاں از خود پہنچ جائیے گا۔ وہاں ملاقات
ہو گی۔"

منصر کی اس روز کی باتیں ایلی کو قطعی طور پر سمجھ میں نہ آئیں۔ نہ جانے وہ رنگیلا راجہ
کچھ کہہ رہا تھا شاید گپ ہانک رہا ہو۔ لیکن ان کہی بات کرنے میں منصر کو کمال حاصل تھا اور اس
حقیقت سے ایلی واقف تھا۔ پھر بھی اس روز کی باتیں تو نہ کہی تھیں نہ ان کہی۔

منظر عام

اگلے روز جب ایلی ٹینس میچ کے میدان میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی منصر کے
ہمراہ سادی باجی اور ایک معمر خاتون تھیں وہ تینوں بے نقاب تھیں۔ ایلی انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔

"آیئے آیئے" منصر چلایا "یہ ہیں الیاس صاحب" اس نے خاتون کو مخاطب کر کے کہا "یہ
آپ والدہ صاحبہ ہیں۔ اور انہیں" اس نے سادی اور باجی کی طرف دیکھ کر کہا "انہیں تو آپ
جانتے ہیں۔" ایلی نے جھک کر والدہ کو سلام کیا۔

ایلی نے شدید خواہش کے باوجود سادی اور باجی کی طرف نہ دیکھا اس میں ہمت نہ پڑی
اسے منصر کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے کہا تھا تا کہ پھر تخصیص کیوں کی جائے۔ منصر نے
سادی اور باجی کو منظر عام پر لانے سے گریز نہ کیا تھا۔ ایلی نے حیرت بھرے احترام سے منصر کی
طرف دیکھا۔ کس قدر پر وقار تھا وہ چھوٹا سا خوب صورت آدمی۔

کھیل کے دوران میں ایلی نے دو ایک بار چوری چوری سادی کی طرف دیکھا۔ اس کے
ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ سادی نہیں بلکہ سکندر ہو جو دریائے جہلم کے
کنارے کھڑا ہو۔

کھیل کے وقفے میں والدہ کے اشارے پر منصر نے بیرے کو آواز دی لیکن اس کی آواز کسی
نے نہ سنی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

والدہ نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں۔" ایلی نے کچھ کہنے کے لیے کہا۔

وہ مسکرائیں اور پھر کہنے لگیں۔ "کبھی مجھ سے ملو نا' مجھے تم سے باتیں کرنا ہے۔"

"جی" ایلی نے جواب دیا۔

"گھر پر آئیے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب۔" والدہ نے کہا۔

"بہت اچھا۔" ایلی نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

"گھڑی دے دیجئے انہیں" سادی چمک کر بولی۔

"جی۔" ایلی نے سادی کی طرف دیکھے بغیر کہا "کہیں دو بجے نہ آ جائیں۔" وہ بولی۔

"ضرور آنا بیٹا" والدہ نے یوں جواب دیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"جی ——"

"اور ——"

"میں انتظار کروں گی۔" والدہ بولیں اور —— پھر منصر کی آمد پر وہ دفعتاً" چپ ہو
گئیں۔

منصر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

والدہ صاحبہ کا وہ "—— اور ——" ایلی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس پر مسلط ہو گیا۔ اس کے
ترنم میں کتنی پر معنی خاموشی تھی۔ مفہوم سے لبریز خاموشی کیا وہ اشارہ اور کنایہ کی عظمت سے
کس حد تک واقف تھے۔ ایلی حیرت سے اس معزز خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا سن پچاس
کے لگ بھگ ہو گا اس کے چہرے پر وقار کی نسبت محبت کے نقوش زیادہ پھیلے ہوئے تھے۔ اس
کی مسکراہٹ میں ایک حسرت زدہ مٹھاس تھی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ایلی سفید منزل میں داخل ہوا تو وہ اس کے روبرو آگیا۔ والدہ پہلے ہی سے اوپر جنگلے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایلی کو دیکھ والدہ نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ دستک دیئے بغیر دروازے پر کھڑا رہا پھر کھلا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو دروازہ بند کر لیا گیا۔ نچلی منزل ویران پڑی تھی۔

رسمی باتوں کے بعد والدہ نے کہا "مجھے اپنی بچیوں سے بڑی محبت ہے۔ بڑی محبت۔" آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کیا کروں میں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور چھوٹی تو بڑی ہی ہے۔ بڑی ہی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تم بڑے اچھے ہو۔" دفعتاً" والدہ نے موضوع بدلا "تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ——"

"مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی" وہ رک گئی۔

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔" ایلی نے کہا۔

"مجھے باتیں نہیں کرنا آتیں بیٹا۔" وہ بولی۔

"جی" ایلی نے اس رسمی جملے پر شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس خاتون کو یوں آغوش میں لے لے جیسے وہ ایک ننھی سی بچی ہو مگر اس میں ہمت نہ پڑی ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجا۔

آؤ نا ادھر اس کمرے میں آجاؤ اس بغلی کمرے میں آیئے اگر اماں کو پتہ چلا کہ تم اس میں آئے ہو۔ تو قیامت آجائے گی۔"

"اماں؟" ایلی نے دہرایا۔

ہاں۔ وہ ہمارا عزیز ہے اللہ رکھے بڑی کا منگیتر ہے۔ چھوٹی کی منگنی ابھی نہیں ہوئی لال جوشیلا ہے۔ پتہ نہیں کیا کر دے —— آؤ ادھر آجاؤ۔"

جب وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا تو قریب ہی سے ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ دونوں سادی اور باجی بیٹھی آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔ اب تم سے کیا پردہ ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

ایلی سر جھکا کر ادب سے بیٹھ گیا۔

سادی نے باجی کے کان میں کہا۔ "دوپٹہ لادو انہیں باجی۔" اور اس نے جان بوجھ کر اتنی آواز میں کہا کہ ایلی سن لے۔

ایلی خاموش بیٹھا رہا اور والدہ سے رسمی باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔

"دیکھو تو۔" سادی پھر بولی جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔"

"اب میں کیا کہوں۔" ایلی نے والدہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا کہا تم نے میں نہیں سمجھی۔" وہ بولیں۔

"میں نے عرض کیا کہ ——" ایلی رک گیا۔

"جملہ مکمل کر دو باجی۔" سادی پھر بولی۔

"جملہ نہیں" وہ بولا "—— کہانی۔"

"وہ کیا میں تھوڑا کروں گی۔" سادی قہقہہ مار کر ہنسی۔

"نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔" والدہ بولیں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھیں "میں ذرا دیکھوں تو لال تو نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

"یہ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے نہ جی۔" وہ چمک کر بولا۔

"اٹیچی نہ اٹھانے کی سزا بھی تو ملنے چاہیے باجی انہوں نے ضد کر کے سب کچھ کھو دیا۔"

"کھویا تو نہیں پالیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"اونہوں پالیا ہے۔" وہ بولی بڑی ہمت والے تو دیکھو یہ تو مابدولت کی محنت کا نتیجہ ہے۔"

"جی" ایلی نے کہا "مابدولت تو غش کھا کر گرنا جانتے ہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسی "غش نہ کھاتے تو بات بھی نہ بنتی۔"

"میں نے سنا تھا تم بیمار تھیں سادی۔"

"اپنا تو وہی بات ہے کہ فراق یار میں گھل گھل کے بن گئے ہاتھی۔" وہ ہنسنے لگی۔

"جھوٹ۔" باجی نے کہا۔

"خاموش باجی۔" سادی اٹھ بیٹھی۔

"دراصل ——" باجی نے بات کرنے کی کوشش کی۔

"ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں۔" سادی نے کہا "اور کل" وہ ایلی سے مخاطب ہوئی۔

"یوں ٹینس بال پر نگاہیں جما کر بیٹھے رہے جیسے حافظ حلوے پر جمائے رہتے ہیں۔"

"ایک گھنٹہ تباہ کر دیا۔ کیوں جی۔ ہم سے بات بھی نہ کی۔"

"تم سے باتیں کرنے کا مزا تو چکھ لیا۔"

"ابھی سے گھبرا گئے۔ اور ہم تو حضور سے امیدیں لگائیں بیٹھے ہیں وہ کیا ہوں گی۔" ملا
چمک کر بولی۔

"ایک کال کلوٹے سے ——" ایلی رک گیا۔

"خاموش ——" سادی نے ایلی کو ڈانٹا۔ "ہائے باجی یہ تو ساری عمر معاف نہ کریں گے
مجھے" وہ ہنسنے لگی۔

"اور وہ سنہری بال خواہ مخواہ پٹ گیا بیچارا۔"

"ہئے واقعی۔" باجی بولی۔

"دونوں طرف پٹ گیا۔" ایلی نے کہا۔

"کچھ کہتے تھے وہ" سادی نے پوچھا۔

"کہتا تھا یار یہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں کبھی کچھ کبھی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔"

"آپ انہیں ساتھ کیوں لائے تھے جی۔ ساتھ لا کر پٹوا دیا۔" سادی نے پوچھا۔

"خود ضد کر کے آیا تھا۔" ایلی نے کہا۔

مجھے حیرانی ہے۔" سادی ہنسی انہوں نے انہیں کیوں پکڑ لیا۔ آپ کو کیوں نہ پکڑا۔"

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔" ایلی بولا۔

"کیوں۔" باجی نے پوچھا۔

"سنہری رنگت والی گوری کے ساتھ گلفام ہی ہونا چاہئے نا۔"

"بس ان سے بات بھی نہ کرو باجی۔" سادی غصے میں اٹھ بیٹھی۔

"مجھے دیر ہو گئی۔" والدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن اماں نہیں ہے چلو فکر تو دور
ہوا۔"

کیراموزووز

اس کے بعد ایلی کے شب و روز میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن
اسے گھر بلایا جاتا۔ وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھ جاتے سادی زیر لب بات چھیڑتی، ایلی والدہ

ے باتیں کرتا لیکن روئے سخن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھیڑتیں اور ایلی کے
جواب پر والدہ حیرانی سے کہتی میں نہیں سمجھی۔"
پھر والدہ اماں کو دیکھنے کے لیے باہر چلی جاتیں اور وہ اکیلے رہ جاتے اور پھر وہ بچوں کی طرح
جھگڑتے حتیٰ کہ ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی اور والدہ واپس آجاتی اور ان کا وہ شور شرابا پھر سے
دب کر اشارات کی شکل اختیار کر لیتا۔

شام کو ایلی منصر کے دفتر جا پہنچتا اور پھر لاہور کی سڑکوں پر شاہ کی سواری نکلتی اور لوگ بصد
ادب و احترام دو رویہ کھڑے ہو کر کورنش بجا لاتے اور پھر ہوٹل میں وہ اس عظیم شخصیت کے
روبرو ادب و احترام کے جذبات لیے بیٹھ جاتا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھے جاتا۔ اسے منصر
سے محبت ہو چکی تھی۔ والہانہ محبت۔

پھر ایک روز جب وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھی تو دروازے پر کسی
نے ٹھڈے ماری۔

"دروازہ کھولو۔" کوئی راکشش چنگھاڑا۔

والدہ صاحبہ نے آواز سنی چہرا زرد پڑ گیا۔" ہے" وہ ہاتھ ملنے لگیں اب کیا ہو گا۔ اماں کو پتہ
چل گیا۔"

"کون ہے۔" اماں نے پوچھا۔

"میں ہوں اماں" وہ چیخنے لگا دروازہ کھولو۔"

"اے ہے۔" اماں بولیں اس وقت کیا ہے ہم کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔"

مجھے معلوم ہے۔" وہ چلایا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازے پر کے مارنے شروع کر دیئے۔ کھول دو ورنہ میں اسے توڑ دوں گا"۔

"کھولتی ہوں" اماں بولیں۔ "ذرا ٹھہر تو۔"

"ابھی کھولو ابھی۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔" وہ چلایا۔

"کس کی گردن مروڑ دو گے" ماں نے ہنس کر کہا۔

"مجھے معلوم ہے کس کی گردن مروڑنا ہے مجھ" وہ غرایا۔

"ان لڑکیوں نے بگاڑا کیا ہے تمہارا۔"

"بعد میں انہیں بھی دیکھ لوں گا میں۔"

"ایسی دھمکی ہے تو نہیں کھولتے ہم۔ توڑ دو دروازے کو" ماں بولی۔

"اچھا" اس نے دانت پیسے کہاں ہے میری بندوق۔" وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

یااللہ یااللہ ——" اماں گھبرا کر دعائیں مانگنے لگی۔

"میں جانتا ہوں" ایلی نے کہا۔

"وہ گولی چلا دے گا چلا دے گا" اماں نے کہا۔

"دیکھوں گی میں کیسے چلائیں گے" سادی جوش میں آگئی اس نے ایلی کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے جانے دو سادی۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں میں ساتھ جاؤں گی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گی۔" غصے میں سادی کی آنکھوں سے انگارے جھڑ رہے تھے۔

"سادی۔" ماں کی آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئیں۔

"پہلے مجھے گولی مارنا پڑے گی انہیں' چلئے۔" وہ ایلی سے بولی۔

"سادی یہ تمہاری عزت کا سوال ہے مجھے جانے دو۔" ایلی نے کہا۔

اماں سادی کے پاؤں پڑ گئی۔

ایلی بھاگا خوش قسمتی سے صدر دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ گیا تاکہ اوپر سے اسے کوئی دیکھ نہ سکے کافی دیر وہ کھڑا رہا۔ پھر جب شور سے معلوم ہوا کہ امان زینہ اتر رہا ہے تو ایلی چپکے سے پڑوس کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو کر کونے میں دبک گیا۔ پھر امان گلی میں چلا رہا تھا۔ کہاں ہے وہ کہاں ہے۔"

ایک اونچے لمبے تنومند مرد کو ہاتھ میں بندوق لیے دیکھ کر گلی کی تمام لوگ کھڑکیوں میں آگئے۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ۔" امان گلی میں یوں چکر کاٹ رہا تھا جیسے شیر پنجرے میں چکر کاٹتا ہے۔ پھر منصر آگیا اور امان کو پکڑ کر اندر لے گیا۔

عین اس وقت کوئی اس ڈیوڑھی میں داخل ہوا جہاں ایلی چھپا ہوا تھا۔ بیشتر اس کے کہ وہ ایلی کو دیکھتا ایلی کونے سے نکل آیا اور معصومانہ انداز سے پوچھنے لگا جی یہ مولوی محمد علی کا مکان ہے۔"

"محمد علی کون محمد علی۔" نو وارد نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

جو اسلامیہ کالج میں پروفیسر ہیں۔" اس نے کہا۔

نہیں" نو وارد بولا۔ یہ ان کا مکان نہیں۔"

تکلیف معاف کہہ کر وہ باہر نکلا اور گلی میں اس سمت کو چل پڑا جو تاؤ گھر سے برعکس جاتی تھی۔ لارنس باغ میں پہنچ کر ایک پلاٹ میں وہ ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر امان کون تھا۔ اس سے ان کی والدہ کیوں خائف تھی وہ کس کی گردن مروڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر وہ چیخ کیوں رہا تھا۔ بھلا بندوق کی کیا ضرورت تھی اور یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور محلے والوں کو اکٹھا کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کے روبرو منصر کھڑا مسکرا رہا تھا "الیاس صاحب آپ نے داستوسکی کی برادرز کیراموزووز نہیں پڑھی ——(Brothers Karamozoves) ضرور پڑھئے۔

ایک اور

——شام کے قریب نیم چھتی میں لیٹے ہوئے ایلی کو یاد آگیا کہ اسے منصر سے ملنے جانا ہے۔ چونکہ خصوصی طور پر منصر نے طے کر رکھا تھا۔ کہ اس روز وہ دفتر میں ملیں گے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنا محال تھا۔ چلو نہ سہی اس نے سوچا کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ اور وہ پھر لیٹ گیا۔

دفعتاً" اسے پھر خیال آیا۔ نہ گیا تو منصر سمجھے گا کہ کوئی خصوصی بات ہے۔ اور دوپہر کا واقعہ اس کی نظر میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا اور وہ سمجھے گا کہ واقعی ایلی سفید منزل میں گیا تھا۔

"نہیں نہیں وہ اٹھ بیٹھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا"۔ منصر پر یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ میں وہاں جاتا ہوں۔

شام کے وقت جب وہ منصر کے دفتر میں پہنچا تو منصر کے طبعی اخلاق کے باوجود اس کے انداز سے تلخی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"میں فارغ ہو لوں تو ابھی چلتے ہیں۔" منصر نے حسب معمول کہا۔

"آج پریشان معلوم ہوتا ہے۔ شاید دوپہر کے واقعہ کے متعلق کبیدہ خاطر ہے۔ ضرور مجھ سے استفسار ہو گا۔ نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔" ایلی سوچ رہا تھا۔" اس میں اماں کی عزت کا سوال ہے۔ اماں کتنی قابل تعظیم ہے۔ لیکن امان نے اماں کا بھی خیال نہیں کیا نہ جانے کون ہے

وہ امان" پھر وہ منصر کی طرف دیکھنے لگا۔ منصر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی حسین اور پرنور
چہرا۔ وہی شان استغنٰے وہی وقار۔ لیکن ان سب پر پژمردگی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ
میں جاذبیت کے باوجود شکستگی کی جھلک تھی جیسے پیالے میں بال آگیا ہو۔

ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ منصر دکھی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دکھ کو چھپانے کی کوشش
میں شدت سے مصروف تھا۔

"پریشان سے دکھتے ہیں آپ" اس نے منصر سے کہا۔

وہ چونکا"ہاں" اس نے ہنسنے کی کوشش کی آج ایسا کام آن پڑا ہے کہ ——"

"تو دفتری پریشانی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"اور کیا ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

لیکن ایلی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کے احساس وقار پر ضرب
پڑی ہے ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر —— ضرور یہ دوپہر کے
واقعہ کا اثر ہے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ تمام تر ذمہ داری ایلی پر عائد ہوتی ہے۔ وہی ان کی پریشانی
اور دکھ کا باعث ہے۔ احساس گناہ سے اس کی نس نس بھیگ گئی۔

جب وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے تو دفعتاً" منصر نے کہا کیا اتفاق سے آج آپ ہماری گلی
سے تو نہیں گزرے تھے۔"

ایلی چونکا۔ اور سوچنے لگا۔ منصر کا سوال اس کی خوش اخلاقی پر دلیل تھا۔

"میرا مطلب ہے۔" منصر نے کہا"شاید آپ ادھر سے گزرے ہوں۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کہے نہیں نہیں یہ بہتان ہے دروغ بیانی ہے۔ لیکن منصر کے
دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آپ ادھر گئے تھے؟"

"جی۔"

"گھر گئے تھے۔"

"جی ہاں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"خود سے گئے تھے" اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بولا آپ مذاق کر رہے ہیں یا ——"

"خود سے گیا تھا۔"

"بیرا" وہ چلایا ایک بڑا —— بیرا —— جلدی ایک بڑا۔"

تعارف

اس روز واپسی پر منصر ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر اس نے آوازیں دینا
شروع کر دیا۔ امان صاحب ہوں تو انہیں ذرا نیچے بھیجئے ابھی۔"

امان ایک اونچا لمبا جاٹ نما شخص تھا۔ انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ جو منصر اور سادی میں
بدرجہ اتم نظر آتی تھی۔ "آئیے آپ کو اپنے نئے دوست سے ملواؤں۔" منصر نے کہا یہ ہیں
الیاس صاحب۔"

امان چونکا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

"آپ میرے عزیز ہیں۔" منصر نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی ہی سمجھ
لیجئے بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ زمیندار ہیں اور میں مزدور۔"

امان نے کوئی استفسار نہ کیا بلکہ چپ چاپ بیٹھ کر ایلی کو بغور اور بے تکلف دیکھنا شروع کر
دیا۔ غالباً" وہ ایلی کو جانچ رہا تھا۔ ایلی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو دوپہر کے وقت شیر
کی طرح دھاڑ رہا تھا اور پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

"امان صاحب کا گاؤں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں اگر آپ کبھی ان کے ہمراہ گاؤں جائیں
تو آپ کو معلوم ہو کہ زمیندار کس شے کا نام ہے۔" منصر ہنسنے لگا۔ "اگر یہ جلال میں ہوں تو میز
پر پڑا ہوا کانچ کا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگتا ہے۔ اور ہاں۔" منصر نے کہا "آپ میرے
دوسرے بھائیوں سے ملے ہی نہیں۔ ان سے بھی تعارف ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ آج اتفاق
سے آپ یہاں آئے ہیں تو ان سے بھی مل لیجئے۔ امان صاحب آپ اوپر جائیں تو انور اور محمد علی
کو بھیج دیں شکریہ۔"

امان اٹھ بیٹھا اور جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

انور ایک شوخ نوجوان تھا جس کی آنکھیں بے حد جاذب تھیں اس کے خدوخال بہت
موزوں تھے۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ محمد علی کی آنکھیں دکھنے والی تھیں انور کی طرح

دیکھنے والی نہیں۔ اس کے چہرے پر خوابوں کا دبیز پردہ پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے
خوابوں کی بستی سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا کو دیکھنے سے گھبراتا ہو۔ وہ وائلن کا رسیا تھا اور بھی
کے انداز میں برہا کے گیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

"باقی رہا رانا۔" منصر کے تعارف کرانے کے بعد کہ "وہ یہاں نہیں ہے لہٰذا اس وقت اس
سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ تعارف کیوں کرائے جا رہے ہیں آپ سے۔ آپ یہ
الفاظ خود ہی کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ ہم نے آپ کو اپنا لیا ہے الیاس صاحب۔"

"ذرہ نوازی ہے" ایلی نے کہا۔

"نہیں اس میں ذرہ نوازی کی بات نہیں عام حالات میں شاید آپ کو درخور اعتنا نہ سمجھا
جاتا۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ آپ کو اپنایا جائے اور اگر اپنایا جائے یعنی اگر اپنانا ہی ہے تو کیوں نہ
فراخ دلی کو کام میں لایا جائے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"والدہ صاحبہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں۔" کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات شروع کی۔
"اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ان کے تابع فرمان ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"دیکھیے" وہ پھر جوش میں بولا۔ "اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجئے گا کہ یہ ایک وعدہ ہے کسی
قسم کا واضح یا مبہم وعدہ اس سلسلے میں کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں کیونکہ اس معاملے میں میری
کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہمارے خلوص کا نشان ضرور ہے۔"

"ہم سب مخلصانہ کوشش کریں گے کیونکہ آخری فیصلہ والد صاحب نے کرنا ہے جو اس
وقت یہاں نہیں اور جنہیں ابھی تک حالات کے متعلق مطلع نہیں کیا گیا۔ نہ جانے انہیں کب
مطلع کیا جا سکے گا۔ چونکہ دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ یہ بات والد صاحب کی خدمت میں کسی
احسن انداز سے پیش کی جائے۔ خیر۔ اب آپ سفید منزل میں آ سکتے ہیں لیکن مناسب ہو گا
آپ یہاں اس وقت تشریف لایا کریں جب میں یہاں موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس
چھوٹی سی تفصیل کو اہمیت دیں گے۔"

اس روز ایلی ناؤ گھر پہنچا تو اس کی خیالات بے حد پریشان تھے۔

راست گو

اس روز کے واقعات کس قدر عجیب تھے۔ سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور

باپ تھے اور ان کے کرداروں میں کس قدر تنوع تھا۔ خاموش غم زدہ باجی۔ زندگی اور رنگینی
سے بھرپور سادگی، محبت اور خلوص بھری والدہ رنگ اور وقار سے پر منصر اور سادہ اور پرجوش
ایلی۔ ذہنی طور پر وہ سب ایک دوسرے سے دور تھے لیکن جذباتی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں
کی مانند تھے۔

مسلسل دو روز تک ایلی ان بیتے واقعات کو ذہن میں دہراتا رہا۔ گذشتہ چند ایک ہفتوں میں
کیا کیا واقعات بیت گئے تھے۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ وہ واقعات اس پر بیتے ہیں اسے محسوس
ہو رہا تھا جیسے وہ ایلی نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو۔ وہ اپنی شخصیت کا دورخاپن شدت سے محسوس کرنے
لگا تھا۔

تیسرے روز ڈاک سے اسے سادی کا خط موصول ہوا جس میں سادی نے اس کی راست
گوئی کا مذاق اڑایا تھا۔
لکھا تھا۔

میرے راست گو! میں بناتی ہوں آپ بگاڑتے ہیں میں چنتی ہوں آپ بکھیرتے ہیں——
میں بنتی رہوں آپ کاٹنے میں مصروف رہیے دیکھئے کہیں آپ پر جھوٹ بولنے کا فرد جرم نہ لگ
جائے۔ چاہے کچھ بھی ہو آپ اپنی راست گوئی قائم رکھیئے۔
توبہ آپ کی اس روز کی راست گوئی کی وجہ سے کتنا ہنگامہ برپا ہوا۔ اتنا ہنگامہ ہوا کہ اماں
صاحب کی بندوق بھی بھول گئی۔ ایک راستہ نکالا تھا وہ بھی آپ نے مسدود کر دیا۔ کئی بار کہہ
چکی ہوں کہ انہیں براہ راست آپ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان کا بس چلے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔
بلکہ محض میری وجہ سے ہے لیکن آپ ہیں کہ راستے سے لگن لگا رہے ہیں اور منزل کو
بھولے جا رہے ہیں۔ اس طرح آپ کھو جائیں گے اور میری کوششیں بے اثر ہو جائیں گی۔
مگر آپ ایسا نہیں کریں گے۔ کہہ جو دیا نہیں کریں گے خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے۔"
سادی کا خط پڑھ کر ایلی کو بے حد افسوس ہوا۔ ظاہر تھا کہ اب سادی سے ملاقات نہ ہو گی
پھر منصر بھی دو ایک روز کے لیے باہر چلا گیا تھا لہٰذا اس سے ملاقات کی صورت بھی نہ رہی

ایلی نے کتابوں کی طرف توجہ مبذول کی لیکن اس کا دل مطالعہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ لہٰذا

امتحان کی تیاری کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن وہ نیم چھتی میں کتاب اٹھائے پڑا رہتا سوچتا اور پھر تھک کر پڑ جاتا۔ وقت اس کے لیے گویا تھم گیا تھا۔ کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ ناؤ گھر پھیل کر جہاز بن گیا تھا۔ اور وہ جہاز کسی نامعلوم سمت میں بہہ رہا تھا بے مقصد بے مصرف۔

منزل اور راہی

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ سب اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے جاہ بھلپال اور جمال جاہ کے لیے کہیں سے آنے میں قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی البتہ بھلپال اور جمل تینوں خوش تھے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ناؤ گھر چھوڑ رہے تھے۔

ایلی سوچتا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ علی پور جانے سے پہلے وہ سفید منزل جائے گا تاکہ منصر سے آخری ملاقات کر سکے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ جب وہاں پہنچے تو منصر موجود نہ ہو اور سادی اسے جنگلے سے دیکھ لے اور وہ دونوں اس چھوٹے کمرے میں جا بیٹھیں اور سادی اس کی راست گوئی کا مذاق اڑائے۔ "لیجئے باجی آ گئے ہمارے راست گو۔ جھوٹ صرف ہم سے بولتے ہیں۔ دوسروں سے نہیں۔ کیوں جی ٹھیک ہے نا۔"

لیکن جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر سفید منزل میں گیا تو وہاں انور اور محمد علی کے سوا کوئی نہ تھا۔ انور نے اسے بتایا کہ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے ہیں لیکن کوشش کے باوجود وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آخر وہ ہسپتال کیوں گئے تھے۔

اسی روز امتحان کے بعد منصر اسے ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں منصر اسے تقریباً روز ملتا رہا تھا۔ پہلے روز جب ایلی پرچہ دے کر ہال سے نکلا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ سامنے منصر اپنے سائیکل پر آ رہا ہے۔ اور منصر نے حسب عادت کہا تھا۔ "کیا عجیب اتفاق ہے میں ابھی لنچ کھا کر آ رہا تھا۔ آیئے آیئے چلئے آپ کو لے چلوں کہئے پرچہ کیسا ہوا۔" اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا تھا کہ عین اس وقت منصر لنچ کھا کر ادھر سے واپس آتا جب ایلی کے پرچے کا وقت ختم ہوتا تو سرسری طور پر اسے پوچھتا کہئے پرچہ کیسا ہوا۔ اس روز بھی وہ اس سے ملا تھا اور سرسری پوچھ کے بعد اس نے کہا تھا۔ "تو آج آپ جا رہے ہیں اور ناؤ گھر کے دروازے پر اسے موٹر سائیکل سے اتار کر کہا تھا اچھا الیاس صاحب خدا حافظ۔ خط تو آپ لکھا ہی کریں گے میرا مطلب ہے جب کوئی ضروری بات ہو اور آپ تو لاہور آتے ہی رہتے ہوں گے علی پور قریب ہی تو ہے انشاءاللہ جلد ملاقات ہو گی"۔

اس روز منصر نے تو ہسپتال کی بات نہ کی تھی۔

ایلی محروم واپس آ گیا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سامان باندھے یا جانے کی تیاری کرے لیکن سب تیاریوں میں مصروف تھے اور وہ لاج چھوڑ رہے تھے ناچار اسے بھی تیاری میں مصروف ہونا پڑا۔ لیکن اس کی تمام توجہ گلی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کب ہسپتال سے واپس آ جائیں لیکن گاڑی کا وقت آ گیا اور گلی میں سے موٹر یا تانگا نہ گزرا۔ ناچار وہ جاہ اور بھا کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔ اس نے ناؤ گھر اور سفید منزل پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈالی اس وقت ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ منزل کو چھوڑ کر راہی بن رہا ہو۔ منزل اس کے سامنے تھی لیکن وہ متضاد راستے پر جانے پر مجبور تھا۔ کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔ دوڑے جا رہی تھی گھوڑے کے سم یوں بج رہے تھے جیسے کوئی چھاتی پیٹ رہا ہو۔ ریل گاڑی کے پہیئے اس پر ہنس رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لاہور سمٹ رہا تھا نیلا آسمان چاروں طرف سے یورش کر رہا تھا چھائے جا رہا تھا مسلط ہوا جا رہا تھا۔

بیگم

علی پور پہنچ کر وہ بلا سوچے سمجھے سیدھا محلے کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے یا علی پور کے گلی کوچوں میں جا رہا ہے۔ اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ کچی حویلی سنسان پڑی تھی۔ لالٹین مدھم لو سے جل رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا تھا علی احمد کے مکان کے دروازے بند تھے صرف ایک کھڑکیوں میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا۔

جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اسے کھلا دیکھ کر وہ چونکا اسے یاد آیا کہ وہ تو باہر گئی ہوئی تھی۔ یہ دروازے کیسے کھلے ہیں اور میں ادھر کیسے آ گیا۔

سامنے چارپائی پر شہزاد بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک نومولود بچہ لیٹا ہوا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا اور وہ یوں حیران بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ جانو چلانے لگی۔

"لو یہ تو ایلی آیا ہے۔"

"کون آیا ہے۔" قریب ہی سے ان جانی باوقار آواز سنائی دی۔ اور پھر بیگم اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ہے۔" شہزاد بولی۔ "ایلی کے لیے چائے بناؤ جانو منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اتنی دیر کے بعد ہے چلو آیا تو ہے"۔

وہ مسکرائی "اب بھی نہ آتا تو اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ اب تو جا کہاں رہا ہے۔" وہ برلو رلر ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ادھر کون ہے وہ تو سبھی کابل گئے ہوئے ہیں"۔

ایلی نے بیگم کی طرف دیکھا۔ بیگم بڑے رعب سے اسے گھور رہی تھی۔

"بیگم کو نہیں پہچانا تو نے ایلی۔"

بیگم۔ اسے وہ نام جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا۔

"اب یہ کیوں پہچانے گا۔" بیگم نے کہا "اب تو جوان ہو گیا ہے۔"

"جوان" شہزاد ہنسی۔ "شکل تو دیکھو جوان کی جیسے راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔"

"راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔" کسی نے اس کے کان میں دہرایا۔ اس کی نگاہوں میں منزل آ کھڑی ہوئی۔ راستہ اور چیز ہے منزل اور! سادی مسکرائی۔ منزل! منزل!! منزل!!! مجھ چمگادڑ چیخی۔ "چلو راستہ بھول کر ہی سہی۔" شہزاد ہنسی۔ "اب بیٹھ بھی جا۔"

وہ بیٹھ گیا۔

"مجھ سے نہیں تو اماں سے ہی بات کر کوئی۔" شہزاد پھر ہنسی۔

"اماں———" دفعتاً" اسے یاد آیا۔ ہاں بیگم شہزاد کی ماں تھی۔ پھر اس کی نگاہوں میں وہ دن پھر گئے جب محلہ گوکل کا بن بنا ہوا تھا۔ سانوری کی نیم وا آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ اس کے ڈھلکے ہوئے شانے اس کی ترچھی نگاہ اور مرچیلی مسکراہٹ نیچے ارجمند چلا تھا۔ "ہے ہے کیا شے ہیں یہ گوکل کے کنہیا جب سے آئے ہیں۔ سارا محلہ پنگھٹ بن گیا ہے۔ ہے ہے اب میں کیا کروں۔"

پھر تھیٹر کی سٹیج پر رنیک اپنا سونٹا لہرا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے گیلری پر لگی ہوئی تھیں جہاں سانوری تخت پر جلوہ افروز تھی اور گلدم اور گلخیرو آہستہ آہستہ چلا رہے تھے اب دیکھ کر بے لیکن تینوں ہی گیلری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہزاد کے والد غلام علی بانکے رنگیلے شخص تھے۔ عورت ان کی واحد کمزوری تھی لیکن وہ

عورتوں کو گھر لانے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ عورت کو بیاہ لینے سے شوق کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ عورت کو محسوس کرتے اور اس کے حصول کی کوشش کرتے ان کے نزدیک حصول وقتی ملاپ کے مترادف تھا اور اسے دوام بخشنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ طبعاً" وہ ایک بھنورا تھے۔ کلی کلی کا رس چوسنا انکا شغل تھا۔ لیکن گھر میں پھول کے تختے لگانا انہیں پسند نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک پھول تھا——— بیگم۔ چونکہ غلام علی گھر کے معاملات میں دخل دینے کے قائل نہ تھے گھر پر بیگم کی حکومت تھی۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا بیگم طبعاً" حاکم تھی یا برسوں کی حکومت کے بعد اس میں حاکمیت کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال گھر کے معاملات میں وہ دخل اندازی گوارا نہیں کرتی تھی۔ چاہتی تھی بلکہ اسے اپنا حق سمجھتی تھی کہ کوئی بات اس کی رضامندی کے بغیر واقعہ نہ ہو۔ وہ گھر کا کام کرنے والوں اور حتیٰ کہ محلے والوں پر حکم چلاتی تھی۔ دراصل اسے کسی محلے میں رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا چونکہ اس کا خاوند محکمہ ریل میں سٹیشن ماسٹر تھا اس لیے ساری عمر اس نے ریلوے سٹیشنوں کے کوارٹروں میں بسر کی تھی۔ جہاں ارد گرد قلی خوانچے والے کارندے بابو لوگ رہتے تھے جو سب غلام علی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ لہٰذا بیگم ان سب کو اور ان کے متعلقین کو براہ راست اپنے ماتحت سمجھتی تھی۔ اس تفصیل کی وجہ سے اس کے انداز میں حاکمانہ وجاہت اور نور جہانیت کے سے عناصر پیدا ہو چکے تھے۔

بیگم کو خاوند کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے صرف ایک دکھ تھا کہ خاوند اس کے حکم سے کیوں نہ اس بات پر اکثر گھر میں فساد ہوتا تھا لیکن غلام علی اپنی رنگیلی اور شوخ باتوں کے بل بوتے پر ٹال دیا کرتے۔

اس کے علاوہ چونکہ غلام علی کا جادو صرف ان عورتوں پر چلتا جن کی سماجی طور پر کوئی حیثیت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے بیگم ان کی خوش فعلیوں پر حقارت کا اظہار کرتیں اور خاوند کی ہر خوش فعلی پر بیگم کی اپنی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی۔

لیکن گھر کے ایک معاملے پر گھر میں غلام علی کی حکومت تھی۔ وہ مقوی اور لذیذ غذا کھانے کے شائق تھے چونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسے شوق کو پورا کرنے کے لیے غذا بے حد اہم چیز ہے۔ لہٰذا کھانے سے متعلقہ کوئی بات ان کی رضامندی اور خواہش کے بغیر عمل میں نہ آ سکتی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے خصوصی غذائیں حاصل کرتے خصوصی اہتمام سے انہیں تیار کرواتے

اور پھر جب وہ دسترخوان پر بیٹھتے تو اہل خانہ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا سب کی نگاہیں غلام ع
چہرے پر جم جاتیں دل دھڑکتے ہاتھ کانپتے نہ جانے کیا ہو گا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد یا تو غلام علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی
سب کے دل قائم ہو جاتے ہاتھ رواں ہو جاتے اور چہروں پر مسرت بھرا فخر پھیل جاتا
غلام علی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی تو برتن دھم سے دیوار سے ٹکراتے "یہ کیا ہے
اور پھر گھر میں سناٹا چھا جاتا۔

غلام علی کے شوق کو بیگم روک نہ سکی تھی اس نے پیار محبت سے سمجھایا۔
دھمکیاں دیں کئی ایک عورتیں جنھوں نے غلام علی کے شوق کو پورا کیا تھا انہیں پیٹا بھی
بات جوں کی توں قائم رہی۔ لہٰذا یہ بات بیگم کو گوارا کرنی ہی پڑی بہرحال بیگم بھی ہٹ
تھی۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ غلام علی عورت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا اور اکثر
مواقع آتے تھے جب غلام علی کو یاد آتا کہ بیگم بھی عورت ہے اس وقت بیگم خاوند سے
بخشی کے ذریعے انتقام لیتی تھی۔ حیوان تڑپتا اور بیگم کو اس کا تڑپنا دیکھ کر لذت حاصل
دہاڑتا چیختا چلاتا اور پھر باہر نکل جاتا اور دیوانہ وار عورت کو تلاش کرتا۔

ایک مرتبہ جب وہ ان حالات میں باہر نکلے تو پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ اور
ایک ایسی خاتون باہر نکل رہی تھی جو خود کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس سے
روپیہ بٹور سکتی ہو۔ وہ فیشن ایبل لباس میں ملبوس تھی ہاتھ میں ہینڈ بیگ اور ماتھے
سے معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کہا تو فر فر انگریزی بولنے لگے گی۔ غلام علی بھانپنے میں بڑے
فوراً تاڑ گئے کہ حالات ساز گار ہیں اگرچہ پہلے کبھی اس نوعیت کی عورت سے سابقہ نہ
پھر بھی آخر عورت ہی تھی۔

ان کا مقصد تو محض ملاپ تھا۔ لہٰذا وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور چلتے چلتے
ڈائننگ روم میں پہنچ گئے۔

خاتون بڑی ہوشیار تھی اس کا مقصد ملاپ نہ تھا۔ حصول زر کی خواہش بھی وقتی نہ
دوام کی قائل تھی چونکہ ضرورت وقتی چیز نہیں۔ لہٰذا اس نے تنگ بخشی کو کام لا کر
آگ میں تیل ڈال کر اسے بھڑکا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ چیخی چلائی لیکن بیگم کو یہ علم نہ ہوا کہ غلام علی کے اس
دوام کا خطرہ ہے لہٰذا وہ چیخ چلا کر خاموش ہو گئی۔

ادھر خاتون نے غلام علی کو پورے طور پر ہاتھ میں لے کر اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ
تعلق صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ اسے پہلی ہی نظر میں غلام علی سے محبت ہو گئی
نے یہ محبت کا لفظ سن کر غلام علی سکتے میں رہ گئے۔ آج تک کبھی کسی عورت نے ان سے محبت کا
کیا تھا۔ اور ان کی اپنی بیوی تو بے رحمی کا انسپکٹر تھی۔ لہٰذا وہ خاتون کے سحر میں آ گئے۔
خاتون کے تحفظ سے متعلقہ تمام شرائط کو تسلیم کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اس سے نکاح کر
خاتون نے تحفظ کے طور پر بیگم کو طلاق دینے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی یہ محض
ہے یا ایک ناخوش کن خواب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دفعتاً اسے معزول کر دیا جائے اور
ترمیں تخت سے اتار دیا جائے جب کہ وہ چار جوان بچوں کی ماں تھی جن میں دو شادی شدہ
لیکن جب طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھمایا گیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شہزاد کے پاس آ گئی تھی۔

بیگم نے ایلی کی طرف دیکھا گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں ٹھہرے گا کہاں۔"

شہزاد ہنسنے لگی۔ "آخر اپنے ہی گھر ٹھہرتا ہے نا انسان۔"

بیگم نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ ابھی بیگم اٹھ کر ایلی کے کان پکڑا دے گی۔

بیگم کے اس رویے کے بعد شہزاد نے اپنی تمام تر توجہ ایلی کی طرف مبذول کر دی۔ وہ
جھاڑ کر اپنا میز پوش نکالا اور پھر خود میز اٹھا کر ایلی کے سامنے لا رکھا۔

"اب چائے لاؤ جانو۔" وہ بولی۔

"ممی یہ کام کیے دیتی ہوں۔" بیگم بولی۔ "تم کیوں خواہ مخواہ تمہاری طبیعت جو اچھی

کام کے لیے اچھی ہے۔" شہزاد جان بوجھ کر بیگم کو چڑا رہی تھی۔

"تو سمجھ میں نہیں آتی تمہاری باتیں۔" بیگم نے بصد تحمل کہا۔

"جائے گی سمجھ۔" شہزاد بولی ——— "آؤ نا ایلی تو اب چائے بھی پیئے گا یا نہیں"۔

" ایلی بولا اس نے ان دونوں کی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔ نہ جانے وہ کہاں

شہزاد ہنسی "اچھا تو یہ بات ہے اب یہاں پہنچ کر بھی کھوئے ہوئے ہو۔"

چند ہی روز میں بیگم اور ایلی ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ایلی نے محسوس کیا کہ پر رعب اور طمطراق بھری بیگم دراصل ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا ہے۔ اپنے گھر کی باتیں [illegible] ہوئے یا غلام علی کا کوئی قصہ سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں انہیں روکنے کی کوشش میں ضبط ٹوٹ جاتا ہے پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر روتی ہے۔

شہزاد کے گھر میں بیگم کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ شہزاد کی دو بچیاں کھیل کود میں رہتیں تیسری بچی ابھی صرف دو ایک ماہ کی تھی۔ ان کے علاوہ جانو تھی جو ہر وقت گھر کے [illegible] میں لگی رہتی تھی محلے والیوں کے روبرو ایسی باتیں بیان کرنا بیگم کے وقار کے منافی تھا۔

شہزاد کی شادی کے بعد علی پور میں بیگم صرف دو تین مرتبہ آئی تھی۔ محلے پر وہ پھبتیاں اڑایا کرتی۔ ناک بھوں چڑھاتی "یہ تمہارے کیا طریقے ہیں۔ اور یہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں [illegible] کے انداز میں نفرت کی جھلک نمایاں ہوتی۔" لو بہن تمہارے خاوند کیسے ہیں ہئے میرے گھر میں مجال ہے جو نمک ذرا زیادہ یا کم ہو اگر گوشت زیادہ گل گیا ہے یا ذرا کم گلا ہے تو بھی ہم میں جرات نہیں ہوتی کہ اس اللہ کے بندے کے سامنے رکھیں۔ بس سمجھ لو زلزلہ آ جاتا ہے [illegible] دھم سے دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی آواز گونجتی ہے شوکت کی ملا [illegible] ہے لاحول ولا قوۃ —— توبہ ہے بہن" خاوند کی بات سناتے ہوئے بیگم پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

بات بات پر اپنے گھر کی بات کرنا گھر میں اشیاء کی افراط کا تذکرہ کرنا اور پھر اپنے خاوند کے غصے اور دبدبے کا اظہار کرنا بیگم کی عادت تھی اور صرف یہی نہیں غالباً" وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کے لیے حقارت اور تضحیک کا اظہار نہ ہو تو اپنے گھر کی بات سنائی ہی نہیں جا سکتی اب بھلا بیگم کس منہ سے ان محلے والیوں کو اپنی تضحیک کا قصہ سناتی کس طرح بتاتی کہ اس کی حکومت چھن چکی ہے۔ وہ معزول ہو چکی ہے۔ فی الحال یہ بات تو گھر کے چند ایک افراد کے درمیان سربستہ راز تھی اور محلے والیوں کے سامنے بیگم اسی انداز سے بات کرتی تھی جیسے اس کا گھر قائم ہو اور اس کے میاں بدستور اس کے میاں ہوں۔

لہٰذا بیگم کے لیے محلے والیوں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزاد سے بات کرتی تو وہ قہقہہ مار کر ہنستی "اماں پھر کیا ہوا۔ اسے بھی کر لینے دو مزے چند ایک سال نئے فیشن کی بیوی ملی ہے [illegible] کو" وہ ہنستی۔

"ہائے لڑکی۔" بیگم حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھتی۔

شہزاد پھر قہقہہ لگاتی "اماں جو ہوا اب چھوڑو یہ قصہ تمہارے بال بچے ہیں۔ اتنے گھر تمہارے اپنے ہیں جس کے پاس جی چاہے رہو جو چاہے کھاؤ پیو۔ پھر رونا کس بات کا۔ اور پھر تمہاری عمر بھی اب پینتالیس کے قریب ہو گی اس عمر میں خاوند سے جدائی ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے"۔

ایک دن میں بیگم نے محسوس کر لیا کہ ایلی وہاں صرف اس لیے موجود تھا کہ سارا دن ان کی باتیں سنے اور اظہار ہمدردی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ایلی کو بیگم سے بے حد ہمدردی تھی لیکن دقت یہ تھی کہ جب بیگم اسے کوئی قصہ سناتی تو سنتے سنتے کسی لفظ یا اشارے کی وجہ سے ایلی کا خیال نہ جانے کہاں جا پہنچتا اور وہ بیگم اور جانو کے پاس بیٹھ کر خالی سر ہلاتا رہتا۔

پھر بیگم کی آپ بیتیوں کے بعد ایک اور دور آیا اور بیگم اور ایلی مل کر عجیب و غریب روحانیات میں کھو گئے۔ بیگم ایلی کو اشارہ کرتی کہ چلو میں آئی۔ وہ رابعہ کے خالی چوبارے میں جا بیٹھتا کچھ دیر کے بعد بیگم آ جاتی وہ سیاہ روئی سی تھیلے سے نکال کر کہتی۔ "اس نے کہا ہے اس روئی کی سات بتیاں بنا لو۔ کورے برتن میں موم کی پتلی بنا کر رکھ۔ پھر اس بتی کو آگ لگا کر اس برتن میں ڈال دو لیکن اس طریق سے ڈالو کہ بتی بجھے نہیں۔ اور جب تک برتن سے دھواں نکلتا رہے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر "آئی بلا کو ٹال تو" پڑھتی رہو۔

"یہ عامل سمجھدار بھی دکھتا ہے یا نہیں" ایلی پوچھتا۔

"بڑا سیانا ہے۔" بیگم جواب دیتی "ہزاروں کے گھر آباد کر دیئے اس نے۔"

"پھر تو بہت اچھا ہے۔" ایلی کہتا۔

"بس ایک ہی مشکل ہے"

"وہ کیا؟ "

"میں ایک ٹانگ پر کیسے کھڑی ہو سکوں گی اتنی دیر کے لیے۔"

"تو اس میں کیا ہے ہاتھ سے کرسی کو تھامے رکھنا۔"

"بلہ" وہ مسکراتی۔ "یہ ٹھیک ہے۔"

"کہو تو میں سہارا دیئے رہوں۔" ایلی اس سے ہمدردی جتاتا۔

وہ غصے سے ایلی کی طرف دیکھتی۔ بیگم کو ہر ایسی بات بری لگتی تھی جس سے قرب کا احساس

ہو یا بے تکلفی کا اظہار ہو۔ اس کی دانست میں بے تکلفی جنسی تعلق کی دلیل تھی۔ اور جنسی
تعلق کے لیے بیگم کے دل میں نفرت کے جذبات قائم ہو چکے تھے۔

بیگم عامل کے دیئے ہوئے تعویذ لے آتی اور وہ دونوں بیٹھ کر انہیں پانی میں گھولتے رہتے۔
ان عملیات کے بعد وہ ان کے نتائج کا انتظار کرتے۔ ایلی کو تو خیر ان عملیات پر کوئی اعتبار نہ
تھا۔ وہ جادو سحر تعویذ یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے اثر سے قطعی طور پر منکر تھا۔ البتہ بیگم کی
تسلی کے لیے وہ کہا کرتا تھا۔ "ہاں ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔" لیکن شہزاد تو بے باکانہ ان باتوں کا
مذاق اڑایا کرتی۔

دوپہر کے وقت دروازہ بجتا تو وہ جانو سے کہتی۔ "جا میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے نیچے ڈاکیہ
رجسٹری لایا ہے۔"

"رجسٹری۔" جانو حیرت سے پوچھتی۔

"کیا مطلب؟" ایلی دریافت کرتا۔

پھر وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی۔ "اماں کا عمل جو ختم ہو گیا ہے اب اباکی طرف سے
اطلاع تو آئے گی ہی کہ وہ قصہ ختم ہو گیا ہے اب گھر آجاؤ کیوں اماں۔"

یا جب بیگم اور ایلی بتی جلانے میں مصروف ہوتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھتی۔ "اماں
یہ موم کی پتلی تم ہو یا ہماری سوتیلی۔" اس طرح وہ اکثر مذاق ہی مذاق میں ماں کے ان عملیات کا
مضحکہ اڑایا کرتی۔ اکثر اس کی باتیں ذو معنی ہوتیں اور ایلی انہیں سن کر چونکتا۔

مثلاً پہلے روز ہی اس نے بیگم سے کہا تھا۔ "اماں چھوڑو ان عملیات کو بھلا بتیاں جلانے
سے کیا ہوتا ہے، اگر یہ عمل پر اثر ہوتے تو میں تعویذ کے زور پر کسی کو اپنا نہ بنا لیتی۔" شہزاد نے
ایلی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ماتھے کا تل بے حد شوخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں
مایوسی اور حسرت بھری تمنا کی تھی۔

پھر ایک روز شہزاد کے سامنے روئی پڑی دیکھ کر بیگم نے پوچھا تھا۔ "روئی کیا کرے گی بی بی"
اور اس نے جواب دیا تھا۔ "میں بھی بتیاں بناؤں گی۔" "کیوں تمہیں کیا ہے؟" ایلی نے پوچھا تو
اور اس نے جواب دیا تھا۔ "بہت کچھ ہے اوپر سے نہیں دکھتا شاید بتیاں جلانے سے میرا بھی
ساتھی واپس آ جائے۔" اور ساتھ ہی اس نے بڑی جرات اور بے باکی سے ایلی کی طرف دیکھا
تھا۔ "کیوں ایلی۔" اس نے کہا تھا "جانے والے واپس بھی آ سکتے ہیں کیا۔" اور پھر یوں ہنسی
جیسے آبگینہ کسی ان جانے دباؤ سے چور چور ہو گیا ہو۔

تو بیگم کے ان عملیات اور اس کے قصے کہانیوں کے خلاف سخت شکایات تھیں چونکہ
عملیات کی وجہ سے ایلی اس سے دور ہو گیا تھا۔ شہزاد کو ایلی کے قرب میں چنداں دلچسپی نہ
تھی۔ ظاہر طور پر وہ ایلی کے قرب سے گھبرا جاتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ ایلی کے دل
میں شہزاد کی آرزو کم نہ ہو جائے۔ وہ اسے ملنے کی آرزو رچائے بیٹھا رہے۔ تنہائی کے لمحات کی
آرزو کرے عملی طور پر کوشش کر کے تنہائی میں اس سے ملے اس کے لٹکتے بازو کو اسی طرح
تھامے جیسے ڈوبتے کے لیے تنکا ہو۔ اس کے پاؤں کو اپنی نگاہوں سے گھیرے رکھے۔ دور بیٹھ کر
دیوانہ وار اس کی طرف دیکھتا رہے۔

لیکن اب کی بار جب سے ایلی علی پور آیا تھا وہ ان سب باتوں سے یوں بے نیاز ہو
گیا جیسے وہ ایلی ہی نہ ہو۔ الٹا وہ چھوٹے سے چھوٹے موقعہ پر بیگم کو ساتھ لے کر رابعہ کے
گھر میں جا بیٹھتا اور بیگم کی باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر شہزاد بار بار بہانے بہانے
سے میں آتی ایلی کے قریب تر آ کھڑی ہوتی چوری چوری اس کا منہ سہلاتی۔ چٹکیاں بھرتی
باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

...ٹیشن

ایلی کی بظاہر بے نیازی نے شہزاد کے شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ یہ شہزاد کی پرانی عادت تھی۔ اس
کے پیچھے پھرو تو وہ آگے کی سمت بھاگتی تھی اس سے دور ہٹو تو وہ تعاقب کرتی تھی حتیٰ کہ دور
والا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا اور پھر وہ دفعتاً بے نیاز ہو جاتی۔

ایک روز جب بیگم کسی عامل کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ جانو نیچے باورچی خانے میں مصروف
تھی۔ ایلی چپ چاپ چوبارے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد نے چپکے سے آ کر اس کی آنکھیں بند
کر لیں۔ اس سے پہلے ایسے حالات میں وہ جھنجھنے کی طرح بجنے لگتا اس کی نس نس میں گویا
جھنجھنا سا جھنجھنانے لگتا تھا اور وہ دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس
روز وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور پھر کہنے لگا۔
"شہزاد ہے۔"

لاچار شہزاد ہنسی ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔ "چلو آخر ایک نہ ایک دن جانے والے نے جانا ہی

"کیا مطلب؟" وہ بولا۔

"میں پہلے ہی جانتی تھی۔" وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں شکست کی آواز تھی۔

"کیا؟" ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ سٹیشن کے برابر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے چند
ٹھہرے گی۔"

"تم تو ریلوے بابو کی طرح بات کر رہی ہو۔" ایلی نے کہا۔

"بابو کے گھر والی جو ہوئی۔" وہ ہنسی ——

ایلی ہنسنے لگا۔ "تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ میں کن حالات میں میں یہاں سے رخصت ہوا تھا۔"

"یاد ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے نہیں ہے۔"

"یہ کیا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے۔"

"اس کی وجہ سنو گی۔" ایلی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

"سن لوں گی لیکن ——"

"لیکن کیا۔"

"لیکن کو چھوڑو تم سناؤ۔"

"تم نوازنا جانتی ہو شہزاد جسے تم نے نوازا سمجھ لو وہ خود سے گیا۔"

"اچھا۔"

"لیکن تمہارا کھیل کر کھلونے کو پھینک دینا بڑا اذیت ناک ہے۔"

"مطلب ہے کہ میں نے پھینک دیا ہے۔"

"یہ تو وقتی پھینکنا تھا۔ وقتی پھینکنا اس قدر خوفناک تو ——"

"اس ڈر کے مارے تم چلے گئے تھے۔"

"اس غصے کے مارے کہ تمہارا ایک حصہ الگ تھلگ رہتا ہے بے پروا بے نیاز۔ لا
حصہ کسی وقت بھی تم پر مسلط ہو سکتا ہے۔"

"تو اس ایک حصے کو سزا دے رہے ہو۔" وہ ہنسی۔

ہو نہوں بے پروا بے نیاز کو کون سزا دے سکتا ہے سزا تو صرف اسے دی جا سکتی ہے جو پروا
ز ہو جسے لگن ہو لگاؤ ہو۔"

"مطلب یہ ہے کہ ایک حصے کے قصور پر دوسرے کو سزا مل رہی ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"بہرحال۔" وہ بولی "گاڑی فلیگ سٹیشن سے نکل گئی۔" پھر اس نے از خود اپنا بازو اس کے
نو میں تھما دیا۔

"مجھے کوئی شکایت نہیں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "ہونی ہو کر رہتی ہے۔ لیکن وہ بولی۔ "یہ سب
لی جو تم سنا رہے ہو محض باتیں ہیں ——" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "ایک روز میں نے
یں ایک کہانی سنائی تھی معلوم ہوتا ہے وہ کہانی اب ختم ہو رہی ہے"۔ اس نے آہ بھری۔
"اور یہ کہانیاں جو تم مجھے سنا رہے ہو محض قصے ہیں سنانے کے قصے تم ناراض اس لیے ہوتے
کہ تم مجھ پر شک کرتے تھے تم سمجھتے تھے کہ میں ہر کسی سے آنکھیں لڑاتی پھرتی ہوں۔ اس
ز تم اسی لیے چلے گئے۔ لیکن یہ تمہاری آج کی نگاہ نہ تو اس شک کی وجہ سے ہے اور نہ غصے
ا وجہ سے۔ یہ تو ——" وہ رک گئی۔

"یہ تو کیا؟"

"یہ تو گاڑی فلیگ سٹیشن سے نکل گئی اور بس"۔ وہ مسکرائی۔

"کیا مطلب" ایلی نے تڑپ کر شہزاد کی طرف دیکھا۔

شہزاد کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک رہے تھے۔ "اچھا کیا۔" وہ بولی۔ "بہت اچھا ہوا یہاں
راہی کیا تھا۔ جو تمہاری بھینٹ کیا جاتا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ زندگی میں تم سے ملنا ہوگا تو میں
ماری بھینٹ کرنے کے لیے اپنا سب کچھ امانت رکھتی۔" اس نے آنسو پونچھے اور دفعتاً کہنے
لے "میرا ہاتھ تو تھام لو کم از کم چلو دھوکہ ہی سہی۔ اب میں خود کو دھوکہ دے کر بھی دیکھ رہی
ل۔ اس میں میری مدد کرو۔"

شہزاد نے ایک عجیب سی نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ایلی نے زبردست دھچکا سا محسوس کیا وہ گر رہا تھا
ا جا رہا تھا۔

ایلی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس پر ہمیشہ شدید خوف غالب رہتا تھا کہ اسے بے
نہ سمجھا جائے۔

ال یا محبت

علی احمد کے گھر میں پرورش پانے کی وجہ سے چند ایک باتیں اس کے دل میں گھر کر گئی

تھیں اور اس قدر جڑ پکڑ چکی تھیں کہ انہیں دل سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ ان باتوں پر
حد تک یقین رکھتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت کی بنیاد بن چکی تھیں۔ یہ باتیں تجربے یا لا
شعور سے اخذ نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کے دل کے گہرے ترین جذبات ان کا منبع تھے۔

ایلی سمجھتا تھا کہ محبت صرف ایک محبوب سے ہو سکتی ہے اور مقصود شادی نہ ہو تو محبت
نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں کسی سے محبت لگا کر بے وفائی کرنا شدید ترین گناہ تھا اس کا خیال
تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ عورت کو مکمل آزادی ہونی
چاہیے اس سے ایسا سلوک روا نہیں رکھنا چاہئے جس میں امتیاز کا عنصر ہو اسے بھیڑ بکری یا مال
نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہ سب خیالات اس نے علی احمد ہاجرہ اور اپنی زندگی سے اخذ کیے تھے۔

اس نے اپنے باپ کی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بہت دکھ سہا تھا۔ اپنی والدہ کی
مظلومیت کی وجہ سے اس کا بچپن تباہ حالی میں گزرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس محبت سے
محروم رہا تھا جس کے بغیر بچے کی شخصیت پھل پھول نہیں سکتی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے شہزاد سے محبت ہے تو پھر سادی سے کیا ہے اسے سادی سے
تنہائی میں ملنے کے کئی ایک مواقع ملے تھے۔ گھنٹوں وہ اس کے پاس کھڑا رہا تھا لیکن اس نے
کوئی خصوصی خواہش محسوس نہ کی تھی اسے سادی سے مل کر ایک ان جانی خوشی ہوتی تھی
کا خط پڑھ کر وہ مسرت کی ایک رو محسوس کرتا تھا۔

اگر اسے سادی سے محبت ہے تو پھر شہزاد سے کیا تھا۔ کیا اس روز جب وہ کھانا لا رہی
تھی۔ اور ایلی نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اس کا ارادہ ہوس کاری پر مبنی تھا۔ اس وقت اس کی
نس نس میں دھنکی سی کیوں بجی تھی جب وہ شہزاد کا ہاتھ پکڑتا تھا تو اس کے جسم میں چیونٹیاں
کیوں چلنے لگتی تھیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب
کیا یہ ہوس تھی کیا جسمانی قرب کی خواہش ہوس ہوتی ہے۔

لیکن محبت میں آرزو تو ضرور ہوتی ہے۔ قرب کی آرزو نہ ہو تو کیا ہو سکتی ہے۔ ا...
سمجھ نہیں آتا تھا۔

یہ درست تھا کہ سادی کے ساتھ اس نے جسمانی قرب کی خواہش محسوس نہ کی تھی

اس کی موجودگی میں ایک لطیف سا نشہ اس کی نس نس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن شہزاد کے لیے وہ
یہی آرزو کرتا تھا اور تنہائی میسر ہوتی تو اس کا جی چاہتا اس کے قریب تر ہو جائے۔ اگر شہزاد
اس کی بے پروانہ ہو جایا کرتی تو نہ جانے اس قریب کا نتیجہ کیا نکلتا۔ بہرحال وہ نتیجہ اسے
بے پروائی پر گوارا نہ تھا۔ جو اس روز بند بیٹھک میں ہوا تھا اس کی ایلی نے آرزو نہ کی تھی بلکہ
اس نے وہ قدم صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ اگر عورت سے منہ زبانی محبت کی
جائے تو وہ اکتا جاتی ہے۔

بہرحال جہاں تک اس کے اپنے جذبات کا تعلق تھا وہ دل کی گہرائیوں میں سادی کی محبت کو
جائز سمجھتا تھا چونکہ اس میں گناہ کا عنصر شامل نہ تھا سادی کسی کی بیاہتا بیوی نہ تھی اس کے علاوہ
اسے شہزاد پر اعتماد نہ تھا نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا محلے کے تمام جوان اس کے عشق میں سرشار
ہیں اور شہزاد فطرتاً "محبت بھری نگاہوں کے سحر سے خود کو محفوظ کرنے کی خواہشمند نہ تھی۔
چاہے وہ نگاہیں کسی کی بھی ہوں۔

شہزاد کا حسن اس کے دل میں احساس رقابت پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس
کی رقیب ہے اور وہ شہزاد کے نقاب کے ابھرے تاروں کو گنتا رہتا لیکن شاید یہی محبت کا ثبوت
تھا بہرحال یہ احساس اس قدر اذیت دہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرے۔

وہ چوری چوری دعائیں مانگتا تھا کہ سادی کی بات میں مشکلات حائل نہ ہو جائیں سادی اس
کی ہو جائے اور اس کی زندگی سے وہ خوف' رقابت اور احساس گناہ خارج ہو جائے جو شہزاد کی
ذات سے وابستہ تھا لیکن اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ اعلانیہ اس آرزو کو اپنا لے کیونکہ وہ
جانتا تھا کہ اسے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ شہزاد سے بے وفائی کر رہا ہے اور یہ بات اسے
کسی صورت میں گوارا نہ تھی۔

جب سے ایلی لاہور سے آیا تھا اس نے شہزاد کی طرف خصوصی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے
اس کا اٹھا ہوا بازو پکڑنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس نے غور نہ کیا تھا کہ اس کے ماتھے کا تل کب
چمکیلا اور کب سرخی مائل۔ اس نے شہزاد کے جسم کی خوشبو کو اس شدت سے محسوس نہ کیا
تھا اس تبدیلی' اس بے رخی کا جواز یہ پیدا کیا تھا کہ وہ شہزاد سے ناراض ہے چونکہ پچھلی
مرتبہ جب وہ علی پور آیا تھا تو شہزاد نے اس سے بے پروائی کا سلوک کیا تھا۔

بہرحال اندرونی طور پر وہ ایک شدید کشمکش میں مبتلا تھا اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ

شعوری طور پر فیصلہ کرتا کہ آیا اسے سادی سے محبت تھی یا شہزاد سے یا بیک وقت دونوں سے۔

دیوتا

اگر شہزاد ایک عام عورت ہوتی تو وہ ایلی کو یوں بے پروا دیکھ کر بے زار ہو جاتی شہزاد کے لیے ایلی بدنامی کے ٹیکے کے سوا اور کیا تھا۔ ایلی کی وجہ سے محلے والیاں اسے طعنے دیا کرتی تھیں ہاجرہ اور فرحت سمجھتی تھیں کہ شہزاد نے جادو کے زور پر ایلی کو طوطا بنا کر اپنی انگلی پر بٹھا رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا خاوند اس سے بدظن ہوا جا رہا تھا۔ اس کی اپنی والدہ شکوک سے بھری ہوئی تھی لیکن مجبور تھی۔ شہزاد کے تیور دیکھ کر خاموش ہو رہتی بذات خود ایلی ہر روز شہزاد سے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر لیتا تھا تم نے فلاں کی طرف کیوں دیکھا تھا۔ تم میرے پاس بیٹھنے سے گریز کیوں کرتی ہو۔ سارا دن ایلی کے سامنے چڑھاوے چڑھتے رہتے۔ نئی نئی چیزیں پکا کر اس کے سامنے رکھی جاتیں جیسے گھر میں دیوتا بٹھا رکھا ہو۔

شہزاد کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ وہ دیوتا سامنے بیٹھا رہے۔ نہ تو اس کے آگے بھکشا کے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی اٹھ کر کہیں جائے لیکن اس کی پریم مرلیا مدھر گیت بجاتی رہے۔ دراصل شہزاد فطری طور پر "ان لنگی۔" عورت تھی۔ اسے جسم سے لاگ تھی اسے اپنے گرد محبت کا ہالہ قائم رکھنے کا جنون تھا وہ پنگھٹ کی پیاری تھی لیکن گگری بھرنے سے اسے بیر تھا اور جسمانی قرب کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھی جب پریم کے دیپ کو جلتا رکھنے کے لیے اس میں تیل ڈالنا ازبس ضروری ہو جائے۔

ایلی کی بے پروائی کو محسوس کر کے شہزاد یوں تڑپنے لگی جیسے مچھلی جل بنا تڑپتی ہے۔ پریت کا دیپ بجھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، ہاتھوں، ہونٹوں، اور انگ انگ سے تیل کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ دیوتا کو منانے کے لیے ناری اپنی بھینٹ لیے کھڑی تھی۔

ایلی کو ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ عشق میں ازلی طور پر خودکشی کا عنصر ہوتا ہے۔ عشق بذات خود عاشق کو محبوب کے وصال سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ محبت محبوب کا حصہ ہے عاشق کا نہیں اور اگر کسی کی محبت حاصل کرنا مقصود ہو تو اسے محبوب بننے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ عاشق۔ اور بے نیازی محبوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ سادی کے خیال میں کھو کر وہ شہزاد کا محبوب بن گیا اور ناری کی تمام قوتیں اس بات پر تل گئی تھیں کہ ایلی

محبت کا دیپ جلا کر اسے وہی پرانی حیثیت بخش دی جائے اور پھر شہزاد شہزاد بن کر وہی پرانا پجاری کا روپ دھارے اور پھولدار دوپٹہ لے کر تتلی سی ادھر ادھر اڑتی پھرے۔

محض اتفاق کی بات تھی کہ بیگم اس وقت علی پور آئی تھی جب شہزاد اور ایلی نے اپنے رول بدل لیے تھے۔ اور ایلی کی حیثیت محبوب کی بن چکی تھی۔

اگر وہ پہلے آتی تو ممکن ہے وہ سمجھتی کہ ایلی شہزاد کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اور شہزاد اسے مارتی نہیں لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ شہزاد ہاتھ پھیلا رہی ہے اور ایلی دیوتا سامنے بے نیاز بیٹھا ہے لہٰذا اس نے محسوس کیا شہزاد غلام علی ہے اور ایلی ایک ہیچ عورت جو خریدی جا سکتی ہو نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم کے دل میں شہزاد کے لیے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو غلام علی سے وابستہ تھے۔ نفرت اور حقارت کا یہ طوفان چونکہ چل نہ سکتا تھا لہٰذا اس کے دل کی گہرائیوں میں اکٹھا ہوتا رہا اور اس کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے شہزاد اور ایلی کا مستقبل تاریک ہوتا گیا۔

سب سے پہلے بیگم نے اس کا اظہار جانو کے سامنے کیا۔

جانو نے اپنی تمام تر زندگی تیاگ کے تحت بسر کی تھی۔ وہ جوانی میں خوش شکل تھی اور جوانی ہی میں اس کا خاوند مر چکا تھا اور اس نے اپنی تمام تر زندگی لوگوں کے کام کاج کرنے اور عصمت کے تحفظ میں بسر کی تھی۔ بیگم کی بات سن کر وہ آتش فشاں پھٹ گیا۔

"اے ہے۔" جانو بولی "بیگم یہاں تو آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے اب رانی سے کون کہے کہ آپ سنبھال۔"

"آخر بیٹی کس کی ہے۔" بیگم کے دل میں غلام علی بسا ہوا تھا۔

"بیٹی تو تمہاری ہی ہے۔" جانو بولی۔

"ہائے میری ہوتی تو یہ چلن نہ ہوتے۔"

"اور وہ شریف میاں بدھو۔؟" جانو بولی۔ "وہ سب کچھ دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا بیگم کو خاوند ہے۔"

"ہوں خاوند۔" بیگم نے کہا "اس محلے کے خاوند تو نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں ملاں والی بات ہی نہیں۔" بیگم کے نزدیک تو صرف ایک خاوند ایسا تھا جو خاوند کہلانے کا حق تھا لہٰذا اس نے بیگم کو گھر سے نکال کر ازلی محبوب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

بیگم اور جانو کی یہ دبی دبی باتیں ابھریں اور پھر اس پراسرار اصول کے ماتحت باہر نکل گئیں

جسے آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔

محلے والے جو ایلی اور شہزاد کے قصے پر اظہار خیال کرتے کرتے اکتا گئے تھے' ایک بار جوش میں آ گئے اور تازہ دم ہو کر اس پٹی ہوئی لکیر کو پیٹنے لگے۔

ایلی یہ حالات دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

محبت نامہ

——ایک روز جب وہ سب چوبارے میں بیٹھے تھے۔ ایلی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا شہزاد کے ہاتھوں میں پوجا کے پھول تھے اور وہ بنفس نفیس آرتی بنی ہوئی تھی۔

بیگم کے دل سے شعلے نکل رہے تھے جانو کے ہونٹوں پر تحقیر تھی تو دروازہ بجا۔

"جا دیکھ جا کر۔" شہزاد جانو سے مخاطب ہوئی "نیچے ڈاکیہ کب سے محبت نامہ لیے کھڑا ہے۔" وہ حسب معمول مسکرائی۔

"محبت نامہ" بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں وہ کہتے ہیں جادو برحق ہے۔"

دوسری مرتبہ دروازہ بجا تو جانو نیچے اتر گئی۔

شہزاد ہنسنے لگی "اماں اگر آج بھی محبت نامہ موصول نہ ہوا تو پھر چھوڑو ان تعویز گنڈوں کو۔"

"کیسے چھوڑوں" بیگم بولی۔ "جس کا راج پاٹ لٹ گیا——" وہ رک گئی اس کی آنکھیں ڈبڈبا چکی تھیں۔

شہزاد پھر ہنسی۔ "تو اماں راج پاٹ کے لیے روتی ہو نا—— میں سمجھی پتی بھگتی کے لیے رو رہی ہو۔"

"جس پر بیتے وہی جانے ہے۔" بیگم نے کہا۔

"مجھ پر بیتے تو میں سمجھوں۔ خس کم جہاں پاک۔" شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔

"تیری نظر میں کوئی ہو گا۔" بیگم نے ایلی پر جلی کٹی نگاہ ڈالی۔

شہزاد نے قہقہہ لگایا۔ "ہاں ہے۔" وہ بولی۔ "نہ بھی ہوتا جب بھی یہی سمجھتی۔"

جانو آئی تو اس کے ہاتھ میں خط تھا۔

"دیکھا نا میں نے کہا نہ تھا۔" شہزاد بولی۔

"تمہارا ہی محبت نامہ ہو گا۔" بیگم بولی۔

"مجھے کون لکھتا ہے جی اور پھر محبت نامہ۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی "محبت نامے" میں زیادہ لکھا ہوتا ہے کہ روٹی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روٹی کا مطالبہ ہے کھائی اور ے زبانا یہ ہمیں موند لیں۔ انہیں محبت سے کیا واسطہ۔"

"یہ تو میرا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"شاید غلطی سے تمہارا نام لکھ دیا ہو۔ کھولو تو۔" شہزاد بولی۔

ایلی نے اسے کھولا تو وہ بھونچکارہ گیا وہ سادی کا خط تھا۔

جانو چلائی ہے "یہ کیا خط ہے۔ یہ تو اخبار معلوم ہوتا ہے۔"

"اور کیا محبت کی بات مختصر ہوتی ہے کیا" شہزاد بولی۔

ایلی کا رنگ فق ہو گیا۔

"اور جس کے نام آیا ہے اس سے پوچھو وہ تو پیاسا ہی رہ جاتا ہے" شہزاد مسکرائی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے شہزاد۔ سادی کے تمام قصے سے واقف ہو۔

"یہ تو کالج کے متعلق ہے۔" ایلی کہنے لگا۔

"جبھی خط نہیں دفتر ہے۔" جانو بولی۔

ایلی خط اٹھا کر ایک طرف چلا گیا۔

سادی کا خط پڑھ کر ایلی ایک مرتبہ پھر اسی فضا میں پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ زینے والے کمرے میں کھڑا ہو اور سادی مسکرا رہی ہو مسکرائے جا رہی ہو سارے خط میں محبت کا تو کہیں نام ہی نہ تھا۔ وہ خود ہنستی تھی اور ایلی کو گدگداتی تھی۔ اور بہانے بہانے لگاؤ کی بات سمجھاتی تھی۔

ایلی نے وہ خط کئی ایک مرتبہ پڑھا۔ اور وہ قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ علی پور میں ہے اور اس کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے سامنے آرتی—— پڑی ہے پوجا کے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ بیگم میں غصے بھرا طوفان اٹھ رہا ہے محلے میں لوگ ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بیٹھے ہیں۔

اس روز پہلی مرتبہ وہ باہر نکل گیا۔

محلے سے وہ جلدی جلدی نکل گیا تاکہ کوئی بات نہ چھیڑے پھر کھیتوں میں پہنچ کر وہ کوٹلی کی

طرف چلا گیا۔

اس کے سامنے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ "خط کا جواب کیوں دیں گے آپ۔" لا
رہی تھی "ان پیسوں کا بالائی کا برف کھائیے نہیں تو پتلون رفو کرا لیجیے" وہ اپنے لکھے ہوئے
دہرا رہی تھی۔

دوسری طرف منصر کھڑا کہہ رہا تھا "وعدہ کیجیے کہ آپ ان لوگوں سے براہ راست رابطہ
نہ کریں گے۔" تیسری طرف امان بندوق اٹھائے اس کی جانب آ رہا تھا۔ اماں ہاتھ مل رہی تھ
"ہیے اب کیا ہو گا۔"

سادی کے خط میں دو باتیں امید افزا تھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی کوئی صاحب علی
آئیں گے تا کہ ایلی اور آصفی خاندان کے متعلق تحقیق کریں۔ کرتے پھریں تحقیق ہمیں
دوسرے اس نے خط میں پتہ لکھا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ جواب ضرور دیا جائے۔ اور اس پتہ پر
جائے اور اس کی راست گوئی کا مضحکہ اڑایا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ معاملہ کو راز رکھنا ضرور
ہے۔

دیر تک ایلی بیٹھ کر اس کے خط کو ذہن میں دہراتا رہا پھر وہ اس کا جواب سوچنے میں منہمک
ہو گیا۔ واپسی پر ایلی کو خیال آیا کہ کیوں نہ رضا سے مل لوں۔ وہ اپنی بے اعتنائی پر شرمندہ
محسوس کر رہا تھا۔ رضا کی دوکان بند تھی اس لیے وہ اس کے گھر چلا گیا۔ ایلی کو گھر کے درواز
پر دیکھ کر رضا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"تم یہاں۔" وہ چلایا۔ "یار بڑے خوش نصیب ہو جو گھر آ گئے ورنہ آج ہی میں نے ا
خطرناک فیصلہ کیا تھا۔"

"کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب بتانے کا کیا فائدہ۔ تم آ گئے ہو تو چلو معاف کر دیا" وہ ہنسنے لگا۔ "آؤ بیٹھو اندر آؤ
تمہیں ایک خبر سناؤں۔"

"کیا" ایلی نے پوچھا۔

"شادی ہو رہی ہے۔"

"کس کی۔"

"اپنی اور کس کی۔"

ایلی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ٹانگ کی طرف دیکھا۔

"تمہاری" ایلی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ٹانگ کی طرف دیکھا۔

"بھئی شادی کو لنگڑے پن سے کیا تعلق" رضا نے قہقہہ مار کر کہا۔ "بلکہ لنگڑے کی پکڑ تو
شور ہے۔"

"تعجب کی بات ہے۔" ایلی بولا۔

"بھئی اپنا اللہ مالک ہے آج تک بھی روزی پہنچتی رہی ہے اب مستقل صورت پیدا ہو
جائے گی۔"

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ وہ روز کسی نہ کسی وقت رضا کو ملنے چلا جاتا۔ اور وہ
دونوں یا تو دوکان میں بیٹھے رہتے یا شیخ ہمدم کے ہاں چلے جاتے۔

شیخ ہمدم اسے دیکھ کر شور مچا دیتا۔

"لو بھئی اب تو چھوڑو بھاؤ تاؤ ہمارے مہمان آئے ہیں اب تو سودا ہو گیا ساڑھے دس آنے
پر بس ــــ ہاں تو الیاس صاحب آئے ہیں آیئے کیا پیو گے بھئی ہم سے بھی کچھ کھا پی لیا کرو
حلال کا مال کھاؤ گے تو موٹے ہو جاؤ گے چلو ایک شطرنج کی بازی رہے او لڑکے دینا ہمیں
شطرنج۔"

ہمدم کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے ایلی سب کچھ بھول جاتا کہ وہ دیوتا بنا بیٹھا ہے۔ سامنے
شہزاد آرتی کے پھول اٹھائے کھڑی ہے اور محلے والے اس دیوتا کو شیطان سمجھتے ہیں۔ اور لاہور
سے لوگ آ رہے ہیں اور اسے علی احمد کو اس بات پر رضامند کرنا ہے کہ باقاعدہ طور پر پیغام لے
کر جائے اور منصر سے ملے۔

ایلی بڑا ہو گیا تھا۔ لہٰذا کچی حویلی یا محلے کے میدان میں کھڑا ہونا یا کھیلنا اس کے لیے مشکل
ہو گیا تھا۔ کچی حویلی اور میدان میں نئی پود نے جگہ لے لی تھی۔ اب یہ ممکن نہ رہا تھا چونکہ یہ
محلے کی روایات کے منافی تھا۔

ایلی کے تمام ساتھی اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ رفیق یوسف اور جمیل اب ملازم تھے
اور مختلف مقامات پر متعین تھے محلے میں صرف رضا کا بھائی ضیاء تھا۔ رفیق کا بھائی صفدر اور چند
ایک اور لڑکے تھے جن سے ایلی کے زیادہ تعلقات نہ تھے البتہ صفدر اب بھی اپنی بیٹھک میں
ادویات کوٹنے چھاننے میں مصروف رہتا تھا اس نے تنگ آ کر اشتہاری حکیم کا کام شروع کر رکھا
تھا۔

صفدر ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایلی کے راز سے واقف ہو۔ ایلی کو دیکھ کر وہ اسے پکڑ لیتا۔ "آؤ بھائی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو گھڑی دو گھڑی کے لیے ہم بھی تو تمہارے چرنوں میں رہتے ہیں۔" ایلی اسے دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صفدر ہمیشہ ایسے انداز سے بات کرتا کہ ایلی کو شہزاد یاد آ جاتی اور اسے محسوس ہوتا جیسے صفدر جان بوجھ کر شہزاد کی بات چھیڑنا چاہتا ہے جیسے وہ ایلی کو زبردستی اس بات پر مجبور کر رہا ہو کہ ایلی اسے راز داں بنا لے اور راز داں بننے کے بعد وہ دونوں مل کر شہزاد سے ... کریں۔

اے ہے

ایک روز جانو ہانپتی ہوئی آئی اور سیدھی ایلی کے روبرو آ کھڑی ہوئی اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایلی اپنے ہی خیال میں مگن بیٹھا رہا۔ اس پر شہزاد بولی "کب تک کھڑی رہے گی تو وہاں۔ اسے تو اپنی بھی خبر نہیں کچھ۔"

"تو کیوں پتلی بنی کھڑی ہے۔"

"اے ہے میں تو حیران ہوں۔" جانو نے کہا۔

"پڑی ہو حیران یہاں کیا فرق پڑتا ہے۔" شہزاد ہنسی۔

"آخر بات کیا ہے۔" بیگم نے پوچھا۔

"ہے وہاں تو مبارکیں مل رہی ہیں۔"

"کسے مبارک مل رہی ہے۔"

"ہے انہوں نے تو مجھے پکڑ لیا۔ تھانیدار کے گھر گئی تھی یہی جو بڑی ڈیوڑھی کے باہر ہے۔ انہوں نے پکڑ لیا۔ مجھے کہنے لگیں۔ بڑا گھر تاکا ہے تم نے۔ اور اب تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔ ہمارے گھر آئے تھے ناپوچھ گچھ کرنے۔ کیا پڑی تھی جانو جو اندر کی باتیں کرتے۔ ہم سے چھپا گئے۔ اب سمجھ لو معاملہ چل نکلا۔"

"تو کھل کے بات کرے گی یا نہیں۔" بیگم نے اسے ڈانٹا۔

"صاف بات تو کر رہی ہوں۔" جانو بولی۔

"خاک صاف ہے۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" بیگم بولی۔

..." بیگم بولی۔ "وہ تو پہلے ہی سے نامزد ہو چکا ہے۔"

"ایلی ... نہیں ان لڑکوں کا کیا اعتبار۔ وہ تو بڑی بڑی مبارکیں دیتے تھے کہتے تھے وہ ... ہے پتہ ... گھرانا اچھا ہے اور لڑکی کا بھائی جو آیا تھا وہ تو مشہور آدمی ہے۔ یہی کہتے تھے بھئی ... اچھے ہیں ..."

"اب تو بھی کچھ بولے گا۔" جانو نے ایلی کو جھنجھوڑ کر کہا۔

"تو نہوں۔" بیگم بولی "یہ مجنوں کہاں بولے گا۔"

"تو کیا وہ لیلے کا خط تھا جو اس روز آیا تھا۔" شہزاد مسکرائی۔

"ہے وہ اخبار؟" جانو نے کہا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔" شہزاد بولی۔ "اس کا گھر بھی بس گیا۔"

"ہے کا تو جائیں گے۔" بیگم نے کہا۔ اس کا چہرا غصے سے لال ہو رہا تھا۔

...لستان

چار ایک دن کے بعد جب ایلی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد چپکے سے دبے پاؤں اوپر آ گئی۔ اور ...ے کہنے لگی۔ "آخر مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ بھاگتے پھرتے ..."

ایلی ہنسنے لگا۔ "خطرناک لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔" اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

"کب سے ہوئی ہوں خطرناک۔" وہ بولی۔

"شروع سے ہی تھی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے۔"

"ایلی" وہ بولی "بات مذاق میں نہ ٹالو۔"

"...ان سے مجھے تو سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بے حد۔ تمہیں ایک ساتھی مل گیا۔ مجھے بے حد خوشی ہے ایلی۔" وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا۔" اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں، ماتھے کا تل سرخ پڑ گیا۔ "مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ایلی۔ ...کا مقصد نہیں۔ میں راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ میں تو بری طرح پھنسی ہوئی ہوں۔ ورنہ مجھ میں اتنی جرات ہے کہ سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔ لیکن ایلی میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اب کیا دھرا ہے۔ کچھ بھی نہیں میں اس قابل نہیں کہ تمہاری زندگی کو

روشن کر سکوں۔" وہ خاموش ہو گئی اور ایلی کے پاس کھڑی ہو کر اس کے بالوں سے کھیلنے لگی
"مجھ سے ڈرو نہیں گھبراؤ نہیں میں تمہاری وہی شہزاد ہوں مجھ سے کیا پردہ رکھو گے لیکن تم
مجھ پر اعتماد بھی ہو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہر راہ گیر سے آنکھیں لڑانے کی شوقین ہوں
تم سمجھتے ہو جس طرح تم نے میرے ہاتھ پکڑے تھے اسی طرح ہر کوئی میرے ہاتھ پکڑ لیتا ہے
میں چپ رہتی ہوں ——"

ہچکی کی آواز سن کر ایلی نے تڑپ کر پیچھے دیکھا۔ لیکن شہزاد نے منہ موڑ لیا تھا۔ کچھ
تک وہ خاموش رہی پھر بولی۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تم میری زندگی میں نخلستان ہو۔ اس صحرا
صرف ایک نخلستان ہے۔"

"جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا تو میں حقارت سے ہنس پڑی تھی۔ جب سادی
نے مجھے بتایا تھا کہ اسے تم سے محبت ہے تو میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے کہا تھا تجھے
نظر آیا ہے ایلی میں۔ بڑا ہی مضحکہ اڑایا میں نے اس کا پھر اس روز جب میں تمہیں کہانی سنا
تھی اور تم نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے نہ جانے اس وقت میں کیوں خاموش رہی ویسے
تمہاری حرکت بہت بری لگی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہو گیا تم نے باتیں کر کے مجھ پر کیا جادو کر دیا
تیری نگاہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور ——
شہزاد نے ایک لمبی آہ بھری۔

"دیکھو شہزاد" ایلی بولا "میں ——"

شہزاد نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"مجھے کہہ لینے دو آج۔ تم تو روز کہتے رہے ہو۔ آج میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ کہہ دوں
جو شاید میں کبھی نہ کہتی وہ بھی کہہ دوں —— میں کئی بار بیٹھی سوچا کرتی تھی مجھے کیا ہو گیا
ہے۔ میرا گھر ہے میرے بچے ہیں میرا خاوند ہے جو میری ہر بات ماننے کے لیے بے چین ہے
مجھے کیا ہو گیا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ انجام کیا ہو ——" وہ رک گئی ——

"میں نے بہت ہی سوچا لیکن میں ہار گئی —— ہار گئی —— ایلی" اس کی ہچکی نکل گئی

——

"میں نے یہ محسوس کیا کہ تم ہو تو زندگی میں سبھی کچھ ہے تم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ
جانے کیوں جی چاہتا کہ تم میرے پاس رہو صرف یہی اور کچھ نہیں مجھے تم سے کوئی غرض نہیں

—— "ایلی کے سر پر پانی کی اک بوند گری۔ اس نے سر اٹھایا۔ شہزاد نے اس
ایلی مجھ نہیں ——
پر کو زبردستی موڑ دیا ——
یونہی بیٹھے رہو میری بات نہ کاٹو۔" وہ بولی ——
"تمہاں نے خواہ مخواہ ان سے بگاڑ کی صورت پیدا کر لی۔ معلوم نہیں کیوں لیکن انہیں دیکھ کر
غصہ آتا ہے خواہ مخواہ میں ان کی ہر بات رد کر دیتی ہوں —— میں نے ان کو عاجز کر دیا
—— جیسے وہ میرے میاں ہی نہ ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہو چکی ہے۔ نفرت"
سیڑھیوں میں سے جانو نے سر نکالا۔ "لو تم یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں ڈھونڈھ رہی
ہے۔ واہ واہ۔" وہ بولی۔
"جانو تم جاؤ۔" شہزاد نے سرد مہری سے کہا۔
"کیوں۔" وہ بولی۔
"بس کہہ جو دیا۔"
"اے ہے ہنڈیا چولہے کی توں پڑی ہے۔" جانو نے کہا "اور تم ——"
"ہنڈیا کو چولہے میں ڈال دو۔" شہزاد نے اپنے ہاتھ ایلی کے سر سے ہٹائے بغیر کہا۔
"لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" جانو نے پوچھا۔
"میں ایلی سے بات کر رہی ہوں۔"
"اے ہے اتنی ہی خاص بات ہے کیا؟"
"ہاں اس سے بھی زیادہ۔"
جانو ہونٹوں پر انگلی رکھے الٹے قدم چلتے ہوئے بولی "اے کوئی خدا کا خوف کرو اگر تمہاری
ماں نے دیکھ لیا تو ——"
"اگر وہ آئے۔" شہزاد نے کہا۔ "تو اسے بھی کہہ دینا کہ اوپر نہ آئے میں ایلی سے بات کر
رہی ہوں۔" جانو نے سینہ تھام لیا۔ "توبہ ہے تمہارا تو جواب نہیں۔"
کچھ دیر کے لیے وہ خاموش کھڑی اس کے بالوں سے کھیلتی رہی پھر بولی "تم میرا ہاتھ تھامتے
ہو تو میں اسے جھٹک دیتی تھی تاکہ بات کا رخ نہ بدل جائے۔ یہ بہشت دوزخ نہ بن جائے۔
اس لیے کہ میں اپنی نگاہ میں آپ نہ گر جاؤں چور نہ بن جاؤں اور پھر مجھ میں اتنی ہمت نہ رہے
کہ سینہ تان کر لوگوں سے بات کر سکوں ——

"مجھے بدنامی کی پروا نہیں ایلی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں لیکن اپنی نظر میں آپ گر جانے
کی پروا ہے۔ اس لیے میں تمہارا ہاتھ جھٹکتی رہی تمہیں روکتی رہی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنا
برا مانو گے ——"

"تم سمجھتے رہے کہ مجھے تم سے صرف دکھانے کی دلچسپی ہے تم سمجھتے رہے کہ میں بے پروا
ہوں بے حس ہوں —— لیکن ——" اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔ شہزاد نے اسے روکا۔ "میری بات سن لو۔" لیکن شہزاد کی باتیں
ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

عین اس وقت بیگم نے زینے سے سر نکالا۔ "تمہاری خاص بات ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔"
اس کے انداز میں غصہ اور طعنہ تھا۔

"تمہارے دخل دینے سے کیا ختم ہو جائے گی' اماں" شہزاد نے جواب دیا۔

"تم تو اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔" بیگم غصے میں چلائی۔

"یہ تو گھر والا جانے ماں تم کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہو۔"

"وہ تو مجھے پتہ ہے کہ یہ گھر میرا نہیں۔" بیگم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"تو کیا اس گھر کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے۔" شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"آؤ ایلی۔" شہزاد بولی۔ "نیچے چل کر چائے پئیں۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

ایلی بیگم کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں بیگم کو چھوڑ کر نیچے جانے کی اس میں جرات نہ تھی۔ دیر
تک وہ بیگم کو بہلاتا رہا۔ تسلی دیتا رہا اور بیگم ٹپ ٹپ آنسو بہاتی رہی۔

گھر میں کوئی نہیں

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے چار ایک روز پہلے ایلی لاہور روانہ ہو گیا۔ اسے نتیجہ کے متعلق کوئی
دلچسپی نہ تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں اس کے ہم جماعت صبح و
شام مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ وہ کتاب کھول کر خیالات میں کھو جایا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ
پوری توجہ سے پڑھے تاکہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔ پہلے ہی وہ اتنے سال ضائع کر چکا تھا اس کے
علاوہ اسے معلوم تھا۔ کہ منصر کی خواہش ہے کہ وہ اچھے نمبروں پر پاس ہو۔ منصر اسے ایک لائق

بیٹا سمجھتا تھا اور ایلی چاہتا تھا کہ منصر کی توقعات پر پورا اترے لیکن جونہی وہ کتاب اٹھاتا پہلی ہی
بار کوئی نہ کوئی ایسا لفظ آ جاتا کہ اس کے خیالات کا رخ بدل جاتا اور وہ سوچ میں کھو جاتا اور
کتاب جوں کی توں اس کے ہاتھوں میں دھری کی دھری رہ جاتی۔

اب ایلی کو پاس ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ نتیجہ کے لیے لاہور جانے سے اس کا مقصد صرف
منزل کے افراد سے ملنا تھا۔

اپنا سوٹ کیس ایک ہوٹل میں رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل میں پہنچا۔ دوپہر کا وقت تھا۔
منزل کا نچلا حصہ ویران پڑا تھا۔ کچھ دیر وہ اس ہال نما ڈیوڑھی میں کھڑا رہا تاکہ کوئی آئے تو
اسے پوچھ سکے۔ پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ پا کر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ وہ
اوپر چڑھ گیا۔ اور اس نے دوسری منزل کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ دیر تک کسی نے جواب نہ دیا
پھر اندر سے آواز آئی۔ "کون ہے؟"

ایلی نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے خود سادی کھڑی تھی۔
ایلی کو دیکھ کر سادی نے چیخ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگی "باجی! باجی!!"

"کیا ہے؟"

"آؤ۔ آؤ۔ جلدی ہی ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگی۔

"ارے کیا واقعی۔" دور سے باجی کی آواز سنائی دی۔

"ہائے بھاگو۔ دوڑ کر۔" سادی چیخ رہی تھی۔

اور ایک طوفان بدتمیزی مچنے لگا۔ جس میں قہقہہ۔ چیخیں' آوازیں اور جانے کیا کیا شامل
تھا۔ ایلی گھبرا گیا۔ اور چپکے سے نیچے اتر آیا۔ نیچے صدر دروازے کے قریب وہ یوں معصوم انداز
میں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی ابھی داخل ہو اور اس شور شرابے کے متعلق اسے قطعی علم نہ ہو جو
اوپر منزل میں مچا ہوا تھا۔

پھر وہ جنگلے پر آ کھڑی ہوئیں اور سلاخوں سے نیچے جھانکنے لگیں۔

"بھاگ گئے کیا۔" باجی بولی۔

"میدان کے مرد ہیں۔" سادی ہنسی

"اب منہ بھی چھپا لیجئے۔"

"تو ہنہ پھیکوں۔"

"اونہوں شرمایئے نہیں۔"

"ڈریئے بھی نہیں وہ بندوق والے چلے گئے۔"

وہ دونوں ایک ساتھ چلا رہی تھیں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

"قریب کیوں نہیں آتے۔"

"پتلون پیچھے سے رفو کی ہوئی ہے نا اس لیے۔"

"ہئے دبلے ہو گئے ہیں۔"

"نہ بھادوں سوکھے نہ ساون ہرے۔"

اس پر وہ دونوں قہقہے لگانے لگیں پھر خاموشی چھا گئی۔

ایلی جوں کا توں کھڑا رہا۔

پھر زینے میں بڑے بڑے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ ایلی چونکا۔

ایک زینے سے سادی اتری اس کے سر پر پانچ چھ دوپٹے یوں لپٹے ہوئے تھے۔ جیسے بڑی پگڑی ہو۔ جسم پر کالا اچکن تھا اور پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔

وہ وہیں رک گئی۔ "کون ہے؟" اس نے بھاری آواز بنا کر کہا "گھر میں کوئی نہیں۔" بولی۔

اتنی سی چوری

ایلی خاموش کھڑا رہا۔ اوپر جنگلے کی سلاخوں سے باجی کا چہرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ کس سے ملیں گے۔" وہ بولی۔

"آپ سے" ایلی اس کی طرف بڑھا۔

سادی نے شور مچا دیا۔ ایک بار پھر سارا گھر قہقہوں سے گونجنے لگا۔

ایلی سادی کے پیچھے بھاگا وہ آگے آگے قہقہے لگاتی دوڑ رہی تھی۔

ایلی کی کوشش تھی کہ اس کے سر سے ایک دوپٹہ اتارے۔

وہ دونوں اوپر جا پہنچے ایلی زینے کے دروازے میں رک گیا۔

"بس" باجی چلائی۔

"آگے پر جلتے ہیں۔" سادی نے شور مچایا۔

"یہ دوپٹہ مجھے دے دو۔" ایلی نے کہا۔

"کیوں پگڑی باندھنے کا ارادہ ہے۔"

"رومال بناؤں گا۔"

"اونہہ رومال۔ یہ دوکان نہیں شریف زادیوں کا گھر ہے۔" سادی ہنسی۔

ایلی جلال میں آگیا۔ "وہ سلگا ہوا سگرٹ یاد ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا" وہ چلائی "جب خلیل فاختہ اڑایا کرتے تھے۔"

"اب بھی فاختہ اڑا سکتے ہیں خلیل۔" وہ بولا۔

"دان تو منگتوں کو دیتے ہیں۔" سادی ہنسی۔ "چھین کر لے جایئے۔"

"ہے ہمت" باجی بولی۔

"اونہوں" سادی چلائی "صرف دروازے تک۔"

"اور اگر چھین لیا تو۔ انعام ——" ایلی بولا۔

"جو مانگو گے ملے گا۔" سادی نے قہقہہ لگایا۔

"شرط یہ ہے کہ سر کا دوپٹہ اتار دو۔" باجی بولی۔

"میں شور مچا کر محلے کو اکٹھا کر لوں گی۔ سوچ لیجئے۔" سادی ہنسنے لگی۔

"اور اگر کوئی آگیا تو؟" باجی نے کہا۔

"تو یک بنی دو گوش" سادی نے قہقہہ لگایا۔

"تو تیار ہو جاؤ۔" ایلی نے کہا "مابدولت تشریف لاتے ہیں۔"

"حرم میں تو صرف خواجہ سرا آتے ہیں مابدولت نہیں" سادی ہنسنے لگی۔

"کیا واقعی —— یا دھمکی دے رہے ہیں۔" باجی نے سادی کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ تو بھگت ہیں۔ سورما ہوتے تو خطرہ بھی ہوتا۔" سادی چلائی۔

"خالی مالا جپتے ہیں کیا؟"

"وہ بھی رام نام کی جبھی تو بن باسی ہیں آج کل" سادی بولی۔

ایلی نے جست بھری اور سادی کی طرف لپکا۔

سفید منزل میں کہرام مچ گیا وہ آگے بھاگ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں قہقہے لگا رہی تھیں وہ پیچھے تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ سفید منزل میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ وہ بھول چکا تھا

کہ گلی کے سب لوگوں دروازے کھول کر سفید منزل کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ
بھول چکا تھا کہ وہ منصر کا دوست ہے۔ اس نے منصر سے وعدہ کیا ہے کہ براہ راست ان سے رابطہ
پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور اسے سفید منزل کے جغرافیہ سے قطعی طور پر واقفیت
نہیں۔

دیر تک وہ بھاگتے رہے پھر ایلی نے سادی کو پکڑ لیا۔ سادی نے با آواز بلند چار ایک چیخیں
ماریں اور دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔

بصد مشکل ایلی نے دوپٹہ الگ کیا۔ سادی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کاٹا۔ اس کے بال
بکھرے ہوئے تھے منہ سرخ ہو رہا تھا۔

ایلی دوپٹہ لے کر بھاگا۔

جب وہ صحن میں پہنچا تو سامنے ایک ضعیف عورت کھڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی
تھی۔ چند ایک ساعت کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے رہے —— پھر ایلی
گھبرا گیا۔

ضعیف عورت نے چیخنا شروع کر دیا "چور چور۔"

ایلی گھبراہٹ میں اندر کی طرف بھاگا۔

نچلی منزل سے شور سنائی دیا۔

سادی اور باجی دونوں سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگیں۔ "کون چور؟ کہاں ہے چور دادی اماں؟"
لیکن بڑھیا برابر چلاتی رہی۔ "چور چور۔ دوڑو دوڑو۔"

پھر صحن میں دو چار مردوں کی آوازیں سنائی دیں "کیا بات ہے کیا ہوا؟"

ایلی کا دل ڈوب گیا اب وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت سادی بھاگی بھاگی آئی اس نے ایلی کی بانہہ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور ایک زینے میں
دھکیل دیا۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں چپ بیٹھا رہا۔ باہر سے باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ "یہاں تو
کوئی چور نہیں ہے۔" سادی کہہ رہی تھی۔ "میں بھائی جان کے کپڑے پہن کر باجی کو ڈرا رہی
تھی۔"

"اے ہے میں کیا پاگل ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

دفعتاً" ایلی کو خیال آیا۔ ارے وہ چونکا یہ تو وہی زینہ ہے جس کے نیچے ہم ملا کرتے تھے

آہستہ آہستہ اس کاٹھ کباڑ سے بچتا ہوا نیچے اتر گیا۔
نیچے جا کر اس نے اس دروازے کو آزمایا جو باہر گلی میں کھلتا تھا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ وہ
ہو گیا۔ اوپر وہ مکان کا کونہ کونہ دیکھ رہے تھے۔
نہ جانے کب کوئی زینے سے آئے۔

ایلی نے اس دروازے کی درز میں سے دیکھا جو سفید منزل کے اندر کھلتا تھا۔ باہر ہال نما
ڈیوڑھی میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ بہر حال باہر نکلنا مشکل تھا۔

اس نے دروازے کی کنڈی کھلی رہنے دی اور پھر آہستہ آہستہ پٹ کھولنے شروع کر
دیئے۔ تاکہ دروازہ کھلا ہو تو انہیں وہاں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو پھر وہ دروازے کے پٹ
کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

چند ساعت کے بعد ایک محلے دار داخل ہوا۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

محلے دار سیدھا آگے نکل گیا۔ پھر وہ زینے میں جھانک کر بولا "یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" یہ
کہہ کر وہ ایلی کی طرف مڑا۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا "کیوں صاحب اس کونے
میں ہے کوئی۔" ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اس کے انداز سے دوستانہ محبت ٹپک رہی تھی۔

"یہاں بھی نہیں نا۔" وہ بولا "میرا خیال ہے گھر والوں کو خواہ مخواہ شک پڑا ہے۔ ہے نا۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے کہا۔

نووارد اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایلی کے شانے پر رکھ دیا۔ "آؤ چلیں۔" وہ بولا
"تلاش بے کار ہے۔"

اس کا خاموش ہاتھ ایلی سے سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے ایلی نے اس کے
گونگے پیغام کو نہ سمجھا۔

"جی جی۔ میں میرا مطلب ہے۔" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے ایلی کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس کے قریب تر ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں —— میں سامنے گھر میں رہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسے باہر لے آیا۔

اور وہ سب سفید منزل سے باہر نکل گئے۔

ایلی کے دل میں جذبات کا ایک عظیم تلاطم موجزن تھا۔

اپنے مکان کے سامنے پہنچ کر محلے دار رکا۔ "آیئے بیٹھئے۔" اس نے ایلی سے کہا "تھوڑی دیر آرام کر جایئے۔"

"بڑی مہربانی ہے مجھے جانا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

محلے دار کے مکان پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل۔

"ارے۔" ڈاکٹر اسماعیل چلایا۔ "یہ دیکھئے۔" اس نے ایلی کی پتلون کی طرف اشارہ کیا پتلون کی جیب میں سے سادی کے دوپٹے کا ایک حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔

"کیا یہ چوری کا مال ہے؟" ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"جی" ایلی بولا۔

"کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دوپٹہ ہے۔"

ڈاکٹر نے تہقہہ لگایا۔ "بس صرف اتنی سی چوری ——— اس کو تو تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا حصہ مانگنا بے کار ہے۔"

ایلی ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔

شاہ کی سواری

گلی پر خاموشی چھا چکی تھی۔ جنگلے ویران پڑے تھے۔ سفید منزل میں کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

دو روز ایلی چھپ کر ہوٹل میں بیٹھا رہا تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ پائے اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس روز لاہور میں موجود تھا جب سفید منزل میں ہنگامہ ہوا تھا۔

اسے یقین تھا کہ منصر کی آمد پر گھر میں ایک بار پھر ہنگامہ ہو گا اور کرامو زور اس واقعہ کی نوعیت پر بحث کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منصر کو سب سے پہلے ایلی کا خیال آئے گا اور ممکن ہے وہ اس امر کی تحقیق بھی کرے کہ ایلی لاہور تو نہیں۔

ایلی کو عجیب سے وہم ستا رہے تھے شاید وہ علی پور میں تھانے دار کے نام جوابی تار بھیج دے۔ جس تھانیدار کے ہاں انہوں نے ایلی کے متعلق تحقیق کی تھی۔ شاید ڈاکٹر اسماعیل اس کا وہ راز افشا کر دے اور ہنس کر کہہ دے:

...نہیں۔ کوئی چور وور نہیں آیا۔ اپنے آدمی کو چور نہیں سمجھا کرتے۔"

...گھبرانے کی بات نہیں ... شاید یہ سوچ کر کہ ایلی نے تو راست گوئی کے تحت سچی بات بتا ہی دینی ہے سادی اور باجی ... پہلے ہی حقیقت حال سے آگاہ کر دیں۔ اس کے بعد اگر ایلی نے جھوٹ بولا تو منصر پر کیا ... پڑے گی۔

...دو روز وہ بیٹھا سوچتا رہا۔

...تیسرے روز رات کے بارہ بجے نتیجہ کا اعلان ہونا تھا۔ ایلی نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور گاڑی کے ... اسٹیشن پر پہنچا وہاں سے وہ ایک دوسرے ہوٹل میں گیا اور وہاں جا کر کمرہ لے لیا تاکہ رجسٹر ... جو اندراج ہو بوقت ضرورت اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکے پھر مطمئن ہو کر وہ باہر ... گیا۔

...نیلے گنبد میں جب وہ چائے پی کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ منصر موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔ ... نے آواز دی۔ منصر رک گیا۔

"ارے" وہ بولا "آپ یہاں؟"

"جی" ایلی نے کہا۔

"کب سے؟" منصر نے سرسری انداز سے پوچھا۔

"دوپہر کی گاڑی سے پہنچا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر اب آپ کی طرف جا رہا تھا۔"

"کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہے کیا؟" منصر نے پوچھا۔

"اب جو نتیجہ سننے کے لیے آیا ہوں تو ———"

"اوہ" منصر بولا "آج تو آپ کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔"

"جی" ایلی نے کہا۔

"آپ تو شاید پاس ہیں۔" منصر نے سوچتے ہوئے کہا "یا شاید ———" وہ رک گیا۔

"دراصل" اس نے بات شروع کی "مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ کیا تھا؟"

ایلی نے اپنا رول نمبر بتایا۔

"ہاں" منصر بولا۔ "شاید یہی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن اپنے ایک جاننے والے کو ... نتیجے کی ایک نقل مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو تھا اگرچہ اچھی طرح مجھے ... کا نمبر یاد نہ تھا۔ اوہ۔" وہ چونکا "شاید میں نے پرزے پر نقل بھی تو کیا تھا۔" اس نے جیب

سے کاغذ کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا۔ "ہاں یہی ہے۔" اس نے کہا۔ "اتفاق کی بات ہے۔" وہ ...
گیا۔

پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "تو سمجھ لیجئے کہ آپ پاس ہی ہیں۔ پاس ہی ہوئے ...
ہے ہاں شاید (Compartment) کمپارٹمنٹ کہتے ہیں اسے، آپ کمپارٹمنٹ میں ...
صاحب آپ نے کمال کر دکھایا۔ جن حالات میں آپ نے امتحان دیا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔
باوجود اگر کمپارٹمنٹ میں آسکتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی عزت کرنی پڑے گی۔
ہنسنے لگا "آئیے چلیں۔"

ایلی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا اتنی دیر کے بعد شاہ کی سواری رکی تزک و احتشام
ایک مرتبہ پھر لاہور کے بازاروں میں چل پڑی۔ لوگ دو رویہ کھڑے ہو کر نعرے لگا رہے
لیکن ان نعروں میں کبھی کبھار چور چور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

دفعتاً بھیڑ میں سے ایک شخص آگے بڑھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"آپ کا کوئی جاننے والا معلوم ہوتا ہے۔" منصر نے سائیکل روکتے ہوئے کہا۔ "جب تک
میں سامنے والی دوکان سے سگرٹ خرید لوں۔"

وہ سائیکل سے اترا۔ اس کے روبرو ایم۔ کے کھڑا ہنس رہا تھا۔

"تم کب آئے؟" ایم کے نے پوچھا۔

"نتیجہ سننے آیا تھا"

"ارے نتیجہ تمہیں معلوم نہیں ہوا۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں آٹھ روز پہلے ہی پتہ چل گیا
ہو گا۔"

"وہ کیسے؟" ایلی نے پوچھا۔

"یار میرا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا تو منصر کا ٹیلی فون آیا تھا منصر
نے اسے تمہارا رول نمبر لکھوایا تھا کہ نتیجہ مرتب ہو جائے تو اسے اطلاع دے۔ بھائی جان نے
آج مجھے بتایا تھا کہ آٹھ روز ہوئے منصر کو اطلاع دے دی تھی۔"

"اچھا۔" ایلی نے حیرانی سے کہا۔

"منصر نے تمہیں اطلاع نہیں دی؟"

"نہیں تو۔"

"تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ" ایم۔ کے حیرانی سے چلایا۔

اتفاق سے

ایم کے سے رخصت ہو کر جب وہ پھر سائیکل پر سوار ہوا تو وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا
اس کی نگاہوں تلے منصر کھڑا کہہ رہا تھا۔

"اچھا تو آج آپ کا نتیجہ نکل رہا تھا"۔

"آپ تو شاید پاس ہیں یا شاید ——— دراصل مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک
جاننے والے کے پاس نتیجہ کی نقل تھی لیکن مجھے آپ کا نمبر ——— پاس ہی سمجھئے کیا کہتے ہیں
اسے ——— ہاں کمپارٹمنٹ میں ہیں آپ"

پھر اسے ان دنوں کا خیال آیا جب وہ مشن کالج میں امتحان دیا کرتا تھا۔ اور جب پرچہ دے
کر باہر آتا تو منصر آنکلتا۔ "اوہ آپ یہاں امتحان دے رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں آج
کل ادھر لنچ کے لیے جاتا ہوں۔"

"اتفاق سے کہیں آپ ان دنوں سفید منزل کی طرف تو نہیں گزرے؟"

منصر کی تمام باتیں بالتفصیل باری باری اس کے سامنے آرہی تھیں۔ اس نے حیرت سے
منصر کی طرف دیکھا تو یہ سب اتفاقات سمجھے بوجھے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر کے گرد
اپنے بازو حمائل کر دے ——— "آپ پریشان کیوں ہیں پرسوں میں آپ کے ہاں گیا تھا۔ دادی
اماں ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ میں تھا۔ اور اب میں پھر ایسی حرکت بھی نہ کروں گا یقین جانیئے کبھی
نہیں۔"

لیکن سائیکل تیزی سے چلا جا رہا تھا اور اس کے لیے اپنی جگہ قائم رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

سفید منزل پہنچ کر منصر نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا دیا۔ "الیاس صاحب آپ ذرا بیٹھئے۔
یہ کتاب ہی دیکھئے میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔

ایلی کے دل میں منصر کے لیے احترام اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ اسے آج تک
کسی ایسی شخصیت سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ جس کا اظہار اس قدر انوکھا اور رنگین ہو۔

منصر کا کمرہ بھی اس کی بے پروائی، رنگینی، ذہانت اور عظمت کا مظہر تھا۔ کمرے میں رنگوں
کی ہم آہنگی کس قدر دلنواز تھی۔ پلنگ کی چادر بھی اس کا ایک جزو محسوس ہو رہی تھی۔

قوال اور قریب آگئے۔ "ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔"

"اپنی ماں سے مانگو اپنی اماں سے مانگو۔" سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

پلنگ کے پاس ہی سلیپر پڑے تھے۔ کیسے گدگدے پاؤں ہیں اور اس کی وہ تصویر جو کارنس پر
پڑی تھی۔ ——— کس قدر جاذب نگاہ تھی۔

"الیاس صاحب" منصر نے داخل ہوتے ہوئے کہا "اماں کہتی ہیں کہ آپ یہیں کھانا کھائیں
گے اگرچہ یہ دعوت رسمی نہیں۔ رسم کے ہم قائل نہیں اور ہوتے بھی تو اس وقت کچھ بھی تیار
نہیں ہو سکتا۔ اور پھر چار ایک لقمے کھانے والے کے لیے کوئی تیاری بھی کیا کرے۔ اب آپ بلا
تکلف بتا دیجئے کہ آپ چاول کھائیں گے یا روٹی۔ میں تو ذاتی طور پر چاول کھانا پسند کرتا ہوں
لیکن دونوں چیزیں تیار ہیں۔ اس لئے تکلف بر طرف۔"

"جی میں تو روٹی کھاتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔" پھر اس نے اوپر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ "بھئی الیاس صاحب روٹی
کھائیں گے اور میں تو آپ جانتے ہیں چاولوں کے ہوتے ہوئے اور کچھ نہیں کھاتا۔"

"تو کیا بھجوا دیں کھانا؟" اوپر سے اماں کی آواز آئی۔

"کیوں الیاس صاحب کیا خیال ہے؟"

"جب آپ کا جی چاہے۔" ایلی نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا "بھئی ہم تو جب مل جائے تب کھاتے ہیں جی کا کیا ہے وہ تو ہر وقت چاہتا ہی
رہتا ہے۔ اپنا تو اصول ہے جب ملے کھاؤ۔ بھجوا دیجئے اماں جان" منصر نے با آواز بلند کہا۔

"آپ تو شاید ہاتھ دھونا پسند کریں میں تو ویسے ہی اڑا جاتا ہوں۔" وہ ایلی سے کہنے لگا۔

کھانے میں پلاؤ کے علاوہ تین قسم کے سالن تھے۔

"ارے" منصر کھانا دیکھ کر چلایا "آج تو بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں ہم' آج تو
اتفاق سے پلاؤ ہے۔ پلاؤ کے ہوتے ہوئے آپ روٹی کھانا کیسے گوارا کریں گے۔ تعجب ہے
صاحب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ارادہ بدل لیتا" لیکن ایلی کے لیے اب اپنی بات بدلنا ممکن نہ
تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

"اتفاق سے آج پلاؤ ہے ——" منصر کے منہ سے "اتفاق سے" سن کر ایلی کے ہونٹوں
پر مسکراہٹ آ گئی۔

منصر نے کبھی سہواً بھی ایسی بات نہ کی تھی جس سے ذاتی خاندانی یا گھرانے کی عظمت یا
امارت ظاہر ہو۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے دوسرا کمتر محسوس کرے۔ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ

[illegible] ہیئت اور حیثیت کا شخص ظاہر کرتا تھا۔

نمک بھری روٹی

ایلی نے پہلا ہی نوالا منہ میں ڈالا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ روٹی میں کوٹ کوٹ کر نمک
بھرا ہوا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" منصر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" ایلی نے کہا "ذرا گرم ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے۔"

ایلی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ سادی کی شرارت ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ منصر کو اس کا
علم ہو۔ لیکن اس قدر نمک کھانا کچھ آسان نہ تھا۔ بہرحال وہ یوں روٹی کھاتا رہا جیسے کوئی بات ہی
نہ ہو۔

"ارے صاحب یہ کیا کھانے کا طریقہ ہے۔" منصر نے کہا "آپ تو یوں کھا رہے ہیں جیسے
[illegible] ٹک چکھ رہے ہوں۔ شاید تہذیب کے خیال سے ایسا کر رہے ہوں بہر صورت کھانے کے
معاملے میں ہم لوگ پیٹ بھر کر بد تہذیب ہیں۔ جب تک تمیز اور تہذیب کو بالائے طاق نہ رکھ
دیں۔ ہم سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ اور صاحب پلاؤ دیکھ کر تہذیب کسے یاد رہے گی۔ مرزا غالب
نے آم کے متعلق کہا ہے نا کہ آم اعلیٰ ہوں اور بہت ہوں اگر میں شاعر ہوتا تو یہی بات پلاؤ کے
متعلق کہتا ——"

کچھ دیر تک منصر پلاؤ کھانے میں منہمک رہا لیکن اس دوران میں اس نے چار ایک بار
ایلی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ "الیاس صاحب ذرا یہ ساتھ والے کمرے سے
[illegible] کی بوتل تو لا دیجئے مجھے۔ معاف کرنا بھائی کھاتے وقت ہم سے تو اٹھا نہیں جاتا۔"

"کہاں ہے؟" ایلی جھٹ اٹھ بیٹھا۔

"اس ملحقہ کمرے میں جائیے نا تو آپ کو بتاؤں۔"

ایلی ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منصر نے چلا کر کہا "پہلے تو بتی جلایئے نا دائیں ہاتھ دروازے کے پیچھے سوئچ ہے ——ل

"جی" ایلی نے بتی جلاتے ہوئے کہا۔

"کارنس پر دیکھئے۔" منصر بولا۔

"یہاں تو نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو دونوں الماریاں دیکھئے۔"

"چلئے نہیں ملتی تو چھوڑیے۔" منصر نے چلا کر کہا۔

جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا۔ "اہو ہو ہو ــــــ" بے تحاشا مسکرائے جا رہا تھا۔

"یہ دیکھ لیجئے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ۔" اس نے گلاس کی طرف اشارہ ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا۔ "تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔ ٹھہریئے میں اور منگواتا ــــــ "اماں" اس نے اوپر آواز دی۔ "دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجئے میرے لیے۔ میں ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے۔ ذرا جلدی کیجئے منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی ــــــ "اتفاق سے ــــــ"

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس کی آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور پلیٹ میں بوند تک نہ گری تھی۔ "اتفاق سے ــــــ" کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر ہنس رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ایلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی کا سا نوالہ اگلا پڑا ہے۔ "اتفاق سے ــــــ اتفاق سے ــــــ" کمرے میں لگی ہوئی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا "کب جا رہے ہیں آپ؟"

"کل" ایلی نے جواب دیا۔

"جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ" وہ مسکرانے لگا۔

"جی ہاں۔"

"ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پور گیا ہوں۔ اتفاقاً" وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلئے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا چلوں" اس کے ہونٹوں پر ایک نہایت دلفریب مسکراہٹ تھی۔ "اب مزید اتفاق سنئیے جہاں میں ٹھہرا

ہے عین مقابل میں آپ کے محلے کی ڈیوڑھی تھی۔"

ہمارے صاحب" وہ کچھ وقفے کے بعد بولا "آپ تو اچھے خاصے تواریخی لوگ ہیں۔ میرا ہے آپ کے آصفی تو آج تک ماضی سے متعلق ہیں۔ اونچے اونچے محل جو بدرنگ ہو ... چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ــــــ وہی نقشہ ہے جو ہمارے ہاں بھی یہاں وہاں جھلکتا ...

"اچھا تو آپ علی پور گئے تھے۔" ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"صرف چند گھنٹوں کے لیے۔" منصر بولا "دراصل بات یہ ہے کہ ہم ایک اوسط خاندان کے لوگ ہیں۔ صرف کھاتے پیتے۔ امارت تو قصہ پارینہ ہو چکی۔ جیسے کہ آپ کے ہاں بھی ظاہر ... نہ ہم خاندانی عظمت کے قائل نہیں بس صرف یہی ایک خیال ہے کہ کوئی ایسے خاندان سے تعلق نہ ہو۔ جیسے مثلاً میراثی ــــــ" وہ ہنسنے لگا۔

"اب آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ اماں مطمئن ہیں ہماری طرف سے کوئی خاص ... یا مطالبہ نہ ہو گا بشرطیکہ ہم والد صاحب کو متفق کر سکیں اور یہ ایک کٹھن کام ہے ... جب والد صاحب رضا مند ہو گئے تو آپ کو اطلاع کر دی جائے گی اس صورت میں آپ ... والد صاحب رسمی طور پر پیغام پیش کر دیں جیسے کہ دستور ہے چونکہ اس میں میری تو چنداں ... نہیں یہ کام والدہ اور والد سے متعلق ہے ہے اس لیے خصوصاً" یہ ایک رسمی آداب برتنا ... ہو گا۔"

"جی" ایلی نے خوشی کی ایک رو دوڑتی ہوئی محسوس کی۔

"کل شاید اماں آپ سے ملنا پسند فرمائیں۔" منصر نے کہا۔ وہ رک گیا پھر خدا حافظ کہتے ہوئے بولا۔

"اب تو آپ کو مطمئن ہونا چاہیے اور ہاں دیکھئے اگر آپ سے ایسی ویسی بات سرزد ہو گئی ... نقصان کا موجب ہو سکتی ہے۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے۔"

ڈریا کوا

اگلے روز جب ایلی سفید منزل میں پہنچا تو اماں اس کا انتظار کر رہی تھی وہ جان بوجھ کر ایسے ... پہنچا تھا جب منصر دفتر گیا ہوا تھا۔

اماں اسے بڑی محبت اور شفقت سے ملی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ کمال محبت سے کہتی۔ "تم نہیں جانتے بیٹا مجھے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے لاکھ لاڈلی بھی ہے اور تم بھی مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنی کہ وہ ہے لیکن ——" وہ رک گئی۔

"تمہیں کیا معلوم کہ بیٹیوں کی بات کیا ہوتی ہے اگر میری بیٹی کو تکلیف ہوئی تو میں تو جی مرجاؤں گی۔ ہئے میرا دل ڈوب جاتا ہے اس خیال پر اس روز جب امان آگیا تھا تو بچے روز میرا دل بیٹھا رہا۔ دل سے ہول نہ جاتا تھا۔ اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔"

عین اس وقت دروازے سے آواز آئی۔ "اماں تو ویسے ہی غم کھاتی ہیں۔ جو کچھ بھی بیتے اماں ہم دونوں پر بیتے گا۔" سادی سامنے آکر ہنسنے لگی "کیوں الیاس صاحب" اماں اسے دیکھ گھبرا گئی۔ "نہ بیٹی تو نہ آ۔ ویسے پردہ وردہ کی تو میں قائل نہیں لیکن سب بھائی برا مانتے ہیں کیا فائدہ۔" وہ اٹھ کر سادی کی طرف بھاگی۔

"اچھا تو الیاس صاحب کل رات بڑی چالاکی سے روٹی پر پانی کا گلاس انڈیل دیا۔ بڑے چالاک ہیں آپ۔" سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی "اماں کل باجی نے الیاس صاحب کے لیے روٹی پکائی تھی نا اس میں دبا کر نمک ٹھونس دیا تھا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تم ایلی کو دق کرتی ہو۔" اماں ہنسی۔

"کیوں نہ کریں۔" سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ "یہ تو صرف آپ کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔"

اوپر مگ سے باجی چلائی۔ "اماں میں نے نہیں ڈالا تھا روٹی میں نمک سادی نے خود ڈالا تھا۔"

سادی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ "میں نے سوچا کہ الیاس صاحب کھائیں گے تو کچھ بھی نہیں شرم کے مارے اگر میں نمک ڈال دوں تو کیا حرج ہے۔ شرماتے بہت ہیں۔ دیکھ لیجئے ان کو بھی۔" وہ ہنسے گئی۔

"اے ہے کیوں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی ہو تم۔" اماں بولی۔

"بہت درد ہے آپ کو الیاس صاحب کا" سادی نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" اماں بولی۔

"لیکن اماں یہ ان کی شرم جو ہے خالص ہاتھی دانت ہے یہ کیوں صاحب۔" وہ الیاس سے

مخاطب ہو کر بولی۔

"کبھی تو سچ بھی بول دکھائیے۔ آپ کو موقعہ دے رہے ہیں ہم۔"

"یعنی مجھے راست گوئی پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔" ایلی دبی زبان سے بولا۔

"نہیں نہیں نہیں۔" سادی چیخنے لگی۔ "معافی معافی" اور وہ قہقہے مارتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

سادی کے جانے کے بعد اماں پھر بیٹھ گئی اور ایلی سے باتیں کرنے لگی۔

جب وہ منصر کے علی پور جانے کے متعلق بات کر رہی تھی تو سادی پھر درمیان میں آ گئی "اور معلوم ہے اماں علی پور میں الیاس صاحب کبوتروں کے ڈربوں میں رہتے ہیں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ بھائی کہتے تھے ویسے تو وہ مکانات محلوں کی طرح ہیں لیکن پرانی وضع کے مکانات آج کل ڈربے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اماں" وہ بولی "مجھے ڈربوں میں رہنے والے کبوتر بہت پسند ہیں۔ بشرطیکہ اصیل ہوں اور اصیل تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں نا ماں" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

"فضول باتیں نہ کیا کر۔" اماں ہنسی۔

"تو الیاس صاحب علمی باتوں کو اماں فضول سمجھ رہی ہیں۔" وہ الیاس سے مخاطب ہوئی۔

"میں کوئی الیاس صاحب پر تو فقرہ نہیں کس رہی۔ یہ تو کبوتر نہیں۔"

"تو خاموش بھی ہو گی یا نہیں۔" اماں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"جیسے بھی آپ فرمائیں —— ویسے الیاس صاحب کی خصلت تو کوے کی سی ہے چھین کر کھاتے ہیں ویسے نہیں۔ کیوں الیاس صاحب۔" سادی ہنسی۔

"کیا ہیں الیاس صاحب۔" باجی داخل ہو کر پوچھنے لگی۔

"اب کیا تو بھی آ گئی۔" اماں نے باجی سے کہا۔

"میرے آنے میں تو کوئی حرج نہیں۔" باجی نے کہا۔ "البتہ سادی کو نہیں آنا چاہیے کیوں الیاس صاحب۔"

"کیوں مجھے کیوں نہیں آنا چاہیے۔" سادی نے پوچھا۔

"اماں جان سے پوچھ لو۔" باجی بولی۔

"دراصل اس سارے فساد کی وجہ تسمیہ الیاس صاحب ہیں اور دیکھو تو یوں خاموش بیٹھے ہیں جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔" سادی نے کہا۔

"کوے بولا نہیں کرتے۔" ایلی نے دبی زبان سے کہا "یہ مینا کا کام ہے۔"

"جواب دو باجی تم سے کہہ رہی ہیں۔" سادی ہنسنے لگی "اگرچہ مثال غلط دی ہے انہوں نے مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کہوں میری پیاری باجی تو جل پری ہے۔ ہائے اتنی پیاری ہے میری باجی کہ میرا دم نکلتا ہے البتہ کبھی کبھار ٹرنک پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے اور سب ملیامیٹ کر دیتی ہے۔" یہ کہہ کر سادی قہقہے لگاتی ہوئی اوپر کی طرف بھاگی۔

سادی کے جانے کے بعد اماں کو خدا حافظ کہہ کر ایلی چلا آیا۔

دل کی بات

جب ایلی علی پور پہنچا تو ہاجرہ اور فرحت کابل سے واپس آ چکی تھیں۔ ان کی آمد کی وجہ سے گھر میں شور شرابا تھا۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فرحت اور ہاجرہ دونوں افغانستان کے متعلق یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے ولایت سے ہو کر آئی ہوں ہر بات پر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لی جاتیں۔ سینے تھام لیے جاتے "ہیئے میں مر گئی ایسا۔"

"ہاں بہن اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

ان کے واپس آنے کے بعد ایلی کا شہزاد کی طرف رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا اس بات پر بیگم بے حد مسرور تھی۔ لیکن شہزاد کو اس کی مطلق پروا نہ تھی اس کے لیے گویا کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ الٹا وہ دن میں چار ایک مرتبہ اسی طرح دادرے کی چال پر ناچتی ہوئی آتی۔ "کیوں گھر والو کیا ہو رہا ہے وہ بدھو میاں کہاں ہے صبح سے آیا کیوں نہیں ہے"

اب تو فرحت بھی طعنے دے دے کر اکتا چکی تھی۔ البتہ محلے والیاں ہاجرہ اور فرحت کے سامنے شہزاد کے متعلق اشاروں میں باتیں کرتی رہیں۔

چار ایک دن کے بعد ہاجرہ اور فرحت ایلی کے گرد آ کھڑی ہوئیں۔

ہاجرہ بولی "ایلی ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے۔"

"کیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"جانو کہہ رہی تھی کچھ لوگ یہاں تمہارے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔"

ایلی کی زبان سے سادی کے خاندان کی بات سن کر فرحت اور ہاجرہ کے خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ "کیا یہ سچ ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہاں بات طے ہو جائے ——" کیا واقعی انہیں

[illegible] آتا تھا کہ ایلی شہزاد کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

ہاجرہ اور فرحت دونوں شہزاد کو غلط سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہزاد نے جان بوجھ کر ایلی کو گرکھا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ کا پنچھی بنا رہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایلی کو اپنا بنانے میں اس کا کوئی خاص مقصد ہے اگرچہ انہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ خصوصی مقصد کیا ہو سکتا

[illegible] ایلی کی بات ہی نہیں شہزاد کے متعلق محلے میں عام خیال تھا کہ اسے نوجوانوں کی نگاہوں پر [illegible] کا شوق ہے ان کا خیال تھا کہ شہزاد کو دیکھ کر محلے کے مرد اپنے ہوش و حواس کھو دیتے ہیں ان کے حواس کھونے کی تمام تر ذمہ داری شہزاد پر ہے۔

فرحت نے سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ شہزاد سے کیا۔ غالباً" اس کا مقصد یا تو شہزاد کو پہنچانا تھا اور یا یہ جتانا کہ ایلی اب اس کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے۔

"میں نے کہا شہزاد۔" وہ بولی "سنا ہے یہاں لوگ ایلی کے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔"

"ہاں" شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "جانو نے بتایا تھا مجھے"۔

"کیا یہ سچ ہے؟" وہ شہزاد کے قریب تر ہو کر بولی۔

"پوچھو ایلی سے مجھے کیا خبر۔" شہزاد نے کہا۔

"میرا مطلب ہے۔" فرحت نے کہا "ایلی دل کی بات کب بتاتا ہے۔"

"وہ ہنسی۔ "مجھے دل کی بات بتائے گا کیا؟"

"بالکل" فرحت بولی۔

"تجھ سے اتنا ہی لگاؤ ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہم تو یہی سمجھتے ہیں۔" فرحت نے کہا۔

"تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" شہزاد ہنسی۔

"کیوں؟"

"پھر یہ خبر غلط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا بس نہیں ہو سکتا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

فرحت کا رنگ فق ہو گیا۔

"دو ہی صورتیں ہیں۔" شہزاد ہنستے ہوئے بولی۔ "اگر ایلی کو مجھ سے لگاؤ ہے تو مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر وہ کیوں بتانے لگا۔"

"کیوں ایلی۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی جو ملحقہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا "یہ ہما
نے" فرحت نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "خدا کے لیے اسے نہ بتانا۔"

"بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں۔" وہ ہنسی ——— "کیوں ایلی"؟ وہ بولی "وہ لاہور والی جو یہ
کیسی ہے وہ؟"

"کیا مطلب؟" ایلی نے پوچھا۔

"جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟"

"بہت خوب صورت ہے۔" ایلی نے کہا۔

"مجھ سے بھی زیادہ۔" وہ فرحت کی طرف دیکھ کر بامعنی انداز سے بولی۔

"کوئی مقابلہ ہی نہیں۔" ایلی بولا۔

"یہی تمہارا مطلب ہے مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔" شہزاد نے شرارت سے کہا۔

"تم تو ہندو ہو۔" ایلی بولا۔ "تمہارے ماتھے پر بندی ہے۔"

"اور وہ مسلمان ہے۔"

"ہاں ہاں۔"

"مسلمان تو خوب صورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت۔" شہزاد نے کہا

"توبہ" فرحت بولی۔ "تو تو بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ایلی وہ لوگ ہیں
کون؟"

"بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"خاندان کیسا ہے"۔ فرحت نے پوچھا۔

"خاندان کا تو پتہ نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن سنا ہے اس کے ابا کسی ریاست میں وزیر
ہیں۔"

"ارے" شہزاد نے منہ بنایا۔ "وزیر۔"

"بھائی دو ہیں ایک بیرسٹر ہیں اور دوسرے بڑے عہدے پر ہیں۔"

"ارے" شہزاد نے پھر منہ بنایا۔

"تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ۔" فرحت بولی۔

"خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ گچھ کیوں ہوتی۔" شہزاد نے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" فرحت بولی۔

"بابا نے منت کی ہوگی اس کا پھل ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "کیوں ایلی۔"

"بابا نے منت کو کون خاطر میں لاتا ہے۔" اس نے معنی خیز نگاہ سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

"میری منت کو کون خاطر میں لاتا ہے۔"

"بابا مائل بہ کرم ہونا چاہے تو پھر کیا دیر لگتی ہے۔" ایلی ہنسنے لگا۔

"شہزاد نے آہ بھر "ہم مائل بہ کرم ہوں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔"

"لڑکی تو بہت پڑھی لکھی ہوگی۔" فرحت نے فوراً بات کا رخ بدلا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن فارسی دان ہے۔" ایلی نے کہا۔

"پھر تو وہی معاملہ ہو گا۔" شہزاد ہنسی۔ "آب آب کر مر گئے بچہ فارسیاں گھر گالے۔"

"کچھ بھی ہو۔" شہزاد بولی۔ "فارسی دانوں سے تمہارا گزارا مشکل ہی ہو گا۔"

"تم اپنی بات کرو۔" فرحت پھر طنز پر آ گئی۔

"میرا کیا ہے میں تو پانی ہوں چاہے آبخورے میں ڈال لو چاہے گلاس میں۔"

"جبھی سبیل لگی ہوئی ہے۔" فرحت چلائی۔

"پیاسا ہی نہیں ملتا سبیل لگی بھی ہو تو کیا۔" شہزاد ہنسی۔

"لیکن ان لوگوں سے واقفیت کیسے ہوئی" فرحت نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"بس ہو گئی۔" شہزاد نے کہا "اب کیا وہ تمہیں بتا دے گا۔"

"تو تم پوچھو نا" فرحت نے کہا۔

"نہ میں نہیں پوچھتی۔"

"کیوں؟"

"جو میں نے پوچھا تو اسے بتانا پڑے گا" شہزاد ہنسی۔

"بڑا زعم ہے۔" فرحت نے کہا۔

"ہے" شہزاد بولی۔ "کیوں ایلی درست ہے نا۔"

"ہاں ہاں" ایلی ہنسا۔ اور پھر فرحت سے کہنے لگا "فرحت تو شہزاد سے بات میں پوری نہیں
نکلتی۔"

"کسی بات میں نہیں اترتی۔" فرحت نے جل کر کہا۔

"کسی میں بھی نہیں یہ تو بات کی دھنی ہے۔" ایلی بولا۔

"غلط" شہزاد بولی۔ "جہاں بات کرنا چاہوں وہاں ہو نہیں پاتی۔ میں تو نہ بات کی ہو
کی بے مصرف باتوں میں البتہ ہوں۔"

کمپارٹمنٹ کے ضمنی امتحان میں ایلی کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار منصر نے تار کے ذر
اسے نتیجے سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے لاہور جانے کا اسے موقعہ نہ ملا۔

اس دوران میں ہاجرہ اور فرحت ایک بار لاہور جا کر سادی کی والدہ سے مل چکی تھیں
ہاجرہ ان لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ "ہائے وہ تو بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔"
نے ایلی سے کہا تھا۔ "امیر کبیر ہوتے ہوئے اتنے سادہ اور ملنسار ہیں وہ۔ مجھے تو یوں دکھا
ہے کہ بات بن جائے گی بس لڑکی کے ابا سے بات کرنی باقی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی منظو
لینے کے بعد وہ ہمیں بتائیں گے ہے اگر ایلی کے ابا نے بات نہ مانی تو کیا ہو گا۔"

ہاجرہ نے لاہور جا کر سادی کی والدہ کے سامنے اپنے تمام حالات صاف صاف بیان کر د
تھے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "بہن ہم تو غریب لوگ ہیں یہ تو آپ کی مہ
ہے جو ہم پر نظر عنایت کی ہے۔ ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے نہ اپنا گھر ہے نہ در ہے ساری زند
سوکنوں کی خدمت میں گزاری بس صرف لے دے کر ایک ایلی ہے وہی میری امارت ہے ای
ساری امیدیں ہیں لیکن بہن آج کل کی اولاد کب امیدوں پر اترتی ہے اپنے اپنے نصیب ہ
نصیب کا کسی سے کیا گلہ باقی رہے ہم تو ہمارا فکر نہ کیجیے ہم تو جیسے ایلی کے خادم ہیں ویسے
سادی کے سمجھ لیجیے۔"

"ہمارے سر آنکھوں پر رہے گی لیکن ہم اس قابل نہیں کہ چاؤ چونچلے کر سکیں ہم تو تن
خدمت گزاری کر سکتے ہیں۔"

جب وہ دونوں لاہور سے واپس آئی تھیں تو شہزاد اور بیگم ان کے گلے کے ہار بن گئی تھ
ان دونوں کے سوالات ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ "لڑکی کیسی ہے کتنے بہن بھائی ہیں ا
کے ابا کیا کرتے ہیں۔" شہزاد کے انداز سے دلچسپی ٹپکتی تھی لیکن ایلی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ا
تفصیلات کو جاننے پر اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ——— کہ سادی کے متعلق بیگم کا رویہ ایسا کیوں تھا اسے ت
خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایلی اس کی بیٹی کے گھر سے ٹل جائے گا اور بیگم کے خیال کے مطابق اگر
وہ شہزاد کے گھر کی تباہی کا باعث تھا تو اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ لیکن

ع ہوا ز ے معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے اس بات پر غصہ آرہا ہو کہ شہزاد سے عہد و پیمان
ے بعد اب وہ یوں اپنا دامن چھڑا رہا ہے۔ اس کی اتنی جرات!

گلے روز ہی انہیں ایک خط موصول ہوا یہ خط منصر کی والدہ کی طرف سے تھا۔ جس میں
طور پر انہیں منصر کے بڑے بھائی رانا کی شادی پر بلایا تھا۔

ب وہ رانا کی شادی پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہزاد کہنے لگی۔ "اے ہے مجھے بھی
لے چلو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ لڑکی کو دیکھوں۔"

"ہاجرہ بولی۔ "یہ تو اور بھی اچھا ہے کم از کم ان سے بات تو کروگی۔"

"مجھے تو بھئی اس قسم کی بات کرنا نہیں آتی مشکل میں پڑ جاتی ہوں۔"

"اماں تو کہیں جاتی ہے تو وہاں دلہن بن کر بیٹھ رہتی ہے۔" ایلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہر
میں جی ہاں اور جہاں بیٹھ جائے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے اسے۔"

اس روز پہلا موقعہ تھا جب شہزاد نے اپنی طبعی بے نیازی چھوڑ کر اس قسم کی درخواست کی
ایلی اس کی بات سن کر حیران ہوا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سادی کو ملنے کے لیے کس
مشتاق تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر رابعہ بھی نہ رہ سکی۔ وہ بھی ساتھ تیار ہو گئی۔

جب وہ جانے لگے تو بیگم ان کے ساتھ چل پڑی۔

"اماں تم کیا ساتھ چلو گی۔" شہزاد نے پوچھا۔

"میں کیوں نہ چلوں۔" بیگم بولی۔

"پیچھے گھر میں کون رہے گا۔" شہزاد نے پوچھا۔

"میں کیا گھر کی ذمہ دار ہوں جس کا گھر وہی جانے۔"

"لیکن اماں تیرا وہاں کیا کام۔" شہزاد نے پوچھا۔

"مجھے دو ایک کام ہیں لاہور میں۔ سانوری کب سے بلا رہی ہے اسے بھی تو ملنا ہے۔"

اور جب وہ تانگے میں سوار ہوئے تو ایلی نے بیگم کی شکل دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ بڑے غصے
میں تھی۔ لیکن اس وقت ایلی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

رانا میں اگرچہ منصر کی سی خصوصیات نہ تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہی اسے مل کر ایلی نے
محسوس کیا کہ وہ ایک ملنسار اور بے تکلف شخص ہے۔

"اچھا تو آپ ہیں ایلی۔" وہ اسے دیکھ کر بولا۔ "ایلی سے میں سمجھا تھا کہ کوئی تیلی قسم کی چیز

ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اور جناب کو معلوم ہونا چاہیے
میں دولہا میاں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔
وہ ایک بھرپور جسم کا آدمی تھا۔ پُر رعب چھریرا کسرتی جسم لیکن اس کے چہرے پر لاابالی
تھی جو منصر کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھمسان کا رن پڑا ہو۔ ہر
مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ اور اس کے علاوہ بھانت
بھانت کے لوگ آجا رہے تھے وہ شاید غالباً" اس کے رشتے دار تھے۔ ایلی حیران تھا کہ کیوں اتنے
رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ ایلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مکان کرائے کا نہیں بلکہ ان کا اپنا
لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہنے والے تھے اگر وہ لاہور کے رہنے والے
تھے تو پھر گھر میں سبھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا لہجہ اہل زبان کا سا تھا اور بڑا
نہایت مہذب اور شستہ تھی۔

ان حالات میں ظاہر تھا کہ سادی کو دیکھنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایلی کی خواہش تھی
کہ سادی سے ملے اسے یاد دلائے کہ دوپٹہ چھیننے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت فاتح کی
ہے اور جو حکم وہ دے گا سادی کو اسے ماننا پڑے گا۔ سادی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو گے لے لو
کئی ایک دن وہ سوچتا رہا کہ کیا مانگوں دوپٹہ تو لے چکا اب قمیص لینے کا فائدہ؟ ایلی نے کئی بار
سادی کا دوپٹہ سونگھا تھا لیکن اس میں سادی کے جسم کی بو نہ تھی۔ اس میں سینٹ کی بو تھی
تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار سادی سے ملا تھا لیکن اس نے کبھی سادی کے جسم کو بو محسوس نہ کی
تھی۔ شہزاد کے جسم کی بو کو محسوس کر کے نہ جانے ایلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں ابل آتی
تھیں۔

نہیں نہیں قمیص مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کئی ایک دن کے
بعد دفعتاً" اسے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ سادی سے کہوں گا کہ مجھے لے
اکیلی ملے۔ گھر سے باہر مقبرے یا شالیمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔

ہاجرہ فرحت رابعہ شہزاد اور بیگم کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا کاش
کہ وہ بھی اوپر جا سکتا۔ شاید اماں اسے بلائیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں وہ
کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اماں کو تو شاید اپنا ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف

تھیں۔ منصر کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ایلی کے پاس بیٹھے اب کی بار وہ بالکل ہی محروم رہا تھا۔
شخص تھا جو مصروف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کی طبعی خصوصی تھی۔ انتظامات
کا حصہ لے رہا تھا لیکن اس کے رویے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فارغ ہو۔
جیسے ازل سے ہی اسے کوئی کام نہ ہو۔ دراصل اس کی طبیعت میں گھبراہٹ اور
تھا لہٰذا وہ کام میں مصروف ہونے کے باوجود مطمئن اور فارغ دکھائی دیتا تھا۔
بھی ان کے ساتھ انتظامات میں مصروف تھا۔ اب کی بار اماں نے ایلی کو دیکھ کر وہ پرانا
نہیں کیا تھا بلکہ جیسے اس نے ایلی کو برداشت کر لیا ہو جیسے اس کے وجود کو تسلیم
کے بعد اب اسے ایلی سے کوئی شکایت نہ ہو۔
منتظموں میں وہ معلوم نہیں رومی ٹوپی کو دیکھ کر ایلی ٹھٹھکا "ارے" وہ چلایا "ان
کو تو میں نے کہیں دیکھا ہے۔" وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اسے یاد آیا۔ آخاہ یہی صاحب تو
روز پھل کا ٹوکرا لائے تھے۔ اب بھی رومی ٹوپی کا وہی پر اسرار انداز تھا جیسے کہیں سے پھل کا
لائے ہوں اور انہیں وہ ٹوکرا نہ جانے کسے دینا ہو۔
منصر کے باقی بھائیوں میں صرف انور ایلی کے لیے باعث دلچسپی تھا۔ اس کی آنکھوں سے
وقت شرارت ذہانت اور تبسم کی پھوار سی پڑتی تھی اب تو ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ انور ہی
دوپٹہ لے کر سفید منزل کے چوبارے سے جمال کو اشارے کیے تھے اور اس طرح ناؤ
اور سفید منزل کے باہمی رابطے کا راز فاش ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں سفید منزل کے اوپر
میں اینٹوں کے جنگلے بند کر دیئے گئے تھے۔ انور جب بھی ایلی کے قریب آتا تو اس کے
پر عجب سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔

رابعہ شکریہ

شادی سے ایک دن پہلے رانا ایلی کے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا "الیاس صاحب کل برات میں کیا
پہنا بلا بنیں گے۔"
"شہر بلا" ایلی نے رانا کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا۔
"شہر بلا کا مطلب" بیسٹ مین "ہے" وہ بولا۔
"آپ کا مطلب ہے۔" ایلی ہنسنے لگا۔ "کہ سہرے لگا کر میرا کارٹون بنایا جائے۔"

"نہیں تو" رانا نے کہا "ہمارے ہاں نہ سہرے ہوتے ہیں اور نہ گھوڑے پر سوار ہوتے"

"تو پھر" ایلی نے پوچھا۔

"برات سفید منزل سے چلے گی اور موتی محلہ پر جا کر رکی جائے گی جہاں ہماری ہونے والی بیگم رہتی ہیں۔ برات کے آگے بینڈ باجا ہو گا۔ بینڈ کے پیچھے دولہا اور شہہ بالا ہوں گے ان کے پیچھے براتی نہ کوئی ہار ہو گا نہ سہرا۔ اور سبھی لوگ پیدل ہوں گے۔"

"اچھا——" الیاس سوچنے لگا۔

"یہ تو آپ کی مرضی پر موقوف ہے کہ شہہ بالا بنیں یا نہ بنیں۔ میں نے تو بھئی تمہارے بھلے کی کہی ہے اگر تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی۔"

"میرے بھلے کی؟" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک سنہرا موقعہ ہے اگر فائدہ اٹھانا چاہو تو——" رانا نے شرارت بھری مسکراہٹ سے جملہ مکمل کر دیا۔

"میں نہیں سمجھا۔" ایلی نے کہا۔

"ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔" وہ کہنے لگا۔ راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھڑکی کبھی کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آئے گی اور دولہا اور شہہ بالا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دولہا اور شہہ بالا پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں، تو کیا کیا پوز بنتے ہیں کیا کیا۔" وہ ہنسنے لگا "اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہہ بالا بن کر ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدمنیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے سامنے ایستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ ارے صاحب اف" رانا نے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لی کہ ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑ گئی۔

"اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔

پڑھ سکو گے؟ اور اگر ذوق نہیں تو علمی دلچسپی ہی سہی۔ پنڈت کوکا کی کتاب کی تفسیر لکھ سکیں گے

یہ کہہ کر رانا یوں کسی کام میں مصروف ہو گیا جیسے ایلی کے فیصلے سے اسے خاص دلچسپی نہ ہو۔

وہ اپنی ایک مصروفیت سے ایک ساعت کے لیے فارغ ہوتا اور آ کر ایلی سے سرسری طور پوچھتا۔

"کہیں الیاس صاحب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر۔ ادھر ادھر چلا جاتا اور ادھر سے فارغ ہو کر ادھر آتے ہوئے ایلی کو کہنی مار کر پوچھتا۔ "کیا فیصلہ کیا؟"

نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز برات کے جلوس میں ایلی رانا کے ساتھ ساتھ شہہ بالا کی حیثیت سے چل رہا تھا۔ اور قدم قدم پر رانا اسے دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ادھر بھئی ادھر دائیں ہاتھ۔ واہ کیا چیز تھی۔ سبحان اللہ۔ تم نے موقعہ کھو دیا۔ ہئے ہئے حد تھی حد تھی۔ ذرا چوکس رہو بھائی——"

"بھئی واہ ادھر تو چاند چڑھا ہوا ہے——وہی بات ہے وقت تنگ است و کارہائے بسیار——اوہو۔ تم تو بھئی اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہو۔"

الیاس کے روبرو کھڑکیاں کھل رہی تھیں چقیں سرک رہی تھیں انگلیاں بڑھ رہی تھیں حیا نشیلی آنکھیں طلوع ہو رہی تھیں۔ تبسم لہرا رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سادی چل رہی تھی وہ مسکرائے جا رہی تھی ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ دیکھ سکتے ہیں تو دیکھ لیجیے۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے دیکھنے کی قوت سلب ہو چکی ہو۔ دیکھنے کے باوجود اسے دکھتا نہیں تھا۔ چاروں طرف سادی ہی سادی نظر آ رہی تھی۔ سارے لاہور پر مسلط تھی۔

جب وہ موتی محلے کی گلی میں پہنچے تو سفید بازوؤں لہراتی انگلیوں متبسم چہروں اور شوخ نگاہوں کا گویا ایک طوفان اٹھ آیا۔

بینڈ رک گیا۔ جلوس تھم گیا۔ رانا کی نگاہیں پھلجھڑیاں چلا رہی تھیں۔ ایلی میں نہ جانے کیسی گھبراہٹ سی پیدا ہوئی جا رہی تھی۔

سامنے کی ایک کھڑکی میں سادی کی جھلک دکھائی دی وہ مسکرا رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ پھیکی اور بے جان تھی جیسے کوئی کھوئی ہوئی ہو سادی تو ایسی نہ تھی۔ ایلی نے کوشش

کی کہ وہ جلوس سے نکل کر سامنے کمرے میں جا بیٹھے لیکن رانا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"واہ" وہ بولا "یہی تو نقطہ عروج ہے اور نقطہ عروج کو چھوڑ کر جانا ——— واہ صاحب

نے مضبوطی سے اسے پکڑے رکھا اور آنکھوں سے اوپر کی کھڑکیوں کی طرف آتش بازی

رہا۔

"یہاں تو قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ طوفان ہیں فتنے ہیں۔ رانا مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر بینڈ نے سلامی کی آخری سُر یں فضا میں پھیلا کر باجے ہونٹوں سے الگ کر دیئے

سحر ٹوٹ گیا۔ اس پر سب کمروں کیطرف بڑھے اور رانا اور ایلی کا ساتھ چھوٹ گیا۔

جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو رانا نے ایک لڑکے کو بھیج کر الیاس کو بلا بھیجا۔ الیاس نے

کہ شاید رسم کے مطابق اسے دولہا کے پاس بیٹھنا چاہیے اس لیے وہ بادل نخواستہ وہاں چلا

اگرچہ مزید نگاہوں پر چڑھنے سے وہ گھبرا رہا تھا۔

"الیاس صاحب" رانا اس کی طرف جھک کر بولا۔ "شکریہ شکریہ الیاس صاحب"

"کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"آج بھئی تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"احسان کیا شہ بالا بننے کی بات کر رہے ہیں آپ" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"لیکن اس میں احسان کی کیا بات تھی۔؟"

"تھی" رانا مسکرایا۔

"آپ تو کہتے تھے الٹا اس میں میرا فائدہ ہے۔"

"اور کیا کہتے بھائی۔" رانا نے شرارت بھری نظر ایلی پر ڈالی۔

"میں نہیں سمجھتا۔" ایلی بوکھلا گیا۔

"بات یہ ہے بھئی کہ تم شہ بالا نہ بنتے تو ظاہر ہے کہ میرے کسی بھائی کو بنا دیا جاتا اور

میرے بھائی تم جانتے ہو سبھی خوب صورت ہیں کم از کم مجھ سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ لو

جب ان میں سے کوئی برات میں میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اور دیکھنے والے اسے دیکھتے تو ظاہر ہے

کہ اپنی حیثیت تو ختم ہو جاتی۔ لوگ کہتے "اسے ہے دولہا تو بس اللہ کا فضل ہی سمجھ لو۔"

"لیکن تم ساتھ تھے تو اپنی وہ حیثیت پیدا ہوئی جو شاید کبھی نہ ہو سکتی کبھی نہ ہوتی۔

نذے ساتھ ہونے نے مجھے خوب صورت بنا دیا۔ آج وہ دھوم مچی ہے اپنی کہ حد ہے اور یہ

نماری وجہ سے ہوا۔" رانا ہنسنے لگا۔

کیل کلوٹا ——— "سادی سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔

ظور میں سانوری سے کہتی تھی ہے تجھے ایلی میں کیا دکھائی دیا جو تو اس پر ریجھ گئی۔"

لزلو آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو یہ ہے وہ لڑکا جس کا تم نے انتخاب کیا ہے۔" موتی محلے کی کھڑکیوں سے آوازیں آ رہی

تھیں۔ "یہ؟" کوئی ہونٹ نکال رہی تھی۔ "ارے" کسی کی نگاہ میں تحقیر جھلک رہی تھی۔ "توبہ

ہے توبہ ہے۔" ڈھولک سر پیٹ رہی تھی۔

ناک موڑ

علی پور واپس جانے کے لیے جب وہ سٹیشن پر پہنچے تو ایلی نے دیکھا کہ بیگم کے چہرے پر

طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ بیگم نے تحقیر بھری نگاہ ایلی پر ڈالی اور پھر ہنس کر بولی "تم بھی

یاد کرو گے کہ مجھے ساتھ لائے تھے۔"

ایلی اس کی بات سن کر گھبرا گیا۔

"میں نے ان لوگوں پر وہ سکہ بٹھایا ہے کہ یاد کریں گے۔ دھاک جما دی ہے آصفیوں

۔" وہ ہنسی۔

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم کا وار چل گیا ہے دراصل اس کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہ سکتی

کہ بیگم اس نئے تعلق کو توڑنے کی کوشش کرے گی اس کا تو یہ خیال تھا کہ بیگم کی کوشش ہو

گی کہ ایلی ان کے سر سے ٹل جائے اور اسے سر سے ٹالنے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔

سب افراد میں جو برات پر گئے تھے اگر کسی کا مفاد اس تعلق کو توڑنے سے وابستہ تھا تو وہ

شہزاد ہو سکتی تھی لیکن بیگم ———

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم نے موقعہ پا کر سادی کی والدہ سے ایسے موقع پر بات کی تھی جب

ترتیب ہی موجود تھی۔ اس نے کہا "ایلی لڑکا تو اچھا خاصہ ہے لیکن یہ بیل منڈھے چڑھتی

نظر نہیں آتی بہن میں تو سچ کہوں گی لڑکے کو میری اپنی بیٹی سے محبت ہے۔ اس بات کو سبھی جانتے

ہیں تو پھر کتنی بدنامی ہے بہن میری بیٹی شادی شدہ ہے یہی جو میرے ساتھ آئی ہے۔ دراصل

خون کا اثر نہیں جاتا ایلی کے باپ کو اب تک عورتوں کا شوق ہے چار بیویاں کر چکا ہے۔"

ایلی کو خبر نہ تھی کہ اتنی سی سرسری بات کر کے بیگم نے حالات کا دھارا ہی بدل دیا تھا اس کی زندگی کا رخ ایک ایسے موڑ کی طرف بدل دیا گیا تھا جس طرف بدنامی، رسوائی اور بے عزتی کی مہیب چٹانیں کھڑی تھیں۔

دراصل بیگم کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اس کی تباہی کا باعث اس کی اپنی جنسی بے مہری تھی۔ اسی وجہ سے جنس سے اسے نفرت تھی براہ راست یا بالواسطہ ہر جنسی تعلق کو توڑ میں در پردہ خوشی محسوس کرتی تھی۔

علی پور واپس جاتے ہوئے بیگم ایک سکندر تھی اور ایلی اور شہزاد شریف اور سادی تباہ تاراج شدہ ریاستیں تھیں جو اس کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں اس کا دل فخر سے دھڑک تھا۔ کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے۔ گاڑی سبک رفتاری سے علی پور کو چلی جا رہی تھی۔

ہاجرہ کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی ناک کی طرف دیکھ اور مسکراتی اور پھر ناک کی طرف دیکھنے لگتی۔ فرحت مسرور تھی لیکن اس کی مسرت میں پریشا اور فکر کا عنصر نمایاں تھا غالباً" وہ سوچ رہی تھی کہ بیگم اور رابعہ خود اپنے دکھ میں گم تھی۔ ا طرح ایک روز اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند محلے میں سب سے زیادہ خوب صور اور لائق تھا لیکن ——— وہ عیسائی ہو چکا تھا اور اب وہیں لاہور میں ایک میم کے ساتھ زندگی کر رہا تھا اور رابعہ کی گود میں اس کا اکلوتا بیٹا امی تھا جس کے پیدا ہوتے ہی رابعہ کے سہا سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ محبت بھرے جذبات سے امی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا نام تا تھا اسے گھر میں پیار سے سب امی کہتے تھے۔ کب امی بڑا ہو گا۔ دولہن بیاہ کر لائے گا اور رابعہ زندگی کا اندھیرا دور ہو گا۔ کبھی کبھی رابعہ سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی تو معاً" اسے یاد آ کہاں ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور اس کا حسین چہرہ سرخی سے تمت اور وہ کہتی "ہے کتنے اچھے لوگ تھے کتنے سادہ اور پیار کرنے والے اور لڑکی توبہ اتنی پیاری کہ خواہ مخواہ اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے۔" شہزاد اس روز مغموم سی تھی اور خلاف معمول سو میں کھوئی ہوئی تھی۔

فرحت اسے کہتی "اے آج سوچ میں کیوں پڑ گئی۔" لیکن شہزاد اس کی بات کا جواب نہ چاہتی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب شہزاد خاموش بیٹھی تھی جو اب تو خیر وہ بیسیوں د

تھی نہ جانے کیوں وہ خاموش تھی۔ سر اٹھاتی اور کھسیانی مسکراہٹ کے بعد پھر سر جھکا کر سوچنے لگتی۔

دراصل بیگم کا انداز دیکھ کر اسے شک پڑ گیا تھا کہ بیگم کچھ کر کے آئی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طبیعت سے واقف تھی وہ سوچ رہی تھی اگر بیگم نے کچھ کہہ دیا اور بات بگڑ گئی تو وہ سب اس پر الزام دھریں گے۔

ایلی اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے کوشش کی تھی کہ سادی کو پیغام بھیجے اور آخری روز وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ کسی مہمان کا بچہ جو ایلی سے خاصہ مانوس ہو گیا تھا اس کے ہاتھ اس نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ یاد ہے تم شرط ہار گئی تھی اور جواب میں سادی جنگلے کے قریب کھڑی ہوئی باآواز بلند چلائی تھی۔ "جاؤ ان سے کہہ دو ہمیں یاد ہے۔ اور ——— نہیں اور کچھ نہیں۔" سادی کی آواز تو وہی تھی۔ لیکن بات کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے برات کے دن کھڑکی میں بھی وہ غمگین کھڑی تھی اور اس وقت بھی اس کی آواز میں وہ مسرت نہ تھی جس کے چشمے ابلا کرتے تھے سادی کی ہر بات میں ہر حرکت میں۔

ایلی کو خبر نہ تھی کہ سادی کی اداسی کا راز اس وقت بیگم کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کی صورت میں ظاہر تھا۔ گاڑی کے پہیوں میں گونج رہا تھا "کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے۔" دور سبز پھنگوں سے پرے کانگڑے کی سلاخی چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور گاڑی ایلی کو اس مہیب اور خطرناک موڑ کی طرف لیے جا رہی تھی جس کی طرف حالات اسے دھکیل رہے تھے بیگم کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ بھی تو حالات کا ایک جزو تھی بے حد اہم جزو اور ایلی اس سے بالکل بے خبر تھا سمجھتا تھا کسی نہ کسی صورت وہ منصر کے گھرانے سے منسلک ہو جائے گا اور اس طرح زندگی کا نیا ورق الٹا جائے گا۔

انگی، ہی، ہی ——— !

علی پور واپس آ کر ایلی نے دو خط سادی کو لکھے اور غیر از معمولی دونوں سے ایک کا جواب موصول نہ ہوا۔ اس کے باوجود یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ بیاہ سے متعلقہ مصروفیت کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں خطوط میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ عہد و پیمان کے نامکمل رہ جانے کی وجہ سے سادی اسے ملے اور مقبرہ یا شالامار میں چند ایک گھنٹے اس کے ساتھ

رہے۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ خط سادی تک نہ پہنچے ہوں شاید اس سہیلی نے جس کی معرفت
خط بھیجتا تھا خطوں کا راز فاش کر دیا ہو۔ شاید وہ لوگ کہیں چلے گئے ہوں شاید ـــــ سائے
ایک خیال آتے لیکن یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شاید بیگم نے سادی کو ایلی سے متنفر کر دیا ہو
جانے کیوں اسے سادی پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنی نسبت شک کر سکتا تھا لیکن سادی ـــ
انہوں جس عظیم کردار کا سادی نے مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے ایلی کو کبھی شک نہیں پڑا
تھا کہ کوئی سادی کو ورغلا سکتا ہے۔

پھر سادی کا خط دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ مضمون پڑھ کر اسے یقین نہ آرہا تھا کہ وہ
سادی نے لکھا تھا۔ پہلے چند ایک جملے نہایت سنجیدہ اور خشک انداز میں تحریر کیے گئے تھے۔ ان
کے نیچے پانچ چھ لائنیں لکھ کر انہیں کاٹ دیا گیا تھا اور اس قدر احتیاط سے ایک ایک لفظ کاٹا گیا
کہ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ کٹا ہوا حصہ کس بات کے متعلق ہے۔ کٹے ہوئے مضمون کے
تحریر تھا "خیر چھوڑیے اس بات کو۔"

اوپر لکھا ہوا تھا۔

مورخہ ۴ ماہ حال کو اس بات کا امکان ہو گا کہ میں آپ سے مل سکوں۔ اس روز شام کے
تین بجے سے پانچ بجے تک آپ بوڑھے دریا کے پل پر میرا انتظار کریں۔ امید تو ہے کہ میں
ضرور آؤں گی لیکن پانچ بجے تک نہ آئی تو سمجھ لیجئے کہ مجبوری کی وجہ سے رکنا پڑا اس صورت
میں پھر اطلاع دوں گی۔

ایلی حیران تھا۔ ایسا خط تو سادی نے کبھی نہ لکھا تھا۔ مضمون کا انداز ہی نیا تھا۔ اس کے علاوہ
سادی نے تو کبھی اپنے خط کا ایک لفظ بھی نہ کاٹا تھا۔ وہ بے تکلف اور بے تکان لکھا کرتی تھی۔
اس کے خطوط اتنے لمبے ہوتے تھے کہ دیکھنے میں اخبار معلوم ہوتے تھے' آخر کیا بات تھی جو
اس نے لکھ کر کاٹ دی تھی۔ ایلی دیر تک سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر شاید اس
نے سوچا کہ ملاقات پر ساری بات معلوم ہو جائے گی اس لیے وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔

لاہور جا کر اس نے سوچا کہ شاید اسے دیر تک پل پر انتظار کرنا پڑے اس لیے اس نے
اپنے ایک عزیز کا سائیکل مستعار لے لیا اور پل پر جا پہنچا۔

بوڑھے دریا کے پل پر چند منٹ انتظار کے بعد سادی کا تانگا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

تانگے میں وہ اکیلی تھی۔
سادی کا چہرہ انبساط کی وجہ سے گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ایلی کو دیکھتے ہی وہ
بولی
"ارے آپ تو پہلے ہی سے موجود ہیں اور میں سمجھی میں پہلے پہنچوں گی۔"
"پہلے پہنچ جاتی تو یہاں کیا کرتی تم۔" ایلی نے کہا۔
"انتظار اور کیا۔"
"انتظار کرنے کا بہت شوق ہے کیا۔" ایلی بولا۔
"شوق کیا کر رہی ہوں انتظار نہ جانے کب تک کرنا ہو گا۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔"
کہتے ہوئے اس نے تانگے والے کو پیسے دے دیئے اور تانگے سے نیچے اتر آئی۔
"ارے" ایلی چلایا "تانگا کیوں چھوڑ دیا۔"
"ہائیں" وہ بولی "مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"
"اور بن سوچے ہی کرایہ چکا دیا۔" ایلی نے پوچھا۔
"آپ کو بھی تو یاد نہیں آیا جو چپکے سے کھڑے رہے۔" وہ ہنسی۔
"میں تو خیر مصروف تھا۔"
"مصروف ـــــ"
"ہاں شدت سے۔"
"تو میں بھی مصروف ہی ہوں گی۔" وہ ہنسنے لگی۔
"اب کیا کریں گے ہم نہ جانے کب کوئی خالی تانگہ آئے ادھر۔"
"سائیکل جو ہے۔" وہ چلائی۔ "مجھے آگے بٹھا لیجئے۔"
"ہائیں" ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
اس زمانے میں لاہور میں عورتیں خیمہ نما نقاب کے بغیر دکھائی نہیں دیتی تھیں بے نقاب
عام طور پر تو نظر نہیں آتی تھیں اور آتی بھی تو میمیں اینگلو انڈین یا ہندو عورتیں۔ پردے کے
کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی اس حد تک کہ نقاب اٹھا کر چلنا بھی معیوب سمجھا جاتا۔
اس دور کے لاہور میں زیادہ تر رونق شہر کی فصیل کے اندر والے علاقوں میں پائی جاتی تھی
اور موتی بازار میں شوقین مزاج لوگ شام کے وقت جمع ہو جاتے چونکہ عورت کی بہار

دیکھنا کسی اور جگہ ممکن نہ تھا۔ ویسے تو شہر سے باہر انار کلی میں خاصی رونق ہوتی تھی لیکن با
سیرو تفریح یا خرید و فروخت کرنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے اندرون ش
ڈبی بازار اور اس کے ملحقہ علاقوں میں زیورات اور پارچہ جات کے چند ایک بازار مخصوص تھ
انار کلی سے باہر کے علاقے آباد تھے۔ مال روڈ پر سارا دن الو بولتا تھا شام کو چند ایک گاڑیاں آ
جاتی دکھائی دیتیں یہ علاقے صرف گوروں اینگلو انڈین اور صاحبو کے لیے مخصوص تھے۔

اس زمانے میں کسی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بٹھا
کی بات چھوڑیئے ان دنوں تو اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ آواز
کستے نعرے لگاتے۔

سادی کی بات سن کر ایلی چونکا لیکن سادی ہنس رہی تھی ہنسے جا رہی تھی۔

"بس ڈر گئے؟" وہ چلائی۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"میں بتاتی ہوں۔" وہ بولی۔ "اور پھر پھدک کر ایلی کے سائیکل کے آگے بیٹھ گئی۔" دیکھ
یوں ہوتا ہے۔ اب آپ چلائیے۔"

"لیکن اگر گر گئی تو؟"

"تو اٹھ بیٹھوں گی اور پھر سے سوار ہو جاؤں گی۔ دونوں اکٹھے ہی گریں گے نا۔"

ایلی حیرت سے سادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

راہ گیر انہیں دیکھ کر رک گئے تھے۔ ان کے گرد بھیڑ لگی جا رہی تھی۔ "ہی ہی ہی ہی"
وہ ہنس رہے تھے لیکن سادی راہ گیروں کی نگاہوں سے گویا بے خبر تھی بے نیاز تھی۔

"چلیے بابو جی میں پہنچا آؤں۔" ایک تانگے والا رک کر بولا۔

ایلی نے ملتجی نگاہوں سے سادی کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" سادی نے بارعب آواز سے کہا "ہم سائیکل پر جائیں گے۔"

راہ گیروں نے قہقہہ لگایا۔ ہی ہی سڑک گونجنے لگی دور کھڑے پولیس مین نے انہ
مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ایلی گھبرا گیا۔ اس بھیڑ میں خصوصاً سپاہی سے بچنے کے لیے اس نے
سائیکل ڈول رہی تھی سادی ایک ساتھ چیخیں مار رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ سڑک پر آ
جاتے لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ "ہی ہی ہی

رہا تھا "بچ کے بابو" لیکن سائیکل ڈولتی ہوئی چلے جا رہی تھی۔

لی کو اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا اس
کے گرد حمائل تھے۔ سادی کی پیٹھ اس کی چھاتی سے چھو رہی تھی۔ اور سادی
سادی کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ ایلی کی تمام تر توجہ راہ گیروں پر مرکوز تھی اسے اتنی
تھی کہ سادی کے جسمانی لمس کو محسوس کرے۔ سادی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ اس
ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اور وہ اس کے آغوش میں بیٹھی ہے۔ اسے صرف اس قرب کا
تھا اور وہ اس احساس میں اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اسے راہ گیروں کا خیال ہی نہ
قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں یا تمسخر سے
رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے دو بچے ایک انوکھا کھیل کھیل رہے ہوں ایک نئے
کو آزما رہے ہوں۔ وہ مسرت سے چھلک رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی قہقہے لگا
تھی۔

ان دنوں وکالت کا فائنل امتحان قریب تھا اور مقبرہ وکالت کے طالب علموں سے بھرا ہوا
ہر جگہ ہر پلاٹ میں ہر بینچ پر ہر پودے تلے طالب علم قانون کی موٹی موٹی کتابیں کھولے
میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں پڑھ پڑھ کر چندھیائی ہوئی تھیں۔ چہرے بے خوابی کی
سوچ سوچ سے دکھائی دے رہے تھے۔ جبینیں فکر کی وجہ سے پر شکن تھیں۔ قانونی
بحثیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں۔

لیکن سادی اور ایلی کو ان کے وجود کا احساس نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو ایلی
نے چاروں طرف دیکھا دو چار ایک پلاٹوں میں چند ایک لڑکے دکھائی دیتے۔ ایلی نے
اطمینان کا سانس لیا اور سڑک کے جھمیلے سے نکل کر یوں محسوس کیا جیسے باغ صرف سادی اور
اس کے لیے مخصوص ہو۔ ان چند ایک لڑکوں کا کیا تھا جو دور اپنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔
دیر معلوم نہ ہوا کہ قریب کے پودوں جھاڑیوں اور پھولوں کے تختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ
بھری آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔

باغ کے ایک ویران کونے میں پہنچ کر ایلی نے کلیوں سے لدی ہوئی چنبیلی کی جھاڑی کی
اشارہ کر کے کہا "یہ تم ہو سادی۔"

سادی نے حسب عادت قہقہہ لگایا۔ "کیوں" وہ بولی "میں کیا جھاڑی ہوں۔"

"چنبیلی پھولوں میں چٹ کپڑی ہے۔" ایلی نے کہا "اور تم عورتوں میں۔"

"لیکن راہ چلتے کا ہاتھ پکڑتی ہے یہ تو۔" سادی مسکرائی۔

"اور تم پگڑی اچھالتی ہو۔" ایلی نے کہا۔

سادی نے قہقہہ لگایا "جبھی آپ ننگے سر رہتے ہیں۔" وہ خوشی سے تالی بجانے لگی۔

چنبلی کی جھاڑی میں حرکت ہوئی۔ اور ٹہنیوں سے ایک سر باہر نکل آیا۔ ایک لمبا گول چہرہ چار ایک سفید دانت۔

ایلی گھبرا گیا۔

"ارے" سادی نے قہقہہ لگایا "سبحان اللہ" وہ چلائی "ذرا کیمرا تو نکالیے" سر نے فوٹو کو اور سبز ٹہنیوں میں گم ہو گیا۔

"کون تھا یہ" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

لڈو

"کیا معلوم۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"ارے۔" وہ پھر چلائی۔

ایلی نے مڑ کر دیکھا۔ ان کی پشت کی طرف آنکھوں کے چار جوڑے ان کی طرف گھور رہے تھے۔ "یہ تو نین جھاڑی معلوم ہوتی ہے۔" وہ ہنسی۔ ایلی نے اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

"تم مجھے پٹواؤ گی۔" وہ بولی۔

"کیا مزا رہے گا۔" وہ ہنسی۔

"تماشہ دیکھتی ہو۔"

"دیکھتی ہوں۔ کرتی نہیں۔"

"لیکن وہ تو تمہیں تماشہ سمجھتے ہیں۔"

"پڑے سمجھیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"سادی۔" ایلی نے سنجیدگی سے پوچھا "تم ان کی نگاہوں سے گھبراتی نہیں۔"

"نہیں تو" وہ بولی۔ "گنوار پن سے کیوں گھبراؤں۔"

مجھے تو ڈر آتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"آپ کا کیا ہے۔" وہ ہنسی "آپ تو یوں ہیں جیسے گھبراہٹ میں جان پڑ گئی ہو۔ لیکن ہم نہیں گھبراتے آپ۔"

"تو کیا تم سے بھی گھبراؤں۔"

"کیوں نہیں۔" وہ بولی۔ "گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے

ہونہوں ان کی بات نہ کیجیے" "کیوں" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں" وہ ہنسی "جلنے کی کوئی بات نہیں۔ اخلاق مانع ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔؟"

"وہ بھی ہوتا ہے۔" سمجھ لیجیے مجھے کوفت ہوتی ہے۔"

"اور ان کی گنوار نگاہوں سے کوفت نہیں ہوتی۔"

"اونہوں۔" وہ ہنسنے لگی۔

"یہ تو یوں دیکھتے ہیں جیسے تم لڈو ہو۔"

"ہوں؟" وہ ہنسی۔

"ہاں۔ ہو" وہ بولا۔

"تو ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے آپ۔"

"اونہوں مجھے لڈو سے دلچسپی نہیں۔"

"جھوٹ" وہ چلائی "سفید جھوٹ۔"

"کیوں" ایلی نے پوچھا "وہ کیسے۔"

"آپ کے منہ سے تو کسی اور لڈو کی بو آتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلا گیا۔

"ہر بات کا مطلب نہیں بتایا کرتے۔"

"کیوں؟"

"بس سمجھ لیجیے خود بخود۔"

"بتا تو دو۔" اس نے منت کی۔

"نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی۔" وہ بولی۔

"بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ۔" وہ بولا۔

"بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے۔"

"اور جلی نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"پر بل نہیں گیا۔" وہ بولی۔

"نہ جانے کیا کہہ رہی ہو۔"

"جاگتے کو کون جگائے۔"

دفعتاً" ایلی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ شہزاد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آسکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آسکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔ دفعتاً" ان کے قریب ہی سے چار ایک آدمی مل کر گانے لگے۔

"ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔"

"وہ سب مل کر یوں گا رہے تھے جیسے قوال گاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تمسخر تھا لیکن تمسخر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھال پر حرص کے پستے چھڑکے ہوئے ہوں۔

"ارے" سادی حسب عادت قہقہہ مار کر بولی۔ "ہم تو قوالوں میں آگئے۔"

ایلی نے ادھر ادھر دیکھا سادی کے پیچھے پودوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ سات لڑکوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"الیاس صاحب آپ بھی لگائیے آواز۔" سادی ہنسی۔

ایلی گھبرا گیا۔

"خدا کے لیے نہ بولو۔" اس نے اشارہ کیا۔

"کیوں نہ بولوں۔"

"چلو یہاں سے چلیں۔"

"ان بزرگوں کے درشن تو کر لوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

قوال قریب تر آگئے۔ "ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔"

"ارے" وہ مڑی۔

زل اور قریب آگئے۔ "ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔"

سے مانگو اپنی اماں سے مانگو۔" سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

ہی ماں سے

ایلی گھبرا کر چل پڑا۔

ابھی وہ چار ایک قدم ہی چلا تھا کہ قوالی کی آوازیں بند ہو گئیں۔

"الیاس صاحب الیاس صاحب" سادی کی آواز سنائی دی "یہاں آیئے۔"

جب ایلی قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی۔ "یہ بھائی صاحب آم دے رہے ہیں تحفتاً" کھائیں گے آپ"

"آم دے رہے ہیں۔"

"لڈو مانگنے سے بات شروع ہوئی تھی آم کھلانے پر ختم ہو رہی ہے۔ اچھے رہے نا۔" وہ ہنسی۔

"معاف کیجئے وہ تو ویسے مذاق تھا۔" ایک نوجوان جھینپتے ہوئے بولا۔

"کہیں یہ آم والی بات بھی مذاق نہ ہو۔" سادی نے کہا۔

وہ سب ہنسنے لگے۔

حور اور لنگور

پھر وہ دونوں آم چوستے ہوئے باغ میں یوں گھومنے لگے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ اور بالآخر ایک بڑے سے پلاٹ میں بیٹھ کر گپیں مارنے لگے۔ سادی بات بات پر ہنستی قہقہہ لگاتی تالی بجا بجا کر ہنستی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ دور دور سے طلبا اس پلاٹ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ چپکے سے پودوں کی اوٹ میں بیٹھ جاتے اور پھر دور بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو اشارے سے بلاتے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد پچیس تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چپکے سے پودوں کی اوٹ سے نکل کر آئے اور انہوں نے سادی اور ایلی کے گرد چاروں طرف حلقہ بنا لیا اور گانے لگے۔

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔"

ایلی نے گھبرا کر ادھر دیکھا اس کا دل ڈوب گیا۔

وہ جھوم جھوم کر گا رہے تھے۔ تالی پیٹ رہے تھے آنکھیں مٹکا رہے تھے۔

"ارے" سادی نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" ایلی نے زیر لب کہا۔

"وہ تو ہے۔" سادی نے کہا۔ "لیکن کہتے سچ ہیں۔"

لڑکے سادی کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے "ہیر ہیر۔"

پھر سادی نے دونوں بازو اونچے کر دیئے۔ دیکھئے بھائی صاحب "وہ یوں چلانے لگی جیسے میں مٹھائی فروش بات شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چلاتا ہے " سنئے بھائی صاحب۔" اس نے دہرایا اور پھر رک گئی۔

"یہ بتا دیجئے۔" وہ بولی۔ "کہ حور کون ہے اور لنگور کون؟"

لڑکوں نے دلچسپی اور تعجب سے سادی کی طرف دیکھا اور قہقہے مارنے لگے۔

"اپنے ان سے پوچھئے۔" ایک شوخ نوجوان ایلی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"کیوں میرے ان صاحب "سادی ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ کے لیے نام تو اچھا تجویز کیا ہے۔ ان لوگوں نے۔"

"لنگور، لنگور، لنگور" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ایلی نے محسوس کیا کہ سادی کے مقابل میں وہ واقعی لنگور تھا۔ اس کی ٹانگوں میں دم لٹکنے لگی۔

"لیکن لنگور ہے کون۔" سادی نے پوچھا

لڑکوں نے دایاں ہاتھ اٹھایا جس طرف سادی کھڑی تھی اور چلائے "حور حور" پھر بائیاں اوپر اٹھایا اور چلانے لگے لنگور لنگور۔" پھر وہ ایک ساتھ بار بار اپنے ہاتھ اٹھ کر چلاتے۔ "لنگور" دیر تک وہ شور مچاتے رہے۔ اور سادی قہقہے لگاتی رہی۔

پھر سادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ان کے حلقے سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف اشارہ کر کے گانے لگی

"پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔"

لڑکے جوش میں اس کے ساتھ چلانے لگے۔ ایلی چپ چاپ گھاس پر بیٹھا ہوا دانتوں میں تنکا چلائے جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر لڑکوں نے حلقہ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس لیے بیٹھ رہنے کے سوا اس کے لئے چارہ کار نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب سادی رخصت ہو رہی تھی وہ بھول گئے تھے کہ سادی ایک لڑکی تھی نوجوان اور خوب صورت لڑکی۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔

"تو آپ جا رہے" ایک نے حسرت بھری نگاہ ڈال کر کہا۔

"ہاں دونوں حور اور لنگور۔"

ہلانے لگے۔ "خدا حافظ" سادی نے کہا۔

بان نے جواب میں سلوٹ مارا اور تانگہ چل پڑا لنگور پائیدان پر رکھے ہوئے سائیکل سے ہوا تھا۔

ر وہ

تانگے میں وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان میں ٹھوڑی ٹیک رکھی تھی اور سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔

"کس سوچ میں پڑی ہو؟" ایلی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"آخر کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"ڈرتی ہوں کہ بھائی جان کو پتہ نہ چل جائے۔"

وہ ہنسی۔ "کیا فرق پڑتا ہے"۔

"پھر سوچ کیسی؟"

"سوچ کے سوا اب ہے ہی کیا۔" وہ بولی۔

"کیوں؟"

"خود کردہ را علاجے نیست۔"

"جذباتی ہو رہی ہے۔"

"اونہوں۔ پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"بس ہوں۔" وہ ہنسی۔

"تم تو بات کہہ دیا کرتی تھی۔" ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہ کہنے والی بات حائل ہو جائے تو۔" اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"نہ حائل ہونے دو۔" ایلی بولا۔

"اگر آپ نے حائل کر رکھی ہو تو۔"

"میں نے۔" ایلی کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے دفعتاً وہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئی تھی۔ ایسی تو اس کی [cut]
نہ تھی۔ وہ تو ایک انبساط کا دھارا تھی جو کبھی رکا نہ تھا۔

"ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ہوئی تو نہیں" وہ بولی "پہلے ہی سے تھی ——— چلو چھوڑو" دفعتاً وہ ہنسی۔ "جاؤ معاف کیا

"ارے تو کیا یہ مذاق تھا۔"

"ہاں" وہ ہنسی۔ لیکن اس کی ہنسی میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

"آپ نے اپنے والد صاحب سے بات کی؟" سادی نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیا وہ مان جائیں گے؟"

"پتہ نہیں۔" وہ بولا۔ "مجھے ڈر آتا ہے۔"

"اچھا۔" سادی نے آہ بھری۔

"کیا یہ ضروری ہے" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولی "ان کی طرف سے رسمی پیغام کا آنا ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

"بڑے خاندانوں کے بڑے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اس بات پر لوگ بضد ہیں۔"

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "اور ———"

سادی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں نے غلطی کی"

"کیا؟"

"میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس معاملے میں انہیں مجبور نہ کروں گی۔"

"کیا دیواریں ہی کھڑی ہوتی جائیں گی؟"

"اونہوں۔ یہ تو دیواریں نہیں۔" وہ ہنسی "دیوار تو ———" وہ رک گئی۔

"کہو نا۔"

"زبردستی ہے کیا۔"

"ہاں" ایلی جلال میں آ گیا۔

سادی نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں بتانا پڑے گا۔" وہ غرایا۔

"نہیں بتاؤں گی، نہیں بتاؤں گی۔" سادی نے قہقہہ لگایا۔

"تو جملہ ہی مکمل کر دو۔"

"اونہوں۔"

"نہیں میری قسم" ایلی نے منت کی۔ "کیا کوئی دیوار ہے۔"

"ہاں" وہ ہنسی ہے۔ "آپ کی جانب سے۔"

"میری جانب سے؟"

"ہاں"

"جھوٹ بکواس۔ کوئی دیوار نہیں۔"

"اور وہ ———" سادی نے قہقہہ لگایا۔

"وہ ———" ایلی سوچنے لگا۔ "وہ کون؟ بتاؤ نا"۔ "جوش میں وہ بھول گیا کہ اس نے دونوں
وں میں سائیکل تھام رکھا تھا۔ اس نے سادی کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ دھڑام
سائیکل تانگے سے گر پڑی۔ ایلی تانگے سے اتر آیا۔

سادی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اور پھر چلا کر بولی "خدا حافظ" اور تانگا چل پڑا۔ ایلی نے
ئیکل سنبھالی اور تانگے کو جا لینے کے خیال سے اس پر سوار ہو گیا لیکن گرنے کی وجہ سے پیڈل
ب ہو گیا تھا۔ اور زنجیر جام ہو چکی تھی۔ وہ سائیکل سے اتر آیا۔ اور پیدل چلتے ہوئے سادی
طرف دیکھنے لگا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ "خدا حافظ، خدا حافظ۔" اس کے
نٹ مل رہے تھے۔

تانگا

لی پور آتے ہوئے گاڑی میں ایلی مسلسل سوچتا رہا لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ کونسی

دیوار اس کی اپنی جانب سے حائل تھی "وہ ———" سے سادی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ وہ ایک دیوار تھی جو سادی اور ایلی کے درمیان حائل تھی لیکن نہ جانے کیوں اس جذباتی تعلق کے باوجود جو وہ شہزاد کے متعلق محسوس کرتا تھا وہ اسے دیوار نہیں سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس موضوع پر غور سے سوچتا تو محسوس کرتا کہ الٹا سادی تو بذات خود شہزاد اور ایلی کے درمیان ایک دیوار بن چکی تھی۔ ایک ایسی دیوار جو راستے کی مشکل نہیں تھی بلکہ ایلی کے تحفظ سکون اطمینان اور خوشی کی دیوار تھی۔ یہ صحیح تھا کہ ایلی کو شہزاد سے بے حد وابستگی تھی لیکن ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ شہزاد کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات صحت مند نہیں رہ سکتے تھے۔

بہرحال وہ سادی کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ کسی نے سادی سے شہزاد کی بات کہہ دی تھی۔ اور پھر بیگم کے یہ خیال اس کے دل میں نہ آیا اگر وہ سادی کے اس اشارے کو سمجھ پاتا تو یقیناً وہ سادی سے مل کر اسے تمام روئیداد سنا دیتا اور سادی اپنی خلوص پسندی اور سادگی کی وجہ سے اس پھانس کو اپنے دل سے نکال دیتی جو بیگم نے انتقام کے جذبے کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔

لیکن حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ مستقبل کے بطن کے واقعات کا رخ کسی اور جانب متعین تھا۔ ہونے والے واقعات مستقبل کے بطن میں چلا رہے تھے اپنی نمو کے لیے بلک رہے تھے۔

علی پور پہنچ کر جب ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صفدر اور شہزاد ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ سادی کی باتوں کی وجہ سے اس قدر پریشان تھا کہ اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس نے صفدر کی آنکھ میں گرسنہ چمک کی طرف توجہ نہ دی اور اس نے بھی نہ دیکھا کہ شہزاد اس کی آمد پر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ہے۔

ایلی کو دیکھ کر بیگم قریب آگئی "تو آ بھی گیا"۔ وہ بولی۔

"ہاں" ایلی نے جواب دیا۔

"دو ایک روز بھی باہر نہ رہ سکا" بیگم کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔

ایلی نے غصے سے بیگم کی طرف دیکھا۔

صفدر کے چہرے پر چمک ابھری۔

شہزاد جوں کی توں خاموش بیٹھی رہی۔

... بات کا جواب دیئے بغیر فرحت کی طرف چل پڑا۔

... بیگم کی بات ... علی پور آنے کے بعد ایلی پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ علی احمد ... رضامندی حاصل کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ ابا اس معاملے میں ضد نہیں کریں گے۔ اسے ... تھا کہ علی احمد ہر اس بات کے خلاف ہیں جس میں روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لحاظ سے ... ایلی کی شادی کی بات ان کے لیے ایک مصیبت تھی زبانی بات چیت بھی ناگوار تھی۔ ... اخراجات سے ہٹ کر انہیں قطعی طور پر اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایلی کی شادی ... ہوتی ہے یا وہ خاندان کیسا ہے یا لڑکی کی ناک اونچی ہے یا بیٹھی ہوئی۔

... اگر ایلی علی احمد سے کہتا ابا جان میری شادی کر دیجئے تو علی احمد اس بات پر ذرا بھی چیں بہ ... نہ ہوتے۔ وہ ان بزرگوں کی طرح نہ تھے جو ایسی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور کھنکار کر ... ہو جاتے ہیں یا آنکھیں نکال کر کہتے ہیں "شرم کرو بیٹا اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہوئے ... شرم آنی چاہیئے۔"

... ایسے وقت ان کا رویہ ایک تماش بین سا ہو جاتا۔

... "بہت اچھا" بہت اچھا وہ نہایت خوش اخلاقی سے کہتے۔ اور پھر اپنی بیویوں کو مخاطب کر ... لیتے۔ "لو بھئی راجو شمیم سنا تم نے ایلی کہتا ہے میری شادی کر دو۔ ہی ہی ہی ہی۔ سن لیا تم ..." وہ قہقہہ مار کر کہتے۔ اس قہقہہ میں تمسخر کا عنصر نمایاں ہوتا۔ پھر دفعتاً" وہ سنجیدہ ہو جاتے ... "راجو بھئی کہتا ٹھیک ہے۔ اب اس کی شادی کی فکر کرنا ہی چاہیئے۔ اب تو جوان ہو گیا ... اور ایلی سچ پوچھو تو شادی کیا ہے اک روگ ہے۔ راجو سن رہی ہے تو کیا کہہ رہا ہوں میں۔ ... تمہارے سننے نہ سننے سے کیا فرق پڑتا ہے سن بھی لے تو کیا سمجھ لے گی میری بات! ہی ہی ... ہنستے۔ لیکن واہ واہ کیا روگ ہے ہزار روگ سے بچانے والا ہزار بری عادتوں سے محفوظ ... رکھنے والا۔ بس ایک روگ لگا لو ہزار مصیبتوں سے محفوظ ہو جاؤ۔ سن رہی ہو راجو مثلاً تمہارا ... شکر ہے میں ہزار مصیبتوں سے بچا ہوا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔ "ہاں بھئی"۔ وہ ایلی ... سے مخاطب ہو کر کہتے۔ "ٹھیک کہتے ہو تم تمہاری شادی فوراً ہو جانی چاہیئے۔ لو بھئی راجو شمیم کر ... لو تیاری ہم بھی کوئی مناسب لڑکی دیکھتے ہیں ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔ "راجو اب میں کوئی ... تھوڑے دیکھتا ہوں اب تو مجھے مجبوراً" ایلی کے لیے لڑکیوں کو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہی ہی

ہی ہی۔ اور دیکھو نا ایلی شادی کوئی کھیل نہیں کہ آج تم کہو اور کل ہو جائے گی یہ تو بڑا
بکھیڑا ہے۔ پہلے تنکا تنکا اکٹھا کریں۔ اتنے امیر تو ہم ہیں نہیں کہ ایک دم سب کچھ ہو جائے
کوئی زمانہ آیا ہے۔ دال روٹی نہیں چلتی۔ بس تنکا تنکا اکٹھا ہو گا پھر تمہارا آشیانہ بنے گا
کوئی فاختہ آ بیٹھے گی اللہ اللہ خیر سلا۔ لو بھئی راجو تو شروع کر دو آج ہی سے تنکا تنکا جمع کرنا
ہی ہی۔" وہ ہنستے اور بات طاق پر دھری کی دھری رہ جاتی۔

ایلی سوچ رہا تھا کہ ابا سے اس انداز سے بات کی جائے کہ انہیں واضح طور پر محسوس ہو
اخراجات کا انتظام ہو چکا ہے۔ تنکا تنکا اکٹھا ہو چکا ہے فاختہ بھی موجود ہے اور ان سے صرف
توقع کی جا رہی ہے کہ رسم کے مطابق فاختہ کو اپنی انگلی پر بٹھا کر لے آئیں اور بنے بنائے گھونسلے
میں بٹھا دیں۔ اس صورت میں شاید وہ اعتراض نہ کریں۔

ایلی نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ اخراجات کون پورے کرے گا روپیہ کہاں سے آئے گا
رسومات کیسے ادا ہوں گی۔ رکھ رکھاؤ کیسے قائم رہے گا۔ یہ باتیں بے حد تکلیف دہ تھیں اور
ناخوش گوار اور تکلیف دہ باتوں پر سوچنا ایلی کو ناپسند تھا۔ طبعی طور پر وہ ذہنی فرار کا قائل تھا
چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے ابا سے رضامندی حاصل کرے اور وہ ایک بار سادی کے اقرباء
کو رسمی طور پر پیغام پیش کر دیں۔ پھر چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔ پھر کے متعلق سوچنے سے ایلی گریز
کرتا تھا۔ غالباً وہ سمجھتا تھا کہ اس دوران میں اسے اللہ دین کا چراغ مل جائے گا اور جملہ ضروریات
پوری ہو جائیں گی یا ایسا نہ ہو سکا تو شائد منصرا سے ان رسمی اخراجات سے آزاد کر کے بات
اماں اس کی مدد کرے آخر اس نے ایلی کی منگنی بھی تو کی تھی اور کی بھی بڑی دھوم دھام سے
تھی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ بشرطیکہ ابا رضامندی دے دیں۔

ماں کے متعلق ایلی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کی دانست میں اماں تو اس بات پر بے حد
مسرور تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس کا بیٹا ایک بیاہتا عورت کے دام سے نکل رہا ہے۔ اور پھر
سادی کے ہاں دو تین مرتبہ ہو آئی تھی اگر وہ اس بات پر خوش نہ ہوتی تو بھلا وہاں جاتی ہی
کیوں۔ لہٰذا یہ بات تو طے شدہ تھی کہ اماں اس امر میں اس کا ساتھ دے گی۔

لیکن جب ایلی نے ماں سے بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔

"نہ بھئی" وہ بولی "میں اس معاملے میں نہیں آؤں گی۔"

ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا مطلب" ایلی...

"مجھے بڑی خوشی ہے کہ تیری شادی ہو لیکن میں اس معاملے میں کیسے آ سکتی ہوں۔"

"نہیں" وہ غصے میں غرایا۔

"دیکھو بیٹا میں نے کتنے چاؤ سے تمہاری منگنی کی تھی۔ اب اگر اس رشتے کو چھوڑ کر میں
جگہ جا بیٹا جوڑوں تو لوگ کیا کہیں گے۔ میرے عزیز کیا سمجھیں گے۔" پھر وہ رونے لگی
"ایلی تو نے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کتنے چاؤ سے میں نے تجھے نامزد کیا تھا اور
کیا نہیں تجھے پوچھ کر میں نے بات پکی کی تھی۔ یاد ہے تجھے تو نے کس خوشی سے ہاں کہا
تھا لیکن اب۔" وہ خاموش ہو گئی اس کے گالوں پر آنسو یوں بہنے لگے جیسے جھڑی لگی ہو۔

"کیوں جی برا کرتی ہے اماں" فرحت بولی۔

"جی برا" وہ رونے لگی۔ "میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اس کی امید
پر بیٹھی تھی۔ اس کو دیکھ کر جیتی رہی۔ خاوند کی بے رخی برداشت کی سوکنوں کی خدمت
کرتی رہی۔ زندگی بھر محنت مزدوری کر کے اسے پالا۔" ہاجرہ کی ہچکی بندھ گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے ہاجرہ کے آنسو اس کے آشیاں کے تنکے ہوں جو بہے جا رہے

...

ایلی گھبرا کر وہ اٹھا اور اپنا غصہ اور اضطراب چھپانے کے لیے سوچے سمجھے بغیر زینہ چڑھنے لگا۔
اوپر کے چوبارے میں پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ شہزاد کھڑکی میں تھی جس کے قریب ہی صفدر
کی کھڑکی تھی۔ اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ چپ چاپ وہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

دفعتاً صفدر کی نگاہ ایلی پر پڑی۔ "آیئے آیئے۔" وہ چلایا۔ "الیاس صاحب آئے ہیں۔"
شہزاد نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر صفدر سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔
"...وہ بولی "مجھے اس ڈیزائن کے بندے پسند نہیں مجھے تو کوئی نئے فیشن کا نمونہ دکھاؤ۔
...بھی خرچوں اور پھر وہی دقیانوسی چیز۔ کام کرنا ہے تو دل سے کرو ورنہ کیا فائدہ" وہ

...

"بہت اچھا" صفدر نے دونوں بازو اٹھا کر یوں کہا جیسے حافظ خدا تمہارا گاتے ہوئے سٹیج
سے جا رہا ہو اور وہ چلا گیا۔

شہزاد فارغ ہو کر چوبارے میں لوھر اودھر گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو
پر کپڑا دیا۔ کارنس پر پڑی سرے والی کو ایک طرف رکھا صندوق کھول کر کے
اسے سرہانے پر چڑھایا اور پھر تیل کی کپی اٹھا کر مشین کو تیل دینے لگی۔
ایلی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔

مسٹر گپتا

جن دنوں ایلی نے بی اے پاس کیا تھا وہ مالی بحران کے دن تھے۔ دوسری جنگ عظیم
سانپ کو گزرے سالہاسال گزر چکے تھے۔ لیکن لکیریں اب ابھر رہی تھیں۔ ہر محکمے میں
کا کلہاڑا چل رہا تھا نوکری حاصل کرنا ناممکن تھا۔

مجبوری میں ایلی نے ایک شارٹ ہینڈ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج علی پور کے
دروازے کے قریب ایک چوبارے میں واقع تھا جس کے ملحقہ مکان میں مسٹر گپتا کالج کے
اور واحد انسٹرکٹر کی رہائش تھی مسٹر گپتا پرانی وضع کے باعزت لالہ جی تھے۔
وہ صبح سویرے جاگتے اور چھڑی لے کر باہر چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ مسٹر گپتا
سہارے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی چال اس قدر چست اور تیز تھی کہ
معاون ثابت ہونے کی بجائے الٹا رکاوٹ معلوم ہوتی۔ لیکن مسٹر گپتا چھڑی یا چھتری کے بغیر
نکلنے کے قائل نہ تھے۔ وہ ایک پرانے باعزت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے آباؤ
میں کسی شخص نے چھڑی یا چھتری کے بغیر باہر نکلنے کی حماقت نہ کی تھی۔ سیر کرنے کے بعد
مندر سے ہوتے ہوئے سیدھے اپنے کالج میں پہنچتے۔ اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر
کرتے اور پھر انہیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔
مسٹر گپتا اس بات پر بے حد ناز کرتے تھے کہ ہندوستان میں صوتی شارٹ ہینڈ کو چلانے کے
لیے انہوں نے ساری عمر جدوجہد کی تھی۔
جب کوئی نیا لڑکا کالج میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا تو مسٹر گپتا اپنی
مصروفیات چھوڑ کر اس کے پاس بہ کمال شفقت آ بیٹھتے اور اسے سمجھاتے کہ شارٹ ہینڈ کا
سسٹم جسے پٹ میں کہا جاتا تھا بالکل بے کار ہے اور ان کے نئے سسٹم کا مقابلہ نہیں کر سکتا

سسٹم جائنٹ واول سسٹم ہے۔
مسٹر گپتا بڑی محنت سے نئے لڑکوں کو سمجھاتے کہ جائنٹ واول سسٹم کا کیا مطلب ہے اور
سسٹم سے کیا مراد ہے اور پھر جب لڑکا داخل ہو جاتا تو پھر بات پر اسے تاکید کرتے
لکھتے وقت وہ سپیلنگ کا خیال رکھے۔
ایلی ان کی اس بات پر بے حد محظوظ ہوتا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھتا:
"کیوں مسٹر گپتا یہ سسٹم صوتی ہے نا یعنی اس میں صرف آواز کا خیال رکھا جاتا ہے۔"
"بالکل بالکل الیاس صاحب بس اس نکتہ کو آپ ہی نے سمجھا ہے لڑکے توجہ سے بات
سنتے۔"
"درست" ایلی کہتا۔ "لیکن ہمیں سپیلنگ کا خیال رکھنا چاہیے۔" وہ طنزاً کہتا۔
"بالکل" وہ خوشی سے چلاتے۔ "بس یہی ایک نکتہ ہے۔" اور پھر وہ فوراً مثال دیتے صبح
آپ نے جے او غلط لکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے لفظ کے سپیلنگ کی طرف خیال نہ
آپ کو یہ خیال نہ رہا تھا کہ یہ لفظ جے او سے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے یوں لکھا جیسے یہ لفظ
ے لکھا جاتا ہو۔"
مسٹر گپتا سے باتیں کرنے میں ایلی کو بہت لطف آتا تھا لہٰذا وہ اکثر مسٹر گپتا کے ہاں جا بیٹھتا
سبق لیتے ہوئے بھی وہ مسٹر گپتا سے گپ بازی کیا کرتا۔ کالج میں ایلی واحد طالب علم تھا جس
مسٹر گپتا نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایلی بی اے تھا اور
مسٹر گپتا کے کالج میں تمام طلباء میٹرک پاس تھے۔
دفعتاً محلے میں شور اٹھا کہ ایلی کی منگیتر ثمرہ کی شادی ہو رہی ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر حیران رہ
گئی بھاگی گئی پوچھ گچھ کی۔ بات کی تصدیق ہو گئی تو ٹھنڈی ہو کر بستر پر آ پڑی۔
اس پر ایلی اماں کے پاس آ بیٹھا بولا ماں اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی دور ہو گیا۔ چل اٹھ
میرے ساتھ چل کہ مظفر آباد میں ابا سے ملیں۔ شاید وہ مان جائیں۔
ہاجرہ نے جب ایلی کی بات سنی تو پہلے تو وہ ادھر ادھر کے بہانے بناتی رہی لیکن ایلی نے بار
بار کی منتیں کیں حتیٰ کہ ایک روز اماں ایلی کے ساتھ مظفر آباد جانے کے لیے مان گئیں۔
ماں اور بیٹا ملتان پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے مظفر آباد کی لائن ٹوٹی ہوئی

ہے اور وہ آگے نہیں جا سکتے۔ مجبوراً" وہ ملتان ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہر گئے اور انتظار کرنے
لگے کہ کب راستہ صاف ہو اور وہ منزل مقصود پر پہنچیں۔ ملتان کے قیام کے دوران میں ایلی
ماں کو باہر لے جاتا اور کسی باغ یا میدان میں پہنچ کر وہ دونوں کسی ویران کونے میں بیٹھ جاتے
ایلی ماں کو سمجھاتا کہ علی احمد سے کس طرح بات کی جائے۔

"دیکھو نا اماں" وہ کہتا "اگر ابا نے محسوس کیا کہ شادی پر بہت خرچ اٹھے گا تو وہ کسی نہ کسی
بہانے یہ رشتہ نامنظور کر دیں گے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی ایسا موقع
ملے اور اماں سادی ایک ایسی ناؤ ہے جو مجھے اس بھنور سے باہر نکال سکتی ہے جس میں میں غو
کھا رہا ہوں اور اگر یہ ناؤ بھی نہ رہی تو پھر —— پھر تم جانتی ہو۔" ایلی وضاحت سے بار
سمجھا رہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہا تو پھر وہ اپنے آپ کو از سر نو اسی بھنور کے حوالے کر دے گا
میں وہ عرصہ دراز سے ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ ایلی نے اپنے منہ سے یہ تسلیم کیا تھا کہ شہزاد ایک بھنور تھی اور وہ ا
بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ درحقیقت وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے استعمال
رہا تھا اور دھمکی کے طور پر بوڑھی ماں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

لیکن ہاجرہ بار بار کہتی اگر تمہارے ابا نے شادی پر خرچ نہ کیا تو کرے گا کون اور بات ک
بنے گی۔

"تم اس بات کی پروا نہ کرو اماں۔ یہ بعد کی بات ہے فی الحال ضروری بات یہ ہے کہ ابا
چلیں اور ہمیں ان کی صرف اس قدر امداد حاصل ہو جائے کہ وہ سادی کے ابا سے مل کر
پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہئے کہ وہ سمجھیں خرچ ورچ کا سلسلہ نہ
گا۔"

"لیکن پھر شادی کیسے ہو گی کیا وہ تمہیں خانہ داماد بنا لیں گے۔"

"نہیں اماں ——!"

"ایسی بات ہے تو میں تو جیتے ہی مر جاؤں گی۔" ہاجرہ چلاتی —— اور بات جوں کی
ادھوری رہ جاتی۔

چار ایک روز کے بعد بصد مشکل گھٹنے گھٹنے پانی سے گزر کر وہ مظفر آباد میں علی احمد

پہنچے انہیں اس حالت میں دیکھ کر علی احمد کے گھر میں شور مچ گیا راجو اور شمیم
انگلیاں رکھے حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شمیم کی دونوں بیٹیاں اور راجو کے
بچے ابا ابا شور مچانے لگے۔

"یہ آپ ہیں۔ یا میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے"۔

"ہیں تو ہے۔" راجو بولی۔

"یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔" شمیم نے ایلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سنا آپ نے۔" راجو نے علی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ "سنتے ہیں کیا کہہ رہی ہوں
آپ لگے اس حساب کے رجسٹر کو ہر وقت اسی میں کھوئے رہتے ہیں آپ۔ نہ آئے کا
نہ گئے کا ہوش۔ میں نے کہا آپ سے کہہ رہی ہوں"

"کیا کہہ رہی ہو کچھ راجو۔" اندر سے علی احمد کی آواز سنائی دی۔

"شکر ہے سن لیا آپ نے۔" وہ بولی۔

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "دیکھو نا راجو یا تو بیوی گونگی ہو اور یا خاوند بہرہ ہو جبھی نبھتی
ہے ورنہ نہیں۔ تم تو طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرتی رہتی ہو اب میں بھی بہرہ نہ بنوں تو نبھے
کیسے ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے "کیا کہتی ہے۔"

"میں کہتی ہوں۔" راجو چلاتی۔ "ذرا باہر تو دیکھو لو کون آیا ہے۔"

"کوئی آیا ہے کیا؟" وہ بولے۔

"ہاں ہاں کہہ جو رہی ہوں۔"

علی احمد نے جلدی سے ٹنگی ہوئی قمیض کو اتارا اور اسے پہننے لگے۔ ان کی عادت تھی کہ
قمیض اتار کر بیٹھا کرتے اور جب کوئی آتا تو فوراً" قمیض پہن لیتے۔

انہیں قمیض پہنتے دیکھ کر راجو ہنسی۔ "اے ہے کوئی باہر سے تو نہیں آئی کہ قمیض پہننے
لگے آئی ہے"۔

"ایلی کی ماں ——" انہوں نے حیرت سے کہا۔

"ساتھ ایلی بھی ہے۔ اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ بھئی راجو انہیں بٹھاؤ نا کوئی چائے
بسکٹ وسکٹ منگوا دو کالے کی دوکان سے لیکن بھئی تم نے پہلے اطلاع کیوں نہ دی۔

اور یہ سیلاب، کیسے پہنچے تم۔ سنا ہے ریل کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے اور سارا شہر تو پانی میں ڈوبا ہوا دو دو فٹ پانی کھڑا ہے پہلے اطلاع دیتے تو ہم کوئی انتظام کر دیتے ـــــ خیر خیر اچھا کیا تم آ گئے۔ راجو راجو ـــــ یہ دیکھا تم نے ایلی کی ماں کو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب تو پگلی ہو گئی ہے۔ اور راجو تمہیں معلوم ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایک مرتبہ ہماری پڑوسن نے کیا کہا وہ ہنسنے لگے۔ ایلی کی ماں سے اللہ رکھے کل کتنے لڑکے ہیں تمہارے اور یہ پلوٹھی کا ہے ہی ہی" وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری طرف اشارہ کرکے بولی اللہ رکھے۔ "کیوں ایلی کی ماں تجھے۔ ہی ہی ہی حد ہو گئی سنا تم نے راجو۔ ہی ہی ہی ہی۔"

جب علی احمد کو معلوم ہوا کہ وہ ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں تو دفعتاً" وہ چپ ہو گئے۔ یہ علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ اگر انہیں کسی بات میں خاص اہمیت دی جاتی تو وہ اس کو خاص اہمیت دینا شروع کر دیتے اور خود اپنی رائے کو اہمیت دینے لگتے۔ اور اس کے کسی مسئلے میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ اس مسئلے کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے اور اس انداز ی کو درخور اعتنانہ سمجھتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

علی احمد نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بات ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تو بات اتنی آسانی سے طے جانی چاہیے۔

"ہاں ہاں ہاں ہاں۔" وہ ہنسنے لگے "بھئی اب جو تم یہاں آ پہنچے ہو تو اب باتیں ہی باتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے اپنوں کے درمیان۔ ہی ہی ہی ہی۔ اب دیکھ لو راجو ہے تو راجو سے باتیں کرتے ہیں ہم۔ کیوں راجو ٹھیک ہے نا ہی ہی ہی ہی۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی جواب نہیں دے سکی لیکن کمال یہ ہے کہ لاجواب بھی نہیں ہوتی۔ کیوں راجو ہی ہی۔"

"آپ میری بات چھوڑیں۔" راجو بولی۔ "ان سے بات کریں اتنی دور سے آئے بات کرنے کے لیے۔"

"ان سے بھی کریں گے ان سے بھی کریں گے۔ لیکن ابھی یہ لوگ سفر کرکے پھر اتنی تکلیف جھیل کے۔ انہیں چار ایک دن آرام کرنا چاہیے۔ آرام کرو کھاؤ پیو

ہے گی ـــــ کیوں راجو تم نے چائے بنائی اور کیا کالے سے بسکٹ منگوائے پھر کوئی خاطر تواضع کرو ان کی تمہارے مہمان آئے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی صندوقچی سے ایک چونی اور راجو کو دیتے ہوئے بولے۔" منگواؤ بسکٹ۔ ذرا جلدی کرو نا بھئی ایلی کی ماں بیٹھ جاؤ نا۔ اور علی پور کا کیا حال ہے۔"

مسلسل چار روز ہاجرہ اور ایلی نے متعدد بار کوشش کی کہ علی احمد سے بات کی جائے لیکن وہ اس کی اہمیت سے اس حد تک واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے بات ٹال دی بات شروع کرنا تو علی احمد کہتے۔ او ہو۔ میں بھول ہی گیا۔ دیکھو نا اتنے بکھیڑے ہیں کہ میں بھول جاتا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔ سب سے بڑا بکھیڑا تو یہ راجو ہی ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ ہو نا تم بکھیڑا۔ بکھیڑے درد سر ہوتے ہیں اور درد دل والے بکھیڑے بھی ہوتے ہیں اور راجو تم تو درد دل والا بکھیڑا ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔ سنا تم نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن تم درد سر والا بکھیڑا بنتی جا رہی ہو پہلے خالص درد دل والا تھی۔ تمہیں درد دل والے بکھیڑے کا تجربہ نہیں ایلی۔ بڑا عظیم بکھیڑا ہوتا ہے یہ۔ توبہ ہے ـــــ اچھا ہے اچھا ہے ابھی یہ درد دل والا بکھیڑا نہ ہی ہو ابھی ساری عمر پڑی ہے۔ کچھ دن اور سکھ کے گزار لو تو تمہاری خوش نصیبی ہوگی۔ یہ بیماری کچھ اور دیر نہ لگے تو بہتر ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے ہی ہی ہی ہی۔"

اس طرح وہ مسلسل باتیں کیے جاتے اور ایلی کی بات پس پشت پڑ جاتی۔

کسی وقت وہ جواب دیتے۔ "ہاں ہاں بھئی آج تو بات ضروری کرنی چاہیے اتنے دن ہو گئے تمہیں آئے ہوئے لیکن بھئی میں تو جا رہا ہوں ڈپٹی صاحب کو ملنے کے لیے۔ انہوں نے بلایا ہے۔ بے چارے بڑا خیال رکھتے ہیں بات بات پر مشورہ کرتے ہیں۔ ان سے مل آؤں میں پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

اس کے بعد دیر تک وہ جوں کے توں بیٹھے رہتے۔ وہ ڈپٹی صاحب کی طرف جاتے ہی نہ تھے اس لیے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور اگر ایلی انہیں یاد دلاتا کہ آپ تو جا رہے تھے ڈپٹی صاحب کی طرف تو وہ ہنس کر کہتے ہاں ہاں بھئی جا رہا ہوں۔ اور پھر بیٹھ رہتے۔ اس طرح ایلی اور ہاجرہ کو وہاں رہتے آٹھ روز ہو گئے۔ اور ان آٹھ روز میں ایلی کو صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔ ایلی طبعی طور پر مزاح اور مزاحیہ صورت حال کو محسوس کرنے سے کورا تھا۔ وہ علی احمد کی

رنگین شخصیت، ان کے انوکھے انداز اور پر کیف انداز گفتگو سے محظوظ نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا اور اپنے مقاصد کے زاویے سے ان کی باتوں پر غور کرتا اس لیے یہ رنگینی اس کی نگاہ میں دنیا داری مکر فریب چالاکی کے مترادف نظر آتی۔ اسے ان کی ہر بات پر غصہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باپ بیٹے کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

مظفر آباد میں ایلی نے مسلسل طور پر کوشش کی کہ جھگڑا نہ ہو اس لیے وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا رہا۔ علی احمد ایلی کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور اکثر جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے تھے جنہیں سن کر وہ اکتا جائے اور جھگڑ کر اٹھ بیٹھے تاکہ انہیں بات سے مخلصی حاصل ہو جائے لیکن ایسے حالات علی احمد ایسے وقت پیدا کرتے تھے جب انہیں بات کی نوعیت کا علم ہوتا اور بات کے متعلق کچھ کرنے کا ان کا اپنا ارادہ نہ ہوتا اس طرح بات کے ٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری ایلی پر عائد ہو جاتی اور علی احمد پر کوئی حرف نہ آتا۔

ان دنوں مظفر آباد میں بھی وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے اس نے ہاجرہ کو بار بار تاکید کی تھی کہ راجو یا شمیم سے بات نہ کرے کیونکہ اکثر مرتبہ ایسے حالات میں وہ راجو اور شمیم کو کہا کرتے بھئی کیا معاملہ ہے کچھ پتہ تو لگاؤ یہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور بات کی نوعیت سمجھ کر وہ یوں ظاہر کرتے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو اور پھر معاملے کی نوعیت کے مطابق عمل کرتے۔ بہر حال نویں روز بصد مشکل بات شروع ہوئی۔

حق و انصاف

"ہوں۔" علی احمد بولے "تو ایلی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔ دال روٹی کما سکتا ہے۔ لہٰذا ضرور کرنی چاہیے اسے شادی۔ اور ایلی کی ماں سنا تھا تم نے تو ایلی کی منگنی کر رکھی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔ بھئی ہم نے تو سنا تھا۔ شاید غلط ہو لیکن سنا ضرور تھا۔ اچھا تو کیا سچ تھا۔" انہوں نے ہاجرہ کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ "بہر صورت بہت اچھا کیا تھا تم نے۔ اور اگر تم اب شادی کرنا چاہتی ہو ایلی کی تو ضرور کرو۔ فوراً" کر دو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھئی جیسے میرا بیٹا ہے ویسے ہی تمہارا ہے میں شادی کروں یا تم کرو باپ کرے یا ماں کرے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اتنی سی بات کے لیے تم دونوں اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو

...سمجھا نہ جانے کیا ہوا ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین ڈوب گئی ہے حد ہو گئی۔ ہی ہی ...ی کیوں راجو۔"

"نہیں نہیں۔" ہاجرہ بولی "ایلی وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا"۔

"وہاں نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں؟" کچھ دیر تک وہ ایلی کی طرف دیکھتے رہے پھر خود بولے۔ خیر خیر یہ تو اپنی طبیعت کی بات ہے لیکن اس سے نہیں تو کسی اور سے سہی محلے میں اتنی ساری بلا ہیں آخر ان کا کرنا کیا ہے اچار ڈالنا ہے کیا۔ وقت پر کام نہ آئیں تو فائدہ کیا ہوا ہی ہی کیوں راجو۔ ہے نا ٹھیک بات۔"

"آپ مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹ لیتے ہیں۔" راجو غصے میں بولی۔

"تو" وہ مسکرائے۔ "خواہ مخواہ بگڑ رہی ہے بھئی تو میری بیوی جو ہوئی۔"

"وہ بھی تو بیوی ہی ہے نا۔" راجو نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ہاں بالکل ہے بے شک وہ بھی بیوی ہے۔ لیکن درمیان میں گھسیٹنے والی نہیں وہ صرف بیوی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔

راجو کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ہاں بھئی تو میں کہہ رہا تھا ایلی کی ماں اتنی لڑکیاں جو پڑی ہیں محلے میں کسی ایک کو پکڑ لو یہ کار خیر سرانجام دے دو اللہ اللہ خیر سلا ہمیں بھی اطلاع کر دینا۔ ایسا نہ کرنا جیسے منگنی پر کیا ہمیں خبر ہی نہ بھیجی۔ اور ہمیں اطلاع کرو گی ایلی کی ماں تو اگر چھٹی ملی تو انشاء اللہ ضرور ہوں گا اور ان دونوں کو تو چاہے آج ہی لے جاؤ" انہوں نے راجو اور شمیم کی طرف اشارہ ...

...لے ہے۔" راجو بولی۔ "محلے میں کونسی لڑکی ہے کام کی۔"

"تو" علی احمد بولے۔ "یہ سمجھتی ہے بس یہی ایک کام کی تھی اور اس کے چلے آنے کے بعد دولت پور میں کوئی کام کی لڑکی باقی نہیں رہی۔"

"آپ میری بات نہ کیا کریں۔" راجو غصے میں بولی۔

"اچھا" علی احمد بولے۔ "سوچ لو۔ شمیم بھی یہی کہا کرتی تھی۔ اور میں نے شمیم کی بات مانی تو اب خود ہی ناراض بیٹھی ہے۔ کہتی ہے مجھ سے بات نہیں کرتے۔"

"بس میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکے کوئی۔" شمیم بولی۔

"اے ہے آپ خواہ مخواہ دوسری بات چھیڑ بیٹھے۔" راجو نے کہا "یہ ایلی کی بات تو
کرو۔ میں کہتی ہوں محلے میں کوئی کام کی لڑکی ہو بھی۔"

"اوہو۔" علی احمد بولے۔ "بابا سب کام کی ہوتیں ہیں۔ چاہے ناک اونچی ہو یا بیٹھی ہو
رنگ گندمی ہو یا سانولا۔ آنکھ موٹی ہو یا چھوٹی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہوں فرق نہیں پڑتا۔" شمیم چلائی۔ "فرق نہیں پڑتا تو خود اتنی شادیاں کرنے کی
ضرورت تھی۔"

"ہائیں۔" وہ ایک ساعت کے لیے رکے۔ پھر ہنسنے لگے "بھئی اتنی شادیاں نہ کرتا تو اس
نکتہ کا پتہ کیسے چلتا۔ اتنی شادیاں کرنے کے بعد تو یہ تجربہ ہوا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایلی کو تو اس بات
کا تجربہ نہیں جبھی اسے بتا رہا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی ———"

"لیکن۔" ہاجرہ بولی "ایلی محلے میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

"ہائیں۔" دفعتاً علی احمد خاموش ہو گئے۔ "محلے میں نہیں کرے گا تو باہر اسے کون لڑکی
دے گا"۔

"کیوں اسے کیا ہے۔" راجو بولی۔

"بھئی آخر باہر والے کسی بات پر لڑکی دیتے ہیں۔ یا دولت ہو یا عہدہ ہو یا پھر ——— نے
خیر۔ نہ یہاں دولت ہے نہ عہدہ۔"

"وہ تو دینے کو تیار ہیں۔" ہاجرہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ ———" علی احمد بولے "کون ہیں وہ؟"

"بڑے اونچے کھاتے پیتے ہیں باعزت خاندان سے ہیں۔ باپ ریاست میں وزیر ہے
بڑے عہدوں پر فائز ہیں لڑکی کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"اوہ ———" علی احمد بھونچکے رہ گئے۔

"بس آپ کی رضامندی اور صرف آشیرباد کی ضرورت ہے۔" ایلی بولا۔

"ہوں ———" علی احمد دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ "تو یہ بات ہے۔"

"آپ کے شامل ہوئے بغیر ———" ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"دیکھو نا ایلی کی ماں" علی احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "ایلی کی شادی کا براہ راست
سے تعلق ہے۔ ایک تو ایلی خود ہے جس نے شادی کرنی ہے اور دوسرے ہم سب تم
یعنی راجو شمیم اور میں جنہوں نے لڑکی کے ساتھ رہنا ہے تو ایلی کی شادی دونوں پارٹیوں
کے مشورے سے ہونی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"کیوں راجو یہ بات حق و انصاف کی ہے یا نہیں۔"

"ہاں ہے تو مناسب" راجو نے جواب دیا۔

"تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے۔" علی احمد نے کہا "یا تو ہم لڑکی کا چناؤ کریں اور ایلی
پسند کرے اور یا یہ کہ ایلی چناؤ کرے اور ہم اسے پسند کریں۔ کیوں راجو۔ ہے ناحق و
انصاف کی بات۔"

"اور اگر آپ چناؤ ہی نہ کریں تو ———" راجو بولی۔

"ہمیں موقع دو نا۔ آج بات کی ہے ایلی کی ماں نے۔ ہمیں چھ مہینے کی مہلت دی جائے چھ
ماہ میں ہم لڑکی کا چناؤ کریں گے۔ اسے آزمائیں گے۔"

"اگر وہ ایلی کو پسند نہ آئی تو۔" شمیم نے کہا۔

"تو پھر موقعہ دیا جائے تاکہ کوئی اور پسند کریں۔ انصاف کی بات ہے نا۔"

"پھر آپ پسند کرتے رہیں ——— حتیٰ کہ ایلی بوڑھا ہو جائے۔" راجو بولی۔ "اچھا تو
دوسری صورت ہے۔" علی احمد بولے "ایلی ہمیں چار یا پانچ لڑکیوں کے نام دے دے جن سے
شادی کرنے کے لیے تیار ہے ان میں سے ہم ایک چن لیں گے۔"

ایلی کہنے لگا چار پانچ نام ———" وہ بولا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

"اچھی لڑکی تو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔" راجو بولی۔

"یہ ایک لڑکی ہے جو بڑی مشکل سے تلاش کی ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔ "ایسی لڑکی کہاں ملتی
ہے آج کل۔"

علی احمد خاموش ہو گئے۔

"آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔" راجو نے کہا۔

"ہاں" ہاجرہ بولی "یہ رشتہ جو ہم نے چنا ہے۔"

"یہ رشتہ ——" علی احمد رک گئے۔"

"ہاں ہاں یہ رشتہ" ہاجرہ نے دہرایا۔

"اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔" راجو بولی۔

"جو جو کچھ بتایا ہے ایلی کی ماں نے اس کے مطابق تو بڑا اچھا رشتہ ہے۔" شمیم نے کہا

"بات کیجئے نا" راجو علی احمد کو خاموش دیکھ کر غصے میں چیخنے لگی۔

"یہ رشتہ مجھے پسند نہیں" علی احمد نے کہا۔

ایلی کا دل ڈوب گیا۔

"لیکن وجہ؟" ہاجرہ غصے میں بولی۔

"وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔" علی احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تو الٹا اچھا ہے۔" راجو دبی زبان سے بولی۔

"میں بہت چھوٹا شخص ہوں۔" علی احمد کہنے لگے "اور میں اعلیٰ اور اونچے خاندانوں رشتہ نہیں کروں گا۔ میں تو اپنے بچوں کا وہاں رشتہ کروں گا جہاں میری ایک حیثیت ہو میری بات کو اہم سمجھا جائے جہاں میری عزت ہو۔ جہاں ——"

"اے ہے وہ تو بڑی عزت کرنے والے لوگ ہیں۔" ہاجرہ بولی۔

"نہیں یہاں نہیں ہو گا۔" علی احمد نے کہا۔ "اگر میری رضامندی کوئی حیثیت رکھتی یہاں نہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھے اور اپنی ڈسک پر بیٹھ کر حساب کے رجسٹر میں لگے مصروف ہو گئے۔

مظفر آباد سے واپسی پر ایلی کے سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی کھڑا تھا اور پانی کے پھیلاؤ میں گاڑی ہونک رہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھیلا ہوا پانی علی احمد کا انکار تھا ہی انکار ہی انکار اور اس پر چاروں طرف اداس آسمان محیط و مسلط۔

گاڑی کراہ رہی تھی۔ ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ ہاجرہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی ایلی کھڑکی سے باہر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

"دور دور" سادی یہ کہتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔ "نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں

معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں میں مجبور ہوں۔" ——

چاروں طرف ٹھہرا ہوا پانی ابھر رہا تھا۔ پانی ہی پانی ہی پانی ہی پانی۔ آسمان پانی میں گر کر ڈوب چکا تھا۔ کہیں کہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً "باہر کوئی چیخنے لگا۔" گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔"

چھ لڑکیاں

علی پور علی پور ——— اس کے کان میں آوازیں پڑیں۔
ایلی چونکا ——— گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس سا ہو۔ جیسے وہاں اسے کچھ کرنا ہو۔ اس نے سامنے دیکھا ہاجرہ سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ سامان اٹھانے لگا باہر پلیٹ فارم پر دھندلکے کا ایک پھیلاؤ تھا۔ اس پھیلاؤ میں گویا لوگ تیر رہے تھے۔ وردی والا بابو ہاتھ میں جھنڈی اٹھائے گھور رہا تھا۔ سر پر بسترے اٹھائے وہ ایک سرخ پوش بہاؤ کو چیرتے ہوئے جا رہے تھے۔

دفعتاً" ایک چہرہ ان کی طرف بڑھا۔ قریب اور قریب اس چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"تم ہو بہن۔" چچا عماد کہہ رہا تھا۔ "تم کہاں گئے ہوئے تھے۔ محلے میں تمہاری ڈھونڈھ مچی ہوئی تھی۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ جلدی پہنچو جلدی ورنہ وہ چلے گئے تو پھر کیا فائدہ۔ میں ذرا موجو والی جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور دھندلکے میں گم ہو گیا۔

ڈھونڈھ مچی ہے۔ ہاجرہ بڑبڑانے لگی۔ ڈھونڈھ کیوں مچی ہے۔ کیوں مچی ہے ڈھونڈھ مچی ہے۔ ڈھونڈھ مچی ہے ——— یکے کے پہیے چیخ رہے تھے۔

جب وہ بازار میں پہنچے تو دور سے حکیم نے انہیں دیکھا اور پھر اشارہ کرنے لگا۔ بہت سے لوگ جھک جھک کر مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دودھ والے کی دوکان پر لوگ ان کے

متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ راجہ پورس ہو۔ اور منہ میں گھاس لئے سکندر کے روبرو اعتراف شکست کرنے جا رہا ہو۔ "مجھ سے ایسا سلوک کرو جیسا بادشاہ شکست خوردہ غلاموں سے کرتے ہیں۔"

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سب کو اس کی شکست کا علم تھا۔ وہ اس کے منہ کے گھاس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی شکست پر خوش تھے۔ لیکن وہ سکندر کون تھا جس کے روبرو پیش ہونے ایلی جا رہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ بہر حال وہ سکندر تھا وہ فاتح تھا وہ اس کا منتظر تھا۔

چوگان میں انہیں ماں دیکھ کر رک گئی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

"ہے تم ہاجرہ۔" وہ چلائی "جو جی کی ماں لو یہ آ گئے۔"

"کون آ گئے۔" ایک کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

"کیا کہا ماں" دوسری چلائی۔

"ہے ہاجرہ تم ہو کیا۔"

"اب کیا ماں بیٹا نیا گل کھلا کر آئے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں بہن پرانے بندھنوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کب تک آگے دوڑ اور پچھلے چھوڑ پر عمل کرو گی۔"

"تو تو ہاجرہ لڑکے کے پیچھے دیوانی ہو گئی۔"

ہاجرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی تعداد ہر ساعت بڑھتی جا رہی تھی کوئی دروازے سے نکل کر رک جاتی کوئی کھڑکی سے سر نکالتی۔ کوئی چھت سے جھانکتی چند ساعت تو ایلی کھڑا حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھاگا اندھا دھند بھاگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے جنگل میں ڈائنوں نے اسے گھیر لیا ہو۔

"ہے تم" رابعہ نے ایلی کو دیکھ کر سینہ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ حیرت سے بت بنی دیکھتی رہی۔

ایلی ڈر گیا ——— نہ جانے کیا بات۔

"لو تم آ گئے" ——— جانو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور اس نے چیخ سی ماری شہزاد کے ہاتھ سے پیالی گر پڑی اور فرش پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے قریب ہی صفدر کھڑا حیرت سے

دیکھ رہا تھا۔ چند قدم پرے بیگم اسے گھور رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے مرجانے کے بعد بدروح کی شکل میں واپس آیا ہو اور وہ سب ڈر اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ دیر تک بات کئے بغیر وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اتنی دیر میں ہاجرہ بھی آپہنچی۔ سب سے پہلے رابعہ بولی۔ "ہے ایک گھنٹہ پہلے آجاتے تو ——"

"اتنے دن تمہاری ڈھونڈھ پڑی رہی۔"

"انتظار میں راہ تکتے رہے۔"

"ہے کتنا ظلم کیا تم نے۔"

"اتنی دیر لگادی تم نے۔"

"آخر ملتان میں کیوں رکے رہے۔"

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ ایلی کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ نہ جانے وہ کس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

پھر رابعہ نے طلسم توڑا۔ "ہے اتنی پیاری ہے وہ کہ کیا بتاؤں۔ اتنی رونق لگا رکھی تھی اس نے وہ تو یوں گھل مل گئی جیسے ہم میں سے ہو اتنی اچھی طبیعت مزاج نہیں بو نہیں خوش طبیعت۔ ہنس مکھ۔ تم تو اتنے خوش قسمت ہو' وہ ایلی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ تو سکندر کا نصیب لے کر آیا ہے۔" شہزاد بولی۔

"ہے اب جلدی کرو جلدی' نیک کام میں دیر نہ کرو۔"

"لو وہ اپنے منہ سے کہتی تھی۔ کہتی تھی میں تو تمہاری ہو گئی اب تم بنالو بات بنے۔"

"توبہ ایسی منہ پھٹ ہونا بھی کیا۔" بیگم نے جل بھن کر کہا۔

ایلی نے غور سے بیگم کی طرف دیکھا۔

"ادھر کیا دیکھتا ہے" شہزاد بولی۔ اماں اور کیا کہے گی۔" وہ ہنسی۔

"اور بہن اتنی خوبصورت اور پھر اتنی اچھی۔"

"یہ تو ساری مرمٹی ہیں اس پر" شہزاد ہنسی۔

"کوئی ایسی بات کرو جو میرے پلے بھی پڑے۔" ہاجرہ بولی۔ "کس کی بات کر رہی ہو۔"

"اے وہ آئے تھے۔" جانو نے کہا۔

"کون آئے تھے۔؟"

"آئے ہے وہی لاہور والے کیا نام ہے اس لڑکی کا۔"

"اے سادی اور کون۔" رابعہ بولی۔

"سادی ——" ایلی کا دل ڈوب گیا۔

"سادی" ہاجرہ نے زیر لب کہا۔ "کہاں آئے تھے۔"

"یہاں یہاں علی پور میں۔ شہزاد کے گھر پورے دو دن رہے۔" رابعہ چلائی۔

"تمہارا انتظار کرتے رہے۔" جانو بولی۔

"وہ اس کی بہن اور اس کی خالہ۔ تینوں۔"

"یہاں آئے تھے؟" ہاجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں یہاں یہاں دو دن یہاں رہے وہ۔ اتنی پیاری ہے وہ سادی اتنی رنگین اور اتنی پیار کرنے والی اور پھر خوبصورت کوئی جواب ہے اس کا" رابعہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

اک دھندلکا

ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ پانی ہی پانی پانی ہی پانی چاروں طرف پانی اس پر ننگا ہوا پھیکا اداس آسمان قریب ہی کوئی چیخ کر بولا "گاڑی آگے نہیں جائے گی ——"

ایلی دیوانہ وار بھاگا —— فرحت کے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے اپنا منہ تکیہ میں ڈبو دیا —— پانی ہی پانی —— تکیہ بھیگ گیا۔ اس نے سر اٹھایا کمرہ نمناک دھندلکے سے بھرا ہوا تھا۔ دور ہاجرہ سہمی ہوئی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی

وہ دھندلکا کئی ایک روز جوں کا توں قائم رہا۔

[illegible] بڑھتی گئی —— پھر مایوسی کے اس تاریک آسمان پر دفعتاً گویا امید کا ایک تارا ایک ساعت کیلئے روشنی کی کرن جھلملائی۔

[illegible] نہیں سادی ضرور کچھ کرے گی وہ گھر والوں پر اثر ڈال سکتی ہے اس کی والدہ اس کا [illegible] گی۔ اور پھر سارے کیرا موزوز غصے میں غرانے کے بعد رو پڑیں گے منصر جوش میں [illegible] دیدہ دلیری پر اسے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے آپ کو پیٹنے اور بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گا اور جوش محبت سے سادی سے بغلگیر ہو جائے گا

اور پھر جب وہ ایلی سے ملے گا تو کہے گا۔ "ایلی صاحب اتفاق سے ——"

لیکن جلد ہی ٹوٹتے تارے کے وہ روشن ذرات بکھر گئے روشنی بجھ گئی اور وہی تاریکی چھا گئی۔

"نہیں نہیں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اس بار میں ضد نہیں کروں گی"۔ سادی چلاتی۔ "خاندانی عزت" وہ طنز سے ہنسی "ان کی مجبوریاں آخر تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں اس معاملے میں مجبور ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ دور ہٹے چلی اور دور اور دور حتیٰ کہ —— جوں جوں وہ دور ہوتی جاتی تاریکی چاروں طرف سے یورش کرتی۔

مظفر آباد سے آنے کے بعد دس پندرہ روز کے لئے تو ایلی بے حد پریشان رہا اس کے دل میں کئی مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ سادی کو ساری بات لکھ دے تاکہ وہ حالات سے واقف رہے۔ پھر اسے خیال آتا کہ یہ بات خط میں لکھنے والی نہیں۔ بلکہ زبانی کرنے والی ہے لہٰذا وہ سوچتا کہ کیسے بات کرے ملنے کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شاید صورت پیدا ہو جائے آخر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو گی ہی۔ لیکن اس کا لاہور جانا ضروری تھا۔ علی پور میں بیٹھے تو صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ سادی کے خط کے انتظار میں تھا۔ خط سے حالات کا کچھ تو علم ہو گا۔ وہ علی پور کیسے آئے تھے کیا چوری آئے تھے یا سب کو علم تھا یا ممکن ہے صرف اماں سے بات کی ہو اور پھر علی پور آنے کے بعد ان کے تاثرات کیا تھے لیکن سادی کا کوئی خط موصول نہ ہو رہا تھا۔ ہر روز ایلی امید لگائے بیٹھ رہتا۔ ڈاکیہ کی آمد کے وقت ہر آہٹ پر اس کے کان بجتے لیکن سادی کا خط موصول نہ ہوا۔ اب مزید انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

گاڑی میں وہ مختلف قسم کے منصوبے بناتا رہا۔

لاہور پہنچتے ہی ایسے وقت سفید منزل جاؤں جبکہ گھر کوئی نہ ہو۔ منصر دفتر گیا ہوا ہو۔ [illegible] کالج میں ہو ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی صورت نہ [illegible] ممکن ہے امان آیا ہوا ہو۔

فرض کیجئے گھر کوئی نہ ہو پھر بھی والدہ تو ہوں گی۔ اور اب شاید وہ سادی کو اس سے [illegible] بلانا پسند نہ کریں۔ بلا بھی لیں تو وہ ان کے سامنے یہ بات کیسے کہے گا۔ بات کی نوبت [illegible]؟

کسی کے روبرو نہیں ہو سکتی۔ باجی کے روبرو بھی نہیں تو پھر —— اگر وہ ایک مرتبہ سفید منزل میں چلا گیا تو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لاہور آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سادی سے ملاقات کی صورت نہ رہے گی اور اگر سفید منزل نہ جائے تو پھر سادی کو کیسے معلوم ہو گا کہ وہ لاہور آیا ہوا ہے —— نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ سادی کو خفیہ پیغام بھیجنا ممکن نہیں۔

ایلی اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ گاڑی لاہور کے سٹیشن میں داخل ہو گئی ایلی گاڑی سے اترا۔

ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دی کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔

جب ایلی نے تیسری مرتبہ دستک دی تو بوڑھا سقہ جو گلی سے گزر رہا تھا ہنس کر بولا "میاں دستک تو دے رہے ہو پر درواجے پر تو تالا پڑا ہے۔"

"تالا ——ا" ایلی نے حیرت سے دہرایا —— دروازے پر واقعی تالا پڑا تھا۔

"لیکن" وہ چلایا "یہ لوگ کہاں ہیں۔"

"میاں کہیں گئے ہوں گے۔" سقہ نے کہا۔

دیر تک ایلی وہیں کھڑا رہا کہ کسی سے پوچھے لیکن کوئی ادھر سے نہ گزرا۔ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھنے کی اس میں جرات نہ تھی ——

شام کو وہ منصر کے دفتر میں پہنچا لیکن وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ "ارے" وہ حیرانی سے چلایا "یہاں بھی تالا" سامنے دوکان پر جا کر اس نے پنواڑی سے پوچھا۔

"کیوں بھئی یہ دفتر نہیں کھلے گا آج۔؟"

"یہ دفتر" پنواڑی بولا۔ "یہ دفتر تو بند ہو گیا بابو جی۔"

"بند ہو گیا۔"

"جی آٹھ روج ہوئے بند ہوئے اسے۔"

"کیا کسی اور جگہ چلا گیا۔"

"یہ تو مالم نہیں بابو۔"

دوکاندار کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو ایک آہنی دیوار آ کھڑی ہو۔

ہوٹل میں پہنچ کر ساری رات وہ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے دریافت کرے لڑکے دوستوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ موتی دروازے کے ایک محلے

میں ان کے رشتہ دار رہتے تھے جہاں رانا کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اسے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا لیکن آخر وہاں جاکر وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے کس سے پوچھے اور اگر انہوں نے پوچھا میاں تم کون ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا ——— ڈاکٹر' وہی ڈاکٹر جس نے دوپٹے کی چوری کے موقع پر اسے تسلی دی تھی۔ "مجھے سب معلوم ہے گھبراؤ نہیں۔"

صبح سویرے ہی ڈاکٹر کے مکان پر جا پہنچا۔

"معاف کیجئے۔" وہ بولا "آپ کو تکلیف دی۔"

ڈاکٹر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا "کیوں کیا پھر دوپٹہ چرانے کا ارادہ ہے۔"

"جی نہیں" ایلی مسکرایا۔

"لیکن اب تو دوپٹہ چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔"

"چلے گئے۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

"انہوں نے یہ مکان بیچ دیا۔ منصر صاحب نے دفتر میں استعفےٰ دے دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے ہیں ———

"ہمیشہ کیلئے۔؟" ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"منصر صاحب کے والد کسی ریاست میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "اس لئے غالباً" انہوں نے سب کو وہیں بلا لیا ہے۔"

"لیکن ———" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے تھپکنا شروع کر دیا "میرے نوجوان دوست زندگی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان دکھ محسوس کرتا ہے یہ عمر ہی ایسی ہے پھر آہستہ آہستہ ———" وہ مسکرایا "سب ٹھیک ہو جائے گا وقت لاجواب مرہم ہے۔ چائے پئیں گے آپ۔"

"شکریہ۔" ایلی گنگنایا اور گردن لٹکا کر چل پڑا۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے سلام علیکم کئے بغیر شکریہ ادا کئے بغیر چل پڑا تھا۔ اس کے روبرو ایک خوفناک دھندلکا پھیلا ہوا تھا تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ مناظر اپنا مفہوم کھو چکے تھے آوازیں محض شور و غل میں تبدیلی ہو چکی تھیں۔ لاہور ملبے کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا اس کے روبرو تاؤ گھر تھا۔ لیکن

...گویا ریت میں دھنسا ہوا تھا۔۔ ریت ریت ریت۔ نمناک دھندلکا اور ریت!! ———

...الد صاحب

...سادی کے یوں اطلاع دیئے بغیر چلے جانے پر ایلی غم نہیں بلکہ حیرت محسوس کر رہا تھا کم از ...اسے اطلاع تو دی ہوتی۔ سادی کو اس کے گھر کے لوگ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ...ئی ہے گھر والوں نے چالاکی سے اسے بہلا پھسلا کر رضا مند کر لیا ہو اور وہ دھوکے میں آگئی ہو ...ید منصر نے جان بوجھ کر نوکری سے استعفےٰ دے دیا ہو تاکہ ان کے لاہور میں رہنے کا جواز نہ ...ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہو کہ ایلی سے سادی کا جذباتی تعلق ٹوٹ جائے۔ نہ بھی ...لے تو اس میں شدت نہ رہے۔ دوری اور وقت مل کر اس کی توجہ کو کسی اور طرف منعطف ...رنے میں ممد ثابت ہوں۔

جب اسے یہ خیال آتا تو دکھ محسوس ہوتا۔ دراصل ایلی کو منصر سے محبت ہو چکی تھی۔ منصر ...ن کا آئیڈیل بن چکا تھا۔ اور منصر کی حیثیت سے ایلی کے ذہن میں اگر سادی سے زیادہ نہ تھی تو ...ی صورت میں اس سے کم بھی نہ تھی۔

منصر کا وہ حسن اس کا بانکپن رنگینیٔ طبع اس کی خودداری اور اس کے علاوہ منصر کی ...نیت سے خلوص بھری محبت کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ایسی شعاعیں جو ...تی نہیں بلکہ محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے بلا کی سردی میں کوئی انجانی انگیٹھی کے پاس جا بیٹھا ہو۔

ایلی کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ درپردہ منصر سے محبت رچا بیٹھا تھا حالانکہ سادی نے کئی بار خطوں کے ذریعے اور زبانی اسے خبردار کیا تھا۔ "دیکھنا یہ نہ بھولنا کہ یہ سب لوگ ...ف میری وجہ سے ——— آپ سے التفات محسوس کرتے ہیں۔ صرف میری وجہ سے ورنہ ...ا اگر میں چلے تو ———" سادی کی تنبیہ کے باوجود ایلی منصر کا ہو چکا تھا۔ وہ منصر کی ہدایات پر ...تو نہیں کرتا تھا لیکن ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

"نہیں نہیں" وہ آپ ہی چلایا "منصر ایسا نہیں کر سکتا۔ منصر اسے دھوکا نہیں دے گا۔ ...ضرور کوئی مجبوری پیش آگئی ہوگی کہ انہیں لاہور کو خیرباد کہنا پڑا ورنہ منصر ——— اگر قطع تعلق ...ی مقصود ہوتا تو وہ اعلانیہ کہہ دیتا۔ "ایلی صاحب اگر آپ سادی کے راستے سے ہٹ جائیں تو ...میں بے حد ممنون ہوں گا۔ پھر ایسی چال چلنے کا فائدہ۔ نہیں نہیں منصر ایسا نہیں کر سکتا۔"

کئی ایک روز ایلی اس سلسلے پر سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ مگر زیادہ سوچنے سے بات اور بھی پیچیدہ ہو گئی حتیٰ کہ وہ الجھ کر رہ گیا۔

پھر سادی کا خط موصول ہوا۔ لکھا ہوا تھا "بھائی جان کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی —— بھائی جان کے لئے اس کے سوا اور چارہ کار نہ تھا کہ لاہور چھوڑ کر یہاں ریاست گرد کل میں جائیں مجھے بھائی جان سے محبت ہے۔ آپ جلتے ہیں تو پڑے جلئے۔ میں بھائی جان کیلئے سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے۔

لیکن گھبرائیے نہیں ہمارے یہاں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اپنے والد صاحب سے بات کر کے ان کے ہاتھ پیغام بھیجنے میں سستی نہ کریں چونکہ میرے والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور ابا کے سامنے اپنی دال نہیں گلتی لہٰذا یہ کام تو آپ کو کرنا ہو گا۔

"یہاں کب آئیں گے آپ کی منتظر رہوں گی۔ منتظر ہوں۔"

سادی کا خط پڑھ کر ایلی کو خوشی کی بجائے الٹا غم ہوا اور وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

"والد صاحب" وہ زیر لب بولا "بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ والد ——— اونہہ" ایلی کا جی چاہتا تھا کہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور دیوانہ وار چلائے "والد صاحب ہاہاہاہا"

"والد صاحب۔ والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ ہاہاہا۔"

"والد صاحب۔ والد صاحب کے سامنے ہماری دال نہیں گلتی۔ ہی ہی ہی۔"

"والد صاحب سے کون بات کرے۔ اور کی بھی جائے تو کسی احسن طریق سے کی جائے والد صاحب کی رضامندی ضروری ہے۔ انہیں خود پیغام لانا چاہئے۔"

"نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ——— میں چاہتا ہوں کہ بچوں کا رشتہ ایسے گھرانوں میں ہو جہاں میری حیثیت ہو۔ میری عزت ہو۔ میری آؤ بھگت ہو۔ میری عزت ——— ہاہاہاہا ——— والد صاحب۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ دیوانہ وار باہر نکل جائے اور لوگوں کو اپنا پیغام سنائے "تمہارے بھی والد صاحب ہیں کوئی۔ ان سے بچو۔ والد صاحب سے بچ کر رہو۔ ان سے دور رہو۔ وہ ایک جاگتی لعنت ہیں۔ بدقسمتی ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ جھوٹ ہے ان کی خاندانی عظمت فریب ہے والد صاحب ایک بہروپیہ ہیں جو فریب سے گھر کی گدی پر آبیٹھتے ہیں۔ والدہ محترمہ نے اگر انھیں

سر چڑھا رکھا ہے تو کسی ذاتی غرض کی وجہ سے ——— والدہ محترمہ نے اپنی آسانی کے لئے انھیں بت بنا رکھا ہے توڑ دو ان بتوں کو توڑ دو۔"

بچپن ہی سے ایلی کو اپنے باپ سے بیر تھا۔ اسے علی احمد کو دیکھتے ہی غصہ آجاتا تھا۔ باپ کی وجہ سے ہی وہ والدین کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نوکرانی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ سے اسے سستی اور کمینی عورتوں کے لئے چلچلاتی دھوپ میں بوتل میں رہٹ سے پانی بھرنا پڑا تھا۔ باپ کی وجہ سے محلے والیاں کہا کرتی تھیں "بہن آخر بیٹا کس کا ہے اپنے باپ کے قدموں پر چلے گا اور کیا وہ بھی گودی میں پلا تھا۔ یہ بھی گودی میں پل رہا ہے"

اور والد صاحب ہی کی وجہ سے آج ایلی کے ہاتھ سے سکون اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے کا موقعہ ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔ اگر سادی چھن گئی۔ اگر اس کی پناہ گاہ ہاتھ سے جاتی رہی تو ——— تو ———" ایلی نے دانت بھینچ لئے تو ——— تو میں گندی بدرو میں چھلانگ لگا دوں گا۔ میں اپنا آپ کتوں کو کھلا دوں گا۔ میں اپنے تعفن کو چاروں طرف پھیلا دوں گا۔ میں بھی گود میں پلوں گا۔ میرے کمرے میں بھی ٹین کا سپاہی برسرپیکار رہے گا ——— والد صاحب زندہ باد پائندہ باد

برہنہ نگاہ

پھر جو ایلی کو ہوش آیا تو اس کے سامنے ہاجرہ اور فرحت سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

"کیوں ایلی" ہاجرہ کہہ رہی تھی "خیر تو ہے۔"

"خیر ———" اسے بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"تجھے کیا ہوا ہے ایلی" فرحت پوچھ رہی تھی۔

"مجھے ———" وہ بولا "کیوں؟"

"تیری چیخیں تو سارے محلے میں سنائی دے رہی تھیں بیٹا۔"

"چیخیں ———" اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہ بیٹا" ہاجرہ قریب آکر بولی "خود کو اختیار میں رکھا کرتے ہیں۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔"

"وہ تو خیر نہ جانے کب نکلے گی۔ لیکن جو صورت نکلی ہوئی ہے اسے تو دیکھو ذرا" شہزاد

داخل ہو کر بولی۔

"کیا نکلی ہوئی ہے۔؟" ہاجرہ نے کہا۔

"یہ" شہزاد نے بڑھ کر ایلی کی ٹھوڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

"اب تو تو بھی نہیں آتی۔" فرحت بولی "آج نہ جانے کتنی دیر کے بعد شکل دکھائی ہے۔"

"میری شکل ——" وہ ہنسی "میری شکل دیکھ کر پہلے تم کب خوش ہوا کرتی تھیں مزہ ایک ایلی تھا اور اب اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی —— کیوں ایلی" وہ چلائی۔

"اپنی سدھ بدھ پہلے کب تھی۔" ایلی نے اسے چھیڑا۔

"اچھا" اس نے منہ پکا کر کے جواب دیا "میں سمجھی پہلے تھی۔"

"اگر سمجھ لیتی تو بات نہ بگڑتی۔" ایلی نے کہا۔

"تت تت —— تم نے ہی سمجھا دیا ہوتا" وہ ہنسی "چل تجھے چائے پلاؤں۔ یہاں اکیلا بیٹھا رہتا ہے فضول چل۔" شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔

ایک ساعت کے لئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ سب کے روبرو شہزاد کو اپنے بازوؤں میں جکڑ اور اس کا بند بند چومنا شروع کر دے اور پھر چلا کر کہے: "چل اگر یہی ہے تو یہی سہی"۔

اس نے شہزاد پر ایک برہنہ نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھا۔

شہزاد بھانپ گئی اور پھدک کر پیچھے ہٹی اور پھر بھاگی۔ "آؤ نا پھر"۔ وہ چلائی۔ "جلدی آؤ۔" ایلی بھاگا۔

اس وقت نہ جانے ایلی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت گویا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ جیسے کوئی اور روح اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ ہاجرہ اور فرحت کھڑی دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھول چکا تھا کہ شہزاد شریف کی بیاہتا بیوی ہے وہ بھول چکا تھا کہ اسے سادی سے محبت ہے۔ اپنا آپ بھول چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی فرد یا اصول کا لحاظ نہ تھا۔ وہ ننگا تھا۔ شرم و حیاء سے قطعی طور پر بے گانہ۔ اسے صرف ایک خواہش تھی۔ کہ اعلانیہ اپنے آپ کو کنوئیں میں پھینک دے اور پھر بھینس کی غلاظت میں لت پت ہو جائے۔ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا کہ سب کے روبرو اپنی تذلیل کرے۔ سب کے روبرو کسی کی تذلیل کرے۔

شہزاد نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ یا شاید ایلی کی

خواہش شہزاد پر بھی اثر کر چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ ڈر نہیں بلکہ کسی اور جذبے سے بھیانک ہو رہا تھا ممکن ہے دونوں ہی باتیں درست ہوں اور ایلی کے قرب سے خائف تھی اور اس کی آرزو کر رہی تھی۔

اگر اس وقت سیڑھیوں میں ایلی کا پاؤں نہ پھسلتا اور وہ دھڑام سے نہ گرتا تو اس کی زندگی کا واقعات کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑتا حالات نئی کروٹ لیتے۔ لیکن گرتے ہی اس کی توجہ چوٹ کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ شہزاد اس پر جھکی ہوئی ہے اور اسے اسی برہنہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد ایلی چارپائی پر پڑا ہوا تھا دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس وقت اسے کیا ہو گیا تھا نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ عجیب سی وحشت تھی عجیب سی اس وقت اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے شہزاد شہد کا چھتہ ہو اور وہ خود ریچھ۔ کتنے خطرناک عزائم لئے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور شہزاد نے جب مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ میں کس قدر خوف تھا —— لیکن اس خوف میں لذت کی جھلک تھی وحشت بھری لذت اور پھر وہ نگاہ جو شہزاد نے اس پر ڈالی تھی جب وہ گر پڑا تھا۔ کیا شہزاد خواہش کے مجذوبانہ اظہار کو پسند کرتی تھی لیکن وہ تخلیے میں بھی خواہش کے اظہار سے گھبراتی تھی وہ تو آرزو کی ہلکی پھلکی کی دلدادہ تھی۔ موسلا دھار بوچھاڑ کو وہ کیسے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت —— ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کیا سبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں آرزو کے ہلکے سے اظہار کو ناپسند کرتی ہیں۔ برا مانتی ہیں۔ لیکن مجنونانہ وحشت بھری خواہش کے اعلانیہ اظہار کے روبرو انکار رکھ رکھاؤ احتیاط ضبط سب اتھل پتھل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں فخر بھری انبساط جھلکتی ہے اور ایک ساعت کے لئے وہ تمام دنیا اور پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

ایلی نے کئی ایک مرتبہ دیکھا تھا کہ وہ شہزاد جو خواہش کے عملی اظہار سے ڈرتی تھی۔ اور تخلیے میں بھی اس سے بچنے کی کوشش کیا کرتی وحشت بھرے اعلانیہ اظہار پر اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی جیسے سانپ کو دیکھ کر چوہیا مبہوت ہو کر بے حس ہو جاتی ہے اور پھر اس عالم میں شہزاد کو بھول جاتا کہ وہ شریف کی بیوی ہے چار بچوں کی ماں ہے اور —— گویا سب کچھ بھول جاتا تھا اور وہ بے پروا بے خوف ہو کر میدان میں آ کھڑی ہوتی دعوت دیتی کہ وہ وحشت طوفان بن کر چلے لیکن ایسے مواقع پر ایلی گھبرا جاتا تھا۔ اور قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہ دیکھ

کر شہزاد کے انداز میں ہلکی سی تحقیر جھلکتی جیسے کہہ رہی ہو۔ بس اتنی ہی جرات تھی۔ سادی نے
ایلی کو صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ جرات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً جب ایلی
نے ضد سے سادی کا سلگا ہوا سگرٹ حاصل کیا تھا۔ دوپٹہ چھینا تھا اور اس رات جب وہ بھاگ
کے بعد سفید منزل میں لوٹ آیا تھا۔ سادی کتنی عظیم شخصیت تھی اس کی وہ بے نیازی وہ نمی
وہ رنگینی ـــــ ایلی نے آہ بھری ـــــ نہ جانے کیوں رات کے اندھیرے میں تن تنہا سادی
کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس نے کبھی خواہش محسوس نہ کی تھی وحشت اور محبوبانہ
اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ـــــ سادی کے متعلق سوچتا تو ایلی کا دل بیٹھ جاتا۔ اسے دکھ
ہوتا اور اس کی توجہ پھر والد صاحب کی طرف مبذول ہو جاتی۔ اس پر ایک اور قسم کا جنون سوار
ہو جاتا اور پھر وہ چاہتا کسی اور طرف توجہ مبذول کرے اور یوں اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔ لیکن
اس کی توجہ مبذول نہ ہوتی اور وہی دیوانہ پن اس پر مسلط ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ ساری
دنیا سے انتقام لے۔ اپنے آپ کو تباہ کر دے۔ کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دے اور بھینس
کی طرح غلاظت میں لت پت ہو جائے ـــــ اس وقت شہزاد مڑ کر ایلی کی طرف دیکھتی اس کی
آنکھوں میں وحشت بھرا خوف جھلکتا جو دفعتاً" وحشت بھری لذت میں بدل جاتا ـــــ اور وہ
گرے ہوئے ایلی کی طرف بڑھتی ـــــ اس کے کپڑے تار تار ہو جاتے۔ دھجیاں ہوا میں
اڑتیں۔ شہزاد کے بلوری جسم سے گلابی شعاعیں نکلتیں اور قریب اور قریب۔ اور قریب پہنچنے
اور رنگ کی ایک بوچھاڑ پڑتی اور وہ لت پت ہو جاتا۔

ایلی کے دل میں ایک پوشیدہ خوفناک عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت سے وہ خود بھی
واقف نہ تھا۔

جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک روز سوچے سمجھے بغیر وہ ہاجرہ سے کہنے لگا۔

"اماں میں امرتسر جاؤں گا۔"

"امرتسر ـــــ" ہاجرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ "امرتسر کون ہے۔" وہ بولی
"کس کے پاس جاؤ گے۔؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک نوکری ہے۔"

"نوکری" ہاجرہ نے سینہ تھام لیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "ہے تجھے نوکری مل جائے تو
کتنا اچھا ہو۔ تیرا خیال بٹ جائے۔ شغل میں لگ جائے اور ہمیں چار پیسے مل جائیں۔ اتنا

"نوکری" فرحت مسکرائی۔ "نوکری گھر بیٹھے تو نہیں ملتی انسان تلاش کرتا ہے جوتے
گھسا تو نہیں ملتی ہے۔ لیکن یہ تو اور باتوں میں کھویا بیٹھا ہے۔"

"اب تو چھوڑ اس بات کو۔" ہاجرہ بولی "اللہ کرے امرتسر نوکری مل جائے۔"

"لیکن دور ملے تو اچھا ہے" فرحت نے کہا "امرتسر سے تو روز ہی آ جائے گا۔ یہ نوکری مل
بھی گئی تو چلے گی نہیں۔

ایلی نے امرتسر جانے کی تجویز نہ سوچی تھی۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ امرتسر جائے گا۔ اور
یہ بات تو ایلی نے ویسے ہی چلا دی تھی۔ ساری بات ہی عجیب تھی۔ اسے ابھی تک معلوم
نہ تھا کہ امرتسر جا کر کرے گا کیا۔ کہاں ٹھہرے گا۔ کدھر جائے گا بات اس کے منہ سے یوں ہی
نکل گئی تھی جیسے میز پر پڑا پستول آپ ہی آپ چل جائے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اسے اس
بات پر تعجب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر امرتسر کیوں۔ جانا ہی تھا تو لاہور جاتا۔ لیکن لاہور اب
ایلی کے لئے خوش کن جگہ نہ رہی تھی۔ لاہور سے بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں جو اس کے
لئے باعث تکلیف تھیں۔

امرتسر پہنچ کر بھی اسے شعوری طور پر احساس نہ ہوا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ بہر صورت
مطمئن انداز سے آوارہ گھومتا رہا۔ ہال بازار میں چار ایک چکر کاٹنے کے بعد وہ کمپنی باغ میں جا
بیٹھا۔ دیر تک وہ بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا پھر آموں والی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

آموں والی کوٹھی ویران پڑی تھی۔ دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں دو ایک کمروں کی چھتیں
بھی گری ہوئی تھیں۔ صحن میں گھاس پھوس اگی ہوئی تھی۔

سڑک کے کنارے وہ ایک ٹوٹے ہوئے پل پر بیٹھ گیا۔ پرانی یادیں ایک ایک کرکے اس کے
ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔

رسوئی میں رسوئیہ اور چھوکرے چل پھر رہے تھے۔ رسوئیہ کھیر پکانے میں مصروف تھا۔
دودھ کی گاگریں قطار میں پڑی تھیں۔ سکھ لڑکے کیس سکھا رہے تھے۔ بنگالی بابو سپرنٹنڈنٹ کے
کمرے سے مچھلی تلنے کی بو آ رہی تھی ـــــ پھر دفعتاً" آصف آ گیا وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا
"تم یہاں بیٹھے ہو" وہ زیر لب گنگنایا "نور آئے گا ـــــ نور ـــــ" نور کا نام سنتے ہی گویا
گلشن میں بہار آ گئی۔ آموں پر بور آ گیا۔ کوئل کوکنے لگی۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔

آصف جا چکا تھا۔ نور کا کچھ پتہ نہ تھا آموں والی کوٹھی پر وحشت برس رہی تھی۔ گھبرا کر وہ
چل پڑا۔

گھومتے گھومتے شام کے وقت وہ کٹڑا رنگین میں جا پہنچا۔ بیٹھکوں میں بجلی کے ہنڈے جل
رہے تھے جنگلوں میں زرق برق ملبوات چمک رہے تھے روغنی چہروں پر وہی مسکراہٹ وہی رنگ
وہی دعوت۔ چوباروں میں سارنگیاں التجائیں کر رہی تھیں۔ طبلے سر پیٹ رہے تھے۔ پان کی
دوکانوں پر ویسے ہی جھرمٹ لگے ہوئے تھے لوگوں کی نگاہیں چوباروں پر جمی ہوئی تھیں۔

شادی

دفعتاً" دھڑ رڑاڑام ——— کی آواز سنائی دی۔ کٹڑا رنگین میں سب لوگ چونکے۔ اس
چوبارے کے زینے سے جس کے نیچے ایلی کھڑا تھا ایک بڑا سا گیند لڑھکتا ہوا گرا اور سڑک کے
درمیان ڈھیر ہو گیا۔ پھر جو ایلی نے غور سے دیکھا تو گیند گویا پھٹ گیا اور اس میں سے ٹانگیں اور
بازو نکل کر سڑک پر بکھر گئے۔

یہ دیکھ کر کٹڑے میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاہاہاہا ———" سبھی لوگ ہنس رہے تھے کوئی امداد کے لئے آگے نہ بڑھا۔

"ارے" ایک بولا "بھئی اب کی بار تو بڑا صبر کیا سائیں نے۔ دس بارہ دن کے بعد جوتی آئی
ہے۔"

"بیچارہ کیا کرے رہا بھی نہیں جاتا بن دیکھے شادی کو۔"

"میاں عشق ہے مجاک نہیں ہے۔"

"ہاں بھئی عشق میں تو ہڈیاں ٹوٹتی ہیں سو تڑوا رہا ہے۔"

"اور وہ شادی اسے مالم ہی نہیں۔"

"کیسے ہو میاں اس کے دروجے پر تو لکھ پتیوں کی اے لمبی کاریں کھڑی رہیں ہیں۔"

"کیا نام پایا ہے بھئی اس شادی نے۔ ہر کوئی مرتا ہے اس پر کٹڑے کی رانی ہے رانی ایسی
سمجھو کل ہی نتھ کھلوائی تھی اس نے اور آج"۔

شادی ——— ایلی کے ذہن میں ایک کرن سی چمکی ——— "شادی" ——— اس کے

...شادی کو جانتا ہو۔
...کیا جیسے وہ ... دبلی پتلی مریل سی مگر اونچی لمبی زرد رو لڑکی اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی
...لیک اتنی بڑی نتھ والی مریل سی ... اس نے تیم کی گٹھڑی اس کی طرف دھکیلی ریشمی ملبوسات
...ہو اپنی بنو کو۔" وہ بولی ——— اس نے تیم کی گٹھڑی اس کی طرف دھکیلی ریشمی ملبوسات
...اور ایک یہاں سے وہاں تک لمبی چوٹی لٹک رہی تھی۔ "چھوڑ بھی شادی تیم نے چڑ کر کہا۔"
...سائیں" ——— ایلی نے سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے زیر لب کہا اس نے محسوس کیا
...وہ خود بھی ایک سائیں ہو سائیں۔ اب بصد مشکل اپنا آپ سمیٹ رہا تھا۔ اس کی ناک اور
...سے خون بہہ رہا تھا مگر اس کی نگاہیں شادی کے چوبارے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ گھسیٹتا ہوا
...کے چوبارے کے زینے کی طرف بڑھا اور زینے کے ساتھ بازار میں تختے پر سر رکھ کر بیٹھ
...دفعتاً" ایلی کو خیال آیا۔ کیا شادی عورت نہیں کیا وہ محض طائفہ ہے کہ اسے سائیں کی
...پر ترس نہیں آتا۔ کیا کٹڑے کی وہ تمام حسین و جمیل پتلیاں سب طوائف ہیں ———
...نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ عورتیں ہیں۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں عورت چھپی بیٹھی
...وہ لاکھ پتی جن کی موٹریں چوباروں تلے کھڑی ہیں اور وہ تماشبین جو کٹڑے میں آتے
...وہ تو طائفہ کے پاس آتے ہیں گھر کی عورتیں چھوڑ کر آتے ہیں۔ عورت سے فرار ہو کر
...نے ہیں ——— ہوں جبھی طائفہ عورت کو چھپا لیتی ہے اور طوائفہ کا روپ دھار لیتی ہے لیکن
...کی اپنی تسکین تو اس چھپی ہوئی عورت میں مضمر ہے۔

دفعتاً" ایلی کے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہوئی۔ ——— کہ وہ جا کر شادی سے ملے
...اسے پوچھے کہ تمہاری عورت کہاں ہے اور تمہیں اپنی اصلیت کو تیاگنے میں کتنی تکلیف
...ہوتی ہے اور تم کتنی دکھی ہو اور تمہاری زندگی اتنا بڑا المیہ ہے تو پھر تم طائفہ کیوں ہو ———؟
اور اگر اس نے ایلی کو سائیں کی طرح سیڑھیوں سے لڑھکا دیا تو ——— اگر وہ چھپی ہوئی
...عورت کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اونہوں ایلی مسکرا دیا۔ اس نے اگر اس کو چنداں
...اہمیت نہ دی جیسے یہ اگر بعید از قیاس ہو جیسے ایسا ہو ہی نہ سکتا ہو۔ میں کیا اس کا عاشق ہوں جو
...مجھے سیڑھیوں سے لڑھکا دے گی ——— لیکن شاید اتنے سارے لکھ پتی تماش بینوں کے روبرو وہ
...بات کرنے پر مجبور ہو۔ اونہوں ——— بے کار ہے جمگھٹ میں ملاقات کیسی ——— وہ چل پڑا۔
لیکن ہجوم کی بات سن کر پھر رک گیا۔

"ارے کہہ جو دیا آج شادی کی طبیعت اچھی نہیں جبھی تو دیکھ لو دروازے پر کوئی موٹر نہیں

ورنہ شادی کا چوبارہ ہو اور موٹروں سے خالی ہو۔“ پنواڑی ہنسنے لگا اور پھر ایلی کی طرف متوجہ ہو کر بولا ”اے بابو جی اگر جو کسی کو غش نہ آئے تو پھر دس سے کیا سلوخ کیا جائے۔“ ایلی مسکرا دیا۔

”اسے سمجھا رہا ہوں کہ بھائی میرے دو روج سے شادی کی طبیعت اچھی نہیں اس لئے پانسو بچپن کے سگرٹ کے ڈبے آج نہیں بکیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسا۔

”طبیعت خراب ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”یہی تو میں کہہ رہا تھا بابو جی۔“

”اجی نہیں بابو جی بڑی ضد والی ہے طبیعت اچھی نہ ہو تو گاہک سے نہیں ملتی۔“

یہ سن کر ایلی کو سوجھی پھر وہ اس چوبارے کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاں پہلے تیم اور نیم رہتی تھی۔ اور اب خالی پڑا تھا۔ دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر جو اس نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک ہی چوبارہ تھا۔ سامنے الماس کھڑی ہنس رہی تھی۔ ”آ جاؤ“ وہ بولی ”تم تو میرے ہم نام ہو الیاس اور الماس میں کیا فرق ہے۔ میں الماس ہوں بائی نہیں چند روز الماس بن کر جی لوں پھر تو“ وہ آہ بھر کر بولی ”بائی بن کر جانا ہی پڑے گا کیوں حنی“ وہ آغا کے بھائی سے پوچھنے لگی ”جانا ہی پڑے گا نا۔“ ——— میرے ایسے نصیب کہاں کہ ہمیشہ کے لئے الماس بن کر تیرے قدموں میں پڑی رہوں“

دفعتاً“ الماس کا چہرہ بدل گیا اور ایک اتنی بڑی نتھ والی لڑکی اس کی جگہ آ کھڑی ہوئی اس نے آہ بھری۔

”شادی بن کر جینا میرے نصیب کہاں۔ تم دیکھتے کیا ہو“ وہ بولی ”شادی گھر پر ہی ہے۔ اس کی طبیعت اچھی نہیں ———“

پھر وہ شادی کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جیسے واقعی شادی نے اسے بلایا ہو۔ کمرے میں ایک موٹے سے میراثی کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رک گیا۔

پیغام بر

”کون ہے“ میراثی نے فرعون بن کر پوچھا۔ ایلی چپکے سے دبکا کھڑا رہا۔ پھر میراثی اٹھ کر زینے کی طرف آیا۔ ”کون ہے“ وہ چلایا۔

”میں ہوں۔“

”تم کون؟“ میراثی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

ایلی خاموش رہا۔ ایلی کا جی چاہا کہ دوڑ کر واپس زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔

”مجھے“ وہ بولا ”مجھے شادی کو پیغام ——— میں پیغام لایا ہوں۔“

”کون ہے“ اندر سے بڑھیا کی آواز آئی۔

”کہتا ہے پیغام لایا ہوں۔“ میراثی بولا۔

”کس کی طرف سے ہے۔“ بڑھیا بولی۔

”اسے آنے دو۔“ ایک نوجوان لڑکی کی آواز آئی۔

میراثی چل پڑا ایلی چپکے سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میراثی رک گیا۔

شادی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی ——— ”آ جاؤ“ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔ میراثی چلا گیا۔

ایلی بات کرنے کے لئے منہ سنوار رہا تھا کہ بڑھیا آ گئی۔

”کہاں سے آئے ہو۔“ وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

”ریاست سے آیا ہوں“ ایلی نے جواب دیا۔

”ریاست سے۔“ بڑھیا چلائی۔

ایلی نے سر ہلا دیا۔

”کس نے بھیجا ہے کیا۔“

”ہاں۔“

”کس نے۔“

”پیغام لایا ہوں۔“

”کس کا۔“

”اے بیٹھ کر ذرا دم تو لینے دو اسے۔“ شادی نے کہا ”تم جاؤ اماں۔“

بڑھیا دو ایک ساعت کے لئے کھڑی رہی پھر میراثی کے بلانے پر چلی گئی۔

”بیٹھ جا“ شادی نے کہا۔

پائنتی کے قریب بڑے صوفے میں ایلی بیٹھ گیا۔

اس کے روبرو ایک میار حسین عورت لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار
بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض ڈھیلی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں۔
"نہیں نہیں یہ وہ شادی نہیں۔" ایلی نے سوچا "وہ نتھ والی شادی چار سال میں [illegible]
ہو جائے ——— نہیں نہیں یہ کوئی اور شادی ہے۔"
"پیغام لائے ہو" شادی نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔
"نہیں" ایلی نے جواب دیا۔
"نہیں۔" شادی چونک کر اٹھ بیٹھی۔
"اور تم تو کہتے تھے پیغام لایا ہوں۔"
"جھوٹ بول رہا تھا۔"
"ہائیں" اس نے آنکھیں گھمائیں۔ "سچ"
ایلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"جھوٹ کیوں بولا۔"
"نہ بولتا تو مجھے آنے نہ دیتے۔"
"کیا آنا اتنا ہی ضروری تھا۔"
"اس سے بھی زیادہ۔"
"اوہ ——— اچھا" وہ قریب تر ہو گئی۔
ایلی نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

دو بچے

شادی نے آنکھوں سے اثبات کا اظہار کیا۔ اس وقت بائی یوں مسکرا رہی تھی۔ جیسے دو
اکٹھے مل کر شرارت سوچ رہے ہوں۔
"چار سال پہلے" ایلی نے کہا "تو مجھ سے ملی تھی۔"
"سچ۔"
"ہاں اتنی بڑی نتھ تھی تیرے ناک میں ——— دبلی پتلی تھی تو۔"
"اور ملی کیوں تھی۔"

[illegible] نے ایک ریشمی گٹھڑی مجھے دی تھی۔"
"گٹھڑی"
"ہاں"
"[illegible] نے تو کبھی کپڑے نہیں بیچے۔" وہ ہنسی۔
"گٹھڑی بزازی کی نہیں تھی۔ اس پر اتنی لمبی چوٹی تھی۔ اور تو نے وہ گٹھڑی میری طرف
پھینکی تھی اور تیرے ساتھ بہت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ اس چوبارے کی نچلی منزل میں چاروں
[illegible] لالٹین تھے اور صحن کے درمیان میری سائیکل تھی۔"
"ہائے اللہ" وہ چونکی "اچھا وہ تسلیم کے گھر مجھے یاد آیا۔"
"تم وہی شادی ہو کیا۔"
"ہاں"
"جھوٹ۔"
"کیوں۔"
"نہیں ——— کہاں وہ زرد روسی لڑکی اور کہاں تم۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف

"کیا ہے مجھے۔" وہ نخرے سے بولی۔
"پتہ نہیں" ایلی نے کہا۔ "لیکن کٹہرے میں لوگ کہہ رہے تھے سارا شہر پاگل ہو رہا
تمہارے پیچھے"
"ہونہہ" اس نے ہونٹ بٹوہ بنائے۔ "سب اپنے مطلب کے سیانے ہیں کوئی بھی پاگل
[illegible]"
"[illegible] دیکھنے تو میں آیا تھا۔ میں نے کہا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔"
"پھر کیا دیکھا۔"
[illegible] نے اثبات میں اشارہ کیا۔ "سب کچھ دیکھا۔"
[illegible] نے جنون سے پوچھا "کیا۔"
"[illegible] ہو جاتا ہے۔"
"[illegible]"

"دیکھنے والا۔"

وہ ہنسی ——— "جھوٹ! کوئی نہیں ہوتا۔"

"جو بائی کے پاس آتے ہیں وہ نہیں آتے۔ جو شادی کے پاس آتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں"

"تم ہو گئے ہو۔" وہ ہنسی۔

"ہو گیا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

"بیٹھو۔" وہ بولی۔

ایلی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں۔"

"زیادہ پاگل ہونے کا فائدہ؟"

وہ ہنسی۔ "تمہاری باتیں الٹی ہیں۔"

"الٹی نہیں سچی ہیں۔"

"کیسے؟"

"تم سے کون سچی باتیں کرتا ہے یہاں کوئی نہیں۔"

"یہ سچ ہے۔" وہ بولی۔

"سبھی سچ تھیں۔"

"اے ہے میں نے تمہاری تواضع نہیں کی۔"

"لو" وہ بولا۔ "شادی سے ملا دیا اس سے بڑھ کر اور کیا تواضع ہو سکتی ہے۔"

وہ چل پڑا۔ اچھل کر شادی نے سلیپر پہن لئے اور ساتھ چل پڑی۔

"تیرا نام کیا ہے؟"

"ایلی۔"

وہ ہنسی۔ "کیا نام ہے۔ کوئی سمجھے تیلی ہو"

"ٹھیک سمجھے۔" وہ بولا "میں تیلی ہوں تو عطر ہے۔"

شادی نے گویا اس کی بات نہ سنی۔

"پھر آؤ گے۔" اس نے پوچھا۔

"کون آنے دے گا۔"

ت کے مہاراجہ کا پیغام لے آنا۔" وہ ہنسی۔

ہارانی۔" ایلی نے جھک کر سلام کیا۔

نیچے کٹڑے میں اترا تو لوگ اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے اوپر دیکھا جنگلے
مسکرا رہی تھی۔ دہلیز پر سائیں کے کھلے ہونٹوں سے لعاب ٹپک رہا تھا۔

عزم

رنگین میں سے گزرتے ہوئے ایلی غور سے ہر بائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو چوبارے
چھت کی سہ نشینوں' اور جدید طرز کے مکانات کی بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔
سنورے خدوخال اور سنگار کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر بائی میں اسے شادی
رہی تھی۔ دبی ہوئی چھپی ہوئی عورت محروم دکھی عورت۔ جس قدر بائی اپنی نمائش
قدر وہ دبی رہتی ہے جس قدر بنی سنوری دکھائی دیتی ہے اسی قدر پریشان حال ہوتی ہے
اٹھا۔

ے سے نکل کر دفعتاً اسے خیال آیا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ سوچنے لگا۔
یہاں آیا ہی کیوں تھا ——— ویسے ہی سیر کے لئے۔ کیا شادی سے ملنے ——— یہ کیسے
مجھے تو شادی کا علم بھی نہ تھا پھر ——— اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنا قدم
رہا۔

رے رے۔" ایک راہ گیر اس کی طرف جھپٹا اس نے ایلی کو بازوؤں میں تھام لیا۔

کیا بدرو میں گرو گے۔"

وقت وہ بدرو کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔

میں گرو گے! بدرو میں گرو گے!!" چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

نت میں لت پت ہونے کا شوق ہے کیا۔" کوئی ہنسا۔

میں گرو گے۔" کوئی چلائی۔

آ جاؤ۔ میں یہاں ہوں۔" آرام باغ کے ایک چوبارے سے ایک بدشکل کسبی نے
نکل کر اسے آواز دی۔

ہائے ہائے۔" چیچک کے داغوں بھرا ہوس سے پھولا ہوا چہرہ اس کے روبرو آگیا۔ "یہ

کیالت پت ہو گا' لت پت ہونا تو مردوں کا کام ہے۔"

"بند کمرے کی بات بھول گیا۔" ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آگئی۔

"آجاؤ آجاؤ۔ اس کی بات نہ سنو۔" ایک نے کہا۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں آرام باغ کے چوباروں میں بیٹھی ہر کسبی اس طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔ اور مردانہ شان سے دانت بھینچ کر بولا۔

"ہاں میں لت پت ہوں گا۔ کیوں میری مرضی ——— مجھے کون روک سکتا ہے۔ اگر اوپر کی طرف جانے کے لئے روکاٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں کنوئیں میں کودوں گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔" وہ اعلانیہ کسبیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا کہا بابو" ایک مزدور رک گیا "کیا ہو گے تم۔"

"میں" ایلی چونکا۔

"کہہ جو رہے ہو کچھ" مزدور بولا "میں سمجھا شاید مجھ سے کہہ رہے تھے۔"

"تم سے نہیں کہہ رہا" ایلی نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو کر سامنے کی کھڑکی میں کھڑی پچھانی کی طرف دیکھنے لگے۔

"دیکھ بابو" مزدور قریب تر ہو گیا۔ یہ جو پچھانی ہے نا یہ سامنے چوبارے والی' ہے تو پٹاخہ طریقے آتے ہیں کہ بس سمجھ لو آنکھیں روشن ہو جائیں پر اسے بیماری ہے۔"

"بیماری۔" ایلی نے حیرت سے دہرایا۔

مزدور نے آنکھ ماری۔ "وہی بیماری۔" وہ بولا "جو ہوا کرتی ہے۔"

کچھ دیر تو ایلی گھور گھور کر اعلانیہ کسبیوں کو جانچتا رہا پھر دفعتاً اسے شرم محسوس ہونے لگی۔

کسبیوں کی باتیں بھدی اور ننگی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے چوکیوں پر غلیظ جسم کے ڈھیر لگے تھے پلپلاتے جسم جونکیں۔ بڑی بڑی جونکیں۔ اس کا وہ مردانہ عزم ختم ہو گیا۔ نگاہیں جھک گئیں دل دھک دھک کرنے لگا ——— پھر جو اس نے دیکھا تو وہ آرام باغ سے دور نکل تھا۔

پھر دفعتاً ایک عظیم شور سنائی دی۔ ادور دور پیچھے بہت پیچھے وہ چیخ رہی تھیں چلا رہی

"دیکھا نا بھاگ گیا۔"

"ہاتھ پلے کچھ ہوتا تو ———!!"

"یہ مرد کا کام ہے ———!!!"

"بند کمرے ہی میں جائے گا ———!!!"

گھبرا کر ایلی پل پر بیٹھ گیا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جانتے ہیں کی سی مسکراہٹ' کوئی بات نہیں کی سی ہنسی۔ بیچارا کہتی ہوئی نگاہیں۔ اس نے ...وس کیا جیسے آرام باغ والیوں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو سب کچھ۔

...لثوم حبشی

کئی ایک بار وہ آرام باغ میں ادھر سے ادھر تک اور ادھر سے ادھر تک آیا گیا۔ کئی مرتبہ ...نے شدید کوشش کی کہ کسی چوبارے کے زینے پر چڑھ جائے لیکن عین قریب پہنچ کر نہ ...نے کیا ہو جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ دوکان دار' راہ گیر' ...ش بین اور کسبیاں۔ یہ محسوس کر کے وہ گھبرا جاتا اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

اس نے کئی مرتبہ ان میں سے ایک کا چناؤ کیا۔ کئی مرتبہ "اچھا یہ ٹھیک ہے یہ والی واپسی پر ...اں گا تو سیدھا اوپر چڑھ جاؤں گا۔" لیکن جب وہ واپس آتا تو وقت پر زینہ پہچان نہ پاتا اور پھر ...کے نکل جاتا اور پھر جب وہ آگے نکل جاتا تو اسے خیال آتا "نہیں یہ تو اچھی نہیں۔ اس کی ...یں تو بے باک ہیں' ننگی نگاہیں' دیکھو تو کیسے چھاتیاں ہلا کر آگے کو بڑھاتی ہیں۔ لاحول ولا ...ۃ۔"

ایلی تھک کر چور ہو گیا۔ لیکن ابھی تک وہ آرام باغ میں گھوم رہا تھا۔ دوکانیں بند ہو چکی ...تھیں۔ پنواڑیوں کے گرد ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا لوگ اوپر دیکھ رہے تھے اشارے کر رہے تھے ...لیں سے دام چکا رہے تھے کسبیاں مسکرا رہی تھیں با آواز بلند گالیاں دے رہی تھیں۔ ننگے ...اشارات کر رہی تھیں۔

ایلی کے دل میں نفرت کا ایک طوفان پیدا ہو چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے کسی چوبارے ...چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ پنواڑی کی دوکان پر کھڑے تماش بینوں سے آنکھ بچا

کر اوپر چڑھنا تقریباً" ناممکن تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر آوازے کس رہے تھے بھنبھنا رہے تھے۔ اس کے باوجود ایلی وہیں ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ اس گھٹن میں تاکا کر با کوئی دروازہ دکھائی دے جو لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو اوٹ میں ہو اور وہ آنکھیں بند کرکے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر سیڑھیاں چڑھ جائے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہوا جا رہا تھا۔ اس عزم کی وجہ حصول لذت نہ تھی۔ وہ خواہش کی شدت سے بیقرار نہ تھا۔ بلکہ ان حالات میں لذت اور عیش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ایلی خوف اور نفرت کے ملے جلے جذبات کے جنگل میں بری طرح پھنسا تھا ان کسبیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اس نے نفرت سے کئی بار جھرجھری لی تھی اور اب وہ نفرت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اسے کوڑے مار رہی تھی۔ اور مظلوم حبشی کی طرح کوڑے کھا کھا کر وہ خود کو مشتعل کئے جا رہا تھا۔

وہ کسبیاں در حقیقت اس وقت ایلی کی نگاہ میں وہ رنڈیاں نہ تھیں بلکہ اس اپنی کورٹ کی جج تھیں جہاں وہ آخری اپیل پیش کرنے جا رہا تھا۔

"مجھ میں لت پت ہونے کی ہمت ہے۔"

اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے دارو پی رکھی ہو۔ اس کا سر گھوم رہا تھا اس کی نگاہوں میں ستارے ٹکرا رہے تھے غلیظ جسموں سے گندگی کی بوچھاڑیں اڑ رہی تھیں کٹے ہوئے سر۔ ڈھیر ہوئے جا رہے تھے۔ خون بہتا ہوا خون۔ بازو اٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ ٹٹول رہے تھے۔ ہتھنیوں کی سونڈیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ اسے گرفت میں لے لیں۔

پھر دفعتاً" ایک چیخ سی سنائی دی کسی کٹے ہوئے دھڑ کی چیخ۔ تمام فضا سرخ ہو گئی۔ وہ کونے سے یوں باہر نکل آیا جیسے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

زینہ چڑھتے ہوئے اس نے نیچے شور و غل کی آواز سنی وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور نعرہ لگایا "لت پت زندہ باد۔"

ایلی کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اوپر دروازے پر بھدا بدنما چہرہ اس کی طرف گھور رہا تھا چاروں طرف سے چیچک کے داغوں کی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔

پھر وہ بدنما بھدا بدنما چہرہ پھیلنے لگا۔ گویا چیچک کے داغوں کا بھرا تھال کسی نے انڈیل دیا ہو پسینے اور گوشت کی مکروہ بو۔ سرکٹ کر نہ جانے کہاں گر گیا لاش۔ ٹھنڈے گوشت کی عظیم

مظلوم حبشی نے کوڑوں کی ایک بوچھاڑ محسوس کی ——— بو کا ایک ریلا آیا۔ جوش اور غصے میں اس نے آنکھیں بند کرکے چھلانگ لگا دی۔ تعفن کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ چھینٹے ... تھے اور پھر ایک ہوائی ———

اتنا ———

اور پھر وہ ننگے فقیر کی طرح کیچڑ میں لت پت تھا۔ شرم سے اس کی گردن لٹک گئی تھی۔ اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

گوشت کا بدنما سمندر لپٹ رہا تھا۔ ایک کریہہ منظر چہرہ ابھر رہا تھا۔ بدنما دانت۔ رینگتی ہوئی آنکھیں۔

پھر کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اپنا گھر ہو اپنی عورت ہو۔ اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔ یہ چیز اپنی بھرنے کی ہے۔ غٹاغٹ کی نہیں۔

"یہ محبت کا کھیل ہے۔ سودے کا نہیں۔ محبت کا۔"

"پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"پہلے پہل لاٹھی مارنے کا شوق ہوتا ہے۔ لاٹھی تو ٹیک ٹیک کر دھری جاتی ہے۔"

ایلی کو اپنے آپ سے بو آ رہی تھی۔ اس کمرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی ... نہ تھی کہ سر اٹھا کر دیکھتا کہ کون اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ اس کی باتیں سننے کی اسے ... نہ تھی۔ چسکیاں بھرنا۔ ٹیک ٹیک کر چلنا یہ سب اس کے لئے بے معنی تھا۔ ایلی یوں ... کر رہا تھا جیسے گندم کا دانہ کھانے کے بعد وہ ننگا ہو۔ احساس گناہ اور احساس پستی چاروں ... سے یورش کر رہے تھے۔

اپنی بوتل اپنا جام

پھر وہ سٹیشن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ڈیڑھ بجے جانے والی گاڑی کو پکڑنے کے لئے بے ... تھا۔

گاڑی میں لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ مگر نیچے وہ سب ننگی تھیں ... سینے ڈھکے ہوئے تھال جن میں سے چیچک کے داغ نکل کر چاروں طرف ڈھیر ہونے کے

لئے بے تاب تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ یوں لیٹ گیا جیسے خود ایک لاش ہو کٹے ہوئے سر کی لاش تعفن
اور بدبو سے بھری گلی سڑی لاش۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو تین بجے تھے۔ فرحت کی ڈیوڑھی بند تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا۔ تھک
کر بیٹھ گیا۔

شاید شہزاد کا دروازہ کھلا ہو۔ اسے دو ایک مرتبہ خیال آیا۔ لیکن وہ شہزاد کی طرف جانا نہیں
چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے بو آ رہی ہے اور وہ اب اس قابل نہیں کہ شہزاد کی
طرف جائے۔ ایک کراہتے ہوئے مظلوم حبشی کا قصر شاہی میں ملکہ کے روبرو جانے سے کیا
مطلب۔

دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دیکھوں تو سہی ——— چاہے اندر نہ جاؤں، پر
دیکھوں تو سہی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

شہزاد کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے آزمایا شاید کھل جائے۔

"کون ہے۔" اندر سے رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

"کون۔" رابعہ پھر چلائی۔

"میں ہوں ایلی۔"

"تو ہے ایلی۔" وہ بولی "ٹھہر ذرا۔"

دروازہ کھل گیا۔ وہ چپکے سے اوپر چڑھ گیا چوبارے کے سامنے صحن میں صرف دو چارپائیاں
بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر بچیاں پڑی تھیں دوسری پر شہزاد تھی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ایلی نے
چاروں طرف دیکھا۔ لیکن بیگم کی چارپائی کہیں دکھائی نہ دی۔ پھر وہ چوبارے کے اندر گیا۔
دوسرے چوبارے میں۔ اور بالآخر چھت پر چڑھ گیا لیکن بیگم کا کہیں نشان نہ تھا۔

واپس آ کر وہ شہزاد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں پڑی تھی جیسے جھوٹ موٹ آنکھیں موند
رکھی ہوں اور ویسے جاگتی ہو۔ اس کی پیشانی کا تل چمک رہا تھا۔ بازو چھاتی پر رکھے ہوئے تھے
قمیص کے بٹن کھلے تھے کتنا روشن جسم تھا۔ جیسے پھولوں سے بنا ہو۔ عجیب سی باس آ رہی تھی۔

"یہ تو محبت کا کھیل ہے" ——— کوئی آہستہ سے بولی۔

"اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔"

شہزاد کا جسم یوں دکھائی دے رہا تھا ——— جیسے بوتل ہو۔

جام بھرنے کے لئے بوتل الٹی ہوئی تھی۔

"ہوں نہیں۔" کسی نے اس کے کان میں کہا "یہ تو چسکیاں لینے کی چیز ہے۔"

شہزاد نے کروٹ لی اور ہاتھ سینے سے اٹھائے۔

ایلی کی نگاہ کھلے بٹنوں پر پڑی ——— حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

ایلی بھول گیا کہ اس سے تعفن بھری بو آتی تھی۔ وہ بھول گیا کہ اس کے جسم سے چیچک
داغ ابھی تک چمٹے ہوئے تھے۔ وہ قریب تر ہو کر بیٹھ گیا۔

"نونہوں" کسی نے اس کے کان میں کہا "لاٹھی تو ٹیک ٹیک کر رکھنے کے لئے ہوتی

ایلی نے آنکھیں بند کر لیں اور ٹیک ٹیک کر لاٹھی رکھنے لگا قریب اور قریب اور قریب
خوشبو کا ایک ریلا آیا۔ نرم نرم لمس ——— ایک جھرجھری۔
بازو اٹھے اور اس کے گرد حمائل ہو گئے۔

علم

اگلی روز ابھی وہ سویا ہوا تھا کہ علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ
ملازمت ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نئے آدمی بھرتی کرنے کی بجائے تخفیف کی
سکیمیں بنا رہی ہے۔ لہٰذا ایلی کو چاہیے کہ وقت ضائع نہ کرے اور سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ
کی کوشش کرے تا کہ اسے ٹیکنیکل تعلیم حاصل ہو جائے اور ملازمت ملنے میں
سہولت پیدا ہو۔

سٹینو گرافی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایلی کے دل میں بڑی امیدیں تھیں۔ اس زمانے
سٹینو گرافر بہت کم یاب تھے اور پھر بی اے سٹینو گرافر کا ملنا تو قطعی طور پر مشکل تھا۔ ایلی کا
خیال تھا کہ اسے ملازمت مل جائے گی۔

ایلی نے کئی ایک محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ دو ایک جگہ سے اسے انٹرویو کا
بلاوا آیا تھا مگر یہ خط اسے انٹرویو کے دن کے بعد موصول ہوئے تھے ظاہر تھا کہ دفتر والوں نے
محروم رکھنے کیلئے وہ خط دیر سے حوالہ ڈاک کئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا

اور دفتروں پر ہندوؤں کا راج تھا۔ یا شاید دفتر والے اپنے آدمیوں کے لئے مواقع پیدا کر رہا
تھے ایک جگہ وہ وقت پر انٹرویو میں پہنچ گیا تھا لیکن جب وہ پولیس کا سب انسپکٹر انہیں ڈکٹ
دے رہا تھا تو ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس زبان میں بول رہا ہے اس کی
انگریزی۔ پشتو اور پنجابی کا مرکب معلوم ہو رہی تھی۔ لہٰذا اس نے کورا پرچہ رکھ دیا تھا اور پھر
ایک ٹین کے سینما ہاؤس میں جا کر تماشہ دیکھنے لگا۔ محکمہ ریل کے ایک انٹرویو میں اسے ایک
سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

یہ بڑے صاحب کی آرام کرسی کے ایک بازو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بڑا صاحب ہنس کر
سے پوچھ رہا تھا۔ "تم اس سے مقابلہ کر سکو گے۔" ایلی نے جواب دیا تھا صاحب خطوط
گولائیوں میں تو نہیں البتہ سپیڈ میں کوشش کروں گا اور بڑے صاحب نے قہقہہ لگا کر لڑکی
کہا تھا۔ "سنا تم نے کیا کہہ رہا ہے یہ۔" اور وہ مسکرا دی تھی اور پھر اس نے ایلی پر ایک
بھری نگاہ ڈالی تھی ایسی نگاہ کہ ایلی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر صاحب سے کہہ دے "حضور
چاہتا ہوں کہ مجھے اس مقابلے میں امیدوار تصور نہ کیا جائے۔" اس کا نام روزی تھا۔ اور اس
کپڑوں سے وہائیٹ روز کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر صاحب قہقہہ مار کر ہنسے تھے۔ ہمیں تم پر
آئے ہو کیا نام ہے تمہارا۔ اگر اب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہم تمہیں بلا لیں گے۔ اپنا پتہ دفتر
چھوڑ جانا۔ "پھر وہ روزی سے کہہ رہے تھے "مس روزی اب اس سے ہاتھ تو ملا لو۔" اور ا
یوں باہر نکلا تھا۔ جیسے اسے نوکری کے لئے چن لیا گیا ہو۔ اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ غم غ
کرنے کے لئے اسے ٹین کے سینما ہاؤس میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

اتنی بار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب تو ایلی واقعی مایوس ہوا جا رہا تھا
اگرچہ نوکری پر جانے کی اس میں قطعی طور پر کوئی خواہش نہ تھی ——— ہاں اگر سادی ہو
——— اگر ابا انکار نہ کرتے اگر منصر سے تعلق قائم رہتا تو۔

لیکن اب ——— خصوصاً" جب اسے اپنی بوتل اور اپنے جام سے واقفیت ہو چکی تھی
جب وہ چسکیاں لینا سیکھ رہا تھا۔ جب وہ لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلنے سے واقف ہو رہا تھا۔ اب نوکری
کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اماں اور بہن شدت سے مصر تھیں کہ وہ داخلہ لے لے۔ اور شہزاد
ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔ "دو گھنٹے کا تو فاصلہ ہے۔ صرف دو گھنٹے کا خواہ مخواہ کیوں رونی شکل بنا
رکھی ہے تم نہ آ سکو گے تو میں جو ہوں۔ میرے پاؤں میں مہندی لگی ہے کیا۔ اب تو ہاتھوں کو

تجھے ہی اچھے نہیں لگتے تو پھر کیوں رنگوں میں اپنے ہاتھ۔"

جب نارمل ٹریننگ کالج میں جب وہ ایڈمشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے کوائف پڑھ کر
ہنسنے لگے۔

"ہاں تو آپ کا نام الیاس آصفی ہے۔"

"جی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اور کیا ہم جان سکتے ہیں کہ آپ یہاں کیوں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔"

"میں استاد بننا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"آخر کیوں۔"

"یہ ایک نوبل پروفیشن ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"یہ آپ نے کب جانا کہ ٹیچنگ نوبل پروفیشن ہے۔"

"جی جی ———" وہ رک گیا۔ یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ دیر سے میرا مطلب
ہے میرے تمام بزرگ درس و تدریس میں ———"

"استاد بننے کی خواہش کب سے آپ نے محسوس کی۔" ایک اور صاحب نے وضاحت کی۔

یہ تو میری پرانی خواہش ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تو پھر آپ نے پچھلے سال سٹینو گرافی کیوں سیکھی۔"

"جی۔ جی۔ میرا مطلب ہے۔" ایلی کھسیانہ ہو کر رہ گیا۔

"نوجوان۔" ایک اور صاحب بولے "آپ سٹینو گرافر ہیں بی۔ اے ہیں آپ کو معقول
نوکری مل سکتی ہے لہٰذا یہاں داخلہ لینا بے کار ہے۔"

ایک اور صاحب بولے۔ ایسے کیس پر غور کرنا سراسر غلطی ہو گی اس نوجوان نے بی۔ اے
اکنامکس اور فلسفہ میں کیا ہے اور یہ دونوں مضامین سکول کے مضامین نہیں یہاں ٹریننگ میں آپ
ان سے مضامین لیں گے۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جی میں سائنس لے سکتا ہوں میں نے دسویں سائنس ڈرائینگ میں پاس کی تھی۔" ایلی
نے جواب دیا۔

"جنٹلمین" کونے میں بیٹھا ہوا انگریز پروفیسر بولا۔ "تمہارا سائنس کا مبلغ علم۔" اس نے
ناک بھری اور کہا۔ "سمجھ لو اس سے بھی کم ہے۔"

ایلی کو علم نہ تھا کہ وہ آرم سٹرانگ تھا اور سائنسی تحقیق میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔
"حضور۔" ایلی چلایا "میرے والد اور دادا عمر بھر پڑھانے کا کام ——"
"پڑھانا تم نے ہے۔" بورڈ کے صدر نے کہا "تمہارے والد نے نہیں۔"
ایلی کچھ کہنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ صدر بولا۔ "یو مے گو نکسٹ ون۔"

بیٹن لسٹ

تمام امیدواروں کو کالج کے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے
اس روز ہوسٹل میں شور مچا ہوا تھا بہت سے امیدوار جنہیں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے ایلی بھی اپنا بستر باندھ رہا تھا کہ ڈارمیٹری کا نوکر گاما ادھر سے گزرا۔

"ارے گامے۔" وہ چلایا "یار آخری مرتبہ کی چائے تو پلا دے۔ سٹرانگ ہو۔"

ایلی کے انداز گفتگو میں صاحبیت کا عنصر نہ تھا۔ عام طور پر امیدوار نوکروں سے یوں بات کیا کرتے جیسے کوئی گورا کالا میں سے بات کر رہا ہو۔ وہ سب بی۔اے، ایم۔اے اور چونکہ تھے۔ لہٰذا انہیں اپنی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔

ایلی میں نہ جانے کیوں یہ بات کبھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے نوکر یا ایسے ہی دوسرے ان پڑھ لوگ عام طور پر ایلی سے خوش رہا کرتے تھے۔

"آخری مرتبہ کیوں بابو جی۔" گاما نے پوچھا۔
"ارے یار گامے ہمیں تو چھٹی مل گئی۔"
"نہ بابو جی مجاک نہ کرو۔" وہ بولا۔
"ارے ٹھیک کہہ رہا ہوں بیوقوف اپنا تو پتہ کٹ گیا۔" ایلی چلایا۔
"میں نے کہا بابو جی۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا۔
"کیا ہے؟"
"جو میں ایسی ترکیب لڑا دوں کہ بات بن جائے تو۔"
"بیوقوف" ایلی ہنسا۔ "ابے ہمارے والد صاحب نے چار سفارشیں پہنچائی تھیں ایک نہ پوری چار سب بے کار گئیں۔ تو کیسی ترکیب لڑائے گا۔"

"اگر جو میری بات مانو تو سمجھ لو بات پکی ہے۔" گاما نے دانت نکالے۔
"کیا" ایلی ہنسا۔
"بس یہاں سے جاؤ نہیں بیٹھے رہو۔ آرام سے بیٹھے رہو بابو جی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"یعنی خواہ مخواہ بیٹھا رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے۔"
"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو گا۔" گامے نے کہا۔
"اور اگر سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔"
"تو کہیے بیٹن لسٹ پہ ہوں۔"
"بے ٹن لسٹ؟" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔
"وہ کیا کہتے ہیں اسے جن کا پھیسلہ ابھی نہیں ہوا۔" گامے نے وضاحت کی۔
"اچھا۔" ایلی ہنسا۔ "ویٹنگ لسٹ۔"
"ہی" گاما دانت نکالے۔ "بات پکی سمجھو بابو جی مجھ پر اقین کرو۔"
"کتنے دن رہنا پڑے گا یہاں۔"
"بس یہی آٹھ دس روز۔"

اس روز تو ایلی رک گیا لیکن اگلے روز اسے خیال آیا کہ ایک جاہل نوکر کی بات یوں اس آٹھ روز پڑے رہنا او نہوں۔ اس نے پھر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن گامے کے اصرار پر رک گیا۔ پھر اسے خیال آیا چلو جانے کی جلدی کیا ہے۔ بیٹن لسٹ نہ سہی آٹھ روز سینما ہی۔

روز باقاعدہ وہ کالج میں جاتا۔ بی ٹی کی کلاس میں تو بہت کم لڑکے تھے لیکن ایس۔ اے۔ وی میں گھمسان کا رن پڑا رہتا تھا۔ اس لئے وہ ایس اے وی میں جا گھستا۔ اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر لڑکوں کے ساتھ بینچ بجاتا —— بوٹ زمین پر گھساتا۔ اور منہ بند کر کے گلے سے شی شی کی آوازیں پیدا کرتا۔

ایلی اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی —— بلکہ جو بی۔اے تک وہ محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ پرانا احساس کمتری شدت کھو بیٹھا تھا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بیٹن لسٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض تفریح سمجھ رہا تھا۔
کلاس میں جب ہنگامہ ہوتا تو پروفیسر غصے میں آ کر حاضری کا رجسٹر منگوا لیتا اور پھر ان لڑکوں

سے پوچھتا جن کے نام رجسٹر میں درج نہیں تھے کہ وہ جماعت میں کیوں بیٹھے ہیں۔ اس پر باری باری لڑکے اٹھ کر اپنی شان نزول کی وجہ تسمیہ بتاتے۔

"صاحب میرے کیس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔"

"میرا کیس بھی زیر غور ہے۔"

"جی میرا نام تو چنا جا چکا ہے ابھی رجسٹر میں اندراج نہیں ہوا۔"

پہلی مرتبہ جب ایلی سے پوچھا گیا اس نے جواب میں کہا۔" جناب میں بیٹن لشٹ پر ہوں۔"

"بیٹن لشٹ۔" پروفیسر نے دہرایا لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ تم ویٹنگ لسٹ پر ہو۔" پروفیسر نے پوچھا۔

"جناب مجھے گامے نے بتایا ہے۔" ایلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"گاما —— " پروفیسر بھگت سنگھ گھبرا گیا۔ "گاما کون۔"

"ہمارا باورچی۔"

اس پر جماعت کے لڑکے قہقہہ مار کر ہنسے۔ ڈسکیں بجنے لگیں۔ سیٹیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پروفیسر بھگت سنگھ غصے سے احتجاجاً کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد سبھی شور مچا رہے تھے۔ "ارے وہ بیٹن لشٹ کون سا ہے۔" وہ سب محبت اور احترام بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں نگاہوں کا مرکز بننے میں کتنی لذت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ محض تصنع تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ایلی کا وہ حجاب اٹھ گیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ابھی تک وہی ایلی تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا ڈر اور خوف کے جذبات کا شکار ایلی۔

آٹھ روز کے بعد کالج پندرہ دن کے لئے بند ہو گیا۔ پھر دفعتاً ایلی کو خیال آیا کہ وہ ابھی تک بیٹن لشٹ پر ہی تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ ایک نوکر کے کہنے پر وہ اپنے آپ کو احمق بنائے ہوئے تھا۔

"صرف ایک روج کے لئے بابوجی۔" گاما اس کی منتیں کر رہا تھا۔ "جب کالج کھلے گا تو صرف ایک روج کے لئے یہاں آجائیں صرف ایک روج کے لئے۔ جہاں اتنے روز

بابا جی صرف ایک روج اور۔ اگر آتے ہی بات نہ بنی تو سجا چاہیں دیں پر جو بن گئی تو ٹھونک بجا کر انعام لوں گا۔"

"لیکن یہ ہو گا کیسے۔" ایلی نے پوچھا۔

"بس یہ نہ پوچھئے۔" گامے جواب دیا۔

کھویا

علی پور پہنچنے کے بعد دوسرے چوتھے روز ہی شہزاد نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اسے پلنگ پر بٹھا دیا اور خود پاس کھڑی ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"ایلی یہ تمہیں کیا ہو گیا۔"

"کیا ہو گیا ہے۔" اس نے حیرت سے دہرایا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟۔"

"کیا کر رہا ہوں —— بیٹھا ہوں۔" ایلی نے دیا۔

"بات کو مذاق میں نہ ٹالو" وہ بولی۔" جب سے تم امرتسر سے آئے ہو تمہارا انداز ہی بدل گیا ہے۔ نگاہ بدل گئی ہے —— تم نے مجھے کیا سمجھا ہے ایلی ——"

شہزاد کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "چلو محبت نہ سہی۔ مجھ سے محبت کون کرتا ہے۔ اور۔ اور میرے پاس اب ہے ہی کیا جو میرے ساتھ محبت کی جائے۔ لیکن لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ تمہارے دل میں میری عزت ضرور ہے۔ لیکن۔" اس کی ہچکی نکل گئی۔

"آخر بات کیا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"بات۔" وہ غصے میں بولی۔ "تم تو مجھ سے یوں سلوک کرنے لگے ہو جیسے میں بازار میں بیٹھی ہوں۔ جیسے۔" —— وہ رک گئی۔ "بازار میں بیٹھی ہوئی بھی یہ برداشت نہ کر سکے گی۔"

"راہ چلتے ہوئے چھیڑتے ہو۔ انگلیاں کھبوتے ہو۔ ہاتھا پائی کرتے ہو۔ سب کے سامنے یہ —— " وہ رک گئی۔

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ "میرا خیال تھا کہ تم میں جرأت ہے۔" اس

نے سوچ کر کہا۔

"جرأت۔" وہ ہنسی۔ "جرأت کی بات کر رہے ہو مجھ میں وہ جرأت ہے کہ تم سب نرد...
انگلیاں ڈال لو۔ جرأت چھوٹی اور گری ہوئی باتوں میں نہیں ہوتی۔ تم نے ہمارا تعلق چھوٹی گری
ہوئی بات بنا دیا ہے۔ کیا ہوس کے لئے جرأت پیدا کروں۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"روتی کیوں ہو۔" ایلی کچھ کہنے کے لیے بولا۔

"روؤں نہ تو کیا کروں۔" وہ بولی۔ "میں سمجھی تھی کچھ پایا ہے اب معلوم ہوا کہ کچھ بھی
——— پایا نہیں۔

"تم سمجھتے ہو میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوس پوری کرنے کا شوق تھا
جسم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہوس تھی ——— الٹا میں نے تو ہوس پوری کرنے کے ذریعے سب
توڑ دیئے میں نے اپنے خاوند سے تعلق توڑ لیا میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ ملنا
چھوڑ دیا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ میں ہوس پوری کرنے کے لئے تمہاری طرف بڑھی تھی۔" وہ رک
گئی کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"میں بھی احمق ہوں ——— "وہ بولی "جو یہ سمجھ بیٹھی کہ میں تمہاری نگاہ میں بہت کچھ
ہوں۔ مجھے کسی کی نگاہ میں بہت کچھ ہونے کی ہوس تھی۔ میں نے سمجھا مجھے دو جہاں کی امارت
مل گئی۔ میں نے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونا گوارا کیا میں نے لوگوں کے طعنے سننا گوارا کیا۔ میں
نے اپنی ماں کی زبان سے وہ وہ لفظ سنے جو کوئی سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری ماں
بہن کے ننگے طعنے سنے اور ہنستی رہی۔ میں نے تمہارے طعنے سنے تم یہ سمجھتے رہے اور سمجھتے
کہ میں ہر آتے جاتے کو مسکرا مسکرا کر اپنے دام میں پھنساتی ہوں۔ تاکہ اپنی ہتک کو ٹھنڈا کر
سکوں۔ میں نے تمہارا جلاپا بھی برداشت کیا اور یہ سب کس لئے۔ کیا صلہ ملا مجھے۔ کہ اب تم
مجھے ——— تم ——— اپنی ہوس کا شکار بنا رہے ہو تمہاری نگاہ میں میری کوئی وقعت نہیں
تمہارے لئے میں ایک دل بہلاوا ہوں۔ ہوس پوری کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

وہ رونے لگی۔

ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"یہ میری اپنی بد قسمتی ہے۔ خاوند ملا جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پاگل تھا۔ اس نے مجھے

کبھی نہیں۔ جب بھی وہ میرے پاس آیا تو اس کی نگاہ میں میں نہیں انور ہوتی تھی۔ گویا وہ
دو اکیلے ہوتے تھے۔ وہ اور انور۔" وہ یوں ہنسی جیسے چینی کا پیالہ تڑختا ہے۔ "اور میں میں
کبھی ہی نہیں۔ اکیلی ساتھی کے بغیر۔ انور سے ملانے کے لئے مجھے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور
تم ہو ——— تم سادی کو بھولنے کے لئے تم ——— مجھے استعمال کر رہے ہو۔" یہ کہہ کر وہ
اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔

ایلی کے ذہن میں ایک خلا پھیل رہا تھا۔ ایک دھندلکا۔

شہزاد کچھ تھی۔ امرتسر سے واپسی کے بعد ایلی کا گویا نقطہ نظر ہی بدل گیا تھا۔ اس کے
لئے شہزاد اب ایک خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے بچہ مٹھائی کی
طرف دیکھتا ہے ایلی کی نگاہ میں شہزاد کے ماتھے کی بندی معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی
آنکھیں ایلی کی نگاہ سے گویا اوجھل ہو گئی تھیں۔ ان کی بجائے شہزاد کے جسم کی گولائیاں
ابھر آئی تھیں۔ اس کے کولھے مٹکنے لگے تھے۔ اس کی کمر ریشمی جھولے کی طرح جھولنے لگی
اس کی سڈول پنڈلیاں برہنہ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہ میں شہزاد دیوی نہیں رہی تھی۔ شہزاد
کے کر اب اس کی جبیں میں سجدے بیتاب نہ ہوتے تھے۔

لیکن ایلی اس واضح تبدیلی سے بے خبر تھا۔ اور اس سے بے خبر رہنے کے لئے اس نے کئی
جواز اور دلائل پیدا کر رکھے تھے۔

ایلی خود ہوس کار نہ تھا۔ اور ہوس کاری سے اس قدر بیگانہ تھا کہ محبت کا بہانہ بنائے بغیر وہ
ہوس کاری کا کھیل نہیں کھیل کر سکتا تھا۔ اس کی ہوس کاری درحقیقت جذبہ کمتری سے بچنے کا
ذریعہ تھی۔ شہزاد پر بھوکی نگاہیں ڈال کر وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ مرد ہے اور اس قابل ہے کہ
کسی سے محبت کر سکے۔ درحقیقت وہ اپنی اہلیت کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہا تھا۔

شاید اس کی وجہ سادی سے محرومی ہو۔

قاتل

ایلی وہاں بیٹھا رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے۔ شام پڑ گئی۔ پھر دیئے جل گئے اور لوگ
بستر بچھا کر لیٹ گئے لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔

پھر رابعہ نے آکر شور مچا دیا۔ "یہ کیوں بیٹھا ہے۔ اٹھ باہر آ۔ یہاں کیا کر رہا ہے تو۔"

ایلی کو خاموش دیکھ کر اس نے شہزاد کو آوازیں دیں۔ "دیکھ تو اسے کیا ہے۔ یہ کیوں
بنا بیٹھا ہے۔" "کیا ہے۔" شہزاد اکتائی ہوئی آواز میں بولی۔

نو بجے کے قریب بیگم آ کر بولی۔ "یہ بدھ مہاراج یہاں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔"

پھر ہاجرہ اور فرحت آ گئیں —— وہ دونوں چیختی چلاتی رہیں۔ لیکن ایلی جوں کا توں
رہا گیارہ بجے کے قریب شہزاد آئی۔

"اب کیوں مجھے ذلیل کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو نہ جانے
غصے میں کیا کیا بک گئی ہوں۔"

"نہیں تم نے تو کچھ نہیں کہا۔" ایلی نے جواب دیا۔ "تو پھر تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو"
وہ بولی۔

"کس طرح بیٹھوں۔"

"جس طرح روز بیٹھتے ہو۔ ہنسو کھیلو۔"

"کیسے کھیلوں کیسے ہنسوں کب تک ڈھیٹ بن کر ہنستا رہوں۔"

"چلو اب اٹھ بیٹھو۔" شہزاد نے پیار سے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔

"شہزاد" وہ بولا۔

"جی"

"میری ایک بات مانو گی۔"

"کیا۔"

"چلو کہیں چلے جائیں۔"

"چلے جائیں۔"

"ہاں کہیں بھاگ جائیں۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" وہ ہنسی۔ "میرے ساتھ بھاگ کر۔ اپنی زندگی تباہ کرو گے کیا۔"

"ویسے بھی تو تباہی ہے" وہ بولا۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے" وہ اس قریب تر ہو گئی۔

"مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔" وہ بولی۔ "مجھے اکساؤ نہیں۔ اگر ایک مرتبہ میں نے پر تول لئے تو ایک

طوفان بنا جاؤں گی کہ تمہیں اپنے آپ کو اور ان سب کو تباہ کر دوں گی۔ مجھے نہ اکساؤ ایلی۔
اس چپ کو نہ توڑو۔ اس طوفان کو رکا رہنے دو۔ بس میرے لئے یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس
ہو۔ تمہیں پا لیا تو زندگی، تمہیں کھو کر میری موت ہے اور جو میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو میں
تمہیں نہیں۔ کھو دوں گی۔"

"مجھے اپنا ہاتھ دے دو۔" ایلی نے شہزاد سے کہا۔

"میرا بس چلے تو میں اسے کاٹ کر تمہیں دے دوں۔" وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

ایلی نے شہزاد کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہونہہ۔" بیگم اندر آ کر ہنسی۔ "یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے"۔ وہ غصے سے بولی۔

شہزاد نے بیگم کو دیکھ کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ دوسرا ہاتھ بھی ایلی کو دے دیا۔

"توبہ بے حیائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔" بیگم چلائی۔

"نہیں اماں۔" شہزاد نے ہنس کر کہا۔ "بے حیائی کی حد نہیں ہوتی حیا کی ہوتی ہے۔"

"توبہ ہے لڑکی۔" وہ چلائی۔ "تو نے تو یہ گھر رنڈی کا چوبارہ بنا رکھا ہے۔"

"ہی ہی —— چوبارہ۔" وہ ہنسی۔

"شرم نہیں آتی" بیگم بولتی بکتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی شہزاد کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"تمہیں پانے کے لئے ایلی مجھے نہ جانے کیا کیا دینا پڑے گا۔ لیکن میں سب کچھ دے دوں
گی سب کچھ۔ خوشی سے لیکن تم میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ سب مجھے رنڈی سمجھتے ہیں۔
سمجھیں۔ لیکن تم مجھے رنڈی نہ سمجھو۔" اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی کی نگاہ میں اس کے جسم —— کی گولائیاں سمٹ کر معدوم ہو گئیں —— شہزاد کا چہرہ
طلوع ہو گیا۔ دیوی لوٹ آئی۔ اس کے ماتھے کا تل روشن ہو گیا۔

اس روز شہزاد کی باتوں نے ایلی کو چونکا دیا وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

علی پور میں پندرہ روز اس نے سوچنے میں گزار دیئے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے یا شہزاد
سے۔ اس روز جب میں نے پہلی مرتبہ شہزاد کا حنا مالیدہ ہاتھ تھاما تھا کیا اس لئے تھاما تھا کہ مجھے
اس سے محبت ہو چکی تھی یا اس لئے کہ وہ ایک بانکی عورت تھی جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا
تھا۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے۔ کیا میں نے محسوس کرنے کے بعد اس سے محبت جتائی تھی

کیا یہ غلط ہے کہ کالی کلوٹے کی خفت مٹانے کے لئے میں نے اسے جیتنے کی کوشش کی تم
اپنی انا کو تسکین دینے کے خیال سے اسے جیت لیا تھا۔ تو کیا مجھے سادی اور شہزاد دونوں سے
نہیں۔ تم سے بھی تو مجھے محبت نہ تھی میں نے اپنے باپ سے انتقام لینے کے لئے اس سے
رچائی تھی۔ تو محبت کیا ہے کیا مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ
اس کے باوجود ایلی کے دل میں شہزاد کا احترام تھا اس کی آرزو تھی لیکن سادی کے
کے دل میں ایک جذبہ تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اسے پالے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے
چھپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ شہزاد کے سحر سے نکل کر نارمل زندگی بسر کرے ساری بات
الجھاؤ تھی۔ اور اس الجھاؤ سے نکلنا ناممکن تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا اور پھر اس
آپ کو حالات کے رحم و کرم پر پھینک دیا چلو کہیں تو کنارے لگوں گا۔
لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ افق سے پرے ایک طوفان اکٹھا ہو رہا ہے۔

ایس۔ اے۔ وی

پندرہ روز کی چھٹی گزارنے کے بعد واپس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور جانے کا سوال
نہیں ہوتا تھا۔ ایک معمولی سے نوکر کی بات کا یقین کر لیتا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ اگر
شہزاد ایلی سے بات نہ کرتی اگر وہ ایلی سے احتجاج نہ کرتی۔ اگر ایلی کی نگاہ میں شہزاد کا جم
رہتا اور اس کا ماتھے کا تل طلوع نہ ہوتا اور وہ سوچ میں نہ کھو جاتا تو وہ غالباً" لاہور نہ جا
اس کی زندگی کا دھارا کسی اور طرف بہتا۔ لیکن اس ایک چھوٹی سی تفصیل نے حالات کا
دیا۔

ایلی کو گامے کی بات کا چنداں یقین نہ تھا۔ وہ صرف اس خیال سے لاہور جا رہا تھا کہ
روز کے لئے سینما دیکھیں گے۔ شاید کسی نوکری کا پتہ چل جائے۔ شائد شادی کے متعلق
ملے۔ نہیں تو سیر ہی سہی۔

جب وہ روانہ ہونے لگا تو شہزاد آ گئی۔
"تم اس قدر خاموش کیوں ہو" وہ بولی "میں کیا کروں اگر تمہارا ہاتھ نہ روکوں تو
نگاہ میں آپ گر جاتی ہوں اور روک دوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے چونکہ تم برف کی طرح جم
ہو۔ کیا کروں میں۔"

وہ ہنس پڑا۔ "جو جی چاہے کرو۔ تمہارے بس میں ہوں۔"
شہزاد کی آنکھوں میں محبت بھری چمک لہرائی۔ "میں آؤں گی" وہ بولی "میں خود تم سے ملنے
آؤں گی میں لاہور آؤں گی۔"
"تم" وہ بولا "لاہور آؤ گی"۔
"تم سے ملنے کے لئے میں سات سمندر پار جا سکتی ہوں یہ تو لاہور ہے۔"
لاہور بورڈنگ پہنچتے ہی گاما دوڑا ایلی کے پاس آیا۔ "آ گئے بابو جی بڑا اچھا کیا میرا انعام ساتھ
لائے ہیں نا۔"
ایلی نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اسے اپنی بات پر اس قدر یقین تھا۔
ایلی کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گا۔
اگلے روز جب ایلی کلاس میں پہنچا تو ایک نہیں چھ لڑکے غیر حاضر تھے وہ لڑکے جن کو چن لیا
گیا تھا اور جن کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ دفعتاً" ایلی کی نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا۔
گاما ہنسنے لگا۔ "بابو جی ہر بار ایسا ہوتا ہے کسی کو نوکری مل جاتی ہے کوئی کسی اور لین میں چلا
جاتا ہے۔ کوئی ویسے ہی نہیں آتا۔ ہر سال دس ایک بابو چھٹیوں کے بعد نہیں لوٹتے۔ بس پھر جو
موجود ہوا اس کا نام رجسٹر پر آ جاتا ہے۔ ہاں بابو جی تو ڈاکٹری ملاحظہ ہو گا۔ نہ جانے کتنے اس میں
رہ جائیں گے۔"
چوتھے روز ہی ایلی نے جماعت میں شور مچا دیا۔ جی میرا نام آپ بولتے ہی نہیں میں بیٹھا
ہوں میرا نام رجسٹر میں نہ ہو گا تو حاضریاں کیسے پوری ہوں گی۔" —— ایلی کا نام رجسٹر
میں درج کر لیا گیا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج کی عمارت بھاٹی دروازے کے قریب ایک وسیع چوگان میں واقع تھی۔
ٹریننگ کالج کی عمارت تھی جس کے شرقی اور غربی پہلو میں بڑے بڑے لان تھے۔ شمال میں
بورڈنگ کی عمارت ایک وسیع دائرے میں بنی ہوئی تھی۔ صدر دروازے کے ارد گرد دو رویہ
کمرے تھے جن کے اوپر چوبارے بنے ہوئے تھے اوپر کی منزل میں بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ لالہ
مقیم تھے نچلے کمروں میں ملاقات کا کمرہ۔ کومن روم اور دیگر کمرے تھے۔ ان کمروں سے
گزرنے کے بعد بورڈنگ کا وسیع صحن تھا جس میں لان بنے ہوئے تھے ایک باغیچہ تھا۔ لان کے
گرد ایک اونچی دیوار تھی جس میں سات دروازے کھلتے تھے۔ نیز دروازے کے اندر داخل

ہوتے ہی ایک بہت لمبا صحن۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ اور ایک بہت لمبا کمرہ تھا
لمبا کمرہ ڈارمیٹری کہلاتا تھا۔ اسی ساخت کی کل چھ ڈارمیٹریاں تھیں ہر ڈارمیٹری میں ۲۵ لڑ
کے رہائش کی جگہ تھی۔ ساتویں ڈارمیٹری میں کچن نوکروں کے رہنے کی جگہ اور ڈائننگ
تھے۔

چند ایک ڈارمیٹریوں میں ہر سیٹ کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹیشن لگی تھی۔ یہ ڈارمیٹریاں
ٹی کے طلبا کے لئے مخصوص تھیں۔ پارٹیشن کے بغیر جتنی ڈارمیٹریاں تھیں وہ سب ایس اے
وی کے طلباء کے لئے تھیں۔ بورڈنگ میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کے علاوہ کو
راستہ نہ تھا۔ ڈارمیٹریوں کے گرد اونچی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر لوہے
مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔

یہ بورڈنگ دوسرے کالجوں کے عام بورڈنگ کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بہت سی قیود او
پابندیاں تھیں۔ باہر کا مہمان بورڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مہمان کو ملنے کے لئے لڑکے
باہر ملاقاتی کمرے میں جانا پڑتا۔ رات کو دس بجے صدر دروازہ بند کر دیا جاتا اس کے بعد کسی
اندر آنے کی اجازت جا کر رجسٹر میں حاضری لگاتے اور غیر حاضر طلبا کی رپورٹ کی جاتی اور عادی
طور پر غیر حاضر رہنے والے کو کالج سے نکال دیا جاتا۔ ایلی کو وہاں پورے آٹھ مہینے گزارنے تھے۔

اسی روز نہ جانے کیوں وہ چلتے چلتے ملاقاتی کمرے میں رک گیا اچھا خاصہ کمرہ ہے اس نے
سوچا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں جا پہنچا۔ اگر منصر ملنے آئے تو وہ
یہاں آئے گا اور پھر ——"

"ارے تم۔" جی کے اندر جھانکتے ہوئے چلایا۔

ایلی چونکا۔

"تم یہاں —— کس سے ملنے آئے ہو۔ کیا مجھ سے؟"

"تم جی کے تم یہاں۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں"

"تم یہاں ہو۔" ایلی تعجب سے بولا۔

"تم کس سے ملنے آئے ہو۔"

"کسی سے بھی نہیں۔"

"تو پھر۔"

"بھائی میں یہاں ہوں۔"

"یہاں تو ہو لیکن کس طرح آئے ہو۔" جی کے بولا۔

"بھائی میں اسی کالج میں ہوں۔"

"کیا کہا۔"

"کیا تم بھی یہاں داخل ہوئے ہو۔"

"بالکل —— لیکن یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے ہم دونوں یہاں ہیں اور ایک
دوسرے کو دیکھا تک نہیں۔"

"تم تو بی ٹی میں ہو گے۔"

"ہاں ہاں۔"

"میں تو ایس اے وی میں ہوں۔"

"پھر بھی رہتے تو اسی بورڈنگ میں ہو نا۔"

"جی کے نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اسے ملاقاتی کمرے سے باہر لے گیا۔ وہ ناچ رہا
تھا رہا تھا تالیاں بجا رہا تھا۔ "یار یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت اچھے بہت اچھے دونوں اکٹھے رہیں
گے آؤ ادھر۔" وہ اسے ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک کمرے کی طرف لے گیا۔

"یہ کدھر لئے جا رہے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایلی کو کرسی میں بٹھا دیا۔ "اب آرام سے
لو۔ وہ چائے پلاؤں گا تمہیں کہ ناؤ گھر بھول جاؤ گے۔"

"لیکن یہ کمرہ کس کا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"میرا اپنا کمرہ ہے۔" پال نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

"لیکن یہاں تو ڈارمیٹریوں میں رہتے ہیں سب۔"

"پڑے رہیں میں تو ان خچر پاتری اصطبلوں میں نہیں رہ سکا۔ اور اب تم بھی یہیں رہو
"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ابھی اپنا سامان یہاں منگوالو۔ ویسے تو چار سیٹوں کے لئے ہے لیکن ہم اسے

ڈبل سیٹر بنالیں گے۔"

"لیکن سپرنٹنڈنٹ۔"

"لالہ جی۔" وہ چلایا "لالہ جی میری ہربات مانتے ہیں۔ ان کا فکر نہ کرو۔"

ایلی کا سامان اسی روز جی کے کمرے میں آگیا اور وہ دونوں وہاں اکٹھے رہنے لگے۔

چھ لڑکیاں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں زندگی ایک محور کے گرد گھومتی تھی۔ اور یہ محور چھ لڑکیاں تھیں یہ لڑکیاں بی ٹی گلاس کی طلبا تھیں۔ دن بھر کالج کے وقت بی ٹی کے طلباء شدت سے محسوس کرتے کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہی ہیں ان کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ صرف لڑکے ہی نہیں۔ بیشتر پروفیسر بھی ان کی موجودگی کا شدید احساس رکھتے تھے۔

ایس اے وی کے طلباء کو یہ احساس ہوتا کہ ساتھ والے کمرے میں لڑکیاں ہیں ایک نہیں چھ۔ اور ان کے اپنے کمرے میں کوئی بھی نہیں۔ اور ابھی جب وہ حساب کا پیریڈ ختم کر کے برآمدے سے گزر کر جغرافیہ پڑھنے کے لئے جائیں گے تو راستے میں گزرتے ہوئے انہیں دیکھیں گے۔ وہ نیچی نگاہ کئے بیٹھی ہوں گی۔ یوں کام میں منہمک ہوں گی۔ جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو مگر اس کے باوجود انہیں سب خبر ہوگی۔ ہر لڑکا یہ سوچتا کہ وہ اس کی چال دیکھیں گی۔ یہ دیکھیں گی کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں ٹائی کس رنگ کی ہے۔ بال کیسے بناتا ہے۔ اور اس کا انداز کس قدر رومانٹک ہے کالج سے فارغ ہو کر جب وہ بورڈنگ میں آتے تو آپس میں ان کے متعلق بحثیں کرتے۔

"بھئی مس رومو بڑی چالاک ہے بن دیکھے بات تاڑ جاتی ہے۔"

"یار آج مس مینا نے حد کر دی۔ دفعتاً" ایسی نگاہ ڈالی کہ اپنے ہوش گم ہو گئے۔"

"آج مس رادھا شام کے ساتھ ٹک شاپ میں گئی تھی۔"

"اور وہ دیکھا تھا تم نے مس مینا نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یار بڑا کلر سنس ہے اسے۔"

وہ لڑکیاں چنداں خوب صورت نہ تھیں نہ ہی ان میں زندگی کی خصوصی چمک تھی البتہ

سنجیدہ اور خاموش تھیں اس کے باوجود ان کا توجہ کا مرکز ہونا۔ وجہ فقط یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی کالج میں مخلوط تعلیم رائج نہ تھی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج واحد کالج تھا جس میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ اور مشن کالج کے طلباء بھی بہانے بہانے سنٹرل ٹریننگ کالج آیا کرتے تھے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ سکیں اور اگر ممکن ہو تو ——— شاید کوئی راستہ نکل آئے۔

بی ٹی کے پانچ چھ لڑکے تو ہروقت ان کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ وہ جیب میں زائد پنسل اور قلم رکھتے اس بات کے منتظر رہتے کہ کب ان میں سے کسی کے قلم کی سیاہی ختم ہو یا پنسل کا سکہ ٹوٹ جائے تاکہ انہیں پنسل یا قلم پیش کر سکیں۔

وہ بڑی محنت سے کلاس کے لکچروں کے نوٹ لکھتے اور بورڈنگ آکر بنا سنوار کر انہیں نقل کرتے کہ شاید لڑکیوں کو نوٹ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ جیب میں زائد رومال اٹھائے پھرتے نہ جانے کب کوئی لڑکی لان میں بیٹھنا چاہے تاکہ وہ فوراً" رومال گھاس پر بچھا دیں۔ ان لڑکوں کو کوٹ بردار کہا جاتا تھا چونکہ وہ لڑکیوں کے کوٹ اٹھائے پھرتے تھے۔ اکثر لڑکے طنز سے انہیں دکٹ بردار کہا کرتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ کوٹ برداری ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا اگر کوئی لڑکی کسی کو اپنا کوٹ اٹھانے کے لئے دے دیتی تو وہ لڑکا پھولے نہ سماتا اور اس بات پر فخر کرتا دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے در پردہ اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھتے۔

ایلی کے لئے یہ محور قطعی طور پر دلچسپی سے خالی تھا۔ ان چھ میں نہ تو کوئی سادی تھی اور نہ شہزاد۔ اور پھر وہ تھیں بھی کیا ایک دو تو والدہ قسم کی تھیں ایک دو وہ چیزیں بن چکی تھیں جو کتابیں جمع عینک جمع ڈیلا پن جمع جلی کٹی نگاہ جمع نسوانیت کا فقدان کا مجموعہ ہوتی ہیں دو ایک البتہ قبول صورت تھیں مطلب ہے اچھی خاصی' وہ خاموش رہتی تھیں۔ ہنستی نہ تھیں کہ کوئی ان کی ہنسی کو التفات نہ سمجھ لے۔ آنکھیں نہ مٹکاتی تھیں کہ کوئی ان کی پتلیوں کی جنبش کو اشارہ نہ سمجھ لے کھل کر بات نہیں کرتی تھیں کہ کوئی بات منہ سے نکل نہ جائے۔

ایلی کے کانوں میں ابھی تک سادی کی باتیں گونجتی تھیں اس کی نگاہوں میں شہزاد کے ماتھے کا تل شنگرف کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کے لئے وہ چھ لڑکیاں جاذب نظر تھیں جماعت میں بیٹھے ہوئے وہ یہ آرزو کرتا کہ جلدی پیریڈ ختم ہو اور وہ برآمدے سے گزرے۔

موٹی موٹی کتابیں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہوتے ہی ایلی پنجاب پبلک لائبریری کا ممبر بن گیا تھا جہاں سے اسے بیک وقت آٹھ کتابیں مستعار مل سکتی تھیں اور وہ ہر ہفتے موٹی موٹی ضخیم کتابیں تبدیل کرلایا کرتا تھا ایلی نے کتابوں سے از سر نو دلچسپی پیدا کرلی تھی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لڑکے لڑکیوں سے کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

"آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے کیا۔"

"فلاں مصنف نے تعلیم کے متعلق ایک انوکھی تھیوری پیش کی ہے۔"

"نفسیات میں دلچسپی ہو تو فلاں مصنف کا مطالعہ کرو۔"

ایلی کالج کے اوقات میں کتابیں لانے کا خاص پروگرام بنایا کرتا تھا۔ اگرچہ اسے کافی لمبا چکر کاٹنا پڑتا لیکن لائبریری سے آتے ہوئے وہ ایسا راستہ اختیار کرتا۔ کہ واپسی پر اسے کالج کے برآمدے سے گزرنا پڑے لور وہ کتابوں کے اس انبار کو یوں اٹھائے برآمدے سے گزرتا جیسے اسے خبر ہی نہ ہو کہ وہاں بی ٹی کلاس میں لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا اس وقت اس کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ لڑکیوں کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھے لیکن وہ اس انداز سے اٹھاتا کہ ان کی پشتیں واضح طور پر دکھائی دیں۔

جاہ کی صحبت کی بدولت ایلی چند ایک مشہور مصنفوں کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا اس مطالعہ کی ابتداء برٹرنڈرسل سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے بکسلے ہالڈین شاپن ہارسنتایانا کی چند ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر انصار منصر سے متاثر ہو کر اس نے داستودسکی اور انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے مطالعہ سے براہ راست خاص دلچسپی نہ تھی۔ جب کبھی سادی کی یاد اسے ستاتی تو وہ اپنی توجہ منعطف کرنے کے لئے نطشے یا برگستاں کی کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا یا جب کبھی شہزاد کے رویے سے وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے تو وہ احتجاجاً" کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور بصد مشکل اس کے چار ایک صفحات پڑھتا لیکن پھر اسے نفس مضمون سے دلچسپی محسوس ہونے لگتی اور اس طرح اس کا مطالعہ منفی حیثیت چھوڑ کر اثباتی حیثیت اختیار کرلیتا بہرحال مطالعہ اس کے لئے محض فرار تھا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج میں بھی اسے زیادہ تر دلچسپی کتابیں لانے اور ان کی نمائش کرنے سے تھی۔ کتابیں جو وہ لاتا تھا۔ تمام فلسفے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا فزیکس کے ایسے مسائل کے متعلق جن میں فلسفے کا رنگ حادی تھا۔ ناول پڑھنے سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ ناول میں عشق و محبت کی داستانیں ہوتی تھیں اور پڑھتے ہوئے اسے شہزاد کا کمرہ یاد آجاتا سادی کے مکان کی وہ سیڑھیاں جہاں وہ رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اس طرح مطالعے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اس سنجیدہ قسم کے مطالعے سے اس کے جذبات کی جھلکن تو دور نہ ہو سکتی البتہ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی کرختگی سی پیدا ہو گئی۔ جیسے زیادہ ابلے ہوئے انڈے پر ہوتی ہے اس کا چہرہ لمبوترا ہوا جا رہا تھا ٹھوڑی نکلتی آرہی تھی۔ اور پیشانی پر گہری تیوری قائم ہوئی جا رہی تھی۔

شاید ایلی ان نمائشی کتابوں کو کبھی نہ پڑھتا لیکن جی ۔کے کے طعنوں نے اسے مجبور کر دیا ان طعنوں سے مخلصی پانے کیلئے چاروناچار اسے ہر روز وہ کتابیں کھول کر بیٹھنا پڑتا۔

جی کے

جی کے ایک نہیں بلکہ دو مزاج تھے۔ وہ بیک وقت بے حد خوش مزاج اور بہت دکھی تھا۔ ان دو مزاجوں کی کھینچا تانی جی کے کی زندگی کا حاصل تھی۔ جب وہ چپ ہوتا تو بالکل ہی چپ ہو جاتا۔ اس کی طوطا نما خمدار ناک کی دیوار پر بدمزاجی کا ڈھیر لگ جاتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دکھ کے انبار لگنا شروع ہو جاتے۔ جب وہ بات کرنے کے موڈ میں ہوتا تو وہ اٹھ کے جاتا۔ شور مچاتا۔ مذاق کرتا۔ شوخ باتیں کرتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یوں ہوتی جیسے سوڈے کی بوتل کھل گئی ہو۔ چھینٹے اڑتے بلبلے اٹھتے اور سب کو بھگو دیتے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جی کے کا اصلی مزاج کونسا تھا اور نقلی کونسا۔

بہرصورت ایلی کے نزدیک جی کے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انا پسندی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو درست سمجھتا تھا اپنی بات کو حق تصور کرتا اپنے جذبات کو خارجی حالات کا مناسب ردعمل سمجھتا تھا۔

جی کے ازلی طور پر آقا طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا برتاؤ محبت رعونت کرختگی خود اعتمادی اور نخوت کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے حلقے کا از خود سردار بن جاتا اور پھر سردار مان لیا جاتا۔ اس بات پر

ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا۔ ایلی میں سردار بننے کی نہ تو ہوس تھی اور نہ اہلیت۔ وہ ہمیشہ کسی
کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا لیکن جب پیچھے چلتا تو محسوس کرتا کہ اسے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جا رہا
ہے۔ اور یہ زیادتی ہے۔ لہٰذا اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا دراصل ذہنی طور پر ایلی میں شدت کی
انفرادیت موجود تھی ذہنی طور پر ایلی مضبوط تھا لیکن طبعی طور پر بے حد کمزور اور بودا تھا اس لئے
جی کے کی انا پرستی سے بے حد نالاں تھا۔

مثلاً" ایلی کی کتابوں کو دیکھ جی کے طنزاً" چلاتا۔

"ارے یہ کتابیں پڑھے گا کون۔"

"کچھ نہ کچھ تو دیکھ لوں گا۔" ایلی جواب دیتا۔

"کیوں ان میں تصویریں ہیں کیا۔" جی کے کی طنز شدت اختیار کر لیتی۔

"نہیں تو۔"

"تو پھر دیکھنے کا کیا مطلب؟"

"مطلب ہے کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔"

"یہ فرائیڈ۔ واٹسن۔ ایلس۔ جیم جینز ورڈز ورتھ۔ انہیں پڑھو گے تو تم۔ لیکن سمجھے گا کون؟"

"تم جو ہو تمہاری مدد سے کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔" ایلی طنزاً" کہتا۔

"اونہوں۔ بھئی ہم تو حساب دان ہیں۔ حساب کا کوئی مسئلہ لے آؤ ——— لیکن یہ فلسفہ اور نفسیات اور جنسیات یہ اپنے بس کا روگ نہیں۔"

جی کے کی ان باتوں کی وجہ سے ایلی کو لازماً" ہر روز کسی ایک کتاب کو کھول کر بیٹھنا پڑتا ——— پھر وہ بھول جاتا کہ اسے صرف کتاب کھول کر بیٹھنا ہے پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پڑھنے کی جگہ وہ سادی کی خوش گپیوں کے متعلق سوچ سکتا ہے شہزاد کے حسین جسم کا تصور کر سکتا ہے پہلوئے حور میں لنگور کے واقعہ پر غور کر سکتا ہے لیکن اس واقعہ پر غور کرنا تو ایلی کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب تو یہ صورت پیدا ہوئی جا رہی تھی کہ سادی کا خیال آتا تو اسے ٹھیس لگتی اور وہ شدت سے محسوس کرتا کہ سادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اگر وہ رہتی وہیں لاہور میں رہتی تو والد صاحب کا انکار بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

جی کے کو کالج کی ان چھ لڑکیوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ چلاتا۔

"یہ لڑکیاں سب کے اعصاب پر سوار ہیں۔ اور پھر لڑکیاں کہاں وہ تو بیشتر عورتیں ہیں والدہ قسم کی عورتیں۔ کیوں ایلی کیا تمہیں والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی ہو سکتی ہے"۔

جی کے کا سوال سن کر ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اس کے روبرو صفیہ آ کھڑی ہوتی اور اپنا نادیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی۔ خانم گورے گدے سے ہاتھوں سے اس کے گال سہلاتی۔ ایلی کو والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق تھا۔ عورت در حقیقت اس کے ذہن میں بھرے بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے جو سہلانے اور تھپکنے کے لئے بے قرار تھے لیکن ایلی نے کھلے طور پر اس شدید جذبے کو کبھی اپنایا نہ تھا۔

"لاحول ولا قوۃ" وہ گویا شدت جذبات کا اظہار کرتا۔ نہ جانے کیوں یہ سب پاگل ہو رہے ہیں۔ کیوں پاگل ہو رہے ہیں۔ بتاؤ نا۔ بول۔" جی کے ترنگ میں آجاتا "جواب دو۔"

"یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔" ایلی کو جی کے پر غصہ آنے لگتا۔

"کیا مطلب" وہ چلاتا "نوجوان والدہ قسم کی عورتوں کو پسند کریں۔ عجیب بات نہیں کیا۔"

"نوجوان نہ کریں تو کیا بوڑھے کریں گے۔" ایلی جواب دیتا۔

"تم بھی بے وقوف ہو۔" جی کے جوش میں آجاتا۔

"ہم دونوں ہی بے وقوف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی حماقتوں کا احساس نہیں۔"

"بالکل غلط۔" وہ چلاتا "تم ہو گے ہم تو نہیں۔ ہم تو دانش ور ہیں۔ دراصل یہ فرائیڈ پڑھ پڑھ کر تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ تم سے بات کرنا بے کار ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

جی کے اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ خاموش ہو جاتا۔ اس کی ناک پر بدمزاجی کے ڈھیر لگ جاتے آنکھوں سے دکھ جھانکتا۔ مظلومیت کی پھوار پڑتی۔

جی کے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے حد مظلوم سمجھتا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔ دوسروں کے مفاد کے لئے وہ اپنے خیالات یا مفاد کی قربانی نہیں لیتا تھا سمجھتا تھا کہ وہ دے رہا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا ایلی ——— اس قسم کے خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا کہ وہ خیالات غلط ہیں۔ ایک

دوست کا اسے یوں جھٹلانا ــــــ اور پھر دوست بھی ایسا جس کے لئے اس نے کیا نہ کیا ہو۔

چپ ہو جانے سے پہلے جی کے ایلی کی طرف ایک نگاہ ڈالتا بالکل وہی "واٹ ٹو بروٹس" والی نگاہ۔ اور پھر سیزر کی طرح آرام کرسی میں گر جاتا اور ایلی کے متوقع خنجر کے وار کا انتظار کرتا ــــــ پھر اسے غصہ آتا کہ متوقع وار میں تاخیر کیوں کی جا رہی ہے۔ تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ جی کے کے کرب میں اضافہ کیا جائے۔

ایلی کو یہ سب باتیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسے صرف جی کے کی پھولی ہوئی ناک نظر آتی تھی جس پر بدمزاجی کے انبار لگے ہوتے۔

پھر ان کے دوستوں میں سے کوئی آجاتا۔ مثلاً بابا شام پریم رائے یا جان۔

"ارے تم دونوں اندر بیٹھے ہو۔" شام چلاتا "ہائیں یہ الیاس اتنی موٹی کتاب پڑھ رہا ہے۔"

"یہاں تو بڑی بڑی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اس کمرے میں۔" جی کے بڑے رعب سے جواب دیتا۔

"کیا ہے یہ۔" شام پوچھتا۔

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی پوچھنے کا فائدہ۔"

ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا۔ لو۔ ابھی ان موٹی کتابوں پر تمسخر کر رہا تھا اور اب ان پر فخر کا اظہار کر رہا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں جیسے وہ کتابیں اس کی اپنی ہوں اور اس نے ایلی کو پڑھنے کے لئے مستعار دی ہوں اور ساتھ ہی نفس مضمون کو سمجھنے میں ایلی کی امداد کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہو۔

جی کے اکثر ایلی پر بھی فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اس اظہار میں ایلی کی عظمت کا عنصر نہ ہوتا بلکہ ایلی کی عظمت کا پہلو نکلتا۔ مثلاً دوسروں کے روبرو وہ ایلی کی دوستی پر فخر کا اظہار کرتا تو ایسے محسوس ہوتا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا ہم وہ ہیں جس کے ایسے دوست ہیں۔

بابا

لڑکیوں کے متعلق کئی ایک مختلف زاویہ نظر رائج تھے۔ بابا کا نقطہ نظر بہت دلچسپ تھا۔ بابا کا نام آئزک تھا اس کی عمر چالیس برس تھی چہرہ ڈھلک چکا تھا۔ جسم میں بیل کی سی بے حسی تھی۔

آنکھوں میں شرارت چمکتی اور وہ بھی مخصوص اوقات پر۔ اس کے کل نو بچے تھے۔ بہت سی بیٹیاں اور تھوڑے سے بیٹے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کب سے بچے پڑھانے کا کام کر رہا ہے پوچھو تو کہتا "بس سمجھ لو جب سے آدم نے پھل کھایا ہے تبھی سے پڑھانے کی نوکری کر رہا ہوں۔ شاید اس سے بھی پہلے سے۔ اور اب سالوں نے مجھے ریفریشر کورس کے لئے یہاں بھیج دیا ہے۔"

اس عمر کے باوجود بابا بنیادی طور پر محبوب واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو ہنس کر کہتا "یہ تم کونسی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو۔ سارا دن سبھی لوگ لڑکیوں کا رونا روتے ہیں۔ ہم نے تو کوئی لڑکی نہیں دیکھی یہاں۔"

"بابا" ایلی چلایا۔ "ایک نہیں چھ ہیں چھ۔"

"ہوں گی بھائی۔" وہ بے پروائی سے کہتا "لیکن ہم نہیں مانتے اگر وہ لڑکیاں ہیں تو بھائی خود ہمارے پاس کھنچی چلی آئیں گی۔ آج تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور خود بخود ہماری طرف نہ کھنچی چلی آئے۔"

"دیکھا تو کرتی ہیں تمہاری طرف۔" ایلی نے اسے چھیڑا۔

"بابا۔" جی کے چیختا۔ "وہ تو والدہ قسم کی ہیں تمہارے جوڑ کی ہیں۔"

"ابے تجھے کیا پتہ" بابا ہنستا۔ تو دو اور دو چار کے سوا کیا جانتا ہے جو والدہ قسم کی ہوتی ہیں۔ تو انہیں اپنی گود ہری رکھنے کے لئے لمڈے تلاش کرتی ہیں۔ ہاں اگر لڑکی ہو تو وہ البتہ" وہ اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہتا "مرد ڈھونڈے گی۔ دیکھ لینا ایک نا ایک دن ہمارے پہلو میں پہنچ کر رہے گی اگر ان میں کوئی لڑکی ہے تو۔ اور اگر نہیں تو ہٹاؤ سب کی سب تمہیں کٹیں۔" وہ شام سے کہتا "ہم گود میں بیٹھنے کے قابل نہیں بٹھانے کے ہیں۔"

بابا کی شخصیت میں ایک عجیب سی مٹھاس تھی اس کے انداز میں جذباتی گرمی منعکس ہوتی تھی۔ ایک عجیب سانگھ۔ اس سے چاہے بات کرو نہ کرو ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ تمہارے پاس بیٹھا ہو۔ تمہارے دکھ درد میں برابر کا حصہ دار ہو۔ اول تو وہ بحث کرنے کا عادی ہی نہیں تھا اور اگر کبھی دوسرے کو جھٹلاتا بھی تو دوسرا محسوس کرتا کہ درحقیقت دل ہی دل میں وہ اس کا ہم نوا ہے ویسے ازراہ مذاق اختلاف رائے کا اظہار کر رہا ہے۔

شام

شام گویا ناچتی ہوئی سورج کی ایک کرن تھی۔ جہاں بھی وہ پہنچ جاتا وہ جگہ انبساط کے دودھیا

اجالے سے منور ہو جاتی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں شام آجاتا تو بحث خوش گوار
گفتگو میں بدل جاتی دلائل رنگین اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بی ٹی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس زمانے میں
نوکری ملنی بے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس
۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے "یار تم ایم۔ ایس سی۔ ہو۔" تو وہ ہنس کر کہتا "ایم۔ ایس۔ سی ہوتا
تو اب اے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔"

لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو وہ ہنس کر چلاتا "یار ہم تو فیل ہو گئے کوئی اپنی طرف تو دیکھتی ہی
نہیں حالانکہ قسم ہے پرماتما کی منہ پر روز کریم مل کر آتا ہوں۔ شیو کے بعد اسٹرجنٹ لگاتا ہوں
بال بڑی احتیاط سے بناتا ہوں۔ کلاس میں جان بوجھ کر چمکدار باتیں کرتا ہوں۔ ذہانت اور رنگینی
سے بھرے ہوئے جتنے جملے یاد ہیں ان کا بروقت برمحل استعمال کرتا ہوں لیکن سب بے کار
دیکھتی ہی نہیں اپنی طرف۔"

"کونسی نہیں دیکھتی۔" جی کے پوچھتا۔

"کوئی سی ہے دیکھ لے بھائی اس میں کیا ہے۔ بھوکے کیک پیسٹری نہیں مانگا کرتے اور
میاں وہ انگریز نے کہا ہے نا بھئی کیا خوب کہا ہے۔ "بیگرز آرناٹ چوزرز" منگتے کس منہ سے
چناؤ کریں۔"

"ابے فکر نہ کر۔" بابا چلاتا۔ "خود آجائیں گی ایک نہ ایک روز۔"

"فی الحال خط ہی بھیج دیں۔" شام چلاتا۔

"جو خط آگیا تو مصیبت پڑ جائے۔ جی کے شور مچاتا۔ پرماتما کے لئے مصیبت پڑ جائے
جلدی پڑے" شام کہتا "اس خیریت ہی خیریت سے تم ہم تنگ آ گئے۔ ڈر ہے کسی روز زہر
کھالوں۔"

"زہر خریدنے جاؤ گے تو مجھے بتا دینا۔" ایلی کہتا۔

"تو لو بتائے دیتے ہیں۔" شام ہنستا۔

...زک تھا اس لی مرچا۔ ہے ہو خریدنے۔" ایلی پوچھتا۔

یں۔"

...ہو لی والی ہے۔"

...ہو یا قیم سائنائیڈ۔ لیبارٹری سے اڑائی ہے بڑی مشکل سے۔ جس روز موڈ خراب ہو ٹرنک
...ل کر کپڑے تک نہیں بدلتا۔"

...ہیں؟"

"ڈرتا ہوں کہیں کھا نہ لوں۔" شام مسکرا کر کہتا لیکن اس کی مسکراہٹ میں سنجیدگی
...تی

"وہ کیسے؟"

"وہیں کپڑوں کے ساتھ ٹرنک میں رکھی ہے نا اس لئے ٹرنک نہیں کھولتا۔"

"لڑکیوں کو معلوم ہے کہ تمہارے ارادے خطرناک ہیں"۔ جی کے ہنستا۔

"ارے یار اتنے دوست ہیں لیکن کوئی نہیں بتاتا انہیں۔ آجکل سچا دوست کہاں ملتا ہے۔"

"تو میں بتا دوں۔" بابا کہتا۔

"تو سن لو نیکی اور پوچھ پوچھ۔" شام چلاتا۔

"کس کو بتاؤں؟"

"باری باری سب کو بتا دو" ممکن ہے کسی کا دل پسیج جائے۔" شام سنجیدگی سے کہتا۔

شام کی باتوں سے یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ دکھاوے کی بات کر رہا ہے۔ یا رنگین گفتگو کی
...ٹ کر رہا ہے۔ اس کے انداز میں ایک عجیب قسم کی عجز اور خلوص تھا جو ایلی کو بے حد پیارا
...تھا۔

ایلی کو پڑھتے دیکھ کر شام جی کے کی طرح طنز نہیں کرتا تھا اس کے برعکس وہ حیرت سے
...اور کہتا۔

"یار تم اتنی بڑی بڑی کتابیں پڑھتے جا رہے ہو اور یار لوگ اس پاکٹ بک میں کھوئے
...ئے ہیں۔"

"کون سی پاکٹ بک۔" ایلی پوچھتا۔

"وہی لڑکیاں اور کون۔"

"کون سی لڑکی۔"

"کوئی سی۔ آج ایک نے رحم کھا کر اٹھانے کے لئے کوٹ دے دیا مجھے جب سے نشہ سا

طاری ہے ——— طبیعت اتنی خوش ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ جو کہو منظور۔ کہو تو ٹک
سے کیک کھلا دوں۔" وہ اپنے جیب ٹٹولتا۔ "لو۔ پورا سوا روپیہ ہے کھا لو جو کھانا ہے آج
پچھتاؤ گے۔ ایسے سنہرے مواقع روز نہیں ملتے۔"

والدہ قسم کی لڑکیوں کے متعلق جی کے شام سے پوچھتا۔ "یار تمہیں ان سے گھن
آتی۔"

شام منہ بنا کر جواب دیتا۔ "بے حد" اس کے انداز سے سخت نفرت کا اظہار ہوتا "مجھے
آتی ہے اور جب وہ لڑکیوں کی طرح چونچلے کرتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ منہ پر یہ تھپڑ دوں"
شام جوش میں آکر تھپڑ چلاتا ———"

"ہوں ——— یہ"

"ہے نا۔" جی کے کہتا۔

"بالکل" شام جواب دیتا۔ "میرا تو اور بھی جی چاہتا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ تھپڑ دوں۔" شام پھر بازو ہوا میں زور سے گھماتا۔ "پھر دفعتاً" اپنی اس حرکت پر اس
قدر ندامت محسوس کروں کہ اس کے قدموں میں گر جاؤں اور پھر وہ مجھے اٹھا کر گود میں بٹھا
اور پھر لوری دے کر سلا دے۔ یار مجھے زندگی میں کبھی کسی نے لوری دے کر نہیں سلایا۔ اماں
تو بالپن میں ہی چھوڑ کر چلی گئیں تھیں۔

شام کا بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی بات پر نکتہ چینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو
تھا۔ وہ سچ کہہ دیتا تھا۔ حالانکہ سچ کی نوعیت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اسے کہہ دینے میں بے
جرات کی ضرورت ہوتی ایلی بھی چاہتا تھا کہ وہ سچی بات کہہ دے لیکن اس میں کبھی جرات پید
نہ ہوئی وہ ڈرتا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے وہ ڈرتا تھا کہ لوگ اسے اخلاق سے گرا ہوا سمجھ
گے۔ لیکن شام جب بھی اس قسم کی بات کرتا تو اس طرح سے اسے ادا کرتا جیسے اس میں ا
یا لوگوں کے دلوں میں نفرت احتجاج یا کچھ اور پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایلی چاہتا
کہ وہ شام کی طرح باتیں کر سکے۔ سچی باتیں جن میں رنگینی اس قدر غالب ہوتی ہے کہ لو
کے دلوں میں کوئی اور ردعمل پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن ایلی کی یہ خواہش خالی خواہش ہی
رہی اور اس میں اتنی جرات نہ پیدا ہو سکی کہ اس پر عمل کر سکے۔

رائے

شام کے علاوہ اور لڑکے بھی تھے مثلاً" جان تھا۔ لیکن وہ تو گونگا تھا۔ بات سن کر ہنس دینے
کے علاوہ اس نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان سب میں بیٹھ جاتا بیٹھا رہتا۔ ان کی باتیں سنتا رہتا
اور مسکراتا رہتا۔ اس نے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

پھر رائے تھا ایک جذباتی لڑکا تھا کئی ایک باتوں میں تو وہ جمال سے بہت ملتا جلتا تھا مثلاً" اپنی
لڑکیوں اور محبوبوں کی باتیں سنانے کے لئے اسے ایک رازداں کی اشد ضرورت تھی ضروری نہ تھا
کہ رازداں قابل اعتماد ہو یا اچھا مشورہ دے سکے یا کچھ اور جہاں تک رائے کا تعلق تھا رازداں
کے چناؤ کی چنداں ضرورت نہ تھی چونکہ اسے صرف ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو اس کی
باتیں سنتا رہے۔ ٹوکے نہیں ایسا مشورہ نہ دے جو اسے قابل قبول نہ ہو۔ جب وہ حماقت کرنے
پر تلا بیٹھا ہو تو عقل کی بات بتا کر اسے روکنے کی کوشش نہ کرے بلکہ حماقتوں میں اسے شہہ
دے۔ اس لڑکی کو جسے وہ حسین سمجھتا تھا عام لڑکی نہ سمجھے بلکہ اسے اہمیت دے اور اس میں وہ
خوبیاں دیکھے جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتی ہوں۔ غرضیکہ اسے ایک سامع رازداں کی ضرورت
تھی اور اس رول کے لئے ایلی بے حد موزوں تھا اس لئے رائے اسے اپنے تازہ ترین کارنامے
سناتا رہتا تھا۔

ایلی نے کبھی غور سے رائے کی بات نہ سنی تھی اگرچہ وہ اس انداز سے سنتا تھا جیسے واقعی
بڑے غور اور انہماک سے سن رہا ہو۔

بہرحال رائے کے قصے ایلی نے کبھی نہ سنے تھا اس کے باوجود اسے ان کے متعلق چند ایک
باتوں کا دھندلا احساس تھا مثلاً" رائے کی ایک محبوبہ گاؤں میں رہتی تھی اور وہ اسے ملنے کے لئے
شدت سے بے قرار تھی۔ اور ہر پندرھویں روز اسے گاؤں بلا بھیجتی اور اگرچہ اس کے والدین کو
ان کا رائے سے ملنا قطعی طور پر ناگوار تھا تاہم وہ رائے کے الفاظ سے اس قدر بولڈ تھی کہ
اسے اپنے گھر ٹھہراتی اور پھر رات کے اندھیرے میں چپکے سے ملتی۔ اس پر بوڑھی ماں شدت غم
سے پہلو بدلتی۔ باپ احتجاج کے طور پر بار بار کھانستا لیکن وہ بڑی بولڈ لڑکی تھی اور اس کی اس
دلیری کی وجہ سے رائے کو اس سے والہانہ محبت تھی رائے کی دوسری محبوبہ شہر میں رہتی
تھی گرلز مشن سکول میں استانی تھی اور اتنی قبول صورت اور اڈوانسڈ تھی کہ سبھی کرسچین نوجوان

جو گرد و نواح میں رہتے تھے اس پر ہزار جان سے عاشق تھے اسے راہ چلتے چھیڑتے تھے لیکن رائے
کے سوا اسے کوئی پسند نہ تھا چونکہ اسے رائے سے محبت تھی۔

رائے کی تیسری محبوبہ لاہور ہی میں تھی۔ وہ بے حد معصوم اور خوبصورت تھی۔ اِ
معصوم تھی کہ ان دنوں ایک بدمعاش لڑکے نے اسے قابو میں کر رکھا تھا۔ اور وہ بیچاری ان جا
سیدھی راہ سے بھٹک گئی تھی بہرصورت رائے جانتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ سمجھ جائے گی
کہ وہ بدمعاش نوجوان محض اپنا مطلب پورا کر رہا ہے اور پھر وہ ایک نئے شوق اور تازہ عزم سے
رائے کی طرف لوٹے گی اور ان کا رومان پھر سے تازہ ہو جائے گا۔ ان دنوں رائے کی سب سے
بڑی خواہش یہ نہ تھی کہ گاؤں والی محبوبہ اسے بلائے یا شہر والی محبوبہ کو نوجوان دق کرنا چھوڑ دے
یا لاہور والی محبوبہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان دنوں تو اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کالج کی ان چھ لڑکیوں میں سے کسی ایک کے
ساتھ اس کا رومان چل پڑے اور اسے ہر ماہ دو بار اتنی دور گاؤں تک سفر نہ کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں وہ اکثر ایلی سے مشورہ طلب کیا کرتا تھا۔

"یار ایلی کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ اپنی بات بن جائے۔"

اور اگر ایلی جواب دیتا۔ "لو۔ اس میں کیا ہے جا کر کسی کا ہاتھ پکڑ لو۔"

"اور اس نے تھپڑ مار دیا تو۔"

"تھپڑ مار دیا تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔" ایلی کہتا۔ "ایکسپرس کا یہی فیصلہ ہے۔"

"کیسے؟"

"سیدھی بات ہے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو سمجھو بات ٹوٹ گئی۔ پکڑے رکھا تو تعلقات قائم ہو
گئے اور اگر جرات کر کے اسی وقت آغوش میں لے لیا تو ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں دماغ پر
مسلط ہو جاؤ گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" رائے جواب دیتا۔ "لیکن کبھی یار اکیلے میں کوئی ملے تو بات بنے۔ اسی
کوشش میں لگا تھا کہ کبھی اکیلے میں کوئی مل جائے۔

ویسے ایلی کو کئی مرتبہ وہ اکیلے میں ملتی تھیں لیکن ایلی نے کبھی ہاتھ تھامنے کی کوشش نہ کی
تھی۔ ہاتھ تھامنا چھوڑ ——— اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دور سے کوئی اکیلی چلی آتی
دکھائی دیتی تو ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا جیسے لڑکی نہیں جگا ڈاکو آ رہا ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی

اسے حوصلہ ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ مڑ کر بھاگ لے۔ نہیں نہیں وہ سوچتا یہ
ہوا جائے تاکہ اسے ... کیا کہے گی وہ۔ مجھے تو یوں گزر جانا چاہیئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آخر بات کیا ہے
... کوئی گزر رہی ہے نا اور کیا اور لڑکی بھی وہ جو مجھے قطعی پسند نہیں۔ پھر گھبراہٹ کیسی۔ وہ
... اٹھا کر یوں چلنے لگتا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس
... جھک جاتی۔ نگاہیں کونے تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

لیکن ایلی کی بات چھوڑیئے اسے تو ان چھ لڑکیوں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور ایسی لڑکیوں
... رومان کیسے قائم کیا جا سکتا ہے بھلا۔ جنہیں انسان جب جی چاہے جا کر مل سکے۔ ان حالات
... محبت کا پیدا ہونا ایلی کی دانست میں ناممکن تھا۔

ایلی کی دانست میں محبت کے لئے ضروری تھا کہ بندشیں ہوں قیود ہوں۔ پردے اور
... حائل ہوں۔ برقعہ ہو گھونگھٹ ہو۔ نگاہ ترچھی۔ مسکراہٹ زیر لبی ہو۔ دور سے
... ہوں۔ ماتھے سے مکھی اڑانے کے بہانے سلام کیا جائے لو لیٹر لکھے جائیں۔ اور یہ کیا ہوا
... مس بینا کہئے مزاج کیسے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔

لڑکیوں کے بارے میں ایلی کو شام کا طرز عمل بے حد پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی
... کسی لڑکی سے اکیلے میں ملے اور کہے جسٹ اے منٹ مس یہ تو بتایئے کہ بھلا آپ کو دیکھ کر
... کچھ کچھ کیوں ہونے لگتا ہے۔ گردن کیوں لٹک جاتی ہے۔ نگاہیں کونے کیوں تلاش کرتی
... ——— اور اگر وہ جواب میں تھپڑ مار دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے جھٹ جیب سے
... اور روئی نکالے اور کہے اب ایک تکلیف اور کیجئے ذرا چوٹ پر ٹنکچر لگا دیجئے مجھے جگہ دکھتی

شام سے دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی دونوں کو اسفند یار سے بغض تھا۔ اسفند نہایت
... منکسار اور ذہین لڑکا تھا۔ وہ کسی مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ریفریشر کورس کے لئے بی
... میں داخل ہوا تھا۔ وہ راہ چلتے لڑکے کو روک لیتا۔ "کہاں جا رہے ہو بھائی کیئے وقت
... گزرتا ہے۔" اور اس کے قریب تر ہو جاتا اور قریب حتیٰ کہ آپ محسوس کرتے کہ ابھی وہ
... بغل گیر ہو کر آپ کا منہ چوم لے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے آپ کا دوست بن

جائے گا۔

وہ السلام علیکم کہہ کر جی کے کے کمرے میں آ پہنچتا۔ "بھائی تم ملتے ہی نہیں کئی مرتبہ
ہوں نہ جانے کہاں گم رہتے ہو تم دونوں۔ یار وہ ایک مشکل آن پڑی تھی۔ میں نے کر
حسابی سے جا کر پوچھوں اپنے کو تو حساب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں اے بی کورس وا
صرف تم ہو نا۔"

شام کی ڈارمیٹری میں جا کر وہ شام سے پوچھتا۔ "بھئی وہ پچنگ آف کمسٹری نیر
کوئی اتہ پتہ یار بتاؤ کچھ ہم بھی پڑھ لیں پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک زمانے کے بعد پھر
کے چکر میں پڑ پڑھ گئے اب عادت بنتے بنتے بنے گی۔"

اسفند ہر ایک سے ملتا تھا۔ بڑے پیار سے ملتا تھا۔ پیار کا اظہار کرتا تھا۔ اپنی ذہنی کم
اظہار بھی کرتا تھا محبت بھری نگاہیں بھی ڈالتا۔ قریب تر ہو کر اپنا بازو آپ کے شانے پر رکھ
یا آپ کا بازو اپنی بغل میں ڈال لیتا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کسی اصول کے تحت ا
لوگ بور سمجھتے تھے بور کا لفظ تو خیر اس زمانے میں رائج نہ تھا لیکن لڑکے اس سے کترا
تھے۔ اس کی مٹھاس کثیف محسوس ہوتی اس کا قرب کھلتا ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نرم
لیس دار چیز آپ سے چمٹی جا رہی ہو۔

نہ جانے قدرت کے کس قانون کے تحت اسفند کے آتے ہی دفعتاً یاد آیا کہ آپ
ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ اپنا پروگرام بدل دیتے کسی اور سمت کی طر
جانے کا فیصلہ کر لیتے۔

شاید اس کی وجہ لڑکیاں ہوں؟

اسفند سب سے بڑا کوٹ بردار تھا۔ وہ ہر وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہتا ہر وقت ان
طواف کرتا۔ چاہے وہ واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتیں۔ موڈ آف ہے آپ جائیے۔ چاہے
کا ساتھ منہ موڑ لیتا یا پوچھ لیتا۔ "کیوں اسفند صاحب آپ لائبریری کو جا رہے ہیں" لیکن
اسفند اپنی جگہ سے نہ ہلتا اور ہزار طنز کے باوجود اس کے ہونٹوں پر وہ لیسدار مسکراہٹ جمی
رہتی۔ اس کی طبعی مٹھاس جوں کی توں قائم رہتی اخلاق بدستور خوش گوار رہتا اس کی باتیں
جاری اور ساری رہتیں حالانکہ باقی لوگ وضاحت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہوتے کہ محفل
میں گنجائش نہیں لیکن اسفند کا رویہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر جانا

چاہے اس کا اپنا حرج ہی کیوں نہ وہ آداب محفل کو نظرانداز کرنے کے لئے
تیار نہیں۔
نہیں

اگر کوئی لڑکا لڑکیوں کو آئس کریم کھانے کی دعوت دیتا تو اکثر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ
ہم تو آئس کریم کھاتا ہی نہیں۔
مگر اسفند فوراً بولتا "کھاتا تو نہیں لیکن تمہارے جیسا پیارا دوست کہے تو انکار نہیں کروں
گا"

دعوت سے زبردستی چمٹے رہنے کی خصوصیت چھوڑیئے اس سلسلے میں تو اسفند اس حد تک
فراخ دل تھا کہ خود لوگوں کو دعوت دیتا۔ ٹک شاپ پر میزبان بن کر سب کو کھلاتا اور پھر چپکے سے
ٹک شاپ والے سے کہہ دیتا۔
"میاں یہ بل شام یا موہن ادا کرے گا۔" ویسے کسی دوسرے کی دعوت میں بھی اسفند کا
رویہ کچھ ایسا ہوتا اور وہ انہماک اور شوق سے لوگوں کو کھلاتا تاکہ ہر کسی کے دل میں احساس پیدا
ہوتا کہ دعوت اسفند کی طرف سے تھی۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے لوگ اسفند سے گھبراتے تھے لیکن ان باتوں کی وجہ سے تو صرف
ان لڑکوں کو گھبرانا چاہیے تھا جو لڑکیوں کے حلقے میں رہتے تھے۔ وہ لڑکے جنہیں لڑکیوں کے حلقے
سے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہیں گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسفند کے متعلق ان کے
خیالات بھی اسی قسم کے تھے اور یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ ایک روز ہنگامہ ہو گیا۔ ہوسٹل
کے صدر دروازے سے باہر برگد کے درخت کے نیچے وسیع میدان میں شور شرابے کی آوازیں
آنے لگیں۔ تمام لڑکے بورڈنگ سے باہر نکل آئے ادھر کالج سے بھی لڑکے آ موجود ہوئے برگد
کے نیچے دو لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی نے ہاتھاپائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ دونوں
غصے سے چیخ رہے تھے۔

"ابے جا بے تیری حیثیت کیا ہے کل کا لونڈا ہے۔ تو ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ میں وہ کمینہ
ہوں کہ کمینہ ہوں کہ ______"

"ابے ہٹ بے بڑا آیا ہے کہیں سے۔ میرے روبرو تیری دال نہیں گل سکتی۔ تو میری
رنگ سے واقف نہیں شکل و صورت تو دیکھ اپنی بھگوان کی سوگند جیسے چھپکلی ہو۔"

"ابے جا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔"

اس طرح دیر تک وہ چلاتے رہے۔

"بات کیا ہے بات کیا ہے۔" لڑکوں نے چاروں طرف سے شور مچا دیا۔

بورڈنگ اور کالج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکے بھاگے بھاگے آ پہنچے۔

چاروں طرف خبر مشہور ہو گئی کہ برگد تلے جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں کمینہ ہوں دوسرا کہتا ہے کہ تیری کیا حیثیت ہے اپنے سامنے۔ میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔ عجیب جھگڑا تھا۔ لہٰذا سب برگد کے درخت کی طرف بھاگے حتیٰ کہ پروفیسر اور چھ لڑکیاں بھی آ پہنچیں۔

دونوں لڑکے بڑی شدت سے چلا رہے تھے منہ سے کف جاری تھا آستینیں ٹنگی ہوئی تھیں جیسے ابھی ہاتھا پائی کی نوبت آ جائے گی۔

"میں کہتا ہوں میں کمینہ ہوں میں۔" ایک چیخ رہا تھا۔

"ابے جا۔" دوسرا کہہ رہا تھا۔ "تو کیا ہے تیری اوقات کیا ہے۔"

جب سے لڑکوں نے جھگڑے کا انداز دیکھا تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لڑکے فوراً تاڑ گئے کہ یہ جھگڑا نہیں کچھ اور ہے نہ جانے مداری کے پٹارے سے کیسا سانپ نکلے گا۔

دیر تک چیخ چیخ جاری رہی۔ حتیٰ کہ سب لڑکیاں آ پہنچیں پروفیسر بھگت سنگھ بھی آ گئے۔ لالہ جی تو دور سے تماشہ دیکھتے رہے لیکن پروفیسر بھگت سنگھ بڑے سادہ لوح اور مخلص تھے وہ گھبرا گئے انہوں نے بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں۔

عین اس وقت دونوں لڑکوں نے جھگڑے کا نقطہ عروج پیدا کر دیا۔

ایک بولا۔ "ابے کمینگی میں میں تیرا باپ ہوں۔"

"بے جا۔" دوسرا چلایا۔ "گلیسکو بے بی تو دیکھو۔" "جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے اور آیا ہے ہم سے مقابلہ کرنے ابے میں تیرے باپ کا باپ ہوں وہ کمینہ ہوں میں۔

"میں خالی کمینہ نہیں ذلیل بھی ہوں۔"

"کس قدر ذلیل ہو تم" دوسرے نے غصے سے پوچھا۔ "میں" پہلا بولا "میں پروفیسر بھگت سنگھ کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

"ابے بس۔" دوسرا چلایا۔ "ابے میں کتے کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

پہلا بولا۔ "میں اسفند کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔"

دوسرا خاموش ہو گیا۔ "بھئی میں اسفند کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔ میں ہار گیا ہار گیا۔"

چاروں طرف سے قہقہوں کا شور اٹھا۔

لڑکوں نے بڑھ کر پہلے لڑکے کو شانوں پر اٹھا لیا۔ اور اسے لے بھاگے جیت گیا!!! جیت گیا!!! وہ چلا رہے تھے اس سے بڑی ذلت نہیں ہو سکتی زندہ باد شام زندہ باد شام۔

"ارے" ایلی حیرت سے چلایا۔ "یہ تو شام ہے۔"

ادھر اسفند کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے شام نے اس کا نام ہی نہ لیا ہو۔ اور لیا بھی ہو تو محض مذاق اور تفریح کے طور پر لیا ہو۔

لیکن بھگت سنگھ چلاتے جا رہے تھے "نالائقوں نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ارے میں تو گرو کا پیارا ہوں۔ مجھے کیوں گھسیٹتے ہو اپنے جھگڑوں میں۔"

پھر شام چپکے سے ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا۔ "وہ پچھاڑا ہے آج کہ سالا کبھی اٹھ نہ سکے گا" اور اسفند یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ کسے بھائی؟

اس روز رات کو بورڈنگ میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ہر ڈارمیٹری میں لڑکے اس ڈرامے کو دہرا رہے تھے جو اس شام برگد کے درخت کے نیچے شام نے کھیلا تھا۔ "میں کمینہ ہوں۔" ایک ڈارمیٹری سے آواز آتی۔ "ابے تیری کیا ہمت ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے۔" دوسری ڈارمیٹری سے کوئی چلاتا۔ "ابے جا بے۔" تیسری ڈارمیٹری سے شور بلند ہوتا۔ اوپر چوبارے میں کھڑے لالہ جی مسکرا رہے تھے "میں کہتا ہوں بھئی۔" وہ کہہ رہے تھے "اس بات کا فیصلہ شام کو ہو چکا اب کوئی اور دعوے کرو۔"

ڈائننگ ہال میں کومن روم میں لان میں ہر جگہ لڑکے باتیں کر رہے تھے۔

"یار شام نے وہ ماری ہے وہ ماری ہے اسفند کو کہ چاروں شانے چت گرا ہے۔"

"ارے لڑکیوں کو دیکھا تھا مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔"

"اب اسفند کا لڑکیوں پر جادو نہیں چلے گا۔"

"اونہوں" اندر شام کہہ رہا تھا "یار اپنی محنت بیکار گئی۔ اسفند پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا مجھ سے پوچھ رہا تھا یار یہ گڑبڑ کس بات پر تھی اپنی سمجھ میں نہیں آیا کچھ۔ اب بتاؤ ایسے آدمی سے کوئی کیا کرے۔"

"ارے نہیں یار بنتا ہے۔" ایک نے جواب دیا۔

"ہاں اندر سے تو چکنا چور ہو گیا ہے۔"

"نہ چکنا چور نہیں۔" دوسرا بولا "بھئی وہ تو مٹی کا پہلوان ہے ادھر گرایا لو ادھر اٹھ کر کھڑا
گیا۔"

"بھگوان جانے ٹھیک کہتے ہو" شام ہنسنے لگا "مٹی کے پہلوان کو کون گرا سکتا ہے۔ چلو
سے ہم نے اسے بخش دیا۔ معاف کر دیا۔"

شام کے اس اعلان پر ہوسٹل کے سب لڑکے تلملا اٹھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

"ارے یار سنا تم نے اتنی بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد شام اسفند سے ہار گیا___"

"نہیں یار اسفند نہیں ہار سکتا"۔

جا کر پوچھ لو۔"

لڑکے شام کے پاس آئے۔ لڑکوں کو اس کا بہت غم تھا اسفند کو پچھاڑنے کے لئے شام ان کا
واحد پہلوان تھا۔ اگر اس نے بھی میدان چھوڑ دیا تو ہو گا کیا۔ یہ خیال ان کے لئے سوہان روح ہو
رہا تھا۔ سبھی چاہتے تھے کہ اسفند کے ساتھ جنگ جاری رہے اگرچہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ
اسفند کے خلاف کیوں تھے۔ اسفند نے کبھی کسی لڑکے کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس کے
باوجود اسفند ایک ایسا پلپلا کیڑا تھا کہ ہر لڑکے کا جی چاہتا تھا کہ پاؤں سے مسل دے۔

جی کے کی ناک پر ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ "لہٰذا" وہ چلا رہا تھا۔ "یہ سب کیا ہے کیا ہے یہ
دکھلاوا اور کیا۔ مقصد یہ ہے کہ لڑکوں پر اثر ڈالا جائے۔"

ایلی خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"خالی۔ ایگزیبیشن خالی کیوں غلط ہے۔" اس نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"بڑا بدمعاش ہے یہ شام۔ لڑکوں کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔"

عین اس وقت گاما نوکر داخل ہوا۔

"کیوں گامے کیا بات ہے۔" جی کے نے پوچھا۔

اندر مہاراج

"جی۔ جی وہ۔" گاما بولا "شام بابو نے حلوہ بھیجا ہے کہتے ہیں گاؤں سے آیا ہے۔"

"حلوہ دکھاؤ نا۔ ارے یہ تو گاجر کا ہے۔" جی کے پلیٹ کو دیکھ کر چلایا حلوے کو دیکھ کر اس

پکڑ کر اپنی جگہ پر آ گئی۔ "اچھا" وہ بولا "جا کر شام بابو سے کہو ہم نے تمہاری سب
غلطیاں معاف کر دیں۔"

"کیا کر دیں۔" گاما پوچھنے لگا۔

"لڑکیوں کو خوش کرنے کے لئے جو تماشہ کھیلا ہے۔ شام نے۔" جی کے نے وضاحت کی۔

"اجی جو تماشہ پچھلے سال ہوا تھا اس کا تو جواب نہیں۔"

"ہائیں" جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

"ہونہوں" گاما مسکرا کر بولا "جی یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جی پچھلے سال ایک بابو تھے ایس پی میں
انہوں نے تو حد کر دی تھی۔ سات کی سات لڑکیوں کو ساتھ لئے پھرتے تھے بس سمجھ لو اندر
مہاراج تھے وہ اپنے وقت کے____

"ساتھ لئے پھرتے تھے سات کی سات" ایلی نے حیرت سے دہرایا۔

"جی" گاما بولا۔ "کالج والوں نے دھمکیاں دیں لالہ جی نے کہا نکال دیں گے بورڈنگ سے
پرنسپل نے لکھ کر بھیج دیا کہ کالج سے نام کاٹ دو پر اس پٹھے نے ذرا پرواہ نہ کی۔ اور خدا جھوٹ
نہ بلوائے بابو جی۔ ہر روز رات کے وقت وہ یہاں آ جاتی تھیں۔ سب لڑکیاں بورڈنگ کے باہر
کے لان میں اور بابو جی دیوار پھلانگ کر باہر نکل جاتے تھے لان میں۔ پھر وہ آدھی آدھی رات
وہاں گھومتے رہتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا کہ وہ کالج کے لان میں گھوم رہے ہیں لالہ جی کو
پتہ ہوتا پھر جب وہ دیوار پھلانگ کر واپس آتے تو لالہ جی پوچھتے چوٹ تو نہیں لگی اور وہ ہنس
کر جواب دیتے لالہ جی میری الماری میں ٹینچر رکھی ہوئی ہے۔ لگا لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی یہ
بات تھی۔" گاما ہنسنے لگا۔

گاما باتیں کر رہا تھا تو ام کے داخل ہوا۔

"ارے تم" جی کے چلایا "تم کہاں۔ اور تم بورڈنگ کے اندر کیسے آ گئے۔؟"

ام کے ہنسنے لگا "دیکھ لو۔" وہ بولا پھر گامے کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بھئی گامے کیا حال چال ہے۔"

گامے کی آنکھوں میں عجیب سا تبسم چھلک رہا تھا "اچھا ہوں بابو جی بڑی مہربانی ہے۔ اور بابو
بڑی عمر ہے آپ کی ابھی آپ ہی کی بات کر رہا تھا۔"

"آپ ہی کی بات" جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں" گاما بولا "تم وہ رستم زمان ہو۔"
"دیکھ لو" ام کے ہنسنے لگا۔
"بالکل بکواس جھوٹ" جی کے بولا "تمہیں تو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا"
"اب بھی نہیں آتا۔" وہ بولا۔
"تو پھر۔"
"صرف بانہہ پکڑنے کا ڈھنگ آتا ہے۔" ام کے ہنسنے لگا۔
"اکٹھی سات بانہیں۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
"نہیں" ام کے بولا۔ "میں تو ایک ہی پکڑتا تھا باقی چھ میری بانہہ پکڑتی تھیں" اور قہقہہ کر ہنسنے لگا۔

"اچھا تو یہ آپ کے بھی دوست ہیں۔" لالہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔ پھر ام کے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "کہو بھئی آج کل کہاں ہو۔ کیا ابھی قصور ہی میں ہو۔"
"جی ہاں" اس نے جواب دیا۔ "لیکن وہ مجھے سسپنڈ کرنے والے ہیں۔"
"کیوں وہاں بھی کیا لڑکیوں کا قصہ ہے" لالہ جی ہنسے۔
"نہیں لالہ جی۔"
"تو پھر کیوں"
"ویسے ہی جلتے ہیں۔" ام کے ہنسنے لگا۔ "شہر میں تو ہوں گی نا لڑکیاں" جی کے نے لالہ جی سے کہا۔
"شہر میں تو وہ وہ چیز ہے کہ لالہ جی کیا بتاؤں' طوفان بپا ہے۔"
"کیا رات یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔" لالہ جی نے پوچھا۔
"نہیں لالہ جی۔" ام کے بولا "البتہ جی چاہتا ہے کہ پھر سے کالج میں داخل ہو جاؤں۔"
"تو ہو جاؤ۔" لالہ جی بولے۔
"کرلیں گے آپ" ام کے ہنسنے لگا۔
لالہ جی کے جانے کے بعد کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے پھر ام کے تیار ہو گیا۔
"اچھا یار میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے پھر آؤں گا۔ اب تو آتا ہی رہوں گا۔"
پھر ایلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "چلو یار ذرا کچھ دیر میرے ساتھ چلو پھر واپس آجانا۔"

ہوسٹل

دیر تک ایم کے اور ایلی لاہور کی ویران سڑکوں پر چلتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ایلی نے کہا مجھے اب جانے دو یار۔ لیکن ام کے نے بس تھوڑی سی دور اور کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔ پھر وہ باتوں کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور ایلی کو خیال ہی نہ رہا کہ اسے واپس جانا ہے اور نامانوس ...نے میں ہو اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس بورڈنگ میں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ام کے اسے ...نگ کالج میں لڑکیوں سے متعلق کارنامے سنا رہا تھا۔
ایک وسیع کوٹھی کے سامنے ام کے رک گیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف قد آدم دیوار بنی ...ی تھی۔ اور سڑک کی جانب ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔
"ایک بات مانو گے" اس نے ایلی سے کہا "اگر تم صرف پندرہ منٹ یہاں میرا انتظار کرو تو ...اپنے دوست سے مل کر واپس آجاؤں گا پھر ہم اکٹھے واپس جائیں گے تم بورڈنگ چلے جانا ...میں بھاٹی دروازے چلا جاؤں گا۔"
اس وقت آدھی رات ہو چکی تھی ایلی اس ویران جگہ انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن ...واپسی کے راستے کا بھی تو علم نہ تھا۔ اس لئے مجبوری میں اس نے ام کے کی بات مان لی۔
...بڑے دروازے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔
دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا پھر وہ گھبرا کر ٹہلنے لگا۔ ام کے کو گئے تقریباً آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔ ...کسی گھڑی نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے ٹہلتے ٹہلتے تھک ...کر وہ بیٹھ گیا۔

دفعتاً مکان کے اندر سے شور اٹھا۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ کون ہے؟ کیا ہے؟
...دو ایک عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ایلی وہ آوازیں سن کر چونکا۔ پھر اس نے سمجھا شاید کوئی ...نہ ہو' ہو گی کوئی بات۔ پھر قریب ہی لوگ چل پھر رہے تھے ٹھک ٹک ٹک جیسے کوئی اونچی ...ایڑیاں فرش پر مار رہا ہو۔
پھر دھڑام سے صدر دروازہ کھل گیا۔ کچھ لوگ لالٹین اٹھائے باہر نکل آئے۔ ایلی بیٹھے ...چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کون ہیں یہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔
ایک نوجوان ہاتھ میں لٹھ سنبھالے دوسرے میں لالٹین پکڑے اس کے قریب آگیا اس کے

پیچھے دو مرد تھے اور ایک ادھیڑ عمر کی میم تھی۔

"کون ہو تم۔" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو۔"

"تھک گیا تھا بیٹھ گیا۔" ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

اس پر میم آگے بڑھی اور انگریزی میں پوچھنے لگی۔

"زنانہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے بیٹھنے کا مطلب۔"

"زنانہ بورڈنگ ہاؤس۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "مجھے یہ معلوم نہ تھا" ایلی اٹھ بیٹھا "آئی ام ساری۔"

"لیکن تم ہو کون۔" وہ بولی۔

زنانہ بورڈنگ کا نام سن کر ایلی کو خیال آیا کہ ضرور ام کے نے کوئی شرارت کی ہوگی۔ اس خیال پر وہ محتاط ہو گیا۔ "دیکھئے محترمہ" وہ بولا "میں راہ گیر ہوں بھاٹی دروازے جانا ہے تھک گیا۔ تو ذرا ستانے بیٹھ گیا مجھے علم نہ تھا کہ یہ زنانہ بورڈنگ ہے۔"

"کیا کرتے ہو" وہ بولی۔

"پردیسی ہوں۔ کام سے لاہور آیا ہوں۔"

"ہوں۔" وہ غور سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی ——— پھر اس کا رویہ بدل گیا۔ بولی "تم نے ادھر سے کوئی آدمی گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا "کیوں کیا بات ہے۔"

"یہاں چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں آج کل" وہ بولی۔

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "تو مجھے چلے جانا چاہیئے یہاں سے۔"

"ٹھہرو۔" لالٹین والا جوان چلایا۔

"نہیں نہیں جانے دو شریف آدمی ہے۔" میم نے کہا۔ اور ایلی چپ چاپ چل پڑا۔

ابھی چند ہی قدم چلا ہو گا کہ اندھیرے سے ایک سایہ اس کی طرف لپکا۔ وہ گھبرا کر رکا۔

"ڈر گئے کیا۔" ام کے کی آواز آئی۔

"ارے تم ہو۔"

"ہاں میں ہوں۔"

"کسی سہیلی سے ملنے آئے تھے کیا۔"

"ارے یار" وہ بولا "مصیبت یہ ہوئی کہ دیوار پھلانگتے ہوئے کسی چوکیدار نے دیکھ لیا۔"

"تو کیا دیوار پھلانگ کر اندر گئے تھے۔"

"اور تو کیا صدر دروازے سے جاتا۔ بیٹا زنانہ بورڈنگ ہے اندر جانے دیتا ہے کوئی۔"

"کسی روز مار کر بھرکس نکال دیں گے تمہارا۔" ایلی نے کہا۔

"یار کیا کروں" ام کے ہنسنے لگا۔ "اس ظالم سے ملے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ جان من ان کے دل میں عزت اور محبت پیدا کرنی ہو تو دلیری دکھانی پڑتی ہے سیکھ لو گر یہ ہم سے۔"

ایلی کے روبرو سادی آکھڑی ہوئی۔ "نہ" وہ بولی "یوں نہیں ملے گا دوپٹہ لینا ہے تو خود آکر اتار کر لے جاؤ۔ پھر مانوں گی آپ کی ہمت۔"

پھر ایک سبز رنگ کی گٹھڑی لڑھک کر اس کے پاؤں میں آگری اور سادی مسکرا کر کہنے لگی "گونگھٹ کے پٹ کھول رہے تو ملیں گے رام۔"

نہ جانے ام کے کیا کہہ رہا تھا۔ غالباً وہ زنانے بورڈنگ میں داخل ہونے کا قصہ یا تفصیل [illegible] وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی سہیلی کس قدر حسین ہے اور کتنی رنگین۔ لیکن ایلی کے روبرو ایک اور حسین رنگین تصویر کھڑی تھی۔ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ "میں یہاں ہوں ایلی میں۔ اگر ہمت ہے تو یہاں آ جاؤ۔ آ جاؤ نا۔ ابھی جاؤ آ جاؤ گے تو سب کچھ مل جائے گا۔ لیکن تم کیوں آنے لگے۔ نہ جانے تمہیں کس کی لگن لگی ہے تمہارے لئے تو میں تفریح تھی۔"

دوسری طرف شہزاد کھڑی اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"چلو تفریح ہی سہی۔" وہ آہ بھر کر کہہ رہی تھی۔ "تمہارے لئے باعث تفریح ہوں نا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے اور میں تمہیں دے ہی کیا سکتی ہوں۔ میرے پاس ہے ہی کیا جو"

اگلے روز سارا دن ایلی اسی خیال میں کھویا رہا اسے بار بار زنانہ بورڈنگ کا خیال آتا اور پھر آنکھوں تلے سادی کی سفید منزل آجاتی اور وہ اس کے پیچھے بھاگتا اور دو بہنیں چیختیں "آگئے !! آگئے !!———" سارا دن وہ اسی خیال میں کھویا رہا شام کے وقت چپ چاپ

کالج کے لان کے ایک اندھیرے کونے میں جا بیٹھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے ملے
کے کے پاس بیٹھے۔

زرد دوپٹہ

لان میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً اسے احساس ہوا کہ قریب ہی کوئی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے۔ وہ
چونکا سامنے پیڑ کے پیچھے کوئی بیٹھا تھا۔ شاید کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے اٹھ کر جانا
مناسب نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد پودے کے پیچھے کسی نے ماچس جلا کر سگرٹ سلگایا۔ ایلی
شام کو پہچان کر وہ چلایا۔

"تم ہو شام۔" وہ بولا شام اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

"شام آہیں کیوں بھر رہے تھے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب عمر بھر آہیں ہی بروں گا اور کیا۔"

"لیکن کیوں۔"

"یار کیا بتاؤں"۔ شام بولا "مسخروں نے میری منگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے جو
زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"اپنی تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔"

"کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟"

"جو سر پر زرد دوپٹہ اوڑھ سکتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم
الیاس" شام دفعتاً" سنجیدہ ہو گیا "میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زرد دوپٹہ اوڑھتی
ہو۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو یہ بات ایلی کے لئے حیران کن تھی۔

"لیکن تمہاری منگنی کب ہوئی؟" ایلی نے پوچھا۔

"آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کہیں چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں
جا کر کھو جائیں سب بھول جائیں۔"

ایلی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام سے ضبط
نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ اپنی دکھی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ

سب کچھ اور اپنے دل کو ہلکا کر لے۔ اس کے انداز بیان میں دکھ تھا اس کے تبسم میں

مجھے کسی سے محبت کرنی پڑے گی۔ ہاں۔ ابھی فوراً" ورنہ زندگی کیسے کٹے گی۔ لیکن مجھ
کرنے والا کوئی بھی تو نہیں ماتا جی بچپنے ہی میں چلی گئیں۔ کوئی بڑی بہن ہوتی تو شاید
جاتی میری کوئی بہن نہیں اور پتا جی ——— لیکن کبھی پتا نے بھی محبت کی ہے۔
آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی اور اب انہوں نے میرا ناطہ ایسی لڑکی سے جوڑ
جو زرد دوپٹہ اوڑھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہو گا۔" وہ باتیں کئے گیا اور ایلی چپ
سنتا رہا۔

"ارے۔" انہوں نے تعجب سے اس گلی کی طرف دیکھا جس کی طرف لوگ بھاگے جا رہے
کے گلے میں ہار تھے۔ ہونٹوں پر تبسم اور انداز میں عجب جوش و خروش تھا۔

"یہاں کیا شادی ہے؟" شام نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہے۔"

"شاید۔"

اور بیٹا

"چلو یار چلیں ہم بھی شادی میں شریک ہو جائیں۔ دیکھیں تو بن بلائے مہمان بننے میں کیا
ہے۔" گلی میں داخل ہوتے ہی شام نے حیرت سے چیخ سی ماری "ارے۔" وہ بولا "یہ تو چکلا
سب بیسوائیں بیٹھی ہیں۔" پہلی مرتبہ شام کی ہنسی میں دکھ کا عنصر نہ تھا "آؤ یار آؤ۔" وہ
کی طرح چلایا۔ "دیکھیں تو یہ نظارہ بھی تو شادی سے کم نہیں۔"

گلی میں جگہ جگہ کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں بیسوائیں بیٹھی تھیں۔ ہر بیسوا کے سامنے
کھڑے اس کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی گھور رہے تھے۔ کچھ
چھیڑ رہے تھے۔

پہلے ہی کھلے دروازے پر شام رک گیا۔ کچھ دیر تو وہ اسے جانچتا رہا پھر وہ بھول گیا کہ کہاں
ہے اور اس کی منگیتر کس رنگ کا دوپٹہ پہنتی ہے اور وہ کالج کا طالب علم ہے۔ وہ ایسے

خصوصی رنگ میں چمکنے لگا۔

"کیوں جی۔" وہ بیسوا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "کوئی ہے مال وال۔"

بیسوا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ دروازے کے سامنے کھڑے لوگوں نے شام کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت جھلکی کوٹ پتلون میں مسکراتا ہوا نوجوان اس اس گلی میں شاید کبھی نہ دیکھا گیا تھا چونکہ وہ جگہ مزدوروں اور جاٹوں کے لئے مخصوص تھی اور سب بیسوائیں نچلے درجے کی تھیں۔

"ہے کوئی مال وال۔" شام نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

بیسوا پھر مسکرائی اور اپنی چتون سے اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہی ہو بہت ہے آجاؤ۔

"تو ذرا دکھاؤ نا ہمیں" شام مسکرایا۔

اس پر لوگ ہنسنے لگے۔

"کچھ ہو تو دکھائے۔" ایک نے قہقہہ مارا۔

"سب لٹا ہوا ہے۔" دوسرا بولا۔

"نہیں نہیں ضرور کچھ چھپا کر رکھا ہو گا۔" شام بولا "کیوں ——— مہارانی ہے نا یہ بات"

بیسوا نے اپنی آنکھیں شام کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"اندر صندوق میں ہو گا۔" ایک بولا "یہاں تو نہیں۔"

"اونہوں۔" دوسرے نے کہا "صندوقچی تو لٹ گئی۔"

بیسوا نے غصے بھری نگاہ سے لوگوں کی طرف دیکھا اور دروازہ بند کر لیا لوگوں نے قہقہہ لگایا اور دوسرے دروازے کی طرف چل پڑے۔

شام کی باتوں پر ایلی خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ایسی بے تکلف باتیں کرنا اور پھر ایسی جگہ جہاں پائے جانا بھی باعث شرم تھا۔ نہ جانے شام کو کیا ہو گیا ہے۔

"چلو چلیں۔" اس نے شام سے کہا "یہ جگہ ٹھیک نہیں۔"

"جائیں گے کہاں" وہ بولا "دیکھو تو کتنی رونق ہے۔ ایسی جگہ کہاں ملے گی ہمیں دلبر"

دوسرے دروازے پر جا کر وہ چلایا۔ "اونہوں دیوی یہ کیا قمیص پہن رکھی ہے۔ بزرگی کی چھی چھی۔ سرخ قمیص پہنو تو ہمیں جوش بھی آئے۔"

بیسوا نے اس کی طرف دیکھا۔ "خالی باتیں ہی بناؤ گے یا آؤ گے بھی۔"

"نہیں نہیں آئیں گے"۔ وہ چلایا "آئیں گے ضرور آئیں گے"۔

"تو پھر آجاؤ۔" وہ نہایت قبیح انداز سے ننگے اشارے کرنے لگی۔

"آئی جوش میں بھئی۔" ایک بولا۔

"خود جوش میں آنے کا فائدہ ہمیں جوش دلائے تو بات ہے۔" شام چلایا۔

لوگ ہنسنے لگے "بھئی بات تو ٹھیک ہے۔" ایک نے کہا۔

بیسوا نے نہایت بے حیائی سے اپنی قمیص اتار دی اور لپک کر سرخ قمیص کھونٹی سے اتار کر پہن لی۔ اس کی میلی انگیا دیکھ کر سب چلانے لگے۔

"ذرا آہستہ ذرا آہستہ اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔" شام نے کہا۔

سرخ قمیص پہن کر وہ شام سے مخاطب ہو کر بولی "آ اب مرد کا بچہ ہے تو۔"

"نہیں تو مرد ہوں۔" وہ بولا "بچہ نہیں ہوں۔"

اس پر لوگ ہنسے۔

"تو پھر آنا۔" وہ بولی۔

"آئیں گے آئیں گے۔ کل آئیں گے۔" یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔

اسی طرح وہ ہر جگہ رک کر باتیں کرتا رہا۔ ایلی کو اس پر غصہ آرہا تھا۔ فضول ایسی باتیں بھلا نہ جانے شام کو کیا ہو گیا ہے اور پھر ایسی غلیظ جگہ اور وہ عورتیں لاحول ولا قوۃ وہ کیا تھیں۔

دفعتاً شام کی نگاہ ایک اندھیری کوٹھڑی پر پڑی جہاں کوئی بتی روشن نہ تھی۔ اور دروازے کے باہر ایک بڑھیا بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

"ارے" وہ چلایا "یہ دادی اماں یہاں کس امید پر بیٹھی ہے۔ آؤ الیاس آؤ۔"

اس کے قریب جا کر شام کہنے لگا "مائی تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟"

وہ خاموش بیٹھی حقہ پیتی رہی۔

"کیا تم بھی بیٹھی ہو۔" شام نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"دکھتا نہیں" وہ بولی۔

"کیا تمہارے پاس بھی کوئی آتا ہے مائی۔" شام نے پوچھا۔

"بیٹا اتنا ہی ترس آتا ہے تو تم خود کیوں نہیں آجاتے۔" وہ نہایت بے شرمی سے کہنے لگی۔

شرم کے مارے ایلی ڈوب گیا۔ پھر وہ بھاگ پڑا۔

"ارے ٹھہرو تو۔ میں نے کہا ٹھہرو نا۔" شام چلا رہا تھا۔ لیکن ایلی بھاگے جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے شام آ رہا تھا۔ اور گلی کے سب تماشبین ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھہراؤ

ٹریننگ کالج کی زندگی کے پہلے دور میں ایک مسلسل کش مکش تھی اضطراب تھا ہر کوئی پُر جوش تھا۔ پر امید تھا۔ کوشاں تھا۔ لیکن چھ ایک ماہ کے بعد لڑکیوں کی زندگی نے دوسرا رخ پلٹ لیا۔ بیشتر لڑکے جو لڑکیوں پر اثر ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔ مایوس ہو گئے۔ اور ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو گئی۔

ادھر لڑکیوں نے اپنا اپنا حلقہ اور اپنا اپنا مرکز متعین کر لیا۔ اس طرح زندگی میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ جیسے گدلے پانی کا بھرا گلاس کچھ دیر کے بعد نتھر کر صاف ہو جاتا ہے گرد و غبار سب بیٹھ جاتا ہے۔

لڑکیوں کی وہ پر شور محفلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہر لڑکی نے امتحان کی تیاری کے لئے ایک مخصوص کونہ مقرر کر لیا تھا مثلاً" مس روموا سی اس بینچ پر بیٹھا کرتی جو لان کے شمالی کونے میں جھاڑیوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ مس راؤ ہا نے سائنس روم کے عقب میں بنی ہوئی گیلری اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ جہاں سے ادھر ادھر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کالج کے لان میں پڑے ہوئے بینچ سب غائب ہو چکے تھے اور مخصوص مقامات پر رکھ دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی تیاری اکیلے میں تو نہیں ہو سکتی ایک ساتھی کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ساتھی ہوں تو بھیڑ لگ جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام نہیں ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے لڑکیاں تقریباً" تقریباً" عنقا ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ البتہ کوئی خاص لیکچر ہوتا تو وہ اپنے اپنے ڈربوں سے نکل آتیں اور لیکچر ختم ہونے کے بعد پھر وہیں لوٹ جاتیں۔

رائے نے پھر سے گاؤں جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر بار گاؤں سے واپس آنے کے بعد ایلی کو اس لڑکی کے قصے سناتا جو اتنی بولڈ تھی کہ حد نہیں اور جس کی بولڈنس کی وجہ سے اس کے پیرنٹس نے احتجاجاً" کھانسنا اور تیوری چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

بابا کی تمام تر توجہ بورڈنگ کے پچھواڑے کے ایک مکان پر مرکوز ہو چکی تھی اور وہ روز ایلی کو بتایا کرتا تھا کہ لاجونتی بیچاری سارا سارا دن دھوپ میں کھڑی رہتی ہے۔ پاگل لڑکی اس طرح وہ صحت خراب کرے گی۔ لیکن بابا کے سمجھانے کے باوجود لاجونتی اپنے مکان کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر بابا کو دیکھنے پر مجبور تھی۔

لاجونتی

لاجونتی کا قصہ بھی عجیب تھا۔ سب سے پہلے لاجونتی کو شام نے دیکھا تھا۔

شام دوڑا دوڑا ایلی کے پاس آیا "لو بھئی" وہ چلانے لگا "اپنا تو جیون سپھل ہو گیا۔"

"وہ کیسے" ایلی نے پوچھا۔

"اپنا بھی ایک گاہک پیدا ہو گیا۔"

"کیوں کیا کالج والیوں میں سے کوئی مہربان ہو گئی۔"

"اونہوں۔ وہ سب سخت مٹی سے بنی ہیں۔ یار ان پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ انہیں وہ وہ باتیں سنائی ہیں کہ ذرا شرم ہوتی تو میرے پریم میں ڈوب جاتیں۔ اور صرف باتیں ہی نہیں تماشے دکھائے ہیں کرتب دکھائے ہیں مسخرا بن کر رانیوں کو محظوظ کیا ہے اور پھر کلاس میں وہ وہ برلینٹ باتیں کی ہیں۔ اپنی لیاقت کی دھاک بٹھا دی ہے۔ اتنا اثر ڈالا ہے کہ کوئی حد نہیں۔"

"تو کیا ان سب باتوں کا اثر نہیں ہوا۔" ایلی نے پوچھا۔

"اثر تو ہوتا ہے۔ ہنساتا ہوں تو ہنستی ہیں۔ اتنا ہنستی ہیں اتنا ہنستی ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ چمکدار بات کرتا ہوں تو اتنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہیں جب لیاقت کی باتیں سناتا ہوں تو مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"بس چند ایک منٹ تو بھیگی رہتی ہیں پھر پر خشک ہو جاتے ہیں تو سالی پھر سے اڑ جاتی ہیں جیسے جانتی ہی نہ ہوں۔"

"تو پھر یہ نیا گاہک کون ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں یار کون ہے۔ کوئی سکول کی دکھتی ہے۔ ہماری ڈارمیٹری کے پچھواڑے میں ان کا مکان ہے۔ ایک روز میں نے ویسے چھیڑ خانی کے لئے دو ایک اشارے کر دیئے تھے اب سالی

کھڑکی میں یوں جمی رہتی ہے جیسے سریش لگا کر جوڑ دیا ہو کسی نے اپنے لئے جتی تی ہو بڑ
ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ایلی بولا۔ "تمہیں بھی لٹکنے کے لئے ایک کھونٹی ہی چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" شام ہنسا۔ "لیکن وہ تو خود لٹک رہی ہے۔"

"یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے" ایلی نے کہا۔ "پکا پکایا مل گیا۔"

"اونہوں" وہ بولا "یار لوگوں کو تو مار کر کھانے کی لت پڑی ہے۔" عجیب بات ہے" ایلی

"اگر وہ لٹک جائے تو اپنی طبیعت نہیں جمتی اور اگر وہ پروانہ کرے تو ہم خود لٹک جاتے ہیں۔"

ایلی ہنسنے لگا۔

"ایک بات اور ہے" شام بولا۔

"وہ کیا؟"

"لاجونتی کی عمر بہت چھوٹی ہے۔"

"اس میں کیا برا ہے۔ جتنی چھوٹی عمر ہوگی۔ اتنا جذبہ بے لوث ہوگا۔"

"اونہوں۔ ہمیں تو مٹیار چاہیے جو ہمیں لوریاں دے دے کر سلائے لپٹ لپٹ کر گائے
اپنے بازوؤں میں سنبھالے۔"

اسی شام وہ دونوں بورڈنگ سے نکل کر اس مکان کی طرف سیر کے لئے نکل گئے جہاں
لاجونتی کا گھر تھا تاکہ قریب سے لاجونتی کو دیکھ سکیں۔

لاجونتی چودہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن نقوش جاذب نظر تھے نگاہوں
میں عجیب دیوانگی سی تھی اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کی دنیا کے طور طریقے
ابھی ناواقف ہو جیسے کوئی دہلیز پر کھڑا ہو اور زندگی کے ایوان میں داخل ہونے کے لئے بے تاب
ہو۔

واپسی پر ایلی کو سوجھی۔ "یار ایک بات کہوں بڑا مزا رہے گا جو تم مان جاؤ تو۔"

اس روز انہوں نے مل کر سازش کی کہ کسی طرح بابا کو یہ غلط فہمی دے دی جائے کہ
لاجونتی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چونکہ بابا جس ڈارمیٹری میں رہتا تھا وہاں
سے بھی لاجونتی کا مکان صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس مذاق کی وجہ یہ تھی کہ ایلی بابا کی باتیں سن کر تنگ آچکا تھا۔ بابا یوں بات کیا کرتا تھا؟

...ہوں گی اس پر ریجھی ہوئی ہو۔ اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔
...جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور جوان لڑکیاں بھلا بابا سے کیسے محبت کر سکتی ہیں۔
...ہی روز میں ایلی نے بابا کو یقین دلا دیا تھا۔ کہ لاجونتی اس پر دل و جان سے فدا ہو چکی
...اور اس کے لئے ہر وقت کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔
اس کے بعد بابا روز ایلی کو لاجونتی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اور ایلی سمجھتا کہ بابا نے ایک الف
...کی دنیا بنا رکھی ہے۔ جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ بابا کے قصے یوں سنا کرتا تھا
...طوطا مینا کی کہانیاں ہوں اس نے انہیں کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ دل ہی دل میں وہ بابا کی
...ن پر ہنسا کرتا تھا پھر ایک روز رات کے نو بجے کے قریب بابا ایلی کے پاس آیا۔ اس وقت وہ
...بن ٹھن کر آیا تھا۔

"ارے" ایلی نے کہا "آج تو دولھا بنے ہوئے ہو۔"

"ہاں یار۔ آج وہاں جانا ہے نا۔ اس لئے میں نے کہا ذرا اچھے کپڑے پہن لوں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"بھئی وہیں" بابا بولا۔ اس نے اشارہ کر کے کہا۔

"وہاں کہاں؟"

"لاجونتی نے بلایا ہے۔" بابا نے اس کے کان میں کہا۔

"ارے ——" ایلی کو بھولی ہوئی لاجونتی یاد آگئی۔ اس نے بلوایا ہے۔"

"ہاں" وہ بولا "بیچاری کتنے دنوں سے بلا رہی ہے۔ کہتی ہے گھر والے کہیں گئے ہوئے
ہیں گھر میں وہ اکیلی ہے۔"

"ارے" ایلی سمجھ رہا تھا کہ بابا ویسے ہی گپ چلا رہا ہے۔ یا شائد لاجونتی اسے بلا رہی ہو۔

"ذرا میرے ساتھ چلو گے۔" بابا نے کہا "وہاں تک۔"

"کیوں؟"

"ایسے معاملے میں ساتھی ہو تو اچھا رہتا ہے۔ صرف مکان تک چلنا پھر چلے آنا۔" بابا نے
...

"کب" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی اور کب۔"

"ابھی ——!" ایلی نے حیرانی سے بابا کی طرف یوں دیکھا —— جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو
دونوں چل پڑے ایلی سمجھ رہا تھا کہ شائد بابا کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ ایلی
ہی دل میں بابا کی سادہ لوحی پر ہنس رہا تھا۔

لاجونتی کے مکان کے نیچے وہ دونوں رک گئے۔ بابا نے کھڑے ہو کر سگرٹ سلگانا شروع
بابا نے ایک ایک دو ماچسیں جلائیں اور انہیں بجھا دیا تاکہ انہیں وہاں رکنے کا بہانہ ملے۔ جب
نے چوتھی ماچس جلائی تو آہستہ سے مکان کا دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں لالٹین اٹھائے لاجو
دروازے میں کھڑی تھی۔ "اچھا بھئی۔" کہہ کر بابا اندر داخل ہو گیا —— اور ایلی حیرت
پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

ونڈر لینڈز

وہاں سے واپس آتے ہی ایلی شام کی طرف گیا۔ وہ شام کو لاجونتی اور بابا کی ملاقات کا قصہ
سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ ڈارمیٹری میں شام اسے دکھائی نہ دیا تو اس نے گوبند اور
سے پوچھا کہ شام کہاں ہے۔

"یہیں تو تھا ابھی۔" وہ بولے "شائد کسی اور ڈارمیٹری میں بیٹھا گپیں ہانک رہا ہو۔" ایلی
دیر تک ڈارمیٹریوں میں گھومتا رہا۔ جب وہ باہر آنے لگا تو راستے میں لالہ جی مل گئے۔

"کسے تلاش کر رہے ہو۔" وہ بولے۔

"شام کو ڈھونڈ رہا ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کہیں چھٹی پر تو نہیں گیا۔"

"نہیں وہ تو حاضر ہے۔" وہ بولے "داس کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور وہ سو
گیا ہے۔"

"اوہ" ایلی بولا "طبیعت خراب ہے۔"

لالہ جی کے جانے کے بعد وہ پھر سے شام کی ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔

"شام کہاں ہے۔" اس نے داس سے پوچھا۔

"اس کی طبیعت اچھی نہیں" داس نے جواب دیا "سو گیا ہے۔"

ایلی شام کی سیٹ کی طرف جانے لگا تو داس نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ "نہیں یار" داس
سے بولا "اسے نہ جگاؤ۔ مشکل سے آنکھ لگی ہے۔"

ایلی باہر نکل آیا لیکن باہر آتے ہی اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہو۔ کہیں شام نے کچھ
نہیں لیا۔ شائد زرد دوپٹے والی منگیتر کی وجہ سے وہ رک گیا۔ اور پھر سے دبے پاؤں شام کی
پچھواڑے کی طرف چل پڑا۔ اب کی بار وہ اس سمت سے داخل نہ ہوا جدھر داس کی سیٹ تھی
بلکہ پچھلی طرف سے داخل ہو کر دبے پاؤں شام کی سیٹ کی طرف چلا آیا —— چارپائی کے
پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔ واقعی یہ تو سو رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ خواہ مخواہ تنگ کرنے کا فائدہ۔
نہیں نہیں جگاتا اسے۔ وہ چارپائی کے قریب تر ہو گیا۔ پھر اس نے جانے کس خیال پر
رضائی کی طرف سے چادر کا پلو اٹھایا۔ ارے وہ بھونچکا رہ گیا۔ بستر میں شام نہیں تھا۔ چارپائی پر
تکیے اور کوٹ اور جانے کیا کیا یوں رکھا ہوا تھا جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔

جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اس وقت تقریباً" بارہ کا وقت تھا۔ ان دنوں جی کے اور ایلی
کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ کے ہسپتال کے ان ڈور وارڈ میں رہتے تھے۔

ایک روز فٹ بال کھیلتے ہوئے جی کے گر پڑا تھا اور اس کی شن بون ٹوٹ گئی تھی۔ اور ڈاکٹر
نے اس کی ٹانگ کو پلستر کر دیا تھا۔ چونکہ بورڈنگ اور کالج کے تمام لڑکوں سے جی کے کے مراسم
تھے لہٰذا ان کے کمرے میں اکثر بھیڑ لگی رہتی تھی لڑکے اس کی عیادت کو آتے تھے ہر وقت کوئی
نہ کوئی جی کے کے پاس بیٹھا رہتا تھا اس بات کو محسوس کر کے لالہ جی نے خود انہیں کہا تھا کہ وہ
ان ڈور وارڈ میں چلے جائیں تو ان کے لئے آسانی رہے گی۔

ان ڈور وارڈ بورڈنگ کے ساتھ ملحق تھا لیکن وہ بورڈنگ سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ اور وارڈ
میں رہنے والے ان تمام پابندیوں سے مبرا تھے جو بورڈنگ میں رہنے والوں پر عائد تھیں۔ مثلاً
بورڈنگ میں دس بجے باقاعدہ حاضری لگتی تھی اور پھر باہر کے دروازے مقفل کر دیئے جاتے تھے
لالہ جی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص نہ تو باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس
کے علاوہ بورڈنگ میں مہمانوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ان ڈور وارڈ میں یہ پابندیاں نہ
تھیں۔ وارڈ کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ اس لئے وہ باہر جانے یا اندر آنے کے لئے قطعی طور پر
آزاد تھے۔ اور باہر کے مہمان بے روک ٹوک ان کے پاس آ سکتے تھے۔

یہ وارڈ ایک فراخ ہال کمرا تھا جس میں متعدد کھڑکیاں اور دروازے تھے اسکی ساخت
بورڈنگ کی عمارات سے مختلف تھی۔ دراصل یہ ایک نیا ونگ تھا جو حال ہی میں بنایا گیا۔ اور چونکہ ابھی
تعمیرات مکمل نہ ہوئے تھے اس لئے نہ تو وہاں کوئی نرس تھی نہ ڈاکٹر صرف چار ایک خالی بیڈ

پڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جی کے اور ایلی نے اپنا تمام سامان کتابیں صندوق چارپائیاں میز کر
وہاں منتقل کر دی تھیں۔

چونکہ جی کے ڈیڑھ ماہ سے صاحب فراش تھا اس لئے کالج اور بورڈنگ کے لڑکے اکثر ت
کے لئے وہاں آ جایا کرتے۔ سارا سارا دن وہاں تاش کھیلا جاتا کیرم چلتا۔ شطرنج کی بازیاں
جاتیں۔ اس طرح وہ کمرہ کومن روم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا ایک ایسا کومن روم جہاں ہرد
دھما چوکڑی رہتی۔ اور جہاں شور مچانا اور دنگا فساد کرنا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وارڈ میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ایلی کو ہر وقت بورڈنگ میں دا
ہونے یا وہاں سے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار اسے دیکھ
آپ ہی آپ اٹھتا اور پھر بن پوچھے آہنی دروازہ کھول دیتا۔ شام کی ڈارمیٹری سے نکل کر جب
باہر آیا تو چوکیدار نے حسب معمول دروازہ کھول دیا اس وقت گیارہ بجے تھے جب وہ کمرے
داخل ہوا۔ تو بتی جل رہی تھی اور جی کے اکڑوں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکھنے کا
پڑا تھا اور قلم ہاتھ میں تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ بستر جھاڑتے ہوئے اس نے جی کے سے پوچھا۔
"کیا لکھ رہے ہو؟"

جی کے نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ مڑا۔ جی کے کے قریب گیا۔ جی کے اسی طرح بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔
بڑی محنت کر رہا ہے بیچارہ۔" ایلی نے سوچا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پیڈ پر پڑی عنوان کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ لکھا تھا میری پیاری سفینہ
سفینہ ۔ ارے سفینہ کون تھی اور پھر پیاری جی کے اور پیاری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ایلی جی کے
کے سب قریبی رشتہ داروں کو جانتا تھا اسے جی کے کی ہمشیرہ والدہ کے نام معلوم تھے۔ لیکن یہ
سفینہ کون تھی۔ کیا جی کے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ل
لڑکیوں سے محبت کرنے کے شغل سے سخت نفرت تھی وہ محبت کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور ل
ہوس سے تعبیر کرتا تھا۔ صراط مستقیم پر چلنے والا شخص کسی کو میری پیاری سفینہ لکھے ایک دلب
دان۔ ایک اصولی آدمی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا شاید یہ خط کسی عزیز کو لکھا ہو۔ ایلی نے پیڈ اٹھا لیا

باہر نکل گیا تاکہ چھپ کر خط پڑھ سکے۔

واقعی وہ ایک محبت بھرا خط تھا۔ جی کے اور یہ جذبات! ایلی حیرت سے اس سوئی ہوئی گٹھڑی
طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سمجھے کیا جی کے کی وہ شخصیت جس سے
واقف تھا محض ایک بہروپ تھی۔

ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی اسے انسانی کردار کے تضاد کا شعور نہ تھا۔ اس نے
پیڈ رکھ دیا اور سوچ بچار میں کھو گیا۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ
رہا ہے پھر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔

باہر برگد کے درخت کے نیچے سادی کھڑی ہنس رہی تھی۔ "آؤ مہاراج جی آیاں نوں" وہ
کہنے لگی ایلی نے ماچس کی ڈبیہ ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ سگرٹ ہونٹوں میں دبا رکھا تھا جسے
وہ بھول گیا تھا۔

سادی نے اس ان سلگے سگرٹ کی طرف دیکھا۔ "سگرٹ خود لگائیں گے مہاراج یا میں لگا
دوں۔" وہ مسکرائی ایلی چونکا اس کو وہ رات یاد آ گئی جب وہ سفید منزل کی سیڑھیوں میں ضد کئے
بیٹھا تھا کہ سادی خود سگریٹ سلگا کر دے۔

"توبہ ہے۔" سادی بولی "کوئی ایسا ضدی بھی نہ ہو۔"

ایلی نے سگرٹ سلگایا اور پھر کالج کی طرف چل پڑا۔

کالج کی عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔ عمارت کی چھت پر شہزاد کھڑی تھی۔ ارے وہ
گھبرا کر رکا واقعی کالج کی چھت پر کوئی تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ کوئی ہو گا اس نے سوچا۔ شاید
چوکیدار ہو۔ وہ گھبرا گیا کالج کا چوکیدار بہت سخت آدمی تھا۔ وہ پرنسپل کو رپورٹ کرنے سے نہ
چوکتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے رات کے وقت ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

ایلی نے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مغربی سمت کو چل پڑا جس طرف کالج کا لان تھا۔ اس وقت
سارا لان چاندنی میں جگمگا رہا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی بنچ پر بیٹھ کر اس پھیلی ہوئی چاندنی کو
جو اسے سادی اور شہزاد کی یاد دلا رہی تھی لیکن لان میں جانا خطرناک تھا۔ اوپر سے چوکیدار
نے دیکھ لیا تو۔ لان میں کوئی بنچ بھی تو نہ تھا۔ تمام بنچ لڑکوں نے لان سے اٹھا کر اس سے ملحقہ
باغیچے میں رکھ دیئے تھے جہاں بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ ایلی ان جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

دفعتاً وہ رکا۔ ان جھاڑیوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ محتاط ہو گیا اور ایک پودے کے

نیچے چھپ گیا۔

"بھگوان کی سوگند میں زہر کھالوں گا۔" کوئی چلا رہا تھا۔ "میرے پاس ہے۔ میرے ٹرنک میں پڑی ہے سچ کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھادوں گا"۔

"زہر ——— ٹرنک ——— ارے" ایلی نے شام کی آواز پہچان لی۔

شام یہاں ——— اور یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی چپکے سے بیٹھ گیا تاکہ کسی کو نظر نہ آئے کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی ——— "بس اس قصے کا یہی انجام ہو گا ——— اور ———"

آواز یوں دفعتاً بند ہو گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

"ایسی باتیں مت کیجئے۔" کوئی بولی۔

"تو کیسی باتیں کروں۔"

"پیار کی باتیں۔"

"اس پیار نے اپنا دیوالیہ نکال دیا ہے۔"

"کیوں۔" وہ بولی۔

شام ہنسا۔ "بس صبح شام مر رہے ہیں۔ پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ اور بھگوان جانے امتحان میں بطخ کا انڈا ملے گا مرغی کا نہیں۔"

ایلی ہنسنے لگا واقعی شام ہے اس نے سوچا۔

وہ ہنسی۔

"لیکن کچھ پرواہ نہیں۔" شام نے کہا۔ "چاہے شترمرغ کا ملے پر اگر تم نے ایسی بے پروائی کی تو پھر ———"

"اونہوں" وہ بولی "پھر وہی بات۔"

"بھگوان جانے میں جھوٹ ———"

اس کی بات ادھوری رہ گئی باغیچے میں خاموشی چھا گئی پر اسرار خاموشی ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہئے وہ اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی بجھادی اس کے دل میں ایک عجیب طوفان مچا ہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی

بنسی بجا رہا تھا۔ اپنی مرلی کی دھن پر ناچ رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے۔ لیکن الٹی دور ——— بہت دور ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بارن ایلی کے لئے گویا الف لیلےٰ کی ایک رات تھی غالباً" اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اس ونڈرلینڈ میں ایلس کی حیثیت رکھتا ہے اور ایلس بذات خود ایک ونڈرلینڈ تھی۔

پہلا سبق

امتحان کے قریب آنے پر لڑکوں کے پریکٹیکل لیسنز شروع ہو گئے اور اسباق کی تیاری میں مصروف ہو گئے پھر انہیں پریکٹیکل کے لئے مختلف سکولوں کی جماعتیں مل گئیں جہاں انہیں بچوں کو ایک مہینے کے لئے عملی طور پر پڑھانا تھا۔

بی ٹی اور ایس ڈی کے طلبہ کی ڈیوٹیاں مختلف سکولوں میں لگ گئیں۔ کسی کو دلی دروازے کے مدرسے میں متعین کر دیا گیا کسی کو بھاٹی دروازے اور کوئی شیرانوالے بھیج دیا گیا۔ ان تعیناتیوں کی وجہ سے کالج کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کالج لان کی جھاڑیوں میں رکھی ہوئی تمام بنچیں ویران ہو گئیں۔ جماعتوں کے کمرے خالی دکھائی دینے لگے۔ بورڈنگ میں آنے جانے اور ملنے ملانے کے اوقات اور بورڈنگ کے معمولات بالکل بدل کر رہ گئے۔

خوش قسمتی سے ایلی کی ڈیوٹی سنٹرل ماڈل سکول میں لگ گئی جو ان کے ہوسٹل کے متصل واقع تھا۔ اس بات پر اسے بے حد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے تمام سکولوں میں ایک معیاری سکول مانا جاتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ جدید طریقہ تعلیم سے واقف تھے اور بچے بہت ذہین سمجھے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب ایلی سنٹرل ماڈل سکول کی جماعت میں داخل ہوا تو کلاس ٹیچر نے اس کی طرف گھور کر دیکھا لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مار کر ہنسنے لگے۔

کلاس ٹیچر ایک بھاری اور بھدے جسم کا شخص تھا۔ اس کے ماتھے پر دائمی شکن تھا جیسے پیشانی میں کھود دیا گیا ہو۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے حسی کا دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور ہونٹ موٹے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ بار بار میز پر بجاتا تھا۔

"میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے آیا ہوں۔" ایلی نے کہا "میرا نام الیاس ہے۔"

"ہوں" کلاس ٹیچر نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پیچھے لڑکوں کی ہنسی کی

آوازیں آرہی تھیں۔

ایلی نے ایک بار پھر ملتجیانہ نگاہ سے کلاس ٹیچر کی طرف دیکھا لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا اسے گھورتا رہا۔

"تو مجھے کب سے کام شروع کرنا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہوں۔" کلاس ٹیچر کی تیوری اور گہری ہو گئی۔

لڑکے قہقہے مار کر ہنس پڑے۔

اس پر کلاس ٹیچر کی توجہ لڑکوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے چھڑی اٹھا کر زور سے میز پر ماری۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ غرایا۔

"کیا اسے اپنی تمیزداری کے متعلق کچھ علم ہے۔" ایلی نے سوچا۔

"ادھر آؤ وحید۔" وہ غرایا۔ نیچے اترو۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بھی اس جماعت کا ایک لڑکا ہو اور کلاس ماسٹر نے وحید کی طرح اسے بھی نیچے بلا رکھا ہو اور اب وحید کے بعد اس کی باری ہو۔ گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد کلاس ٹیچر باہر نکلا۔

"ہوں۔" وہ ایلی کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "تو تمہیں ملی ہے یہ جماعت۔"

"جی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اور ایک ماہ میں تم اس کا ستیاناس کر دو گے ؟"

ایلی محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کہے گا۔ "نکالو ہاتھ۔"

"دیکھو۔" کلاس ٹیچر نے اسے پھر ڈانٹا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مجھے تمہارا رپورٹ دینا ہو گی۔"

"جی۔" ایلی بولا۔

"اور اگر میں نے گندی رپورٹ دی تو تم فیل کر دیئے جاؤ گے۔"

"جی۔"

"اگر مجھ سے اچھی رپورٹ لینی ہے۔" وہ بولا "تو وعدہ کرو۔"

اس کے انداز میں اس قدر واضح دھونس تھی کہ ایلی جھٹ بول اٹھا "جی کرتا ہوں۔ کرتا ہوں۔"

"وعدہ کرو کہ جو جدید طریقے تعلیم کے تم نے سیکھے ہیں وہ میری جماعت پر نہیں برتو گے۔ انہیں آج سے بھول جاؤ گے۔ وہ محض ہاتھی کے دانت ہیں۔"

ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"یہ ڈنڈا ہے۔" کلاس ٹیچر چھڑی ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کا استعمال فراخدلی سے کرنا ہو

"جی ہاں۔ جی ہاں۔" ایلی چلایا۔

"سبق رٹوا کر یاد کرانا ہو گا چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔"

"جی۔"

"ہمیں نتیجہ دکھانا ہے پڑھانا نہیں۔"

"جی اچھا۔"

"تو تم وعدہ کرتے ہو۔"

"جی کرتا ہوں۔"

"تو جاؤ پڑھاؤ۔" اس نے ڈرامائی انداز سے جماعت کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت اچھا" کہہ کر ایلی چل پڑا۔

"ٹھہرو۔" وہ بولا ——— "تم ڈنڈا تو بھول گئے۔"

"اوہ۔"

کلاس ٹیچر نے چھڑی ایلی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کئی بار پھر اسے ڈانٹا۔

"خبردار جو اسے بھولے۔ ورنہ تمہاری رپورٹ ———

ایلی کانپتے ہوئے جماعت میں داخل ہو گیا۔

لڑکے کھڑے ہو گئے۔

"سٹ ڈاؤن" ایلی نے کہا اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔

لڑکے جوں کے توں کھڑے رہے۔

"سٹ ڈاؤن۔" اس نے دہرایا۔

وہ ہنسنے لگے۔

"بیٹھ کر ہنسو۔" وہ بولا۔

انہوں نے ایلی کو منہ چڑانا شروع کر دیا۔ جماعت سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہونے لگیں اس کونے میں گھڑی چل رہی تھی ٹک ٹک ٹک ٹک۔ ادھر چکی آٹا پیس رہی تھی گھمر۔ گھمر۔ گھمر۔ گھمر۔ پرلی طرف موٹر سٹارٹ ہو رہی تھی۔ دور الو بول رہا تھا۔ کہیں مرغا اذان دے رہا تھا۔ بلیاں لڑ رہی تھیں۔

ایلی حیرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیر تک وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر کلاس ٹیچر نے دروازے سے جھانکا۔

دفعتاً کمرے پر بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

"تم ڈنڈے کو پھر بھول گئے۔" ماسٹر نے ایلی کو ڈانٹا۔" اور تم نے وعدہ کیا تھا کیا تھا یا نہیں؟"

ایلی نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"تم اچھی رپورٹ کے قابل نہیں ہو۔" وہ بولا

پھر کلاس ٹیچر جس سرعت سے آیا تھا اسی سرعت سے چلا گیا۔

جماعت میں پھر سے آوازیں گونجنے لگیں۔

"فول۔ فول۔" کوئی چلا رہا تھا اگرچہ سب کے ہونٹ بند تھے۔

"سلی سلی۔ ٹون ——— میاؤں دھپ۔ دھڑاڑاڑ دم۔"

ایلی سر تھام کر کرسی میں بیٹھ گیا۔

وہ ۔ وہ ۔ وہ

جوں جوں امتحان قریب آتا جا رہا تھا کالج پر اداسی کا ایک دبیز پردہ پڑتا جا رہا تھا۔ لڑکوں کی خوش گپیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے چہروں سے مسکراہٹیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ پروفیسروں کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل چکا تھا۔ اب وہ کالج کے لڑکوں سے یوں سلوک کرنے لگے تھے جیسے وہ طالب علم نہیں بلکہ ہم کار ہوں۔

کونوں میں پڑے ہوئے بنچوں سے رنگین قہقہے سنائی دینے بند ہو گئے تھے۔ وہاں یا تو چھوٹی چھائی رہتی اور یا کبھی کبھار ہچکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں سے لڑکیاں باہر نکلتیں تو یہ معلوم ہوتا جیسے روئی روئی ہوں۔

شام کی رنگین باتیں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی گھنی بھنویں اور بھی بوجھل ہو گئی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" ایلی شام سے پوچھتا۔ "تم وہ شام دکھائی نہیں دیتے۔"

"وہ شام ہوں تو دکھائی دوں۔" وہ جواب دیتا۔

"تو وہ شام کیا ہوا؟"

"شام ختم۔ اب تو رات پڑ چکی ہے۔ جدائی کی رات۔"

"ارے اتنے ہی مر چکے ہو تم اس مرہٹن رادھا پر۔" ایلی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ "شاید تم سمجھ رہے ہو مجھے معلوم نہیں وہ چلایا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

شام نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تمہیں ہی کیا۔" وہ بولا "سب کو معلوم ہے۔" سب جانتے ہیں حتیٰ کہ ہماری لیبارٹری کا بچہ بھی جانتا ہے۔ صرف ہم دو ہیں۔ رادھا اور میں جو ابھی تک اپنے آپ کو فریب دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا۔"

"ایک بات پوچھوں۔" ایلی نے کہا۔

"پوچھو۔" شام بولا۔

"رادھا میں وہ کونسی خوبی ہے۔ جو تمہیں پسند آ گئی ہے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور پھر اپنی مست آنکھیں ایلی کی آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا۔

"صرف ایک۔ اور اس ایک خوبی پر ساری دنیا قربان کی جا سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ عورت میں بس یہی ایک خوبی ہوتی ہے جس پر مرد مرتا ہے۔ تم تو نفسیات پڑھتے ہو۔ تمہیں تو جاننا چاہیے۔ باقی جو ناک نقشے اور رنگ کی بات ہے۔ سب باتیں ہیں منہ زبانی باتیں۔"

"کیا واقعی وہ محبت کرتی ہے تم سے۔ سچی محبت۔"

"سچی محبت کا تو اپنے کو پتہ نہیں کچھ البتہ پیار کرتی ہے۔ جیسے ماں بچے کو کیا کرتی ہے۔ اس عمر میں ماتا مل گئی اور مجھے کیا چاہئے۔"

"تو کیا ماتا کی تلاش تھی تمہیں۔"

"سبھی کو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں!" وہ ہنسنے لگا۔ "یار یہ فلسفہ چھوڑو۔ مجھے تو غم کھائے جا رہا ہے اب میں کیا کروں گا۔ ہم کیسے دن گزارا کریں گے۔ پرماتما کرے ہم دونوں فیل ہو جائیں۔"

شام کی باتیں عجیب تھیں۔ اس کی شخصیت میں عجب مٹھاس تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام باتیں بلا تامل کہہ سکتا تھا جو ایلی کے دل میں بھی تھیں لیکن وہ انہیں زبان پر لانے یا اپنے آپ سے اظہار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ڈرتا تھا غالباً" اسی وجہ سے ایلی کو شام سے محبت تھی۔

اس روز شام کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس نے ایلی کے دل کا راز فاش کر دیا ہو۔ جیسے وہ ایلی کے اس راز سے کماحقہ' واقف ہو اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہو کہ ایلی کو شہزاد سے کیوں محبت تھی۔ اور وہ ایلی کا راز فاش کر رہا تھا۔ رادھا کا تو محض بہانہ تھا۔

ایلی کو پسینہ آ گیا اس کی زبان بند ہو گئی اس کے بعد نہ جانے شام کیا کہہ رہا تھا۔ شاید سرسری جسم کی تعریف کر رہا تھا۔ یا اس کے جسم کے خم و پیچ کی بات کر رہا تھا۔ ایلی کے روبرو اس وقت شہزاد کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ کہہ رہی تھی۔

"میں نے اس سودے میں کچھ پایا نہیں کھویا ہے۔ ایلی میں نے اپنا آپ کھو دیا ہے۔ تم جانتے ہیں کہ میں اپنے آپ سے گئی ہوں۔ ایک تم ہو جس نے آج تک اس بات کو نہیں پایا۔"

جی۔ کے کی ٹانگ ٹھیک ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک اسی کمرے میں مقیم تھے۔ اب آخری ایام میں کمرہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیماری کے ایام میں جی کے کی جذباتی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔

جس روز سے ایلی نے اس کا محبت نامہ پڑھا تھا جی کے کے متعلق ایلی کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا تھا پہلے اس کا خیال تھا کہ جی کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے۔ دوستوں سے تو وہ اکثر طور پر اظہار محبت کیا کرتا تھا لیکن ایلی کے اندازے کے مطابق وہ لڑکیوں سے محبت کرنے کا اہل نہ تھا چونکہ بنیادی طور پر وہ خود پسند شخص تھا۔ اور جو اس حد تک خود پسند ہو ایلی کے خیال

میں کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خط پڑھنے کے بعد ایلی کے مفروضات کا محل دھڑام سے گر گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا بہرحال اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جی کے کے بدلتے موڈ در حقیقت اس راز کی وجہ سے تھے جسے وہ یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ کون لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کبھی ملتے بھی تھے یا نہیں البتہ ایک بات اس خط سے واضح تھی کہ جی کے اپنی محبوبہ کے سامنے سرنگوں ہونے کا قائل نہ تھا۔ اس کے انداز میں سپردگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جی کے کے جذبات کی شدت قابل تحسین تھی۔

جس روز وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے ایلی کے منہ سے بات نکل گئی۔

"جی کے۔" وہ بولا "مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری زندگی میں دکھ کا عنصر اس حد تک حاوی ہے۔ میں سمجھتا رہا کہ تمہارا رویہ بدمزاجی کا شاہد ہے۔"

اس پر جی کے کی ناک یوں تن گئی جیسے کسی نے تلوار نکال لی ہو لیکن وہ خاموش رہا۔

"پہلے مجھے تمہاری محبت کا علم نہ تھا۔" ایلی نے کہا "لیکن اب میں جانتا ہوں کہ تم دکھی ہو۔"

"نہیں نہیں۔" جی کے سنجیدگی سے بولا۔ "میرے دکھ کو چھوڑو۔ مجھے تو صرف یہ دکھ ہے کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے دکھ کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اور ——— اور ———" جی کے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ———

"اس کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔"

اس وقت وہ سامان باندھ رہے تھے۔

"کب سے دکھی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ازل سے" وہ بولا۔

"ازل سے!"

"ہاں۔ ازل سے۔" جی کے نے بڑے دکھ سے کہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ صدیاں۔ اب تو اس بیچاری کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔ ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور وہ صرف اسی لئے جی رہی ہے صرف ایک آرزو' ایک امید کی زور پر۔" جی کے کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی اور وہ غسل خانے کی طرف دوڑا۔ غالباً" وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس عالم میں دیکھے۔

ایلی حیرت سے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کس قدر عجیب عجیب تھے اور اس کے سوچے ہوئے خیالات اور پڑھی ہوئی باتیں اور سمجھے ہوئے اصول کس قدر غلط تھے۔

باہر میدان میں برگد کے پتے جھڑ رہے تھے۔ زمین خشک پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ درخت کے تلے سامان رکھے اسفند ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی ملائمت تھی۔ سامنے برآمدے میں کلاس ٹیچر چھڑی سنبھالے کھڑا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ سب بے بس اپاہج ہوں۔ نہ جانے وہ کون تھی جس نے کلاس ٹیچر کے ماتھے پر تیوری کندہ کر دی تھی جس نے اسفند کو پلپلاہٹ بخش دی تھی نہ جانے وہ کون تھی جس نے کے جی کے ناک کو دھار دیدی تھی۔ دور کوئی چکی ہونک رہی تھی۔ وہ وہ وہ!

سیس نویا

گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایلی ایک انجانی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد وہ شہزاد کے پاس جا رہا تھا۔ وہ شہزاد جو علی پور میں صرف اس لئے بیٹھی تھی کہ اسے ایلی کے آنے کا انتظار تھا۔ ایلی کو بار بار شام کی بات یاد آ رہی تھی۔ عورت میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے صرف ایک کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس ایک خوبی کے لئے مرد اسے چاہتا ہے۔

ہاں۔ شام سچ کہتا تھا۔ عورت میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے۔ لیکن شہزاد میں تو بیسیوں خوبیاں ہیں۔ وہ اتنی دیر سے ایلی کا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے محبت کر رہی ہے۔ بے لاگ محبت جس میں ہوس کا عنصر نہیں اور اس نے اس محبت کے لئے سب کچھ کھو دیا ہے۔ کچھ پانے کی امید نہیں۔ اس میں حسن ہے رنگینی ہے جرأت ہے۔ کتنی جرأت ہے اس میں۔ ایلی کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے لوگوں کی جلی کٹی باتیں سننے کے لئے تیار ہے۔

ایلی کے دل میں شہزاد کے لئے نئے جذبات ابھر رہے تھے۔ وہ شہزاد کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے اوپر نیلا آسمان۔ پھر اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ براتیوں کی حیثیت سے شہزاد کو لا رہے تھے۔ جب شہزاد زنانے ڈبے میں سبز گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور محلے کے لڑکے باری باری

باری اس کی طرف جاتے تھے اور بہانے بہانے اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس سبز گٹھڑی کے پٹ کھل جائیں اور وہ ایک جھلک دیکھیں صرف ایک۔ اس روز بھی گاڑی سرسبز میدانوں میں بھاگ رہی تھی اور دور پہاڑیوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر نیلا آسمان تنا ہوا تھا۔

اس سبز گٹھڑی کو بیتے ہوئے آج بارہ برس ہو چکے تھے۔ بارہ برس۔ اب شہزاد چار بچوں کی ماں تھی لیکن اس کے انداز کی رنگینی میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔ اس کا چہرہ ویسے ہی جاذب نظر تھا۔ اس کی چال ویسے ہی روشن تھا۔ اس کا جسم ویسے ہی خم و پیچ سے بھرپور تھا۔ آنکھیں اسی طرح بھری بھری تھیں۔ ڈولتی تھیں۔ ایلی کو شہزاد کا قرب حاصل ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ دس سال سے شہزاد نے اسے آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور صرف یہی نہیں دس سال سے اس نے علانیہ اپنا رکھا تھا۔ اب تو بات اتنی پرانی ہو چکی تھی۔ کہ لوگوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور تھک کر خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن ایلی مسلسل دس سال سے شہزاد سے شادی رہا تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ شہزاد اس کے ساتھ نہیں آتی۔ اس سے دور رہتی ہے۔ اس سے صرف کھیلنا مقصود ہے جیسے ایلی کھلونا ہو۔ اسے خیال تھا کہ شہزاد کو صرف ایلی کے اس جذبہ کو قائم رکھنے کا شوق ہے جو اس کے دل میں اس کے لئے موجزن تھا اسے بذات خود ایلی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایلی سوچ رہا تھا۔ ہاں واقعی اس نے شہزاد کی محبت کی قدر نہیں کی بلکہ اسے کبھی تسلیم تک نہیں کیا۔ اور وہ ہمیشہ اس بات کا خواہاں رہا کہ اس سے جسمانی قرب پیدا کرے۔

پھر سادی کے آنے کے بعد ایلی نے دفعتاً محسوس کیا تھا کہ شہزاد اس کی محبت میں اس کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور اسی وجہ سے اس کی زندگی نارمل نہیں رہی۔ نہیں رہ سکتی۔ سادی سے میل ملاپ کے بعد اس نے شدت سے محسوس کیا تھا ایک شادی شدہ عورت سے محبت عظیم بدقسمتی ہے۔

لیکن ایلی سوچنے لگا اس میں شہزاد کا کیا قصور کہ وہ شادی شدہ تھی۔ شہزاد نے تو اس کا ہاتھ نہ تھاما تھا۔ خود ایلی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور ہاتھ تھامتے ہوئے تو اس کو احساس نہ تھا کہ اسے محبت ہے اس وقت تو محض ہوس کی وجہ سے اس نے ہاتھ تھاما تھا۔ مانا کہ اس کا کوئی مقصد صرف ایک حسین عورت کا قرب۔ اور وہ قرب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ

صرف اس لئے دکھی تھا کہ وہ شنزاد کو اعلانیہ اپنانا چاہتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن خواہش تھی جو
پوری نہ ہو سکتی تھی لہٰذا اسے آتش رقابت میں جلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شنزاد کے
ابھرے ہوئے تاروں کو گنا کرتا تھا۔

ایلی کو ان باتوں پر از سر نو ندامت ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے
قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کی قدر نہیں کی۔ اس کی قربانی اور جرات کی قدر نہیں کی۔
"نہیں نہیں۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میرا کام ہے اسے
اس کے آگے سیس نواتا۔"

ہاں ہاں۔ اب میں اس کے پاس پہنچ لوں اب کی بار ——

محلے کا میدان ویران پڑا تھا۔ غالباً محلے کے لڑکے دوسری طرف کھیل رہے تھے
غالباً گرمی کی وجہ سے اپنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جا چڑھی تھیں۔ اس وقت ناید
ہوں گے لیکن گرمیوں میں رات کے ۹ بجے تک تو میدان میں چہل پہل رہا کرتی تھی۔

ایلی نے اوپر کھڑکیوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ رابعہ کی کھڑکی بند تھی۔ اوپر کے چوبارے
کھڑکی کھلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چھتی گلی میں داخل ہوا تو مائی نتھی کی
سن کر ڈر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ مائی نتھی اتنی لاغر اور نحیف تھی کہ چھ
کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی وہ ایلی کو دکھائی نہ دی تھی۔

"کون ہے؟" ماں نتھی نے پوچھا۔

"میں ہوں۔" ایلی نے اسے پہچانے بغیر جواب دیا۔

"میں کون۔" اس نے پوچھا۔

"ایلی۔" وہ بولا۔ "سلام کہتا ہوں۔"

"ہے اپنا ایلی ہے۔" اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرا گھر آباد ہو۔ ہے۔ اب کی بار تو بڑی دیر
سے آیا ہے تو خیر سے تو ہے نا۔"

"ہاں ہاں۔"

"اے اچھا کیا دیر سے آیا تو۔ یہاں روز آ کر کیا کرنا ہے تو نے۔ لڑکے اپنے کام پر تو
لگتے ہیں۔ اچھا ہوا جو دیر سے آیا تو۔ جان چھٹی تیری۔ اس دلدل میں پھنس کر تو نے کیا لینا
خواہ مخواہ۔ اس کے تو لچھن ہی ایسے ہیں۔"

ایلی اس کی بات سن کر چونکا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایلی نے اس کے بے معنی باتوں
ٹالنے کے لئے بات کا رخ بدلا۔

"تو خیریت سے ہے نا ماں۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے بیٹا میرا ——"

"اچھا تو کل ملوں گا ماں۔" کہہ کر وہ چل دیا۔

لیکن وہ رہ رہ کر اس کی بات یاد آ رہی تھی کس کے لچھن کی بات کر رہی تھی۔ وہ اور دیر
نے کا کون سا فائدہ جتا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آ گئے مہاراج

رابعہ کا چوبارہ مقفل تھا۔ شنزاد کو حیرت میں ڈالنے کے لئے وہ دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا
اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور چوبارے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر شنزاد چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس
کے زیب ہی صفدر اکڑوں بیٹھا تھا۔ صفدر نے اپنی آنکھیں شنزاد پر گاڑ رکھی تھی۔ اس کے
ے پر عجیب سا تبسم تھا۔

ایلی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے زینہ بیٹھتا جا رہا ہو اور وہ گرا جا رہا ہو۔
نے بصد مشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر آخری سیڑھی پر چڑھ کر روشنی میں آ کھڑا ہوا۔
ایلی کو دیکھ کر صفدر گھبرا گیا اور فوراً سرک کر پیچھے ہو گیا۔ ایک ساعت کے لئے شنزاد کی
آنکھوں میں تذبذب لہرایا —— پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"آ گئے مہاراج۔" اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

"جی۔ آ گئے۔" وہ بولا غالباً اس کی آواز میں دھار تھی۔

"تو آ جاؤ۔" وہ ہنسی۔

کتنی خشک تھی وہ ہنسی۔!

ایلی سوٹ کیس اٹھائے آگے فرحت کے گھر کی طرف نکل گیا۔

فرحت اور اماں سے باتیں کرتے ہوئے وہ مسلسل شنزاد کے چوبارے کی طرف دیکھتا رہا کہ
کب آ کر اسے لے جائے۔"

"کل تجھے کریلے کھلاؤں۔ لو کب سے ادھر چائے بنی پڑی ہے چلو چائے تو پی لو پہلے۔"

لیکن اس روز شہزاد فرحت کی طرف نہ آئی۔ البتہ اس کے آنے کے چند منٹ بعد صفدر
جھومتا ہوا آیا اور رسمی طور پر ایلی کی مزاج پرسی کرتا ہوا اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہی نہیں کئی ایک باتیں غیر معمولی تھیں۔ اور پھر اس کا ایلی
شہزاد کے اس قدر قریب بیٹھنا اور آنکھوں میں وہ تبسم اور پھر ایلی کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹنا
—— یہ سب باتیں بڑی عجیب تھیں۔ پھر شہزاد کا وہ روکھا لہجہ اور خشک رویہ۔ یہ سب کیا تھا
ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔

اس کی نگاہوں تلے ماں نتھی آگئی۔ "اے اچھا کیا جو تو دیر سے آیا۔" وہ بولی "اچھا کیا تیری
جان چھٹی اس کے تو لچھن ہی ایسے ہیں۔"

دفعتاً" ماں نتھی کی بے ربط باتیں معانی سے بھر گئیں۔ ان میں مفہوم پیدا ہو گیا
خطرناک، ڈراؤنا مفہوم۔ ایلی بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ در
دیوار گھوم رہے تھے جھول رہے تھے۔ چاروں طرف سے اندھیرا یورش کر رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار
اٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شہزاد کے چوبارے میں جا گھسے اور با آواز بلند اس سے کہے۔

"اچھا کیا جو میں دیر سے علی پور آیا۔ میری جان چھوٹ گئی۔"

اور پھر وہ واپس آکر آرام سے سو جائے۔

رت آئے رت جائے

ساری رات وہ کانٹوں پر پڑا رہا۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب منظر آرہے تھے۔

اب وہ کھڑکیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے مکانات کی
کھڑکیاں ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں نا۔ صفدر نے اپنی آنکھیں شہزاد کی آنکھوں میں ڈال
رکھی ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ شہزاد اسے اشارے کر رہی ہے۔ ابھی نہیں ذرا ٹھہر جاؤ۔ بچے جاگ
رہے ہیں۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوبارے میں آ
ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب اس نے شہزاد کو جگایا۔ شہزاد
آنکھیں کھول دیں اور اور —— اس خیال پر ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جانے کہاں
سے اٹھتا اور اس کے تن بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا

ایلی دیوانہ وار اٹھتا۔ جی چاہتا کہ دیوانہ وار شہزاد کے چوبارے کی طرف اٹھ بھاگے اور ان
کے سرہانے کھڑا ہو جائے اور جب شہزاد اس کی طرف دیکھے تو اس کے منہ پر تھوک دے
کر واپس آجائے۔ دو ایک مرتبہ یہ دیوانگی اس شدت سے مسلط ہوئی کہ وہ واقعی ادھر جانے
کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا اگر وہ اکٹھے نہ ہوئے تو۔ اگر شہزاد اکیلی ہوئی تو۔ یہ ڈر اس
کے لئے روح ہو گیا اور وہ دعائیں مانگنے لگا۔ یا اللہ وہ اکٹھے ہوں۔ وہ کھڑکی پھلانگ کر آ چکا

صبح سویرے حسب معمول شہزاد آگئی مگر اس کے انداز میں نہ وہ شوخی تھی نہ رنگینی۔ اس
نے ایک نظر ایلی پر ڈالی اور پھر فرحت سے مخاطب ہو کر نہ جانے کیا کہنے لگی۔ اندر سے ہاجرہ

... آرہی ہے۔" وہ بولی۔ "ایلی آیا ہوا ہے۔ تجھے معلوم نہیں کیا۔ تو کل رات بھی نہیں

"اب اسے آنے کی فرصت کہاں"۔ فرحت نے طنزاً" کہا۔ "وہ دن گئے اماں۔ رت رت
کی بات ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" شہزاد ہنسی۔ "دن تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ دنیا کا یہی دستور ہے میں
نے کہا چلو میں بھی چار روز کے لئے خوشی منالوں تو کیا حرج ہے ——"

"توبہ ہے تم سے کون بات کرے۔" فرحت بولی۔

"اے ہے ایلی سے بات نہ کریگی۔ تو ناراض ہے کیا؟" ہاجرہ نے پوچھا۔

"ناراض تو نہیں۔" وہ بولی "لیکن ڈر آتا ہے۔"

"کیوں؟"

"مزاج چڑھے ہوئے ہیں کوئی بے ادبی ہو گئی تو پٹ جاؤں گی۔" شہزاد نے کہا۔

"تجھے بھی کوئی پیٹ سکتا ہے کیا؟" فرحت نے طنزاً" پوچھا۔

"تم ہی تو پٹتی ہوں"۔ وہ بولی۔ "وہی پٹتے ہیں نا جنہوں نے کشتی دریا میں ڈال رکھی ہو۔
کنارے پر بیٹھنے والیاں کیا جانو۔"

"تو پھر کیوں ڈال رکھی ہے سمندر میں۔" فرحت بولی۔

"تھپیڑوں کا مزا آتا ہے۔" شہزاد ہنسنے لگی۔

"تو پھر روتی کیوں ہو؟"

"رو رہی ہوں کیا؟" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

"تم خواہ مخواہ جھگڑتی ہو۔" ہاجرہ بولی۔ "چھوڑو اب۔"

"آ چائے پی لے۔" فرحت نے شہزاد سے کہا۔

"پلا دے۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "ہمارے ہاں کوئی پینے نہ آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہو گا۔ کیوں مہاراج۔" وہ ایلی کی طرف مخاطب ہوئی۔ "ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

ایلی کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

"د کشنا دو نا۔" فرحت ہنسنے لگی۔

"دیں گے۔" شہزاد بولی۔ "دیوتا بات تو کریں۔"

"یہ دیوتا پتھر کا نہیں بنا" ایلی نے کہا۔

"ہم کب کہتے ہیں۔" وہ ہنسی۔

"کہتی نہیں سمجھتی ہو۔" ایلی نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

"اونہوں۔" شہزاد بولی۔ "ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی دال نہیں گلے گی۔"

"ہاں ہاں۔" ایلی بولا۔ "ابھی چولہے پر چڑھائے رکھو۔"

"ایلی سے جیتے تو جانیں۔" فرحت بولی۔ "ہمیں کو لاجواب کرنا آتا ہے تمہیں۔"

"گرو مہاراج سے کیسے جیتوں۔" وہ بولی۔

عین اس وقت جانو آ گئی۔

"ہے ایلی آیا ہے۔ کب آیا تو۔ اب کی بار تو تیری شکل ہی نہیں دیکھی"۔ پھر وہ شہزاد سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "وہ آیا ہے۔ تیرا صفدر ادھر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ کہتا ہے ستار کے بل جا رہا ہوں۔ بندے ٹھیک کرانے ہیں تو دیدے۔"

"ہے میں تو بھول ہی گئی۔" شہزاد چلائی۔ "میں ذرا بتا آؤں اسے۔" اور پھر ایلی کی طرف دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صفدر کی آمد کی بات سنتے شہزاد کا رنگ ہی بدل گیا ہو۔ نہ جانے

حقیقت پر مبنی تھا کہ صفدر کی خبر سن کر شہزاد کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ لہرائی
اس کی آمد پر لہرایا کرتی تھی۔
پینے کے بعد ایلی باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔
جائے گا تو۔" ہاجرہ نے پوچھا۔
جا رہا ہوں۔ لوگوں سے ملنے کے لئے۔"
لوگوں سے ملنے کے لئے۔" فرحت نے معنی خیز انداز سے کہا۔ "آج لوگوں کو ملنا یاد آ گیا

نے کہا۔" ہاجرہ بولی۔ "تو کیا شہزاد سے ناراض ہو ؟"
نہیں تو" وہ بولا۔
ادھر گیا کیوں نہیں۔"
جاؤں گا۔"
"فرحت بولی۔ "تو بھی حد کرتی ہے خواہ مخواہ۔"
نہیں بیٹی۔" ہاجرہ بولی۔ "نہ کسی سے اتنا میٹھا ہونا چاہیے اور نہ اتنا کڑوا۔ جا کر مل لے
ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔"
مجھے لوگوں کی پروا نہیں اماں۔" ایلی بولا۔
دیکھو نا ایلی۔" فرحت بولی "اب تو تعلیم سے فارغ ہو گیا ہے اب تجھے یہاں نہیں رہنا
پھر اسی جھنجھٹ میں پھنس جائے گا۔ اب تو تجھے کسی نہ کسی نوکری پر چلے جانا چاہئے۔"
ابھی تو نتیجہ نہیں نکلا۔ ابھی سے نوکری کہاں ملے گی۔" ایلی اسے گھورنے لگا۔
ابا نے ہمیں لکھا ہے کہ فوراً" اسے بھیج دو۔ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی نوکری مل سکتی ہے۔"
نے جواب دیا۔
ہاں بیٹا۔" ہاجرہ بولی۔ "اب تو وقت ضائع نہ کرنا۔ اتنے سال ضائع کر چکا ہے اس طرح تو
زندگی کبھی نہیں سنورے گی۔ تباہ رہے گی ساتھ ہماری بھی۔"
ایلی خاموش ہو گیا۔
تو کیا میری بات مان لے گا۔" ہاجرہ نے پوچھا "دیکھ میں اک تیری امید کے آسرے پر جی
رہی ہوں۔" ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"چلا جاؤں گا اماں" ایلی نے کہا۔

"دو ایک دن میں نا" فرحت نے کہا۔

"ہاں۔" وہ بولا "دو ایک دن میں"

"اور اگر شہزاد سے صلح ہو گئی پھر بھی۔" فرحت نے چمک کر کہا۔

"اے ہے تو چھوڑو۔ خواہ مخواہ ایسی بات کرتی ہے۔" ہاجرہ بولی۔ اور دیکھ شہزاد سے ہنستے جدا ہونا غصے میں نہیں۔ کیا فائدہ ہے؟"

"اس بے چاری نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ الٹا اس نے تو ہم سے بہت ہی اچھا سلوک ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"ہوں۔" ایلی بولا اور چل پڑا۔

اجنبی عورت

سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر دفعتاً اس نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور شہزاد کے گھ طرف چل پڑا وہ سوچ رہا تھا شاید یہ میرا وہم ہے ناحق اس پر شک کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بات نہ ہو۔

اسے وہ دن یاد آ گیا۔ جب سنٹر ٹریننگ کالج میں جانے سے پہلے وہ رابعہ کے چوبارے شہزاد سے ملا تھا۔ شہزاد اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

"تم سمجھتے ہو۔" اس نے کہا۔ "کہ میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہو پوری کرنا تھی۔ الٹا میں نے تو ہوس پوری کرنے کے سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ میں اپنے خاوند سے بگاڑ کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہاں میں کس لئے بیٹھی ہوں۔ لئے کس امید پر۔"

ایلی گھبرا گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس کا وہم تھا۔ ناحق اس پر شک کر تھا۔ جب وہ شہزاد کے کمرے میں پہنچا تو وہ چپ چاپ بیٹھی مشین پر کام کر رہی تھی۔

"یہ دیکھ کون آیا ہے۔" جانو چلائی۔

شہزاد چپ چاپ کام کئے گئی۔

"میں نے کہا ایلی آیا ہے۔" جانو بولی۔

"آیا ہے تو ٹھیک ہے۔" وہ بولی "میں کیا جانتی نہیں کہ آیا ہے۔"

ایلی کو دھچکا سا لگا۔

"چائے نہیں پلائے گی کیا۔" ایلی نے دل کڑا کر کے کہا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ویسے ہی کام میں مصروف بولی۔ "جا جانو لے آ چائے۔ لگا دے اس میز پ"

یہ انتہا تھی۔ ایلی کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے لیکن وہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ جانو چائے لانے کے لئے نیچے چلی گئی تو اس نے شہزاد پر نگاہیں گاڑ دیں لیکن وہ اس قدر مصروف تھی کہ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"یہ صفدر یہاں کب سے آتا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"جب میں بلاتی ہوں آتا ہے۔" اس نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

"دن میں کئے بار بلاتی ہو۔"

"جتنی بار دل چاہے۔" وہ بولی۔

"بہت دل چاہتا ہے تمہارا۔" ایلی نے نفرت سے پوچھا۔

"اپنا اپنا دل ہے۔" وہ بولی۔ "مجھ پر کون بندشیں ڈال سکتا ہے۔"

ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی شہزاد تھی جو ابھی ابھی فرحت کے پاس بیٹھے ہوئے اسے دیوتا کہہ رہی تھی۔

"شہزاد کیا تمہیں معلوم ہے۔" ایلی نے کہا "کہ وہ ایک اوباش آدمی ہے۔ شرابی ہے اور سے کسی کی عزت کا خیال نہیں۔"

"جس کی عزت ہو وہ سوچے یہ باتیں۔ مجھے ان سے کیا۔" اس نے جلے کٹے انداز سے جواب دیا۔

ایلی اٹھ بیٹھا اور شہزاد کی طرف بڑھنے لگا۔

"نہ مہربانی کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر طنزاً بولی۔ "مجھے آرام سے جینے بھی دو گے یا نہیں۔"

"لیکن تم نہیں سمجھتی۔" وہ چلایا۔

"میں سمجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی نہ سمجھائے۔"

"تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا کسی کو حق نہیں۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

"شہزاد یہ تم کہہ رہی ہو۔" وہ چلایا۔

وہ خاموش رہی۔

"میں کیا پوچھ رہا ہوں؟"

"میں کیا مجرم ہوں کہ جواب دیتی پھروں۔"

وہ چپ چاپ پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ مشین چلانے لگی۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر کے بعد جانو کی نیچے سے آواز آئی۔

"یہ آگیا ہے صفدر۔" وہ بولی۔

"اچھا میں آئی۔" یہ کہہ کر وہ قلانچیں بھرتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگیں

ایلی چپ چاپ اٹھا اور نہ جانے کدھر کو چل پڑا۔ اس کے حواس معطل ہو چکے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں ایک بھیانک خلا پھیل رہا تھا۔ اس وقت نہ اسے غم تھا نہ غصہ۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق میں تبدیلی ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف لامحدود وسعتیں پھیل گئی تھیں۔ اور ان میں ایلی گویا کھو گیا تھا۔ وہ بوجھل اور بھیانک خلا یوں جھول رہا تھا جیسے سمندر ہو۔ اس میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایلی کی ناؤ جھول رہی تھی۔ بہہ رہی تھی۔ بہے جا رہی تھی۔ نہ بادبان تھے نہ چپو۔ نہ کوئی راستہ نہ منزل۔

سارا دن نہ جانے وہ کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر رک جاتے۔

"ایلی ہے۔ کب آیا تو۔ ارے۔" وہ چلاتے۔ "یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ اپنی شکل کی طرف تو دیکھ۔ بیمار ہے کیا؟"

پہلے تو اس نے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔ "ہاں بیمار ہوں۔"

"کیا بیماری ہے؟" وہ پوچھتے۔

"بخار آتا رہا ہے۔" وہ جواب دیتا۔

لوگوں کو ایسے سوال کرتے دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کسی کے

پاس جا بیٹھے لوگوں سے ملے۔ رضا تو امرتسر جا چکا تھا۔ چلو ہمدم کی طرف ہی سہی یا بھا اور جاہ کے
پاس جا جائے۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کا چہرہ ضبط کے باوجود بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔
مڑ چلا جائے۔
وہ باہر قبرستان کی طرف چلا گیا اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟

شہزاد وہ شہزاد نہیں تھی۔ کہاں وہ ہنستی کھیلتی مسکراتی ہوئی شہزاد اور کہاں یہ عورت۔ ایسا لوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک اجنبی عورت ہو جسے ایلی نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ ہنستی تو وہ تھی مگر ں کی وہ ہنسی کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور پھر صفدر کے لئے۔ ایلی کے دل میں ہیں سی اٹھتی۔ اگر شہزاد ویسے ہی ٹھکرا دیتی تو اسے تکلیف نہ ہوتی۔ کسی ایسے کے لئے ٹھکراتی ز کسی حیثیت کا مالک ہوتا۔ جس کی کوئی شخصیت ہوتی۔ کچھ بھی ہوتا لیکن صفدر ایک خود غرض نراب۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا۔

اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے صفدر ابھرتا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر بھری مسکراہٹ جھلکتی اور وہ ایلی کی طرف دیکھتا۔

"میں نے تو کہا تھا بانٹ کر کھائیں کتنی منتیں کی تھیں کہ ہمیں بھی اس دہلیز پر بیٹھنے کی جازت دو۔" وہ قہقہہ لگاتا۔ "لیکن تم کب سنتے تھے" ——— پھر وہ ایڑیاں اٹھا کر گانے لگتا ماظ خدا تمہارا۔" ——— اور یوں اشارے کرتا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب چھٹی کرو بھائی۔" ——— پھر وہ شہزاد کی طرف متوجہ ہوتا اور دوسرا مصرع اسے مخاطب کر کے کہتا "اے دلربا ہوں ل فدا۔"

گھر پہنچ کر بھی ایلی کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ بہر حال ایک بات واضح تھی اس کا علی پور میں رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اسے جانا ہی ہو گا۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ الانہ جائے۔ شاید کسی روز شہزاد کہے۔ تم خود مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ سبھی کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن یہ الزام برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے شہزاد سے بے وفائی کی۔

وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ثابت کر دے کہ شہزاد اس سے بے وفائی کر رہی ہے لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ بات تو واضح تھی۔ شہزاد کی ہر حرکت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی الغرض توجہ صفدر پر مرکوز ہو چکی ہے اور اب وہ ایلی کو محض ایک رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ ڈرامائی انداز سے اس وقت ان کے سر پر جا کھڑا ہو جب وہ ایک دوسرے سے محبت کا

انظہار کر رہے ہوں تاکہ وہ شنراد کی بیوفائی اور اپنی مظلومیت کی دھاک بٹھا دے اور پھر ایک
عاشق کی طرح ان کے راستے سے ہٹ جائے اور باقی ساری زندگی اس بے وفا محبوبہ کی یاد میں
رو کر بسر کر دے۔

رات تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

رت جگا

فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ دونوں ضرور ملتے
ہونگے صفدر اپنی کھڑکی سے پھلانگ کر شنراد کے چوبارے میں آجاتا ہوگا۔ شنراد اکیلی ہی تو تھی
اس کی ماں بیگم کہیں گئی ہوئی تھی۔ جانو گھر کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی
صرف شنراد اور اس کی چار بچیاں چوبارہ میں رہ جاتی تھیں۔ پھر رکاوٹ کونسی تھی۔ وہ ضرور ملتے
ہوں گے ضرور۔

بارہ بجے تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اس نے بہانہ بنایا جیسے سو رہا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھا
اور دبے پاؤں شنراد کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس دروازے میں جا کھڑا ہوا جو شنراد کے
کوٹھے پر کھلتا تھا اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ شنراد کی بچیاں باہر صحن میں سوئی ہوئی تھیں اور
وہ خود اندر کھڑکی میں کھڑی غالباً" صفدر سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ
دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور رابعہ کے خالی چوبارے میں جا کر چھپ گیا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ شنراد کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے ان کی
گفتگو کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا چونکہ وہ ان سے کافی دور تھا لیکن ان کے قہقہے ایلی کو سنائی
دے رہے تھے۔ وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔

پھر دفعتاً" اس نے ہنسنا موقوف کر دیا اور وہ زیر لب باتیں کرنے لگے۔ ضرور وہ ملنے کی
تفصیلات طے کر رہے تھے۔

تقریباً" آدھ گھنٹے کے بعد شنراد چلائی۔

"ہے۔ آدھی رات ہو چکی ہے اب مجھے نیند آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے آخری قہقہہ
لگایا اور پھر باہر چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔

دیر تک ایلی وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔

محلے پر سکوت طاری تھا۔ تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں البتہ احاطہ میں چمگادڑیں چیخ رہی
تھیں جو اس سکوت کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھیں۔ احاطے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ شنراد کے
[illegible] پر بھی خاصا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم
روشنی صحن کے ایک حصے میں پڑ رہی تھی۔

اگر صفدر نے آنا تھا تو شنراد نے دیا کیوں جلا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا ---- شائد اس لئے کہ
کھڑکی پھلانگ کر آنے میں اسے دقت نہ ہو۔ وہ کھڑکی پر نگاہیں جمائے سوچتا رہا۔ مسجد کی گھڑی
نے دو بجائے اور وہ چونکا۔ دو بج گئے۔

پھر وہ دبے پاؤں نکلا اور شنراد کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ وہ بازو سر تلے رکھے بے خبر سو رہی
تھی جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ ایلی کا دل چاہا کہ اسے جگا دے اور پھر اس کے پاؤں پر سر رکھ کر
رو دے لیکن اسے شنراد کے قہقہے یاد آ گئے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایلی دکھی ہے۔ دکھی
سہی چلو ناراض ہی سہی اور وہ جان بوجھ کر صفدر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ اور پھر جب وہ
اس وقت اس کے پاس آیا تھا تو کس بے اعتنائی سے اس نے کہا تھا۔ جانو اسے چائے پلا دے۔
جیسے کسی بھکاری کو بھیک دی جاتی ہے۔

چند منٹ وہاں رک کر وہ شنراد کے چوبارے میں داخل ہو گیا۔

وہاں وہ صندوقوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ بہت رات بیت چکی اب تو
شاید صفدر نہیں آئے گا۔ اسے اس بات پر دکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خوشی
اس بات پر منحصر تھی کہ صفدر کھڑکی پھلانگ کر آ جائے۔ آ کر شنراد کو جگائے اور شنراد اس کے
گلے میں بانہیں ڈال دے پھر ایلی چپکے سے باہر نکلے اور ان کے روبرو آ کر کہے۔

"آداب عرض ہے محترمہ۔"

اور پھر چپ چاپ اپنے گھر آ جائے اور اگلے روز صبح سویرے ہی ہمیشہ کے لئے علی پور کو
خیر باد کہہ دے گھڑی نے تین بجا دیئے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکے
گی۔ شاید وہ اس لئے نہیں مل رہے تھے کہ ایلی وہیں تھا اور شنراد کو ڈر تھا کہ کہیں بھانڈا پھوٹ
نہ جائے ---- پھر وہ اعلانیہ قہقہے کیوں مارتی تھی ---- ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
بہرصورت کوئی ثبوت تو ضرور ہونا چاہیئے۔ شاید شنراد کے ٹرنک میں صفدر کے محبت نامے
ہوں۔ صفدر نے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جیسے وہ خود شنراد کو لکھا کرتا تھا۔

اس نے شہزاد کا صندوق کھول کر اس کی ہر چیز باہر نکال کر دیکھی لیکن اس میں کوئی خط نہ تھا البتہ اس میں کئی ایک ایسی بیکار چیزیں پڑی تھیں جو کسی زمانے میں ایلی نے اسے دی تھیں مثلاً ایلی نے ایک مرتبہ شہزاد کو ایک کھلونا دیا تھا۔ سیاہ لکڑی کا بنا ہوا ایک جاپانی کبڑا۔ اور ایلی نے یہ کبڑا دیتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"جانتی ہو یہ کون ہے؟ یہ تمہارے میاں ہیں دیکھ لو۔" پہچان لو۔"

اور شہزاد نے قہقہہ لگایا تھا۔

پھر وہ تسبیح تھی جو اندھیرے میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹرنک میں شہزاد نے اپنی پرانی پھٹی ہوئی دو بنیانیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بھی ایلی شہزاد سے ملتا تو وہ تقاضا کیا کرتا کہ شہزاد اسے اپنی پرانی میلی بنیان دے۔ ایلی کو شہزاد کے جسم کی بو سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی پہنی ہوئی میلی بنیان پہن کر بے حد مسرت محسوس کیا کرتا تھا کہتا تھا۔ یہ بنیان پہن کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے تم مجھ سے بغل گیر ہو۔ اسی لئے شہزاد اپنی پرانی بنیانیں سنبھال کر رکھا کرتی تھی کہ ایلی آئے تو اسے "تحفتاً" دے۔

ایلی ان سب چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ان چیزوں کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

مایوس ہو کر اس نے صندوق بند کر دیا۔

دفعتاً" اس کی نگاہ لیٹر پیڈ پر پڑی۔ ہائیں۔ اس نے سوچا' لیٹر پیڈ۔ شہزاد نے تو کبھی لیٹر پیڈ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اسے خط لکھنا ہوتا تھا تو وہ اپنی بچیوں کی سکول کی کاپی سے ورق پھاڑ لیا کرتی تھی۔ پھر یہ پیڈ۔

اس نے پیڈ کو اٹھا لیا۔ اچھا خاصا خوب صورت پیڈ تھا۔ ابھی نیا ہی تو تھا۔ صرف چند ایک ورق ہی پھاڑے گئے تھے۔

ارے ——— وہ پیڈ اٹھا کر دیئے کے پاس جا بیٹھا۔ اوپر کے ورق پر الفاظ کھدے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے کسی نے پنسل سے کسی ورق پر کچھ لکھا ہو اور نچلے ورق پر دباؤ کی وجہ سے نشانات پڑ گئے ہوں۔

اس نے پیڈ کا اوپر کا ورق پھاڑ لیا اور اسے دیکھنے لگا لیکن روشنی کافی نہیں تھی اس لئے کچھ پڑھ نہ سکا بہرحال الفاظ واضح طور پر موجود تھے۔

اس نے وہ کاغذ اٹھایا اور دبے پاؤں چپ چاپ گھر واپس آگیا۔

حافظ خدا

گھر آکر بھی وہ سو نہ سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد صبح ہو اور وہ کاغذ روشنی میں پڑھ سکے۔

پیڈ کے اس کاغذ پر سرنامے کی جگہ واضح طور پر صفدر لکھا ہوا تھا اور اختتام پر شہزاد۔ ایلی نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ اسے نفس مضمون کے متعلق کچھ علم ہو جائے لیکن وہ نقوش بے حد مدھم تھے اور ان سے کوئی اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔

سارا دن وہ اس خط کو پڑھنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ اس نے خوردبین مہیا کی۔ آئینہ استعمال کیا۔ اس کاغذ کی فوٹو لی اور آخرش اس پر سیاہی ملی تاکہ دباؤ سے بنے ہوئے الفاظ کی سفیدی واضح ہو جائے۔ لیکن اس کی کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی۔

اس پر دفعتاً" اسے غصہ آگیا۔ میں بھی کمینہ ہوں وہ سوچنے لگا۔ جو ثبوت مہیا کر رہا ہوں کیا شہزاد کی ہر حرکت ایک واضح ثبوت نہیں ہے۔ کیا اس کا برتاؤ واضح ثبوت نہیں ہے۔ تو پھر ثبوت کیوں۔ یہ سوچ کر اس نے اماں کو بلایا۔

"اماں۔" وہ بولا "اماں۔ میں خان پور جا رہا ہوں۔"

"اچھا" ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ "کب؟"

"آج رات کی گاڑی سے۔"

"آج" وہ گھبرا گئی۔ "اے ہے دو چار دن تو رہ لے۔"

"اماں تم بھی حد کرتی ہو۔ اگر وہ خوشی سے جاتا ہے تو روکو نہیں۔" فرحت بولی۔

"تو خوشی سے جا رہا ہے ایلی؟" ہاجرہ نے پوچھا۔

"تو کیا مجبوری سے جا رہا ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو شہزاد سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہا؟" ہاجرہ بولی۔

"واہ اماں۔" فرحت چلائی۔

"ہے کوئی بری بات کر رہی ہوں کیا؟" ہاجرہ نے معصوم انداز سے کہا۔

"تو بھی بڑی بھولی ہے اماں۔"

"مجھے نہیں آتیں ٹیڑھی باتیں"۔ ہاجرہ نے کہا "ہے کسی سے ناراض ہو کر کیوں جدا ہو لئے۔"

"تو پھر ان دونوں کو منا دے۔" فرحت ہنسنے لگی۔

"ہاں ہاں۔" ہاجرہ بولی "اس میں کیا حرج ہے۔"

"تو اس کی باتیں نہ سن ماں۔" ایلی نے کہا۔

"مجھے نہیں سمجھ میں آتیں یہ باتیں۔ میرا دل تو صاف ہے۔" ہاجرہ بولی۔

"کچھ زیادہ ہی صاف ہے ماں۔" فرحت ہنسی۔

"چل میرے ساتھ شہزاد کی طرف۔" ماں نے فرحت کی بات پر غور کئے بغیر کہا۔

"نہیں اماں چھوڑ اس بات کو۔" ایلی گھبرا کر بولا۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو جانو نے شور مچا دیا۔

"کچھ خبر ہے یا اپنی ہی دھن میں غرق رہو گی۔" وہ شہزاد سے کہنے لگی جو اس وقت صفدر سے باتوں میں مصروف تھی۔

"کیا ہے؟" شہزاد بولی۔

"ایلی خان پور جا رہا ہے۔"

شہزاد نے قہقہہ لگایا "تو پھر؟"

"اے میں کہتی ہوں واقعی وہ جا رہا ہے۔" جانو چلائی۔

شہزاد پھر ہنسی۔ "تو کیا کروں؟" وہ بولی "کیا گھوڑا گاڑی جوت کر لاؤں۔"

"ہئے کیا باتیں کر رہی ہے تو۔ ابھی کل تو ——" جانو رک گئی۔

"بہت منا دیکھا میں نے۔" شہزاد نے کہا "اب نہیں ——"

ایلی نے سنا۔ اس کے دل پر کسی نے گویا جلتی ہوئی میخ گاڑ دی۔

محلے کے چوگان میں محلے والیوں نے ایلی کو روک لیا۔

"کون جا رہا ہے ماں؟" ایک کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"اپنا ایلی ہے۔" ماں نے کہا۔

"جا رہا ہے۔ علی پور چھوڑ کر جا رہا ہے۔" دوسری بولی۔

"ہئے شہزاد کی کھڑکی خالی ہے۔" ایک نے طعنہ دیا۔

"وہ ادھر دوسری کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔ اس لئے۔"

"ہئے کتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں اس کے چوبارے میں۔"

...دوری ہے ماں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

...یک دن جانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔" ماں بولی "چلو اچھا ہی ہوا تو بھی کام کاج پر لگے گا۔"

ایلی کا سر جھک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب نے گوبر کی ٹوکری اس کے سر پر گرا...

...شرمساری اور ذلت سے لت پت وہ چل پڑا۔ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ گردن...

...گویا ٹوٹ گیا تھا۔ سامنے ایک خلا تھا۔ ایک دھندلکا تاریکی جو منہ کھولے بیٹھی تھی۔ دور...

...گراموفون چلا رہا تھا۔

حافظ خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں فدا۔

بن باسی

خانپور جاتے ہوئے ایلی کے دل میں غم بوند بوند گر رہا تھا لیکن دراصل اس غم کی حیثیت ثانوی تھی۔ اسے شہزاد سے جدائی کا غم نہ تھا۔ شہزاد کی محبت کھو دینے کا صدمہ نہ تھا بلکہ احساس ندامت اور شکست کی وجہ سے اس کا دل چور چور تھا۔

ایلی جذبہ عشق اور احساس غم سے بیگانہ تھا۔ اگر وہ عشق یا غم سے محروم نہ ہوتا تو یہ راز اس کے کردار میں ایسی گہرائی پیدا کرتا جو اپنی نوعیت میں تعمیری ہوتی۔ اس کے برعکس وہ محسوس کر رہا تھا کہ دیوتا پتھر کے ٹکڑے کی طرح ٹھکرا دیا گیا۔ اور اب وہ دیوتا نہیں محض ایک پتھر جو لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا ہے۔ آج تک اس کی تمام تر اہمیت کا انحصار شہزاد کی توجہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے تھا ——— اب وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہ تھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ گاڑی کی چھکا چھک کی آواز اسے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے شہزاد اور صفدر قہقہے مار کر ہنس رہے ہوں۔ سبھی اس پر ہنس رہے تھے۔

"آخر ایک نہ ایک دن جانا ہی پڑتا ہے۔" ماں ننھی مسکرا رہی تھی۔ "ایسے ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہی۔" چچا صمد چلا رہا تھا۔

"بہن اس کے چوبارے میں تو کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں۔ بارہ دری ہے۔"

"جا رہا ہے تو میں کیا کروں؟" شہزاد ہنس رہی تھی۔

"حافظ خدا تمہارا۔" صفدر قہقہے مار رہا تھا۔

اور جب وہ خان پور پہنچے گا تو علی احمد ہنسیں گے۔

ہو بھئی نصیر احمد کی ماں۔ ایلی آ گیا۔ آخر آ ہی گیا۔ ہی ہی ہی ہی بھئی بڑی ہمت کا کام کیا ایلی نے سنتی ہو نصیر کی ماں۔ کارنامہ دکھایا ہے ہی ہی ہی ہی۔ وہاں سے چلے آنا کوئی آسان تھی کیا؟ ——— اونہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم تم کیا جانو۔"

ان کی آنکھ میں چمک لہرائے گی اور پھر وہ جھک کر راجو کے کان میں کہیں گے:

"تمہیں کیا پتہ مرد کی مجبوریاں۔ تم خود مجبوری ہو۔ ہی ہی ہی۔"

ایلی کو خانپور جانے سے ڈر آتا تھا۔ علی احمد کے روبرو جانے سے ڈر آتا تھا۔ اگرچہ علی احمد نے واضح الفاظ میں ایلی کو کبھی شہزاد کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان کی ہنسی میں وہ ہمیشہ دھار دیں کرتا تھا۔ ان کی خصوصی ہنسی ایلی کے لئے کند چھری کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے راستے میں وہ ایک روز کے لئے لاہور رک گیا۔

لاہور ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اس لئے وہ سیدھا دہلی مسلم ہوٹل چلا گیا اور کمرے میں سامان رکھ کر وہ چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا ہو جیسے پہلی مرتبہ ایک بچہ انگلی کا سہارا لئے بغیر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اگلے روز وہ لاہور میں گھومتا رہا یوں جیسے ایک بیگانہ شہر ہو۔

سنٹرل ٹریننگ کالج ویران پڑا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک اجنبی مقام پر ہو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی چند روز پہلے وہ اسی بورڈنگ میں رہتا تھا۔ وہ چھ لڑکیاں وہ شام۔ جی کے نائب اب اس کے ذہن میں دھندلا چکے تھے جیسے انہیں کبھی خواب میں دیکھا ہو۔

شام کے وقت جب وہ انار کلی میں گھوم رہا تھا تو دفعتاً کسی نے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے تم؟" کوئی چلایا۔

"شام" ایلی کی چیخ نکل گئی۔ "تم یہاں ہو؟"

"ہم اب کہیں جانے کے قابل نہیں رہے۔ بس اب تو یہیں اپنا مقبرہ بنے گا۔" شام مسکرا

"کیوں؟"

"بس سنگ ناتہ لیلئے۔" شام ہنسا۔ "وہ میرے لئے یہیں رک جائے تو پھر میں کہیں جا سکتا ہوں کیا؟"

"رک گئی ہے؟" ایلی بولا۔

"ہاں۔ اس نے یہاں نوکری کر لی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں نے لاء کالج جائن کر لیا ہے۔ کالج تو بہانہ ہی ہے۔" شام نے آنکھ ماری۔ "مطلب ہے جہاں فیڈنگ بوتل وہاں گلیکسو بے بی۔"

شام ایلی کو اپنے نئے بورڈنگ میں لے گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچتے ہی جب اس نے روشنی میں ایلی کی طرف دیکھا تو چلانے لگا۔"

"ارے تم۔ تمہیں کیا ہوا؟"

"مجھے۔" ایلی نے جھوٹ موٹ دہرایا۔ "کیوں مجھے کیا ہے؟"

"دایہ سے پیٹ چھپاتے ہو۔" شام چلایا۔

"تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

شام کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

"بتاؤں؟" وہ بولا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"ٹھس س س س س۔" وہ چلایا۔ "پنکچر"۔

"پنکچر" ایلی نے بناوٹی حیرت سے دہرایا۔

"وہ پنکچر ہوا ہے کہ ساری ہوا نکل گئی ہے ——— کیوں اب بولتے نہیں۔" شام چلایا۔ "بولو نا۔"

"سچ کہتے ہو۔" ایلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ارے۔" شام اس کی آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

سب ختم ہو گیا۔" ایلی بولا "وہ تخت وہ تاج و شہنشاہی سب۔ صرف میں باقی رہ گیا ہوں اور شاید میں بھی ختم ہو جاؤں۔"

"زہر ———" شام نے بات کو مذاق میں ٹالنے کے لئے کہا "ابھی تک میرے ٹرنک میں پڑا ہے اور الیاس، بھگوان کی سوگند بس ساری عمر ٹرنک میں پڑی رہے گی۔ نہ مجھ میں کھانے کی ہمت ہوئی نہ تم میں ہو گی۔" وہ ہنسنے لگا۔

"نہیں شام" ایلی بولا "ساری زندگی چوپٹ ہو گئی۔ بساط ہی الٹ گئی۔ اب جینا بے کار ہے۔"

"اس کے باوجود جیے جاؤ گے بیٹا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی پٹ سے ٹھیک ہو جائے گی۔ بساط پھر قائم ہو جائے گی۔ غم نہ کھاؤ۔"

"غم تو اب لگ گیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔؟" شام نے کہا۔

ایلی نے اثبات میں اشارہ کیا۔

"اس نے بے وفائی کی۔ بس یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔" ایلی بولا "پہلے تخت پر بٹھایا۔ پھر مورچھل کرتی رہی اور پھر دھکا دے کر وہاں سے گرا دیا۔"

"بس تم سمجھ لو رشی منی بن گئے۔ تمہارا کلیان ہو گیا۔"

"کیوں؟"

"جس نے کامیابی دیکھی۔ تخت پر بٹھایا گیا۔ مورچھل کروایا۔ وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک عروج پر سے گرایا نہ جائے۔ سمجھ لو تمہارا کلیان ہو گیا۔ آؤ تمہیں بیئر پلاؤں۔" وہ چلانے لگا "لاجواب چیز ہے پنکچر لگ جائے گا۔ پھر سے تخت پر بٹھا دے گی۔ مورچھل کرے گی۔ آؤ اب اپنا آپ سنبھالو۔" شام کہنے لگا۔ "جوتیاں کھانا تو اپنا پرانا پیشہ ہے۔ تم تو یوں شکل بنائے ہو جیسے پہلی بار جوتا کھایا ہو۔ ہمت کرو۔"

"مجھے نصیحتیں کرتا ہے بے سالے۔" ایلی جلال میں آ گیا۔

"کر لینے دو۔ کر لینے دو۔" شام چلایا۔ "تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ میری نصیحتوں سے تم نے کونسا ماننا ہے۔ لیکن اپنی بات بن رہی ہے۔ کر لینے دو نصیحتیں مجھے۔"

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"یار ایلی۔" شام بولا "ساری عمر بیت گئی ہے۔ ہمیشہ مجھے ہی پنکچر ہوتا رہا۔ ہمیشہ لوگ مجھے

ہی نصیحتیں کرتے رہے۔ بھگوان جانے یہ پہلا موقعہ ملا ہے جب میں تمہیں نصیحت کر سکتا ہوں۔
دل چھوٹا نہ کرو۔"

"بائے بائے۔" ہوٹل میں پہنچ کر شام چلایا "چار بوتل۔ اچھی سی لانا۔" وہ ہنسا۔ "تیزی کی
تخت پر بٹھائے اور مور چھل کرے۔"

خانپور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے جمیل مل گیا۔ جب ایلی پلیٹ فارم پر قلی ڈھونڈ رہا تھا
اس نے دیکھا کہ بریک کے قریب جمیل کھڑا ہے۔

"ارے تم۔" وہ حیرت سے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔

جمیل مسکرا رہا تھا۔

"میں تو یہیں ملازم ہوں۔ ابھی ٹھہرو اکٹھے چلیں گے۔"

خانپور کے اس صحرائے اعظم میں جمیل ایلی کے لئے واحد نخلستان تھا۔ اگرچہ ایلی کو جمیل
سے حجاب سا محسوس وہ رہا تھا۔ چونکہ جمیل صفدر کا چھوٹا بھائی تھا اس لئے وہ جمیل پر ظاہر نہیں
کرنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کیا المیہ واقع ہوا ہے۔

آج تک ایلی نے شہزاد کو راز بنائے رکھا تھا۔ اس نے شہزاد کے متعلق اپنے کسی دوست
سے بات نہ کی تھی۔ لیکن اب اس عظیم شکست کے بعد اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر کسی کو روک
کر اپنی کتھا سنائے اور راہ چلتوں کو بتائے کہ اس نے ایلی سے کیا سلوک کیا ہے۔ ہر ملنے والے
کو خبردار کرے کہ کبھی کسی عورت پر بھروسہ نہ کرے کبھی اس کی محبت پر اپنی خوشی کا انحصار
رکھنا۔ لیکن ایلی یہ بات جمیل سے نہیں کر سکتا تھا۔ صفدر کے چھوٹے بھائی سے یہ بات کرنا
اسے گوارا نہ تھا۔

محفل

علی احمد کے گھر میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مثلاً" ان کی تیسری بیوی شمیم جو کشمیر کے سیب کھا کھا کر پلی تھی۔ اور علی احمد کے گزشتہ
بیان کے مطابق بذات خود ایک سیب تھی اب قطعی طور پر اپنی شخصیت کھو چکی تھی۔ کشمیر کا
سیب اب گل سڑ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس حد تک اعتراف شکست کر چکی تھی کہ اب اس
میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ غالباً" نا امیدی اور مایوسی کی شدت کی وجہ سے

اپنا آپ مسخ کر لیا تھا۔ از خود۔

علی احمد کی چوتھی بیوی راجو' جو کسی زمانے میں دوراہے کی رانی تھی اب چار دیواری سے
گھرے گھر کی خاتون بن کر رہ گئی تھی۔

نہ تو اس کی نگاہوں میں شوخی تھی نہ انداز میں نمائش اور نہ چال میں مٹک جو نگاہوں کو
دیتی ہے۔ اس کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ
جو ابھی تک اس قلعے کی تسخیر میں جوں کا توں منہمک تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے گھر
آستانیوں کی آمد و رفت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے علی احمد نے خود ہی اس
توڑ دیا ہو یا شاید اس کی وجہ راجو کا رویہ ہو۔ بہر حال علی احمد کا گھر اب ایک گھر تھا۔

گھر میں علی احمد تھے۔ شمیم اور اس کی دو بیٹیاں۔ نا ئمہ اور انجم' اور راجو کے دو بیٹے شیر
اس کے پہلے شوہر سے تھا اور نصیر جو علی احمد سے تھا۔

وہاں پہنچ کر دو ایک روز تو ایلی کھویا کھویا رہا۔ پھر محض اتفاق سے اس کی توجہ کتاب پر مرکوز
اور وہ شہزاد کو بھولنے کے لئے ——— اپنے کھوئے ہوئے تخت و تاج کو بھولنے کے لئے
میں کھو گیا۔

سارا دن وہ کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا اور جب مطالعہ سے اکتا جاتا یا جب سادی اور
کتاب کے صفحات سے جھانک کر مسکراتیں' اشارہ کرتیں تو وہ کتاب پھینک کر جمیل کی
چلا جاتا۔ اور جمیل فارغ ہوتا تو وہ اسے اپنے دوستوں کی محفل میں لے جاتا جہاں وہ تاش
کھیلتے، گپیں ہانکتے اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے۔

جمیل کے ساتھی تو بہت تھے لیکن ان میں صرف دو ایسے تھے جنہوں نے ایلی کو اپنی طرف
کھینچا۔ نقی اور راز۔

نقی ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا۔ جسم منحنی تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی
ہوئی تھیں۔ ناک اس حد تک ابھری ہوئی تھی کہ سوائے ناک کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن
اس کی باتیں بے حد دلچسپ تھیں۔ ان میں رنگینی یا مزاح کی جھلک نہ تھی۔ اس کے برعکس ان
میں سنجیدگی ہوتی اور نقی کو یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی اچنبھے کی بات کر رہا ہے یا اس کی شخصیت
ہلا دیتا ہے۔ وہ یوں بات کرتا جیسے عام سی بات کر رہا ہو۔ اور جب لوگ اس کی بات پر
وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔

"ہاں یار۔" وہ سنجیدگی سے کہتا "مجھے احساس نہ تھا کہ میں اتنی بامعنی بات کر رہا ہوں۔ میں
تو ویسی ہی بن سوچے سمجھے برسبیل تذکرہ کچھ کہنے کے لئے بات کر رہا تھا"۔

مثلاً "اگر وہ دفعتاً" خاموش ہو جاتا تو جمیل پوچھتا:

"کیوں نقی! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟"

نقی چونکتا "کیا میں واقعی سوچ میں پڑا تھا"

"ہاں ہاں۔" راز چٹکی بجا کر گنگناتا "کس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا"

اس پر نقی چیختا "یار اس کا اگلا مصرع کیا ہے؟"

راز اپنے آپ پر کیفیت طاری کر کے، آنکھوں میں مستی پیدا کر کے دوسرا مصرع گاتا۔

"دلبر کا کہا کرنا یا دل کا کہا کرنا۔"

"اونہوں۔" نقی چلاتا۔ "بات نہیں بنی۔ کش مکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھئی دلبر کا کہا
کرنا۔ اور کیا؟"

"تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا سوچ رہے تھے۔" جمیل اسے چھیڑتا۔

"ٹھہرو۔" نقی چیختا "ایک سیکنڈ —— ہاں ٹھیک ٹھیک سوچ رہا تھا میں واقعی۔ میں سوچ
رہا تھا کہ کیا واقعی مجھ میں اس قدر ضبط ہے کہ دو دن بیوی کو پیٹے بغیر رہ سکوں۔" نقی [illegible]
معصومیت سے کہتا جیسے بیوی کو پیٹنا خاوند کے لئے نارمل بات ہو بلکہ اس کا فرض ہو۔

یا راہ چلتے ہوئے دفعتاً" نقی رک جاتا۔ "یار! عجیب بات ہے۔" وہ گویا اپنے آپ سے
مخاطب ہو کر کہتا۔ "ہے نا عجیب بات۔"

"کیا بات ہے؟" ایلی پوچھتا۔

"یار حد ہو گئی۔" نقی سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے کہتا۔ "یہ جو نانک شاہی اینٹوں کی بنی
ہوئی حویلی ہے نا۔ یہ سامنے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حویلی سے پورے طور پر واقف
ہوں اور اس کا ایک ایک کمرا اور دالان جانتا ہوں۔ حالانکہ میں کبھی اس کے اندر داخل نہیں
ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے اسے باہر سے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس راستے سے گزرا ہی
نہیں میں۔ ہے نا عجیب بات۔" یہ کہہ کر نقی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کہتا: "داخل ہوتے ہی
ڈیوڑھی ہے۔ دو دروازے ہیں۔ بایاں دروازہ ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس کے
دالان ہے۔ دالان میں ہرن کے سینگ دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔"

"ارے۔" راز چلاتا۔ "اب ختم بھی کرو گے یہ رام کہانی۔ جانتے ہو تم حویلی کو تو پھر کیا
"چھوڑو اب"

"نہیں یار۔" وہ چلاتا "ایسا کیوں ہے۔" وہ ضدی بچے کی طرح اڑ جاتا۔

اس پر جمیل قہقہہ مارتا:

"جاؤ یار کوئی اسے کہ ایسا کیوں ہے ورنہ یہ اڑ کر یہیں کھڑا رہے گا عمر بھر۔"

"ارے یار چھوڑو اب اس قصے کو۔" راز چلاتا "سنو تمہیں شعر سناؤں۔" اور وہ اپنے
مخصوص انداز سے گنگنانے لگتا۔

گھونٹ

نقی کے مشاغل بے حد دلچسپ تھے۔ وہ حقہ پیتا تھا۔ چائے کا شوقین تھا۔ بحث میں بڑے
شوق سے حصہ لیتا تھا۔ شطرنج اور تاش کھیلتا تھا۔ شعر کہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں کپڑے پر
[illegible] تاگے سے رنگین چڑیاں کاڑھتا تھا اور ہر رات بیگم کو پیٹتا تھا۔

راز کو گانے کا شوق تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کی آنکھوں میں عجب مستی چھلکتی۔ برج کھیلنے کا
شوقین تھا بشرطیکہ سٹیکس سے کھیلا جائے اور شوق کے باوجود ہارنے لگتا تو دفعتاً" یا تو اسے کام یاد
آ جاتا اور یا ویسے ہی کھیلنا چھوڑ دیتا۔ اس کی باتیں رنگین ہوتی تھیں۔ اپنے والد صاحب کے
متعلق قصے سنانے کا خبط تھا جو بنگال کی طرف کسی علاقے میں بڑے عہدے پر مامور تھے۔

جمیل ایک خاموش لڑکا تھا لیکن اس کا دل جذبات اور ذہن خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چاہتا
تھا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن جہاں تک بات کرنے کا تعلق تھا اس پر
ایک حجاب مسلط تھا۔ اس حجاب کی وجہ سے اس کی طبعی جولانی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غالباً" اس کی
وجہ احساس کمتری کی شدت تھی۔ وہ ملنسار تھا لیکن اس کی یہ عادت گونگے پن کی وجہ سے اذیت
میں بدل چکی تھی۔ پھر ایک روز اسے اتفاق سے اس اذیت سے نکلنے کا ایک راستہ مل گیا اور اسے
علم ہو گیا کہ شراب کے چند گھونٹ پینے سے وہ اپنے گونگے پن کو دور کر سکتا ہے اور سوسائٹی
میں ایسے ہی چمک سکتا ہے جیسے راز چمکا کرتا تھا۔ غالباً" اس سے پہلے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس
کا دل اور ذہن جذبات و خیالات سے بھرے ہیں۔ اس روز اسے اپنے خیالات و جذبات اپنی زبان
سے سن کر حیرت ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے چھپے ہوئے خزانے کی کنجی پالی ہے۔

نقی کو شراب سے خاص دلچسپی نہ تھی چونکہ اس کی شخصیت ہی میں مستی کا عنصر تھا۔ راز
کے لئے شراب محض ایک پھلجھڑی کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کھیلنا اسے پسند تھا لیکن اس
پھلجھڑی کی حیثیت محض تفریحی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس کا محتاج نہیں تھا۔
ایلی کے لئے شراب کا اثر خاصہ تکلیف دہ ہوتا تھا پی کر اسے وہ دن یاد آ جاتا جب وہ اور منصر
ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب منصر نے چلا کر کہا تھا۔

"بیرا دو بڑے۔"

اور ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ شراب پلانے سے منصر کا مقصد صرف یہ ہے کہ
ترنگ میں آ کر ایلی سادی کے اس رومان کا راز کہہ دے اور ایلی نے عزم کر لیا تھا کہ چاہے وہ
نشے میں دھت ہی کیوں نہ ہو جائے وہ منصر کو حقیقت حال سے آگاہ نہیں کرے گا اور یہ سوچ کر
وہ پتھر بن گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی اسے شراب پینے پر مجبور کیا جاتا تو اس پر وہی کیفیت
طاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتا جیسے اس کے ساتھی منصر ہوں اور اس کا راز پا لینے کے لئے
زبردستی پلا رہے ہوں۔

ایلی نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو کئی بار سمجھایا تھا کہ یہ خیال غلط ہے وہاں کوئی منصر نہیں۔
پینے سے مقصد صرف تفریح ہے لیکن سب بیکار۔ گلاس ہونٹوں سی لگاتے ہی خواہ مخواہ وہی
کیفیت طاری ہو جاتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد کی بات نہ چھیڑ دے۔ بہر حال شراب ہمیشہ
کے لئے اس پر حرام ہو چکی تھی۔ اس کے لئے وہ گھونٹ تلخ بن جاتا۔ جس کے بعد اس پر جمود
طاری ہو جاتا۔ جسم منوں بوجھل ہو جاتا۔ سر چکراتا۔

ایلی کے لئے جمیل، نقی اور راز کی محفلیں یوں تھیں جیسی کسی طوفان زدہ ڈولتی ہوئی کشتی
کے لئے کنارہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اسی محفل میں بیٹھا رہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو نہ
جانے کس اصول کے تحت اسے اپنی گزشتہ تباہی پھر سے یاد آ جاتی اور وہ محفل میں بیٹھ کر پھر
سے اپنے آپ میں کھو جاتا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر سے طوفان بیتنا شروع کر دیتا۔

ایلی نے اپنا راز جمیل سے نہ کہا لیکن جمیل کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب
جانتا ہو۔ سمجھتا ہو اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ خود جمیل نے کبھی شہزاد کی بات نہ
چھیڑی تھی۔ جمیل نے ایلی کو کبھی نہ جتایا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ اسی مزید دکھ نہ
ہو۔ جمیل نے ایلی کی آمد پر اس کی کیفیت بھانپ کر خاموش، بے لاگ ہمدردی کی گود پھیلا دی

تھی اور شاید اس گود نے ایلی کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔

ایلی کی آمد پر جمیل کی تمام توجہ ایلی پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا
خیال رکھتا تھا۔ اپنی گونگی مٹھاس سے اس کی تلخی اور اضطراب کو دور کرتا اور ہر وقت اس کے
پاس رہتا۔ اس پر جمیل کی بیوی جو طبعاً خاوند کو جذب کر لینے کی قائل تھی۔ بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ جمیل کے گھر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

گھر میں اسے کتابوں میں منہمک دیکھ کر علی احمد ہنستے:۔

"دیکھو نا نصیر کی ماں! ہمارا ایلی بھی عجیب شے ہے۔ جب پڑھنے کے دن تھے تب سینما دیکھتا
رہا اور اب جب پڑھنے کے دن ختم ہو چکے ہیں تو کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے۔ ہی ہی ہی"۔ وہ
ہنسے ___ "کیوں ایلی؟"

"اب اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔" راجو کہتی۔ "اب اس کی شادی کی فکر کیجئے نا۔"

"یہ کسی کی شادی کا فکر کیوں کرنے لگے۔" شمیم بولتی "یہ تو اپنی ہی تانک جھانک میں لگے
رہتے ہیں۔"

"تو نصیر کی ماں۔" وہ ہنستے۔ "اسی کے لئے تانک جھانک کرتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو اپنے لئے
کرتا ہوں۔ لا حول ولا قوۃ" وہ چلاتے۔

"وہیں کیوں نہیں کر دیتے جہاں وہ چاہتا ہے۔" راجو بولتی۔

"وہاں کیسے کر سکتے ہیں۔" علی احمد جواب دیتے۔

"کیوں نہیں کر سکتے؟"

"وہ لوگ تو بہت بڑے ہیں اس لئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" شمیم بولتی۔

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" راجو ہنستی۔

"بھئی تمہارے ہی بھلے کی سوچتا ہوں۔" علی احمد منہ پکا کر لیتے۔

"ہمارے بھلے کی۔ وہ کیسے؟"

"بھئی۔" علی احمد جواب دیتے۔ "اگر وہاں ایلی کا بیاہ کر دوں تو کیا وہ تمہاری قدر کریں گے
لڑکی ماں! تمہیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ کہیں گے یہ کیا چیز ہے نہ شکل نہ صورت
نہ رکھ نہ ماتھا نہ تہذیب نہ تعلیم۔ یہ کیا چیز ہے ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے "لو بھئی شمیم! تم ہی

انصاف کرو۔ میرا کیا ہے۔ اپنا گزار تو ہو جائے گا۔ چند جماعتیں بھی پڑھی ہیں۔ اچھی بری بھی کر لیتا ہوں لیکن نصیر کی ماں کا کیا ہو گا۔ ہی ہی ہی ہی۔ اب نہیں بولتی۔ ہو گئی بولتی بند۔" ان کا قہقہہ گونجتا۔

"آپ سے کون سر کھپائے۔" راجو جواب دیتی اور پھر اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ اس پر علی احمد بھی اپنی میلی دھوتی سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

"اب دے نا جواب۔ کیوں نصیر کی ماں۔"

"نہ میں نہیں دیتی۔"

"کیسے نہیں دے گی۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔

"چھوڑو بھی۔" اندر راجو تنک کر نخرے سے کہتی۔

"حافظ قرآن ہوتی تو چھوڑ دیتے لیکن تو کیا سمجھے گی اس لطیف اشارے کو۔ ذات کی ہوئی رنگڑ پلی دولت پور میں۔ ہی ہی ہی۔"

دفعتاً شمیم اور اس کی دونوں بچیاں نا ظمہ اور انجم محسوس کرتیں کہ ٹین کا سپاہی نمودار ہو رہا ہے اور وہ گھبرا کر کھسک جاتیں اور اندر اپنے کمرے میں جا پناہ لیتیں اور ایلی کو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور وہ اٹھ کر جمیل کی طرف چل پڑتا۔

دیپال پور

چار ایک ماہ خانپور کے بعد ایلی کی تعیناتی دیپالپور ہو گئی۔

دیپالپور ایک وسیع صحرا تھا جس میں یہاں وہاں دور دور مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وسیع صحرا کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا کہ جیسے بطخ تالاب میں آ پہنچی ہو۔ ایلی ذہنی طور پر خود ایک ویرانہ تھا دیوانہ ویرانے میں مل گیا۔ اسے ریت کے اس پھیلاؤ کو دیکھ کر سکون سا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر آ گیا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایلی نے جانا کہ خانپور میں محفل جما کر اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش غلطی تھی۔ اس کی زندگی میں دو رخی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل کے ویرانے کو بھولنے کے لئے نخلستانوں کا متلاشی تھا۔ دیپالپور پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اپنی اصلیت کو بھولنے کی کوشش سے سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصلیت میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کر لینے میں راحت ہے جھٹلانے میں نہیں۔

دیپالپور میں اس کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ کوئی دوست نہ تھا اس لئے وہ اکیلا ریت کے تودوں کی طرف نکل جاتا اور پھر کسی ٹیلہ نما تودے کے سائے میں بیٹھ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔

ان دنوں وہ سادی کو بھول چکا تھا۔ اس کے صبح و شام شہزاد کے خیال سے پر تھے۔ شہزاد اس کی زندگی پر یوں مسلط و محیط تھی کہ کسی اور کی گنجائش نہ رہی تھی۔ سادی کا خیال ——— ایک مسرت بھرا جام تھا۔ جس میں رنگ تھا لطافت تھی۔ اس کے برعکس شہزاد کے خیال میں تلخی تھی دکھ تھا اور اسی لئے شدت تھی۔ شہزاد نے اسے بے عزت کر کے اپنی محفل سے نکال دیا تھا اس کے احساس خودی پر کاری زخم لگایا تھا، جسے یاد کر کے وہ تڑپتا تھا اور اس تڑپن، گھاؤ اور رقابت کی وجہ سے شہزاد کا خیال اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ ایلی دراصل ایک غم خور نوجوان تھا اور اس کا ایمان تھا کہ عشق کو محرومی اور غم سے تعلق ہے ——— اس کے برعکس مسرت اور خوشی محض تفریح یا عیاشی کا نام ہے۔ شہزاد سے ایلی کی محبت اب عشق میں بدل چکی تھی۔ اس لئے آہیں بھرنا، ریت کے تودوں تلے بیٹھ کر رونا، کروٹیں لینا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

اس کے علاوہ شہزاد کا خیال آتے ہی اسے اپنے رقیب کا خیال آ جاتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ نگاہوں میں نگاہیں ڈالے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ ہنس رہے ہوں گے۔ اشاروں میں باتیں کر رہے ہوں گے عہد و پیمان ——— اب وہ مل رہے ہوں گے۔ قریب اور قریب۔

ایلی کے دل پر ایک چوٹ لگتی۔ وہ گھائل ہو کر تڑپتا۔ اس تڑپنے میں اسے لذت محسوس ہوتی یا شاید دل ہی دل میں وہ انتقام لینے کی آرزو کو پال پوس رہا ہو۔

دیپالپور میں پہلی مرتبہ اسے بچوں کو پڑھانے کا موقعہ ملا۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہاں کے بچے قطعی طور پر بچے نہ تھے۔ نویں جماعت کے طلبہ ایلی سے زیادہ طاقت ور اور قد میں لمبے تھے۔ پہلی مرتبہ جب وہ جماعت میں داخل ہوا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے کام میں کھو گیا۔ اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ دوسروں کے متعلق سوچے۔

اس کے ہم کار اساتذہ سب کے سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان کی چال ڈھال، بول چال میں ایک رسمی اور مصنوعی وقار تھا۔ ان کی حرکات بھدی اور بے جان تھیں۔ اور ان کے خیالات ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کولہو کے بیل

محمود

سارے مدرسے میں صرف ایک شخص تھا جس کا انداز مختلف تھا۔ اس کا نام محمود تھا اور وہ سکول کا کلرک تھا۔ شاید اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ وہ استاد نہ تھا۔ تو کیا اساتذہ کا وہ رویہ اور انداز بچوں کو پڑھانے کے مشغلے کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ ایلی گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس کے علاوہ محمود کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ وہ عنفوان شباب میں تھا۔ اگرچہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور ایک بچی بھی تھی۔ محمود کا قد چھوٹا تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ بال گھنے اور بھور کالے تھے رنگ میلا میلا سا تھا۔ بھنوئیں گھنی تھیں۔ پیشانی سے شدت کا اظہار ہوتا تھا ہونٹوں میں شرارت دبی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکتا اور بھوؤں سے شوخی اور الھڑ ٹپکتا اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ رومی ٹوپی جو وہ پہنتا تھا اور نمازیں جو وہ باقاعدہ پڑھتا تھا محض جھوٹ تھیں۔

محمود کے کردار کا سب سے بڑا جزو جذبہ اور اسکی شدت تھی۔ یہ جذبہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح مذہب اور عورت کے درمیان گردش کرتا تھا ——— اس کے علاوہ اس میں بے پناہ ذہانت تھی۔

محمود سے مراسم پیدا ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ ایلی کو جو مکان رہنے کے لئے ملا وہ محمود کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ ابتدا میں ایلی نے محمود کے لئے کوئی جاذبیت محسوس نہ کی تھی غالباً" نہ ہی ایلی اسے متاثر کر سکا تھا۔ چند ایک مرتبہ ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر محمود نے آنا جانا شروع کر دیا۔ محمود کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو ایلی کی کتابوں سے اور دوسرے اس کے مکان کے جغرافیے سے۔ چونکہ اس کے چوبارے سے محلے کے بیشتر مکانات دکھائی دیتے تھے۔ محمود کو عورتیں دیکھنے کا شوق تھا اور عورتوں کے لئے اس کی شخصیت میں ایک انوکھی جاذبیت تھی۔ محمود کو دیکھ کر وہ چڑ جاتیں۔ انہیں یوں غصہ آنے لگتا جیسے انہیں چھیڑ دیا گیا ہو۔ پھر نہ جانے کس اصول کے تحت وہ غصہ دفعتاً" روپ بدل لیتا اور عورت محمود کو ملنے کے لئے بڑی بے باکی سے باہر نکل آتی۔

ایلی کو محمود کی اس خصوصیت کا نہ تو علم تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ان کے میل ملاپ کی تمام تر وجہ انگریزی زبان تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹریکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی

تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹریکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی لکھتا تھا اور ایلی کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ محمود کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کو دو مرتبہ یوں پڑھ چکا تھا جیسے ناول پڑھتے ہیں۔

چند ماہ دیپالپور رہنے کے بعد ایلی کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا جہاں صحرا کی جگہ پہاڑوں نے لے لی اور تودوں کے نیچے بیٹھنے کی بجائے وہ چیل اور دیواروں تلے بیٹھ کر آہیں بھرنے میں مصروف ہو گیا۔

دھرم سالہ سکول میں وہ اکیلا مسلمان ٹیچر تھا۔ چونکہ فارسی کا مولوی چند ایک ماہ ملازمت کرنے کے بعد لمبی رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس سے پہلے ایلی نے کبھی مذہب کے نقطہ نظر سے زندگی کو نہ دیکھا تھا بلکہ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ اس سے قطعی طور پر کورا تھا۔ اگرچہ دسویں جماعت میں اس نے کئی ایک روزے رکھے تھے اور زندگی بھر وہ عید کی نماز پڑھنے جاتا رہا تھا۔

صرف علم ہی کی بات نہیں جذبے کے لحاظ سے بھی وہ مسلمان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب منصر نے اس کے روبرو اپنے اسلامی جذبے کی وضاحت کی تھی تو اسے بات سمجھ میں نہ آئی تھی اگرچہ بات کی رنگینی سے متاثر ہوا تھا۔

اس روز وہ دونوں سفید منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصر نے جذبہ اسلام کی بات کی تو ایلی کی ہنسی نکل گئی۔ چونکہ منصر میں کوئی بات بھی اسلامی رنگ کی نہ تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ روزے نہیں رکھتا تھا اور عاشق مزاج تھا۔

ایلی نے طنزاً" منصر سے کہا:

"اچھا تو آپ مسلمان ہیں؟۔"

"بالکل۔" منصر جوش میں آ کر بولا۔ "الحمد اللہ کہ میں مسلمان ہوں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" ایلی نے کہا۔ "آپ کیسے مسلمان ہیں۔"

"ٹھہریئے۔" منصر ایک سیکنڈ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "دیکھئے اگر اس وقت چھت پھٹ جائے اور جبرائیل اتریں اور آ کر مجھ سے کہیں۔ مجھے باری تعالے نے بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ انصار منصر کو ہمارا اسلام پہنچا دو اور کہو کہ اسلام جھوٹا مذہب ہے اور عیسائیت سچی ہے۔ تو میں جبرائیل سے کہوں گا کہ باری تعالے کو میرا سلام دو اور کہو حضور کا ارشاد گرامی موصول ہوا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن انصاری منصر مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

ایلی اس نقطۂ نظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ صرف ناواقف ہی نہیں اس لئے اس م
ایسے جذباتی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ تھی۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں۔ اس کے
برعکس جذباتی طور پر وہ مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی نقطۂ
نظر کا قائل ہونا ذہنی وسعت کے فقدان کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے وہ نمائ
طور پر مذہب سے بے تعلقی اور بے زاری کا اظہار کرنے کا دلدادہ تھا۔ اور کفر والحاد کی بات کر
میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔

رام دین

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ ایلی کو احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس روز وہ حسب معمول پڑھا رہا تھا۔ پڑھاتے ہوئے اس نے پیاس محسوس کی۔

"دین محمد۔" وہ چلایا۔ چونکہ اس کی جماعت میں صرف ایک مسلمان لڑکا تھا جو اسے پانی
کر دیا کرتا تھا۔

اس روز دین محمد حاضر نہ تھا۔

"رام لال۔" وہ بولا۔ "مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔"

رام لال جوں کا توں اپنے ڈسک پر کھڑا رہا۔

"تم جاتے نہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"جی ماشٹر جی۔ میں ہندو ہوں۔"

"تو کیا ہوا؟۔" ایلی ہنسنے لگا۔

"جی میں بھرشٹ ہو جاؤں گا۔"

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "دیکھو رام لال۔" وہ اسے سمجھانے لگا۔ "اگر تم میرے ہاتھ ک
پانی پیو گے تو بے شک بھرشٹ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم مجھے پانی لا دو تو اس میں بھرشٹ ہونے کی
کیا بات ہے؟ "

اس پر بھی رام لال جوں کا توں کھڑا رہا۔

"جاؤ نا۔" ایلی کو غصہ آ گیا۔

"جی میں بھرشٹ ہو جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"چھا تم جاؤ۔ مکند۔"

مکند بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

ایلی کے دل پر ایک ٹھیس لگی۔ اس نے جماعت کی طرف دیکھا۔ سبھی لڑکے سر لٹکائے
ے تھے۔

ایلی کی نگاہوں سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

"میں مسلمان ہوں۔" نہ جانے کون اس کے دل میں چیخ رہا تھا۔

"الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔" آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جماعت سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز ابھی وہ رام دین کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ڈاکیا آ گیا اور اس نے ایک
ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لفافے پر غیر مانوس خط میں اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا
ے۔ پتے بھی تو کئی ایک لکھے ہوئے تھے۔ علی پور کا پتہ۔ خانپور کا پتہ اور دھرم سالہ کا۔ جا
برں لگی ہوئی تھیں۔

اس نے لفافہ کھولا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر سرخی میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا اور اس نے لفافے کی مہریں پڑھنے کی
ش کی۔ لفافے کی پشت پر صاف طور پر مہر لگی ہوئی تھی۔ گرو کل ہٹیٹ۔

"ارے۔" اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ خط کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

عجب سی سیاہی تھی۔ نہ وہ سرخ تھی نہ —— شعر کے نیچے ایک دھبہ سا پڑا تھا۔ دفعتاً
خیال آیا لہو۔ خون۔ پھر اسے معلوم نہیں۔

"تہ لگ۔ وہ خلا۔

تا بھول گیا کہ وہ رام دین ہے۔ کمرے کی کارنس پر سادی کی مورتی رقص کرنے لگی۔ وہ
ا مسرت بھری حرکات سے عاری تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سیاہ لباس زیب تن تھا۔
ا مجسم حزن و ملال تھا۔ نرت میں اداسی اور غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد ایلی کا خیال سادی پر مرکوز ہو گیا۔ شہزاد کی صورت دھندلی پڑتی گئی۔ صفدر کے
بے معنی ہوتے گئے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر وہ صفدر کو چاہتی ہے تو ٹھیک ہے بلکہ اور بھی اچھا ہوا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔"

سامنے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دھرم سالہ کے سرسبز پہاڑوں پر دوڑ رہی تھی۔ اسے بلا رہی تھی۔ ایلی نے سونٹا اٹھالیا۔ کندھے پر بیگ ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔

اسی طرح اس نے دو ماہ بسر کر دیئے۔ وہاں وہ صرف دو ماہ کے لئے بھیجا گیا تھا۔ وہ ان پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا۔ سادی کے ساتھ وادیوں اور چوٹیوں پر گھومتا رہا۔

وہ اسے کہتا: "نہیں نہیں سادی۔ میں نے تمہیں فراموش نہیں کیا۔ کیسے فراموش کر سکتا ہوں لیکن کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ کاش کہ تم والد صاحب کی رضامندی کی شرط نہ لگاتیں۔"

اور سادی جواب میں کہتی: "میرا بس بھی تو نہیں چلتا۔ میں کیا کروں۔"

اور پھر وہ دونوں بانہہ میں بانہہ ڈال کر چل پڑتے جیسے اس مجبوری کو بھولنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں۔

ہیڈ ماسٹر

دھرم سالہ کے بعد اس کی تعیناتی جاورا میں ہو گئی اور وہ جاورا چلا آیا۔ جاورا لائلپور کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کا مدرسہ نہایت فراخ اور خوبصورت تھا اور اس کے ساتھ بہت فراخ گراؤنڈ اور باغ اور پارک ملحق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک کالج ہو۔

جب پہلے روز اس نے سکول کا بینڈ دیکھا جس میں گیارہ بیگ پائپ بینیں بج رہی تھیں۔ تو ایلی پر نشہ سا طاری ہو گیا۔

سب سے حیران کن چیز جو جاورا سکول میں نظر آئی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے کئی ایک سکولوں کے ہیڈ ماسٹر دیکھے تھا۔ وہ سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر رسمی وقار اس قدر چھایا رہتا تھا۔ جیسے دور کا سفر کرنے کے بعد جوتے پر غبار کی تہ جم جاتی ہے۔ غبار کی اس دبیز تہہ کی وجہ سے ان کے چہرے بے حس اور مردہ نظر آتے تھے۔ ان کی گردنیں گویا مکلّف ہوتیں جو بڑے تکلف سے حرکت کرتیں۔ آنکھیں نہ تو ہمدردی نہ انبساط کی چمک سے واقف ہوتیں۔ وہ دیکھتی نہیں تھیں بلکہ کریدتی تھیں۔ نکتہ چینی کرتیں۔ وہ سب

پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ایک مخصوص انداز سے کھانستے۔ ایلی انہیں دیکھ کر لرز جاتا ند جھوٹے وقار کے حصول کے لئے وہ کتنی بڑی قیمت ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ زندگی حرام کر رکھی تھی۔ اور وہ سب علم کی دولت سے کورے تھے چونکہ ان میں طلب علم نہ طلب کیسے ہوتی جبکہ انہیں کامل یقین تھا کہ وہ جانتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ شبہ کبھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ جو جانتے ہیں شاید غلط ہو۔ شاید اس میں ترمیم کی ضرورت ہو۔ وقت کے تقاضے کے مطابق ردوبدل کی ضرورت ہو۔ انہیں دیکھ کر ایلی کے دل پر خوف مسلط ہو جاتا تھا۔ کہ ایک روز وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا۔ ہاتھ میں چھڑی تھام لے گا۔ آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دے گا اور بچوں کے دل میں ویسی ہی نفرت و حقارت پیدا کر لے گا۔

جاورا سکول کا ہیڈ ماسٹر قطعی طور پر مختلف تھا اور یہ امر ایلی کے لئے باعث تعجب اور مسرت تھا۔ اس کا نام شیخ مسعود تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ جسم گٹھا ہوا۔ کلین شیو۔ آنکھوں میں جستجو اور چمک اور انداز میں ہیڈ ماسٹریت نام کو نہ تھی۔

"آیئے آصفی صاحب۔" وہ ایلی کو دیکھ کر چلایا۔ "تو آپ ہیں ہمارے نئے ٹیچر۔ اگر آپ تعیناتی کا خط نہ دیتے مجھے کچھ دیر اور تو میں کہنے ہی والا تھا کہ آپ کون سی جماعت میں داخلہ چاہتے ہیں۔" اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ "اب آپ ہی بتایئے آصفی صاحب۔ اگر سکول میں ایسے اساتذہ آ جائیں تو کس قدر مشکل ہو جاتی ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ استاد کون ہے اور سٹوڈنٹ کون؟ خیر خیر مگر ایک بات ہے۔ آپس کی بات ہے میں کسی سے کہوں گا نہیں۔ یہ بتایئے کہ جماعت کو سنبھال بھی لیں گے۔" شیخ مسعود نے پھر قہقہہ لگایا اور پھر ایلی کی گھبراہٹ کو سمجھ کر فوراً بات بدلی۔ "چلیئے وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا کیوں نہ کھالیں۔ کہتے ہیں پہلے طعام بعد کلام۔ آیئے۔ گھر سے میرا کھانا آیا ہوا ہے اور وہ مقدار میں اتنا ہوتا ہے کہ دو شخص پیٹ بھر کر کھالیں پھر بھی بچ جاتا ہے۔"

شیخ مسعود باتیں کرتے ہوئے آگے آگے جا رہے تھے۔ ایلی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" وہ ڈھکے ہوئے دسترخوان کے قریب جا کر کہنے لگے۔ "شرط لگاؤ۔ اگر میری بیوی نے آج دال کے علاوہ کچھ بھیجا ہو۔ خدا کی قسم۔ بیگم ولی اللہ سے کم نہیں۔ جب مہمان آتا ہو سو فیصدی دال پکاتی ہے۔"

یہ کہہ کر شیخ نے دسترخوان ہٹا دیا اور برتن کو دیکھ کر بے تحاشہ قہقہہ لگایا:

"لو دیکھو آصفی صاحب۔ میں نے کہا نہ تھا۔ ہی ہی ہی۔" وہ قہقہے پر قہقہہ مارنے لگے

شیخ مسعود ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی طبیعت بیک وقت رسمی اور غیر رسمی تھی۔ کبھی وہ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنے مدرسے میں آ جاتا اور انگریزی بولنا شروع کر دیتا۔ کبھی کمبل لپیٹے آوارد ہوتا اور دہقانوں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا اور وہ اکیلے بیٹھنے سے بے حد خائف تھا جیسے اسے خود سے ڈر لگتا ہو۔ دفتر میں بھی اکیلا نہ بیٹھتا بلکہ اساتذہ کو بلا کر اپنے گرد ایک بھیڑ لگا لیتا اور پھر ان سے بے تکلف دوستانہ باتیں کرتا۔ ان کے روبرو گالیاں دیتا، قہقہے لگاتا۔ گالی دینا اس کی عادت تھی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ وہ غصے میں گالی دے رہا ہے، بے تکلفی کے اظہار کے لئے یا ویسے ہی عادت پوری کرنے کے لئے۔ نہ جانے کس اصول کے تحت قہقہے مارتے مارتے دفعتاً" وہ غصے میں آ جاتا اور پھر منظر ہی بدل جاتا۔ عام طور سے وہ بے تکلف گفتگو کے دوران میں اپنی طبیعت کی ستم ظریفی کے متعلق باتیں کرنے کا عادی تھا۔

"میں وہ —— شخص ہوں۔" وہ گالی دے کر کہتا۔ "جو گرگٹ کی طرح اولتا بدلتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ آج تک اپنی طبیعت کا جنتر منتر سمجھ میں نہیں آیا۔ ہنسوں تو یقین نہ کیجئے کہ ہنس رہا ہوں۔ اور غصہ۔ غصہ تو اس حد تک آتا ہے مجھے اور اس قدر آنا" فانا" کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بندوق خریدی تھی کہ چور چکار سے محفوظ رہوں لیکن اسے کھول کر اس کے کل پرزے الگ الگ صندوقوں میں بند کر رکھے ہیں کہ جب تک انہیں اکٹھا کر کے جوڑوں تب تک شاید غصہ اتر جائے اور نہ بھی اترے تو بیگم دہائی تو مچا سکے۔"

اس کی باتیں بے جوڑ ہوتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کوئی نہ کوئی خیال آ جاتا اور وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور اس خیال کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا۔

اس عجیب و غریب طبیعت کے باوجود ایلی کو شیخ مسعود بے حد پسند آیا لیکن دقت یہ تھی کہ شیخ مسعود ایلی کو کسی وقت بھی تو اکیلا نہ رہنے دیتا تھا۔ سکول بند ہوتا تھا تو وہ اسے بلا لیتا:

"چلو آصفی صاحب۔ تمہیں شہر دکھلاؤں۔ بڑے بڑے دلچسپ لوگ ہیں یہاں۔"

وہ دونوں شہر کی طرف چل پڑتے۔ راستے میں شیخ گپیں ہانکتا جاتا اور ہر آتے جاتے سے ملتا اور بے تکلفی سے باتیں کرتا۔

"ارے۔" چلتے چلتے وہ چونکتا۔ "آج بدھ ہے نا۔ آج تو مجھے چک بیس جانا تھا۔ ہے تانگے والے۔" وہ شور مچا دیتا اور پھر زبردستی ایلی کو تانگے میں سوار کر کے وہ چک بیس کو چلے جاتے۔

شام کو جب وہ لوٹتے تو وہ زبردستی ایلی کو پکڑ لیتا:

"اب کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ کوئی قصہ چھیڑ لیتا اور ایلی سوچتا کہ کب بات ختم ہو اور وہ اجازت حاصل کرے۔

طبعی طور پر ایلی ایک تنہا شخص تھا۔ اس کی نشوونما کے لئے تنہائی بے حد ضروری تھی جیسے پودوں کے لئے کھاد ضروری ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں بیٹھ تو جاتا تھا اور بات بھی کر لیتا تھا لیکن اسے سوسائٹی میں بیٹھ کر سکون یا خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اس پر ایک اضطراب چھائے رہتا۔

اس کے علاوہ سادی اس کی منتظر رہتی تھی کہ کب اسے تنہائی حاصل ہو اور وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کریں۔

صرف اس وجہ سے ایلی چند ایک روز ہی میں شیخ مسعود کی مصاحبت سے اکتا گیا لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ زبردستی اپنے آپ کو الگ کر سکے۔ بہانے تو وہ بناتا تھا یا چوری چوری بچ جانے کی کوشش کرتا سب کوششیں بے کار ہو جاتیں چونکہ شیخ مسعود اسے ڈھونڈ نکالتا اور پھر شیخ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

ساتھی

جاورا میں ایلی نے صرف چند ایک ساتھی بنائے اور وہ سب متفقہ طور پر شیخ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ سکول کے اساتذہ بھی جہاں تک ممکن تھا اس سے دور رہنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ اس کے خلاف کیوں تھے بالآخر شیخ کی شخصیت کے کئی ایک روشن پہلو تھے۔ ممکن ہے دو ایک تاریک بھی ہوں۔ تاریک پہلو کس میں نہیں ہوتے۔

جاورا میں سکول کے قریب ہی ایلی اور افضل نے مل کر ایک مکان لے رکھا تھا اور کام کاج کے لئے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ افضل ڈاکخانے کا ایک کلرک تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا قد آور نوجوان تھا۔ مسلسل فکر کی وجہ سے اس کا چہرہ لمبا ہو چکا تھا۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن آنکھوں میں غم یا پریشانی کے بجائے شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تضاد کئی بار ایلی کو چونکا دیتا۔

افضل نکما اور چپ چاپ بیٹھنے کا عادی نہ تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوتا تو اضطراب کی وجہ سے اس کا پاؤں یا ٹانگ مسلسل حرکت کرتا جیسے مضطرب ہو۔ چہرے پر سوچ بچار اور فکر کے آثار چھائے رہتے اور وہ کوئی شعر گنگناتا رہتا۔ اسے اچھے شعروں سے والہانہ عشق تھا اور اسے سینکڑوں اچھے شعر یاد تھے۔

ایلی اسے پوچھتا:

"یار یہ کیا ماجرہ ہے؟ پیشانی سے تم فکر کرتے ہو۔ ٹانگیں اضطراب میں جلترنگ بجاتی ہیں۔ ہونٹوں پر گیت رہتا ہے اور آنکھیں نت نئی شرارت سے چمکتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ "

افضل مسکرا دیتا: "بس دیکھ لو۔ جو موجود ہے حاضر ہے اور جو حاضر ہے اس میں حجت کیسی؟ "

پھر ان کا پڑوسی شبیر تھا۔ شبیر سکول میں عربی اور فارسی پڑھانے اور چھوٹی سی داڑھی رکھنے کے باوجود مولوی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر محبوبیت کی جھلک نمایاں تھی۔ نگاہوں میں شوخی تھی۔

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فرانس یا اٹلی کا باشندہ ہو۔ شبیر کی زندگی بیوی کے مرکز کے گرد گھومتی تھی بلکہ یوں کہئے کہ اسے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ اس مرکز کے گرد گھومے۔ ممکن ہے اسے بھی اس مرکز سے کچھ لگاؤ ہو لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک بچہ ہو اور گھر والی اس کی دیکھ بھال کرنا اپنا فرض سمجھتی ہو۔ وقت پر اسے کھانا کھلاتی۔ وقت پر بستر پر لٹا کر سونے پر مجبور کر دیتی۔ مناسب لوگوں سے ملنے کی اجازت دیتی اور وہ بھی فقط مناسب وقت کے لئے۔ صرف ایسی جگہ جانے کی اجازت دیتی جہاں اس کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے۔

ایلی کو پہلے پہل اس کا احساس اس روز ہوا جب وہ شبیر سے ملنے اس کے گھر گیا۔ وہ دونوں بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دفعتاً" اندر سے کسی نے چلا کر شبیر کو پکارا۔

"کون ہے؟ " ایلی نے پوچھا۔

"بیگم بلا رہی ہے۔" شبیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو جا کر سن آؤ اس کی بات۔"

"پھر سہی۔" وہ بولا۔ "ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔" وہ پھر باتوں میں معروف ہو گئے۔

"دھڑ دڑ ررڑ رڑ ڑام ....." قریب ہی ایک دھماکہ ہوا۔

"ارے۔" ایلی ڈر کر اچھلا۔ "یہ کیا تھا؟"۔

شبیر کا منہ زرد ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زیر لب بولا۔ "بیگم نے پتھر کی سل دروازے پر دے ماری ہے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے روزمرہ کی بات ہو۔"

"ہاں" ـــــ شبیر نے اثبات میں اشارہ کیا۔ "ہے۔"

"بیگم ہے یا پہلوان ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"دھڑام ـــــ " دروازے پر پھر سل پڑی۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ "میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرے شانوں پر تو صرف ایک ہی سر ہے"

اس کے بعد ایلی نے دیکھا کہ جب بھی شبیر ان کے ہاں آتا تو یوں دبے پاؤں داخل ہوتا جیسے چور ہو۔ ذرا سی آہٹ پر گھبرا جاتا۔

پھر ایک روز تو بالکل ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔

ابھی شبیر کو آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ گلی کا ایک لڑکا آیا۔

"شبیر صاحب کو گھر بلاتے ہیں" وہ بولا۔

ایلی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شبیر پھدک کر کونے میں جا چھپا اور اشارے سے ایلی کہنے لگا کہ کہدو شبیر یہاں نہیں آیا۔ لڑکے کے جانے کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھ گیا ور دیوار پھلانگ کر ڈرائنگ ماسٹر کے گھر چلا گیا جس کے مکان کا دروازہ پرلی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی چھت کے پیچھے کھڑی ایلی کے مکان کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس لئے دوسری گلی سے گھوم کر گھر چلا گیا تاکہ بیگم یہ سمجھے کہ کسی اور جانب سے آیا ہے۔ اس روز ایلی کو اندازہ ہوا کہ شبیر جیسی مولوی واقعی سکول کا بچہ ہو جو گھر سے چوری چوری آوارہ گردی کرنے کا عادی ہے۔

پھر ان کا پڑوسی ڈرائنگ ماسٹر جو طبعاً" لاہور کا بھاء ماجھا تھا۔

اور وہ انگلش ماسٹر احمد تھا جو کلاس میں اونگھنے کا عادی تھا۔

اور جب محفل میں کوئی دلچسپ بات ہو رہی ہوتی تو اس کے دوران سو جایا کرتا تھا اور پھر اثر چودھری تھا۔

چودھری کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔ اس کی بات میں دھار تھی اور نگاہوں کی مسکراہٹ قینچی

کی طرح کاٹ دیتی تھی۔ سیدھی بات میں الجھاؤ ڈالنا۔ دوسروں کو بنانا اور سنجیدہ ترین مسئلے کو
ہنسی میں ٹال دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

ایلی کے یہ ساتھی اس کے شیخ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ
سمجھتے تھے کہ شیخ مسعود قابل اعتماد آدمی نہیں۔ ایلی سمجھتا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کے اندازے
درست نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان سب کی خواہش تھا کہ مل بیٹھیں۔ گپیں ہانکیں۔ تاش کھیلیں
یا گھومیں پھریں۔ شاید اس لئے وہ ایلی کے شیخ سے زیادہ میل جول رکھنے کے خلاف تھے۔

جاورا سکول میں آتے ہی ایلی کی حیثیت شیخ کے مصاحب کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کا مشیر نہ
بن سکتا تھا چونکہ شیخ اپنی مرضی کا مالک تھا اور کسی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ
تھا۔ اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایلی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے کسی کا مشیر نہ بن
سکتا تھا۔

سکول سے فارغ ہو کر شیخ ایلی کو اپنے گھر لے جاتا۔ کھانا کھا کر وہ ایلی سے کہتا:

"دو ایک خط لکھ لیں تو کیا حرج ہے۔"

اور پھر اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنا شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی قہقہہ مار کر
ہنستا:

"بھئی آصفی! معلوم ہے میں دروازے کیوں بند کر رہا ہوں۔ جونہی مجھے خط لکھنے کا خیال
آیا تو ساتھ ہی بے سوچے سمجھے میں نے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے تاکہ خط لکھواؤں تو
کوئی سن نہ لے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔

"تو کیا کانفی ڈنشل خط لکھوانے ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" وہ ہنسنے لگا۔ "عام سرکاری خط ہیں لیکن میرے لئے ہر خط کانفی ڈنشل ہے۔
میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا میری دشمن ہے۔ سب میرا
بھید جاننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ رات کو جب میں کمرے میں سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کدھر
سے مجھ پر وار کیا جا سکتا ہے۔ کھڑکیاں کھول کر نہیں سوتا چاہے کتنی گرمی ہو۔ چونکہ مجھے خیال
آتا ہے کہ کوئی کھڑکی سے پستول چلائے گا اور خود بھاگ جائے گا۔" شیخ مسعود ہنسنے لگا۔ "میری
طبیعت ہی ایسی ہے۔"

اس قسم کی باتیں سن کر ایلی کو شیخ پر ترس آتا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی۔ اس حد تک شکی اور

...شخص پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا! وہ سوچتا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایلی کی طبیعت میں شیخ کے لئے نفرت پیدا ہو گئی
اور شیخ ایلی پر شک کرنے لگا اور جاورا میں ایلی کی زندگی کا دھارا کسی اور رخ پر بہنے لگا۔

پاگل مولوی

نہ جانے ایک روز بیٹھے بٹھائے شیخ کو کیا سوجھی ایلی سے کہنے لگا:

"آصفی۔ آؤ تمہیں تماشہ دکھائیں۔"

شیخ اسے دفتر میں لے گیا۔ پھر اس نے مولوی رحمت اللہ عربی ماسٹر کو بلا بھیجا۔ پہلے تو عربی
...نرے اس نے چند ایک سوالات کئے پھر جوش میں آ کر انہیں ڈانٹنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔
...بے بہانے کو آگ دکھا دی گئی ہو —— شیخ مسعود نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ غلیظ
...ی گالیاں۔

اس پر عربی ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان سے مہمل
...وازوں کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔ ظاہر تھا کہ شدت و غصہ اور بے بسی کی وجہ سے مولوی صاحب
...حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں ان کی حالت غیر ہوتی توں توں شیخ کا جوش بڑھتا۔

آخر مولوی صاحب کے لئے حالات ناقابل برداشت ہو گئے۔ ناقابل برداشت تو ہو پہلے ہی
...ے لیکن مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ مزید بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ کمرے سے
...ر چلے جائیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ
...دروازے کے باہر اساتذہ اور طلبہ کی بھیڑ لگی ہے تو انہیں مزید بے عزتی کا احساس ہوا اور اس
...صدمہ ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

مولوی رحمت اللہ جاورا کے ایک معزز شخص تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اکثر جمعہ
...روز جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے۔ کم گو تھے اور مدرسے کا کام بڑی محنت سے کرتے تھے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے غصے میں ڈویژنل انسپکٹر کو ایک پرائیویٹ خط لکھ دیا جس
...میں انہوں نے اس واقعہ اور شیخ کی زیادتی کا قصہ تفصیل سے بیان کر دیا۔

اس واقعہ پر ایلی بھی بھونچکارہ گیا۔ کیا یہ تماشہ تھا؟ کیا یہ بات شیخ کے لیے مذاق کی حیثیت
...رکھتی تھی؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسے سوچ بچار میں کھوئے دیکھ کر شیخ بھی تاڑ گیا کہ ضرور مولوی کے واقعہ نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ یہ محسوس کر کے شیخ نے ایلی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب کا تذکرہ شروع کر دیا۔

"یہ مولوی لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔" وہ بولا۔ "انسان اتنا بھی مسئلے مسائل میں نہ کھو جائے کہ اسے یہ تمیز ہی نہ رہے کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مولوی خود تو بے حد شریف اور بے زبان ہے لیکن اس کی بیوی اس کی شرافت اور بے زبانی کا خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔" شیخ نے قہقہہ مارا۔ "ادھیڑ عمر کی عورت خود کیا فائدہ حاصل کرے گی لیکن اس کی بیٹیاں جو ——" شیخ نے ایلی کو آنکھ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

ایلی کو اس کی ہنسی بری لگی لیکن اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ اعلانیہ احتجاج کرتا۔ بہرحال اس شام ایلی گھٹا گھٹا رہا اور شیخ ہر ممکن طریقے سے دلچسپ اور مزاحیہ باتیں سنا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب ایلی گھر پہنچا تو وہاں تمام ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب غصے میں تھے۔ ایلی پر وہ یوں برس پڑے جیسے مولوی کی بے عزتی اسی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ افضل غصے سے کانپ رہا تھا شبیر کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس روز وہ بھول گیا کہ اس کی بیوی دیکھ رہی تھی کہ وہ ایلی کے مکان میں بیٹھا ہے۔ سمیع شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ احمد سر جھکائے بیٹھا تھا اور چودھری مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا: "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تمام شرارت الیاس آصفی کی ہے۔"

پانچ چھ روز کے بعد ڈویژنل انسپکٹر سے دو خط موصول ہوئے۔ ایک تو شیخ کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ جواب دے کہ اس نے ایسا سلوک مولوی سے کیوں روا رکھا اور دوسرا خط ہیڈ ماسٹر کے توسط سے مولوی صاحب کے نام تھا جس میں ان سے اس امر کی جواب طلبی کی گئی تھی کہ انہوں نے براہ راست انسپکٹر کو خط کیوں لکھا۔

شیخ نے اپنے نام کے خط کے متعلق تو کسی سے تذکرہ نہ کیا لیکن مولوی صاحب کے خط کی اس قدر تشہیر کی کہ بچے بچے کو علم ہو گیا کہ انسپکٹر نے الٹا مولوی صاحب کو ڈانٹا ہے۔

اس روز رات کو شیخ ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا:

"بھئی آصفی۔ میں سمجھتا ہوں مولوی صاحب سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک تو اس روز میں نے انہیں بلاوجہ برا بھلا کہا حالانکہ وہ محض مذاق تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور اب انسپکٹر

ہیں ے جواب طلبی کی ہے۔ بے چارہ پٹ جائے گا۔"

ایلی کو موقع مل گیا۔ بولا: "ہاں آپ نے واقعی مولوی صاحب سے زیادتی کی تھی۔"

"تو اب کس طرح سے اس کا تدارک کریں۔" شیخ نے ہنس کر پوچھا۔

"[illegible] کریں تو بہتر ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تو میں معافی مانگ لوں۔" شیخ چلایا۔

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھ دے کہ میں نے صدق دل سے معاف کر دیا۔"

شیخ کی یہ بات سن کر ایلی کے دل میں پھر سے اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد مسلسل دو روز سارا سٹاف مولوی صاحب کی منتیں کرنے میں لگا رہا کہ شیخ کو کر دیں اور تحریر لکھ کر دیدیں۔ مولوی صاحب اس پر آمادہ نہ تھے لیکن آخر کار انہوں نے ی صاحب کو مجبور کر دیا اور انہوں نے یہ تحریر لکھ دی کہ اگرچہ شیخ کا طرز عمل ناروا تھا تاہم راضی نامہ ہو گیا ہے اور انہوں نے شیخ کو معاف کر دیا ہے۔

یہ تحریر حاصل کرنے کے بعد شیخ نے سکول بند ہونے پر مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں جب کہ سب اساتذہ اور طلبہ جا چکے تھے اور پھر سے انہیں لاتعداد فحش گالیاں دیں اور جان کر ایسے سخت کلمات کہے کہ وہ پھر غصے میں آ کر انسپکٹر کو شکایت کریں۔ شیخ کا یہ اقدام سوچے پلان کے مطابق تھا۔ بلکہ ایک چپڑاسی کو آگ لگانے کے لئے ان کے گھر بھیجا۔ چپڑاسی نے ی صاحب کو بتایا کہ انسپکٹر نے شیخ کی بھی جواب طلبی کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب کے خلاف شکایت کا ایک اور خط لکھیں۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب نے خط لکھ دیا ہے تو شیخ نے انسپکٹر کو اپنی طرف سے خط لکھا جس کا نفس مضمون یہ تھا:

"مولوی رحمت اللہ میرے باپ کی جگہ ہیں ان کی عزت کرتا ہوں۔

عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ اونٹ سے سر کے بل گر پڑے تھے۔ ان کے سر پر چوٹ آئی تھی جب سے ان کا ذہن کا توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی بے وجہ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی مجھے معاف کر دیتے ہیں۔

[illegible] وہ جالارا میں رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ خانگی امور ہیں۔ بہرحال

میں نہیں چاہتا کہ ان کی بہتری میں حائل ہوں۔ مولوی صاحب کا معافی نامہ ارسال خدمت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ اگرچہ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ سہواً کوئی بات منہ سے نکل گئی ہو جسے غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے برا مان لیا ہو تو مجھے علم نہیں۔"

ایم معروف ولایت سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر نئے نئے ہندوستان میں آئے تھے اور آتے ہی کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر چند ماہ کے بعد محکمہ میں ڈویژنل انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اور چونکہ طبعی طور پر کسی کا برا نہیں چاہتے تھے لہٰذا شیخ مسعود کے اس خط سے جو مولوی رحمت اللہ کے دوسرے شکایتی خط کے ساتھ موصول ہوا تھا انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی مولوی صاحب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کے لئے بے انتہا ہمدردی محسوس کی۔ اپنے ڈپٹیوں کو بلا کر انہیں ساری بات سمجھائی کہ وہ دورے پر جائیں تو کوئی مناسب مقام تلاش کریں جہاں مولوی صاحب کو تبدیل کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی ڈپٹی یا معروف جاتے کمال ہمدردی سے کہتے:

"ہمارے ایک عربی مولوی ہیں جو بڑے معزز اور شریف آدمی ہیں البتہ ذرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ان کا۔ اگر آپ انہیں اپنے سکول میں لے لیں تو کیا اچھا ہو۔"

افسران کی اس بے پناہ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی دیوانگی پر مہر ثبت ہو گئی اور ڈویژن کے کونے کونے میں مولوی صاحب کے دماغی عارضے کا پرچار ہو گیا۔ ادھر شیخ مسعود نے اسے ہوا دی۔

مولوی صاحب کی بیگم کے کانوں تک بات پہنچی تو اس نے سر پیٹ لیا۔ کہنے لگی:

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ باؤلا ہے کوئی مانتا ہی نہ تھا۔"

یہ بات ان کی بیوی کے حق میں تھی چونکہ وہ مولوی صاحب سے الگ آزادی میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے بہانہ مل گیا۔ ایک روز دفعتاً اس نے شور مچا دیا جب مولوی صاحب وظیفہ پڑھنے میں معروف تھے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس پر بیگم نے پینترا بدلا:

"دہائی خدا کی اب لوگوں کو دکھانے کے لئے جائے نماز پر جا بیٹھا ہے۔"

یہ تو بہرصورت تمہید تھی۔ بیگم نے محلے کے چار بزرگوں کو بٹھا کر کہا کہ میں تو ہرگز اس پاگل کے ساتھ نہ رہوں گی۔ اور یہ فیصلہ کرا لیا کہ وہ لائلپور رہے اور مولوی صاحب انہیں خرچ بھیجتے رہیں۔ اس فیصلے کے بعد وہ بچیوں کو لے کر چلی گئی اور مولوی صاحب تن تنہا رہ گئے۔

حالات کو یوں بدلتے دیکھ کر مولوی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے چاروں طرف آگ سی کیوں لگ گئی ہے۔ کیوں لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ ... اور گھبراہٹ سے ان کی شکل و صورت میں دیوانگی کی جھلک پیدا ہو گئی۔

شیخ مسعود واحد آدمی تھا جو حالات کے رخ کو سمجھ رہا تھا۔ مولوی صاحب کا ذکر آ جاتا تو وہ ... لگتا اور خوش ہوتا جیسے کسان اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹتے وقت خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ شیخ ... اپنی کارکردگی پر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی اس صناعی میں مزید بیل بوٹے کاڑھنے کا ... فیصلہ کر لیا۔

اس نے اپنے ایک سکھ شاگرد سوبھا سنگھ کو جو سکھوں کے ایک چک میں مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر بن چکا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے سکول میں لے لینے کی پیش کش کرے اور بعد میں ذرا ان کے مزاج صاف کرنے کا انتظام کرے۔

انسپکٹر صاحب کو بھلا بات کی حقیقت سمجھنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو صرف نظم و نسق چلانے پر مامور تھے انہوں نے سکھ ہیڈ ماسٹر کے اس اقدام کی تعریف کی اور مولوی رحمت اللہ وہاں تبدیل کر دیئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سوبھا سنگھ کے توسط سے مولانا کو چک میں کوٹھڑی مل گئی۔ اور وہ ... کسمپرسی کے عالم میں جا پڑے۔ سوبھا سنگھ نے پہلے ہی چک میں مشہور کر دیا کہ ان کے دماغ میں کچھ فتور ہے۔

ایک روز مولانا نے جوش اسلام میں آ کر باآواز بلند اذان فرما دی۔ سوبھا سنگھ کا اشارہ تو پہلے ہی تھا۔ لوگ مولوی صاحب پر پل پڑے۔ انہوں نے پیٹ پیٹ کر انہیں ادھ موا کر دیا اور کوٹھڑی سے ان کا سامان نکال کر باہر پھنکوا دیا۔ سامان کیا تھا۔ ایک بستر، ایک لوٹا، ایک جائے نماز ایک تسبیح۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ چک سے دیس نکالا ملنے کے بعد مولوی صاحب نے عالم مجبوری میں علاقے کی اس واحد مسجد میں قیام کیا جو وہاں سے چار میل دور بر سرراہ مسافروں کے نماز پڑھنے کے لئے بنائی تھی اور جو چار مربع فٹ اینٹوں کے چبوترے پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں

صرف وہی پناہ گاہ انہیں مل سکی۔ انہوں نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا اور خود اللہ کی یاد میں بیٹھ گئے۔ پھر ایک روز سوبھاسنگھ کے اشارے پر کوئی ان کا بستر اٹھا کر لے گیا۔ جب وہ سکول سے واپس آئے تو بستر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ رات کو سردی کی وجہ سے وہ اکڑ گئے اور اگلے روز سکول میں لڑکے ان کے گرد جمگھٹا کئے انہیں چھیڑ رہے تھے

"پاگل پاگل۔"

پھر معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا۔ زمین نگل گئی یا آسمان نے ڈھانپ لیا۔

سازشی

مولوی صاحب کے اس المیہ پر ایلی ششدر رہ گیا۔ ملازمت کی دنیا سے متعلق یہ پہلی جھلک تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ ملازمت میں سازش کا یہ پہلا تجربہ تھا آج تک وہ زندگی کو گویا کنارے پر بیٹھ کر دیکھتا رہا تھا۔ اس کے روبرو سنٹرل ماڈل سکول کا ٹیچر کھڑا چھڑی ہلا رہا تھا۔

"بھول جاؤ۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے سب بھول جاؤ۔ کتابوں کی دنیا کو فراموش کر دو۔" وہ چھڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ "یہ لو اسے استعمال کرنے میں دریغ کیا تو پٹ جاؤ گے۔"

دوسری طرف شیخ مسعود قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا:

"دیکھا۔ کیسا تماشہ دکھایا تمہیں۔ بیوقوف کہیں کا۔ میری شکایت کرتا ہے۔ میری۔ بکری کا بچہ جنگلی سؤر سے کھیلنا چاہتا ہے۔ بے وقوف دیوانہ۔"

ایک طرف مولوی خود کھڑا تھا۔ اس کا چہرا بھیانک ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھنچ گئی تھیں۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ "یا اللہ۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"یا اللہ۔" ایلی دانت پیس کر بولا۔ "یہ تیری دنیا ہے کیا۔"

اللہ تعالےٰ کے خلاف اسے ایک اور شکایت پیدا ہو گئی اس زمانے میں وہ اس مشہور شعرہ قائل تھا۔ انسان پر ایک اور ظلم۔ اللہ تعالےٰ کی ایک اور توہین۔

"سؤر۔ سؤر —— جنگلی سؤر۔" ایلی کے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔ گھرمتا اس کے تمام ساتھی غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔"

"اب ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہ جائے۔" افضل کی ٹانگ ہل رہی تھیں۔ آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

"وہ چال چلو،" چودھری مسکرا رہا تھا،" کہ زندگی بھر شیخ کو معلوم نہ ہو کہ کون چال چل گیا بس چاروں شانے چت گرا ہو۔"

اس رات دیر تک ایلی کے مکان پر کانفرنس ہوتی رہی۔ طے پایا کہ فوری اقدام کیا جائے مگر شیخ کو علم نہ ہو کہ وار کدھر سے ہو رہا ہے ورنہ اگر وہ خبردار ہو گیا تو حملہ کرے گا اور اس میں وار کرنے کی عظیم صلاحیت ہے۔ جاورے کے تمام لوگ مل کر بھی اعلانیہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

حملے کی تمامتر تفصیلات کو طے کرنا ایلی کے ذمے کر دیا گیا۔

اس کے بعد ایلی اور افضل کا گھر سازش کے اڈے میں بدل گیا۔ افضل کی آنکھوں میں پھلجڑیاں چلنے لگیں جیسے بلغ تلاب میں آ پہنچی ہو۔ چودھری کے گال ابھر کر گلابی ہو گئے۔ احمد کے خوابیدہ خدوخال میں ہلکی سی بیداری پیدا ہو گئی۔ شبیر میں خارجی دنیا میں اس حد تک دلچسپی پیدا ہوئی کہ وہ بیوی کو بھول گیا۔ اور مسلسل گھر سے باہر وقت گزارنے لگا۔

ایلی کا مکان چونکہ گلی کی نکڑ پہ واقع تھا اس لئے اسمبلی ہال بن گیا۔ وہاں بحث مباحثے ہونے لگے۔ قراردادیں پیش ہونے لگیں۔ پلان بننے لگے۔ تفصیلات طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب وہ سرگرم بحث تھے تو دروازہ بجا اور شبیر داخل ہوا:

"کچھ ہوش بھی ہے۔" وہ بولا۔

"اب ہم ہوش و حواس کی دنیا سے نکل آئے ہیں۔" افضل نے جواب دیا۔

"بس اب تو ایک دھن سوار ہے۔" چودھری نے اپنی رندانہ آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

"اونہوں۔ یہ غلط بات ہے۔" شبیر بولا۔ "اگر بات نکل گئی تو سازش دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دنگل شروع ہو جائے گا۔"

"نہ بھئی۔" جمل بولا۔ "ہم تو سازش کے قائل ہیں، دنگل کے نہیں۔"

"دنگل تو ان پڑھ اور غیر مہذب آدمیوں کا کام ہے۔"

"ہے نا۔" شبیر نے رازدارانہ طور پر کہا۔ "تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سازشیوں کا یہ ٹولا ابھی خام ہے۔"

اس بات پر افضل بگڑ گیا۔

"ہماری توہین کرتے ہو؟" وہ بولا۔ "ہم جو پیدائشی کیا خاندانی طور پر مانے ہوئے سازشی

ہیں۔"

"تو خاندانی سازشی کو معلوم ہونا چاہئے ابھی آدھ گھنٹہ ہوا۔ آپ کے دروازے پر خود شیخ مسعود کھڑا تھا اور وہ یہاں پورے پانچ منٹ کھڑا رہا۔"

"ارے۔" سب کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر محفل پر سناٹا چھا گیا۔

"ابھی تو شیخ پر وار نہیں ہوا اور وہ مطمئن ہے اس کے باوجود وہ اس قدر شکی مزاج واقع ہوا ہے کہ فضا کو سونگھنے سے نہیں چوکتا۔ جب وار ہو جائے گا پھر تو وہ ساری ساری رات بستی کے چکر کاٹے گا جیسے مسلمان بادشاہ بھیس بدل کر رعایا کا حال جاننے کے لئے گھوما کرتے تھے۔"

"بھئی یہ تو ٹھیک ہے۔" افضل بولا۔

"اور اس گھر میں جو بات ہوتی ہے وہ آدھی گلی تک سنائی دیتی ہے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چندہ کر کے ایک پرانا ہارمونیم خریدا گیا۔ چند ایک تاش کی گڈیاں منگوائی گئیں جب بھی بحث کا آغاز ہوتا تو ایک آدمی ہارمونیم بجانے پر تعینات کیا جاتا۔ تاکہ باجے کے شور میں بات سنائی نہ دے اور سازشی ہر وقت تاش کے پتے تھامے رہتے تاکہ کوئی آ جائے تو سمجھے تاش کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کہیں سے ایک پرانا ٹائپ رائٹر حاصل کیا گیا اور شیخ کے خلاف گمنام چٹھیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

ان چٹھیوں کا انداز انوکھا تھا اور ایلی نے التزاماً انہیں ایسی شکل دی کہ وہ عام گمنام چٹھیوں سے ہٹ کر ہوں تاکہ افسران بالا انہیں دلچسپی سے پڑھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ نہایت مختصر ہوتیں۔ زبان میں دفتری انداز مفقود ہوتا۔ کوشش کی جاتی ان میں مزاح کا رنگ غالب رہے، مظلومیت اور شکایت کا عنصر نہ ہو۔

ڈویژنل انسپکٹر کو روز ایک چٹھی لکھی جاتی جس کا مستقل عنوان جاورا بلیٹن تھا۔ مستقل عنوان کے نیچے ایک ذیلی عنوان ہوتا۔ اس کے نیچے سیریل نمبر اور نیچے نفس مضمون۔

مثلاً

فلاں سال میں ۱۲۰۰ روپیہ بہار ریلیف فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ چار صد روپیہ سرکاری بنک میں جمع کرایا گیا۔

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

ان انوکھے خطوط وجہ سے ڈویژنل دفتر میں ایک شور سا مچ گیا۔ پرانے افسران حیران تھے کہ گمنام خط کیسے ہیں؟ ایسے گمنام خط تو کبھی موصول نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر معروف انہیں پڑھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ غالباً انہیں اس بات پر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنے ملک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسے رنگین قسم کے شکایتی خط لکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

شیخ مسعود کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یااللہ یہ کیسے گمنام خط ہیں؟ اور ان کا جواب کس طرح دیا جا سکتا ہے؟ اور لکھنے والا کون ہے؟ اور یہ انداز اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن شیخ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ خطوط کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے تو اس پر ایک وحشت اور دیوانگی طاری ہو گئی۔

اس نے ایلی کو اپنے کمرے میں بلایا اور چاروں طرف کے دروازے بند کر کے کہنے لگا:

"کیوں بھئی آصفی صاحب۔ آج کل کچھ دور دور رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ مجھ سے ناراضگی ہے کیا؟"

ایلی نے ایک ساعت کے لئے سوچا کہ اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ بہر صورت ایلی طبعی طور پر رسمی رویے کا حامی نہ تھا لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عام سازشی نہیں بنے گا اور یہ نہ کہے گا ــــ "اچھا۔ یہ بات ہے۔" یا "آخر بات کیا ہے۔"

"بالکل۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں آپ سے سخت ناراض ہوں اور جان بوجھ کر آپ سے دور دور رہتا ہوں۔"

شیخ بھونچکا سا رہ گیا۔ "کیا وجہ ہے؟" اس نے کہا۔

"وجہ آپ کو معلوم ہے۔" یہ کہتے ہوئے ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ الٹا چور ہو۔

شیخ اور گھبرایا۔ "مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔" وہ بولا۔

"آپ سمجھتے نہیں جانتے ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔ اور شیخ کو مزید پریشانی سے بچانے کے لئے اس نے بات کی وضاحت کی۔ "دیکھئے شیخ صاحب۔" وہ بولا۔ "گزشتہ دو تین روز سے آپ پریشان ہیں۔ آپ کا چہرہ۔ آپ کی چال ڈھال، آپ کی باتیں پکار

پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرائے ہوئے ہیں اور سوچ بچار میں پڑے ہیں۔ صرف آپ کی زبان خاموش ہے باقی تمام اعضا چلا چلا کر وہ راز کہہ رہے ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ وہ راز آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے۔" ایلی ہنسنے لگا۔

شیخ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "کیا واقعی؟ " وہ بولا۔ "تو کیا آپ اسی لئے مجھ سے ناراض ہیں؟ "

"ناراض اس لئے ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ مجھے بات نہیں بتا رہے۔"

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

"اب ہنسئے نہیں شیخ صاحب۔" ایلی جلال میں آکر بولا۔ "ایسا راز رکھنے کا فائدہ جس کا آپ کے جسم کا بند بند اعلان کر رہا ہے۔"

"تو کیا تمہیں معلوم ہے وہ راز؟ "

"اونہوں۔" ایلی بولا۔ "مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں جسے آپ بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اسے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اسے بتائیے جس پر آپ کو اعتماد ہے۔"

"اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں۔" شیخ ہنسنے لگا۔

"تو نہ بتائیے۔ لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ضبط سے کام لیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ کوئی چیز اندر ہی اندر آپ کو کھائے جا رہی ہے۔"

شیخ کھسیانہ ہو گیا۔

ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں شیخ اسے اس امر میں رازداں نہ بنا لے۔ اس حد تک دوہرا رول ادا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہرحال اس کی باتیں سن کر شیخ اور بھی گھبرا گیا اور ایلی کو شیخ سے دور رہنے کا جواز مل گیا۔

مسلسل ایک ماہ کی جواب طلبیوں پر شیخ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اسے شک تو ہر استاد پر تھا لیکن اسے یہ ثبوت نہ مل سکا کہ کون اس کے خلاف خط لکھ رہا ہے اور شکایت کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ انکا جواب اس سے بن نہ آتا تھا۔ اس کے پرانے ہتھکنڈے سب فیل ہو چکے تھے۔

شاید اسی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ کار آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک خصوصی شاف میٹنگ بلائی اور اساتذہ کو جمع کر کے سب کے سامنے اس نے وہ راز افشا کر دیا۔

"حضرات۔" وہ بولا۔ "یہ میٹنگ میں نے اس لئے منعقد کی ہے کہ میں آپ سے برادارانہ طور پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف مسلسل شکایات لکھ کر بھیج رہا ہے اس معاملے کو چلتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس صاحب کو مجھ سے شکایت ہے اور یہ مہم چلا رہا ہے وہ میرے روبرو آجائے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی کاروائی نہ کروں گا۔ بلکہ میں اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں اور اس کی جائز شکایات دور کرنے کے لئے کوشش کروں گا۔"

شیخ یہ کہہ کر رک گیا۔ تمام اساتذہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دیر تک وہ انہیں نگاہوں سے کریدتا رہا۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔

"میں دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔

"پوچھئے آصفی صاحب۔"

"یہ بتائیے کہ شکایات کی نوعیت کیا ہے؟ "

ایک ساعت کے لئے شیخ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب عادت بات ٹالنے کے لئے اس نے کہا: "بس معمولی قسم کی شکایات۔ ادھر ادھر کی۔"

"لیکن حضور۔" چودھری کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ "ایسی گمنام شکایات کو کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ کرنے دیجئے۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔"

"آپ کو کسی پر شک ہے؟ " ایلی نے پوچھا۔

"شک تو مجھے آصفی صاحب آپ پر بھی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

سارا سٹاف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"یہ خط۔" شیخ نے وضاحت کی۔ "جدید انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور جدید ترین ٹیچر اس سکول میں صرف آپ ہیں۔ اور انسپکٹر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے نام لکھ بھیجوں جن پر مجھے شک ہے۔"

"ہاں ہاں تو ضرور لکھئے میرا نام۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو پھر اقبال کرو نا کہ تمہیں مجھ سے شکایات ہیں۔" شیخ ہنسنے لگا۔

"ہاں۔ مجھے آپ سے دو شکایات ہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "پہلی شکایت یہ کہ آپ نے دو ماہ تک ہم سے یہ بات چھپائے رکھی ورنہ شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے اور دوسری شکایت یہ کہ آپ ہم سب سے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپ پر اعتماد کریں لیکن آپ کو ہم سے کسی شخص پر اعتماد نہیں۔"

سارا اسٹاف حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔

مسٹر معروف

عین اس وقت تار والا ڈاکیہ داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شیخ از سرِ نو گھبرا گیا۔

"کیوں؟" وہ بولا۔ "کوئی تار ہے کیا میرے واسطے؟"

"نہیں جی۔" وہ بولا۔ "الیاس آصفی کے نام کا ہے۔" اس نے ایک تار ایلی کی طرف بڑھا دیا۔

ایلی نے تار کھول کر پڑھا۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" شیخ نے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل۔" ایلی نے جواب دیا۔ "والد صاحب نے مجھے خانپور بلایا ہے۔"

"خیر سے بلایا ہے کیا؟"

"لکھا ہے مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں؟"

"مجھے نہیں علم۔" ایلی نے جواب دیا۔ "وہ والد صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ شاید میری تعیناتی کی بات ہو کوئی۔"

ایلی خانپور پہنچا تو گھر میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال تھا نہ جانے کتنی اہم بات ہو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔ شاید مسٹر معروف کو شک پڑ گیا ہو کہ وہ جاور ایلیٹن کا ایڈیٹر ہے یا کسی نے بھید کھول دیا ہو۔ ممکن ہے شیخ مسعود نے خود شکایت کی ہو۔ بہرصورت بات اہم تھی لیکن وہاں جا کر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"اچھا ایلی آیا ہے۔" علی احمد نے اس کی آمد کی خبر سن کر کہا۔ "بہت اچھا کیا جو آ گئے۔

ابا تو نصیر کی ماں گویا جاورے کا بن کر رہ گیا۔"

"ابا معروف صاحب کی کیا بات ہے؟" ایلی نے دبی زبان سے پوچھا۔

"بھئی مجھے تو معلوم نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنے ان سے تعلقات ہیں۔ سبھی افسر عزت کرتے ہیں۔ دوستانہ سلوک سمجھ لو۔ یہ ان کی محبت ہے ورنہ —— خیر خیر تو وہاں چائے پارٹی پر بیٹھے تھے۔ اتفاق سے جاورے کی بات چل پڑی تو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا ہمارا ارادہ ہے وہاں جانے کا۔ اپنا لڑکا ہے نا وہاں۔ اس بات پر مسٹر معروف چونکے۔ اچھا تو الیاس وہاں ہے آج کل' —— آپ ہی نے تو تعیناتی کی تھی' میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ بولے۔ "تو اسے بلوا لو ایک دن کے لئے اور جب وہ یہاں آئے تو ذرا میری کوٹھی پر بھیجوا دینا۔ ہی ہی ہی ہی۔"

علی احمد ہنسنے لگے۔ "وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ سبھی افسر تمہیں جانتے ہیں۔ کبھی بلکہ اکثر باتوں میں تمہارا تذکرہ آ جاتا ہے نا اس لئے۔ دوست جو ہوئے اپنے۔ کیوں نصیر کی ماں۔ تو کیا دیکھ رہی ہے یوں۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو بات کو۔ میں بتاؤں بالکل بیکار ہے سمجھ کا خانہ ہی نہ ہو تو پھر کوشش بیکار ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ کیوں شمیم۔ کیا یہ غلط ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔"

"اچھا بھئی ایلی آج شام کو تم معروف صاحب سے ضرور مل لینا۔ ان کی کوٹھی سے واقف ہو۔ دانیا کی دوکان کے بائیں ہاتھ صدر میں۔ تم شام کو آٹھ بجے پہنچ جانا ورنہ وہ کلب ولب چلے جاتے ہیں۔ بیرے کو بلا کر کہنا میں آصفی صاحب کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے جب جاؤ بڑی خاطر مدارت کرتا ہے جہلمیہ ہے نا۔ یہ جہلمیئے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور معروف صاحب کو یاد دلا دینا کہ تم آصفی صاحب کے بیٹے ہو ورنہ شاید انہیں یاد نہ رہے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے۔ "یہ نہ ہو کہ تمہیں واپس لوٹا دیں۔ ہی ہی ہی ہی ہاں بھئی تم جیسے ماتحت تو ان کے سینکڑوں ہیں۔ بیچارے ملنے کو ترستے ہیں لیکن رسائی نہیں ہوتی۔ اور تم۔ تمہیں تو خود تار دے کر بلوایا ہے انہوں نے۔"

"آصفی صاحب سے دوستانہ جو ہوا۔" نصیر کی ماں نے طنزاً کہا۔

علی احمد ہنسنے لگے:

"لو اب چمگادڑوں نے بھی بات کرنا سیکھ لیا۔ ہی ہی ہی۔ سن رہی ہو شمیم۔ چیونٹیوں کے بھی پر نکل آئے۔ کہتی ہے میں پرندہ ہوں۔ ہی ہی ہی —— "

مسٹر معروف ایک خوبصورت رنگین مزاج' خاموش اور نسائیت سے بھرے ہوئے نوجوان

تھے۔ وہ عام انسپکٹروں سے قطعی طور پر مختلف تھے اور ان کا انداز بالکل انوکھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ براہ راست اس عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ ویسے عام طور پر محکمہ تعلیم کے افسر بتدریج ترقی کرنے کے بعد ڈویژنل انسپکٹر بنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً وہ پہلے ڈویژنل انسپکٹر تھے جو ولایت سے ڈگری حاصل کر کے آئے تھے۔ پرانے افسروں کا طرز عمل تحصیل دار اور پٹواری کے بین بین ہوا کرتا تھا۔ وہ دیکھنے کی بجائے گھورتے۔ بات کرنے کی بجائے ڈانٹتے اور اساتذہ سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس معروف نہایت اخلاق سے ملتے یوں باتیں کرتے جیسے وہ افسر ہی نہیں اور ڈانٹنے کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھے۔

ایلی معروف سے مل کر حیران رہ گیا۔ معروف نے اسے پاس بٹھالیا۔ سگریٹ پیش کیا اور پھر یوں باتوں میں معروف ہو گئے جیسے ایلی کو صرف ٹیبل ٹاک کے لئے بلایا ہو۔

پھر دفعتاً انہوں نے موضوع بدلا اور جاورا کے متعلق پوچھنے لگے۔ کیا وہ اچھی جگہ ہے؟ موسم کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ سکول کیسا ہے؟ آپ کا دل لگ گیا کیا؟

پہلے تو ایلی بے پروائی سے ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شاید جاورا بلیٹن کا بھید پانے کے لئے اس سے حالات پوچھ رہے تھے۔ اس پر ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شیخ کے خلاف کوئی بات نہ کرے گا۔

"ہاں تو الیاس صاحب۔ آپ کے سکول میں تو پارٹی بندی نہیں ہو گی کوئی؟" معروف نے پوچھا۔

"میں نے تو نہیں دیکھی۔" وہ بولا۔

"ہیڈ ماسٹر تو وہاں کے بہت قابل اور کارکن آدمی ہیں۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "اور بے حد دلچسپ ہیں۔"

معروف صاحب نے طرح طرح سے ایلی کو بات کرنے پر اکسایا لیکن اس نے انہیں سرسری جواب دیکر ٹال دیا۔

آخر انہوں نے واضح بات کی:

"دیکھو الیاس۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلایا ہے کہ جاورا سکول میں سخت گڑبڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ لوگ ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور چونکہ میرا اصول ہے کہ ایسے سازشیوں کو سخت سزا دیتا ہوں اس لئے تم خاص طور پر خیال رکھو۔ ایسے لوگوں سے بچ

بلکہ اگر پتہ چلے تو ہمیں بتاؤ کہ وہ کون ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ایک دوست کا لڑکا ایسے کیس میں الجھے۔ گڈ نائٹ۔"

معروف صاحب نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ایلی گھر چلا آیا۔

اگلے روز معروف نے غالباً علی احمد سے بھی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دن وہ اسے نصیحتیں کرتے رہے۔

"دیکھو نا ایلی۔ ایسے لوگ ملازمت میں کبھی فائدے میں نہیں رہے جو اس قسم کی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں ہمیشہ اپنے افسر سے بنا کر رکھنی چاہئے —— چاہئے دوسروں سے اس کا سلوک کیسا بھی ہو ہمیں اس سے کیا۔ تم ہمیشہ ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دینا اور بلکہ اگر تمہارا کوئی جاننے والا اس سازش میں شریک ہو تو اسے بھی خبردار کر دینا۔ اس کا بھلا کر دینا چونکہ معروف صاحب بہت سخت ایکشن لیں گے۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ تمہیں خود بلا کر بات سمجھا دی ہے۔ تم میرے بیٹے ہو اس لئے۔ ورنہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ایک معمولی ٹیچر۔ ایسے سینکڑوں ٹیچر مارے مارے پھرتے ہیں کون پوچھتا ہے جی۔ اور ڈگریاں' ان کی قیمت کیا ہے آج کل —— اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو کیا تمہیں نوکری مل جاتی۔ اجی توبہ کرو۔ کون پوچھتا ہے۔ ہی ہی ہی۔ کیوں نصیر کی ماں۔"

گاڑی میں بیٹھے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا کیا مسٹر معروف کا مجھے بلانے سے یہ مقصد تھا کہ جاورا کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ اونہوں۔ معروف کو صحیح حالات جاننے کی خواہش نہیں۔ اسے اس بات سے دلچسپی نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ انہیں تو صرف یہ فکر دامن گیر ہے کہ کسی جائز یا ناجائز طریقے سے نظم و نسق قائم کیا جائے قائم رکھا جائے۔ تبھی انہوں نے مجھے بلوایا تھا تاکہ میری معرفت ان لوگوں کو ڈرا دیا جائے کہ ایسی سازشوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور سازشیوں کو انسپکٹر صاحب سخت سزا دینے کے قائل ہیں۔

جاورا پہنچ کر ایلی نے ساری بات کا رنگ ہی بدل دیا۔ سازشیوں کی محفل میں اس نے ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر معروف انصاف کرنے کے قائل تھے لیکن وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو جرات سے شکایت نہیں کر سکتے اور شیخ صاحب کے پاس جا کر اس نے انہیں بتایا کہ معروف آپ کے بڑے مداح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے سمجھوتہ کر لیں جنہیں آپ سے شکایات ہے تاکہ جاورا سکول کی مزید بدنامی نہ ہو۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ایلی واپس جاورا پہنچا تو جاورا سکول کی سازش اور تقویت پکڑ گئی۔ وہ لوگ جو تفریحاً" سازشیوں کا ساتھ دے رہے تھے اس میں نمایاں حصہ لینے لگے۔ بلیٹن کے لئے تازہ مواد دستیاب ہونے لگا۔ اور شیخ مسعود اس کا مقابلہ کرنے کی امید کو بیٹھے اور انتہائی خطرناک اقدام کو عمل میں لانے کی سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈپٹی کمشنر، سپیشل پولیس، سی آئی ڈی اور سول پولیس سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اپنے پرانے ہتھکنڈوں کے مطابق وہ اس بات کے قائل تھے کہ دشمن پر سخت وار کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے بچاؤ کی کوشش میں لگ جائے اور مزید وار نہ کر سکے۔

ضدی عورت

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جب وہ سب مل کر ایک نئی سکیم پر بحث کر رہے تھے تو شبیر کا بھانجہ جاوہ داخل ہوا۔ اس کی عمر نو سال کی ہوگی۔

"کیوں کیا بات ہے۔" شبیر اسے دیکھ کر چلایا۔ "کیا مجھے بلایا ہے؟"

"جی نہیں خاں صاحب۔" وہ بولا۔

"تو پھر؟"

"پیغام دیا ہے۔"

"اچھا۔" شبیر بولا۔ "تو ٹھہرو میں ابھی سنتا ہوں۔"

"جی ـــــ" جاوہ نے کہا۔ "انہوں نے کہا ہے کہ سب کے سامنے دینا پیغام سب کے سامنے۔"

"اچھا تو دے۔" افضل چلایا۔

"جی انہوں نے کہا ہے کہ جاکر کہدو اگر خان صاحب اس گھر میں پھر داخل ہوئے تو میں شیخ کے گھر جاکر ساری بات بتادوں گی۔"

"کیا کہا؟" سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"جی یہی کہا تھا۔"

"کس نے کہا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"شبیر کی بیگم نے اور کس نے۔" افضل بولا۔

"ویسے ہی رعب ڈالتی ہے اور کیا۔"

"ہونوں۔" شبیر بولا۔ "یہ نہ کہو تم اس سے واقف نہیں۔ وہ کر گزرے گی۔ وہ بڑی نا عورت ہے۔"

"تو پھر نہ آیا کرو یہاں۔" افضل بولا۔

"اسے تم سب سے نفرت ہے۔" شبیر بولا۔ "وہ اس مکان کو بہت برا سمجھتی ہے۔ کوئی ب نہیں کہ وہ شیخ کے گھر جاکر اسے صورت حال سے مطلع کر دے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔" احمد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے۔" چودھری نے کہا۔ "آخر ایک نہ ایک دن تو بات نکلے گی۔"

شبیر کی بیوی کے رخ کو بدلنا آسان کام نہ تھا۔ اسے راز فاش کرنے سے باز رکھنے کی صرف ایک صورت تھی کہ شبیر کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ لیکن شبیر نے اعلان کر دیا۔ "میں ہوں چاہے لاکھ کوشش کروں میں تم سے ملنے سے باز نہ رہ سکوں گا۔"

"تو پھر اپنی بیوی کا ذمہ لو کہ وہ ایسی واہیات حرکت نہ کرے گی۔" افضل نے کہا۔

"نہ بھائی۔" وہ بولا۔ "یہ میرے بس کا روگ نہیں۔"

اس نئے جھمیلے کی وجہ سے نکڑ والے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

شبیر کی بیوی کو ہر اس مکان سے نفرت تھی۔ جس میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق صرف وہی مرد معزز ہو سکتا تھا۔ جس کے گھر ایک اپنی بیاہتا بیوی ہو اور چونکہ افضل اور ایلی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی۔ لہٰذا ساری دنیا کے گناہ اس مکان میں ہوتے تھے۔ وہاں تاش کھیلا جاتا تھا۔ واہیات گفتگو ہوتی تھی۔ شراب پی جاتی تھی۔ جوا کھیلا جاتا تھا۔ رنڈیاں آتی تھیں۔

ان حالات میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے خیالات کو بدلنا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔" افضل بولا۔

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا۔" لیکن اس کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح کوشش کرے۔

ساری رات وہ سوچتا رہا پھر دفعتاً اسے دعوت کا خیال آگیا جو شبیر نے انہیں کھلائی تھی۔

اس دعوت کے کوائف بھی انوکھے تھے۔

کریلے

ایک مرتبہ انہوں نے شبیر کو مجبور کیا کہ وہ انہیں دعوت کھلائے۔ پہلے تو شبیر انہیں ٹالتا رہا لیکن آخر اس نے محسوس کیا کہ دعوت کھلائے بغیر چارہ نہیں اس نے ایک دن مقرر کر دیا۔ مقررہ دن وہ سب تیار بیٹھے رہے کہ کب بلاوا آئے۔ آخر شبیر آیا اور کہنے لگا۔ "لو بھئی ابھی کھانا آتا ہے۔"

"آتا ہے کا کیا مطلب؟ افضل نے کہا کیا ہم تمہارے گھر نہ جائیں گے؟۔"

"نہیں یار۔" وہ بولا۔ "وہاں جا کر کھانے کا کیا مزا۔ یہیں بھجوا دیتا ہوں میں تم میری بیوی کی عادت سے واقف نہیں کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شبیر کا بھانجا جاوہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں آنے کے بجائے وہ سیدھا آگے نکل گیا۔

انہوں نے جاوہ کو آوازیں دیں شور مچایا مگر وہ چپ چاپ سیدھا نکل گیا۔

"بیگم کی سہیلی کے ہاں کھانا پہنچانے گیا ہے" شبیر بولا۔ "ابھی واپس آ کر ہمارا کھانا لے آئے گا۔ گھبراؤ نہیں۔" کچھ دیر کے بعد جاوہ وہی بھرا ہوا ٹرے اٹھائے واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر شبیر بولا۔

"اچھا تو کیا وہ لوگ گھر نہیں ملے؟ اچھا تو انہیں پھر دے آنا۔ یہ ہمیں دے دو۔" شبیر نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ افضل اور ایلی کو سمجھ میں نہ آیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ شبیر کی بیوی ایلی اور افضل سے مشٹنڈوں کا کھانا پکانے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے شبیر نے یہ بہانہ بنایا تھا کہ مسجد میں دو ولی اللہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت کرنا ہے۔ بیگم اس کی چال میں آ گئی اور اس نے کھانا تیار کر دیا۔ جب جاوہ کھانا لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوا تو وہ حسب عادت دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ نکڑ والے مکان پر تو نہیں رکتا اور شبیر کی ہدایات کے مطابق جاوہ سیدھا نکل گیا تھا اور موڑ مڑنے کے بعد کچھ دیر وہاں انتظار کرتا رہا تھا تاکہ بیگم شبیر مطمئن ہو کر اپنے کام کاج میں لگ جائے اور وہ کھانا لے کر

...آئے

بہرحال ایلی اور افضل کو اس بھید کا علم نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شبیر نے منتیں کر کے بیوی کو دعوت پکانے پر تیار کر لیا ہے۔

اس رات اسے خیال آیا کہ بیگم شبیر کو راضی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اگلے روز ایلی نے گھر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔

"کیوں بھئی۔" ایلی نے پوچھا۔ "شبیر کہاں ہے؟"

"وہ تو ابھی سکول سے نہیں آئے۔" جاوہ بولا۔

ایلی نے باآواز بلند چلا کر کہا۔ "لیکن شبیر تو آج سکول آیا ہی نہیں تھا۔" اس کا مقصد یہ تھا کہ بیگم بات سن کر چونک جائے۔

"گھر سے تو سکول ہی گئے تھے" جاوہ نے کہا۔

"میں نے کہا جاوہ۔" ایلی بڑے رازدارانہ انداز سے بولا۔ "تمہارے گھر جب بھی کریلے پکیں تو یار تھوڑے سے مجھے دینا۔ اتنے اچھے کریلے تمہارے ہاں بنتے ہیں کہ جواب نہیں۔ یار مجھے کریلے بے حد پسند ہیں۔"

جاوہ چپ چاپ کھڑا تھا۔

ایلی نے آواز اور آہستہ کر لی اور بولا۔ "چاہے چرا کر کھلاؤ لیکن صرف ایک بار کھلا دو میں نے ایک مرتبہ تمہارے گھر کے پکے ہوئے کریلے کھائے ہیں۔ اس روز جب شبیر نے ہماری دعوت کی تھی۔ کھلاؤ گے یار؟" اس نے کہا۔ "گھر نہ بتانا۔ چوری چوری کھلا دینا۔ ضرور۔" ایلی کو اچھی طرح علم تھا کہ شبیر کی بیگم بڑے غور سے اس کی ہر بات سن رہی ہے اس لئے اس نے جاوہ کی بہت منتیں کریں اور پھر چلا آیا۔

گھر آ کر اس نے افضل کو کہا۔ "بھئی پتھر تو پھینک آیا ہوں اب پتہ نہیں کیسی لہریں اٹھیں کشتی ڈوب گئی اور یا کنارے جا لگی۔"

"کیسا پتھر پھینکا ہے؟" افضل نے پوچھا۔

"بس سمجھ لو پتھر تھا۔ اب تو لہریں دیکھو۔"

رات کو شبیر آیا تو اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔ "یار یہ کیا سحر کر دیا تم نے الیاس حد ہو گئی۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" افضل نے پوچھا۔

"بات؟" وہ بولا۔ "بات کہاں تو معجزہ ہو چکا ہے۔"

"معجزہ۔" افضل نے دہرایا۔ "کچھ پلے بھی پڑے یار۔"

"بات بتانے سے پہلے میں تمہیں پچھلا قصہ سنا دوں۔ شبیر نے کہا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے مجھ سے دعوت کھلانے کی بات کی تھی تو میں نے اپنی بیوی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تمہارے لئے دعوت پکائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے کہا تھا کہ مسجد میں دو مولوی ٹھہرے ہوئے ہیں ان کی دعوت کرنی ہے۔"

"ارے۔" افضل چلایا۔

"اچھا۔" ایلی بولا۔ "جبھی جادہ پہلے خوان لے کر آگے چلا گیا تھا۔"

"بھئی بیگم تو تمہارا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آج۔ معلوم ہے آج کیا مطالبہ کیا ہے اس نے؟"

"کیا؟" افضل بولا۔

"کہ کل تمام سامان خرید کر لاؤ میں ان کی دعوت کروں گی۔"

"کس کی؟" افضل چلایا۔

"بھئی تمہاری اور کس کی۔" شبیر ہنسنے لگا۔ "مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ نہ جانے آصفی نے وہاں جا کر کیا کیا ہے۔ نقشہ ہی بدل گیا ہے گھر کا۔"

"لیکن یہ ہوا کیسے؟ ساری بات بتاؤ یار۔" افضل بولا۔

"گھر لوٹا تو پہلے تو جواب طلبی ہوئی کہ بتاؤ آج سکول کیوں نہیں گئے تھے اور گئے کہاں تھے۔ پھر دوسری جواب طلبی ہوئی۔ کہنے لگی اس روز مجھے دھوکا دیا تھا نا۔ دعوت دوستوں کی کی تھی اور بہانہ مولوی صاحب کا بنایا تھا۔ بیگم کو یہ شکایت ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا کہ "اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو مجھے بتایا ہوتا تاکہ میں دل لگا کر پکاتی۔ میں نے تو ویسے ہی بے پروائی سے کھانا پکایا تھا۔ حیرت ہے یار۔"

"تو تیر نشانے پر بیٹھا۔" ایلی ہنسنے لگا۔

"سبحان اللہ کیا تیر ہے اور کیا تیر انداز ہے۔" شبیر نے کہا۔ "ایسی بات کر دکھائی ہے تم نے جو میری دانست میں ممکن ہی نہ تھی۔"

"چلو" ایلی بولا۔ "شیخ سے جا کر شکایت کرنے کا خطرہ تو ٹل گیا۔"

"ارے۔" شبیر چلایا۔ "تو کیا اس لئے یہ تیر چلایا ہے۔"

"اور کیا دعوت کھانے کے لئے"؟ ایلی ہنسنے لگا۔

"میں تو دعوت کھانے کے لئے ہی آیا ہوں۔" محمود داخل ہو کر بولا۔

"ارے تم؟" ایلی اسے دیکھ کر چلایا۔ "تم یہاں کہاں؟"

"دیکھ لو۔" وہ بولا۔ "ڈھونڈ ہی نکالا تمہیں۔"

"لیکن اس وقت کونسی گاڑی سے آئے ہو؟" ایلی نے پوچھا۔

"گاڑی کا تو وقت نہیں۔" افضل بولا۔

"میں موٹر سے آیا ہوں۔" محمود مسکرانے لگا۔

"بس سے اس وقت؟"

"تو کیا کار سے آئے ہو۔" ایلی نے طنزاً کہا۔

"ہاں ہاں کار سے۔ بیٹھ کر سب کتھا سناؤں گا۔"

"اچھا تو بیٹھ جاؤ۔" ایلی نے کہا۔ "پہلے ہماری بھجن منڈلی کی کتھا سن لو پھر تمہاری کتھا بھی سن لیں گے۔ چلو بھئی۔" ایلی چلایا۔ "پہلے کام پھر کلام۔"

اس پر اس کے ساتھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ دو ایک طرف بیٹھ کر ہارمونیم بجانے لگے۔ چار تاش کھیلنے میں معروف ہو گئے۔ کھیلنا تو کیا تھا وہ یوں شور مچانے لگے۔ جیسے تاش کھیل رہے تھے۔ ایلی نے اٹھ کر اپلوں کے ڈھیر تلے سے ٹائپ مشین نکالی اور ٹائپ کرنے لگا۔

"ارے۔" محمود حیرت سے چلایا۔ "یہ کیسی کتھا ہے۔"

"یہ سازش ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"سازش۔" محمود کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

اب کی بار محمود آیا تو اس کا حدود اربعہ بدلہ ہوا تھا۔ وہ رومی ٹوپی اور شلوار غائب تھیں شلوار کی جگہ پتلون نے لے لی تھی اور سر ننگا تھا۔

جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو انہوں نے بات چھیڑی

"کہاں ہو تم آج کل؟" ایلی نے پوچھا۔

"یہی تو مجھے معلوم نہیں۔" محمود نے کہا۔

"آخر کہیں تو ہو گے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"کیا دیپالپور ہو؟"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔ "مجھے تبدیل کر دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"لائلپور۔"

"لائل پور میں تو کوئی گورنمنٹ سکول نہیں۔"

"کوئی نہیں۔" وہ مسکرایا۔

"تو پھر؟" میں نے ویلفیئر کے محکمہ میں نوکری کر لی ہے لیکن۔"

یار میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔" محمود نے جملہ ختم کیا۔

"کیوں؟"

"اس محکمہ میں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔"

"اس میں کیا دقت ہے۔"

جس افسر کے ساتھ میں ہوں وہ تو ہر بات میں جذباتی پہلو مد نظر رکھتی ہے۔ پھول دیکھ لے تو یوں خوشی سے ناچتی ہے جیسے نہ جانے کیا دیکھ لیا ہو۔ کوئی نوکر آ کر اپنا دکھڑا روئے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ہر بات میں ذاتی زاویہ ہر معاملے میں پرسنل ویو نہ بھئی ان کے ساتھ میرا گزارہ نہیں۔"

"تم بھی جذباتی پہلو اختیار کر لو۔"

"عورت کے ساتھ میں تو صرف ایک ہی پہلو اختیار کر سکتا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تو کر لو۔" ایلی نے کہا۔

"نوکری ہاتھ سے جائے گی۔"

"جانے لگے تو سامنے جا کر رو دینا۔ وہ بھی رو پڑے گی بات ختم ہو جائے گی۔"

"سچ۔" محمود کی آنکھوں میں عجیب چمک لہرائی۔

"تم خود ہی کہتے ہو۔ نوکر رو کر کتھا سنائے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔"

"لیکن جذباتی پہلو اختیار کیسے کیا جائے۔" اس نے پوچھا۔

"یہ تو آسان ہے۔" ایلی نے کہا۔ "نئے کپڑے پہنے تو شوق بھری نگاہوں سے دیکھو اور کہو

بڑا پیارا لگتا ہے۔"

"یہ تو میں کرتے کرتے تھک گیا۔" وہ بولا۔ "خوش تو ہو جاتی ہے وہ مگر میری طرف نگاہ بھر

نہیں دیکھتی۔"

"خوب صورت ہے؟"

"ایسی خوبصورت تو نہیں لیکن میم ہے۔"

"میم۔" ایلی اچھل کر بیٹھ گیا۔

"اور جو دیسی ہوتی تو کیا تم سے ہی پوچھتا آ کر۔"

"کار میں کیسے آئے تھے؟"

"اسی کی کار ہے۔" وہ بولا۔

"ارے تو کیا اس نے اپنی کار دے دی تمہیں یہاں آنے کے لئے؟"

"خود پہنچانے آئی تھی۔" وہ ہنسا۔

"خود ـــــ؟"

ایک ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔

"اور اب وہ کہاں ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"واپس چلی گئی۔"

"واپس کہاں؟"

"لائل پور۔"

"تو کیا وہ تمہاری شوفر ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا کروں بھئی واہ۔" ایلی ہنسا۔ "جو آتا ہے مجھے بے وقوف بناتا ہے۔"

"یقین کرو۔" محمود بولا۔ "میں خود بھی بے وقوف بنا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا نہیں آتا سمجھ میں؟" ایلی نے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں آتا۔" وہ بولا۔ "کسی وقت میری ہر بات مانتی ہے۔ کسی وقت بات نہیں

سنتی۔ کسی وقت بات بات پر ضد کرتی ہے۔ جیسے ہر بات میری خواہش کے خلاف کرنے کی قسم کھائے بیٹھی ہو۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ جیسے مجھ سے بہت قریب آگئی ہو اور پھر ایک ساعت میں یوں دور چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ نہیں یار۔" وہ چلایا۔ "میں تذبذب سے اکتا چکا ہوں۔ اگر میں اس زنانہ محکمے میں کام کرتا رہا تو کسی روز موقوف ہو جاؤں گا۔"

محمود کے آنے پر ایلی مسلسل دو روز اس کے پاس بیٹھا رہا وہ دونوں کتابوں کی باتیں کرتے رہے آکسفورڈ ڈکشنری کے محاوروں پر بحث کرتے رہے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔

پھر محمود نے سوشل ورکروں کی بات چھیڑ دی۔ "یار ایلی یہ دنیا ہی نرالی ہے۔" وہ بولا۔ "یہ قوم جسے عورت کہتے ہیں۔ عجیب قوم ہے۔ قہقہوں میں روتی ہے۔ آنسوؤں میں ہنستی ہے۔ نہ کہہ کر پچھتاتی ہے ہاں کہتے ہوئے جھجکتی ہے۔ میں آج کل الف لیلیٰ کی دنیا میں جی رہا ہوں ——— وہاں خواجہ سرا ہیں جنات ہیں۔"

ایلی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے پوم پوم کی آواز آئی۔

"ارے یہ کیا ہے؟" ایلی چلایا۔

محمود کا رنگ فق ہو گیا۔

"کار کا ہارن معلوم ہوتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں۔"

"کیا وہ خود لینے تو نہیں آگئی؟"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔ "اس نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ ایک روز رہنا پھر چلے آنا اور آج تین روز ہو چکے ہیں۔"

"تو یقیناً" وہی ہے۔" ایلی نے کہا۔

محمود اٹھ کر باہر چلا گیا اور چند ساعت میں آ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار وہی ہے کہتی ہے چونکہ تم وعدے کے مطابق کل نہیں پہنچے تو میں لینے آئی ہوں۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "اچھا افسر ملا ہے تمہیں۔"

محمود نے اپنی چیزیں سوٹ کیس میں رکھنی شروع کر دیں اور کہنے لگا۔ "یار مجھے اس محکمے میں مجھے اپنا انجام اچھا معلوم نہیں ہوتا۔"

ایلی حیران تھا کہ ایسے سازگار حالات کے باوجود محمود وہاں سے تبادلہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی ...ن بات تھی اور پھر محمود جو طبعی طور پر لیڈیز مین واقع ہوا تھا۔ جو عورتیں سے دوریوں ...ں کرتا تھا۔ جیسے کسی آبی جانور کو صحرا میں پھینک دیا گیا ہو۔ زندگی کس قدر عجیب تھی۔

...الو رجنگ

محمود کے جانے کے بعد ایلی سکول گیا تو شیخ کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔

"کہیے آصفی صاحب۔" شیخ اسے دیکھ کر بولا۔ "بڑے مصروف معلوم ہوتے ہیں آپ آج ...

ایلی نے محسوس کیا کہ شیخ کی بات طنز بھری تھی۔ "جی ہاں۔" وہ بولا۔

"عجیب مصروفیت ہے کہ آدھی رات تک گھر باجے بجتے ہیں۔"

"وہ تو بجیں گے۔" ایلی نے کہا۔

"خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"سچ ہے" شیخ بولا۔ "دشمن پروار ہو رہے ہوں تو خوشی تو ہوتی ہے۔"

نہ جانے کیوں ایلی شیخ کی اس بات پر بگڑ گیا۔ "اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ میں آپ کو ...ن سمجھتا ہوں تو چلئے یونہی سہی۔"

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

"شیخ صاحب آپ کے قہقہے نہ گئے۔"

"کوشش تو بہت کی لوگوں نے۔" شیخ ہنستے ہوئے بولا۔

"کیا۔" ایلی بولا۔ "مجھے یہی حیرت ہے۔"

"اچھا ذرا آئیے تو سہی۔" شیخ نے اپنا رویہ بدلا۔

لیکن نہ جانے کیوں ایلی کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہانے شیخ سے ناراض ہو جائے اس دو رخی سے نجات حاصل ہو جس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس دو رخی پر اسے اپنے آپ سے

نفرت محسوس ہوتی تھی۔

"نہیں شیخ صاحب۔" وہ بولا۔ "اس وقت فرصت نہیں۔"

ایلی کے اس رویے کی وجہ سے شیخ ایلی کے ساتھیوں کو بلواتا اور ان سے کہتا بھئی میری اور آصفی کی صلح کرا دو اور وہ سب مل کر ایلی کو مجبور کر دیتے پھر یہ قافلہ شیخ کے گھر جا پہنچتا۔

وہاں پہنچ کر ایلی صاف صاف بھری محفل میں کہتا۔ "مجھے شیخ صاحب کے خلاف کوئی شکایت نہیں صرف اس بات کا رنج ہے کہ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں اور پھر ان میں اتنی جرات نہیں کہ صاف صاف منہ پر کہہ دیں۔ نہیں صاف صاف نہیں کہتے بلکہ عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں۔" اس پر شیخ قسمیں کھاتا کہ مجھے آصفی پر شک نہیں۔

شیخ کی یہ بات سنتے ہی چودھری شور مچا دیتا۔ "چلو بھئی صلح ہو گئی اب کوئی جھگڑا نہیں رہا اب آصفی شیخ صاحب سے بغل گیر ہو جائے۔ اٹھو آصفی۔" افضل اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ شبیر آہستہ سے چلاتا۔ "اور مٹھائی۔" "وہ تو ہو گی ضرور ہو گی۔" چودھری چیختا۔

پھر وہ سب بیٹھ کر مٹھائی کھاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایلی کے گھر کی طرف چل پڑتے۔ وہاں جا کر باجے بجنے شروع ہو جاتے۔ تاش کی بازی لگ جاتی اور اپلوں کے انبار تلے سے ٹائپ کی مشین نکل آتی اور چودھری قہقہہ مار کہتا۔ "لو بھئی آصفی آٹھ دن کے بعد شیخ سے پھر بگڑ جانا یار تمہارا کیا بگڑے گا ہمیں مٹھائی مل جائے گی کیا حرج ہے۔" شبیر قہقہہ لگاتا۔ "ضرور ضرور۔" احمد تالی بجاتا۔

"بگڑ جائے گا بگڑ جائے گا۔" افضل سنجیدگی سے کہتا۔ "میرا ذمہ رہا۔ لیکن تم صلح کرانے میں دیر نہ لگانا۔"

چودھری چلاتا۔ "اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔"

ان کے لئے یہ ایک نیا شغل تھا۔ جیسے یہ لڑائی اور صلح کا ڈرامہ ڈرامہ در ڈرامہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک اس نئی بات نے سازش کو صلح اور جنگ کے ایک دلچسپ کھیل میں تبدیل کر دیا تھا۔

پھر وہ بیگم شبیر تھی۔ ان سب نے اس کے پکوانوں کی تعریفیں کر کے اسے بالکل رام کر لیا تھا۔ ہر مہینے وہ ان کو دعوت دیتی اور وہ اس کے گھر جا کر کھانا کھاتے اور کھانے کے دوران بڑے اہتمام سے اس کے پکانے کی تعریفیں کرتے ان کی تعریفیں سن سن کر شبیر زیر لب کہتا۔ "ارے

بتو اب بس کرو کیوں میرا دیوالہ نکالنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ ابے او خبیثو کیوں اس نیک ن کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیوں میرا گھر اجاڑ رہے ہو۔" لیکن دل ہی دل میں وہ بھی خوش تھا۔ کہ اب بیگم اس پر پابندیاں عائد نہیں کرتی تھی۔

ت تت۔ بیچارا

بیگم شبیر کی اس تبدیلی کی وجہ صرف کریلے نہیں تھے۔ ایلی نے بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ خالی کریلے دیرپا ثابت نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان بنیادی باتوں کے متعلق کوئی بات نہ کی جائے جن کی بنا پر بیگم شبیر کو ان کے خلاف شکایت تھی۔

ایلی ابھی زندگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زندگی کا تار و پود کیا ہے۔ وہ صرف چند ایک تھیوریوں سے واقف تھا۔ جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اور اسے شوق تھا کہ تھیوریوں کو کام میں لائے اور دیکھے کہ زندگی میں وہ کیا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس نے ان چند نظریات کو آزما دیکھا تھا اور اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے ان خیالات کو مزید آزمانے میں اسے راحت ہوتی تھی۔

ایک روز اس نے بڑی سنجیدگی سے شبیر کو کہا تھا۔ "شبیر میرا ایک پیغام بیگم تک پہنچا دو۔"

شبیر گھبرا گیا۔ "نہیں یار چھوڑو اس بات کو اس نیک بخت کو زیادہ دق نہ کرو کہیں وہ بالکل ہی بگڑ نہ جائے۔"

نہیں یار وہ بولا۔ "یہ خالی کریلے دیر تک نہ چلیں گے۔"

منتیں کر کے اس نے شبیر کو منا لیا تھا اور شبیر نے ایلی کی ہدایات کے مطابق اپنی بیگم کو پیغام دے دیا تھا۔

"میں نے کہا۔" شبیر نے بیگم سے کہا۔ "ایک کام کر دو تو بڑی مہربانی ہو گی ثواب کا کام ہے۔"

"کیا ہے؟" وہ بولی۔

"یہ جو الیاس ہے نا۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی اچھی لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے۔"

"تو پھر کرتا کیوں نہیں۔" بیگم غصے میں چلائی۔

"کسی اچھے رشتے کی تلاش ہے اسے۔ اچھی لڑکی ملے تو کرے۔"

"تو کہے نا اپنے ماں باپ سے۔" وہ بولی۔ "میں نے تو سنا ہے کہ ماں باپ کا کہا نہیں مانتا وہ۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" شبیر بولا۔

"جو ماں باپ کا کہا نہیں مانتا وہ کیا انسان ہے۔" وہ غصے میں بولی۔

"نہیں تم نہیں سمجھتی بیگم۔" وہ بولا۔ "اسے ماں باپ کے چناؤ پر اعتماد نہیں۔"

"ہئے ماں باپ کے چناؤ پر اعتماد نہیں۔" بیگم چڑ گئی۔

"دیکھو نا۔" وہ بولا۔ "اس کی چار مائیں ہیں۔"

"چار مائیں۔" وہ چلائی۔

"ہاں۔" شبیر نے کہا۔ "والد اپنی دھن میں لگے ہیں۔ والدہ کی کوئی مانتا نہیں۔"

"تت تت تت۔" بیگم پسیج گئیں۔ "بیچارہ۔"

"کل بھری محفل میں کہہ رہا تھا——" شبیر رک گیا۔ "لیکن چھوڑو اس بات کو۔"

"کہو تو کیا کہہ رہا تھا۔" وہ مصر ہو گئی۔

"چلو چھوڑو۔" شبیر نے کہا۔

"چھوڑو کیوں۔"

"تم برا مانو گی۔"

"نہیں میں نہیں مانتی برا۔"

"سچ؟"

"کہہ جو دیا۔"

"کہہ رہا تھا میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو اچھی لڑکی کا چناؤ کر سکتی ہو۔ صرف ایک بیگم شبیر ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ویسے ہی اناپ شناپ بکتے رہتے ہیں یہ۔" وہ بولی۔

"نہیں نہیں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔"

"اچھا——" وہ بولی۔ "تو کیا میں نے یہاں شادی ایجنسی کھول رکھی ہے۔ میں کیا کروں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولا۔ "مقصد یہ ہے کہ الیاس چاہتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ ملے تو تم جا کر

لڑکی کو لو۔"

"آخر کس قسم کی لڑکی چاہیے اسے۔" بیگم نے پوچھا۔ "ہے بیچارہ۔"

"بس ایک ہی شرط ہے اس کی۔"

"کیا؟"

"یہ لڑکی مغرب زدہ نہ ہو۔"

"کیا سچ۔" وہ حیران رہ گئی۔

"اچھا—— میں تو سمجھتی تھی——"

شبیر قہقہہ مار کر ہنسا۔ "مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تمہاری بیگم کی کوئی چھوٹی بہن ہے۔ جس کی دی نہ ہوئی ہو۔"

شبیر اور ایلی کو اچھی طرح سے علم تھا کہ بیگم شبیر کی کوئی چھوٹی بہن نہیں اور اصولی طور پر شادی کے جھمیلے میں پڑنے کی قائل نہیں اس لئے انہوں نے یہ پیغام اسے بھیجا تھا تاکہ بات ں پہنچ جائے اور اس کے نتائج بھی پیدا نہ ہوں۔ اس پیغام کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ بیگم شبیر الیاس کو چارہ کہنے لگی—— اور ایلی مطمئن ہو گیا چونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے چند بار بیچارہ کہہ دیا جائے ں کے خلاف غصہ نہیں رہتا۔

ہلجاتی ہڈیاں

محمود کے جانے کے بعد ایلی کو ایک خط موصول ہوا۔ جمیل نے ایلی کو خان پور بلایا تھا کہ ئی ضروری معاملہ ہے۔

خان پور پہنچ کر وہ سیدھا جمیل سے ملا۔

"کیوں خیر ہے؟" اس نے پوچھا۔

جمیل حسب عادت مسکرا دیا۔ "گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ نقی نے کہا تھا بلا لو۔"

"کیوں؟"

"وہ آج کل پریشان ہے۔ یار اس کا کچھ کرو اس نے اپنی زندگی بہت تلخ کر رکھی ہے۔ روز بی کو پیٹتا ہے۔ روز رات کو ان کے گھر میں ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ محلے والے اکٹھے ہو جاتے ہیں راہ گیر کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا تو کیا اس لئے بلایا ہے مجھے؟"

"نہیں وہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔" جمیل نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ نقی خود بتائے گا۔ لیکن نقی کے گھر کے جھگڑے کے بارے میں کچھ سوچو یار ہم سب بڑے پریشان ہیں۔"

شام کے وقت جب وہ نقی کے ہاں پہنچے تو وہ ارد گرد اوزار رکھے جوتے کا تلا سی رہا تھا۔

"ارے تم یہ کیا کر رہے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

"جوتا سینا سیکھ رہا ہوں۔" نقی نے جواب دیا۔

"اور وہ چڑیاں کیا ہوئیں جو تم کپڑے پر کاڑھا کرتے تھے۔"

"اڑ گئیں۔" وہ بولا۔

"لیکن کوئی اور ہابی منتخب کرتے۔" ایلی نے کہا۔

"یہ ہابی تو نہیں۔" نقی نے اپنی تھوتنی اٹھائی۔ "ایک روز سوچ رہا تھا کہ آخر ہر نیا جوتا جو میں خریدتا ہوں۔ میرے پاؤں کو کاٹتا کیوں ہے۔ یہ بات میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا۔ یعنی مطلب ہے کہ ذہن میں تھی یہ بات تو مجھے خیال آیا کہ یہ موچی لوگ سٹینڈرڈ سائز کے جوتے بناتے ہیں۔ یعنی اوسط سائز کے اور جس کے پاؤں اوسط سے ہٹ کر ہوں انہیں جوتے کاٹتے ہیں لہٰذا میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں کے مطابق جوتا سینا چاہئے یہ بات دیر سے میرے ذہن میں تھی۔ اب کی بار نہ جانے کیسے عمل میں آ گئی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک روز میری جیب میں بیس روپے تھے اور میں اتفاقاً اس بازار میں جا نکلا جہاں موچیوں کے اوزار بکتے ہیں تو میں نے اوزار خرید لئے پھر جوتا سینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ جو ہمارے مکان سے باہر موچی بیٹھتا ہے۔ اس سے ٹانکا لگانا سیکھ لیا۔ اللہ اللہ۔ خیر سلا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخر چینی موچی کا کمال کیا ہے۔ یہی نا کہ وہ خوبصورت شکل کا جوتا نہیں بناتے بلکہ ایسا جوتا بناتے ہیں جو پاؤں پر فٹ بیٹھے۔"

"سنا ہے تم نے بیگم کو پیٹنے کا شغل تیز کر دیا ہے۔" ایلی نے بات بدلی۔

"ہاں یار۔" نقی بولا۔ "میں نے بھی سنا ہے۔ کل رات کو میں جو اپنی بیٹھک سے باہر نکل کر ایک بند دوکان پر جا بیٹھا۔ ویسے ہی جا بیٹھا۔ میں نے سوچا چلو آتے جاتے لوگوں کا تماشہ دیکھو تو دو محلے والے آ کھڑے ہوئے وہاں۔ انہوں نے یا تو مجھے دیکھا نہیں اور یا پہچانا نہیں۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ اس نقی بابو نے جو ساتھ والے گھر میں

[...]ہے نے بڑا اودھم مچا رکھا ہے۔ محلے میں روز لڑائی روز لڑائی مجھے اس کی بات تو بری نہ [...]

[...]قی نے کہا "لیکن جو جواب دوسرے نے دیا اسے سن کر کباب ہو گیا میں۔"

"دوسرے نے کیا کہا؟" ایلی نے پوچھا۔

[...]کہنے لگا۔ "چھوڑو جی کس کی بات کرتے ہو۔ وہ نقی تو مستی پر آئی ہوئی کتیا ہے۔ کتیا۔" وہ

[...]کہنا بھی نہیں کتیا۔ اور پھر سوچے تو بیگم سے لڑنے کو کتیا سے کیا تعلق۔ بڑی گہری بات [...]ی سالے نے۔ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"تو پھر اسے کیوں پیٹتے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

"اگر اس نقطے کا مجھے علم ہوتا تو ——— "

"تو کیا بے خبری میں پیٹتے ہو۔"

"ہاں یار اب جو تم نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ واقعی بے خبری میں یہ عمل ہوتا ہے۔ مثلاً [...]انے کوئی واہیات بات کی اور مجھے غصہ آیا۔ یہاں تک تو شعور ہوتا ہے۔ پھر جو ہوش آتا ہے [...]تو پیٹ رہا ہوتا ہوں اور وہ چیخ رہی ہوتی ہے۔"

"تو اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"

"یار تم سے پڑھے لکھے ایسی بات کریں حیرت ہے۔ تم سمجھتے ہو جیسے میری انا گھوڑا ہو اور [...]سوار ہوں۔ اس کے برعکس مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری انا سوار ہے اور میں گھوڑا [...]ہ میں اسے قابو میں کیسے رکھوں۔ ہاں یار۔" دفعتاً اسے یاد آیا۔ "جس بات کے لئے [...]نے تمہیں بلایا ہے وہ تو سنو۔ میں تو عجیب مصیبت میں مبتلا ہوں۔ سمجھ لو باؤلا ہو رہا ہوں۔ [...]ہے یار تم یہ بیگم کے قصے کو کیوں لے بیٹھے یہ تو پرانا روگ ہے۔ نہ جانے میرا یا بیگم کا [...]ں کہ شاید اس معاملے میں میں ہی مظلوم ہوں۔ خیر خیر اس قصے کو چھوڑو۔ میں سمجھتا [...]پٹنے کے لئے اس کی ہڈیاں چلچلاتی رہتی ہیں۔"

"چائے تو کہہ دو۔" جمیل نے کہا۔

"تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔" نقی بولا۔ "کہا تو چائے بنانے کو ہے پتہ نہیں شاید [...]ہارے یا ستو گھول دے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "پتہ ہے کل کیا ہوا۔ حقہ جو بھرا اس نے تو میں

حیران یا اللہ یہ کیا بھرا ہے چلم میں۔ کہنے لگی تمباکو ہے۔

"چلم الٹا کر دیکھا تو گدھی نے چائے کی پتی ڈال رکھی تھی چلم میں۔" وہ ہنسنے لگی۔ "پھر لوگ کہتے ہیں۔ میں پیٹتا ہوں اسے۔"

"ہاں تو وہ بات سنا رہے تھے تم۔" جمیل نے کہا۔

"یہ کیا خرافات ہیں۔" نقی نے کہا۔ "بھئی یہ زندگی ہے۔ شکر کرو کہ ہم تمہیں اتنی اہمیت دیتے ہیں اور جب بھی کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو تمہیں سناتے ہیں۔"

"لیکن اتنی دور سے بلانا' یہ کیا زیادتی نہیں؟"

"میں نے تو نہیں بلایا۔" نقی بولا۔ "میں نے تو جمیل سے کہا تھا کہ میں جاورے ہو آؤں چونکہ میں چاہتا تھا کہ تمہارا مشورہ لوں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی میں گھبرا گیا اور جاورے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جمیل نے کہا کہ تم وہاں نہ جاؤ۔ اسے یہاں بلا لو۔"

"ہاں۔" جمیل بولا۔ "میں نے سوچا چلو ہمیں بھی مل جائے گا۔ اپنے بھی دو دن خوشی سے گزرے جائیں گے۔"

تو ——— یہاں

"ہاں تو بات بڑی الٹی سی ہے" نقی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

"پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں۔" وہ بولا۔ "کہ میں یہاں چکلے میں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی مجھے وہاں جانے سے کوئی دلچسپی ہے۔ سمجھ لو میرے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ چکلا کہاں واقع ہے شاید کہیں کسی جگہ اس کے جائے وقوع کے متعلق سنا ہو۔ ضرور سنا ہو گا۔ لیکن مجھے شعوری طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔"

"ایک روز۔" وہ بولا۔ "مجھے جلدی تھی۔ ایک دوست سے ملنے کے لئے چندو محلے کی طرف جا رہا تھا۔ کابلی دروازے پہنچا تو میں نے چکلے کی گلی کی طرف دیکھ کر سوچا کہ رادھا چوک سے گھوم کر کیوں جاؤں۔ اسی گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں ضرور یہ گلی آگے کہیں نہ کہیں نکل جائے گی۔ بند گلی تو معلوم نہیں پڑتی۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں چکلے کی گلی میں داخل ہوا۔ اب اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہوں کچھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا ہی نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں تھی۔

بھیڑ تو رات کے وقت ہوتی ہے۔ آدھی گلی تو میں نے ایسے ہی ان جانے میں عبور کر لی۔ اب جو سر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو سامنے ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ میں گھبرایا۔ ادھر دیکھتا ہوں تو ایک دروازے میں کھڑی ہے۔ ایک ادھر چوکی پر بیٹھی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں چکلے سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت مکدر تو ہوئی لیکن میں نے سوچا اب آ جو گیا ہوں تو نکل ہی جاؤں۔

"ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتاً میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ چوبارے کے جنگلے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں خواہ مخواہ رک گیا۔ عجیب انداز سے بیٹھی تھی نہ تو وہ راہگیروں کو دیکھ رہی تھی اور نہ اپنا آپ دکھا رہی تھی۔" نقی مسکرایا۔ "اسے خبر ہی نہ تھی کہ وہ بیٹھی ہے یا کھڑی ہے یا کہاں بیٹھی ہے۔ باورچی خانے میں بیٹھی ہے یا پلیٹ فارم پر یا چکلے میں۔ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس میں ٹھوڑی رکھی ہوئی تھی اور خود کھوئی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے روئی روئی ہو۔ بال کھلے تھے پریشان حال کپڑے بے پرواہی سے پہنے ہوئی۔ بس صرف ہونٹوں پر لپ سٹک لگی تھی اللہ اللہ خیر سلا۔

"اسے دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آیا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چند ایک ساعت تو میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا چلو چھوڑو مجھے کیا لینا دینا ہے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے اپنا کیا لیتی ہے۔ میں چل پڑا لیکن یہ سوال میرے دل میں کانٹا سا لگا رہا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ دو قدم چلا پھر رک گیا۔ مجھے غصہ محسوس ہونے لگا۔ آخر یہ کیوں یہاں بیٹھی ہے۔ پھر رک گیا۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ لیکن غصہ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔ جی میں آیا کہ جا کر پوچھوں تو اس میں حرج کیا ہے۔

"میں واپس آیا۔ لیکن جب اس کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو خیال آیا کہ آخر اوپر جا کر کہوں گا کیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول خیال ہے۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ بیٹھی ہوں تجھے کیا۔ تو کیا جواب دوں گا۔ اس خیال پر میں آگے چل پڑا۔ لیکن آگے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر قدم کے بعد رک جاتا۔ غصہ دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہرصورت اتنی بار رہا۔ میں کہ میں نے سوچا آگے جانا بے کار ہے اور پھر اس قدر غصے میں آ چکا تھا کہ کوئی اور بات ذہن میں نہ رہی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک تانگا لیا اور تانگے والے سے کہا کہ مجھے گھر لے چل۔ گھر پہنچ تو گیا لیکن وہاں بھی رہ رہ کر مجھے یہ خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے اور وہ غصہ جو مجھے آ رہا تھا۔ وہ میں نے سب بیوی پر نکالا۔ پیٹ پیٹ کر اس کا پلستر نکال دیا۔ میرے اپنے ہاتھ دکھنے لگے۔ پھر تھک

ہار کر سو گیا۔

"اگلے روز پھر وہی چکر۔ دفتر گیا تو وہاں کام کرتے کرتے رک جاتا اور وہی خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ہزار سمجھایا لیکن بے کار۔ اب میں دفتر میں خواہ مخواہ لوگوں سے الجھ رہا ہوں بے کار باتوں پر لڑ رہا ہوں حتیٰ کہ صاحب سے جا کر الجھ پڑا۔

"پھر میں نے سوچا یہ تو بری بات ہے گھر چلو ورنہ گڑبڑ کر بیٹھوں گا۔ تو میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر گھر چلا آیا۔ راستے میں اپنی اس حماقت پر سوچتا آیا۔ چلتا رہا اور سوچتا رہا چلتا رہا اور سوچتا رہا۔

"اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس کے چوبارے کے نیچے کھڑا ہوں۔ یعنی گھر کو پیچھے چھوڑ کر ایک میل آگے نکل گیا اور مجھے علم ہی نہ ہوا کہ آگے نکل آیا ہوں یا کہاں جا رہا ہوں۔ یا راستہ غیر مانوس ہے۔"

چوبارے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میرا مطلب ہے جنگلے میں کوئی نہ تھا۔ اس وقت کون ہوتا۔ بھلا دوپہر کو دو بجے کون طائفہ باہر بیٹھتی ہے۔

"وہاں جو ہوش آیا تو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور اس قدر شدت سے غصہ آیا اپنے آپ پر کہ اب اپنے دل کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لہٰذا اب مجھے اوپر چڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ اوپر چوبارے میں وہ میلے کچیلے کپڑوں میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میں نے اوپر جاتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہی بات ہوئی نا۔" نقی بولا۔ "نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ جی سلام۔ میں نے کہا۔ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اور تیرا یہاں بیٹھنے سے کیا مقصد ہے؟ اور تو کیا طائفہ ہے؟ پھر تیرا یہاں کیا کام؟

"پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔ سمجھتی ہو گی کوئی پاگل ہے۔ پھر اس کے حواری آ گئے۔ انہوں نے آ کر مجھ سے الجھنا شروع کر دیا اور غصے سے میرا دماغ اور بھی چل گیا اور میں نے اتنا اودھم مچایا اور ان سے اتنی مار کھائی کہ کیا بتاؤں۔ پھر لوگوں نے مجھے چھڑایا اور تانگے میں ڈال کر گھر بھجوا دیا۔

"اگلے روز پھر وہی جنون۔ میری زندگی گویا حرام ہو گئی۔ بس یہی دھن جی میں سمائی تھی کہ وہاں جاؤں اور جا کر اس سے لڑوں۔ چار ایک روز تو میں نے زبردستی اپنے آپ کو روکے رکھا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بھوت ایسے نہیں اترے گا۔ سمجھانا بجھانا فضول ہے۔ لہٰذا میں نے سوچ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جاؤں اسے بک کروں۔ منہ مانگے دام دوں اور پھر لڑنے کی بجائے اس سے باتیں کروں شاید اس اقدام سے دل کی بھڑاس نکل جائے تو صاحب۔" نقی نے قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ "اس روز میں نے نہا دھو کر اچھا لباس پہنا اور بن سنور کر رات کو وہاں جا پہنچا۔

"اس کے حواریوں نے جب دیکھا کہ میں رات رہنا چاہتا ہوں اور میرا دنگا فساد کا ارادہ نہیں تو انہوں نے مزاحمت نہ کی۔ البتہ حرامیوں نے مجھ سے بہت پیسے مانگے۔ ظاہر تھا کہ مجھے لوٹ رہے ہیں۔ خیر میں نے کہا جو مانگو گے دوں گا۔

"تو جناب۔" نقی بولا۔ "میں وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ میں اس کے ہاں رہنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یعنی میں صرف باتیں کرنا چاہتا تھا اور بس ٹھہرنا تو محض بہانہ تھا۔ خیر۔

نقی اور بانو

"جب ہم اکیلے رہ گئے تو عجیب بات ہوئی۔ اب میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور وہ کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کی۔ میں نے کہا۔ "بتا نا مجھے تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔"

"وہ بولی۔ تو اس بات کو چھوڑ۔ تجھے اپنے کام سے واسطہ۔ میں نے کہا۔ میں تو آیا ہی اس لئے ہوں کہ تجھ سے پوچھوں کہ آخر بات کیا ہے؟ تو یہاں کی نہیں۔ نہ تو یہاں کی دکھتی ہے۔ نہ تیری کوئی حرکت ایسی ہے۔ جو ظاہر کرے کہ تو یہاں کی ہے بلکہ تجھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے مجھے جیسے کوئی مچھلی ریت پر پڑی ہے۔ تو تو یہاں دم توڑ رہی ہے۔"

"پھر میں نے اس سے محبت بھرے انداز سے بات کرنی شروع کی کیونکہ ویسے تو وہ میرے مطلب نہ دیتی تھی۔ میں نے کہا۔ دیکھ بانو' چونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا نام بانو ہے۔ پہلی اس بازار میں وہ بیٹھی ہیں جو جسم ہی جسم ہوں اور تو تو جسم ہے ہی نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تو بغیر جسم کے ہو۔ یہ روئی روئی آنکھیں یہ کھوئی کھوئی نگاہ۔ جیسے کوئی راستہ بھول گیا ہو اور رو رو کر تھک گیا ہو۔

"وہ مجھ سے بار بار کہتی رہی تو چھوڑ اس قصے کو لیکن میں نے اپنی رٹ نہ چھوڑی پھر وہ پوچھنے لگی۔ "تو کون ہے۔" میں نے اسے اپنا نام اور کام بتایا۔ اپنا گھر کا پتہ دیا۔ پھر وہ پوچھنے لگی۔

"تو مجھے حق میں لے گا۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔

"میں نے کہا۔ تو غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے تیری ہوس نہیں۔ مجھے عورتوں سے کچھ دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں تیری محبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تو یہاں کیسے آ گئی۔ یہ تیری جگہ نہیں۔

"قصہ کوتاہ۔" نقی بولا۔ "پھر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ روتی رہی۔ کہنے لگی میرے نصیب۔ پھر میں نے بحث چھیڑلی اور پھر مجھے غصہ آنے لگا اور جب اس نے دونوں بانہیں میری گردن میں ڈال کر ہونٹ میری طرف بڑھائے اور بولی۔ اب چھوڑ بھی نا۔ تو غصے میں میں نے اسے یہ تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور اس نے شور مچا دیا اور پیشتر اس کے کہ حواری آ پہنچتے میں بھاگ آیا اسے ملے مجھے دس دن ہو چکے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ چاہے میں یورپ کو جاؤں یا پچھم کو مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اس کے چوبارے تلے جا پہنچتا ہوں اور ہوش آتا ہے تو وہاں سے بھاگتا ہوں۔ سارے چکلے میں چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ گردن اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے ہیں۔ طائفوں کے بھڑوے مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ رنڈیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ اور وہ بانو۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ساکت ہو جاتی ہے۔ جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اس نے ہنسنا مسکرانا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتی عجب تماشہ ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا "یار وہ چائے تو مدت سے بنی ہوئی ہو گی میں لایا ہی نہیں۔" وہ اندر چلا گیا اور چند ساعت کے بعد چائے کا ٹرے اٹھائے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے چائے بنانا شروع کی۔

"ہاں۔" وہ چائے بناتا ہوا بولا۔ "تو تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے۔ الیاس آصفی۔ یہ سب گڑبڑ گوٹالہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے مجھ سے۔ یار ایسی عجیب و غریب باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر بات الٹی ہر واقعہ پیچیدہ اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

"ارے۔" وہ چائے کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

چائے کا رنگ ہلکا پیازی تھا۔ جیسے چائے نہیں بلکہ پشاوری قہوہ ہو۔

"لو۔" وہ بولا۔ "پھر اس نے گڑبڑ کر دی۔ نہ جانے قہوہ بنا دیا ہے یا کیا حد ہو گئی۔" نقی نے چائے دانی اٹھالی اور اندر چلا گیا۔

پہلے تو مکان سے اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دفعتاً چیخ و پکار شروع ہو گئی وہ دھاڑ رہا تھا اور نہ جانے کس چیز سے بیگم کو زدوکوب کر رہا تھا اور وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

"اور ارے اور پیٹ اور پیٹ۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

"تو توڑ دے۔ ایک بار میں قصہ ختم کر دے۔"

"وہ قصہ ختم کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔"

پڑوسی چاروں طرف سے اکٹھے ہو گئے۔

"اب چھوڑ بھی کہ مار کر ہی دم لے گا۔" ایک نے کہا۔

"ارے کیا قیامت اٹھا رکھی ہے تم نے۔" دوسرا بولا۔

"اے نقی صاحب اے نقی صاحب۔"

دو ایک محلے والے بیٹھک میں آ گئے۔ "کیوں صاحب یہ کیا آئے دن کا فساد سے ہمارا ناک میں دم آ گیا بھائی صاحب۔"

ایلی اور جمیل خاموش بیٹھے تھے۔

اندر جھگڑا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس پر محلے والے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے نقی کو پکڑ لیا لیکن وہ ویسے ہی بکے جا رہا تھا۔ "اندھیر خدا کا حقے میں تو چائے ڈالتی ہے اور چائے بناتی ہو تو پان کا زردہ ڈال دیتی ہے۔" وہ چیخ رہا تھا۔

"چلو چلیں۔" جمیل نے ایلی سے کہا۔

"لیکن یہ گڑبڑ۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ تو یوں ہی رہے گی۔" جمیل بولا "کوئی مدد نہیں کر سکتا کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

"لیکن۔" ایلی بولا۔

"بے کار ہے نقی کا بھید کسی نے نہیں پایا۔"

"کیا واقعی۔"

وہ دونوں بیٹھک سے باہر نکل آئے۔

باہر بازار میں چراغ جل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا آسمان پر گلابی بادل تیر رہے

تھے۔

بیٹھک کے پاس ہی ایک عورت کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

وہ ان کے قریب آ گئی۔ "یہ نیا محلہ ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"جی۔" جمیل نے جواب دیا۔

"مجھے نقی صاحب کے گھر جانا ہے۔" وہ بولی۔ "مکان نمبر ۳۰۳ آپ کو معلوم ہو گیا؟"

"نقی صاحب کے ہاں۔" جمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی وہ دبلے پتلے صاحب ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم ہیں۔"

"آپ کون ہیں؟" جمیل نے پوچھا۔

"میں ——" وہ رک گئی۔

"ان کی رشتہ دار ہیں کیا؟" جمیل نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولی "میں ان کی جان پہچان ہوں۔ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے۔"

"آپ کا نام بانو ہے نا۔" ایلی نے کہا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"بانو ——" جمیل نے حیرانی سے عورت کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔" وہ بولی۔

"ارے تم کہاں جا رہے ہو۔" نقی نے بیٹھک سے سر نکال کر انہیں آواز دی۔ "یہ لیجئے نقی آ گیا۔" ایلی نے کہا۔

بانو کو یوں اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ نقی کی آنکھیں ابل آئیں ایک ساعت کے لئے وہ جھجکا پھر وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ بانو سمٹ کر رک گئی' خوف سے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لیکن جسم کے بند بند میں سپردگی موجیں مار رہی تھی۔ باہر بازار میں چراغ جھلملا رہے تھے۔ گلابی بادل دھند لا رہے تھے۔ ہوا رک کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ نقی بانو کی طرف یوں بڑھ رہا تھا جیسے وہ ایک خوفناک موج ہو۔ بانو ڈوب جانے کی منتظر تھی۔ "چلو۔" جمیل نے ایلی کو کہنی ماری اور وہ چپ چاپ چل پڑے۔

انکوائری

جب ایلی واپس جاورا پہنچا تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ اس کے تمام ساتھی گھر پر جمع تھے۔

"ارے۔" افضل چلایا۔ "ایلی آ گیا۔"

ایلی آ گیا ایلی آ گیا' چاروں طرف شور مچ گیا۔

"بڑے موقعے پر آئے ہو ورنہ تمہیں تار دینے والے تھے۔" چودھری بولا۔

"آخر بات کیا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"پٹاخہ چل گیا۔" افضل نے شور مچایا۔

"اور شیخ کی بات بتاؤ نا۔ اسہال جاری ہیں بری حالت ہے۔" شبیر نے کہا۔

"صاف بات کرو یار اسے پریشان کیوں کر رہے ہو۔" افضل بولا۔

"جو پودا بویا تھا۔ اسے سمجھ لو پھل لگا ہے۔"

"یار انکوائری ہو رہی ہے۔"

انکوائری کی خبر سن کر ایلی ساکت رہ گیا۔

"ہاں ہاں۔" شبیر بولا۔ "خود مسٹر معروف انکوائری کے لئے آ رہے ہیں۔"

"خود؟"

"ہاں ہاں۔"

"کب؟"

"کل صبح۔"

اگلے روز سکول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مسٹر معروف شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ باہر لڑکوں کے دل دھڑک رہے تھے اور وہ انتقاماً لڑکوں کو گھور گھور کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ سازشیوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ان کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ لیکن ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ چپڑاسی مئودبانہ سٹولوں پر بیٹھے تھے۔ ڈرل ماسٹر خصوصی طور پر کھرج میں ملت نافذ کر رہا تھا اور ایلی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ اسے بار بار افضل کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے ایلی سے کہا تھا۔ "تمہارے ساتھیوں میں جرات نہیں۔ نہ یہ بات کر سکیں گے نہ سامنے آ سکیں گے۔ اب سوچ لو۔ آیا سامنے آنا ہے یا نہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔ اگر تم سامنے نہ آئے تو سب سارا کیا کرایا بے کار جائے اور اگر سامنے آ گئے تو شاید زد میں آ جاؤ اور فائدہ کچھ بھی نہ ہو۔" ایلی سوچ رہا تھا۔

طبعی طور پر وہ سامنے آ جانے کا قائل تھا۔ وہ صرف اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ میرے سامنے آ جانے سے باقی ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔

سکول کے بچوں کو چھٹی دینے کے بعد مسٹر معروف نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ ہال کمرے میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ اساتذہ بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر معروف کا شیخ سے برتاؤ ایسا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شیخ مسعود کی ہر بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ہر مشورے پر عمل کرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ باتوں کے دوران میں وہ نیچی نگاہ سے اساتذہ کے رد عمل کا جائزہ لے رہے تھے یا شاید یہ دیکھ رہے تھے کہ جو اثر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے کیا وہ پیدا ہو رہا ہے۔

شیخ صاحب نہایت مؤدبانہ بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے فکر کے آثار مترشح تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے جھجک اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

دفعتاً معروف صاحب نے اساتذہ کو خطاب کرنا شروع کیا۔

"اساتذہ کرام۔" وہ بولے۔ "میں آپ کے سکول میں انکوائری کے لئے آیا ہوں۔"

"کوائف یہ ہیں کہ تقریباً ایک سال سے جلورا سے گمنام شکایتی خط موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کا انداز انوکھا ہے۔ روز ایک خط بھیجا جاتا ہے۔ جس میں صرف ایک شکایت درج ہوتی ہے' وہ بھی نہایت اختصار سے گمنام خط لکھنے والا یقیناً کوئی ذہین آدمی ہے اور یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ یہ شکایت کسی خاص آدمی کے خلاف نہیں ہوتی۔ بہرحال ظاہر ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک یا چند لوگ مل کر یہ خطوط بھیج رہے ہیں۔ میں صرف آج اس لئے آیا ہوں کہ اس کے متعلق انکوائری کروں۔ لیکن انکوائری جبھی ہو سکتی ہے۔ جب مدعی اور مدعا الیہ دونوں موجود ہوں۔ مدعی شکایت پیش کرے۔ مدعا الیہ اس کا جواب دے اور میں انسپکٹر کی حیثیت سے دونوں پارٹیوں کے دلائل سن کر اس کا فیصلہ کروں۔ لہٰذا میں آپ کی خدمت میں ایک درخواست کروں گا کہ جو بھی مدعی ہے وہ اپنا آپ ظاہر کرے۔"

مسٹر معروف خاموش ہو گئے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تمام اساتذہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

مسٹر معروف نے چند ایک منٹ انتظار کیا۔ وہ اساتذہ کو جانچتے رہے لیکن پھر مزید وضاحت کے لئے کہنے لگے۔

"دیکھئے۔" وہ بولے۔ "یہ بات تو میں تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں کہ یہ ف

علاوہ کوئی اور شخص ایک سال سے مسلسل اس سکول کی شکایت بھیج رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے" انہوں نے پوچھا۔ اساتذہ خاموش بیٹھے رہے۔

ی اور مدعا الیہ

"تو آپ کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ آپ کو میرے خیال سے اتفاق ہے۔" مسٹر معروف ا کر کہنے لگے۔ "لہٰذا اگر آپ میں ہی وہ صاحب موجود ہیں۔ جو ایسے خط لکھ رہے ہیں۔ تو وہ ے بات کریں اور اگر آپ میں سے کوئی شخص ان خطوط کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے تو یئے کہ انکوائری ختم ہو گئی۔ کیونکہ اگر آپ میں سے کسی شخص کو کوئی شکایت ہی نہیں تو ائری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شیخ کا چہرا بھیانک ہو گیا۔ لیکن مسٹر معروف نے اسے ل اہمیت نہ دی۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں الیاس صاحب۔" معروف نے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کیا گمنام خط لکھنے والے نے انکوائری کا مطالبہ کیا ہے۔"

مسٹر معروف کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔ "میرے خیال میں نہیں۔" "تو آپ خود انکوائری کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہٰذا مدعی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں ۔" ایلی نے کہا۔

"ہوں۔" مسٹر معروف مسکرائے۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ انکوائری ہو۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

مسٹر معروف نے تمام اساتذہ کو مخاطب کر کے کہا کیا آپ میں سے کوئی صاحب چاہتے ہیں انکوائری ہو۔"

سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔

"میری ایک گزارش اور ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کہو۔" معروف بولے۔

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ شکایات کسی فرد کے خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ مدعا الیہ

بھی کوئی نہیں ہے تو پھر مدعی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" کچھ دیر تک مسٹر معروف خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ "الیاس صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس کیس سے خاصی دلچسپی ہے۔"

"جی۔" ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔

"کیا دلچسپی ہے؟" معروف بولے۔

"مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔" ایلی نے گھبرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہوائی کو آگ دی گئی ہو۔

مسٹر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھالیں۔ ہال کمرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرنا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائینگ ماسٹر مسکرا رہے تھے۔

"تو آپ مدعی ہیں۔" مسٹر معروف بولے۔

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔"

"دیکھئے الیاس صاحب۔" مسٹر معروف نے پینترا بدلا۔ "میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔ میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق نظم و نسق بحال رکھوں۔ سمجھے۔"

"جی۔" الیاس نے کہا۔ "میں آپ سے انصاف نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ آپ کے نظم و نسق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا الیہ ہیں۔"

"تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔"

"شکایت کے ساتھ متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟"

مسٹر معروف بولے۔ "لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں"۔ مسٹر معروف

"تو نہ دیکھئے آپ جانیں آپ کا نظم و نسق جانے۔"

مسٹر معروف نے ایک قہقہہ مارا۔ "آپ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ مسٹر آصفی۔ میں آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ لیکن اس سپرٹ سے آپ نوکری نہیں کر سکیں گے۔"

انکوائری کے بعد فضا پر گویا ایک اداسی اور ویرانی چھا گئی وہ اداسی جو کامیابی اور جدوجہد کے بعد چھا جاتی ہے۔ کیا یہ تھی وہ انکوائری جس کے لئے انہوں نے زندگی کا ایک سال حرام کر دیا تھا ایک سال محنت کی تھی۔ سوچ بچار کی تھی۔ پلان بنائے تھے آخر اس تمام تگ و دو کا مقصد کیا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

مولوی! مولوی! منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ مولوی! مولوی!!

اس کے روبرو پاگل مولوی آ کھڑا ہوا۔ وہ سڑک پر بنی ہوئی مسجد پر کھڑا تھا۔ سن رہے ہیں آپ" ایلی چلایا۔ "سن رہے ہیں آپ۔ آپ کو ستانے والا آج خود مصیبت میں گرفتار ہے۔" "ہوں ہوں۔" مولوی نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ خالی تھا۔ خوشی اور غم سے بے نیاز۔ "ہوں ہوں۔" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا "بیکار ہے بے کار۔" ایلی کے دل سے آوازیں آنے لگیں۔ "تم ایک دکھی کا دکھ دور نہیں کر سکے۔ تم اسے مسرت نہ دے سکے۔ الٹا تم نے ایک اور آدمی کو دکھی بنا دیا۔"

ایلی کے روبرو شیخ آ کھڑا ہوا۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ "میں صرف اس لئے پٹ گیا۔" وہ بولا۔ "کہ تم نے دوست بن کر مجھ پر وار کیا۔"

ادھر مسٹر معروف مسکرا رہے تھے۔ "الیاس زندگی سے انصاف کی توقع رکھو گے تو سدا دکھی رہو گے۔ سرکاری ملازمت میں انصاف نہیں ہوتا صرف ایڈمنسٹریشن ہوتی ہے اور ایڈمنسٹریشن کے پاٹ تلے ظالم مظلوم دونوں پستے ہیں۔"

ایلی کے ساتھی خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ہارمونیم ایک طرف پڑا تھا۔ تاش کے پتے صحن میں اڑ رہے تھے۔

"کچھ مزا نہیں آیا ایلی۔" افضل کہہ رہا تھا۔

"ہاں یار کچھ بھی تو نہیں ہوا۔" شبیر آہیں بھر رہا تھا۔

احمد سر جھکائے بیٹھا گہری سوچ میں پڑا تھا۔

ڈرائینگ ماسٹر کہہ رہا تھا۔ "اب اس انکوائری کا نتیجہ کیا نکلے گا۔"

پوم پوم

عین اس وقت باہر سے پوم پوم کی آواز آئی اور پھر محمود ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

"چلو۔" وہ بولا۔ "جلدی کرو۔ جلدی۔ ابھی واپس آ جانا۔"

"کہاں جانا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہاں باہر تک۔ چلونا۔ یار۔ باہر کار کھڑی ہے۔" وہ بولا۔

"کار۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں ہاں۔" محمود بولا۔ "تم سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"اچھا۔" ایلی بولا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔

دروازے کے باہر میدان میں کار کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔" محمود بولا۔ "بھئی بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بڑی ضروری باتیں ہیں۔"

محمود نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا اور جونہی وہ کار میں داخل ہوئے گاڑی چل پڑی۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر ایلی چلایا۔ "ارے یہ تو میم ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا۔" محمود ہنسا۔ "تمہیں کیا کہتی ہے۔" اس نے زیرلب کہا۔

"لیکن تم تو کہتے تھے باتیں کریں گے۔"

"باتیں ہی تو کریں گے۔"

"اس کے ہوتے ہوئے۔" ایلی نے پوچھا۔

"باتیں کرنا جرم تو نہیں۔"

"لیکن یار۔" ایلی بولا۔

"میڈم یہ میرا دوست کہہ رہا ہے۔" محمود نے میم کو مخاطب کر کے کہا۔ "کہ آپ کی موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔"

وہ مڑ کر دیکھے بغیر پنجابی میں کہنے لگی۔ "ہام پنجابی نہیں سمجھتا۔"

"معاف کیجئے۔" محمود بولا۔ "ہمیں شک ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔"

"شکی مجاج اچھا نہیں ہوتا۔" وہ پنجابی میں بولی۔

"لیکن آپ تو پنجابی بول رہی ہیں۔" ایلی نے کہا۔

"پنجابی بولنا ہے سمجھتا نہیں۔" وہ بولی۔

ایلی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس نے محسوس کیا کہ کار میں تین بچے بیٹھے تھے۔ میم ڈیم کوئی نہ تھی۔ اس لئے وہ چلا چلا کر باتیں کرنے لگا۔

"میرا تار ملا تھا۔" محمود نے پوچھا۔

"کیسا تار؟" ایلی نے کہا۔

"جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں تیار رہنا۔" محمود نے کہا۔

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔"

"نہیں تو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تعجب کی بات ہے۔" اس نے کہا اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ ایلی کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ موٹر میں کوئی اور بھی موجود ہے یا موٹر مسلسل چلے جا رہی ہے۔

دوکانوں کو دیکھ کر دفعتاً ایلی کو خیال آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔

ذرا روکئے میں سگرٹ خرید لوں۔"

کار سے باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا۔ ارے۔" وہ چلایا۔ "یہ کونسی جگہ ہے؟"

غالباً" وہ سمجھ رہا تھا کہ کار جاورا کے چکر کاٹ رہی ہے۔

"کونسی جگہ ہے۔" محمود نے ہنس کر پوچھا۔

"یہ تو لاہور معلوم ہوتا ہے۔"

"اور کیا پشاور ہو۔" محمود نے کہا۔

"کیوں پریشان کر رہے ہو اپنے دوست کو۔" مسز فلپ نے کہا۔ "یہ تو جاورا کا بازار ہے۔"

لیکن میں واپس کیسے جاؤں گا۔" ایلی نے پوچھا۔

"رات کی گاڑی سے چلے جانا۔ صبح پہنچ جاؤ گے۔" محمود نے کہا۔

"یا بیماری کی عرضی دے دینا۔" مسز فلپ نے کہا۔ "آخر میڈیکل سارٹیفکیٹ کس مرض کی دوا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"یہ ٹھیک ہے۔" محمود چلایا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

"کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"نیا شہر۔" محمود نے جواب دیا۔

"لیکن تم تو لائل پور ہونا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ان نہوں۔" محمود بولا۔ "دفتر تبدیل ہو کر نیا شہر میں چلا گیا ہے۔"

"اب غصہ میں آنے کا کیا فائدہ۔" مسز فلپ نے کہا۔

"محترمہ۔" وہ بولا۔ "اس شخص نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔"

"کوئی نئی بات ہے۔" وہ مسکرائی۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تو چھوڑو۔" وہ بولی۔

اور موٹر پھر چل پڑی۔ رات لاہور رکنے کے بعد اگلے روز وہ تینوں نیا شہر جا پہنچے۔

مسز فلپ

مسز فلپ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ لیکن وہ یوں چلتی پھرتی اٹھتی تھی۔ جیسے ابھی ابھی جوان ہوئی ہو اور اسے اس انوکھی زندگی سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ والہانہ عشق تھا۔ وہ مسرت بھری حیرت سے ہر چیز کی طرف دیکھتی جیسے اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہو۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی اور پھر چاہتی کہ کسی اور کو دکھائے۔ اس تازہ مسرت میں کسی اور کو اپنا شریک بنائے۔ اس کے لئے زندگی سکون اور اطمینان نہیں بلکہ مسلسل حرکت مسلسل مسرت اور مسلسل تگ و دو تھی۔ غالباً" اسی وجہ سے وہ زندگی کی خوشیوں میں پندرہ افراد کو شریک کر چکی تھی اور اب مسٹر فلپ اس کا سولھواں خاوند تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر ذہانت اور چمک کی مالک تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس کے ہمراہ چلتے تو تھے لیکن بہت جلد تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ اکیلی ہے تنہا ہے۔ اس بات پر اسے غصہ آنے لگتا۔ اس وقت اس کی خواہش ہوتی کہ کوئی اس سے محبت کرے یا لڑے، بحث کرے ہاتھا پائی سے بھی گریز نہ کرے۔ اسے جمود سے نفرت تھی۔ سکون ایک بھیانک چیز دکھائی دیتی تھی۔ اسے ہر بات گوارا تھی۔ سکون سے نکال کر پھر سے متحرک کر دے چاہے وہ حرکت کس قدر شدید اور خطرناک کیوں نہ ہو بلکہ ہو تو اور بھی اچھا۔ مسز فلپ کے لئے واحد خطرہ سکون تھا۔

اس کا نیا خاوند مسٹر فلپ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن خوبصورت کے علاوہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔ جو مسٹر فلپ کی شخصیت کو جذب کر سکتی۔ درحقیقت مسز فلپ سے شادی کرنے سے مسٹر فلپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

مسٹر فلپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ تنخواہ میں گزارہ ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ حاجت مند رہتا۔ یہ حاجت مندی مسز فلپ کی اپنے خاوند سے دلچسپی میں گویا سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔ تنخواہ ملتے ہی مسز فلپ ایک معقول رقم بذریعہ تار مسٹر فلپ کو منی آرڈر کر دیتی۔ پھر مسز فلپ کے خطوں کا ایک تانتا بندھ جاتا۔ "فلپ ڈارلنگ تمہیں مزید روپے کی ضرورت ہو تو مجھے لکھو فوراً اطلاع دو۔ نہیں ڈارلنگ گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ اگر بورے والا میں اعلیٰ سگریٹ دستیاب نہ ہوتے ہوں تو مجھے لکھو تاکہ میں نیا شہر سے پیٹی بھیج دوں۔

مسز فلپ میں مامتا کا ایک طوفان دبا پڑا تھا۔ چونکہ سولہ شادیوں کے باوجود اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور وہ مسٹر فلپ کا یوں خیال رکھتی تھی۔ جیسے اس کا اکلوتا بیٹا ہو۔ مسز فلپ اس کی اس کمزوری سے واقف تھا اور دل کھول کر اس کے مامتا بھرے جذبات کو حرکت میں لانے اور ان میں شدت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کیا کرتا تھا۔ دقت یہ تھی کہ وہ بہت دور دراز مقام پر نوکری کرتا تھا اور مسز فلپ کو خالی خطوط پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ شاید اسے خاوند کی جسمانی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو مگر مسلسل تنہائی اسے کھائے جا رہی تھی۔

جب کبھی مسز فلپ کو اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ کوئی ایسا ساتھی ہو جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکے۔ یہ کیا زندگی ہوئی کہ لڑنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ پیار کرنے والا نہیں نہ سہی۔ لڑنے والا بھی ہو تو۔ اس وقت وہ بغیر وجہ اپنے ماتحتوں سے لڑنے کی شدت سے کوشش کرتی مگر اس کے ماتحت نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ جواب میں سر جھکا کر اس کے روبرو کھڑے ہو جاتے۔ "یس میڈم ساری میڈم۔" اس بات پر میڈم کو اور غصہ آتا اور آنکھیں دکھاتی منہ بناتی اور فر فر انگریزی بولتی جسے سن کر ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو جاتے اس پر مسز فلپ مایوس ہو کر کمرے میں جا کر رو دیتی لڑائی سے دل کی بھڑاس نہ نکلتی تو مسٹر فلپ کو ایک لمبا خط لکھنا شروع کر دیتی۔

مسز فلپ کے دفتر والے سمجھتے تھے کہ میڈم کی بات سمجھ میں نہیں آتی کبھی ہنستی ہے ہنسے جاتی ہے کبھی بغیر وجہ گرجنا شروع کر دیتی ہے۔ خواہ مخواہ الجھتی ہے۔ منہ کو آتی ہے اور پھر بیٹھ

کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ نہ جانے کیسی افسر ہے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ ابھی معطل کر نے کی دھمکی دے رہی تھی اب چپڑاسی کے ہاتھ بادام بھیج دیئے کہ پشاور سے آئے ہیں تم بھی کھا لو۔

"محمود نے جب نئی آسامیوں کا اشتہار دیکھا تو تفریحاً" ایک عرضی دے دی تھی۔ اس وقت اسے علم نہ تھا کہ ویلفیئر کے محکمہ میں زیادہ تر کارکن عورتیں اور محکمہ کا چیف بھی عورت ہے۔ عورتوں کے متعلق محمود کا رویہ عجیب تھا۔ اگرچہ وہ عاشق قسم کا فرد نہ تھا پھر بھی اسے عورتوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایسی دلچسپی جو ایک نارمل مرد عورت سے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے عورت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ان سے گھبراتا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی شدید کوشش کرتا۔ یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ توجہ جذب کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا انہیں غیر معمول اہمیت دے رہا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ بے پروائی کا لبادہ اوڑھے رکھتا اور ماتھے پر یوں تیوری جما لیتا جیسے نسوانی سحر سے مستثنٰی ہو۔ پھر موقعہ ملنے پر ایک شدت بھری نگاہ ڈالتا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا۔ گلیبڈر آئی چمکاتا اور پھر تیوری چڑھا کر یوں منہ موڑ لیتا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔

میڈم اور محمود

جب وہ نیا نیا اس محکمے میں گیا تو عورتیں ہی عورتیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی محسوس کی۔ بہرحال اس نوکری میں سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اسے محکمہ کی چیف یعنی میڈم سے کام کرنا پڑتا تھا۔ میڈم کو دیکھتے ہی محمود نے تیوری چڑھائی اور یوں کام میں محو ہو گیا۔ جیسے اسے عورت اور مرد کی تمیز ہی نہ ہو۔ لیکن ویلفیئر کی کئی ایک کارکن بڑی بانکی تھیں۔ کئی ایک شوخ تھیں۔ ایسے حالات میں بھلا ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جب میڈم کی توجہ ادھر ہوتی تو وہ کارکن پر آنکھ چمکاتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

آنکھ چمکا کر دفعتاً" پھر سے پتھر ہو جانے کے فن میں محمود کا جواب نہیں تھا۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کارکنیں بالکل ہی نوجوان تھیں۔ وہ اس کی نگاہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پگھل کر موم ہو جاتیں اور موم سے چھینٹے اڑتے اور میڈم پر جا پڑتے۔ اس پر میڈم کو غصہ آ جاتا۔

میڈم کو اس بات پر غصہ آتا کہ ابھی یہ لڑکی مناسب طریقے سے باتیں کر رہی تھی اب منہ لگی لفظوں کو رولنے لگی۔ آنکھیں چمکانے لگی۔ رکنے لگی۔ گال تمتا گئے یہ کیا گڑبڑ ہے۔ سمجھنے لگی کہ لڑکیاں محمود کے روبرو آ کر دھک جاتی ہیں۔ اسے پتہ نہ تھا کہ محمود اپنے ماتھے کی شکن اتار سکتا ہے۔ دو ایک بار میڈم نے اعلانیہ محمود سے اس تبدیلی کی بات کر دی جو اس کی موجودگی میں لڑکیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر محمود گھبرا گیا اور اسے غصہ آ گیا اور اس کا رویہ میڈم سے اور بھی سخت ہو گیا۔

ایک روز جب میڈم نے کہا۔ "تم نے دیکھا کلرک جب اس لڑکی نے تمہیں دیکھا تو اس کے ہاتھ میں پن شیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ خط بدل گیا۔"

میڈم کی ایسی بات پر محمود کو غصہ آتا تھا۔ "تو پھر تمہیں کیا۔" وہ دل میں کہا کرتا۔ اس روز اسے بہت ہی غصہ آیا۔

وہ ابھی غصے میں بھرا بیٹھا تھا کہ مالی پھول لے آیا۔ میڈم نے پھول دیکھ کر گویا خوشی سے چیخ ہی۔ "یہ دیکھا تم نے کلرک۔" وہ چلائی "کتنے خوبصورت پھول ہیں یہ دیکھو تو۔"

محمود نے منہ موڑ لیا۔ "نہیں میں نہیں دیکھتا۔" اس کے منہ سے نکل گیا۔

میڈم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

کسی ماتحت نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید اسے غلطی لگی ہو۔ شاید کلرک نے غلطی سے نہ کر دی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ادنیٰ ماتحت مجھ سے لڑنے کی کوشش کرے۔

"تمہیں دیکھنا پڑے گا۔" وہ شدید جوش میں بولی۔

"یہ میرے فرائض میں سے نہیں ہے۔" محمود نے گھور کر میڈم کی طرف دیکھا۔

میڈم کا منہ سرخ ہو گیا۔ شاید خوشی سے پھر وہ غصے میں چلانے لگی۔ یا شاید لڑائی کے اس نئے امکان پر خوشی سے چیخ رہی ہو۔

"یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ نہیں ہے کلرک۔" وہ بولی۔

"میڈم یاد رکھئے کہ میرا نام کلرک نہیں محمود ہے۔" محمود نے کہا اور پھر خراماں خراماں چل پڑا۔ جیسے شاہ کا پارٹ ادا کرنے کے بعد ایکٹر بڑے رعب سے سٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔

میڈم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اگلے روز جب محمود دفتر آیا تو وہ جان بوجھ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ ورنہ عام طور پر اس

کا دستور تھا کہ آتے ہی پہلے میڈم سے ملتا کام کاج کے متعلق پوچھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

کچھ دیر کے بعد مالی آیا۔ "میم صاحب بلاتی ہیں۔"

"اچھا محمود نے کہا۔ "کام سے فرصت ہو گی تو آؤں گا۔"

مالی کو گئے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ میڈم خود آ گئی۔ وہ بولی۔" مجھے پھول نہیں دکھانے بلکہ خط کا جواب لکھوانا ہے۔"

"ہوں"محمود نے سر ہلایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

اس روز میڈم بے حد خوش تھی وہ بار بار محمود کے کمرے میں آتی اور اسے کوئی نہ کوئی بات سمجھا کر یا بتا کر چلی جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر لوٹ آتی۔ محمود کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ کیوں بدلا ہوا ہے۔ اس نے کلرک کی جگہ مسٹر محمود کہہ کر اسے پکارنا کیوں شروع کر دیا ہے۔

شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ میڈم اس کی امداد کے بغیر کام نہیں چلا سکتی تھی۔ چونکہ دفتر کے دوسرے کلرک قابلیت اور ذہانت سے خالی تھے اور روز مرہ کے معمولی کام کے علاوہ کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ محمود کو اپنی قابلیت پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد مزید مشکلات کا باعث تھا۔

ایک روز میڈم محمود کا لکھا ہوا خط پڑھ کر بولی۔" ٹھیک ہے لیکن متاثر کے لفظ کے ہجے ٹھیک کر لو۔"

"ہوں۔" محمود بولا اور اس نے میڈم کے سامنے وہ خط لفافے میں بند کر کے ڈسپیچر کو دے دیا۔ "اسے ابھی ڈسپیچ کر دو۔" وہ بولا۔

"لیکن میں کہہ رہی تھی متاثر کے ہجے ٹھیک کر کے بھیجو۔"

محمود بڑے اطمینان سے خط کی نقل اٹھائی پھر آکسفورڈ ڈکشنری لے کر وہ نقل اور ڈکشنری میڈم کی طرف بڑھا دی۔

اس بات پر میڈم سیخ پا ہو گئی ۔ "میں نے کہا تھا کہ تم ہجے دیکھ لو۔"

"میں تو وثوق سے جانتا ہوں کہ ہجے ٹھیک ہیں۔" محمود بولا میڈم اپنی تسلی کر لیں۔

محمود کے اس کے اس قسم کے طرز عمل سے میڈم چونکی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک مرد سے بات کر رہی ہے کلرک سے نہیں۔ غالباً" اسے اپنا خاوند یاد آ جاتا اور پھر شاید اس خیال

کہ کلرک کو مردوں کا سا برتاؤ کرنے کا حق ہے یا شاید اس لئے کہ اس کا خاوند اتنی دور کیوں رہتا ہے وہ غصے سے بھوت بن جاتی۔ بہر صورت میڈم اور محمود کے درمیان عجیب چپقلش شروع ہو گئی۔ غالباً" محمود کی خواہش تھی کہ کسی وجہ سے میڈم ناراض ہو کر اسے واپس اپنے محکمے میں بھیج دے۔ اس لئے اس نے جان بوجھ کر میڈم کی باتوں کو رد کرنا شروع کر دیا اسے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ ایسی باتیں کر کے وہ میڈم کو احساس دلا رہا ہے کہ وہ کلرک نہیں مرد ہے اور میڈم چیف کے علاوہ عورت بھی ہے۔

اس کے بعد محمود نے مسز فلپ کے نجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کے معاملات میں دلچسپی لے اس سے جھگڑے مشورے دے تا کہ اسے ایک ساتھی کی موجودگی کا احساس ہو

اگرچہ مسز فلپ تنخواہ ملتے ہی ایک معقول رقم مسٹر فلپ کو بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن جلد ہی فلپ کی زیادتی کا تذکرہ ہوتا اور عام ضروریات مثلاً" سگریٹ وسکی کافی کی کمی کی شکایت ہوتی۔ مسز فلپ پھر کچھ روپیہ بھیج دیتی۔ لیکن جلد ہی پھر ایسا ہی خط موصول ہوتا۔ پھر روپیہ بھیجنے کے علاوہ صبح شام مسٹر فلپ کی پریشانیوں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس نے کبھی ان مطالبات کا برا نہ مانا تھا۔ بلکہ اکثر وہ اس قدر روپیہ ارسال کر دیتی کہ خود اپنی ضروریات میں تخفیف کرنی پڑتی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسے خود کھانے پینے کے لئے قرض لینا پڑتا تھا۔

سترھواں لے پالک

ایک روز جب وہ مسٹر لے پالک کو دوسری قسط ارسال کر رہی تھی تو محمود نے کہا۔

"میڈم یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ نقد روپیہ بھیج دیتی ہیں اور مسٹر فلپ اسے ادھر ادھر خرچ کر دیتے ہیں اور سگرٹ اس کی تمام ضروریات وسکی کی پوری ہوئے بغیر رہ جاتی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" میڈم چلائی۔

سیدھی بات ہے۔" محمود بالا۔ "روپیہ کی جگہ سگرٹ وسکی چائے کافی وغیرہ بھیجئے تا کہ ضروریات پوری ہو جائیں۔

"سچ"۔ وہ چلائی اور بچوں کی طرح خوشی سے تالیاں پیٹنے لگی۔ "یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں۔"

"جبھی تو سمجھا رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔

"سچ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تمہارے بغیر —— " وہ دفعتاً رک گئی۔ اس روز غالباً پہلی مرتبہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے اس نے خود کو روک لیا۔ محمود پھر بھی بات کو پا نہ سکا اور مسز فلپ اس حقیقت کو واضح طور پر پانے کے بعد شدت سے اسے نظر انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش میں کھو گئی۔ جب ایلی ان کے ساتھ نیا شہر پہنچا تو ان دونوں کی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ وہ پا نہ سکا تھا وہ پا چکی تھی۔ لیکن نظر انداز کرنے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھی ادھر مسٹر فلپ نقد روپیہ کی جگہ اشیا کی پیٹی موصول کر کے حیران رہ گیا تھا۔ ایسی بات تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیاری بیوی تو ہمیشہ اسے نقد روپیہ بھیجا کرتی تھی اور منی آرڈر سے نہیں بلکہ تار کے ذریعے اور آج غیر از معمول سگرٹ کے ڈبوں اور وسکی کی بوتلوں کی پیٹی اس کے روبرو پڑی تھی۔ خیر اشیا تو کچھ بری نہ تھیں لیکن وہ اس افراط سے بھیجی گئی تھی کہ مہینہ بھر مطالبہ کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اور نقد روپیہ وصول کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔

یہ دیکھ کر وہ چڑ گیا۔ نہ جانے میری بیوی کو کون ایسے گر بتا رہا ہے۔ ورنہ وہ تو صرف محسوس کرنا جانتی ہے۔ سوچنا نہیں۔

مسٹر فلپ نے اس بھید کو جاننے کے لئے اپنے ذرائع استعمال کرنے شروع کر دیئے اور غالباً گھر کے کسی نوکر نے مسٹر فلپ کو صورت حالات سے واقف کر دیا۔

ایلی کے نیا شہر پہنچنے پر میڈیم کو یاد آیا کہ ویلفیئر کے طالب علموں کے پرچے جو اس کے پاس دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے —— انہیں چیک کر کے واپس کرنے کی تاریخ سر پر آن پہنچی تھی۔ اس لئے اس نے محمود کو بلایا اور اس نئی مشکل کا تذکرہ کیا۔

محمود نے کہا۔ "میڈم اس میں کیا مشکل ہے۔ اگر ہم چار شخص بیٹھ جائیں تو ایک رات میں بارہ سو پرچے ختم کر دیں گے۔ میں ہوں ایلی ہے۔ آپ ہیں اس کے علاوہ آپ کی ڈپٹی ناظمہ ہے۔"

میڈم کو یہ تجویز پسند آئی اور ایک رات وہ چاروں میڈیم کی کوٹھی کے بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ تاکہ پرچے دیکھ کر صبح سویرے انہیں واپس بھجوا دیں اور اس اہم فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

ادھر مسٹر فلپ کو جب معلوم ہوا کہ میڈیم کا ایک کلرک اسے ایسے ویسے مشورے دے رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس مصیبت کو کسی طرح شروع شروع میں ہی ٹالنا چاہیے ورنہ اگر مسز فلپ

... پر چل نکلی۔ تو پھر اس کا زاویہ نگاہ بدلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے صورت حالات کو ... کے لئے اس نے آٹھ یوم کی رخصت لی۔ اور اطلاع دیئے بغیر نئے شہر آ گیا۔ دن بھر وہ ... ویٹنگ روم میں بیٹھا رہا۔ جب رات پڑی تو چھپ کر گھر آیا۔ آ کر اس نوکر سے ملا جس ... اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ نوکر ہنس کر بولا۔ "صاحب وہ تو اس وقت بھی اندر کمرے میں بیٹھے ... دو مرد ہیں ایک عورت ہے اور میڈم ہے۔"

یہ سن کر مسٹر فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سب نوکروں کو اکٹھا کیا۔ ایک ... مرتب کیا۔ جس کے مطابق ایک نوکر نے بجلی کا مین سوئچ بند کر دیا اور باقی سب نے اس ... پر یلغار بول دی جس میں ایلی محمود میڈم اور ناظمہ پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔

بجلی بند ہوتے ہی کمرے میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ محمود نے ایک چنگھاڑ سی ماری۔ میڈم ... نے لگی۔ ناظمہ چیخ رہی تھی۔ ایلی حیران تھا کہ ماجرہ کیا ہے ایک جوتا اس کے سر پر پڑا۔ ارے ... تو بیٹھا۔

کمرے میں سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ڈر گیا۔

کمرے کی ایک کھڑکی مکمل کھلی تھی۔ محمود نے باہر چھلانگ لگا دی اور پھر چیخنے لگا۔ "ایلی ..."

محمود کی آواز سن کر ایلی کا دل بیٹھ گیا اس نے خطرے کو شدت سے محسوس کیا اور وہ کھڑکی کی طرف بھاگا۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ محمود اور ایلی چپ چاپ ویران گلی میں دوڑ رہے تھے۔

"لیکن بات کیا تھی۔" ایلی پوچھ رہا تھا۔

"خاموش۔" محمود کا رویہ اسے اور بھی ڈرا رہا تھا۔

اپنے مکان کے قریب پہنچ کر محمود رک گیا۔ بولا۔ "گھر جانے میں خطرہ ہے۔"

"لیکن کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"شاید وہ پولیس لے کر ہمارے گھر آئیں۔"

"لیکن کون۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہی۔" محمود بولا۔ "جو وہاں میڈم کے گھر آئے تھے۔"

"وہ تھے کون؟" ایلی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں ـــــ لیکن مجھے خطرے کی بو آتی ہے۔ دشمن وار کرنے سے نہیں چوکے گا۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہمیں گھر نہیں جانا چاہیئے۔"

"لیکن اس وقت گلیوں میں آوار گردی کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ چلایا۔ "چلو ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں جا بیٹھیں۔"

صبح سویرے ہی محمود نے ایلی کو کہنی ماری۔ "اب دن چڑھنے کو ہے۔" وہ بولا۔ "اب یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"تو پھر جائیں کہاں۔"

"باہر دور۔ کسی ویرانے میں۔" محمود بولا۔ "جب تک ہمیں صورت حال کا علم نہ ہو ہمارا پایا جانا ٹھیک نہیں۔" وہ دونوں نیا شہر کی مشہور ندی کرن کی طرف چل پڑے اور ٹیلوں میں جا چھپے۔

ادھر میڈم کو جب معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس کے خاوند نے کی تھی اور اسے شک تھا کہ میڈم اور محمود کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں تو وہ ضد میں آگئی اور ایک جملے سے اس نے اپنے شوہر کو خاموش کر دیا "ناجائز تعلقات کو جائز بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مسٹر فلپ مجھے روکنے والے تم کون ہو۔"

پھر مسٹر فلپ اس کے قدموں میں گر کر رو رہا تھا۔ اظہار محبت کر رہا تھا اور میڈم یوں پتھر بنی بیٹھی تھی جیسے وہ ماں جو ـــــ اپنا اکلوتا بیٹا سپرد خاک کرنے کے بعد قبرستان سے لوٹی ہو۔ غالباً وہ اپنے سترہواں لے پالک کے متعلق سوچ رہی تھی اور اس کا سترہواں لے پالک اس موہوم خطرے سے بے خبر سہا ہوا بیٹھا تھا۔

پہلی ٹھوکر

ایلی واپس جاورا پہنچا تو سکول پر سکوت طاری تھا۔ اساتذہ اداس تھے اور ایلی کے ساتھی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ مسعود اور وہ خود تبدیل کر دیئے ہیں اور جاورا کے تمام اساتذہ کو وارننگ کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ جس میں مسٹر معروف نے

بتایا ہے کہ اگر جاورا اسکول میں مزید کسی قسم کی گڑبڑ ہوئی تو زبردست ایکشن لیا جائے گا۔

جب وہ گھر پہنچا تو افضل خاموش بیٹھا تھا۔ "تم آ گئے۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"کہاں رہے اتنے دن۔"

"پھنس گیا۔"

"ہوں۔" وہ خاموش بیٹھا حسب عادت پاؤں ہلاتا رہا۔

"ایلی۔" وہ بولا۔

"جی۔"

"تمہیں معلوم ہوا۔"

"کیا؟"

"تمہاری تبدیلی ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔"

"تو تم جاؤ گے؟۔"

"جانا ہی پڑے گا۔"

"ہوں ـــــ تم چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گا۔" افضل کی آواز کانپ رہی تھی۔

"اگر ہمیں معلوم ہوتا۔" شبیر بولا۔ "تو یہ کام ہی نہ کرتے۔"

"پتہ ہے۔" احمد نے کہا "شیخ کی ترقی رک گئی ہے۔"

"اس سے ہمیں کیا فائدہ۔" افضل نے کہا۔ "پتہ ہے مولوی کا کیا حشر ہوا۔"

"کیا؟" شبیر نے پوچھا۔

"پاگل خانے میں ہے۔"

"کیا واقعی۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک آدمی خود مل کر آیا ہے اسے ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ہماری محنت بالکل اکارت گئی۔ مولوی کو بچا سکے نہ شیخ کو توڑ سکے پتہ ہے مسٹر معروف نے کیا کہا تھا۔" شبیر نے پوچھا۔

"کب۔"

"تمہارے جانے کے بعد ایک دن پھر آئے تھے۔" شبیر بولا۔ "سب اساتذہ کو اکٹھا کر کے

وعظ فرمایا تھا۔"

"کیا کہا تھا۔"

"کہنے لگے۔ سب ہیڈ ماسٹر ایسے ہی ملیں گے۔ تم خود ہیڈ ماسٹر بنو گے تو ایسے ہی ہو جاؤ گے۔"

"سچ کہتا ہے۔" افضل بولا۔

"اللہ بچائے۔" ایلی نے کہا۔

اور وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔

دروازہ بجا تو وہ چونکے۔

"میں اندر آ سکتا ہوں۔" کسی نے باہر سے پکارا۔

"آ جاؤ میاں۔" افضل بولا۔ "یہاں۔"

کسی نے نووارد کی طرف نہ دیکھا۔

"یہ شیخ مسعود بڑا حرامی ہے۔" افضل بولا۔ "اس کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکے۔"

"یہ تو غلط ہے۔" نووارد نے کہا۔

"انہوں نے نووارد کی طرف دیکھا۔ سامنے خود شیخ مسعود کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم نے میری وہ پٹائی کی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "جو آج تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ میں تمہاری عظمت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔"

"نہیں شیخ صاحب۔" افضل نے کہا۔ "جو تم نے مولوی کے ساتھ کیا ہم اس کا انتقام نہیں لے سکے۔"

"اچھا تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ آخر آصفی کا میرے خلاف ہو جانا کس وجہ سے ہے میں نے آج تک آصفی کے خلاف کچھ نہیں کیا الٹا مجھے آصفی سے اک لگاؤ سا ہے۔ کیوں آصفی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے۔" "سچ ہے۔" ایلی بولا۔

"ہاں۔" شیخ نے سر جھکا لیا۔ "مولوی سے مذاق میں زیادتی ہو گئی۔"

"بہر حال میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔
آج سے تم میرے دوست ہو۔ ہمیشہ ہی تھے۔ میرے دل میں تمہارے خلاف غصہ بہت

لیکن اس کے ساتھ میں تمہاری قابلیت کا بھی معترف ہوں۔" شیخ کی آواز جذبے سے کانپ
تھی اس کی آنکھیں نم ناک تھیں۔

"ہیں حرامی ہی سہی لیکن ایسے آدمی کی دوستی اچھی ہوتی ہے۔" ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہنے
"زندگی میں میری یہ پہلی ٹھوکر ہے۔"

"ٹھوکر تو لگی ہی نہیں۔" افضل مسکرا کر بولا۔

"لگی ہے۔" شیخ نے جواب دیا۔

"صرف ترقی ہی بند ہوئی ہے نا۔" افضل نے کہا۔

"ٹھوکر دل پر لگتی ہے تنخواہ پر نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

ہڑاگن

چادورا چھوڑنے کے بعد ایلی کا دل پھر سے اچاٹ ہو گیا۔ محبت کے متعلق اس کے احساسات
تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دوسرے پہلو کی تلخی کا احساس ہوا تھا۔
ری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی میں انصاف کو دخل نہیں۔ کیا اللہ میاں
اسٹر معروف کی طرح خالی ایڈمنسٹریشن کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھی ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔

سکول کی فضا سے وہ بے زار ہو چکا تھا۔ یہ ادارے جہاں ملک کی آئندہ نسلوں کی تشکیل ہو
ی تھی۔ اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کی عجیب و غریب ذہنیتوں کی وجہ سے تعفن سے بھرے ہوئے
اساتذہ کے انداز میں خود پرستی جابریت اور جھوٹے وقار کی جھلک تھی اور ان پر بے حسی کا
ف لگا ہوا تھا۔ ان کے خیالات میں وسعت کا فقدان تھا۔ گھریلو معاملات کے الجھاؤ کا عکس ان
ذہنیتوں میں جھلکتا تھا۔ وہ علم کی ظاہری شکل پر مرکوز تھے۔ مفہوم ان کی نگاہ سے اوجھل
ایلی کی نگاہ میں وہ سب کیڑے تھے۔ رینگنے والے کیڑے' سینٹرل ماڈل سکول کے کلاس
موں کی طرح وہ چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ چھڑی ہاتھ میں ہو تو
مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔

اور ایلی کو سب سے بڑا ڈر تھا کہ ایک روز وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ وہ بھی خلاصوں میں
ھی تلمیحوں کو علم سمجھنے لگے گا۔ بچوں کے ذہن پر آہنی پابندیاں ڈالنے کو اخلاق سے تعبیر
ے گا اور پھر وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا ــــــ اس خیال پر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

جاورا کی سازش سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اس کے ذہن سے شہزاد کی بے وفائی کی تلخی دور ہو چکی تھی۔ اگرچہ کانٹا ویسے ہی لگا تھا لیکن اب وہ درد میٹھے درد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ شہزاد کی بے وفائی نے ایلی کے جذبے کو کم نہیں کیا تھا الٹا اسے قائم کر دیا تھا۔ تقویت بخش دی تھی۔ طبعی طور پر ایلی بے وفا محبوب سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت فرحت بخش جذبہ نہ تھا۔ بلکہ فرحت بخش جذبات تو اس کی نگاہ میں عیش پرستی کے مظہر تھے اور محبوب پر شک و شبہ کرنے کی عادت جو اس نے پال رکھی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اگر محبوب بے وفائی نہ کرے تو اس کی محبوبیت کی حیثیت قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اس پر موہوم بے وفائی تھوپ دی جائے اور خیالی رقیب قائم کر کے محبت کے جذبہ کو حقیقی بنا لیا جائے۔

جب سے وہ شہزاد کے گھر سے نکلا تھا۔ ایلی کے ذہن میں شہزاد کی محبوبیت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ اب وہ بے وفا حسینہ ایلی کے تخیل میں رقیب سے ہنستی کھیلتی نظر آتی تھی اور ایلی کی طرف دیکھ کر نفرت بھرا قہقہہ لگاتی "تم۔" اس کے ہونٹ تحقیر سے بڑا سا بن جاتے اور اس کا قہقہہ گونجتا۔ اس پر ایلی محسوس کرتا کہ واقعی اسے شہزاد سے محبت ہے اور اس کی محبت کو عیش پرستی سے دور کا واسطہ بھی نہیں

اب وہ ایک سچے عاشق کی طرح اس امید پر جی رہا تھا کہ ایک روز شہزاد کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ محسوس کرے گی کہ واقعی ایلی اس کا سچا عاشق تھا اور رقیب تو صرف مطلب پرستی کے لئے اس کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ پھر وہ عفو کی طلب گار ہو گی اور آ کر اس کے قدموں پر گر پڑے گی۔ مگر وہ سوچتا۔ میں اسے قدموں میں گرنے نہیں دوں گا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا لیکن میں اسے ذلیل نہ ہونے دوں گا۔ قدموں پر گرنا تو میرا کام ہے۔ میں قدموں پر گر پڑوں گا اور اس کا ہاتھ بڑھ کر مجھے تھپکے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی اور وہ رک رک کر کہے گی۔ مجھے معاف کر دو ایلی مجھے معلوم نہ تھا اس وقت میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا اور پھر ——— "

لیکن پھر کا کیا سوال۔ جس مقصد کے لئے وہ جی رہا ہے۔ وہ تو پورا ہو چکا ہو گا۔ پھر اس کا زندہ رہنے کا بھلا کیا فائدہ۔ پھر اس کے قدموں میں پڑے پڑے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی اور یہ دیکھ کر شہزاد کی چیخیں نکل جائیں گی اور وہ بیراگن ہو جائے گی اور گلی گلی

دوارے پر گاتی پھرے گی۔

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

ساوی کے نقوش ایلی کے دل سے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غالباً" اس لئے کہ اس کا چہرہ مجسم دکھائی دیتا۔ اس کا جذبہ ہمیشہ جواں نظر آتا۔ اس کا خیال ہمیشہ ایلی کے دل میں زندگی رنگینی کا تصور پیش کرتا۔ ساوی کے خیال کے ساتھ آتش رقابت کی جلن محسوس نہ ہوتی اسے ساوی کی محبت پر کبھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی رقیب کے وجود کے متعلق نہ سوچا تھا۔ کوئی خیالی رقیب پیدا نہ کیا تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہ محسوس کی ساوی کا خیال ایلی کے لئے زندگی اور رنگینی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا اگر وہ ساوی سے منسلک ہو جاتا۔ اگر رکاوٹیں نہ ہوتیں، اگر ابا یوں قطعی طور پر انکار نہ کرتے اگر ان کے انکار کے باوجود وہ آگے قدم بڑھا سکتا۔ اگر ساوی یہ اعلان نہ کرتی کہ وہ اس سلسلے میں مجبور ہے۔ اگر اس کے انداز میں قطعیت نہ ہوتی۔ اگر وہ اتنی دور گرد کل ریاست کو مراجعت نہ کر جاتی۔ ایسی ریاست جس کا وجود ایلی کے لئے اس قدر موہوم تھا۔ جیسے وہ الف لیلیٰ کا شہر ہو۔ تو ایلی ساوی سے شادی کر کے کتنی اچھی زندگی بسر کر سکتا۔ لیکن شاید یہ خیال اسے صرف اس لئے آتا تھا کہ وہ ساوی سے شادی کر کے شہزاد سے انتقام لے سکتا تھا۔

جاورا سے تبدیل ہو کر جب وہ چک بالا پہنچا تو چند ہی دنوں کے بعد اسے جمیل کا ایک تار ملا۔ جس میں لکھا تھا گرد کل ریاست سے ایک خط موصول ہوا ہے یہاں آؤ تو ملے گا۔

ہملو اور چنگاری

جب وہ خان پور پہنچا تو علی احمد پنجے جھاڑ کر اس پر جھپٹ پڑے۔

"بھئی ایلی نے تو حد کر دی۔" وہ بولے۔ "مسٹر معروف کہہ رہے تھے کہ انکوائری میں وہ ہملا کیں آپ کے فرزند نے کہ کیا بتاؤں اس کو تو وکیل ہونا چاہئے تھا۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے "مسٹر معروف نے ایلی کی بڑی تعریف کی اور نصیر کی ماں پتہ ہے کیا کہنے لگے۔ آخر کیوں نہ ہو کس باپ کا بیٹا ہے۔ ہی ہی ہی۔ ساری تان مجھ پر توڑ دی۔ لیکن ایک بات ہے نصیر کی ماں لگتے تھے دستور کے مطابق ایلی کو سسپنڈ کر دینا چاہئے تھا۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔" راجو نے پوچھا۔

"ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوکری سے چھٹی۔"

"ہے۔" وہ چلائی۔

"ہاں۔" علی احمد بولے "لیکن ہمارا بیٹا ہے نا۔ سمجھی۔ کیا سمجھی؟"

ایلی کو اس پر غصہ آگیا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی وجہ سے میں نوکری پر قائم ہوں۔" ایلی نے دبی زبان سے کہا۔

"بالکل۔" وہ بولے۔ "ورنہ ایک دن بھی نوکری نہیں کر سکتے تم۔" علی احمد جلال میں آ گئے۔

"یعنی مجھ میں ذاتی طور پر قابلیت نہیں کہ نوکری پر فائز رہ سکوں۔"

"لو۔" راجو بولی۔ "ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ معروف ایلی کی تعریف کر رہے تھے۔"

"ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "تمہیں کیا پتہ۔ قابلیت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قابلیت جو ایلی میں ہے۔ نوکر شاہی کی قابلیت نہیں۔ یہ تو اپنے ہی پر چلانے کی قابلیت ہے۔ نہ یہ تیل دیکھ سکتا ہے۔ نہ تیل کی دھار یہ تو پٹرول میں چلتی ماچس پھینک سکتا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگے۔

پھر انھوں نے ایلی کو نصیحت کرنا شروع کر دیں۔

"دیکھو ایلی۔ نوکری میں ہمیشہ اپنے امی جیٹ افسر کا ساتھ دینا چاہیے۔ سمجھے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا غلطی کر رہا ہو یا ظلم۔ تمہیں اس سے کیا اور یاد رکھو تم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ کیسے کرے گا کیا اسے معلوم نہیں کہ تم کس کے بیٹے ہو اور ہمارے معروف سے کتنے تعلقات ہیں۔ یہ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہر بات کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھو نا اگر اپنے افسر کے خلاف کوئی کاروائی کرنی ہو تو۔" وہ بولے۔ "تو خود کچھ نہیں کیا کرتے بلکہ دوسروں کو اکسا دیا۔ دیکھا ہے نا تم نے نصیر کی ماں تم سے کیا چھپا ہے ہی ہی ہی۔ ذرا ایلی کو سمجھا دو یہ گر بڑا آرام دہ رہتا ہے۔"

ابا کی باتوں سے اکتا کر ایلی جمیل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں نقی کے مکان پر رک گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

"نقی صاحب کہاں ہیں؟" اس نے نوکر سے پوچھا۔

"جی وہ تو شکار پر گئے ہیں۔" نوکر نے کہا۔

"شکار پر؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"کسی خاص تقریب پر گئے ہیں کیا؟"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "وہ تو اکثر شکار پر جاتے ہیں۔"

"ارے۔ وہ تو جوتے سیا کرتے تھے۔"

"جی بابو جی۔" نوکر ہنسا۔ "پہلے جوتے سیا کرتے تھے آج کل شکار کھیلتے ہیں۔"

"ارے۔" ایلی ہنس پڑا۔ "پہلے چڑیاں کاڑھتے تھے۔ پھر جوتے سینے لگے اور اب شکار!۔"

مالٹا مٹھا

ایلی کو دیکھ کر جمیل کی باچھیں کھل گئیں۔

"یار تم آ گئے۔" وہ بولا۔ "بڑا اچھا کیا تم نے دو چار روز رونق رہے گی۔ مزا آ جائے گا۔"

"اور وہ خط؟ کیا صرف مجھے بلانے کا بہانہ تھا؟" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ بولا۔ "تمہاری قسم۔ تم سے جھوٹ نہیں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولا۔ آج تک کوئی چالاکی نہیں کی۔"

ایلی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "پیئے ہوئے ہو کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی واہ۔" وہ ہنسا۔ "یہ کیا چھپانے کی بات ہے۔ بڑی بہادری کی تم نے کہ بوجھ لیا۔ اے بھائی جب خاموشی سے تمہاری بات سنوں تو سمجھ لو کہ خالی ہوں اور جب بات کروں تو سمجھ لو کہ قائم ہوں۔"

"نشہ وشہ نہیں ہوتا اونہوں۔ زبان سے رنگ اتر جاتا ہے۔ بس اتنا صرف اتنا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"تم سمجھتے ہو۔" جمیل بولا کہ صرف تمہیں ہی سوجھتی ہیں۔ یہ غلط ہے شاید مجھے تم سے بھی زیادہ سوجھتی ہیں تم سے بھی زیادہ انوکھی۔ لیکن جب تک مالٹا مٹھا کا ادھیا اندر نہ ہو زبان لگک رہتی ہے۔ سال کو وہ زنگ لگا ہوا ہے کہ اترتا نہیں۔ تم پی کر آپے میں نہیں رہتے میں پی کر اپنے آپ میں آ جاتا ہوں۔ بس اتنا فرق ہے۔"

"بکو نہیں۔" ایلی بولا۔

"لو۔" جمیل چلایا۔ "ہم بات کریں تو بکو نہیں۔ بھئی واہ اور تم خود باتیں کرو تو PURE WISDOM تمہاری بات عقل کا نچوڑ ہماری بکواس اچھا انصاف ہے۔"

"اچھا وہ خط نکالو۔" ایلی نے کہا۔

"خدا کی قسم۔" جمیل بولا۔ کیا خط ہے۔ واہ واہ اگر مجھے کوئی ایک محبت بھرا خط لکھ دیتی تو کبھی بوتل کا محتاج نہ ہوتا عمر بھر لیکن کسی حرام زادی نے نہیں لکھا اور نتیجہ یہ ہے۔ جب تک اندر مالٹا مٹھانہ جائے بات نہیں بنتی۔"

"تمہاری بیوی نہیں منع کرتی تمہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"پہلے پہل جب نئی نئی آئی تھی تو کیا کرتی تھی۔ اب نہیں خدا کی قسم اب تو اکساتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کبھی توبہ کرلوں تو مصیبت پڑ جاتی ہے اسے پھر وہ بہانے بہانے مجھے اکساتی ہے کہ توبہ توڑ دوں۔"

"لیکن کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگا۔ "اسے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ناؤ پانی بغیر نہیں چلے گی۔"

"تمہاری ناؤ واقعی اس پانی کے بغیر نہیں چلتی۔" ایلی نے کہا۔

"اونہوں۔" جمیل ہنسنے لگا۔ "میری ناؤ کو کون پوچھتا ہے چاہے چلے نہ چلے۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی اس کی ناؤ نہیں چلتی عجب چکر ہے نا۔ مالٹا مٹھا میں پیوں اور ناؤ اس کی چلے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

"لیکن وہ خط تو دکھاؤ۔" ایلی نے کہا۔

"وہ خط دکھانے والا نہیں۔" جمیل بولا۔ "تعویز بنا کر گلے میں ڈالنے کی قابل ہے۔ میں نے ایسا خط کبھی نہیں دیکھا۔ تم بڑے خوش قسمت ہو خدا کی قسم بڑے خوش قسمت ہو اگر مجھ سے کوئی اس کا دسواں حصہ پیار کرتا تو میں نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا کی قسم اور پھر وہ تو عالم بے عالم اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پائے کا عالم ہونے کے باوجود اس میں لڑکی بے حد نمایاں ہے ورنہ پڑھ لکھ کر یہ آج کل کی چھوکریاں نسائیت کھو دیتی ہیں۔ سچ کہتا ٹھیک کہتا ہوں یا نہیں

البتہ خط اس نے تمہیں نہیں لکھا۔"

"تو پھر کس کو لکھا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اپنی بھابھی کو۔"

"کون سی بھابھی؟"

"اس کا کوئی بھائی ہے۔" وہ بولا۔ "انصر نام ہے یا نصیر مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کا نیا نیا بیاہ ہوا ہے۔ اس کی بیوی کو خط لکھا ہے۔" —— "تو پھر یہاں کیسے آگیا۔ وہ" ایلی نے پوچھا۔

"وہ شعر سنا ہے تم نے —— شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں۔" جمیل گانے لگا۔

"تو یہ کسی کے آنے کا اعجاز ہے۔" ایلی نے کہا۔

جمیل ہنسنے لگا۔ "خط اسے لکھا ہے۔ لیکن اس بیچاری کے نام صرف سرنامہ ہے باقی سارے میں تمہارا تذکرہ ہے اور تمہارے خیال سے اس قدر بھری بیٹھی تھی کہ لفافے پر پتہ بھی ہمارا ہی لکھ دیا۔ واہ واہ واہ۔ لگن ہو تو ایسی ہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

ایلی نے وہ خط پڑھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ ساوی کے جذبہ کی شدت مجسم ہو کر اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر جذبہ اس قدر لطافت اور رنگینی تھی کہ وہ تڑپ گیا۔ اس نے بھی ساوی کے دکھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے لاشعور میں ساوی اور غم متضاد چیزیں تھیں۔

لیکن ساوی کا خط پڑھ کر ایلی پر گویا دکھ کا ایک پہاڑ آ گرا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جائے اور پھر جوگی بن کر پہاڑی پر جا بیٹھے۔

دو ایک دن تو وہ پڑا آہیں بھرتا رہا پھر شدت جذبہ سے مجبور ہو کر علی احمد کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس نے ساوی کا تذکرہ پھر سے چھیڑ دیا۔ علی احمد پہلے تو اس کے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پینترا بدلا اور اپنی عادت کے مطابق ہنسنا شروع کر دیا۔ "نصیر کی ماں یہ سنا ہی ہی ہی ہی۔" اور اس ہی ہی ہی ہی میں بات دب کر رہ گئی۔

تجدید

کیڑا اور کویا

ایلی کے بن باس کو چار سال گزر چکے تھے۔

یہ چار سال اس نے مسلسل مطالعہ میں صرف کیے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خیالات میں خاصی پختگی پیدا ہو چکی تھی مطالعہ سے حاصل کئے ہوئے کئی ایک نظریات کو وہ عملی زندگی میں آزما چکا تھا۔ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر اس کے کردار اور شخصیت کی دیواریں اسی احساس کمتری پر کھڑی تھیں، لیکن اب اس کے برتاؤ سے اس حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ گونگا نہ رہا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو میں ایک جاذبیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے دوست اور ساتھی اس کی باتیں سنتے اور سر دھنتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلی نے "الٹراما" زندگی کے متعلق ایک انوکھا نکتہ نظر استوار کر رکھا تھا۔ جو رسمی زاویوں سے ہٹ کر تھا۔

دراصل اس کا انٹلکچول سلف ایک کولے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کے تلے اس کی جذباتی انا کیڑے کی طرح چھپی ہوئی تھی۔ مطالعہ نظریات اور پختگی خیالات کا اس کے جذباتی تار و پود پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ایک بچہ تھا۔ وہ بچہ مار کھا کر روتے روتے سو گیا تھا۔ ایلی کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ بچہ پھر نہ جاگ پڑے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جاگ پڑے گا۔ اور پھر سے بسورنا شروع کر دے گا۔ اس بات کا مطالبہ کرے گا۔ کہ ماں اسے تھپکے ماتا سے اس کی وابستگی جوں کی توں قائم تھی۔ اس کے گرد و پیش کئی ایک نوجوان لڑکیاں تھیں جو پردوں سے

جھانکتی تھیں قہقہے لگا کر آواز نشر کرتی تھیں۔ شرما کر چھپ کر ڈھونڈنے کی دعوت دیتی تھیں۔ ان میں دلفریبی تھی حسن تھا رعنائی تھی۔ لیکن ماتا نہ تھی۔ وہ جگاتی تھیں تھپک کر سلاتی نہ تھیں ان میں سپردگی تھی۔ لیکن گردنیں اٹھانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے وہ ایلی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں اور ماتا بھری تھپکی کی عدم موجودگی میں ایلی اپنے محنت سے پیدا کئے ہوئے انٹلکچول کوئے میں سوتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے اسے آرزو تھی کہ وہ جاگ اٹھے۔ ڈھکی چھپی آرزو اور ممتا بھرے ہاتھ اسے تھپکیں تھپکتے تھپکتے اٹھا کر ممتا بھری گود میں ڈال لیں۔

اسی ڈر کے مارے چار سال وہ علی پور نہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سویا ہو بچہ پھر سے نہ جاگ پڑے وہ کویا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ٹوٹ نہ جائے اور لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں کہ وہ وہی پرانا کیڑا ہے۔ پلپلا۔ رینگتا ہوا کیڑا۔

اس کے باوجود جب کبھی علی پور سے کوئی آتا۔ وہاں سے خبر آتی تو ایلی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ بظاہر بے پروائی دکھاتے ہوئے بڑی توجہ سے علی پور کی باتیں سنتا اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر بڑے انہماک سے خبروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتا اور پھر اندازے لگاتا کہ شہزاد کا کیا حال ہے اور صفدر اور شہزاد کے تعلق کے متعلق محلے والوں کا کیا خیال ہے کیا شریف حالات سے بے خبر ہے۔ کیا شہزاد شریف کے ساتھ نہیں جاتی۔

شروع شروع میں محلے سے۔ جو خبریں آتی تھیں ان میں شہزاد اور صفدر کا بہت چرچا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا ہے وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر آوازیں دیتی رہتی ہے۔ وہ منڈیر سے جھانکتا ہے۔ "چچی سودا منگواؤ گی۔ آج تو کریلے پکاؤ اور وہ جو زیور تم نے بنوایا تھا۔" کھڑکی میں کھڑا رہتا ہے دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ وہیں کھڑے دوپہر سے شام ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں رات کو گراموفون کو سرہانے بیٹھ کر گیت سنتے ہیں۔ آدھی رات بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے نہیں تھکتے۔

پھر آہستہ آہستہ باتیں رنگ بدلتی گئیں۔ صفدر کے شراب کے نشے میں دھت رہنے کی تمیں چل نکلی توبہ ہے۔ ہر وقت بوتل منہ سے لگائے رہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ شہزاد کا مال ہے کیوں نہ لٹائے مفت کی تو کہتے ہیں قاضی بھی نہیں چھوڑتا اور صفدر تو بچپنے کا شرابی ہے پی کر ننگا رہتا ہے۔ بیوی کو پیٹتا ہے۔ چیخ چیخ کر شعر گاتا ہے۔

اگرچہ ایلی کو یقین تھا کہ اسے ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں اسے قطعی طور پر پروا نہیں کہ شہزادہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے یا بازار میں صفدر نمازیں پڑھتا ہے یا شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ صفدر کے شراب پی کر چلانے کی بات سن کر اسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اعتراف وہ اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا تھا ایک پرائیویٹ خفیہ خوشی۔ اب شہزاد کو سمجھ آئیگی۔ اب وہ جانے گی کہ سچے اور جھوٹے عشق میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ان چار برس میں علی پور جانے کے کئی ایک موقعے ملے تھے لیکن ایلی نے جان بوجھ کر علی پور جانے سے احتراز کیا تھا وہ علی پور سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزاد کی آواز سننے سے ڈرتا تھا وہ آواز جو محلے میں گونجتی تھی جس کے سرے محلے والیوں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جس میں لے تھی زیروبم تھا۔ وہ عجیب سی جھنجلاہٹ تھی۔ جو سیدھی دل پر اثر کرتی اور پھر نس نس میں دھنکی سی بجتی۔

ہر سال جب سکول گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے ڈیڑھ ماہ کے لئے بند ہو جاتا تو ایلی مشکل میں پڑ جاتا چھٹیاں گزارنے کے لیے جب وہ خان پور جاتا تو کوئی نہ کوئی علی پور کی بات چھیڑ دیتا۔ مثلاً علی احمد کہتے۔

"نصیر کی ماں کتنی خوشی کی بات ہے کہ ایلی چھٹیاں ہمارے پاس بسر کرتا ہے۔"

"بے چارہ اپنی ماں سے ملنے سے بھی گیا۔" راجو دبی زبان سے کہتی۔

"اس کا نام زندگی ہے نصیر کی ماں۔" علی احمد چلاتے "کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔"

"میں نے کہا۔" راجو اسے دیکھ کر بولی "ایلی آیا ہے۔"

"لیکن ————" راجو کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا۔" علی احمد چلانے لگے۔

راجو کی آواز مدھم پڑ گئی۔ "ہم تو علی پور جا رہے ہیں۔"

"تو پھر ———— تو مطلب کی بات کر۔"

"مطلب یہ" اس کی آواز اور مدھم پڑ گئی۔ "وہ کہاں رہے گا چھٹیوں میں۔"

"ہی ہی ہی ہی۔" علی احمد ہنسے۔ نصیر کی ماں تو بھی ہمیشہ باؤنڈری اگاتی ہے۔ اسے بھی ساتھ لے چلو آخر ایک دن جانا ہی پڑے گا۔ آج نہیں کل سہی۔ کل نہیں پرسوں۔ بکرے کی ماں

کب تک خیر منائے گی۔ ہی ہی ہی ہی وہ ہنسنے لگے۔"

جب وہ علی پور پہنچے تو محلے کا احاطہ محلے والیوں کی آوازوں سے گونجنے لگا وہ سب علی احمد کو پیٹنے لگیں۔

قافلہ

دفعتاً ایلی کو خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ احاطے کے میدان میں کھڑے ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ اس نے چند ایک لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ڈیوڑھی میں جا کر رک گیا۔ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ باہر چیلیں چیخ رہی تھیں۔ کوے کائیں کائیں کر رہے تھے اور ان میں علی احمد کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"کون؟ علی احمد آیا ہے؟"

دفعتاً ایک مختلف نوعیت کی آواز سنائی دی۔ انوکھی۔ سریلی۔ پنچم آواز۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ جسم میں لہریں سی چلنے لگیں۔

"ہے یہ تو سارا قافلہ ہے کسی کو چھوڑ تو نہیں آئے پیچھے۔"

"تو گھبراؤ نہیں۔" علی احمد بولے۔ "سبھی ساتھ ہیں۔ سبھی۔" علی احمد نے قہقہہ لگایا۔ "تو یہ بات سنا شہزاد سنا ہے تو نے اپنے میاں کو عاق کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اسے ریٹائر کر دیا ہے۔"

"عمر عمر کی بات ہوتی ہے' وہ ہنسی۔"

"عمر تو ڈیوٹی کی ہے۔ کیوں چاچی۔ جھوٹ کہتا ہوں کیا؟ ہی ہی ہی۔"

"اب کیا رہا ہے پیچھے۔" پنچم گونجی۔

"نگاہیں کھا گئیں تجھے۔" علی احمد نے قہقہہ لگایا۔

"نگاہوں کی بھینٹ جو چڑھا دیا اپنے آپ کو۔" ماں مدھم آواز میں بولی۔

"ہی ہی ہی ہی۔" علی احمد کا قہقہہ ایلی کے بند بند میں ناچنے لگا۔ ایلی نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

محلے میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں نے احاطے کے میدان میں بیٹھ کر چرخا

کاتنا آزار بند بننا ترک کر دیا تھا۔ سر جھکا کر چلنے والے بڈھے تعداد میں کم رہ گئے تھے۔ محلے کے نوجوانوں کی وہ حالت نہ رہی تھی۔ اب وہ چھاتی نکال کر چلنے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بوڑھیوں کی موجودگی میں سینہ ابھا کر کھڑی ہو جاتیں۔ نظر بچا کر مسکراتیں۔ بال جھٹکتیں۔ بچے بڑوں کا کہا نہ مانتے ضد کرتے بڑوں کو منہ پر جواب دیتے محلے کی بوڑھیاں بالکل ویسی ہی تھیں جیسے کہ پہلے ہوا کرتی تھیں ان میں قطعی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ البتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہت سی ادھیڑ عمر کی عورتیں ان کی صف میں شامل ہو گئی تھیں۔

ایک نئی چیز جو محلے میں زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ گراموفون باجہ تھا پہلے تو محلے میں صرف ایک باجا ہوا کرتا تھا۔ جو بالا کے کمرے میں یوں بجا کرتا تھا جیسے مکھیاں بھن بھنا رہی ہوں بالا کے پاس چند ایک پرانے ریکارڈ تھے۔ جن کی آواز اس کے کمرے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی جو چلتے چلتے میرا نام جانکی بائی الہ آباد والی کہہ کر ختم ہو جاتے تھے۔ جنہیں سن کر بوڑھیاں ہاتھ چلا چلا کر چلاتیں۔ "اے ہے یہ باؤلا کیا توے سے گھساتا رہتا ہے ہر وقت کی ٹیں ٹیں نہ شرم نہ حیا۔" لیکن بالا تو باؤلا تھا۔ اس سے جھگڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آسیب زدہ لوگوں سے بھلا کیا جھگڑا اس لیے بالا باجہ محلے میں سسکیاں لیتا رہتا تھا۔ بوڑھیاں چلملاتی رہتیں۔ بالا ہی ہی کر کے سنتا رہتا۔

اب محلے میں کئی ایک باجے آ گئے تھے ان پر ایسے ریکارڈ چلتے جو ہنہناتے نہیں بلکہ گاتے تھے اور گانے کے بول دور دور تک صاف سنائی دیتے تھے روز رات کے وقت کوئی نہ کوئی باجا بجنے لگتا اور دیر تک گیتوں کی آوازیں محلے میں گونجتیں اکثر ایسا ہوتا کہ دو باجوں کی آپس میں شرط باندھی جاتی اور وہ باری باری ریکارڈ بجاتے مقابلے کے شوق کی وجہ سے باجے والے نئے ریکارڈ خریدتے تاکہ حریفوں سے بازی لے جائیں۔

محلے والیوں نے ان کے باجے کے خلاف ضرور احتجاج کیا ہو گا۔ ظاہر تھا کہ ان کی آواز میں اب وہ اثر نہ رہا تھا۔ بولتیں تو وہ اب تھیں۔ انہیں تو بولنے سے دلچسپی تھی اثر پیدا کرنے سے نہیں محلے کے جوان اب ان باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بولتی ہیں تو پڑی بولیں آپ ہی تھک جائیں گی۔ بہرحال ابھی تک ان میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی تھی کہ بوڑھیوں کی بات کاٹیں یا ان کی بات کا جواب دیں۔

بکھری کہانی

اتنی دیر کے بعد ایلی سے مل کر محلے والیاں بے حد خوش ہوئیں گویا انہوں نے اس کے

پہلے گناہ سب کے سب معاف کر دیئے تھے۔

"اے ایلی ہے۔" وہ اسے دیکھ کر چلاتیں۔ اے اتنی دیر کے بعد دیکھا ہے تجھے۔ جی نہیں چاہتا تھا تیرا وطن آنے۔ اے تو نے تو حد کر دی۔ محلہ چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا پہلے تو باہر جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ پھر جو چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔"

پھر وہ ایلی کے قریب تر ہو جاتیں۔ "اچھا ہی کیا تو نے جو اس دلدل سے نکل گیا مردوں کا کیا کام کہ دلدل میں پھنسے بیٹھے رہیں مرد تو چلتے پھرتے گھوڑے ہوتے ہیں۔"

"اے کوئی جگہ ہوتی تو تو جان کی بازی لگاتا۔ وہ تو بارہ دری ہے بارہ دری ایک آیا ایک گیا اچھا ہوا تیری جان چھوٹی۔"

اے میں نے کہا ایلی کچھ معلوم ہے تمہیں اس اللہ مارے شرابی نے کیا کیا پیچ کر کھایا اسے۔ بہو کو نچوڑ لیا۔ اچھا ہوا اسے بھی سمجھ آئی کہ کیا کیا ہوتا ہے لیکن اسے کیا سمجھ آئے گی۔ وہ تو کہتی ہے لوٹ لو وہ خود لٹنے کے لیے بے قرار ہے۔ خاوند سے بگاڑ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ تو بدھو ہے بدھو۔ ورنہ عورت کی کیا مجال ہے کہ خاوند کا کہا نہ مانے۔ اس بے چارے نے ہزار منتیں کیں کہ چل میرے ساتھ چل لیکن اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"اے ہے۔ اب تو لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی ہٹ سے باز نہیں آتی۔ ادھر وہ کالے منہ والا شرابی روز پی کی بیوی کو پیٹتا ہے پھر ڈھیٹ کہیں کا اسے آوازیں دیتا ہے چیختا ہے چلاتا ہے منتیں کرتا ہے اور جب کھڑکی نہیں کھلتی تو پھر سے بیوی کو پیٹنے لگتا ہے۔ توبہ ہے۔ اتنے بے شرم ہو گئے ہیں۔ کہ توبہ ہے نہ کسی کی شرم نہ لحاظ۔"

ایلی ان کی باتیں سن سن کر ان ٹکڑوں کو جوڑتا رہا بہرحال وہ خوش تھا۔ ہنگامہ ہوا اچھا ہوا سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ سچا عشق کسے کہتے ہیں۔

خوشی کے باوجود ایسی باتیں سن کر اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ اس نے اپنا آپ تباہ کر لیا عزت و ناموس گنوا دیا۔ اپنی جوانی برباد کر دی۔

ہاجرہ نے ایلی کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ "ہے ایلی تو تو ہم سے دور ہی بھی گیا پہلے ہمارے پاس رہ کر ہمارا نہ تھا۔ اب ساتھ ہم کو بھی چھوڑ دیا۔ تیرا جی نہیں چاہتا تھا علی پور آنے کو اس سے تو وہی دور اچھا تھا۔ تمہیں دیکھ تو لیتے تھے۔ اب تو دیکھنے سے

بھی گئے۔"

ہاجرہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے فرحت چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

"چل ادھر فرحت کی طرف۔" ہاجرہ بولی۔ "تو کیا ادھر علی احمد کے گھر رہے گا۔ اکیلا ہی۔ نہ بیٹا چل ہمارے ساتھ رہ جیسے ہمیشہ رہا کرتا تھا۔"

فرحت کی طرف جا کر رہنا ——— گویا پھر سے منجدھار میں کودنے کے مترادف تھا۔ وہاں شہزاد تھی۔ صرف ایک چھت اور ایک زینہ حائل تھا ایلی ادھر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔

"تو بھی حد کرتی ہے اماں۔" فرحت بولی۔ "اگر ایلی کا جی ادھر رہنے کو چاہتا ہے۔ تو تو اسے کیوں مجبور کرتی ہے۔ ادھر لے جا کر خواہ مخواہ پھر سے مصیبت سر پر کھڑی کرنی ہے کیا۔ مشکل سے جان چھٹی ہے پہلے ہی۔"

"اچھا" ہاجرہ بولی۔ جس طرح تو خوش رہے۔ جیسے تیری مرضی۔"

ایلی کو یقین تھا کہ شہزاد علی احمد کے گھر آنے کی جرات نہ کرے گی اور اگر آئی بھی تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس کا سامنا کر سکتا ہے اسے تو صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ اکیلے میں ایلی کے روبرو آ کھڑی ہو پھر اسے خیال آتا کہ آخر وہ کیوں آئیں گی۔ اس کی آمد کا خطرہ دراصل محض خوش فہمی ہے۔ آخر اسے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چار ایک دن کے بعد ایک روز علی احمد اور گھر کے جملہ لوگ علی احمد کے کسی دوست کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے انہیں صرف چند ایک گھنٹے کے لیے باہر رہنا تھا۔ ایلی نے اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اس لیے وہ کتاب اٹھا کر ایک الگ کمرے میں جا بیٹھا اور مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

ہاں ——— ہوں

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ سر اٹھا کر دیکھتا ریشمی کپڑوں کی ایک خوشبودار گٹھڑی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی گٹھڑی کے اوپر والے سرے پر سیاہ ناگن سی بل کھائے ہوئے تھی۔

وہ چونکا۔ کون ہے؟"

گٹھڑی سے دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایلی گھبرا گیا۔

اس نے چوٹی کو اٹھایا ——— ماتھے پر تل دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا اس نے چوٹی کو چھوڑ دیا دم سے گٹھڑی پھر سے گر گئی۔ سسکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹھوکر مار کر اس ریشمی گٹھری کو پرے ہٹا دے اور پھر خراماں خراماں کمرے سے باہر نکل جائے جیسے ہیرو سٹیج سے نکلتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ریشمی گٹھڑی کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس کا جی چاہتا تھا گٹھڑی پر ڈھیر ہو جائے۔ اسے بانہوں میں سمیٹ لے اور دبی آواز سے کہے قدموں پر گرنا تمہارا کام نہیں دیوی یہ تم کیا کر رہی ہو۔"

اس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ نہ کہے۔ بیٹھا رہے۔ "کیا اپنے شرابی محبوب سے اکتا گئیں۔ کیا دل بہلاوے کے لیے کوئی اور نہیں ملتا۔"

"مجھے معاف کر دو۔" وہ اس کے قدموں میں گری ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی شکست کا اعتراف کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے عظیم تر لمحہ اس کی زندگی میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ خوش تھا اس کی تذلیل پر خوش تھا۔ اس کے اعتراف شکست پر خوش تھا۔ وہاں وہ چاہتا تھا کہ یوں ہی بیٹھا رہے۔ دیوتا بن کر بیٹھا رہے اور اس کے قدموں پر وہ سرنگوں رہے۔

تمام دنیا پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا۔ صرف دیوتا اور پشیمان پجاری' کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ صرف وہ دونوں باقی رہ گئے تھے۔ یا پھر' ایک خلا تھا۔ وسعتوں کو گھیرے میں لئے ہوئے ایک عظیم تر خلاء۔

صدیوں خاموشی طاری صرف ہچکیاں۔ لمبی۔ دبی۔ دبی ہچکیاں پھر کپڑوں کی گٹھڑی میں رکت ہوئی حرکت ہوئی۔ پیشانی کا سیاہ تل ابھرا۔

"میں میں ——— تم۔" آبدیدہ ہچکی نے اس کی بات کاٹ دی

"تم ہو؟" ایلی نے نفرت بھرے انداز سے کہا بناوٹی نفرت۔

"ہاں ——— میں۔"

"تم۔" ایلی کی نگاہ کند چھری کی طرح پڑی۔

"ہاں میں۔ چور چور ہو کر تمہارے قدموں میں آگری ہوں۔"

"جو شرابی کے ہاتھ کا گلاس بنے ——"

"تم مجھے شرابی کے ہاتھ دے گئے تھے نا۔"

"میں دے گیا تھا؟" نفرت سے اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"تم نہ جاتے تو ——"

"اب کیا رکھا ہے؟" وہ بولا۔

"سچ ہے" وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے معافی بھرے انداز سے چہرے سے بال ہٹائے اور اپنا منہ ننگا کر کے بولی۔ "اب کیا دھرا ہے۔"

وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ اس کے روبرو وہ شہزاد نہ تھی۔ ایک لٹا پٹا چہرہ۔ ویران آنکھیں۔ ہڈیوں بھرے گال' داغ دار جلد' بجھا ہپ' وہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

"ہاں" وہ بولی "اب کیا رکھا ہے۔ ویرانی' تباہی لئے ہوئے کو کون منہ لگاتا ہے۔ چور چور ہو جائے تو کون ٹکڑے چنتا ہے۔" وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی فضا گویا منوں بوجھل ہو گئی۔

ایک اداس بھاری خاموشی چھا گئی۔

دور کوئی کراہ رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ سسکیاں لے رہا تھا۔

"مجھے معلوم تھا۔" وہ بولی "اب تم بھی منہ نہ لگاؤ گے۔ اب رکھا ہی کیا ہے۔" اس نے سسکی زدہ قہقہہ لگایا۔

"تو پھر" وہ بولا۔

"پھر —— ہونہہ ——"

"آخر پھر مجھ پر نوازش کیوں کی گئی؟"

"تم پر میں کیا نوازش کروں گی؟"

"تو کیا یہ نئی چال ہے؟"

"چال" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس ہنسی میں دھار تھی۔ ایسی دھار جس کا رخ اس کی اپنی طرف تھا۔

"گناہ بخشوانے آئی تھی۔ کیا؟"

"جبھی خدا بن کر بیٹھ گئے ہو تم۔"

ایلی بھونچکا رہ گیا اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

"تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔"

"بہر حال تم کو سمجھتا ہوں۔"

"ہونہہ" نفرت سے اس کی ناک دھار بن گئی۔ "تم —— مجھے سمجھتے کیا تم۔ تم مجھے کیا سمجھو گے' تم میں اتنی وسعت ہی نہیں کہ دوسرے کو سمجھ سکو۔ دوسرے کو دیکھ سکو۔ سمجھنا تو دور کی بات ہے۔"

"ہاں" وہ غصے میں بولا "میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ نہیں سمجھ سکتا۔"

"خود پرست شخص کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"ہاں میں خود پرست ہوں۔"

"تمہاری خود پرستی نے ہم سب کو تباہ کر دیا۔"

"اس شرابی کو بھی ——" اس کی آواز میں تمسخر تھا۔

"ہاں اس نالی کے کیڑے کو بھی۔"

"نالی کا کیڑا؟"

"ہاں۔ اس کا مقصد مجھے لوٹنا تھا۔ اس نے مجھے دل بھر کر لوٹا۔ اور میں جان بوجھ کر لٹتی رہی۔ مجھ میں اب بھی اپنا آپ لٹانے کی جرات ہے۔"

"اوہ ——"

"تمہاری طرح نہیں کہ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گئے۔"

"میں چلا گیا؟"

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہ تھا۔ تم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تم میں اتنی وسعت نہیں۔ تم شک کی بنیاد پر پیار کرتے ہو۔ محبت کرنا نہیں جانتے۔" آج تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ گری ہوئی پاؤں میں روند رہے ہو میں صرف تمہارے سامنے گری ہوں۔ کسی اور کے سامنے نہیں۔ اتنی گری ہوئی بھی نہ سمجھو مجھے۔"

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے دونوں بازو سینے پر تہہ کیے ہوئے تھے ڈانواں ڈول کھڑی تھی جیسی جلتے ہوئے جہاز میں کوئی کیسابیانکا کھڑا ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی کھڑی ٹکٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ تلے ایلی ایک انجانی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے لٹا پٹا دیکھ کر وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اسے وہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا جیسے اس کا ساتھ دینا اس پر فرض ہو چکا ہو۔

سکھ میں چاہے وہ اس کا ساتھی نہ بنتا لیکن دکھ میں وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب شہزاد کے پاس رہا کیا تھا۔ جوانی ڈھل گئی تھی۔ جوبن ختم ہو چکا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے قدموں پر گر جائے اور رو رو کر اس سے معافی مانگ لے لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی۔

دفعتاً" وہ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا سر تھام لیا "لیکن تم یوں چوہے کی طرح کیوں دبکے بیٹھے ہو۔ کیوں منہ چھپائے پھرتے ہو۔ کبھی علی پور نہیں آئے۔ اور اب آئے تو سامنے کیوں نہیں آتے۔ مجھ سے دلچسپی نہیں تو نہ سہی مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن مجھ سے نفرت ہی سہی اعلانیہ نفرت کرو تھوکو' میرے منہ پر تھوکو۔ ٹھوکر مار کر مجھے باہر نکال دو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا منہ اپنی طرف موڑ لیا۔

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ بھن سے اس کا سر ہوائی کی طرح چل گیا اس نے ان جانے میں اٹھ کر شہزاد کو دونوں بانہوں میں تھام لیا اور پھر دیوانگی بھرے جوش سے اس ریشمی گٹھڑی کو سمیٹ کر اپنی گود میں ڈال لیا۔ پھر وہ نہ جانے غصے میں جوش میں یا نفرت کی شدت کی وجہ سے چیخنے لگا۔

"تم کمینی ہو۔ حرام زادی ہو۔ فاحشہ ہو۔ تمہیں دوسروں کو تباہ کرنے میں دلچسپی ہے تم انسانوں سے کھیلتی ہو۔ تم حرام خور ہو۔"

"ہاں ہوں۔" وہ بولی "کر لو میرا کیا کرتے ہو۔" اور پھر گٹھڑی سی بن کر پڑ گئی۔

ایلی نے اس گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ پھر دفعتاً" اس کے ذہن میں گاڑی کی کوک سنائی دی۔ گاڑی اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان چھکا چھک چلی جا رہی تھی۔ ایک ڈبے میں مونگیا رنگ کی گٹھڑی پڑی جھول رہی تھی۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ تباہی بربادی' لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔" ارجمند چلا رہا تھا۔ پھر گٹھڑی کے پٹ کھلے اور دو حنائی ناگ باہر نکلے۔

سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایلی نے گود میں پڑی ہوئی گٹھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ میں نے کیا کر دیا پھر سے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا" غصے سے اس کا منہ

سرخ ہو گیا۔ "کر لو میرا کیا کر سکتے ہو۔ کر لو میرا کیا کر سکتے ہو۔" کوئی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ غصے سے ایلی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اس ریشمی گٹھڑی پر پل پڑا۔

لفافہ

اگلے روز جب وہ بنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو نیچے زینے سے شور بلند ہوا۔ "راجو شمیم۔ کوئی ہے بھی اس گھر میں کہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔"

ایلی شہزاد کی آواز سن کر چونکا۔ وہ تو علی احمد کے گھر کبھی نہ آئی تھی۔ کبھی آتی بھی تو سال میں ایک مرتبہ۔ لیکن اس طرح گھر والوں کو آوازیں دے رہی تھی جیسے روز کی آنے والی ہو۔ اور پھر اس کی آواز اسی طرح گھنٹی کی طرح بج رہی تھی جیسے ٹن جوں کا توں قائم ہو۔ بات کا انداز بھی وہی تھا۔ جیسے ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

"ہی ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے ہوئے آگے بڑھے "لو" وہ بولے "ہماری قسمت مفت میں جاگ اٹھی۔"

"کس نے جگا دی آپ کی قسمت" راجو نے پوچھا۔

"دیکھ لو شہزاد آئی ہے ہمارے گھر۔"

"اب تو آئے گی ہی۔"

"کیوں" علی احمد بولے۔

"اب سودا بک گیا۔" شہزاد چلائی "اب خطرہ کیسا۔"

"ابھی تو گودام بھرے ہیں۔" علی احمد بولے۔ "کیوں نصیر کی ماں ٹھیک ہے نا۔"

"تم آپس میں ہی فیصلہ کر لو۔" راجو ہنسنے لگی۔

"جبھی تو میں آئی ہوں" شہزاد نے کہا۔ "میں نے کہا آج روبرو فیصلہ ہو جائے۔"

"تو آؤ بیٹھو۔ ہمارے پاس تو کبھی بیٹھی ہی نہیں تو۔ بس کھڑکیوں پر چیل کی طرح منڈلاتی رہتی ہے۔

کبھی ہمیں بھی موقعہ دیا ہوتا۔ ہی ہی ہی ہی" علی احمد ہنسنے لگے۔

"جسے سدھ بدھ ہی نہ ہو اسے کیا موقعہ دیتا" وہ ہنسی۔

"اب آئے گی بھی اندر یا ان کی باتوں میں الجھی رہو گی۔" اندر سے راجو بولی۔

"آتی ہوں۔ یہاں تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔"

علی احمد ہنسنے لگے "بھئی بڑی تیز ہے یہ شہزادو۔"

"ابھی کیا دیکھا ہے۔" وہ اندر جانے کی بجائے سیدھی ایلی کی طرف آتے ہوئے بولی اور بے پروائی سے برسبیل تذکرہ ایلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی "تو یہ کیا پڑھنے کی جگہ ہے۔ لو یہ وقت پڑھنے کا ہے۔ میرا یہ خط تو ڈال آؤ ذرا ڈاک میں۔" شہزاد نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ علی احمد سے بولی۔ "اے ہے مہمان آئے ہیں کچھ تواضع کرو۔ کچھ منگواؤ نا شہزاد آئی ہے۔"

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر شہزاد مسکرائی پھر مڑ کر ایلی سے کہنے لگی "یہ خط تمہارے لیے ہے کہیں ڈاک میں ڈالا تو میں پٹ جاؤں گی۔"

ایلی نے دیکھا تو لفافے پر شریف کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھولا تو اندر مختصر طور پر لکھا ہوا تھا۔ "مجھ سے آج ہی ملو میں نے تم سے بہت باتیں کرنی ہیں وہ بیٹھک جو احاطے میں کھلتی ہے۔ اس کی تیسری کھڑکی اندر سے کھلی ہوگی کھڑکی میں اندر ٹارچ پڑی ہوگی۔ اٹھالینا۔ بارہ بجے سے پہلے نہ آنا۔"

رابعہ کے چوبارے کے نیچے کی بیٹھک جس کی کھڑکیاں احاطے کے میدان میں کھلتی تھیں سال ہا سال سے بند پڑی تھی۔ اس میں گھر کا کاٹھ کباڑ ڈھیر کیا ہوا تھا۔ رابعہ اور شہزاد کے مکان کا صدر دروازہ چھتی گلی میں کھلتا تھا جسے گلیارہ کہتے تھے۔ لیکن یہ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ یہاں سے چار ایک مکانات کو راستے جاتے تھے۔ اس لیے صدر دروازے کو چوری چھپے شہزاد کے گھر جانے کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میدان میں کھلنے والی بیٹھک کی کھڑکیاں ان کے گھر میں داخل ہونے کا براہ راست ذریعہ تھا وہ بھی صرف اس لیے ممکن العمل تھا کہ رابعہ ان دنوں باہر گئی ہوئی تھی۔ اور شہزاد نہ جانے کس وجہ سے اپنے چوبارے میں آ گئی تھی شاید اس کی وجہ صفدر ہو۔ جس کا مکان شہزاد کے چوبارے سے عین ملحق تھا۔

اس رات وہ جنگل میں لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اوپر چھت پر سوئے تھے باہر صحن میں زینے کے پاس ہاجرہ کی چارپائی تھی۔ جس کے پاس ہی وہ جائے نماز پر بیٹھی نہ جانے کیا پڑھ رہی تھی۔ انہی دنوں ہاجرہ نے دلی کے ایک بزرگ جنہیں حاجی صاحب کہتے تھے کی بیعت کرلی تھی اور نمازوں اور وظائف میں مصروف رہتی تھی۔

نیچے احاطے کے میدان میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ چاندنی ...نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے محلے میں چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ برتن بج ...رہی تھی چارپائیاں گھسیٹی جا رہی تھیں ——— دروازوں کے پٹ بند ہو رہے تھے۔

آہستہ آہستہ محلے پر خاموشی طاری ہوئے جا رہی تھی۔ خاموشی کے وقفے لمبے ہوتے جا ...تے پھر محلے کی مسجد سے نمازی وظائف سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ رہے تھے قدموں ...ہم آوازیں آرہی تھیں ٹپ ٹپ ٹپ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔ ...ی دروازہ چراؤں کر کے کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ چند ساعت کے ...پھر ٹپ ٹپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جاتی اور پھر چراؤں ٹھک کے بعد ...ہوشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

...جھا

احاطے کے میدان کے عین درمیان میں کنوئیں کو منڈیر کے قریب ماجھا ڈھیر ہو رہی تھی۔ ماجھا ایک مستانی تھی۔ جو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اور شام کے وقت محلے کے احاطے میں آ جاتی اور کنوئیں کی منڈیر کے قریب رات بسر کرتی تھی۔

ماجھا کو اپنی سدھ بدھ نہ تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جسم پھولا ہوا تھا۔ غالباً اس کے جسم میں حسیات مفقود ہو چکی تھی۔ اگر کوئی ماجھا کے جسم پر چٹکی بھرتا تو ماجھا کو قطعی احساس نہ ہوتا وہ آپ ہی آپ بیٹھی قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی یا پھوٹ پھوٹ کر روتی یا چیخیں مارتی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا چغہ پڑا رہتا تھا۔ سر اور جسم میں جوئیں چلتی تھیں اور رات ...جاگتے میں بیٹھے بیٹھے اس کا پیشاب اور پاخانہ خطا ہو جاتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ماجھا کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کس کی بیٹی ہے اور اس کی یہ حالت کیا ہو گئی ہے؟

کوئی کہتا کہ وہ امیر کبیر گھرانے سے ہے اور کشتۂ محبت ہے۔ محبت کی شدت کی وجہ سے ...ہو گئی ہے کوئی کہتا کہ نوجوانی میں غنڈوں نے اس سے زیادتی کی اور اس عفت مآب لڑکی کو ...صدمہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہوش کھو بیٹھی۔

رات کے وقت محلے کے کتے اسے چاٹتے رہتے تھے پھر نہ جانے کون کتا اسے چاٹ گیا کہ

ماجھا پیٹ سے ہو گئی۔ لوگوں نے حیرت سے ماجھا کی طرف دیکھا۔ مردوں نے نگاہیں جھکالیں عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ اور اس سے عجیب و غریب قسم کے استفسارات کرنے لگیں۔ دیر تک وہ اس ٹوہ میں لگی رہیں کہ بکار خویش ہشیار والا معاملہ تو نہیں لیکن وہاں تو سدھ بدھ ہی نہ تھی لہٰذا بات ختم ہو گئی۔ معینہ وقت پر بصد مشکل عورتیں اسے کمرے میں لے گھسیں۔ ماجھا کے ہاں ایک واقعی چاند سے مکھڑے والا بچہ پیدا ہوا۔ اور چند روز زندہ رہ کر مرگیا اور ماجھا فراغت پا کر سیدھی کنوئیں کی منڈیر کے قریب جا کر ڈھیر ہو گئی اور اسی طرح قہقے مارنے چیخنے اور رونے میں مصروف ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پھر ایک روز آدھی رات کے وقت محلے میں شور مچ گیا۔

اجو بہت دیر کے بعد دوکان سے واپس گھر آیا۔ ان دنوں کسی تہوار کی وجہ سے دوکان پر سلائی کا کام بہت زیادہ تھا۔ جب وہ احاطے کے میدان کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ ماجھا کے ڈھیر کے قریب ایک اور ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ چونک کر رکا۔ دوسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی "کون ہے۔" وہ چلایا ڈھیر میں پھر حرکت ہوئی۔ ایک سایہ سا بلند ہوا۔ اور تیزی سے گلی کی طرف بڑھا۔

اجو نے شور مچایا۔

اس پر محلے کی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آکھڑی ہوئیں۔

"کون ہے؟" ماں چلائی۔

"میں ہوں میں۔" اجو بولا "یہاں کوئی تھا۔"

"کہاں تھا کوئی۔" دوسری بولی۔

"یہاں ماجھا کے پاس۔"

"ہے کون ہے۔ کالے منہ والا۔"

"معلوم نہیں ماں' میں آیا تو کوئی تھا۔" میرے سامنے بھاگ کر گیا ہے۔

اس پر محلے کے دو ایک مرد لالٹین اٹھائے باہر نکل آئے اور اسے تلاش کرنے لگے۔

ادھر عورتیں ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بد دعائیں دینے لگیں۔

"نہ جانے کون بے شرم ہے۔ ہئے کیا زمانہ آیا ہے۔"

"اور پھر ماجھا کے پاس ماں۔ وہ تو گندگی کا بورا ہے۔"

"ہے لڑکی یہ مرد تو اندھے ہو جاتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں اسے پکڑ کر باندھ دو۔ اور صبح گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤ۔"

لیکن عورتوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی ——— تلاش کے باوجود کوئی نہ ملا۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ محلے والے چوکنے ہو گئے اور محلے والیوں کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ جب بھی رات کے وقت کسی کی آنکھ کھلتی یا نیند نہ آتی تو وہ اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر میدان میں نگاہ دوڑائی کہ ماجھا کے ڈھیر کے پاس کوئی اور ڈھیر تو نہیں پڑا۔

اجو کے اس انکشاف کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محلے کے جوان اور عمر رسیدہ کنوارے محلے والیوں کے شبہات کا مرکز بن گئے۔ اور رات کے وقت میدان میں جانا خطرہ مول لینے کے مترادف ہو گیا۔

ہاں میں آگیا

گھڑیال نے بارہ بجائے۔ ایلی چپ چاپ میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ایلی نے اٹھ کر اپنے گھر کا جائزہ لیا علی احمد کوٹھے پر چوبارے میں تھے۔ شمیم اور اس کی دونوں بچیاں اندر کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ شمیم کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جنگلے کے باہر دالان میں ہاجرہ تھی۔ لیکن حاجرہ کے متعلق ایلی کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دبے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ باہر صحن کا جائزہ لیا۔ دالان میں ہاجرہ گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ اس نے سیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چپکے سے نیچے اترا نیچے ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ ڈیوڑھی کے پیچھے چھ سات دکانیں تھے وہ رک گیا دیر تک کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر میدان کا جائزہ لینے لگا۔

باہر نکل کر اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کیا اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنوئیں کے منڈیر کے پاس ماجھا کا ڈھیر پڑا تھا۔ جو اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔

دفعتاً" وہ چونکا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ماجھا سے دس فٹ کے فاصلے پر کوئی دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ ایلی کونے میں چھپ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یقیناً" وہ محلے کا آدمی نہ تھا۔ اس کا جسم گول مٹول تھا۔ کپڑے پھٹے پرانے تھے اور منہ پر وحشت سی برس رہی تھی۔ یقیناً" وہ

شخص ماجھا کے لے وہاں کھڑا تھا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی وہاں کسی ماجھا کے لیے کھڑا ہے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس کے دل میں اس نامعلوم شخص کے لیے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔ وہ ماجھا کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا تھا اور ماجھا وہاں گندگی میں لتھڑی پڑی تھی۔ اس سے بو آتی تھی۔ سوجے ہوئے پنڈے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

ایلی نے جیب سے ٹارچ نکالی بٹن دبایا نامعلوم شخص دیوانہ وار بھاگا۔ ایلی نے ٹارچ گل کر دی چند ساعت کے لیے انتظار کیا۔ پھر وہ چھلانگیں مارتا ہوا میدان پار کرنے لگا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے اس نے اندر سے بند کر لیا۔ اور پھر ٹارچ کی روشنی میں کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی بیٹھک میں دبے پاؤں چلنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چوبارے کی طرف بڑھا تو رابعہ کے کمرے سے شہزاد نے جھانکا "تم آگئے۔" خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ شہزاد ایک ماجھا ہے۔ اور اس سے صفدر کے تعفن کی بو آ رہی ہے۔ اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔ میں کیوں آیا ہوں۔ کیوں پھر سے اپنے آپ کو تعفن میں جھونک رہا ہوں۔ اس کے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر میں جھجک تھی۔ شہزاد اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ "تم سچ مچ آگئے ہو ایلی"

"ہاں میں آگیا۔" وہ بولا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی تم اب نہ آؤ گے کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ کیا واقعی"۔ وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

آہستہ آہستہ صفدر کا تعفن ختم ہوتا گیا۔ اور بو کی بجائے شہزاد سے وہی خوشبو آنے لگی جس سے وہ بہت مانوس تھا۔

اس کا انداز وہی تھا۔ وہی حرکات۔ وہی آواز۔ وہی باتیں۔ بالکل صرف اس کے چہرے پر معصومیت نہ تھی۔ انداز میں شوخی نہ تھی۔ اب اس تھیلی میں وہ مینڈک نہیں پھدکتا تھا۔ خدوخال میں ایک عجیب سی موہوم بے حسی آچکی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں ضمنی تھیں۔ سب سے اہم بات تھی کہ سالہا سال کی گمنامی کے بعد آج پھر اسے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اسے مور چھل کر رہی تھی۔ اور اس کے گرد خوشبو کی طرح منڈلا رہی تھی۔ اور لمبی لمبی زلفیں پیار سے اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں اور ریشمیں ملبوسات اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے

ہوئی آنکھیں اسے رکھے رہی تھیں۔ اس پیش منظر کے عقب میں ایک رسیلی آواز دکھ بھرے کوئی دکھ بھرا گیت الاپ رہی تھی۔

کنہیا تنہا اس پر براجمان تھا۔ سامنے گوپیوں کو بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

دور نہ جانے کہاں ماجھا کراہ رہی تھی۔

اس کے بعد یہ اس کا معمول ہو گیا۔ رات کو وہ دیر تک پڑھتا رہتا پھر لیمپ بجھا کر محلے کی آوازیں سنتا برتن الماریوں میں رکھے جاتے۔ پلنگ کھینچے جاتے دروازے بند ہوتے اور آخر قدموں کے قدموں کی ٹپ ٹپ جیسے ٹین کی چھت پر بوندیں گر رہی ہوں۔ ٹپ ٹپ چراؤں اور پھر خاموشی کا وقفہ شروع ہو جاتا اور پھر دور سے ٹپ ٹپ کی مدھم آواز پھر سے سنائی دیتی قریب آتی اور پھر مدھم پڑتی جاتی اور آخر چراؤں دروازہ کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ اور خاموشی کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

رات کے بارہ کے قریب گلی سے ایک سایہ ابھرتا اور پھر میدان کے کسی نہ کسی کونے میں کھڑا ہوتا۔

ایلی کو اس سائے سے بے حد دلچسپی ہو چکی تھی۔

دھوپ چھاؤں

ایلی کی نیت میں وہی دورخی ابھر رہی تھی۔ وہی دھوپ چھاؤں جو غالباً بچپن ہی سے اس کی روح میں دبکی بیٹھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کا کھویا ہوا تخت واپس واپس مل گیا تھا۔ وہ پھر کسی حسینہ کا محبوب تھا۔ حسینہ نہ سہی لیکن اب بھی وہ محلے کی محبوب تھی۔ اس کی محبت کو اس کے جسم اور خدوخال سے تعلق نہ تھا۔ اس کی باتیں اس کا انداز اس کا کردار اس کی محبت کے ضامن تھے۔ اس کے علاوہ ایلی کو رو رو کر بتاتی کہ صفدر نے کس طرح اس سے کس طرح اس کا زیور چرایا۔ کس طرح مالی مفاد کے خیال سے اسے بے وقوف بنایا۔ ایلی محسوس کرتا جیسے وہ ایک رہبر ہو ایک ایسا عاشق ہو۔ جس کا نام رانجھا اور مہینوال جیسے عاشقوں کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

لیکن اس خوشی کے ساتھ ہی بیٹھے بٹھائے اسے خیال آتا کہ وہ ایک ماجھا کے فریب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی زندگی غلاظت سے بھری ہے۔ اس کی محبت دراصل جسمانی حرص۔ اور

اس کی ملاقاتیں اپنی پرانی رنگینی کھو چکی ہیں۔ ان میں وہ شوق نہیں۔ وہ انتظار نہیں۔ وہ خوشی نہیں۔ اسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔ اب وہ ایک تعلق تھا ایک بھونڈا بھدا عام سا تعلق جو عورت اور مرد کے درمیان ہوتا ہے۔

پہلے اسے یہ شکایت ہوتی تھی کہ شہزاد اسے قرب بخشنے سے ہچکچاتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر اس سے دور رہتی ہے۔ اور قریب ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کہاں ہوتی ہے۔ اب جب اس سے رات کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اپنی محبوبیت اور رنگینی کے باوجود شہزاد ایک ماجھا ہے۔ اور وہ خود تعفن کا شیدائی۔ اس خیال پر اسے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہوتی۔ اور وہ شہزاد سے نفرت کرتا اور اپنی زندگی کو ذلت بھری حماقت کے مترادف سمجھتا۔

رات کے بارہ بجتے تو ایلی میں تعفن کا شیدائی ابھرتا۔ ماجھا کی دھن اس پر جزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہو جاتی۔ لیکن جب وہ شہزاد کے پاس پہنچتا تو تخت پر بیٹھ کر مورچھل کراتے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہزار داستان کا کوئی شہزادہ ہو اور سوتے جاگتے کا دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے۔

صبح کے وقت شہزاد کھڑکی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی سے باتوں میں مصروف رہتی۔ "میں نے کہا ماں جی یہاں کھڑی کس کی راہ دیکھ رہی ہو۔"

"ہے لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو" ماں ہونٹ پر انگلی رکھ لیتی۔

"میں نے کہا چاچی" شہزاد چیختی۔ "کیا پکا ہے آج۔"

پھر وہ شمیم سے مخاطب ہوتی۔ "میں نے کہا وہ اپنے علی احمد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"میں کیا جانوں" شمیم جل کر کہتی "پوچھو راجو سے جو اسے بغل میں دبائے بیٹھی ہے۔"

"ہئے آخر تمہارا بھی تو حق ہے" وہ ہنسی۔

"نہ بہن میں اس سونٹھ کی گانٹھ کو لے کر کیا کروں گی۔" شمیم بولتی۔

اس پر علی احمد چوبارے سے نکل کر منڈیر پر آکھڑے ہوتے۔

"کیوں بھئی شہزاد۔" وہ چلاتے۔ "اب تو ہم کو بھی کبھی کبھی یاد کر لیتی ہو۔"

"جی" وہ بولتی "وقت وقت کی بات ہے۔ برا وقت کسی پر نہ آئے۔"

"ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے "لیکن چیز وہی جو برے وقت کام آئے۔"

ہم آئے تو ہے نا۔" وہ ہنس کر کھڑکی سے ٹل جاتی۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب ڈرامہ اس کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ صبح کے وقت اسے زب لور لگاؤ کا احساس دینے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب وہ جنگلے میں بیٹھا پڑھ رہا ہوتا تو شہزاد کسی کو مخاطب کر کے پوچھتی۔

کیوں جی کیا ہو رہا ہے۔"

ایلی جھٹ اوپر دیکھتا اور کتاب کی طرف اشارہ کرتا۔

"اوہو جی۔" وہ چلاتی "سارا دن بس آلو ہی چھیلتی رہتی ہو۔"

ایلی کتاب بند کر کے بیٹھ جاتا۔

"تو میں نے کہا زینب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔"

"اے ہے۔" زینب چیختی "میرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔"

"تمہیں کیا معلوم۔" شہزاد ہنسی۔

"آخر کیا بات ہے۔" زینب پوچھتی۔ "جو مجھ سے کرو گی۔"

"بات کا کیا ہے کوئی زبان سے تھوڑی ہی کی جاتی ہے۔ آمنے سامنے بیٹھ جاؤ تو بات بن آتی ہے چاہے منہ سے نہ بولو۔"

"ہے مجھے سامنے بیٹھا کر اب کیا بات بناؤ گی۔" زینب حیرت سے چلاتی اور ہنس ہنس کر ایلی ابرا حال ہو جاتا۔

پھر وہ کھڑکی سے جانے لگتی تو چیخ کر کسی سے کہتی۔ "ابھی آئی ہیں۔"

پر ٹھوکو

ایک روز رات کے نو بجے کے قریب جب ایلی محلے کی آوازیں سننے میں مصروف تھا دفعتاً الو کے مکان کے عقب سے شور و غل بلند ہوا۔ کوئی چیخیں مار رہی تھی۔ محلے والیاں کھڑکیوں میں آ کھڑی ہوئیں۔

"کون ہے ماں؟"

"اے ہے وہی سکینہ ہے۔ اس شرابی کی بیوی اور کون۔"

"کیا جانوں اسے پیٹ رہا ہے۔"

"کوئی نئی بات ہے بس حاجاں روز پیٹتا ہے' روز پیٹتا ہے۔"

"ہے نہ جانے پھر وہ کیوں رہتی ہے شرابی کے گھر میں۔"

"پوچھو اس سے۔"

"میں جانوں ماں ایسی بھی ہوتی ہیں کئی ایک۔"

"ایسی کیسی۔"

"جنہیں ہڈیاں تڑوانے کا شوق ہوتا ہے۔"

"ہے نہیں پھوپھی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"لو تمہیں کیا معلوم کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں ایسیوں کو۔"

"سکینہ تو ایسی نہیں۔"

"بس تو رہنے دے میری زبان نہ کھلوا۔"

میں نے کہا ماں ان کی بھنگن بتا رہی تھی مجھے کہہ رہی تھی۔ جو صفدر نہ پیٹے تو بیوی کا جی نہیں لگتا گھر میں۔"

"ٹھیک تو ہے شرابی جی نہیں لگائے گا تو کون لگائے گا۔"

"اب لڑکی یہ صفدر سمجھ لے چار دن کا مہمان ہے جب سے اس کا گھر چھوٹا ہے۔"

"کس کا ماں؟"

"اے ہے آہستہ بول" ماں بولی۔ "اپنی شہزاد کا تب سے کہتے ہیں سپرٹ پیتا ہے۔"

"وہ کیا ہوتی ہے ماں؟"

"اے ہوتی ہو گی کچھ۔ وہی جو مٹی کے تیل سے بنتی ہے جسے بھک سے آگ لگتی ہے' سارا کلیجہ جل چکا ہے۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ چھتی گلی سے شور سنائی دیا۔ اور پھر صفدر میدان میں کھڑا ہوا وہ لڑکھڑا رہا تھا اسے دیکھ کر عورتوں نے کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیئے اور درزوں سے دیکھنے لگیں ایلی پھلانگ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے صفدر کے روبرو جانے سی ڈر لگتا تھا۔ شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔

صفدر میدان کے درمیان کھڑا ہو کر چیخنے لگا۔ "سب چلی گئیں۔" وہ بولا "سب چلی گئیں مجھے دیکھ کر سبھی چلے جاتے ہیں۔" وہ رک گیا۔

پھر اس نے پتھر اٹھا کر شہزاد کی کھڑکی پر دے مارا۔ ٹک سے آواز آئی۔ "یہ کھڑکی بھی بند ..." وہ دیوانہ وار چلانے لگا "اب یہ کبھی نہیں کھلے گی کبھی نہیں کھلے گی۔ کھولو' کھولو" وہ ... صرف ایک بار صرف ایک بار سب کھڑکیاں کھول دو۔ اور پھر میرے منہ پر تھوکو مجھے ... کچھ کرو۔ خدا کے لئے وہ بیٹھ کر رونے لگا۔

...رتوں نے مردوں کو آوازیں دینا شروع کر دیا

...ی وہ بیٹھا رو رہا تھا کہ محلے کے دو ایک مرد میدان میں اتر آئے۔

...صفدر" اجو درزی بولا "یہ کیا تماشہ دکھا رہے ہو۔"

...دکھا تو نہیں رہا۔" صفدر نے جواب دیا۔ "تماشہ بن گیا ہوں۔"

...یوں بنتے ہو۔"

...ونوں میں نہیں بنتا۔" وہ بولا "مجھے حالات نے بنا دیا ہے۔ تمہاری قسم بھائی صاحب وہ ...ہے کہ ——" وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس نے ایک نظر اوپر کھڑکی پر ڈالی اور پھر ...ں نہیں میں نشے میں نہیں ہوں میں ہوش میں ہوں۔"

...بزرگ بولے۔

...لا نہ پیا کرو۔"

...ہوش میں آتا ہوں چچا۔ ویسے مردوں طرح پڑا رہتا ہوں۔ جیسے یہ ماجھا پڑی ہے۔"

...جاؤ۔" اجو نے کہا۔

...ماجاؤں" صفدر بولا "سب نے کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔

...گھر جاؤ۔"

...گھر" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "اپنا گھر۔ ہی ہی ہی ہی۔"

...نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹنے لگے۔

...نہیں میں ہوش میں ہوں —— ہوش میں ہوں —— تمہاری قسم"

...کے جانے کے بعد محلے کی بوڑھیوں نے بھریات شروع کر دی۔

...ہے کیا حالت بن گئی ہے اس کی۔"

...پہلے بھی تو پیا کرتا تھا۔"

...پینے کی بات چھوڑو اب جو دو سال میں یہ دوسرا نشہ ...

ہے۔"

"دوسرا نشہ کون سا ماں۔"

"اے آہستہ بات کر لڑکی۔ اگرچہ اس کی کھڑکی بند ہے پر وہ سب کچھ سن رہی ہے۔" ماں نے شہزاد کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس رات جب ایلی شہزاد کے پاس پہنچا تو وہ غیر از معمول خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ روئی روئی ہے۔

"تم اداس کیوں ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں تو" شہزاد نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"رو تو رہی ہو۔" وہ بولا۔

"کیوں کیا صفدر کا غم ہے۔" ایلی نے اسے طعنہ دیا۔

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ "ایلی" وہ بولی "مجھے اس کا طعنہ نہ دیا کرو۔"

"کیوں کیا جھوٹ ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں سچ ہے۔" وہ بولی "لیکن ——"

"لیکن کیا؟"

"اس کا ساتھ دے کر میں نے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہ سے گرا دیا۔ میں خود اپنی نگاہ سے گر گئی ہوں۔"

"کیوں" ایلی نے پوچھا "کیا میرا ساتھ دے کر تم لوگوں کی نگاہ سے نہیں گری تھیں۔"

"نہیں" بولی۔

"بدنام نہیں ہوئی کیا؟"

"ہوئی ہوں۔ لیکن میں ذلیل نہیں ہوئی۔ الٹا مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔"

"یہ کیا دلیل ہوئی؟" ایلی ہنسنے لگا۔

"مجھے نہیں پتہ کیوں بدنامی کے باوجود میری تذلیل نہ ہوئی بلکہ میری گردن اونچی رہی۔ لوگ باتیں کرتے رہے۔ بکتے رہے میں نے ذرا بھر پروا نہ کی۔ لیکن چھوٹے آدمی کو منہ لگا کر ذلیل ہو گئی۔ شہزاد کے منہ سے بے ساختہ ایک دبی ہوئی ہچکی نکل گئی۔ ایلی حیران تھا۔ اس نے شہزاد کو ایسی بے بسی اور خود ترسی کی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

فن کا شیدائی

ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھی کہ احاطے کے میدان میں شور بلند ہوا "حرامزادہ جائے گا کہاں۔" پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چاروں طرف کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ بوڑھیاں چلانے لگیں۔

"کسے پکڑ لیا ماں؟"

"پتہ نہیں۔"

"اسی حرامی کو ماں۔"

"اے کس کو۔"

"کمینہ —— ساجھا کو پکڑے بیٹھا تھا۔"

"اے اللہ" چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔

مرد جوتی پہن کر باہر کی طرف بھاگے۔ عورتوں نے لالٹینیں جلائیں۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا

گھبرا گیا۔

"میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"گھر میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں موجود نہیں۔"

"پتہ چل جائے گا۔" وہ بولی اور اس نے ایلی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس پر ایک چادر ڈال دی اور پھر کھڑکی کھول کر ایلی کو اسی طرح ساتھ لپٹائے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔"

ایلی چلایا۔

"تو نہوں۔ مرو نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" شہزاد نے گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا پھر با آواز بلند چلانے لگی۔

"کون ہے یہ ماں؟"

"نہ جانے کون ہے" ماں نے جواب دیا۔

"ذرا دیکھو تو۔ کیوں چچا دیکھا اسے۔"

"کوئی باہر کا ہے۔"

نیچے سے کسی نے جواب دیا۔

سامنے جنگلے سے شمیم چلائی "شہزاد یہ ساتھ کسے چمٹائے کھڑی ہو۔" شہزاد قہقہہ لگا رہی۔

"جانوں تو نہیں" شمیم نے پوچھا۔

"لو تم بھی حد کرتی ہو۔ بھلا جانوں کو بغل میں دبانے کو کس کا جی چاہے گا۔"

میدان میں پھر شور مچ گیا۔ وہ اسے لوہے کی نال سے باندھ رہے تھے۔"

"یہ ٹھیک ہے' یہ ٹھیک ہے۔" وہ چلا رہے تھے۔

"رات بھر تو یہاں نل سے بندھا رہے صبح بات کریں گے۔"

ہر کوئی اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا۔

ایلی سوچ رہا تھا ایک دن وہ بھی اسی طرح پکڑا جائے گا۔ اور وہ سب اس کے منہ پر تھوکیں گے۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"نہ جاؤ۔" وہ بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟ تمہیں ؟"

"ہاں" وہ بولی "اب تو ہر بات پر ڈر لگتا ہے۔"

"اور اس وقت تو یوں نڈر کھڑی ہو۔"

"اس وقت تم جو ہو سو ہو۔ تم ساتھ ہو ایلی تو میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کسی سے نہیں۔"

"آہستہ بولو۔" وہ چلایا "کوئی سن لے گا۔"

"پڑا سن لے۔" وہ بولی "اس دوزخی سے نجات ملے۔"

"یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔" ماں نے پوچھا۔

"سہیلی ہے میری" وہ ہنس کر بولی۔

"تیری سہیلیوں کا بھی شمار نہیں لڑکی۔" ماں بولی۔

ایلی پھر گھبرا گیا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ کر چلا آیا۔

شہزاد کی دیدہ دلیری کو دیکھ کر ایلی بے حد خوش ہوتا تھا شاید اس لیے کہ اس کی دلیری میں عجیب سی رنگینی کی جھلک ہوتی تھی یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کر ایلی خود بے حد ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کی دلیری سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔

لیکن کچھ دیر کے بعد اس دلیری کا ایلی کے دل پر عجیب سا رد عمل ہوتا۔ اس کے دل میں ے متعلق عجیب و غریب شبہات پیدا ہوتے۔ شاید اس وقت جب میں شہزاد کے پاس تھا۔ ے کسی اور کو دوسرے کمرے میں چھپا رکھا ہو۔ شاید میرے علی پور سے جانے کے بعد کا وہی دروازہ کسی دوسرے کے لیے بھی کھلتا ہو۔ شاید بیک وقت وہ کئی ایک سے کھیل ہو۔ شاید——

ایلی کے دل میں شبہات یوں بھنبھناتے جیسے حلوائی کی دکان پر مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔ اس کی منے عجیب و غریب مناظر یوں آ کھڑے ہوتے جیسے وہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہوں۔" پھر دیو اسے اپنی چنگل میں لے لیتا اور وہ کرب سے تڑپتا۔ یہ کرب اس حد تک شدت کر لیتا کہ ایلی کا سانس بند ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا اور سینہ پھٹنے لگتا۔ شاید یہی جذبۂ رقابت اس کے لیے تازیانہ بن جاتا۔

اس رات شہزاد کے گھر سے واپس آنے کے بعد اسے احساس رقابت کا شدید دورہ پڑ گیا۔ دان سے سب لوگ جا چکے تھے۔ عورتوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں محلے پر سناٹا چھایا ہوا گلی کی منڈیر کے پاس ماجھا کا غلیظ ڈھیر لگا تھا۔ سامنے کی دیوار کے قریب نل کے ساتھ اجنبی شیدائی بندھا ہوا تھا۔ ایلی جوش رقابت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ عین اسی طرح رسے کے بند کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دفعتاً ایلی کو خیال آیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

اجنبی کی دیوانہ وار جدوجہد سے ایلی کو یہ شبہ گزرا کہ وہ اس قید سے مخلصی پانے کے لیے نہیں کر رہا۔ بلکہ ماجھا کے تعفن کی لذت کا ایندھن اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنا آپ اس غلاظت بھرے کنویں میں چھلانگ لگا دے۔ اگر وہ اجنبی کو کسی ایسی جگہ باندھے جہاں ماجھا کا قرب حاصل کرنے کا امکان نہ ہوتا تو غالباً" وہ صبح تک چپ چاپ دیوار سے لگا کھڑا

ایلی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کتنی مناسبت تھی۔ دونوں ہی ماجھا کے دیوانے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ اس ماجھا سے خوشبو آئی تھی۔ وہ گونگی تھی اس کے تکلم میں شوخی تھی۔ ی چاہتا تھا کہ دبے پاؤں اتر کر اس ماجھا کے دیوانے کو کھول کر آزاد کر دے' لیکن پھر خیال لا رسہ جو اس کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بندھن نہ تھا۔ اس کا بندھن تو ماجھا تھی' اس

کا تعفن تھا۔

چاہے کچھ بھی ہو اس نے سوچا اور چپ چاپ اٹھ کر دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میدان میں پہنچ کر اس نے نل کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بھاگ گیا۔ اس نے سوچا۔ ڈر کر بھاگ گیا۔ وہ واپس اوپر آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

دفعتاً اس کی نگاہ میدان پر پڑی۔ ماجھا کے ڈھیر کے قریب ہی ایک اور ڈھیر اس کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ چپکے سے لیٹ گیا۔ جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

دور ماجھا ور' ور' کر کے کسی کتے کو دھتکار رہی تھی۔

محلے کی چمگادڑیں چیخ رہی تھیں۔ دور بہت دور کوئی گاڑی ہونک رہی تھی۔

نہ جاؤ نہ جاؤ

ایک روز رات کے ایک بجے کے قریب شہزاد کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ہاجرہ کی چارپائی کے قریب پہنچا تو ہاجرہ دفعتاً چونک کر بیدار ہو گئی اس نے چارپائی سے ایک جست لگائی اور آ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

ہاجرہ کے جاگنے پر ایلی قطعی طور پر نہ گھبرایا۔ چونکہ وہ رات کو اکثر اٹھ کر پیشاب کرنے کا عادی تھا۔ بچپن ہی سے ایلی کو مسلسل البول کی شکائت تھی۔ سبھی جانتے تھے۔ کہ وہ بار بار پیشاب کرنے کا عادی ہے اگر ہاجرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس میں گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی۔

"کیوں کیا بات ہے؟" ایلی نے دوہرایا۔

ہاجرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔

"تم ادھر نہ جاؤ ایلی" ہاجرہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"کدھر" ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"میں تمہاری منت کرتی ہوں" وہ اپنی ہی دھن میں بولتی گئی۔ دیکھو میں پاؤں پڑتی ہوں۔"

"لیکن کس لیے اماں" ایلی تنگ کر بولا۔

"نہ بیٹا میری بات مان لے۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

"مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"کس نے بتا دیا ہے۔ کیا بتا دیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"حاجی صاحب نے۔" بولی۔

"کون حاجی صاحب؟"

"نہ بیٹا" وہ بولی۔ "آہستہ بول۔ سب جاگ اٹھیں گے کیا فائدہ۔"

"لیکن اماں مجھے کچھ پتہ بھی چلے۔"

"ادھر آ۔ ادھر میں تجھے بتاؤں" وہ اسے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔

"حاجی صاحب میرے مرشد ہیں" وہ بولی "وہ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ ابھی ابھی انہوں نے جھنجوڑ کر جگایا اور کہنے لگے ایلی ادھر جا رہا ہے۔ اسے روک لے۔ اور میں گھبرا کر جاگ پڑی کیا دیکھتی ہوں کہ تم کھڑے ہو۔"

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "اماں تم بھی حد کر دیتی ہو۔ وہ بولا "کون جا رہا ہے کہاں جا رہا ہے۔ میں نے تو پیشاب کرنے کے لئے اٹھا تھا تمہارے مرشد کو غلطی لگی ہے۔"

"نہ نہ نہ" ہاجرہ چلائی "ایسا نہ کہو۔ تم نہیں جانتے۔ تمہیں معلوم نہیں۔"

"تو نہیں ہو گا۔" ایلی بولا "اب آرام سے سو جاؤ۔"

اس کے بعد دیر تک ایلی جاگتا رہا۔ لیکن اسے شک تھا کہ ہاجرہ ابھی جاگ رہی ہے۔ اس مرشد نے کیا گڑبڑ ڈال دی تھی۔ خواہ مخواہ پھر جب ہاجرہ خراٹے لینے لگی تو ایلی نے دیکھا کہ بج چکے تھے اور ادھر جانا بالکل بے کار تھا۔ لہٰذا اس نے ادھر جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو فرحت کے ہاں لے گئی اور ابتدائی خاطر تواضع اور منتیں کرنے کے بعد کہنے لگی "ایلی میری ایک بات مان لے صرف ایک بات اس کے بعد جو جی میں آئے کرنا۔ پھر نہیں کہوں گی۔ صرف ایک بات مان لے میری خاطر۔"

"کیا بات ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"تو جا کر حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔ بس اور کچھ نہیں۔"

"بیعت" ایلی نے حیرت سے پوچھا "وہ کیا ہوتی ہے۔"

"ہوا بھی ہوتی ہے۔" وہ بولی "چاہے کچھ بھی ہو وہ تو کر لے۔"

"اماں تو بھی پاگلوں سی باتیں کرتی ہے۔" فرحت نے کہا۔

"چلو میں پاگل ہی سہی۔" ہاجرہ نے کہا۔

ایلی رضامند ہو گیا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ ویسے عام طور پر وہ ہاجرہ کی بات سن کر ہنس دیا کرتا تھا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ بولا "بس اتنی سی بات ہے چلو میں بھی اس مرشد کی زیارت کر آؤں جو آدھی رات کے وقت آکر اماں کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر پریشان کرتا ہے۔"

اس بات پر ہاجرہ اس قدر خوش ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی اس نے فوراً روپے کا انتظام کیا اور دوڑی دوڑی جلیل کے پاس پہنچی۔ جلیل آصفیہ کا بیٹا تھا۔ جو ہاجرہ کی سگی بہن کی لڑکی تھی۔

اب جلیل وہ جلیل نہ تھا جس سے کسی زمانے میں ایلی واقف تھا۔ جب وہ رفیق اور یوسف مل کر ان کے ہاں جایا کرتے تھے اور جلیل آنکھیں بنا بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا جو ان کی بیٹھک کے متصل کی گلی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ اور پھر وہ یوسف کو بنایا کرتے تھے اور وہ بنتا تھا اور بازی گروں کی طرح قلا بازیاں لگاتا جسے دیکھ کر لڑکی بے حد محظوظ ہوتی تھی۔

اب جلیل کا طرز زندگی بدل چکا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ باقاعدہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ جلیل نے بھی انہی حاجی صاحب کی بیعت کر لی تھی۔ اس کی تبدیلی اس قدر حیرت انگیز تھی کہ اس کا چہرہ تک بدل گیا تھا۔ شاید ہاجرہ کا خیال تھا کہ حاجی صاحب سے بیعت کر لینے کے بعد ایلی بھی داڑھی رکھ لے گا۔ نماز پڑھنے لگے گا اور اس کی زندگی بھی یکسر بدل جائے گی۔

اگلے روز جب ایلی شہزاد سے ملا تو اس نے اماں کی ساری بات سنائی۔ وہ ہنسنے لگی۔

"بیچاری ہاجرہ۔" وہ بولی۔ "اسے علم نہیں کہ ہمارا بالکا کسی اور کا مرید نہیں بن سکتا۔ حاجی صاحب جتنا چاہے زور لگا لیں۔ ڈھاک کے وہی تین پات رہیں گے۔"

"لیکن یہ بیعت کیا ہوتی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ۔" وہ بولی "ہاجرہ تو مجھے بھی مجبور کر رہی تھی۔"

"کس لئے؟"

"کہ میں بھی بیعت کر لوں حاجی صاحب کی۔ مجھ سے ہاجرہ نے کہا۔ رابعہ نے اصرار کیا۔ رفیق نے منتیں کیں۔ ان دنوں حاجی صاحب یہیں آئے ہوئے تھے۔ علی پور میں۔ اور یہ سب

ہاں ان کے گرد بیعت کی بھیڑ لگائے بیٹھے تھے جیسے بتاشے بٹ رہے ہوں۔"

"تو پھر تم نے کیوں نہ کی۔" ایلی نے پوچھا۔

"پہلے سے ہی نہ کی ہوتی تو کر لیتی۔" وہ بولی۔

"پہلے سے کی ہوئی ہے تم نے۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"کس کی۔"

"تمہاری اور کس کی۔" وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔ "مجھے اتنا زبردست مرشد ملا ہے کہ ب کسی اور کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔

لی

اگلے روز ایلی جلیل کے ساتھ دلی روانہ ہو گیا۔

دلی میں وہ غلام احمد کے گھر ٹھہرے۔ غلام احمد ان کا عزیز تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ خوش شکل تھا اور رنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ اسے گانے کا بہت شوق تھا۔ اور جب وہ گاتا تو اس کا چہرہ کسی انجانی جذبے سے منور ہو جاتا۔ اسے بہت سے گیت یاد تھے۔ خصوصاً ایسے گیت جن کی دھنیں چلنت تھیں۔ اور گاتے ہوئے سماں بندھ جاتا تھا۔ دلی پہنچتے ہی جلیل نے کہا کہ وہ اسی شام حاجی صاحب کی طرف جائیں گے۔

غلام احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا "شام کے وقت بزرگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں کل صبح ملیں۔"

پھر وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا "چلو بھائی صاحب۔ آج شام کو دلی کی سیر رہے"

جب جلیل نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا تو احمد نے ایلی کو کہنی ماری: "کل تو بھائی صاحب آپ باقاعدہ طور پر مرید بن جائیں گے۔ پھر تو دنیا ہی بدل جائے گی۔ آج آخری مرتبہ ذرا آزادی سے گھوم پھر لو۔ آؤ دلی کی بانکیاں دکھائیں تمہیں۔

احمد ایلی کو لے کر چاوڑی جا پہنچا۔ پہلے تو اس نے سارے بازار کا جائزہ لیا۔ پھر باری باری بالاخانوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو ایلی گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہر بیٹھک پر لوگ احمد کو بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور یوں باتیں کرتے ہیں جیسے مدت کی جان پہچان

ہو۔ تو وہ مطمئن ہو گیا۔

دلی کی طائفہ کو دیکھ کر ایلی بہت حیران ہوا۔ طائفہ تو اس نے لاہور اور امرتسر میں بھی دیکھی تھیں لیکن یہاں بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسبیاں ہیں اور بازار میں کاروبار کے لئے بیٹھی ہیں۔

ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ تھی۔ انداز میں نمائش نام کو نہ تھی بلکہ ایک عجیب سے دوستانہ اور گھریلو انداز کی آمیزش تھی۔ احمد صرف ان بیٹھکوں پر جاتا تھا جہاں محفل نہ لگی ہو اور اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملے۔ وہ ایک سے اس نے گانے کی بھی فرمائش کی۔ ان کا گنگنانا کس قدر پیارا تھا۔ چونکہ اس وقت وہ رسمی ساز کے شور و شغب سے پاک تھا۔ وہ یوں بیٹھی گا رہی تھی جیسے کوئی گھروالی ہنڈیا پکاتے ہوئی گنگنا رہی ہو۔

ہو کے رہے گا

اگلے روز صبح سویرے جلیل اور ایلی حاجی صاحب کی طرف چل پڑے۔

دیر تک وہ بلی ماراں کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ آخر ایک مکان پر پہنچ کر جلیل نے دستک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔

ان کا قد درمیانہ تھا۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال نستعلیق تھے جسم دبلا پتلا۔ چہرے پر جلال اور دبدبے کی بجائے بے بسی اور عجز چھایا ہوا تھا۔ البتہ ان کی سرمے سے بھری ہوئی آنکھیں بے حد منور اور نم آلود تھیں اور ان کا سر حرکت کر رہا تھا۔

"کیا یہ ہیں ——— حاجی صاحب؟" ایلی نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے دل سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب ایک انسان ہیں۔ نہ تو دیوتا ہیں اور نہ پیر یا ولی! ان سے بات کی جا سکتی ہے اور ان کی بات کاٹی جا سکتی ہے۔

جلیل حاجی صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور ایلی سوچ رہا تھا۔

جلیل سے باتیں کرنے کے بعد حاجی صاحب ایلی کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ اور سب طرح خیریت ہے۔ جملہ متعلقین اچھے ہیں۔ آج کل آپ کہاں ملازم ہیں۔"

انہوں نے ایسے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اور ایلی رسمی طور پر ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔

پھر وہ حاجی کے ہمراہ جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔

ہر چند قدم کے بعد کوئی نہ کوئی راہ گیر حاجی صاحب کو جھک کر سلام کرتا اور وہ بڑے اخلاق سے باتیں کرتے اور پھر جلد ہی رخصت طلب کر کے آگے چل پڑتے۔ ان کا سر اسی طرح حرکت کر رہا تھا۔ جیسے گردن اور سر کے درمیان ایک زم تار لگا ہو جو سر کے بوجھ کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جامع مسجد پہنچ کر حاجی صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایلی سے کہا۔

"بھائی وضو کر لو۔"

ایلی کو وضو کرتے دیکھ کر حاجی صاحب خاموش رہے۔ جلیل نے ایلی کو ٹوکا۔

"اونہوں۔" جلیل بولا "ایسے نہیں بلکہ ———"

حاجی صاحب نے جلیل کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں کرنے دیجئے جیسے بھی یہ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔"

ایلی نے حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب پیر ہے جو احکام صادر نہیں کرتا۔ اس کی آواز اس قدر مدھم ہے۔ پیروں کی آواز تو حلق کے نچلے پردے سے نکلا کرتی ہے اور انداز جابرانہ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑے ملائم انداز سے بات کر رہا ہے جیسے معذرت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کا تمام تر وجود ایک معذرت ہے۔

ایلی کو شک پڑنے لگا کہ وہ پیر نہیں بلکہ کوئی تاجر ہے جس نے پیری مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے۔ پیر تو ہونے والے مریدوں کو ڈانٹتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں۔ ایلی کو براہ راست کسی پیر سے ملنا نہیں پڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پیر کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پیر بڑے بارعب اور جلالی ہوتے ہیں اور مریدوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

پیر یا تاجر

بہرحال اسے یقین ہو گیا کہ حاجی صاحب نے پیر بننے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وضو کرنے کے بعد انہوں نے ایلی کو اپنے روبرو بٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کچھ پڑھنے لگے

"ایک بات پوچھوں۔" ایلی نے کہا۔

"جی فرمایئے۔" حاجی صاحب بولے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"آپ کی والدہ کے حکم کو بجا لا رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"لو سن لو۔" ایلی نے سوچا۔ "اپنے مرید کا حکم بجا لا رہا ہے۔ کسی پیر نے کبھی مرید کے متعلق ایسی بات کی ہے کیا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

"پھر بھی۔" ایلی نے پوچھا "اس عمل کو کیا کہتے ہیں۔"

"اسے بیعت کہتے ہیں۔"

"بیعت کیا ہوتی ہے۔"

"بیعت ایک تعلق ہوتا ہے جیسے دوستی ہوتی ہے۔"

"دیکھئے حاجی صاحب۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے۔"

اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنا دیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔"

"کیوں۔" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں وہ نیکی چاہتا ہوں جو میرے دل سے نکلے۔ کسی کی بخشی ہوئی نہ ہو۔"

وہ ہنسنے لگے۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔"

"ارے۔" ایلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا "یہ تو بالکل ہی تاجر ہے۔"

"اگر آپ اپنی نیکی اور عبادت کے زور سے مجھے اللہ سے ملا دیں۔" ایلی نے کہا "تو بھی مجھے منظور نہیں۔ ملنا ہے تو میں اپنے زور پر ملوں گا۔ اس کے علاوہ" وہ بولا "میں نہیں چاہتا کہ بدلوں۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہوں۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔" وہ بولے۔ "نہایت اچھے خیالات ہیں آپ کے۔"

"ارے۔" ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ "بالکل ہی نیا قسم کا مرشد ہے یہ۔"

"باقی رہا تعلق کا سوال۔" ایلی نے کہا "تو ابھی میرا اور آپ کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ تعلق تو دل کی بات ہے جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتا ہے۔ اگر آپ والدہ صاحبہ کا فرمان پورا

کرنا چاہیں تو بسم اللہ۔"

"بہت خوب۔" حاجی صاحب نے کہا۔ اور از سر نو اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔

"ایک بات اور ہے۔" ایلی نے پھر انہیں ٹوکا۔

"ہاں ہاں۔" وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"اس وقت میرے دل میں سپردگی یا حوالگی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔"

حاجی صاحب نے پیار بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

چار ایک منٹ وہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسرت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جلیل سے مخاطب ہوئے۔

"جلیل صاحب" وہ بولے۔ "آپ والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں۔ ان سے کہیں کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ لیکن ان سے کہہ دیں کہ ——"

جلیل نے ان کی بات کاٹ کر کہا "لیکن حاجی صاحب بیعت ——" اور پھر بامعنی انداز میں ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔ "کوئی بات نہیں۔"

وہ بولے "ایلی صاحب ہمارے دوست ہیں۔ مخلص ہیں اور ہم اپنے دوست سے کوئی بات چھپا کر نہ کریں گے۔"

ایلی نے پھر حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولے۔" چونکہ ہمارے دل میں آپ کی دوستی کی خواہش ہے لہٰذا اس خواہش کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آپ کا دوست سمجھتے ہیں۔ چاہے آپ کے دل میں ایسی خواہش ہو یا نہ ہو۔ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ دیکھئے نا اگر آپ کے دل میں اللہ کی دوستی کی خواہش پیدا ہو جائے تو یقیناً" آپ اللہ کے دوست بن جائیں گے۔ خواہش بڑی چیز ہے ایلی صاحب —— ہاں تو جلیل صاحب آپ والدہ محترمہ سے کہہ دیں۔" حاجی صاحب نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ان سے کہہ دیں کہ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ ہمارا مطلب ہے جس بات کا والدہ محترمہ کو ڈر ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ جو اللہ کو منظور ہے وہی ہو گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ اسی میں بہتری ہے۔"

"اور" حاجی صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ "والدہ محترمہ سے کہہ دیں کہ ابھی وقت

نہیں آیا —— وقت آئے گا۔ ضرو آئے گا اور بہت اچھا ہو گا۔ بہت اچھا۔ ماشاء اللہ ایلی صاحب کے خیالات بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ بہت اچھا ہو گا۔ گھبرائیں نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ایلی صاحب بہت اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ ان کی خوشنودی حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ۔

جادو کی مرہم

اسی روز شام کے وقت وہ دوبارہ حاجی صاحب سے ملے تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

”جلیل صاحب۔ آپ آگئے۔ اچھا کیا آپ نے۔ اب آپ نماز سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں ایلی صاحب کو دلی کی سیر کرا لوں۔ کیوں ایلی صاحب۔ آپ دلی کی سیر کریں گے۔ آیئے۔“

ایلی نے پھر حیرت سے اس عجیب و غریب پیر کی طرف دیکھا۔ درحقیقت اب وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ حاجی صاحب پیر' ولی یا اللہ لوک ہیں۔ اب وہ انہیں تاجر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ ہی بنیا۔ اب حاجی صاحب اس کے نزدیک ایک خوش مزاج با اخلاق اور اخلاص سے بھرا انسان تھا۔

وہ دونوں چل پڑے۔

ایلی حیران تھا کہ یہ منحنی سرد چشم نحیف و نزار آدمی اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ بھلا اسے دلی کی کیا سیر کرا سکتا ہے۔ دلی کی سیر تو احمد نے کرائی تھی۔ واہ واہ کیا چیزیں دکھائی تھیں۔ لیکن احمد کے ساتھ جانے میں ایک قباحت ضرور ہوئی تھی۔ احمد کا طائفہ کے ساتھ کچھ ایسا طرز عمل تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا بھڑوا ہو۔ وہ اسے اہمیت ضرور دیتی تھیں لیکن ایسی اہمیت جیسے بھڑوے کو دی جاتی ہے۔ وہ اس سے یوں بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا دوست نہ ہو بلکہ ہم کار ہو۔

”آپ نے دلی کی سیر کی ہے کیا۔“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

ایلی چونکا۔ ”جی ہاں۔“

”کون کون سی جگہ دیکھی ہے۔“ وہ بولے۔

”جی چاوڑی میں گیا۔“

ایلی کا جواب سن کر حاجی صاحب چونکے۔

”خوب۔“ وہ بولے۔

”کیا آپ نے کبھی چاوڑی کی سیر کی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”ہم تو بھائی وہیں رہا کرتے تھے۔“

”وہاں رہا کرتے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیمسٹ کی دکان تھی۔ کلکتے میں ہیڈ آفس تھا۔ بمبئی اور دلی میں برانچیں تھیں۔“

”ارے۔“ ایلی چونکا۔ ”تو کیا گھاٹا پڑ گیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولے۔ ”بس چھوڑ دیا کاروبار۔“

”کیوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اللہ میاں نے اپنی طرف بلا لیا۔“

”اللہ میاں سے دوستی ہے کیا۔“

”نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”ابھی تو معمولی جان پہچان ہوئی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”ضرور پوچھئے۔ جو جی چاہے پوچھئے۔“

”اللہ میاں کیسے ہیں۔“

”بہت پیارے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”بہت ہی پیارے۔“

”وہ تو بہت سخت ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

حاجی صاحب مسکرائے۔ ”سخت ہوتے تو کیا ہم سب اس قدر بگڑے ہوئے ہوتے۔“

ایلی کو یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے اس زاویے سے اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک عظیم ہستی تھی۔ بے نیاز۔ بے پروا!!

”ایلی صاحب!“ وہ بولے۔ ”اللہ تعالیٰ سے دوستی کر کے دیکھو۔ اس قدر مخلص دوست کہاں مل سکتا۔“

”میں اس قابل نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”قابلیت اور اہلیت وہ خود عطا کرتے ہیں۔“ حاجی صاحب نے کہا ”صرف ان کی دوستی کی

خواہش پیدا کرو۔ صرف خواہش۔"

"خواہش تو خود پیدا ہوتی ہے زبردستی پیدا نہیں کی جا سکتی۔" ایلی نے کہا۔

"تو یہ خواہش ان سے مانگو۔ اللہ میاں سے یارانہ خوبصورت سے خوبصورت عورت کے یارانے سے کہیں زیادہ رنگین ہے۔"

حاجی صاحب کی باتیں عجیب تھیں۔ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص کا تخیل کس قدر رنگین ہے۔ اس کی غمناک نگاہ میں کتنی وسعت ہے۔

"کیا آپ نے کبھی عورت سے بھی یارانہ لگایا تھا۔" ایلی نے پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ "ہاں ہاں۔"

"مجھے بتایئے۔" ایلی بولا۔

"ہم نے ایک مرہم بنایا تھا۔"

"کیسا مرہم۔"

"ہم نے بہت سی ادویات سے ایک مرہم تیار کیا اور پھر سات روز ایک وظیفہ کیا ایسے مقام پر وظیفہ کیا تھا جو لق ودق ویرانہ تھا۔ بمبئی میں سمندر کے ساحل کے پاس ایک پرانا لائٹ ہاؤس تھا جو مسمار ہو چکا تھا۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے وظیفہ پڑھا اور پھر مرہم مکمل ہو گیا۔ وہ وظیفہ بھی اس مرہم کا ایک جزو تھا۔

"لیکن وہ مرہم کیوں بنایا آپ نے۔"

وہ مسکرائے۔ "بھائی نوجوان تھے۔ عورتوں کا شوق تھا۔ ان دنوں جی چاہتا تھا کہ ایسی چیز ہاتھ لگے کہ جس عورت سے آنکھے چار ہوں وہ دل و جان سے ہم پر نثار ہو جائے۔ ان دنوں جوانی کا جوش تھا۔ روپیہ عام تھا۔ صحت ماشاء اللہ جوبن پر تھی۔ عاشق مزاج لڑکپن ہی سے تھے۔"

ایلی سننے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ یہ وہی حاجی صاحب ہیں جن کی بیعت کرنے کے لئے وہ علی پور سے دلی آیا تھا۔

"مرہم کا نسخہ ہمیں بڑی تلاش سے ملا تھا۔" حاجی صاحب نے پھر قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ "ایک سادھو سے ہمیں یہ نسخہ ملا بہت گیانی قسم کا سادھو تھا۔ اس نے سالہا سال تپسیا کی تھی لیکن گیانی ہونے کے باوجود بڑا موجی آدمی تھا۔ میں نے صبح شام اس کی خدمت کی تو ایک روز بولا۔ "ارے عقل کے اندھے۔ مانگا بھی تو کیا مانگا تو نے۔ بھگوان کے د، شن مانگتا۔ یہ نہیں تو

...نے کی بدھی مانگتا۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ سندر تا بھری نار بننے کی رکشا کرتا۔ نار میں ...تی ہے اگر کچھ بننا ہو تو محبوب بنو۔ عاشق نہ بنو۔ لگن نار مانگی تو کیا مانگا۔ اپنے آپ کو بھسم ...گے تو کیا ہو گا؟ اچھا اب جو مانگا ہے وہی پاؤ گے۔"

ایلی حیرت سے حاجی صاحب کی بات سن رہا تھا۔

...ہیں تو ایلی بھائی ہم نے وہ مرہم بڑی محنت سے تیار کیا۔ اس مرہم کی خاصیت یہ تھی کہ ...ایک سلائی آنکھ میں لگا کر جس عورت کی آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ وہ تمہارے پیچھے چل ...گی۔ تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔"

"اچھا۔ تو پھر آپ نے وہ مرہم آزمائی۔" ایلی نے پوچھا۔

"صرف ایک بار۔" وہ بولے۔

"اس کا اثر ہوا۔"

"ہاں۔ اس قدر اثر ہوا۔ اس قدر اثر ہوا کہ ——" وہ رک گئے۔

لب خالی طلب

"شام کا وقت تھا۔ بمبئی کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ وہ مرہم لگا کر ہم چوپاٹی کے ساحل پر جا ...اس وقت ساحل کے باغیچے میں بنچ پر ایک پارسی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت ...اگرچہ نوجوان نہ تھی۔ ہم اس کے پاس جا بیٹھے اور اس تاک میں رہے کہ کب وہ ادھر ...اور اس سے آنکھیں چار ہوں۔

جب آنکھیں ملیں تو وہ گویا ہمیں دیکھ کر بھونچکی سی رہ گی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ ...اور وہ ٹکٹکی باندھ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک تو ہمیں اس کا بہت لطف آیا۔ ...پھر ہم گھبرا گئے۔

"گھبرانے کی کیا بات تھی۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی۔" وہ بولے۔ "کیا وہ نگاہیں جھکائے رکھنے والی عورت۔ اور کہاں آنکھوں میں ...میں ڈال کر دیدہ دلیری سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والی۔ نہ اس کی نگاہ میں شرم تھی نہ ...اور پھر اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت اس میں ...نسائیت نہ رہی تھی۔"

ایلی بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"بہت جلد ہم اس سے اکتا گئے۔" انہوں نے پھر بات شروع کی۔ "پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اور شیار سڑک پر چل رہی ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں ملائیں تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اب وہ کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح آدھ گھنٹے میں ہمارے گرد تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر آنے جانے والوں نے مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک سپاہی آ گیا۔ اس کے روبرو ہم تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن وہ اسی طرح ٹکٹکی باندھ کر ہماری طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کر دی اور ہم وہاں سے کھسک آئے۔"

"پھر اسی رات ہم تھیٹر دیکھنے چلے گئے۔ ہمارے اگلے صوفے پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جب وقفہ آیا تو ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ہم پہلے ہی تاک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خوب آنکھیں چار کیں۔ ان کی بھی وہی حالت ہوئی۔ اب وہ مستقل طور پر منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن وہ اسی طرح سٹیج کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی رہیں۔ ان کے لواحقین نے ہزار کوششیں کیں کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھیں لیکن لڑکیوں نے ان کی بات کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہنگامہ ہو گیا اور ہم وہاں سے بھی بھاگے۔

"عجیب مرہم تھا وہ۔" ایلی بولا۔

"ہم نے تو یہ محسوس کیا کہ جس کی طرف ہم دیکھتے تھے اس کی روح گویا شل ہو جاتی تھی اور خالی جسم رہ جاتا اور پھر اس جسم سے خوف آنے لگتا۔ نسائیت تو گویا ختم ہو جاتی۔ یعنی گلاب کے بجائے کدو کا پھول رہ جاتا جس میں نہ بو ہوتی نہ باس۔ یہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ طلب ہی واحد چیز ہے حصول کی کوئی حیثیت نہیں۔ بس ہم نے وہ مرہم سمندر میں پھینک دیا۔ اور دل میں سما گئی کہ کیوں نہ ایسی طلب پیدا کریں جہاں حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی طلب۔ بس دفعتاً طبیعت نے پلٹا کھایا اور سب کچھ چھوڑ دیا ——— سب کچھ کاروبار، شوق، تفریح سب کچھ۔"

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو رہے پھر بولے۔

"ایلی صاحب یہ تو سب بہانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں جب چاہیں اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ ہم پر بھی کرم کر دیا انہوں نے۔ ان کی کرم نوازیاں ہیں۔" وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگے۔

"آیئے ایلی صاحب۔ آپ کو اللہ کے بندوں سے ملائیں۔ ہمارے پاس اور کیا ہے۔ بس ماحضر تو بس یہی توفیق والی بات ہے۔"

"جی اچھا۔" ایلی نے جواب دیا۔

عربی ماسٹر

——— "تو کن سے ملیں گے آپ عقل والوں سے یا دل والوں سے یہ دلی تو اللہ کے بندوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک انوکھا ہے۔ ایک سے ایک نرالا ہے۔ دلی پر خدا کا ہمیشہ کرم رہا ہے۔ اس شہر سے انہیں بہت لگاؤ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے لئے خزانوں کے منہ کھول رکھے ہیں۔ جس کی جتنی ہمت ہو اٹھا لے۔ اور بھائی ہم تو ابھی مبتدی ہیں اس مکتب میں ابھی الف کے چکر سے نہیں نکلے۔ ہاں تو بتایئے عالم سے ملیں گے یا......؟"

"جی۔ عالم سے ملایئے۔" ایلی نے جواب دیا۔ ایلی ابھی عقل کے چکر سے نہیں نکل پایا تھا۔ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ اس کی دانست میں انسان کی نفسیات میں صرف دو چیزیں اہم تھیں۔ عقل ذہن۔ ایلی کو یہ علم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ قلب کیا ہے اور روح کس بلا کا نام ہے۔

چوبارے پر چڑھتے ہوئے حاجی صاحب کہنے لگے "جن صاحب سے آپ کو ملانے جا رہے ہیں ان کا نام محمد حسین ہے۔ عمر بھر عربی پڑھاتے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ۔"

"عربی ماسٹر!" ایلی کے ذہن میں حقارت کی ایک رو دوڑ گئی۔ عربی ماسٹر بھلا کیا عالم ہو گا۔ انہیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ عربی ماسٹروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ حلق کے نچلے پردوں سے بات کرتے۔ بار بار لاحول پڑھتے اور تہذیب جدید کی ہر بات پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے چڑ تھی۔ جسے انگریزی زبان سے چڑ ہو وہ کیا عالم ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔

ایک مختصر سی بیٹھک میں چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں کئی ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔ ان کے درمیان چار ایک ڈیسک نما چوکیاں رکھی تھیں۔ ایک ایسی ہی چوکی کے پاس ایک اکہرے بدن کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سادہ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ کھدر کا لمبا چغہ اور [illegible]۔ سامنے چار ایک لوگ بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔

ماسٹر صاحب جملہ لوگوں سے مخاطب تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے کہ ہر چیز میں ہونا اور پھر واحد ہونا دونوں بیک وقت غیر از امکان نہیں۔

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ ایلی کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کئے بغیر وہ اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایلی غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن اسے خاک سمجھ نہ آیا۔ چونکہ وہ ان الفاظ اور اصطلاحات سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ایلی پر محمد حسین کی شخصیت نے خاصا اثر کیا۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ ان کی باتیں جذبہ سے سرشار تھیں اور ان کا انداز دوستانہ تھا۔

جب وہ جزو اور کل کا مسئلہ سمجھا چکے تو سامعین نے جو پہلے ہی اثر اور احترام سے بھیگے بیٹھے تھے اجازت حاصل کی اور رخصت ہو گئے۔

اس وقت مولانا نے حاجی صاحب کو دیکھا۔ بڑی تعظیم سے انہیں ملے۔ ایلی سے شفقت بھرا مصافحہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ایک منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو اصحاب آ گئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔

"مولانا۔ ایک مشکل در پیش ہے۔ امداد کے لئے حضور کی طرف رجوع کیا ہے۔"

"کہئے کہئے۔" مولانا نے بے تکلفی سے کہا۔

"گستاخی معاف۔" وہی صاحب بولے۔

"شوق سے پوچھو میاں۔ جو جی میں آئے پوچھو۔ جو جی میں آئے کہو۔ اگر ہماری دانست میں بات آئی۔ تو بیان کر دیں گے۔ صحت کے ضامن نہیں اپنا اپنا خیال ہے۔ میاں اپنی اپنی رائے ہے۔ علم تو وہ سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔ اور ہم تو میاں ابھی کنارے پر بیٹھے ہیں۔ علم کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں ہاں شوق سے کہو۔"

"سوال یہ ہے حضور مولانا کہ گُو کا کیا ذائقہ ہے۔"

ایک ساعت کے لیے مولانا نے سر جھکا لیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سر اٹھا کر مسکرانے لگے۔ بولے۔

"میاں ہمارا اندازہ ہے کہ گُو کے تین ذائقے ہوتے ہیں۔"

"تین ذائقے۔" ایلی حیرت سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پہلے اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ پھر وہ کٹھاس سے بھر جاتا ہے اور بالآخر زہر بن جاتا ہے۔"

سن لیجئے کہ ہمارے اندازے کی بنیادیں کیا ہیں۔ پہلی حالت میں اس پر مکھی بیٹھتی ہے اور مکھی ہمیشہ مٹھاس پر بیٹھتی ہے۔ پھر اس میں سنڈی پڑتی ہے اور صاحب من! سنڈی ہمیشہ کھٹی چیز میں پڑتی ہے اور بالآخر اس پر نہ مکھی بیٹھتی ہے نہ سنڈی پڑتی ہے نہ چیونٹی منہ لگاتی ہے نہ کوئی اور جانور تو ظاہر ہوا کہ تیسری حالت میں وہ زہر ہو جاتا ہے۔"

اس پر واہ واہ سبحان اللہ کا شور مچ گیا۔

ابھی وہ دونوں اصحاب جو گُو کے ذائقے کے متعلق پوچھنے آئے تھے اجازت حاصل کر رہے تھے کہ چھ سات لوگ اور آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا۔

ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔

"مولانا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اجمیر شریف کے گزشتہ عرس میں ہم آپ کو اجمیر شریف میں ملے تھے۔ اس روز جمعرات کا روز تھا۔ آپ ہمیں اس حجرے میں لے گئے تھے جہاں آپ ٹھہرے ہوئے تھے اور شاید آپ کو یاد ہو کہ آپ نے ہمیں مسئلہ ارتقاء سمجھایا تھا۔"

"شاید۔" مولانا بولے۔ "ہمیں یاد نہیں۔ خیر آپ بات کیجئے۔"

اس کے بعد ایک اور صاحب بولے۔ کہنے لگے:

"مولانا۔ عرس کے روز ہم دلی میں آپ سے ملے تھے۔ اسی ویران خانے میں۔ بلکہ باتوں باتوں میں آپ نے اجمیر شریف کا ذکر کیا تھا۔"

"اب سوال یہ ہے کہ۔" ایک اور صاحب کہنے لگے "کیا یہ ممکن ہے مولانا کہ ایک شخص بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ فرمائیے کہ ایسے صاحب کا روحانی طور پر کیا مرتبہ ہو گا۔"

مولانا ہنسنے لگے۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولے "روحانی طور پر اچھے مرتبے اور مقام والے اصحاب کے لئے عین ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہوں۔ سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے۔" وہ رک گئے۔

"آخر عربی ماسٹر ہی ہے نا۔" ایلی نے سوچا۔ "خود ستائی سے کیسے بچ سکتا تھا۔"

کچھ توقف کے بعد مولانا نے کہا "جناب عالی' ایک شرط لازم ہے اس سلسلے میں' وہ یہ کہ بیک وقت دو مقامات پر حاضر ہونے والے صاحب کو یہ احساس ہو کہ وہ بیک وقت دو مقامات پر ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ شعور ہے کہ ہم اس روز دلی میں موجود تھے

اجمیر شریف کی حاضری کا نہ ہمیں شعور ہے نہ احساس نہ علم لہٰذا مرتبے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

پہلے دو آدمیوں نے اس پر شور مچا دیا۔ بولے "حضرت! ہم نے تو بہ قائمی ہوش و حواس آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی ہے۔ آپ نے ہم سے گفتگو فرمائی ہے۔"

"بالکل بالکل۔" مولانا نے کہا۔ "ہم آپ کی بات جھٹلاتے نہیں۔ یقیناً" آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ نے ضرور ہم سے ملاقات کی ہو گی۔"

"تو پھر۔ تو پھر۔" انہوں نے شور مچا دیا۔

"میاں۔" وہ بولے۔ "وہ قادر مطلق بہت بڑا شعبدہ باز ہے۔ اگر وہ چاہے کہ کوئی فرد دو جگہ موجود دکھائی دے تو یہ اس کی شعبدہ بازی ہے۔ البتہ اگر ہم الزاماً" اپنی مرضی سے اور ارادے سے دو جگہوں پر موجود ہوتے اور ہمیں اس امر کا شعور ہوتا تو اور بات تھی۔ کیوں حاجی صاحب؟" انہوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

"آپ بہتر جانتے ہیں۔" حاجی صاحب بولے۔

پیلی بائی

حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ایلی گھر آکر پڑ رہا۔ اس روز وہ عجیب خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ حاجی صاحب کی دنیا عجیب دنیا تھی۔ وہ مرہم و عالم اور نجانے کیا کیا محسوس کرنے لگا تھا جیسے حاجی صاحب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہو جس کا صرف ایک کونہ اس نے دیکھا تھا۔ کیا وہ علی ماسٹر واقعی دو جگہوں پر بیک وقت موجود تھا یا وہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ کیا گو کا ذائقہ اس نے عقل کے زور پر بتایا تھا۔ بہرحال وہ حیران تھا۔ اس کے رو برو وہی عربی مولوی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا اپنا مرشد برٹرنڈ رسل مودبانہ مولوی کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی دانستوئسکی' برنارڈ شا' ایچ جی ویلز' کافکا' سلمہ لگراف جینز' سب مودبانہ بیٹھے تھے۔ اور مولوی انہیں سمجھا رہا تھا۔

"میاں!" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اللہ کی دین حاصل ہے لیکن تمہیں اللہ کی دین کا احساس نہیں۔ اپنے علم میں اللہ کو بھی شامل کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔"

کونے میں فرائڈ مشتبہ نگاہوں سے مولانا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک [illegible]

تھی جیسے وہ بار بار لگاتا اور یوں مولانا کی طرف دیکھتا جیسے کسی جرثومہ پر تحقیق کر رہا ہو۔

اگلے روز وہ شام کو علی پور جانے والے تھے۔ دوپہر کو احمد بولا "ایلی صاحب چلئے آپ کو پیلی بائی سے ملاؤں۔ بڑے غضب کی چیز ہے۔"

جب وہ دونوں پیلی بائی کے چوبارے پر پہنچے تو وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑکی میں فرش پر بیٹھی تھی۔

"آؤ احمد۔" وہ بے تکلفانہ انداز سے بولی۔ "بڑی دیر کے بعد آئے ہیں آپ۔"

احمد نے آداب عرض کی اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

"تشریف رکھئے نا۔" وہ ایلی سے کہنے لگی۔

ایلی چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔

"یہ کون صاحب ہیں۔" اس نے احمد سے پوچھا۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔ الیاس آصفی۔"

"الیاس صاحب۔" وہ بولی۔ "میں نے آپ کی تصویر کہیں دیکھی ہے۔"

"یہ تو خود تصویر ہیں۔ ان کی تصویر کیا ہو گی۔" احمد بولا۔

"کیا مطلب۔"

"بولتے نہیں۔ تصویر بن کر بیٹھ رہتے ہیں۔" احمد نے قہقہہ مارا۔

"جنہیں دیکھنا ہو وہ بولتے نہیں۔" ایلی نے بصد مشکل ایک بھڑکیلی بات کی۔

"ارے۔" وہ ہنسی۔ "تو آپ دیکھتے ہیں۔"

"جی۔" ایلی نے بائی پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

"دیکھنا تو اچھی چیز نہیں۔" وہ بولی۔ "خواہ مخواہ خطرہ مول لیا۔" وہ مسکرائی۔ "اس سے تو دکھانا کہیں اچھا ہے۔"

"تو جبھی آپ دیکھتی نہیں۔" احمد ہنسنے لگا۔

"ہمارا کیا ہے۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "ہماری طرف سبھی دیکھتے ہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ اور اپنی یہ حالت ہے کہ بت کہیں چت کہیں۔"

"تو آپ بیک وقت دو جگہ ہوتی ہے۔" ایلی نے کہا۔

وہ ہنسی۔ "ایک جگہ رہیں تو جیون کیسے کٹے۔ اور یہ جو روپ ہے یہ تو نقلی ہے۔"

"اور اصل چیز کنی میں باندھ کر رکھی ہوئی ہے۔" احمد ہنسا۔

"اونہوں۔" وہ بولی۔ "اصلی چیز خاک میں مل چکی ہے۔"

"خاک میں مل کر ہی تو سونا بنتا ہے۔" ایلی نے ایک اور نمائشی فقرہ چست کیا۔

"بنتا ہو گا۔ ہم تو مٹی بن کر رہ گئے۔"

"اے تو بیٹھی کیا کر رہی ہے پہلی۔" اس کی ماں نے غصے سے ادھر دیکھا۔ "اٹھ اب تیار ہو۔"

"بیٹھ لینے دے ماں۔" وہ بولی۔ "بیٹھ لینے دے کچھ دیر اور۔ ساری عمر تیار ہی ہونا ہے نا۔"

پہلی کے انداز کو دیکھ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے مولانا پہلی کا بھیس بنا کر بیٹھے ہوں۔ یہ بات حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔ ویسے دیکھنے میں کس قدر دور۔ یہ حقیقت کیا چیز تھی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ حقیقت ایلی کے لئے وہ مقام تھا جہاں سے ہر چیز اپنی تمامتر عریانی میں پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں پہلی کے پاس بیٹھے رہے۔ احمد کو نہ جانے کیا سوجھی وہ نیچے جا کر بہت سے چلغوزے لے آیا اور وہ تینوں بچوں کی طرح چلغوزے کھاتے رہے۔ احمد نے بہت سے چلغوزوں کے مغز نکال کر پہلی کو پیش کیے۔

"اونہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "خود توڑ کر کھانے میں مزہ ہے احمد۔ مغز نہ دو مجھے چلغوزے کھانے کا سارا رومان ختم ہو جاتا ہے۔"

"آپ کو رومان سے دلچسپی ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن ہمارے لئے رومان کچھ اور چیز ہے۔ یہ رومان نہیں۔ اس کی حقیقت ہم پر اس حد تک آشکار ہو چکی ہے کہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں رہا۔"

"ہمیں بھی پتہ چلے۔" ایلی بولا۔

"اونہوں۔" وہ مسکرائی "چل بھی جائے تو بھی نہ چلے گا۔ آپ کی دنیا اور ہے ہماری اور۔ آپ دیکھتے ہیں اور ہم پر دکھنا لازم ہے۔ رہا دیکھنا تو میں دیکھ دیکھ کر اکتا گئی ہوں۔ پھر بھی دکھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر لوں پھر بھی دکھتا ہے۔"

اس کی بات سن کر ایلی خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔

"وہ دُھن کیسے ہے۔" احمد نے کہا۔ "کُھ موڑ موڑ مسکات جات۔"

اور وہ گانے لگی۔ دفعتاً اس کے چہرے کا عالم ہی بدل گیا۔ پہلے اس پر بے نیازی کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی۔ جمال اور بے نیازی جس میں تصنع نہ تھا لیکن جونہی اس نے آہستہ آواز میں گانا شروع کیا بے نیازی ختم ہو گئی۔ ایک مبہم تڑپ ایک دلفریبی جیسے دفعتاً محبوبیت کی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہو۔ جو خود بخود بلا جدوجہد بغیر خواہش اور کوشش کے چھائے ہوئے تھی۔ اب وہ محبوبیت پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں کیفیات میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ خدا بنی بیٹھی تھی۔ بے نیاز لاشعوری محبوبیت سے سرشار۔ اب نہ جانے کیا بن گئی تھی۔ کیا واقعی خواہش بذات خود محبوبیت کی کاٹ تھی۔

مہارانی

علی پور آتے ہوئے راستے میں ایلی دلی کے تاثرات میں سرشار رہا لیکن علی پور پہنچ کر جب وہ پہلے روز شہزاد سے ملا تو وہ تاثرات سب کے سب یوں کافور ہو گئے جیسے صبح کی دھند سورج کی شعاعوں سے صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ جاتی ہے۔

"ہمارے مرشد ہی کسی کے مرید بن آئے تو اب ہمارا کیا ہو گا۔" شہزاد نے کہا۔ "ہمیں کوئی حیثیت ہی نہ رہی نا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"تم تو مہارانی ہو۔" وہ بولا "اور مہارانی مہارانی ہی ہوتی ہے۔"

"جب مہاراج ہی بھکشو ہو جائیں تو مہارانی کہاں رہی۔"

"جسے تم سا خزانہ ملا ہوا ہو وہ بھلا بھکشو کیوں بنے۔ بھکشو تو وہ بنتا ہے جس کے کچھ نہ ہو۔"

"ہاں تو پھر حاجی صاحب نے کیا کہا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا۔" شہزاد اس کے قریب تر ہو، تم حاجی صاحب نے کہا۔ "اس کا مرشد بہت زبردست ہے۔ اس کو سنبھالنا اپنے بس کا روگ نہیں۔"

"سچ۔"

"تمہاری قسم۔ وہ دبلا پتلا حاجی چاہے کچھ بھی ہے لیکن صاحب نظر ضرور ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔ صاحب نظر۔"

"اس نے مجھے دیکھ کر تمہاری طاقتوں کا اندازہ لگا لیا۔ مجھ میں تمہارا پر تو دیکھ لیا۔"

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ شہزاد کو سب کچھ بتا دے۔ وہ پیغام جو حاجی صاحب نے اماں کو دیا تھا ——— "ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔" ایلی کے دل میں کوئی چلا رہا تھا۔ "ہو کے رہے گا۔" اس کی زبان پر بار بار آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہزاد کو اس راز سے آگاہ کرے۔ شاید اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ شہزاد اسے رد کر دے گی۔ جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ بہرصورت اس نے بات پھر سے چھیڑی۔ بولا۔

"شہزاد ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" وہ بولی۔

"اس طرح کیسے زندگی بسر ہو گی۔"

"کس طرح۔" اس نے پوچھا۔

"اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے انجام کیا ہو گا۔"

"انجام تو ہو چکا۔" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں کھو کر پا لیا۔"

"لیکن میں نے تو تمہیں نہیں پایا۔"

"تم نے کھویا ہی نہیں تھا۔ پھر پانے کا کیا سوال ہے۔"

"نہیں شہزاد۔ ہماری زندگی ایک ڈھونگ ہے۔ ایک مسلسل جھوٹ۔ فریب۔ ہم دوسروں کو دھوکا نہیں دے رہے۔ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ خود فریب کھا رہے ہیں۔"

"فریب ہی سہی۔" وہ بولی۔ "مجھے یہ فریب کھانے ہی دو۔ اتنی زندگی بیت گئی ہے۔ اب باقی رہا کیا ہے۔"

"نہیں شہزاد۔" وہ بولا چلو کہیں چلے جائیں۔ اب بھی وقت ہے۔"

"میری طرف دیکھو۔" وہ بولی۔

ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ہے؟"

"دیکھا۔" وہ بولی "کیا اب بھی یقین نہیں۔ میں چھ بچوں کی ماں ہوں۔ چھ بچوں کی۔"

"تو پھر؟"

"اپنی زندگی تو میں نے تباہ کر لی۔ اب تمہاری زندگی تباہ کیسے کروں۔"

"اس طرح تو بہت آباد ہے۔" وہ بولا۔

"تم شادی کر لو ایلی۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "میں یہ بخوشی برداشت کر لوں گی۔"

"تو پھر بات کیا بنی۔"

"بس تم مجھ سے الگ نہ ہونا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔"

"نہیں شہزاد۔" وہ بولا "یہ ہو کے رہے گا۔"

"کیا ہو کے رہے گا۔"

"ہم ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔"

"وہ تو ہم ہیں ہی۔" وہ بولی۔

"اعلانیہ ہو کے رہیں گے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگی۔ "اعلانیہ ہی تو ہیں۔ سبھی جانتے ہیں۔ خود شریف جانتا ہے۔"

"شریف جانتا ہے۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں۔ وہ صفدر کے متعلق مجھے طعنے دیتا تھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا طعنہ دینا ہے مجھے تو ایلی کا دو۔ اس شرابی اور کمینے کا طعنہ نہ دو۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔"

"اور وہ؟"

"وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔" وہ بولی۔ "کوئی بات نہیں کی۔ مجھے خود معلوم نہیں ایلی کہ میں کس لئے تمہاری ہو گئی۔ تمہارے پاس دھن نہیں۔ دولت نہیں۔ خوبصورتی نہیں۔"

"خوبصورت تو میں ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"آئینہ دکھاؤں۔ نہ تم بچے ہو نہ جوان ہو۔ نہ جانے کیا ہو تم۔ مجھے جسمانی ہوس نہیں تم سے۔ کچھ بھی نہیں پھر بھی میں تمہاری ہو چکی ہوں ——— پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔ کبھی نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے ——— پھر بھی ———" اس کی ہچکی نکل گئی۔

ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شہزاد پہلی بائی ہو۔ جس نے کہا تھا "سب ہمیں دیکھتے تھا لیکن دیکھتا کوئی بھی نہیں۔" شہزاد کو محلے کے سب جوان بوڑھے دیکھتے تھے۔ لیکن شاید اسے

کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی پہلی بائی کی طرح ہروقت دو جگہ موجود رہتی تھی۔ قریب ہو کر دور رہتی۔ دور ہوتے ہوئے اس قدر قریب آ جاتی۔ اس کی دو رخی کو ایلی نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ ایلی کے لئے ایک معمہ تھی۔ اس میں ماجھا پہلی بائی دیوی مہارانی اور نہ جانے کون کون براجمان تھیں۔

چھٹیاں ختم ہونے پر جب وہ آخری مرتبہ شہزاد سے ملا تو اس نے پھر سے تذکرہ چھیڑا۔

"چلو شہزاد۔ کہیں چلے جائیں۔"

لیکن شہزاد نے اس کی بات نہ سنی۔ "اب کہاں جانا ہے۔" وہ بولی پھر اس نے بات کا موضوع بدل دیا۔

بنو گورا بنو

——— ایلی کا تبادلہ ڈیرہ میں ہو چکا تھا۔ اس کے اس تبادلہ پر سب حیران تھے۔ رام پور سے جلد مخلصی پالینا حیرانی کی بات تھی۔ رام پور دور دراز مقام پر آباد تھا۔ دریائے سندھ کے اس پار جہاں جاتے جاتے دو دن لگ جاتے تھے۔ اگرچہ جگہ نہایت اچھی تھی اور وہاں کا ہیڈ ماسٹر تو دیوتا خصلت کا ایک ہندو تھا۔ اس کے علاوہ رام پور کا سکول بے حد خوبصورت تھا۔ اس کے ساتھ ملحقہ زمین بہت وسیع و عریض تھی جس پر باقاعدہ کھیتی باڑی کی جاتی اور اس کی آمدنی اس قدر ہوتی تھی کہ سکول میں غربا کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بلکہ ان کی کتابیں اور کپڑے بھی اسی فنڈ سے دیئے جاتے تھے۔ اور بورڈنگ میں جو کھانا پکتا تھا وہ بھی اسی فنڈ سے پکایا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس سکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ایک تو تعلیم، دوسرے کھانا کپڑے اور کتابوں پر کوئی خرچ نہ اٹھتا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ کئی ایک اور ضروریات کے لئے امداد ملتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود اساتذہ وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔ اس کی وجہ رام پور کی دوری تھی۔

جب ایلی رامپور سے بدل کر ڈیرہ آیا تو چار ایک دن کے بعد جمیل آ دھمکا۔ جمیل ڈیرہ کے سٹیشن پر ملازمت کر چکا تھا اور شہر کے بیشتر لوگ اس سے واقف تھے۔ جمیل نے آتے ہی شور مچا دیا۔

"تو ایلی صاحب ڈیرہ میں تبدیلی ہو گئے ہیں۔ کاش کہ میں بھی ڈیرہ میں ہوتا۔ مگر کچھ پروا

خانپور سے کچھ زیادہ دور نہیں۔"

ایلی ہنسنے لگا "یہ تو الٹا اچھا ہے۔"

"ب معلوم ہو جائے گا۔" جمیل چلانے لگا۔ "وہ اچھا ہو گا وہ اچھا ہو گا۔ برخوردار کہ سمجھ آ جائے گا تم کو۔ بڑا رانی خان بنا پھرتا ہے۔ عزت والا گنا جاتا ہے۔ اور ہم، ہم کو لوگ رذیل ہیں۔ حالانکہ تو ہم سب کا پیر و مرشد ہے۔ لیکن ایسا فریب دے رکھا ہے لوگوں کو کہ وہ عزت سمجھتے ہیں۔ اچھا بیٹا ——— تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

ایلی نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا۔ جمیل نے تو اس سے کبھی ایسی باتیں نہ کی

"ارے۔" دفعتاً اسے خیال آیا۔ "گونگے کو زبان ملی ہوئی ہے۔ یار نے پی رکھی ہے۔"

"ہاں پی رکھی ہے۔" جمیل بولا۔ "پھر تمہیں کیا تکلیف ہے سالے۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہم جو جی چاہے کریں۔ کوئی ہے سالہ جو پوچھنے کی جرأت رکھتا ہو۔"

شام کو سیر کے بہانے جمیل اسے شہر لے گیا۔ ایلی چونکہ نووارد تھا۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا جمیل کے ساتھ ساتھ چلے گیا۔

"ارے۔" دفعتاً ایلی چونکا۔ شہر کے لڑکے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ "ارے دیکھ وہ ماسٹر جی جا رہے ہیں۔ ———" ایک ساعت کے لئے وہ چونکا۔ پھر اپنی طبعی بے نیازی کی وجہ سے سب بھول گیا۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ وہ چکلے کھڑا ہے۔

"ارے۔" وہ چلایا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو مجھے۔"

"ابھی دیکھ تو۔" جمیل بولا "آج ڈیرے کے بچے بچے کو پتہ چل جائے گا کہ تو شرابی اور باز ہے اور کل وہ سکول میں تیرا مذاق اڑائیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگا۔

پھر جمیل اسے باری باری ہر چوبارے پر لے گیا اور بڑے اہتمام سے اس نے بائیوں سے کا تعارف کرایا:

"یہ الیاس آصفی ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور یہاں گورنمنٹ سکول میں ماسٹر ہے۔"

سب کی سب جمیل کے ڈیرے سے تبادلے پر افسوس کا اظہار کرتیں تو وہ چلا کر کہتا۔ ایلی جو یہاں ہے۔ بس سمجھ لو میں یہاں ہوں۔ میری جگہ یہ حاضری دیا کرے گا۔ کوئی کام ہو

سیدھی سکول چلی جانا اور الیاس آصفی کا پوچھ لینا۔"

ایلی سخت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا مگر جمیل کے سامنے بے بس تھا۔

آخر کار جمیل ایلی کو لے کر ایک چوبارے میں جا پہنچا۔

"یہ گھر میرا خاص گھر ہے۔" وہ بولا۔

"ان کے مجھ سے پرانے مراسم ہیں۔ آؤ تمہیں ملاؤں۔ ہاں بھئی حساب سے کھڑی ہو جاؤ۔ یہ ہے سب سے بڑی بنو۔ اور یہ منجھلی گوری اور یہ چھوٹی بنو۔ بیٹھ جاؤ۔ اب سب بیٹھ جاؤ۔"

وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی اور دو خوش پوش پٹھان داخل ہوئے۔

"ارے بھئی۔"

جمیل انہیں دیکھ کر چلایا۔ "گاہک خواہ مخواہ منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں"۔

نوواردوں نے تینوں بہنوں کی طرف دیکھا۔

بنو اٹھی اور ان کے قریب جا کر کہنے لگی۔ "آپ کچھ دیر کے بعد آجائیں۔ ان کے جانے کے بعد۔" اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔

"ہاں تو" جمیل بولا "ان کی صفات سنو۔ یہ بنو تو مرہم ہے۔ ایسی مرہم جو ہر قسم کی جلن دور کرتی ہے پھوڑا ہو پھنسی ہو۔ غم و تفکر ہو۔ عشق ہو۔ روپے پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پریشانی ہو۔ کچھ ہو۔ اس کے پاس آجاؤ۔ ایسا پھاہا رکھے گی سب غم دور۔ کیوں بنو۔"

ایلی نے بنو کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود دکھ بھری بوتل ہو۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھیں نمناک تھیں۔

"اور یہ دیکھو گوری یہ گوری نہیں گورا ہے۔ تم نے بھی گورے دیکھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ یہ اس مکتی فوج کا گورا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو بلی ایسی ہیں اور یہ ہر وقت مسکاتی ہے ہر وقت۔ بارش ہو دھوپ ہو گرمی ہو سردی ہو۔ اس بوتل سے ہمیشہ چھینٹے اڑتے ہیں۔ یہ تمہیں بہلا سکتی ہے۔ بچہ بن کر تم سے کھیلے گی۔ ہنسے گی۔ ہنسائے گی۔ دکھ دور نہیں کر سکتی لیکن ہنسا سکتی ہے۔ کھلا سکتی ہے۔ ہے تو گورے کی طرح حرامی مگر ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ دیر کی ساتھی۔

"اور یہ بنو۔" اس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا "بس دیکھ لو اسے ۔ یہ تو خالص پٹاخہ

ان چلا پٹاخہ۔ نہ کوئی اسے چلا سکتا ہے نہ کوئی اس سے کھیل سکتا ہے۔ اگر اضطراب پیدا ہو۔ اگر دیوانگی حاصل کرنی ہو۔ اگر اطمینان کھونا ہو۔ اگر طوفان کے ہچکولے دیکھنے ہوں تو ے آلو۔ یہ ایک ہنگامہ ہے۔ بارود ہے منجھل پوٹاش ہے۔"

اور ایلی یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں میں نے دو سال گزارے ہیں دو سال۔ اور اب یہ تمہارا ہے سمجھے اور اگر تم نے یہاں باقاعدہ حاضری نہ دی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

اگلے روز جب ایلی سکول گیا تو اس کی طرف انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے اسے دیکھ کر رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لڑکوں کو کنٹرول کرے گا۔ کس طرح ان بانے استاد کی حیثیت سے کھڑا ہو گا۔ لیکن اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اس بھی رسمی استاد کی طرح بچوں سے سلوک نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی رسمی طور پر سبق نہ پڑھایا اس کی باتیں سن کر لڑکے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مسکرانا شروع کرتے اور بالآخر اس کے دوست بن جاتے۔ خاص طور پر پٹھان لڑکے جنہیں کنٹرول کرنا مشکل سمجھا جاتا تھا۔

لیں جماعت میں داخل ہو کر اس نے پہلے ہی سبق میں چھلکے کے موضوع پر اظہار خیال کرتا تاکہ بچوں کے دل کی بات پھوڑا نہ بن جائے۔

رہ میں وہ واحد شخصیت جس نے ایلی کو متاثر کیا' غلام کی تھی۔ اس کا نام غلام علی تھا بھی اسے غلام کہتے تھے بلکہ وہ خود اس بات پر مصر ہوتا کہ اسے غلام کہا جائے۔ وہ کہا

"بھئی گھر والوں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ علی کی غلامی کا اعزاز بخش دیا۔ اس اعزاز کا میں کیں۔ اتنی عظیم شخصیت کی غلامی ——— نہ بھئی میں تو اللہ کے ہر بندے کا غلام ہوں۔ ان کا۔ سب کا۔"

غلام کا رنگ گورا تھا۔ جسم بھرا بھرا اور خدوخال میں جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد پر ان کا رنگ شربتی تھا۔ نکھرا نکھرا اور ان میں شرارت یوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ل معزز چہرے پر ان آنکھوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ہر وقت سوڈے کی ی نظر آتی تھیں۔ ایک عجیب سی پھوار پڑتی اور دیکھنے والوں کو اثر سے بھگو دیتی۔

غلام کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ابھی وہ نظر بھر کر راہ چلتی ہوئی خاتون کو دیکھے گا تو

وہ مسحور ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے گی۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس کے قدموں میں آ گرے گی لیکن غلام عورت کو دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتا تھا اور التزاماً اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ نگاہ بھر کر کسی عورت کو دیکھ نہ لے۔ ایلی نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے اس نے دلی والے حاجی صاحب کی بنائی ہوئی مرہم کی دو سلائیاں آنکھوں میں لگا رکھی ہوں۔

غلام

غلام سے ایلی کی ملاقات الطاف اور اسد کی وساطت سے ہوئی تھی۔

الطاف ان لوگوں میں سے تھا جو ہر نووارد سے تعلقات پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور بلا تکلف اسے کھانے کی دعوت دینے کے مشتاق۔

الطاف کی دعوت اس کے چھوٹے بھائی ارشد نے دی۔ ارشد نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ تین بھائی تھے۔ الطاف' اسد اور ارشد۔ اسد سکول سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اب لاہور کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر ایلی نے اسے ٹال دیا۔ کہنے لگا۔

"بھئی۔ ہم تمہارے بڑے بھائی سے واقف نہیں۔ ان سے جا کر کہنا کہ ناواقفوں کو کھانا کھلانا اچھا نہیں ہوتا۔"

شام کو الطاف خود آ گیا۔

"السلام علیکم۔" وہ بولا "میرا نام الطاف ہے۔ میں ارشد کا بڑا بھائی ہوں۔ لیجئے اب تو ہماری واقفیت ہو گئی۔ اب چلئے گھر۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

الطاف کی معصومیت اور سادگی سے ایلی بے حد متاثر ہوا۔

اسی روز کھانے پر جب الطاف کو معلوم ہوا کہ ایلی کو راگ سے دلچسپی ہے تو وہ بولا چلئے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ اسے موسیقی سے دلچسپی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے منجھلے بھائی اسد کو اشارہ کیا اور وہ گوندھے ہوئے آٹے کا گولا اچھالتا ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ جتنا ہی الطاف سادہ طبیعت تھا اتنا ہی اسد بھڑکیلا تھا۔ وہ یوں بات کرتا تھا جیسے ابھی ابھی ولایت سے تحصیل علم کر کے آیا ہو۔ بہر حال اسد کی نسبت ایلی کو اس آٹے کے گولے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک انگلینڈ ریٹرنڈ خوبصورت جوان جس نے ایک اچھا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا وہ آٹے کے گولے سے کیوں کھیل رہا تھا۔ اور یوں بر سر

جب وہ غلام کے گھر پہنچے تو ایک بچے نے دروازہ کھولا۔ اور بیٹھک کی طرف اشارہ کر کے بیٹھک میں میز پر چند ایک کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف ہوا تھا۔ دوسری طرف فرش بچھا ہوا تھا اور فرش کے ایک کونے پر جائے نماز پر غلام نماز میں مصروف تھا۔ جائے نماز کے ساتھ ہی ایک ستار رکھی ہوئی تھی۔

وہ سب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ الطاف نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اسد نے ایک گٹھڑی اٹھائی۔ اسے کھولا تو اس میں سے طبلے کی جوڑی نکل آئی۔ پھر اس نے کے گولے کو جو وہ ساتھ لایا تھا' توڑ کر اس پر لگانا شروع کر دیا۔ ایلی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ تو یہ آٹے کا گولا طبلے پر لگایا جاتا ہے۔

غلام نے سلام پھیرا اور پھر کسی سے بات کئے بغیر سلام علیکم کئے بغیر ستار اٹھا لی اور اسے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مدھم لے میں اسد نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔

وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ستار گویا کراہ رہی تھی۔ اور طبلے کی تھاپ دل میں اترتی جا رہی تھی۔ یہ بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کون ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کوئی دس منٹ کے بعد "دھن دھن کی آواز آئی اور ساز ختم ہو گیا۔ غلام مؤدبانہ اٹھ بیٹھا۔

"معاف کیجئے۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا "میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ کو انتظار کی ت کرنی پڑی۔"

"لیکن آپ تو ستار بجا رہے تھے۔" ایلی بولا۔

"نہیں تو۔" غلام بولا "میں تو نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔"

"دعا مانگ رہے تھے۔" ایلی نے دوہرایا۔

"ہی۔" غلام نے کہا "دعا زبان سے نہیں مانگی جا سکتی۔ دل کے تاروں کی لرزشوں سے ہوتی ہے۔"

"اور یہ ستار غلام کا دل ہے۔" اسد نے ہنس کر کہا۔

"بس یہی ہے۔" غلام بولا "میری ساری کائنات یہ ستار ہے اسی سے نماز پڑھتا ہوں۔ اسی دعا مانگتا ہوں۔ یہی بھگتی ہے۔ یہی نروان ہے۔"

سوڈے کی دو بوتلیں کھلیں۔ رنگ پچکاری کی پھوار پڑی۔ پنگھٹ جھول کر پاس آ گیا۔

گوپیوں کی قطاریں رقص کرنے لگیں۔ دور کنہیا کی مرلی کی مدھم سریں گونج رہی تھیں۔ ایک ساعت کے لئے ایلی بھونچکا رہ گیا۔

ارے۔ یہ کیا چیز ہے۔ یہ نمازیں یہ دعائیں یہ لرزشیں اور یہ نگاہ۔ بس ایک ساعت میں نہ جانے کیا کر دیا۔ ایلی غلام کا غلام بن گیا۔ اس کے بعد ایلی کا دستور ہو گیا۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر وہ غلام کے پاس جا بیٹھتا۔ غلام جائے نماز پر ستار بجاتا۔ ایلی اپنا سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھ رہتا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے۔ بے مقصد آنسو۔ غم کے نہیں وافر جذبات کے آنسو۔ حتیٰ کہ عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اور غلام اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا اور ایلی گھر چلا آتا۔

کرم نوازی

چند ہی دنوں میں ایلی غلام کا بے تکلف دوست بن گیا بلکہ ایلی کو غلام سے محبت سی ہو گئی۔ غلام کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی لیکن نہ جانے اس رنگینی کے دھارے کا رخ کدھر کو مڑ گیا تھا۔ اس رنگ پچکاری نے روپ بدل لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ سادگی اور عجز اور بے نیازی ایلی محسوس کرتا تھا جیسے غلام، وہسکی کی ایک ایسی بوتل تھا جس میں سے شراب انڈیل کر آب زمزم بھر دیا گیا تھا۔

ایک روز ایلی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "غلام! تم غلام کیوں ہو؟"

غلام نے جواب دیا۔ "میں لوگوں کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں بن سکا۔ اپنا غلام نہیں بننا چاہتا لیکن ہوں اور ——"

"پھر غلام کیوں کہلواتے ہو۔"

"اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ اپنے مرشد کا غلام ہوں۔"

"تو کیا تمہارا کوئی مرشد بھی ہے۔"

"ہاں ہے۔"

"میں تو تمہیں مرشد بنانا چاہتا تھا۔" ایلی نے کہا۔

"تو بنا لو۔ چاہے کسی کو بناؤ۔ مجھے بناؤ یا میرے حضرت صاحب کو بناؤ یا کسی پتھر کو بنا لو یا کسی بائی کو بنا لو لیکن بناؤ ضرور۔ بے مرشد جینا تو بالکل ایسے ہی جیسے بے پتوار کی ناؤ۔"

"جسے چاہوں بنالوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نشہ اندر سے نکلتا ہے اپنے اندر سے جتنا گڑ تمہارے اندر ہے میٹھا ہو گا۔ ہر صورت میں ہو جائے گا۔"

"کیا تم میں گڑ ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"تھا۔" وہ بولا "بہت تھا۔ بے انداز تھا لیکن میں نے تو سارا بیر بہوٹیوں کو کھلا دیا۔"

"ہوں۔" ایلی ہنسا۔ "تو تمہاری زندگی میں بیر بہوٹیاں تھیں۔"

"تھیں۔" وہ بولا "بھائی صاحب۔ بیر بہوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری زندگی کی داستان بے مختصر ہے۔ عورت شراب اور راگ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تھا۔ آپ ہی چلی آتی تھی۔ یوں چلی آتی تھی جیسے ہپناٹزم کے زیر اثر ہو۔ اور پھر اپنی عادت تھی کہ را پھیر کو آنکھ بھر کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ ان کا کیونگ جاتا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میں نے تو اپنا سارا ان بیر بہوٹیوں کو کھلا دیا۔ اگر دس ایک سال پہلے مرشد مل جاتے تو آج تک بہت بڑا ولی بنا تا تمہاری قسم۔"

"اور اب؟" ایلی نے پوچھا۔

"اب تو کچھ ذرے رہ گئے تھے۔ سارا ہی لٹا بیٹھا تھا۔ شکر ہے اللہ کا اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔"

"غلام۔" ایلی نے پوچھا۔ "تم نے مرشد کی جستجو کی تھی کیا؟"

"اونہوں۔" وہ بولا۔ "مجھے تو شعور بھی نہ تھا کہ مرشد کسے کہتے ہیں۔ کبھی اس زاویہ نگاہ دیکھا ہی نہ تھا۔ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔"

"تو پھر کیسے مل گیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"بس اللہ نے دے دیا۔ بیٹھے بٹھائے دے دیا۔ کرم نوازی کر دی۔"

"آخر کس طرح۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ بھی اک راز ہے۔" وہ بولا اسے راز ہی رہنے دو۔ تم اسے سن کر کیا کرو گے۔"

"مجھے تو اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" اس نے ایک بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی۔ "تمہیں اعتماد نہیں ہے" "اسے تو

اس نے ستار اٹھائی اور بجانے لگا

ایلی نے کچھ کہنا چاہا تو غلام نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرا دیا۔

"باتیں کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔" وہ بولا "سنو۔ سن سن کر کان بھر لو۔ پھر یہ بوند بوند دل میں ٹپکے گا اور ایک روز دل کی ناؤ جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے ان بوندوں کے پانی میں بہہ نکلے گی۔ سنو۔" اور وہ مدھم آواز میں گانے لگا۔

میں چوہڑی سرکار دی ہاں میں چوہڑی

نورانی

ڈیرہ میں ایلی کی زندگی کا مرکز غلام بن گیا۔ غلام کی ستار نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا۔ اس کی تاروں کی لرزشوں نے ایلی کے دل میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے جب بھی اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا تو وہ فوراً شہزاد پر مرکوز ہو جاتا تھا اور وہ شہزاد کے تصور میں کھو کر رہ جاتا۔ لیکن غلام کی ستار نے گویا اسے شہزاد سے بے نیاز کر دیا۔ اب اس کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا لیکن وہ شہزاد پر مرکوز نہ ہوتا۔ اس کا کوئی بھی مرکز نہ ہوتا تھا۔ ایک لامتناہی بے مرکز جذبہ جیسے دفعتاً اس کے دل کا سوتا سمندر بن گیا ہو۔ ایک بے نام غم بے کنار بحر۔ اس کے لئے یہ کیفیت بالکل انوکھی تھی۔

پھر ایک روز نورانی آ گیا۔

ایلی وہاں ایک سالم مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے ایک باورچی خانہ ایک غسل خانہ۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ ان کے علاوہ ایک الگ سی بیٹھک تھی۔ ایلی کا سامان اس حد تک مختصر تھا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساری چیزیں سمٹ کر ایک کمرے میں سما گئی تھیں اور باقی سب کمرے خالی پڑے تھے۔

ایک روز دروازہ بجا اور ایک سیاہ فام فربہ قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔

"معاف کیجئے گا۔" وہ بولا "میرا نام نورانی ہے اور میں محکمہ تعلیم میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوں۔ میرا تبادلہ یہاں ہو گیا ہے لیکن ابھی مکان کا بندوبست نہیں ہوا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند روز کے لئے آپ کی بیٹھک میں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔ اور جب بھی آپ چاہیں گے بیٹھک خالی کر دوں گا۔"

ایلی نے غور سے اس لمبے تڑنگے آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر

ی کرختگی تھی۔ ماتھے پر تیوری چڑھی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی خوفناک کشش تھی اور

"نورانی۔ سبحان اللہ کیا نورانیت ہے۔" ایلی نے سوچا۔

"بہت اچھا۔" ایلی نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال ——"

"شکریہ" نورانی نے کہا اور بے تکلفی سے اپنا سوٹ کیس اور بستر اٹھا کر بیٹھک میں گھس

نورانی خاموش طبع آدمی تھا۔ سارا دن یا تو چپ چاپ بیٹھا کام میں مصروف رہتا اور یا باہر ے پر چلا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کے لئے اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ وہ آپس بھی کبھار بات کرتے تھے۔

"کہیے نورانی صاحب" ایلی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔

"بس دیکھ لیجئے۔" وہ جواب دیتا اور بدستور کام میں مصروف رہتا۔

"آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔"

"مصروف رہنا اچھا ہوتا ہے۔" وہ جواب دیتا۔

نورانی کے منہ پر کبھی تبسم نہ آیا تھا۔ قہقہہ مار کر ہنسنا تو گویا اس کی سرشت کے منافی تھا۔ اور تعجب خیز بات تھی کہ نورانی دودھ بہت پیتا تھا۔ ہر وقت اس کی میز پر دودھ سے بھرا ہوا ں پڑا رہتا کام کرتے کرتے وہ گلاس اٹھاتا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر رکھ دیتا۔ حیرت کی بات کہ اتنا دودھ پینے کے باوجود نورانی کے چہرے پر دودھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چہرے کی رنگی اور تناؤ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور ماتھے کی تیوری یوں دکھائی دیتی تھی۔ جیسے لوہے میں میخ کی ے لکیریں کھود دی گئی ہو۔

ایک روز غلام آ گیا۔ اس وقت ایلی نورانی کے پاس کھڑا تھا۔ ایلی نے غلام کا نورانی سے ف کرا دیا۔

طلب کا مٹکہ

اسی شام جب غلام علی اور ایلی اکٹھے بیٹھے تھے تو نورانی کی بات چل پڑی۔

"عجیب بات ہے۔" ایلی نے کہا۔ "یہ شخص اتنا دودھ پیتا ہے لیکن اس کے چہرے پر اتنی کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔"

"اونہوں۔" غلام نے جواب دیا۔ "بھئی وہ تو لوہے کا آدمی ہے۔"

"لوہے کا آدمی۔" ایلی نے دہرایا۔

"ہاں ہاں۔" غلام بولا۔ "ضرور وہ کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔ سنکھیا یا کچلا۔ اس لئے اس کا جسم لوہے کی خصوصیات کا حامل ہے۔"

"سنکھیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔"

"وہ تو زہر ہوتا ہے۔"

"ہوتا ہے۔"

"تو پھر۔"

"پھر کیا۔" غلام بولا۔ "تمہارے چہرے پر بھی تو کرختگی ہے۔"

"میں تو سنکھیا نہیں کھاتا۔"

"یہ تمہارے خیالات کی وجہ سے ہے۔" وہ بولا۔ "تمہاری شخصیت میں مٹھاس نہیں تلخی ہے ——— جذبات میں رنگ نہیں شدت ہے۔ تمہارا صفرا سودا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "تم طب جانتے ہو۔"

"جانتا ہوں۔"

"واقعی۔"

"ہاں ـ طب ہمارے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ میں بھی سنکھیا استعمال کیا کرتا تھا۔"

"کیوں۔"

"تمام تماش بینی کرتے ہیں۔"

"لیکن تمہارے چہرے پر تو دودھ ہی دودھ ہے۔"

"یہ میرے سرکار قبلہ کی کرم نوازی ہے۔ ان کی دین ہے۔"

ایلی کے لئے سرکار قبلہ اور کرم نوازی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا۔ لیکن سرکار قبلہ اور کرم نوازی پر پہنچ کر گویا اس کے پر جل جاتے اور پھر وہ ایک بے بس کیڑے کی طرح رینگتا۔ اس پر احساس کمتری کا منوں بوجھ پڑ جاتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ کس طرح اس مشکل سے مخلصی حاصل کرے۔ اس کا ذہن سرکار قبلہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے رو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب آکھڑے ہوتے۔ ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہلتا۔ ان کی روشن آنکھیں۔ چمکتیں۔

"وقت آئے گا۔" وہ مسکرا کر کہتے۔

پھر عربی مولوی کی کرخت آواز گونجتی۔

"اس شعبدہ باز قادر مطلق کے تماشوں کی حد ہے کوئی۔ دم مارنے کی گنجائش بھی ہو۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔

ایک روز بیٹھے بیٹھائے ایلی نے غلام سے حاجی صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شہزاد کی بات چھوڑ کر باقی سب کہانی سنا دی۔

غلام مسکراتا رہا۔

جب ایلی بات ختم کر چکا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ "ہاں وقت آئے گا۔ تمہارے ماتھے لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہیں سرکار قبلہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ آؤ اب ان آنے والے حضور کا ذکر کریں۔"

اس نے ستار اٹھالی اور مدھم آواز میں گانے لگا۔

"اب ہو نہ آئے کن دھوتین بھرمائے۔ اب ہو نہ آئے۔"

اس روز پہلی مرتبہ ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی سرکار قبلہ اس کی زندگی کو بھی نور کر دیتا۔

چونکہ ایلی کو ان ٹھمریوں اور خیالوں کے بولوں سے بے حد دلچسپی تھی جو غلام گایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے غلام سے کہا کہ یہ گیتوں والی کاپی مجھے دے دو میں نقل کر کے لوٹا دوں گا۔

"کاپی۔" غلام بولا۔ "لیکن یہ تو میرے سرکار قبلہ کی کاپی ہے۔"

"اس میں تو گیت لکھے ہوئے ہیں۔"

"اس میں گیت ہیں۔ مناجاتیں ہیں۔ قوالیاں ہیں یہ سب قوالیاں گیت اور راگ سرکار قبلہ کے ہیں۔ میں چاہے کچھ بھی گاؤں روئے سخن ان کی طرف رہتا ہے۔ اس برات کے دولہا وہی ہیں۔ صرف وہ اور بس باقی سب ہوس۔" غلام نے ایک دلدوز نعرہ لگایا۔

بہرحال ایلی نے وہ کاپی غلام سے لے لی اور گھر چلا آیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس لئے اس وقت گیت نقل کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا چلو کل نقل کر لوں گا اور شام کو کاپی لوٹا دوں گا۔ کیونکہ غلام نے تاکید کی تھی کہ گیت نقل کر کے جلد کاپی لوٹا دے۔

رات کے دو بجے کے قریب دروازہ بجا۔ ایلی جاگ پڑا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کون ہے۔ شاید پڑوس کے دروازے پر ہو۔

دروازہ پھر بجا۔ شاید نورانی کا دوست ہو کوئی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش پڑا رہا۔

پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی کوئی باتیں کر رہا تھا۔ پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی اور نورانی اور غلام اس کے سرہانے آ کھڑے ہوئے۔

"ارے تم ہو۔" ایلی چلایا۔

"ہاں۔" غلام مسکرایا۔

"حیرت ہے۔"

"مجھے وہ کاپی دے دو۔"

"کاپی۔ کیا کاپی لینے کے لئے آئے ہو۔"

"ہاں۔"

"اس وقت۔"

"ہاں۔"

"کیوں۔"

"بھئی۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری کاپی اس پیشاب کے مٹکے میں کیوں پھینک آئے ہو۔"

"ارے۔" ایلی کا دل ڈوب گیا۔ "تو کیا میں پیشاب کا مٹکا ہوں۔"

"مجھے کیا معلوم۔" غلام نے کہا۔ وہ بہتر جانتے ہیں۔"

غلام تو کاپی لے کر چلا گیا لیکن ایلی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ جب بھی وہ آنکھ بند کرتا تو اس کے روبرو ایک بڑا سا مٹکا آ جاتا اور اس میں سے بدبو آتی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور طنزاً" حاجی صاحب سے کہہ رہا تھا۔ "آپ تو کہتے تھے وقت آئے گا لیکن اب یہ پیشاب کا مٹکا۔"

ایلی کو عرصہ دراز سے مسلسل بول کی شکایت تھی۔ اس رات شرمندگی کی وجہ سے ساری رات وہ پیشاب کرتا رہا۔

سلسل البول

ایلی کی یہ سلسل البول کی شکایت بھی ایک عجیب قصہ تھا۔

جس زمانے میں وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو اس کی نور احمد سے بڑی دوستی تھی۔ نور احمد ان کا دور کا رشتہ دار تھا اور لاہور پولیس میں نوکر تھا۔ جب کبھی میس فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ایلی کی حاضری بند ہو جاتی اور اسے بورڈنگ میں کھانے سے جواب مل جاتا تو نور احمد اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر اسے کھلاتا۔ نور احمد کی شادی ہوئی لیکن اس کی بیوی مر چکی تھی اور وہ عرصہ سے اکیلا رہتا تھا۔

نور احمد کو ایلی سے برادرانہ قسم کی محبت تھی اور ایلی کو نور احمد سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نور احمد بہت سیانا تھا اور اسے لاہور کا بے پناہ تجربہ تھا۔

ایک مرتبہ نور احمد کو نہ جانے کیا تکلیف ہو گئی اور وہ چھٹی لے کر علی پور آ گیا۔ اس زمانے میں ایلی کو گرمی کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اور وہ علی پور ہی میں تھا۔ نور احمد آتے ہی ایلی سے ملا۔ کہنے لگا:

"بھئی ذرا باہر چلنا ہے۔"

"لیکن کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"ذرا باہر جانا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

طبعی طور پر نور احمد کھل کر بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ ہر بات کو راز رکھتا اور صرف اسی بات کا اظہار کرتا جسے وہ ضروری سمجھتا۔

شہر سے باہر جا کر وہ پرانے مقبروں میں گھومتے رہے اور نور احمد ان مقبروں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے چونا اکھیڑتا رہا۔

"یہ کس لئے ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ بھی ہے۔" نور احمد نے جواب دیا۔

""لیکن کس لئے اکٹھا کر رہے ہو۔"

"کام آئے گا۔"

"کس کام۔"

"دوائی کے طور پر۔"

"یہ دوائی بنائی ہے کیا۔"

"ہاں۔ ہاں"

"کس کے لئے۔"

"اپنے لئے۔"

"بیمار ہو۔"

"ہاں۔"

"کیا بیماری ہے۔"

"سوزاک ہو گیا ہے۔"

"ارے۔" ایلی اچھلا۔

نور احمد نے یوں سر سری بات کی تھی جیسے کوئی بات نہ ہو جیسے سوزاک نہ ہوا سردرد ہو گئی۔ یہ نور احمد کی عادت تھی۔

گھر پہنچ کر نور احمد نے ایک کورا گھڑا لیا۔ وہ پرانا چونا دھو کر اس میں ڈال دیا اور پھر اسے پانی سے بھر دیا گرمیوں کے دن تھے۔ وہ دونوں سارا دن اکٹھے بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے اور نور احمد ہر دس منٹ کے بعد ایک گلاس مٹکے میں سے بھرتا اور غٹ غٹ پی جاتا۔ ایلی نے پیاس محسوس کی۔ نور احمد بولا۔

"یہی پانی پیو نا۔" تمہارے لئے بھی بہت فائدہ مند ہو گا۔ جگر کی گرمی اتر جائے گی۔"

اس کے بعد ہر دس منٹ بعد وہ دونوں اکٹھے پیشاب کرتے اور پھر ایک ایک گلاس پانی پی کر پھر سے بیٹھ جاتے۔ دس پندرہ دن کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ اسے سلسل البول کی شکایت ہو گئی ہے لیکن اس نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ دو ایک سال گزر گئے۔

اس کے بعد ایلی نے محسوس کیا اسے سلسل بول کی بیماری ہو چکی ہے۔

زخمی کتا

ان دنوں اس کا خالہ زاد بھائی جو میڈیکل کالج میں تعلیم پانے کے بعد جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ نہ تھا۔ ولایت میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے چلا گیا۔ واپس وطن لوٹا اس کے ساتھ اس کی آئرش بیوی بھی تھی۔ ایلی نے ڈاکٹر آصفی کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تکلیف کے متعلق فکر مندی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے اسے لاہور بلا لیا۔

جب ایلی لاہور پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے کہا:

"دیکھو بھائی جو علاج کرانا ہے تو آٹھ روز میرے پاس رہو۔ یہاں تمہیں صرف ایک تکلیف ہو گی۔ ہم لوگ رات کا کھانا پونے آٹھ بجے کھاتے ہیں اور پھر آٹھ بجے لیٹ کر سو جاتے ہیں۔ یہ بندش تم پر بھی رہے گی۔"

ڈاکٹر نے رات کے آٹھ بجے ایلی کو ایک کمرے میں بند کر دیا جس کے ساتھ اٹیچڈ باتھ نہ تھا۔

"لیکن میں پیشاب کہاں کروں۔" ایلی نے پوچھا۔

"تمہارے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "باہر باغیچہ ہے۔ جب چاہو باہر نکل کر پیشاب کر لو۔ لیکن ——— ڈاکٹر رک گیا۔ "ذرا احتیاط سے باہر باغیچہ میں جانا۔"

"کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"رات کو کتا کھلا ہوتا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

ایلی روز ڈاکٹر سے کہتا کہ وہ اس کا معائنہ کریں لیکن ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتے۔ آٹھویں روز ایلی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور علی پور جانے کی تیاری کر لی جب ڈاکٹر نے سنا کہ وہ خفا ہو کر جا رہا ہے تو اس نے جلدی سے کاپی اٹھائی اور میز لگا کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی ایلی۔" وہ بولا۔ جانے سے پہلے ہسٹری تو بتا جاؤ۔"

ایلی کا غصہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر آصفی سے علاج کرانے پر رضامند ہی نہ تھا لیکن ان کی آئرش بیوی نے آکر ایسی ایسی باتیں کیں کہ وہ کیس ہسٹری دینے پر مجبور ہو گیا۔

"ہاں بھئی ایلی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ تمہیں دن میں کتنی مرتبہ پیشاب آتا ہے۔"

"میں نے کبھی گنا نہیں۔"

"پھر بھی اندازاً"۔"

"یہی آٹھ دس بار۔"

"اور پیاس کی کیا حالت ہے۔"

"بار بار پانی پیتا ہوں۔"

"کے بار۔"

"بس ایک چکر ہے۔ ادھر گلاس پانی کا پیا ادھر پیشاب کیا۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔"

"سردیوں میں زیادہ آتا ہے یا گرمیوں میں۔"

"دونوں موسموں میں ایک سا۔"

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ دن میں کون سے وقت زیادہ پیشاب کرتے ہو۔"

"کیا مطلب۔"

"صبح کے وقت زیادہ یا شام کے وقت۔"

"سونے سے پہلے۔"

"شام کو یا رات کو۔"

"لیٹ جانے کے بعد۔ چاہے جس وقت لیٹ جاؤں۔ جب تک نیند نہیں آتی تب تک۔"

"اچھا تو اب ان گزشتہ آٹھ دنوں کے کوائف لکھوا دو مجھے۔"

"جی۔"

"کل رات لیٹنے کے بعد سونے تک کے مرتبہ پیشاب کیا۔"

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"اندازاً"۔"

"کل تو نہیں کیا۔"

"ہوں۔ اچھا پرسوں۔"

پرسوں بھی نہیں۔"

"ایک بار بھی نہیں"۔

سارا دن تو کرتا رہا تھا۔"

"دن کی بات چھوڑو۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کے درمیان کے وقفے کی بات کرو ——— اچھا ازسوں۔"

"نہیں۔"

ڈاکٹر آصفی نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ "دیکھو ایلی میں نے تمہیں آٹھ دن انڈر آبزرویشن رکھا ہے اور گزشتہ آٹھ روز تم نے سوتے وقت پیشاب نہیں کیا حالانکہ یہ وہ وقت ہے جب کہ تمہارے بیان کے مطابق بہت زیادہ پیشاب آتا ہے۔ اگر تمہاری اس بیماری کو ایک خیالی کتے کا ڈر روک سکتا ہے تو بتاؤ یہ بیماری جسمانی ہوئی یا ذہنی۔ میری جان! تمہیں کوئی بیماری نہیں۔"

ڈاکٹر آصفی کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا حتیٰ کہ علی پور جاتے ہوئے گاڑی کی چھکا چھک میں بھی وہ ڈاکٹر کے قہقہے کی آواز سنتا رہا۔

آج پھر وہ ڈاکٹر کی آواز سن رہا تھا۔ "ہی ہی ہی ہی۔ ایلی بھئی تمہارا علاج تو سہل ہے۔ غسل خانے میں ایک کتا باندھ لو ہی ہی ہی۔"

پیشاب کا مٹکا پیشاب کا مٹکا !

"پیو۔ پیو۔" نور احمد چونے کے گھڑے سے پانی نکال کر اسے دے رہا تھا۔ "یہ تمہارے جگر کی گرمی اٹھالے گا۔"

اگلے روز صبح سویرے ایلی کے سر پر ایک دھن سوار تھی۔ صرف ایک دھن۔

پس پاٹ چور

اس روز وہ سکول بھی نہ گیا بلکہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انچارج ڈاکٹر محمد علی اس کا اچھی طرح سے واقف تھا۔ وہاں اس نے ایلی کی تمام کیس ہسٹری بڑے غور سے سنی۔ پیشاب ٹسٹ کیا اور پھر بولا۔

"الیاس صاحب۔ ہمارے ہاں کیمیکل امتحان کا سامان تو ہے لیکن مائیکروسکوپک ٹسٹ کا انتظام نہیں لہٰذا آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو لاہور چلے جائیں۔ وہاں کے سول سرجن میرے دوست ہیں۔ ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ان سے جا ملیں وہاں مائیکروسکوپک ٹسٹ کا

انتظام ہو جائے۔"

ڈاکٹر محمد علی کا خط دیکھ کر سول سرجن اسے بڑی گرمجوشی سے ملا۔

"کیا آپ پیشاب ساتھ لائے۔" اس نے پوچھا۔

"میں تو ڈیرہ سے آیا ہوں۔"

"اوہ ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔ "یہ تو کیس ہی مختلف ہے۔ فریکوئنسی آف یورن کی شکایت ہے نا۔" انہوں نے ایک اسسٹنٹ کو بلایا۔ بھئی انہیں پس پاٹ دے دو اور غسلخانہ دکھا دو۔ لیجئے صاحب آپ پیشاب لے آیئے۔" انہوں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجے ہیں ابھی بہت وقت ہے۔ آپ شام تک ڈیرہ واپس پہنچ سکیں گے۔"

سول سرجن کے اسسٹنٹ نے اسے پس پاٹ پکڑا دیا۔ وہ غسل خانے میں جا بیٹھا۔ بارہ بج گئے لیکن اسے پیشاب نہ آیا۔ جیسے پیشاب کا سلسلہ ہی موقوف ہو چکا ہو۔ ایک بجے اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ دو بج گئے چار بج گئے۔

باہر ڈاکٹر چلا رہا تھا۔ ارے بھئی وہ فریکوئنسی آف یورن کا مریض کیا ہوا۔"

"کچھ پتہ نہیں صاحب۔"

"کیا اسے ابھی تک پیشاب نہیں آیا۔ مسخرہ تو نہیں کوئی۔"

"کہیں پس پاٹ چرا کر نہ لے گیا ہو۔" کمپاؤنڈر نے کہا۔

"ارے بھئی دیکھنا۔" ڈاکٹر قہقہہ مار بولا۔

ایلی نے چپ چاپ خالی پس پاٹ زمین پر رکھا اور غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگا گاڑی ڈیرہ کو جا رہی تھی۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیشاب کا مٹکا!

ڈاکٹر آصفی قہقہہ مار رہا تھا۔ "کتا پال کتا۔"

"میری کاپی دے دو کاپی ——" غلام چلا رہا تھا۔

"مسخرا۔ مسخرا۔" سول سرجن ہنس رہا تھا۔

"نہیں نہیں۔ پس پاٹ چور۔" کمپاؤنڈر ہنس رہا تھا۔

ایلی کی اس ذہنی پریشانی کا کوئی علاج نہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی پریشانیوں اور خفتوں کو جذب کر سکتی تھی۔ جذب کر لیتی تھی۔ اور وہ غلام کی ستار تھی۔

وہی غلام جس کے آقا ایلی کو پیشاب کا مٹکا سمجھتے تھے لیکن ایلی کے لئے غلام اور اس کے

...ے دور رہنا ممکن نہ تھا اس لئے سٹیشن سے وہ سیدھا غلام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے۔" غلام کی آواز آئی۔

"پیشاب کا مٹکا۔" ایلی نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔

"آیا ابھی آیا —— بسم اللہ بسم اللہ۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔" اتنے دن کہاں

...ے"

"میاں تمہارا ہمارا ساتھ۔ تم پوتر ہم پلید تم تنگ پچکاری۔ ہم پیشاب کے مٹکے۔"

غلام نے قہقہہ لگایا۔" تم تو بڑے خوش قسمت ہو بھائی جو صرف پیشاب کے مٹکے ہو۔ پتہ ہے مجھے کیا خطاب ملا ہے۔"

"کیا؟"

غلام مسکرایا۔ "فرمایا۔ تم تو زانی نفس ہو۔"

"کیا واقعی۔"

"تمہاری قسم۔"

اس ایک جملہ نے ایلی کو اس قدر تسکین دی۔ اس قدر تسکین دی جو دنیا بھر کے ڈاکٹر نہ ...ے سکتے تھے اور اس کی زندگی میں جو یہ نئی تلخی پیدا ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کے ...لت ستار کی تاروں کی لرزشوں نے صابون کے بلبلوں کی طرح اڑا دیئے اور وہ اس کراہتی ...لی ستار کے پہلو میں بیٹھ گیا جیسے تار کو کھینچنے والی کیل ہو جو ستار کے بازو پر لگی ہوئی تھیں۔

...کھاز عم

ایک روز شام کے وقت ایلی بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چلا گیا۔ اس نے دیکھا ...لا وہاں بیٹھا کام کر رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چبوترہ تھا جس پر بعد دوپہر ...ب آجاتی تھی۔ نورانی اس چبوترے پر بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز نرالا ...لا سڑک کی طرف پیٹھ کر لیتا میز دیوار کے ساتھ لگا لیتا۔

ڈیرہ میں وہ سڑک خاص طور پر مشہور تھی۔ چونکہ شام کے وقت ہندو خواتین پنڈتانیاں ...نتیاں اور لالائیاں اس سڑک پر سیر کرتی تھیں۔ شوقین مزاج لوگوں نے اس سڑک کو پنگھٹ ...نام دے رکھا تھا۔

ایلی خود کئی بار شام کے وقت بیٹھک سے باہر چبوترے پر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ہندو خواتین
جو ادھر سے گزرتی تھیں عام طور سے خوبصورت ہوتی تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی
ان کے چہروں پر شرم و حیا کی سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ جھکی جھکی رہتیں اور چھپنے کے لئے
کونے تلاش کرتیں اور جسم اپنا اعلان کرنے کی بجائے سمٹا سمٹا رہتا۔ ایلی کو انہیں دیکھ کر یوں
محسوس ہوتا تھا جیسے عصمت و عفت اور شرم و حیا کی پہاڑیوں پر ننھے ننھے چشمے ابل رہے ہوں

لیکن نورانی کا رویہ عجیب تھا۔ وہ سڑک سے منہ موڑ کر کیوں بیٹھ رہتا تھا۔ اسے ا
بدصورتی کا احساس تھا۔ کیا واقعی؟

ایک روز ایلی نے طنزاً نورانی سے کہا۔ "نورانی صاحب۔ آپ سڑک کی طرف منہ کر
کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ کوئی راہ چلتی آپ کو دیکھ کر آپ کی محبت میں اسیر
ہو جائے۔"

نورانی نے کام سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "کیا فائدہ۔"

"کیا مطلب۔"

"یہاں سے بچیاں گزرتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کو الجھن میں ڈال دوں تو۔"

ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا واقعی اس خیال سے آپ سڑک کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھتے
ہیں۔"

"ہاں یہ ڈر ہے۔" وہ بولا۔

"ارے۔" ایلی چلا اٹھا۔ "کیا آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

"تو پھر۔"

"الیاس صاحب کشش اور چیز ہے حسن اور۔"

"تو کیا آپ میں کشش ہے۔"

"بالکل ہے۔"

"ہمیں تو نہیں محسوس ہوتی۔"

"آپ عورت نہیں ہیں اس لئے۔"

"ارے۔"

نورانی اٹھ بیٹھا۔ ایلی کے قریب آ کر کہنے لگا۔ "الیاس صاحب اگر میں کسی عورت کی
طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لوں۔ نگاہیں چار ہو جائیں تو وہ میری تلاش میں آپ کا دروازہ نہ کھٹکھٹائے
تو۔"

"شرط رہی۔" ایلی چلایا۔

"ارے بھئی۔ شرط نہ لگاؤ۔" نورانی پھر سے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

"ڈرتے ہیں آپ۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "خواہ مخواہ آپ ہار جائیں گے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "اس قدر زعم ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" نورانی نے کہا۔

"تو شرط رہی۔"

"اچھا۔" وہ بولا۔ "اگر آپ مصر ہیں تو۔"

"منظور ہے۔" ایلی بولا۔

"لیکن اس میں دو چار شرائط ہوں گی۔ عورت میں خود منتخب کروں گا۔" ایلی نے کہا۔

"منظور۔" وہ بولا۔

"اگر آپ کوئی شرط عائد کرنا چاہیں تو۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" نورانی نے کہا۔ "پہلی شرط یہ ہے میرا نام اور پتہ نہ بتانا ورنہ بدنامی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ مجھے مناسب موقع دیا جائے کہ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ لوں۔"

"ٹھیک۔"

"تیسری بات یہ ہے۔ شرط نہیں منت ہے۔"

"کیا؟"

"کسی معصوم بچی کو نہ منتخب کرنا۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

ایلی نورانی کے یقین کامل پر حیران تھا۔

دن ایلی سوچتا رہا۔ اس مسئلے پر نہ وہ غلام سے بات کر سکتا تھا نہ اسد سے اور نہ کسی اور
سے چونکہ اس نے نورانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس شرط کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں

کرے گا۔ ان کے مکان کے گرد لڑکیاں تو بہت رہتی تھیں اور وہ چلا چلا کر اپنی موجودگی کا پیغام ان تک پہنچاتی رہتی تھیں۔ سڑک پر آنے جانے والی ہندو خواتین بھی تھیں لیکن ایلی نے سوچا ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو اس قدر جہاندیدہ ہو کر اسے فریفتہ کرنا آسان کام نہ ہو۔

"۔۔۔۔۔بنو!" دفعتاً" اسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ طائفہ بھلا کب کسی کی بنتی ہے۔ اسے کسی کا ہو جانے کا چاؤ بھی نہیں ہوتا اور پھر بنو تو واقعی پٹاخہ ہے۔

بھروپیئے

اگلے روز رات کے نو بجے کے قریب نورانی اور ایلی گھر سے نکلے۔ دونوں نے کالے کمبل اوڑھ رکھے تھے تاکہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ سر پر پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایلی آگے آگے جا رہا تھا نورانی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب وہ چکلے میں پہنچے تو نورانی رک گیا۔

"اچھا تو طوائف کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔"

"یہ شرط تو نہ تھی کہ یہاں کی نہ ہو۔" ایلی نے کہا۔

"مشکل کام دیا ہے آپ نے۔" نورانی بولا۔ "لیکن کچھ پروا نہیں چلئے۔"

بنو کے گھر جا کر ایلی نے کمبل اور پگڑی اتاری اور بے تکلفی سے ان سے باتیں کرنا لگا۔

"آیئے۔" وہ بولا۔ "آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ یہ آج ہی دلی سے آئے ہیں صرف ایک روز کے لئے ٹھہریں گے یہاں ڈیرے میں۔"

"آپ کی تعریف۔" بنو بولی۔

ایلی نے جھٹ جواب دیا۔ عظمت خاں۔"

"بڑا ٹھاٹھ دار نام ہے" گورا ہنسی۔

"خود بھی تو ٹھاٹھ دار ہے۔" ایلی نے کہا۔

"فی الحال تو پگڑی اور کمبل ہی دکھائی دیتے ہیں۔" گورا ہنسی۔

"اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کمبل کہاں ختم ہوا اور عظمت خاں کہاں شروع ہوئے۔" بنو
کہا۔

"یہی تو کمال ہے۔" ایلی بولا۔

"خود گونگے ہیں شاید۔" گورا بولی۔

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "بولنا نہیں جانتے۔ دیکھنا جانتے ہیں۔ تاجر ہیں نا اس لئے۔"

"تاجر ہیں۔" بنو نے کہا۔

"ہاں۔" موٹروں کا کاروبار ہے۔"

وہ سب دیر تک گپیں ہانکتے رہے لیکن نورانی اسی طرح گھٹا گھٹا گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے
کو کہنی ماری۔

"کونسی ہے؟"

"یہ ہے۔" ایلی نے اعلانیہ بنو کا ہاتھ پکڑ کر نورانی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

بنو نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نورانی نے بلا تکلف بنو کا بازو کھینچ کر اسے اٹھا لیا اور
بنا ہوا ملحقہ کمرے میں لے گیا۔ بنو اور گورا حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"گھبراؤ نہیں۔" ایلی بولا۔ ابھی آ جائیں گے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔"

"ایسی ویسی بات ہو بھی تو کیا ہوا۔" بنو بولی۔

"ہمیں بھی لے چلے کوئی۔" گورا ہنسی۔

"تمہیں نہیں البتہ۔" ایلی نے بنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔

بنو چیخ رہی تھی۔ "یہ کیا مذاق ہے۔"

کمرے میں پہنچ کر ایلی نے کہا۔ "مذاق نہیں۔ جمیل نے کہا تھا کہ تم دکھ جذب کر لیتی ہو۔
لگا۔ "میں دکھی ہوں۔ بنو! میرا کچھ کرو۔"

وہ ہنسنے لگی۔

"ڈرا نہ بنو۔" وہ بولا "ہنسی سے دکھ دور نہیں ہوتا۔"

"تو پھر۔" وہ بولی۔

"تمہیں کیا پتہ دکھ کیسے دور ہوتا ہے۔"

"مجھے بھی تو پتہ نہیں"۔ وہ بولی۔

"اچھا تمہاری مرضی۔" وہ بولا اور اس نے بنو کے ہاتھ میں بیس روپے تھما دیئے۔

"یہ کیسے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"سردیوں کے دن ہیں۔ ریوڑیاں اور مونگ پھلی کھا لینا۔"

"فضول۔" وہ غصے میں چلائی۔

"شانت شانت۔" ایلی نے کہا۔ تم تو نروان دینے والی ہو۔ سیخ پا کیوں ہوتی ہو۔"

"دینے والی ہوں۔ لینے والی نہیں۔"

"تو دے دو۔" وہ اس کی طرف بڑھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹکی۔

ایلی نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس پر رکھ دو۔"

"کیا؟"

"جو تمہارے پاس ہے دینے کو۔"

وہ ہنسی۔ "آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔"

"ان باتوں میں نہ پھنس جانا۔ اونچے بول اندر سے ڈھول والا معاملہ ہے۔"

"آؤ نا بھئی اب۔" نورانی نے اسے آواز دی۔

"کیوں۔ ہو گئے فارغ۔"

"لاحول ولا قوۃ" وہ غصے میں پھنکارا۔

"اوہ میرا مطلب تھا" ایلی نے معذرت کی۔

"بس گھورتے ہی رہے۔" بنو چلائی۔

ایلی نے غور سے بنو کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی کی نگاہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ "مار لیا میدان ......" اس نے سوچا۔

اگلے روز نورانی دورے پر چلا گیا۔ اور دو ہی دن میں ایلی بالکل بھول گیا کہ اس نے شرط بدھی تھی۔ اور بنو کو تختہ مشق بنایا تھا۔ وہ پھر سے غلام کی ستارے کے پاس جا بیٹھا اور جے ونتی اور کیدارے میں کھو گیا۔

پیاں پڑوں گی پلنگھا نہ چڑھوں گی پیاں پڑوں گی۔

غروب و طلوع

چند روز بعد ایک روز جب ایلی نویں جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھا رہا تھا تو چپراسی آیا۔

"جی۔ لالہ جی بلاتے ہیں۔" وہ بولا۔

"لالہ جی۔" ایلی نے لاپرواہی سے دہرایا۔

لالہ جی ان کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ عمر میں پچپن کے قریب تھے اور طبیعت کے لحاظ سے ستر کے ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ پنشن پانے والے ہیں لہٰذا نے پہلے ہی پنشن کی مشق شروع کر دی تھی۔ سارا دن باہر دھوپ میں یا اندر کمرے میں رہتے۔ نہ کسی استاد سے بگڑتے نہ کسی کو منہ لگاتے۔ البتہ جب بھی بن آتی لوگوں کی مدد تے تھے۔

ایلی دفتر میں داخل ہوا تو بنو کو لالہ جی کے روبرو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن جلد ہی نے خود کو سنبھالا۔

"جی لالہ جی۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کے مہمان ہیں۔" لالہ جی نے بنو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر بنو سے کہنے لگا۔

"آپ ذرا دفتر سے باہر باغیچے میں چلئے یہ ابھی آتے ہیں۔"

بنو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لالہ جی نے نگاہیں جھکا لیں اور بولے۔ "الیاس صاحب! مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی ــــ دیکھئے نا عورت کا سکول میں آنا ــــ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ نے بلانا ہی تھا تو گھر یا ہوتا۔"

"لالہ جی" ایلی نے جواب دیا۔ "اگر میں بلاتا تو گھر ہی بلاتا۔ اس کا یہاں سکول میں آنا ہی بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں نے اسے بلایا ہے نہ میں اسے جانتا ہوں۔"

لالہ جی نے آنکھ اٹھا کر غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور بولے "اچھا تو دیکھئے کہ بات کیا ہے۔"

ایلی باغیچے میں پہنچا تو بنو اس پر یوں جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔

"نہ جانے" وہ بولی۔ "بنو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو اسی روز سے تمہارے دوست کی مالا جپتی تی ہے ــــ اسے بلواؤ۔"

"ارے" ایلی چلایا۔ "کیا واقعی۔"

"نہ جانے کیا کر دیا ہے اس نے میری بنو پر۔" بنو کی آواز گلوگیر تھی۔

وہ تو عام سا آدمی تھا۔ جادوگر تو نہ تھا۔

"پتہ نہیں۔ کیا ہوا ہے۔ بے چاری بیمار ہے۔ آپ آئیں نا آج ضرور آئیں ضرور۔"

"آؤں گا۔" ایلی بولا۔ لیکن حیرت کی وجہ سے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر کیوں۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر نورانی۔ لاحول ولا قوۃ۔"

سکول سے فارغ ہو کر وہ گھر پہنچا۔ دروازے میں ایک خط پڑا تھا۔ اس نے بے خبری میں وہ خط اٹھا لیا اور بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ بیٹھک مقفل تھی۔

"ہوں۔ تو ابھی تک دورے سے نہیں آیا۔ لیکن آخر بات کیا ہے۔ نورانی نے کیا کیا ہوگا۔ شاید ٹونا کیا ہو۔ شاید تعویز لے گیا ہو۔ نگاہ میں اتنا اثر نہیں ہو سکتا۔"

اس نے بے خبری میں لفافہ چاک کیا اور خط پڑھے بغیر ٹہلنے لگا۔ سنکھیا کا یہ اثر تو نہیں ہو سکتا۔

"نہیں نہیں" وہ چلایا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

دفعتاً اس کی نگاہ خط پر پڑی۔ صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔

"میں جا رہی ہوں ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔ مجھ سے مل جاؤ اللہ کے واسطے۔" شہزاد

اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

نورانی، بنو، گورا، غلام اور اس کا ستار سب غروب ہو گئے۔ ان کی جگہ ایک چہرہ طلوع ہو گیا۔ منور چہرہ، ماتھے پر بڑا سا تل، غمناک آنکھیں، اداس صورت۔

"میں جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"لیکن .... لیکن ...." ایلی کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی علی پور جا رہی تھی۔

بھگوڑے

علی پور پہنچتے ہی ایلی نے شور مچا دیا۔ کبھی وہ فرحت کو آوازیں دیتا کبھی رابعہ کو تاکہ اس کی د کے متعلق شہزاد کو علم ہو جائے لیکن شہزاد رابعہ کے چوبارے کو چھوڑ کر اپنے چوبارے میں جا ی تھی۔ اس لئے اس نے ایلی کی آواز نہ سنی۔ پھر وہ اندھیری گلی کے راستے فرحت کی طرف لا گیا۔

ایلی نے بہانہ بتایا۔ کہنے لگا۔ "میرے افسر نے سرکاری کام سے امرتسر بھیجا تھا میں نے کہا لاز کے لئے علی پور بھی ہو آؤں۔"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ملحقہ مکان سے شور اٹھا۔ کوئی چیخ کر رو رہا تھا۔

"کون ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"اے ہے۔ صفدر ہے۔" ہاجرہ بولی۔

"روتا کیوں ہے؟"

"کبھی روتا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی سر دیوار سے دے مارتا ہے۔" فرحت بولی۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔"

"کوئی پردے کی بات ہے کیا؟"

"ہونہہ پردے کی ———" فرحت چلائی۔

"تو پھر بتانے میں کیا حرج ہے۔"

بس دیا اب بجھنے ہی کو ہے۔

"کیا مطلب؟"

"ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ ماری سپرٹ پی پی کر پھیپھڑا جل گیا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"بس آج نہیں تو کل ——" ہاجرہ کی ہچکی نکل گئی۔ "تو کیوں روتی ہے اماں۔" فرحت نے غصے سے کہا۔ "اے ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "میرے بھائی کا بیٹا ہے آخر۔" "اچھا تو میں چلتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"اے ہے کھانا تو کھالے۔" فرحت نے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہتا۔" ایلی نے کہا۔ پاؤں کی چاپ سن کر ایلی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں شہزاد کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اداسی اور تفکر ٹپک رہے تھے۔ "کون شہزاد ہے۔" فرحت بولی۔ "پہلے تو ناچتی ناچتی دھما چوکڑی مچاتی آیا کرتی تھی اور اب بلی کی طرح دبے پاؤں آتی ہے۔" "وقت وقت کی بات ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "یہ ایلی کب آیا؟"

"ابھی آیا ہوں۔" ایلی نے روکھے انداز سے کہا۔ "مجھے تو آج ڈر لگتا ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"تجھے اور ڈر۔" فرحت نے کہا۔ "وہ ڈر کے زمانے گزر گئے کیا؟" شہزاد نے آہ بھری۔

"بیت گئے۔" وہ بولی۔ "کس بات کا ڈر ہے تجھے۔" ہاجرہ نے پوچھا۔

"پڑوس سے خیر کی آوازیں نہیں اٹھ رہیں۔" وہ بولی۔ "ہاں وہ تو ہے ہی نہ جانے کس وقت۔" —— فرحت رک گئی۔ "تو ایلی کو لے جا تو اپنی طرف۔" ہاجرہ نے کہا۔ ہاجرہ کی اس بات پر وہ سب چونک پڑے۔ فرحت نے حیرت سے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔

"اور جو کسی کو پتہ چل گیا تو ——" فرحت بولی۔ "تو بھی کمال کرتی ہے اماں۔"

"ہم کسی کو بتائیں گے تو پتہ چلے گا نا۔" ہاجرہ نے کہا۔

فرحت غصے سے لال ہو گئی —— "واہ اماں واہ۔" ——

"ویسے بھی تو اس نے جانا ہی ہے نا۔" ہاجرہ چلائی۔ "ان دونوں کو آج تک تو کوئی روک نہ سکا۔ اب فضول غصہ چڑھانے سے فائدہ۔"

ایلی اٹھ بیٹھا۔ "چلو شہزاد۔" وہ بولا۔ "میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔"

شہزاد نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اس کے آگے آگے چل پڑی۔

ب کیا ہے

جب وہ چوبارے میں پہنچے تو شہزاد کے تینوں بچے سو رہے تھے۔ اس کی تین بڑی لڑکیاں بیہ نفیہ اور ریحانہ تو پہلے سے ہی گرد پتن کے سکول میں داخل تھیں چونکہ علی پور میں کیوں کا ہائی سکول نہ تھا۔ اس لئے شہزاد نے گرد پتن بھیج دیا تھا جو علی پور سے بیس میل کے ملے پر تھا اور جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی اور میں بیدی اور ناز ں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ لہٰذا شام ہی سے سو گئے تھے۔ اس کی ملازمہ جانو ان دنوں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے لاہور گئی ہوئی تھی۔ "کھانا کھا لو۔" شہزاد نے کہا۔ "میرا جی نہیں چاہتا۔ ایک پیالہ چائے کا پلا دو البتہ۔" ایلی نے جواب دیا۔ وہ چولہے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

ایلی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ "ہاجرہ نے بڑی جرات کی ہے آج" شہزاد نے کہا۔ "اور تم نے بھی۔ اب کیا ہے۔" اور پھر مدھم آواز میں گنگنانے لگا۔

"اب جو کچھ گزرنا ہے جان پر گزر جائے۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ شہزاد بات کیوں نہیں کرتی۔ ویسے بلا بھیجا ہے۔ لیکن خاموش ہے۔ "خط مل گیا تھا۔" شہزاد نے پوچھا۔ "ہاں" وہ بولا

"مجھ سے ملنے آئے ہو۔"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔ "مجھے پتہ تھا تم آؤ گے۔" وہ بولی۔

"اچھا؟" اس نے طنزاً کہا۔

"نہ بھی آتے۔" وہ بولی۔ "تو مجھے گلہ نہ ہوتا۔"

"اوہ۔" ——وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"کہاں جا رہی ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"پھر بھی۔"

"شاید عیسائی ہو جاؤں۔"

"اس سے کیا ہو گا۔"

"مزدوری کر سکوں گی۔"

"مجھے ساتھ لے چلو" ایلی نے کہا۔

"اونہوں۔" وہ بولی۔

"کیوں۔"

"بس نہیں کہہ جو دیا ——" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ایک بات پوچھوں۔" ایلی نے کہا۔

"پوچھ۔"

"کیوں جا رہی ہو۔"

"اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔"

"کیوں۔"

"بے عزتی کی زندگی سے بھیک مانگ لینا اچھا ہے۔"

"شریف آیا تھا کیا؟"

"ہاں۔"

"کب آیا تھا۔"

"جس روز تمہیں خط لکھا تھا اسی روز گیا تھا وہ۔"

"کچھ کہتا تھا۔"

"بہت کچھ۔"

"کیا؟"

"چھوڑو اس بات کو ——" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"ادھر کا دروازہ بند ہے کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"کدھر کا۔"

"فرحت کی طرف کا۔"

"نہیں تو۔"

"پھر آؤ۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ مسکرائی۔

"اگر فرحت آجائے تو۔"

"اگر ہم کچھ کرنے لگ جائیں تو۔"

"تو کیا ہے ——" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ شہزاد نے چائے تیار کر دی۔

"میز پر رکھ دوں۔" وہ بولی۔

"نہیں رہنے دو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"پیؤں۔"

"ہاں۔ تم پیو گی۔"

"پیوں گی۔"

"شہزاد۔" وہ بولا۔ "کیا تم زندگی سے اکتا گئی ہو۔"

"نہیں تو۔" وہ بولی۔ "ابھی کہاں۔"

"اب تو وہ تڑپ نہیں رہی۔"

"اونہوں" وہ بولی۔ "تڑپ تو ہے۔"

"تو پھر اداس کیوں ہو۔"

"اداس نہیں۔" وہ بولی۔

"پھر"

"ڈری ہوئی ہوں۔"

"کس سے۔"

"اس شرابی پڑوسی سے۔"

"منظور سے۔"

"ہاں۔ روز میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہتا ہے مجھے معاف کر دو تو مروں گا۔ ورنہ نہیں۔"

"تو کر دو نا معاف۔" ایلی نے کہا۔

"دل نہیں مانتا۔"

"اتنی سخت گیر تو نہیں تو۔"

"عورت ہوں۔" وہ بولی۔

"اوہ ——" اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔

دفعتاً شہزاد بولی۔ "تو وہاں کیوں کھڑی ہے یہاں آجا۔"

ایلی حیران تھا کہ کس سے بات کر رہی ہے۔

فرحت مسکراتی ہوئی دروازے سے نکل کر اندر آ گئی۔ "میں نے کہا دیکھوں تو کیا کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔

"یہاں بیٹھ کر دیکھو نا۔" شہزاد بولی۔ "چھپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔"

"میں تو حیران ہوں۔" فرحت بولی۔ "تم دونوں ہی عجیب ہو۔"

"کیوں۔" شہزاد نے پوچھا۔

"یوں بیٹھے ہو۔ جیسے صدیوں سے ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہو۔"

"وہ تو ہے۔" شہزاد بولی۔ "صدیوں سے اکٹھے رہتے ہیں ہم۔ کیوں ایلی۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا "صدیوں سے۔"

"اور میں سمجھتی تھی۔" فرحت ہنسی۔

"تو جو جی چاہے سمجھ تیرا کیا ہے۔" شہزاد بولی۔

اکیلی یا دونوں

فرحت چند ایک منٹ ٹھہری اور پھر بہانہ بنا کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"دیکھو شہزاد۔" ایلی اٹھ بیٹھا۔ "اگر تم نے جانا ہی ہے تو چلو اکٹھے چلیں۔"

"بڑی بدنامی ہو گی۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"تم برداشت نہ کر سکو گے۔"

"میری بات چھوڑو۔" وہ بولا "میں مرد ہوں۔ سبھی کچھ برداشت کر لوں گا۔ تم عورت ہو۔ میری تنخواہ بہت قلیل ہے۔ تم غربت برداشت نہ کر سکو گی۔ تم غربت سے واقف نہیں شہزاد'

اگر تم بچے چھوڑ جاؤ گی تو تم ان کی جدائی برداشت نہ کر سکو گی۔"

وہ خاموش رہی۔

"بولو نا۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

"میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے تیار نہیں۔" وہ بولی۔

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔

"ایک بات کہوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"کہو۔"

"چلو اس کا فیصلہ نہ تم کرو نہ میں کرتا ہوں۔"

"تو پھر۔"

"دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔" ایلی نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"آؤ پرچیاں ڈال لیں۔ ایک پر لکھیں دونوں دوسری پر اکیلی تم ایک پرچی اٹھا لو۔ اگر اکیلی نکلی تو میں چپکے سے چلا جاؤں گا اور اگر دونوں نکلا تو تم چپکے سے میری ساتھ چل پڑنا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

"بولو منظور ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

دیر کے بعد اس نے آہ بھری۔ چلو ساری عمر جوا کھیلا ہے تو اب کی بار بھی سہی۔" شہزاد

"تو منظور ہوا نا۔" ایلی نے کہا۔

"لیکن میری ایک شرط ہو گی۔" وہ بولی۔

"کیا؟"

"وعدہ کرو کہ اگر اکیلی کی پرچی نکل آئی تو تم شادی کر لو گے۔ میرے جانے کے فوراً بعد اور زندگی بھر مجھ سے نہیں ملو گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"میری خاطر ہمیشہ سب کچھ ہوتا آیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ بھی ہو گا۔ جو بھی میں چاہوں گی ہو کے رہے گا۔" وہ مسکرا دی۔

"کیا مطلب؟"

"میں ابھی جیتی ہوں۔" وہ بولی "مجھے مردہ نہ سمجھو۔ مجھ میں ابھی کس بل ہے۔" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"میری خاطر تم یہ بھی کرو گے۔ دیکھ لینا۔"

"اور نہ کروں تو۔"

"تو میرا آخری فیصلہ تم سن ہی چکے ہو۔"

"یعنی جوا نہیں کھیلو گی۔"

"اونہوں۔" شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا ـــــ" ایلی بولا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"وعدہ۔"

"تمہاری قسم۔"

"مجھے تم پر یقین ہے۔"

"لیکن دونوں نکلا تو میری بھی ایک شرط ہو گی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔" ایلی نے کہا۔

"کیا؟"

"اگر بچوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو غربت برداشت کرنی پڑے گی اور اگر بچوں کو ساتھ نہ لے جاؤ گی تو ان کا غم نہ کھانا۔ ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔

"میں بتاؤں۔" ایلی بولا۔

"کیا۔"

"تم لڑکیوں سے سچی بات کہہ دینا اور پوچھ لینا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ بھوکوں مرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

"تو پرچیاں لکھ دو۔"

وہ اٹھی۔ ٹرنک سے کاپی کا ورق پھاڑا۔ پنسل لی اور لکھنے بیٹھ گئی۔

دفعتاً نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے ل میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رونے لگی۔

"شہزاد۔" "شہزاد۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کی توں پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

ں نہیں مروں گا

ـــــ عین اس وقت ملحقہ کمرے سے شور سنائی دیا۔

"نہیں نہیں۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔" صفدر چلا رہا تھا وہ کمرے میں ادھر سے ر اور ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔

"نہیں نہیں نہیں نہیں۔" وہ چلائے جا رہا تھا۔

شہزاد نے سر اٹھایا اور غور سے سننے لگی۔

"ننھی کے ابا ننھی کے ابا۔" صفدر کی بیوی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ "خدا کے لئے ان ے چھوٹے بچوں کے لئے۔"

"چلی جاؤ چلی جاؤ۔" وہ چلانے لگا۔

"ان بچوں پر رحم کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔

"چلی جاؤ، چلی جاؤ۔ مجھ پر کسی نے رحم نہیں کیا۔ میں کسی پر رحم نہیں کروں گا۔"

"اپنے آپ پر رحم کرو۔ یہ زہر نہ پیئو۔" اس کی بیوی بولی۔

"ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ چیخ رہا تھا۔

"خدا کے لئے خدا کے لئے۔" وہ کراہ رہی تھی۔

ر ملحقہ کمرے پر خاموشی چھا گئی ـــــ وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"شہزاد۔" ایلی بولا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"میری طرف دیکھو۔"

شہزاد نے سر اٹھا لیا۔ اس کی گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔

سوچ رہا تھا۔ نہ جانے صفدر کے متعلق کونسی بات تھی۔ جو شہزاد چھپا رہی تھی۔

وہ تو طبعاً" بے نیاز تھی۔ کسی بات کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کیا بات تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"شہزاد۔" وہ بولا "آخر بات تو ہے کوئی۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولی۔

اچھا تو یہ پرچیاں تو لکھو۔

"لکھتی ہوں۔" وہ بولی اور ویسے ہی بت بنی بیٹھی رہی۔

ملحقہ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف لمبے لمبے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

——— دیر تک وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔

ملحقہ کمرے سے ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی۔ کوئی دیوار بجا رہا تھا۔ شہزاد کے کان کھڑے ہو گئے۔

"دیوار بجا رہا ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"شہزاد نے اثبات میں سرہلایا۔

"کون ہے۔" اس نے پوچھا۔

شہزاد نے پھر اثبات میں سرہلایا۔

ایلی بجھ گیا۔ لیکن صفدر دیوار کیوں بجا رہا ہے۔ یہ اسے سمجھ میں نہ آیا۔

"مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔" صفدر کی مدھم آواز سنائی دی۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"وہی ہے کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

شہزاد نے اثبات میں سرہلایا۔

"تو کہہ دو معاف کر دیا۔" ایلی نے کہا۔

شہزاد نے برا سامنہ بنایا "دل نہیں مانتا۔" وہ بولی۔

"تو جھوٹ موٹ کہہ دو۔" ایلی نے کہا۔

"جب تک میں نہیں مروں گا۔" صفدر با آواز بلند چیخنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور "کہہ کیوں نہیں دیتی۔" ایلی نے پوچھا۔

"ساری عمر جان کنی کے عذاب میں مبتلا رہے۔" شہزاد بولی۔

ایلی نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ کیا یہ شہزاد بول رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ تو اتنی دل نہ تھی۔ پھر کون بول رہی تھی۔ ایلی کے لئے شہزاد کی شخصیت کا یہ پہلو نیا تھا۔ جس سے وہ آج تک واقف نہ ہوا تھا۔

کچھ دیر ملحقہ کمرے پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر دیوار پر پھر سے ٹک ٹک ہونے لگی۔

"کہہ کیوں نہیں دیتی۔" ایلی بولا۔

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"میری خاطر کہہ دو۔" ایلی نے منت کی۔

"جی نہیں مانتا۔" وہ بولی۔

"کہہ دیتی ہوں۔ صرف ہونٹوں سے۔"

"تو کہہ دو۔"

شہزاد نے ٹرنک سے تالہ اٹھایا اور اسے دیوار پر مارنے لگی۔ ٹھک ٹھک ٹھک پھر وہ رک گئی۔

صفدر نے پھر دیوار بجائی۔

شہزاد نے پھر تالہ دیوار پر مارا۔ ٹھک ٹھک ٹھک

دفعتاً "صفدر چلایا "تم ہو۔ تم ہو۔ بولو۔"

"ہاں" وہ با آواز بلند بولی۔ "میں نے معاف کیا۔"

ملحقہ کمرے سے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی چیخ رہا تھا' ناچ رہا تھا۔ قہقہے مار رہا کھانسی پھر چھڑ گئی۔ پھر وہی قے کرنے کی آواز اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"اب پرچی لکھو نا۔" ایلی نے کہا۔

"ہاں پرچی۔" شہزاد گویا خواب سے بیدار ہوئی۔

پرچیاں لکھتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اس نے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کے ان دونوں پرزوں کو تہہ کیا اور بولی۔ "اب اٹھاؤ۔"

"میں نہیں۔" ایلی بولا۔ "تم اٹھاؤ۔" ایلی نے پرچیوں کو مٹھی میں لے کر ہلایا۔

شہزاد نے ایک پرچی اٹھائی۔ "کھولو۔" وہ بولی۔

"نہیں تم خود کھولو۔" اس نے کہا۔

شہزاد نے اسے کھولا۔ "دونوں" دیکھ کر وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے میں صفدر کی بیوی کے بین شروع ہو گئے۔

ایلی چونکا۔ "کیا مر گیا؟" وہ بولا۔

"ہاں۔" شہزاد نے جواب دیا۔ "جان چھٹی۔" ——— لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو رواں تھے۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے۔

"تم اب جاؤ۔" شہزاد بولی۔ "مرگ پر سارے محلے والے اکٹھے ہوں گے۔"

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "کل میں چلا جاؤں گا۔ انتظام کرنے کے لئے۔ انتظام کر کے واپس آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "دیر نہ لگانا۔" وہ بولی۔

"نہیں۔" ایلی بولا، جلد آؤں گا۔" وہ دبے پاؤں فرحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔

وکیل میم

لاہور پہنچ کر ایلی سوچنے لگا کہ اسے کیا تیاری کرنی ہے۔ اسے قانون سے چنداں واقفیت نہ تھی اور نہ ہی اسے کسی لڑکی کو بھگا کر لے جانے کا تجربہ تھا۔ شہزاد نے کئی بار اسے بتایا تھا کہ شریف کے ساتھ اگر ایسی واردات ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ میدان میں آ کر لڑنے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہر حال اگر اس نے کوئی اقدام کیا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح زد میں آتا ہے۔ ایلی نے کورٹ روڈ پر دو چکر لگائے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ لیکن اس میں اس قدر ہمت نہ پڑتی تھی کہ کسی وکیل کے پاس جائے۔

اپنی کوٹھی کے باغیچے میں ایک معمر وکیل کو بیٹھے دیکھ کر اس نے اندر داخل ہونے کی شدید کوشش کی لیکن اس کے قدم رک گئے عین اس وقت وکیل کا منشی آ گیا۔

"کیوں مہاراج۔" وہ بولا۔ "آپ لالہ جی سے ملیں گے۔"

"ہاں۔" ایلی نے مشکل سے کہا۔

"تو آؤ نا وہ سامنے بیٹھے ہیں۔"

ایلی کو مجبوراً لالہ جی کے پاس جانا پڑا۔ "آداب عرض۔" وہ بولا۔

"نمستے۔" وکیل نے جواب دیا اور کتاب ایک طرف رکھ دی۔ "ہوں کیا بات ہے۔"

"مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔"

"ہوں۔" وہ حقے کا کش لے کر بولے۔

"اغوا کا کیس ہے۔" ایلی نے بصد مشکل کہا۔ پھر وہ گھبرا گیا۔ "میرا مطلب ہے۔ ابڈکٹ کل۔ یعنی۔" وہ رک گیا۔ اس کا گلا سوکھ گیا تھا۔

"کیا کیس ہے۔" وہ بولے۔

"اگر ایبڈکمنٹ کی جائے۔ تو اس میں قانونی زد کیا کیا ہو سکتی ہے۔"

"یہ تو کوائف پر منحصر ہے۔" لالہ جی بولے۔

"میرا مطلب ہے۔" ایلی نے بصد مشکل کہا "کیا کوائف ہونے چاہئیں؟"

"یعنی کیا مطلب ہے؟"

"مطلب ہے یعنی ———"

"دیکھو نوجوان۔" لالہ جی بولے۔ "کیا ارتکاب جرم ہو چکا ہے؟"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

لالہ جی قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"کیا تم اس کے ہیرو ہو گے۔" لالہ جی نے پوچھا۔

"جی۔" ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لڑکی کی عمر کیا ہے؟" وہ بولے۔

"عمر ———" ایلی کے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ "معلوم نہیں۔" وہ بولا۔

"پھر بھی اندازاً"

"اس کے چھ بچے ہیں۔"

لالہ جی کی آنکھیں ابل آئیں۔ "نوجوان وہ بولے تمہیں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہئے وکیل

لالہ جی کی کوٹھی سے نکل کر ایلی نے اطمینان کا سانس لیا "کچھ پرواہ نہیں۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اور لالہ جی سے ملنے کی کوفت مٹانے کے لئے وہ سینما ہال میں جا گھسا۔

سینما سے نکل کر جب وہ انار کلی میں جا رہا تھا تو محمود کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ "ارے تم؟"

"میں یہیں ہوں۔" محمود بولا۔

"یہاں تبدیلی ہو گئی ہے کیا۔"

"نہیں چھٹی پر ہوں۔" محمود نے کہا "لمبی چھٹی پر۔"

"کیوں؟"

"یہاں کالج میں داخل ہو گیا ہوں۔ بی اے کر رہا ہوں۔"

"ارے۔ اور زر۔"

محمود ہنسا۔ "پرایا دھن۔" وہ بولا۔

"کس کا؟"

"اسی کا۔"

"اسی کس کا۔"

"میری میم کا۔"

"ارے۔ کیا وہ تمہاری بن گئی ہے۔"

"شاید نہ بنتی لیکن مسٹر فلپ نے اس روز حملہ کر کے اسے اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا۔"

"وہ کس طرح۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی عورت ہے۔ ضد میں آ گئی۔ بولی یوں ہے تو چلو یونہی سہی۔"

"تو وہ میم کہاں ہے آج کل۔" ایلی نے پوچھا۔

"میرے پاس ہے۔"

"کہاں؟"

"مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ چلو گھر چلیں۔ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔"

گھر جا کر ایلی نے محمود کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ محمود سٹپٹا گیا۔ "ارے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر رہے ہو۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر رہی ہے۔ یار اگر خاوند نے قانونی چارہ جوئی کی تو اندر ہو

ؤ گے۔"

"پھر کیا ہے۔" ایلی بولا۔ "مجھے ڈراؤ نہیں۔ مشورہ نہ دو۔ امداد کرو۔"

"جتنی مدد کہو گے کروں گا۔ بشرطیکہ میں قانون کی زد میں نہ آؤں۔" محمود ہنسنے لگا۔

"چھ بچوں کی ماں ہے وہ کیا۔" میم نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تمہارا رومینس ہے۔" اس نے پوچھا۔

"سولہ سال سے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"سولہ سال" اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"حرام زادی۔" محمود غصے میں چلایا۔ "اس کی آنکھ کی چمک دیکھو۔"

"تم تو خواہ مخواہ بگڑتے ہو۔" میم نے یوں لاڈ سے کہا جیسے بچی ہو۔

"ابھی رومینس کی لت نہیں گئی کیا۔" محمود نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور اوندھا کر کے اس کے چوتڑوں پر یوں مکے مارنے لگا۔ جیسے سکول کی بچی کو سرزنش کر رہا ہو۔

"ہائے مری ہائے مری۔" میم چلا رہی تھی۔

"میرے دوست پر للچائی نظریں ڈالتی ہے تو"۔ محمود غرا رہا تھا۔

ایلی حیران تھا۔ اس کے ذہن میں میم کا تخیل کچھ اور تھا۔ یہ عجیب میم تھی اور محمود عجیب
نوی تھا۔ جو میم کا محتاج ہونے کے باوجود اسے یوں پیٹ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہاؤس میڈ ہو۔

بہر حال محمود سے کوائف طے کرنے کے بعد وہ ڈیرہ آ گیا۔

محرم لفظ

ڈیرہ پہنچ کر بھی اس کے کانوں میں محمود کا مشورہ گونج رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا۔ "ایک بات رکھو۔ اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنا۔ روپوش نہ ہو جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

ایلی نے ڈیرہ پہنچ کر اس کے توسط سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تاکہ شہزاد کو وہاں رکھ
ئے اس انتظام کے باوجود وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

پہلے روز جب وہ غلام کے گھر گیا۔ تو غلام اسے دیکھ کر بولا۔

"کیوں خیریت تو ہے۔"

"بالکل" ایلی نے جواب دیا۔

"معلوم تو نہیں ہوتی۔" غلام نے کہا۔

نہ جانے کیا بات تھی۔ ہر کوئی اس سے یہی سوال پوچھتا تھا۔ کیا واقعی اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے آثار اس حد تک نمایاں تھے۔

"الیاس بھائی۔" غلام بولا "اپنے آپ سے لڑو گے تو بند بند چغلی کھائے گا۔"

"میں کیا اپنے آپ سے لڑ رہا ہوں۔"

"ظاہر ہے۔" وہ بولا پھر غلام نے پیار سے ایلی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ جو بھی کرنا ہے کر ڈالو۔ سوچو نہیں ورنہ سوچ کا آرا چلتا ہے۔ بری طرح چلتا ہے۔"

ایلی کئی بار چاہتا تھا کہ غلام سے ساری بات کہہ دے، لیکن اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس روز بھی اس نے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو نورانی خلاف معمول ایلی کے کمرے میں آ گیا۔

"الیاس صاحب۔" وہ بولا "معاف کیجئے میں نے دیکھا ہے کہ آپ سخت پریشان ہیں۔"

ایلی نے محسوس کیا کہ اسے جھٹلانا بے کار ہے۔ "ہاں ہوں۔" وہ بولا۔

"میں کوئی مدد کر سکتا ہوں کیا؟"

"نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو پھر؟"

"بات یہ ہے نورانی صاحب کہ میں مستقبل کے متعلق پریشان ہوں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" نورانی بولا "ضرور کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے۔" ایلی نے پوچھا۔

"میں علم جفر سے واقف ہوں۔" نورانی نے کہا "کیا آپ اپنا سوال مجھے بتا سکتے ہیں۔"

"نہیں" ایلی نے کہا "وہ ایک راز ہے۔"

"اچھا۔" نورانی بولا "تو آپ نہ بتائیے۔ میری ہدایات پر عمل کیجئے۔"

"وہ کیسے؟"

"اپنا سوال تیرہ الفاظ میں لکھ دیجئے۔" نورانی کہنے لگا "شرط یہ ہے کہ الفاظ تیرہ ہوں نہ کم

شلا کیا میں بی۔اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ جو اسال ہو گا۔ دیکھئے اس سوال
الفاظ ہیں اور اس کا متن معانی کے لحاظ سے مکمل ہے۔"

س کے بعد نورانی نے ایلی کو ایک لمبا چوڑا عمل بتایا۔ ان الفاظ کو ابجد کے ہندسوں میں
اور اسی طرح تیرہ مرتبہ بدلنا تھا اور پھر ان کا مجموعہ نکالنا تھا۔ نورانی بیٹھ گیا اور اس عجیب و
ل میں ایلی کی مدد کرنے لگا۔ جب مجموعہ نکال چکا تو نورانی بولا۔ "اب ذرا ٹھہریئے۔ میں
ر ستاروں کی پوزیشن دیکھ لوں۔"

ابای ایک جملہ آپ لکھیں جس میں پورا مفہوم موجود ہو۔ مجھے بے شک نہ بتائیں۔

الی نے تیرہ لفظوں کا جملہ لکھا۔

کیا یہ اغوا میرے اور شہزاد کے لئے باعث خوشی یا پریشانی ہو گا۔

ورانی باہر نکل گیا اور وہاں کھڑا گویا عجیب عجیب منتر پڑھتا رہا۔ مشتری، اسد، زہرہ، سرطان
جانے کیا کیا نام لیتا رہا۔

پھر وہ اندر آ گیا۔ "ستاروں کے لحاظ سے۔" وہ بولا "آپ اس مجموعے میں ۲۱۵ جمع کر

ئی" ایلی نے جمع کر کے کہا۔

ب آپ از سر نو انہیں حروف میں بدل لیجئے۔"

لی نے ایسی ہی کیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے تیرہ الفاظ کا ایک مکمل جملہ بنا ہوا

یہ فعل آپ کے اور لواحقین کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہو۔"

کیا میں جواب دیکھ سکتا ہوں۔" نورانی نے کہا۔

لی نے وہ چٹ جس پر جواب لکھا تھا۔ نورانی کی طرف بڑھا دی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا
ے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

مجھے افسوس ہے۔" نورانی بولا۔

مجھے بھی ہے۔" ایلی نے کہا "لیکن میرا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔"

لیاس صاحب۔" نورانی بولا "میں دوست ہوں ناصح نہیں البتہ اگر کبھی میری مدد کی
ضرورت پڑ جائے تو آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر نورانی باہر نکل گیا۔

"یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ اللہ اچھا کریں گے۔" حاجی صاحب کی گردن روئی کے گالے کی طرح لرز رہی تھی۔

"اپنے آپ سے نہ لڑو۔" غلام مسکرا رہا تھا۔ "جو کرنا ہے کر ڈالو۔ کر ڈالو۔"

"تم قید ہو جاؤ گے۔" محمود چلا رہا تھا۔

"تمہیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔" لالہ جی اسے گھور رہے تھے۔

دھمکی

آٹھ روز کے بعد ایلی لاہور سٹیشن پر بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزاد کی لڑکیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر حالت میں ماں کا ساتھ دیں گی۔ انہیں غربت اور بھوک کی تکلیف کا تصور ہی نہ تھا۔

شہزاد کی تینوں بڑی لڑکیاں ہنسوڑ تھیں۔ وہ ہر بات پر ہنستی تھیں۔ ہنسے چلی جاتی تھیں۔ بات بات پر ان کی مسرت میں یوں ابال آتا تھا۔ جیسے سوڈے میں نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔

سب سے بڑی صبیحہ تھی۔ اس کا چہرہ بے حد معصوم تھا۔ طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ لیکن ذہنی چمک نہ تھی۔ نفیسہ اس سے چھوٹی تھی اسکا رنگ سانولا تھا۔ وہ بے حد تیز اور ذہین تھی۔ لیکن بات بات پر ہنسنے میں وہ نفیسہ کی ساتھی تھی۔ تیسری جسمانی طور پر بھی صبیحہ اور نفیسہ کی طرح رنگین نہ تھی۔ اسے مزاح پیدا کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ بہنوں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی بات بات پر ہنسنا سیکھ لیا تھا۔ طے شدہ انتظامات کے مطابق شہزاد نے علی پور سے گردتن لڑکیوں سے ملنے جانا تھا اور پھر گورپتن سے محمود نے انہیں لاہور لے آنا تھا۔ جہاں سے ایلی انہیں ڈیرہ لے جا رہا تھا۔ ڈیرہ میں ایلی نے خفیہ طور پر ایک الگ مکان ان کی رہائش کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔

ایلی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مگر جب وہ لاہور پہنچے اور ایلی انہیں لے کر ڈیرہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا تو شہزاد کی لڑکیوں کی مسلسل ہنسی نے اس کا فکر دور کر دیا۔

ایلی حیران تھا۔ انہیں خطرے کا احساس ہی نہ تھا۔ شہزاد خاموش تھی۔ لیکن جب ایلی نے خطرے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑی۔ وہ بولی۔ ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا۔ جہاں جی چاہے گا رہیں گے جہاں نہیں جی چاہے گا نہیں رہیں گے۔ اب مزید بے عزتی برداشت نہ ہوئی تو چلی آئی۔ لڑکیاں

[illegible]وٹی سے آئی ہیں۔ واپس لینا چاہے تو لے لے۔"

"لیکن اگر اس نے چارہ جوئی کی تو۔" ایلی نے پوچھا۔

"پڑا کرے میں بھری کچہری میں جواب دوں گی اسے تم کیوں غم کھاتے ہو۔" وہ بولی۔

انہیں ڈیرہ میں رہتے ہوئے دس روز ہو گئے۔ لیکن کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جو باعث فکر ہوتا۔

گیارھویں دن محلے کے ایک بزرگ سکول میں آ گئے اور ہیڈ ماسٹر کے توسط سے ایلی سے ملے۔ ایلی کو یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ شہزاد کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ایلی انہیں اپنے گھر لے گیا۔ جب انہوں نے گھر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو ایلی کا ماتھا ٹھنکا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے ایلی سے بات کی۔

بولے۔ "بھئی بات یہ ہے کہ مجھے شریف نے یہاں بھیجا ہے۔"

"شریف نے؟"

"ہاں۔" وہ بولے۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ شہزاد اپنے تمام بچے لے کر چلی گئی ہے۔"

"چلی گئی ہے؟" ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"یہاں ہم صرف اس لئے آئے ہیں کہ تم سے کہیں کہ تم شہزاد کی مدد کرنا ورنہ خواہ مخواہ نیں بدھ جائیں گی۔ چونکہ شریف کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سخت کارروائی کرے گا۔"

وہ بزرگ ایلی کو دھمکی دے کر چلے گئے۔

جب وہ شہزاد کے پاس گیا اور اس نے یہ قصہ بیان کیا تو وہ ہنس پڑی۔ "اونہہ" وہ بولی" سخت کارروائی کرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے کر گزرتے ہیں۔"

بہرحال اس بزرگ کے آنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈیرہ نہیں رہیں گے اگلے روز ہی وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر جملہ لوگوں کو ساتھ لے کر امرتسر چلا گیا۔

...ان

ادھر شریف چھٹی لے کر علی پور آ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے بنے بنائے گھر میں [illegible] اڑ گئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے تمام اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ تو اس میں ایک عجیب [illegible] واقع ہوئی۔ وہ شریف جس نے کبھی محلے میں سر نہ اٹھایا تھا۔ جسے کسی نے اونچی آواز سے [illegible]کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔ جس کی آواز تک کبھی محلے میں نہ گونجی تھی وہ شریف احاطے کے

میدان میں آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ محلے والوں کے احساس خودداری کو للکار رہا تھا۔ لوگوں کو غصہ دلا رہا تھا۔ اپنی لٹی ہوئی دنیا کا واسطہ دے کر انہیں علی احمد کے گھرانے کی خلاف ابھار رہا تھا۔

شریف کی آواز سن کر محلے کی عورتیں کھڑکیوں میں آ گئیں انہوں نے ہاتھ چلا چلا کر شریف کی شرافت کو سراہا۔ جو ظلم اس پر ہوا تھا۔ اس میں رنگ بھر کر شہزاد کے قصے بیان کئے اور شریف کو مزید ابھارا۔ اس محلے کے مرد اکٹھے ہو گئے۔

"ان کا حقہ پانی بند کر دو۔" کسی نے نعرہ بلند کیا۔

"بند کر دو بند کر دو۔" وہ نعرہ چاروں طرف گونجا۔

عورتوں نے علی احمد کے خاندان کے جملہ لوگوں پر لعنتیں بھیجنا شروع کر دیں۔ مردوں نے لٹھ اٹھا کر لہرائے نوجوانوں نے قسمیں کھائیں۔

"محلے سے نکل جاؤ۔" وہ چلائے "نکل جاؤ۔"

گھر میں ہاجرہ فرحت سیدہ سب سہمی بیٹھی تھیں۔ ان کے دروازے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے خلاف آوازے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن علی احمد اطمینان سے گھر میں بیٹھے روز کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"میں کہتی ہوں یہ ایلی ہی کا کام ہے۔" ایک بولی۔

"جو جو یہاں ہوتا رہا ہے اسے دیکھ کر ہماری تو آنکھیں پک گئی تھیں۔ گند مچا رکھا تھا اس اللہ کی بندی نے۔"

اعلانیہ ملتے تھے وہ کیوں ماں۔"

"بالکل لیکن خاوند نے آنکھیں موند رکھیں تھیں۔ ہم کس منہ سے بات کرتے۔"

"اے سچ پوچھو تو شریف کی شرافت نے جلتی پر تیل ڈالا۔ ورنہ انہیں اتنی جرات نہ ہوتی کبھی۔"

"وہ کہتے ہیں نا کہ گربا کشتن روز اول۔"

محلے کے اس طوفان نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ علی احمد اور ہاجرہ سے متعلقہ پرانی دشمنیاں جاگ اٹھیں۔ لوگ پرانے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے اور شریف کو خوفناک مشورے دینے لگے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شریف نے شہزاد کی بجائے نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پھر نہ ...انہیں کہاں سے خبر مل گئی کہ ایلی امرتسر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سب لاٹھیاں اٹھا کر امرتسر آ

ایلی جونہی امرتسر پہنچا تو نہ جانے کیا ہوا۔ اس کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئیں اور پھر سب ...گئیں۔ ان میں سے پانی رسنے لگا۔ ایلی کو کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ امرتسر کا وہ علاقہ ...میں انہیں مکان ملا تھا۔ بالکل نیا تھا۔ جس سے ایلی واقف نہ تھا۔ لہٰذا اس نے گھر سے دور ...ناسب نہ سمجھا ان کے گھر کے قریب ہی ایک جراح کے دوکان تھی وہ جراح کی پاس چلا گیا۔

"یہ کیا نکلا ہے مجھے۔" اس نے جراح سے کہا۔

"یہ اگزیما ہے۔" جراح نے کہا "میرے پاس اس کا خاص علاج ہے۔" جراح نے پرانے ...ے کا بڑا سا ٹکڑا جلایا اور جلے ہوئے کپڑے کو ان سوراخوں میں بھر دیا۔ جو ایلی کے منہ پر ...یوں کے پھوٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ایلی نے آئینہ دیکھا۔ اس کی ہنسی نکل گی۔ ...معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سرکس کا کارٹون ہو۔

...وہ دوکان سے باہر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کے سات آٹھ افراد ہاتھوں میں لاٹھیاں ...آ رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر پتھر بن کر کھڑا ہو گیا۔

قریب آ کر وہ رک گئے پھر ساتھ والے دوکان دار سے کہنے لگے "شیخ عثمان صاحب آپ ...ارے محلے کا کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو۔" عثمان نے جواب دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف چل پڑے۔

...نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محلے والے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اگر اس کا منہ نہ پھٹا یا اس ...ہوئی دھجیاں نہ لگی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔

ایلی گھر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ وہ سب تاش کی گڈی سامنے رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ...ناچ رہی تھی۔ صبیحہ اور ریحانہ ہنس ہنس کر دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اوئیس چلا چلا کر نہ ...کیا اعلان کر رہا تھا۔ ناز تالیاں پیٹ رہی تھی۔ اور بیدی چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔"

...اللہ کے بندو مجاہدو۔ کچھ خبر ہے۔ محلے والوں کے جتھے امرتسر کا چپہ چپہ چھان رہے ...تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں لاٹھیاں اٹھائے ہوئے ہیں۔"

"کرنے دو تلاش۔" شہزاد بولی۔ "ڈھونڈ بھی لیا تو کریں گے کیا۔"

"مجھے ملے تھے۔ ابھی۔" ایلی نے کہا۔

دفعتاً ان کی نگاہ ایلی کے چہرے پر منعطف ہو گئی وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ "یہ کیا حلیہ بنایا ہے چچا جان۔"

"یہ حلیہ نہ بنا ہوتا تو وہ گھسیٹ کر لے گئے ہوتے۔" ایلی بولا۔

لیکن وہ سب موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے سے منکر تھے انہوں نے ایک اور قہقہہ بلند کیا ایلی محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ ناچ اور گانا کمپنی کا جوکر ہو۔

صحرا میں نخلستان

اگلے روز بارہ بجے کے قریب دروازہ بجا۔

"یااللہ یہ کون ہے۔" ایلی کا دل ڈوب گیا۔

"الیاس صاحب۔" کسی نے آواز دی۔

ایلی گھبرا گیا۔

شہزاد اٹھ بیٹھی۔ "میں دیکھتی ہوں کون ہے۔"

"نہ نہ نہ" اس نے شہزاد کو روکا مگر وہ جا چکی تھی۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی باتیں کرتی رہی پھر آکر کہنے لگی "کوئی ڈیرہ کا ٹیچر ہے کہتا ہے میرا نام شیخ ہے تم سے ملنے آیا ہے۔"

"لیکن اسے ہمارے گھر کا علم کیسے ہوا۔"

"یہ نہیں مجھے معلوم۔" وہ بولی۔

ایلی ڈرتا ڈرتا باہر نکلا۔

"اسلام علیکم۔" شیخ اسے دیکھ کر چلایا۔ "بھئی بات یہ ہے کہ میں نے کل تمہیں دیکھا تھا پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ پھر آج میں نے تمہیں پہچان لیا۔ اس لئے ملنے چلا آیا۔"

"لیکن تم یہاں کہاں۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی یہ ساتھ والا مکان میرا ہے۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں نا آٹھ روز سے چھٹی پر ہوں۔"

"شیخ صاحب کیا کسی اور کو بھی علم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" وہ بولا۔ "گھبراؤ نہیں۔ میں معاملے کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"بھئی تمہارے متعلق خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔"

"اخباروں میں؟"

"ہاں۔" وہ بولا "اور تم پر نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔"

ایلی سخت گھبرا گیا۔

"اچھا ہوا تم یہاں آ گئے ہو۔" شیخ نے کہا "یہ میرا اپنا محلہ ہے انشاء اللہ تمہیں کوئی زک نہ پہنچے گی۔ میرے سگے بھائی وکیل ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کر لو۔"

شیخ ریحان ڈیرہ کے مدرسے میں ایلی کے ہم کار تھے۔ وہ ایک خاموش مزاج شخص تھے اور مدرسے میں اکثر ایلی سے ملا کرتے تھے۔ چپ چاپ ایلی کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں کبھی ایک دوسرے سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

پہلے دو ایک دن تو ایلی شیخ پر شک کرتا رہا۔ شاید یہ شخص ہمدرد بن کر ہمارا بھید لے رہا ہے۔ شاید شریف کا جاسوس ہو شاید۔ لیکن دو دن کے بعد اس کے شکوک رفع ہو گئے اور شک ان کے لئے صحرا میں نخلستان بن گیا۔

شیخ کے بھائی نے ایلی کو مشورہ دیا کہ شہزاد کچہری میں جا کر حلفیہ بیان درج کروا دے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہے اور اس کی بچیاں جن کی وہ جائز ولی ہے اس کے ساتھ رہتی ہیں۔

کچہری کا نام سن کر ایلی کی روح فنا ہو گئی۔ شہزاد ہنس پڑی۔ "تو اس میں کیا مشکل ہے۔" وہ بولی۔ "اوکھلی میں سر دینے والے کیا دھمکیوں سے ڈرتے ہیں۔" اگلے روز ہی شہزاد نے شیخ کے گھر سے ایک برقعہ منگوا لیا اور وہ دونوں تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ وہ اپنا برقعہ نہیں پہننا چاہتی تھی تاکہ محلے والے اسے پہچان نہ لیں کچہری سے کچھ فاصلہ پر ایک پرانا مقبرہ تھا۔ شہزاد نے وہاں تانگہ روکا اور ایلی کو اتار دیا۔ بولی "جب تک میں نہ لوٹوں یہاں سے نہ ہلنا۔" اور خود کچہری کی طرف چل پڑی۔

مقبرے کے اندر ایک سپاہی نے اسے للکارا "اے" وہ بولا "ادھر آؤ۔"

"جی۔" ایلی پاس جا کر بولا۔

"بھگوڑے ہو تم۔"

"جی۔" ایلی نے گھبرا کر سچ کہہ دیا۔

"تم اس عورت کو بھگا کر لائے ہو نا جو ابھی ٹانگے سے تمہیں اتار کر گئی ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا

سپاہی نے قہقہہ مارا۔ بولا "تم جھوٹ بولتے ہو معلوم ہوتا ہے تم نے اسے اغوا نہیں کیا۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائی ہے۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "ہمیشہ عورت ہی اغوا کر کے لاتی ہے۔ لیکن مجرم مرد گردانا جاتا ہے اور سزا مرد کو ملتی ہے۔"

سپاہی نے پھر قہقہہ لگایا "سچ کہتے ہو میاں۔"

وہ سپاہی ایلی کا دوست بن گیا۔

"وہ اکیلی کچہری گئی ہے نا۔ بڑی جرأت ہے اس میں۔" سپاہی نے کہا۔

"ان سب میں بڑی جرات ہوتی ہے۔" وہ بولا۔

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

شہزاد نے کچہری میں حلفیہ بیان درج کرایا۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو آصفی محلے کے ایک جتھے نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ شہزاد یہ دیکھ کر پھر سے مجسٹریٹ کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کہنے لگی۔

"مجھے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ میری حفاظت کا انتظام کر دیجئے۔" مجسٹریٹ نے دو سپاہی ساتھ کر دیئے۔ مقبرے پر جا کر وہ تانگے سے اتر گئی۔

محلے والے اس کا پیچھا کر رہے تھے وہ مقبرے میں آ گئے۔ سپاہی نے باہر جا کر ان کا راستہ روک لیا۔ "کسے ڈھونڈ رہے ہو۔" وہ بولا۔

"یہاں ایک عورت اتری تھی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"وہ تو ادھر گئی ہے۔" سپاہی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" سپاہی بولا "یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔"

"ہم خود چلے جائیں گے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

"تو تو چلی جائے گی۔ لیکن یہ" سپاہی نے ایلی کی طرف اشارہ کیا۔ "جسے تو ساتھ لائی ہے۔"

"ایسوں کو ہی ساتھ لایا کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

ارم پورہ

سپاہی نے قہقہہ لگایا "بھئی واہ کیا جوڑی ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

مہینہ بھر وہ امرتسر میں رہے۔ ایلی باہر نکلتا تو اس کے منہ پر دیگچیوں کی سیاہ راکھ تھپی ہوتی ڑاس نے اپنے گرد ایک کمبل لپیٹا ہوتا۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے کئی بار اس نے محلے والوں ے گروہ دیکھے تھے اور ڈر کی وجہ سے اس کا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا تھا۔ چار ایک بار وہ ھری بھی گئے تھے لیکن حسب دستور ایلی کو شہزاد نے مقبرے میں چھپا دیا تھا۔

جب ایلی گھر آتا تو گویا نقشہ ہی بدل جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ پکنک پر آئے ں اور ان کی زندگی میں خطرے یا مشکل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

سارا دن وہ بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جو ہارتا اسے چور بناتے۔ اس کے لئے انوکھی سزائیں تجویز تے اور پھر قہقہے لگاتے۔ لڑکیاں ناچ ناچ کر چلتیں بات بات پر ہنستیں۔ مل کر گیت گنگناتیں۔ تالیاں بجاتے وہ سب قطعی طور پر اس خطرے سے بے نیاز تھے۔ جو ان کے سر پر منڈلا رہا دھر شریف کے ساتھیوں نے سارا امرتسر چھان مارا۔ لیکن انہیں ایلی اور شہزاد کے چھپنے کی کا علم نہ ہو سکا۔ شیخ نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی۔ ان کے بھائی نے انہیں قانونی رے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور پھر سے اس پر قنوطیت چھا گئی جو کی طبیعت کا بنیادی جزو تھی اور ایک روز وہ چپکے سے روپوش ہو گیا۔ اس پر محلے والے بگڑ ۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ جب خود شریف میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیوں اس کی ونیا بھر کی دشمنی مول لیں۔ اس لئے وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

محلے والوں نے ڈیرہ اخباروں میں جو جو خبریں ایلی کے متعلق چھپوائی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ خود ڈر گیا تھا۔ سکول کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس نے کوشش کر کے ایلی کا تبادلہ کرا تیجہ یہ ہوا کہ اس لمبی رخصت کے دوران ایلی ڈیرہ سے ارم پورہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبادلہ ایلی لئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔

ارم پورہ بنیادی طور پر لاہور کے قریب ایک قصبہ تھا۔ لیکن لاہور شہر کے پھیلاؤ کے وجہ ب وہ لاہور کی بستی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر وہ ڈیرہ ہی میں مقیم رہتے تو ایلی اپنے

مکان کو خفیہ نہ رکھ سکتا۔ لیکن لاہور میں اپنے مکان کی جائے وقوع کو صیغہ راز میں رکھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت کے بعد ایلی نوکری پر حاضر ہو گیا۔ اس نے ایسی جگہ مکان کرایہ پر لیا جو لاہور کی ایک اور بستی تھی اور ارم پورہ کی متضاد سمت میں واقع تھی۔

اگرچہ طوفان گزر چکا تھا پھر بھی لکیر ابھی تازہ تھی۔ ایلی ڈرتا تھا کہ نہ جانے کب طوفان پھر سے چلنے لگے۔ اس لئے وہ بے حد محتاط تھا۔ اس کی یہ احتیاط اوراک کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈر کی وجہ سے تھی۔ وہ بنیادی طور پر بے حد بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ سب مقدمات جو شریف نے ان کے خلاف دائر کر رکھے تھے۔ عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو چکے تھے۔ لیکن محکمے میں ایلی کی بے حد بدنامی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ افسر اعلیٰ معروف صاحب نے ایلی کے والد کو خط لکھ کر متنبہ کر دیا تھا کہ ان حالات کے تحت وہ ایلی کی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔

جب وہ پہلے روز ارم پورہ کے مدرسے میں حاضر ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ بولے "ہم نے آپ کا کیس ڈائرکٹر بہادر کو بھیج دیا ہے۔ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کریں ہم آپ کو چارج نہیں دے سکتے۔"

چار ایک روز کے بعد ہیڈ ماسٹر نے ایلی کو بتایا کہ مسٹر معروف نے اسے انٹرویو کے لئے بلایا ہے لہٰذا اسے بڑے دفتر میں جانا چاہیے۔

معروف اور راغب

مسٹر معروف سے ایلی کا وہ دوسرا انٹرویو تھا۔ چند ایک سال قبل جاور ا میں وہ انکوائری کرنے آئے تھے اور ایلی اور مسٹر معروف کی بات چیت ہوئی تھی۔ آج پھر وہ مسٹر معروف کے روبرو حاضر تھا۔

مسٹر معروف نے ایک ساعت کے لئے بڑی سنجیدگی سے اسے گھورا۔ نہ جانے کیوں لیکن ایلی مسٹر معروف کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا جیسے اس کے روبرو ایک خوش مذاق رنگیلی عورت بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں ذرہ بھر خوف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے خلاف اخباروں میں خبریں نکلی ہیں۔" معروف بولے۔

"جی مجھے نہیں علم۔"

"کیا آپ نے گزشتہ دنوں میں اخبار نہیں دیکھے۔"

"جی نہیں۔"

"کیوں۔"

"جی میں چھٹی پر تھا۔"

"آپ نے کس لئے چھٹی لی تھی؟"

"جی تفریح کے لئے۔"

"تو آپ نے کیسے تفریح کی؟"

"گھر بیٹھا رہا۔ منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کوئی کام نہیں کیا۔ تاش کھیلتا رہا۔"

"ہوں۔" وہ بولے "تاش کا کون سا کھیل کھیلتے رہے؟"

"جی چور سپاہی۔"

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پر اغوا کا الزام ہے"۔

"جی مجھے نہیں معلوم۔" وہ بولا۔

"ہم جو آپ کو بتا رہے ہیں۔" وہ غصے میں بولے۔

"کسی عدالت نے مجھے نہیں بتایا۔ بہر حال۔"

"تو آپ کو کوئی سمن نہیں ملا۔"

"جی نہیں۔"

"آپ کچہری میں حاضر نہیں ہوئے"۔

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو وہ خبریں کیوں چھپیں۔"

"جی مجھے معلوم نہیں۔"

"آپ کو علم ہونا چاہئے الیاس صاحب کہ اس خاتون کے شوہر نے مجھے سب باتیں لکھی ہیں۔"

"ممکن ہے۔" وہ بولا "مجھے اس کا علم نہیں۔"

"کیا آپ نے اس کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ وہ غصے میں بولے۔

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو پھر کوائف کیا ہیں؟ سچ سچ بتائیے ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔"

"جی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بیوی نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

معروف صاحب کی ہنسی نکل گئی۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔" وہ بولے۔

"جی نہیں۔" ایلی نے کہا۔ "میں ایک عام آدمی ہوں۔"

"لیکن آپ ابھی کہہ رہے تھے۔" معروف صاحب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ "کہ آپ چھٹیوں میں تاش کھیلتے رہے۔"

"سچ عرض کیا ہے میں نے"۔

"کس سے تاش کھیلتے رہے۔"

"جی ان سے جنہوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔"

"وہ کون کون ہیں۔"

"جی چھ بچے اور ان کی ماں۔"

"تو کیا یہ سچ ہے کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔"

"جی ہاں۔"

"آپ عجیب بے وقوف ہیں۔ اگر اغوا ہی کرنا تھا تو کسی لڑکی کو کرتے خواہ مخواہ آپ نے اتنے بڑے کنبے کا بوجھ اٹھا لیا۔"

"جی کوئی لڑکی مجھے اغواء کرنے کو تیار نہ تھی۔ سوائے اس چھ بچوں کی ماں کے۔"

"شٹ اپ۔" معروف نیم غصے نیم مذاق سے بولے۔ "جا کر چارج لیجئے اور یاد رکھئے۔ اگر پھر آپ کی رپورٹ آئی تو آپ کو سسپنڈ کر دوں گا۔"

معروف کے بعد ارم پورے کے ہیڈ ماسٹر راغب صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔ راغب صاحب ایک دبلے پتلے جلے کٹے آدمی تھے۔ ان کا چہرہ لمبا تھا مگر کتابی نہیں تھا۔ آنکھیں

ر کو دھنسی ہوئی تھیں ناک یوں ابھری ہوئی تھی جیسے سمندر سے مونگے کی چٹان جھانک رہی ہو۔ ایلی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ معروف سے برعکس قسم کی شخصیت تھے۔

"آصفی صاحب۔" وہ بولے "اگرچہ معروف صاحب نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سکول میں کام کریں۔"

"معروف صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولے۔

"معروف صاحب نے فرمایا ہے کہ راغب صاحب کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کر

"۔

"لیکن ــــ لیکن"۔ وہ رک گئے۔ "اچھا مجھے اس کا علم نہ تھا۔"

"معروف صاحب نے صاف کہہ دیا تھا۔" ایلی نے کہا "میں اجازت دینے والا کون ہوں کام ب صاحب نے لینا ہے۔"

"خوب خوب۔" وہ خوشی سے چلائے "تو ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ میں کام کریں گے۔"

"جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھئے نا ہم بدنام آدمی کو اپنے سکول میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم اپنا ڈسپلن خراب نہیں کریں

"۔

"جیسے آپ کی مرضی لیکن راغب صاحب بدنام آدمی ڈسپلن خراب نہیں کر سکتا۔"

"آپ کا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ شرارت وہ لوگ کرتے ہیں جن پر شبہ نہ کیا جا سکے۔ یا جن کا اعمال نامہ ہو اور ان پر حرف نہ آ سکے۔ بدنام آدمی تو اپنا جائز تحفظ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو کانچ کے کی طرح ہوتا ہے۔ ذرا ضرب لگی اور ٹوٹ گیا۔"

"کیا آپ مجھے عقل سکھانے آئے ہیں"۔

"جی نہیں۔" وہ بولا "مجھ میں تو خود عقل نہیں میں کیا عقل سکھاؤں گا کسی کو"۔

"کیا مطلب۔" وہ چلائے۔

"جی عقل ہوتی تو کیا چھ بچوں کی والدہ کو اغوا کر لاتا۔"

"تو کیا یہ سچ ہے؟" وہ بولے۔

"ہاں جی اور یہی میری بے وقوفی کی دلیل ہے"۔

راغب صاحب بوکھلا گئے۔

اگلے روز راغب صاحب نے معروف صاحب سے احکامات کی وضاحت کی درخواست کرتے ہوئے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ الیاس آصفی کے بیان کے مطابق انہیں اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا ارم پورہ کے سکول میں الیاس کام کرتے ہیں یا نہیں۔

معروف فوراً بھانپ گئے کہ وہ بات جو انہیں کہنی چاہیے تھی۔ ایلی نے از خود راغب سے کہہ دی ہے۔ اس بات پر وہ بے حد مسرور ہوئے اور بولے۔ "یہ ٹھیک ہے راغب لیکن ہمارا مشورہ ہے کہ آپ الیاس کو اپنے پاس رکھنے پر رضامندی دے دیں وہ ایک قابل شخص ہے۔ آپ کو کام سے تعلق ہے نا عورتوں کے اغوا سے تو نہیں"۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی نے ارم پورہ میں کام شروع کر دیا۔

جھوٹ سچ

ایلی نے زندگی میں نئی بات سیکھی تھی۔ وہ سچ کے ذریعے جھوٹ بولتا تھا۔ اس نے تجربے کے زور پر اس حقیقت کو پالیا تھا کہ سچی بات کہہ دی جائے تو سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس کے دل میں نفرت کی بجائے دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھار احترام بھی۔ اس کے علاوہ کہنے والے کے دل پر بوجھ نہیں رہتا۔ اور بات کہہ دی جائے تو وہ پھوڑا نہیں بنتی۔ اس میں پیپ نہیں پڑتی۔ اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ سچی بات کو اعلانیہ تسلیم کر لیا جائے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ مذاق کر رہا ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ شاید ایلی نے یہ انوکھا طریقہ شہزاد سے سیکھا ہو۔

بہر صورت جب اساتذہ اس سے ملے تو اخباری خبروں کی بات چھڑ گئی۔ ایک صاحب اخبار اٹھا کر بولے۔ "اجی ان اخبار والوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہتا ہے/اناپ شناپ لکھ دیتے ہیں۔ سچ تھوڑے ہی لکھتے ہیں۔ "کیوں الیاس صاحب۔"

"اپنا تجربہ تو مختلف ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" ایک اور صاحب بولے۔

"مطلب یہ ہے کہ میرے متعلق آج تک صرف ایک خبر چھاپی ہے انہوں نے اور وہ سولہ

نے سچی ہے۔"

"ارے۔" وہ چلائے "کیا واقعی؟"

"تو کیا جو خبریں آپ کے متعلق چھپی تھیں وہ درست ہیں۔" ایک صاحب نے پوچھا۔

"بالکل۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کہیں دو ایک مسکرا رہے تھے۔ دو ایک تحسین بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تو آپ نے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر لیا۔" ایک نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

"ہائیں۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے ——"

"خبر تو سچی ہے مگر انداز بیان میں کچھ غلطی رہ گئی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کیا؟"

"یہ کہ چھ بچوں کی ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہی ہی ہی ہی ——" ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی بات پر لوگ قہقہہ مار کر ہنس لیں تو بات اپنی سنگینی کھو دیتی ہے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک لیکچر دینا شروع کر دیا کہنے لگا "بھائیو مردوں کی اور عورتوں کی قوم ہمیشہ ظلم کرتی آئی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کو اغوا کرتی رہیں اور نام بدنام ہوتا رہا مرد کو مجرم گردانا جاتا رہا۔ مرد جیل جاتا رہا مرد' قید کاٹتا رہا مرد۔ معلوم ہوتا ہے۔ تعزیرات ہند کی اغواء کی دفعہ لکھتے وقت مصنف کی بیوی بھی پاس بیٹھی تھی۔ اس ظالم نے ساری کی ساری غلط لکھوا دی۔"

مرد اور عورت کی بات کرتے وقت ایلی یوں محسوس کیا کرتا تھا۔ جیسے بطخ خشکی سے اتر کر پانی میں جا پہنچتی ہو۔

پہلے روز ہی جملہ اساتذہ کو ایلی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور وہ اس کے دوست بن گئے۔ جب بھی تفریح کی گھنٹی بجتی اور ایلی کو لے کر کسی مقام پر جا بیٹھتے اور اسے چھیڑ کر اس کی باتیں سنتے۔ لڑکے دور دور سے اسے دیکھتے اور مسکراتے اور ہیڈ ماسٹر اسے معروف کا آدمی سمجھ کر اس اخلاق سے پیش آتے۔

آٹھ بچے

سکول میں ہیرو بن کر گھومنے کے بعد وہ سائیکل اٹھا کر چوروں کی طرح گھر کی طرف چل پڑتا۔ جان بوجھ کر لمبے راستے سے گھر جاتا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ رہتا کہاں ہے کوئی اس کے گھر کا پتہ پوچھتا تو صاف کہہ دیتا "بھائی گھر کا پتہ نہ پوچھو اور کوئی خدمت بتاؤ جو اغوا کرتے ہیں وہ گھر کا پتہ صیغہ راز میں رکھتے ہیں۔"

گھر پہنچتا تو وہ گھر کے ہنگامے میں کھو جاتا۔

گھر میں وہ آٹھ بچے تھے۔ کبھی کسی نے محسوس نہیں کیا تھا کہ گھر میں کوئی بڑا بھی ہے۔ بڑا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ماں کیا بڑی بن سکتی ہے۔ جو چھ بچے ساتھ لے کر گھر سے بھاگ آئی ہو۔ وہ مرد کیا بڑا بن سکتا ہے۔ جو چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر لایا ہو۔ ان حالات میں جو تھوڑی بہت بزرگی اور بڑائی شنزاد اور ایلی میں تھی۔ وہ بھی خارج ہو چکی تھی۔ کس منہ سے وہ عقل و اوراک اخلاق یا سنجیدگی کا ڈھونگ رچاتے اور پھر ان بچیوں کے روبرو جو جوان تھیں۔ صبیحہ تیرہ سال کی تھی۔ نفیسہ بارہ کی اور ریحانہ نو سال کی البتہ ایک بات ضرور تھی۔ شنزاد اور ایلی نے کبھی بڑائی ہاتھ سے جانے پر افسوس محسوس نہ کیا تھا۔

اگر شنزاد کبھی کبھار لڑکیوں کے شور سے تنگ آجاتی اور چلا کر کہتی "اے لڑکیو سنتی ہو۔"

"امی۔" نفیسہ ہنستی "ذرا زور سے بولو تو کچھ سنائی بھی دے۔"

"کانوں میں تیل ڈالا ہوا ہے کیا؟"

"تیل تو نہیں۔" صبیحہ کہتی۔ "کانوں پر صرف بال ڈالے ہوئے ہیں۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

"دل تو اچھا ہے نا امی۔" وہ قہقہہ مار کر ہنستیں۔

پھر وہ سب جھرمٹ ڈال امی کے گرد آکھڑی ہوتیں اور ناچتیں گاتیں ہنستیں۔ ایلی کہتا۔

"شور نہ مچاؤ۔ اگر کسی کو ہمارے گھر کا پتہ چل گیا تو۔"

"تو کیا۔" وہ جواب دیتیں۔ "یہی نا کہ وہ چٹھی لکھ دے گا ہمیں اور چٹھی رساں چٹھی لے آئے گا اور ہم پڑھ لیں گے"۔

"اور اگر کسی نے آکر تمہیں چوٹی سے پکڑ لیا تو۔" ایلی چلاتا۔

تو چوٹی کاٹ ڈالیں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔

ان کی زندگی میں ایک مشکل تھی۔ جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایلی کی تنخواہ صرف سنتالیس روپے تھی۔ ایلی اس زمانے میں جوان ہوا تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ کے اثرات رونما ہوئے تھے اور دنیا بھر میں مالی بحران کا دور دورہ تھا۔ بنیادی طور پر ایک گریجویٹ کا گریڈ اسی روپے سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن مالی بحران کی وجہ سے گورنمنٹ کے ملازمین کی تنخواہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی اور اسی (۸۰) کی جگہ اب پینسٹھ روپے کا گریڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔ لیکن پینسٹھ روپے کے گریڈ پر ملازم رکھا جائے اور پینسٹھ روپے ایم اے بی ٹی دیئے جائیں۔ اس لئے ایلی کی تنخواہ پینتالیس روپے سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ سنتالیس روپے پا رہا تھا۔ سنتالیس روپے اتنے بڑے کنبے کے لئے بے حد ناکافی تھے۔ خصوصاً" ایسا کنبہ جو مالی مشکلات کے تصور سے ہی بیگانہ تھا۔

ان کے پاس جو اثاثہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شدت سے مالی مشکلات کو محسوس کرنے لگے تھے۔ اس امر کو صرف ایلی ہی محسوس کرتا تھا۔ لڑکیاں اس بات سے بے نیاز واقع ہوئی تھیں۔ روایتی ملکہ کی طرح وہ سوچتی تھیں کہ غریبوں کو اگر کھانے کو روٹی نہیں ملتی تو وہ پیسٹری کیوں نہیں کھاتے۔

بہرحال یہ امر مسلمہ تھا کہ اگر مالی مشکلات کا احساس ان کے گھر میں صدر دروازہ سے داخل نہ ہوا تھا۔ تو عقبی دروازے سے ضرور داخل ہو رہا تھا۔ لاشعوری طور پر جانے بغیر ان کی زندگی میں انجانی تلخی بڑھنے لگی تھی۔

...ل ہان"

لاہور میں صرف ایک آدمی تھا۔ جو ان کے مکان سے واقف تھا۔ وہ تھا محمود کبھی کبھار محمود شنزاد اور ایلی کو میم کی باتیں سناتا اور کالج کے قصے بیان کرتا۔ محمود سترھواں لے پالک ہونے کے باوجود گھر میں یوں رہتا تھا۔ جیسے الف لیلیٰ میں شنزادیوں کے جھرمٹ میں سلطان رہتے۔ ان کے تالی بجانے پر حبشی جلاد ہاتھ میں تلوار اٹھائے حاضر ہو جاتا۔ لیکن کبھی کبھار ایلی کو شک پڑتا کہ محمود میں بھی ایک ایلی چھپا ہوا ہے۔ جو مامتا بھری گود میں لیٹنے کے لئے بلکتا ہے۔ جسے یہ چاہیے کوئی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس کی ناک پونچھے منہ دھوئے اور پھر پیار سے جھڑک کر

سکول بھیج دے ایلی جذباتی طور پر ڈرا ہوا بچہ تھا اور ذہنی طور پر ایک نڈر مفکر۔

ایک روز وہ سب بیٹھے تھے تو محمود آ گیا۔ اس کے ساتھ ساری میں لپٹی ہوئی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ جسے اس نے اندر بھجوا دیا۔

"ارے یہ کون ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"یہ بھی ہے۔" محمود بولا۔

"کوئی نئی پھنسی ہے؟"

پھنستی ہی رہتی ہیں۔ اب ایک کام کرو۔" محمود بولا۔

"کیا؟"

"ایک مولوی بلوا دو۔"

"بھئی نکاح پڑھوانا ہے۔"

"اور وہ میم کیا ہوئی؟"

ایلی ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر ایک مولوی لے آیا۔

مولوی صاحب پہلے تو محمود کو کلمے پڑھاتے رہے۔ پھر جب ایجاب و قبول کا وقت آیا۔ تو مولوی صاحب نے کہا۔ "کیا آپ کو محمود ولد احمد سکنہ رام پور کی زوجیت میں آنا قبول ہے؟"

وہ خاتون بولی "ہام کو منجور ہے۔"

اس پر لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

ایلی نے حیرت سے خاتون کی طرف دیکھا۔ "ارے آپ تو میم ہیں۔" وہ بولا۔

میم نے کہا "ہام "ڈول ہان" ہے میم نا ہیں۔"

مولوی کی جانے کے بعد ایلی کے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ لڑکیاں میم کے سہاگ گانے لگیں۔ اسے چھیڑنے لگیں۔ میم ہنسے جا رہی تھی۔ محمود مسکرا رہا تھا۔ شہزاد کی آنکھوں میں مسرت کی پھوہار پڑ رہی تھی۔

محمود اور میم کے نکاح کے چند روز بعد محمود بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ "ایلی۔" وہ بولا "وہ نہیں آئی!"

"کون نہیں آئی۔" ایلی نے پوچھا۔

"آج ویک اینڈ ہے۔" وہ بولا "ہر ویک اینڈ پر وہ آیا کرتی ہے۔ بلاناغہ لیکن اب کی بار نہیں

ایلی نے قہقہہ لگایا "تم تو پاگل ہو۔" وہ بولا "خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو جیسے وہ بچی ہو۔"

"تم نہیں جانتے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "واقعی وہ بچی ہے۔"

"بچی ہے۔" ایلی ہنسا۔

"ہاں۔" محمود نے کہا یہ سب بچیاں ہوتی ہیں۔ ان کی عمر نہ دیکھو شکل نہ دیکھو صورت نہ
یہ سب بچیاں ہوتی ہیں اور جبھی تک ٹھیک رہتی ہیں جب تک ان پر بچی حاوی رہے۔"

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔" ایلی بولا "گھبرانے کی بات تو ہے۔" محمود نے کہا "وہ آئی جو

"مجھے سمجھ میں نہیں آئی بات۔"

گئیں

"مجھے بھی نہیں آئی نا۔" محمود نے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔"

روز محمود میم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ وہ پھر وہ نئے شہر چلا گیا۔ وہاں جا کر اپنا ظاہر کئے بغیر اس نے حالات کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ وہاں موجود نہیں۔ اس پر وہ گھبرا گیا۔

مزید پوچھ گچھ پر اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ علم نہ ہو سکا۔

لاہور واپس آ کر وہ سیدھا ایلی کے پاس آیا۔ "غضب ہو گیا۔" وہ بولا۔ "وہ نئے شہر میں بھی ہے۔ کہتے ہیں کوئی گورا صاحب اسے آ کر لے گیا ہے۔"

"کیا زبردستی لے گیا ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھئی۔" وہ بولا "اسے کوئی زبردستی لے جائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر رومینس نہیں ہو سکتا۔ یہ سبھی ایسی ہوتی ہیں۔ پہلے روتی ہیں۔ چیختی ہیں چلاتی ہیں پھر غم سے ہو کر لے جانے والے سے چمٹ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"کس کی بات کر رہے ہو۔" ایلی نے پوچھا۔

محمود خاموش رہا۔ "کیا میموں کی بات کر رہے ہو۔" ایلی نے پھر پوچھا۔

"دونوں" وہ بولا "عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ چاہے وہ میم ہو دیسی ہو یا حبشن ہو۔"

کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

محمود کی بات صحیح نکلی چند ہی دنوں کے بعد اسے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا۔

"مجھے اچھی سے معلوم ہے کہ تم غنڈوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہو اور تم نے ایک برٹش نیشنل خاتون کو عرصہ دراز سے اغوا کر رکھا ہی اور تم نے اسے زبردستی مسلمان کرنے کی قبیح کوشش کی ہے اور دھوکے سے اس کے ساتھ عقد کیا ہے۔ حالانکہ تعزیرات ہند کے تحت کوئی ہندوستانی کسی برٹش نیشنل خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک خاص اجازت نامہ حاصل نہ کرے لہٰذا تم اور تمہارے دوست دھوکہ دہی اور اغواء کے مرتکب ہوئے ہو اور میں تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی سے گریز نہیں کروں گا اور اگر تم نے اس خاتون سے دوبارہ ملنے کی سعی کی تو اپنے اختیارات کو کام میں لا کر میں تمہیں کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

خط کے نیچے لمبے چوڑے دستخط کئے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا کمشنر بیجاپور

"ارے۔" ایلی چلایا "یہ تو کوئی کمشنر ہے"۔

"یہی تو مصیبت ہے۔" محمود بولا "وہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی مدت سے آرزو تھی کہ کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے جائے پھر جب تم ان سب کو لے آئے اور اس نے یہ قصہ سنا تو گویا جلتی پر تیل پڑ گیا وہ بھی بھڑک اٹھی۔ اس کی یہ خواہش اور بھی مچلی اور اب' اب یہ ڈارٹگنیں نہ جانے اسے کہاں سے مل گیا ہے۔"

محمود سخت گھبرایا ہوا تھا۔

محمود کے کہنے پر ایلی بیجاپور گیا —— تاکہ وہاں سے کوائف حاصل کرے۔ پہلے تو وہ شہر کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کمشنر کی کوٹھی کا پتہ لگایا اور وہاں پہنچ کر باہر انتظار کرتا رہا کہ کب کمشنر دفتر جائے تو کوٹھی کے کسی نوکر سے ملے آخر کمشنر کی کار کوٹھی سے باہر نکلی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ کوٹھی کے آوٹ ہاؤس کی طرف گیا اور چوکیدار سے ملا۔ چوکیدار ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ اسے دیکھ کر ایلی کی امید بندھ گئی۔ اس نے چوکیدار کو پانچ روپے تھما دیئے۔ "بابا یہ صاحب کس قسم کا آدمی ہے؟"

"توبہ ہے" بابا نے جواب دیا۔ "یہ صاحب تو سمجھ کر لو آفت ہے آفت۔"

"کیا سخت مزاج ہے۔"

"اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔ سارا دن بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ سارا دن۔"

"کیا عمر ہو گی؟"

"بوڑھا ہے۔ لیکن سخت زانی ہے اور شرابی بھی۔"

"ایک بات بتاؤں بابا۔" ایلی نے کہا اور پھر قدرے توقف کے بعد اس نے چوکیدار سے

"تمہارا صاحب ایک مسلمان عورت کو بھگا لایا ہے۔ نئے شہر سے۔"

"نہ بابو۔" وہ بولا "یہاں اپنی دیسی عورت کبھی نہیں آئی یہاں تو میمیں آتی ہیں۔ جوان ...می ادھیڑ سبھی آتی ہیں"۔

"لیکن بابا۔" ایلی نے کہا "وہ ہے تو میم مگر مسلمان میم ہے۔"

"بابا قہقہہ مار کر ہنسا۔"

"سچ کہتا ہوں بابا۔" ایلی نے کہا۔

"نہ بھئی۔" وہ بولا "میم مسلمان نہیں ہوتی۔ ان میموں کا اسلام سے کیا واسطہ۔"

ایلی نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں میم کا مسلمان ہونا ممکن ہی نہ ...ا۔ اس لئے ایلی کی تجویز ناکام ہو گئی۔

"اچھا۔" وہ بولا "بابا یک کام تو کرو مجھے اس میم کے سامنے لے چلو۔ جو اس وقت صاحب ...ے گھر میں ہے۔"

"اونہوں۔" بابا نے جواب دیا۔ "گھر میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔"

"تو چلو باہر سے ہی جھانکوں گا۔"

بابا کو یہ بات بھی منظور نہ تھی۔ بولا "نہ بابو وہ دیکھ لے یا اسے پتہ چل جائے تو کھا جائے ...ا۔

"ایسا سخت ہے ہو۔"

بہرحال ایلی نے کوٹھی کے باہر دو ایک چکر لگائے کوٹھی چاروں طرف سے بند تھی۔ اس ...نے کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر دبیز پردے لٹک رہے تھے۔

ابھی وہ وہیں کھڑا تھا کہ خانساماں کا لڑکا آ گیا۔

وہ ایلی کو گھورنے لگا۔

ایلی نے اس سے پوچھا "کوٹھی میں کوئی ہے کیا؟"

"نہیں بابو۔" وہ بولا "صاحب اکیلے ہی رہتے ہیں۔"

"کوئی مہمان عورت تو نہیں آئی ہوئی؟"

"نہیں۔" وہ بولا۔

"جھوٹ نہ بولو۔" ایلی نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"ہاں۔" لڑکے نے اقبال کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ "پر وہ بند ہے۔"

"بند ہے۔" ایلی بولا۔

"ہاں۔" لڑکے نے ڈرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا "صاحب تالہ لگا کر جاتا ہے۔"

ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ موٹر کے آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب بھاگ کر آؤٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے۔ تاکہ صاحب انہیں دیکھ نہ لے۔ ایلی نے دور سے چھپ کر دیکھا۔ ڈار ٹگنیں ادھیڑ عمر ختم کر چکا تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ چہرے پر شراب نوشی کے واضح آثار تھے اور اس کے ساتھ ہی جابرانہ رجحانات مترشح ہو رہے تھے۔ اس کی شکل و صورت ان فلمی غنڈوں کی سی تھی۔ جو ہیروئین کو اٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے قلعہ کے زیرین کمرے میں مقفل کر دیتے ہیں۔

محمود نے جب یہ سنا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ "بس سمجھ لو قصہ ختم ہو گیا اسے تو دیر سے یہ خواہش تھی کہ کوئی ظالم قسم کا جابر آدمی اسے پکڑ کر لے جائے اور کسی قلعہ میں قید کر دے۔"

محمود کی بات سچ ثابت ہوئی۔ میم نے اسے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ممکن ہے اسے کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا ہو۔ وہ لمبی رخصت پر رہی اس لئے نئے شہر واپس نہ آئی۔ بلکہ کا جائزہ لینے میں نے اپنی قلم سے درخواست بھیج دی جس میں تحریر تھا کہ مسز فلپ رہا کہ کب کمشنر دفتر جائے جو جو رقوم اسے واجب الادا ہیں ان کی تفصیل بھیج دی جائے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ڈن پا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ دونوں ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ اسے رگئے اور سترہواں لے پالک لاہور میں بے بس بیٹھا حالات کا دیئے۔ "بابا یہ صاحب کس قسم کا

"توبہ ہے" بابا نے جواب دیا

"کیا سخت مزاج ہے۔"

"اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔ ایا ویسے ہی شریف ایک مظلوم شخص تھا۔ اس نے فطرتاً"

پلونا" اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار اپنی مظلومیت پر استوار کر رکھا تھا۔ پہلے وہ انور کے عشق میں رشار تھا۔ اس حد تک سرشار تھا کہ شہزاد سی رنگیلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی مظلومیت کی رت میں کھویا رہا۔ یہ کہنا کہ اسے شہزاد سے محبت نہ تھی غلط ہو گا۔ اسے واقعی شہزاد سے محبت ی اسے شہزاد پر ناز تھا۔ وہ اس کی رنگینی سے کما حقہ' واقف تھا۔ وہ شہزاد کے لئے سبھی کچھ رنے کو تیار تھا۔ لیکن مظلومیت کے احساس کو رد نہ کر سکتا تھا یہ احساس اس کی گھٹی میں پڑا ا تھا۔ سال ہا سال کے عشق نے اسے اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ اب وہ تفریحاً" اپنی مظلومیت اور الم عشق کا پرچار کرتا تھا۔ اسے خیال نہ آیا تھا کہ ایک رنگین بیوی کی موجودگی میں کسی اور رت کے عشق میں آہیں بھرنا اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔

شریف کو یقین تھا کہ خود شہزاد اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ چونکہ اسے تھیلی کے بڈک کی بات نہ بھولی تھی۔

بہرصورت انور کے عشق کی ناکامی تو اس کے لئے ایک رنگین غم تھا۔ چونکہ ازلی طور پر ریف ایک سچا اور خالص عاشق نہ تھا۔ بلکہ ایک سچے عاشق کی طرح ہجر پسند واقع ہوا تھا۔ انور ے محروم ہو جانے پر اسے صدمہ تو ضرور ہوا —— مگر وہ صدمہ ایسے ہی تھا جیسے بلغ کے لئے ل کا طوفان ہوتا ہے۔

شہزاد اور بچوں کا اپنی مرضی سے شریف کے گھر سے نکل آنا شریف کے لئے ایک شدید مدمہ تھا۔ ایک ایسا صدمہ جس میں رنگینی کا عنصر نہ تھا۔ الٹا اس میں خفت اور رسوائی تھی۔ کی رسوائی جو عشق کی رسوائی سے قطعی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پر ہسٹیریا کا دورہ گیا تھا۔ اور اس دورے کے تحت وہ اپنے آپ سے باہر نکل آیا تھا۔ اور محلے میں آ کر اس نے حسب معمول آگ لگا دی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہسٹیریا کی شدت مدھم پڑ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس رویے ے تو رسوائی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ اس کی بنیادی انا نے اسے للکارا اور وہ چپ چاپ علی پور ے روانہ ہو گیا اور اپنی نوکری پر حاضر ہو گیا۔

اس صدمہ کی شدت کے ختم ہونے پر شریف نے محسوس کیا کہ وہ میٹھا میٹھا درد جو باقی ہ گیا تھا۔ اس کے لئے باعث تسکین ہے۔ ایک غم خور کو گویا ہمیشہ کے لئے غم کی ایک دولت گراں مایہ مل گئی تھی۔

اس دولت کو پا کر وہ اپنے پرانے کوئے میں گھس گیا اور اس نے اپنی طبعی قنوطیت کا لبادہ اوڑھ لیا۔

غم خور کے لئے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے ساتھی کی ہوتی ہے جس سے اظہار غم کیا جا سکے اور اپنی محرومیت اور زمانے کے مظالم کا رونا رویا جا سکے اس لئے شریف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پرانی زندگی کو یکسر بھول جائے گا اور ایک نیا ورق الٹے گا۔ یہ نیا ورق ایک نئی شادی اور نئی بیوی تھی۔ لیکن ایسی بات اپنے منہ سے کہہ دینا یا شعوری طور پر اس پر سوچنا ایک غم خور کے لئے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر لئے کہ اس کی ہمشیرہ نے یہی تجویز بھائی کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ حیرت سے بہن کا منہ تکنے لگا "یہ تم کہہ رہی ہو حمیدی۔" اس نے ملامت سے بہن کی طرف دیکھا اور مجبور ہو کر بہن کی بات مان لی شادی کے روز وہ بہت رویا جیسے اسے اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمیدی نے نیاز مرحومہ کی بڑی بیٹی رشیدہ بانو سے شریف کا بیاہ کر دیا۔ رشیدہ کے لواحقین کو یہ ڈر تھا کہ کہیں شریف کی بیوی شہزاد اپنے چھ بالکوں کو لے کر پھر سے شریف کے گھر نہ آدھمکے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شہزاد کو طلاق دے دو تو مناسب ہے۔ شریف اعلانیہ شہزاد کو طلاق دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد قانونی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ اس لئے اس نے چوری چوری طلاق نامے پر دستخط کر دیئے اور اس بات کو مخفی رکھا۔

شریف کے گھر ایک نئی بیوی آ گئی۔ جس کے سامنے وہ صبح و شام اپنی مظلومیت کا قصہ بیان کر سکتا تھا۔ آہیں بھر سکتا تھا۔ چھت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ سکتا تھا گویا مینڈک کو پھر کیچڑ بھرا کنارہ مل گیا اور وہ پھر سے اپنے آشیاں میں آ بیٹھا۔

محض اتفاق سے اس خفیہ طلاق کی خبر ایلی اور شہزاد تک پہنچ گئی۔ اس روز وہ یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ از سر نو عشق میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ اگرچہ جہاں تک ظاہر کا تعلق تھا۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ یہ قانونی نقطہ ایک بے معنی بات ہے۔ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھے اور ساتھ ہی اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب وہ دونوں ایک بوڑھے مولوی کے سامنے بیٹھے تو ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ____ شہزاد پھر سے مونگیا گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ پھر جب وہ گھر واپس پہنچے تو لڑکیوں نے ان کے

گرد جھرمٹ لگا لیا۔ نفیسہ ناچنے لگی۔ صبیحہ گا رہی تھی۔ وہ سب مل کر انہیں چھیڑ رہے تھے۔ تنگ کر رہے تھے۔ ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اب وہ قطعی طور پر آزاد تھے۔ اب انہیں چھپ کر رہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ سکول میں لوگ بھول چکے تھے کہ ایلی کے متعلق اخبارات میں خبریں چھپی تھیں۔ مسٹر معروف کو یہ امر یاد نہ رہا تھا کہ اس کے خلاف خطوط موصول ہوتے رہے تھے۔ محلے والوں کے دلوں میں ان کے لئے نفرت نہ رہی تھی ایک دو شریف کے رشتہ دار تھے جو ایلی کا نام سن کر تیوری چڑھاتے یا نفرت سے منہ پھیر لیتے باقی لوگوں کو ان کے ساتھ کوئی عناد نہ رہا تھا۔

دو ابن الوقت

پھر ایک روز ان کے ہاں علی احمد آ گئے۔ شہزاد کے آنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ علی احمد ان کے ہاں آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔ کیوں بھئی شہزاد کوئی حقہ وقہ بھرو کوئی چائے وائے پلاؤ۔ مہمان آئے ہیں۔ ایلی اور شہزاد علی احمد کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ "میں نے کہا۔" وہ بولے۔ "جب تو ہم سے آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی۔ اب بولو"۔ شہزاد ہنسنے لگی۔ "اب ہنستی ہے۔ جب دیکھ کر تیوری چڑھاتی تھی۔"

"جب کی بات جب کے ساتھ۔" وہ بولی۔ "اب کی اب کے ساتھ۔"

"تو تم ابن الوقت ہو۔" علی احمد نے قہقہہ لگایا "کہ جب اور اب کا خیال رکھتی ہو۔"

"آپ بھی تو ہیں ابن الوقت۔" وہ چلانے لگی۔

"وہ کس طرح۔" علی احمد نے پوچھا۔

"جب آپ کی نگاہ اور ہوتی تھی اب اور ہے۔"

"ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "تو تم نگاہ کو پہچانتی ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔ لیکن ہمارے کمال کی بھی داد دو نا بھئی موقعہ اور محل سمجھتے ہیں کیا کہتی ہے۔"

پھر وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "بائی بائی۔" وہ چلانے لگے۔ "یہ تو سب جوان ہو گئی ہیں۔ عورت نے دنیا میں دھاندلی مچا رکھی ہے۔"

"وہ کیسے؟" شہزاد بولی۔

"آج دیکھو تو بچی ہوتی ہے کل دیکھو تو جوان اور پرسوں دیکھو تو ماں بن کر بیٹھی ہوتی ہے۔ عورت ذات تو ہاتھ پر سرسوں ہے ادھر رکھی ادھر اگی۔ کیا کہتا ہے۔ اب تو بھائی اپنا آپ بھول جاؤ اور ان کا فکر کرو کیوں شہزاد لیکن شہزاد کہاں اپنا آپ بھولتی ہے۔ اب بھی آئینہ کے سامنے کھڑی ہو جاؤ تو ۔۔۔۔۔۔ کیوں۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"میں نے کہا۔" شہزاد بولی۔ "اب تو آپ پنشن پا چکے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بولے۔

"اور محلے ہی میں رہتے ہیں۔"

"لو اور کہاں رہنا ہے ہم نے۔"

"تو محلے میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ بڑے پریشان ہوئے ہوں گے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسے "ہاں۔" وہ بولے۔ "بڑا فساد مچا تھا محلے میں۔ آگ لگ گئی تھی۔ لیکن شور زیادہ تھا اور فساد کم، ہمیں بڑی بڑی دھمکیاں دیں۔ میدان میں کھڑے ہو ہو کر ہمیں للکارا۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ "ہم نے بھی ایسی چال چلی کہ سب کو الو بنا دیا۔ ہی ہی ہی ہی۔"

"وہ کیسے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"جب وہ ہمارے پاس آئے محلے کے معزز لوگ۔ کہنے لگے کہ بتائیے اس معاملے میں آپ ایلی کا ساتھ دیں گے یا محلے والوں کا' تو میں نے کہا۔

"بھئی محلے والے تو شریف کا ساتھ دے رہے ہیں نا؟ ہاں ہاں وہ بولے چونکہ شریف شرافت اور سچائی پر ہے' بالکل درست ہم مانتے ہیں کہ شریف بے حد شریف ہے اور ایلی نے اس سے زیادتی کی ہے بلکہ ظلم کیا ہے' اس پر وہ بولے تو پھر آپ شریف کا ساتھ دیں گے۔ بالکل' میں نے کہا۔ دل و جان سے۔ اس حد تک شریف کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں کہ کہو تو ایلی کو عاق کر دوں اور اس کی والدہ کو طلاق دے دوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔ "کیا ہے؟" وہ پوچھنے لگے۔

" شرط یہ ہے کہ شریف سب کے روبرو قسم کھا کر کہے کہ میں پورے عزم اور استحکام سے اس معاملے کی پیروی کروں گا۔" میں نے کہا۔ "دیکھو نا شریف ایک سادھو قسم کا آدمی ہے اسے دنیا سے لگاؤ نہیں کسی سے دشمنی اس کے دل میں نہیں۔ اس کا کیا ہے کل اس جھگڑے کو چھوڑ

ھاڑ کر چلا جائے اور اعلان کر دے کہ میں نے سب کو معاف کیا تو پھر ہمارا کیا ہو گا۔ دیکھو نا ہزرگو' میں نے کہا۔ "ہم دنیا دار لوگ ہیں ایسا نہ ہو تا کہ ہم شریف کا ساتھ دیں لیکن شریف ہمارا ساتھ نہ دے اور ہم اپنے عزیزوں سے بھی محروم ہو جائیں۔" علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔

"نتیجہ یہ ہوا۔" علی احمد بولے۔ "کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے یہی اعتراض پکڑ یا اور پھر ہوا وہی ایک روز شریف چپکے سے محلہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ہی ہی ہی ہی۔ اس روز ہم نے محلے والوں سے کہا دیکھا ہم نے کہا تھا۔ ہمیں اسی بات کا ڈر تھا۔ پھر تو وہ سب شریف کے خلاف ہو گئے۔" علی احمد پھر ہنسنے لگے۔

علی احمد کے آنے کے بعد گویا عزیزوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہاجرہ کئی مرتبہ ایلی اور شہزاد سے ملنے آئیں۔ فرحت نے بھی دوبار ان سے ملاقات کی۔ پھر محلے کے لوگ بلا تکلف آنے جانے لگے۔

طوفان

ایک روز جب ایلی ارم پورہ میں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ڑکیاں چپ چاپ بیٹھی ہیں اور گھر پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔

"شہزاد کہاں ہے۔" اس نے پوچھا۔ "امی کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ وہ بیمار ہو گئی تھیں۔" نفیسہ بولی۔

"کون لے گئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"پڑوسیوں نے انہیں ہسپتال پہنچا دیا ہے۔"

ایلی ہسپتال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ نازک ہے اور شہزاد کی زندگی خطرے میں ہے کے پیٹ کا بچہ مر چکا ہے اور مردہ بچے کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر چکا ہے۔

وہ رات خوفناک رات تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ بارش اور ہوا کا طوفان چل رہا تھا۔ ہٹل کے چوکیدار کے پاس ایلی کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ نرس کی اطلاع کے مطابق اندر شہزاد پریشن ٹیبل پر پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر سوچ رہے تھے کہ آیا وہ آپریشن کی تکلیف برداشت کر سکے کی یا نہیں۔

ایلی انگ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں بیرونی طوفان سے زیادہ شدید طوفان چل رہا

تھا۔ کیا یہی اس قصے کا انجام تھا۔ سالہا سال کی تگ و دو کے بعد جب کہ وہ جیون ساتھی بن چکے تھے کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ پھر جدا ہو جائیں۔ اگر شہزاد کو کچھ ہو گیا تو بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ سوچ رہا تھا۔

بیتے ہوئے لمحات اس کے سامنے پردہ فلم کی طرح آ رہے تھے۔ جب وہ شہزاد کو پہلی دفعہ بیاہ کر لائے تھے اور ملحقہ ڈبے میں وہ موتیا گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ حنا مالیدہ ہاتھ گٹھڑی سے نکلے تھے۔ یہ ہے ایلی۔ کسی نے کہا تھا اور دو ناگ اس کے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

پھر جب وہ کہانی سنا رہی تھی اور ایلی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے انگوٹھے پر ایک رنگین بوجھ سا پڑ گیا تھا اور اس کا سر بھن سے اڑ گیا تھا جیسے کسی نے ہوائی کو آگ دی ہو اور ان جانے میں اس نے وہ حنا مالیدہ ہاتھ تھام لئے تھے اور نہ جانے جذبے کی شدت میں کیا کہدیا تھا۔ ”تم ایلی تم——“ شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

پھر بند بیٹھک میں اپنے مردانہ پن کی دھاک جمانے کے لئے وہ سکندر کی طرح حملہ آور تھا اور پھر پورس کی طرح منہ میں گھاس لئے اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

پھر وہ بے نیاز درزن اس کے روبرو بیٹھی تھی۔ جو قریب ہو کر اس سے دور ہو جاتی تھی اور دور ہوتی تو گویا اس کی گود میں آ بیٹھتی۔ وہ اجنبی عورت کی طرح اس کے روبرو کھڑی تھی۔ وہ صفدر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں اور ایلی کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہہ رہی تھی ”تم!“ اس تم میں کتنی دھار تھی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

پھر وہ چلا رہا تھا۔ ”تم رذیل کمینی عورت ہو۔ آج پھر میرے روبرو آتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی کیا؟“ اور وہ اس کے قدموں میں گر کر کہہ رہی تھی ”ہاں—— ہوں۔“ پھر صفدر چلا رہا تھا۔ ”میں نہیں مروں گا میں نہیں مروں گا—— مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو——“ اور اب شہزاد آپریشن ٹیبل پر پڑی ایلی سے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم تھا۔ میں تم سے پہلے مروں گی۔ ہمیشہ سے مجھے اس کا علم تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔ مجھے کوئی غم نہیں صرف میری بچیاں۔“ اس نے آخری ہچکی لی—— ایلی گھبرا کر چونک پڑا۔ چوکیدار جاچکا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ نرس اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”آپریشن کامیاب رہا۔ تمہیں مبارک ہو۔“ ایلی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے دل میں کوئی خوشی پیدا نہ ہوئی اور وہ اسی طرح دیوانہ وار بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا

ر۔

پھر ہسپتال کا بھنگی اس کے روبرو کھڑا تھا۔ مردہ بچے کی لاش لے جاؤ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

لاش! ایلی سوچنے لگا۔ لاش کو کہاں لے جاؤں۔ کیا کروں۔ لاش!!

بھنگی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”ابھی لے جاؤ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اسی وقت۔ اٹھانے والا ہے

ں۔“ ایلی حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

ندبوند

شہزاد ہسپتال سے واپس آئی تو ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ وہ شہزاد نہیں تھی۔ جس سے وہ ں تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی شہزاد تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ گال بری طرح پچک ے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کا تل گویا گل ہو گیا تھا۔ اس میں وہ روشنی نہ رہی تھی۔ ، کسی نے دیپ بجھا کر اس کی گذشتہ روشنی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسے ان طاقوں پر رکھ ہو۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی۔ لیکن اس چمک میں مایوسی کا دھندلکا شامل ہو گیا تھا۔ ناک ر آئی تھی۔ ہونٹ گویا بھنچ گئے تھے۔ دانت نکل آئے تھے۔

انے ڈسچارج کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے اچھی غذا اور ئم لیکن جب وہ گھر پہنچی تھی تو ان کے ہاں کچھ آٹا اور تھوڑی سی دال کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ان کی غربت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سر پر قرض کا طومار کھڑا ہو گیا تھا۔ جسے ادا کرنے کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قرض حاصل کرنے کے مزید ائلت بالکل ختم ہو چکے تھے۔

لاہور میں ایلی کے ماموں زاد بھائیوں رفیق جمیل اور خلیق نے اس کی بے حد امداد کی تھی۔ ل ابھی تک خان پور میں تھا۔ رفیق لاہور رہتا تھا چونکہ اس کی تبدیلی ہیڈ آفس میں ہو چکی ۔ خلیق اب ڈاکٹر بن چکا تھا اور اکثر لاہور آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے خالہ زاد بھائی ف نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔ لیکن انہیں تو آئے دن امداد کی ضرورت رہتی ا۔ کبھی کبھار کی بات ہوتی تو بھی وقت گزر جاتا۔ روز کی حاجت مندی کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ دو لڑکیاں اب جوان ہو چکی تھیں۔ ان میں شہزاد کی سی رنگینی تو ی۔ لیکن پھر بھی وہ شہزاد کی بیٹیاں تھیں اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔ لہٰذا ان کی

طبائع میں وہ گھٹا گھٹا پن نہ تھا۔ محلے کی تمام عورتیں ان کے سحر سے مخدوش تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر یا بھائی یا بیٹے شہزاد کے گھر جائیں یا ان سے ملیں۔ اس لئے یہ سب لوگ چوری چھپے وہاں آتے تھے۔

ان کے آتے ہی فرش بچھا دیا جاتا اور پھر سب مل کر تاش یا چوپٹ کھیلنے بیٹھ جاتے اور کھیل میں وہ سب ہنستے چیختے چلاتے قہقہے لگاتے۔ گیت گنگناتے اور شور مچاتے۔ ایک دھما چوکڑی لگی رہتی۔ لیکن ان کے جاتے ہی مالی دقتوں کا احساس بیدار ہوتا اور شہزاد ایک طرف لیٹ کر سوچتی اور آہیں بھرتی۔

لڑکیاں طبعاً ہنسنے پر مجبور تھیں یا ان کا عنفوان شباب انہیں مسکرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لئے وہ ہنستی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی پچھتاوے کی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ غالباً وہ اس احساس کا اظہار صرف ماں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ مغموم اور افسردہ رہنے لگی تھی۔ شہزاد کو ذاتی طور پر کوئی غم نہ تھا نہ وہ پچھتانے کی قائل تھی۔ غالباً اسے بیٹیوں کے غم نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

ایلی نے آنے سے پہلے بار بار شہزاد سے کہا تھا کہ مالی مشکلات ہوں گی۔ اس لئے سوچ لو کیا تم انہیں برداشت کر سکو گی۔ لیکن ان دنوں شہزاد اس کے اس سوال کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ ایلی کو اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اب وہ کیوں اکیلی پڑی رہتی ہے کیوں آہیں بھرتی ہے۔ کیوں غم کھاتی ہے۔

شہزاد کو اپنی بڑی لڑکیوں کی تعلیم کا بھی غم تھا۔ جب وہ گروپتن سے آئی تھیں۔ تو دونوں نویں جماعت میں تعلیم پا رہی تھیں۔ ان کے دو سال پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ پہلے سال تو انہیں کسی سکول میں داخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرے سال میں انہیں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ گروپتن سے ان کے سرٹیفکیٹ دستیاب ہو جائیں۔ لیکن شریف نے ہیڈ مسٹرس کو لکھ کر دے دیا تھا کہ جب تک وہ خود ان کے سرٹیفکیٹ طلب نہ کرے۔ سرٹیفکیٹ جاری نہ کئے جائیں۔ لہٰذا ان کا دوسرا سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں تیسرا سال بھی ضائع نہ ہو جائے۔ بوند بوند غم اس کی روح میں سرایت کر رہا تھا۔

دو پاگل

پھر ایلی کا تبادلہ شاہ وال ہو گیا اور وہ سب شاہ وال چلے گئے!

شاہ وال ایک بڑا قصبہ تھا جو لاہور سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ابھی وہ شاہ پہنچے ہی تھے کہ شہزاد پھر بیمار پڑ گئی۔ اسے خون جاری ہو گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ "اسے لاہور ہسپتال میں لے جایئے۔ لاہور ہسپتال کے ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ مریضہ کا اندرونی جسم مردہ بچے کے زہر کی وجہ سے گل گیا ہے۔ آپریشن ہو گا۔

کیا آپریشن کے بعد مریضہ یقینی طور ٹھیک ہو جائے گی۔" ایلی نے پوچھا۔

"یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔" ڈاکٹر بولا۔ زیادہ امید نہیں۔"

"اوہ۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

جب وہ شہزاد سے ملا تو وہ بولی "میں آپریشن نہیں کراؤں گی۔"

"کیوں۔" اس نے پوچھا۔

"بے کار ہے۔" وہ بولی۔

"بے کار کیوں۔"

"وہ کہتے ہیں سڑاند پچھلی جھلی تک پہنچ چکی ہے اور خون بند نہیں ہو گا۔"

"تو پھر۔"

"مجھے لڑکیوں کے پاس لے چلو۔"

"اچھا۔" ایلی نے سر جھکا لیا۔

جب شہزاد لیڈی ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت طلب کرنے گئی تو ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔ "بے وقوف مت بنو۔" وہ بولی۔ "اگر تم ہسپتال چھوڑ کر چلی گئی تو زیادہ سے زیادہ دو روز جیو گی۔

"اور اگر میں ہسپتال میں رہوں تو۔"

"تو تو ——— تو شاید۔"

شہزاد نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا لی۔ ڈاکٹر گھبرا گئی۔ "نہیں نہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے کون روک سکتا ہے۔" شہزاد نے کہا اور باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈاکٹر نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔ "اے مسٹر۔ یہ تمہاری مسز دیوانی ہو گئی ہے۔ جان بوجھ خودکشی کر رہی ہے۔ اے مسٹر۔"

ایلی رک گیا۔ "یہ عورت پاگل ہے۔" ڈاکٹر چلائی۔

"ہم دونوں پاگل ہیں۔" وہ بولا۔

"ارے۔" ڈاکٹر بولی: "تم تو پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا "میں پڑھا لکھا پاگل ہوں۔"

"ارے۔" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں پاگل باہر نکل آئے۔ شہزاد نے ایلی کا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔ "ایلی۔"

"جان من۔" وہ بولا۔

"پندرہ دن ہیں۔" اس کی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔

"ہاں۔"

"پندرہ دن ہم اکٹھے رہیں گے۔"

"ہاں۔"

"پندرہ دن بہت ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" وہ بولا۔

"تم نے کہیں باہر تو نہیں جانا۔"

"نہیں جاؤں گا۔"

"ہم اکٹھے بیٹھ رہیں گے۔"

"بالکل۔"

"اور پھر ہم بیٹھ کر سب باتیں دہرائیں گے۔"

"ہاں۔"

"جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔"

پن۔ درہ۔ دن

اپنی ہی دھن میں پاگل پیدل چلے جا رہے تھے۔

"بابو جی تانگہ چاہیئے۔" تانگے والے نے قریب آ کر پوچھا۔

"تانگے پر چلو گی۔" ایلی نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے۔" وہ بولی۔

"چلتے ہوئے تمہیں تکلیف ہو گی۔" وہ بولا۔

"تکلیف "—وہ ہنسی۔ "اب کیا ہے۔"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "اب کیا ہے۔"

"ایلی۔" وہ بولی۔

"جی۔"

"ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"مانو گے؟"

"مانوں گا۔"

"شروع سے ہی مجھے معلوم تھا۔"

"کیا؟"

"کہ میں پہلے مروں گی۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ جب بھی تم میرے پاس آیا کرتے تھے تو کوئی میرے کان میں کہتا۔ تم پہلے مرجاؤ گی۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

"کون کہتا تھا؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا وہ سچ کہتا ہے۔"

"بس اتنا ہی کہتا تھا؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔

"تو؟"

"ایک بات اور کہتا تھا۔"

"وہ کیا؟"

"کہتا تھا —— نہیں بتاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"نہ بتاؤ۔" وہ بولا۔ "لیکن تم روتی کیوں ہو۔"

"ہاں روتی ہوں۔" وہ بولی۔

"اچھا جیسے تمہارا جی چاہے۔"

"اس لئے نہیں روتی کہ پندرہ دن اور ہیں۔"

"تو کس لئے؟"

"وہ جو دوسری بات کہتا تھا۔ اس پر نہ جانے کیوں اس کی دوسری بات سن کر میں ہمیشہ روتی رہی چھپ چھپ کر روتی رہی۔"

"کیا کہتا وہ ایسی بھی کیا بات ہے؟"

"کہتا تھا —— بتا دوں؟"

"تمہاری مرضی۔"

"کہتا تھا۔ تمہارے مرنے کے بعد اس کی زندگی شروع ہو گی۔"

"کس کی زندگی؟"

"تمہاری۔"

"زندگی ختم ہو جائے گی یا شروع ہو جائے گی۔"

"شروع ہو گی۔" وہ بولی۔

"اس میں رونے کی کیا بات ہے؟"

"مجھے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں تمہارے راستے کی رکاوٹ ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"اور تمہاری زندگی شروع نہیں ہو سکتی جب تک رکاوٹ دور نہ ہو۔"

"بے وقوف تم رکاوٹ نہیں زندگی ہو۔ تم چلی گئیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"سچ۔" وہ بولی۔

"تمہاری قسم۔"

وہ مسکرائی۔ "بس مجھے ایک غم ہے۔ میری بچیاں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شاہ وال جا رہے تھے۔ انجن ہونک رہا تھا۔

"پن۔ درہ۔ دن —— پن۔ درہ۔ دن۔"

دفعتاً ایلی کی توجہ سامنے بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف منعطف ہو گئی۔

"پندرہ" "دن" ایک چلا رہا تھا۔ "صرف پندرہ دن۔"

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ان کے راز سے واقف تھا۔

"کیوں بھائی"۔ وہ ایلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "لو تم ہی بتاؤ پندرہ دن بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں"۔ اس نے چٹکی بجائی۔ "یوں گئے ہے نا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ "ہم نے تو بس وہی ایک ڈاکٹر دیکھا ہے۔ دو سال میری بیوی میو ہسپتال میں پڑی رہی۔ دو سال آخر انہوں نے جواب دے دیا اور میں اسے دوراہے لے گیا اور اس اللہ کے بندے نے پندرہ روز میں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں چل کر گھر آئی اور اللہ اس کا بھلا کرے۔ آج ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"کون ہے وہ ڈاکٹر؟ ایلی نے پوچھا۔

"دوراہے کا ہومیوپیتھ ہے جی۔"

"کیا نام ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہاشم

"بھئی واہ۔" وہ بولا۔ "تم ڈاکٹر ہاشم کو نہیں جانتے۔"

"جی ڈاکٹر ہاشم کو کون نہیں جانتا۔" اس کا ساتھی بولا۔

اگلے روز ہی ایلی دوراہے میں ڈاکٹر ہاشم کے معمل میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر ہاشم کا معمل ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ جس کے ایک طرف دو تنگ کمروں میں ادویات رکھی تھیں اور دو کمپاؤنڈر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک برآمدہ تھا۔ جس کے پیچھے دو وسیع کمروں میں کتابیں پڑی تھیں۔ تیسری طرف ایک دروازے کے پیچھے ڈاکٹر کا مکان تھا۔ صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا۔ جس پر ایک پرانا سا تکیہ لگا تھا۔ نیچے ایک میلا سا گدا بچھا ہوا تھا ایک چھوٹے سے ڈیسک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ ہاون، محدب شیشہ۔ ربڑ کی نلکیاں۔ ڈسک پر ایک پرانا قلمدان پڑا تھا۔ یہ ڈیسک تخت پر لگا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی کاغذ کی پرچیاں سی پڑی تھیں۔ تخت کے ایک طرف بوسیدہ کالا کمبل

ڈھیر ہو رہا تھا۔

صحن میں کوئی کرسی نہ تھی۔ کتابوں والے کمرے میں بھی بیٹھنے کے لئے فرش کے علاوہ کوئی کرسی یا کاؤچ نہ تھا۔ صحن میں لوگ ادھر ادھر زمین پر چوکیاں رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اور یوں شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ ڈاکٹر کا مطب نہیں بلکہ سٹہ منڈی ہو۔ ڈاکٹر ابھی زنان خانے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

دفعتاً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا ایک حقہ اٹھائے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک دیوانہ سا آدمی یوں لڑھکتا ہوا آ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر متحرک کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ نیچے سیاہ جرابیں تھیں ایک پھٹی ہوئی گرگابی۔

اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ گویا سوجا ہوا تھا۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ تخت کے قریب پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بڑھ کر کمبل اٹھا لیا اور اسے اپنے گرد لپیٹ کر تخت پر ڈھیر ہو گیا۔

مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

ایک ساعت کے بعد اس نے سر اٹھایا اور مجمع پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ ایک آدمی پر رکی۔ "ہوں۔" وہ بولا "تم۔"

"جی۔" وہ شخص بولا۔

"تمہاری بیوی مر گئی ہے کیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ شخص بولا۔

"تو اس کا برا حال ہے کیا۔"

"جی نہیں۔ الٹا وہ رو بصحت ہے۔"

"تو پھر تم کیوں آئے ہو۔" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

"جی دوا لینے۔"

"کیسی دوا۔"

"جی دوائی۔ یعنی۔" وہ گھبرا گیا۔

"جب وہ رو بصحت ہے تو دوائی کا مطلب۔ دوائیاں لینے کا شوق ہے کیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "میں نے سمجھا کہ مزید دوائی ـــــ"

"بے وقوف۔" ڈاکٹر بولا۔ "میں نے سمجھا کہ تم میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

"تو پھر مت سمجھو۔"

"جی بہت اچھا۔"

"جاؤ مزے کرو۔ اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔" وہ شخص سر جھکائے چل پڑا۔

"ہوں تم۔" ڈاکٹر کی نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ "تم۔" وہ بولا۔

"جی۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "میرا نام ماجد ہے۔"

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا "نام کو میں کیا کروں۔ تمہیں تپ دق ہے نا۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"تو جاؤ تمہارے لئے میرے پاس کوئی دوا نہیں جاؤ۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔" وہ بولا۔ "میں کہاں جاؤں؟"

"تم اللہ کے پاس جاؤ۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "وہاں سکھی رہو گے۔ جاؤ جاؤ۔"

وہ شخص مایوس ہو کر چل پڑا۔

"ہوں۔" ڈاکٹر نے ایلی کی طرف دیکھا۔

"جی میں۔" ایلی بولا۔ "میں شاہ وال سے آیا ہوں۔"

"تو کیا مجھ پر احسان کیا ہے۔" ڈاکٹر بولا "میاں لوگ حیدر آباد سے آتے ہیں۔" وہ رک گیا۔

"میسور سے آتے ہیں۔ تم شاہ وال سے آ گئے تو کیا ہوا۔" اس نے دوبارہ کہا۔

ایلی گھبرا گیا۔ "جی آپ بجا فرماتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیا فائدہ ہوا شاہ وال سے آنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بے وقوف۔" ڈاکٹر اسے گھورتا رہا۔

ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔

"لو بھائی اس شخص کی طرف دیکھا۔" ڈاکٹر نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "یہ شاہ وال سے آیا ہے لیکن بے وقوف مریض کو ساتھ نہیں لایا۔"

"ارے۔" ایلی حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

"میاں۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔ "اگر تم مریض کو ساتھ نہیں لائے تو کیا میرا منہ دیکھنے آئے ہو۔"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنس۔ بولا۔ "اچھا تو دیکھو۔"

عین اس وقت ایک معزز ہندو داخل ہوا اور دروازے میں ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "نمستے ڈاکٹر صاحب۔" ڈاکٹر صاحب کی توجہ نووارد کی طرف منعطف ہو گئی۔

"یہ لالہ جی دورا ہے کے تحصیلدار ہیں۔" قریب سے ہی آوازیں آئیں۔

لالہ جی قریب آ گئے۔ وہ ایک معزز اور شریف آدمی نظر آتے تھے اور انداز میں بلا کا تحمل تھا۔ جب وہ قریب آئے تو ڈاکٹر نے بغور ان کی طرف دیکھا۔

"لالہ جی۔" ڈاکٹر بولا۔ "مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔"

تحصیلدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"تشریف لے جائیں۔" ڈاکٹر نے دہرایا۔ "پھر سے داخل ہوں اور السلام علیکم کہیں۔"

تحصیلدار کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

"جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو دوا نہیں دوں گا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب۔" تحصیلدار نے کہا۔ "میں نے داخل ہوتے وقت ہاتھ باندھ کر آپ کو نمستے کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"نمستے کرنے میں کیا برائی ہے؟" تحصیلدار نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔"

"الٹا اس میں تو بے حد عجز ہے۔"

"جی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ اس میں بہت عجز ہے۔ لیکن ازراہ کرم واپس جائیے پھر داخل ہو کر السلام علیکم کہیے۔ تاکہ میں آپ کو دوائی دوں۔"

اس پر تحصیلدار صاحب مسکرائے اور احاطے سے باہر نکل گئے۔ پھر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم اسلام۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "فرمائیے کس کے لئے دوائی لینا ہے آپ نے۔"

"گھر والی کے لئے۔" وہ بولے۔

"اپنی گھر والی کو اپنی طرح تحمل پسند بنائیے نا۔" ڈاکٹر بولا۔ "وہ اپنی طبیعت کی تلخی کی وجہ سے بیمار رہتی ہے۔"

"یہ میرے بس کا روگ نہیں۔" تحصیلدار نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ان کی بیماری کی تفصیلات سن لیجئے۔"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "پہلے ہمیں ایسی دوائی دینا ہو گی۔ جس سے ان کی طبیعت بدل جائے۔"

"دوائی سے طبیعت بدل جائے۔" تحصیلدار نے کہا۔

ڈاکٹر نے قلم نیچے رکھ دیا آپ دوائی کو کیا سمجھتے ہیں لالہ جی۔" اس نے پوچھا۔

شاید آپ سمجھتے ہیں کہ دوائی صرف پیٹ کا درد دور کرتی ہے۔ کھانسی کو روکتی ہے۔ اسہال بند کرتی ہے۔"

"جی ڈاکٹر صاحب۔" وہ بولے۔

"آپ غلط سمجھے ہیں اور یہ ایک خوراک دینے کے بعد۔" ڈاکٹر نے پرچی پر لکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ دوائی کیا چیز ہے۔"

"مجھے اجازت ہے کہ ایک بات پوچھوں۔" ایلی بولا۔

ڈاکٹر نے مڑ کر ایلی کی طرف دیکھا۔

"لالہ جی بھی تو مریض کو ساتھ نہیں لائے۔" وہ بولا۔

"تو پھر۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تو پھر۔ انہیں کیوں دوائی دے رہے ہیں آپ؟"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "اس کا جواب تمہیں اس وقت دیں گے جب تم مریض کو ساتھ لاؤ گے اب ہالی کر کے چلے جاؤ۔" ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا اور چپ چاپ صحن سے باہر نکل آیا۔

کمبل کی گٹھڑی

شاہ وال کو واپس جاتے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا۔ ایسا ڈاکٹر تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی ہومیوپیتھی سے اسے کبھی سابقہ پڑا تھا۔ علاج بالمثل کے تصور سے ہی وہ بیگانہ تھا۔ عجیب ڈاکٹر تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ وہ مریضہ کو اپنے ہمراہ نہیں لایا۔ شکل د

صورت کی بھی بات نہ تھی۔ چونکہ دیکھنے میں تو وہ ہمیشہ ہی مریض دکھائی دیتا تھا۔ بہرحال عجیب ڈاکٹر تھا وہ۔ ایلی کے دل میں بے وجہ یقین پیدا ہوا جا رہا تھا۔ کہ شہزاد صحت مند ہو جائے گی۔

جب اس نے شہزاد سے بات کی تو وہ ہنس پڑی۔

"اب یہ چودہ دن بھی ضائع کرو گے۔" وہ بولی۔ "ایک دن ضائع کر آئے ہو۔"

اکٹھے جائیں گے۔ ایک ہی ڈبے میں بیٹھیں گے۔ ایلی نے کہا۔ "پھر کیسے دن ضائع ہو گا ——— تم سمجھ لینا کہ سیر کرنے جا رہے ہیں۔"

"اور ڈاکٹر کو دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

"اللہ مالک ہے۔" وہ بولا۔ "کچھ ہو ہی جائے گا۔"

شہزاد تیار ہو گئی۔ ایلی نے سوچا کہ رات کو سفر ٹھیک نہیں۔ سارا دن سفر کریں تاکہ شہزاد کو تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر ہاشم شام کے وقت بھی مطب میں آتے ہیں یا نہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ چلو سٹیشن پر مسافر خانے میں بیٹھ رہیں گے اس نے سوچا اور وہ اسی روز دوراہے کو روانہ ہو گئے۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ دوراہے پہنچے۔ ایلی شہزاد کو لے کر سیدھا مطب میں پہنچا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی مریض نہ کمپاؤنڈر اس نے شہزاد کو باہر صحن میں بٹھا دیا اور خود ادھر ادھر جھانکنے لگا۔

کتابوں والے کمرے میں کمبل کی ایک گٹھڑی سی پڑی ہوئی تھی۔ ایلی مایوس ہو کر صحن میں آ گیا۔ اور چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔

کمبل کی گٹھڑی کو حرکت ہوئی۔

"ارے۔" ایلی چونکا اور پھر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر کمبل اوڑھے گٹھڑی بنا پڑا تھا۔

ایلی ڈر رہا تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائے۔

"کون ہے؟" ڈاکٹر بولا۔

"جی میں ہوں۔" ایلی بولا۔

"میں کون؟"

"میں شاہ وال سے مریضہ کو لایا ہوں۔"

"اچھا۔" وہ بولے۔ "تم شاہ وال والے ہو کیا؟"

"جی۔"

ڈاکٹر نے کمبل سے ہاتھ نکالا۔ اس کا سر اور منہ کمبل ہی میں لپٹے رہے۔ "نبض دکھاؤ۔" تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "ادھر آؤ مریضہ۔"

ایلی نے شہزاد کو گھسیٹ کر پاس بٹھا دیا ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولی۔

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا اور نبض تھامے بیٹھا رہا۔

"دوسرا ہاتھ۔" وہ بولا۔

شہزاد نے دوسرا ہاتھ تھما دیا۔

دیر تک ڈاکٹر نبض تھامے جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"جسم سے خون جاری ہے نا۔" وہ بولا۔

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"اندر گل گیا ہے۔"

"جی ہسپتال والوں نے یہی کہا تھا۔"

"ٹھیک کہا تھا۔" وہ بولا۔

"انہوں نے کہا تھا پندرہ روز اور جئے گی۔ ڈایا فرام کو گھن لگ گیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"ڈایا فرام کو گھن لگ چکا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن یہ کہنے والے وہ کون ہیں کہ پندرہ روز جئے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟" ڈاکٹر نے غصے میں کہا۔

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

"بولو۔" وہ ڈانٹنے لگا۔ "بولو نا۔ وہ کون ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر وہ کون ہیں؟"

"جی ———" ایلی نے کہا۔

"تم مسلمان ہو؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"جی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اچھے مسلمان ہو تم۔" ڈاکٹر نے ایلی کو ڈانٹا اور دفعتاً اپنا منہ کمبل سے باہر نکال کر اس طرف دیکھا۔ ایلی ڈر گیا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں انگارہ سی چمک رہی تھیں۔

"مسلمان ہوتے ہوئے تم نے ان کے منہ پر تھپڑ نہ مارا۔ کیسے مسلمان ہو تم۔"

ایلی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر نے کمبل پرے پھینک دیا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے آیا وہیں بیٹھا رہے یا باہر چلا جائے۔

نہ جانے ڈاکٹر کیوں باہر گیا تھا۔

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"لو۔" ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔

"ارے۔" ایلی چونکا۔

"منہ کھولو۔" وہ بولا۔

ایلی نے منہ کھول دیا۔

"بے وقوف۔" ڈاکٹر چلایا۔ "مریض وہ ہے یا تم۔"

ڈاکٹر ہاتھ میں ایک پڑیا اٹھائے کھڑا تھا۔

شہزاد نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے پڑیا اس کے منہ میں انڈیل دی۔ "جاؤ۔" وہ بولا اور پھر ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"جاؤ۔ چلتے جاؤ اور اچھے ہوتے جاؤ۔"

ایلی حیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

"آپ کی فیس۔" اس نے ڈرتے ڈرتے دس کا نوٹ نکالا۔

"فیس ——" وہ بولا۔ "تم میری فیس دے سکتے ہو کیا؟"

"جی نہیں۔" ایلی بولا۔ "دوائی کی قیمت۔"

"دو آنے۔" ڈاکٹر بولا۔ "دو آنے۔"

ایلی نے گھبرا کر دو آنے نکالے۔

"رکھ دو۔" وہ بولا۔ "رکھ دو۔"

ایلی نے دونی رکھ دی۔

"گھر کے لئے دوا۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "جاؤ۔ یہی کافی ہے۔"

"کوئی پرہیز۔" ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہنسا "بے وقوف کھانے کو میسر نہیں آتا اور پوچھتے ہیں پرہیز۔ جاؤ۔" وہ چلایا۔

ٹھہرو۔" ڈاکٹر نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "پندرہ روز کے لئے تم اس کے خاوند نہیں اور یہ تمہاری بیوی نہیں سمجھے۔"

"جی۔" ایلی بولا۔

"سولہویں دن کوئی بندش نہیں۔"

ایلی اور شہزاد باہر نکلے تو وہ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ ڈاکٹر ہے کیا۔" شہزاد نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکٹر ہاشم۔"

"مجھے تو پاگل دکھتا ہے۔" وہ بولی۔

"مجھے بھی۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن سمجھ لو اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔"

"مجھے تو ڈھونگی معلوم ہوتا ہے۔" شہزاد نے کہا۔

"نہیں خالی پاگل۔ پگلاپن اور قابلیت ایک ساتھ ملتے ہیں۔"

"قابل آدمیوں کی شکل ایسی ہوتی ہے کیا۔" شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔ شاہ وال پہنچ کر پندرہ شہزاد اور ایلی نے گن گن کر کاٹے۔

امون

سولہویں دن ایلی نے پوچھا۔ "شہزاد کیا خون اب بھی جاری ہے؟"

وہ مسکرائی۔ "نہیں تو۔" وہ بولی۔ "کب سے ختم ہو گیا۔"

"تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"میں نے کہا۔ شاید پھر جاری ہو جائے۔"

"تو نہیں ہوا نا۔"

"اونہوں۔" وہ بولی۔

"تو وہ دوائی کام کر گئی نا۔"

"پتہ نہیں۔" وہ ہنسی۔

"ایک بات کہوں۔" ایلی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔

"کہو۔"

"مانو گی؟"

"کہو تو۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلے کہو مانو گی۔"

"مانوں گی۔" وہ پیار سے بولی۔

"آج ہمارا ہنی مون ہے۔" وہ بولا۔

شہزاد نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

"آج ہم پرانے زمانے کی یاد منائیں گے۔"

"کیسی یاد۔"

"جب تم مو نگیہ گٹھڑی تھیں۔ تب کی یاد۔"

وہ مسکرائی۔

"اب کہاں۔" وہ بولی۔ "اب وہ بات کہاں؟"

"اب بھی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیسے؟"

"میرے لئے ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

شہزاد نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یاد ہے وہ زمانہ۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" شہزاد ہنسی۔ "بھول سکتا ہے کیا۔"

ایلی نے زیر لب کہا۔ "آج میں آؤں گا۔"

شہزاد نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

ایلی نے پھر سرگوشی کی۔ "کھڑکی کھلی رکھنا۔"

شہزاد بامعنی انداز سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایلی باہر نکل گیا شام کو وہ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ حتیٰ کہ نو بج گئے۔ پھر وہ سینما میں جا بیٹھا۔ جب وہ فلم دیکھ کر نکلا تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ شاہ وال کی

لیاں ویران پڑی تھیں۔ کتے بھونک رہے تھے۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چل رہا تھا۔ گھر کے پاس جا کر وہ رک گیا اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جست بھر کر وہ کھڑکی کے پاس پہنچا۔ پٹ کو آہستہ سے دبایا۔ پٹ کھل گیا۔ دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔ چارپائی پر شہزاد سبز چادر اوڑھے مشین سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔

ایلی نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ "چپ۔" وہ بولا۔

شہزاد مسکرائی۔

"چائے پلاؤ گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساری رات وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ جب بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

"کون ہے۔" وہ زیر لب کہتا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ گنگناتی اور پھر باہر نکل جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر اس کے پاس آ بیٹھتی۔

یونہی صبح ہو گئی اور ایلی اسے الوداع کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر صدر دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بستر پر پڑ کر سو گیا۔

سراب

شاہ وال ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کا مدرسہ بھی کافی بڑا تھا اگرچہ عمارت پرانی تھی۔ لیکن عمارت کے ساتھ وسیع و عریض میدان تھے۔ سکول کے قریب ہی بورڈنگ کی عمارت تھی۔ جس میں شاہوال کے گردونواح کے دیہات کے لڑکے رہتے تھے۔ بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ کا کوارٹر بورڈنگ کی عمارت کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام سراب تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ جسم گول مٹول رنگ گورا اور چہرہ فٹ بال کی طرح تھا۔ جس میں اس قدر ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ سراب کی آنکھیں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں۔ کبھی طلوع ہوتیں بھی تو جیسے دو لکیریں ہوں اور پھر وہ جلد ہی غروب ہو جاتیں چونکہ سراب کو بات بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو گوشت کا ایک طوفان چہرے

پر چلتا۔ بڑھتا سمٹتا۔ آنکھیں کشتیوں کی طرح لہروں میں ڈوب جاتیں۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ ہوتا یا جان بوجھ کر غصے میں آ جاتا تو دو بھوری دھاریاں ابھرتیں حتیٰ کہ وہ کٹاریں بن جاتیں۔ ان میں دھار پیدا ہو جاتی اور وہ بری طرح سے کاٹنے لگتیں۔ ایلی سراب کو مل کر بے حد خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے درمیان گزارا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا۔ کہ اساتذہ زیادہ تر رسمی یا کتابی زندگی بسر کرتے تھے۔ وسعت نظر سے قطعی طور پر بیگانہ تھے۔ چونکہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ تر زندگی بچوں میں بسر کرتے تھے۔ ان کی شخصیت رسمی خیالات جذبات اور حرکات کا مجموعہ تھی۔ وہ سب ایک ہی دائرے میں گھومتے تھے اور اپنے خیالات علم اور نظریات کو ناجائز طور پر بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ہاتھی دانت کی طرح انہوں نے اخلاقی معیار پال رکھتے تھے۔

ایلی اساتذہ سے اکتا چکا تھا۔ ان میں نہ تو ذہنی چمک تھی نہ وسعت قلب اور نہ ہی وہ رنگینیِ جذبات سے واقف تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر تو بالکل ہی ایلی کے لئے ناقابل قبول تھے۔ وہ اساتذہ سے بھی یوں پیش آتے۔ جیسے وہ بچے ہوں۔ مدرسے میں وہ ایک جزیرے کی طرح الگ تھلگ رہتے اور یا اساتذہ کے قریب آتے تو یہ توقع رکھتے کہ وہ ان کی ہر بات کو سراہیں۔ ان کے ہر خیال پر واہ واہ کریں۔

سراب میں خودستائی کی واضح جھلک تو تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں رنگینی کا عنصر مفقود نہ ہوا تھا۔ جسے وہ بڑی محنت سے چھپائے پھرتے تھے۔ اس وجہ سے بڑوں کی نسبت وہ بچوں سے قریب تر تھے۔ ان کے گھر میں نوجوان طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ انہیں پڑھاتے تھے۔ چھیڑتے تھے گھورتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

نہ جانے کیوں ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ ہیڈ ماسٹر نہیں۔ جیسے کسی میم نے زبردستی سوٹ پہن رکھا ہو یا کوئی دلہن شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر مردانہ لباس میں باہر نکل آئی ہو۔

ان کی بیگم ایک معزز خاندان کی خاتون تھیں۔ نہ جانے کیوں یہ وہم اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا کہ ان کا مکان پاک صاف نہیں۔ لہٰذا وہ بہت سے طالب علموں کو اکٹھا کر کے گھر کی صفائی میں لگی رہتی تھی۔ فرش دھلواتی۔ دیواریں جھاڑتی۔ دروازوں کے تختوں کو پانی سے دھوتی حتیٰ کہ دروازے کی زنجیروں کو پاک کرنے کے لئے ان پر صابون ملتی۔

گھر کے اندر زنانے میں وہ ہر وقت صفائی میں مصروف رہتی تھی۔

باہر مردانے میں سراب نوجوان طلباء کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے بیٹھے رہتے۔ لیکن اندر میں راجہ کی نسبت رانی کی زیادہ جھلک تھی۔

سراب کو دیکھتے ہی لاشعوری طور پر ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق روا نہ رکھے گا۔

مثلاً" سراب اس سے پوچھتے۔ "آصفی صاحب آج آپ لیٹ کیوں آئے ہیں۔"

"جی آج کی بات تو نہیں۔" ایلی جواب دیتا۔ "میں تو روز لیٹ آتا ہوں۔"

"کیوں لیٹ آتے ہیں آپ۔" وہ پوچھتے۔

"جی میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اس نکتے کو حل کروں۔ لیکن ——— "

"کیا آپ کا اخلاقی فرض نہیں کہ آپ وقت پر سکول آئیں۔" وہ بصد مشکل اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کر کے کہتے۔

"اخلاقی فرض تو نہیں سراب صاحب۔"

"کیوں۔"

"نوکر ہوں لہٰذا۔ وقت پر آنا چاہئے۔"

"تو یہ فرض ہوا نا۔"

"جی اخلاقی فرض تو نہیں نا۔ دیکھئے سراب صاحب آپ میرے افسر ہیں اور میں آپ کا ماتحت ہوں۔" ایلی کہتا۔ "میرا فرض یہ ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ اور بس۔"

سراب صاحب کے گال سرخ ہو جاتے۔ چہرے پر گوشت کی لہریں چلنے لگتیں اور آنکھیں غائب ہو جاتیں۔

"بہرصورت آپ وقت پر آیا کریں۔" وہ کہتے۔

"بہت اچھا صاحب۔"

اگلے روز ایلی پھر لیٹ آتا۔

سراب نے سوچا کہ ایلی کو شرمندہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہوں نے خود وقت پر آنا شروع کر دیا۔ آتے ہی وہ ایلی کو تلاش کرتے اور پھر اس کی جماعت میں جا کر خود پڑھانا شروع کر بیٹھتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایلی دو ایک روز صورت حالات کا جائزہ لے گا تو شرمندگی محسوس کرے

گا۔ لیکن ایلی نے یہ دیکھ کر کہ سراب صاحب اس کی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ پہلے پریڈ میں آنا ہی بند کر دیا۔ اس پر سراب صاحب بہت سٹ پٹائے اور اساتذہ کی میٹنگ میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ کیا بولے۔ "شرمندہ ہونے کی بجائے آصفی صاحب نے پہلے پریڈ میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

ایلی نے کہا۔ "جناب عالی دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آپ مجھ سے بہتر پڑھاتے ہیں۔ لہٰذا میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنی جماعت کو آپ کے درس سے محروم کروں۔"

سراب صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ الیاس کا برتاؤ باقی اساتذہ سے ہٹ کر ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں اس پر خوش تھے۔

ایک روز ایلی سے سراب نے پوچھا۔ "آصفی صاحب آپ کا رویہ باقی اساتذہ کا سا نہیں۔ کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ہے۔" وہ بولا کہ آپ کا رویہ باقی ہیڈ ماسٹروں کا سا نہیں۔"

وہ مسکرائے "کیا فرق ہے؟" وہ بولے۔

"وہ فرق جو سوکھے اور ہرے بھرے درخت میں ہوتا ہے۔"

چند ایک روز تو ایلی باتوں کی مدد سے اپنے قدم جماتا رہا۔ پھر جب اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تو ایک روز جب وہ اکیلے تھے۔ ایلی نے نہ جانے کس بات کے جواب میں اپنے دل کی بات ازراہ مذاق کہہ دی۔ کہنے لگا۔ "سراب صاحب کسی وقت تو میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے آپ دلہن ہوں۔" دفعتاً" سراب صاحب میں چھپی ہوئی عورت تمام احتیاط اور ضبط کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس نے نوچ کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور برہنہ ایلی کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

سراب کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ وہ سرخی نہیں جو دوران خون تیز ہونے پر جھلکتی ہے بلکہ وہ سرخی جو دلہن کا گھونگھٹ اٹھنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایلی حیران رہ گیا۔ اسے اس برہنگی کا خیال نہ تھا۔ توقع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر چلا آیا۔ اس کے بعد سراب اور ایلی کے درمیان ایک حجاب سا دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ جیسے وہ دونوں کسی راز سے واقف ہوں۔

کپور اور ریاض

مدرسے میں سراب کے علاوہ دو شخص پیش پیش تھے۔ ایک تو سکول کے دفتر کا کلرک تھا۔

[...]ن کا نام ریاض تھا۔ اس کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ رنگ کالا تھا اور طبیعت میں حکمرانی [...]ی بو کے علاوہ اخلاق، نیکی اور سچائی کی طلب کا جنون تھا۔

دوسرا شخص کپور تھا۔ کپور سینیئر انگلش ٹیچر تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ طبیعت میں بلا کا عجز [...]ر مٹھاس تھی۔ کپور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جیتا [...]ا۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی شخص کی جائز یا ناجائز امداد پر کمربستہ رہتا تھا۔ صبح سویرے گھر سے [...]ا اور پھر رات گئے گھر لوٹتا اور سارا دن کسی نہ کسی حاجت مند کے کام میں مصروف رہتا۔ کوئی [...]ے کچہری لے جاتا تاکہ مقدمے میں اس کی امداد کرے۔ کوئی اسے اپنی بیٹی کی شادی کے جملہ [...]تظامات سونپ دیتا۔ کوئی کہتا بھائی کپور۔ تھوڑا سا قرض چاہیئے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ کوئی [...]ے ٹیوشن کے لئے فرمائش کرتا اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو کپور گھر گھر لوگوں سے ملتا "کوئی سیوا [...]تایئے صاحب۔" وہ کہتا "میں آپ کا سیوک ہوں۔" ایلی کے لئے ریاض اور کپور دونوں نعمت [...]یر مترقبہ تھے۔ وہ دونوں ایلی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کپور اسے ادھار سودا دیتا تھا۔ ریاض لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ کے بغیر گرلز سکول میں داخل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا تھا۔ پھر کپور نے ان کی فیس معاف کرانے کا ذمہ لے لیا اور ریاض ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح وہ دونوں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتے رہے۔ سراب کو بھی ایلی کے حالات سے بے حد ہمدردی تھی۔ لیکن سراب کی ہمدردی کو عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایلی کی جملہ مشکلات مالی نوعیت کی تھیں تنخواہ میں اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس پر قرض کا طومار لگا جا رہا تھا۔ اس کے قرض خواہ ادائیگی کے لئے تقاضہ کرتے اور ایلی دوڑ کر کپور کو بنیئے کی طرف بھیجتا تاکہ اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر راضی کرے۔ اگلے روز کپڑے والا آ جاتا اور ایلی ریاض کی طرف دوڑتا۔

کپور اللہ واسطے کام کرنے کا قائل تھا۔ مگر ریاض طبیعت کا سخت تھا وہ کام تو کرتا تھا مگر ساتھ [...]کچر بھی پلاتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا کہ ایلی اس کی عظمت اور نیکی کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ وہ ایلی پر خوش نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آخر یوں کب تک گزارا ہو گا۔ اس کا کوئی عملی تدارک کرنا چاہیئے۔ ریاض اور کپور چاہتے تھے کہ ایلی کوئی ٹیوشن کرے اور اس طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ لیکن ایلی ٹیوشن کا قائل نہ تھا۔ اس کی زندگی نظم سے خالی تھی۔ وہ بلاناغہ

مقررہ وقت پر حاضر ہو کر کام کرنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ ایلی محنت سے گریز کرتا تھا اور ریاض کو یہ بات پسند نہ تھی۔

کپور اور ریاض کے علاوہ شاہوال سکول میں ایک اور شخص بھی تھا جو جونیئر ٹیچر تھا۔ اس کا نام ثناؤ اللہ تھا۔ ثناء اللہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی۔ جو ایلی کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ اس کا جسم موٹا تھا۔ منہ سوجا سوجا سا طبیعت میں شوخی یا رنگینی کا عنصر نام کو نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک معزز آدمی تھا۔ البتہ اسے افسروں کے خلاف شکایت کرنے کی عادت تھی۔ کسی کو اکیلا دیکھ پاتا تو اسے پکڑ کر زیر لب افسروں کی شکایات کا دفتر کھول لیتا زندگی میں یہ اس کی واحد دلچسپی تھی۔ ثناء اللہ کی ایلی سے راہ و رسم صرف اس لئے ہوگئی کہ ان دونوں کے مکانات ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ ایلی سکول سے واپس آتا تو ثناء اللہ آ نکلتا۔

"یہ سراب بڑا حرامی ہے" وہ ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہتا۔ "اس کے کارنامے سنو گے۔ بھائی صاحب تو دنگ رہ جاؤ گے۔ بس اندر کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ اس سے مدرسے کے بچوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔

تعلیم تو محض بہانہ ہے۔"

"ایلی صاحب کپور کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ اوپر سے دھرماتما بنا ہوا ہے۔ ویسے اندر سے کٹر ہندو ہے اور بے انتہا متعصب۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ تو صرف ظاہر پر جاتے ہیں۔ یہ لالے بڑے چالاک ہوتے ہیں اور یہ جو سیوا سمتی شروع کر رکھی ——— اس نے یہ محض دکھلاوا ہے۔"

"یہ جو موٹا ریاض ہے نا۔ مدرسے کا سارا پیسہ کھا گیا ہے۔ لیکن ہے اس قدر چالاک کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ ایک روز بھانڈا بھوٹے گا تو پتہ چلے گا۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں ورنہ جب بات نکلے گی تو ساتھ دھر لئے جاؤ گے۔"

ایلی کو ثناء اللہ سے قطعہ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس کی باتوں کو غور سے سنا کرتا تھا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ثناء اللہ سے اپنا پیچھا چھڑاتا۔ اس کے برعکس وہ اس کی باتیں سن کر مجبوری سے تعجب بھری آوازیں کہتا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔"

یا۔ "کیا واقعی۔" یا "ارے ایسا معلوم تو نہیں ہوتا۔"

شاہ وال پہنچ کر زندگی میں پہلی مرتبہ ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ سبھی اساتذہ اس کے راز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ چھ بچوں کی ماں کو بھگا کر لے آیا ہے اور وہ اس بات پر شرم

محسوس کرنے لگا تھا۔

ایلی کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کے قہقہے گھر سے باہر نشر ہونے لگے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر راہ گیر رک جاتے تھے۔ اور کہتے اچھا یہ ہے ایلی صاحب کا گھر جب وہ سکول جاتی تھیں تو راستے میں لوگ خصوصاً نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے۔ مسکراتے اور کوئی عاشقانہ گیت گنگناتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے۔

ان باتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شبہات کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا۔ ایلی ان لڑکیوں کی معصومیت سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ہر لڑکی اپنا آپ نشر کرنے پر فطری طور پر مجبور ہے۔ اسے اس کا شعور نہ تھا کہ لڑکیوں کی مسکراہٹیں کسی ٹھوس مقصد کے شعور سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے قہقہے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی خاص شخص کو لبھانے کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ عنفوان شباب میں لڑکی کسی تحسین بھری نگاہ کو رو نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔

ان وجوہات کی بنا پر ایلی کو معصوم لڑکیوں سے شکایات پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ شکایات تعصب کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے شہزاد میں ایک اداسی اور احساس محرومیت پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی وہ رنگینی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طبعی شوخی اب محض روایت سی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں وہی تلخی پیدا ہوئی جا رہی تھی۔ جو ایک ایسی عورت میں پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہو اور جسے احساس ہو کہ وہ اپنا حسن کھو چکی ہے۔ شہزاد کو ایلی کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ اسے اب بھی ایلی سے وہی لگاؤ تھا۔ لیکن اس کے اظہار کے موقعے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی کوئی بات شروع کرتے تو نہ جانے کیسے وہ بات کسی نہ کسی اقتصادی مشکل پر آ ختم ہوتی اور بات کی رنگینی تلخی میں بدل جاتی۔

کبھی کبھار لاہور سے محمود آ جاتا۔ میم کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔ میم کے جانے کا اس پر اثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گہرا نہ تھا کہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔ ایلی کی دانست میں محمود ازلی طور پر ایک ایسا لڑھکتا

ہوا پتھر تھا۔ جسے ہر لڑکھن نئی چمک عطا کرتی ہے۔

دوراہے سے واپس آئے ابھی انہیں دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایلی کو معلوم ہوا کہ شہزاد امید سے ہے۔ لیکن شہزاد کو شبہات تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ لاہور ہسپتال والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بچے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوا بھی تو ماں کے لئے خطرے کا باعث ہوگا۔ لیکن امید کی تمام علامات واضح تھیں۔

"نہ جانے کیا ہے۔" شہزاد نے کہا۔ "یہ علامات شاید کسی آنے والی بیماری کا پیش خیمہ ہوں۔"

ادھر یا پاگل خانہ

"تم تو خواہ مخواہ شک کرتی ہو۔" ایلی نے کہا۔

"میری طبیعت تو شکی نہیں۔" وہ بولی۔ "شکی تو تم ہو۔"

"پھر مجھے شک کیوں نہیں پڑتا۔" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" شہزاد بولی۔

"میں بتاؤں شہزاد۔" ایلی نے کہا "چلو ایک بار پھر دوراہے جا کر ہاشم سے ملیں۔

ہاشم کا نام سنتے ہی وہ گھبرا گئی۔ "نہ میں نہیں جاتی۔"

"کیوں۔"

"وہ تو دیوانہ ہے۔"

"پڑا ہو ہمیں اس سے مطلب۔"

شہزاد دوراہے جانے کے لئے تیار نہ ہوئی تو وہ اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے شہزاد کا معائنہ کیا اور پھر مسکرانے لگی۔ "تمہیں بچہ ہونے والا ہے ظاہر ہے کہ تم امید سے ہو—— لیکن تمہاری صحت اچھی نہیں تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔"

اب بھی شہزاد کو یقین نہیں آتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی اور صاحب فراش ہو گئی۔ ایلی گھبرا گیا اور اس کی منتیں کرنے لگا کہ ایک مرتبہ دوراہے چلے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو وہ راضی ہو گئی اور وہ دونوں دوراہے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس مرتبہ بھی وہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر شام کو تین بجے کے قریب دوراہے پہنچے۔
ہاشم کا معمل خالی پڑا تھا۔ ڈاکٹر ہاشم اسی طرح کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔
ایلی نے اپنی آمد کا اعلان نہ کیا۔ بلکہ شہزاد کو سمجھا دیا کہ تم چپکے سے اپنا ہاتھ بڑھا دینا تاکہ ڈاکٹر نبض دیکھ لے۔ ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر اپنے طبعی جنون کی وجہ سے اسے دیکھنے سے انکار نہ کر دے۔

"کون ہے۔" ڈاکٹر نے آواز سن کر پوچھا۔

"مریضہ۔" وہ بولی۔

"اس وقت نہیں۔" وہ بولا۔ "صبح آنا۔"

"بہت دور سے آئی ہوں۔" شہزاد نے کہا۔ ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

"کتنی دور سے۔"

"شاہ وال سے۔" وہ بولی۔ "آج ہی واپس جانا ہے۔"

"ہوں۔" وہ بولا۔ "تو دکھاؤ نبض۔" ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کمبل سے باہر نکالا اور وہ شہزاد کی نبض دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ چونکا۔ "اوہ۔" وہ بولا۔ "معاملہ تو خراب ہے۔ بہت خراب ہے۔"

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

"بچہ تو گل گیا ہے۔" وہ بولا۔ "اور اگر تم بروقت نہ آتے تو——"

"آپ نے پہلے بھی دوائی دی تھی۔" ایلی بولا۔

"کب؟"

"چھ مہینے ہوئے۔" وہ بولا۔ "آپ نے کہا تھا جسم اندر سے گل گیا ہے۔"

"دی ہو گی دی ہو گی۔" ڈاکٹر چلایا۔ "لیکن معاملہ پھر بگڑا ہوا ہے۔" اس نے کمبل سے سر نکالا۔ "یہاں روز مریض آتے ہیں۔" وہ چلایا۔ "سینکڑوں آتے ہیں۔ ہمیں کیا یاد رہتا ہے۔ کہ کس کو کیا دوائی دی تھی۔ یہ دیکھو۔" ڈاکٹر نے اس قالین کا کونہ اٹھایا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے نیچے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ "دیکھو۔" وہ بولا۔ "یہ سب مریضوں کے خط ہیں۔ ان سب کو کون جواب لکھے۔ خواہ مخواہ خط لکھتے چلے جاتے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"میاں۔" وہ پھر بولا۔ "ہم کیا خدا ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے جتنا مطلوب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے صحیح دوا لکھوا دیتے ہیں۔ ورنہ یونہی اناپ شناپ دوائی

مل جاتی ہے۔ سب اللہ کی شعبدہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر سب ڈھونگ ہے
ڈھونگ "وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"تم کیا کام کرتے ہو۔" اس نے ایلی سے پوچھا۔

"جی میں بچے پڑھاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"تم بچے پڑھاتے ہو۔" اس نے ایلی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"تم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔"

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"اور تم یہ کام کرو گے بھی نہیں۔"

"جی ــــــ؟"

"چھوڑ جاؤ گے۔" ڈاکٹر نے پھر سے اپنا منہ کمبل سے ڈھانپ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔
"تمہاری زندگی میں گڑ بڑ ہے۔" وہ بولا۔ "ذرا نبض دکھاؤ۔" اس نے ایلی سے کہا اور اپنا ہاتھ کمبل سے نکال کر ایلی کی نبض دیکھنے لگا۔ دیر تک نبض ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا رہا۔

"سب کچھ غلط ہے" وہ بولا۔ "سرے سے سب کچھ غلط۔ دل و دماغ اعضاء سب غلط ہیں۔ سب الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ سودا کی طرف مائل ہو۔ صفرا حد تک پہنچ چکا ہے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔" وہ بولا۔ "یقیناً" ہو جاؤ گے۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے۔" اس نے کہا "صرف ایک اگر ادھر نہ پہنچے تو مینٹل ہسپتال میں پہنچ جاؤ گے۔ اور وہیں مرو گے۔"

"ادھر کدھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"وہ بھی ایک سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جس سے تم واقف نہیں ہو۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"تو پھر ادھر پہنچنے کا کیا امکان ہو سکتا ہے اگر میں اُدھر سے واقف ہی نہیں۔" ایلی نے کہا۔
ڈاکٹر ہنسا۔ "وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے۔ بلائے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے پاکھنڈ مچا رکھے ہیں۔" اس نے سر سے کمبل پھر اتار دیا۔

"تم لڑکی۔" وہ شہزاد کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تمہارا اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ دیر تک نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ بیماری ــــــ تمہیں لے جائے گی۔" ہاں لے جائے گی۔ لیکن

ہارے پیٹ میں جو بچہ ہے جو گل چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بچہ معمولی بچہ ہیں۔ بہت کچھ لے کر آئے گا بہت کچھ عالی ظرف ہو گا۔ فنکار ہو گا سبحان اللہ۔"

وہ دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ "آؤ تمہیں پڑیا دیں۔" وہ بولا۔ "آؤ۔"

"ہاشم سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ سٹیشن پر بیٹھے رہے۔ شہزاد اپنے ہی خیالات میں کھوئی ئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" وہ شہزاد سے پوچھنے لگا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ بولی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر دھیان نہ دو ایلی نے کہا۔ "وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ دیوانہ بھی ہے۔ بہت فلسفی بھی ہے۔ روحانیات سے بھی شغف رکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ شاید تم سوچ رہی ہو ہ واقعی ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔"

"وہ تو میں دیر سے جانتی ہوں۔" شہزاد بولی۔

"کیا؟"

یہی کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور میں چلی جاؤں گی۔ لیکن ایلی ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

شہزاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میرے جانے سے پہلے کہیں مجھے چھوڑ نہ جانا۔"

"پاگل ہو گئی ہو۔" وہ بولا

"بس مجھے یہی ایک فکر ہے۔" شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟"

"ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن پتہ نہیں کیوں یہ خیال بار بار میرے دل میں اٹھتا ہے۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ شاہ وال پہنچے تو شہزاد کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر روز بروز اس کی طبیعت ترہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اداس رہتی تھی۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے جب اس کی نگاہ بڑی لیوں پر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ دراصل اسے لڑکیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔ ل کا خیال تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ چونکہ وہ اس کی بیٹیاں تھیں۔ کوئی

عزیز یا رشتہ دار ان سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ شہزاد نے اپنے اس خیال کے متعلق ایلی سے بھی کئی بار بات کی تھی لیکن ایلی اس کی بات پر ہنس دیتا تھا۔ "ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔" وہ کہتا۔

"میرے پاس زیادہ وقت بھی ہو۔" شہزاد جواب دیتی۔

اس پر ایلی چڑ جاتا۔ "کیا واقعی تم یہ خیال دل میں لیے بیٹھی ہو کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا۔" شہزاد پوچھتی۔

"پاگل ہو" وہ چلاتا۔ "خواہ مخواہ کے فکر لگائے بیٹھی ہو۔" اسے واقعی اس بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن اس کے غصے نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

بھارت سیتم

ایک روز ثناء اللہ اپنی بیوی کو ان کے ہاں لے آیا۔ اس کی بیوی بڑی لڑکی صبیحہ کو دیکھتے ہی چلانے لگی۔

"ہائے کتنی پیاری بیٹی ہے۔ تمہاری۔ آمیں واری جاؤں۔ آمیں تجھے پیار کروں۔" اس نے صبیحہ کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

صبیحہ حیران تھی وہ زیر لب ہنسے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک بیگانہ عورت اس پر اس قدر مفتون کیوں ہوئی جا رہی ہے۔ شہزاد کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔ ثناء اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا پیغام لے کر آ گیا۔

"صبیحہ کو تو ہم نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔" وہ بولا۔ "میری بیوی تو اسے دیکھ کر اپنا دل دے چکی ہے۔ کل سے اسی کی باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر اسی کا تذکرہ اگر آپ ہم غریبوں کا پیغام منظور کر لیں تو بہت کرم نوازی ہو گی۔"

چند ہی روز کے بعد ثناء اللہ نے اپنے دونوں بھائیوں کو شاہ وال بلا لیا تاکہ وہ ایلی سے مل سکیں۔

اس کا بڑا بھائی ذکاء اللہ شکل و صورت اور بات چیت سے خالص فنکار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال گیسوؤں کی طرح لمبے تھے۔ چہرے سے خوش مذاقی اور ذہنی چمک واضح تھی۔ گفتگو

یت پر اخلاق اور آواز بہت رسیلی تھی۔ ثناء اللہ کے بیان کے مطابق وہ سیکرٹریٹ میں ایک اعلیٰ ہدے پر فائز تھا۔

چھوٹا بھائی ضیاء ابھی نوجوان ہی تھا۔ اس نے ایف اے تک تعلیم پائی تھی اور آنکھوں میں والی چمک تھی۔

شہزاد اور ایلی ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

"لو۔" ایلی نے کہا۔ "تمہارا یہ غم بھی دور ہو گیا۔ صبیحہ کو اچھا رشتہ مل گیا۔"

"ادنہوں۔" شہزاد بولی۔ "میں خوش نہیں ہوں۔ ایف اے سے کیا ہوتا ہے آج کل لڑکا وری طرح تعلیم یافتہ نہیں اور جب تک اسے مناسب ملازمت نہ مل جائے میں یہ کام نہیں روں گی۔"

بہر صورت اس بات چیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ صبیحہ اور ضیاء نام زد ہو گئے۔

نامزدگی سے پہلے ایلی ایک روز ثناء اللہ کو مدرسے میں ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔

ہئی پیشتر اس کے کہ اس امر کا فیصلہ ہو میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے حالات سے اہ کر دوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں ان تفصیلات کا علم ہو اور تم ہم سے گلہ کرو کہ ہم نے ہیں دھوکے میں رکھا۔" یہ کہہ کر ایلی نے اپنی زندگی کے متعلق اہم باتیں اسے بتا دیں۔

ثناء اللہ غور سے اس کی باتیں سنتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ "ہمیں سب علم ہے۔ آپ نے ئی نئی بات نہیں سنائی۔"

"تو کیا۔" ایلی نے پوچھا۔ "آپ نے یہ سب جانتے ہوئے پیغام دیا تھا۔"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "ذکاء زندگی بھر بیرونی ممالک میں گھوما ہے۔ وہ ان باتوں کو درخور اعتنا ں سمجھتا اور چونکہ چھوٹا ضیاء اس کے زیر اثر ہے اس لئے اس کا نقطۂ نظر بھی رسمی نہیں ۔"

ڈ ایک ماہ کے بعد ایک روز شہزاد اور ایلی کو اکٹھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر زنے کہا۔ "اب جو یہاں آئے ہیں تو ذکاء اور ضیاء سے مل کر جانا چاہئے۔ انہیں علم ہو گا کہ لاہور آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے تو وہ برا مانیں گے۔"

یہ سوچ کر وہ دونوں انار کلی گئے وہاں سے انہوں نے پھل وغیرہ خریدا اور پھر مال روڈ کی ۔ چل پڑے۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ ضیاء اور ذکاء اکٹھے نمبر ۱۱۳ کی کوٹھی میں رہتے

ہیں۔ دیر تک وہ مال روڈ پر گھومتے پھرے۔ لیکن انہیں ۱۱۳ نمبر کی کوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ایلی ایک دوکان پر گیا۔ پان فروش سے پوچھا۔ "بھائی نمبر ۱۱۳ کا بنگلہ کدھر ہے۔"

نمبر ۱۱۳ پنواڑی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے قریب کھڑے ایک اور آدمی کو آواز دی۔ "کیوں بھاجی۔" وہ بولا۔ "بھلا نمبر ۱۱۳ کی کوٹھی کون سی ہوئی۔"

"۱۱۳۔" وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس پر دو چار آدمی اور آ گئے۔

"بھائی صاحب کچھ اتا پتہ دیجئے خالی نمبر سے تو کام نہیں چلے گا۔" ایک آدمی نے کہا۔

"بھئی ان کا نام ذکاء اللہ ہے یہاں سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ہوں۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"کتنے بھائی ہیں۔" ایک نے پوچھا۔

"دو بھائی ہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"ارے۔" ایک چلایا۔ "وہ ناچ تو نہیں کیا۔"

اس پر ان سب نے غور سے ایلی اور شہزاد کا جائزہ لیا۔

"ارے نہیں۔" ایک بولا۔ "وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھئی انہیں ملنے تو میمیں آتی ہیں۔"

"ناچ۔" ایلی سن کر مسکرایا۔ "ناچ کا کیا مطلب۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

"معلوم نہیں جی۔" ایک شخص بولا۔ "آپ ان پچھلے بنگلوں میں دیکھیں۔ شاید وہیں ہوں۔"

ایلی ان بنگلوں کی طرف چل پڑا۔ شہزاد تانگے میں بیٹھی رہی۔

سامنے بنگلے سے موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بنگلے کے گول کمرے پر بورڈ آویزاں تھا۔

"بھارت سیتم ۔" گول کمرے میں ساز سنگیت کا ریکارڈ چل رہا تھا۔ کس قدر صاف آواز تھی۔ کیسا اچھا باجہ تھا۔ ایلی نے قریب جا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ایک جوان حسین و جمیل لڑکی ناچ رہی تھی۔

"ارے۔" وہ گھبرا گیا۔ "کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔ انگریز تو نہیں۔ ہندوستانی معلوم ہوتی ہے۔" ایک ساعت کے لئے وہ کھڑا دیکھتا رہا۔

دفعتاً اس گول کمرے سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ "ارے۔" وہ ضیاء تھا۔

رتی گن گلی

"آخاہ ضیاء ہے۔" ایلی چلایا۔ "یار ہمیں نمبر ۱۱۳ ملتا ہی نہیں تھا۔ دیر سے تلاش کر رہے ہیں۔"

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے ضیاء چپ چاپ کھڑا اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ایک ن کے بعد ضیاء بولا۔

"اس بلاک کے پچھواڑے میں ہے۔ ہمارا گھر۔"

ایلی اور ضیاء شہزاد کو ساتھ لے آئے اور ضیاء انہیں اس بلاک کے پچھواڑے کی طرف گیا۔ گول کمرے کے قریب پہنچ کر ایلی نے دیکھا کہ موسیقی بالکل بند ہو چکی ہے اور کمرے وئی بھی نہیں۔

ذکا انہیں بہت تپاک سے ملا۔ "آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔" وہ بولا۔

"ویسے ہی آ گئے تھے۔" شہزاد بولی۔ "تو ہم نے کہا آپ کو مل لیں۔"

"پھر بھی اطلاع دینا مناسب ہوتا ہے —— خواہ مخواہ آپ کو کوفت ہوئی۔" ذکاء نے بات بدلی۔

چند منٹ بیٹھنے کے بعد ایلی اور شہزاد نے اجازت طلب کی۔ "گاڑی چلنے میں صرف ایک رہ گیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

ضیاء اور ذکاء انہیں تانگے تک چھوڑنے آئے۔

جب وہ اکیلے رہ گئے تو شہزاد بولی۔ "ان کے گھر تو کوئی بھی عورت نہیں۔"

"ذکاء کی بیوی تو مر چکی ہے۔" ایلی نے کہا۔

"مجھے یہ بات یاد ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عورت ہوگی گھر میں۔" شہزاد بولی۔

ابھی ان کا تانگہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایلی تانگے والے سے بولا۔ "بھئی ذرا ٹھہرنا میں ذرا ٹ لے آؤں۔"

اور وہ اسی دکان پر سگریٹ خریدنے چلا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پتہ پوچھا تھا۔

پنواڑی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے بامعنی انداز سے کہنے لگا۔ "کیوں بھاجی گئے تمہیں وہ لوگ۔"

"جی۔" ایلی نے جواب دیا۔ "مل گئے۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا بھاجی۔" وہ بولا۔ "کہ وہی ہوں گے۔"

"نہیں۔" ایلی بولا۔ "وہ تو پچھلے بلاک میں رہتے ہیں۔"

"اجی وہی ہیں نا جو ابھی آپ کو تانگے تک چھوڑنے آئے تھے۔" پنواڑی بولا۔ "وہ بھائی ہیں اور ایک بہن بہت اچھا ناچتی ہے وہ بھائی خود سکھاتا ہے اسے ساری عمر مدراس میں رہا ہے نا وہیں سے سیکھ کر آیا ہے۔"

بھارت ستیم! ایلی کے روبرو گول کمرے کا بورڈ آ گیا۔

"آج ہی شو ہے بھاجی۔" پنواڑی بولا۔ "اپنے کیپٹل میں ہو گا۔ ہم بھی جا رہے ہیں۔ دیکھنے کے لئے۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

جب شہزاد کو ایلی نے پنواڑی کی بات بتائی تو وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

"لوگوں کا کیا ہے۔" وہ بولی "خواہ مخواہ بہتان لگاتے ہیں۔ اگر ان کی بہن ہوتی تو کیا وہ ہمارے سامنے نہ آتی۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے ان کے گھر اور گھر کی صورت ہی سے ظاہر تھا کہ کوئی عورت نہیں رہتی وہاں۔"

اس پر ایلی کو وہ لڑکی یاد آ گئی جو گول کمرے میں ناچ رہی تھی۔

"کیا وہی ان کی ہمشیرہ تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔" ایلی سوچنے لگا۔

"تو پھر آج کی رات ہم یہیں رہ جاتے ہیں۔" ایلی نے شہزاد سے کہا۔

"کیوں۔" وہ بولی۔

"وہ کہتا تھا آج شام کو ان کا شو ہے اور ان کی بہن ناچے گی۔ چلو آج دونوں شو دیکھیں گے۔"

شہزاد اس کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس کے بغیر انہیں حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا لہٰذا وہ مجبوری میں ایلی کی بات مان گئی۔

شام کو جب وہ کیپٹل میں پہنچے تو اشتہار میں لکھا تھا۔ بھارت ستیم کا شاہکار شریمتی گن گلی پیش کریں گی۔

شہزاد چلانے لگی۔ "ناچ دیکھنے کو اپنا جی چاہتا تھا اس لئے بہانہ بنا کر لاہور رک گئے۔"

ایلی خود حیران تھا۔ شریمتی گن گلی پڑھ کر وہ خود سوچ بچار میں کھو گیا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ وہی حسین و جمیل لڑکی جسے ایلی نے گول کمرے میں دیکھا تھا۔ سٹیج پر آئی۔ اس نے ناظرین کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر یورپین فیشن کے مطابق جھکی اور پھر تتلی کی طرح محو رقص ہو گئی۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ اعضاء میں بلا کی چمک تھی اور چہرہ مسکراہٹوں سے بھرپور تھا۔ ایلی بھول گیا کہ وہ کیوں شو دیکھنے آئے تھے اور انہیں کس بات کا پتہ لگانا تھا۔

شریمتی نے تین سولو ناچ پیش کئے۔ چوتھے ناچ میں اس کے ہمراہ ایک نوجوان تھا۔ نوجوان کو دیکھ کر شہزاد ٹھٹھکی۔ "یہ تو مجھے ضیاء معلوم ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"ضیاء؟" ایلی چونکا اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ ضیاء کون تھا ——— "اوہ ضیاء" کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔ "نہیں نہیں۔ کہاں ضیاء کہاں یہ لڑکا۔ یہ تو کوئی مدراسی معلوم ہوتا ہے۔"

چوتھے ناچ کے بعد انٹرول ہو گیا اور ذکاء بنفس نفیس سٹیج پر آ کر ناظرین کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

اگلے روز شاہ وال آتے ہوئے شہزاد گاڑی میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔

"آخر رونے کا مطلب۔" ایلی بولا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کہنے لگی۔

"ناچنا تو ایک فن سمجھا جاتا ہے۔" ایلی نے کہا۔ "یہ ناچ کوئی طائفہ ناچ تو نہیں ہے نا۔ پھر کیوں دل برا کرتی ہو۔"

"نہیں ایلی۔" وہ بولی۔ "وہ میری صبیحہ کو نچائیں گے۔ اس کے شو کریں گے۔"

"تو کیا ہوا۔" ایلی نے کہا۔ "یہ تو بھارت نیتم ہے۔ بھارت نیتم تو فن ہے۔ عیب تو نہیں۔"

"لیکن لوگ کیا کہیں گے۔" وہ بولی۔

"تم تو لوگوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی تھی۔" ایلی نے کہا۔

"اپنے لئے نہیں کرتی تھی نا۔" وہ بولی۔ "لڑکیوں کے متعلق پرواہ کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"تو کیا انہیں جواب دے دو گی۔ منگنی توڑ دو گی۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہائے تو کیا ناچوں کو دے دوں اپنی بچی۔" شہزاد نے جواب دیا۔

لاہور سے آنے کے بعد شہزاد پر مایوسی سی چھا گئی۔ ایک تو صبیحہ کی بنی بنائی بات ٹوٹ گئی تھی دوسرے وہ بچے سے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل کی تہوں میں بیٹھا ہوا غم چڑچڑاہٹ اور غصے میں بدل گیا۔ بات بات پر اس کا غصہ جوش میں آ جاتا اور پھر بھوکی شیرنی کی طرح کچھار میں بیٹھ کر غراتی رہتی۔ ایلی اس کی اس تبدیلی پر پیچ پا ہو جاتا ہے۔

وہ دن ان کے لئے نہایت تلخ تھے۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی۔ تاش اور چوپٹ کی بازی لگی رہتی تھی جہاں لڑکیاں ناچتی تھیں۔ بچے قہقہہ لگاتے تھے وہ گھر ویرانے میں بدل چکا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم ہو گئی تھیں۔ چونکہ ریاض اور کپور کی کوششوں کی وجہ سے ایلی کو بورڈنگ کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تھا اور اب وہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ کر سرکاری کوارٹر میں مقیم ہو گئے تھے اس طرح اسے کچھ مالی امداد حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا اور دوسرے ایک قلیل رقم الاؤنس کے طور پر ملنے لگی تھی۔

ناظم

انہی دنوں ڈائریکٹر تعلیم نے ان کے سکول میں ایک جونیر کلرک کی آسامی منظور کر دی تھی اور ایک نیا کلرک اس آسامی پر مامور ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک نوجوان بی اے تھا۔ اس کا نام ناظم تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ نہ تو بی اے نظر آتا تھا اور نہ اسے نظم سے کوئی تعلق معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ ناظم شادی شدہ نہ تھا اور شاہ وال میں نووارد تھا اس لئے اسے بورڈنگ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایلی اور وہ روزانہ ملا کرتے تھے۔

پہلے روز جب ایلی نے ناظم کی طرف دیکھا تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اگرچہ ناظم نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کا سوٹ گویا سوٹ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت سوٹ اور بی اے دونوں سے بے نیاز تھی۔ ناظم اے بی کورس کا گریجویٹ تھا۔ جب ایلی کو اس تفصیل کا علم ہوا تو وہ اور بھی حیران ہوا اس کے علاوہ جب اسے یہ علم ہوا کہ ناظم ریاضی پڑھانے میں بڑی دسترس رکھتا ہے تو ایلی بالکل ہی کھو گیا۔ شخصیت کو سمجھنے کے متعلق ایلی کو اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا اس کا خیال تھا۔ کہ وہ شخصیت اور کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناظم کو دیکھ کر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔

ناظم کے چہرے سے ذہانت کے آثار مترشح نہیں ہوتے تھے۔ اس کے خدوخال عام سے ے کے باوجود یہ احساس دیتے کہ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا فرق تھا قدر ہلکا کہ کسی وقت دکھائی نہ دیتا اور نہ محسوس ہوتا لیکن کسی وقت وہ اس قدر شدت سے ہوتا جیسے ڈھول بجا بجا کر اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔

ناظم سے چار ایک مرتبہ ملنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجموعہ اضداد تھا۔ مثلاً کے چہرے پر ذہانت کا فقدان تھا۔ اس کے باوجود وہ اکثر ذہانت بھری بات کرتا اور ایلی حیرانی اس کی طرف دیکھتا۔ ناظم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سوسائٹی سے دور ناپسند کرتا ہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایلی نے دیکھا کہ بورڈنگ کے تمام لڑکے اس کے گرد ٹ کئے بیٹھے ہیں تمام لڑکے تھوڑے ہی عرصے میں ناظم کے مداح ہو گئے تھے۔ اور اس کے و قابلیت کے متعلق سارے سکول میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ناظم کے چہرے پر ہٹو رہو قسم کی علامات ہر وقت موجود رہتی تھیں جو لوگوں سے میل جول پیدا کرنے میں رکاوٹ رہتیں۔ اس میں ایک واضح جھجک تھی۔ لیکن درحقیقت اس کا دل جذبات کی شدت سے بھرا تھا۔ اسے دیکھ کر شک پڑتا کہ وہ جذبات سے خالی ہے اور حسیات سے کورا ہے لیکن قیقت جذبات اور خصوصاً شدت اس کے کردار کے بنیادی پہلو تھے۔

بی اے ہونے اور سوٹ پہننے کے باوجود ناظم کی طبیعت امرتسر کے "بھاجی۔" قسم کی تھی۔ بہترین دوست اور بدترین دشمن ہوتے ہیں جو دکھلاوے سے دور بھاگتے ہیں اور کسی کا رعب اشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ناظم اور ایلی کی دوستی روز بروز بڑھتی گئی اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم پر عائد ہوتی تھی۔ روز شام کے وقت وہ ایلی کو آواز دیتا۔ "آصفی صاحب۔" اور پھر اسے ساتھ لے کر باہر نکل ایلی سیر و تفریح کا مشتاق نہ تھا۔ اس لئے وہ شامیں گھر پر ہی بسر کرنے کا عادی تھا۔ عام طور پر اپنا وقت مطالعہ میں بسر کرتا۔ ناظم زبردستی اسے باہر لے جاتا اور وہ دیر تک گھومتے رہتے۔ کہ ناظم میں دلچسپی محض کتابی قسم کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہتا تھا۔ اسے ایسی عجیب و غریب شخصیت سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

ناظم کو بازار میں کھانے پینے کی بہت عادت تھی۔ مثلاً وہ سوڈا پینے کھڑا ہوتا تو سوڈے کی بوتلیں پی جاتا کباب کھانا شروع کرتا تو دو درجن کباب کھا جاتا پہلے روز ہی جب اس نے دو

درجن کباب کھائے اور اس کے اوپر تین میٹھی بوتلیں پیں تو ایلی گھبرا کر بولا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں ناظم صاحب۔"

"یار۔" اس نے کہا۔ "بہت دکھ لگا ہوا ہے آج۔"

"دکھ۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ "دکھ لگا ہو تو بھوک نہیں لگتی۔"

"مجھے تو بہت لگتی ہے اتنی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں پیٹ میں جھونک دوں۔ اندر ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو بھرتا ہی نہیں" ناظم نے جواب دیا۔

"کیا واقعی؟"

"ایمان سے۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب کہاں۔" وہ بولا یہ تو میرا دستور ہے بچپن سے ہی ایسا ہے۔"

"آج کیا غم ہے تمہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"میرا دوست بیمار ہے۔" ناظم بولا۔

"دوست بیمار ہے؟ کون سا دوست؟"

"آج ہی خط آیا ہے ساری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔" ناظم بولا۔

"ارے بس اتنی سی بات پر غم ہے تمہیں۔"

"اتنی سی بات۔" اتنا ناظم نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ "دوست کی بیماری سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے۔"

ایلی حیران تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ناظم کی آنکھوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور تجربے کی بنا پر ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں کا زاویہ جذبات کی شدت کی وجہ سے بدلتا ہے۔ ایسی صورت میں ناظم سے عقل کی بات کہنا اچھے اثرات پیدا نہیں کر سکتا۔ بہرحال ناظم کے آنے سے ایلی کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

نصیر اور شیر

پھران کے گھر نصیر اور شیر علی آ گئے۔

شیر اور نصیر ایلی کے بھائی تھے وہ دونوں راجو کے بطن سے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ شیر

علی راجو کے پہلے خاوند سے تھا اور جب وہ علی احمد کے گھر آئی تھی تو اس کی گود میں تھا۔ اور نصیر علی احمد سے تھا۔

نصیر اس زمانے کی پیداوار تھا۔ جب علی احمد بڑھاپے کے اولین دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس لئے علی احمد نے غیر از معمولی محبت سے پالا تھا۔ اگرچہ یہ محبت خصوصی محبت تھی۔ جس میں علی احمدیت کی جھلک تھی۔ لیکن اس کے باوجود نصیر کی جسمانیت یا شخصیت پھل پھول نہ سکی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ جذباتی کمزور اور نیکی کی طرف مائل تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کیا کرتا تھا۔ ماں باپ کا احترام کرتا تھا اور ایلی سے بہت متاثر تھا۔

نصیر کے برعکس شیر علی جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ اس کے جسم کے ساخت ہی اس بات کو واضح کرتی تھی کہ وہ آصفیوں میں سے نہیں اور علی احمد کے خاندان سے ہٹ کر ہے وہ طبعاً" خاموش تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دل کی بات چھپا کر رکھتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ بڑا آدمی بنے۔ شیر علی میں جنسی پہلو کی شدت تھی اور اس شدت میں پراسراریت کا عنصر تھا۔

دسویں پاس کرنے کے بعد شیر علی دوراہے میں ایک ٹیکنیکل کورس کرنے کے لئے چلا گیا تھا اور ایک سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کا قد بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا ہو۔ وہ گھر کی کسی بات میں باآواز بلند دخل نہیں دیتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ گھر میں اس کی پوزیشن ایسی نہ تھی۔ جیسے ایلی یا نصیر کی تھی یا شاید طبعاً" وہ بات کہہ دینے کی صلاحیت سے بے گانہ تھا۔ لیکن ایلی محسوس کرتا تھا کہ اس کے دل کی تہوں میں ان کہی باتوں کا طومار لگا ہے۔ ایلی کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو پسند نہ تھا۔

دوراہے سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد علی پور آتے ہی شیر علی کو ایلی کی پرانی منگیتر ثمو کی چھوٹی بہن عاصمہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو خفیہ خط لکھا کرتے تھے اور لب بام کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اشارے کیا کرتے تھے۔ لیکن شیر علی نے اس کے متعلق کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔

شیر علی کو محلے والے ہمیشہ بیگانہ سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ آصفیوں میں سے نہ تھا۔ حالانکہ محلے

میں بیشتر لوگ ایسے تھے۔ جنہیں آصفی خاندان سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ کیونکہ بہت سے لوگ باہر سے آکر وہاں مقیم ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے متعلق کبھی صحیح جائزہ نہ لیا تھا۔

شیر علی کے رومان کی بات باہر نکلی تو عاصمہ کی والدہ غصے سے بھوت بن گئی۔ اسے پہلے ہی علی احمد کے خاندان کے خلاف شکایت تھی۔ چونکہ ایلی نے اعلانیہ اس کی بڑی بیٹی ثمرہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں منسوب تھے اور ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔

اب جب اسے علم ہوا کہ شیر علی جان بوجھ کر عاصمہ کو ورغلا رہا ہے۔ تو وہ سمجھی کہ شیر علی کا مقصد صرف اس کے گھرانے کو بدنام کرنا ہے۔

ایلی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ راجو سے بات کرنے کے بعد خود عاصمہ کی والدہ زبیدہ سے ملا اور اس نے کوشش کی کہ زبیدہ شیر علی اور عاصمہ کی شادی پر رضامند ہو جائے اس پر زبیدہ کو اور بھی غصہ آیا۔ ایلی کی اتنی ہمت کہ وہ شیر علی کا پیغام لے کر آئے جب کہ اس نے ثمرہ کے سلسلے میں اس سے اس حد تک بدسلوکی کی تھی کہ آخر وہ ثمرہ کو نور علی سے بیاہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالانکہ ثمرہ اور نور علی میں بیس پچیس سال کا فرق تھا اور نور علی کی پہلی شادی سے ایک بیٹی تھی جس کی عمر ثمرہ سے کم نہ تھی۔

نصیر اور شیر علی بہت دیر کے بعد ایلی سے ملے تھے۔ کیونکہ شہزاد اور ایلی تو بن باسیوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے اور محلے میں نہیں جا سکتے تھے۔ نصیر بڑی محبت سے ایلی کو ملا شیر علی اپنی طبیعت کے مطابق خاموش تھا اگرچہ اس کے انداز میں رسمی ادب اور اخلاق بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ دونوں دو ایک روز شاہ وال رہے اور پھر واپس علی پور چلے گئے۔

ان کے جانے کے چند روز بعد ایک دن صبح سویرے ہی لڑکیوں نے ایلی کو جگایا۔ "امی کی طبیعت اچھی نہیں۔" انہوں نے کہا۔ ایلی شہزاد کی طرف گیا۔ شہزاد نے اٹھنے کی کوشش کی اور دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گئی —— ایلی گھبرا گیا۔ اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔ لڑکیاں سہم گئیں۔

جب وہ ڈاکٹر کو لے کر آیا تو دیکھا کہ شہزاد چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے اور اس کے پاس چارپائی پر ایک بچہ چپ چاپ پڑا ہے۔ لڑکیوں کے پاس ان کی پڑوسن بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

ایلی نے غور سے بچے کی طرف دیکھا۔

اس کے سامنے ڈاکٹر ہاشم آ کھڑا ہوا۔ "یہ بچہ۔" وہ بولا۔ "بہت کچھ لائے گا۔ بہت کچھ، عالی ظرف عالی۔ عالی۔" ایلی کے کانوں میں ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔

"عالی۔" ! ایلی نے بچے کی طرف دیکھا۔

"اور تم لڑکی۔" ہاشم نے شہزاد کی طرف دیکھا۔ "تم چلی جاؤ گی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" شہزاد نے نگاہیں جھکالیں۔

ایلی باہر جنگلے میں نکل گیا اور کھڑکی میں سے سٹیشن کی طرف دیکھنے لگا۔ سٹیشن پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر چل رہے تھے اس کے باوجود ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے تمام دنیا پر جمود طاری ہو۔ جیسے لوگ نیند میں چل رہے ہوں۔

عالی کی آمد کے بعد ایلی کے گھر میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شہزاد کی بدمزاجی دور ہو گئی۔ لڑکیاں عالی میں کھو گئیں۔ سارا دن وہ اسے کھلاتیں۔ اٹھائے پھرتیں۔ عالی کے آنے سے گھر میں ایک بار پھر زندگی پیدا ہو گئی۔

ایک مرتبہ شہزاد اور ایلی کو لاہور جانا پڑا۔

محمود اور نفلیہ

جب وہ لاہور سے لوٹے تو شاہ وال میں محمود ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ان دنوں محمود بی اے کر چکا تھا۔ اب وہ لاہور میں محکمہ تعلیم کے ہیڈ آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ ایلی محمود سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وہ پرانے ساتھی تھے اور جب بھی آپس میں ملتے تھے علم و ادب کے علاوہ نفسیات پر بحث کرتے یا پرانی باتوں کو دہرا دہرا کر ہنسا کرتے۔

شام کے وقت محمود اور ایلی دونوں سیر کے لئے باہر نکل گئے۔ تو محمود نے بات چھیڑ دی۔ کہنے لگا۔ "ایلی یار تم ان لڑکیوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ اس گھر میں خوش نہیں ہیں۔"

شادی کی بات تو خیر ٹھیک تھی۔ لیکن یہ سن کر وہ گھر میں خوش نہیں ایلی چونکا۔

"خوش نہیں ہیں۔" ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوش نہیں۔"

محمود اپنے پراسرار انداز سے مسکرایا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی شخصیت میں ایک

عجیب سی پراسراریت تھی۔ وہ بات کھل کر نہیں کرتا تھا۔

"انہوں نے مجھے خود بتایا ہے۔" وہ بولا۔

"خود بتایا ہے۔" ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ شرماتے ہوئے بولا۔ "جب میں کل یہاں پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ تم گھر پر نہیں ہو تو تمہاری غیر حاضری میں میں نے تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن۔" ——— وہ رک گیا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ "انہوں نے خود مجھے ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ میرا مطلب ہے۔" وہ مسکرایا۔ "نو فاؤل پلے آفسٹ اور پھر رات کو نفیسہ میرے پاس آ گئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔ روتی رہی۔" ایلی نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ انکی زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اور ان کا مستقبل تاریک ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد ان کی شادیاں ہو جائیں تاکہ وہ اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔" محمود نے کہا۔

"لیکن شہزاد اور میں -----" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

"اونہوں۔" محمود بولا۔ "تم دونوں لڑکیوں کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی حقیقت ہے۔"

"تو کیا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔" ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔" محمود بولا۔ "اور اسی پہلو کے تحت وہ میرے پاس آئی تھیں۔ صبیحہ اندر دروازے میں کھڑی رہی اور نفیسہ میرے پاس آ بیٹھی اور وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے۔" ایلی نے کہا۔ "صبیحہ کے لئے رشتہ آیا تھا۔"

"ہاں وہ ناچے۔" وہ بولا۔ "مجھے انہوں نے سب بتایا تھا۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔" ایلی نے پوچھا۔

"نفیسہ کا نکاح کر دو۔" محمود بولا۔

"لیکن کس سے۔" ایلی نے پوچھا۔

محمود مسکرایا ——— "تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں اس کا تمام خرچہ برداشت کروں گا اور جب تک وہ چاہے گی اسے تعلیم دلاؤں گا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔"

"تم ———" ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "میں! مجھ پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔"

"لیکن لیکن۔" ایلی بولا۔ "کیا وہ رضامند ہو جائے گی۔"

"کون۔" محمود نے پوچھا۔

"نفیسہ اور کون۔" ایلی نے جواب دیا۔

"نفیسہ رضامند ہے۔" محمود نے کہا۔ "بلکہ وہ خود چاہتی ہے اور میں اسی کے کہنے پر تم سے بات کر رہا ہوں۔"

ایلی کو دھچکا سا لگا۔ اسے محمود کے خلاف شکایت نہ تھی اسے لڑکیوں پر حیرت تھی "دیکھو محمود۔" وہ بولا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ نفیسہ اس بات کی خواہاں ہو اور اگر وہ خواہاں ہے تو شہزاد کو میں منالوں گا۔"

محمود کے جانے کے بعد ایلی نفیسہ کو ایک طرف لے گیا۔

"نفیسہ۔" اس نے بات شروع کی۔ "نفیسہ ایک بات بتاؤ مجھے۔"

نفیسہ نے پراسرار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"شرمانے کی کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "جو بھی تمہاری صحیح رائے ہو وہ مجھے بتا دو چونکہ میں تمہاری رائے کے بغیر تمہاری رضامندی کے بغیر کچھ نہ کروں گا۔"

نفیسہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔"

وہ چپ چاپ بت بنی کھڑی رہی۔

"اگر تمہاری شادی محمود سے کر دی جائے تو تمہیں اعتراض تو نہ ہو گا۔" ایلی نے پوچھا۔

نفیسہ جوں کی توں چپ چاپ کھڑی رہی۔

"جواب دو نا۔" وہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "اگر تم نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم رضامند ہو۔"

وہ جوں کی توں خاموش کھڑی رہی۔

"اچھا۔" ایلی نے کہا۔ "تو فکر نہ کرو میں کوشش کروں گا کہ تمہاری شادی محمود سے ہو جائے۔ فکر نہ کرو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔"

اس شام وہ بغور نفیسہ کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ نفیسہ خوش تھی۔

اسی رات جب ایلی نے شہزاد سے بات کی تو وہ بگڑ گئی بولی۔ "کیا ہر نتھو خیرا کے لئے میری ہی لڑکیاں رہ گئی ہیں۔" ایلی نے التزاماً اسے حالات سے آگاہ نہ کیا تاکہ نفیسہ کی شکایت کا پہلو نہ نکلے۔

ایلی کو محمود اور نفیسہ کی شادی سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس سلسلے میں صرف اس لئے کوشش کر رہا تھا کہ نفیسہ چاہتی تھی کہ وہ محمود کی ہو جائے۔ ایلی نے شہزاد کو سمجھایا بجھایا اور رضامند کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز محمود کا نفیسہ سے نکاح ہو گیا۔

محمود ایلی کے گھر میں دس روز نفیسہ کے ساتھ رہا پھر اس نے نفیسہ کو زنانے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا چونکہ نفیسہ کا مطالبہ تھا کہ اسے بورڈنگ میں داخل کرا دیا جائے تاکہ وہ بورڈنگ میں محنت کر سکے اور دسویں پاس کر لے۔

جب دسویں کا امتحان ہو چکا تو محمود نفیسہ کو لینے کے لئے آ گیا اس نے اسے لاہور کالج میں داخل کرانے کے جملہ انتظام کر رکھے تھے۔

جب ایلی نفیسہ کو بورڈنگ سے لینے گیا تو نفیسہ نے آنے سے انکار کر دیا۔ پھر سکول کی استانیاں اکٹھی ہو گئیں اور وہ ایلی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ سمجھتی تھیں کہ نفیسہ کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔

ایلی حیران تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔

اس نے شور مچا دیا حتیٰ کہ سکول کی عزت کے خیال سے انہیں نفیسہ کو باہر بھیجنا ہی پڑا۔

ایلی نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ "یہ کیا حماقت ہے نفیسہ! تمہاری شادی ہو چکی ہے تم دس روز اکٹھے رہ چکے ہو اور اب —— لیکن یہ شادی تو تمہاری رضامندی سے کی گئی تھی۔" نفیسہ نے چلتے چلتے زور سے جھٹکا مارا اور ہاتھ چھڑا کر بورڈنگ کی طرف بھاگی۔

طلاق

جب وہ گھر پہنچا تو شہزاد یوں کھڑی تھی۔ جیسے شیرنی کچھار میں کھڑی ہو وہ غصے سے کانپ

رہی تھی۔ "اگر اپنا بھلا چاہتے ہو" وہ بولی "تو ابھی میری بیٹی کو طلاق دلواؤ۔ ورنہ۔"

"تو کیا تم بھی ——" وہ شہزاد کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگا۔

"تم نے میری بچی کو ایک بدمعاش کے ہاتھ بیچا ہے۔" شہزاد بولی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو۔" ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں کہہ رہی ہوں۔" شہزاد بولی۔

"تم نے اپنی بیٹی سے پوچھا ہے کیا۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

شہزاد کے عقب میں صبیحہ اور ریحانہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

فرش پر عالی بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ "ابو ابو۔"

شہزاد گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ بورڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔

"غصہ میں نہ آؤ۔" محمود ایلی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"تم جاؤ محمود۔" وہ بولا۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہونے والا ہے تم چلے جاؤ۔"

"کیوں۔" وہ بولا۔

"بات بڑھ جائے گی۔" ایلی نے کہا۔ "بہت بڑھ جائے گی اگر تم یہیں رہے تو۔"

"ہوں یہ تو ٹھیک ہے۔" محمود نے لپک کر اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"میں تمہیں اطلاع دوں گا۔" ایلی نے کہا۔ محمود چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

ایلی صحن میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ وہ شہزاد کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ سب یک لخت کیوں بدل گئے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ جو ہو رہا تھا۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔

باہر محلہ سنسان پڑا تھا۔

دور کتے بھونک رہے تھے۔

کمرے میں لڑکیاں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

پلنگڑی پر عالی بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس کا منہ ایلی کی طرف تھا۔

دفعتاً شہزاد داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ نفیسہ تھی اور سکول کی ایک ادھیڑ عمر کی استانی۔

ایلی انہیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

شہزاد خاموش تھی۔ نفیسہ آتے ہی لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے اندر سے کنڈی لگا لی۔

استانی بولی۔ "بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کا فیصلہ کرا دیں۔" اس کا روئے سخن ایلی کی طرف تھا۔

"آپ سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی شادی زبردستی کی گئی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

"لڑکی یہی کہتی ہے۔" وہ بولی۔

"اور وہ ٹھیک کہتی ہے۔" شہزاد بولی۔ "لڑکی کو دھوکے سے پھانس لیا گیا ہے۔"

"لڑکی کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لیجئے۔" ایلی نے استانی سے کہا۔

"وہ سامنے نہیں آئے گی۔" شہزاد دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ایلی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"بس نہیں آئے گی۔" وہ غرائی۔

"کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔" ایلی نے استانی سے کہا۔ "میں نے یہ رشتہ لڑکی کی منشا کے مطابق کیا ہے۔ بلکہ اس کے اشارے پر کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"بالکل غلط ہے۔" شہزاد بولی۔ "بالکل غلط۔ یہ شادی ایک سازش تھی۔ بہتر یہی ہو گا کہ فوراً اسے طلاق دلا دی جائے۔"

"ورنہ ——" ایلی بولا۔

"ورنہ میں طوفان کھڑا کر دوں گی۔" شہزاد چلائی۔

"ہوں۔" ایلی بولا۔ "طلاق مل جائے گی لیکن ہمارا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں رہے گا۔ تمہیں منظور ہے۔"

اس نے پوچھا۔

"منظور ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

ایلی اندر چلا گیا۔ اس نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے بند کئے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر آیا۔ "آیئے۔" وہ استانی سے کہنے لگا۔ "میں آپ کو بورڈنگ تک چھوڑ آؤں۔"

شہزاد نے ایک مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ایلی خالی دھمکی رہا ہے۔

"طلاق تمہیں مل جائے گی۔" ایلی نے دہرایا۔ "خرچ بھی ملتا رہے گا۔ حسب توفیق۔"

"لیکن آپ جائیں گے کہاں۔ اس وقت۔" استانی نے پوچھا۔

"میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا جہاں اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود دس دن کے بلاوجہ طلاق مانگی جائے۔" ایلی نے جواب دیا۔

شہزاد دونوں بازو کولہوں پر رکھ کر صحن میں کھڑی ہو کر ایلی کو گھورنے لگی۔

"ایسا نہ کیجئے۔" استانی نے کہا۔

"تو کیا یہاں رہ کر بے عزتی کی زندگی بسر کروں۔" وہ بولا۔

"اب تو عزت والے بن بیٹھے ہو۔" شہزاد چلائی

"لڑنا بیکار ہے۔" وہ بولا۔ "صرف ایک بات پوچھتا ہوں کیا تم طلاق مانگتی ہو۔ تم چاہتی ہو نفیسہ طلاق لے لے۔"

"چاہتی۔" وہ غرائی۔ "میں دیکھوں گی کہ کیسے نہیں ہوتی طلاق" "اس کی کیا وجہ ہے۔" ایلی پوچھا۔

"تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ غرائی۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "مجھے کوئی تعلق نہیں تو خدا حافظ۔" ایلی باہر نکل گیا۔

"ابو۔ ابو۔" عالی سوتے سوتے جاگ پڑا —— "ابو" وہ رو رہا تھا۔ ایلی بھاگ رہا تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں عالی کی چیخیں سن کر وہ واپس جانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ابو ابو ایک چکی ہونک رہی تھی۔

ابو۔ ابو ریل نہ جانے کدھر جا رہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں سر دبائے چپ چاپ ڈبے میں بیٹھا

انجام

کہاں جاؤں

ایلی چپ چاپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اس
ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

شہزاد کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ بلا سوچے سمجھے سٹیشن کی طرف چل پڑا تھا۔ آدھی رات
عالم تھا۔ اس وقت وہ ریلوے سٹیشن کے سوا کہاں جا سکتا تھا۔ اس لئے ان جانے میں وہ ادھر چل
دیا۔ اور وہاں پہنچ کر پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

پھر نہ جانے کب گاڑی آگئی اور ٹکٹ لئے بغیر سوچے سمجھے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی
چل پڑی اور وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

اس نے شانے پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ چونکا۔ پاس ایک وردی پوش بابو کھڑا تھا۔ ایلی نے بابو
کی طرف دیکھا۔

ٹکٹ بابو نے کہا: "ٹکٹ۔"

"ٹکٹ۔" ایلی نے تعجب سے دہرایا۔

اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہے۔

"ہاں ٹکٹ۔" ایلی نے پھر دہرایا اور جیب ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس
کے پاس تو کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔

"ٹکٹ تو نہیں۔" وہ بولا۔

"کہاں جانا ہے۔" بابو نے پوچھا۔

"شاہوال سے آیا ہوں۔" وہ بولا۔

"جانا کہاں ہے۔" بابو چلایا۔

"یہ گاڑی کہاں جائے گی۔" ایلی نے پوچھا۔

بابو نے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے۔"

"مجھے۔" وہ بولا۔ مجھے تو کہیں بھی نہیں جانا۔"

اس کے ہمراہی مسافر قہقہہ مار کر ہنس رہے تھے۔

"تو گاڑی پر سوار کیوں ہوئے۔" بابو بولا۔

"پتہ نہیں۔" ایلی گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔

"کرایہ نکالو۔" بابو نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

ایلی نے جیب ٹٹولی۔ اس کی جیب میں صرف سات روپے آٹھ آنے تھے۔

"میرے پاس صرف یہ ہیں۔" ایلی نے کہا۔

بابو نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیا ہے تمہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "تم عادی بے ٹکٹے نظر نہیں آتے۔"

"جی نہیں۔" ایلی بولا۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"اچھا تو پھر اگلے سٹیشن پر اتر جانا۔"

"جی اچھا۔"

بابو نے اپنی کاپی بند کر لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایلی پھر اپنے خلا میں کھو گیا۔

اگلے جنکشن پر بابو نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ "چلو اترو۔" وہ بولا۔

ایلی نے سوٹ کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

"اب کہاں جاؤ گے۔" بابو نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"واپس شاہوال کیوں نہیں جاتے۔"

ایلی نے نفی میں سرہلا دیا۔

پھر وہ پلیٹ فارم پر ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ بابو اسے دور کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی چل پڑی۔ ایلی جوں کا توں بت بنا بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر بابو پھر سے گاڑی پر چڑھ گیا۔

دیر تک ایلی وہیں بیٹھا رہا۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر ایلی چونکا۔ ذہن میں حرکت سی ہوئی۔

"ابو ابو——" عالی اس کی طرف ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پھر دھندلکے سے ایک شکل ابھری: "تم نے میری بیٹی کو بیچا ہے۔" کوئی چلائی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے سینے میں کٹار سی بھونک دی ہو گھبرا کر اٹھ بیٹھ اور چائے کے سٹال پر کھڑا ہو کر چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں میں؟ کہاں جاؤں؟

اس کے روبرو محمود آ کھڑا ہوا۔ "اونہوں۔" وہ بولا۔ "غصے میں نہ آؤ۔"

"محمود۔" کسی نے اس کے کان میں کہا۔ "محمود جو ہے۔"

"اونہوں۔" ایلی نے نفی میں سرہلایا۔

علی پور۔ رفیق۔ خانپور—— اس کی کانوں میں آوازیں آنے لگیں لیکن وہ نہ تو علی پو جانے کے لئے تیار تھا نہ لاہور نہ خانپور۔

"کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں؟" گاڑی ہونکتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔

ایلی کی توجہ گاڑی کی طرف منعطف ہو گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ گاڑی کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر دھندلی دھندلی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ مسافر کمبلوں اور چادرو میں لپٹے اونگھ رہے تھے۔

دفعتاً اس کی نگاہ گاڑی کی پلیٹ پر پڑی: "راجواڑہ پسنجر۔"

"راجواڑہ۔" اس نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر خلیق اس کے روبرو آ کھڑا ہو:

"الیاس صاحب۔ کبھی میرے پاس راجواڑہ آؤ۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔" ایلی کو یاد آیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی خلیق راجوڑے کے ہسپتال میں نوکر تھا۔ ایلی چپکے سے باہر نکلا۔ اس نے راجواڑے کا ٹکٹ خریدا۔ اور پھر سے اندر آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بوندا باندی

ایلی کو دیکھ کر خلیق حیران رہ گیا۔

"ارے الیاس بھائی ہیں۔" اسے یقین نہ آتا تھا کہ الیاس اسے ملنے راجواڑے آیا ہے۔

ہی واہ۔" وہ چلانے لگا۔ "یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی بے حد۔ یہ خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز الیاس آئیں گے۔ بڑی مہربانی کی بڑی عنایت ہے۔"

دیر تک خلیق چلاتا رہا۔ اظہار خوشی کرتا رہا۔ پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ ایلی وہ ایلی نہ جانے کیا بات ہے۔

"لیکن۔" وہ چلایا۔ "خیریت تو ہے۔"

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کوئی بات تو نہیں۔" خلیق نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں۔" ایلی نے ناامیدی اور مایوسی سے کہا۔

"آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائے گا۔ ایلی کو خلیق پر پورا اعتماد تھا۔ وہ بات سے پورے طور پر واقف تھا کہ خلیق کے دل میں ایلی کے لئے محبت ہے اور اس محبت احترام کا عنصر شامل ہے اور خلیق کسی واقعہ پر بھی ایلی سے بدظن نہیں ہو سکتا۔ پھر نہ جانے بات چھپانا چاہتا تھا کہ وہ شہزاد سے قطع تعلق کر کے چلا آیا ہے۔ اسے یہ بات کہنے کی نہ پڑتی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ اس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔

خلیق سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا اور دکھی ہے۔ چپ لگی ہے۔ کے بعد وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ جیسے وہ کچھ سمجھا ہی نہ ہو اور ایلی کا دل نے کے لئے اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

"الیاس صاحب۔" وہ بولا۔ "ایسی اچھی جگہ ہے یہ راجواڑہ کہ کیا بتاؤں۔ تاریخی اہمیت کا ہے۔ اگرچہ چھوٹا سا ہے لیکن مطالعہ کے لئے لاجواب شہر ہے۔"

پھر وہ ایلی کو شہر لے گیا۔

"یہ دیکھئے یہ راجواڑے کے محلات ہیں۔ منہدم ہو چکے ہیں پھر بھی واضح آثار ہیں اور یہ ہوتا ہے اس کے نیچے منوں سونا اور چاندی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ حکومت یہ آثار کھودنے پر

غور کر رہی ہے اور یہ دیکھئے یہ پرانے باغات ہیں۔ مغلیہ وقت کے کسی زمانے میں یہاں گورنر رہتا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ تھے اس زمانے میں راجواڑے کے۔ بے حد زرخیز جگہ ہے نا اس لئے اتنے باغات تھے یہاں کہ اسے باغ بستی کہتے تھے۔ یہ نام تو اب رکھا گیا ہے۔ پہلے اسے باغ بستی کہا جاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کا میوہ اُگتا تھا۔ بس ایک ہی وقت ہے یہاں سانپ بہت ہیں۔"

ایلی خلیق کی باتیں سنے بغیر ہوں ہوں کہتا رہا اور باغات دیکھے بغیر بہت خوب کہہ دیتا۔

دراصل ایلی راجواڑہ میں ہوتے ہوئے راجواڑہ میں نہ تھا۔ وہ ان دنوں کہیں بھی نہ تھا۔ نہ شاہوال میں نہ کہیں اور۔ اس کے ذہن میں وہی خلا پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو۔ نگاہ میں چاروں طرف ایک دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ گردوپیش اس دھندلکے میں اونگھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چیزوں میں وضاحت نہ تھی۔ حرکات بے جان اور نم آلود دکھائی دیتی تھیں جیسے سلوموومنٹ فلم چل رہا ہو۔ بازاروں میں دوکان دار اونگھتے دکھائی دیتے تھے۔ راہ گیر چلتے نہ تھے بلکہ لڑھکتے تھے۔ آہستہ آہستہ بے جان بے عزم طبعی طور پر ایلی کے غم کے کوائف ہی مختلف تھے۔ شدت غم میں اس کا ذہن خلا میں بدل جاتا۔ دفعتاً" چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا۔ پھر غم بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں گرتا۔ بوند بوند۔ بوند بوند۔ اور وہ بوندا باندی لگی رہتی۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں۔

ایلی کو صرف ایک ڈر تھا کہ کہیں خلیق راجواڑہ میں اس کی آمد کے متعلق کسی کو خبر نہ کر دے۔ اگر اس نے خبر کر دی تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شہزاد اسے منانے نہیں آئے گی لیکن ممکن ہے لوگ اسے سمجھانے کے لئے آ جائیں۔ وہ راجواڑے میں صرف اس لئے آیا تھا کہ کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ راجوڑے میں ہے۔ اس نے کپور کو بھی کوئی خط نہ لکھا تھا تا کہ شاہوال میں کسی کو علم نہ ہو کہ وہ راجواڑے میں مقیم ہے۔ اس نے اپنی چھٹی کی عرضی سراب کے نام بھیج دی تھی۔ جس میں ایک خط ملفوف کر دیا تھا کہ اس کی تنخواہ اس کے گھر شہزاد کو بھجوا دی جائے۔ یہ عرضی اس نے آر ایم ایس میں پوسٹ کی تھی۔

خلیق ہر وقت ایلی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ ہسپتال جاتا تو ایلی کو ساتھ لے جاتا۔ اسے اپنے کمرے میں بٹھاتا۔ اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا اور اگر اسے کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا ہوتا تو بھی ایلی کو ساتھ لے جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایلی کو اکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں چونکہ چند ہی روز میں خلیق کو یقین ہو چکا تھا کہ ایلی کی کیفیت معمولی سے بہت ہٹ کر

ذہنی حالت شدید بحران کی غماز ہے۔

پال سنگھ

راجواڑے میں پہلا وہ واقعہ جس نے ایلی کی توجہ کو خارجی دنیا کی طرف منعطف کیا راجپال متعلق تھا۔ راجپال سنگھ ایک قوی ہیکل سکھ تھا۔ وہ راجواڑے کی ایک بستی میں رہتا تھا۔

ایک روز جب ایلی اور خلیق شام کے وقت کواٹر سے باہر میدان میں بیٹھے تھے تو راجپال آگیا۔ آتے ہی وہ لڑکھڑایا، گرا اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ یاں اڑی ہوئی تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

خلیق گھبرا کر اٹھ بیٹھا: "کیوں کیا بات ہے۔" وہ چلایا۔

راجپال بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اس نے ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"تم بیمار ہو کیا؟" ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"اونہوں۔" راجپال نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اچھا بھلا ہوں ڈاکدار۔" وہ بولا۔

"تو پھر بات کیا ہے۔"

راجپال نے اشارہ کیا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

دیر تک وہ ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا رہا۔

"ڈاکدار۔" وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "میری جندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

"وہ تو کسی کی زندگی کا بھی نہیں۔" خلیق ہنسا۔

"نہیں ڈاکدار۔ یہ اور بات ہے۔" راجپال بولا۔ "بات یہ ہے کہ ایک نا ایک روج ناگنی ے کاٹ کر چھوڑے گی۔"

"ناگنی" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے غلطی سے ایک روج اس کے نر کو مار دیا۔ وہ دونوں نہر کے کنارے کھڑے ے پر ناگنی اوٹ میں تھی سو مجھے دکھائی نہ دی۔ دکھائی دے جاتی ڈاکدار تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔ گ اور ناگنی اکٹھے ہوں تو انہیں کچھ نہ کہنا چاہئے۔ جو ایک مرجائے تو دوسرا بدلہ لئے بغیر نہیں وڑتا۔ اکیلا ناگ ہو چاہے نر ہو یا مادہ جو چاہے کرو۔ چاہے وہ مرجائے چاہے جنجمی ہو جائے۔ ئی بات نہیں۔

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔ "تو پھر۔"

"پھر کیا۔ میں نے موقع پا کر ایک لٹھ مار دی۔ نر وہاں چت ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں ڈاکدار تو بوٹے کی اوٹ میں مدین ناگنی ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی پسینہ آ گیا۔ بس ڈاکدار۔ وہ روج اور آج کا روج ہے۔ جب باہر جاؤں تو مجھے پتہ ہوتا ہے کہ ناگنی دور نہیں۔ کہیں پاس ہی ہے۔ خبردار رہتا ہوں۔ لاٹھی بنا باہر نہیں جاتا۔ ایک پلٹ کے لئے بے خبر ہو جاؤں تو سمجھ لو معاملہ ختم ہو گیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد بولا:

"دن کے سمے تو کوئی بات نہیں۔ ناگنی چالاک ہے تو اپنے باجوؤں پر جی جو رہے۔ جو پاس آئے گی تو چھوڑتا میں بھی نہیں۔ پر رات جو باہر پڑ جائے تو سمجھ لو پھر وہ مجھے شہر پہنچنے نہیں دے گی۔ آج کچھ دیر ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی وہ۔ میں بھاگا۔ وہ بھی بھاگی۔ بس سمجھ لو گرو کی مہربانی ہے جو سلامت پہنچ گیا ورنہ آج کوئی صورت نہیں تھی پہنچنے کی۔" وہ لمبے سانس لینے لگا۔

"تو میں اس بات میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"بس ایک بات ہے۔" وہ بولا۔ "دو سلائیاں اس سرمے کی دیدو مجھے صرف دو سلائیاں۔"

"سرمے کی۔" ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ وہ جو کمپنی والوں کے پاس سرمہ ہے سانپ کے کاٹے کا۔"

"سرمہ ہے۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ "سانپ کے کاٹے کا سرمہ۔"

"ہاں بابو۔" راجپال بولا۔ "جس کو ناگ کاٹ جائے یا کیڑا سونگ جائے اس کی آنکھ میں سرمے کی سلائی لگا دیتے ہیں۔ بس سارا جہر بھسم ہو جاتا ہے۔"

"ارے۔ کیا یہ سچ ہے" ایلی نے خلیق سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" خلیق نے جواب دیا۔

"بالکل سچ ہے ڈاکدار جی۔" راجپال بولا۔

"تو پھر تم کمپنی والوں سے کیوں نہیں مانگتے۔"

"وہ نہیں دیتے بابو جی۔ وہ نہیں دیتے۔ ڈاکدار انہیں کہیں تو شاید دے دیں۔ میرے کہنے پر نہیں دیتے۔" راجپال نے کہا۔

"اچھا۔" ڈاکٹر بولا۔ "میں ان سے کہوں گا۔ تم کل پتہ کرنا۔"

راجپال کی بات پر پہلی مرتبہ ایلی کا وہ خلا ٹوٹ گیا۔ راجپال کی بات نے اس کی تمام توجہ کو ب کر لیا۔ اس کے دل میں بیسیوں سوالات پیدا ہوئے۔ کیا واقعی مادہ نر کا انتقام لیتی ہے؟ کیا وہ ن کا پیچھا کرتی ہے۔ کیا سانپ بھی سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور چالاکی سے وار کرتے ہ۔ کیا سانپ کے کاٹے کا علاج سرمہ بھی ہو سکتا ہے۔

د کیڑا

"سانپوں کی زندگی بے حد پر اسرار ہے" خلیق نے کہا۔

"ہاں" وہ بولا۔ ایلی کو ہاجرہ کا واقعہ یاد آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب ایلی علی پور میں شارٹ ہینڈ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس انے میں وہ بیشتر وقت شہزاد کے چوبارے میں بسر کیا کرتا تھا۔

ایک روز ہاجرہ نیچے تہ خانے میں اتر گئی اور دیر تک وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک رتی رہی تہ خانے میں وہ دوسرے چوتھے روز جایا کرتی تھی۔ انہوں نے گھر کا کاٹھ کباڑ وہیں کھا ہوا تھا۔

ہاجرہ تہ خانے سے واپس آ کر سیدھی شہزاد کی طرف گئی۔ نہ جانے اسے کیا کام تھا۔ وہ ئی باتیں کر رہی تھی کہ دفعتاً اس نے اپنی شلوار میں کوئی حرکت محسوس کی اور اپنا ہاتھ ادھر ھایا۔ پھر ہاجرہ نے ایک لمبی چیخ ماری اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ ایلی اور شہزاد حیرانی سے ا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چیخ سن کر رابعہ اور جانو بھاگی بھاگی اوپر آئیں۔

وہ سب ہاجرہ کی طرف لپکے۔

"ہائیں۔" وہ حیران رہ گئے۔ ہاجرہ کا منہ نیلا ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے نیلی سیاہی انڈیل دی چند ہی منٹوں میں سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا۔" محلے والیاں چلانے لگیں۔

"ہے۔ یہ تو نیلی ہو گئی۔" ایک بولی۔

"لیکن ہوا کیا ہے بہن؟"

"کیا پتہ کیا ہوا ہے۔ بس ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہے۔"

"ہٹ۔ وہ تو نیلی پڑ چکی ہے۔ سانپ سنپولئے نے تو نہیں ڈسا۔"

"پتہ نہیں۔" شہزاد بولی۔ "ہم نے تو نہیں دیکھا۔"

"ہٹے۔ ابھی تو آئی تھی تہہ خانے سے۔" فرحت روتے ہوئے بولی۔

ایک نے بڑھ کر ہاجرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ وہ مریضہ کو دیکھ کر رک گیا اور دور ہی سے دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" وہ بولا۔

"کچھ پتہ نہیں۔"

"چیخ مار کر گر پڑی اور پھر نیلی ہو گئی۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر بولا۔ "بہت زہریلا سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کس نے دیکھا ہے کیا؟"

"نہیں۔" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

"ٹانگ ننگی کرو۔" ڈاکٹر چلایا۔

انہوں نے ہاجرہ کی شلوار کے پائینچے اوپر کر دیئے۔ بائیں ٹانگ پر کچھ جگہ یوں ابھری ہوئی تھی۔ جیسے پھوڑا نکلا ہوا ہو۔ ڈاکٹر نے ایک تیز چاقو سے وہ پھوڑا کاٹنا چاہا لیکن چاقو لگتے ہی پھوڑا یوں کٹ گیا جیسے کیلا ہو۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔" وہ چیخنے لگا۔ "کوئی مریضہ کے جسم کو نہ چھوئے۔ اٹھو اٹھو۔" وہ اس عورت سے مخاطب ہوا جو ہاجرہ کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ "اٹھ بیٹھو ورنہ زہر تمہیں بھی چڑھ جائے گا۔"

اس عورت نے ڈر کر ہاجرہ کا سر نیچے دھکیل دیا۔ اور خود اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کے دھڑ میں سکت نہ رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی توجہ ہاجرہ سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ چار عورتوں نے اسے اٹھایا اور اندر چارپائی پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر بولا: "اسے فوراً دفنا دو۔ ورنہ کچھ دیر کے بعد اس کا جسم پھٹے گا اور جہاں جہاں چھینٹے پڑیں گے وہاں وہاں زہر پہنچے گا۔ لے جاؤ لے جاؤ۔" وہ چلایا۔ "سب چلی جاؤ۔ مریضہ کے پاس کوئی نہ ٹھہرے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سب عورتیں بھاگ گئیں۔ صرف شہزاد' فرحت' رابعہ ایلی اور جانو رہ گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

ہ کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا اور اس کے جسم کا گوشت گویا ابل رہا تھا۔ عین اس وقت ایک سپیرا ڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔

"کس کو کاٹا ہے کیڑے نے۔" وہ بولا۔

ایلی نے حیرانی سے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اب یہ کیا کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

سپیرے کی نگاہ ہاجرہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت بھری مسکراہٹ چمکی۔ "ہا وہ دیوانہ وار چلایا۔ اس نے اپنی بنچی نیچے پھینک دی۔ "آج تو نند کیڑا کے درشن ہو ے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔" وہ چلانے لگا۔

سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

"کوئی سونٹا دو۔" وہ بولا۔

"جاؤ۔ دودھ گھی اور کالی مرچ کا انتجام کرو۔ یہاں کوئی نہ رہے۔ گرو چاہے تو آج دودھ دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

سپیرے نے سب کو چوبارے سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی لگا لی اور بیٹھ کر نہ جانے کیا ا جنتر منتر پڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹی تھی۔ سامنے دودھ کا بھرا ہوا برتن تھا۔ وہ بار سوٹی سے ہاجرہ کو چھوتا۔ اور پھر چند ایک مرتبہ چھونے کے بعد سوٹی کو دودھ میں ڈال دیتا۔ وقت عجیب سی آواز پیدا ہوتی جیسے آگ میں سرخ کئے ہوئے لوہے کو پانی میں ڈالتے ہیں تو ا ہوتی ہے۔ کوئی دو گھنٹے تک وہ ہاجرہ کی لاش کے پاس بیٹھا وہی عمل دہراتا اور منتر پڑھتا رہا — پھر دفعتاً ایک لمبی چیخ سنائی دی۔ ایسی ہی چیخ جیسی ہاجرہ نے بے ہوش ہوتے وقت ی تھی۔ چیخ سن کر وہ سب بھاگ کر کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے۔ ہاجرہ کا رنگ سیاہ سے نیلا چکا تھا۔ ہلکا نیلا۔ اور وہ حرکت کر رہی تھی۔

سپیرا چلا رہا تھا۔ آہاہا۔ گرو کی دیا سے نند کیڑا کا بھوشن مل گیا۔ ہاہاہا۔ "سامنے پڑا ہوا دودھ کٹورہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سپیرے کے ہاتھ کی چھڑی بھی اگلے سرے سے جلی جلی دکھائی دے رہی تھی۔

ک دیوی

چار ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے اسے اٹھا کر اندر چارپائی پر

ڈال دیا۔ سپیرا اپنی گٹھڑی سنبھال رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ پھر اس نے بغچی سے ایک بڑی سی ڈبیہ نکالی اور دو لکڑیوں کی مدد سے ہاجرہ کی ٹانگ کا وہ پھوڑا اٹھا لیا۔ جسے ڈاکٹر نے قینچی سے کاٹا تھا۔ سپیرے نے گوشت کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک سیاہ تھا اٹھا کر ڈبیہ میں ڈال لیا۔

"تمہاری کیا خدمت کریں؟" ایلی نے باہر نکل کر سپیرے سے کہا۔

"تم کیا سیوا کرو گے بابو۔" وہ بولا۔

"پھر بھی ——۔" ایلی نے کہا۔

"اونہوں۔" سپیرا مسکرایا۔

"کچھ تو لے لو۔" شہزاد نے پانچ ایک دس دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

"لڑکی تمہیں تو صرف بڑھیا کا جیون ملا ہے پر مجھے گرو کی دیا سے ساری جیون شکتی مل گئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔" اس نے اپنی ڈبیا کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اب چلتا ہوں۔"

دفعتاً" وہ رک گیا۔ "اے لڑکی۔" وہ بولا۔

"کیا ہے۔" فرحت نے کہا۔

"تو نہیں۔" وہ بولا۔ "یہ جو دوسری والی ہے۔ ذرا منہ میری طرف کرو۔"

شہزاد نے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ شہزاد کے ماتھے کے تل پر پڑی۔ "آہا۔" وہ بولا —— "تیرے تو ماتھے پر نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔ یہ لے کیا یاد کرے گی کہ سپیرے نے کیا دان کیا تھا۔" اس نے ایک اور ڈبیہ سے چند سیاہ مرچیں نکالیں اور شہزاد کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔: انہیں کھالے۔ ابھی کھا۔"

شہزاد نے نفرت سے ان گندی مرچوں اور سپیرے کے غلیظ ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر ہچکچاتے ہوئے دو مرچیں منہ میں ڈال لیں۔

سپیرے کے جانے کے بعد اس نے باقی مرچیں پھینک دیں۔

ہاجرہ رو بصحت ہونے لگی۔ سپیرے کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ تک وہ اسے دودھ اور گھی پلاتے رہے۔

جب وہ تندرست ہوئی تو خود ہی کہنے لگی: پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس روز بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ایک لٹھ میرے سر میں دے ماری ہو۔ پھر پتہ

ں مجھے کیا ہوا۔ پھر جب میں ہوش میں آئی تھی تو بھی میں نے محسوس کیا تھا جیسے کسی نے لٹھ
ے سر پر دے ماری ہو۔"

ہاجرہ بالکل صحت مند ہو گئی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک اگر اسے کوئی بھڑ یا کوئی زہریلا
ر کاٹتا تو معاً" مرجاتا اور ہاجرہ کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر ایک روز ان کالی مرچوں کے دان کے اثر کا راز بھی کھل گیا جو سپیرے نے شہزاد کو بطور
ن دی تھیں اور جن میں سے شہزاد نے صرف دو تین چبائی تھیں۔

ایک روز شہزاد کی انگلی پر بھڑ کاٹ گئی۔ شدت درد سے بلبلا اٹھی۔ اتفاقاً" اس نے وہ انگلی
میں ڈال لی۔ دفعتاً" درد غائب ہو گیا۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔ اس کے بعد نہ تو انگلی سوجی اور
ہی درد ہوا۔

پھر ایک روز ریحانہ کو بھڑ نے کاٹا تو شہزاد نے آزمانے کے لئے اس جگہ اپنا لب لگا دیا۔
ہانہ کو فوراً آرام آ گیا۔ پھر دفعتاً" اسے خیال آیا کہ شاید ان کالی مرچوں کا اثر ہوا اور وہ
وس کرنے لگی کہ اس نے ساری مرچیں کیوں نہ کھائیں۔

ایلی کو وہ سب واقعات یاد آ گئے۔ اس کی نگاہ تلے شہزاد آ کھڑی ہوئی۔ اس کی پیشانی پر وہ
ا شربتی تل یوں روشن تھا جیسے دیا جل رہا ہو۔ سپیرا رک گیا۔ "میری طرف دیکھ لڑکی۔" وہ بولا۔
رے ماتھے پر تو نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔"

پھر شہزاد شاہوال کے گھر میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔
ے کی بندی گل ہو چکی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"میں دیکھوں گی کس طرح تم اسے طلاق نہیں دلواتے۔"

یہ شہزاد اس شہزاد سے کس قدر مختلف تھی۔

شاید وہ محض ایک رنگیلی محبوبہ تھی۔ اس میں بیوی بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ ایلی سوچ رہا
لہ اس روز پہلے دن اس نے شہزاد کے متعلق سوچا تھا۔ ورنہ جب سے وہ راجواڑے آیا تھا اگر
ے شہزاد کا خیال بھی آتا تو اس قدر دکھ محسوس ہوتا کہ وہ اس خیال کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں
ابتا۔ اس روز رات کو سونے سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دے لیکن خلیق کی
وجودگی مانع تھی۔ اس لئے اس نے چپکے چپکے چند آنسو بہائے۔ بہر صورت وہ جمود جو اس پر
طاری تھا ٹوٹ گیا اور وہ ذہنی خلا سمٹ کرنا پید ہو گیا۔

ماده کا انتقام

اگلے روز چائے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کمیٹی کے سیکرٹری کے گھر چلے گئے۔ راجواڑے کی میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کا نام حافظ عبدالمجید تھا۔ وہ چالیس برس کے ہوں گے۔ قد درمیانہ، خدوخال پر وضع داری کے جملہ نشانات واضح تھے۔ انداز میں روایات پرستی کی واضح جھلک تھی۔ وہ احتیاط سے چلتے۔ احتیاط سے بات کرتے اور احتیاط سے سوچتے تھے۔ خلیق نے کچھ دیر بعد مطلب کی بات چھیڑی۔ بولا:

"حافظ صاحب۔ کیا آپ کے پاس سانپ کے کاٹے کا سرمہ ہے یعنی ——۔" خلیق نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ اور کہنا چاہا۔

"ہاں ہاں" حافظ صاحب بولے۔

"حیرت ہے۔" خلیق بولا۔ "کہ سرمہ لگانے سے سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔"

"اجی صاحب۔" وہ بولے۔ "ساری بات ہی عجیب ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ آج سے چار سال پہلے ہمیں حکومت کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے ساتھ ہی حکیم محمود علی کا ایک اشتہار ملفوف تھا۔ اشتہار میں اس سرمے کے متعلق مرقوم تھا کہ اس کی سلائی لگانے سے سانپ یا بچھو کا زہر یا تو اثر نہیں کرتا اور اگر اثر ہو چکا ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خط میں لکھا تھا کہ ہم اس سرمہ کو خریدنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ چونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سرمہ کا اثر فوری ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا ہسپتالوں، سکولوں اور کمیٹی گھروں کو یہ سرمہ خریدنا چاہئے۔

"آپ جانتے ہی ہیں ڈاکٹر صاحب۔" حافظ صاحب بولے۔ "کہ ایسے سرکاری خط آیا ہی کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ ویسے ہی حکیم محمود کا کاروبار چلانے میں مدد دینا مقصود ہے۔ چونکہ ساری بات ہی مہمل تھی بھلا آنکھوں میں سرمہ لگانے کو سانپ کے کاٹے سے کیا تعلق۔

"بالکل بالکل۔" خلیق ہنسنے لگا۔

"ہے نا" حافظ صاحب بولے۔ "تو صاحب ہم نے گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دو شیشیاں خرید لیں اور وہ عرصہ دراز تک گھرجوں کی توں پڑی رہیں۔"

"ایک رات دو بجے کے قریب بیگم صاحب جو اٹھیں تو انہیں سانپ نے کاٹ لیا۔ اب اس

کیا کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے ناگ تیل بھی لگا دیکھا۔ کچھ افاقہ نہ ہوا۔ پھر مجھے سرمہ یاد آیا میں نے کہا۔ چلو اسے بھی آزما دیکھو۔ سو جناب میں نے ان کی آنکھوں میں ایک سلائی لگا دی۔ سلائی لگنے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ درد گویا کافور ہو گیا۔ اس روز ہمیں سمجھ میں آیا کہ یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ سو جناب ہم نے کمیٹی کی طرف سے ڈونڈی پٹوا دی کہ کسی شخص کو بچھو یا سانپ کاٹ لے تو وہ ہمارے پاس پہنچ جائے صاحب بیسیوں مریض آئے اور ایک ایک سلائی لگانے کے بعد یوں اپنے پاؤں پر چل کر گھر لوٹے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

"تو کیا اب بھی آپ کے پاس وہ سرمہ ہے۔" خلیق نے پوچھا۔

"اونہوں۔" حافظ صاحب بولے۔ "ختم ہو گیا۔ شاید ایک آدھ سلائی نکل آئے۔ اجی ڈاکٹر صاحب ہم نے حکیم محمود علی کو کئی ایک خط لکھے" تاکہ اور شیشیاں بھیجے لیکن تمام خط ڈی ایل او کے ذریعے واپس آ گئے۔ ڈاکیے نے ان پر تحریر کیا ہوا تھا کہ ایسے نام کا کوئی شخص بھاٹی دروازے میں رہائش نہیں رکھتا۔ لہٰذا خط واپس کئے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ حکیم محمود علی صاحب کیا ہوئے اور ان کا مطب کیا ہوا۔ ہم نے بڑی تحقیق کی لیکن بے فائدہ۔"

خلیق نے پھر راجپال کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حافظ صاحب بولے:

"ہاں وہ ہمارے پاس بھی آیا تھا لیکن دوائی پہلے ہی دے دینا یہ چیز ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اگر سانپ اسے ڈس لے اور وہ یہاں پہنچ جائے تو میرا خیال ہے ایک سلائی سرمہ تو نکل ہی آئے گا۔"

چار ایک روز بعد شام کے آٹھ نو کے قریب راجواڑے کے بازار میں شور مچ گیا۔

راجپال آ رہا ہے۔ راجپال آ رہا ہے۔"

جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو اس کا منہ سوج چکا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کتنی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ دیر تک وہ فصیلی دیوار سے لگ کر کھڑا رہا۔ پھر اک عزم سے دوڑنے لگا۔ لالہ رام داس کی دکان پر وہ گھی کی طرف جھپٹا اور گھی پینے لگا۔ اتنے میں اس کے گرد بھیڑ لگ چکی تھی۔ لوگوں چاروں طرف سے دوڑ پڑے تھے۔ ایک آدمی حافظ صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر کے پاس۔ گھی پینے کے بعد راجپال نے پھر ہمت کر کے بھاگنا شروع کیا لیکن چند ہی قدم اٹھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا اور پھر چکر کھا کر دھڑام سے بازار کے عین وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں حافظ

صاحب بھی عین موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سرمے کی ایک سلائی اس کی آنکھوں میں ڈالی۔ راجپال کا جسم یوں تڑپنے لگا جیسے بجلی کا شاٹ لگ گیا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھولدیں اور وحشیانہ انداز سے نعرہ لگایا: "واہ گرو۔"

ایلی نے اس وقت محسوس کیا جیسے اس پر بھی سانپ کے کاٹے کا اثر ختم ہو گیا ہو۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا کہ زور سے نعرہ لگائے۔ "واہ گرو۔"

اگلے روز خلیق نے دیکھا کہ ایلی کی پرانی شخصیت پھر سے استوار ہو گئی ہے اور اس کا وہ ذہنی جمود ختم ہو چکا ہے تو اس نے بات چھیڑی۔

"شکر ہے اب آپ کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"صورت حال بڑی خطرناک تھی۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آخر بات کیا تھی؟"

"مجھے بتانے میں تو کوئی حرج نہیں۔"

رسوائی

ایلی کا قصہ سننے کے بعد خلیق خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس لمبی چوڑی داستان کا یہ انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سال ہا سال دکھ اور تکلیفیں سہنے کے بعد اتنی سی بات پر انہیں جدا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ خلیق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

خلیق طبعاً کہنے والا شخص نہ تھا۔ وہ خاموشی سے محسوس کرنے کا عادی تھا۔ اس نے بصد مشکل آنسو پی لئے اور بولا: "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔"

پندرہ روز راجواڑے ٹھہرنے کے بعد ایلی خلیق سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہوا جو رات کے ایک بجے شاہوال پہنچتی تھی۔ شاہوال پہنچ کر وہ سیدھا کپور کے گھر گیا۔ حالات کو جاننے کے لئے وہ کسی اور کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ ریاض سے وہ گھبراتا تھا۔ ناظم سے ملنا مشکل تھا۔ اور بورڈنگ میں جانا مناسب نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکے اسے پہچان لیں گے اور پھر آپس میں باتیں کریں گے۔ کپور اسے دیکھ کر گھبرا گیا:

"الیاس بھائی۔ تم کہاں۔ آؤ آؤ۔" دفعتاً وہ رک گیا۔ "لیکن نہیں۔ یہاں نہیں۔ کوئی ں دیکھ نہ لے۔ ٹھہرو میں ابھی آیا۔"

پور چند منٹ کے بعد باہر نکلا۔ "آؤ آؤ۔" وہ بولا۔ "باہر جا کر بات کریں گے۔" اور وہ ں چپ چاپ سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر کپور ایلی پر برس پڑا:

"تم نے یہاں سے جانے میں بڑی شدید غلطی کی ایلی۔ تم نے میدان خالی چھوڑ دیا۔ نتیجہ وا کہ تمہاری بیوی نے وہ واویلا مچایا۔ تمہارے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ شاہوال کا ہر اہلکار رے خلاف ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔ پولیس کے افسروں نے حکم دیا ہے کہ تمہیں حراست میں لے لیا جائے۔ مجسٹریٹ تمہاری بیوی کا قصہ سن کر اتنا متاثر ا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ سراب تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر تمہارے حق میں ں۔ سارے شہر میں تمہارے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ تو وہ یں ماریں گے۔ ان سب کو یقین ہو چکا ہے کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا۔ اور اس کی اور ی کی ماں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کی شادی کر دی تھی ——— اور پھر تم بھاگ کر وش ہو گئے۔ اس سے ان کا یقین اور بھی پکا ہو گیا۔"

"کیا تمہارا بھی یہ خیال ہے۔" ایلی نے کپور سے پوچھا۔

"میری بات چھوڑو۔ میرا کیا ہے۔"

"میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ جانے سے پہلے بتاتے۔ اب کیا فائدہ اب تو کان سے نکل چکا ہے۔ تمہاری گھر گھر رسوائی ہو چکی ہے۔ لوگ اور اہل کار تمہیں بدمعاش ے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں جو اے۔ ایس۔ آئی رہتا تھا وہ ان کی امداد کر رہا ہے۔"

"حد ہو گئی۔" ایلی نے کہا۔

"حد سی حد ہوئی ہے۔" کپور کہنے لگا۔ "حتیٰ کہ ریاض بھی مخالف پارٹی میں شامل ہو چکا ہے۔ صرف ناظم کو تم سے ہمدردی ہے لیکن وہ بھی کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔"

"اوہ۔ تو پھر ہوگا کیا۔" ایلی نے پوچھا۔

"پھر بھی تم تاریخ پر تو یہاں آؤ گے ہی۔" کپور نے کہا۔

"کیسی تاریخ۔" ایلی نے پوچھا۔

"تمہارے خلاف دو مقدمے درج ہو چکے ہیں۔" کپور بولا۔

"اوہ۔" ایلی بولا۔

"خبردار رہنا۔ جب بھی تم آؤ گے کسی نہ کسی بہانے تمہیں حوالات میں بند کر دیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اس بارے میں کھلم کھلا تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔"

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ راجپال ہو اور اسے مادہ نے ڈس لیا ہو۔

"ہم تو بس یہی ایک کام کر سکتے تھے سو ہم نے کر دیا۔" کپور نے کہا۔ "سراب صاحب تمہارے خلاف محکمے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑے' میں نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے۔ وہ کہنے لگا کہ ہم اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تو بلکہ اچھا تھا۔ چونکہ یہاں تمہارا رہنا ممکن نہیں رہا۔ سو بھائی۔ میں نے ان سے کہا کہ رپورٹ نہ کیجئے میں ویسے ہی اس کا تبادلہ کرا دوں گا۔ سو میں ایک روز کے لئے لاہور چلا گیا اور لوگوں سے مل ملا کر میں نے تمہارا تبادلہ کرا دیا ہے۔"

"کس جگہ۔" ایلی نے پوچھا۔

"قاضی پور۔" وہ بولا۔ "وہاں کا ہیڈ ماسٹر شریف آدمی ہے اور وہ جگہ لاہور کے قریب ہے۔"

"تو میں یہاں چارج کیسے دوں گا۔" ایلی نے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" کپور نے کہا۔ "ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا: "یہ لو۔ "یہ تمہارا آرڈر ہے اور اس پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ تمہیں یہاں سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ سیدھے قاضی پور جا کر ڈیوٹی سنبھال لو۔ اگر چھپے رہے تو معاملہ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔"

کپور سے جدا ہونے کے بعد ایلی گویا بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کا ساتھ دے۔ ایک بار پھر وہ فکر میں ڈوب گیا۔ لیکن اب کی بار اس کا ذہن خالی نہیں تھا۔ اس میں بیسیوں سوال ابھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور گاڑی قاضی پور کو جا رہی تھی۔

کوڑھی

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے وہ آرڈر ان کے سامنے

پیش کر دیا اور کہنے لگا:

"مدرسے میں حاضر ہونے سے پہلے میں آپ کو اپنے حالات سے واقف کرنا چاہتا ہوں۔"

اتنی سی تمہید کے بعد اس نے اپنی روئداد مختصر طور پر انہیں سنا دی۔

"ہوں۔" اس کا قصہ سن کر انصاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ ایلی کے لئے ہمدردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن آصفی صاحب "وہ بولے۔ "میں اس بارے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

"آپ میری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لئے مجھے برداشت کر لیں۔" ایلی نے کہا۔

"کیا مطلب۔"

"مجھے یہاں اپنے سکول میں رہنے دیں۔"

وہ ہنسے۔ "اچھا۔" وہ بولے۔ "تو آپ شوق سے ہمارے مدرسے میں کام کریں۔ لیکن ہاں صاحب! ایسی گڑبڑ سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔"

قاضی پور پہنچ کر ایلی کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ وہ باتیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ جذب کیا کرتا تھا ختم ہو گئیں۔ اپنے اردگرد اساتذہ کی بھیڑ لگانے کی بجائے وہ جان بوجھ کر ان سے دور ہٹ۔ جماعت میں چھکیلی۔ باتیں کرنا بھی چھوٹ گیا۔ وہاں بھی خاموش رہتا اور پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔

اسے شاہوال سے دلخراش خبریں آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنا بڑا محاذ اس کے خلاف کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ آخر شہزاد کا مقصد کیا تھا۔ اس نے جو احتجاج کیا تھا اس کی بنیاد کسی غلط بات پر استوار نہ تھی۔ شہزاد اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے نفیسہ کی شادی کی بات کی بناء پر نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی نے اسے بیچا نہیں تھا۔ پھر وہ کیا چاہتی تھی۔ کیا اس کا مقصد ایلی کو رسوا کرنا تھا۔ یا ڈرا دھمکا کر اپنے تابع کرنا تھا۔ لیکن اس کی جرات ڈر کے جذبے پر استوار تھی۔ جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا اور بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تو وہ نڈر ہوتا جاتا تھا۔

پولیس اور کورٹ اس کے لئے خطرناک مقامات تھے۔ اس وقت اس کے سر پر قید کا خطرہ بڑی وضاحت سے منڈلا رہا تھا۔ کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ قید ہو جاؤں گا تو کیا

ہوا۔ وہ سوچتا۔ لیکن ڈر کی وجہ سے کسی کے تابع نہیں ہوں گا۔

جب اسے اپنی رسوائی کا خیال آتا تو وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ شہزاد نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچتا۔ پھر اس کی نگاہ میں وہ پولیس آفیسر آ جاتا جو شہزاد کے پڑوس میں رہتا تھا۔ شہزاد اس کے قریب آ بیٹھتی اور آنسو بہاتی۔ لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں۔ ہنستیں، قہقہے لگاتیں اور معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ ایلی کو دھچکا لگتا۔ شہزاد سے اسے ایسی توقع نہ تھی۔ قاضی پور کا وہ زمانہ ایلی کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کامل یقین تھا کہ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہیڈ ماسٹر جس کے روبرو اس نے خلوص سے تمام واقعات ہمدردی حاصل کرنے کے خیال سے دہرائے تھے وہ بھی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ شاہوال میں اس کے خلاف ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ آصفی محلے میں لوگ اس کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے دوست اور رشتہ دار بھی اعلانیہ اس کے خلاف ہو چکے تھے۔

اس کے مکان پر وحشت برستی تھی۔ وہ مکان جو قاضی پور میں اسے رہنے کے لئے ملا تھا بہت وسیع تھا۔ اس میں کئی ایک کمرے تھے اور اس کا جملہ سامان ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ چارپائی۔ خوش قسمتی سے وہ گرمیوں کے دن تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ مکان میں، مالک مکان کا ایک ٹوٹا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس پر رات کو پڑ کر سو رہتا۔ سارا دن بھی وہ اسی تخت پوش پر بیٹھا سوچتا رہتا۔

دو مرتبہ اس کے نام شاہوال سے سمن آ چکے تھے۔ مدرسہ کے دفتر شاف کی مہربانی سے ان کی تعمیل نہ ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک روز اسے شاہوال جانا ہی پڑے گا۔

تیسری مرتبہ جب سمن آئے تو ساتھ ہی ایک اور مصیبت رونما ہوئی۔ اس روز جب وہ صبح جاگا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر اور بازوؤں پر ایگزیما کے چھالے نکل آئے تھے۔ ایسی ہی پھنسیاں جو امرتسر میں اس کے چہرے پر نکلی تھیں۔ جب وہ پھنسیاں پھٹ گئیں اور اس کے ہاتھوں کی جلد اتر گئی۔ ہاتھوں کے زخموں سے پانی رسنے لگا۔ اس نے حیرت سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا سمن کی تعمیل کرنے شاہوال جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو

تھے۔ ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس نے دونوں بازو اوپر اٹھا رکھے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی نگاہوں تلے سارا شاہوال پلیٹ فارم پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس والے ہتھکڑیاں اٹھائے کھڑے تھے۔

"ٹکٹ بابو ٹکٹ۔" ریلوے کا ایک وردی پوش ٹی ٹی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

ایلی چونکا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ٹی ٹی کی طرف دیکھا۔ ٹکٹ اس کی جیب میں تھا لیکن اس کے ہاتھ بیکار تھے۔ وہ ٹکٹ نکال نہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بے ٹکٹا ہے۔" بابو مسکرایا۔

"جی نہیں" وہ بولا۔

"تو پھر دکھاؤ۔"

اس نے اپنی جیب ٹی ٹی کی طرف کر دی۔ "اس جیب میں ہے۔"

ٹی ٹی نے مخدوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک ہمراہی مسافر نے بات سمجھ کر ایلی کی جیب میں سے ٹکٹ نکالا۔

"کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھوں کو۔" ٹی ٹی نے پوچھا۔

"جی ایگزیما ہے۔"

اجانا بھائی

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر یہ سن کر پرے ہٹ گئے جیسے وہ کوڑھی ہو۔ شاہوال کا سٹیشن ویران تھا۔ صرف چند ایک مسافر تھے۔ وہ جلدی سے اترا اور چپکے سے سٹیشن سے باہر نکلا۔ اس نے ایک ویران راستہ اختیار کیا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کچہری پہنچ کر وہ مجسٹریٹ کے کمرے کے باہر چند دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں کا کوئی جانا پہچانا نہ تھا۔ پھر وہ آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر ہو گئی لیکن اسے آواز نہ

ایک پولیس والا دور کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ ایلی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی جو اس کے پاس بیٹھے تھے سب جا چکے تھے۔ دروازے کے سامنے وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا گیا تو اس نے گھبراہٹ محسوس کی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر کچہری کے پیادے سے ملا۔

"شہزاد بنام الیاس کی باری کب آئے گی۔" اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔" وہ بولا۔

"میں الیاس ہوں۔"

پیادے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ "اپنی باری پر حاضر نہیں ہوتے اور پھر پوچھتے ہیں۔"

"لیکن مجھے تو آواز نہیں پڑی۔"

"تمہارے تو وارنٹ بھی نکل چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"کیوں بھئی۔ کیا بات ہے۔" وہی پولیس والا آ گیا۔ "کون ہو تم؟" اس نے ایلی سے پوچھا۔

"الیاس آصفی۔" ایلی نے جواب دیا۔

"   صاحب۔ ذرا ادھر آئیے۔" پولیس والا چلایا۔

ایک انسپکٹر نہ جانے کہاں سے آ گیا۔

"ادھر آؤ۔" انسپکٹر نے ایلی کو گھور کر دیکھا۔ "ادھر آؤ ہمارے ساتھ۔"

وہ اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک پولیس افسر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے زیر لب کچھ باتیں دہرائیں۔ پھر وہ افسر کہنے لگا: اسے حوالات میں بند کر دو۔"

"کس لئے؟" ایلی نے بصد مشکل کہا۔

"وجہ بعد میں بتائیں گے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"میں نے کیا جرم کیا ہے؟" ایلی نے پوچھا۔

"تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔" انسپکٹر نے بولا۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے ایلی کی طرف دیکھا اور بولا: "تمہارے ورانٹ ہیں۔ یا تو ابھی پانچ ہزار کی ضمانت کراؤ ورنہ حوالات جاؤ۔"

"کہاں ہے تمہارا ضامن۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

ایلی نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ اسے لے جانے لگے تو پولیس کا ایک اور اے ایس آئی داخل ہوا۔ "السلام علیکم۔" وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آصفی صاحب۔ آپ یہاں کہاں؟"

ایلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے قطعاً نہ جانتا تھا۔

"اسے لے جاؤ۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔

سپاہی نے ایلی کا بازو پکڑ لیا۔

"لیکن۔" نووارد اے ایس آئی نے کہا۔ "میں جوان کا ضامن ہوں۔"

انہوں نے حیرت سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

ایلی خود حیران کھڑا تھا۔

"آپ اس معاملے میں نہ آئیں مجید صاحب۔" افسر نے اے ایس آئی سے کہا۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔" مجید بولا۔

ایلی نے پھر حیرت سے مجید کی طرف دیکھا "بھائی۔ اس نے تو کبھی مجید کو دیکھا بھی نہ تھا۔"

"میں ان کی ضمانت دوں گا۔" مجید بولا۔

"آپ سرکاری افسر ہیں آپ ضمانت نہیں دے سکتے۔" افسر نے مجید سے کہا۔

اے ایس آئی نے اپنی پیٹی کھولی اور افسر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ "یہ لیجئے اپنی نوکری۔" نہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ "اب تو میری ضمانت منظور کیجئے گا۔"

ایلی بت بنا کھڑا تھا۔ وہ مجید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں ایک خوش شکل آدمی داخل ہوا۔ وہ سب مؤدبانہ انداز سے کھڑے ہو گئے۔

"آخاہ۔" نووارد چلایا۔ "الیاس صاحب ہیں۔ آئیے الیاس صاحب۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے ایک تانگے کو اشارہ کیا۔ ایلی کو تانگے میں بٹھا کر وہ خود بھی سوار ہو گیا اور تانگہ چل پڑا۔ کچھ دور جا کر تانگہ رکا۔ ایک برقعہ پوش عورت بنچ پر بیٹھی تھی۔ خوش پوش شخص نے اشارہ کیا۔ وہ عورت آ کر ایلی کے پاس بیٹھ گئی اور تانگہ پھر سے روانہ ہو گیا۔

اس روز عجیب واقعات ہو رہے تھے۔ وہ مجید کون تھا؟ وہ اس کی ضمانت کیوں دے رہا تھا؟ وہ خوش پوش شخص اسے کیوں لے آیا تھا؟ کہاں لے جا رہا تھا؟ اور وہ برقعہ پوش کون تھی؟"

اور گھن

جب تانگہ شہزاد کے مکان کے پاس رکا تو ایلی چونکا۔ ارے وہ تو شہزاد برقعہ پہنے اس کے

پاس بیٹھی تھی۔ اور وہ خوش پوش خوبصورت جوان ضرور اس کا پڑوسی پولیس والا انسپکٹر تھا۔ وہ ایلی کو اپنے گھر میں لے گیا۔ شہزاد نے برقعہ اتار دیا۔ اس کے چہرے سے نفرت اور غصہ ٹپک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے اور وہ اسی طرح ایلی کے روبرو تن کر کھڑی ہو گئی جس طرح اس روز کھڑی تھی جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

انسپکٹر نصیب نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھئے الیاس صاحب۔" وہ بولا۔ "بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں ورنہ اس کے نتائج آپ کے حق میں بے حد نقصان دہ ثابت ہوں گے۔"

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

"آپ کو علم ہونا چاہئے۔" نصیب بولا۔ "کہ شاہوال کے لوگ اور حاکم سب آپ کے اس فعل پر لعنت بھیج رہے ہیں اور مجسٹریٹ علی قلی خاں نے تو اعلان کر دیا ہے کہ آپ کو اندر کر دے گا۔" نصیب خاموش ہو گیا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

"آپ کے ڈائریکٹر کو تمام تفصیلات معلوم ہیں اور آپ نوکری سے برطرف ہونے والے ہیں۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔

"آپ کا ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکال کر یوں بے یارو مددگار چھوڑ جانا ایک قبیح فعل ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بے یارو مددگار تو میں ہوں۔" ایلی نے کہا۔

نصیب مسکرایا: "جو لوگ ایسے فعل سرزد کرتے ہیں ان کے عزیز اور دوست بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں بلا رورعایت آپکو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں۔"

"میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"تو پھر آپ انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"یہ طلاق کا مطالبہ چھوڑ دیں۔ لڑکی اپنے گھر جا بسے تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"تمہیں لڑکی کو طلاق دینی پڑے گی۔" شہزاد غرائی۔ "تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم

نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میری بچی کو ایک بدمعاش کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔"

انسپکٹر نے پھر اشارہ کیا: آپ فی الحال نہ بولیں۔" اس نے شہزاد سے کہا۔

"یہ سب الزام ہیں۔" ایلی بولا۔

"چلو الزام ہی سہی۔" نصیب نے کہا۔ "لیکن واقعات کا رخ ایسا ہے کہ آپ پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ قانون آپ کے حق میں نہیں۔

"نہ ہو"۔ ایلی نے کہا۔

"آپ کو سزا ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

"ہو جائے۔" ایلی نے کہا۔

"آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔" ایلی بولا۔

"وہ تو ڈھیٹ ہے۔" شہزاد چلائی۔

"آپ خاموش رہئے۔" نصیب نے کہا۔

آپ سوچ لیں الیاس صاحب۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"دیکھئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

شہزاد نے نفرت سے اونہہ کہا۔

"آپ کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔" نصیب بولا۔

دفعتاً ایلی کو نہ جانے کیا ہوا کہ ملحقہ گھر سے لڑکیوں آوازیں سن کر یا شاید شہزاد کی نفرت بھری "اونہہ۔" سن کر وہ بالکل نڈر ہو گیا۔

"دیکھئے انسپکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ مجسٹریٹ اور پولیس کے افسران لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر قدم آپ کے مشورے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے کہ ڈائریکٹر کو شکایات پہنچ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ لیکن آپ کو علم نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کیا جو ایک باعزت خاوند کے شایان شان ہے۔"

"باعزت خاوند۔" شہزاد چلائی۔

"میں حق بجانب ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "مجھے ان لوگوں کے خلاف غصہ نہیں۔ میں ہمیشہ انہیں خرچ دوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ جب تک یہ لوگ باعزت لوگوں کی طرح اس نکاح کا احترام نہیں کریں گے۔ آج اگر لڑکی اپنے خاوند کے پاس چلی جائے تو کل میں از خود اپنے گھر آ جاؤں گا۔"

"ہوں۔" نصیب سوچ میں پڑ گیا۔

"اور رسوائی' قید اور ملازمت سے برطرفی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" ایلی نے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

"الیاس صاحب۔ الیاس صاحب۔" نصیب نے آوازیں دیں لیکن وہ نصیب کے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

اندر شہزاد چیخ رہی تھی: "اس کے مزاج ٹھیک نہ کئے تو میرا نام بھی شہزاد نہیں۔ میں دیکھوں گی کیسے نہیں دیتا طلاق!"

باہر محلے میں لوگ ٹکڑیوں میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بچے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھتے تھے۔ لیکن اسے اس وقت کسی کا ڈر نہ تھا۔ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سینہ تانے چل رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اسے ہاتھوں پر کوڑھ چل گیا ہے۔

محلے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ سامنے سکول کے باہر ناظم کھڑا ہے۔

"ارے تم۔" ایلی چلایا۔ "تم کہاں۔"

ناظم کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ میں ہاکی سٹک اٹھائی ہوئی تھی۔

ایلی کو دیکھ کر اس نے چار ایک گالیاں دیں:

"تم اکیلے نہیں ہو۔" وہ چلایا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں دیکھوں گا یہ کیا کرتے ہیں۔ ان کی ایسی کی تیسی۔" اس نے ہاکی سٹک جھلاتے کہا۔ اور پھر گالی دے کر بولا: "انہوں نے تمہیں اکیلا سمجھا ہے کیا۔ میں جان دے دوں گا جو میرے یار کو کسی نے انگلی سے چھوا بھی تو۔ پولیس افسر ہیں تو پڑے ہوں۔ ہم بھی غنڈے ہیں۔" اس کے منہ سے تھوک کے فوارے چل

ہے تھے۔

"میں صبح سے تمہارے ساتھ ہوں۔" ناظم بولا۔ "جب تم گاڑی سے اترے تھے۔ پھر جب م گھوم کر پرانے قلعے کے راستے کچہری گئے تھے اور پھر علی قلی کی عدالت کے باہر زمین پر بیٹھے ئے تھے۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔"

"لیکن یار۔" ایلی نے کہا۔ "وہ مجید کون تھا۔ اس نے تو حد کر دی۔"

ناظم قہقہہ مار کر ہنسا۔ "وہ میرا یار ہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا ورنہ انہوں نے تمہیں ذر کرنے کی سکیم مکمل کر رکھی تھی۔"

ایلی نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

"دیکھتے کیا ہو۔" وہ بولا۔ "ہم امرتسریئے یار ہوتے ہیں۔ ریاض' کپور اور سراب کی طرح بوتیہ نہیں ہوتے بودے ڈر گئے۔ پیچھے ہٹ گئے۔" اس نے غصے میں سٹک گھمائی۔

"مجھے بھی مشورہ دیتے تھے کہ آگے نہ بڑھنا ورنہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔ میں گھن ہوں گھن۔" وہ کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ "مجھے پیسنے والا آئے تو میرے سامنے۔" وہ سڑک پر کھڑا دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ اور لوگ رک کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے سکول کے طلباء بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ اساتذہ کمروں سے جھانک رہے تھے۔

سراب کا چہرہ سمٹ رہ تھا۔ دو بھوری آنکھیں ابھر رہی تھیں۔ کپور سر جھکائے کھجا رہا تھا۔ ریاض خاموش کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

ابو۔ ابو

قاضی پور پہنچ کر ایلی ایک بار پھر بے چارگی اور بے بسی میں کھو گیا۔ وہ ویران مکان' ٹوٹا ہوا تخت وہی ویران سکول جہاں لوگ اسے درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے اور اساتذہ نفرت سے اس کی رف دیکھتے تھے۔ وہی غربت جو اس روز سے اس کی سر پر یوں سوار تھی جیسے جزیرے کا بڈھا۔

ایک بار اس کے بعد اسے تاریخ پر شاہوال جانا پڑا۔ لیکن اب ہر بار ناظم اس کے ساتھ ہوتا ا۔ اور ناظم کے دوست اے ایس آئی کی امداد اسے حاصل تھی۔

علی قلی خاں مجسٹریٹ نے اسے عدالت میں اعلانیہ ڈانٹا لیکن اس کے خلاف کچھ نہ کر سکا ر تمام مقدمات عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو گئے چونکہ شہزاد اپنی بچیوں کو لے کر لاہور

آ گئی تھی۔ اس کی والدہ نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہوال چھوڑ کر لاہور آ جائے۔ اس کے جانے کے بعد اس کے حمایتی افسروں نے ایلی کی مخالفت چھوڑ دی تھی۔

پھر ایلی کو معلوم ہوا کہ شہزاد نے محمود سے مل کر نفیسہ کی طلاق حاصل کر لی ہے۔ اس پر ایلی کو بالکل تعجب نہ ہوا۔ چونکہ محمود نے بارہا اسے خط لکھے تھے جن میں اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کی خاطر جھگڑا نہ بڑھائے۔ چونکہ ان حالات میں اسے نفیسہ کو طلاق دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا چونکہ وہ نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے اپنے گھر میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ نفیسہ کا نکاح شیر علی سے ہو گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو کیا یہ سب فساد شیر علی کا مچایا ہوا تھا اور اس کے اپنے بھائی نے شہزاد کو اس بات پر ابھارا تھا۔ ایلی کو یہ خبر سن کر اس قدر تکلیف ہوئی کہ اس کا دل زندگی سے بالکل اچاٹ ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تن تنہا شخص ہے۔ ایک سوکھا ہوا درخت جو صحرا میں اگا ہوا ہے۔ اور اردگرد چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ ریت اور ویرانی۔

لیکن کبھی کبھار اس ویرانے سے آواز آتی۔ "ابو ابو۔" اور ایلی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔

ایلی کا جی چاہتا کہ چوری چوری شہزاد کے گھر جائے اور کسی سے ملے بغیر' کسی کے جانے بغیر عالی سے ملے اور اسے کہے:

"عالی! تم تو جانتے ہو۔ تم تو گواہ ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ انہوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے جبھی تم مجھے بلاتے ہو۔ ابو ابو پکارتے ہو۔ کوئی اور میرا نام نہیں لیتا۔ صرف تم ہو عالی۔"

آخری بار

دو ایک مرتبہ وہ چوری چوری لاہور گیا بھی تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں وہ اس مکان کے باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ اور جب ایک ننگا گول مٹول سا' بچہ باہر نکلا تھا تو ایلی نے دوڑ کر ایک بڑا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لفافے کو دیکھ کر عالی سہم گیا تھا لیکن مٹھائی اور پھل دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہرائی تھی —— اور پھر ایلی اس سے بات کئے بغیر وہاں سے بھاگ لیا تھا۔

ایک مرتبہ جب ایلی ایک بڑا سا لفافہ اٹھائے وہاں کھڑا تھا تو شہزاد عالی کو اٹھائے ہونکتی اور کھانستی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی —— وہ شہزاد کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

"لے لو عالی۔" وہ بچے سے کہہ رہی تھی۔ "اپنے ابو سے لفافہ لے لو۔" عالی حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایلی نے لفافہ بڑھا دیا اور چلنے لگا۔

"آؤ۔" وہ بولی۔ "چائے کا پیالہ پی لو۔"

"ایلی جوں کا توں کھڑا رہا۔

"آ جاؤ اب کیا ہے۔" وہ کھانستے ہوئے بصد مشکل بولی۔ "اب تو کھیل ہی ختم ہو گیا۔"

ایلی چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔

شہزاد کو دیکھ کر ایلی کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے بڑھ کر شہزاد کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اس کی چیخیں نکل گئیں۔ شہزاد اسے تھپکنے لگی۔

ایلی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں گویا کسی مردے کا پنجر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور گوشت گویا تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کھانستی تھی۔

"اب کیا رونا ہے۔" وہ بولی۔

"کیوں۔" وہ چلایا۔

"اب کہانی ختم ہو گئی۔" وہ بولی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"ٹی بی ہے۔" شہزاد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"دوائی پیتی ہو۔"

"دوائی۔" وہ ہنسی۔ "اب تو صرف چند روز اور ہیں۔"

ایلی کے دل پر ایک چھری سے چل گئی۔

"لڑکیاں کہاں ہیں؟" اس نے بات بدلی۔

"ادھر گئی ہیں نفیسہ کی طرف۔" وہ کھانستے ہوئے بولی۔

"اور تم اکیلی ہو۔"

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "وہ ہوں بھی یہاں تو اکیلی ہوں۔" وہ بولی۔

"ہوں۔" وہ خاموش رہا۔

"اب اکیلے پن کے سوا کیا ہے۔" وہ بولی۔ "اب تو ——۔"

"شہزاد۔" وہ بولا۔

"ہاں۔۔۔۔" وہ کھانسنے لگی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں؟"

"چھوڑو اب۔" وہ بولی۔ "جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"بڑا ظلم ہوا۔" وہ بولا۔

"ہاں۔ ہو گیا بس۔"

"چلو میں تمہیں دوراہے لے چلوں۔" ایلی نے کہا۔

"بے کار ہے۔" وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

"کیوں۔"

"کیا فائدہ۔"

"شاید تم صحت مند ہو جاؤ۔"

"اب کیا فائدہ۔" وہ بولی۔

"کیوں۔ صحت اچھی ہو جائے تو ——"

"تو کیا ہو گا۔" اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

ایلی اس کی بات سن کر کانپ گیا۔

"کیا حرج ہے۔" وہ بولا۔ "چلو تو۔"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "اب میں نہیں جاتی۔"

"ضد کرتی ہو نا۔" وہ بولا۔

"چھوڑو اب ان باتوں کو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔"

"صرف ایک ہی بات ہے میرے پاس۔"

"کیا؟"

"کہ آج بھی تم میرے لئے وہی شہزاد ہو جو پہلے تھی۔ وہی سبز گٹھڑی۔"

"سچ۔" اس نے ایلی کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔

"میرا خیال تھا۔" وہ کہنے لگی لیکن اسے کھانسی چھڑ گئی۔

"کیا خیال تھا۔" ایلی نے پوچھا۔

"کہ تم بدل گئے ہو۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں بدل سکتا۔"

"سچ۔" اس نے ایلی کا ہاتھ دبایا۔ "پھر مجھ سے اس قدر ضد کیوں کی۔"

"وہ اور بات تھی۔" وہ بولا۔ "میرے دل نے اس بات کو گوارا نہ کیا لیکن میرے دل میں ہارے لئے کبھی غصہ یا نفرت پیدا نہیں ہوئی۔"

"سچ۔" اس نے پوچھا۔

"تم بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔" وہ بولا۔

"چلو چھوڑو اس بات کو۔" وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"کیا کرتی ہو آجکل۔" اس نے پوچھا۔

"کیا کرنا ہے۔ پڑی رہتی ہوں۔"

"سارا دن۔"

"ہاں۔ ڈاکٹر نے اٹھنے بیٹھنے سے منع کر رکھا ہے۔"

"پھر تم باہر کیوں آئی تھی۔"

"جی چاہتا تھا آخری بار ملوں۔"

"کیا واقعی۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ ہنسی۔ "دعائیں مانگتی تھی کہ ایک بار تم آؤ۔"

"میں تو آتا ہی رہتا تھا۔"

"مجھے پتہ نہ چلتا تھا۔" وہ کھانسنے لگی۔

"ہوں۔"

"پھر جب عالی لفافہ لاتا تو پتہ چلتا۔ پر تم جا چکے ہوتے۔"

"اور اب کی بار۔" ایلی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں" وہ بولی۔ "سوئی ہوئی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر ایسے ہوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔"

"کس نے؟"

"پتہ نہیں کسی نے میرے کان میں کہا۔ مل لو۔"

"ہوں۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

"میں نے عالی کو اٹھالیا اور باہر نکل آئی۔"

"تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔"

"نہیں جاتا۔" وہ بولی۔ "پر تم سے ملنا تھا اس لئے۔"

ایلی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گال پر رکھ لئے۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"تو تم مجھے بھول نہیں آ جتک۔" ایلی نے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی۔

"ان دنوں تو بہت غصہ تھا۔"

"تھا۔ لیکن یہ بھلا مجھے بھولنے دیتا ہے۔"

"کون؟"

"یہ عالی۔" وہ کھانستے ہوئے بولی۔

"عالی؟"

"ہاں۔ سارا دن بیٹھا ابو ابو کرتا رہتا ہے۔"

"مجھے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔"

"پتہ نہیں۔ گھر میں ابو ابو کرتا ہے۔"

"ہوں۔" وہ بولا۔

پھر کھانسنے لگی اور پھر خون تھوکا۔

ساری رات دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ صبح کے قریب ایلی کی آنکھ لگ گئی۔ جب بیدار ہوا تو سات بجے تھے۔

"شہزاد۔" وہ بولا۔

"جاگ پڑے۔" شہزاد بے بسی سے مسکرائی۔

"تم نہیں سوئیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"اب تو دیر ہو گئی۔"

"یعنی۔" اس نے پوچھا۔

"دیر سے سونا چھوٹ گیا۔" وہ کھانسنے لگی۔

"کیوں؟"

"نیند نہیں آتی۔"

"ساری رات بیٹھی رہتی ہو۔"

"ہاں۔"

"وقت نہیں گزرتا۔"

"باتیں یاد آتی ہیں۔"

"کونسی؟"

"ایک ایک۔" اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "میں آ جاؤں گا۔"

"کہاں۔" اس نے پوچھا۔

"تمہارے پاس۔"

"سچ۔"

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔ "آج جا کر چھٹی لے آؤں ایک مہینے کی۔"

"ایک مہینے کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اکٹھے رہیں گے۔"

"اچھا۔" اس نے ایلی کا ہاتھ دبایا۔ "کب تک مل جائے گی؟"

"ہفتے کے اندر۔"

"ہفتہ۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

"کیوں؟" ایلی نے پوچھا۔

"ہفتہ نہیں۔" وہ بولی۔ "جلدی۔"

"اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ اب جاتا ہوں۔"

"اچھا۔" شہزاد نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ "اگر جانے سے پہلے کوٹھے پر چھوڑ آؤ۔"

"کیا مطلب۔" ایلی نے کہا۔

"میں سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی۔ دھوپ میں پڑی رہوں تو آرام رہتا ہے۔"

"اٹھا کر لے چلوں۔"

"ہاں۔" وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

ایلی نے اسے دونوں بازوؤں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ یوں اس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہو۔

"آؤں گا۔" وہ بولا۔ "تو روز تمہیں کوٹھے پر لے جایا کروں گا۔"

"ہاں۔ دھوپ میں مجھے آرام رہتا ہے۔" وہ بولی۔

"اکٹھے دھوپ میں بیٹھا کریں گے۔"

"ہاں۔" وہ بولی۔ "پر جلدی آنا۔"

ایلی اسے چارپائی پر لٹانے لگا تو شہزاد کا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔

"اوہ۔" وہ بولا۔ "تمہیں چوٹ آئی ہے۔"

"اچھا ہوا۔" وہ بولی۔

ظاہر تھا کہ شہزاد کو بے حد چوٹ لگی ہے۔

"مجھ سے غلطی ہوئی۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا ہوا۔" وہ بولی۔ "تمہارے ہاتھوں چوٹ آنی ہی تھی مجھے۔"

"کیوں۔"

"بس۔ اچھا ہی ہوا۔" وہ کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک اس کا سر ہاتھوں سے ملتا رہا اور پیار سے اسے دباتا رہا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا میں اب جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

شہزاد نے چپ چاپ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا سکول پہنچا۔

دلگا

اس روز اس نے محسوس کیا کہ قاضی پور کے سکول کی عمارت بہت بڑی اور خوبصورت اور ملحقہ پارک بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور گراؤنڈ میں سفیدے کے درخت بہت ورت لگتے تھے۔

سکول میں آدھی چھٹی ہو چکی تھی۔ اساتذہ حسب معمولی باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ ساتذہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"آیئے آیئے الیاس صاحب" ایک صاحب نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

"آپ تو الگ تھلگ رہتے ہیں۔" دوسرے صاحب بولے۔

"کبھی صورت ہی نہیں دکھائی۔" تیسرے صاحب بولے۔

آپ جیسی صورت ہو تو مجھے بھی دکھانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔" ایلی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔

"وہ صاحب۔" ایک صاحب کہنے لگے۔ آپ تو بولنے لگے۔"

"میرا قصور نہیں۔" ایلی نے کہا۔ موسم ہی ایسا ہے۔"

"تو آپ ذیدر کاک ہیں۔" دوسرے صاحب نے کہا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

اس روز دیر تک وہ اساتذہ سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور چھٹی کی درخواست پیش کر دی۔

"دیکھئے الیاس صاحب۔" انصاری بولے۔ "میں ایک ماہ کی چھٹی تو منظور نہیں کر سکتا۔ ہاں رش کر کے لاہور بھجوا دیتا ہوں۔ منظور ہو جائے تو آپ شوق سے چھٹی پر چلے جایئے۔"

"کب تک منظور ہو جائے گی۔" اس نے پوچھا۔

"ایک ہفتہ لگے گا۔" وہ بولے۔ "کم از کم۔"

"بہت خوب۔"

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے چند ایک چیزیں خرید کر گھر میں رکھنی ہیں یہ خواہش ایلی نے اس شدت سے محسوس کی کہ وہ اسی وقت بازار چلا گیا تاکہ پتہ لگائے

کہ آیا اسے چند ایک چیزیں کرایہ پر مل سکتی ہیں۔ دیر تک وہ بڑے بازار میں گھومتا رہا۔

"کیا فرنیچر کرایہ پر دیتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" لڑکے کے والد نے کہا۔ "آپ فرمایئے آپ کو کیا چاہئے۔"

رات کو دیر تک وہ مکان میں فرنیچر کی چند چیزیں سجاتا رہا اور پھر سو گیا۔ اس روز گویا اس کی دنیا ہی بدل ہوئی تھی۔

ایلی کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر سبھی حیران تھے۔

جماعت میں وقت کاٹنے کی بجائے اس نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نویں جماعت کے لڑکے تو اس کے دو ایک سبق سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

اساتذہ بھی اب اس میں دلچسپی لینے لگے حتیٰ کہ انصاری صاحب نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے ایلی کو بلا کر اس سے بات بھی کی تھی۔ بولے:

"الیاس صاحب۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی لمبی چھٹی کو ملتوی کر دیں۔"

ایلی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھئے نا۔" انصاری بولے۔ "امتحانات بالکل قریب ہیں۔ اگر آپ چھٹی پر چلے گئے تو نتیجہ پر برا اثر پڑے گا۔"

"جی۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن مجبوری ہے۔"

"آخر آپ کس لئے چھٹی لے رہے ہیں۔"

"جی میری بیوی بیمار ہے۔"

"آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے۔" انصاری نے کہا۔

"جی وہ بہت بیمار ہے۔"

"اگر میں موٹر کا انتظام کر دوں تو۔"

"شاید۔" ایلی نے کہا۔ "شاید یہ ممکن ہو۔"

"آپ کوشش کریں گے۔"

"جی۔" وہ بولا۔ "کروں گا۔ اگر ممکن ہوا تو۔"

ابھی وہ ہیڈ ماسٹر سے بات کر رہا تھا کہ ڈاکیہ آ گیا۔ اس نے ایک لفافہ سا اٹھایا ہوا تھا۔

"جی۔" وہ بولا۔ "الیاس آصفی۔"

نے وہ خط ہاتھ میں تھام لیا اور بدستور ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کرتا رہا۔" انصاری ے حالات میرے بس میں نہیں۔ کچھ ایسی الجھنیں ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔

"

"ارے بھائی۔" انصاری بولے۔ "اس تار کو پڑھ لو پہلے۔"

"تار۔" ایلی نے ہاتھ کے لفافے کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے تار کھولا۔

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

"جی۔" ایلی چونکا —— وہ پھر کھو چکا تھا۔ اس نے تار ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔

ما تھا

"شہزاد کل رات فوت ہو گئی۔ جنازہ صبح نو بجے ہو گا۔"

سامنے گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔

گرد و پیش پر دھندلکا چھا چکا تھا۔

انصاری کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

باغیچے میں ایک بڑے سے پلنگ پر ایک لاش پڑی تھی۔

پاس ہی ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھائے چلا رہا تھا۔ "ابو۔ ابو۔" پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے چلا جا رہا تھا

"اب کیا ہے۔ اب کیا ہے۔" لاش منہ سے چادر اٹھا کر کہہ رہی تھی راستے کی رکاوٹ۔

ریل ہونک رہی تھی۔ انجن چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔

تانگے والے چلا رہے تھے۔

پھر بہت سے لوگ دروازے اور کھڑکیوں میں کھڑے اسے گھور رہے تھے۔

"وہ آ گیا۔ وہ آ گیا۔"

"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔"

"اب آیا تو کیا آیا۔"

یہ ہو کے رہے گا۔" حاجی صاحب مسکرا رہے تھے۔

"تم آ گئے۔" شہزاد اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ابو۔ ابو۔" دو ننھے منے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

ایلی نے ایک بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔

پھر وہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک بڑی سی قبر سامنے آ گئی۔ اس پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔

وہ قبر پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ سارا قبرستان اس کی اوٹ میں آ گیا۔

پھر وہ ابھرنے لگی۔ ابھرتی گئی زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔

"تم آ گئے"۔ ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

پھر ایک سیلاب امنڈ آیا۔ پانی ہی پانی۔ وہ قبر اس پانی میں بہہ گئی پھر وہ بچوں۔

پھر وہ بچوں کی طرح بلبلا کر چیخیں مار رہا تھا۔ اس سیلاب میں ڈوب رہا تھا۔

دفعتاً اس کی نگاہ اس بچے پر پڑی جو اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ "ابو۔ ابو۔"

وہ اٹھ بیٹھا جیسے دفعتاً اسے سہارا مل گیا ہو۔ جیسے زندگی میں پھر سے مفہوم پیدا ہو گیا ہو

"عالی عالی" —— اسے کوئی جھنجھوڑ رہا تھا۔

اسے عالی کو اس سیلاب سے بچانا تھا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

"ابو۔ ابو۔" ریل گاڑی چیخ رہی تھی۔ "ابو۔ ابو۔"

سامنے شہزاد کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ایک چھوٹا

ئ

پاکستان

ہینے کی چھٹی گزارنے کے بعد گویا اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک نیا آدمی ابھر آیا تھا۔
ایسا آدمی جسے اپنے ماضی سے نہ لاگ تھا نہ لگاؤ جو اپنی گزشتہ زندگی پر نہ تو شرم محسوس کرتا
ر نہ بیتے ہوئے واقعات کو ذہن میں دہرانے کا شوق رکھتا تھا' اسے اپنے گزشتہ افعال پر پشیمانی
تھی نہ ہی وہ اس پر فخر کرتا تھا۔ جو بیت چکا تھا۔ وہ اپنے گزشتہ عشق کو حماقت نہیں سمجھتا تھا۔
اب بھی عشق کی عظمت کا اعتراف تھا۔ وہ حماقتوں کی اہمیت کا معترف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان
توں نے اس کی زندگی میں رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ حماقتیں فطری تھیں انسانیت بخش تھیں۔ وہ
ں دہرانے کا بھی شوقین نہ تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے مستقبل پر تاریک سایہ نہیں
رہی تھیں۔

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کے پھوڑے اور پھنسیوں نے اس کی
ت شخصیت کردار' خیالات' محسوسات پر کوئی داغ نہ چھوڑا تھا۔ اسے اس حسن اتفاق کا
ت سے احساس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی سے عشق لگا کر بیٹھ جاتا اور شریف
طرح باقی زندگی آہیں بھرنے اور چھت کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے میں بسر کر
یا اپنی گزشتہ زندگی کو قابل نفرین قرار دے کر من نہ کردم شما حذر بکنید کا پرچارک بن
ا

اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ زاویہ نگاہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں اس لیے اس نے
کچھ بھی تو نہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ گزشتہ زندگی سے اخذ کیے گئے لاگ یا لگاؤ سے

"ابو۔ ابو۔" دو ننھے منے ہاتھ ہے لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ نعمت کس کی دین ہے۔

ایلی نے ایک بچے کو ۔۔ سے وہ ابھی تک بچہ تھا۔ ذہنی طور پر اس کی پختگی اور بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ جا رہا تھا، ظ سے زندگی نے اسے کچھ نہ سکھایا تھا۔ ذہنی لحاظ سے ہر تجربہ ہر مشاہدہ اس چار۔۔س ایک نئی کلی بن کر رہ جاتا تھا۔ اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا تھا۔

زندگی کے دریا کے بہاؤ کی منجدھار گزر چکی تھی۔ اب وہ پایاب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایاب پانی میں پہنچ کر الیاس آصفی نے دفعتاً" محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد۔ اپنی انا کی بندشوں سے آزاد اس کی آنکھوں سے ذاتیات کے چشمے اتر گئے تھے۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

دنیا بے حد وسیع تھی۔ مگر وہ بلا کی وسعت اداسی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کو دیکھا۔ اس کے روبرو سینکڑوں ایلی تھے جو جذبات کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ وہ انہیں قابل نفرین نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اسے ان سے ہمدردی تھی اس کے دل میں ان کی عزت تھی۔

ایلی میلے سے واپس آ رہا تھا۔ لیکن جو میلے کو جا رہے تھے ان پر خندہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ بھرپور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری ہے۔ اور بے لاگ لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری ہے۔

اس کے خیال میں محبت ایک عظیم تجربہ تھا۔ اور اس عظیم تجربے کے چار ضروری دور تھے۔ پہلا یہ کہ شدت سے محبت کرے دوسرے اسے محبت میں عظیم کامیابی حاصل ہو یعنی تخت پر بیٹھے اور مور چھل کرائے۔ تیسرے یہ کہ محبوب اس کی تذلیل کرے اور دھکا دے کر تخت سے نیچے پھینک دے ذلت اور رسوائی چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور چوتھا یہ کہ وہ عشق کامیابی تذلیل اور رسوائی سب سے بے نیاز ہو جائے ——— بے لاگ بے لگاؤ۔

اس کا یہ نظریہ جسمانی عشق کے متعلق تھا۔ افلاطونی یا روحانی عشق کے تخیل سے وہ واقف ہی نہ تھا۔ افلاطونی عشق تو محض ایک قصہ تھا۔ البتہ روحانی عشق کے وجود سے وہ منکر نہ تھا۔ لیکن اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ روحانی عشق کا مطلب کیا ہے۔ ایک انسان کس طرح اللہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ مرشد کا نام سنا تھا۔ لیکن بیعت اور مرشد کے متعلق ابھی تک اس کے وہی خیالات تھے جن کا کسی زمانے میں دلی کی جامع مسجد میں اس نے

صاحب کے روبرو اظہار کیا تھا۔

روپتن

قاضی پور سے ایلی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گروپتن میں مقیم تھا۔ گروپتن ایک چھوٹا بصورت سا قصبہ تھا۔ اس میں دو ایک کشادہ سڑکیں تھیں جن پر بنگلے نور کاٹیج بنے ہوئے دو ایک تنگ و تاریک بازار تھے شہر کے باہر چند ایک صاف ستھری آبادیاں تھیں کچھ حصہ گھٹا سا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گروپتن میں طرز کہن اور طرز جدید دونوں پہلو موجود

بازاروں میں بھیڑ تھی سول لائنز نما علاقے میں خوبصورت ویرانی تھی۔ ایلی کو ویرانی پسند اور اس کا مکان بھیڑ اور ویرانی بھرے علاقوں کے سنگم پر تھا۔ گھر میں عالی تھا اور ایلی کی ماں رہ۔ اب ایلی اکیلا نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ عالی سے الگ رہنا تکلیف دہ تھا۔ چونکہ اس اپنی تمام تر محبت عالی پر مرکوز کر دی تھی۔ اس محبت میں ہسٹریا کا عنصر نہ تھا۔ پھر بھی اس کی م تر توجہ عالی پر مرکوز تھی غالباً" گزری ہوئی تلخی کو بھلانے کے لیے اس نے عالی کا سہارا لے لیا

عالی ایک بھدا سا لڑکا تھا۔ اس کے نقوش موٹے تھے۔ چہرے پر بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ ت خاصی حد تک بے ربط تھیں۔ اس کے خدوخال میں قطعی طور پر شہزاد کی جھلک نہ تھی۔

ہاجرہ کا ایلی کے پاس رہنا ناگزیر تھا۔ چونکہ چار سال کے بچے کو پاس رکھنا ایلی کے لیے ممکن تھا۔ وہ اکیلا نہ تو اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر خود نوکری کے ئض ادا کر سکتا تھا۔

ایلی نے پھر سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ بلاواسطہ کتاب اٹھائی اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ شدت سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت محض فرار کی ی تھی۔ تلخ واقعات کو بھولنے کے لیے اس نے کئی بار کتاب کا سہارا لیا تھا۔ لیکن اب پہلی تبہ اس نے کتاب کے لیے مثبت شدت سے محسوس کی تھی۔

سارا دن یا تو وہ پڑھتا اور یا عالی سے کھیلتا رہتا اور پھر اس کا جی چاہتا کہ شام کو کسی طرف ل جائے اور پھر کسی غلام کے پاس جا بیٹھے۔ اور مسئلہ کی لرزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر

لیں اور وہ ان میں ڈوب جائے۔

ایلی کے کردار کی شدت اگرچہ بہت کم ہو چکی تھی پھر بھی وہ مٹھاس بھرے تاثرات کا محتاج تھا ایسے تاثرات جو اس کی شخصیت کے کونوں کو تراش کر ہموار کر دیں۔ بچی کچی تلخیوں کو سمیٹ لیں۔ اس کے نزدیک موسیقی سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔ جو اسے سکون سے ہم آہنگ کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت میں لے پیدا کرے۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کیوں نہ میں طبلہ بجانا سیکھوں۔

اس نے اس سلسلے میں تحقیق کی۔ لیکن ہر جگہ سے اسے ایک ہی جواب ملا۔ سارے گروچتن میں صرف ایک ہی فرد تھا جو طبلہ بجانے اور رنگینیٔ محفل کے لیے مشہور تھا۔ اور غالباً اسی وجہ سے سب لوگ اسے رنگی کہتے تھے۔

رنگی کسی سرکاری دفتر میں انسپکٹر تھا——! ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی انسپکٹر طبلے میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے اس نے انسپکٹر سے ملنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اسے ایک بڑے عہدے دار سے راہ و ربط پیدا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

گروچتن میں جو مکان انہیں ملا اس کے پڑوس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں وہ وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ اور بے حجابانہ ایلی کی طرف دیکھ کر پراسرار طور پر مسکراتی رہتیں۔

ایلی نے پہلے تو ان سے دور رہنے کی کوشش کی۔ وہ گھر میں داخل ہوتیں تو ایلی کمرے میں گھس جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے میں پہنچ جاتیں تو وہ باہر صحن کی طرف بھاگتا۔ ایک روز جب وہ صحن کی طرف جانے لگا تو بڑی لڑکی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور بامعنی انداز سے مسکرانے لگی۔ ایلی کو اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ اب وہ ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے عورت میں وہ خصوصی دلچسپی نہ رہی تھی جو کسی زمانے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ جوانی میں وہ عورت سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کی طرف بری طرح کھنچا جاتا تھا۔ ڈر اور دلچسپی۔ عورت اس کے دل میں یہ دو جذبات پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت کو اس نے بے حد اہمیت بخش رکھی تھی۔

پھر عورت کے متعلق اس کے خیالات تلخی سے بھر گئے۔ وہ بے وفا تھی، اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلتی تھی وہ ایک سنہرا جال تھی۔ لیکن اس

باوجود اس کا سحر عظیم تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عورت ایک کمزور اور بے بس مخلوق ہے۔ اور اس کی یت میں گہرائی نہیں۔ اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ قدرت کی طرف سے وہ تسخیر پر ر رہے۔

شاید اسی وجہ سے اسے ان دو لڑکیوں سے قطعاً دلچسپی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس نے سوچا کہ وہ اس کی آزادی میں مخل ہو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا مکان بدل لیا۔ اور وہ ہر کے کونے پر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

رنگی

پہلے روز ہی رات کے وقت اس کے کان کھڑے ہوئے کوئی شخص طبلہ بجا رہا تھا۔ پھر کسی نے گانا شروع کر دیا۔ اسے غلام یاد آ گیا۔

اگلے روز شام کے وقت ایلی نے پھر طبلہ کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل گیا۔ ریب ہی پڑوس میں ایک بیٹھک سے طبلہ بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہو کر بیٹھک کی طرف دیکھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سوٹ پہنے بو لگائے فرش پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ اس کا لباس خوبصورت تھا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ارسٹوکریٹ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے میں بلا کی جاذبیت تھی اس کی شخصیت سے مٹھاس کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

ایلی قریب چلا گیا۔

"آیئے آیئے۔" وہ مسکرایا "بیٹھیے۔"

"نہیں نہیں۔" ایلی بولا۔ "آپ شغل جاری رکھیے میں یہیں سے سنوں گا۔"

"آیئے بیٹھیے نا۔" وہ بولا "آ بھی جایئے۔" وہ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد دلنواز تھی

"اب آ بھی جایئے۔"

ایلی اندر داخل ہو گیا۔

دیر تک وہ طبلہ بجاتا رہا۔ ایلی چپ چاپ سنتا رہا۔

پھر اس نے طبلہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور بولا "لیجئے میں ذرا سستالوں۔ اجازت ہے نا؟"
وہ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے عرصہ دراز سے اسے جانتا ہو۔

"آپ کو اس میں دلچسپی ہے کیا؟" اس نے طبلے کی طرف اشارہ کیا۔

"سننے کا شوق ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"یہ تو کان کا رس ہے۔" وہ مسکرایا۔ "جس کے کان میں رس ہے اس کی روح میں مٹھاس ہے۔"

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "کان میں رس نہیں لیکن روح میں مٹھاس پیدا کرنے کی آرزو ہے"۔

"سب رنگ رس کا کھیل ہے۔" وہ بولا۔

"آپ کی تعریف؟" ایلی نے پوچھا۔

"مجھے رنگی کہتے ہیں۔"

"رنگی؟"

"ہاں طنزاً کہتے ہیں"۔ "وہ بولا۔ "بے رنگ ہوں نا اس لیے۔"

"بے رنگ ہیں آپ۔" ایلی نے کہا۔ "ایسا اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔"

"اونہوں۔" وہ بولا۔ "زندگی صرف کر دی لیکن سمجھ لیجئے کھو دی۔ بات پیدا نہیں ہوئی۔"

"نہیں ہوئی۔"

"بالکل نہیں ہوئی۔" وہ بولا "رس پیدا نہیں ہوا۔ صرف ڈب ڈب کرنا سیکھ لیا ہے۔ صرف فارم روح نہیں شور ہے دھڑکنیں نہیں۔"

ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قدر رنگین شخصیت۔ اس کی ہر بات میں رنگ تھا رس تھا۔ انداز بیان میں، چھوٹی چھوٹی حرکات میں۔ نگاہ میں، تکلم میں، گروپتن کے صحرا میں وہ پہلا نخلستان تھا۔

رنگی پھر سے طبلہ بجانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ طبلہ بجاتے ہوئے اس کی بیٹھک بھی عجیب تھی چھاتی نکلی ہوئی۔ سر اٹھا ہوا۔ کتنا وقار تھا اس بیٹھک میں ایلی اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً" وہ مسکرایا۔ "تکلیف نہ ہو تو ذرا آگے سے ہٹ جایئے۔ ذرا ادھر کو۔" انہیں

لیف ہوتی ہے اس لیے کہتا ہوں۔" رنگی پھر مسکرایا۔

"کسے تکلیف ہوتی ہے؟" ایلی پوچھا

"شریمتی کو۔" وہ مسکرایا۔

شریمتی وہ حیران تھا۔ لیکن مزید بات پوچھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

کچھ دیر رنگی اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا کر بولا۔ "شب بخیر شب بخیر جایئے۔ آرام فرمایئے۔" اس کا روئے خطاب ایلی کی طرف نہ تھا۔

شریمتی

"ارے۔" ایلی حیران تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے اس نے دروازے سے باہر دو ایک بار دیکھا تھا۔ لیکن باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

"معاف کیجئے گا صاحب۔" رنگی ایلی سے مخاطب ہوا۔ "شریمتی آ جاتی ہیں تو مجھے انہیں لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اکثر آتی ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ دروازے کے سامنے بیٹھو۔ روشنی منہ پر پڑے۔ دروازے میں کسی کو کھڑا ہونے نہ دو ہم تو احکامات کے پابند ہیں۔"

"کون ہے وہ؟" ایلی نے پوچھا۔

"ہے۔" وہ مسکرایا۔ اپنے مہربانوں میں سے ایک ہے۔ اپنی زندگی ان مہربانوں کی نگاہ کرم کے سہارے بیت رہی ہے۔"

رنگی سے مل کر ایلی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔ رنگی میں کس قدر جاذبیت تھی۔ کتنا رنگین کردار تھا۔ ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ رنگی کے بے حد قریب ہو بہت قریب۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ مدرسہ سے آ کر ایک پیالہ چائے پیٹ میں انڈیل کر وہ رنگی کے پاس جا بیٹھتا۔ رنگی کی شخصیت سے رنگ کے چھینٹے اڑتے اور بھیگ بھیگ جاتا۔

"ایلی صاحب۔" تیسرے ہی روز رنگی نے مسکرا کر کہا۔ "آپ شریمتی کے چانسز تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ دروازے سے ہٹ جایئے نا۔ انہیں دیکھ کر اپنا شوق پورا کرنے دیجئے۔"

ایلی نے مڑ کر دروازے سے دیکھا۔

دور سے ایک بڑی سی کوٹھی کی چار دیواری پر ایک رنگ دار گھٹا سا رکھا ہوا تھا۔ "اونہوں

یہ فاؤل ہے۔" رنگی بولا۔ "ادھر اعلانیہ دیکھنا فاؤل ہے۔ ہاں اندر بیٹھ کر چھپ کر شوق سے دیکھئے۔ میرے سارے دوست دیکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شریمتی یہ سمجھیں کہ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ میرے سبھی دوست جانتے ہیں اور شریمتی جانتی ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ اور چھپ چھپ کر اسے دیکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں کہ اس راز کو صرف ہم دونوں جانتے ہیں وہ خود اور میں۔ کیا پیارا دھوکا ہے۔ ساری شر۔متاں ہی پیارے دھوکے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان پیارے دھوکوں کا ایک جمگھٹا لگا رہے۔ اور میں اس میں ڈوبا رہوں۔" ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ ایلی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں انہیں دیکھوں آپ مجھے دیکھیں۔"

کچھ دیر تک وہ دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ "لیجئے "شریمتی چلی گئیں غالباً "پتا جی آ گئے۔"

"وہ کون ہیں ان کے پتا جی؟"

رنگی نے جھرجھری لی۔ "پتا جی وہ ہیں جو چاہیں تو مجھے تین سال کے لیے اندر کر دیں۔"

"یعنی۔" ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

"مجسٹریٹ ہیں غالباً" اور روز دعائیں مانگتے ہیں کہ میں کبھی ان کے پنجے میں پھنس جاؤں۔"

"ارے۔" وہ چلایا۔ "میں آپ سے باتیں کرنے میں وقت گنوا رہا ہوں اور ادھر وہ انتظار کر رہے ہیں۔" وہ دوڑ کر باہر نکلا اور بیٹھک سے باہر کھڑا ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد رنگی داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ کون تھے؟"

"اپنے ایک مہربان دوست ہیں۔ اپنی زندگی میں اور ہے ہی کیا۔ انسپکٹری کی بک بک۔" وہ ہنسنے لگا۔

"انسپکٹری؟" ایلی نے رنگی کی طرف دیکھا۔

"نوکری اور کیا۔" وہ بولا

"تو کیا آپ انسپکٹر ہیں؟"

"ہاں۔" بڑی ذلیل چیز ہے یہ انسپکٹری۔ دم گھٹتا ہے۔"

تو یہ وہی انسپکٹر تھے جنہیں ملنے سے ایلی ہچکچاتا تھا۔

"جی چاہتا ہے۔" رنگی بولا "کہ آج ہی استعفیٰ دے دوں' پر گزارہ گزر کیسے ہو گا۔ دال روٹی سے بھی جواب مل جائے گا۔ مجبور ہوں۔"

رنگی کی شخصیت میں رنگ اور رس کے علاوہ عجیب تضاد تھے۔ طبعاً" وہ ایک محبوب تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں عشق کرنے کے لیے بے پناہ تڑپ تھی۔ عشق میں وہ ایک بھنوار تھا جو پھول پھول بیٹھ کر رس چوستا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں واضح نسائیت کی جھلک تھی۔ لیکن جسم مردانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عظیم مرد کی جھلک تھی۔ کردار میں بھی مردانہ رنگ تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ وہ پیدائشی ارسٹوکریٹ تھا مگر اس کے خیالات اور جذبات میں عوام سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ خود کو ہمیشہ عوام میں سمجھتا تھا۔ اور آخری بات یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بہرحال زندگی کی بے پناہ شخصیت نے ایلی کو جذب کر لیا اور وہ گہرے دوست بن گئے۔

رضی

پھر ایک روز رضی آ گیا۔

رضی رنگی کا دوست تھا لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

رضی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ بدن فربہی پر مائل تھا۔ چہرے پر اکتاہٹ برس رہی تھی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی بیت چکا ہو اور اب کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کر رہا ہو۔ گزشتہ زندگی کی جھلک اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔

رضی کی آنکھیں بھری بھری تھیں جیسے نہ جانے کیا کیا جذب کر چکی ہوں۔ ان میں ایک دنیا آباد تھی۔ ایک شوخ و شنگ دنیا' جیسے ان آنکھوں سے کبھی رنگ کی پچکاریوں کے فوارے چھٹے ہوں جیسے وہ کبھی سرخ چیونٹیوں کے مسکن رہی ہوں۔ وہ بلاٹنگ پیپر اب بھی بھرے ہوئے تھے لیکن اب نہ تو ان میں تلخی تھی نہ شدت۔ مٹھاس کی پھلجھڑی چل رہی تھی۔ مسکراہٹ اس مٹھاس کو ہوا دیتی تھی۔

"ان سے ملیے یہ میرے نئے دوست ایلی ہیں' نام تو الیاس آصفی ہے۔ لیکن مجھے ایلی پسند

ہے۔ ایلی، رضی اور رنگی کیا تگڑی ہے۔"

"یہ وہ رضی ہیں۔" رنگی نے ایلی سی کہنے لگا "جو اس مردے میں جان ڈالتے ہیں۔" اس نے طبلے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ہاں تو رضی صاحب آج کچھ ہو جائے۔" رنگی نے اپنی ستار رضی کی طرف بڑھا دی "آج تو رضی ایمان سے آگ لگا دو۔ آگ آگ۔ چاروں طرف شعلے اٹھیں۔ اپنے مہربان بھی کیا یاد کریں گے۔ انہیں بھی پتہ چلے کہ تڑپ کسے کہتے ہیں۔"

رضی مسکرایا۔ اور کچھ کہے بغیر اس نے ستار بجانی شروع کر دی۔ رنگی نے طبلہ اٹھایا۔

رضی گانے لگا۔ اے ری عالی پیابن۔"

اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ اکتاہٹ بھری اداسی پھیل رہی تھی۔ وسعتیں اور بڑھ رہی تھیں۔ خلا قریب تر آ رہا تھا۔ خاموش ویران خلا۔

"اے ری عالی پیابن۔"

ایک روز جب رضی اور ایلی اکیلے تھے تو شبرمیتی آ گئیں۔

"آپ بھی درشن کر لیں۔" ایلی نے رضی سے کہا۔

رضی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

"آپ کو دلچسپی نہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"بہت، بے حد۔" رضی مسکرایا۔

"تو پھر؟"

"تھی —— اب نہیں۔" وہ بولا۔ "پہلے راہ چلتی سے تھی۔ چاہے راہ چلتی ہو۔ یا منڈیر پر کھڑی ہو۔ کہیں ہو۔ کیسی ہو۔"

"کیسی ہو۔" ایلی نے دوہرایا

"ہاں۔" رضی نے کہا۔ "ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ ہر عورت۔"

"کیا واقعی۔"

"ہاں۔" رضی بولا "لیکن اب تو سب بیٹیاں بن گئیں ہیں۔ کوئی عورت رہی ہی نہیں۔"

"کیوں۔" ایلی نے پوچھا۔

"بھرا میلا دیکھ لیا۔ بس ہم بھرا میلا چھوڑنے کے قائل ہیں۔" رضی مسکرایا۔

"کوئی تلخی رکاوٹ بن گئی کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

"نہیں۔" رضی نے جواب دیا۔ "الٹا اب تو مٹھاس ہی مٹھاس ہے۔" اس نے ایک مٹھاس بھری مسکراہٹ چمکائی۔

"رنگی تو مصروف کار ہے۔" ایلی نے کہا۔

"اچھا ہے۔" رضی بولا۔ "جو مصروف ہے وہ مصروف ہے۔"

"نصیحت کرنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟" ایلی نے پوچھا۔

رضی پھر ہنسا۔ "لوگوں نے ہمیں بہت کی تھیں۔"

"کیا۔"

"   ۔"

"پھر۔"

"وہ اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ ہم نہیں کرتے کیوں کریں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔"

رضی مسکرایا اور پھر چھوٹی آواز میں گانے لگا۔

"گردھر کی مرلیا باجے رے —— مدھوبن میں رادھکاں ناچے رے۔"

گردھر کی مرلیا باجے رے۔"

ایلی کے لیے یہ ایک نیا نظریہ تھا۔ کتنا رنگین تھا۔ کتنا پیارا تھا۔

ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اور گردھر کی مرلیا۔ باجتی رہی۔ مرلیا کے بول فضا میں گونج رہے تھے۔ اس کی تلخیاں ان سروں میں دھوئی جا رہی تھیں۔ شہزاد کے ماتھے کی بندی چمک رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی گردھر کی ایک رادھکاں ہو۔ اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ نفرت۔

انشاء اللہ

ایک روز جب ایلی چپ چاپ اداس بیٹھا تھا تو ہاجرہ بولی "ایلی۔"

"کیوں اماں!" اس نے اماں کی طرف دیکھا۔

"تجھے چھٹی مل سکتی ہے۔ کیا؟"

"کیوں نہیں۔"

تو چار دن کی چھٹی لے لے۔" وہ بولی۔

"کیوں اماں۔"

"سنا ہے دلی سے حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چل کے انہیں ملیں۔"

ایلی علی پور جانے کا خواہشمند نہ تھا کیونکہ جب بھی وہ وہاں جاتا تو محلے والیاں اس پر انگلیاں اٹھاتیں کہتیں اے ایلی دیکھ لیا نا تو نے ان باتوں کا انجام بس آخر دھول ہی اڑتی ہے۔

بوڑھے اسے دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے تھے۔ نوجوان سرگوشیاں کرتے۔

لیکن حاجی صاحب کا نام سن کر وہ تیار ہو گیا اور وہ چار روز کے لیے علی پور چلے گئے۔ حاجی صاحب ایلی کو دیکھ کر مسکرائے۔ "آیئے الیاس صاحب۔" وہ بولے۔ "بسم اللہ۔ خیریت تو ہے۔ ویسے تو اچھے ہیں آپ؟"

"جی شکریہ۔" وہ بولا۔

"کہیئے وہ طوفان گزر گیا نا۔"

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"جن طوفانوں کو چلنا ہوتا ہے چل کے رہتے ہیں۔" وہ بولے۔

"جی ہاں۔"

"اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا۔" وہ بولے۔ "آپ بھیگے نہیں۔"

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔

"ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔" حاجی صاحب مسکرائے۔

"کیوں ہمشیرہ صاحبہ۔" وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ "وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"جی۔" ہاجرہ بولی۔ "اب تو وقت آ گیا نا۔"

انشاء اللہ آئے گا۔" وہ بولے۔

آئے گا؟" ہاجرہ نے دوہرایا۔

"زیادہ دیر نہیں۔" وہ بولے۔ "دھوپ نکلنے سے پہلے بادلوں کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ محفل لگنے سے پہلے صفائی ہوتی ہے۔ فرش بچھایا جاتا ہے۔ گھبرایئے نہیں ہمشیرہ صاحبہ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گا۔"

"ابھی تو وہی حال ہے۔" وہ زیر لب بولی۔ "ایک قدم نہیں اٹھایا۔"

"ہوں۔" وہ مسکرائے۔ "کوئی چل کر آتے ہیں۔ کوئی تلاش کرنے کے بعد پہنچتے ہیں کسی

کو اٹھا کر لایا جاتا ہے۔"

"سبحان اللہ۔" وہ مسکرائے۔

"شادی کا نام نہیں لیتا۔" وہ زیر لب بولی۔

"وقت کی بات ہے۔"

"کوئی لڑکی بھی ملے۔" ہاجرہ نے کہا۔

"پہلے ہی خیال میں رکھا ہوتا تو آج بات کی شکل ہی اور ہوتی۔" حاجی صاحب مسکرائے۔

ایلی ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

حاجی صاحب کی باتیں بے حد سادہ تھیں اس کے باوجود وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ مسکرا رہی تھی ظاہر تھا کہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہاجرہ تو سمجھ لے اور وہ نہ سمجھ سکے۔

اس روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ذہن کے علاوہ کسی اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قابلیت کیا تھی اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا۔

بہرحال ایک بات تو مسلم تھی کہ حاجی صاحب کی ہر بات میں خلوص تھا۔ وہ پیر نہیں تھے۔ صحیح مرشد تھے یا نہیں اس کے بارے میں وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

حاجی صاحب دراصل اپنے کسی مرید کی سفارش کرنے کے لیے علی پور آئے تھے۔ وہ مرید خود دلی جا کر انہیں ساتھ لایا تھا۔ وہ آصفی محلے کا فرو نہ تھا۔ اور حاجی صاحب اس کے گھر ٹھہرے تھے۔

دو ایک مرتبہ وہ آصفی محلے میں آئے تھے تاکہ لوگوں سے مل سکیں۔ آصفیوں کی مسلسل منتوں کے باوجود انہوں نے ان کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اندریں حالات ان کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔

حاجی صاحب کے اس مرید نے اپنے مکان میں ایک کمرہ ان کے لیے خالی کرا دیا تھا۔ کہ وہ بہ اطمینان سے رہ سکیں۔

ان دنوں رمضان شریف کے دن تھے حاجی صاحب سے ملنے کے لیے رفیق اور یوسف بھی

آئے ہوئے تھے۔ یوسف نے اتنی لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رفیق پکا نمازی تھا۔ دونوں روزے رکھتے تھے۔ لیکن ایلی نے کبھی روزہ نہ رکھا تھا۔ صبح آٹھ دس بجے کے قریب وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف چلے جاتے اور سارا دن ان کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ پھر تین چار بجے کے قریب وہاں سے گھر آجاتے۔

ایلی رفیق اور یوسف کی باتیں سن کر حیران ہوتا تھا۔ یوں باتیں کرتے اور مسئلے مسائل پوچھتے جیسے کوئی بڑے مولانا ہوں۔

ان کی باتیں سن کر ایلی کو وہ دن یاد آجاتے جب وہ تینوں مل کر جلیل کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور جلیل مست آنکھیں بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں جھاڑو دیتے ہوئے باہر گلی میں نکل آتی اور ساری گلی میں جھاڑو دینے لگتی تھی۔ اس وقت بار بار رفیق کھڑکی سے باہر جھانکتا اور اس کے منہ سے "سی سی۔" کی آواز آتی۔ جیسے اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔ باہر صحن میں یوسف قلابازیاں لگاتا اور بندروں کی طرح ناچتا۔

اب وہ دونوں معزز سے بنے بیٹھے تھے اور شرع کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ جلیل تو بالکل ہی نمازوں اور وظائف میں کھو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے بدل جاتے ہیں۔ ایلی سوچتا۔

ایلی محسوس کرتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ وہی ایلی ہے جو اس زمانے میں تھا۔ اس کے خیالات بالکل وہی تھے۔ ان کی بنیاد اور تانے بنے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے خیالات کی لکیریں کچھ اور پھیل گئی تھیں لیکن ان کے پھیلاؤ کی سمت وہی تھی۔ رخ وہی تھا۔

ایلی کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ حاجی صاحب کی دنیا کی ایک جھلک دیکھے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرے لیکن جانے بغیر وہ آنکھیں بند کر کے آمین کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ حاجی صاحب کی عزت کرنے لگا تھا کیونکہ ان میں خلوص تھا اور وہ ناصح نہ تھے' بلند تر ہستی نہ تھے۔ مرشد نہ تھے۔ مسند پر نہیں بیٹھے تھے بلکہ ان سب کے قریب بہت قریب۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرتا تھا کہ وہ اس کے قریب تھے حالانکہ وہ خود ان سے بہت دور تھا۔ کوسوں دور۔ ان میں انسانیت تھی۔ برابری کا احساس تھا۔ اور ان کے دل میں ہر شخص کے لیے ہمدردی تھی۔

بڑا انسان

اب کی بار آپ نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔"

"جی۔" ایلی نے ان کی طرف دیکھا۔

"دلی میں تو آپ نے ہم سے بڑی باتیں پوچھی تھیں۔"

"جی۔" وہ ہنسنے لگا۔

"وہ مرہم کی بات یاد ہے آپ کو؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ زمانے گئے مرہم کی بات پوچھنے والے۔"

"ہاں۔" وہ بولے۔ "یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"انشاء اللہ بہتر زمانہ آئے گا۔"

"جی۔" اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے

"وہ پریشانی تو نہیں رہی نا۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔ "پشیمانی بھی نہیں۔"

وہ مسکرائے۔ "پشیمانی بھی لگاؤ کی دلیل ہوتی ہے۔"

ایلی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ نفسیات کا وہ باریک نقطہ ایک سادہ آدمی سے سن کر اسے حیرت ہوئی۔

"تو آپ آزاد ہو گئے۔" حاجی صاحب بولے۔

"جی آوارہ ہوں۔"

"آوارگی۔" وہ بولے "کبھی منزل کی طرف بھی لے جاتی ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ بولے۔ "لیکن کوئی منزل ہو بھی۔"

"کبھی منزل خود راہی کے سامنے آجاتی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "یہاں سبھی راہی ہیں۔ کسی کو منزل کا شعور ہے کسی کو نہیں ویسے راہی سبھی ہیں۔"

"منزل کو کرنا کیا ہے۔" ایلی نے کہا۔

"سبحان اللہ۔ اچھا خیال ہے۔" وہ بولے

ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ عجیب مرد ہے اس کی بات رد بھی کرو تو بھی

سبحان اللہ کہتا ہے۔

"انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا۔" حاجی صاحب بولے۔

"کون سا دن؟" ایلی نے پوچھا۔

"آئے گا ضرور آئے گا۔" وہ بولے "ہم تو شاید نہ ہوں گے۔" وہ مسکرائے۔

اسی شام چار بجے کے قریب جب حاجی صاحب لیٹے ہوئے تھے اور رفیق یوسف اور ایلی آپس میں باتیں کر رہے تھے تو نہ جانے کس بات پر انہوں نے حاجی صاحب کی رائے پوچھنے کے لیے انہیں پکارا

حاجی صاحب چپ چاپ پڑے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سو گئے ہیں۔" رفیق نے کہا۔

"ارے یہ ان کے دانت تو دیکھو۔" ایلی نے کہا۔

وہ سب حاجی صاحب پر جھک گئے۔ حاجی صاحب کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے مقفل ہو گئے ہوں۔

"ارے۔" ایلی چلایا "یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔"

رفیق نے انہیں جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کے توں پڑے رہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔

رفیق نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

حاجی صاحب کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ رفیق ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔

ڈاکٹر نے آ کر ٹوٹیاں لگائیں اور پھر ایک بوتل سنگھائی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

جب وہ ان کے منہ میں دوا انڈیلنے لگے تو حاجی صاحب نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کہ انہیں کچھ نہ دیا جائے۔ غالباً" وہ روزہ توڑنے کے حق میں نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "مریض کو بے حد نقاہت ہے —— ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر کے آنے پر کئی ایک محلے وار بیٹھک میں آ گئے اور مریض کی صحت کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہ مرید جس کے حاجی صاحب مہمان تھے کارخانے میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ایک بوڑھی عورت آ کر حاجی صاحب

اور دیکھتی رہی پھر رفیق سے کہنے لگی۔ "بے ہوش نہ ہو تو چارہ کیا کرے۔"

"کیوں اماں۔" یوسف نے پوچھا۔ "بات کیا ہے۔"

"اے تین دن سے یہاں پڑا ہے یہ اور نہ سحری نہ افطاری۔"

"کیا مطلب۔" ایلی نے پوچھا۔

"گھر والا تو کام پر رہتا ہے اسے کیا خبر کہ مہمان کی کیا حالت ہے۔" بڑھیا نے کہا۔ "اور گھر والی کہتی ہے۔ میں تو نہ بھیجوں گی کھانا۔ میں کیا نوکر ہوں کہ اس کے دوستوں کی خدمت کرتی پھروں۔"

"کیوں۔" رفیق نے پوچھا۔

"بس ضد اور کیا۔ بڑی بدمزاج ہے۔"

ایلی یہ سن کر حیران رہ گیا چار روز سے وہ روز وہاں سارا سارا دن گزارتے تھے لیکن حاجی صاحب نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ سحری اور افطاری کے بغیر روزے رکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کام سے وہاں نہیں آئے تھے بلکہ مرید کی سفارش کرنے آئے تھے جس کی بیوی انہیں بھوکوں مار رہی تھی۔

اس روز وہ تینوں افطار کے وقت وہیں رہے۔ رفیق اور یوسف افطار کے لیے کچھ پھل لے آئے اور انہوں نے حاجی صاحب کی منتیں کیں کہ وہ آصفی محلے میں جا کر ٹھہریں مگر انہوں نے انکار کر دیا بولے "یہ ٹھیک نہیں جن کے ہاں میں مہمان ہوں وہ برا مانیں گے ان کا دل دکھے گا۔" ایلی اس بڈھے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا انسان تھا۔

پوٹ

جب ایلی گروچین واپس پہنچا اور رنگی سے ملا تو اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہے

"یہ مانی ہے۔" رنگی بولا۔ "ویسے میرا بھتیجا ہے لیکن ہر بات میں مجھ سے چار قدم آگے ہے" وہ مسکرایا۔

مانی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا رنگ رنگی کی نسبت بہت گورا تھا خدوخال ستواں تھے جسم موزوں تھا۔ بال گھنگریالے تھے اور طبیعت میں لاابالی پن اور ساتھ ہی محبوبانہ بے نیازی

تھی وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا پکا راگ گنگنا رہا تھا۔

"آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔" مانی نے کہا اور پھر اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر گیت گنگنانے اور شریمتی کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"آپ کالج میں ہیں۔" ایلی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بولا "اب تو نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔"

"کیا ملازمت کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"نوکری کیا ہے۔"

"پوئٹ ہوں۔" اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"پوئٹ۔" ایلی نے حیرت سے دوہرایا۔ "نظمیں لکھتے ہیں کیا؟"

"نظمیں لکھتا ہوں ڈرامے سٹیج کرتا ہوں۔ شو کا اہتمام کرتا ہوں سبھی کچھ۔" اس نے بے پرواہی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"لاجواب نوکری ہوئی نا۔" ایلی نے کہا۔

"بے کار۔" وہ بولا۔ "بیگم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے۔ لڑکیاں مسکاتی ہیں صاحب گھورتا ہے۔ کسی روز جان سے مار دے گا۔"

"تم تو روتے ہی رہتے ہو۔" رنگی مسکرایا۔

"رونق سے کون منکر ہے۔" مانی بولا۔ "رونق کا تو میں بھی قائل ہوں۔"

"تو پھر۔" ایلی نے پوچھا۔

"جان کا روگ نہ بنیں تو۔" مانی نے کہا۔

"نہ بناؤ۔" رنگی بولا۔

کون بناتا ہے' زبردستی بنتی ہیں۔" مانی نے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں شریمتی آ گئی۔ رنگی دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ "لو بھئی۔" وہ بولا۔ "اب تو خاموش ہو جاؤ۔ شریمتی پہلے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہو گیا۔"

"یار۔" مانی بولا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں۔"

"تمہیں کیا پتہ یہ ظالم تو جے جے ہے۔" رنگی نے جواب دیا۔

"جے جے تو نہیں خالی دنتی ہی ہے۔" مانی نے کہا۔ "البتہ وہ دوسری والی پتلی جو ادھر رہتی ہے۔ وہ ہے کچھ کچھ۔"

"وہ وہ تو شہزادی ہے شہزادی۔" رنگی نے کہا۔

شہزادی تو نہیں خیر۔" مانی بولا۔ "خاصی ہے۔"

"شہزادے کو جو بھی میسر ہو وہ شہزادی ہوتی ہے۔" رنگی مسکرایا۔

شہزادہ تو جھک مارتا رہتا ہے۔" مانی ہنسا اور پھر دھوپ میں بیٹھ کر گیت گنگنانے لگا۔

ایلی اس کی باتیں حیرانی سے سن رہا تھا۔ عجیب لوگ تھے۔ ذہنی چمک تھی۔ رنگینی تھی اور جوانی بھی۔

ایلی ہمیشہ ان شخصیتوں کو پسند کرتا تھا جن میں ذہنی چمک ہو جو رسمی خول سے آزاد ہوں۔ لیکن حال میں وہ سوچنے لگا تھا کہ صرف ذہنی چمک ہی کافی نہیں۔ وہ حاجی صاحب تھے ان کی شخصیت میں اس قدر ہی جاذبیت کیوں تھی۔ پھر وہ غلام تھا۔ ڈیرہ والا غلام۔ آخر وہ کون سی بات تھی جو ان میں بلا کی جاذبیت پیدا کر رہی تھی۔ ان میں ذہنی چمک قطعی طور پر مفقود تھی۔ رنگین باتیں یا رنگ کی پچکاریاں نہیں تھیں۔ پھر وہ شخصیتیں دوسرے کو گود میں کیوں لے لیتی تھیں۔ وہ جاذبیت اس ذہنی چمک کی جاذبیت سے کہیں زیادہ پر اثر تھی بے شک ذہنی چمک میں اٹھان تھی۔ پھیلاؤ نہیں تھا۔ وسعت نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رضی میں بھی پھیلاؤ ہے' وسعت ہے۔ اگر مانی اور رنگی کی باتوں میں رنگینی تھی تو رضی اور غلام کی خاموشی رنگین تھی۔ رنگی میں گرفت تھی رضی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رضی مسلسل سورج تھا جس میں سے ہر وقت شعاعیں نکلتی تھیں اور گرماتی تھیں۔

مانی اور رنگی کی گفتگو صرف لڑکیوں تک ہی محدود نہ رہتی تھی کبھی وہ راگ و دیا پر بحث چھیڑ لیتے اور مختلف راگوں کے تاثرات پر گرمجوشی سے باتیں کرتے ——— سیاست میں ان کی دلچسپی محض اخباری قسم کی تھی۔ ایلی خود سیاست میں کورا تھا۔ اسے سیاسی مسائل سے قطعی طور پر لگاؤ نہ تھا۔

نگہت

گروچتن میں ایلی کا مرکز رنگی کی بیٹھک تھی۔ مدرسے سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر جاتا اور

چند ایک منٹ رسمی طور پر وہاں ٹھہر کر عالی کو اٹھا کر رنگی کی بیٹھک میں پہنچ جاتا۔

عالی کے ذہن پر ایک خوف طاری رہتا تھا۔

پہلے ایک روز ناگاہ ابو گھر چھوڑ گیا تھا اور وہ اپنی امی کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ابو کہاں گیا اس کے بعد اس کی امی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اور ابو نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اور اسے اٹھا کر نہ جانے کہاں لے آیا تھا۔ اسے امی اور ابو کا یہ بکھیڑا سمجھ میں نہ آیا تھا۔

جب بھی ایلی گھر سے باہر نکلتا تھا تو عالی گھبرا جاتا۔ اسے یہ ڈر لاحق ہو جاتا کہ شاید وہ لوٹ کر نہ آئے اب تو گھر میں امی بھی نہ تھی۔ ابو چلا جائے گا تو کیا ہو گا۔ گھر میں ہاجرہ تو تھی لیکن عالی کو ہاجرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہاجرہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

عالی کا یہ خوف ایلی کے لئے بہت بڑی مشکل تھی وہ باہر نہ جا سکتا تھا۔ سکول جانے میں اسے بے حد دقت ہوتی تھی۔ عالی رونے لگتا۔ اور ایلی کے دل پر ٹھیس سی لگتی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دو ایک مرتبہ ایلی نے اسے سکول لے جانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار وہ ساتھ چلا بھی گیا لیکن وہ وہاں اداس پریشان حال رہا۔ اس بھیڑ میں ابو کا بھی ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔

سکول سے آنے کے بعد بہرحال ایلی اسے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ اور رنگی کی بیٹھک میں تو وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ اس پر رنگی ہنستا۔ "یہ باپ اور بیٹا بھی عجیب ہیں۔ جہاں ایک ہو گا' دوسرا بھی قریب ہی ہو گا کہیں۔ ایلی اور عالی کیا جوڑی ہے۔"

وہ دونوں بیٹھ ستار سنتے۔ رضی گانا سنتے اور مانی اور رنگی کی محبتوں اور یارانوں کے قصے سنتے حتیٰ کہ رات کے دس گیارہ بج جاتے۔ پھر وہ گھر لوٹتے تو ہاجرہ چپ چاپ بیٹھی ہوتی۔ ایلی کو ہاجرہ پر ترس آتا تھا۔ وہ بیچاری بڑھاپے میں پھر سے قید میں پڑ گئی تھی۔

ایک روز ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑی بولی۔ "ایلی زندگی کس طرح بسر ہو گی۔"

"کیا بات ہے اماں؟"

"دیکھو نا۔" وہ بولی۔ "آخر میں ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔"

"تو پھر؟"

"تم شادی کر لو بیٹا' ورنہ یہ لڑکا کس طرح پلے گا۔"

"تو کر دو۔" ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

ہاجرہ کا خیال تھا کہ ایلی شادی کے نام پر بدک جائے گا۔ شاید وہ ساری عمر دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہو گا۔ ایلی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔

تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہو جائے تو بھی اعتراض نہیں۔ نہ ہو تو بھی نہیں۔"

"تو کہاں کرو گے؟"

"کہیں بھی۔" وہ بولا۔

"محلے والے تو نہیں دیں گے اپنی لڑکی۔"

"ظاہر ہے۔" وہ بولا

"تو کہیں سے خود ہی تلاش کر لو نا۔"

"نہ اماں۔" وہ بولا۔ "یہ جھنجٹ مجھ سے نہ ہو گا۔"

"تو تمہاری پسند کیسی ہو گی ؟"

"کوئی بھی ہو منظور کر لو گے؟"

"ہاں۔" وہ بولا۔ "صرف ایک بات ہے۔"

"وہ کیا؟"

"جس روز اس نے عالی سے بدسلوکی کی میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔"

"ہاجرہ ہنس پڑی۔ "اے تم اپنے دوست سے کیوں نہیں کہتے۔"

"کس سے۔" وہ بولا۔

"اس رنگی سے۔"

"میں تو نہ کہوں گا۔"

"تو پھر میں کہوں۔" ہاجرہ نے کہا۔

"کہہ دیکھو۔"

"یہ تو اچھے لوگ دکھتے ہیں۔"

"ہاں اچھے ہیں۔"

"شاید کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں۔"

"شاید۔" وہ بولا۔ اور پھر عالی کو اٹھا کر رنگی کی طرف چلا گیا۔

ایلی کا رنگی کی بیوی سے ملنے کا اتفاق یہ ہوا کہ اسی روز جب چائے کا وقت ہوا تو غیراز
عمول بیٹھک میں چائے پینے کی ——— بجائے رنگی اسے گھر کے اندر زنانے میں لے گیا۔ اور
وی نکہت سے اس کا تعارف کرا دیا۔ نکہت کو دیکھ کر ایلی گھبرا گیا۔

نکہت خوبصورت تھی اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ نگاہ بے نیازی سے لبریز تھی۔
ونٹوں میں رنگی کی جھلک تھی۔ ٹھوڑی میں دبی ہوئی انبساط تھی۔ جوانی تھی۔ بے تکلفی تھی۔

ایلی اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ بلکہ نکہت میں رنگی اور رضی کی
میزش دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس میں وہی برداشت تھی جو رضی اور غلام میں تھی وہی
ھاس تھی اور اس کے باوجود نسائیت کی تمام تر رنگینی اور شوخی بھی تھی۔ یہ متضاد خصوصیات
ک جگہ کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں وہ حیران تھا۔

نکہت کو دیکھ کر ایلی کو رنگی کی شریمتیوں پر غصہ آنے لگا۔ رنگی کیوں جھک مار رہا تھا۔
یوں پھول پھول اڑ رہا تھا۔ جب کہ اس کے اپنے گھر میں بہار آئی ہوئی تھی۔ بلکہ ایک روز اس
نے رنگی سے اشارۃً یہ بات کہہ بھی دی۔ رنگی کا چہر خوشی سے تمتا اٹھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھا نا نکہت
قعی میری زندگی کی بہار ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی ہے جبھی تو مجھے اس سے اس قدر عشق ہے
لہانہ عشق۔“

ایلی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ دیکھ کر رنگی چلایا۔ ”تمہیں یقین نہیں آیا کیا۔ نکہت میری
وح کی روشنی ہے جسم کی بات چھوڑو۔“

”اور یہ جو فن فیریاں ہیں تمہاری۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اجی ان کی کیا حیثیت ہے۔“ رنگی نے کہا۔ ”اگر نکہت کو زکام ہو جائے اور اگر ان تمام
ن فیریوں کا بھرتا بنا کر کھلانے سے اس کا زکام دور ہو سکتا ہو تو میں ذرا تامل نہ کروں۔“

رنگی بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا' لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح متضاد
یں کیے جا رہا تھا عین اس وقت مانی نے شور مچا دیا۔ ”بھئی ادھر کی بھی خبر لو۔ کب سے بیچاری
وپ میں کھڑی ہے۔ تمہارے لیے۔“

”تتلی ہے کیا؟“ رنگی اچھل کر بولا۔

”ہاں ہاں۔“ مانی چلایا۔

رنگی نے دو چھلانگیں ماریں اور بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

”کیا نکہت برا نہیں مانتی۔“ ایلی نے مانی سے پوچھا۔

”بہت۔“ مانی بولا۔ ”کڑھتی ہے۔ لیکن بھئی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوں گے۔“

”وہ بھی تو نکہت ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”نکہت کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب کی محبوبہ ہے۔ جگت
بوبہ ہے۔ ہم سب اسے پیار کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ اسے بغیر پیار کرنے کے کوئی نہیں رہ
لک وہ میری محبوبہ ہے سہیلی ہے۔ راز دان ہے۔ اور وہ میری ماں ہے ماں۔ آؤ ہم چل کر اس
ے عشق لڑائیں۔“ مانی اندر جا کر نکہت کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”مامی۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو
باہو گئے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”بس برباد ہو گئے۔“

وہ مسکرائی۔

”کوئی خاطر میں نہیں لاتی۔“

”تت تت۔“ اس نے مذاق سے منہ بنایا۔

”اچھی مامی کسی ایسی لڑکی کا پتہ دو کہ مزا آ جائے۔ بے حد خوبصورت ہو۔ رنگیلی ہو۔
طرحدار ہو ——— تمہاری طرح۔“ پھر وہ دفعتاً چلایا۔

”یہ ہمارا ایلی ہے اس کی بات بنا دو کہیں۔“

”کیسی بات؟“

”اسے اچھی سی بیوی دلا دو۔“

”اچھا۔“

”بس یہ کام کر دو۔ ساتھی تلاش کر دینا۔ بیوی نہیں۔“ مانی نے کہا۔

”بیوی کیوں نہیں؟“

”بیوی بڑی بھدی شے ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

”پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟“

”الو کے پٹھے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اور تم۔“

"میں بھی ہوں۔ الو کا پٹھا۔"

"کیوں ہو؟" وہ ہنسی

"ماں باپ نے بنا دیا بس۔"

"نہ بنتے۔"

"زبردستی بنا دیا۔ اب کہیں ایلی کو الو کا پٹھا نہ بنا دینا۔ خیال رکھنا۔"

"ہے۔" رنگی چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ "میری پیاری کو دق نہ کرو۔"

نگہت رنگی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"بس تمہارے بغیر میرا دم نکلتا ہے۔" رنگی نے پیار سے نگہت کی طرف دیکھا۔ "ہم تو بس تمہارے بغیر یتیم ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ مسکرائی اور وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔

پاک بابا

ایک صبح ہاجرہ بولی آج میں نے خواب میں پاگ بابا کی زیارت کی۔

"پاگ بابا؟" ایلی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولی۔ "انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔"

"کیوں؟"

"دیر سے ان سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔"

"تو پھر۔"

"جانا ہی نہیں ہوا۔"

"کیوں۔"

"بس جھنجھٹوں میں پڑ رہی۔"

"ہوں۔" ایلی بولا۔

"حاجی صاحب کیا پاگ بابا کی زیارت کر آؤں۔" میں نے حاجی صاحب سے پوچھا تھا۔

"تو وہ کیا کہنے لگے۔"

کہنے لگے "اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضری دینا اچھا ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا تو ہو

ں کبھی کہنے لگے ہاں ہاں کیا حرج ہے۔"

"تو پھر ہو آؤ کہاں ہیں وہ۔" ایلی نے کہا۔

"لو اکیلی کیسے جاؤں۔"

"تو کسی کو ساتھ لے جاؤ۔"

"تم کیوں نہیں چلتے۔" اس نے پوچھا۔

"میں جا کر کیا کروں گا۔"

"حرج بھی کیا ہے۔ تم بھی کر لینا۔" ہاجرہ بولی۔

"کیا فائدہ۔"

"وہ ہنسی۔ "لو' اللہ کے بندوں سے ملنے کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"تقدیریں بدل جاتی ہیں۔"

"اب تقدیریں بدل کر کیا کرنا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔ "ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے تیری۔"

"ماں تو میری زندگی کی بات چھوڑ۔" ایلی نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتا ہے۔" وہ بولی۔ "چل اپنے لیے نہ سہی۔ میری خاطر چل۔"

"کیا کروں گا وہاں جا کر۔"

"تو چل تو سہی۔"

پاگ بابا امرتسر علی پور سڑک پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک بہت مٹا پگڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پگڑی باندھی ہوئی نہ ہو بلکہ گٹھا سا بنا کر سر پر رکھ لگی ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا چغہ لٹکتا تھا۔

ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بستر' ایک مٹی کا پیالہ۔ ایک لوٹا۔ اور ایک تھالی پڑی تھی۔ یہ بابا کا جملہ سامان تھا۔ اسے کبھی کسی نے بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ سڑک پر ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر گھومتا رہتا۔ چھاتی ابھری رہتی' گردن اٹھی رہتی۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے نپولین جہاز کے تختے پر گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہو۔

پھر وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن نماز پڑھنے کے لیے وہ سڑک سے ہٹ کر

قریب ہی کھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ واپس سڑک پر آ جاتا۔ بابا کو کبھی کسی نے سوتے' اٹھتے یا کھاتے پیتے نہ دیکھا تھا۔

اللہ سے بیاہ

ربتی پور کے گاؤں میں ایک روز جب لوگ مسجد میں گئے تو بابا وہاں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا مختصر سا سامان جس میں ایک چھوٹا سا بستر بھی شامل تھا۔ حجرے میں رکھا ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ مسافر ہے۔ شاید ستانے کے لیے وہاں رک گیا ہے۔ دو ایک روز تو لوگ اسے ساگ روٹی بھیجتے رہے۔ تیسرے روز ربتی کا نمبردار غصے میں آگیا۔ کہنے لگا۔ "دیکھ بابا یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ تو اب اپنا راستہ لے۔ یہاں ڈیرہ جمانا غلط ہے۔" چوتھے روز وہ پھر مسجد میں گیا۔ تو بابا جوں کا توں بیٹھا تھا۔

نمبردار کو طیش آ گیا۔ اس نے بابے کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

بابے نے اپنی پگڑی سر پر رکھی سامان اٹھایا۔ اور ربتی پور کی مسجد سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک پر بیٹھ گیا۔

اسی شام نمبردار کی بھینس بیمار پڑے بغیر مر گئی۔ سارا گاؤں حیران تھا کہ بھینس کو کیا ہوا۔ کچھ لوگ کہنے لگے "تم نے بابا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے"۔

نمبردار غصے میں چلانے لگا۔ "میں نے کیا برا کیا تھا۔ کیا شریعت کے خلاف بات کی تھی۔ سیدھی بات ہے میاں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ وہاں جا کر نماز پڑھو۔ میلاد کرو۔ عبادت کرو اور اگر کوئی مسافر ہو تو بے شک دو دن کے لیے وہاں ٹھکانہ بھی کر لے۔ پر یہ کیا ہوا کہ اسے گھر بنا کر بیٹھ جائے۔" نمبردار نے بھینس کی موت کو بابا کی بددعا کا نتیجہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے روز جب وہ حویلی میں گیا تو ایک اور بھینس مری پڑی تھی۔ "ارے۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ آٹھ روز میں جب اس کی تینوں بھینسیں بے وجہ مر گئیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی منتیں کیں "میں تباہ ہو گیا۔" یہ کیا مصیبت آ پڑی ہے مجھ پر' خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ضرور یہ اس بابا کی بددعا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میری توبہ ہے' میں اس کے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس سے معافی لے دو' ورنہ تباہ ہو جاؤں گا۔"

وہ سب مل کر بابا کے پاس گئے۔ لیکن بابا چپ چاپ بے نیازی سے سڑک پر ٹہلتا رہا جیسے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو۔ دیر تک وہ چیختے چلاتے رہے لیکن بابا اپنی ہی دھن میں ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر سڑک ناپنے میں مصروف رہا۔

اسی شام وہ پھر بابا کے پاس گئے۔ انہوں نے منتیں کیں۔ کہ وہ پھر مسجد میں آ بیٹھے۔ وہ گاؤں میں ایک مکان دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب تھے بلکہ وہ گاؤں والوں کو معاف کر دے ——— لیکن بابا نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔

پھر اگلے روز انہوں نے گاؤں کے وارے میں بیٹھ کر مشورہ کیا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز پیش کی۔ لیکن دولے چمار کی بات سب کو پسند آئی۔ اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک آدمی سڑک پر جا بیٹھا کہ بابا پر نگاہ رکھے۔ گاؤں کے دس ایک آدمی وضو کر کے انتظار میں بیٹھ رہے۔ جب بابا نماز پڑھنے کے لیے کھیت میں گیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب آگے اور بابا کے پیچھے قطار بنا کر نماز پڑھنے لگے۔

جب بابا نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور اس نے پیچھے دیکھا کہ گاؤں والے اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ چلانے لگا۔ "جاؤ جاؤ۔ اٹھو میرے پیچھے مت بیٹھو۔ تم نے اللہ سے بیاہ نہیں کیا۔"

گاؤں والوں میں سے ایک بولا۔ "ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑیں گے۔ جب تک ہمیں معاف نہ کرو"

"مت پڑھو' مت پڑھو۔" بابا چلایا۔ "تم نے اللہ کے ساتھ بیاہ نہیں کیا۔"

"تو کہہ دو گاؤں والوں کو معاف کیا۔" وہ بولے۔

"اللہ معاف کرے گا۔" وہ بولا۔ "جاؤ جاؤ۔"

"اللہ نہیں کرے گا۔ جب تک تم نہ کرو۔" گاؤں والوں نے کہا۔

"جاؤ جاؤ۔" بابا بولا۔ "میں کون ہوں۔ میں کچھ نہیں میں کچھ نہیں۔ جاؤ۔"

"چاہے تم کچھ نہیں۔" گاؤں والوں نے کہا۔ "جب تک تم یہ نہ کہو گے کہ جاؤ معاف کیا نہیں جائیں گے۔"

"بابا اٹھ بیٹھا۔ وہ کھیتوں میں گھومنے لگا۔" پگلے پگلے تنگ کرتے ہیں۔ تنگ کرتے ہیں۔"

گاؤں والے وہیں بیٹھے رہے۔

"جاؤ۔ جاؤ۔" بابا بار بار ان کے قریب آ کر چلاتا۔

"کہو معاف کیا۔" وہ جواب دیتے۔ بابا پھر گھومنے لگتا۔ "میں کون ہوں میں کون ہوں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔"

دیر تک وہ یوں ہی چلاتا رہا۔ پھر بولا۔ "جاؤ معاف کیا جاؤ جاؤ۔ اللہ سے بیاہ کر لو۔ سب اللہ سے بیاہ کر لو جاؤ۔"

اس کے بعد انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ بابا گاؤں میں آ رہے لیکن بابا نے ان کی بات نہ سنی اور وہیں سڑک پر گھومتا رہا۔

بابا کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ارد گرد کے علاقے کے لوگ بابا کے پاس آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ بابا نہ بیٹھے گا نہ بات کرے گا۔ لہذا لوگوں نے آ آ کر بابا کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ بات کرنی ممکن نہ تھی مگر وہ سلام تو کر سکتے تھے اور رسم اس قدر عام ہو گئی کہ سڑک پر چلتی ہوئی بسیں' لاریاں اور موٹریں بابا کے ڈیرے کے پاس آ کر رک جاتیں ڈرائیور انجن بند کر دیتے اور پھر از سر نو گاڑی سٹارٹ کر کے چل پڑتے یہ ان کی سلامی تھی۔

براتیں رک جاتیں۔ بینڈ انگریزی نیشنل انتھم بجاتے اور سلام کے بعد خاموشی سے پھر چل پڑتے راہگیر رک جاتے۔ سلام کرتے اور پھر چل پڑتے۔

اور بابا اتنی بڑی پاگ سر پر رکھے سڑک پر ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہتا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوتی۔ گردن تنی ہوتی۔ سر اوپر کی طرف اٹھا ہوتا۔ اور وہ ادھر ادھر یوں دیکھتا جیسے جہاز کا کپتان ہو۔ حالات کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کو کھینچ کر پار لے جانے کے متعلق ملاحوں کو احکامات صادر کر رہا ہو۔"

میں کیا کروں

جب ہاجرہ اور ایلی وہاں پہنچے تو بابا کھیت میں بیٹھا نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ ہاجرہ چپکے سے بابا کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ ایلی عالی کو اٹھائے قریب ہی بیٹھ کر تنکے سے زمین کریدنے لگا۔

نماز سے فارغ ہو کر بابا نے مڑ کر دیکھا۔ "تم نے اللہ سے بیاہ کیا ہے؟ وہ چلایا۔

"کیا ہے بابا جی۔" ہاجرہ نے جواب دیا۔

"اچھا کیا۔" وہ بولا۔ "اچھا کیا۔"

"بابا جی یہ میرا بیٹا ہے۔" وہ ایلی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "ادھر آ ایلی۔ ادھر آ۔ بابا کے سامنے۔"

ایلی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بابا نے ایلی کی طرف دیکھا۔ غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہارا بیٹا ہے۔" دفعتاً وہ بولا۔

"جی بابا۔" ہاجرہ بولی۔

"تمہارا بیٹا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔"

"دعا کریں آپ۔" وہ بولی۔

"میں کون ہوں۔" وہ چلایا۔ "میں کون ہوں کہ دعا کروں۔"

"آپ اللہ والے ہیں۔" ہاجرہ بولی۔

"اللہ اپنے کام آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرے وہ سب کرتا ہے ں کون ہوں۔"

"آپ اللہ والے ہیں۔" ہاجرہ نے پھر دہرایا۔

"سبھی اللہ کے ہیں۔ میں بھی ہوں پھر میں کیا کروں۔" پھر وہ اٹھ بیٹھا اور وہیں کھیت میں ر کاٹنے لگا۔

"وہ سب کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے کون کرتا ہے پھر کون کرتا ہے۔ وہی جانے۔ اسی کے کام ا وہی جانے۔ میں کیا کروں۔" دیر تک وہ میں کیا کروں کی رٹ لگاتے ان کے سر پر منڈلاتا

پھر وہ ایلی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیا نہیں کیا؟ ———۔" بابا چلایا۔ "کیا نہیں کیا؟ جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرا لگایا تو حضرت لاغور نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لیا تھا' نہیں لیا تھا؟"

ایلی نے ڈیرہ کا نام بابا کے منہ سے سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا نہیں کیا اس نے۔" بابا چلا۔ "وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ واپسی پر وہ پھر ایلی سے روبرو کھڑا ہو بلا۔

اور تم کو وقت پہ وہاں سے نکال دیا۔ اور تمہیں چٹے کٹڑے میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟"
چٹا کٹڑا۔ ایلی کو امرتسر یاد آگیا۔

"اور پھر تمہارا منہ کالا کر دیا۔ اور تم چلتے پھرتے رہے اور لوگ چلتے پھرتے رہے۔ اور تم ان کو دیکھتے رہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہے۔ پر انہوں نے تمہیں نہ دیکھا۔"

کیا نہیں کیا؟ کیا نہیں کیا؟ پھر وہ دیوانہ وار چکر کاٹتا رہا۔ کہتے ہیں نہیں کیا۔ نہیں یا تو نہیں کیا کروں۔ چلو نہیں کیا۔ پھر تم کون ہو کہنے والے نہیں کیا۔ سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ پھر وہ ایلی کے روبرو آکر کھڑا ہوا۔ "کیا نہیں کیا۔" وہ چلایا۔ "پھر تمہیں داتا کے قدموں میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟" وہ بولا۔ "بولو۔ دی ۔ دی۔ وہ دینے والا ہے۔ ہم کون ہیں۔ ہم کون ہیں وہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ دینے والا۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

بابا پھر ایلی کے روبرو آکھڑا ہوا پھر بولا۔ "جھنڈے شاہ نے تمہاری حفاظت کی۔ تم پر ترس کھایا۔ تمہیں بچایا۔ رحمت ہو گی اللہ کی بس اسی کی رحمت یہی چیز ہے۔ ہم کیا ہیں۔ ہم کیا ہیں کہتے ہیں کیا نہیں کیا پگلے پگلے۔" وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔

بڈھا اور لمبا

"اور اور۔" وہ رکا۔ "اس نے تمہارا ناواں لکھ لیا۔ نہیں لکھا؟ تم نے نہیں لکھوایا۔ تم نے کہا کہ تم اس سے بیاہ نہ کرو گے۔ نہ کرو نہ کرو۔ پھر کیا ہے؟ اس کا کیا؟ وہ تو اپنی رحمت سے بلاتا ہے۔ نہ جاؤ۔ نہ جاؤ پھر کیا ہے؟ اس پر بھی تمہارا ناواں لکھ لیا۔ لکھ لیا۔"

وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ "خود اندھے ہیں خود اندھے۔ اور کہتے ہیں۔ کچھ نہیں کیا۔ پھر میں کیا کروں۔ کیا کروں ہیں۔"

وہ پھر آکھڑا ہوا۔ "اس بڈھے نے سب کچھ بتایا نہیں بتایا کچھ بولا۔ اس نے تمہارا ناواں لکھا ہے وقت وقت کی بات ہے۔ وقت پر ہوتا ہے وقت پر نہیں ہوتا۔ اس بڈھے نے کہا وقت آئے گا۔ تم نے پرواہ نہ کی۔ اندھے ہیں اندھے اندھے ہی اندھے۔" وہ پھر چکر لگانے لگا۔

ایلی حیرت سے اس بڈھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ہاجرہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بابا نے کبھی کسی کو پاس نہ بٹھایا تھا۔ وہ ہاجرہ عالی اور ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عالی انگلیوں سے لکیریں

کھینچ رہا تھا۔

بابا پھر آگیا ۔ "پھر میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم وہاں جاؤ نہ جاؤ۔ جہاں تمہارا بلاواں ہے۔ دور بہت دور۔ رومی ٹوپی والا بڈھا بیٹھا ہے۔ وہ تم ایسوں سے نپٹ لے گا۔ کنویں کے پاس۔ مسجد کے پاس ندی کے پاس۔ وہ بڈھا بڑا جبردست ہے اور اس کا بالکا وہ لمبا ہی لمبا اور اونچے قد والا دونوں بیٹھے ہیں جہاں تم نے پہنچنا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ چلایا۔ "میں کیا کروں۔ جاؤ جہاں تم نے جانا ہے ان سے ہو کر پھر تم نے وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں تمہارا ناواں لکھا ہے یہیں سے ہو کر جانا ہے۔" اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔"

دفعتاً" بابا کو غصہ آگیا۔ "جاؤ جاؤ جاتے کیوں نہیں' جاؤ۔" اس نے ہاجرہ اور ایلی کو دھمکایا۔

"اس کو بھی لے جاؤ۔" اس نے عالی کی طرف دیکھا۔ "اس کو جو گل گیا تھا۔ پیٹ میں گل گیا تھا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ وہ غصے میں چلایا۔

"نہیں جاتے' نہ جاؤ نہ جاؤ۔ تم جانو بڈھا جانے میں کیا کروں' میں کیا کروں۔" یہ کہتا ہوا بابا سڑک کی طرف چل پڑا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ہاجرہ کے چہرے پر عجز اور انکسار کے تودے لگے ہوئے تھے عالی ایلی کا منہ تک رہا تھا۔ اور ایلی خاموش بیٹھا تھا چاروں طرف سے دھندلکا اس پر یورش کر رہا تھا۔

دھندلکے میں کھڑی شہزاد مسکرا رہی تھی۔ "جاؤ۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "رکاوٹ تو دور ہو گئی۔" حاجی صاحب کا سر ہل رہا تھا۔ "آئے گا وقت ضرور آئے گا۔" وہ مدھم آواز میں گنگنا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے انہوں نے اسی سرمے کی سلائی لگا رکھی ہو۔

غلام مسکرا رہا تھا۔ اللہ ہی اللہ ۔ اللہ ہی اللہ اس کی ستار سر دھن رہی تھی۔

"اے ری عالی پیابن ۔" رضی کی آنکھوں سے مٹھاس بھرے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ پیا پیا اُکل چیختی ہوئی اڑے جا رہی تھی۔

اس دھندلکے میں ایک بڈھا میلی سی رومی ٹوپی پہنے فضا کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ایک

اونچا لمبا دبلا پتلا انسان چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کنواں ایڑیاں اٹھائے ان کی طرف جھانک رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی مسجد کے مینار گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے چھوٹے چھوٹے درخت باادب کھڑے تھے۔

جب ایلی گروپتن پہنچا تو وہ دھندلکا بدستور قائم تھا۔

اس کے بعد ایلی کے احساسات میں نہ جانے کیا ہوا۔ جب بھی وہ رضی مانی اور رنگی کے پاس بیٹھا ہوتا اور رضی کوئی نہ کوئی راگ چھیڑتا۔ "گھری رے اے ندیا۔"

تو اس کے روبرو ایک وسیع میدان پھیل جاتا۔ گھری ندی کے قریب ایک کنواں ابھر آتا اور پھر پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے آ بیٹھتی اور ایک مختصر سی چار دیواری کے اندر سفید ٹائیلوں پر رومی ٹوپی اوڑھے ایک بڈھا اپنے ہی دھیان میں مگن بیٹھا ہوتا۔ پاس ہی دراز قد با ادب کھڑا ہوتا۔

"پون چلت بروتیا۔" رضی گویا آہیں بھرتا۔ "وہی دنیا" وہ چادر میں لپٹی ہوئی مسجد اپنا آپ سمیٹتی۔ دور ہوا سیٹیاں بجاتی۔ وسعتیں اور پھیل جاتیں۔ کائنات انگڑائی لیتی پتے سرگوشیاں کرتے درخت جھکتے ندی اور گہری ہو جاتی۔

ایلی رضی رنگی اور مانی کے درمیان بیٹھ کر بھی اسی منظر میں کھویا رہتا۔

"لو شریمتی آ گئیں۔" رنگی مسکرایا۔

ایلی کی نگاہ تلے ایک نیلی رومی ٹوپی ابھری۔

"کیا بوٹا سا قد تھا۔" مانی تتلی کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایک بوٹا ایلی کی نگاہوں میں ابھرتا۔ اور پھر دراز قد ایلی کی طرف دیکھتا۔ اور پھر پاگ بابا چیختا۔ "جاؤ۔ چلے جاؤ تم جانو اور وہ جانیں۔ میں کون کون ہوں۔"

اور حاجی صاحب کا سر جھولتا۔ "اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔"

پاگ بابا نے نہ جانے ایلی کو کیا کر دیا تھا۔

لیکن ایلی کا ذہن جوں کا توں تھا۔ وہ ایک مضبوط قلعے کی طرح اس کے گرد حصار کیے ہوئے تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ بابا نے اس کے ماضی کے متعلق اتنی ساری باتیں بتا دی تھیں۔ ضرور بابا میں کوئی طاقت کام کر رہی تھی۔ لیکن ایلی سوچتا اس شعبدہ بازی سے مجھ سا سمجھدار آدمی کیسے متاثر ہو سکتا ہے۔ شعبدہ بازی ایلی کو حیران کن ضرور کرتی تھی اسے شعبدہ بازی سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ معجزات یا اس قسم کی غیر مرئی طاقت اس کے لئے حیران کن ضرور تھی۔ لیکن وہ اس

ی ایمان کو استوار نہ کرتی تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں خدا یا مذہب کے لیے جذبہ پیدا کرتی۔ نہ ہی وہ ایسے لوگوں کو اللہ والے تسلیم کرنے پر تیار تھا جن سے ایسی طاقتوں کا ظہور ہوتا۔

غالباً" اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد قائم نہ تھا

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا وہ جیمز جینز کی فلکیات ہالڈین کیسلے کے سائنس کا عجز۔" سے متعلق مضامین برٹرنڈرسل کے فزکس سنتایانا کے جذبات کاؤنٹ بیبین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ولز کی سائنس فکشن کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا۔

ڈر کی بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا اسے اللہ کے بندوں طاقتوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو اسے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چونکہ اسے ڈ کی طلب نہ تھی احترام تھا فقط احترام۔ ویسے وہ اللہ کی محبت سے کورا تھا۔ اللہ سے محبت کا ال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ سے محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی لی اٹھا کر نیچے اتر آئیں۔ اسے بجائیں اور کائنات مادھوبن میں رادھکاں کی طرح ناچے اور ان مرلی کے سحر تلے بوٹے اگ آئیں پھول کھل جائیں اور کوئل چلائے پیو پیو۔

ہندوئیت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لیے قابل قبول تھا۔ اسلام ے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا۔ عظمت عظمت عظمت عظمت۔ محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں ے اخذ کیا تھا۔ اسلام سے نہیں۔

لہٰذا معجزات کو خاطر میں لانا یا اللہ کے ان بندوں کے سامنے جھکنا بے کار تھا۔ ایلی کی ذہنی بے حد مستحکم اور محفوظ تھی۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

شاید اسی لیے اسے ٹھمریوں سے محبت تھی چونکہ ٹھمریوں کے زیر اثر مرلی اٹھائے کٹ ے نیچے اتر آئے۔ اور پنگھٹ پر اسے گھیر لیتے۔ اس کی ذہنی چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ اس کے کی گاگر پھوٹ جاتی اور وہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہو کر رادھکاں بن کر ناچتا۔

لیکن یہ رومی ٹوپی والا بڈھا اور دراز قد کون تھے۔ جو اس کی پرائیویٹ زندگی میں خواہ مخواہ ے چلے آ رہے تھے۔ لاحول ولا قوۃ عجیب بات تھی کہ وہ لاحول پڑھنا بھول جاتا۔ اس کا دل

احترام سے بھر جاتا۔ اور پھر نہ جانے کون مرلی چھیڑ دیتا اور کائنات ناچنے لگتی۔

خاموش عزم

پھر ایلی ہاجرہ اور عالی چند ایک روز کی رخصت پر علی پور چلے گئے۔

علی پور ایلی کے لیے ایک ویرانہ تھا۔ نہ وہاں اس کا دوست تھا۔ نہ کوئی دلچسپی شہزاد کے چوبارے کو دیکھ کر اسے ہلکی سی اداسی محسوس ہوتی تھی۔ اور بس۔ محلے والوں کے دلوں میں ابھی تک اس وقت کی یاد باقی تھی۔ اگرچہ محلے والیاں اسے ہنس کر بلاتی تھیں لیکن جلد ہی کسی کے منہ سے زمانہ ماضی کی کوئی بات نصیحت کے رنگ میں نکل جاتی۔

گھر میں علی احمد اسی طمطراق سے رہتے تھے۔ وہ بات بات پر گھر والوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے اور راجو یا شمیم کو طعنے دیتے رہتے۔

شمیم کی دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑی دسویں جماعت پاس کر چکی تھی۔ اور اب کسی مدرسے میں معلمہ تھی۔ چھوٹی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

راجو کا بیٹا شیر علی لاہور میں اپنی بیوی کے پاس رہتا تھا۔ نصیر کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے دو بیٹے اور تھے۔ وزیر اور کبیر وہ دونوں مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جب سے علی احمد نے پنشن پائی تھی ان کی زندگی میں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن گھر بیٹھے رہتے اور اپنے رجسٹروں میں کچھ لکھتے رہتے۔ نصیر وزیر اور کبیر سے ان کا رویہ قطعی طور پر مختلف تھا۔ چونکہ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور باپ کی بجائے دادا بن گئے تھے لہٰذا وہ ہر وقت اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے اور انہیں اپنے خیالات کے انجیکشن لگاتے رہتے۔

ایلی علی پور پہنچا تو علی احمد نے حسب معمول بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گروپتن کے متعلق پوچھنے لگے۔

"کیوں بھئی۔" تمہارا جی لگ گیا وہاں۔ بڑا اچھا مدرسہ ہے۔ خوبصورت شہر ہے۔" پھر معروف صاحب کی بات چل نکلی بولے "دراصل تم کیرئیر کے لحاظ سے خاصے بدقسمت واقع ہوئے ہو۔ ورنہ محکمہ تعلیم کے سبھی افسر اپنے دوست ہیں اگر تمہارے خلاف شکایات نہ ہوتیں تو نہ جانے ان کی مدد سے تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔"

اپنے اثر و رسوخ پر ناز کرنے کی علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود بڑے عہدے پر نہ پہنچ

سکے تھے۔ اور اپنی تمام تر زندگی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل تھا۔ ایلی ان کی اس عادت سے پورے طور پر واقف تھا لیکن اس میں اس قدر فراخدلی نہ تھی کہ ان کی اس چھوٹی سی کمزوری کو برداشت کرتا۔

ان کے منہ سے اپنے دوستوں کی عظمت کا تذکرہ سن کر وہ جل کٹ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد کا کوئی دوست نہیں۔ لوگ صرف ان کی بذلہ سنجی کی وجہ سے ان سے ملتے اور گپیں ہانکتے تھے۔ دراصل وہ علی احمد کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ علی احمد کی اپنی طبیعت تھی۔ چونکہ وہ بڑے آدمیوں کو ہوا دینے کے قائل تھے۔ ان کا ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے۔ وہ کسی بڑے آدمی سے برابری کے احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔

بہرصورت ایلی میں اس قدر وسعت قلب نہ تھی کہ علی احمد کی اس چھوٹی سی خوشی میں ان کا ساتھ دیتا۔

"دیکھئے ابا جان۔" وہ بولا۔ "آپکے دوست آج تک میرے لیے کچھ نہ کر سکے چھوڑیئے اس بات کو۔"

اس پر علی احمد کو غصہ آ گیا۔ غصہ تو آنا ہی تھا۔ چونکہ ان کا اپنا بیٹا ان کی تمام تر اہمیت کو یوں یک قلم رد کر رہا تھا۔

"اگر معروف صاحب ڈائریکٹر نہ ہوں۔" وہ جلال میں کہنے لگے۔ "یا تم میرے بیٹے نہ ہو تو تم ایک روز بھی اپنی نوکری پر قائم نہیں رہ سکتے۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے نا کہ انہوں نے آپ کی وجہ سے میرے خلاف شکایات پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔" ایلی نے کہا۔

"بالکل۔" وہ بولے۔

"یہ میں تسلیم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "لیکن ان کی امداد مثبت قسم کی نہیں۔"

"کیا مطلب۔" علی احمد بولے۔

"انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ صرف نوکری پر بحال رکھا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"اجی میاں۔" علی احمد چلائے۔ "اگر وہ نہ ہوں تو تم ایک دن کے لیے بھی نوکری نہیں کر

سکتے۔" ایلی کو غصہ آ گیا بولا۔ "یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ادنیٰ سی نوکری بھی کر سکوں۔" وہ ہنسے۔ "میاں تم اپنی قابلیت کے زور پر ادنیٰ سے ادنیٰ نوکری بھی نہیں کر سکتے صرف میری وجہ سے تم اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو یہ سنا تم نے نصیر کی ماں کیا کہا ہے ہم نے۔ کیا کہتی ہے۔ کیا غلط کہا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسے۔ "یہ ایلی کیا نوکری کرے گا۔ اپنے بل بوتے پر۔ وہ ہم ہی تھے جو بغیر کسی کی مدد کے کسی واسطے کے اتنے سال نوکری کی اور عزت سے کی۔ کیا کہتی ہے۔"

ایلی کے دل میں ایک عزم بیدار ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ خاموش عزم تقویت پکڑتا گیا۔ ایلی کی تمام تر انا گویا احتجاج میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ ایک مظلوم حبشی کی طرح تن گئی تھی۔ حبشی کی آنکھیں اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ گویا سوجا ہوا تھا۔ بازو تنے ہوئے تھے۔ توڑ دو توڑ دو۔ یہ زنجیر توڑ دو۔ اس کے جسم کے بند بند سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

ایلی نے اب تک اپنی اہمیت شہزاد سے اخذ کی تھی۔ اسے وہ محبوبہ حاصل تھی جس کے لیے آصفی محلے کے تمام افراد چشم براہ تھے۔ لیکن اب اس کی موت کے بعد ایلی کے لیے کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ اپنی اہمیت کو استوار کر سکتا تھا۔ علی احمد کی اس سرسری بات نے ایلی کی توجہ کو اس بات کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ جملہ اساتذہ کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ اساتذہ کے جھرمٹ سے نکل جائے۔ ان کی زندگی کھوکھلی تھی۔ ان کی شخصیتیں بناوٹی اور رسمی تھیں۔ انہوں نے اخلاقیات کا خول پہن رکھا تھا۔ ان کا علم کتابی تھا۔ نذر، فکر کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔

ایلی کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ وہ محکمہ تعلیم کو چھوڑ دے گا۔ جہاں اعلیٰ افسر علی احمد کے دوست تھے۔ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے گا۔

رام گوپال

چند ایک روز کے بعد ایلی لاہور چلا گیا۔

لاہور میں اس نے محمود سے بات کی۔ "یار کوئی نوکری تلاش کرنے آیا ہوں۔ میری مدد کرو۔" وہ بولا۔ "میں سکول کی نوکری نہیں کروں گا۔"

"نوکری تلاش کرنے آئے ہو۔" محمود بولا۔ "تو مہربانی کر کے تلاش کرو۔ میں بھی اس محکمے سے اکتا گیا ہوں۔"

محمود نے بات مذاق میں ٹال دی۔ اب ایلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کس طرح کوشش کرے۔ اتفاق سے اس کی توجہ میز پر پڑے ایک اخبار کی طرف منعطف ہو گئی۔ اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ چونک پڑا۔ اخبار میں لکھا تھا ایک نئے محکمے کے لیے چند آسامیاں پر کرنے کے لیے گریجویٹوں کی ضرورت ہے۔

"یہ دیکھو۔" اس نے محمود سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے نوکری ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔"

محمود ہنسا۔ "خالی تو بیسیوں ہوتی ہیں روزانہ لیکن ملتی نہیں۔"

"میں عرضی دوں گا۔" وہ بولا

"دینے کا کیا مطلب ہے۔" محمود چلایا۔ "انہوں نے تو لکھا ہے کہ عرضی لے کر خود آ جاؤ۔ وہاں سینکڑوں سفارشی ہوں گے۔ تمہیں کون پوچھتا ہے۔"

ایلی نے عرضی لکھی اور اسے لے کر خود اس محکمے میں جا پہنچا۔

محکمہ کا ڈائریکٹر ایک نوجوان ہندو تھا۔ اس نے ایلی کا بغیر جائزہ لیا۔ "ہوں۔" وہ بولا۔

"تو آپ الیاس آصفی ہیں؟"

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"اور آپ محکمہ تعلیم میں ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"کتنی نوکری کر چکے ہیں آپ محکمہ تعلیم میں۔"

"پندرہ سال۔"

"پندرہ سال کافی لمبا عرصہ ہے۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"لیکن آپ اس نوکری کو چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟"

ایک ساعت کے لیے ایلی نے سوچا اور پھر فیصلہ کر دیا کہ وہ اسے سچی بات بتائے گا۔ بولا۔

"جناب محکمہ تعلیم میں میرے والد کا اثر و رسوخ ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" وہ بولا۔

"جی۔" ایلی نے کہا۔

"تو آپ وہ محکمہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟"

"میں ایسے محکمے میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں بلاواسطہ اپنے بل بوتے پر ترقی حاصل نہ سکوں۔"

"کیوں۔" ڈائریکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے۔" ڈائریکٹر نے کہا۔" کہ یہ آسامی جس کے لیے آپ نے درخواست ہے مستقل نہیں۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"اس میں پنشن نہیں۔"

"جی۔" وہ بولا۔

"آپ کی پندرہ سال کی نوکری بے کار جائے گی۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ایلی نے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔"" وہ بولا۔

"میں آپ کو یہ آسامی دے کر آپ کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔

"معاف کیجئے گا۔" ایلی نے کہا۔

"میرا فائدہ اور نقصان میں بہتر سمجھتا ہوں۔"

"اچھا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔ "تو آپ امتحان میں شامل ہو جائیے۔"

"امتحان۔" ایلی نے دوہرایا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔

"ہم انٹرویو لیں گے۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو میں آپ کا کیس رکمنڈ کر دوں گا۔"

انٹرویو کے بعد ڈائریکٹر نے ایلی کو بلایا۔ اور ایک ٹائپ شدہ کاغذ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
آفر ہے۔" وہ بولے۔ "اگر آپ کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ منظور ہے۔ تو آپ مجھ سے کر سکتے ہیں۔ لیکن تب جب آپ یہاں جائن کرنے کے لیے آئیں۔"

"آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں۔" ایلی نے جذبہ کی ت سے اٹک اٹک کر کہا۔

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔" ڈائریکٹر نے کہا۔

"میں تو سمجھتا ہوں۔" ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

"آپ غلط سمجھتے ہیں۔"

"اتنے میں ایک چپراسی کچھ کاغذات لے کر آ گیا۔

"ذرا ٹھہریے۔" ڈائریکٹر نے ایلی سے کہا۔

"تشریف رکھیے۔ ایک منٹ۔"

کاغذات پر دستخط کر کے وہ ایلی کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔ "وہ بولا۔ "ان بچوں پر احسان کیا ہے جنہیں آپ ھاتے ہیں۔" ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بے حد ناموزوں ہیں۔" وہ بولا۔ ایلی کی سمجھ میں نہیں آ ہا تھا۔ کہ کیا کہے۔

"یہ درست ہے۔" وہ بولا۔ "کہ آپ ان میں فکر کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ آپ ان میں تحقیق کی سپرٹ بیدار کرتے ہیں۔"

"جی میں ——— " وہ گھبرا کر بولا ———

"سن لیجئے۔ ڈائریکٹر نے کہا۔

ایلی خاموش ہو گیا۔

"لیکن آپ کی تعلیم ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور تمام دنیا حریف بن کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔" وہ رک گیا۔

پھر مسکرا کر بولا۔ "آپ کی تعلیم کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مشکلات پیدا ہوئیں۔ بلکہ میری بیشتر مشکلات کی وجہ آپ ہیں آپ۔"

ایلی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈائریکٹر بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا نام رام گوپال ہے۔ میں آپ کا شاگرد ہوں۔

ڈائریکٹر نے تپاک سے ایلی سے ہاتھ ہلایا۔

ایلی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

"یہ بھی صحیح ہے۔" رام گوپال بولا۔ "میں نے آپ سے پایا بھی بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔
حافظ۔"

ایلی کے استعفیٰ پر اک شور مچ گیا۔ لالہ جی نے جوان کے ہیڈ ماسٹر تھے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ
کو بار بار سمجھاتے کہ پندرہ برس کی نوکری کو یوں ٹھوکر مار کر چلے جانا عقل مندی نہیں۔
ذہ بھی حیران تھے۔ علی احمد نے سنا تو فوراً ایک خط لکھا۔ "برخوردار ایسی حماقت نہ کرنا ورنہ
ی بھر پچھتاؤ گے۔ تمہیں مسٹر معروف سا افسر اعلیٰ کہیں نہیں ملے گا۔ اس محکمے کو نہ چھوڑو
۔ محکمہ تعلیم کا وزیر بھی میرا پرانا لنگوٹیا ہے۔ ایسی آسانیاں کہیں دستیاب نہ ہوں گی۔"

لیکن ایلی نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

صرف رضی رنگی اور مانی تھے۔ جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

رضی نے کہا۔ "بھئی دانہ پانی کی بات ہے۔"

رنگی بولا۔ "یار میں بھی اس محکمے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک بات نہیں بنی۔ وہاں
گے تو میرے لئے بھی کوشش کرنا۔"

"بڑا اچھا کیا تم نے۔" مانی بولا۔ "شاباش اپنا راستہ خود بناؤ۔ چاہے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔"

لاہور میں ایلی کی زندگی یکسر بدل گئی محکمہ بدلنے کی وجہ سے ماضی کی تمام تلخیاں گویا اس
نامہ اعمال سے دھل گئیں۔ محکمہ تعلیم میں اس کے افسران اور رفقائے کار کسی نہ کسی حد
اس کے گزشتہ کارناموں سے واقف تھے۔ اس کی ہر بات کا مفہوم اس کی گزشتہ زندگی کے
پود کے حوالے سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات بلا واسطہ کوئی حیثیت نہ
تے تھے۔

اس محکمے میں وہ ماضی کے حوالے سے قطعی آزاد ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کے ہمکار
ں خیالات اور دکھلاوے کے تقدس سے بے نیاز تھے اگرچہ وہ نڈر ہو کر سوچ نہ سکتے تھے لیکن
خیالات کے خلاف ان میں بغض نہ تھا۔ محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کیچڑ
ے جوہڑ سے نکل کر دریا میں آ پہنچا تھا۔ وہاں روانی تھی وسعت تھی اور جمود نام کو نہ تھا۔

نئے محکمے میں آ کر چند ہی روز اس نے محسوس کیا جیسے وہ پرانا ایلی نہ تھا۔ جیسے بیتی ہوئی
رگی محض ایک خواب ہو۔

"میں نے کہا نا تھا۔" شہزاد آ کر مسکراتی۔ "تمہاری زندگی پھر سے شروع ہو گی۔" لاہور پہنچ

کر اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کو یاد کیا۔ شہزاد کی یاد اب اس کے ذہن میں گزشتہ تلخیوں سے بے
تعلق تھی۔ جب بھی شہزاد کی یاد آتی تو وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا۔ اور اس کے دل میں
عجیب سی خوشی پیدا ہوتی۔

لاہور میں اس کا ماموں زاد بھائی رفیق تھا۔ پھر فرحت بھی وہیں تھی۔ چونکہ اس کا خاوند
اجمل لاہور کے ایک دفتر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور حکومت کی وساطت سے انہیں مادھو محلہ میں
ایک مکان مل گیا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ایلی فرحت کے پاس ٹھہرا تھا۔ اور ایک بار پھر اسے
بھرے گھر میں رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ فرحت نے ایک بڑا سا کمرہ ایلی عالی اور ہاجرہ کے لئے
مخصوص کر دیا تھا۔

ہاجرہ سے جب فرحت نے سنا کہ رنگی اور مانی ایلی کی شادی کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہے
ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ فرحت کو ایلی کی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ لیکن اس نے ایلی
اور شہزاد کے تعلقات کے کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔

ابھی ایلی کو لاہور آئے چند ایک روز ہی ہوئے تھے کہ مانی اور رنگی لاہور آ گئے۔ رنگی کے
لئے لاہور ایک عظیم نعمت تھی۔ وہ وہاں آ کر بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خوبصورت
ماحول اس کے نزدیک سب سے بڑی نعمت تھی۔ لاہور میں لباس تھا جوانی تھی۔ رنگ تھا۔ شوخی
تھی۔ اور رنگی کے لئے یہی بہشت تھا۔

دور روز وہ اکٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ راگ ودیا کی باتیں کرتے رہے۔ پتلی اور شرمیتی
کے قصے دہراتے رہے۔ جب رنگی اور مانی جانے لگے تو دفعتاً" رنگی بولا "ایلی تمہارے لئے ایک
ایسی بیوی تلاش کی ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ وہ تمام خصوصیات اس میں ہیں جن کی تمہیں
اشد ضرورت ہے شکل و صورت سے تو تم بے نیاز ہو۔ باقی رہی طبیعت تو جناب ایسی نیک لڑکی
ہمارے قصبے میں تو ہے نہیں کوئی۔ اور اس کا باپ ایک لاجواب مرد ہے۔ اس قدر شدت کی
انفرادیت شاید ہی کسی میں ہو۔ جو منہ سے کہہ دیا پتھر کی لکیر سمجھ لو۔ اور دیانتداری کی تو حد
نہیں کوئی۔ بات کا پکا قول کا پورا اور رسمیات سے بیگانہ بالکل بیگانہ۔ وہ لوگ آ کر تمہیں دیکھ لیں
گے جیسے عام طریقہ ہے اور یہ بھی محض رسم ہے چونکہ لڑکی نگہت کی بچپن کی سہیلی ہے وہ اسے
ذاتی طور جانتی ہے۔ بہر حال بات پکی سمجھو۔

"دیکھو بھائی۔" ایلی نے کہا "چاہے جو جی چاہے کرو میرے مرضی کے متعلق کوئی بات چھپا

کر نہ رکھنا ایسا نہ ہو کہ بعد میں کہیں ہم سے دھوکا کیا گیا۔"

"یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔" مانی بولا۔

"نہیں یار یہ غلط ہے۔" ایلی نے کہا۔

"تم ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو نہیں جانتے۔" مانی نے کہا۔ "بے حد غلیظ لوگ ہیں۔ پشت در پشت دوکانداری کرتے رہے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر روپیہ تک محدود ہے جس کے پاس روپیہ ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ ہر بات قابل قبول ہے جس میں سے رسم کی بو آتی ہو۔ نئی بات الحاد ہے۔ نیا چین قابل تف ہے۔" مانی شدت میں نہ جانے کیا کہتا گیا۔ رنگی مسکرا رہا تھا۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جس قصبے نے رنگی نگہت اور مانی جیسے کردار پیدا کئے ہوں۔ وہ قصبہ ازلی طور پر رنگ سے خالی ہو یا زندگی سے محروم ہو ضرور مانی بڑھا کر بات کر رہا تھا۔ چونکہ مانی میں تو توازن مفقود تھا۔ اس میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا خود پسندی کی دبی دبی جھلک تھی اور بے پناہ جرات تھی۔

شادی کے متعلق ایلی اب سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کا قائل نہ رہا تھا۔ زندگی میں بہت سی باتیں جو اس نے سوچ سمجھ کر کی تھیں ان کا انجام اچھا نہ ہوا تھا۔ عورت کے متعلق تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ چاند کی طرح ایک مخصوص پہلو آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور عورت میں کئی ایک پہلو ہیں۔ متبسم پہلو۔ متذبذب پہلو "مجھے کیا"۔ اور وہ پہلو جس کے تحت شہزاد نے اس شرابی کے متعلق کہا تھا۔ "نہیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میرے سامنے بلک بلک کر گھسٹ گھسٹ کر مرے"۔

عورت کو پرکھنا ایلی کے خیال کے مطابق ناممکن تھا۔ عورت میں یہ صلاحیت تھی کہ سال ہا سال اپنا ایک مخصوص پہلو پیش کرے وہ سالہا سال تبسم پہلو پیش کر سکتی تھی کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو متبسم ہی دکھائی دے گی۔ اور جب وہ سمجھے کہ اب ضرورت نہیں رہی تو حالات کے تقاضے سے بے نیاز ہو کر گھورنا شروع کر دے گی۔ یا بے پروائی اور بے نیازی کا جامہ اوڑھ لے گی۔ اس لئے عورت کو جانچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ایلی سمجھنے لگا تھا شادی ایک جوا ہے۔ چاہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھیلو یا آنکھیں بند کر کے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے یہ خواہش محسوس نہ کی

تھی کہ ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ لے یا ہاجرہ کو بھیج کر اس کے ذریعے معلومات حاصل کرے۔

نامن پور

نامن پور ایک پرانا قصبہ تھا۔ جو لاہور سے تقریباً" تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا نامن پور مغلوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ قصبے پر مغلوں کی مہر ثبت تھی قصبے کے گرد چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی چار دیواری تھی۔ جس میں آٹھ دروازے کھلتے تھے۔ چار دیواری کے اندر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے تنگ گلی نما بازاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان تنگ گلیوں کے ارد گرد اونچی اونچی چونے کی عمارتیں تھیں حویلیاں تھیں۔ ادھر گکے زیوں کا احاطہ تھا ادھر سیدوں کا پرلی طرف دیوانوں کا۔

قصبے کے شمال مغرب میں ہندوؤں کا سیٹھ کنبہ آباد تھا۔ جن کی وجہ سے نامن پور مشہور تھا سیٹھوں کا یہ کنبہ نامن پور کا قدیم ترین کنبہ تھا۔ نامن پور کے گرد و نواح کے کھیت انہیں کی ملکیت تھے۔ سیٹھ حسین تھے' متحمل مزاج تھے اور دولت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ سیٹھوں کے بعد نامن پور کے نومسلم مشہور تھے وہ سب ویش تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ اور وہ قدیم زمانہ سے دوکانداری کرتے آئے تھے۔ ان ویشوں کی کئی ایک گوتیں نامن پور میں آباد تھیں مثلاً" کاپر تھے ناروج تھے ہنگا تھے چالیہ تھے۔ نامن پور اور اس کے جوار کے قصبوں اور شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں۔ جہاں وہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے۔ ان کا چند ایک لوگ ہندوستان کے دور و دراز کے شہروں میں جا کر پنجاب کی مصنوعات بیچتے تھے۔ ایک ماہ شہروں کے چکر لگاتے اور پھر نامن پور میں لوٹ آتے تاکہ اگلے چکر کے لئے اشیاء فراہم کریں۔

ان میں سے گنتی کے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے کاروبار چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی تھی ان کی تعداد بہت کم تھی۔

چالیہ گوش کے ویشیوں کا سب سے بڑا گھرانا آصف کا تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود آصف صاحب فکر تھے۔ اس کے فکر میں انفرادیت تھی۔ اور یہ انفرادیت صرف فکر کی حد تک محدود نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے اور اسے فوراً عمل میں لانے کے قائل تھے۔ فکر کی اس عادت کی

وجہ سے انہوں نے زندگی میں چند ایک اصول مرتب کئے تھے جن پر شدت سے پابند ہونے کے باوجود وہ اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ زندگی اصول سے زیادہ اہم ہے۔

نامن پور میں لوگ آصف کی عزت کرتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ہندو اپنی امانتیں آصف کے سپرد کر دیتے دیش اپنے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے آصف کو پنچ بنانے پر خوشی محسوس کرتے لیکن آصف کے اپنے گھر میں ان کے خیالات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان کی بیوی کو ان کی رائے مشورے یا فیصلے پر قطعی اعتماد نہ تھا۔ گھر میں ہر بات پر انھیں جھاڑ جھپٹ ہوتی تھی۔ جسے وہ سر جھکا کر سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خیال اور رائے پر قائم رہتے اور وہی کرتے تھے جو ان کے خیال میں درست ہوتا۔

آصف نے زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں گزاری تھی۔ جہاں ان کا ایک اعلیٰ قسم کا ہوٹل تھا۔ جس میں بڑے بڑے اہل کار اور یورپین آ کر ٹھہرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دوسروں کی بات غور سے سننے کے عادی ہو چکے تھے ان کی طبیعت میں اخلاق تھا تحمل تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ وہم کی بیماری میں مبتلا تھے۔ جو کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

تین بیٹوں کے علاوہ آصف کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کا نام بلند بخت تھا۔ بلند بخت نے چند ایک جماعتوں تک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اور پھر آصف نے اسے مدرسہ سے اٹھا لیا تھا چونکہ دستور کے مطابق نامن پور کے لوگ بچیوں کو زیادہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ آصف خود تو تعلیم کے حق میں تھے ممکن ہے ان کی بیگم نے زبردستی بلند بخت کو مکتب سے اٹھا لیا ہو۔

بلند بخت ابھی عنفوان شباب میں ہی تھی کہ اسے ایک قریب رشتہ دار کے بیٹے سے منسوب کر دیا گیا۔ اور جلد ہی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

لڑکے نے دولہا بننے سے پہلے بار بار اپنے والدین کو کہلوایا تھا کہ اس کی شادی نہ کی جائے چونکہ وہ شادی کے قابل نہیں۔ لیکن والدین نے اس کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے رہے کہ لڑکا ویسے ہی ہچکچاتا ہے اس کے ذہن پر عورت کا ڈر حادی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سامان کو دیکھ کر جو آصف جہیز کے مشتاق تھے لڑکا چاہے قابل ہو یا نہ ہو۔ سامان پر قبضہ جمانے کے تو وہ قابل تھے۔ لہٰذا انہوں نے لڑکے کی بات نہ سنی۔

بلند بخت شب عروسی میں دولہا کا انتظار کرتی رہی۔ دولہا کے والدین اسے ڈھونڈتے رہے۔

آخر بات نکل گئی کہ دولہا غائب ہے۔ بلند بخت نے سنا تو اسے ایک دھچکا لگا۔ اس کی حیات منجمد ہو گئی۔ نسائی تقاضوں کے راستے مسدود ہو گئے۔ نسیں ایک زبردست ہیجان سے ٹکرائیں اور حیات کا وہ فیوز ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ جو اس کی نسائی زندگی میں تحریک پیدا کر سکتا تھا۔

اگلے روز اس کے والدین بلند بخت کو اپنے گھر لے گئے۔

پہلے تو موہوم سی امید باقی تھی۔ کہ شاید دولہا کسی روز گھر واپس آ جائے پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا مایوسی گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ سات سال گزر گئے۔

دیش لوگوں میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ گالی کے مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برادری میں ہمیشہ کے لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہٰذا بلند بخت کی دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بلند بخت نگہت کی سہیلی تھی اور نگہت رنگی اور مائی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یا شاید فطری طور پر نامن پور کی عورتوں سے ہٹ کر تھی۔ ہاجرہ کی بات سن کی اسے فوراً بلند بخت کا خیال آیا تھا۔ رنگی نے اس بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اور مائی عملی طور پر اس سلسلے میں کوشش کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مل کر برداری میں بات چلا دی۔ اور کچھ حیرت کچھ تعجب اور عورتوں کے ناک بھوں چڑھانے کے بعد بلند بخت کو طلاق ہو گئی۔ ایک مختصر سی رسم کے بعد بلند بخت کا ایلی سے عقد ہو گیا۔ اور وہ ایلی کے گھر آ گئی۔ اور ایلی نے دیکھا کہ اس کے گھر ایک لاش پڑی ہے اور زندگی بھر اسے ایک لاش اٹھائے پھرنا ہے۔

بلند بخت کو دیکھ کر ایلی کو ایک دھچکا لگا۔

اگرچہ وہ اس بات پر مصر تھا کہ کسی نوجوان لڑکی سے اس کی شادی نہ کی جائے۔ بظاہر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی حسین نہ ہو۔ رنگین نہ ہو۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شدت بھری زندگی بسر کرنے کے بعد وہ تھک چکا تھا۔ اکتایا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش سکون و اطمینان تھا۔ اس کے علاوہ اسے یقین تھا کہ وہ عالی کے لئے شادی کر رہا ہے۔ اگر اس کے گھر میں حسین و جمیل بیوی آ گئی تو ممکن ہے وہ اپنی بیوی میں اس حد تک کھو جائے کہ قریب ہی عالی بے توجہی کی گود میں پڑا بلکتا رہے اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ بلک رہا ہے۔ رو رہا ہے۔ پریشان حال ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بلند بخت کو دیکھ کر ایلی کو ایک دھچکا لگا۔

لیکن جلد ہی اس نے جواز پیدا کر لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بلند بخت اس کی بیوی بنے۔ جیون ساتھی نہ بنے۔ ورنہ عالی تنہا رہا جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ ضرور اس میں قدرت کا ہاتھ ہے۔

دقت یہ تھی کہ بلند بخت اس گزشتہ سانحہ کی وجہ سے بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔

بلند بخت کے خیالات بے حد پاکیزہ تھے لیکن یہ پاکیزگی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر سر نہیں بلکہ ایک پھوڑا تھا جس میں مسلسل درد رہتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ خاوند اس سے دور رہے بلند بخت کی آمد پر ایلی نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایلی اور عالی فرحت کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر میں منتقل ہو گئے۔

مشملات

ایلی کو سیاست سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اخبار تو وہ پڑھتا تھا لیکن سیاسی خبروں کے متعلق اسے دلچسپی نہ تھی۔ صرف سرخیاں پڑھ کر مطمئن ہو جاتا۔

جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو ایلی کو بے حد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ ایلی کے دل میں ان مجاہدوں کے لئے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا تھا۔ مثلاً" مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور محمدؐ علی جناح۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محبوب لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ اس زمانے میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔

پاکستان کے قیام کا سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم مچی ہوئی تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم و ادب کی جگہ سیاسیات کا ابال آیا ہوا تھا۔

لیکن ایلی اس جھگڑے سے بالکل بے گانہ تھا۔ وہ پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان کے خلاف بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی اس مسئلے کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو آزادی مل جائے۔ اور لوگوں کی اور ملک کی اس میں بہتری ہے تو پاکستان کا قیام عمل میں آ

جائے۔ بہرحال وہ ہر اس بات کا طرف دار تھا۔ جو عوام اور ملک کی بہتری کے لئے تھی۔ لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ ملک کی بہتری کس بات میں ہے۔

پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے کبھی کبھار اس کے دل میں بھی پاکستان کے لئے جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جذبہ محض وقتی ہوتا۔ یا کبھی کبھار بیٹھے بیٹھائے اس کے روبرو دھرم سالہ کا سکول ابھرتا۔ چھٹی جماعت کا لڑکا رام لال اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ "رام لال مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔" ایلی کہتا۔ ! رام لال کی گردن جھک جاتی اور وہ چپ چاپ جوں کا توں کھڑا رہتا۔ "رام لال۔" ایلی چلاتا۔" تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔" "جی میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔" رام لال جواب دیتا۔ "بے وقوف لڑکے۔" ایلی ہنستا۔" اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پیو تو دھرم بھرشٹ ہو گا۔ اگر تم مجھے پانی لا دو تو تمہارا دھرم کیسے بھرشٹ ہو سکتا ہے۔" رام لال اسی طرح گردن جھکائے کہتا۔ "جی میرا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔"

پھر اس کے روبرو دھرم سالا کا پڑوسی آ کھڑا ہوتا۔ "جی میرا نام رام دین ہے۔"

"رام دین؟"

"جی میں بھگوان کی دیا سے مسلمان ہوں۔"

"مسلمان۔"

"جی جی۔"

پھر ایلی کی نگاہ میں رام دین کی کٹیا ابھرتی۔ وہ چونکا۔ وہ پوتر گوبر کا ڈھیر کارنس پر دھری ہوئی مورتیاں۔

"جی میں مسلمان ہوں۔" رام دین چلاتا۔ اور پھر تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو کر چلاتے۔" جی میں بھگوان علی ہوں۔ جی میں کرشن اللہ ہوں۔ جی میں غلام گرد ہوں۔ ہم مسلمان ہیں۔" وہ چلاتے۔ "پاکستان زندہ باد پاکستان زندہ باد۔" اس کے دل میں کوئی نعرے لگاتا۔ لیکن جلد ہی ایلی چونکتا۔" نہیں نہیں" وہ چلاتا۔ اگر رام لال اس قدر تنگ خیال واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو پانی پلانے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنے درمیان رہنے والے اکے دکے مسلمان کو رام دین بنا دیتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوؤں کے خلاف ایسے بغض پال کر میں بھی رام لال بن جاؤں۔ نہیں نہیں وہ چلاتا۔ ان باتوں پر ہندوؤں کے خلاف تعصب پال لینا اچھا نہیں۔

اگرچہ اسلام کے اصولوں کا وہ مداح تھا اور فلسفہ مذہب کے مطابق اسلام کی عظمت کا قائل تھا۔ لیکن یہ احساس محض ذہنی تھا۔ جس کا عکس اس کے جذبات پر نہیں پڑتا تھا۔

ایک روز جب وہ لاہور کی مال روڈ پر گھوم رہا تھا تو دفعتاً" ایک شور بلند ہوا۔ وہ رک گیا۔ ل روڈ پر ٹہلنے والے سبھی لوگ چونک پڑے۔ ہندو اور سکھوں کا ایک جم غفیر مال روڈ کی طرف ڑھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جنہیں وہ لہرا رہے تھے۔ عورتیں سر پیٹ رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ وہ سب اسمبلی چیمبر کی طرف بھاگ رہے تھے اور پاکستان مردہ باد کے عرے لگا رہے تھے۔

اس جلوس میں ایک شدت تھی اشتعال تھا۔ ایک وحشت تھی جس میں تشدد کی واضح ھمکی تھی لوگ حیرت سے اس دوڑتے ہوئے تشدد بھرے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک خوف ابھرا اور وہ اپنے اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ ایلی چپ چاپ کھڑا یکھتا رہا۔

"اجی صاحب میری بیٹی تو ہندوؤں کے محلے میں رہتی ہے۔" کوئی اس کے قریب کہہ رہا تھا۔

"یہ تو بھس میں چنگاری ڈالنے والی بات ہے۔"

"ظاہر ہے کہ سمجھے بوجھے پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔"

"نہ جانے کس وقت خون کی ندیاں چل نکلیں۔"

"بھئی میں جا کر بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ حالات نازک ہیں۔"

حالات نازک ہیں۔ حالات نازک ہیں۔ ایلی کے سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے دفعتاً" اسے فرحت کا خیال آیا۔ ارے فرحت بھی تو مادھو پورہ میں رہتی ہے جہاں ہندوؤں کا گڑھ ہے وہ بے سوچے سمجھے مادھو پورہ کی طرف بھاگا۔

مادھو پورہ کے بڑے بازار میں لوگ یہاں وہاں گروہوں میں کھڑے تھے ان کے تیور اچھے نہ تھے۔

پیشانیوں سے تشدد بھرے ارادے ظاہر ہو رہے تھے ہر آتے جاتے کو مخدوش اور مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایلی آنکھ بچا کر چوبارے پر چڑھ گیا۔

"چلو فرحت۔"! وہ بولا "یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں چلو میرے گھر چلو۔"

ابھی وہ تیار ہی نہ ہوئے تھے کہ نیچے بازار میں شور مچ گیا۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔

انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بازار میں ایک تانگہ کھڑا تھا زمین پر تانگے والے کی لاش تڑپ رہی تھی۔۔ پاس ہی ایک ہندو بڑھیا چلا رہی تھی۔ اے تمہیں بھگوان کا ڈر نہیں کیا بیچارا مجھے بچا بچا کر لایا تھا۔ کہتا تھا ماں جی میں لے جاتا ہوں چاہے میری جان جائے پر تم پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے گا۔ ہائے جالمو یہ کیا کیا تم نے۔" وہ رو رہی تھی بین کر رہی تھی۔

فرحت گھبرا گئی اجمل باہر دورہ پر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچیاں تھیں۔ اکیلا ایلی انہیں سنبھال نہیں سکتا تھا۔ ایلی کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے انہیں جانا چاہیئے یا نہیں ممکن ہے وہ وہیں گھر میں محفوظ ہوں۔ لیکن شام پڑ چکی تھی۔ اور پھر رات کے وقت نہ جانے کیا ہو۔ اسے اسی وقت ایک فیصلہ کرنا تھا۔

عین اس وقت دروازہ بجا۔

ایلی گھبرا گیا۔ شاید وہ آ گئے۔ شاید انہوں نے ہلہ بول دیا ہے۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔

"میں ہوں۔ مانی۔ کھولو جلدی۔"

"مانی ——— " ایلی مانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جلوس کو دیکھ کر مجھے فوراً بہن فرحت کا خیال آیا مانی اندر داخل ہو کر چلانے لگا۔

"چلو چلو۔" وہ چلایا۔ "آ جاؤ آ جاؤ۔ سب آ جاؤ ڈرو نہیں۔"

"لیکن ایلی بولا۔ "باہر وہ سب کھڑے ہیں۔ اگر ——— "

مانی سن کر چلایا۔ "ان کی ایسی تیسی۔ لالے وہ کیا بگاڑیں گے ہمارا۔ چلو ہمشیرہ———"

"لیکن ٹھہرو وہ سونٹا دے دو مجھے۔ بس ٹھیک ہے چار پانچ کو مارے بغیر تو نہیں مروں گا نا۔ جب تک تم انہیں نکال کر لے جانا۔ آ جاؤ آ جاؤ۔" وہ خوشی میں چلایا۔ وہ سب چل پڑے۔

چوک میں ہندوؤں کے جتھوں نے ان برقعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھا۔

مانی نے لٹھ لہرائی اور نعرہ لگایا۔

وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

مانی لٹھ لہرائے جا رہا تھا۔ "جاؤ چلتے جاؤ۔" وہ ایلی کی ہمت بڑھا رہا تھا۔

ایک نوجوان ان کی طرف بڑھا۔

مائی نے ایک چنگاڑ ماری۔ "مولا علی"۔ اور لاٹھی گھمانے لگا۔

وہ گھبرا کر پرے سرک گئے۔

"جلدی چلو جلدی چلو۔" ایلی عورتوں کو ہانک رہا تھا۔

"آ جاؤ آ جاؤ۔" ایک بوڑھا تانگے والا چلایا "آ جاؤ۔" اس نے برقعہ پوش عورتوں کیطرف دیکھ کر کہا۔

"اللہ اپنا فضل کرے۔" وہ بھول چکا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو محلے میں کھڑا چلا رہا ہے۔

پھر وہ سب تانگے میں سوار تھے۔ اور تانگہ بھاگ رہا تھا۔

"اجی صاحب۔" بڈھا کہہ رہا تھا۔ "سارے شہر میں چھری چل رہی ہے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ آگ لگ گئی ہے شہر میں۔ اللہ اپنا فضل کرے انہوں نے سوئے شیروں کو جگایا ہے۔ ہمیں للکارا ہے انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ فضل کرے۔ اللہ فضل کرے۔"

پاکستان زندہ باد

اس جلوس کے بعد شہر میں ایک طوفان آ گیا۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ محلوں میں جانا خطرناک ہو گیا۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر چلنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ ایک روز جب ایلی شام کے وقت گھر آ رہا تھا تو مزنگ کے نوجوان چھوکروں نے اسے روک لیا۔

"ابے او۔" ایک نے للکار کر کہا۔

ایلی نے ان کی للکار کی پرواہ نہ کی۔

"پکڑ لو۔ پکڑ لو۔" وہ چلائے۔ انہوں نے اس کی سائیکل روک لی۔

ایلی کو غصہ آ گیا۔ غالباً" اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان محلے میں پکڑا گیا تھا۔

"اے کون ہے تو" ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

"تجھے اس سے کیا۔" ایلی نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں یہ ہندو ہے۔" ایک بولا۔

"پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔" ایلی چلایا۔

"پکڑ لو پکڑ لو۔" وہ سب اس کی طرف بڑھے۔

"بڑے مجاہد بنے پھرتے ہو۔" ایلی چلانے لگا۔ "اللہ اور محمد کی خدمت کر رہے ہو نا۔"

"ابے مسلمان ہے یہ۔" ایک بولا۔

"نہیں نہیں بچنے کے لیے اللہ کا نام لیتا ہے۔" دوسرا بولا۔

"کلمہ پڑھ" ایک چلانے لگا۔

"اللہ کا نام نہ لیتا تو اب تک ڈھیر ہوتا۔ میرا ہاتھ رک گیا۔" ایک غنڈہ بولا۔

ایلی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو ہے۔

اس روز ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان تھا۔ سیاسی خیالات کا سوال نہ تھا۔ مسلم لیگی اور کانگرسی کا سوال نہ تھا۔ یہ سوال نہ تھا کہ آیا وہ اسلام سے واقف ہے۔ آیا وہ شریعت کا پابند ہے یہ سوال نہ تھا کہ آیا رام دین سا مسلمان ہے یا محمد علی سا۔ سوال صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اس روز جب وہ مادھو پورہ سے باہر نکلے تھے تو ہندوؤں کے گروؤں کے گروہوں نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ آیا وہ نیشنل نقطہ نظر کے حامل تھے۔ یا مسلم لیگی۔ آیا وہ پاکستان کے حق میں تھے یا پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ صرف مسلمان تھے۔ تانگے والے کے پیٹ میں چھرا گھونپتے وقت بھی ہندو بڑھیا کے چلانے کے باوجود انہیں یہ احساس نہ ہوا تھا کہ تانگے والا ہندو ماتا جی کو مسلمان غنڈوں سے بچا بچا کر مادھو پورہ میں لایا تھا۔ اور اس نے ماتا جی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ماتا جی کو بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دے گا۔ چاہے وہ ماتا جی کو بچا کر لایا تھا۔ چاہے ہندوؤں کی خدمت کی تھی ——— لیکن وہ مسلمان تھا اس لئے انہوں نے اس کے پیٹ میں چھرا جھونک دیا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا پاکستان زندہ باد۔

باادب

ایلی کے تمام تر خیالات درہم برہم ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن گویا از سر نو ترتیب پا رہا تھا۔ پرانے خیالات کی اینٹیں اکھڑی جا رہی تھیں۔ نئی اینٹیں نہ جانے کہاں سے آ گئی تھیں اور اس

ن میں آپ ہی آپ لگی جا رہی تھیں۔

اسی روز شام کو دفتر سے آتے ہوئے وہ ان جانے میں انار کلی کی طرف گھوم گیا۔ حالانکہ ادھر کوئی کام نہ تھا۔ اور ان دنوں بے کار گھومنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا چونکہ شہر میں زی کی وارداتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ادھر ادھر گھومنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

کچھ دیر وہ انار کلی میں گھومتا رہا پھر سرکلر روڈ کی طرف چل پڑا اور آخر کار اس نے دیکھا کہ ا صاحب کے مزار کے باہر کھڑا ہے۔

داتا کے مزار پر وہ کئی مرتبہ گیا تھا چند ایک بار وہ مزار کے اندر بھی داخل ہوا تھا لیکن جب ر جاتا تو اس کی توجہ ان عورتوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو بن سنور کر داتا کے دربار میں ہوتی تھیں۔ اور وہاں پہنچ کر اپنی نمائش کرنے کے خیال سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں ہیرا ی کی طوائفیں ان دنوں داتا کی بڑی متوالی تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ وہاں جانے سے ان کا حباب وسیع تر ہوتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ایلی عورتوں کو دیکھنے کی غرض سے وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر نے عورتوں کے سوا پھر وہاں ملنگ تھے جو طوائف کی طرح اپنی نمائش کرنے میں مصروف تھے مزار کی جالی کے گرد کھڑے لوگوں کو ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ایلی کے ہونٹ نفرت سے بڑھ تے ضعیف الاعتقاد لوگ۔!

اس روز داتا صاحب کے مزار کے باہر اس کے خیالات کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔

پاگ بابا سامنے محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ "کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔" وہ چلا رہا تھا۔ "سب کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ اور تمہیں داتا کے قدموں میں لا کھڑا کیا۔ کیا نہیں کیا کس تمہاری حفاظت نہیں کی۔ مادھو پورہ سے کس نے نکالا۔ مزنگ میں کس نے بچایا۔ وہی نے والا ہے وہی سب کچھ کرتا ہے۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں —— وہی کرنے والا "

ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود نہیں آیا ہو بلکہ اسے بلایا گیا ہو اور اندر داتا اس کا انتظار کر ہوں۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ نہیں محسوس کر تا کہ وہ مجرم ہے یا گنہگار ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے اور اسے شاہ کے ر میں کھڑے ہونے کا موقع ملا اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ نگاہوں تلے روی

ٹوپی والا کھڑا تھا جس کے ساتھ دراز قد تھا دونوں داتا سے اس کی سفارش کر رہے تھے۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ داتا صاحب سے کیا کہے۔ دفعتاً حاجی صاحب آ گئے ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہل رہا تھا۔ "وقت آئے گا وقت آئے گا۔"

وہ دبی دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔

"تمہاری نئی زندگی شروع ہو گی" شہزاد مسکرا رہی تھی۔ "نیا جیون۔"

"وہی کرنے والا ہے وہی کرنے والا ہے۔" پاگ بابا چلا رہا تھا پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک کنواں ابھر آیا۔ اس کے قریب ہی سفید چادر اوڑھے ایک مسجد چپ چاپ آ بیٹھی۔ پھر ایک چار دیواری ابھری تھی اور اس چار دیواری کے اندر ایک قمقمہ روشن ہو گیا۔

داتا مسکرا رہے تھے۔

پریتماں

جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں ناظم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ناظم اسے دیکھ کر یوں کھل گیا ہے۔ جیسے مٹھاس کی وجہ سے خربوزہ پھوٹ جاتا ہے۔ "میں تمہارے دفتر سے آیا ہوں۔" وہ بولا۔ صبح سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ صبح سے۔"

"تم یہاں کیسے؟ ایلی نے پوچھا۔

"میرا تبادلہ ہو گیا ہے یہاں۔" وہ بولا۔ "بڑے دفتر ہیں۔"

"اچھا۔"

"اب میرے ساتھ چلو۔" وہ بولا۔

"ارے کہاں؟"

"بس آ جاؤ۔ آ جاؤ شاید وہ مل جائے۔" ناظم بولا۔

"کون مل جائے؟"

"بھئی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"کون انتظار کر رہی ہے"۔

"تم آؤ تو" وہ بولا۔

"پھر بھی۔" ایلی نے اس کی منت کی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو

ی۔"

"بھئی وہ آندھرے فلم کمپنی کی مالک ہے۔"

"ارے اسے مجھ سے کیا کام؟"

"میں نے کہا تھا اس معاملے میں میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ میرا ایک دوست ہے

ں۔"

"تو اس نے کہا مجھے اس سے ملا دو۔"

ایلی حیران تھا ناظم کیسی باتیں کر رہا ہے۔

"اب اس سے بات کر لو چل کر۔" ناظم مسکرایا۔

"لیکن کس سلسلے میں۔" ایلی نے چڑ کر کہا۔

"بھئی اسے اپنی فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔" وہ بولا۔

آئیڈیا۔" ایلی کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

ناظم زبردستی اسے برگینزا ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں پریتماں ٹھہری ہوئی تھی۔
وں نے اندر اپنا کارڈ بھیجا اور انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد پریتماں نے انہیں اندر بلا لیا۔

وہ ایک بنی سنوری ہوئی میٹاور عورت تھی۔ جیسے چینی کی گڑیا ہو۔ ان کے روبرو بیٹھے ہوئے
لمی ادارے کی مالکہ کم دکھائی دیتی تھی۔ عورت زیادہ ایلی کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر
سا تبسم لہرایا۔ جس میں طنز کی جھلک تھی۔

"آپ الیاس آصفی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیا آپ کو فلم سے دلچسپی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "صرف۔"

"فلم سازی سے واقفیت ہے کیا؟" وہ بولی۔

"جی نہیں۔"

"فلمی کہانی لکھی ہے کبھی؟"

"جی نہیں۔"

"ناظم صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔" پریتماں طنزیہ انداز سے مسکرائی۔

"ان کا حسن ظن ہے۔"

ناظم نے غصے بھری نگاہ ڈالی۔

آئیڈیا

"مجھے ایک آئیڈیا کی تلاش ہے۔" پریتماں بولی۔

"جی۔" وہ بولا۔

"ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں۔"

"اس وقت شاید یہ ممکن نہ ہو۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کیوں۔" وہ بولی۔

"اس کی ایک وجہ ہے۔"

"اچھا۔" وہ بولی۔ "گزشتہ دو روز سے میں چار ایک اصحاب سے ملی ہوں لیکن بات نہیں
بنی۔"

"کیا وہ لوگ آپ سے ملے تھے۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں ہاں وہ مجھ سے ملے تھے۔"

"اور وہ آپ کو آئیڈیا نہیں دے سکے؟"

"بالکل نہیں دے سکے۔"

"وجہ ظاہر ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کیا مطلب۔" وہ بولی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھئے شریمتی۔" ایلی نے کہا۔ "آپ موجود ہوں تو کوئی دوسرا آئیڈیا نہیں آتا۔"

پریتماں کے چہرے پر رنگ پھیل گیا۔ ایک چمک لہرائی۔ "کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"مطلب یہ۔" ایلی نے کہا کہ "آپ مرکز بن جاتی ہیں۔"

"عجیب بات کی ہے آپ نے۔" وہ مسکرائی اور پہلی مرتبہ طنز و تحقیر کے بغیر اس کی طرف
دیکھا۔

"دراصل" وہ بولی۔ "مجھے اپنے نئے فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔"

"کس قسم کا آئیڈیا۔"

"میں عورت اور مرد کی زندگی کا کمپیریزن کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کا مطلب ہے موازنہ۔" ناظم نے کہا۔

"ہاں ہاں۔" وہ بولی ——— "موازنہ۔"

"تو کیجئے۔" ایلی نے کہا۔ "آئیڈیا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آئیڈیا تو آپ ہی کا ہوا۔"

اس نے پھر ایلی کی طرف دیکھا بولی۔" لیکن کسی طریق سے اسے پیش کیا جائے؟"

"اس میں تو کوئی مشکل نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"مثلاً۔" وہ بولی۔

"مثلاً۔" ایک ساعت کے لئے اس نے توقف کیا۔ "دنیا میں تبدیلی جنس کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔ پھر لڑکی کی جنس تبدیل کر دیجئے اور بحیثیت مرد اس کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔"

"واہ واہ ایکسیلنٹ ـ" وہ اچھل پڑی۔ "واہ آصفی صاحب۔"

ناظم نے فخریہ انداز سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ایک صورت اور بھی ہے۔" ایلی بولا۔

"کہئے۔" وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

"ایک ڈاکٹر تبدیلی جنس کا راز پا لیتا ہے۔ پھر وہ باری باری عورت اور مرد بن کر جیتا ہے۔ تفریحاً" ——— اس طرح موازنہ بہتر ہو گا۔"

"بہت خوب۔" وہ بولی۔

"پھر اسے ایک مشکل میں ڈال دیجئے۔ اور اسے فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اسے ہمیشہ کے لئے عورت بن کر جینا ہے یا مرد۔"

"ایکسیلنٹ ـ" وہ مسکرائی۔

اس کے بعد دیر تک وہ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

چائے کے دوران میں پریتماں نے اپنے بیگ میں سے ایک فارم نکالا۔ اس کے نیچے دستخط کئے اور ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ آفر ہے۔" وہ بولی۔ "جب بھی آپ چاہیں میرے سٹوڈیو میں آ جائیں۔ فی الحال میں

آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار دے سکتی ہوں۔"

ناظم خوشی سے جھوم اٹھا۔

"میری رائے مانیئے تو یہ آفر منظور کر لیجئے۔" پریتماں نے کہا۔ "آپ کی آمد کا کرایہ میرے ذمے رہا۔" اس نے سو سو کے پانچ نوٹ بٹوے سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

"جب بھی آپ کا جی چاہے آ جائیے۔" وہ نہایت دلنواز انداز سے مسکرائی۔

"ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

پریتماں کی آفر نے ایلی کی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلم میں کام کرنے کا موقعہ ملے گا۔ پانچ سو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ملاقات محض ایک خواب تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھے گا کہ وہ کاغذ جو پریتماں نے اسے دیا تھا ایک سادہ ورق ہے۔

ناظم اسے اکسا رہا تھا:

"تمہیں جانا چاہئے۔ فوراً چلے جانا چاہئے۔ بمبئی کے سٹوڈیو میں کام کرنے کا چانس ہاتھ سے گنوانا عقلمندی نہیں۔"

مانی اس کے ساتھ جانے پر تیار تھا۔ وہ یونٹ کی نوکری سے استعفٰے دے چکا تھا چونکہ اسے افسر اعلیٰ کی بیگم اور بیٹیوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

مانی نے ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ ایک ناشر سے معاملہ طے کر لیا تھا کہ بمبئی جا کر وہ اعلیٰ پیمانہ پر ایک فلمی رسالہ جاری کرے گا۔

بلند بخت اس آفر اور اس کے نتائج سے متعلق بے پرواہ تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ ایسی آفر کا مطلب کیا ہے؟

ہاجرہ خوش تھی: "ہاں ہاں چلے جاؤ۔ سنا ہے بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کام چل نکلا تو بڑی تنخواہ پاؤ گے۔"

ایلی تیار ہو گیا۔

اس نے بلند بخت کو نامن پور بھیج دیا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑا۔ ان دنوں تقسیم کی بات زبان زد خلق تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ کہیں لاہور ہندوستان کا حصہ نہ بن جائے کیونکہ علی پور ضلع گورداسپور میں واقع تھا اور گورداسپور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس

لئے علی پور ایک محفوظ مقام تھا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑنے کے بعد وہ واپس لاہور پہنچا اور
پنی اسامی سے استعفٰی دے کر مانی کو ساتھ لے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی

بمبئی کو دیکھ کر ایلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اتنا خوبصورت شہر اس نے کبھی
نہ دیکھا تھا۔ چند روز وہ بے وقوفوں کی طرح سر اٹھا اٹھا کر ان سربفلک عمارتوں کو دیکھتا رہا۔
عمارتوں کی عظمت سمندر کی وسعت اور بھیڑ کے تسلسل کو دیکھ کر اس کی اپنی حیثیت ختم ہو چکی
تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حقیر سمجھ رہا تھا۔ پریتماں کو آئیڈیا دینے سے جو اس میں خود
اعتمادی اور فخر پیدا ہوئے تھے، بمبئی پہنچ کر صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ گئے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب وہ میرین ڈرائیو کے قریب ایک باغیچہ میں بنچ پر بیٹھا ہوا
تھا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر ہل رہا
تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یہی بنچ تھا وہ۔" وہ بولے۔

"بنچ۔" ایلی نے دہرایا۔

"اسی بنچ پر بیٹھے تھے ہم۔" وہ مسکرائے۔

ایلی کو یاد آگیا ـــــ "ہاں جب سرمہ لگا کر وہ گھر سے نکلے تھے تو ـــــ" ان
دنوں وہ بمبئی ہی میں مقیم تھے۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اس کے قریب آبیٹھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک راہ گیر حسینہ کی
طرف دیکھا۔ وہ حسینہ ان کے قریب آبیٹھی۔ وہ دیوانہ وار حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک اور طرحدار عورت وہاں آبیٹھی۔ پھر ایک میم آگئی۔ وہ تینوں حاجی صاحب کی
طرف یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا آپ ان کی بھینٹ چڑھا رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے اور ایلی کے روبرو آکھڑے ہوئے:

"بیکار ہے۔" وہ بولے۔ "بے کار۔ سب بے کار ہے۔"

انہوں نے نفرت سے عورتوں کی طرف دیکھا اور چل پڑے۔ ایلی چونکا۔ اس نے گرد و
پیش پر نگاہ دوڑائی۔

"بے کار ہے۔ کھلونے۔" حاجی صاحب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ایلی نے پھر ان خوبصورت عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ تلے گتے کے رنگدار ڈبے
اوپر سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک پر چلتی ہوئی خوبصورت عورتیں گویا کپڑے کی دکانوں کی
ونڈوز سے بھاگی ہوئی پتلیاں تھیں۔

اس نے سمندر کی طرف نگاہ دوڑائی۔

سمندر نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

سامنے مغرب میں افق پر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔

اس روز جب وہ رات کو اپنی جائے قیام پر پہنچا تو وہ سوچ رہا تھا۔ حاجی صاحب کے خیال
نے آکر اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ عجیب بات تھی۔ اس عظیم الشان شہر کو اور
خوبصورت عورتوں کو بدل دیا تھا۔ یہ کیا جادو ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نقطہ نظر انسان کے
بس کی بات نہیں۔ یا ایک عام سا آدمی اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ کسی کے زاویہ نظر کو بدل
رکھ دے۔ زندگی بھر تنکے تنکے چن کر جو آشیاں بنایا تھا اسے ایک نگاہ سے تاراج کر دے۔ یہ
طاقت تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا کاروبار جس کی شاخیں کلکتہ، بمبئی اور دلی میں تھیں یک قلم چھوڑ دیا
آخر کیوں۔ کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا یا ایسے ہی کسی مرد خدا نے ان کا زاویہ نظر بدل دیا تھا۔

ایلی کو اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ شاید ان عالموں کے پاس اس کا جواب تھا ہی۔
جن کے علم و فکر پر اس نے اپنے ذہنی نظریوں کی بنیاد استوار کی تھی۔ برٹرنڈ رسل کھڑا
رہا تھا۔

دفعتاً" وہ مسکرایا:

"بچہ روتا ہو۔" وہ بولا۔ "تو اس کی توجہ کسی اور طرف کر دو۔ وہ خاموش ہو جائے گا۔"

داستووسکی مسکرا رہا تھا: ہم سبھی بچے ہیں۔"

داستووسکی کہہ رہا تھا: "اگر انسان میں بچے کا عنصر نہ ہو تو وہ عفریت بن کر رہ جائے"

ایلی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سبھی بچے تھے۔ کیا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ قدرت کی دین تھی۔ کیا
نگاہ میں معمولی تبدیلی اتنا عظیم فرق پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے روبرو پاگ بابا کھڑا چلا رہا تھا:
کون ہوں۔ کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔"

ایلی کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کسی وقت تو اس کی وحشت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ خود کو کانکا کا میٹا مارفیس سمجھنے لگتا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اس خیال پر وہ بالکل گھبرا جاتا۔

بمبئی میں ایلی کے دھندلکے میں صرف مانی دھوپ کی ایک شعاع تھی۔ مانی میں زندگی تھی۔ چمک تھی۔ جوش تھا۔ شوق تھا۔ اس کے نقطۂ نظر میں صحت تھی۔ بے پروائی تھی۔

وہ بمبئی کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں خوبصورت عمارتیں گتے کے ڈبے نہ تھے۔ حسین عورتیں درزیوں کے ماڈل نہ تھے۔ اس کی نگاہ میں عورتیں عورتیں تھیں اور اس قدر حسین بھی نہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی حیثیت کھو دیتا۔ حسین عورتیں ——— خوب تھیں۔ اچھی خاصی تھیں ——— اس قابل تھیں کہ ان سے دل بہلایا جائے۔

مانی جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس میں جھجک نہ تھا۔ ایلی کبھی جوانی سے واقف نہ ہوا تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا۔ زندگی کی راہ پر تھکا ہارا ہوا۔ گزشتہ تلخیوں کی وجہ سے اس کی طبیعت ڈر اور گھبراہٹوں سے اٹی پڑی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن میں قطعی طور پر ہم آہنگی نہ تھی۔

مانی اور ایلی کو بمبئی میں رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ ملی جہاں شاعر اور مصنف رہتے تھے۔ ایلی کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسے ادیبوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ عجیب لوگ تھے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہ تھے۔ بات کرنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ کہ اس بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ وہ اثر یا ردعمل سے بے نیاز تھے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ کیا سوچے گا۔ آیا اسے بات بری لگے گی۔ وہ دوسروں کے احساسات سے بے گانہ تھے۔ دل کی بات کو چھپانے کے قائل نہ تھے۔ وہ خود شعوری سے بے گانہ تھے ایلی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں بہاؤ ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ وہ خود پسند ہیں۔ اپنی اہمیت کے چراغ جلانے کے شوقین ہیں اور دنیا کو اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں۔

ان دنوں بمبئی میں بھی ہندو مسلم فسادات جوبن پر تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ اس کے علاوہ آتشزدگی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو علاقوں میں اکثر

وارداتیں ہوتی تھیں لیکن کبھی کبھی سول لائنز کے علاقے میں بھی کوئی واردات ہو جاتی اور کچھ دیر کے لئے وہ علاقہ ویران دکھائی دیتا۔ پھر جلد ہی لوگ اسے بھول جاتے اور پھر سے آمد و رفت شروع ہو جاتی۔

ایلی خوف کے مارے کبھی ہندو علاقوں میں نہیں گیا تھا۔ سول لائنز میں گھومتے ہوئے بھی اس پر خوف مسلط رہتا۔ لیکن مانی بے نیاز تھا۔ اس نے چلتے ہوئے کبھی اپنے اردگرد نہ دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلے جاتا۔ چلتے ہوئے کوئی گیت گنگناتا رہتا۔ ایلی کو اس کی بے پروائی پر غصہ آ جاتا اور وہ ہر وقت مانی سے بحث کرتا۔ اسے گھورتا۔

ابھی انہیں بمبئی پہنچے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پریتماں کے نگار خانے کے دروازے پر ایک وارداتیں ہو گئیں۔ غنڈروں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ نگار خانے کو آگ لگا دیں گے چونکہ پریتماں کا خاوند مسلمان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگار خانہ بند کر دیا گیا۔

اس کے بعد مانی اور ایلی کی تمام تر توجہ فلمی پرچے کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو وہ شائع کرنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ مانی انٹرویوز میں مصروف تھا چونکہ وہ بے دھڑک ہر علاقے میں جا سکتا تھا اور لوگوں سے مل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ایلی کا خوف سدراہ تھا۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔

ریڈیو پاکستان

اگست سنتالیس میں مانی کے پبلشر نے انہیں بلا بھیجا تا کہ وہ چند امور کا تصفیہ کر لیں۔ اس بلاوے پر ایلی مسرور تھا چونکہ اس اس کا جی چاہتا تھا کہ عالی سے ملے۔ اسے خیال تھا کہ عالی اس کی غیر حاضری پر متعجب ہو گا۔ سوچتا تھا کہ پہلے ابو چلا گیا۔ پھر امی چلی گئی اور ابو آ گیا اور اب دونوں نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مانی انٹرویوز کے چکر میں ایسا پھنسا تھا کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاہور جائے۔ اسے فلمی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ ستاروں، ناقدوں اور فلمسازوں سے مل جل کر اس نے اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس لئے وہ ایلی کے ساتھ لاہور جانے پر رضامند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایلی لاہور جا کر بات چیت طے

کر لے۔ جب تک وہ خود بمبئی میں کام جاری رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی لاہور آ گیا۔

ابھی ایلی نے لاہور میں قدم رکھا ہی تھا کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گاڑیوں کی آمدورفت ختم ہو گئی۔ بسوں کا چلنا موقوف ہو گیا۔

ایلی نے اس خبر کو سن کر خصوصی پریشانی محسوس نہ کی۔ ہاجرہ عالی فرحت اور علی احمد کے کنبے کے تمام افراد علی پور میں محفوظ تھے اور علی پور محفوظ ترین مقام تھا البتہ لاہور کے متعلق مسلمان پریشان تھے اور ریڈ کلف ایوارڈ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔

لاہور شہر میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے۔ رات کے وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور پھر موت کی سی خاموشی چھا جاتی۔ پھر کسی مجمع کا شوروغل بلند ہوتا۔ لوگ چنگھاڑتے چلاتے چیختے اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ صبح سڑکوں پر یہاں وہاں لاشیں دکھائی دیتیں۔ انہیں دیکھ کر اپنے قدم راہ گیر اور تیز کر دیتے تھے۔ سپاہی واردات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر منہ موڑ لیتے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی کہ ۱۴۔ اگست کا دن قریب آ رہا تھا۔ اس روز پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور ایوارڈ کا اعلان ہونے والا تھا۔

اس شام شہر پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ لوگ گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ بازاروں میں مسلح فوج ہاتھوں میں مشین گنیں لئے گھوم رہی تھی۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک کھڑے تھے۔

ایلی ریڈیو کھول کر بیٹھا تھا۔

گھڑی نے بارہ بجا دیئے۔ ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بارہ بجے اعلان ہونے والا تھا۔

آج وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اعلان اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہو۔ جیسے آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ مذہبی تعصب سے بلند و بالا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ قیام پاکستان سے بے گانہ ہے۔ وہ ہندوستان اور عوام کی بہتری کے فلسفے کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بذات خود پاکستان ہے اور اس روز حدود طے ہونے والی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک بادشاہ ہو اور پاکستان کے قیام کا اعلان دراصل اس کی

رسم تاجپوشی کا اعلان تھا۔ اس روز اسے معلوم ہونا تھا کہ اس کی قلمرو کہاں سے کہاں تک ہو گی۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ ایک ان جانی اداسی اور پریشانی اس پر مسلط تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کی قلمرو اسے مل جائے گی۔ وہ مضطرب تھا۔ بے حد مضطرب۔

دفعتاً" حاجی صاحب اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ ان کی گردن ہل رہی تھی۔

"وقت آئے گا۔" وہ مسکرائے۔ "انشاء اللہ۔" وہ بولے۔

پاگ بابا چلانے لگا: "وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ اسی کا کام ہے۔ وہی جانے۔ میں کون ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔"

پھر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔ ابھر رہی تھی۔ ان کے پیچھے کنواں گڑگڑا رہا تھا۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی مسجد سجدے میں پڑی تھی۔

رومی ٹوپی والے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر دراز قد نے آنکھیں بند کر لیں۔

"الحمد للہ۔ الحمد للہ۔" مدھم سی سرگوشی ابھری۔

ریڈیو نے مہر سکوت توڑ دی۔

طبل بجنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی۔ اور قریب۔ اور قریب۔

"ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔"

اعلان ایلی کے بند بند میں گونجا۔

پھر دھڑکن بن کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس کا سر بھن سے اڑ گیا۔ جیسے کسی نے بارود کو آگ دکھا دی ہو۔

پھر اس کے بدن پر چیونٹے رینگ رہے تھے۔ چیونٹے ہی چیونٹے۔

پھر کسی نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

"پاکستان زندہ باد۔" کوئی چلایا۔

اسکے روبرو دنیا بھر کے مسلمان قطاروں میں کھڑے تھے اور ہر مسلمان کے سر پر تاج تھا۔

الی عالی

اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ ضلع گورداسپور ہندوستان میں شامل ہو گیا ہے۔ تو اس کا
ل دھک سے رہ گیا۔

اسے یقین نہ آتا تھا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟" وہ آپ ہی آپ چلا رہا تھا —— "نہیں
ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟"

پھر وہ باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں دکانوں پر کھڑے لوگ "گورداسپور" گورداسپور چلا رہے
تھے۔

نکڑ پر حلوائی دودھ کے کڑاہے میں چمچہ ہلاتے ہوئے آپ ہی آپ گنگنا رہا تھا: "پر بھائی جی
—— گورداسپور کا کیا ہو گا؟"۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے جا رہا تھا۔

"بھوں بھوں۔" کار چیخ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔

"کیوں جی۔" ڈرائیور نے سر نکالا۔ "گورداسپور کا کیا بنا۔"

"کیا بنا۔" ایلی نے دہرایا۔

"وہاں میرے بچے ہیں۔" ڈرائیور نے ایک عجیب سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

کار چل پڑی۔ اس کے پیچھے عالی بیٹھا تھا۔ "ابو۔ ابو۔" وہ ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ "ابو۔
ابو۔" پھر بہت سے لوگ اس کے گرد آ کھڑے ہوئے۔

"کون ہے تو بابو۔" وہ چلائے۔ وہ غنڈے تھے۔

ایلی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کہاں جا رہا ہے تو؟" وہ اسے گھورنے لگے۔

"علی پور۔" وہ بولا۔ "وہاں میرا بچہ ہے۔ میری ماں ہے۔ میرے سبھی ہیں۔"

وہ پیچھے ہٹ گئے۔

"پیدل جائے گا۔" ایک لڑکا چلایا۔

"اے ہٹ جا۔" کس نے تڑاخ سے لڑکے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "جانے دے۔" غنڈہ
چلایا۔

ریلوے سٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ دیر تک
وہاں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ "بابو جی بابو جی۔" وہ وردی والے بابو کو دیکھ کر بولا۔ "بابو جی بابو
جی۔ امرتسر کو گاڑی جائے گی کیا؟"

بابو رک گیا اور چونکتے ہوئے انداز سے بولا: گاڑی؟"

"جی۔" ایلی نے کہا۔ "امرتسر گاڑی جائے گی کیا؟"

"اوہ۔" بابو چونک کر بولا۔ "مطلب ہے گاڑی۔"

"جی ہاں۔" ایلی بولا۔ "امرتسر کو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ "گاڑی نہیں جائے گی۔"

"نہیں جائے گی؟"

بابو نے سرہلا دیا۔ اس کی آنکھیں پر نم تھیں۔

دو روز وہ ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ بسوں والے اس کے سوال کا
جواب نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

"میں تمہیں کرایہ دوں گا۔ جو مانگو گے دوں گا۔" وہ چلاتا۔

وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور سرہلا دیتے۔

بسوں کے اڈے سے وہ پھر سٹیشن پر جا پہنچا۔

حتیٰ کہ ایک روز گاڑی آ گئی۔

"یہ گاڑی امرتسر جائے گی۔" وہ چلایا۔

"بابو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ امرتسر سے آئی ہے"۔

"کیا یہ واپس جائے گی" وہ چلایا۔

بابو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ "جا کر دیکھ لو۔"

ایلی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید گارڈ اسے بتا سکے۔

وہ ڈبے کی طرف لپکا۔

ڈبے میں چاروں طرف خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ سرخ گٹھڑیاں ادھر ادھر پڑی
تھیں۔

ایلی کی چیخ نکل گئی۔

"یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔ یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔" چاروں طرف شور مچ گیا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ علی پور ٹرک لے جانے کے لئے اسے دفتر سے پرمٹ حاصل کرنا
ہے۔

جب وہ پرمٹ دفتر پہنچا تو وہاں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ دیوانہ وار دفتر کے گرد گھوم رہے
تھے۔

سارا دن وہ وہاں گھومتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ جب دفتر بند ہو گیا تو وہ ایک
…و کے سامنے چلانے لگا:

"پرمٹ لینا ہے؟" بابو نے پوچھا۔

"جی۔"

"کہاں کا؟"

"جی علی پور کا۔"

"ہوں۔ ٹرک ہے تمہارے پاس۔"

"جی نہیں۔" وہ بولا۔

بابو قہقہہ مار کر ہنسا۔ "تو پرمٹ کس کا لو گے؟"

"لیکن ......" ایلی بولا۔

"بھائی صاحب۔" بابو کہنے لگا۔ "پہلے ایک ٹرک حاصل کرو جو ادھر جانے کے لئے تیار ہو۔
…ر یہاں آ کر پرمٹ لو۔ اور علی پور لے جاؤ۔ ایسے غم نہ کھاؤ۔ علی پور ابھی تک محفوظ ہے۔"

پھر کئی ایک دن وہ ٹرکوں کے پیچھے گھومتا رہا۔ ادھر جانے کے لئے کوئی ٹرک رضامند نہ ہوتا
…ا

"بھائی صاحب۔ امرتسر کی طرف جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ سالے ٹرک کو آگ لگا دیتے
…یں وہاں امرتسر میں تو خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔"

آخر اسے ایک ٹرک مل گیا۔

"دیکھو بابو۔" ٹرک والا بولا۔ "جتنے دن کھڑا ہے سو روپیہ فی روز ہو گا اور جس روز پرمٹ

مل گیا دو سو جانے کا اور دو سو آنے کا یعنی چار سو لگے گا۔"

ایلی نے محسوس کیا کہ پرمٹ حاصل کرنے سے پہلے اسے روپیہ کا انتظام کرنا ہے۔ لاہور میں اس کے گرد وحشت ناک مناظر تھے۔ مکانات جل رہے تھے۔ سڑکوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ لوگ گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے آ رہے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ امرتسر سے آئے ہوئے لوگ اشتعال بھرے نعرے لگا رہے تھے لیکن وہ ان مناظر سے بیگانہ تھا۔ اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ہاجرہ کے چہرے کی جھریوں پر آنسوؤں کے قطرے بہہ رہے تھے۔

صبح سویرے وہ پرمٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ سارا دن وہاں دھکے کھاتا اور پھر جب دفتر بند ہو جاتا تو ٹرک والے کے لئے سو روپیہ اکٹھا کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتا۔

چھ دن گزر گئے۔ وہ ٹرک والے کو چھ سو روپیہ ادا کر چکا تھا۔ اب اس پر مایوسی اور ناامیدی چھا چکی تھی۔ پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

ہولڈ آپ

پھر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شیر علی کھڑا تھا۔

"آپ یہاں۔" وہ بولا۔

اس نے شیر علی کو پہچان لیا۔ "تم یہاں؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں یہاں ملازم ہوں۔" وہ بولا۔

"اور وہ سب۔ وہ ------ " ایلی نے پوچھا۔

"وہ سب علی پور ہیں۔" شیر علی بولا۔

"پرمٹ نہیں ملا۔" ایلی نے مایوسی بھرے انداز سے کہا۔

"مجھے ایک ٹرک مل گیا ہے۔" شیر علی بولا۔ "آج ہی محکمہ والوں نے دیا ہے۔"

"مل گیا ہے۔" ایلی چلایا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں مل گیا ہے۔ صرف ایک بندوق والا سپاہی اور ایک ڈرائیور۔"

"اوہ ...." ایلی اٹھ بیٹھا۔

اسی روز وہ فوجی ٹرک میں بیٹھے علی پور جا رہے تھے۔

ٹرک کے پردے بند تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے زیر لب قرآن کی آیات پڑھ رہا
سپاہی نے بندوق کی نالی پردے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اور وہ سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔
شیر علی چپ چاپ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ ایلی ٹرک کے اندر پچھلی سیٹ پر گٹھڑی بنا ہوا
اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"اللہ اپنا فضل کرے۔" ڈرائیور چلایا۔ "بسم اللہ۔" اس نے ایکسیلیٹر کھولتے ہوئے کہا۔

"ہم امرتسر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے کوئی باہر نہ جھانکے پردے کے پیچھے نہ
۔ گولی سے بچاؤ نہ ہو گا۔"

"روکنا نہیں۔" سپاہی بولا۔ "چاہے کچھ بھی ہو۔"

"روکنا۔" ڈرائیور بولا۔ "ہم چالیس کی سپیڈ پر چلیں گے۔ چاہے کوئی بھی سامنے ہو۔"

"اللہ مالک ہے۔" سپاہی بولا۔

ٹرک جھول رہا تھا۔ ربڑ کے گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

دور بہت سے لوگ چلا رہے تھے۔ نعرے مار رہے تھے۔ لمبی سنسنی خیز چیخیں سنائی دے
تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وقت رینگ رہا تھا۔

دفعتاً" سپاہی چلایا۔ "وہ دیکھو۔ ریل کی پٹری کے دونوں طرف سکھوں کے جتھے ہیں۔"

"وہ دیکھو۔" وہ پھر چلایا۔ "وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔"

"اندھے ہو گئے ہیں اندھے۔" ڈرائیور بولا" یہ سکھ۔"

"سر پر خون سوار ہے۔" سپاہی نے کہا۔

"لیکن ریل کی پٹری پر کیوں۔ سڑک پر کیوں نہیں۔" شیر علی نے پوچھا۔

"ضرور کوئی بات ہے۔" سپاہی نے کہا۔

پھر سپاہی اور ڈرائیور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شیر علی اور ایلی خاموش بیٹھے تھے۔

"لو چار میل رہ گیا علی پور۔" ڈرائیور بولا۔

"چار میل۔" سپاہی بولا۔ "ذرا روکو۔" وہ چلایا "روکو۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" ڈرائیور بولا۔

سپاہی نے بندوق کی نالی ڈرائیور کی طرف پھیر دی۔ "میں کہتا ہوں۔ روکو۔ سنا تم نے۔"
اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز تھرا رہی تھی۔ "روکو۔"

گاڑی رک گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھائی اور باہر چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ "میرا انتظار
کرو۔ میں ابھی آیا۔ جانا نہیں۔" اور وہ بھاگتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے ایلی اور شیر علی کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ ایلی کے
ذہن میں وہی خلا کھول رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عالی کی چیخیں مدھم پڑ چکی
تھیں۔ اس کی شکل دھندلا گئی تھی۔ ہر چیز پر دھندلکا چھائے جا رہا تھا۔

"یہ تو سمجھو ہولڈ اپ ہو گیا۔" ڈرائیور بولا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سپاہی انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں وہ
سکھوں کے ساتھ تو نہیں مل گیا تھا۔ ان کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانا۔ ایسی جگہ جہاں
چاروں طرف دشمن تھے۔

"چلو لے چلو۔" شیر علی نے ڈرائیور سے کہا۔ "اب تو علی پور قریب ہے۔"

"اونہوں۔" ڈرائیور بولا۔ "اس کو یہیں چھوڑ جائیں ——— وہ مسلمان ہے بھئی۔ کیسے
چھوڑ جائیں۔"

سامنے ایک ویران گاؤں تھا۔ گاؤں کے دو ایک مکان جلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دھواں
اٹھ رہا تھا۔

اس کے اردگرد کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ دفعتاً" ڈرائیور اٹھا۔ اس نے لوہے کی
دو بڑی بڑی سلاخیں اٹھائیں۔

"یہ لو۔" وہ بولا۔ ایک سلاخ ایلی کے ہاتھ میں تھما دی۔ "یہ لو یہ۔" اس نے ایک کونے
کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے پردے سے باہر نکال رکھو۔"

پھر اس نے دوسری سلاخ شیر علی کے ہاتھ میں تھما دی۔ "وہ سمجھیں گے کہ بندوقوں کی
نالیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پتہ نہ چلے کہ ہم نہتے ہیں۔"

"جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔" اس نے ٹرک کی جالی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی۔

"انشاء اللہ دو چار کو مار کر مریں گے۔"

دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

"وہ آ رہے ہیں۔ خبردار۔" ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ "خاموش۔"

سامنے چار سکھ ہاتھوں میں لٹھ اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹرک کے قریب آ کر وہ ... گئے

"قریب آئیں تو گولی مار دو۔" ڈرائیور چلایا۔ گولی مار دو سارجنٹ۔" وہ چلایا۔ "ایلی نے ... کی سلاخ کو اور باہر نکال دیا۔

"سارجنٹ۔" ڈرائیور چیخنے لگا۔ سنتے ہو سارجنٹ۔"

یہ سن کر سکھ بھاگ گئے۔

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ "بزدل بھڑوے۔" وہ بولا۔ "ڈر گئے۔"

ایلی کی پیشانی پسینہ میں شرابور تھی۔

دفعتاً" دور سے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "آ گیا گرایاں آ گیا۔ اللہ اکبر۔" اس نے نعرہ ... وہ بندوق اٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔ "اللہ ہو اکبر۔" اس کا نعرہ دور تک گونج رہا تھا۔ "چلو چلو۔ ...ٹ کرو۔" وہ قریب آ کر بولا۔ "وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

ٹرک چل پڑا۔

"کیا بات تھی؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"گیا تھا رپورٹ کرنے۔"

"کہاں گیا تھا۔"

"بانڈری فورس کا ہیڈ کوارٹر ہے یہاں ۔ وہاں گیا تھا۔"

"کہاں ہے ہیڈ کوارٹر۔"

"یہاں سے تین میل دور۔" سپاہی نے کہا۔ "وہ سامنے اس جھنڈ سے پرے۔"

"کیوں گئے تھے۔"

"میں نے سوچا۔ یہ سکھ جو ریل کی لائن پر کھڑے ہیں۔ ضرور رفیوجیوں کی گاڑی آنے والی ... تو میں نے سوچا مسلمانوں کی ساری گاڑی کٹ جائے گی۔"

"تو پھر۔" ڈرائیور نے پوچھا۔

"پھر مجھے پتہ تھا کہ یہاں بانڈی فورس فرنٹیر فورس کی ہے۔ سب مسلمان ہیں اس لئے میں

نے کہا۔ مہاجر گاڑی کو اللہ کے حکم سے بچاؤں گا۔ فورس کا صاحب انگریز ہے۔ میں نے سیلوٹ مارا۔ میں نے کہا حضور ریل کی پٹڑی پر رفیوجی گاڑی کو سکھوں کے جتھے روک کر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔"

"گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔" ایلی بولا۔

"تمہیں کیا معلوم بابو۔" سپاہی بولا۔ "ایسا نہ کہتا تو وہ سپاہی کیسے بھیجتا جو یہ کہتا گاڑی آنے والی ہے تو کون سنتا میری بات۔"

"تو پھر؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"صاحب ابھی سوچ رہا تھا کہ جوانوں نے سن لیا اور وہ حکم ملنے سے پہلے ہی رفلیں لے کر بھاگے۔ وہ سب آ رہے ہیں سکھوں کے جتھے بھاگ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو گاڑی بچ جائے گی۔"

"انشاء اللہ۔" ڈرائیور بولا۔

"اگر ہم پر یہاں حملہ ہو جاتا۔" شیر علی نے پوچھا۔

"یہاں تو صرفت تین مرتے۔" سپاہی بولا۔ "وہاں تو سینکڑوں کی بات تھی۔"

"اللہ مالک ہے۔" ڈرائیور بولا۔

ایلی نے حیرانی سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "اور اگر تمہیں گولی مار دیتے تو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے بابو۔ مار دیتے۔" وہ مسکرایا۔ "اپنا کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن گولی سے ہی مرنا ہے۔ پر وہ مسلمان رفوجی کی گاڑی ——— " وہ رک گیا۔

ایلی کی نگاہ سے گویا ایک پردہ سا ہٹ گیا۔

عالی پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی جگہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بچے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا ابو ابو۔ بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ سینکڑوں بوڑھی عورتیں اس کی طرف امید بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

جاؤ جاؤ

انہوں نے محلے پر آخری نگاہ ڈالی۔

وہ آصفی محلے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

محلہ ویران پڑا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواریں چپ چاپ ا-ستادہ تھیں۔

محلے کا میدان خالی پڑا تھا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ کچھ اداس کھڑے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں کی زبانیں گویا تالو سے چمٹ گئی تھیں۔ ان کی قوت گویائی آنکھوں میں ڈوب رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کی گھرانے کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایلی نے آخری نگاہ ڈالی۔ اوپر چوبارے میں شہزاد کھڑی تھی۔ پھر وہ سب ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی احمد چپ چاپ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

ہاجرہ کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ عالی حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شمیم اور اس کی بیٹیاں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ صرف راجو کے چہرے پر ہمت اور امید کی جھلک تھی۔ نصیر دانتوں میں تنکا چلا رہا تھا۔ الہ ہاتھ مل رہی تھی۔ فرحت کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بچے سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

ٹرک چلے جا رہا تھا۔

ریل کی سڑک کے دو رویہ فوجی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

دفعتاً سپاہی چلایا: "اللہ اکبر"

سب سپاہی کی طرف دیکھنے لگے۔

"رفیوجی گاڑی۔ رفیوجی گاڑی۔" وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہا تھا۔

انہوں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔

سامنے ریل کی پٹڑی پر مسلمانوں کی پہلی رفیوجی گاڑی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ لوگ یوں چمٹے ہوئے تھے جیسے گڑ پر چیونٹیاں۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے اس عظیم بوجھ تلے ہونک رہی ہو۔

"اور گرایاں۔" سپاہی چلانے لگا۔ "آج اگست کا آخری دن ہے۔"

ڈرائیور نے سپاہی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر وہ بولا:

"کل مسلمان باؤنڈری فورس یہاں سے چلی جائے گی۔"

"چلی جائے گی۔" علی احمد بولے۔

"اور اور۔" ڈرائیور بولا۔ "چلی جائے گی تو ...."

"سکھ دھاندلی مچا دیں گے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"اور علی پور کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو باؤنڈری والوں کی وجہ سے بچا ہوا تھا۔" سپاہی بولا۔

"گرودتن تو صاف ہو گیا۔" ڈرائیور نے کہا۔

ایلی نے جھرجھری لی۔

ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔

"ارے بھائی۔" ڈرائیور نے ایک چیخ سی ماری۔

سبھی ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔

ٹرک رک گیا۔

وہ سب سہم گئے۔ شاید حملہ ہو گیا۔ شاید ٹرک خراب ہو گیا۔

سپاہی نے علی کا نعرہ مارا اور بندوق اٹھائے باہر چھلانگ لگا دی۔

وہ پردے ہٹا کر دیکھنے لگے۔

سڑک پر یہاں وہاں لاشیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑے ہوئے تھے اور ان کے درمیان پاگ بابا چھاتی نکالے گردن اٹھائے بے پروائی اور بے نیازی سے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں ٹہل رہا تھا جیسے جہاز کا کپتان ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کے ملاحوں کو احکامات جاری کر رہا ہو۔

"بابا......" ڈرائیور چلایا۔

سپاہی بابا کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

"بابا۔" ڈرائیور پھر چلایا۔

بابا دور نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

"آؤ باؤ چلیں۔" سپاہی چلایا۔ "پاکستان چلیں۔"

بابا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "چلیں۔" وہ بولا۔ "سب نے چلے جانا ہے۔ سب نے۔ ہاں تو جاؤ۔ جانا ہے تو جاؤ۔ جس نے جانا ہے جائے۔"

"تم آ جاؤ بابا۔" ڈرائیور چلایا۔

بابا اپنی ہی دھن میں چلا رہا تھا: "جانا ہے تو جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔
وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے۔"

"لیکن بابا۔" سپاہی چلایا۔ "وہ تمہیں مار دیں گے۔"

"مار دیں گے ------وہ ------" بابا کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی۔ "وہ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ۔ کوئی بھی تو نہیں صرف وہی ہے۔ صرف وہی۔ یہاں وہاں ہر جگہ ہر جگہ اور کون ہے؟"

"اسے زبردستی اٹھالو۔" ڈرائیور چیخنے لگا۔ "اٹھالو۔ ٹرک میں ڈال دو۔"

بابا نے ایک غضب ناک نگاہ سپاہی پر ڈالی۔

"مت کرو۔ مت کرو۔" ہاجرہ بولی۔ "بابا کو کچھ نہ کہو۔"

بابا نے ایلی کی طرف دیکھا۔ ایلی نے جھک کر سلام کیا۔

حضور حضور

بابا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ٹرک کے قریب آ کھڑا ہوا:

"بولو کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔" وہ چلایا۔ "سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کہاں کہاں حفاظت نہیں کی۔ کہاں کہاں خیال نہیں رکھا۔ کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔ بولو بتاؤ۔"

"وقت آ گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے۔" وہ پھر بولنے لگا۔ "جاؤ جاؤ۔ تم جاتے کیوں نہیں۔ وقت آ گیا۔ دور دور۔ جاؤ جاؤ۔ مسجد کے پاس کنوئیں کے پاس دونوں بیٹھے ہیں۔ اللہ نے معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا وہ جس کے ہاتھ میں چاہے دیدے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہ جانے اور وہ جانے۔ وہ دینے والا وہ لینے والا۔ جاؤ جاؤ۔"

ڈرائیور نے ٹرک سٹارٹ کر دیا۔ سپاہی پھدک کر اوپر چڑھ گیا۔

"آ جاؤ بابا۔" سپاہی آخری مرتبہ چلایا۔

بابا نے قریب ہی سے ایک لاٹھی اٹھائی اور دوسری طرف منہ پھیر کر اسے لہرانے لگا۔
"ہٹ جاؤ ------ ہٹ جاؤ۔" اور پھر لاٹھی پھینک کر ہنسنے لگا۔ "مجھے کیا ہے مجھے کیا ہے۔ کرنے والے تم ہو۔ تم جانو۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں" وہ چلا رہا تھا۔

ٹرک روانہ ہو چکا تھا۔

دفعتاً" ایلی کے روبرو حاجی صاحب آ کھڑے ہوئے۔ "وقت آئے گا۔ وقت آئے گا۔" وہ مسکرائے۔ "الحمدللہ۔ اللہ اچھا کرے گا۔ وقت آئے گا۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی: "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی۔

ولی کا عالم مولوی ہنس رہا تھا۔ "سب اس کا پرتو ہے۔ سب اس کی شعبدہ بازی ہے۔ وہ بڑا شعبدہ باز ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔

"خبردار۔" ڈرائیور چلایا۔ "امرتسر آ گیا۔ کوئی باہر نہ جھانکے۔ کوئی آواز نہ نکالے۔"

"اللہ مالک ہے۔" سپاہی بولا۔

ایلی چونک پڑا۔

اس نے سامنے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔

سامنے چوک میں ایک فوجی کھڑا تھا۔

"اگر اس نے روکا۔" سپاہی بولا۔ "تو رکنا نہیں۔"

"جو اللہ کرے۔" ڈرائیور نے ٹرک تیز کر دیا۔

چوک میں کھڑے فوجی نے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

"جاؤ جاؤ۔" دور سے پاگ بابا کی آواز سنائی دی۔

"تڑاخ ------۔" ایک آواز سی سنائی دی۔

چوک میں کھڑا فوجی ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلی نے دھڑکتے ہوئے دل سے سامنے دیکھا۔

"جاؤ جاؤ۔ چوک میں۔" پاگ بابا چلا رہا تھا۔ "سڑک سے نہیں۔ کھیتوں سے۔ کھیتوں سے۔"

ڈرائیور نے ٹرک سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔

"نیا جیون۔ نیا جیون۔" کھڑکی میں شہزاد گنگنا رہی تھی۔

"آنے دو۔" رومی ٹوپی والا کھیتوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔

"راستے کی رکاوٹ تو میں تھی۔" شہزاد

"آنے دو۔ آنے دو۔" دراز قد اشارے کر رہا تھا۔

ٹرک دوڑ رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔

"آ جاؤ۔ جاؤ۔" پہیوں کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

"حضور حضور۔" ہارن خوشی سے چیخ رہا تھا۔

"پاکستان۔ پاکستان۔" ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

علی پور کا ایلی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

"علی پور کا ایلی۔" کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چیپی لگی ہوئی ملتی تھی۔ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ "اسے آدم جی انعام بھی ملا۔" اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بابت ابن انشاء صاحب نے کہا۔ "اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا" اور جملہ کا یہ حصہ اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا ضرور ملے گا۔ مگر انعام "تلاش بہاراں۔" کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیباک تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام "خدا کی بستی۔" کو دیا گیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا۔ "آپ نے ترازو بٹہ سے تول کر انعام دیا ہے۔" اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ "آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔" مولوی صاحب ہنس دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال "تلاش بہاراں۔" کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا۔ وہ قریب المرگ تھے۔ مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا۔ "اب کی انعام دینے کے سلسلہ میں "علی پور کا ایلی۔" اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہٰذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب "تلاش بہاراں۔" کو آپ نے انعام دے دیا۔" مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آ جاتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری سنی یا نہیں۔ مگر میں یہ سب ہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی

تعریف یہ ہو کہ "اسے آدم جی انعام ملا" اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ اسے "آدم جی انعام نہیں ملا۔" انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک جن ناولوں کے بابت یہ کہا جائے کہ انہیں انعام ملا یا نہیں ملا وہ بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس بنا پر "مجھے علی پور کا ایلی۔" سے ایک مبہم سا تعصب ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس تعصب کو ختم ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے یہاں اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو "ہماری لائبریری۔" کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت ہی واقف تھا۔ اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ "علی پور کا ایلی۔" کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب عاریتاً لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں ایسا محو ہوا کہ دن دن بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھرا اور کراچی کی بسوں میں دفتروں میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا۔ اس کی طرف رجوع ہو گیا کتاب ضخیم تھی اور جلد پیپر بیک جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلامبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا۔ "اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا" چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور میرے لئے میں غیر ادبی یا ادب سے گری ہوئی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔" غرض اس کتاب کو ایک ہلکی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے دلچسپ اور قابل وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس مثل پر پوری اتری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشفق محمد طفیل ایڈیٹر "نقوش۔" نے اس کا "فسانہ آزاد۔" سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "علی پور کا ایلی۔" اور "فسانہ آزاد۔" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر الذکر ناول کے میدان میں پہلا ڈگمگاتا ہوا قدم ہے اول الذکر اس میدان کے ادب میں پورے طور پر تسخیر کا نشان ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اس پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالئے۔" میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آ گئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھ ڈالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقوش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیئے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر

مفصل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا بلکہ ناول کے اصل معنوں میں پہلے دور کے نقوش جما رہی ہیں۔ میری رائے ہے کہ "علی پور کا ایلی۔" ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انعام تو بیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے۔ جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکسار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

"اپنی دانست میں میں نے ناول بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اس لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔---- "

بہر حال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی۔ جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چناؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ بیتی ہے۔

(پیش لفظ، طبع ثانی)

پیش لفظ طبع ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرما چکے تھے۔

---------- یہ روداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پلا پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی پھلجھڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالا نہ پیدا کر سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول بھلیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے

یک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور فسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے اور ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔"

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ نہیں ملتا ہے اسے باقاعدہ تنقید ہی کہا جا سکتا مگر وہ ممتاز مفتی صاحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب ذیل خاصی باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتدا کرنے والوں کے سامنے بھی یہی مخصوص مقصد تھا اور یہی مقصد آج بھی تمام ادبی ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اس مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظریہ یا تخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی بحث کا مواد بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روئداد کو بے کم و کاست بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب رہا ہے۔ ابتدا کے ناول نگار اسے فسانہ سمجھ کر بہت سے فرضی، خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ اس لئے ہمار۔۔ یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ مفتی صاحب اس فارم اس "خالص ناول۔" کی راہ پر چل رہے ہیں اور "علی پور کا ایلی۔" اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور قدریت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں لغزش نہ آنا۔ بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہمکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں دو

خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چننے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج کا انتخاب اور ارتفع کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑا کر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول فنکار اور صاحب ذوق دونوں کی تخیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر لوگ اسے اپنی اپنی طرح پر سمجھتے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور ہر اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے۔ اور زندگی کا واضح سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے "علی پور کا ایلی۔" میں ہمیں جدید فنکاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی کتنا زور دار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہو مگر زیادہ تر لوگ ضخامت سے ٹھٹھر جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد چار سو صفحوں کی ہو۔ "علی پور کا ایلی۔" کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بدمذاقی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت مواد اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخامت گھیرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روانی کے ساتھ ناول سرسراتے گئے ہیں اور انہیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخلیق کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اسی کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو دائمی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول نگاری کے سلسلے میں بھی باغی ہے۔ اور بالکل واقعاتی کردار پیش کرنے کے

بجائے اشاریت وغیرہ پر عمل کرتی ہے۔ مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو "دون کا ہوٹے۔" سے شروع ہو کر "پکوک پیپرز۔" تک چلی آتی ہے اور آج بھی سومرسٹ ماثم وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں بھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاؤوں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرنا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے۔ پھر ناول کا مرکزی کردار ایلی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بابت چند بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اسی مثل کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی باکمال آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی باکمال سے وابستہ ہونا چاہئے اور اگر ایلی دنیائے ناول نگاری کے ان کرداروں میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیاد۔ روح یا سیدھی ضرور راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی رائے کو کوئی خاص وقعت نہیں دینا چاہئے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور "علی پور کا ایلی۔" میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے غداری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی صاحب نے رومانی رنگ چڑھانے سے گریز کیا۔ اس لئے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی بھی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈھتے ہیں اور ویسی دلچسپی بھی جو جیسی ایک فرد کے دنیا سے کشمکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کش مکش سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ایک مسلسل عشقیہ قصہ بھی ہے۔ جو بڑے جزئیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلو دکھاتا ہے۔ ایلی اور

شہزاد کا عشق بڑی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا رومانی ہے اور اس میں رخنوں کو اور اس کے نتیجوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکلتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ لاہور میں ایلی کا ایک اور عشق چلتا ہے اور وہ بھی بڑا دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ پر عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا پھر جب ہمیں ایلی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلہ کے تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظریہ پیش کرتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ اور ضخامت ہماری دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہو گی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی ضخیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ (بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجئے تو اس میں ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوئی تو کسی طرح نہ ہو گی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوئے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہو گی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھئے اس کی ایک چوٹی ہو گی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مثلث کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ "علی پور کا ایلی۔" بھی اسی قسم کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتدا ایلی یا الیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے۔ باپ علی احمد دو مائیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ۔ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ پر منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص رد عمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز سن کر دھک سے رہ جاتا ہے۔ اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازمہ کی طرح ہے جو قناعت اور رواداری سے زندگی گزار رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور گھن کھاتا ہے مگر اس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ماحول پورے طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتدا بڑی معنے خیز اور فنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف رد عمل

جو داستان کی بنیادی چیز ہو گا پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ کو وہ ہیروئن اور صفیہ کو وہ ولن سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو تیار ہے۔ علی احمد اس سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دینا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان تو اپنے کام کی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے پورے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔

بہرحال ابتدا ایک فوکس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف گریز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے۔ اس کا آصفی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا ہے اور اس کے بادشاہ اور ملکہ علی احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گہرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا باب "گرد و پیش۔" اسی طرح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو مارجن میں چھپی نظر آتی ہے۔ ظاہرہ یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور دھیان لگا رہنے میں خاص مدد کرتا ہے۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے سائز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے۔ اک پہاڑی کہئے مگر اس پر جانے کا راستہ چکر کا سہی مگر صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہنمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم بہم پہنچاتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی۔" قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ اُپج اور جدت کے ساتھ اس پر چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ راہبر کے فرائض ادا کئے ہیں۔ بے خیالی میں یہ مان لینا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹرکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہنگم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کرانے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا

بالکل غلط ہو گا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی طرح بے ہیئت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا شعور داد کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طول عمل ہو گا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آ جانا دکھائی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے۔ تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد۔ ایلی اور کچھ آگے چل کر شہزاد کے قصے پلاٹوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لکیر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب معاشقوں کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرتسر کو حد مان کر دائرے میں بلایا جا سکتا ہے۔ ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوصہ حصہ جسے علی پور کہتے ہیں۔ ایک واقعاتی مگر نئی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے۔ اور مختلف بلکہ گوناگوں قصوں اور کردار کو ایک اتحاد میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تخیلی اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرخی "علی پور کا ایلی۔" نہایت سادہ۔ نہایت سیدھی۔ سپاٹ اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے۔ مگر یہ انگریزی اور یوروپی ناولوں کی سرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے اول مواد کے ہر ہر جزو میں پروئی ہوئی نظر آتی ہے۔

اتحاد کا تاثر اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے ابل کر نکلتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بنیادی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی احمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ اسے تعلیم حاصل کرنا ہے اور ملازمت پر آنا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ واقعات کا منفرد مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خاندانی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں۔ جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھ بچوں والی شہزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ پلاٹ ہو جاتا ہے۔ کسی پر اسرار اصول کے ماتحت ناول کو عشقیہ قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کش مکش سے ہی سارے قصے کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک ہر بات حد سے زیادہ حقیقی ہے مگر ہم اسے بجا اور پر خلوص عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ مضحک بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہرے پر ایک عجیب تخیلی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قصہ کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دولہن کی طرح داخل ہوتی ہے اور علی پور کے آصفی محلّہ کے سب سے خاص مکان یا محل میں آکر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کا دل قریب ہے۔ شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی بھاوج چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آجاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو وہ یہ کہہ کر روکتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آکر پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے یا اور کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر ایلی کی خاص نظر رہتی

ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو "چھن سے۔" اس کی طرف آجاتی ہے۔ اس مبہم مگر دلچسپ محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سامان کی الگ کوٹھری میں ہے تو ایلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگر ناکامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن طے ہو جاتا ہے کہ ایلی شہزاد کو بھگا لے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے۔ اور وکیل یہ سن کر کہ محبوبہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت کچھ دخل ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں "چھن سے۔" آجاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آکر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کی پینگ کافی بڑھتے ہیں۔ اس لڑکی کو سائیکل پر لئے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آجاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ منگنی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ علی احمد جس کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہنا ہے ایلی کو رنڈیوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور ایلی کو ایک رنڈی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانہ کی گندگی میں کود ہی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا کچھ ہوتا ہے کہ ایلی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت پر آتا ہے اور شہزاد سے اس کی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنے پہلے شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر ایلی کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بمبئی میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب تقسیم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو "عالی عالی۔" کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے رہتے ہیں۔ علی احمد کے ٹین کا سپاہی بن کر متعدد معاشقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ضمناً" ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل

کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہر سلسلے میں ڈرامائی سین بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضافہ رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ کیا لفظ بھی بلا ضرورت ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم دیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد اہل فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجہ طے ہوں۔ عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہی بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایلی کا خاندانی محل ایک سٹیج ہے اور اسی پر سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرت سر' لاہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی اسٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحاد تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں قاری کے تصور میں جو دنیا رہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی محلہ اور اس کے خاص محل کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تو تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فنکاری سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر کہہ دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوی اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سمیٹتی اور ایک مستقل شکل یا ہیئت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈرا دینے والی چیز ضرور ہے۔ اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم معنے سمجھتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی۔" ایسے کلیوں کی صاف رد ہے۔ اتنے وسیع مواد کو ترتیب میں لے آنا۔ ایک مستقل فارم کا تاثر دینا اور دلچسپی کو قائم رکھنا ہی وہ کمال ہے جو مفتی صاحب کو ناول نگاروں کی صف اول میں کھڑا کر دیتا ہے۔ طفیل صاحب نے ضخامت میں لطف پیدا کرنے کا خیال کرتے ہوئے "علی پور کا ایلی۔" کا سرشار کے فسانہ آزاد سے مقابلہ کیا ہے۔ "علی پور کا ایلی" فسانہ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانہ آزاد ایسی بے تکان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کڑ بڑ جھالے سے ایک دلکش تعمیر میں ارتقا کر

کے پہنچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانہ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لایا جا سکتا ہے۔ تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے "علی پور کا ایلی۔" کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھب گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان سرگزشت' ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں۔ یعنی نقاد کی حیثیت سے ان کی بابت ناول کا لفظ استعمال کرنے سے ہچکائیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ تنقیدی شکوک سے بالاتر ہے۔ اور اس کی موج خرام نے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکہ ان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر "علی پور کا ایلی۔" اس کے بڑے پیمانہ پر عمل اور کامیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ "علی پور کا ایلی۔" میں ہر جگہ کردار امنڈتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان بظاہر تین لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلے سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص ٹھپہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔ اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قمیض اتار کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کی دھوتی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوتی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھر ادھر سرکے رہنے کی عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔ "ایلی حقہ بھر دو۔" حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان کی ایک بیاہتا بیوی ہاجرہ ایلی کی ماں ہیں۔ جو اب محض نوکرانی ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ

ایک ہی ٹھنی بیوی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے کمرے کی زینت رہتی ہیں۔ مگر صفیہ ان کے بے پناہ جنسی رجحان کی ایک مثال ہے ورنہ

"دادا کی وفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہاجرہ کو ہمیشہ کے لئے آلو چھیلنے اور آٹا گوندھنے پر مامور کر دیا اور خود کمر ہمت باندھ کر اپنے جذبہ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ایستادہ چال۔ ابھری ہوئی چھاتی۔ فراخ پیشانی اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر تخلیے میں ڈان کو ہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے گا۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما ٹین کے سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تارو پود تھا۔ ٹین کا سپاہی جنگجو سورما۔"

علی احمد اس صفت کے تمام تر بندے ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کری کیچر بھی کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ ایلی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منتظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ان کا ٹین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی والہانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کی فتح پر فتح حاصل کرتے ہیں۔ ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آتے ہیں۔ جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ انہیں لکھنے سے عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود تھا۔ ایک جنرل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلقہ ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلو دار (ROUND) کرنے کی مفتی صاحب کوشش کرتے

ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو میں اور ہرگز کر یکیچر نہیں کہے جا سکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک منفرد، نیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے۔ عورت دیکھتے ہی یہ ٹین کا سپاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر بھی ایلی کو داخل ہوتے ہوئے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر وقت رجسٹر پر علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جنسی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو راز میں رکھنا رسم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو دون کو ہٹے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایلی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے۔ جیسے ڈون کو ہٹے کے سات سانکو پانزا مردانیٹر کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے مسٹر پکوک اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے دھیان میں بھی وہ آفاقی اور دائمی ٹائپ ہیں، اور "علی پور کا ایلی۔" میں وہ علی احمد اور ایلی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈون کہوٹے کی طرح اپنا بھالا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایلی سانکو پانزا کی طرح اس کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارا صبورہ و نعدار عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کسیاں جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایلی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے۔ سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی۔ اپنے سے رشتہ کی عزیز کی جوان بیوی شہزاد بھی ان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر بھی عجیب ہے وہ کھل کھلا کھل کھلا لگاوٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ خیر ان کا وار خالی جاتا

مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آ جاتی ہے کہ جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزیات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں۔ خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے شیکسپیئر نے فالسٹاف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پر اثر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوجی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزاروں صفحوں پر بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوجی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاح کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہو گا۔

"علی پور کا ایلی۔" کا کردار نگاری میں دوسرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن جوانی اور زندہ دلی کی صورت ہے اور حسین عورت کی بیباکی اس میں عجیب و غریب کرشمہ دکھاتی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا شریف بیان کرتا ہے۔

واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسم با مسمیٰ ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دہلیز سے باہر آگئی اور میرے روبرو اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔

—— اس نے مینڈک کو ایک تھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سو رہا تھا تو وہ تھیلی میرے منہ پر پھینک دی اور ڈر کر اٹھ بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔

اور پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک شوخ حسینہ آ کھڑی ہوئی اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک مونگیا گٹھڑی اسے دکھائی دیتی ہے۔

"مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیگے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے تازہ خون کی لو کا ایک ریلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ مخملی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اور بالآخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ڈبے کے دوسرے لوگ جھلملا کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہزاد کی کردار نگاری اس کے دوسرے لوگوں پر تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آصفی محلہ میں

آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے۔ مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا رومانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے۔ اس کی چال چھم سے آ جانا۔ اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا انداز اس کے ماتھے پر تل۔ اس کے گورے گورے کھلے بازو۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سنگ مرمر کے پیر۔ اس کا لگاؤ اس کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شرمی کہتے ہیں۔ اور اس کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود ایلی سے شوخی کرنے کا بہانا نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطۂ نظر سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن نکھنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ شہزاد سے انہیں خود ویسا ہی دلی تعلق ہے۔ جیسے ایلی کو تھا۔ وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو سب سے زیادہ آیا اور روشن کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے۔* ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقعیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین وجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد چھم سے آ جاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پر بلانے آنا۔ پھر اکیلے میں ایلی سے بے باکانہ ملنا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی حسین تاثرات کے باوجود اسے آسمانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے مگر ٹالتی بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گالوں کو سہلاتی ہے۔ اس کے چٹکی بھی لے لیتی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے۔ شہزاد وہاں آئے تو اس پر حملہ آور ہو شہزاد

کو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے:۔

دروازہ کھلا شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی۔ "تم یہاں۔" ایلی کی خاموشی اور اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ "یہ سب کیا ہے؟" وہ بولی "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا۔" وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمتری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

"خدا کے لئے۔" وہ چلائی۔ "ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔"

"وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

"ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔" وہ بولی۔ "تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔"

"ہاں۔" ـــــ ایلی نے بھیانک آواز میں جواب دیا۔ "نہیں ہوں۔"

"ایلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ وہ چلائی "پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔"

ایک رنگین دھندلکا ایلی کے قریب تر آ گیا اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جونک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو، منہ سر جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔

بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی۔ چرار چرار۔ ریشمی کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

"ایلی پاگل نہ بنو۔" ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی "پاگل نہ بنو۔" مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بپھر گیا۔

دھپ ـــــ ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور معاً گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اڑا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزاد کے بند بند چومنے لگا۔ اور بالآخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا۔ "مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے۔"

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو۔

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی اور محبوبہ بھی۔ معشوقانہ انداز پوری بیباکی کے ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور بچہ پیدا کرنے میں زرخیز بھی کہی جا سکتی ہے۔ مگر ایلی کی طرف اس کا رجحان مادرانہ بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے بابت ڈھر سے اچھی یا بری رائے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت کی پیچیدہ اور غیر فطرت کا کتنا زبردست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کا رویہ متضاد سوالات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار انہیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس

زمانے میں جب ایلی چھٹی لے کر علی پور آتا ہے اور شریف بھی آموجود ہوتا ہے حرکات سے محبت ٹپکتی ہے اور وہ اسے بڑی ذہانت سے بیباکی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایلی کو ڈھونڈھنے جاتی ہے۔ اور اسے گھسیٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی محبوبہ کی باتیں کرتی ہے جن کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پردے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے۔ اور اکیلے میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کو شبہ ہے کہ وہ ایلی سے عشق لڑا رہی ہے۔ اور وہ اس عشق کو کبھی بیباکی میں اور کبھی زکاوت کی باتوں میں چھپالیتی ہے۔ اس کا چھم سے آجانا۔ اس کا چھن سے آجانا قیامت ہے۔ وہ وارفتہ بھی ہو جاتی ہے مگر اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افسردگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایلی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایلی رقابت محسوس کرتا ہے۔ تو اسے سمجھاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی۔ ”تم مجھے سمجھے کیا ہو۔“ تم مجھے نہیں سمجھتے۔ حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے مفتی صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرشمہ ہے۔ جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرانے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایلی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ چھن سے تصور میں آجاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرد ہے اور دھڑا دھڑ بچے بھی ہو رہے ہیں۔ ایلی سے ملاقات ہوتی رہتیں ہیں۔ کبھی نیاز اور آخر میں اس چھ بچوں کی ماں سے کنوارا ایلی شادی کر لیتا ہے۔ ایلی نوکر ہے اور وہ اس گھر کی ہی نہیں دل کی بھی شہزادی بنی رہتی ہے۔ شادی کے بعد وہ دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ سخت بیمار بھی ہوتی ہے مگر ہومیوپیتھ کی دوا سے مرنے سے بچ جاتی ہے۔ مگر اپنی شریف سے لڑکی کے بارے میں اس کا ایلی سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ بالکل دوسری چیز ہے ایلی اس سے الگ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا دل بھی اس کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ آخر میں وہ دق ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقاء کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثبت رہتی۔ ٹولسٹوئے نے انا کارینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے

پہلے ہی مار ڈالا۔ فلابیر نے میدم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاب بالکل رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ریلسٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹتا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہئے۔ بہرحال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پر اثر بنایا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیروئن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کرشمہ کا اشارہ ہے۔ وہ ہر کرشمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ شیکسپیر کی کلیوپاترا کو نگر کی میلانات۔ ٹولسٹوئے کی انا۔ فلابیر کی ایماء اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے ——— وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

(۴)

مگر ناول کی ریڑھ کی ہڈی۔ روح رواں اور جان ایلی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کے ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقوش میں علی احمد شہزاد کے نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایلی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بابت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایلی ایسا کردار ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پر اسرار صنعت نہیں کھوتا۔ ایسا پنچھی جو پانی میں ڈبکیاں لگاتا ہے مگر پر جھاڑ کر پھر جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جا سکتے۔ شاید بلکہ یقیناً ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایلی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے اور اسی لئے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں

ڈھونڈھے نہیں ملتا اس لئے اسے نایاب کہہ دیتے ہیں۔ ایلی وہ نایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور اسے انہوں نے صفحہ ناول پر اتار دیا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ نارمل انسان کی شکل دکھائے۔ فیلڈنگ نے ٹوم جونس میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج بھی ماڈل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایلی میں ایسا کردار پالیا ہے شاید وہ خود ایلی میں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی اعلیٰ صلاحتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی ان صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحتیوں کو سامنے لاتے ہیں یا انکساری میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بڑھانے سے سروکار ہے نہ گھٹانے سے۔ ان کے ذاتی تجربہ سے جو آدمی محض آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ عموماً" بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام سنسنی پیدا کر کے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑائی چھو کر بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ ٹوم جونس راسکل ہے مگر تجربہ اسے ہیرو بنا ہی دیتا ہے۔ جرمن ناولوں میں جنہیں ROMAN BUILDING کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقاء نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے بعد پر جھاڑ کر ویسے کا ویسا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدروں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گڑا ہوا پودا ہے جس کا قد اور سن مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقاف کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جاندار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹتے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوار کے لوگوں سے ملئے تو ان

میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ایلی معلوم ہو گا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھڑے پر لگ گئی ہو گی۔ بچپن کھیل میں یا گھر کے معمولی کام بددلی سے کر آنے میں گزرا ہو گا۔ زبردستی اسکول اور کالج بھی گیا ہو گا۔ اور کسی نہ کسی طرح تعلیم نپٹا کر معمولی ملازمت پر بھی آگیا ہو گا۔ رسمی طور پر اس کی منگنی اور شادی بھی ہو گئی ہو گی۔ اگر اس میں غیر معمولی بات ہو گی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہو گی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جا سکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی کی طرح کی جنسی دلچسپی رہی ہو گی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہو گا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہو گا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہو گی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو برا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود غرضی بھی واجبی واجبی ہو گی۔ وہ ایک گھٹیا سا معلوم ہو گا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھٹاتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اچھائیوں اور برائیوں میں پڑنے کا برابر اہل اور نااہل ہو گا۔ ہم خالص جذباتی EVERY MAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معمولی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہروں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تولے جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیرو اس لئے دلچسپ ہوتے ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی ہی ہے کہ وہ ہر کام میں نااہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے۔ اور اس کی بنا پر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت میں مگر ہم کو ان پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہرگز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ تکڑم بازی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھلاہٹ کے باوجود ایک عزم اور

استقلال آ جاتا ہے اور وہ اس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کرلیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک
کہہ سکتے ہیں مگر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی
سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شہزاد سے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر
نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ
وسیع ہوتا ہے اور اس کی "ذہین۔" قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ
زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔

غالباً" اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد
پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جینس جینز کی فلکیات ہالوس ہکسلے
کے سائنس کا عجز' سے متعلق مضامین برٹرینڈ رسل کے فزیکس سیتانا کے جذبات کاؤنٹ
کر-بمکین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ویلز کی سائنٹیفک فکشن کتابوں سے اخذ تھا۔
ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا ـــــــ

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام
کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا' عظمت عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں
ہوتا تھا اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں سے
اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی
تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایلی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔
اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایسی واقعاتی دنیا
میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایلی کی اور اس دنیا کی ذہنی اور کرداری سطح
ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور
ہمیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور
معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ سے زیادہ معمہ ہوتی جائے۔ ایلی
اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایسی ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہو گا کہ یہ ایلی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح

کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے
کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی
زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے۔ ظاہرہ واقعات کے ساتھ ساتھ ایلی کی اندرونی دنیا بھی
سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف ردعمل اور اس کے
مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے اسے نفرت کا بھی تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد کا عشق ایلی کی اندرونی
یا ذہنی کشمکش کا اظہار ہے وہ گومگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چل گیا
ہے پوری نفسیاتی تخیل کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی
ہے۔ اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لگا ہوا ہے۔ تو
بھی شہزاد چھن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیائیں ساتھ ساتھ
چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح دو سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی
جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر جیمس جوائس کی "جولیس۔" میں کہتی ہے۔ مفتی صاحب
INTERNAL MONO LOGUC کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک
دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی
کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایلی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مرجانے
کے بعد بھی شہزاد ایلی کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب
وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے۔ تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی
ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی۔ "میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔" وہ بولی۔ "ایلی نیا جیون
جیو۔ نیا جیون جیو۔"

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑکا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی میں
یہ سن کر کہ گورداس پور ہندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امرتسر
اور علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا ـــــــ

پرمٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

"عالی عالی۔" اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:۔ حضور حضور ——— ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستو فسکی کے "براور کارمازاف۔" کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستوفسکی سے گہرے طریق پر متاثر ہے۔ ایلی کے کردار میں دوستو فسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لئے ماڈل ہے۔ مفتی صاحب بھی اس ماڈل پر چلنے میں پورے کامیاب ہیں۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کی ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی۔ اس کا رخ واقعیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور واقعیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روسی ناول کی تفصیل اور جزئیات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید واقعیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عالموں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور میں ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے۔ مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچتے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پور زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تخیل اثر جماتا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے۔ مگر ٹولسٹو کی "اناکارینہ۔" پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ ہو بہو حیات ہے۔ مفتی صاحب کی واقعیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود ناپے جا سکیں یا جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے۔ مفتی صاحب اسے "ڈھیر۔" کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ وہ ہو بہو زندگی کی طرح ہے

اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسپا کر دیتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فنکاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگا گئے ہیں۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا نادانی مان لیتے ہیں۔ یہ ناول ہے۔ اس معنوں میں ناول نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محفوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر ہے اور یہ تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں لائی گئی ہے۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے' اس کی کوئی تکی بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا مخرج ایلی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا آصفی محلے' علی پور' امرتسر' لاہور تک جاتا ہے۔ وہ سارا خطہ جو گرداسپور سے لے کر لاہور تک ہے اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ بمبئی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایلی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایلی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں ہر جگہ ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناور کی سی طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کا ہے مگر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ناول میں بس وہی وہ ہے اور شہزاد تک اس کے ذہن کی پیداوار ہے۔

"یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایلی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ "علی پور کا ایلی۔" ایک خود نوشتہ سوانح ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تخیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دوسرا آدمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایلی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایلی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تخیل کی تخلیق ہے اس لئے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعات کا

نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ حیات کے مطابق اور ایک فنی نظر کے مطابق تعمیر ضرور ہے۔

علی پور کے آصفی محلہ کی سماجی اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عالم اسلام ہے جو ہندویت اور تصوف سے متاثر ہے۔ ایلی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی درجہ پر اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے عظیم تصور خدا حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزاد کے حسن کا وہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش ہوتی ہے۔ اور وہ شوہر والی چھ بچوں کی ماں سے شادی کر ہی لیتا ہے۔ اس کا ادب کی طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحافی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر قلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس میں احساس کمتری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست سے کوئی غرض نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھونس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں وقت ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں سہی مگر وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرنا ہے وہ کر گزرتا ہے اور اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطہ نظر کو مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے واقعات اور عمل نقطۂ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعات ہی واقعات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جاتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے۔ شیکسپیئر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس سے کوئی واضح نقطۂ نظر نکال لینا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے ایلی کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا نقطۂ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تخلیق کے سلسلے میں بھی ہر فن کاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فنکارانہ ترتیب۔ انتخاب ارتفع سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر

اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو ربط دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تابع نہیں ہیں مگر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استاد ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آ گئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پرواہی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امنڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور انگلی کے سیلاب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فنکاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داد دی جا سکتی ہے مگر فن کو چھپانا کمال ہے اور مفتی صاحب اس کمال پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظریہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ "علی پور کا ایلی۔" میں کوئی فن نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا مگر غور کی نظروں کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فن کار بول اٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ "اسے آدم جی انعام نہیں دیا گیا۔" ممکن ہے کہ اس بات پر پبلک سے شکایت ہو مگر اس سے انعام دینے والوں کی نااہلی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہو گا۔ اس بات کو طے کرنے والے "نقاد" ہوں گے اور میں ان کو ہی نہیں بلکہ ان کے اچھے اچھوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ لگے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ "علی پور کا ایلی۔" کے ایسے اوریجنل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی

نقاد کسی نئے راہ کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے بروست نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ "مجھے اس کی قدر کرنے کی نقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبان ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پر کھ لیتے ہیں۔" "آلار شر سے دو تان بارود۔" کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شکایت کی ان سے مل کے کہا۔ "آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔" اصل بات یہی ہے کہ ہمارے پروفیسر نقاد کے لئے ادب لگائے بندھانے کا سودا ہے اور وہ جو طالب علم نکال رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ "علی پور کا ایلی۔" کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول کے آشنائے راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں ماڈل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن و فکر کے بہانے ناول سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب "ناول کیا ہے؟" پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت تک "علی پور کا ایلی۔" وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا "علی پور کا ایلی کو پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہیئے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آ جائے۔" حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

مصنف کا نوٹ

اگرچہ علی پور کا ایلی ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب کی واحد خوبی ہے کہ اس میں ہر واقعہ سچ سچ بیان کر دیا گیا ہے۔ اخلاق' ادب' روایت اور کلچر سے بے نیاز ہو کر۔ عبادت آرائی سے پاک بناوٹ سجاوٹ سے بے نیاز مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی' لیکن زبان دانوں اور ناقدروں نے اسے شرف قبولیت بخش دیا۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے۔

اب اس خود نوشت کی تصدیق کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں کتاب کے اہم کرداروں کے اصلی نام پیش کر دوں تاکہ حقائق کے متعلق تحقیق میں آسانی ہو۔

مصنف کے آبا شیخ فیروز ولی اور احمد راست قلم کے قلمی کتابوں سے اخذ شدہ کوائف

شہر بٹالہ پاک و ہند برصغیر میں تقریباً ۷۶ طول بلد اور ۳۲ عرض بلد پر ۱۴۶۵ء مطابق ۸۶۹ھ بہلول لودھی کے دور حکومت میں آباد ہوا سولھویں صدی عیسوی میں نواب شمشیر خان ۳ کروڑی ناظم علاقہ ما جھہ ودو آبہ جالندھر نے بٹالہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور اس شہر میں عالیشان عمارات' خوبصورت باغات وسیع تالاب تعمیر کئے اور یوں شہر کو فروغ ملا۔ خاندان مغلیہ کے دور حکومت میں بٹالہ کو پرگنہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا انتظام ایک کروڑی منصب دار کے سپرد تھا سکھوں کے زمانے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی مہتاب کور کی والدہ سدا کور اور مہاراجہ شیر

سنگھ عرصہ تک بٹالہ میں سکونت پذیر رہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر موقعوں پر بٹالہ آکر نواب
شمشیر خاں کے بنوائے ہوئے تالاب کے قریب کئی روز متواتر قیام کرتا۔ برطانوی راج میں بٹالہ
کافی عرصہ تک ضلع کا صدر مقام رہا اور بعد میں حکومت نے ضلع کا صدر مقام بٹالہ سے
گورداسپور منتقل کیا اور بٹالہ کو تحصیل بنا دیا۔

آزادی برصغیر اور تقسیم صوبہ پنجاب کے وقت ۱۹۴۷ء میں بٹالہ شہر کی آبادی پچاس ہزار
سے تجاوز کر چکی تھی، شہر بٹالہ کی جنوبی فصیل میں دروازہ کلاں ہے جسے تقسیم پنجاب تک بڑا
دروازہ یا ہاتھی دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر کچھ فاصلہ پر شہر میں شمال کی جانب
ایک قلعہ نما محلہ مفتیاں تھا، جسے عام شیخاں حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ محلہ ستمبر ۱۹۴۷ء تک خاندان
مفتیاں بٹالہ کی اقامت گاہ رہا اور تقسیم ملک کے بعد اس کا نام چتوڑ گڑھ رکھا گیا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں بٹالہ میں
چار درویش وارد ہوئے۔ چاروں عرب نژاد بزرگ ایران سے اپنے عقائد کی حفاظت کی خاطر
ہندوستان آئے۔ ان کے قافلہ میں ایک مرزا غیاث بیگ بھی تھے۔ جن کے اس سفر کے دوران
ایک لڑکی تولد ہوئی جس کا نام مہرالنساء رکھا گیا اور جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے ملکہ جہانگیر
بنی۔ یہ چار بزرگ بٹالہ میں مقیم ہوئے اور باقی قافلہ آگے دہلی کی طرف چل دیا۔ ان بزرگوں
میں سے ایک فقیر منش اور درویش صفت بزرگ نے شہر سے باہر شمال مشرق کی جانب ایک میل
کے فاصلہ پر گوشہ نشینی اختیار کی اور مصروف عبادت ہوئے۔ ان کی وفات پر وہیں ان کا مقبرہ بنا
جسے حجیرہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے بزرگ وزیر صاحب شہر کے دروازہ کلاں کے باہر جنوب کی سمت
تقریباً" آدھے میل کے فاصلہ پر گوشہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد وہیں ان خانقاہ
زیارت گاہ خاص و عام بنی تیسرے بزرگ شہر کے جنوب مشرقی حصہ (اندرون نصیرالحق دروازہ)
میں سجادہ نشین ہوئے اور ان کی اولاد میں قادریہ سلسلے کے کئی خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ
ہوئے۔ چوتھے بزرگ شیخ فیروز ولی بن شیخ بہلول بن شیخ جلال تھے۔ شیخ فیروز ولی کے بٹالہ پہنچتے ہی
قاضی عبداللہ خطیب ان کی علمیت اور قابلیت سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے ہمسایہ میں ایک
مسجد کے قریب رہنے کی دعوت دی اور ملازمت حاکم کی ترغیب دلائی بلکہ شیخ فیروز ولی کی خواجہ
معین تک رسائی کرائی۔ جس سے شیخ فیروز ولی کا تقرر فوراً روزنامچہ نرخ پر ہو گیا۔ شیخ فیروز ولی

مسجد کے نزدیک اولین رہائش گاہ اور قریبی علاقہ کے گرد ۱۵۸۹ء میں ان کے تیسرے صاحبزادے
شیخ فتح اللہ صدی نے فصیل کھینچ کر محلہ مفتیاں کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۹ء میں ایک اور نظریہ فروغ پایا کہ شیخ ولی بن شیخ بہلول (بھلیو) بن شیخ جلال (جلو) بن
ددود بن نادر بن لکڑ بن جیل بن ہانسل بن سپل بن شاہ تکوچر قوم راجپوت موضع بوہ پرگنہ ہیبت
پور پٹی سے خضر خان گورنر لاہور کے ہاتھوں موضع بوہ کی تباہی کی وجہ سے اپنے موروثی علاقہ
سے کئی سوگاؤ میش چھوڑ چلے اور موضع گوندوال اور موضع رائے پور سے ہوتے ہوئے بٹالہ
پہنچے تھے۔ باقی تفصیلات میں البتہ کوئی فرق نہیں۔ شاید کوئی تحقیق طلب ان نظریات کی گتھی کو
سلجھائے۔ جب کہ ہر دو نظریات بے کم و کاست خاندان مفتیاں کے اجداد کے بارے میں یہاں
رقم ہیں۔

شیخ فیروز ولی کے دوسرے فرزند شیخ احمد فیروز ۱۵۵۴ء میں شیخ فیروز ولی کے ہاں پیدا ہوئے۔
آپ کی والدہ کا اسم مبارک سلیم خاتون تھا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی شیخ محمد ولی کی عمر دو یا
تین سال تھی۔ آپ نے بٹالہ میں ہوش سنبھالا، مسجد کی قربت اور والد کے علمی ذوق اور مشاغل
کے درمیان اپنے بڑے بھائی شیخ ولی محمد (تاریخ پیدائش ۱۵۵۲ء) اور چھوٹے بھائیوں مسمی شیخ فتح
اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۸ء) اور شیخ نعمت اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۶۸ء) کے ساتھ احسن تربیت
پائی۔ خود منشی طبیعت تھے۔ بچپن میں تبدیلی وطن کی صعوبت برداشت کی جس نے عمر بھر کے
لیے محنت اور کاوش کی عادت ڈال دی۔ رقوم ثلث، نسخ، تعلیق، نستعلیق و سیاق اور خط شکستہ
میں کمال حاصل کیا اور جدت پسند طبیعت نے ان میں نئی اختراعات پیدا کیں۔ ادھر خاندانی
روایت کے تحت فنون حرب میں ایسی استعداد حاصل کی کہ مغل اور افغان آپ کی تیراندازی کی
تعریف کرتے۔ آپ بیس سال کی عمر میں نواب وزارت پناہ قاضی علی سلطان کے سرخط نویس
مقرر ہوئے پھر روزنامچہ پر ترقی پائی۔ اور دو بیستی منصب پایا۔ نواب جالینوس الزمانی حکیم ابوالفتح
اور حکیم ہمام گیلانی جیسے نامور بزرگوں کے مقرب رہے۔ اور تقریباً" تینتیس سال کی عمر ۹۹۶ھ
میں دیوان پرگنہ شہر کوٹ اور پرگنہ فاربرہ مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۴ھ میں خواجہ طاہر محمود والد خواجہ عماد
الدین اور نواب آصف صفات آصف خاں کی وساطت سے دربار اکبری پہنچے اور بادشاہ کے دہن
مبارک سے "راست قلم" کا لقب پایا۔ اکثر امراء نے آپ کو مبارک دی۔ اس وقت آپ کے
چھوٹے بھائی شیخ فتح اللہ شاہی تخت کے پاس نواب آصف خان کی مسند کے عقب میں کھڑے

تھے۔ چند روز بعد بادشاہ نے منصب میں بھی ترقی دی۔ دو دفعہ کشمیر کا دورہ کیا۔ اولاً حکیم ہمام کے ہمراہ' دوئم شہنشاہ اکبر کے جلو میں ۔ دکن' مالوہ اور برہان پور کی مہمات میں شامل ہوئے۔ نواب کا لقب اور کروڑی منصب پایا۔ شاہی دربار میں آگرہ پہنچے تو وہاں رؤسا اور امرا آپ کی مہمان داری کا شرف چاہتے۔ ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۲۰ء شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کی مہمان داری چھ روز تک بٹالہ میں کی اور بارہ روز تک رسد بٹالہ سے کلانور بھجوائی۔ یہ تھی دنیاوی دولت اور عزت۔

شبیہ کا یہ عالم تھا کہ بسیار خوش صورت' پوشاک اور طریق یوں اپنائے کہ دربار اکبری میں اکثر امرا آپ کو مغل زادہ سمجھتے۔ اخلاق حسنہ کی بلندی کا یہ حال کہ غربا کی مدد فرماتے۔ فقرا کو گھر بلاتے' مہمانداری کرتے اور عزت و احترام سے پیش آتے۔ پاکبازی' خشوع' ہردلعزیزی' دلربائی اور راست گفتاری میں مشہور وقت جس کی مندرجہ ذیل جھلکیاں اس زمانے کے خطوط میں ملتی ہیں۔

"شیخ احمد راست قلم و دوست کردار۔۔۔۔"

"برگزیدہ نیکاں و پاکاں ہندوستان یعنی شیخ الشیوخ شیخ احمد محظوظ بود ہمیشہ در کشاکش و طلب و تصدیع دوستاں راسخ دم و ثابت قدم۔۔۔۔۔"

راستی شد چوں شعار قلمش   احمد راست قلم شد علمش

"بے تکلف و مبالغہ' ہیچ روزے نیست کہ ان کہن سال دودمان اخلاص یعنی پیر عدالت گزیں شیخ احمد را از صمیم قلب یاد نمیکنیم و از مفاوقت قسمت او تاسف نداریم۔۔۔۔۔"

حق گوئی میں اتنے یکتائے زمانہ کہ بڑے بڑے آپ کی وکالت اور فیصلے کے خواہاں رہتے۔ گھر میں ہر بزرگ و خورد کا صلاح مشورہ لیتے اور اگر کوئی مشکل پڑتی تو خاندان کا اجلاس طلب کرتے پھر نقش عمل مرتب کرتے۔ نماز' روزہ اور ذکر خدا میں کسی حال کوتاہی نہ کرتے اور ہر دعا میں روح بزرگان کو ثواب بخشتے۔ اور سلامتی افراد خاندان کی دعا فرماتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا۔ چہار یارؓ باصفا کے مداح۔ حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے ثناخواں اور حضرت فرید گنج شکر علیہ رحمتہ کے مرید تھے۔

حضرت والدہ اور بڑے بھائی کی عزت کرتے۔ چھوٹے بھائیوں اور عزیزگان سے شفقت سے پیش آتے۔ اور جب بھی کار دنیا سے فرصت ملتی روضہ حضرت فرید گنج پاکپتن اور والدہ

کی خدمت میں بٹالہ حاضر ہوتے۔

قصہ مختصر نواب شیخ احمد فیروز راست قلم کروڑی نے اپنی زندگی میں کارہائے دنیا و دین میں صحیح توازن رکھا۔ ۱۶۳۳ء میں اس توازن کا نقشہ یعنی اپنی روئداد (۲۰۲) دو سو دو حکایات کی صورت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فارسی کتاب "قصص الاحمد۔" میں محفوظ کر گئے۔

شیخ فیروز ولی (جیسا کہ ہم بزرگوں سے سنتے آئے ہیں) سادات ہاشمی تھے۔ جن کے بزرگ عرب سے آکر ایران میں آباد ہوئے۔ اور جب شیخ فیروز ولی نے اپنے عقائد کے تحفظ کی خاطر حالات ایران ناسازگار پائے تو اپنے خاندان سمیت مغلیہ عہد میں ہندوستان چلے آئے اور بٹالہ میں اقامت اختیار کی۔ شیخ کا لقب انھوں نے اپنے علم' عمل اور قابلیت کی بنا پر پایا تھا۔ اس سلسلہ کا ذکر سید عبدالمجید امجد بخاری چشتی سلیمانوی نے بھی اپنی کتاب "یاد ایام۔" (بٹالہ اور مشاہیر بٹالہ کی مختصر تاریخ) (مؤلفہ ۱۹۶۹ء) میں صفحہ نمبرے پر کیا ہے۔

تقسیم کے وقت بٹالے کے مسلمان شہر بدر کر دیے گئے۔ مفتیاں محلے کے لوگ یا تو راستے میں دم توڑ گئے یا پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے' لیکن سب بکھر گئے۔